صلی اللہ علیہ وسلم

رسولؐ نمبر

نقوش

۳

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۱۲ ٹیلی فون نمبر ۵۴۵۲۵

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمایندہ

نقوش

رسولؐ نمبر

جلد سوم

شمارہ نمبر ۱۳۰

جنوری ۱۹۸۳ء

مدیر:
محمد طفیل

ادارۂ فروغ اُردو ۔ لاہور

قیمت لائبریری ایڈیشن : ۱۲۵ روپے
بار دوم

ترتیب

۳۔ اصلاحِ معاشرہ

۴۔ عظمتِ انسانی کا نقیبِ اوّل، ہمارے رسولؐ

(۵۔ سیاسی نظام پر اثرات

۶۔ فلاحی معاشرہ اور اقتصادی نظام

(محمد طفیل پرنٹر و پبلشر و ایڈیٹر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغِ اردو لاہور سے شائع کیا)

طلوع

مجھے سیر و تفریح کا قطعاً شوق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے ایک شہر سے دُوسرے شہر جاتے ہوئے خاصا پریشان ہونا پڑتا ہے۔ ملکوں ملکوں کی سیر تو دُور کی بات ہے۔

مگر اب کے مَیں سعودی عرب گیا۔ بڑے شوق سے گیا۔ کیونکہ یہ ملک میرے محبوب کا ملک ہے۔ جہاں کہ وُہ پلے بڑھے تھے، جہاں کہ اُنھوں نے اپنے پیغام سے دنیا کو متوجہ کیا تھا۔

پہلے مَیں جدہ گیا۔ اس کے بعد مکّہ گیا۔ خانۂ خدا کو دیکھا۔ حجرِ اسود کو دیکھا کہ جسے رسولؐ اللہ نے خانۂ کعبہ میں رکھا تھا۔ پھر مَیں مکّہ کی گلیوں اور بازاروں میں گھومتا رہا، یہ جان کر کہ شاید ادھر سے میرے رسولؐ گزرے ہوں!

اس کے بعد مدینہ گیا۔ روضۂ اقدس کو دیکھا۔ منبر کی جگہ کو دیکھا کہ جہاں رسولؐ اللہ کھڑے ہو کر خدا کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچایا کرتے تھے۔ منبر کے سامنے کھڑے ہو کر نمازیں پڑھیں، یہ سوچ کر کہ شاید یہیں حضورؐ کھڑے ہو کر خدا کی بارگاہ میں سجدے کرتے ہوں!

پھر مسجد قبا گیا جو رسولِ حقؐ نے بنائی تھی۔ جو دُنیا کی پہلی مسجد تھی۔ اُس جگہ کو بھی دیکھا کہ جہاں سرورِ دوعالمؐ کھڑے ہو کر، خدا کی وحدانیت کا اعلان کیا کرتے تھے۔

خواہش صرف اتنی تھی کہ اُس جگہ آنکھیں بچھاؤں، جہاں کہ رسولِ اکرمؐ نے قدم رکھا ہو۔ اُس جگہ سجدہ کروں کہ جہاں حضورؐ نے سجدہ کیا ہو۔

بالآخر مَیں نے روضہ کے سامنے بیٹھ کر دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیئے۔ دل پر جو کچھ اُترا، وہی حاصلِ زندگی:

مجھے کچھ اور نہیں چاہیے!
مجھے کچھ اور نہیں چاہیے!

○

محمد طفیل

اس شمارے میں

جلد اوّل، جلد دوم میں سیرت کے بنیادی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے، وُہ بھی پوری تفصیل کے ساتھ!

جلد سوم کا انداز ہی اور ہے۔ اس میں قبل از بعثت سے لے کر آخری دنوں تک کے حالات، محققانہ انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔ جتنے موضوعات کا احاطہ موجودہ جلدوں میں کیا جا سکا، وہ حاضر کیے جا رہے ہیں۔

اس نمبر میں لکھنے والوں کی اہمیت سے زیادہ موضوع کو اہمیت دے کر مضامین کو ترتیب دیا گیا ہے۔ وہ جرأت بھی اس خیال سے کی کہ بارگاہِ رسولؐ میں، کسی کا بھی نام بڑا نہیں۔ بڑائی کام کی ہے جو اپنی اہمیت ہر جگہ منوائے گی۔ دُوسرے ایسا اس لیے بھی کیا گیا کہ مضامین کی ترتیب کا تقاضا یہی تھا، یا میرا خیال ایسا تھا۔

اس نمبر میں مندرجہ ذیل عنوانات قائم کر کے، ان کے تحت متعدد مضامین پیش کئے جا رہے ہیں تاکہ وہ اپنے "قبیلہ" میں رہیں اور قاری کو بھی کھچڑی ترتیب سے بچایا جا سکے۔ بڑے عنوانات یہ ہیں:

۱ ـــــ عالمِ بشریت، اسلام سے پہلے
۲ ـــــ رحمۃ للعالمینؐ، بہ حیثیت انسانِ کامل
۳ ـــــ اصلاحِ معاشرہ
۴ ـــــ عظمتِ انسانی کا نقیب اوّل، ہمارے رسولؐ
۵ ـــــ سیاسی نظام پر اثرات
۶ ـــــ فلاحی معاشرہ اور اقتصادی نظام

ان چھ موضوعات کے تحت ۴۶ مضامین چھاپے گئے ہیں، باقی موضوعات پر مضامین آیندہ جلدوں میں پیش کیے جائیں گے۔

اہتمام یہ کیا گیا ہے کہ ہر جلد اپنی جگہ مکمل ہو!

[محمد نقوش]

كُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ

تم لوگ ایک آگ کے گڑھے کے دہانے پر کھڑے تھے،

(آل عمران: ۱۰۳)



عالمِ بشریت اسلام سے پہلے

انسانیت اسلام سے پہلے

محمد مظہر الدین صدیقی

بعثتِ نبویؐ کے وقت دنیا کی سیاسی اور اقتصادی حالت

اسلامی تعلیمات کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اس مذہبی، سیاسی، اقتصادی اور تمدنی ماحول کو مدِنظر رکھیں، جس کے اندر اسلامی تحریک رونما ہوئی۔ جہاں تک اس زمانہ کی سیاسی حالت کا تعلق ہے، اس وقت عرب کے آس پاس دو بڑی زبردست سلطنتیں قایم تھیں۔ یعنی روم اور ایران۔ لیکن ان دونوں پر سیاسی اور اخلاقی زوال طاری تھا۔ ان کی باہمی جنگوں سے مہذب انسانیت کا ایک بڑا حصہ پامال اور عوام الناس کا امن وچین رخصت ہوچکا تھا۔ حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ ولی اللہ صاحب نے اس زمانہ کے حالات کا جو نقشہ کھینچا ہے، وہ اتنا صحیح اور حقیقت پسندانہ ہے کہ ہم ان کی عبارت کو ہو بہو نقل کرتے ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

(ترجمہ) "جب ایرانیوں اور رومیوں کو مختلف اقوام پر حکومت کرتے صدیاں گزر گئیں اور انھوں نے دنیوی زندگی ہی کو اپنا مقصد بنا لیا اور آخرت کو فراموش کر بیٹھے اور شیطنت ان پر غالب آگئی، تو ان کی زندگی کا حاصل یہ بن گیا کہ عیش کے دن گزاریں۔ چنانچہ ان میں سے ہر شخص دادِ عیش دینے لگا۔ ان کے اس طرزِ زندگی کو دیکھ کر دنیا کے ہر گوشہ سے علماء اور سائنسدان ان کے گرد جمع ہونے لگے، جو ان کے لیے سامانِ عیش مہیا کرنے کی غرض سے عجیب عجیب دقیقہ سنجیاں اور نکتہ آفرینیاں کرنے لگے اور نئے نئے اسبابِ زینت کی ایجاد و اختراع میں مصروف ہوگئے۔ سرمایہ پرست امراء کا یہ حال ہوگیا تھا کہ جس کسی کے پاس ایک لاکھ درہم سے کم مالیت کا پٹکا یا کلاہ ہوتا تھا، اسے بخیلی کا طعنہ دیا جاتا تھا۔

ایسے ہی انھوں نے عالیشان سربفلک محل، اعلیٰ درجہ کے آبزن، نفیس حمام، نظر افروز پائیں باغ، سواری کے نمایشی جانور، خدمت کے لیے خوب صورت غلام اور حسین باندیاں، اپنی زندگی کے لوازم بنالیے اور مقصدِ حیات صرف یہ سمجھ لیا کہ صبح و شام عیش و نشاط کی محفلیں ہوں، جن میں طرح طرح کے کھانے وسیع دستر خوانوں پر چُنے ہوں اور لباسِ فاخرہ پہنے اُن پر بیٹھے ہوں۔ بغرض ان ملوک ایران و روم کی داستان پاستان کہاں تک بیان کی جائے۔ تم اپنے زمانے کے پادشاہِ دہلی کی جو حالت دیکھتے ہو، وہی ان ملوکِ ایران و روم کی حالت کا قیاس کرنے کے لیے کافی ہے۔

بادشاہوں اور امیروں کی اس عیاشانہ زندگی سے بہت سے خطرناک معاشی اور معاشرتی امراض پیدا ہوگئے، جو حیات معاشری کے ہر شعبہ میں داخل ہوگئے۔ ان سے نہ شہری محفوظ رہا، نہ دیہاتی، نہ امیر اور

نہ غریب۔ اس ہمہ گیر مصیبت کا سبب یہ تھا کہ یہ سامانِ تعیش کثیر زر و مال صرف کیے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ مالِ کثیر کاشتکاروں اور تاجروں وغیرہ پر نئے ٹیکس لگانے اور پہلے کے لگے ہُوئے ٹیکسوں میں اضافہ کیے بغیر حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ پھر مصیبت بالائے مصیبت یہ کہ گراں بار ٹیکس لوگوں کو طرح طرح سے تنگ کر کے وصول کیے جاتے تھے۔ اگر وہ ٹیکس ادا کرنے سے انکار کرتے تھے، تو ان کے خلاف فوجی کارروائی کی جاتی تھی ......

اس اقتصادی بدحالی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ٹیکس ادا کرنے اور اپنا اور اپنے اہل و عیال کا پیٹ پالنے کے سوا لوگ اور کسی امر کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتے، چہ جائیکہ سعادتِ اُخروی کے متعلق سوچ کر سکیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سارے ملک میں ایک شخص بھی نہیں رہتا، جو حصولِ معاش کی کشمکش یا عیش و عشرت کی دلفریبیوں سے نکل کر کائنات کی حقیقت اور اخلاقی سعادت کے بارے میں غور و فکر کر سکے۔"

آخر میں شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:

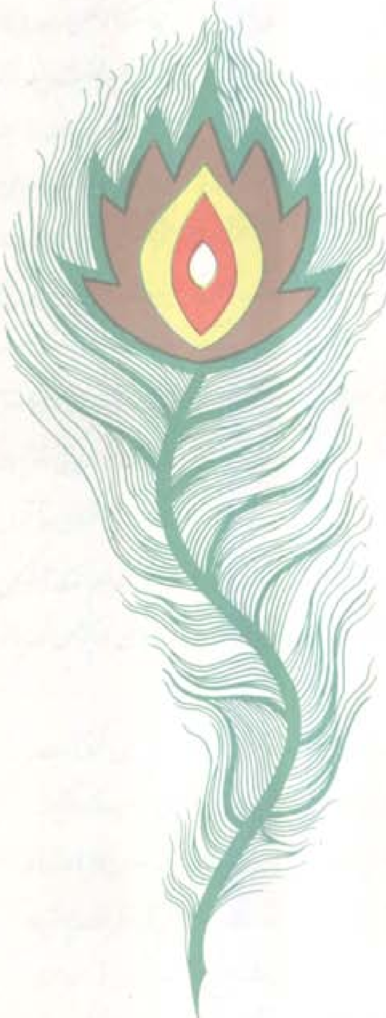
فلما عظمت ہٰذہ المصیبۃ و اشتد ہٰذا المرض سخط علیہم اللہ والملٰئکۃ المقربون و کان رضاہ تعالیٰ فی معالجۃ ہٰذا المرض بقطع مادتہ فبعث نبیًا امیًا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم لم یخالط العجم والروم و لم یترسم برسومہم وجعلہ میزانًا یعرف بہ الہدی الصالح المرضی اللہ من غیر المرضی وانطقہ بذم عادات الاعاجم وقبح الاستغراق فی الحیاۃ الدنیا والاطمئان بہا و نفث فی قلبہ ان یحرم علیہم رؤس ما اعتادہ الاعاجم وتباھوا بہا کلبس الحریر والقسی والارجوان والاستعمال اوانی الذھب والفضۃ وحلی الذہب غیر المقطع والثیاب المصنوعۃ فیہا والصور وتزویق البیوت وغیر ذٰلک ۔ وقضیٰ بزوال دولتہم بدولتہ و ریاستہم بریاستہ و بان ہلک کسریٰ فلا کسریٰ بعدہٗ و ہلک قیصر فلا قیصر بعدہٗ۔ (حجۃ اللہ البالغہ۔ جلد ا۔ ص ۱۰۶)

(ترجمہ) جب یہ مصیبت بہت بڑھ گئی اور مرض نے شدت اختیار کر لی، تو خدا تعالیٰ اور اس کے مقرب فرشتے ناراض ہُوئے۔ اس وقت خدا تعالیٰ کی مشیت یہ ہُوئی کہ اس مرض کا مادہ ہی کاٹ کر پھینک دیا جائے کیونکہ مرض لا علاج حد تک بڑھ گیا تھا۔ چنانچہ اس غرض کے لیے خدا تعالیٰ نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا، جو بالکل ان پڑھ تھے اور جنھوں نے کبھی ایرانی اور رومی لوگوں سے میل جول نہ رکھا تھا اور نہ ان کی رسم و رواج اور طرزِ معاشرت اختیار کی تھی۔ انھیں رسوم صالح اور غیر صالح کے درمیان تمیز کرنے کا معیار قرار دیا اور ان کی زبانِ فیض ترجمان سے عجمیوں کی رسموں کی مذمت کروائی۔ اور دنیاوی زندگی میں انہماک اور اس پر اطمینان کر کے بیٹھ جانے کی خرابی ظاہر کی۔ ان کے دل میں ڈالا کہ جن اخلاقِ فاسدہ اور رسوم ردّیہ کے عجمی

كُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ

تم لوگ ایک آگ کے گڑھے کے دہانے پر کھڑے تھے،

(آل عمران: ۱۰۳)



عالمِ بشریت اسلام سے پہلے

عادی ہیں اور جن پر وہ فخر و مباہات کرتے ہیں، وُہ حرام ہیں۔ مثلاً ریشمی لباس، ارغوانی کپڑے، سنہرے اور روپہلے برتن، سنہری زیور اور ایسے کپڑے جن پر تصویریں بنی ہوں، مکانوں پر نقش و نگار۔ خداوند تعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ اس نبی کی حکومت کے ذریعے سے قیصر و کسریٰ کی حکومت کو برباد کر دے اور اس کی لیڈر شپ کے ذریعے ان کی لیڈر شپ کو ختم کر دے۔ چنانچہ اس کے وجود سے کسریٰ ہلاک ہو گیا اور پھر کوئی کسریٰ نہ ہو گا اور قیصر کی قیصریت ختم ہو گئی اور پھر اس کا کوئی جانشین نہ ہو سکے گا۔

ساسانی حکمرانوں کے تحت زردشتی مذہب اپنے عروج کی انتہا کو پہنچ گیا۔ لیکن اس کی اخلاقیات کو گھن لگ چکا تھا۔ ایران کے مذہبی آتشکدے آباد تھے۔ لیکن دلوں کے آتش کدے بجھ چکے تھے۔ اردشیر اور اس کے جانشین مذہبی یکسانیت پیدا کرنے کی غرض سے زردشتیوں کے سوا سارے مذاہب کی بیخ کنی کے درپے تھے، لیکن ان کا مقصد حاصل نہ ہو سکا۔ زمانہ مابعد کے ساسانیوں کے تحت ایرانی سلطنت فرقہ وارانہ نزاعات کی گرم بازاری، حکمرانوں کی عیاشی، امراء کے ظلم و ستم اور مذہبی طبقات کے غرور و تکبر میں بازنطینی سلطنت سے کسی طرح پیچھے نہ تھی۔ اس کے فرمانرواؤں کو الوہیت کا درجہ حاصل تھا۔ وہ اپنی رعایا کے جان و مال اور عزت و آبرو پر پورا پورا اختیار رکھتے تھے۔ عوام بالکل بے زبان اور تمام حقوق سے محروم تھے۔ ان کی حیثیت بالکل غلاموں کی تھی۔

یورپ میں سپین کی حالت بالخصوص نہایت ابتر تھی۔ امراء جنھیں رومی شہنشاہوں کے تحت تمام اعلیٰ مناصب اور عہدے حاصل تھے، ہر قسم کے محصول سے بری قرار دیے گئے۔ یہ لوگ نہایت شاندار محلات میں رہتے اور غلاموں اور کنیزوں کا ایک جمِ غفیر ان کی مشایعت کیا کرتا تھا۔ ان کا زیادہ وقت حماموں میں گزرتا، جو بداخلاقیوں کے اڈے بن گئے تھے۔ ان کی دولت و ثروت اور اعلیٰ معیارِ زندگی کے مقابلہ میں عوام الناس کی حالت نہایت شکستہ اور قابلِ رحم تھی۔ متوسط طبقے اور شہروں اور دیہاتوں کی آزاد آبادی رومیوں کے ظلم و ستم سے تنگ تھی۔ غلاموں کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کیا جاتا تھا۔ وحشی اقوام کے حملوں نے ملک میں اور زیادہ ابتری پھیلا دی۔ انھوں نے ہر طرف قتلِ عام اور تباہی کا بازار گرم کر دیا اور ہزاروں عورتوں، بچوں اور پادریوں کو غلام بنا لیا۔

رومی سلطنت کی کیفیت اس سے بدتر تھی۔ جان بی فرتھا سکو اپنی کتاب "قسطنطین اعظم" میں لکھتا ہے:

"یہ تو ہم پڑھ چکے ہیں کہ فرمانروائے سلطنت کی حیثیت بہ نسبت سابق کے اب بہت بدل گئی تھی۔ اب وُہ ایک رومانی امپراطور یعنی مالک جنگ و پیکار یا سلطنت کا سب سے اعلیٰ مبارز نہیں رہا تھا بلکہ محلوں کا بادشاہ ہو گیا تھا۔ ایک مشرقی تخت نشین حکومت کے تکلفات اس میں پیدا ہو گئے تھے، عوام کی نظر سے پوشیدہ رہتا تھا۔ سونے اور جواہرات سے مرصع لباس پہنتا تھا اور ہر چہار طرف جاہ و حشم کے سامان موجود رہتے تھے۔ رعایا کو تعلیم ہوتی تھی کہ شہنشاہ کا خیال جب دل میں یا ذکر زبان پر آئے، تو اس کو انسان سے بڑھ کر معظم و محترم سمجھیں اور جب لوگ اس کے حضور میں حاضر ہوں تو نہایت ادب سے گھٹنے ٹیکتے ہوئے آگے بڑھیں۔"

ہر زوال پذیر سلطنت کی مانند رومی سلطنت میں دفتریت کا پھیلاؤ بھی بہت بڑھ گیا۔ چنانچہ وہی مصنف، جس کا حوالہ ہم پہلے دے چکے ہیں، لکھتا ہے:

"ہر ایک ایسے حاکم کے نیچے اہلکاروں کا ایک انبوہِ کثیر ہوتا تھا اور یہ ہی انتظام درجہ ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک کے سر رشتوں اور محکموں میں جاری تھا۔ خود مختار بادشاہوں کو مجبوری ہوتی ہے کہ ماتحتوں کی ایک با اختیار اور تربیت یافتہ جماعت (بیوروکریسی) کے ذریعہ ملک پر حکومت کریں اور یہ سلسلہ حکام با اختیار کا ایک ایسے پھیلاؤ کا بھاری چٹان ہوتا ہے، جس کے بوجھ میں محصول دینے والی رعایا دبی مرتی ہے۔ کیونکہ اس عظیم الشان انتظام کی عمارت کر سنبھالے رکھنا ان ہی غریبوں کا کام ہوتا ہے۔"

رومی بازنطینی سلطنت کے نظامِ محصول بندی کا ذکر بھی مصنف ان الفاظ میں کرتا ہے:

"خلاصہ یہ کہ اس سخت محصول بندی سے صوبجات کے زمیندار اور چھوٹے کاشتکار بالکل ہی فنا ہو گئے .... قسطنطین کے زمانے میں بالخصوص اس کے آخری دورِ حکومت میں اس بات کی شہادت بکثرت موجود ہے کہ صوبجات کے گورنر جس طرح چاہتے تھے، رعایا کو لوٹتے تھے۔ بلکہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کو اجازت تھی کہ جس طرح چاہیں، رعایا پر جبر کریں ...... ظاہر ہے کہ اس سخت محصول نے رعایا پر بڑی سختیاں کی تھیں۔ ہر ایک علاقے میں جس قدر سرمایہ پس انداز لوگوں کے پاس تھا، وہ سب ختم ہو گیا۔ اور یہ کاشت کار بالکل تباہ ہو چلے ......"

غرض کہ ملکی واصلات اور خرچ کا جو طریقہ جاری تھا اور جہاں تک اس کا تعلق اراضی کی بابت مالگزاری سے تھا، اس کے وضع کیے جانے کی غرض صرف یہ معلوم ہوتی تھی کہ ہر ایک علاقے کی دولت بالکل کھینچ لی جائے۔ اس سختی کی وجہ سے رعایا میں حدّ بندی کا طریقہ نکل آیا اور اس طریقہ کی سختیاں خزانۂ شاہی کی ضروریات کے مطابق بڑھتی گئیں اور آزاد کاشتکار، جو پہلے کسی کے غلام نہ تھے نہ نوکر، بالکل ہی بگڑنے لگے۔ جب مفلسی بڑھی تو امیروں کے غلام نہیں تو ادنیٰ رعیت بن کر کاشتکاری کرنے لگے اور یہ ادنیٰ پیشہ ان کی جات ہو گئی، یہ کاشت کار گو غلام نہ تھے، لیکن اپنی نقل و حرکت پر قدرت نہ رکھتے تھے۔ جس وقت ان غریبوں کا حقِ ملکیت زمین سے اُٹھ گیا، تو پھر وہ دوسروں کے نوکر اور بندے ہو گئے۔ اس حال میں جو کچھ زمین سے پیدا کرتے تھے اس کا ایک مقررہ حصّہ مالک کو دیتے تھے۔ اس کے علاوہ جہاں کہیں مالک کی سکونت ہوتی، وہاں جا کر چند مقررہ ایام تک بیگار میں کام کرتے تھے بغرض ان کاشتکاروں کی حالت جن کو کولونس کہتے تھے، رفتہ رفتہ ایسے غلاموں کی ہو گئی، جن کو پوری آزادی نہ ملی ہو، بلکہ غلامی اور آزادی کی درمیانی حالت میں ہوں۔ دُوسرے لفظوں میں یہ سمجھیے کہ اب وہ محض سرف (SERF) رہ گئے تھے۔ یعنی ایسے کاشت کار ہو گئے تھے، جن کا تعلق کسی طرح زمین سے، جس پر وہ کاشت کرتے تھے، جُدا نہیں ہو سکتا تھا۔ گویا زمین کے ساتھ اشیائے غیر منقولہ میں ان کا بھی شمار تھا۔ ان کاشتکاروں کی نسبت لکھا جاتا تھا کہ "وہ زمین کے ساتھ شامل ہیں"۔ ان غریبوں کو اپنی حالت بہتر کرنے یا اپنی اولاد کی مدد کرنے کا مطلق موقع حاصل نہ رہا تھا۔ صرف ایک صورت اس حالت سے

نجات کی تھی اور وہ یہ تھی کہ کہیں فوج میں بھرتی ہو جائیں۔

طبقہ واریت

ہندوستان میں جب آریہ حملہ آور پنجاب سے آگے بڑھے، تو ان کے مذہبی طبقات نے مفتوحہ آبادی کو الگ تھلگ رکھنے کے لیے نہایت سخت قواعد وضع کیے۔ اگر مفتوحہ آبادی کا کوئی فرد فاتح طبقہ کے کسی شخص کو چھو لیتا، تو اس کو مذہباً ناپاک تصور کیا جاتا تھا۔ اعلیٰ ذاتوں کے مذہبی رسوم و شعائر شودروں کے لیے بالکل ممنوع تھے۔ شودروں کو یہ اجازت تو ضرور تھی کہ وہ اپنے آبا و اجداد کی یاد میں قربانیاں کریں، لیکن ان مراسم میں کوئی برہمن حصہ نہیں لے سکتا تھا اور اگر لیتا تو اسے سخت سزاؤں کا مستوجب قرار دیا جاتا۔ اگر کوئی شودر کسی برہمن کو وید پڑھتے سُن لیتا، تو اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالا جاتا تھا۔ اگر وہ کسی برہمن کی نشست پر بیٹھ جاتا، تو اسے گرم لوہے سے داغ دیا جاتا۔ کوئی شودر اونچی ذات والوں میں شادی بیاہ نہیں کر سکتا تھا اور نہ طبقہ اعلیٰ کے کسی فرد کو یہ اجازت تھی کہ وہ شودروں میں شادی بیاہ کرے۔

ایران میں مسلمانوں کے داخلہ سے قبل محصولات کا جو نظام رائج تھا، اس سے ایرانیوں کی طبقہ وارانہ ذہنیت صاف عیاں ہوتی ہے۔ خسرو نوشیرواں کی اصلاحات کے مطابق ایران میں عام آبادی کو دو محصول ادا کرنے پڑتے تھے، ایک خراج یعنی محصول زمین، دوسرے گزیت یعنی جزیہ۔ لیکن ایران کے سات بڑے خاندان، جن میں شاہی خاندان بھی شامل تھا، ان محصولوں سے مستثنیٰ تھے۔ اسی طرح اُمرائے عظام جنھیں العظما، کہا جاتا تھا۔ انھیں بھی دونوں محصولوں سے بری کر دیا گیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ تمام فوجی سپاہی، سرکاری عہدہ دار، آتشکدوں کے نگران کار، مذہب کے نمایندے اور وہ اشخاص جو شہنشاہِ ایران کے شخصی ملازم تھے، ان محصولوں کی ادائیگی پر مجبور نہ تھے۔ اس طرح حقوق یافتہ طبقات اور عوام الناس کے مابین ایک گہری خلیج حائل تھی۔ یہ حقوق یافتہ طبقات حکمرانوں، امیروں، مذہبی پیشواؤں اور نظم و نسق کے کارکنوں پر مشتمل تھے۔

زن و مرد کی عدم مساوات

عرب میں اسلام سے قبل عورتوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جاتا تھا، اس کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن دنیا کے دوسرے حصوں کی کیا حالت تھی۔ دختر کشی کی رسم صرف عرب تک محدود نہ تھی بلکہ ہندوستان میں بھی اس کا خاصا رواج تھا (امیر علی۔ اسپرٹ آف اسلام۔ مقدمہ ص ۲۸) یہ امر صحیح طور پر معلوم نہیں کہ بیواؤں کو زندہ جلا دینے کی رسم ہندوستان میں کب سے شروع ہوئی۔ لیکن ساتویں صدی عیسوی میں اس کا رواج عام تھا۔ عورتوں کو وید پڑھنے کی ممانعت تھی اور اسی طرح وہ دیوتاؤں کی قربانیوں میں بھی حصہ نہیں لے سکتی تھیں۔ عورت کا مقصدِ زندگی صرف یہ تھا کہ وہ عمر بھر شوہر کی چاکری کرتی رہے۔ ہندوستان میں مردوں کی طرح عورتوں کی بھی بہت سی مذہبی برادریاں قائم تھیں۔ یہ غیر شادی شدہ عورتیں آزادی کے ساتھ خانقاہوں میں داخل ہو سکتی تھیں۔ جہاں انھیں باقاعدہ رکن کی حیثیت دی جاتی تھی۔ غیر شادی شدہ عورتوں اور مردوں کے اختلاط سے فضا بالکل ناپاک ہو چکی تھی اور زناکاری عام تھی۔

ایران میں عورتوں کی حالت کچھ اس سے بہتر نہ تھی۔ ہندوستان میں تو منو کے قوانین کے باعث مردوں اور عورتوں پر کچھ اخلاقی پابندیاں عاید تھیں۔ لیکن ایران میں مرد ہر قسم کی اخلاقی، مذہبی اور قانونی گرفت سے بالکل آزاد تھا۔ اس کی مرضی اپنا آپ قانون تھی۔ وہ خون کے قریب ترین رشتوں میں شادی کر سکتا تھا اور جتنی بیویوں کو چاہتا طلاق دے سکتا تھا۔ عورتوں کو مردوں سے علیحدہ رکھنے کی رسم صرف ایرانیوں تک محدود نہ تھی، آیونی یونانیوں میں عورتوں کو گھروں میں بالکل مقفل رکھا جاتا تھا اور انھیں

کسی حالت میں باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ ایران میں زمانہ قدیم سے یہ دستور تھا کہ عورتوں کی حفاظت کے لیے مردوں کو ملازم رکھا جاتا تھا۔ نیز یونان کی طرح یہاں بھی خواصوں اور داشتہ عورتوں کو رکھنے کا طریقہ عام تھا۔ اسے نہ صرف مذہباً جائز قرار دیا گیا تھا بلکہ یہ ایرانیوں کی سماجی زندگی کا لازمی خاصہ بن گیا تھا۔

مذہبی عدم رواداری اور فرقہ واریت کا زور عیسائیوں کے باہمی مذہبی اختلافات کا پہلا مظاہرہ مجلس نیقیہ میں ہو چکا تھا اس مجلس نے آریوسی عقیدہ کو مردود قرار دیا تھا۔ حالانکہ آریوس کو مسیح کی الوہیت سے انکار نہ تھا۔ اس کا عقیدہ صرف یہ تھا کہ ایک وقت ایسا تھا جب باپ تھا اور بیٹا نہ تھا۔ یعنی حضرت مسیح ابدیت میں خدا سے ایک درجہ کم ہیں۔ اس جرم میں آریوسی عقاید کے پیرؤوں کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا گیا اور آریوس، یوسی بیوس اور تھیوگ نس کو سلطنت سے جلا وطن کر دیا گیا۔ اسی زمانہ میں نسطورس کی تکفیر کا واقعہ پیش آیا، جس کے متعلق ڈریپر اپنی کتاب "معرکۂ مذہب و سائنس" میں لکھتا ہے:

"عیسوی مذہب میں بت پرستی کے عنصر کی آمیزش کا عمل تو بہ طرف جاری ہی تھا۔ اب ہر بطریق کو ہر دلعزیز بننے یا اپنا اثر و رسوخ برقرار رکھنے کے لیے اس بات کی فکر پڑ گئی کہ جس طرح بن پڑے، اپنے معتقدیوں کے عقاید کو سام اس سے کہ ان عقاید کا زمانہ قبل ظہور مسیحیت ہو یا بعد ظہور مسیحیت مذہب میں داخل کر لیا جائے۔ مصریوں نے اسی طرح مسئلہ تثلیث کے متعلق اپنے خاص قسم کے عقاید کو عیسائیت میں زبردستی داخل کر لیا تھا اور اب وہ چاہتے تھے کہ مریم عذرا کی پرستش کے بہانے سے آئی سس کی قدیم پرستش کو از سر نو زندہ کیا جائے۔

انھیں دنوں میں قیصر تھیوڈوسیس نے نسطور کو جو فلسفہ میں تھیوڈور کا ہم مسلک تھا، قسطنطنیہ کا بطریق اعظم مقرر کیا (۲۴۷ء) ان ذلیل تجسیمیہ عقاید سے جو عوام میں پھیلے ہوئے تھے، نسطور کو انکار تھا اور اس کا یہ خیال تھا کہ خدائے ذوالجلال و قیوم کو جو کائنات کے ذرّہ ذرّہ میں ساری و دائر ہے ذات یا صفات میں انسان کے مشابہ یا مماثل قرار دینا کفر ہے۔ نسطور پر ارسطو کے فلسفہ نے گہرا اثر ڈالا تھا اور اس کی یہ کوشش تھی کہ عقاید مشائیہ کو خالص مسیحی عقاید کے ساتھ تطبیق دی جائے۔ اس بنا پر اس میں اور اسکندریہ کے بطریق سائرل میں جھگڑا ہو گیا۔ سائرل کا تعلق کلیسا کی اس جماعت سے تھا، جو بت پرستی کی حامی تھی اور نسطور اس گروہ کا سرگروہ تھا، جو مذہب کو مطابق عقل ثابت کرنے میں کوشاں تھا۔ یہ سائرل وہی ہے، جس نے ہائی پیشیا کو قتل کیا تھا۔ سائرل نے عزم بالجزم کر لیا تھا کہ حضرت مریم کی پرستش خدا کی ماں ہونے کی حیثیت سے ارکان کلیسا میں داخل ہو جائے اور نسطور کا مصمم قصد تھا کہ ایسا نہ ہونے پائے۔ چنانچہ قسطنطنیہ کے صدر گرجا میں نسطور نے ایک خطبہ پڑھا جس میں خدائے قیوم کی صفات کو شرک سے مبرا قرار دیتے ہوئے اس نے ازراہِ استعجاب یہ سوال کیا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ایسے خدا کی ماں ہو؟ ....

اسکندریہ کے ادنیٰ درجہ کے پادریوں کی شہ پا کر قسطنطنیہ کے پادریوں نے "خدا کی ماں" کی حمایت کا

بڑا اٹھایا اور نسطور کی مخالفت شروع کی۔ اس مناظرہ نے یہاں تک طول کھینچا کہ شہنشاہ کو مجبوراً حکم دینا پڑا کہ الفیسس میں کونسل منعقد ہو۔ سائرل نے اس اثناء میں دربارِ شاہی کے صدر خواجہ سرا کو کئی سو مثقال سونے کی رشوت دے کر شہنشاہ کی بہن تک رسائی حاصل کر لی۔ اس طور پر سائرل نے ایک دن میں میدان مار لیا، اور اپنے حریف کو شکست فاش دے کر خوش خوش گھر پہنچا۔ نسطور نے بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے کہ اس کے عذرات تو سُن لیے جائیں اور جو دلائل وہ پیش کرنا چاہتا تھا ان کو ایک نظر تو دیکھ لیا جائے۔ لیکن اس کی ایک پیش نہ گئی۔ بجائے اس کے کہ اس کو صفائی کا موقع دیا جاتا اُس پر فردِ قرار دادِ جرم لگا دی گئی۔ ۔ ۔ ۔ نسطور موردِ عتاب ہوا اور جلا وطن کر کے مصر کے ایک ریگستان میں بھیج دیا گیا۔ اس کے دشمن عمر بھر اس کو ایذائیں دیتے رہے۔

دو سال کے بعد نسطور کے پیروؤں نے اپنا ایک علیحدہ کلیسا قائم کر لیا اور الفیسس کی مجلسوں کے فیصلوں کو ماننے سے انکار کر دیا۔ لیکن سرکاری کلیسا کو دنیوی اقتدار حاصل تھا اور نسطوریوں کو شدت سے سزائیں دی گئیں۔ انطاکیہ اور یونانی بولنے والے شامی علاقہ میں ظلم و ستم نے اپنا پورا کام کیا اور نسطوری مصر میں ایک مغرور فرقہ کی حیثیت میں آ گئے۔

۴۸۹ء میں شہنشاہ زینو نے اڈیلسہ کے مدرسے کو اس بنا پر بند کر دیا کہ اس کے ارکان نسطوری میلانات رکھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اڈیلسہ کے نسطوری اساتذہ اور اہلِ علم بارسوما کی قیادت میں ایرانی سرحد کے پار نقل مکانی کر گئے۔ بارسوما نے ایرانی بادشاہ فیروز کو سمجھایا کہ راسخ العقیدہ یعنی سرکاری کلیسا یونانیوں کا موید ہے لیکن نسطوری بازنطینی سلطنت کے مظالم کی بنا پر اس سے بالکل الگ ہو گئے ہیں۔ اس طور پر نسطوریوں کو ایران میں پناہ مل گئی۔

یہ تو تھا عیسائیوں کے مختلف فرقوں میں باہمی رواداری کا حال۔ اب یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ عیسائیوں کے اقتدار کے تحت یہودیوں کے ساتھ برتاؤ کیا جاتا تھا۔ قسطنطین پہلا بازنطینی رومی فرمانروا تھا، جس نے عیسائیت کو سرکاری مذہب قرار دیا تھا۔ اس بادشاہ نے یہودیوں کے متعلق یہ قانون وضع کیا کہ اگر کوئی یہودی کسی ایسے شخص کو پتھر سے مارے یا اس کی زندگی خطرہ میں ڈالے، جس نے یہودی مذہب ترک کر کے عیسائیت قبول کی ہو، تو ان تمام لوگوں کو زندہ جلا دیا جا سکتا ہے، جو ایسی کارروائی میں شریک ہوں۔ اس کے بعد ایک قانون یہ وضع کیا گیا کہ کوئی عیسائی یہودی مذہب نہیں اختیار کر سکتا۔ مرنے سے چھ ماہ پہلے قسطنطین نے ایک اور قانون کے ذریعہ یہودیوں کو ممانعت کر دی کہ وہ کسی عیسائی کو غلام نہ رکھیں۔"

ڈین ملمین اپنی کتاب "یہودیوں کی تاریخ" میں صفحہ ۱۹۱ پر لکھتا ہے:

"قسطنطین کے جانشین نے یہودیوں کے بارے میں جو سخت تر قواعد وضع کیے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے مابین عداوت کے جذبات کتنے شدید تھے۔ بدقسمتی سے یہودیوں نے اپنے

رویہ سے حکومت کو اشتعال دلانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ یہودیوں کے جوشیلے نوجوانوں نے آریوسی اور اثاتانیوسی فرقوں کے جھگڑوں میں شریک ہو کر ان مذہبی اور فرقہ وارانہ فسادات کو اور زیادہ ہوا دی، جن سے اسکندریہ کی فضا مکدر تھی۔ انھوں نے بُت پرستوں کی طرح آریوسی فرقہ کی طرفداری میں بڑی سنگدلی اور غارتگری کا مظاہرہ کیا۔ کئی گرجاؤں کو جلا دیا اور بہت سی دوشیزاؤں کی آبروریزی کی۔ جنھوں نے کلیسا کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دی تھیں۔ اسی زمانہ میں جوڑیا میں یہودیوں نے پھر بغاوت کی۔ جس نے عیسائیوں کے ظلم وستم کے لیے ایک اور بہانہ فراہم کر دیا۔ یہودیوں پر محاصل کا شدید ترین بوجھ ڈال دیا گیا۔ انھیں منع کر دیا گیا کہ وہ کوئی عیسائی غلام اپنے پاس نہ رکھیں، ورنہ انھیں موت کی سزا دی جائے گی۔ اسی طرح عیسائی عورتوں سے بھی شادی کی ممانعت کی گئی۔ شہنشاہ ہیڈریان کے زمانہ کا ایک قانون دوبارہ نافذ کر دیا گیا، جس کی رُو سے بیت المقدس میں ان کا داخلہ روک دیا گیا۔

جولین کی تخت نشینی سے یہودیوں کی جان میں جان آئی۔ کیونکہ یہ شہنشاہ بُت پرست تھا اور عیسائیوں کا سخت مخالف۔ لیکن جولین کے جانشینوں نے پھر قدیم عیسائی حکمتِ عملی کا احیاء کر کے یہودیوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا۔ چنانچہ تھیوڈوسیس نے ایک قانون کے ذریعہ فلسطین سے باہر بسنے والے یہودیوں کو حکم دیا، کہ وہ فلسطین کے یہودی بطریق کو سالانہ خراج کی رقم ادا کرنا بند کر دیں۔ اس حکم کی وجہ سے فلسطین میں یہودیوں کی مذہبی سیادت اور مرکزیت کو سخت صدمہ پہنچا۔“

ترکِ دُنیا اور رہبانیت کا زور

اسلام سے پہلے جو تمدن کش رجحانات کارفرما تھے، ان میں سب سے زیادہ نمایاں تصوّر یہ تھا کہ دنیوی زندگی ایک لعنت ہے۔ جس سے چھٹکارا حاصل کرنا انسانی نجات کے لیے ضروری ہے۔ بُدھ مت نے ہندوستان میں اس رجحان کو اور زیادہ تقویت دی۔ اس نے مذہب کا ترکِ خواہشات پر دارومدار رکھا اور نروان یا فنا سے کامل کو مقصودِ حیات قرار دیا۔ اس کے علاوہ اس نے ایک نہایت وسیع اور منظم خانقاہی نظام کی تخلیق کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں لاکھوں انسان جو اپنی اعلیٰ درجہ کی صلاحیتوں کو قوت سے فعل میں لا کر تمدن کی ترقی اور انسانیت کی خوشحالی میں اضافہ کر سکتے تھے۔ دنیا اور علائقِ دنیا سے الگ ہو کر خانقاہوں، جنگلوں اور پہاڑوں میں ریاضت اور نفس کشی کے دن گزارنے لگے۔ ان کے نزدیک انسان خدمتِ خلق کے لیے نہیں بلکہ مراقبہ اور ذکر و فکر کے لیے پیدا ہوا تھا اور روحانی تسکین و نجات کے حصول کا طریقہ یہ نہ تھا کہ انسانیت کو اس کی پست سطح سے بلند کیا جائے۔ تمدن کے وسائل کو ترقی دی جائے اور انسانی تعلقات کے نظام کو بہتر اصولوں پر قائم کیا جائے بلکہ رُوح اور نجات کی تسکین کا ذریعہ صرف یہ ہے کہ آدمی کسی گوشہ میں بیٹھا اللہ اللہ کرتا رہے اور زبان، آنکھ، کان اور دل و دماغ کے تمام دریچے بند کر کے صرف مراقبہ اور فکر میں دن گزارے۔ عیسائیت نے زندگی کو لعنت تو نہیں قرار دیا، لیکن اس نے انسان کی پیدائشی گناہگاری کے تصور سے ایک ہمت شکن اور تمدن کش طرزِ فکر پیدا کر دیا۔ بُدھ مت کی طرح عیسائیت بھی خانقاہی زندگی کی حامل بن گئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ لاکھوں مردوں اور عورتوں نے زندگی کے اعلیٰ مشاغل ترک کر دیے اور اپنی قوتوں کو

انسانیت کے فائدہ کی خاطر استعمال کرنے کی بجائے انھیں بالکل مجہول کر دیا۔ اس ضمن میں ہم قسطنطین اعظم کے مصنف جی۔ بی۔ فرتھ اسکوائر کا حسب ذیل بیان پیش کرتے ہیں، جس سے معلوم ہوگا کہ مذہبی عبادات و ریاضات کا یہ غلو دنیا کو کس طرف لیے جا رہا تھا:

"کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا کہ رومانی سلطنت میں خاص کر اس کے مشرقی حصہ میں لوگوں کے اطوار بگڑ کر کس درجہ طبیعتیں مسخ ہو گئی تھیں اور کیسی بے شرمی اور بدکاری عموماً پھیل گئی تھی۔ اگر قوم کا بحیثیت مجموعی کوئی ایمان تھا تو اس کی قوتِ احساس بالکل زائل ہو چکی تھی۔ اب اس کے لبوں پر مہر سکوت تھی۔ کوئی نیک ہدایت اس سے ظاہر نہ ہوتی تھی۔ نیک بخت اور پاکیزہ طبیعتیں نازک مزاج بن کر الگ ہو بیٹھی تھیں۔ تمام خرابیوں کو گوارا کر کے مطلق ہاتھ پاؤں نہ ہلاتی تھیں۔ پس اشد ضرورت تھی کہ کوئی تحریک ان خرابیوں کے رفع کرنے کے لیے ظاہر ہو۔ آخر کار وہ تحریک ظاہر ہوئی۔ لیکن اس دین کے ماننے والوں میں بہت لوگ ایسے تھے، کہ جن گناہوں میں دنیا مبتلا تھی، ان کو جتا کر خود دنیا چھوڑ بیٹھے تھے اور گوشہ نشین ہو کر رہبانیت اختیار کر لی تھی۔ رہبانیت بھی ایسی سخت جس میں انسان کی فطری کمزوریوں کا لحاظ کرنا تو چیزِ دیگر تھا، قدرتی ضرورتوں کو بھی، جو انسان کے ساتھ لگی ہیں قطعی ترک کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان لوگوں میں جن کے مزاج میں سختی بڑھی ہوئی تھی، اتنا تو ضرور مانا جاتا تھا کہ ازدواج ایک قابلِ عزت چیز ہے۔ لیکن تجرد کی خوبیوں کو بیان کرنے میں بحدِ غایت مبالغہ کرتے تھے اور گو خود اس پر عمل نہ ہو، لیکن دوسروں کو سمجھانے میں جس قدر بلاغت و فصاحت میں کمال پیدا کیا تھا، وہ سب اسی مضمون پر صرف کیا جاتا تھا۔ کوئی شخص بلا افسوس اس تکلیف و اذیت کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا، جو صدہا بلکہ ہزارہا مردوں اور عورتوں کو اس رہبانیت کی وجہ سے اٹھانی پڑیں، جو اگر بالکل نئی نہ تھی، تو کم از کم سختی میں پہلے سے بڑھی ہوئی تھی۔ سلطنت کو اور ملکوں کو ان مردوں اور عورتوں کی خدمات کی واقعی ضرورت تھی اور بہت خوب ہوتا کہ ملک ان کی خدمتوں سے مستفید ہوتا۔ لیکن ان لوگوں نے دنیا کے تعلقات سے کنارہ کیا اور تنہائی کے گوشوں میں جا بیٹھے۔ جہاں انھوں نے یہ نہیں سیکھا کہ اپنے بھائی انسان کی مدد کس طرح کرتے ہیں، بلکہ اس خود غرضانہ حیرانی اور پریشانی میں کہ کسی طرح خود عذابِ آخرت سے بچ جائیں، اپنا خاتمہ کر دیا۔ ان کو سوائے اپنی روحانی نجات کے اور کسی چیز سے بحث نہیں رہی تھی۔"

یہی مصنف آگے چل کر لکھتا ہے:

"اس کے ساتھ اس کا خیال بھی رہنا چاہیے کہ ازدواج سے پرہیز کرنا اور اس کی ذمہ داریوں سے بچنا رومانی سلطنت میں کوئی نئی بات نہ تھی۔ صدہا برس سے سلطنت کو خوف تھا کہ بڑے طبقوں میں بالخصوص یہ خیال قوت پکڑتا جاتا ہے کہ شادی کر کے اہل و عیال کا بوجھ اپنی گردن پر لینا درست نہیں۔ چنانچہ رعایا کے اسی میلانِ طبیعت کو بدلنے کے لیے سلطنت کی جانب سے خاص خاص انعام اور محصولات سے معافیوں کے وعدے ہوئے تاکہ لوگ صاحبِ اولاد ہونے سے پرہیز نہ کریں...... اس قسم کے احکام اس اصول پر مبنی تھے کہ انسانی

معاشرت کا یہ ایک لازمی فرض ہے کہ انسان شادی کر کے ملک کی خدمت کے لیے اولاد پیدا کرے۔ چنانچہ دربار کے ایک خوش بیان شاعر نے لکھا تھا: "قوم کی اولاد سلطنت کی بیج ہے۔ یہی وہ کیاری ہے، جہاں سے نئے پودے تیار ہو کر دُور دُور کے باغوں میں لگائے جاتے ہیں۔ یہی وہ باغ جوانی ہے، جہاں سے افواج رومانی کے لیے شجاعت و مردانگی کے چشمے جاری ہوتے ہیں"۔ لیکن لوگوں کو لاولد رہنے میں ایسی آسائش معلوم ہوتی تھی کہ گو شہنشاہ جولیان نے اس مضمون کے متعلق بہت سے فرامین جاری کیے، مگر کسی نے کچھ پروا نہ کی۔ ٹاسی ٹیوس ان فرامین کی نسبت لکھتا ہے کہ ان میں مرض کا علاج مرض سے بھی بدتر بتایا گیا ہے۔ جس نیت سے ایک دنیا سے متنفر آدمی یا زنا کار بت پرست بدنی پاکیزگی حاصل رکھنی چاہتا تھا، وہ ایک عیسائی کی نیت سے مختلف ہوتی تھی مگر حیرت کا مقام ہے کہ اس بدنی طہارت کو حاصل رکھنے کے لیے طریقہ دونوں نے ایک ہی سا اختیار کیا تھا۔ یعنی شادی کرنے سے بیزاری ظاہر کرتے تھے"۔

انسانی فکر و نظر کا انحطاط اب تک ہم نے اسلام سے پہلے کے تمدنی اور مذہبی خیالات کا ذکر کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ساری مہذب دنیا کا سیاسی، معاشی اور تمدنی نظام ابتر ہو چکا تھا۔ ایک طرف تو دنیا اور مشاغل دنیا میں محویت کی یہ حالت تھی کہ عیش و عشرت ایک فن لطیف بن گیا تھا اور مالدار طبقوں کو زندگی کی دلفریبیوں میں نہ خدا یاد رہا تھا اور نہ روسانی فلاح و سعادت کا کوئی تصور ان کے ذہن میں باقی رہ گیا تھا۔

دوسری طرف غریب، مفلوک الحال طبقوں کو زندگی میں جن مصائب اور محرومیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس کا ذہنی ردِ عمل ان پر یہ ہوا کہ وہ دنیا کو ایک لعنت سمجھنے لگے۔ زندگی اور تمدن کو نفرت اور کراہیت کی نظروں سے دیکھنے لگے اور روز بروز ترکِ دنیا اور لاطائل ریاضات و مجاہدات کی طرف مائل ہوتے گئے۔ لیکن یہ ساری خرابیاں اس فکری زوال کی پیداوار تھیں، جو اس زمانہ میں انسانیت پر طاری تھا۔ اس فکری انحطاط میں افلاطونی فلسفہ اور بعض مشرقی مذاہب مثلاً ہندومت اور بدھ مت کے نظریات کا بڑا حصہ تھا۔ ان اثرات نے مل جل کر نوفلاطونی نظام فکر کو جنم دیا، جو اس دور میں انسانی ذہن پر اتنا حاوی ہو گیا کہ مذہب عیسوی کی پوری تعلیمات اس کے رنگ میں رنگ گئیں۔ یہ تمدن کش راہبانہ فلسفہ دنیا اور انسان کی حقیقت کا منکر تھا۔ مراقبہ اور کشف کو ادراکِ حقیقت کا واحد ذریعہ قرار دیتا تھا۔ وجدان کو حواس پر اور کشف و الہام کو عقل پر ترجیح دیتا تھا۔ اس نے خدا کے ساتھ اتصال اور فنا فی اللہ کا ایک ایسا مہمل نظریہ پیش کیا جس نے بڑے بڑے علماء، عقلاء اور اعلیٰ صلاحیت کے آدمیوں کو زندگی کی کشمکش اور تمدن کی خدمت سے ہٹا کر تزکیہ نفس میں لگا دیا۔ اس فلسفہ نے نہ صرف مسیحیت کو مسخ کیا بلکہ زمانہ مابعد میں اسلامی تہذیب و تمدن کو بھی زندگی کی حرارت اور تعمیر کے ولولے سے خالی کر دیا۔ اس کی ابتدا کیونکر ہوئی۔ اس کی توضیح کے لیے ہم "فلسفہ ابن رشد" سے حسب ذیل اقتباسات پیش کرتے ہیں (ملاحظہ ہو ابنِ رشد، مصنفہ محمد یونس صاحب فرنگی محلی، صفحات ۲۰۷ اور ۲۴۷):

"بطلیموسی خاندان کے فرمانروا مرکزِ علم ایتھنز سے اسکندریہ کو منتقل کر چکے تھے۔ روم بھی مرکز تھا، مگر اس کو زیادہ شہرت

رہتی۔ اسکندریہ میں مختلف عقاید کے لوگ آباد کیے گئے تھے۔ اس بنا پر اسکندریہ مذہب کا سنگم قرار پایا۔ یعنی سامی اور مشرقی مذاہب وخیالات سے پہلے پہل مغربی فلسفہ کی تناسائی ہوئی۔ قیصر کالیگولا کے عہد میں فیلو نامی ایک یہودی اسکندریہ میں درس دیتا تھا۔ اس نے پہلے پہل فلسفہ میں مشرقی مذاہب کے عناصر شامل کیے۔ اس کے فلسفہ کا ماحصل یہ تھا کہ عالم خدا کی ہستی کا ایک جزو ہے اور مقدس لفظ کن سے اس کی پیدایش ہوئی۔ یہ لفظ خدا اور عالم کے مابین واسطہ ہے۔ فیلو کے بعد اپالونیس پلوٹارک وغیرہم ہوئے، جو سب کے سب گو افلاطون کے مذہب کے پیرو تھے، مگر مشرقی خیالات کا ان پر اثر غالب تھا۔ سب کے بعد تیسری صدی عیسوی میں امونیس سیکاس ایک عیسائی خاندان میں پیدا ہوا۔ اس کے خیالات تمام تر عیسائیت سے اثر پذیر تھے۔ اس نے کشف ومراقبہ کے عنصر کو فلسفہ میں شامل کیا، یعنی اپنے فلسفہ کی بنیاد اس بات پر رکھی کہ علم و ادراک بیکار چیزیں ہیں۔ حقایق عالم کا ادراک محض کشف و مراقبہ سے ہوتا ہے۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی مسند پر پلاٹینس بیٹھا، جو ۲۰۴ء میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے فنا وجذب کے مسائل فلسفہ میں شامل کیے۔ یہ سلسلہ افلاطونی فرقہ کے پیروؤں کا تھا اور افلاطونیہ جدیدہ کے نام سے موسوم تھا۔"

"یونانی فلسفہ میں تصوف کی آمیزش پہلے پہل فرقہ افلاطونیہ جدیدہ کی بنیاد پڑنے سے ہوئی۔ اس فرقہ کا بانی ایک مرتد عیسائی امونیس سیکاس نامی تھا۔ یہ اسکندریہ میں تیسری صدی عیسوی میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے اپنے فلسفہ کی بنیاد اس مسئلہ پر رکھی کہ علم انسان کو اُسی وقت حاصل ہوتا ہے، جب تزکیہ باطن کے ذریعہ انسان بیرونی اثرات سے یہاں تک مستغنی ہوجاتے کہ عالم ومعلوم متحد ہوجائیں۔ اس کا خیال تھا کہ عالم میں تین قوتیں جوہر مطلق، عقل فعال اور قوت مطلق کارفرما ہیں۔ انسان کی سعادت یہ ہے کہ مکاشفہ کے ذریعہ اپنے باطن کا تزکیہ کرے کہ عقل فعال سے اس کا اتصال ہوجائے۔ امونیس سیکاس کے بعد اس کا شاگرد پلاٹینس، جو ۲۰۳ء میں پیدا ہوا، اپنے استاد کی مسند پر بیٹھا۔ یہ اکثر روزہ دار رہتا اور عزلت میں بسر کرتا۔ اس کا خیال تھا، اس کو اپنی زندگی میں متعدد مرتبہ رویت باری کا شرف حاصل ہوا ہے اور چھ مرتبہ اس کا جسم جسم خداوندی سے مماس ہوا۔ اس کے نزدیک دنیا محض خواب وخیال ہے۔ خدا سے اتصال کامل انسان کی حقیقی سعادت ہے۔ اتصال بھی اتنا کامل کہ انسان بیرونی اثرات سے پاک ہوکر خدا کے تصور میں اپنے تئیں فنا کر دے۔ لیکن یہ حالت محض کشف ومراقبہ سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ بلکہ اس وقت حاصل ہوتی ہے، جب انسان خودی کو فنا کر کے بے خود ہوجاتا ہے اور شخصیت کو کلیت میں فنا کر کے فنا فی الکل کے مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے۔ اس بیخودی اور فنا فی اللّٰہی کی حالت میں اصلی حقیقت کے راز اس پر کھل جاتے ہیں اور انسان اس چیز سے متحد ہوجاتا ہے، جس میں وہ اپنے تئیں فنا کر رہا ہے۔ یعنی فنا کے رتبہ سے بقا تک اور شخصیت سے کلیت تک اس کو صعود ہوجاتا ہے۔ یہی اس کی حیاتِ جاودانی اور

حقیقی سعادت ہے۔''

افلاطونیہ جدیدہ کے یہ تمام رہبانی اور تمدن کُش خیالات درحقیقت افلاطون کے نظریہ اعیان سے ماخوذ تھے۔ افلاطون نے تجربہ اور احساسات کی دنیا کو غیر حقیقی قرار دیا تھا۔ اس کی نظر میں حقیقی عالم فوق الحسّی ہے، جس میں نہ احساس کا گزر ہے، نہ تجربہ کا۔ یہی دنیا ہے، جس کو وہ عالم اعیان یا کلّی تصورات کی دنیا کہتا ہے۔ ہماری روزمرہ کی حسّی اور تجربی زندگی میں جو اشیاء نظر آتی ہیں، ان کی نسبت نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وُہ ہیں اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ نہیں ہیں۔ بلکہ وہ وجود اور عدم کی درمیانی حالت میں ہیں۔ مثلاً کسی حسین شے کو لیجئے، جس کا ہم اپنے احساسات کے ذریعہ تجربہ کرتے ہیں۔ اس میں حسن کامل نہیں پایا جائے گا بلکہ کوئی نہ کوئی پہلو ضرور لگا ہوا ہوگا۔ ایسی چیزیں صحیح علم موضوع نہیں بن سکتیں۔ لیکن مجرد حسن اور مجرد نیکی ایسے ابدی حقایق ہیں، جن میں ان کی ضد کا کوئی شائبہ نہیں پایا جاتا۔ ان کا کمال ہر نقص سے مبرا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ کلی تصورات یا اعیان تجربہ کے عالم سے تعلق نہیں رکھتے۔ اس لیے معلوم ہُوا کہ ایک اور فوق التجربہ عالم ہے، جس کو افلاطون عالم اعیان کہتا ہے۔ یہی عالم حقیقی اور علم کا اصلی موضوع ہے۔ افلاطون اپنے اس نظریہ کا اطلاق صرف اخلاقی تصورات جیسے حسن اور نیکی وغیرہ پر ہی نہیں کرتا بلکہ مادی اشیا، پر بھی۔ مثلاً کسی مادی شے کو لیجیے۔ جیسے بلّی، کُتا، آدمی، میز۔ یہ ظاہر ہے کہ ہم جس بلّی کو دیکھتے اور چھُوتے ہیں، وُہ ایک مخصوص اور منفرد ہستی ہے۔ لیکن جب ہم بلّی کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اُس سے کوئی مخصوص بلّی مراد نہیں ہوتی۔ یہ ایک عمومی تصور ہے، جس کا ہمیں کبھی کوئی حقیقی تجربہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہم جو بلّی بھی پائیں گے، وہ ایک مخصوص بلّی ہوگی۔ نہ کہ بلّی کا عمومی اور مجرد تصور۔ پس معلوم ہوا کہ یہ مخصوص اور منفرد ہستیاں مثلاً بلّی، کتا، آدمی اور میز وغیرہ اس عمومی اور مجرد تصور بلّی، کتے، آدمی اور میز کی ٹھوس اشکال ہیں۔ پھر چونکہ ہم اس مجرد اور کلّی تصور کا کوئی مشاہدہ اور تجربہ نہیں کر سکتے، اس لیے معلوم ہُوا کہ اس کا تعلق عالم مادی اور حسی سے نہیں بلکہ عالم اعیان یا کلّی تصورات کے عالم سے ہے، جو فوق التجربہ ہے اور یہی عالم اصلی اور حقیقی ہے۔ باقی رہا مادی اور حسی عالم، تو وہ اس عالم کا پرتو ہے جس طرح کوئی بلّی، کتا، آدمی وغیرہ جو ہمارے ادراک میں آتا ہے، اس عینی بلّی، کتے اور آدمی کی ایک مثال ہے، جو عالم اعیان میں موجود ہے۔ لہٰذا تجربہ اور احساسات کے مقابلہ میں عقل، جزئیات کے مقابلہ میں کلّیات اور عالم مادی کے مقابلہ میں عالم اعیان زیادہ حقیقی اور پائدار ہے۔ مادی عالم تو آنی وفانی ہے۔ لیکن ابدی حقائق کا عالم لازوال ہے۔

بظاہر یہ فلسفہ بڑا معصوم اور ٹھوس معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کے عملی نتائج زمانہ ما قبل اسلام میں بڑے خطرناک ثابت ہُوئے۔ پہلے تو اس نے ایک ثنویت پیدا کر کے حقیقت کو دو جداگانہ اور مستقل خانوں میں تقسیم کر دیا، جن میں سے ہر ایک قایم بالذات اور دُوسرے سے غیر متعلق ہے۔ پھر اس نے علم کے لیے حسی تجربہ کو غیر ضروری ٹھہرایا، جس کے نتیجہ میں علم وجدانی کا تصور پیدا ہُوا۔ اس علم کے لیے کسی دلیل و برہان اور تجربہ کی ضرورت نہ تھی۔ اس سے نہ صرف دنیاداروں اور دینداروں کی وہ تفریق عمل میں آئی، جو بالآخر رہبانیت اور ترکِ دنیا کی طرف لے گئی۔ بلکہ اس نے علم ظاہر اور علم باطن کی بھی تفریق پیدا کی۔ شریعت اور طریقت کے جو جھگڑے زمانہ مابعد میں مسلمانوں میں پیدا ہُوئے، وُہ اسی فلسفہ کی پیداوار تھے کیونکہ

طریقت کے پیرو ایک ایسے باطنی علم و وجدان اور کشف و الہام کے مدعی تھے، جس کو عقل و دلیل سے ثابت کرنا ضروری نہ تھا۔ ہر شخص یہ دعویٰ کر سکتا تھا کہ فلاں فلاں حقیقت اس نے اپنے باطنی علم اور وجدان کے ذریعہ معلوم کی ہے۔ اس طرح تمام ذاتی توہمات اور شخصی آراء کو مذہب اور عقل کا درجہ حاصل ہو جاتا۔ افلاطونی فلسفہ نے نہ صرف دنیاداروں اور دینداروں کی تقسیم کا آغاز بلکہ خود دینداروں کے دو حصے کر دیے۔ ایک حصہ علم ظاہر کا پیرو تھا اور ایک علم باطن کا۔ چنانچہ مانی کے مذہبی نظام میں بھی ایک طبقہ خواص کا تھا اور دوسرا سامعین کا۔ خواص کو گوشت سے پرہیز کرنا پڑتا تھا اور ازدواج سے توبہ کرنی پڑتی تھی اور تمام احساسات و خواہشات کو کچل دینے کا حکم تھا۔ سامعین پر اس کے مقابلہ میں بہت کم پابندیاں تھیں۔ یہ فرقہ وارانہ درجہ بندیاں بہت سے مشرقی مذاہب میں داخل ہو گئیں اور زمانہ مابعد میں اسلام کے مذہبی نظام پر بھی ان کا اثر پڑا۔ حالانکہ اسلام کے احکام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

علمی حیثیت سے یہ فلسفہ اس لیے تباہ کن ثابت ہوا کہ اس نے تجربہ کی ناقدری کر کے انسان کو مجرد تصورات کا خوگر بنا دیا۔ اس طرح انسان جزئیات تجربہ سے کلیات تک پہنچنے کے بجائے اس کوشش میں مصروف ہو گیا کہ ایک جست میں کل حقیقت معلوم کرے۔ تجربہ اور آزمائش کی صبر آزما منزلوں سے گزر کر حقیقت مجردہ اور تصورات تک پہنچنے کے بجائے وہ من مانے حقائق اور عینی صورتوں کے پیچھے پڑ گیا۔ جن کی صحت و صداقت اس کے نزدیک اتنی بدیہی تھی کہ انھیں زندگی کی تجربہ گاہ میں آزمانا اس کو بلا ضرورت معلوم ہوتا تھا۔ حالانکہ کوئی مجرد حقیقت اس وقت تک صداقت کا رتبہ حاصل نہیں کر سکتی، جب تک وہ زندگی کے عملی تجربات میں انسانیت کے لیے مفید مطلب نہ ہو۔ جس چیز کو انسان کی مادی معاشرتی اور اخلاقی زندگی کے معیارات پر نہ جانچا جا سکے۔ اس کی صداقت یا عدم صداقت کا حال کس طرح معلوم ہو سکتا ہے اور وہ عملی زندگی میں انسان کی کس طرح رہنمائی کر سکتی ہے۔ افلاطون کے نظریہ اعیان کا نتیجہ یہ ہوا کہ حقیقت اور صداقت کا رشتہ زندگی سے ٹوٹ گیا۔ کیونکہ زندگی تو جزئیات اور احساسات و تجربات کا نام ہے اور افلاطون کے نزدیک حقیقت و صداقت اور علم کا ان امور سے کوئی تعلق نہیں۔ صداقت و حقیقت اور علم کی دنیا اس دنیا سے مافوق اور بالکل الگ تھلگ ہے۔

اخلاقی زندگی کے لیے افلاطونی نظریات اس لیے تباہ کن ثابت ہوئے کہ اخلاقیات کا تمام تر تعلق ہماری مادی حسی اور معاشرتی زندگی سے ہے۔ جس اخلاق سے انسان کے معاشرتی تعلقات میں کوئی اصلاح نہ پیدا ہو۔ جس سے اس کے معاشی نظام کی اونچ نیچ اور ناانصافیاں دور نہ ہوں۔ جس سے بین الاقوامی تعلقات اور طبقاتی امتیازات میں کوئی ہمواری اور عدل نہ پیدا ہو۔ آخر اس اخلاق کا مقام کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن افلاطون کہتا ہے کہ تمام اخلاقی تصورات مثلاً حسن، نیکی، عدل وغیرہ کا اس عالم سے کوئی علاقہ نہیں۔ ان کی دنیا تو بالکل الگ تھلگ ہے۔ حالانکہ جو حسن انسانی روابط و تعلقات میں ظہور پذیر نہ ہو، جو نیکی پریشان حال اور مصیبت زدہ انسانوں کی چارہ سازی کرنے سے قاصر ہو اور جس عدل کا مظاہرہ طبقاتی اور بین الاقوامی تعلقات میں نہ ہو سکے، اس حسن، نیکی اور عدل کی حقیقت بہت مشتبہ ہے۔ اخلاقی زندگی کا انسانی تجربات اور جذبات و احساسات سے بہت گہرا تعلق ہے۔ ایک بے جذبہ ہستی پر ہم اخلاقی اقدار کا اطلاق نہیں کر سکتے۔ ایک بے حس وجود کی روحانیت کیا معنے رکھتی ہے۔

اسی طرح جس چیز کو عقل و وجدان اور کشف و الہام سے تعبیر کیا جاتا ہے، وہ بھی تجربات و احساسات اور جزئی تصورات کی

جڑوں میں پیوست ہے۔ عقل جزئیات تجربہ سے بالاتر کوئی مستقل بالذات قوت نہیں۔ وُہ انھیں جزئی تجربات کے صحیح تجزیہ اور ترکیب کا نام ہے۔ کشف و الہام اور وجدان بھی انسان کے حسی تجربات کی سرزمین سے پھوٹتے ہیں۔ جو انسان دنیا ترک کر کے غاروں اور جنگلوں میں زندگی گزارتا پھرے، جو ترک علائق کے چکر میں پھنسا ہُوا ہو، جس نے انسانوں کے باہمی ظلم و ستم اور معاشرہ کی ناانصافیوں کا کوئی تجربہ نہ کیا ہو، اس کا کشف و الہام صرف اس کے جسمانی عوارض کی پیداوار ہو سکتا ہے۔ پھر وہ کون سی وحی، کون سا الہام اور کون سا کشف ہے جو صرف اس دعویٰ پر مشتمل ہو کہ یہ میرا ذاتی تجربہ اور ذاتی کشف و الہام ہے۔ میں اس کے لیے کوئی دلیل پیش نہیں کر سکتا۔ ہر شخص کو بلادلیل میرے دعووں کو ماننا پڑے گا۔ قرآن بھی وحی و الہام ہے مگر وہ دلائل پیش کرتا ہے۔ اور نہ صرف پیش کرتا ہے بلکہ طلب کرتا ہے :

قل ھاتوا برھانکم (دکھاؤ اپنی دلیل لا) مگر یہ دلائل و براہین ایک ایسی دنیا سے ہی متعلق ہو سکتے ہیں، جو تمام انسانوں کے تجربہ میں مشترک ہو جس کو سب افراد بلا استثنا محسوس کر سکیں۔ اگر یہ ایک مشترک حسی اور تجربی عالم سے متعلق نہ ہو، تو ایک آدمی کی دلیل کو دُوسرا آدمی کیا سمجھ سکے گا۔ لیکن افلاطون کہتا ہے کہ وجدانی علم اور کلّی تصورات و اعیان کا علم ایک ایسے عالم سے متعلق ہے جو مافوق الحس اور مافوق التجربہ ہے۔

غرضیکہ اسلام سے پہلے زمانہ میں عیسویت کی جتنی اخلاقی، علمی اور مذہبی خرابیاں تھیں، جن کا ذکر ہم اُوپر کر چکے ہیں، بالواسطہ یا بلاواسطہ ان سب کا ماخذ اور منبع افلاطونی فلسفہ اور نو افلاطونی تصوف ہیں۔

دُنیائے قبل از اسلام پر ایک نظر

سید امیر علی
ترجمہ : محمد ہادی حسن

نوعِ انسانی کی ذہنی ترقی میں جو تسلسل پایا جاتا ہے، وہ ایک ایسا موضوع ہے جو انسان کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے انتہائی دلچسپی رکھتا ہے۔ نفسِ انسانی کا تدریجاً ایک ہمہ گیر ذات، ایک محیطِ کائنات ارادے کو پہچاننا! اندھیرے میں بھٹکنے پھرنے کی جو زحمتیں، کیا افراد اور کیا اقوام دونوں نے جھیلی ہیں، اس سے پیشتر کہ ان کے ذہنوں پہ ایک ایسی روحِ مطلقہ کا تصور جلوہ گر ہوتا، جو تمام موجودات میں جاری ساری اور نظامِ فطرت کو قاعدہ و قانون کے سانچے میں ڈھالنے والی ہیں، یہ ایسی چیزیں ہیں جن سے نہایت معنی خیز سبق حاصل ہوتے ہیں۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ جس عمل کے ذریعے نوعِ انسانی اشیائے مادی کی پرستش سے ترقی کر کے عبادتِ الٰہی تک پہنچی ہے، وہ معرضِ تعویق میں پڑ گیا — اقوام اور افراد کثیر تعداد میں شاہراہ ترقی سے منحرف ہو گئے اور اپنی خواہشاتِ نفسانی کے غولِ راہ کا دھوکا کھا کر اپنے عہدِ طفولیت کے بتوں کی طرف لوٹ گئے، جو محض ان کے جذبات کے تراشے ہوئے مجسمے تھے۔ لیکن خدا کی آواز، چاہے کوئی اسے سُنتا یا نہ سُنتا، ہمیشہ دعوتِ حق دیتی رہی ہے اور وقت آنے پر اس کے بندگانِ خاص نے اُٹھ کر اعلان کیا ہے کہ انسان پہ دوسرے انسانوں کی طرف سے اور اس کے پیدا کرنے والے کی طرف سے کیا کیا فرائض عائد ہوتے ہیں۔ یہ بندگانِ خاص خدا کے حقیقی پیغمبر تھے۔ وہ اپنی قوموں میں اپنے وقت کی پکار بن کر آئے۔ جس میں سچائی، پاکبازی اور انصاف کے وہ تمام ولولے تڑپ رہے تھے جو رُوحِ انسانی میں ودیعت کئے گئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے زمانے کے روحانی تقاضوں کا ترجمان تھا۔ ہر ایک اس لیے آیا کہ ایک گری ہوئی قوم کو سدھارے، نکھارے اور اُبھارے اور ایک بگڑی ہوئی مملکت کو بنائے۔ بعض ایک مدوّد تمدن کی تعلیم دینے کیلئے آئے جو ایک چھوٹے سے دائرے کے اندر محصور رہا۔ دوسرے ایک عالم گیر پیغام لے کر آئے۔ ایک ایسا پیغام جو کسی ایک نسل یا قوم کے لیے نہ تھا بلکہ ساری نوعِ بشر کیلئے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا شمار مؤخر الذکر زمرے میں ہوتا ہے۔ آپؐ کا پیغام صرف عربوں کیلئے نہ تھا۔ آپؐ صرف ایک زمانے یا ملک کے لیے مبعوث نہ ہوئے تھے بلکہ سارے بنی آدم کے لئے، اس دُنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جتنے بندگانِ خدا ہیں ان سب کے لیے۔ اس معلمِ اعظمؐ کا ظہور، جس کے سوانحِ حیات اس کی بعثت کے لمحے سے لے کر آخیر تک مصدقہ طور پہ قلمبند ہو چکے ہیں، محض ایک اتفاقی حادثہ یا تاریخِ عالم کے حاشیے پہ لکھا ہوا ایک غیر متعلق اور ضمنی واقعہ نہ تھا۔ وہ اسباب، وہ زبانِ حال سے پکارتی ہوئی خرابیاں، ساری کائنات میں جاری و ساری ایک قدرتِ مطلقہ پر یقینِ محکم پیدا کرنے کے وہ اندرونی داعیے، جو قیصر آگسٹس کے زمانے میں ٹیبر کنارے ایک ایسے پیغمبر کو وجود میں لائے تھے، جس کی زندگی ایک المیہ تھی۔ وہی ساتویں صدی عیسوی میں دوبارہ بروئے کار آئے اور اب کی پہلے سے بھی زیادہ قوت کے ساتھ۔ جیسا کہ بجا طور پہ کہا گیا ہے۔ ساتویں صدی عیسوی کا آغاز قومی، معاشرتی اور مذہبی انتشار کا زمانہ تھا، اس میں جو مظاہر رونما ہوئے، وہ ویسے ہی تھے، جیسے ثبتِ ایمان و ایقان کے کسی نئی صورت میں جلوہ گر ہونے کا باعث بننے میں تاکہ وہ سرگرم ان قوتوں کو مذہبی ارتقا کے اس ناگزیر راستے پہ لایا جائے، جس کی منزلِ مقصود ذاتی عبادت کی تکمیل و تنظیم ہے۔ یہ تمام مظاہر [illegible]

اس کے بعد جس شاخ نے اُم البلاد سے کوچ کیا، وہ سامی (SEMICTIC) نسل تھی۔ سامی بھی تورانیوں کے نقش قدم پر چل کر مغرب کی طرف گئے اور معلوم ہوتا ہے کہ بین النہرین (MESOPATOMIA) کے ڈیلٹے کے شمالی حصے میں آباد ہو گئے۔ بہت جلد انہوں نے تعداد اور قوت میں ترقی کر کے بابل کی سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور اس کی جگہ ایک وسیع سلطنت قائم کی جس کا سکہ تمام ہمسایہ ملکوں میں چلتا تھا۔ مغربی ایشیا کے دو بڑے دریاؤں کے درمیان اشوریوں (ASOYRIANS) نے جو دارالحکومت بنایا، اس میں جو مذہب رائج تھا، وہ کبھی کبھی ایک مثبت تصور توحید کی بلندی تک جا پہنچتا تھا۔ ان کے یہاں جو سماوی سلسلہ مراتب تھا، اس میں ایک افضل و اعلیٰ ہستی کے صریح اعتراف کے نشان ملتے ہیں۔

ادھر ڈیلٹے کے شمالی حصے میں سامی نو آبادوں کی بڑی جماعت ترقی کے مراحل طے کر رہی تھی۔ ادھر سامیوں کا ایک چھوٹا سا گروہ اُر (UR) کے علاقے میں داخل ہو گیا۔ جو کلدانی[1] سلطنت کے زیر نگین تھا۔ اس قبیلے کا شیخ جس کی خود اختیاری جلا وطنی اور بادیہ گردی بہت سے مذہبوں کے قصوں کا مضمون بن گئی ہے، مستقبل کے تاریخ آفرینوں کا جد امجد بنا[2]۔

معلوم ہوتا ہے کہ یافثی شاخ دوسری تمام شاخوں کے چلے جانے کے بعد بھی اپنے اصل وطن میں مقیم رہی۔ جس زمانے میں دوسری شاخیں اپنے اصلی تنے سے جدا ہو کر سلطنتیں قائم اور مذاہب ایجاد کر رہی تھیں، اسی زمانے میں یافثی شاخ اپنے طور پر نشو و نما پا رہی تھی لیکن قوموں کی جادہ پیمائی جب ایک بار شروع ہو گئی تو پھر کہاں تھمتی تھی؟ یافثی قبیلے یکے بعد دیگرے مغرب کی طرف روانہ ہو گئے۔ نہ جانے اس فطری بے چینی کے باعث، جو وحشی قوموں کو ایک جگہ ٹکنے نہیں دیتی یا اس وجہ سے کہ ان کی آبادی اتنی بڑھ گئی تھی کہ ان کی اصلی سرزمین ان کے راعیانہ مشاغل کے لئے ناکافی ہو گئی تھی۔ جو لوگ سب سے پہلے نکلے، ان میں پلیسجین (THE PELASGIANS) اور کلٹ (THE CELTS) تھے۔ ان کے بعد دوسرے لوگوں نے بھی کوس رحلت بجایا یہاں تک کہ بالآخر صرف خاص آریہ لوگ اپنے قدیم مسکن میں باقی رہ گئے۔ ان کا ایک گروہ بدخشاں کے نزدیک آباد تھا۔ اور دوسرا بلخ کے نزدیک، جہاں وہ ہمسایہ قوموں سے الگ تھلگ اور ان کے جنگ و جدل اور نقل و حرکت سے کوئی سروکار رکھے بغیر صدیوں تک بود و باش کرتے رہے۔ تاریخ کی جو روشنی سلطنتوں اور تہذیبوں کی بنیاد رکھنے والی مغربی نسلوں پر پڑتی ہے، وہ زمین کے ان قدیم باشندوں کا ایک دھندلا سا نقشہ بھی ہمیں دکھاتی ہے، جس میں اُن کے بہت سے قبیلے اس سطح مرتفع پر رہتے سہتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ کمل وحشت سے ترقی کر کے نیم وحشت کے درجے تک پہنچے ہیں اور ایک عالمگیر مجرّد ذات کا مبہم سا احساس اُن کے ذہنوں میں تشکل پذیر ہو رہا ہے اب تک وہ خوف کے مارے لرزہ براندام ہو کر جن اشیائے فطرت کی پرستش کرتے رہے تھے، ان کی جگہ لاتعداد خیالی ہستیاں لے رہی ہیں۔ بعض قبیلوں کے یہاں مجرّد شخصیتوں کا یہ لشکر دو جامع اصولوں کا تابع فرمان ہے، یعنی نور اور ظلمت۔ زندگی اور روشنی کا نقیب آفتاب ایک احد

---

[1] RAWLINSON ANCIENT MONARCHIES

[2] عربی روایتوں میں حضرت ابراہیمؑ کے باپ کا نام آزر بیان کیا گیا ہے، جو صریحاً اشور کی ایک دوسری صورت ہے۔ آزر کے بنائے ہوئے خوبصورت بتوں کا ذکر اسلامی ادب میں اکثر آتا ہے۔ ان روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اشوری النسل تھے۔

خدائے رحیم کی علامت بن جاتا ہے، جس کی قوت ابھی مزاحمتوں سے دوچار ہے۔ لیکن آخر الامر اپنے مخالف اصول یعنی ظلمت اور شر پر غالب آجائے گی۔ دوسرے قبیلوں کے یہاں یہ صورتِ حال ہے کہ وہ اپنے معبودوں کو جن خیالی ہستیوں کا جامہ پہنا رہے ہیں، وہ خیالی ہستیاں ایک دوسری میں مدغم ہو رہی ہیں۔ کبھی تو وہ جُدا جُدا شخصیتیں بن کر سامنے آتی ہیں اور کبھی یکجا ہو کر روحِ حیات مادے کی ایک وحدت بن جاتی ہیں۔ دھند کے بادل رفتہ رفتہ چھٹ جاتے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ شعوب و قبائل بادشاہیوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ زراعت نے آہستہ آہستہ راعیانہ مشاغل کی جگہ لے لی ہے۔ دھاتوں کا استعمال رائج ہو رہا ہے اور ان سب سے زیادہ اہم بات تو یہ ہے کہ ایک افضل و اعلیٰ شخصیت کا بلند تر تصور ذہنوں کے بند دریچے کھول کر ان در داخل ہو رہا ہے۔ کیومرس، ہوشنگ اور دوسرے شاہانِ پاستان، جن کے گیت ایک حیرت انگیز نادر الکلامی سے فردوسی نے گائے ہیں، ایک رُو بہ ترقی تہذیب کے اولین نشان بردار ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں آریوں کے یہاں بادشاہی کا آغاز ہوا، اسی زمانے کے لگ بھگ آریائی خاندان کی دو شاخوں میں وہ مذہبی تنازعہ رونما ہوا، جس کے نتیجے میں مشرقی شاخ اپنے مرزبوم سے جلاوطن ہو گئی۔ مغربی آریوں میں ایک معلّم نے، جو اپنے مذہب کی کتابوں میں سنانہ زرتشت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ایک زبردست انقلاب برپا کر دیا تھا۔ اس تحریک نے جو شدید مذہبی کش مکش پیدا کی، اس کے نشان اُن تبرّوں میں ملتے ہیں، جو ویدوں کے بھجنوں میں مشرقی آریوں کی نسل و مذہب کے دشمن "جرتوشتی" پر بھیجے گئے ہیں۔ اصلاح شدہ مذہب کے بارے میں ان بھجنوں کے لکھنے والوں کا جو ذہنی زاویہ تھا، وہ ناموں کے غیر معمولی توارد سے کہیں بڑھ کر اس امر کا قوی ترین ثبوت ہے کہ یہ مذہبی اختلاف ہی خالص آریوں کی دو شاخوں کے علاحدہ ہو جانے کا فوری اور بلاواسطہ سبب تھا۔ اس مذہبی جنگ میں جو غالباً انسانی تاریخ کی پہلی مذہبی جنگ تھی، مغربی آریوں کے ثنویت مسلک (DUALIST) قبیلے اپنے مشرقی بھائیوں کو جن کا مذہب تعدّدِ ارباب (POLYTHEISM) اور وحدۃ الوجود (PANTHEISM) کی ایک معجون مرکب تھا (PARODAMISADAC) کی سرحدوں سے باہر نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ مشرقی آریہ ہندوستان پر ٹوٹ پڑے۔ یہاں انہوں نے اصلی سیاہ فام باشندوں کو اپنی آبادیوں سے نکال باہر کیا، یا قتل کر دیا، یا غلام بنا لیا اور انھیں ہمیشہ اپنے سے کمتر ہستیاں، یعنی داس اور شودر سمجھتے رہے۔ بہر حال ویدوں کے مذہب اور زرتشتی مذہب میں جو اختلاف تھا، وہ محض اضافی تھا۔ زرتشتیت مظاہر کی بجائے اُن کے سبب کی پرستش کرتی تھی۔ جہاں تک ویدوں کے دیوتاؤں کا تعلق تھا، اس نے انھیں دیووں کا جامہ پہنا دیا اور دیو پرستوں کو کافر قرار دیا۔ ویدوں کے بھجن لکھنے والوں نے اس کے جواب میں اوستا کے خدا اہورا کو ایک خبیث دیوتا اور دیوتاؤں کا دشمن کہا اور "جرتوشتی" پر دل کھول کر سب و شتم کی بوچھاڑ کی۔

پہلا زرتشت کہاں اور کس زمانے میں ہوا۔ یہ پردۂ لاعلمی میں مستور رہے۔ بہر حال داریوش ہستاسپ کے عہد میں اس نام کا ایک اور معلّم گزرا، جس نے پرانی تعلیمات کی تجدید، تدوین اور توسیع کی۔

اگر ہم ایک قدم پیچھے ہٹ کر نگاہ ڈالیں، تو ہمیں ہندوستان میں آریائی فتوحات کا سیلاب صدیوں تک مشرق اور جنوب کی سمت بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ آریائی مذہب جو حملہ آور قدیم وطن سے اپنے ساتھ لائے تھے، زیادہ تر دو چیزوں پر مشتمل تھا، یعنی اجداد کی ارواح کی پرستش اور مرئی مظاہر میں مجسم قواے فطرت کی پرستش۔ پنجاب میں رُوحانی تصور نے مزید نشوونما پائی۔ ویدوں میں ہمیں ترقی کا کارواں آگے بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے، تاہم کہ ہم اُپنشدوں میں ہندوؤں کے مذہبی خیالات کو اپنے اوجِ کمال پر پہنچا ہوا دیکھتے ہیں۔ اُپنشدوں میں روحانی ولولہ اس شدت سے ہے کہ وہ بلند ترین وحدانیت کے قریب جا پہنچتا ہے۔ اُپنشد نہ صرف خدا کے نفوذِ مطلق سے بحث کرتے ہیں، جو ایک ایسا تصور ہے، جس نے بعد کے زمانوں میں مادی وحدت الوجود کی صورت اختیار کر لی، بلکہ یہ تعلیم بھی دیتے ہیں کہ رُوحِ مطلق پر تمام موجودات

کی محافظ اور ساری کائنات کی حاکم ہے۔ وہ انسانوں کے دلوں میں رہتی ہے اور آخرالامر انفرادی روحوں کو لامتناہیت میں یوں جذب کر لیتی ہے، جیسے سمندر دریاؤں کو اپنے اندر غرق کر لیتا ہے۔ جب یہ انجذاب ہو جاتا ہے، تو انسانی روح پر کالبدِ خاکی میں جو تجربات گزرے ہوتے ہیں، وہ اُن سب کا شعور کھو دیتی ہے۔ لیکن انسانی ترقی کی ان دلچسپ دستاویزوں میں بلاشک وشبہ روحانی انحطاط کے جراثیم موجود تھے، جنھوں نے بہت جلد ارتقا کے عمل کا رُخ پلٹا دیا۔ چنانچہ مزید عروج کی بجائے ہمیں مسلسل تنزل دکھائی دیتا ہے۔ اُپنشدوں کا مقام پُران حاصل کر لیتے ہیں اور پھر تنتروں کا طریقِ پرستش پرانوں کو اس مقام سے ہٹا دیتا ہے۔

اُپنشدوں میں جو خیال بار بار دُہرایا گیا ہے کہ پرم آتما مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوتی ہے، اسی سے اوتاروں کا تصور پیدا ہوا۔ جس طرح مغربی غیر اہلِ کتاب کا فلسفہ کائنات نفسِ عامہ کی اس زبردست خواہش کی تسکین نہ کر سکا کہ اسے ایک ایسا شخصی خدا مل جائے، جو انسانوں میں رہ چکا ہو اور اُن کے ساتھ آئے دن کا میل جول رکھ چکا ہو۔ اسی طرح اُپنشدوں کے موحدانہ ولولے ہندوستان کے عوام کو جذباتی تشفی بہم نہ پہنچا سکے۔

چنانچہ انہوں نے بہت جلد کشتری جاتی سے ایک ہیرو یا لیڈر ڈھونڈھ نکالا جس کے متعلق تھوڑی مدت کے بعد یہ عقیدہ رائج ہو گیا کہ وہ بنفسہٖ برہما تھا اور پرمیشور کا اوتار بن کر اس سنسار میں زندگی بسر کرنے آیا تھا۔

کرشن بھگتی کو اپنے حریف کالی پوجا کی طرح جو عام مقبولیت حاصل ہوئی، وہ نہ صرف اس امر کی پُرزور شہادت دیتی ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں ہندوستان کیسی مذہبی ابتری میں مبتلا تھا۔ بلکہ اس وسیع خلیج کو بھی نمایاں کرتی ہے، جو اُپنشدوں اور بھگوت گیتا[1] کے لکھنے والے فلسفیوں کے ذہنی اور عوام کے جذبات وخیالات کے درمیان حائل تھی۔ یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ اس علاقے میں داخل ہونے سے پہلے، جسے صحیح معنوں میں ہندوستان یا آریہ ورت کہا جاتا ہے، ان آریوں نے جو پنجاب میں آباد تھے، یا اُن کے پروہتوں اور مذہبی معلموں نے بہت سخت قاعدے وضع کئے تھے، جن کا مقصد یہ تھا کہ آریوں نے اپنے طویل طویل فاتحانہ کوچ کے دوران جن قوموں کو مطیع و منقاد بنایا تھا، ان میں خلط ملط نہ ہو جائیں۔ ان قوموں کو سماج کے اسفل ترین طبقے میں جگہ دی گئی ان کو اچھوت قرار دیا گیا اور جو مذہبی رسومات اُونچی ذاتوں کے لیے مقرر تھیں، وہ ان کے لئے سختی سے ممنوع کر دی گئیں۔

وحدت الوجود کے موضوع پر آریائی ہندو فکر میں جو مدوجزر آئے ہیں ان سب کے دوران ارواحِ اسلاف کی پرستش مذہبی و معاشرتی نظام کا ایک لازمی جزو بن کر ہندوؤں کے ذہنوں میں جمی رہی ہے۔ یوں تو شودروں کو بھی اجازت تھی کہ اپنے آباؤ اجداد کی ارواح پر چڑھاوے چڑھائیں لیکن اگر کوئی برہمن اُن کی پُوجا میں شریک ہوتا، تو اسے بڑی سنگین سزا دی جاتی۔ اگر کوئی شودر اتفاقاً کسی برہمن کو منتر پڑھتے ہوئے سن پاتا، تو اس کے لئے یہ سزا مقرر تھی کہ اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جائے۔ اگر وہ کسی برہمن کے برابر چوکی پر بیٹھ جاتا تو اس کے بدن کو لوہے سے داغ دیا جاتا۔ شودروں اور تین اونچی جاتیوں کے لوگوں کی آپس میں شادیاں انتہائی بے رحمانہ سزاؤں کی مستوجب اور قطعاً ممنوع تھیں لیکن کسی قسم کی قانونی پابندیاں بھی آریوں کے مذہبی افکار و عبادات کو اصلی باشندوں کے عقائد کا اثر قبول کرنے

---

[1] زمانہ حال کا ایک مصنف کہتا ہے کہ بھگوت گیتا میں بے شک وحدانیت کے نشان پائے جاتے ہیں لیکن وہ غیر موحدانہ عناصر کے ساتھ مخلوط ہیں۔

سے نہ روک سکیں ۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ غیر آریہ قوموں اور قبیلوں کے دیوتا ہندوؤں کی دیومالا میں داخل ہو گئے ۔ اور اُن کی پوجا ہندوؤں کی آئے دن کی ریتوں میں شامل ہو گئی ۔ بھانت بھانت کے پختہ اور خام ، نئے اور پرانے عقیدوں کے گڈمڈ ہو جانے کا نتیجہ ناگزیر طور پر یہ ہوا کہ فلاسفہ صدیوں سے جس پیچیدہ اور دقیق وحدت الوجودی نظامِ خیال کے ارتقا میں مصروف تھے ، اس میں ابتذال آ گیا ۔

جب تک تابعینِ اسلام نے وہ پردہ نہ اٹھایا جس کے پیچھے ہندوستان ہزاروں سالوں سے ایک پُراسرار زندگی بسر کر رہا تھا ۔ اس وقت تک ہندوستان کی کوئی تاریخ نہ تھی ۔ یہ کہنا ناممکن ہے کہ واسودیو کرشن کس زمانے میں گزرا یا اس کی شخصیت کیسی تھی ۔ اس کے بارے میں ان گنت کہانیاں ہیں ، جو سب سر دیا اور لچر معلوم ہوتی ہیں ، ظاہر ہے کہ یہ کہانیاں پروہتوں نے گھڑیں ، جو دیوتاؤں سے اُونچے نہیں ، تو اُن کے ہمسر ضرور بن گئے تھے اور جن کا فائدہ اس میں یہ تھا کہ عوام کے دلوں کو بھائے اور رچھائے رکھیں ۔ واسودیو کرشن کو ہندو دیومالا میں وشنو کے اوتار کا مقام حاصل ہے اور اس حیثیت سے وہ بھگوت گیتا کے اس حصے کی ، جو بھکتی سے تعلق رکھتا ہے ، مرکزی شخصیت ہے ۔ وہ بدیہی طور پر ایک جامع شخصیات دیوتا ہے ۔ اس کی ایک شخصیت وہ نٹش دیوتا ، وہ رنگیلا کنھیا ہے ، جو گوکل کے گوالوں میں رہتا تھا اور برندابن کے مشہور کنجوں میں اپنی ہمجولیوں کے ساتھ لیلا رچا کر اپنا جی بہلاتا تھا ۔

واسودیو کرشن کے مسلک کا بنیادی رُکن یہ تھا کہ پورا پورا دھرم یعنی ایمان مُکتی یعنی نجات کی کنجی ہے ۔ جو کوئی وشنو کے اس اوتار پر ایمان لے آتا ، اس کے اعمال چاہے کیسے ہی ہوتے ، اُسے ابدی سعادت کا نصیب ہونا یقینی تھا ۔

اس کامل ایمان کے نظریے نے بعض ایسی رسومات اور عقائد کو جنم دیا ، جو اب تک ہندوستان میں رائج ہیں ۔ چونکہ پارسائی اس پر مشتمل سمجھی جاتی تھی کہ کرشن کو پرماتما سمجھ کر اپنے من میں بسا لیا جائے اور پھر اپنے من سے پوری پوری لو لگا لی جائے ، اس لیے عام لوگ بیراگ اور سنیاس کو مہاپن تصور کرنے لگے ۔ آنکھیں اپنے بدن کے کسی ایک حصے پر جما کر اور من کو کرشن جی سے لگا کر سالہا سال تک جنگل میں بیٹھے رہنا ، برسوں تک ایک ٹانگ پر کھڑا رہنا ، بدن میں آنکڑے گڑوا کر ادھر اُدھر گھٹتے پھرنا ، یہ سب ایسے کام تھے ، جو سب پاپ دھو ڈالتے تھے ۔ اگر کسی شخص کو کسی گناہ کا کفارہ دینا یا کوئی منت ماننا منظور ہوتا ، تو وہ کسی آدمی کو کچھ دان دے کر اس کام پر لگا دیتا کہ وہ اس کے گھر سے دیوتا کے مندر تک کا راستہ اپنے بدن کی لمبائی سے ماپتا ہوا چلا جائے

بھگوت گیتا کا پورے دھیان کے ساتھ پاٹھ کرنے سے یا گنگا جل میں اشنان کرنے سے ساری بُرائیاں ودوش اور پاپ دُھل جاتے تھے ۔

شکتی پوجا نے بہت سے ہندوؤں کے دلوں پر جو سکہ جما رکھا ہے ، وثوق سے کہنا مشکل ہے کہ یہ سکہ اس نے کب جمایا ۔ شکتی ہر ہندو دیوتا کا نسوانی نصف اور فعال تخلیقی پہلو ہے ۔ شیو جی کی شکتی یا استری وہ بھیانک دیوی ہے ، جو پاربتی ، بھوانی ، کالی ، مہا کالی ، دُرگا ، چنڈا اور

لہ سری کرشن کو عموماً گوپال کرشن (یعنی کرشن گوالا) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ اُن کی ہمجولیوں کو گوپیوں (یعنی گوالنیں) کہا جاتا ہے ۔ اہیروں یعنی شمالی ہند کے گوالوں کے اس سورما دیوتا کے بارے میں بہت سی پُر لطف کہانیاں مشہور رہیں ۔ بعض لوگوں نے اسے ہندوؤں کے اپالو (APALLO) کا لقب دیا ہے ، لیکن یہ لقب کچھ پھبتا نہیں ۔

دوسرے ناموں سے پکاری جاتی ہے ۔ اس دیوی کی پُوجا ، جیسے کہ وہ مجھوا بھُوتی کے ڈرامے میں ، جو غالباً ساتویں صدی عیسوی میں لکھا گیا ، بیان کی گئی ہے ، انسانی قربانیوں اور دوسری انسانیت سوز رسموں کے ساتھ کی جاتی تھی ۔ اسے چاہے کسی نام سے پکارا جائے اور اس کی پُوجا چاہے کسی طریقے سے کی جائے ، اس میں عیسائی مذہب کی " مادرِ غمخوار " ("MATER DOLOROSA") کی سی کوئی بات نہیں پائی جاتی ۔ اسکندریہ کے پُجاری آئی سس (ISIS) دیوی کی طرف جو انسانی رحم اور انسانی دکھ درد سے ہمدردی منسوب کرتے تھے ، اس کا بھی شائبہ تک ہندوؤں کی اس خوفناک دیوی میں موجود نہیں ۔ یہ ہیبت ناک بلکہ دہشت انگیز تصور ، جو تنزل پذیر مذہبی نفوس کی پیدا وار ہے ، صریحاً غیر آریہ قوموں سے مستعار لیا گیا اور یہ ایک ایسا تصور ہے جس کی کوئی نظیر دنیا کے غیر اہلِ کتاب مذاہب میں نہیں ملتی اور تو اور سبلی (CYBELE) یعنی اہلِ روما کی مادرِ کبریٰ (MGNA MAT-ER) بھی اتنی بے رحم اور انسانوں کو دکھ پہنچانے کی اتنی شائق نہ تھی جتنی تباہی کے دیوتا شو کی شکتی تھی ۔ اس دیوی کی پُوجا تنتروں کی رسومات کے مطابق کی جاتی ہے ، جو گویا شکتی دھرم کی بائیبل ہیں ۔ تنتروں کے بہت سے بھجن بھگتی اور سادھنا سے بھرے ہوئے ہیں اور دیوی سے جو پرارتھنائیں کی گئی ہیں ان میں اکثر اس سے دیا اور کرپا کی بھیک مانگی گئی ہے لیکن فلسفیوں کے لیے تنتروں میں خواہ کیسے ہی صوفیانہ معانی ہوں ، عام لوگ ان کی بتائی ہوئی پُوجا پر لفظاً عمل کرتے ہیں[1]۔

ہندوؤں کے دو بڑے حماسوں سے ، جن میں سے ایک پانڈوؤں اور کوروؤں کی لڑائی اور دوسرا لنکا کے راجہ راون کے ہاتھوں سیتا کے اغوا کی کہانی بیان کرتا ہے ۔ ہمیں کافی وضاحت کے ساتھ پتا چل جاتا ہے کہ اس زمانے میں کس قسم کے مذہبی عقیدے اور طریقے عوام میں رائج تھے ۔ دونوں حماسوں میں ایک خاصے ارتقا یافتہ معاشرے کا نقشہ کھینچا گیا ہے ۔ جس میں کافی مادی ترقی ہو چکی تھی ۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اخلاقی انحطاط بھی بہت بڑھ چکا تھا ۔ چنانچہ بدھ مت کے بانی گوتم بدھ کے خروج سے بہت مدت پہلے ہندوستان کے عوام میں مذہبی عبادت محض بلیدانوں اور چڑھاووں کا ایک رسمی مجموعہ بن کر رہ گئی تھی ، جس میں ثواب کا معیار پوجا کرنے والے کی نیکی یا پرہیزگاری نہیں بلکہ پروہت (جس کے بغیر ان رسموں کا ادا کرنا سرے سے ممکن ہی نہ تھا) کی یہ صلاحیت ہوتی تھی کہ وہ مناسب جنتر منتر پڑھ کر دیوتا کو دعا قبول کرنے پر مجبور کر سکے ۔ گوتم بدھ اور مہاویر نے جو بغاوت کی ، وہ خود غرض پروہتوں کے اقتدار کے خلاف ہندوؤں کے دل سے اُٹھنے والی ایک آواز تھی ۔

---

[1] تنتری پجاریوں کے دو بڑے بڑے گروہ ہیں ۔ دکھنا چاری اور بام چاری ، یعنی دائیں ہاتھ کی اور بائیں ہاتھ کی ریتوں پر عمل کرنے والے ۔ دکھنا چاریوں کی پوجا کھلے طور پر ہوتی ہے اور اس میں دوسری دیویوں مثلاً وشنو دیوتا کی بیوی لکشمی یا مہالکشمی سے بھی خطاب کیا جاتا ہے ۔ بام چاری کی پوجا میں جسے خاص طور پر تنتر یکا کہا جاتا ہے ، کالی دیوی بلا شرکت غیرے معبود ہوتی ہے ۔ یہ پُوجا تنہائی میں کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس میں بہت سی ناپاک رسمیں ہوتی ہیں ۔ سارے ہندوستان میں بام چاری پنتھ کے پیرو کار بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں اور اس کی بے شمار شاخیں ہیں ۔ درگا پوجا میں ، جو عموماً اگست کے مہینے میں منائی جاتی ہے ، درگا کی مورتی کو سنگھاسن پر بٹھا کر جلوس نکالے جاتے ہیں ۔ شمالی ہندوستان میں اس مورتی کو ہلدیہ رنگ میں رنگا جاتا ہے ۔ بنگال میں اس کی مورتی بالکل کالی ہوتی ہے ۔ اس کے چار ہاتھ ہوتے ہیں اور وہ شیر پر سوار ہوتی ہے ۔ کالی گھاٹ (جس سے کلکتہ کا نام پڑا) کے مندر میں دیوی خونچکاں سروں کی ایک مالا پہنے ہوتی ہے ۔ جے پور کے ایک مندر میں دیوی کا سر پیچھے کو مڑا ہوا ہے ۔ روایت ہے کہ انسان کی بجائے اُسے بکری بھینٹ چڑھائی گئی ، تو اس نے گھن کے مارے منہ پھیر لیا ۔

دونوں مذہبی پیشوا اس کے منکر ہیں کہ اس کائنات کا کوئی خالق ہے یا اس پر کوئی ایسی عقل کل حکمران ہے، جو اس کا نظام چلا رہی ہے لیکن وہ یہ اعلان کرتے ہیں کہ انفرادی زندگی بالآخر معدوم ہو جائے گی اور دونوں یہ کہتے ہیں کہ یہ نیک انجام صرف اچھے کاموں کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن ان میں ایک فرق ہے۔ جین مت تو ہندو مت سے وابستہ رہا ہے اور اب عملی طور پر برہمنوں کے مذہب کا ایک فرقہ بن گیا ہے۔ لیکن بدھ مت نے جرأت سے کام لے کر ایک نئی روش کی داغ بیل ڈالی اور اس پر چل نکلا۔ اس نے کرم یعنی عمل کو مکتی کا واحد وسیلہ قرار دیا اور اس کے جلیل المرتبت بانی کے عمر بھر عمل کے میدان میں جد و جہد کی۔ موت کے بعد انسان کی تقدیر کے بارے میں بدھ مت کا جو تصور تھا، وہ برہمنی نظریوں کی عین ضد تھا اور اس کا سری تصوف بہت جلد دوسرے مذاہب میں سرایت کر گیا۔ لیکن اپنی جنم بھومی میں ایک مختصر مگر شاندار زندگی بسر کرنے کے بعد بدھ مت انتہائی مصائب سے دوچار ہوا۔ ظفر مند برہمن دھرم نے اسے جو سنگین سزائیں دیں، ان کی رُوداد جنوبی ہندوستان کے مندروں کی دیواروں پر منقوش دکھائی دیتی ہے۔ بہر حال یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اپنی اصلی صورت میں بدھ مت وہ کشش نہ رکھتا تھا جس کی بدولت برہمن دھرم نے اپنے پیرؤوں کے دل موہ لئے۔ اس نے کبھی ایک مثبت دین ہونے کا دعویٰ نہ کیا۔ اس کی جزائیں اور سزائیں آئندہ زندگی میں راحت و سعادت کے وعدے، اس زندگی میں فرائض ادا نہ کرنے کے نتیجے، سب اتنے مبہم تھے کہ عام لوگوں کے دلوں پر ان کا کوئی اثر نہ ہو سکتا تھا۔ بہت جلد اس کے لئے ضروری ہو گیا کہ یا تو خارجی دنیا سے مقابلہ ترک کر دے، یا جس مذہب کی جگہ لینے کی اس نے کوشش کی تھی، اس سے سمجھوتہ کرے۔ چنانچہ اسے اپنے پیرؤوں کو یہ اجازت دینی پڑی کہ نیک کاموں کو چھوڑ کر پوجا پاٹ میں گم ہو جائیں یا اس کی بے لطف تعلیمات میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے متبرک رسومات اختیار کریں۔ اسے اپنے اصلی وطن میں نہایت ناموافق حالات کے تحت جو ناکامی ہوئی، اس نے اس کی کوئی گنجائش نہ چھوڑی کہ وہ اپنے آپ کو ایک ولولہ انگیز مذہبی نظام ثابت کر سکے۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ اس کے بعض صوفیانہ پہلو مغربی ایشیا اور مصر کے فلسفوں پر بڑی حد تک اثر انداز ہوتے ہیں۔

بدھ مت کے ہندوستان سے دیس نکالے کے بعد برہمن دھرم نے دوبارہ غلبہ حاصل کر لیا جس زمانے میں بدھ مت کا راج تھا۔ اس زمانے میں برہمن دھرم نے جو بُرے دن دیکھے تھے، اُن سے اُس نے کوئی سبق نہ سیکھا تھا۔ اس کے روحانی تصورات میں کوئی اصلاح نہ ہوئی تھی۔ چنانچہ وہ بے جان رسم پرستی، جس کے خلاف مہاتما بدھ نے بغاوت کی تھی، آگے سے بھی زیادہ استوار بنیادوں پر از سرِ نو قائم ہو گئی۔ بحال شدہ برہمن راج میں لوگوں کی زندگیوں پر ایک ایسے مذہب کا آگے سے بھی کڑا پہرہ لگ گیا، جو محض قربانیوں کا ایک سلسلہ تھا۔ یہ مذہب لوگوں کے روحانی تقاضوں کی تو کیا تسکین کرتا۔ البتہ وہ ان کے حواس اور غالباً اُن کے جذبات کو بھاتا تھا۔ عام لوگوں کی مذہبی عبادت بے معنی اور بیہودہ رسموں کا ایک روزانہ چکر بن گئی۔ ان کے معبود پروہت تھے، اگلوں کی روحیں تھیں اور محض ظاہر داری کے طور پر ویدوں کے دیوتا تھے۔ ہندوستان کے اصلی باشندوں سے جو بُت پرستی ہندوؤں نے سیکھی تھی، اسے نہ ان کا فلسفہ، نہ بدھ مت کی اخلاقی تعلیم مٹا سکی۔ اس نے اب تمام جاتیوں کی اندرونی زندگی میں گھر کر لیا۔ درخت، پتھر، دوسری اشیائے فطری اور بُت، جو گھروں اور خاندانوں کے دیوتاؤں اور پرانے دیوتاؤں کی علامتی مورتیاں تھے، عام لوگوں کے معبود بن گئے۔ منو کا دھرم شاستر، جس پر ہندوؤں کو بجا طور پر فخر ہے اور جو بعد کے زمانوں میں دوسری مشرقی اقوام کے قانونی نظریوں کا نمونہ بنا، ایک ایسی مملکت کا ضابطہ آئینی ہے، جس میں ایک طرف تو مادی تہذیب بڑی ترقی کر چکی تھی اور دوسری طرف پروہتوں کے طبقے کا مطلق اقتدار اور عوام میں ایک تعجب انگیز اخلاقی انحطاط تھا۔ پروہتوں کی طرح اب راجا بھی دیوتا

بن گیا تھا۔ دوسری صدی عیسوی میں اگرچہ منو سمرتی کی اب بھی عزت کی جاتی تھی اور اسے ہر معاملے میں حتمی سند سمجھا جاتا تھا لیکن اس کی جگہ دھیان گرہ بجنولکیہ نے لے لی۔ اس کے نزدیک ذات پات کا فرق اتنا ہی پتھر کی لکیر تھا، جتنا منو کے نزدیک تھا۔ دونوں کی نگاہوں میں شودر اتنے ہی ملیچھ تھے جتنے وہ ابتدائی زمانوں میں سمجھے جاتے تھے۔

نوزائیدہ بچیوں کو مار ڈالنے کی رسم ہندوؤں میں اتنی ہی عام تھی، جتنی دورِ جہالت کے عربوں میں تھی۔ اس کا کوئی تحریری ثبوت نہیں ملتا کہ ستی کی رسم کب شروع ہوئی۔ لیکن قرائن بتاتے ہیں کہ وہ ساتویں صدی عیسوی میں عام تھی۔ بہرحال بیوائیں یقیناً جیتے جی چتا میں جل جانا خوشی سے قبول کرتی ہوں گی۔ کیونکہ اگر ان کے اولاد نہ ہوتی، تو ان کی زندگی اجیرن ہوتی تھی۔

عورتوں کو اجازت نہ تھی کہ ویدوں کا پاٹھ کریں یا اگلوں کی روحوں کو جو بھوگ دیے جاتے تھے، ان کے دینے میں شریک ہوں یا دیوتاؤں کو جو بھینٹیں چڑھائی جاتی تھیں، اُن کے چڑھانے میں شمولیت کریں۔ استری کا دھرم یہی تھا کہ اپنے ناتھ کی سیوا کرے اور اس کا جُگ جُگ کا سکھ چین اسی فرض کے ادا کرنے پر منحصر تھا۔ جو باوفا عورت اپنے سوامی کی چتا میں جل کر ستی ہو جاتی تھی، اسے ہندو مذہب کے تمام پیرو اپنے دل میں جگہ دیتے تھے اور صنفِ نسواں کے بہترین اور برگزیدہ ترین افراد میں شمار کرتے تھے۔ بلکہ اکثر اسے دیوی بنا کر اس کی پوجا کرتے تھے۔

اگرچہ سوچ بچار کرنے والے لوگوں کو ہندو مذہب کی اُن رکیک رسموں میں کوئی گہرے معانی نظر نہ آتے تھے اور ان کی روحیں ان رسموں سے بلند تر فضاؤں میں پرواز کرتی تھیں، لیکن کسی فلسفی یا پنڈت نے بے بس اور عموماً نوعمر بیواؤں کی ان ظالمانہ قربانیوں پر نفرت یا غصے کا اظہار نہ کیا۔ بہت سی دھرم سبھائیں وجود میں آ گئی تھیں۔ جن میں مرد بھی شریک ہوتے تھے اور عورتیں بھی شریک ہوتی تھیں اور جن کی امتیازی صفات میں پاکبازی شامل نہ ہوتی تھی۔ تجرّد کی زندگی بسر کرنے والی بہت سی منڈلیاں بھی بن گئی تھیں، جو مختلف دیوتاؤں کو پوجتی تھیں۔ ان کے اراکین ہمیشہ دھرمسالوں میں یکجا ہوتے تھے، جن میں عورتوں کو بھی داخلہ دیا جاتا تھا۔ ان منڈلیوں میں اور اسی طرح جوگیوں اور سنیاسیوں کی ان منڈلیوں میں، جو اس زمانے کے لگ بھگ وجود میں آئیں، کنوارپن کا بچن محض دھوکے کی ٹٹی تھا اور پالنے کی خاطر نہیں بلکہ توڑنے کی آسانی کی خاطر دیا جاتا تھا۔ جوگیوں کے جتھے مندروں اور متھوں میں مزے کی زندگی بسر کرتے تھے۔ بہت سے بیراگی اور سنیاسی قرونِ وسطیٰ کے بھک منگے راہبوں کی طرح یا فلیجلینس (FLAYIGS) کے عہد کے تارک الدنیا کلبیوں (CYNIGS) کی طرح عقیدت مند لوگوں سے خیرات لے کر ثواب کمانے کی خاطر ادھر اُدھر پھرتے رہتے تھے۔ خیرات دینے والوں کی نظروں میں اُن کی سندِ استحقاق کیا ہوتی تھی؟ اُن کے گندھے ہوئے لمبے لمبے بال، الجھی ہوئی گھنی داڑھی، گیروے رنگ کا کرتا، بھبوت ملا ہوا بدن، کشکول اور ڈنڈا۔

چونکہ دیوتا ناچ اور گانے کے رسیا ہوتے تھے، اس لیے مندروں میں بہت سی ناچنے گانے والی عورتیں آتی تھیں، جو نام کو تو دیوداسیاں کہلاتی تھیں، لیکن دراصل پروہتوں کے آنند کے لیے رکھی جاتی تھیں۔ عورتوں کو شروع شروع کے قوانین میں بہت پست درجہ دیا گیا تھا۔ منو نے عورتوں کے بارے میں جو نفرت و ملامت سے بھرے ہوئے الفاظ لکھے ہیں، ان کی نظیر صرف عیسوی سینٹ ٹرٹلین (TERTULLIAN) کے تعصب انگیز اقوال میں ملتی ہے۔ منو کہتا ہے: "عورتوں میں ناپاک خواہشیں ہوتی ہیں۔ وہ ارادے کی کچی اور چال چلن کی خراب ہوتی ہیں۔ ضروری ہے کہ انہیں دن رات کڑی نگرانی میں رکھا جائے۔"

جہاں تک شودروں کا تعلق تھا، اس نے تقریباً (PANDECTS) کے الفاظ میں اعلان کیا کہ خدا نے انھیں غلام پیدا کیا ہے اور

اگر کوئی شودر غلامی سے آزاد کر بھی دیا جائے تو بھی وہ آزاد نہیں ہوتا۔ چونکہ غلامی اس کی فطرت میں ہے، اس لیے اسے کون اس سے چھٹکارا دلاسکتا ہے؟

اجمالاً یہ تھے آریہ قوم کی ایک سب سے زیادہ ترقی یافتہ شاخ کے مذہبی و معاشرتی حالات اس وقت، جب پیغمبرِ اسلامؐ نے اپنا پیغام دنیا کو دیا۔

آئیے! اب ہم ایران پر ایک نگاہ ڈالیں۔ ایران ہماری سنجیدہ توجہ کا مستحق ہے۔ ایک تو اس لئے کہ وہ اسلام کے مرزبوم سے آتنا قُرب رکھتا ہے اور دوسرے اس لئے کہ اس نے نہ صرف دینِ موسوی اور دینِ عیسوی کے مزاج پر بلکہ فکرِ اسلامی پر بھی بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔

مغربی آریہ ایک قوم کی صورت میں متحد ہو کر اور روحانی نشوونما کے مدارج طے کر کے اپنے قدیم وطن کی حدود سے باہر نکل پڑے اور ان علاقوں میں جو آج کل ایران اور افغانستان کہلاتے ہیں، پھیل گئے معلوم ہوتا ہے کہ ان علاقوں میں حامی اور کوشتی (KUSHITE) نسلوں کے جو باشندے تھے، انہوں نے ان کو مسخر کر لیا یا تباہ کر دیا اور رفتہ رفتہ بحیرۂ خزر تک جا پہنچے جہاں وہ حامیوں اور کوشیوں سے زیادہ مضبوط اور جفاکش تورانیوں سے دوچار ہوئے۔ جو ماد اور سوسیانہ (SUSIANA) میں آباد تھے۔ لیکن اس سے پیشتر کہ وہ تورانیوں کو محکوم بنائے وہ خود ایک غیر ملکی حملہ آور کے حلقہ بگوش ہو گئے، جو یا کوشی تھا یا اشوری (اغلب ہے اشوری تک) اور بڑی مدت تک اس کے زیر فرمان رہے[1]۔ ان غیر ملکی فاتحین کے نکال دیئے جانے کے بعد ایرانیوں اور تورانیوں کی وہ جنگ شروع ہوئی، جس میں کبھی ایک فریق غالب آجاتا تھا اور کبھی دوسرا اور جو صدیوں تک جاری رہنے کے بعد ماد اور سوسیانہ میں تورانیوں کے محکوم بن جانے پر ختم ہوئی[2]۔ افراسیاب اور کیکاؤس کے پیروؤں کو رزم و بزم میں ایک دوسرے سے بسا اوقات جو سابقہ پڑا۔ اس نے ایرانیوں کے مذہب پر ایک دائمی اثر ڈالا۔ تورانیوں کی انتہائی مادیت ان کے ایرانی حریفوں اور ہمسایوں کی ناپختہ تصوریت میں پستی پیدا کیئے بغیر نہ رہی۔ ایرانیوں نے ماد کے قدیم آبادکاروں پر غلبہ تو پالیا، لیکن تورانیوں کے طریقہ ہائے پرستش اُن کے مذہب میں داخل ہو گئے۔ چنانچہ جہاں ایران میں صرف ہرمُزد کی پرستش کی جاتی تھی اور اہرمن کو ملعون سمجھا جاتا تھا، وہاں ماد میں خیر و شر کے ان دونوں نمائندوں کی پُوجا کی جاتی تھی۔ تورانی باشندوں کا ایرانی فاتحوں کے خدا کی بہ نسبت اپنے قومی دیوتا کی پرستش کی طرف زیادہ راغب ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ چنانچہ تورانی عوام اہرمن یا افراسیاب کو ہرمُزد پر ترجیح دیتے تھے۔

مادیوں اور بابلیوں کا ایک تعاونی معاہدے کی بدولت، جو تاریخ میں اپنی قسم کا پہلا معروف معاہدہ ہے، اشوری سلطنت کا تختہ الٹ گیا۔ لیکن اشوری مذہب بہت سے ایسے علاقوں پر جو آریوں نے فتح کئے، اتنی مدت تک مسلط رہ چکا تھا کہ زرتشتیوں کے تصورات پر اس کے نقوش کا ثبت رہنا ناگزیر تھا۔ سماوی رابطہ بندیوں اور ایک قدسی سلسلہ مراتب کا جو پیچیدہ تصور اشوریوں میں رائج تھا، اس کا پیوند زرتشتی مذہب میں لگ گیا۔ اب ہرمزد کی ایک اشور ثانی کے طور پر پرستش ہونے لگی اور ایرانیوں نے زرتشتی کے خدائے مہربان کو مجسم کرنے

---

[1] ایرانی روایات کے مطابق ضحاک نے ایک ہزار سے زیادہ سالوں تک ایران پر حکومت کی۔ بہت سے محققوں نے اشوریوں کے اقتدار کی بھی یہی مدت بتائی ہے۔ اگر یہ خیال صحیح ہے تو فریدون کا خروج اور نینوا کا سقوط دونوں ایک ہی زمانے میں ہوئے۔

[2] LERMONT, ANCIENT HISTORY OF THE CAST, P. 54

کے لئے جو علامتی نشان منتخب کیا، وہ اشوریوں کا ایک پردار سپاہی تھا، جو ہاتھ اوپر کو اٹھائے اور ایک کمان تھامے سنہرا چکر میں محصور کھڑا تھا۔ ان کے یہاں جو جھاڑ نشو و نما کی علامت تھا، پہلے اس کی اوپر کو اٹھی ہوئی شاخیں مل کر صنوبر کے پھل کی شکل بناتی تھیں، اب وہ سرو کے پھل کی شکل بنانے لگیں۔ اس سے قبل کہ کسریٰ نے آ کر فتوحات کے ذریعے مملکت کو سالمیت بخشی ابتدائی مہاجروں اور آبادکاروں میں جو علامتی پرستش رائج تھی، وہ عوام کے یہاں بگڑ کر آتش پرستی بن گئی یا اس نے کلدانیوں اور اشوریوں کے صابی مذہب کی صورت اختیار کر لی۔

آشور کا شہر، جس نے تقریباً ایک ہزار سال سرحدِ ہندوستان تک سارے مغربی ایشیا پر حکومت کی تھی اور جس کے زیرِ فرمان آنے سے فراعنۂ مصر کی سلطنت بال بال بچی تھی، طاقتور سارگون اور عظیم سنخریب (SANNACHERIB) کا شہر بابلیوں اور مادیوں کے مجموعی لشکروں کے ہاتھوں زیر ہو چکا تھا اور ایسے طور پر زیر ہو چکا تھا کہ پھر اسے اقوامِ عالم میں سر اٹھانا نصیب نہ ہوا۔ بابل جو شروع شروع میں نینوا کا حریف رہ کر اشوریہ کے زیرِ نگیں آ گیا تھا، پھر ایک بار ایشیائی تہذیب کا مرکز بن گیا۔ اس نے ان تمام علوم و فنون کو، جو ایک ہزار سالوں کی نشو و نما کا ماحصل اور "قوموں، مذہبوں، مندروں اور پروہتوں کے اختلاط کا نتیجہ تھے"۔ اپنے دامن میں سمیٹ لیا اور زمانۂ سلف کے بے جان مذہبوں اور جدید اعتقادات کے درمیان رابطے کی کڑی بن گیا۔ اشوریہ نے اکادیوں سے نہ صرف ان کا تمدن اور ادب حاصل کیا تھا بلکہ ان کے مذہب سے بھی بہت کچھ اکتساب کیا تھا۔ بابل، جس کی عظیم تر شان و شوکت نے نینوا کی خاکستر کے اندر سے جنم لیا تھا، ایک ایسے مذہب کا علمبردار تھا، جو اشوری اور کلدانی مذہبوں کا نچوڑ تھا۔ بنو نصر (بخت نصر) کے عہدِ حکومت میں بابل کی سلطنت اپنے اوجِ اقتدار کو پہنچ گئی۔ یہودیہ اس کی قلمرو میں آ گیا اور اس کے چیدہ و برگزیدہ لوگ غلام بنا کر بابل میں منتقل کر دیئے گئے "تا کہ اس کے دریا کے کنارے بیٹھ کر یہودہ کی بادشاہی کا ماتم کریں۔ یہ طاقتور فاتح عرب میں بھی داخل ہو گیا اور وہاں اس نے بنی اسماعیل کو مسخر کر کے قریب قریب تباہ کر دیا۔ اس نے صوریوں کو بھی زبردست ضربیں لگائیں۔ اور فراعنۂ مصر کی قوت کا بھی خاتمہ کر ڈالا۔ اگرچہ عبرانی وطن پرست دل کھول کر بابل پر لعنتیں بھیجتے ہیں، تاہم بابل نے یہودیوں پر اتنی سختیاں نہ کیں، جتنی مصر نے کیں۔ بنی اسرائیل خود اس فیاضانہ سلوک کی شہادت دیتے ہیں، جو ان سے کیا گیا۔ جب تک نجات دہندہ (یعنی حضرت موسیٰ) نے ایک جری لشکر لے کر اس بدنصیب شہر پر چڑھائی نہ کی، اس وقت تک بنی اسرائیل نے بابل کے خلاف کوئی آواز بلند نہ کی۔ لیکن جب انہیں رہائی مل گئی، تو انہوں نے سب و شتم، بددعاؤں اور ملامت و نفرین کا وہ ہنگامہ برپا کیا، جو نسلِ عبرانی کے دورِ وحشت کا خاصہ تھا۔ "بابل کے دریاؤں کے کنارے ہم بیٹھ گئے اور صیہون کو یاد کر کر کے روئے۔ اسے دخترِ بابل! خوش نصیب ہوگا وہ شخص، جو تو نوزائیدہ بچوں کو پتھروں پر پٹک دے گا۔"[1] بنو نصر کے عہدِ حکومت میں بابل بلا شک و شبہ اس دور کی تمام تہذیبوں کا مرکز تھا اور اس کے پروہتوں کو جو اثر و نفوذ حاصل تھا، وہ بابلیہ کی سلطنت کے خاتمے کے ساتھ ختم نہ ہو گیا۔ یہودی نظام پر بھی اور عیسوی نظام پر بھی بابلی تصورات کے نقوش نمایاں طور پر ثبت نظر آتے ہیں۔ یہودیوں نے کلدانی موبدوں کے درمیان غریب الوطنی کی جو طویل زندگی گزاری، بعض عبرانیوں کو شاہِ بابل کے دربار میں جو رسوخ حاصل ہوا اور دونوں قوموں میں ناگزیر طور پر جو میل جول ہوا، ان سب نے یکجا ہو کر فرزندانِ اسرائیل کی یہودیت کا مزاج بدل دیا۔ جب یہودی قیدی بنا کر بابل سے جائے گئے، تو وہ نیم وحشی تھے۔ جب وہ دیارِ غربت

---

[1] PS . CXXXVII

کی طویل آزمائشوں کے بعد صیہون لوٹے، تو وہ ایک ایسی قوم بن چکے تھے، جو نظریات و عقاید میں ترقی یافتہ، بڑھے ہوئے حوصلوں سے مملو اور ایک وسیع تر سیاسی بصیرت کی مالک تھی۔

فتح بابل سے مذہب کے ارتقا کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اب ایشیا پر مذہب ثنویت کی حکومت قائم ہوگئی۔ کسریٰ نے یہودیوں سے جو فیاضانہ رواداری کی، اس کے صلے میں انہوں نے قدرتی طور پر اسے "مسیحا"، "نجات دہندہ" اور "شفیع عالم" کے القاب دیئے۔ عبرانی قبیلوں کی اسیری، ایرانی اقتدار کے مرکز کے قریب ان کا مجبوراً آباد ہونا اور کسریٰ کے تحت ان کا ایرانیوں سے اختلاط، یہ چیزیں غالباً زرتشتیوں کی اس مذہبی اصلاح کی محرک ہوئیں، جو داریوش ہستاسپ کے تحت ظہور میں آئی۔ فعل و انفعال کا دو طرفہ عمل جاری رہا۔ اسرائیلیوں نے تجدید یافتہ زرتشتی مذہب پر ایک محیطِ کُل قدسی شخصیت کا گہرا اور پائدار تصور مرتسم کر دیا۔ اس کے بدلے میں انہوں نے ایرانیوں سے ایک ساوی سلسلہ مراتب اور خیر و شر کی تخلیق کے اصول دوگانہ کا خیال اکتساب کیا۔ اب اسرائیلی یہ نہ کہتے تھے کہ خدا خود گناہگاروں کے اندر بدی کی رُوح داخل کر دیتا ہے۔ اہرمن کی طرح شیطان نے عبرانیوں کی مذہبی و اخلاقی تاریخ میں ایک نمایاں کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔

کسریٰ کا عہدِ حکومت ملک گیری کا دور تھا، تنظیم کا دور نہ تھا۔ داریوش کا عہدِ حکومت استحکام کا دور تھا۔ وہ ہُرمزد کا پکّا پرستار تھا اور اپنی ساری فتوحات کو اس کا احسان کہتا تھا۔ چنانچہ اُس نے یہ کوشش کی کہ زرتشتی مذہب کو ساری غیر ملکی آلائشوں سے پاک کر دے، مادیوں کی مجوسیّت کا قلعہ مسمار کر دے اور آریہ نژاد ایرانیوں کو مہذب دنیا کی سب سے بڑی طاقت بنائے۔ لیکن انحطاط کا جو عمل شروع ہو چکا تھا، وہ کسی کے روکے رک نہ سکتا تھا۔ ایک سو سال نہ گزرنے پائے تھے کہ زرتشتی مذہب نے وہ ساری خرابیاں کوٹ کوٹ کر اپنے اندر بھر لیں، جن کا اس نے اپنے عہدِ طفلی میں مقابلہ کیا تھا۔ جو لوگ بُت پرستوں کے لئے عذاب کے فرشتے تھے اور جن کا جوشِ بُت شکنی اس غضب کا تھا کہ انہوں نے مصریوں کے متبرک بیل ایپس (APIS) کو ذبح کر ڈالا تھا اور اس کے استھان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی، انہوں نے بہت جلد ہُرمزد کی پرستش میں اپنے محکوم ملکوں کے سامی خداؤں کو داخل کر لیا۔ پُرانی مجوسی عناصر پرستی از سرِ نو تازہ ہوگئی اور داریوش کے ایک قریبی جانشین اردشیر نیمون (ARTOXERXCES MNEMON) نے زرتشتیوں میں مخنث دیوتا متھرا کی پُوجا رائج کرائی۔ یہ کلدانی دیوتا ملتا بانائی ہیس کا مثنیٰ تھا اور اس کے ساتھ لِنگ پُوجا بھی وابستہ تھی۔ اس متھرا پوجا کا نشوو نما پا کر خوبصورت سورج دیوتا کی پرستش میں تبدیل ہو جانا تاریخ کے عجائبات میں سے ہے۔ جگمگاتا ہوا سورج، پہاڑوں کی درزوں کے اندر سے نکلتا ہوا، بیل کو باڑے میں سے جا کر ہلاک کرتا ہوا اور اس کے خون سے انسانی گناہوں کا کفارہ ادا کرتا ہوا، یہ ایک ایسا تصور ہے، جو دنیا کے ایک عظیم مذہب پر اپنا اَن مٹ نقش چھوڑ گیا ہے۔ متھرا کی پُوجا کو رُومی لشکری وادیِ فرات سے یورپ کے دُور ترین گوشوں میں لے گئے اور قیصر ڈائیو کلیشین (DIOCLATIAN) کے زمانے میں وہ روما کا سرکاری مذہب بن گئی۔

مجوسی زرتشتیوں کے تحت عورتوں کے حالات ان سے بدتر اور کبھی نہ ہوئے تھے وہ مردوں کے من کی موج کی باندیاں تھیں۔ منو کے قوانین نے ایک قسم کی عصمت عائد کی اور اپنی گوت کے باہر بیاہ کرنے کا جو سخت قاعدہ ابتدائی آریوں میں رائج تھا، اس نے کسی حد تک نفسانی خواہشات پر لگام کا کام دیا۔ لیکن ایرانی جنسی تعلقات کے معاملے میں اپنی مرضی کے سوا کسی قانون کے "تابع نہ تھے۔ وہ اپنی قریبی رشتہ داروں سے شادی کر سکتے تھے اور اپنی خوشی سے بیویوں کو طلاق دے سکتے تھے۔ عورتوں کو پردے میں رکھنے کی رسم ایرانیوں ہی تک محدود نہ تھی۔ آیونیا

(IONIA) کے یونانیوں کے یہاں عورتیں حرم سرا (GYNAIKONITIS) میں بند رہتی تھیں۔ جس کے دروازے عموماً قفل بستہ ہوتے تھے۔ اور انھیں سرعام باہر آنے کی مطلق اجازت نہ تھی۔ بہرحال ابتدائی زمانے میں یونانی حرم سراؤں کی رہنے والیوں کو مجروح کر کے بے بس نہ کر دیا جاتا تھا۔ ایران میں عورتوں کی نگہبانی کے لئے خواجہ سراؤں کو ملازم رکھنے کا دستور قدیم ترین زمانوں سے چلا آرہا تھا۔ یونان کی طرح ایران میں بھی جاریہ بازی یعنی باندیوں کو داشتہ بنا کر رکھنے کا دستور ایک معروف دستور تھا۔ اور معاشرے کی رگ و پے میں ساری تھا۔ بہرحال ایرانیوں نے شہوت رانی کو اپنی قومی عبادت میں داخل نہیں ہوتے دیا۔ ان کے یہاں کوئی ایفروڈائٹی پینڈیموس (APHRODITE PANDEMOS) نہ تھی۔ زرتشتی معاشرہ اس اخلاقی وبا میں مبتلا نہ تھا، جو تمام بدکاریوں میں سب سے ذلیل بدکاری ہے اور یونان میں عام تھی۔ اور پھر روم میں بھی پھیل گئی اور جس کا قلع قمع عیسائیت بھی نہ کر سکی[1]

جب ہخامنشی سلطنت کو زوال آیا تو اس کے بعد زرتشت دنیا کی ترقی میں ایک قوت محرکہ نہ رہی۔ فاتحوں کے ان ٹڈی دل لشکروں نے جو ایران کی سرزمین پر جھکڑوں کی طرح آئے، معاشرتی اور اخلاقی زندگی کا نظام تہ و بالا کر دیا۔ سکندر مقدونی کا ظفرمندانہ حملہ بھانت بھانت کے جتھے، جو اس کے جلو میں آئے، ایشیائے کوچک کے وہ ذلیل ترین لوگ سیلیشی، صوری، فینیقی، فریجی اور لانعداد دوسری قوموں کے لوگ، نیم یونانی، نیم ایشیائی، جو کار کی طرح اس طغیانی کے ساتھ آکر ایران کی سرزمین پر پھیل گئے اور جو کوئی اخلاقی قانون نہ مانتے تھے اور ان سب سے بڑھ چڑھ کر خود فاتح کا جلد باز اور بے دھڑک مزاج، ان سب نے مل کر زرتشتی مذہب کو پستی میں دھکیل دیا۔ تومی زندگی کے نمائندے موبذان کی جیرہ دستیوں کے تختہ مشق بنے کیونکہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ایشیا کو یونانی رنگ میں رنگنا تھا۔

سکندر کی زندگی ایک شہاب ثاقب کی طرح تھی۔ قصے کہانیوں کا جو تانا بانا اس کی شخصیت کے گرد بُنا گیا ہے اور جس نے اس کی زندگی کو ایک حماسہ بنا دیا ہے، اُسے ہٹا بھی دیا جائے، تو اس صورت میں بھی وہ مہتم بالشان تصورات اور بلند ہمت مقاصد کا ایک مجسمہ بن کر ہمارے سامنے آتا ہے جس میں اعلیٰ درجے کی اولوالعزمی تھی، ایک ایسی زبردست فطانت تھی، جو ہر طرح کی مخالفت پر غالب آجاتی تھی اور ایک ایسی شخصی جاذبیت تھی، جس کی بدولت وہ اپنے اردگرد کے تمام لوگوں کے دل و دماغ کو اپنے ارادوں کے سانچے میں ڈھال دیتا تھا۔ اس کی طبیعت ایک اجتماع ضدین تھی۔ وہ تھا تو ارسطو کا ایک شاگرد، جس کا نصب العین یہ تھا کہ ایشیا کو ایک یونانِ ثانی بنا دے اور خود ساری دنیا سے خراج عبودیت وصول کرے اور دوسرے وہ فلاسفہ و حکما کا ہم صحبت بھی رہ چکا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس کی زندگی نفرت انگیز زیادتیوں سے مملو تھی۔ اس کا ایک مداح ذیل کے الفاظ میں اس امر کا اعتراف کرتا ہے:۔

> "صُور کی تاخت و تاراج اور اس کے باشندوں کو طوق غلامی پہنانا، ہندوستان اور باختر میں اس نے جو ہنگامۂ قتال برپا کیا، کلائٹس کا قتل، نلوٹس اور وفادار پارمینیو کی موت کے جو فرمان اس نے جاری کیے، طوائفوں کے کہنے پر تخت جمشید کا جلانا اور اس کے کتب خانہ کو راکھ کا ڈھیر بنا دینا، یہ سب ایسے کام تھے، جن کی کوئی معذرت تاریخ پیش نہیں کر سکی۔"

---

[1] DOLLINGER. THE GENTILE AND THE JAW, VOL. ii, P. 239

سکندر کی فتح یابی اور ہخامنشی سلطنت کی بربادی کے بعد مذہب زرتشت کی جگہ یونانیت اور کلدانی تہذیب کی بدترین روایات نے لے لی۔ اساطیر الصنادید کے اس ہیرو کے دل میں بابل کی جو محبت اور اسے ایک نئی، قوی تر اور مکمل تر تہذیب کا مرکز بنانے کی جو زبردست خواہش تھی، اس کی وجہ سے اس نے تمام ایسے مذاہب، عقاید اور سیاسی یا مذہبی اداروں کو پروان چڑھنے سے روکا، جو اس کے واحد مقصد کے منافی تھے۔ سیلیوکی حکمرانوں کے تحت ایرانیوں کی قومی خصوصیات کو تبدیل کرنے کا عمل بثابت قدمی سے جاری رہا۔ انیٹوکس اپی فینیز کو، جس نے یہودہ کے پرستاروں پر انتہائی مظالم توڑے، یہودیوں نے بھی اور زرتشتیوں نے بھی اہرمن کا نفرت انگیز لقب دیا۔ پارتھیوں کے برسر اقتدار آنے کا بھی یہ اثر ہوا کہ مذہب زرتشت کے زوال میں سرعت آگئی۔ سیلیوکی فرمانروا دجلہ اور روفٹیز کے کناروں پر حکمران تھے۔ پارتھیوں نے ہخامنشی سلطنت کے وسط میں اپنی بادشاہی قایم کی۔ یونانی باختری خاندان مشرقی علاقوں یعنی باختر اور شمالی افغانستان پر قابض تھے۔ سیلیوکیوں کا سرکاری مذہب کلدانی اور یونانی مذاہب کا مرکب تھا۔ یہودی اور زرتشتی جلاوطن اور معاشرتی حقوق سے محروم کر دیئے گئے۔ پارتھیوں کے تحت مزدکیت اگرچہ بالکل ختم نہ ہوگئی، پھر بھی حکمرانوں کی نظر بچا کر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوگئی۔ جن علاقوں میں امن و امان تھا، وہاں زرتشتیت بابلیوں اور کلدانیوں کی پرانی صابیت سے مخلوط ہوگئی۔ اگر کسی جگہ وہ اپنی اصلی صورت میں قائم بھی رہی تو وہاں بھی اسے صرف چند ایسے موبدوں کے دلوں میں جگہ ملی، جو ملک کے دور دراز حصوں میں روپوش تھے لیکن جب پارتھیا پھیل کر ایک سلطنت بن گیا اور پارتھی حکمرانوں کے سینوں میں شہنشاہ کے لقب کا شوق پیدا ہوا تو انہوں نے جبری تبدیلی کو چھوڑ کر رواداری کا شیوہ اختیار کیا۔ چنانچہ مجوسی زرتشتیت نے از سر نو مذاہب عالم کی صف میں سر اٹھایا۔ ساسانیوں کے عروج نے اسے مزید تقویت بخشی۔ نئی سلطنت کے بانی نے موبدوں کو اعیان مملکت کے منصب عطا کئے۔ ایک قریب مرگ مذہب کے یہ آخری نمائندے ان تمام امیدوں کا مرجع تھے، جو زرتشتیوں کے دلوں میں ساسانی خاندان کے زیر سایہ نئی زندگی پانے سے متعلق پیدا ہوئیں۔ اس نئی سلطنت کے بانی اردشیر بابکان کی اولوالعزمانہ امنگیں کہاں تک پوری ہوئیں، یہ ایران کی تاریخ کی ایک چیستان ہے۔ ایران کی سیاسی آزادی، یعنی اس کی قومی زندگی تو بحال ہوگئی، لیکن معاشرتی اور مذہبی زندگی اس حد تک زوال پذیر ہو چکی تھی کہ اس کا احیا حکمرانوں کے بس میں نہ تھا۔ قدیم تعلیمات کتابوں کے اوراق میں تو محفوظ تھیں، لیکن لوگوں کے سینوں میں وہ گشتاسپ اور رستم کی طرح مردہ ہو چکی تھیں۔

ساسانیوں کے عہد میں زرتشتیوں کا اقتدار اپنے نقطہ عروج پر تھا۔ کئی صدیوں تک وہ ایشیا کی سلطنت کے لیے رومیوں کے حریف رہے۔ بار ہا انہوں نے روما کی فوجوں کو شکست دی۔ اس کے شہروں کو تاخت و تاراج کیا۔ اس کے قیصروں کو قیدی بنایا اور اس کی رعایا کی دولت لوٹی۔ لیکن ایک اخلاقی عامل کی حیثیت سے زرتشتیت کی آگ ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔ وہ آتشکدوں میں تو اب بھی جل رہی تھی، لیکن لوگوں کے دلوں میں بجھ چکی تھی۔ خدائے برحق کی پرستش کی جگہ کلدانی مجوسیت نے لے لی تھی۔ اردشیر نے جس سخت تعصب سے کام لے کر حریف مذاہب کو دبانے کی کوشش کی، اس سے بھی زرتشتیت کی حالت بہتر نہ ہوئی۔ آخری ساسانی بادشاہوں کے تحت ایرانی سلطنت میں فرقہ بازی کا جو بازار گرم تھا، اس کے بادشاہ جس شہوت پرستی میں مبتلا تھے، اس کے اشراف و اعیان جس اخلاقی پستی میں گرے ہوئے تھے اور اس کے موبد اور کٹمیش جس کبر کا شکار تھے، ان سب چیزوں میں اس کی واحد نظیر بازنطینیوں کی سلطنت تھی۔ بادشاہ دیوتا تصور کیے جاتے تھے وہ رعایا کی جان و مال پر کلی اختیار رکھتے تھے اور رعایا غلاموں کی طرح تمام حقوق سے محروم تھی۔ بدکاریوں اور خرابیوں کی انتہا اس وقت ہوئی جب مزدک نے چھٹی صدی عیسوی کے آغاز میں اس اشتراکیت کا پرچار کیا، جس سے یورپ حال ہی میں آشنا ہوا ہے اور" لوگوں کو یہ تعلیم دی

کہ وہ آگ، پانی اور گھاس کی طرح دولت اور عورتوں کو اپنی مشترکہ ملکیت سمجھیں، نجی املاک کو ختم کر دیں اور دنیا کی اچھی اور بُری چیزوں میں برابر کے شریک ہوں[1]۔" مجوسی زرتشتیت نے بہنوں اور خون کے رشتے کی دوسری عورتوں کے ساتھ شادی پہلے ہی جائز قرار دے رکھی تھی۔ اس اشتراکیت کے پرچار نے صحیح الخیال ایرانیوں کو برگشتہ خاطر کیا۔ چنانچہ مزدک، جو اپنے آپ کو زرتشت کا جانشین کہتا تھا، قتل کر دیا گیا۔ لیکن اس کے خیالات ایران میں جڑ پکڑ چکے تھے۔ وہاں سے وہ مغربی ایشیا میں بھی جا پہنچے۔

یہ خرابیاں اخلاقی زندگی کے انتہائی انحطاط کی علامتیں اور قوم کے مستقبل کے حق میں ایک فالِ بد تھیں۔ اس فالِ بد کو کسریٰ نوشیرواں کی بلند سیرت نے کچھ مدت تک پورا ہونے سے روک کے رکھا لیکن اس کی موت کے بعد وہ پوری ہو کر رہی۔ بہرحال ایک معلمِ عظیم کا ظہور ہو چکا تھا جیسے دنیا کے جسدِ مُردہ میں نئی روح پھونکنی تھی۔

یہودیوں کو بابل کی قیدِ غلامی سے آزاد ہوئے گیارہ صدیاں گزر چکی تھیں اور ان کے حالات میں بڑے تغیر رونما ہو چکے تھے۔ جو قیامتیں ملتِ موسوی پر یکے بعد دیگرے ٹوٹیں، ان میں قیامتِ کبریٰ قیصران ٹائی ٹس اور ہیڈرین کی جنگیں تھیں۔ روم نے ان کے ہیکل کو مسمار کر دیا تھا اور تیغ و آتش سے ان کا بحیثیتِ ایک قوم کے خاتمہ کر دیا تھا۔ عیسوی قسطنطنیہ نے بھی اتنی ہی بے رحمی سے ان کو مظالم کا نشانہ بنایا۔ لیکن انہوں نے ماضی کے تجربوں سے کوئی عبرت حاصل نہ کی۔ انہوں نے سنگی القلب جابروں کے ہاتھوں جو ذلتیں اٹھائی تھیں، اُن سے انہوں نے انسانیت اور امن پسندی کا سبق نہ سیکھا۔ مصر، قبرص اور سیرینی کے شہروں میں جہاں وہ مقامی باشندوں سے دوستی کا ڈھونگ رچا کر بود و باش کر رہے تھے، انہوں نے جو انسانیت سوز مظالم کیے، وہ ان کی حالتِ زار پر رحم کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتے۔ قومِ اسرائیل کا گھر اُجڑ گیا، اس کے افراد روئے زمین پر آوارہ و سرگرداں تھے اور انھیں کہیں دیر تک امان نصیب نہ ہوتی تھی۔ وہ جہاں جاتے اپنا متمردانہ غرور اور اپنی شقاوتِ قلب جس کی مذمت ان کے انبیا یکے بعد دیگرے کر چکے تھے، اپنے ساتھ لے جاتے۔ غیر ممالک میں جہاں کہیں انھیں پناہ ملی، انہوں نے اپنی تاریخ دہرائی اور وہی پہلے سے کرتوت کیے۔ یہ قوم اُمیدوں پر زندہ تھی۔ لیکن امیدوں میں ایک طرف تو ایک اکھڑ اور کٹر تعصب اور دوسری طرف شہوت رانی اور عیش پرستی ملی ہوئی تھی۔ حضرت عیسیٰؑ آ کر جا چکے تھے۔ لیکن وہ ان کی حالت کو بدل نہ سکے تھے۔ ایک مسیحا کے آنے کے بارے میں اس وقت جو خیالات عام تھے، حضرت عیسیٰؑ نے ان کی فضا میں آنکھ کھولی اور تربیت پائی۔ ناممکن تھا کہ اس معلم کے دل پر، جو اپنی قوم کے ادبار پر آنسو بہا رہا تھا، کتاب دانیال کا گہرا اثر نہ ہوتا۔ جو قوم کے سیاہ ترین ایام میں لکھی گئی تھی اور جو اُس کی آرزوؤں کا اظہار اور اس کے لیے امید کا ایک پیغام تھی۔ پہاڑوں میں پناہ گزین ذیلیوں کا شدید تعصب، صدوقیوں کی بے جان رسم پرستی، فریسیوں کی ظاہر دارانہ آزادہ روی، اسینیوں کا ایک ہاتھ اسکندریہ کی طرف اور دوسرا بُدھ مت کے پیرو ہندوستان کی طرف پھیلائے امیدوں بھرے خواب دیکھنا، اس درویشِ پُرخروش کا ملامت آمیز وعظ، جس کی زندگی ہیرودیس کے دربار کی سیاہ کاری پر بھینٹ چڑھی، ان سب چیزوں نے حضرت عیسیٰؑ کو متاثر کیا۔ لیکن رومی عقاب نے یہودیہ کے دل کو اپنے پنجوں میں دبوچ رکھا تھا اور روما کے لشکر کسی قسم کے انقلاب کو سر اٹھاتے ہی کچل دیتے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ نے ترکِ دنیا کی جو تعلیم دی اور براہِ

---

[1] "دبستانِ مذاہب" از محسن فانی۔ شیخ محمد اقبال کی کتاب (DEVELOPMENT IN PERSIA) بھی ملاحظہ کیجیے۔

راست خدا کے ہاتھوں قائم کی جانے والی آسمانی بادشاہی کا جو پُر آزاد خواب انہوں نے دیکھا، دونوں ان کے وقت کی پیداوار تھے۔ وہ کسی سے مصالحت نہ کرنے والے ہٹ دھرموں کی قوم میں عالمگیر اخوت اور محبت کے پیغامبر بن کر آئے۔ ایک اکھڑ اور اکل کھری قوم میں رہ کر انہوں نے فروتنی اور انکسار کو اپنا شیوہ بنا لیا۔ وہ اپنے حواریوں سے شفقت و مودت کا سلوک کرتے تھے اور اپنے تمام پیروؤں کی بہبودی کا خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک عالی ظرفانہ ایثارِ نفس کی مثال اپنے پیچھے چھوڑی۔ طاقتور، دولت مند حکمران طبقوں کے سینوں میں انہوں نے صرف نفرت، خوف اور دشمنی کے جذبات پیدا کئے تھے لیکن غریبوں، جاہلوں، ستم رسیدوں اور محروموں کے دلوں کو انہوں نے شکرگزاری اور محبت کے جذبات سے معمور کر دیا تھا۔ ایک دن صبح کے وقت وہ دل میں یہ امید لے کر کہ وہ مسیحائے موعود بن کر دنیا میں جو کام کرنے آئے تھے، اس میں انہیں کامیابی حاصل ہونے ہی والی تھی، یہودی تعصب کے قلعے میں وارد ہوئے تھے۔ دو ہفتے نہ گزرنے پائے تھے کہ وہ اپنے وقت کی مفاد پرستی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ گئے۔

حضرت عیسٰی کی شخصیت اور زندگی پر افسانوں کا جو پردہ پڑا ہوا ہے، اس کو ہٹا یا جائے تو چند واقعات واضح طور پر آنکھوں کے سامنے آتے ہیں۔ وہ غریبوں میں پیدا ہوئے اور ان کا پیغام بھی غریبوں ہی کے لیے تھا۔ وہ ربانوی علوم میں بڑی دسترس رکھتے تھے۔ لیکن ان کی مختصر المیعاد تبلیغ صرف دیہات کے مسکین لوگوں یعنی غریب کسانوں اور گلیلی کے ماہی گیروں کے لئے وقف رہی۔ ان کے حواری بھی غریب اور ان پڑھ لوگ تھے۔ اگرچہ یہ لوگ زود اعتقاد تھے اور اس پر طرہ یہ ہوا کہ حضرت عیسٰی کے پُر اسرار طریقے سے غائب ہو جانے نے انہیں حیرت میں ڈال دیا۔ پھر بھی ان لوگوں نے انہیں ہمیشہ ایک انسان ہی خیال کیا۔ اُن کے مجسم خدا یا فرشتہ ہونے کا تصور تو بعد میں سینٹ پال نے عیسائیت میں داخل کیا۔ کلیسا کا مؤرخ موشیم کہتا ہے کہ اگرچہ روح القدس کے خود بخود جلوہ گر ہونے کا وعدہ ہو چکا تھا تاہم "یہ ضروری سمجھا گیا کہ آسمانی پیغام کی حمایت کے لیے کوئی ایسا شخص ہو، جو اتنی علمی فضیلت رکھتا ہو کہ یہودی علماء اور غیر اہلِ کتاب فلاسفہ کا مقابلہ خود ان کے ہتھیاروں سے کر سکے۔ چنانچہ حضرت عیسٰی نے خود ایک آوازِ غیبی کی ہدایت پر ایک تیرھواں شخص اپنے حواریوں کے حلقے میں شامل کیا، جس کا نام سال تھا (بعد میں بدل کر پال ہو گیا) اور جسے عبرانی اور یونانی علوم سے کافی واقفیت تھی"[1]

مجوسی زرتشتیوں کا عقیدہ تھا کہ ایک نجات دہندہ فرشتہ یا سروشِ غیبی مشرق سے نمودار ہوگا۔ بدھ مت کے پیرو ایک مجسم دیوتا یا اوتار کے قائل تھے، جسے ایک کنواری کے بطن سے پیدا ہونا تھا۔ اسکندریہ کے صوفیوں نے کلام یا ایک "نیم خدا" کا نظریہ ایجاد کیا اور سیارس کی پیدائش، موت اور دوسری زندگی کے بڑی تصورات آئی سس سریز کا تصور، یعنی اس کنواری ماں کا تصور، جو نوزائیدہ سورج دیوتا ہورس[2] کو گود میں لیے ہوئے ہے۔ یہ تصورات مصر میں بھی اور شام میں بھی عام تھے۔ پال جو ایک صاحب علم فریسی تھا، ان نیم صوفیانہ اور نیم فلسفیانہ خیالات سے بڑی حد تک متاثر تھا۔ وہ ایک خیال پرست اور جوشیلی طبیعت کا آدمی تھا۔ سٹراس کے قول کے مطابق وہ جسمانی عارضوں میں بھی

---

[1] MOSHIM, ECCLESIASTICAL HISTORY, VOL. ii, 63

[2] ملاحظہ کیجیے مسٹر ارنسٹ ڈی بنسن (MR. ERNEST DE BUNSUN) کا مضمون بعنوان "محمدؐ کا مقام کلیسا میں" (ASIATIC QUARTERLY REVIEW, APRIL, 1889.)

مبتلا تھا۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ اسے حضرت عیسیٰ سے کبھی قریب کا تعلق نہ رہا تھا۔ چنانچہ اس کے لیے آسان تھا کہ حضرت عیسیٰ کی طرف الوہیت کی صفات منسوب کر دیے، یا انھیں ایک مجسم فرشتہ کہے۔ اس نے حضرت عیسیٰ کی سیدھی سادی تعلیمات میں نیشا غورثیت جدید کے پُر اسرار نظریے داخل کر دیے، جن میں مشرقِ بعید سے مستعار لیے ہوئے عقولِ سماویہ اور تین واجب الوجود ہستیوں کے تصورات بھی شامل تھے۔

ملکی اور غیر ملکی یہودی اور غیر یہودی تابعین میں جو رقابت تھی، اس کا مظاہرہ سب سے نمایاں طور پر حضرت عیسیٰ کے دو شاگردوں پطرس اور پال کی مشہور باہمی مخالفت میں ہوا[1]۔ ابیونی غالباً یسوع ناصری کے اصلی شاگردوں کے خیالات کے نمائندے تھے۔ حضرت عیسیٰ نے ان کے ساتھ بالمشافہ گفتگو کی تھی اور انہوں نے حضرت عیسیٰ کو "عقلی اور روحانی زندگی" کے تمام اعمال میں اپنا ہم جنس اور ہم فطرت پایا تھا انہوں نے حضرت عیسیٰ کو بچپن، نوجوانی اور بلوغ کے مرحلوں سے گزرتے ہوئے اور عقل و دانش میں ترقی کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ چنانچہ ان لوگوں کا حضرت عیسیٰ کے بارے میں جو عقیدہ تھا، وہ ان کی انسانی شخصیت سے اس واقفیت پر مبنی تھا۔ یہ اصلی عقیدہ تبدیلیوں کے ایک سلسلے سے گزر کر بگڑا، جس کی قابلِ ذکر کڑیاں دوسیتی[2]، مارشونی، پیٹری پاسی اور ان سب سے اخیر میں نیس کی کونسل ہے، جو ۳۲۸ء میں منعقد ہوئی، اس زمانے میں جو عقیدہ رائج تھا کہ ذاتِ باری کا قرن بہ قرن صدور ہوتا ہے۔ اس کی بدولت ہر طبقے کے لوگوں نے، بالخصوص انہوں نے جنھوں نے حضرت عیسیٰؑ کو دیکھا نہ تھا، ان کی انسانی شخصیت سے آشنا نہ ہوئے تھے اور ان کی آئے دن کی زندگی ملاحظہ نہ کی تھی۔ اُن کی الوہیت کا نظریہ قیل و قال کے بغیر قبول کر لیا۔

جب حضرت عیسیٰ نے تبلیغ شروع کی، اس وقت روما کی سلطنت نصف سے زیادہ یورپ پر پھیلی ہوئی تھی اور تقریباً سارا شمالی افریقہ اور مغربی ایشیا کا بہت بڑا حصہ اس کے زیر نگیں تھا۔ تاریخ کے ایک اتفاقی حادثے کی بدولت یہ وسیع اقلیم عیسائیت کی پود کیاری اور مخالف فرقوں کا میدانِ کارزار بن گئی۔

فریزیوں کی دیوی سبلی[3] کے روم لائے جانے سے ایک صدی پیشتر بطلیموس سوتر، جو اسکندریہ کے سب سے خوش قسمت اور غالباً سب سے دُور اندیش جرنیلوں میں تھا، مصر پر قابض ہو چکا تھا۔ مصریوں اور یونانیوں کو ایک مشترک مذہب کے رشتے میں مربوط کر کے ایک واحد قوم بنانے کی خاطر اس نے یہ تدبیر سوچی کہ ایک ایسا طریقِ عبادت ایجاد کرے، جس میں دونوں قومیں شامل ہو سکیں۔ یہی خیال دو ہزار سال بعد اکبرِ اعظم کو سوجھا تھا۔ لیکن جہاں اکبر ناکام رہا، وہاں بطلیموس کو کامیابی ہوئی، کیونکہ حالات سب کے سب اس کے مساعد تھے۔ یونانی، زیوس، دمیتر اور اپالو یا ڈایونیشیس کی پوجا کرتے تھے۔ مصری، اوسائرس، آئی سس اور ہورس کی۔ عقیدۂ تثلیث دونوں میں مشترک تھا۔ مصری مذہب کا مدار اوسائرس

---

[1] MILNER, HISTORY OF THE CHURCH OF CHRIST, VOL. I-H. 26-27

[2] دوسیتی حضرت عیسیٰ کو خالص خدا سمجھتے تھے۔ مارسیونیوں کا عقیدہ تھا کہ "وہ سب سے زیادہ خدا کے مشابہ ہے۔ اس کا بیٹا یسوع مسیح ہے اور جسم کی ایک سایہ نما سی شباہت کا جامہ پہنے ہوئے ہے تاکہ انسانی آنکھیں اسے دیکھ سکیں۔" پیٹری پاسی اس کے قائل ہیں کہ آسمانی باپ نے اپنے بیٹے کے ساتھ صلیب پر اذیت سہی۔ (موشیم اور گبن مزید ملاحظہ کیجیے نیسینڈر)

[3] سبلی کی پوجا ہندوؤں کے مشہور دیوی درگا یا کالی کی پوجا سے قریب کی مشابہت رکھتی تھی۔

اور آئی سس کے بیٹے ہورس کی اذیت کشی اور رستخیز تھی۔ یونانی مذہب کا مدار ڈایونیشیس کی اذیت کشی اور رستخیز۔ یونان کے شہر ایلیوسس میں بھی پرستش کے پُراسرار طریقے رائج تھے، جن میں نوواردوں کے داخلے کی مخفی رسوم ادا کی جاتی تھیں۔ مصری سرشیش بھی آئی سس کی پُراسرار پرستش کی پیشوائی بھی اسی قسم کی مخفی رسوم کے ساتھ کرتے تھے۔ نہ یونانیوں کے لیے اور نہ کوئی مصریوں کے لیے یہ بات کوئی اہمیت رکھتی تھی کہ جن دیوی دیوتاؤں کی پوجا کی جاتی تھی، یا جن کے سامنے رسوم ادا کی جاتی تھیں، ان کے نام کیا تھے۔ انھیں صرف پوجا اور رسوم سے مطلب تھا۔ ناموں سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ یوں سیراپیوم کا مسلک وجود میں آیا۔ سیراپس نے یونانیوں کے یہاں زیوس کی اور مصریوں کے یہاں اوسائی رس کی جگہ لے لی۔ آئی سس نے اسکندریہ کے مسلک کی "مادرِ غمخوار" بن کر دیمیتر کو برطرف کر دیا اور ڈایونیشیس کو اب تک جو خراجِ عبودیت پیش کیا جاتا تھا، وہ اب ہورس ہیپوکریٹس کو پیش کیا جانے لگا بہرحال ڈایونیشیس نے ایشیائے کوچک کے ساحلی علاقوں میں اپنا مرتبہ نہ کھویا۔ چنانچہ عام لوگوں میں جو عقیدہ رائج تھا کہ ایک دیوتا انسانوں میں رہ چکا تھا اور اذیتیں اٹھا کر دنیا سے رخصت ہو چکا تھا اور پھر قبر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس عقیدے نے بعد میں عیسائیت کو پھیلنے میں سہولت بہم پہنچائی۔

کہا جاتا ہے کہ آئی سس، جس کی شان و شوکت اوسائی رس کے شوہر کی عظمت ماند پڑ گئی تھی۔ حضرت عیسٰی کی پیدائش سے اسّی سال پہلے روم میں پوجی جانے لگی۔ اس کی پوجا نے بہت جلد عوام کو بھی اور شائستہ طبقوں کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اس کی بھڑکیلی رسومات، اس کے سر منڈے صفاچٹ داڑھیوں والے پروہت، اس کے سفید پوش نوعمر ادنیٰ پروہت جو مشعلیں اٹھائے چلتے تھے، اس کے باوقار جلوس جن میں اوسائی رس ہورس کی تکلیف اور موت پر غم و اندوہ کے پرجوش جذبات اور اس کے دوبارہ زندہ ہونے پر دیوانہ وار خوشی کے جذبات کے اکسانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جاتا تھا۔ اس کے صوفیانہ معانی سے مملو پُراسرار عبادات اور سب سے بڑھ کر حیاتِ جاودانی کی بشارت میں ایک ایسی دنیا کے لیے جس کے پرانے دیوتا چُپ ہو چکے تھے اور جو کائنات کے دائمی مسائل سے ایک قریب تر واسطے کی تمنائی تھی، بڑی کشش رکھتی تھیں۔ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ آئی سس نے رومیوں کے دلوں پر مضبوطی سے قبضہ جما لیا[1]

اگرچہ "دکھیاروں پر ایک ماں کی ممتا نچھاور کرنے والی" آئی سس کی پوجا لوگوں کے جذبات پر ہمیشہ مسلط رہی لیکن سورج دیوتا متھرا کے نسبتاً زیادہ مردانہ وار مسلک نے، جس میں پُراسرار رسومات کے ساتھ ساتھ کفارہ گناہ کا نظریہ اور انسانوں کے ساتھ دیوتا کے براہِ راست تعلق پر اصرار بھی تھا۔ رومی لشکریوں میں خاص ہر دلعزیزی حاصل کر لی۔ جہاں کہیں یہ لشکری گئے وہیں وہ متھرا پوجا کی یادگاریں چھوڑ آئے۔

عیسائیت کا جو دعویٰ ہے کہ اسے تمام مذاہب سے بڑھ چڑھ کر بلکہ کسی دوسرے مذہب کی شرکت کے بغیر یہ حق ہے کہ وہ ساری نوعِ انسانی کو اپنے پرچم کے نیچے جمع کرے اور اس کے ضمیر پر فرمانروائی کرے۔ اس دعوے پر منصفانہ رائے قائم کرنے کی خاطر ضروری ہے کہ ان اسباب کو ذہن نشین کر لیا جائے، جو شہنشاہ قسطنطین کی تخت نشینی سے پہلے دینِ ناصری کی اشاعت میں ممد و معاون ثابت ہوئے۔ حضرت عیسٰی کے دوبارہ دنیا میں آنے کی بشارت نے اور اس خوش خبری نے کہ ان کے آنے کے ساتھ ہی خدا کی بادشاہی قائم ہو جائے گی، جس میں غریبوں کو

---

[1] DILLS ROMAN SOCIETY FROMNERO TO MARCUS AVRELIVS-CHAP.V. LEGGES FORCRAMER AND RIYALS OF CHRISFIANITS VOL II. P87

سرفرازی حاصل ہوگی اور دولت مند طبقہ کی جگہ غریب جنت کی نعمتوں کا لطف اٹھائے گا، ادنیٰ طبقوں کے دلوں میں امیدوں کی ایک ہل چل برپا کر دی۔
حضرت عیسیٰ کے قریبی حواریوں اور پیروؤں کے وعدوں سے بھری ہوئی اُمیدوں نے اس پاس کے لوگوں کو بھی متاثر کیا اور جیسے جیسے دینِ عیسوی کے مبلغوں کی تعداد بڑھتی گئی ویسے ویسے یہ پُرجوش عقیدہ دُور دراز علاقوں میں پھیلتا چلا گیا۔ قدرتی امر تھا کہ ایک ایسے مذہب کو جو عدم مساوات زیادتیوں اور بے انصافیوں کو بہت جلد رفع کرنے کا وعدہ کرتا تھا، عوام میں فوراً ہر دلعزیزی حاصل ہو جائے۔ یہ عقیدہ کہ حضرت عیسیٰ کے دوبارہ آتے ہی خدا کی بادشاہی قائم ہو جائے گی، لوگوں کے دلوں میں اس قدر راسخ تھا کہ اگرچہ اس عہد کا ایفا جس کے بارے میں یقین دلایا گیا تھا کہ وہ ابتدائی حواریوں کی زندگی ہی میں ہو جائے گا مستقبل کی دھندلی دُوریوں میں آنکھوں سے ہٹتا چلا گیا، تاہم جن توقعات اور اُمیدوں کو اس نے جنم دیا تھا، ان کا زور اس وقت تک کم نہ ہوا۔ جب تک عیسائیوں کو صلیبی جنگوں میں حتمی شکست نہ ہوئی۔ ایک ہزار سال کی مدت کے بعد جو پہلے مصائب کا اور پھر کامیابی کا دور تھی، دینِ عیسوی کے غازی اپنے آقا کے ظہورِ ثانی کا پختہ عقیدہ دل میں لیے ایک دوسرے مذہب کے نام لیواؤں کو نیست و نابود کرنے کے ارادے سے میدان میں آئے۔

اس کے علاوہ اور بھی اتنے ہی قوی اسباب تھے، جو عیسائیت کے اس صورت میں پھیلنے کے کفیل ہوئے، جو اس نے حضرت عیسیٰ کی وفات یا ابیونی اور مسلم عقیدہ کے مطابق ان کے پردۂ غیب میں چھپ جانے کے بعد اختیار کی۔

جیسا کہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں، یہودیوں کے سوا ایشیائے کوچک، شام اور بحیرۂ روم کے ساحلی علاقوں کے تمام لوگوں میں ایک مرکز بنائے ہوئے خدا اور ایک تثلیثِ قدسیہ کا تصور عام تھا مصریوں کے سراپیسی مذہب کا یہ ایک لازمی رکن تھا لیکن آئی سس کی پوجا کے پھیلنے کے ساتھ ساتھ رومی سلطنت کے ہر حصے میں تثلیث کا تصور سرایت کرتا چلا گیا۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ کی وفات کے بعد عیسائیت نے جن عقاید کی صورت اختیار کر لی، ان کے مانے جانے کے رستے میں نہ کوئی جذباتی اور نہ کوئی مذہبی رکاوٹ تھی۔

ساتھ ہی ساتھ فلسفیوں نے بھی عیسائیت کو کمک پہنچائی۔ اگرچہ غیر شعوری طور پر اور اس کی حمایت کرنے کے ارادے کے بغیر، بلکہ ہو سکتا ہے کہ اس کے عقاید سے واقف ہوئے بغیر انھوں نے فطرت الٰہی اور حیاتِ بعد الموت کے بارے میں جو قیاس آرائیاں کیں، ان کا اثر یہ ہوا کہ آئی سس اور متھرا کے اسرار اور پرانے مسلکوں کی رسومات و عبادات پر بہت سے صاحبِ فکر لوگوں کا یقین متزلزل ہو گیا۔ لیکن شائستہ طبقوں کے لوگ دینِ عیسوی کے انقلابی نظریات کو شک کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور اسکندریہ کے خداؤں اور سورج دیوتا نے ان کے دلوں پر کچھ اس طرح تسلط کر رکھا تھا کہ تقریباً تین صدیوں تک عیسائیت کی اشاعت اَن پڑھ اور غیر متمول طبقوں تک محدود رہی۔
جب تک عیسوی کلیسا نے اپنے عظیم اور مسخر القلوب حریفوں سے بہت سے ایمانیاتی مسائل اور ان کے تقریباً تمام قاعدے، رسمیں، عملیات اور ادارے مستعار لے کر اپنے الٰہیاتی اور عبادتی نظام میں داخل نہ کیے، اس وقت تک اسے اصحابِ فرہنگ و ثقافت میں مقبولیت حاصل نہ ہوئی۔ پھر جب یہ لوگ مذہبی جبر یا سلطانی حکم کے دباؤ سے کلیسا کے حلقے میں داخل ہوئے تو وہ اپنے ساتھ وہ تمام عناصر لے آئے، جنھوں نے جدید عیسائیت اور اس کے لاتعداد فرقوں کی تشکیل کی ہے[1]۔ بہرحال دینِ عیسوی کی نشو و نما کے ابتدائی دَور میں اس بے پناہ جبر و تشدد نے

---

[1] DILLS ROMAN SOCIETY FROM NERO TO MARCUS AURELIUS CHAP. V

جو صدیوں تک جاری رہا، عقاید و نظریات میں ایک طرح کی وحدت برقرار رکھی۔

عوام الناس میں آئی سس پوجا نے مریم پرستی کی شکل اختیار کر لی۔ حضرت عیسیٰ کی والدہ حضرت مریم مصری دیوی کی جگہ "امن کا ملجا" اور "رحم کا ماویٰ" بن گئیں۔ اب ان کی پرستش "خدا کی ماں" کے طور پر ہونے لگی۔ جیسی کہ آج تک لاطینی نسلوں میں ہوتی ہے۔

ترک دنیا فدایان اسکندریہ کے پرستاروں کا ایک مرغوب دستور تھا۔ فیثاغورث اور آرفیس کے مسالک کے تابعین اس پر عمل کرتے تھے اور انہوں نے اسے گنگا کے ڈیلٹے کے برہمنوں سے، جن کے یہاں یہ عام تھا، اکتساب کیا تھا۔ عیسوی کلیسا نے اسے اختیار کیا اور مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے اسے مقدس قرار دیا۔ بپتسمہ دینے والے یوحنا کی رسم بالکل سیدھی سادی تھی۔ آئی سس پوجا کے زیر اثر وہ ایک پرتکلف اور پر اسرار رسم بن گئی۔ داخلے کی رسم کی جگہ شرکت اعشائے ربانی کا قاعدہ رائج ہو گیا۔ اور تو اور، آئی سس کی سری عبادات سے جو یہ عقیدہ منسلق تھا کہ مرے ہوئے خدا کا لہو شراب میں تبدیل ہو جاتا ہے، وہ بھی عیسوی نظام کا ایک لازمی جزو بن گیا۔ عیسوی کلیسا کے سر منڈے صفاچٹ واڑھیوں والے پادریوں کو، سفید پوش خادموں کو، رسومات کی شان و شوکت کو، عشائے ربانی کے طریقوں کو، روزوں، ضیافتوں کی مدتوں کو تاریخ بین عینک لگا کر دیکھیے، تو وہ قدیم تر مذہب جن کی جگہ عیسائیت نے لی، اپنے سارے طمطراق اور دھوم دھڑکے ساتھ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتے ہیں۔ عیسوی کلیسا کے مکالماتی دعائیہ سنگیتوں میں ہمیں وہ من موہنے بھجن سنائی دیتے ہیں، جو ہزاروں سفید پوش لڑکے لڑکیاں مل کر اسکندریہ کی دیوی (یعنی مغربی غیر اہل کتاب دنیا کی "مادر غمخوار") کے حضور گایا کرتے تھے اور سینٹ پیٹر یا سینٹ پال کے گرجا سے سراپیم کے مندر تک خیالی سفر کرنے کے لئے کسی خاص کوشش کی ضرورت نہیں پڑتی۔

اسلام سے پہلے عرب کے تصوّرات

عبد اللہ قدسی

عرب قدیم کی کوئی تاریخ مدوّن نہیں ہوسکی۔ سب سے بڑا ماخذ ادب ہے اور پھر پتھر کے نقوش و نشانات اور دوسرے ملکوں کی قدیم تاریخوں کے کچھ حوالے ہیں۔ زمانہ جاہلیت قبل اسلام کے ادب کو لوگوں نے ایک سو سال میں منحصر کر دیا ہے[2]۔ بعض لوگوں نے دورِ جاہلیت سے نوحؑ و ادریسؑ کا درمیانی زمانہ مراد لیا ہے، قرآن شریف میں ہے ۔

وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاھلیۃ الاولیٰ ۔

کلبی لکھتا ہے حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ کا درمیانی زمانہ مراد ہے[3]۔ اور بعض نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کا درمیانی زمانہ شمار کیا ہے اور بعض نے حضرت عیسیٰؑ اور آنحضرتؐ کا درمیانی زمانہ مراد لیا ہے۔ لیکن عام طور پر اس سے اسلام سے پہلے کفر کا زمانہ مراد ہوتا ہے[4]۔

جاہلیت عرب کے دورِ اول کا ادب قدیم تو ضائع ہوگیا۔ اس لیے کہ وہ لوگ فن کتابت سے نا واقف تھے لیکن دورِ ثانی یعنی اسلام سے پہلے کی جاہلیت کا ادب مدوّن ہے۔ جس کا کچھ حوالہ قرآن شریف میں آیا ہے اور باقی تمام شعرا کے جاہلیت کے اشعار میں موجود ہے۔ اس کا ماخذ سیرت ابن ہشام، اخبار عبید بن شریہ، الاکلیل، حیات الحیوان الدمیری اور بعد کی کتب جیسے الاغانی، مروج الذہب ارزقی، القزوینی، الثعالبی، الالوسی وغیرہ ہیں۔

عربی، فینیقی، اشوری اور بابلی ایک ہی باپ کی اولاد ہیں۔ اسی لیے ان کے جسم اور ان کی عادتیں ملتی جلتی ہیں۔ پھر عرب اپنے بھائیوں سے جدا ہوگئے۔ یہ سامی کہلائے اور عرب خالص "سادی بدوی" ہوئے اور باقی قبیلے بابل و مصر میں رہے۔ بہر کیف دونوں تہذیبیں ایک ہی جگہ سے نکلی ہیں، لیکن ان کی جدائی کا زمانہ معلوم نہیں ہوسکا۔

اکثر بڑے مورخ اس بات پر متفق ہیں کہ سامی قومیں حقیقت میں عرب سے آئی ہیں[5]۔ بہرکیف یہ قومیں عرب سے باہر گئی ہوں یا عرب ان سے جدا ہو کر آئے ہوں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اس لیے کہ عرب ہیئت اجتماعی اور ہیئت اقتصادی میں سامیوں سے مختلف ہیں۔ البتہ عادات اور عقائد میں کچھ قریب ہیں[6]۔

---

[1] LITERARY HISTORY OF THE ARABS BY NICHOLSON, B. XXII

[2] تاریخ الطبری ج ۱ ص ۴۳ [3] بلوغ الارب ج ۱ ص ۱۷ [4] بلوغ الارب ج ۱ ص ۱۸

[5] DIEALTE GEOGRAPHIE ARABIENS, P. 293, BERNE 1875

[6] فجر الاسلام ج ۱ ص ۱۳۰ (طبع ثانی)

چنانچہ ایک محقق کوک صاحب نے اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے[1] کہ یہ بات بالکل مبہم ہے کہ سامی عالم آخرت کے معتقد تھے۔

"THERE IS CERTAIN GLOOM, MORBIDITY AND ABSENCE OF OTHER-WORLDLINESS AMONG SEMITES.."

ہیرودوطس بیان کرتا ہے کہ جس زمانہ میں فینیقیہ اور فلسطین سے بیش قرار خراج ایران کے بادشاہوں کو جایا کرتا تھا۔ اس وقت عرب ہی ایسے تھے جو خراج سے مستثنیٰ تھے[2]۔

عرب باشندے سرحدات شمالی عربستان غیر اقوام کی فتوحات سے بالکل محفوظ رہا۔ مصری، یونانی، رومی اور ایرانی وغیرہ ملک گیر جنہوں نے تمام دنیا کو تہ و بالا کر ڈالا، عربستان کا کچھ نہ کر سکے۔ اگر عرب میں بیرونی آبادکار آئے بھی، تو تاریخ میں اس کا کوئی ریکارڈ نہیں ملتا۔ ہمیں کسی ایسے حملہ آور کا بھی علم نہیں، جو ان ریگستانی دیواروں کو چیرنے میں کامیاب ہوا ہو اور اس سرزمین میں حکومت قائم کر چکا ہو[3]۔

البتہ یمن پر ۵۲۵ء میں حبشیوں نے چڑھائی کر کے حکومت قائم کی اور کچھ لوگوں کو عیسائی بنا لیا۔ لیکن ۵۹۷ء میں ایرانیوں کی مدد سے انہیں نکال دیا گیا اور حجاز تک اس کا بھی اثر کبھی نہیں پہنچ سکا۔

خود یمن کی ترقی رومیوں سے بالکل علیحدہ تھی اور یہاں خالصتاً عربی تمدن تھا۔ اسی وجہ سے عربوں کے پرانے تمدن کا پتا یمن میں مل سکتا ہے[4]۔

تاریخ سے یہ بالکل واضح ہوتا ہے کہ عرب ہمیشہ آزاد رہا اور اس پر دوسروں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس لیے عرب اپنی خصوصیات دوسرے ممالک سے بالکل علیحدہ رکھتا ہے اس کا تمدن، اس کا مذہب اس کی زبان اور اس کا ذہن سب علیحدہ خصوصیات کے حامل ہیں اور ان میں سے ہر ایک میں اس کی ملکی خصوصیات نمایاں ہیں۔ ان کی خاص خصوصیات یہ ہیں وہ تیز نظر، ذہین، بے دین، بت پرست، حریت پسند اور خوش بیان ہے اس کی حریت پسندی اس کے تمام نظریات پر حاوی ہے۔

روئے زمین پر کوئی ملک نہیں ہے، جس کی خاص آب و ہوا کا اور مٹی کا ایسا بین اور صریح اثر اس ملک کے باشندوں پر ہوا ہے، جیسا عربستان کی مٹی اور آب و ہوا کا اثر عربستان کے باشندوں پر ہوا ہے[5]۔

عربوں کی جبلت اور ان کے خصائص روحانی کے مطالعہ سے ان کی سرگزشت اور ان کے اسباب ترقی و تنزل کا پتہ لگ سکتا ہے۔ اس قوم کی خصائص اخلاقی اور رواداری کی مضبوطی اور التزام کے ساتھ سالہائے دراز تک قوم کی اولاد و احفاد میں قائم

---

[1] RELIGION OF PALESTINE, P. 36

[2] HERODOTUS, BOOK III, CHAP. 8

[3] HISTORY OF THE ARABS BY P.K. HITTI, P. 8

[4] تمدن عرب ص ۸۷۔ [5] تمدن عرب ص ۸۰

رہی ہے، جس طرح خصائص جسمانی ارثاً اولاد میں ظاہر ہوتی ہیں۔

مذاہب عرب

۱۔ بعض عرب تو ایسے تھے، جو خالق کو مانتے ہی نہ تھے اور نہ قیامت کو کچھ سمجھتے تھے۔ بلکہ کہتے تھے طبیعت عناصر خالق ہے اور دہر فنا کرنے والا ہے۔

۲۔ بعض خالق کو مانتے تھے، مگر قیامت کے منکر تھے۔

۳۔ اکثر تعداد بت پرستوں کی تھی،

۴۔ ایک فرقہ ستارہ پرست تھا لیکن یہ بھی ستاروں کے بت پوجتے تھے اور ان کی نظر بھی مادہ سے بلند نہیں تھی۔

۵۔ مجوسی فرقہ بھی تھا لیکن یہ بھی حقیقت میں بت پرست ہی تھے۔

۶۔ کچھ یہودی اور عیسائی تھے، لیکن ان پر بھی بت پرستی غالب تھی۔ اور ایک خدا کا تصور مبہم تھا۔

وسط عرب کے باشندے عام طور پر خالق کے تصور سے خالی تھے اور اگر بت پرستی یا مظاہر پرستی کا وجود تھا، تو اس پر کوئی اعتقاد نہیں رکھتے تھے۔ یہ بدوی فطرت ان لوگوں پر بھی غالب تھی، جو شہر میں آباد تھے۔ اس لیے کہ وہ بھی اسی کلچر پر فخر کرتے تھے اور اسی سے رشتہ جوڑتے تھے۔ بہرکیف یہ حقیقت ہے کہ عرب عام طور پر مذہب سے ناآشنا تھے اور بتوں کی بھی ان کے دل میں خاص عزت نہ تھی[1]

رہائش اور ہیئت اجتماعی میں ان کی فطرت یہ تھی کہ وہ صحرا اور ریتلے میدان اور بے آب و گیاہ زمین کے رہنے والے تھے، جہاں درخت ناپید تھے، چشمے اتفاق سے ملتے تھے ایسے لوگ سورج کی تیزی سے بچنے کے لیے رات کو نیلے آسمان کے نیچے سفر کرتے ہیں اور ستاروں سے رستہ تلاش کرتے ہیں۔

ان کی اجتماعی زندگی عارضی ہوتی ہے پہاڑوں کے غاروں کی طرح خیمے بنا لیتے ہیں۔ فصل میں قیام کیا، خزاں آتے ہی چل پڑے۔ ان کے پاس نہ زراعت کے آلات ہوتے ہیں، نہ ایسی صنعتیں، جو سکون و اطمینان چاہتی ہیں یہ اپنی روزی کے لیے قدرت پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ایسے لوگ کل پر بھروسہ نہیں کرتے اور نیچر کے علاوہ اور کسی بات پر غور نہیں کرتے، بلکہ قریب پر نظر رکھتے ہیں۔ ان کی فکر بالکل صاف اور سادہ ہوتی ہے، جیسا ریتلا میدان۔ ان کی باتیں سلجھی ہوئی اور ان کا بیان واضح ہوتا ہے۔ وہ ہر چیز کا گہرا مشاہدہ کرتے ہیں اور صاف دیکھتے ہیں۔ اس لیے ان کی نظر تیز اور ان کی یاد قوی ہوتی ہے وہ نظر آنے والی چیزوں کے اوصاف میں دقیق باتیں بیان کرتے ہیں ضرورتیں پوری کرنے میں عجلت کرتے ہیں۔ اس لیے یہ صحرا والے خانہ بدوش بالکل مادی زندگی رکھتے ہیں اور قوتِ مشاہدہ میں آریوں سے ممتاز ہوتے ہیں۔ نزار کا قصہ ان کی فطرت سمجھنے کے لیے مناسب ہے:

جب نزار کی موت کا وقت آیا، تو اس نے اپنے چاروں بیٹوں، ایاد، ربیعہ، انمار اور مضر کو جمع کر کے وصیت کی کہ میری وفات کے بعد تم لوگ اسقف نجران کے پاس جانا وہ عرب کا حکیم اور قاضی ہے۔ چنانچہ جب نزار مر گیا، تو یہ لوگ اس کے پاس روانہ ہوئے راہ میں انہوں نے اونٹ کے نشانات دیکھے۔ ایاد نے کہا، یہ اونٹ بھینگا ہے، مضر نے کہا، وہ دم

---

[1] ENCYCLOPEDIA OF ISLAM, VOL. I, P. 999

کٹا اونٹ ہے، ربیعہ نے کہا ترچھا چلنے والا بھی ہے، انمار بولا اور بھگوڑا بھی ہے اس کے بعد انہیں اونٹ کا مالک ملا اس نے دریافت کیا کہ کیا آپ نے میرا اونٹ دیکھا ہے؟ ایاد نے اس سے پوچھا، کیا وہ بھینگا ہے؟ جواب ملا جی ہاں۔ مضر نے کہا، کیا وہ دم کٹا ہے؟ اس نے کہا جی ہاں۔ غرض سب نے جیسا پوچھا، ویسا ہی نکلا۔ آخر اونٹ والے نے کہا، وہ کہاں ہے؟ انہوں نے جواب دیا، ہم نے تو نہیں دیکھا۔ اونٹ والا ساتھ ہو گیا اور اسقف نجران سے شکایت کی۔ ان لوگوں نے جواب دیا ہم نے اونٹ کے نشانات دیکھے اور ان سے اونٹ کی صفات پہچان لیں۔

اسقف نے پوچھا، تم نے کیا صفات بیان کیں؟ چاروں نے اپنے اپنے نشانات بتا دیئے اسقف نجران نے ایاد سے پوچھا۔ اس کی کیا دلیل ہے کہ وہ بھینگا ہے؟ کہا، میں نے دیکھا کہ وہ اپنی داہنی آنکھ کی طرف چلتا ہے اور اس پر چارا لدا ہوا ہے مضر سے پوچھا، تمہاری کیا دلیل ہے کہ وہ دم کٹا ہے؟ جواب دیا کہ اس کی مینگنیاں ایک جگہ جمع تھیں، اگر دم ہوتی تو اس سے پھیلا دیتا۔ ربیعہ سے پوچھا، تم نے کیسے جانا، وہ ترچھا چلتا ہے؟ کہا اس کے پاؤں ایک دوسرے پر پڑتے ہیں اور کبھی دونوں مخالف پڑتے ہیں، میں نے سمجھ لیا وہ ترچھا چلتا ہے۔ انمار سے پوچھا، تمہیں اس کے بھگوڑے ہونے کا کیسے علم ہوا؟ جواب دیا، کہ اس کے پاؤں کے نشانات عموماً راستے سے ہٹ جاتے ہیں۔ میں نے سمجھ لیا کہ اگر کوئی سامنے سے آئے، تو رستے سے ہٹ جاتا ہے۔ اگر بھگوڑا نہ ہوتا، تو ہم سب اس کی جگہ پر پہنچ جاتے۔[1]

اپنی قوت مشاہدہ اور تجربات کی بنا پر یہ لوگ عرافہ اور قیافہ میں ماہر تھے، لیکن عرافہ کا تعلق کہانت سے قطعی نہیں ہے عرب کا عرافہ یہودی کی کہانت سے بالکل مختلف ہے ان دونوں میں بنیادی فرق ہے۔ کہانت اور رہبانیت خالص روحانی نظریئے ہیں۔ اور عرافہ مادی نظریہ ہے، جو محسوسات اور علامات سے مستنبط ہوتا ہے۔

عربی طبیعت مادیت اور دہریت کی طرف مائل ہے، لیکن اطراف عرب سے مختلف ادیان بھی داخل ہوئے اور اس طرح ان کی خالص طبیعت کے خیال کو دوسرے خیالات کی آمیزش نے مبہم کر دیا، لیکن انہوں نے اپنی طبیعت کو بدلا نہیں۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اپنی کتاب "ادب الجاہلی" میں اپنی پوری تحقیق و تنقید کا یہ خلاصہ پیش کیا ہے کہ سبعہ معلقہ کے تمام مشہور شاعروں کی وہی اصلی شاعری ہے، جس میں ملکۂ تخیل شاعری کے مادی احساس سے مکمل طریقہ سے وابستہ ہو اور اس حس سے الگ اس کی کوئی اہمیت نہ ہو۔ یہاں تک کہ وہ کوئی کام اکیلے نہ کر سکے۔ جاہلی شاعر کی طرف حواس کے ذریعہ جو صورتیں منتقل ہوتی تھیں، ان کو وہ مجرد کر کے اور ان کی تنقیح و تصفیے کے بعد انہیں دوبارہ مرکب نہیں کر سکتا تھا۔ بلکہ اس تالیف و ترکیب میں حواس ہی کو وسیلہ بناتا تھا۔ اس لیے اس کی شاعری میں وصف (حالات کا بیان) حسی اور بلوی ہوتا تھا۔[2]

عرب میں صابئین کی کواکب پرستی اور یہود و نصاریٰ کے عقائد آئے۔ مجوسیت کا اثر بھی پہنچ گیا۔ لیکن یہ نظریات بھی ان میں فلسفیانہ فکر پیدا نہ کر سکے۔ اس کا اندازہ ان کی معاشرت کے اسلوب سے ہوتا ہے وہ اگرچہ حج اور عمرہ کرتے تھے بت پرستی اور کواکب پرستی کرتے تھے، لیکن ان کی طبیعت انہیں آبائی دین کی طرف کھینچ لے جاتی تھی، چنانچہ وہ یہود و نصاریٰ کے خداؤں

---

[1] کتاب التیجان ص ۲۱۴ و ۲۱۵ [2] ادب الجاہلی پانچواں باب

کی صفات اپنے اولین اسلاف کی بیان کی ہوئی صفات کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ وہ کبھی یہود و نصاریٰ کے خداؤں کی پرستش کرنے اور کبھی ان کا مذاق اڑاتے اس لیے کہ یہ لوگ دہری مزاج تھے۔ اساطیر ان کا دین تھا اور دوبارہ زندہ ہونا ان کے نزدیک خرافات اور بیہودہ بات تھی[1] جیسا کہ عبداللہ ابن الزبعری نے کہا تھا[2]

حیات ثم موت ثم نشر
حدیث خرافه یا ام عمر

(زندگی، پھر موت، پھر زندہ ہونا، اے ام عمر، یہ سب باتیں خرافات ہیں)

اہل عرب سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ دنیا کہاں سے پیدا ہوگئی اور کدھر جا رہی ہے جیسا کہ اس وقت دوسری قومیں سوچتی تھیں کہ ہوائیں کہاں سے چلتی ہیں۔ زمین و آسمان کی ابتداء اور انتہا کیا ہے، اہل عرب عالم کو غیر متغیر، لازوال اور حوادثات پر موثر خیال کرتے تھے سجاح بن سباع الضبی نے لکھا ہے[3]

لقد طوفت فی الآفاق حتی
بلیت وقد أنیٰ لی لو ابید

(میں نے آفاق میں گشت کیا، یہاں تک کہ مصیبت میں پڑ گیا اور قریب ہوا کہ ہلاک ہو جاؤں)

وشهر مستهل بعد شهر
وحول بعده حول جديد

(مہینے کے بعد مہینہ شروع ہو جاتا ہے اور سال کے بعد نیا سال شروع ہو جاتا ہے)

ومفقود عزیز الفقد تاتی
منیة و ماموّل ولید

(اور گم گشتہ نہیں لوٹتا، موت آتی ہے اور جوان پر امید ہوتا ہے)

اکثر قبائل کا یہی عقیدہ تھا۔ ان میں اہلِ قریش پیش پیش تھے اور یہ ظاہر ہے کہ قبیلہ قریش کا تمام عرب میں کس قدر اثر تھا۔ یہ لوگ معطلین تھے۔ ان کے عقیدہ میں زمانہ ازلی ہے، نظام عالم کا مدبر ہے، انسان کی تنگی اور فراخی زمانہ پر منحصر ہے، انسان کی عمر پر زمانہ کو قدرت ہے۔ وہی تمنائیں پوری کرتا ہے، وہی مارتا اور جلاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ انسان کی سعادت اور شقاوت زمانہ کے ہاتھ میں ہے۔ شعراء زمانہ کے اعمال کا تذکرہ کرتے، تو اس کی یہ صفات بیان کرتے تھے۔ زمانہ ان کے نزدیک ایسا تیرانداز ہے، جس کا تیر خطا نہیں ہوتا اور یہی موت کا پیالہ پلاتا ہے۔ ان کے اس عقیدہ کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔

---

[1] اساطیر العربیہ قبل الاسلام صفحہ ۲۱ [2] الملل والنحل للشہرستانی ج ۳ ص ۲۶۲ [3] دیوان حماسہ ج ۱ ص ۲۴۴ مطبعہ محمد علی مصر۔

وقالوا ماهی الا حیاتنا الدنیا نموت ونحیا وما یهلکنا الا الدهر[1]

(ان لوگوں نے کہا اور کچھ نہیں ہے، مگر یہی دنیا کی زندگی، مرتے ہیں اور جیتے ہیں، ہمیں کوئی نہیں مارتا سوائے زمانے کے)

چنانچہ اس آیت کی تفسیر میں علامہ المسعودی نے تحریر کیا ہے۔

"ان کا عقیدہ تھا کہ مرورِ ایام ہلاکت کا سبب ہے۔ یہ لوگ حوادثات کی نسبت دہر اور زمانے کی طرف کرتے تھے اللہ کے حکم سے روح کے قبض ہونے کے قائل نہیں تھے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ زمانہ کو بُرا نہ کہو، اللہ ہی زمانہ ہے۔ یعنی حوادثات کی نسبت اللہ کی طرف ہے، نہ کہ زمانہ کی طرف"[2]

علامہ قرطبی نے اپنی تفسیر میں اس سے بھی زیادہ تحقیق سے کام لیا ہے۔

"اہلِ عرب کا عقیدہ تھا کہ لیل و نہار اور سن و سال ہلاکت کا سبب ہیں۔ اس عالم میں دوسرا کوئی موثر نہیں۔ زمانہ کے ہاتھ میں موت و حیات ہے، جیسا کہ قطرب نے کہا ہے"

وما یهلکنا الا الموت

(ہمیں صرف موت ہلاک کرتی ہے)

اور ابی ذوئیب نے یہ شعر کہا ہے۔

امن المنون وریبها تتوجع

والدهر لیس بمعتب من یجزع

(زمانہ کی مصیبتوں نے مجھے لے لیا اور اس کے مصائب تکلیف دہ ہیں۔ زمانہ گھبرانے والے کو خوش کرنے والا نہیں ہے)

حضرت ابوہریرہ نے روایت بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

کان اهل الجاهلیة یقولون ما یهلکنا الا اللیل والنهار وهو الذی یهلکنا، یمیتنا فیسبون الدهر، قال الله تعالیٰ۔ یؤذینی ابن آدم یسب الدهر وانا الدهر بیدی الامر اقلب اللیل والنهار

(ترجمہ:۔ اہلِ جاہلیت کہتے تھے کہ ہمیں کوئی نہیں مارتا مگر رات اور دن اور وہی ہمیں ہلاک کرتے ہیں اور مارتے ہیں اور جلاتے ہیں۔ اس لیے زمانہ کو برا کہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا مجھے ابن آدم نے ایذا دی زمانہ کو برا کہتا ہے اور میں زمانہ ہوں۔ میرے ہاتھ میں حکم ہے میں رات اور دن کو تبدیل کرتا ہوں۔

یہ بخاری کی حدیث ہے، مسلم اور ابوداؤد نے بھی روایت کی ہے۔ اس قسم کی حدیث موطا میں بھی ہے۔ ان لوگوں کا اعتقاد تھا کہ زمانہ غافل ہے۔ لہٰذا جب مصیبت پڑتی یا اور کوئی خرابی آتی، تو اسے دہر کی طرف منسوب کرتے اور زمانہ کو برا کہتے۔ اس لیے ان سے کہا گیا، زمانہ کو بُرا نہ کہو"[3]

---

[1] قرآن! پارہ ۲۵ سورۃ الجاثیہ رکوع ۱۹۔ [2] تفسیر ابی السعود ج ۵ ص ۶۰) [3] تفسیر القرطبی ج ۱۶ ص ۱۷۱

عرب دیکھتے تھے، سب کو فنا ہے، لیکن شمس و قمر اور رات دن باقی ہیں، تو انہوں نے قیاس استقرائی سے کام لے کر نتیجہ نکالا کہ یہ رات دن ہی موت و حیات پر قادر ہیں اور انہیں کا نام دہر ہے۔

الم تر ان الدھر یوم ولیلۃ
وان الفتی یسعی لعاریۃ دائبا[1]

کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ دہر رات دن ہیں اور جوان پیٹ کے لیے کرتا ہے۔

اقول وفاضت بعینی عبرۃ
ارا الدھر یبقی والاخلاء تذھب

(میں کہتا ہوں اور میری آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔ میں دیکھتا ہوں، زمانہ کو بقا ہے اور دوست گزر رہے ہیں)

اخلای لو غیر الحمام اصابکم
عتبت ولکن ما علی الدھر متعب[1]

(اے میرے دوستو! اگر موت کے علاوہ تکلیف پہنچتی تو میں غصہ ہوتا۔ لیکن زمانہ پر تو عتاب نہیں ہو سکتا۔)

رائیت المنایا خبط عشواء من تصب
تمتہ ومن تخطی یعمر فیھرم[2]

(میں موت کو اندھی اونٹنی کی طرح دیکھتا ہوں، جو ملا اسے مار ڈالا اور جو بچا وہ بوڑھا ہو کر ہلاک ہوا۔)

اس سے بالکل ثابت ہوتا ہے کہ عرب کی عقل خیال اختراعی سے خالی تھی۔ یہ گمان ہو سکتا ہے کہ ان کے ادب میں وصف، تشبیہہ، مجاز وغیرہ کا بہت کافی استعمال ہے، جس میں قوت خیال صرف ہوتی ہے لیکن یہ واضح رہے کہ اہل عرب کی شاعری میں جس کی تقسیم خیال تصوری اور خیال اختراعی[3] میں سے صرف خیال تصوری کا استعمال ہوا ہے۔ عرب خیال تصوری میں ماہر ہیں اس میں اشیاء کا تصور سابقہ تجربات کی روشنی میں پیش کیا جاتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ اہل عرب کچھ مرئیات میں سے لیتے ہیں اور کچھ محسوسات میں سے اور ان دونوں سے مرکب بنا لیتے ہیں جس میں کوئی نئی چیز نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر طہٰ حسین نے اپنی کتاب "من حدیث الشعر والنثر" میں لکھا ہے کہ اہل عرب جاہلیت کی تشبیہات منظر میں اچھی اور صورت میں حسین ہوتی ہیں، لیکن تخیل کی ندرت نہیں ہوتی۔ اس لیے ان کی عقلیت مشاہدات اور محسوسات میں محصور رہی۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کی عادتوں اور محسوسات میں کوئی مثل اعلیٰ نہیں ہے زندگی میں عرب کی خاص نظر تھی زندگی کا مقصد تمام عرب کے نزدیک مشترک تھا اور امت کے تمام افراد میں جاری تھا۔ اگر حیات و خلو د مقصد نہ ہوتا، تو امرء القیس

---

[1] الدرۃ الفاخرہ لحمزۃ الاصفہانی نقل من الخزانۃ التیموریہ دارالکتب المصریہ۔ نسخہ قلمی استاذ عبدالعزیز المیمنی [2] لسان (عتب)

[3] سبعہ معلقہ زہیر [3] PRINCIPLE OF PSYCHOLOGY BY WILLIAM JAMES, P 44

یہ کیوں کہتا۔

فلو انما اسعی لادنی معیشت
کفانی ولم یطلب قلیلا من المال لی

(اگر میں معمولی زندگی کے لیے کوشش کرتا، تو مجھے کافی ہوتا اور میں تھوڑے مال کو طلب نہ کرتا)

ولکنما اسعی لمجد موثل
وقد یدرک المجد الموثل امثالی[1]

(لیکن میں مثالی بزرگی کے لیے کوشاں ہوں اور مثالی بزرگی مجھ جیسے حاصل کر لیتے ہیں)

یہ بات کہ غایت حیات یا مثل اعلیٰ اہلِ عرب کے نزدیک "خلود" ہے اور مادی بقا اور مادی دوام ہی ان کی طلب ہے، اس کے لیے اساطیر میں ہزاروں شہادتیں ملتی ہیں۔

بادشاہ ذوالقرنین کو آبِ حیات کی طلب ہوئی۔ یہ بھی اسی کی دلیل ہے[2]۔ عرب کے تصور میں حیات طبیعت سے خارج نہیں تھی اس لیے کہ طبیعت اور مادہ سے باہر ان کے نزدیک کوئی حقیقت نہیں تھی۔ اس لیے روح کو وہ خون خیال کرتے تھے اور یہی بنی اسرائیل کا بھی تصور تھا[3]۔

مسعودی نے لکھا ہے، بعض لوگ حیات کو خون سمجھتے تھے اور روح کو ہوا، جو جسم کے اندر ہے بعض کہتے تھے، نفس ایک پرندہ ہے، جو جسم انسانی میں موجود ہے۔ جب انسان مرجاتا ہے، تو وہ پرندہ اس کی قبر کا طواف کرتا ہے[4]۔

سیرت ابن ہشام کی روایت سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ انبیاء کے ذریعہ روح کی تعریف سے واقف تھے۔ لیکن عرب اس سے بالکل نابلد تھے[5]۔

بلوغ الارب میں بھی اسی قسم کی روایتیں اور اشعار درج ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جن، بھوت، چڑیل وغیرہ حیوانات ہیں۔ بھوت ایک حیوان نادر ہے[6]۔ چنانچہ عرب بعض افراد اور قبائل کو جن کی نسل سے سمجھتے تھے[7]۔

عرب نے اپنی مادہ پرست طبیعت اور دہری عقیدہ کی تسکین کے لیے دہر کے بت بھی بنا لیے تھے۔ منات اور عوض دہر ہی کے صنم تھے۔

ولو لا نبل عوض فی
خطبای و اوصالی

---

[1] عمدۃ الادب ج ۱ ص ۵۹۔ طبع دمشق [2] کتاب التیجان ص ۹۱

[3] RELIGION OF THE SEMITES, P.40 [4] مروج الذہب ص ۳۱۰

[5] سیرت ابن ہشام ص ۱۰۲ [6] عجائب المخلوقات ص ۲۰۴

[7] بلوغ الارب ج ۲ ص ۳۴۹

(اگر عوض کا تیر میرے دونوں جوڑ اور گھٹنوں میں نہ ہوتا۔)

لطاعنت صدود الخیــــل

طعناً لیس بالآلــــ[1]

(تو میں شہسواروں کے سینوں میں ایسا نیزہ مارتا جس میں ذرا سستی نہ ہوتی)

کلبی نے روایت کی ہے کہ بکر ابن وائل قبیلہ کا صنم عوض تھا[2] اور بعد بھی دہر کا صنم تھا۔

منات اہل لغت اس کے معنی قدر اور قوت کے لکھتے ہیں اور قدر بھی افکار عرب کا مرکز تھا۔ تصور جاہلیہ اسی محور کے گرد چکر لگاتے رہے ہیں شعراء نے اسے مختلف لقبوں سے پکارا۔ جیسے منون منیہ وغیرہ۔ منات قدید میں ایک صنم ہے اور قدید مکہ اور مدینہ کے درمیان ہے[3]

اوس و خزرج کے قبیلے منات کی پرستش کرتے ہیں اور ذبیحہ کرتے ہیں، اس کی منتیں مانتے ہیں اور اس پر تحفے چڑھاتے ہیں[4]

منات قدیم صنم ہے۔ اس کی عبادت حجاز میں ہوتی تھی۔ لیکن یہ وہیں کا صنم نہیں تھا بلکہ بابلی ادب سے پتا چلتا ہے کہ وہاں بھی یہ صنم تھا۔ یہ ان کا موت و حیات کا خدا تھا اور اس کا نام مامناتو (MAMNATN) تھا۔[5]

اسی طرح قدیم نبطی نقوش میں مناوات آیا ہے[6]

اس سے ثابت ہوا کہ عرب کا منات، بابل کا مامناتو اور نبطی نقوش کا مناوات ہے۔ فرق اتنا ہے کہ بابل میں یہ صنم (مرد) مذکر اور عرب میں (عورت) مونث ہے۔

اہل بابل اسے موت و قدر کا خدا مانتے تھے۔

OMAM-MITU THOU GOD OF FATE AND DEATH

THOU SPIRIT OF FIERCE HATE AND PARTING BREATH[7]

شہرستانی نے دہریوں پر جامع انداز میں لکھا ہے اور تمام بحث کو مدون کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں، کہ یہ فرقہ معطلہ کہلاتا ہے۔ اس کی کئی قسمیں تھیں۔ ایک گروہ وہ تھا، جس نے خالق کا انکار کیا۔ اسے دوبارہ زندہ ہونے اور آخرت سے انکار تھا۔ زندگی اور موت کو ترکیب و تحلیل پر موقوف سمجھتے تھے، چنانچہ طبیعت پیدا کرنے والی اور لیل و نہار ہلاکت کے

---

[1] حماسہ ج ۱ ص ۲۱۴

[2] ENCYCLOPEDIA OF RELIGION AND ETHICS (ARABS)

[3] کتاب الاصنام ص ۱۴

[4] سیرت ابن ہشام ص ۲۷۲

[5] BABYLONIAN LITERATURE, P. 93

[6] ENCYCLOPEDIA OF RELIGION AND ETHICS (ARABS)

[7] BABYLONIAN LITERATURE, P. 110

باعث ہیں[1]۔ انہیں کے عقیدہ کو قرآن شریف میں بیان کیا گیا ہے۔ وقالوا ما ھی الا حیاتنا ... الخ اور دوسری آیت بھی انہیں کے متعلق ہے۔ ائذا متنا وکنا ترابا وعظاما ائنا لمبعوثون او آباؤنا الاولون[2]

(جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیوں میں تبدیل ہو جائیں گے، تو کیا ہم پھر زندہ ہوں گے اور ہمارے آباؤ اجداد بھی؟)

یہ تو واضح ہو گیا، کہ عرب بالطبع دہری تھے۔ عام طور پر بت پرست تھے اور اللہ کے توحیدی تصور سے خالی تھے۔ اگر اللہ کا تصور تھا، تو وہ بہت مبہم تھا۔ زائد سے زائد یہ تھا کہ اللہ کو ان بتوں سے سب سے بڑا خدا تسلیم کر لیتے تھے۔ اوس بن حجر نے کہا ہے۔

وبا للات والعزی ومن دان دینھا وبا اللہ ان اللہ منھن اکبر[3]

(میں لات، اور عزیٰ کی قسم کھاتا ہوں اور اس کی جو اس کے دین پر چلا اور اللہ کی قسم کھاتا ہوں۔ بے شک اللہ ان میں سب سے بڑا ہے)

اور اس لیے جب اسلام نے ایک خدا کا تصور پیش کیا، تو وہ حیران رہ گئے اور سخت تعجب ہوا۔

اجعل الالھۃ الھا واحدا ان ھذا لشئ عجاب[4]۔

(کیا اس نے بہت خداؤں کو ایک خدا کر دیا، بے شک، یہ تو بہت ہی عجیب بات ہے)

بت پرستی یہ تو ظاہر ہے کہ عرب اللہ کے علاوہ دوسرے معبود مانتے اور ان کی پرستش کرتے تھے۔ یہ بت مختلف قسم کے تھے درخت، چشمے اور پتھر سب ان میں شامل ہیں۔ ان بتوں کے نام، ان کی تفصیل اور رسوم و رواج کا ذکر کلبی کی کتاب الاصنام میں درج ہے اور قرآن شریف سے بھی اس پر واضح روشنی پڑتی ہے لیکن یونان میں جس طرح دیوتاؤں کے اعمال اور ان کی فطرت کی تفصیل ملتی ہے، عرب میں ایسا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ جو کچھ تفصیل ملتی ہے، وہ شاعری اور ضرب المثلوں میں ملتی ہے[5]۔

عرب ان بتوں کو وسیلہ مانتے تھے اور کہتے تھے یہ ہماری سنتے ہیں، ہماری گواہی دیتے ہیں۔ وہ بتوں کی قسم کھاتے تھے۔ ان کے سامنے حلف اٹھاتے تھے اور ان کی عبادت کرتے تھے انہیں ہدیے دیتے تھے۔ عرب میں ہر قبیلہ کا الہ مخصوص تھا۔ جیسے رب قریش، رب ربیعہ، اور ان الہ میں حاکم و محکوم کا رشتہ بھی نہیں تھا بلکہ عرب کے تمام قبائل بلا امتیاز ان اصنام کو مانتے تھے[6]۔ ان کے

---

[1] الملل والنحل لالشہرستانی ج ۳ ص ۲۵۷

[2] حاشیہ الملل والنحل لالشہرستانی ج ۳ ص ۲۵۷ (الصفت آیت ۱۶)

[3] کتاب الاصنام ص ۱۷

[4] قرآن پارہ ۲۳، رکوع ۱۰

[5] ENCYCLOPEDIA OF ISLAM, VOL. I, P. 660

[6] کتاب الاصنام ص ۴۳۔

نام پر جانور آزاد کرتے تھے اور ان پر قربانی کرتے تھے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ جب کوئی جانور بوڑھا ہو جاتا تو وہ بت کے نام پر چھوڑ دیتے تھے چنانچہ بُت کے نام پر چھوڑے ہوئے بوڑھے اونٹ کو حام اور بت کے نام پر چھوڑی ہوئی اونٹنی کو بحیرہ کہتے تھے۔

ان بُت پرستوں کی کوئی مذہبی شریعت یا احکامات نہیں تھے، جو فرد کو سوسائٹی سے وابستہ کرتے ہوں یا فرد پر کچھ فرائض اور حقوق عائد کرتے ہوں۔ بلکہ افراد بتوں کو اپنی ضروریات کے لیے استعمال کرتے تھے[1]۔

عرب فطرتاً قدامت پرست تھے اور باپ دادا کے رسم و رواج پر بغیر سوچے عمل کرتے تھے۔ جیسا کہ قرآن میں ان کا مقولہ نقل ہوا ہے۔ انا وجدنا آبائنا علیٰ هٰذا[2] (ہم نے اپنے باپ دادا کو اس پر پایا ہے)

ان عربوں میں بدوی عرب اور بھی زیادہ سخت منکرِ خدا تھے۔ الاعراب اشد کفرا و نفاقا[3]۔

(عرب کفر و نفاق میں زیادہ سخت ہیں)

ان عربوں کے دل میں بتوں کی عزت بھی زیادہ نہیں تھی۔ بلکہ وہ ان کا مذاق بھی اڑاتے تھے اور ان سے انکار بھی کر دیتے تھے۔ اس کا اندازہ اس قصے سے ہوگا، جسے حتی (HITTI) نے بھی نقل کیا ہے۔

امرالقیس باپ کا انتقام لینے کے لیے روانہ ہوا، تو ذو الخلصہ کے مندر میں ٹھہرا تاکہ ازلام سے فال نکلوائے۔ تینوں دفعہ فال نکلی کہ ارادہ چھوڑ دو۔ تو اس نے ٹوٹے ہوئے تیر دیوتا پر کھینچ مارے اور چلا یا۔ ملعون اگر تیرا باپ مارا گیا ہوتا، تو پھر تو مجھے انتقام لینے سے ہرگز منع نہ کرتا[4]۔

اس کا سراغ لگانا بہت مشکل ہے، کہ عرب میں کب سے بت پرستی جاری تھی، لیکن اس کی قدامت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ان کی بت پرستی بہت قدیم ہے۔ جب اسلام آیا ہے تو اس وقت خانہ کعبہ میں ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ ہر قبیلہ کا علیحدہ بت تھا لیکن عرب تو بتوں کیلئے لڑتے تھے نہ بتوں کے سلسلہ میں اختلافات کا کہیں سراغ ملتا ہے یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جو مشرکانہ عقاید ایک مدت سے رائج تھے، وہ اب ایسے فرسودہ ہو چکے تھے کہ لوگوں کے مذہبی تقاضوں کی سیری نہیں ہوتی تھی، بلکہ موسیو ریناں کا یہ نتیجہ بالکل درست ہے کہ جس طرح سے رومی شہنشاہوں کے وقت میں قدیم دیوتاؤں سے نفرت پیدا ہو چلی تھی، اسی طرح عربستان میں بھی اس قسم کی نفرت ظاہر ہو چکی تھی۔ پرانے اعتقادات کی عزت اور پرانے بتوں کی عزت جا چکی تھی۔ یہ پرانے اعتقادات بہت پرانے ہو چکے تھے اور دیوتاؤں میں کچھ دم نہیں رہا تھا[5]۔

توحید بے شک عرب میں دو چار آدمی موحد بھی گزرے ہیں، جیسے ورقہ ابن نوفل، عثمان بن حویرث، عبداللہ بن جحش

---

[1] THE HISTORIANS' HISTORY OF THE WORLD, VOL. VII P. 292

[2] قرآن شریف

[3] قرآن شریف (التوبہ - ۹۷)

[4] آغانی ج ۸ ص ۷۰

[5] تمدن عرب ص ۹۰

وغیرہ، لیکن یہ اس قسم کے موحد تھے جنہوں نے بتوں کے آگے نہیں جھکایا اور ان کی عقل سلیم نے خالق حقیقی کو تلاش کرنا چاہا مگر وہ اس کی معرفت اور اس کی صفات کا ادراک نہ کر سکے۔ پھر یہ کہ ایسے لوگوں کا وجود شاذ و نادر تھا اور الشاذ کالمعدوم (نادر نایاب کے برابر ہے۔ ایک موحد زید بن عمرو بن نفیل نے کہا ہے۔

أربًا واحدًا او الف رب
أدین اذا تقسمت الامور[1]

(کیا ایک رب ہے یا ہزار رب۔ میں اس وقت مانوں جب کاموں کی تقسیم ہونے لگے)

ڈاکٹر طہٰ حسین کی تحقیق یہ ہے کہ ان لوگوں کے نام پر جو شعر اور روایتیں منسوب ہیں، حقیقت میں وہ مسلمانوں نے بعد میں گھڑے ہیں، محض اس لیے کہ عربی ممالک میں اسلام کی سابقیت اور فوقیت ثابت کی جائے اور انگریز مستشرقین اس لیے ان کو مان لیتے ہیں، تاکہ عربی ماخذوں سے یہ ثابت کیا جائے کہ قرآن ایک طرف یہودیت اور دوسری طرف عیسائیت سے نیز ان دیگر درمیانی مذاہب سے جو عربی ممالک یا اس کے قرب و جوار میں پھیلے ہوئے تھے، متاثر ہوا ہے۔ حالانکہ تھوڑی سی تحقیق سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ اشعار گھڑے ہوئے ہیں۔[2]

عرب میں یہودیت و نصرانیت

عرب میں کچھ یہودی اور نصرانی بھی موجود تھے، جنہیں عربوں نے ہمیشہ اپنا غیر سمجھا۔ عرب کے یہود و نصاریٰ میں حلول تثلیث اور نسلی خدا کی صفات تھیں ان بھٹکے ہوئے یہود و نصاریٰ کی بات پرتھی کو عربوں نے تسلیم کیا لیکن اگر ان میں توحید کا کچھ اثر تھا بھی، تو اسے عربوں نے نہیں سمجھا، نہ اس سے اثر لیا۔

اکثر یورپین مورخین بھی اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ "عرب میں یا اس سے متصل جو یہودی اور نصاریٰ اس وقت آباد تھے، ان کی دینی حالت بالکل تباہ تھی اور ان کے پاس خود شریعت کا کوئی علم نہیں رہا تھا۔ اس وقت کے عرب تمام بت پرست تھے اور ان پر مذاہب کا کچھ اثر نہیں تھا۔"[3]

عیسائی، ربیع غسان اور حیرہ میں آباد تھے۔ انہوں نے وہ عقائد اختیار کئے تھے جو مقامی حلولی اعتقاد فرقہ مونوفیری (MONOPHYSITE) سے مطابقت رکھتے تھے۔[4]

حیرہ (عراق) ایرانی عرب کا صدر مقام تھا۔ کوفہ سے تقریباً تین میل دور یہاں کچھ نسطوری فرقہ کے عیسائی تھے جنہیں عباد یعنی حضرت مسیحؑ کی پرستش کرنے والا کہتے تھے۔[5]

---

[1] آغانی ج ۳ ص ۱۲۵

[2] الادب الجاہلی باب المذہب والالحاق

[3] THE HISTORIANS' HISTORY OF THE WORLD, VOL. VIII, P. 10

[4] THE HISTORY OF THE ARABS BY HITTI, P. 78

[5] طبری ج ۱ ص ۷۷۰

یہودی بنو نضیر اور بنو قضاعہ مدینہ کے دو قبیلے تھے جن کا پیشہ زراعت، تجارت اور سُود پر روپیہ دینا تھا۔ عرب انہیں غیر شمار کرتے تھے۔ ان سے ان کی رشتہ داریاں نہیں تھیں۔ یہ قبیلے آپس میں حلیف ہو کر رہتے تھے۔ اسی لیے عربوں میں ان کے نسب کا سلسلہ موجود نہیں ہے۔

بہرکیف اس زمانے کے یہود و نصاریٰ خاص طور پر عرب کے اہل کتاب بھی بت پرستوں سے کم نہیں تھے اللہ کا نام تو ضرور لیتے تھے، لیکن کہیں اللہ نسلی تھا اور کہیں انسانی شکل میں، جیسا کہ ان کے لیے قرآن مجید میں مذکور ہے۔

وقالت الیھود عزیر ابن اللہ وقالت النصاری المسیح ابن اللہ ۔ (التوبہ۔ ۳۰)

(یہود نے کہا عزیر خدا کا بیٹا ہے اور نصاریٰ نے کہا مسیح خدا کا بیٹا ہے)

ذالک قولھم بافواھم یضاھئون قول الذین کفروا من قبل[1]

(یہ ان کے صرف زبانی دعوے تھے۔ یہ اگلے کافروں کی بات کی نقل اتارتے ہیں)

موسیو یبنان نے لکھا ہے کہ روم، یونان اور ایشیا کی حالت اسلام سے پہلے ایک لفظ میں بیان کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ان کا متخیلہ سوچکا تھا، قومی دیوتاؤں کی پرستش کا کوئی اثر باقی نہیں رہا تھا۔ ایک خالص اور محض نفسی خود غرضی رہ گئی تھی[2]

عرب کا قانون

عرب میں چونکہ کوئی ریاست یا بادشاہت نہیں تھی، نہ کوئی باقاعدہ حکومت قائم تھی، اس لیے وہاں کوئی قانون بھی نہیں تھا۔ نہ کوئی افسر، نہ ماتحت، نہ کوئی بالادست طاقت تھی۔ قبیلہ کا سردار طاقتور خاندان والا شخص ہوتا تھا۔ لیکن وہ بھی طاقت کے بل پر اپنی بات منوا سکتا تھا، ورنہ قبیلہ سردار کا ماتحت نہیں ہوتا تھا۔ قبیلہ کا ہر خاندان اپنی جگہ آزاد تھا اور خاندان کا ہر فرد اپنی جگہ خود مختار تھا۔

فرد کو دوسرے فرد سے خون کے رشتے کے علاوہ کوئی چیز وابستہ نہیں کرتی تھی۔ البتہ ضرورت پر کام آنے کے لیے معاہدے اور حلف ہوتے تھے اور پڑوس کا حق اور بھائی چارہ بھی ہوتا تھا جس کے ذریعے فرد قوت بڑھاتا تھا اور اس طرح خاندان بھی طاقت بڑھاتا تھا۔ گویا سیاسی تعلقات اخلاق پر مبنی تھے اور اخلاق قبیلہ سے وابستہ تھے۔

ان کے ہاں سب سے بڑی چیز خون کا بدلہ تھا۔ خون کا بدلہ خون سے لیتے تھے۔ لیکن اگر بدلہ لینے کے قابل نہ رہتے اور کمزور ہو جاتے، تو خون بہا لیتے۔ لیکن یہ خاندان کے افراد لیتے تھے۔ فرد کا فرد سے تعلق تھا۔ دوسرے مذاہب مثلاً یہودی اس کو خدا کا گناہ مانتے تھے۔ لہٰذا یہ مذہبی فریضہ تھا۔ اس قسم کا کوئی تصور عرب میں نہیں تھا[3]

---

[1] قرآن :- پارہ ۱۰، رکوع ۱۱

[2] تمدن عرب ۱۲۹

[3] THE HISTORIANS HISTORY OF THE WORLD VOL. VIII CHAP. XI.

فرد، اس کا خاندان اور قبیلہ علی الترتیب خون کا بدلہ لینے میں وابستہ تھے دوسرے جرائم میں وہ مال قبول کر لیتے تھے۔ یہ بدلہ بھیڑ، بکری، اونٹ کی صورت میں ہوتا تھا۔

باپ کے مرنے کے بعد بیٹا سوتیلی ماں کو ورثہ میں پاتا تھا۔ لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ چوری، ڈکیتی اور قتل کرکے مال لوٹنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔

عرب میں مساوات تھی۔ ایک معمولی فرد قبیلہ کے شیخ سے مساویانہ گفتگو کرتا تھا ان میں کبھی ملک کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ ان کی اس مساوات نے حضرت عمرؓ کے الفاظ میں اسلام کے لیے کچا مسالہ فراہم کیا۔[1]

عرب کا فلسفۂ اخلاق

جب عرب میں کوئی مذہب اور قانون نہیں تھا، تو وہ کون سا اصول تھا جس کی روشنی میں وہ زندگی بسر کرتے تھے اور جس کے لیے ان کا مرنا اور جینا تھا اور جس اصول کے گرد ان کے قبیلہ، خاندان اور فرد کی زندگی گردش کرتی تھی؟ یہ اصول عرض (بہ کسر عین) یا عزت ہے۔ یہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلامؒ کے سپلیمنٹ میں بھی عرض پر جو بحث ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ عرض کی تقسیم تین حصوں میں کی جاسکتی ہے ــــ قبیلہ، خاندان اور فرد ــــ قبیلہ میں شاعر، خطیب، اور کمزور، خاندان اور فرد میں جوانی، بغاوت، شجاعت، حریت، بیوی کی عفت، آزادی، وعدے کا لحاظ کرنا، آزاد عورت کی آزادی، حسب کی حفاظت، مہمان نوازی شامل ہے۔ لیکن یہ تمام صفات کبھی قبیلہ اور فرد سے اور کبھی خاندان اور فرد سے اور کبھی قبیلہ، خاندان اور فرد سے وابستہ ہو جاتی ہیں۔ یعنی قبیلہ یا خاندان کی عزت فرد کی عزت ہو جاتی ہے۔ یا فرد کی عزت قبیلہ یا خاندان کی عزت ہو جاتی ہے۔

طاقت اور قوت سے جو صفات وابستہ ہیں، وہ عرض ہیں۔ ان پر فخر کیا جاتا ہے اور کمزوری سے جو صفات متعلق ہیں وہ ذلت ہیں۔ ان سے منافرت اور دوری ہوتی ہے۔

عرض سماجی اور جماعتی کام ہے۔ قدیم عرب میں مذہب کمزور تھا بلکہ مذہب نہ تھا ہی نہیں۔ نہ اس پر عمل ہوتا تھا۔ اس کی جگہ عرض نے لے لی تھی۔ عرض کا اصول ان پر چھایا ہوا تھا اور یہ فوری اثر کرنے والا اور جذبات ابھارنے والا تھا۔ ان کی زندگی کے لیے یہی شمع ہدایت تھی۔ اور یہی نصب العین تھا۔ ان کے کردار اور اعمال اسی سے وابستہ تھے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ عرض نے عرب میں دین کی جگہ لے لی تھی۔[2]

عرض پر فخر کرنے کے لیے مقابلے ہوتے تھے اور اس کے جوش اور معاشرت میں اسے زندہ رکھنے کے لیے میلوں میں جلسے ہوتے تھے اور اس پر فخر کیا جاتا تھا۔ عرض کا عرب میں سب سے اونچا مقام تھا۔ اور اس کی حفاظت کے لیے وہ ہتھیار اٹھاتے تھے۔ اس کی مثال کے لیے تاریخ عرب کا سب سے مشہور واقعہ کافی ہے، جسے ہر مورخ نے نقل کیا ہے۔

---

[1] طبقات الکبیر ابن سعد، ج ۳ ح ۱ ص ۲۴۶ لیدن ۱۹۰۴ء

[2] ENCYCLOPEDIA OF ISLAM, SUPPLEMENT, P. 96.

لخمی خاندان کے مشہور بادشاہ مندر سوم کے بعد اس کا بیٹا عمر (ابن ہند) تخت پر بیٹھا تو اس کے دربار میں عرب کے سات مشہور ترین شاعروں میں سے تین موجود تھے (طرفہ، عمر ابن کلثوم اور حارث ابن ہند نے لوگوں سے دریافت کیا، مجھ سے بڑا عزت والا بھی کوئی موجود ہے؟ لوگوں نے کہا، عمر ابن کلثوم ہے۔ قبیلہ کی مفاخرت میں لمبی نظم کہی، جو سبعہ معلقہ (SEVEN GOLDEN ODES) میں ہے اور بادشاہ کو قتل کر دیا۔[1]

اس غرض میں حسب کی حفاظت شامل ہے اور اس کی وجہ سے عرب میں علم نسب نے اتنی ترقی کی کہ اس کے ذریعہ ہم تک عرب کی مختصر انسائیکلوپیڈیا پہنچ گئی۔ بقول ابن خلدون، خاندان کے حالات حسب و نسب کا سلسلہ، نسلی تاریخ زبانی یاد رکھنے اور شاعری میں استعمال کرنے کا طریقہ صرف عرب ہی میں تھا۔ چنانچہ شعرائے عرب نے اس حصہ کو مرتب کرنے کے لیے زبردست مواد بہم پہنچایا ہے۔

مشہور شاعر جریر قریش اور بنو تمیم کی تعریف میں کہتا ہے۔

فما ولد باکرم من قریش
ولا خال باکرم من تمیم

(کوئی فرزند دنیا میں قریش سے بڑھ کر نہیں ہے اور نہ کوئی ماموں تمیم سے زیادہ عزت دار ہے)

اس علم کے ذریعہ ہم تک عرب کے بڑے بڑے حاکموں، حکموں، عقلاء، شعراء، مشاہیر مرد اور عورتوں کا حال اور نام پہنچ گئے ہیں۔

ابو المنذر ہشام ابن عمر کلبی کی کتاب "جمہرۃ" علم نسب کی بہترین کتاب ہے۔

---

[1] طبری ج ۲ ص ۱۸۸۲۔ یاقوت ج ۳ ص ۷۰۹۔

عہدِ جاہلیت میں عربوں کے مذہبی معتقدات

عبد الحمید صدیقی

دنیا کا کوئی نظامِ حیات نہ خلا میں پیدا ہوتا ہے اور نہ خلا میں پروان چڑھتا ہے بلکہ ہر نظام ایک خاص ماحول میں جنم لیتا ہے اور رائج الوقت نظام سے نبرد آزما ہو کر آگے بڑھتا ہے۔ اس لیے ہر نئے نظام کی رُوح، اس کے اساسی تصورات اور اس کے عملی تقاضوں کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم سب سے پہلے اس ماحول کو سمجھنے کی کوشش کریں، جس میں وُہ نظامِ حیات معرضِ وجود میں آیا ہے۔ یہی فطری اصول ہمیں اسلام کے معاملے میں بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ آپ اگر قرآن مجید کی تصریحات اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی انقلاب انگیز تعلیمات کے مضمرات کو پوری طرح جاننا چاہتے ہیں تو اس کے لیے یہ بالکل ناگزیر ہے کہ ہم سب سے پہلے اس پس منظر کو ذہن نشین کریں، جس میں اللہ تعالیٰ کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا۔ اس مضمون میں ہم عربوں کے صرف مذہبی معتقدات پر بحث کریں گے۔

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مثبت طور پر جس عقیدے پر سب سے زیادہ زور دیا ہے وُہ توحید ہے اور جس باطل خیال کا پوری شدت کے ساتھ ابطال کیا ہے وہ شرک ہے۔ عربوں کے اندر یوں تو شرک کی کوئی قسم ایسی نہ تھی جو موجود نہ ہو مگر اس میں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت بُت پرستی کو حاصل تھی۔ اس لیے ہم سب سے پہلے قدیم عربوں کی بت پرستی کا ہی جائزہ لیتے ہیں۔

عرب میں بُت پرستی کا آغاز

عرب میں بت پرستی[1] کا آغاز خانہ کعبہ کی عقیدت کے پاکیزہ جذبہ سے شروع ہُوا۔ جو شخص بھی مکہ سے عارضی یا مستقل طور پر جُدا ہوتا، وہ حرم کے مقدس پتھروں میں سے ایک آدھ پتھر عقیدت کے طور پر اپنے ساتھ لے جاتا۔ منزلِ مقصود پر پہنچ کر وُہ اسے ایک خاص مقام پر نصب کر لیتا اور اس کے گرد اسی طرح طواف کرتا، جس طرح کہ قیامِ مکہ کے دنوں میں وہ خانہ کعبہ کے گرد طواف کیا کرتا تھا۔ وہ اس پتھر سے حرم کے تعلق کی بنا پر خیر و برکت کا طالب ہوتا اور اس کے ساتھ اسی محبت اور وابستگی کا اظہار کرتا، جو ایک نیک اور خدا ترس انسان اللہ کے مقدس گھر سے کرتا ہے۔

سب سے پہلے جس شخص نے عرب میں دینِ ابراہیمؑ کو مسخ کر کے بت پرستی کا آغاز کیا، وہ قبیلہ خزاعہ کا سردار عمرو بن ربیعہ لحی بن حارثہ بن عمرو بن عامر الازدی تھا۔ کعبہ کی تولیت پہلے الحارث کے سپرد تھی مگر جب عمرو بن لحی مکہ میں قیام پذیر ہوا تو اس نے حارث کے حقِ تولیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور اپنی اولاد کی مدد سے حارث اور اس کے خاندان کو اس قابلِ رشک عہدہ سے محروم کر کے خود اس پر قابض ہو گیا۔[2]

---

[1] اس موضوع کے لیے ہم نے زیادہ تر مواد ابی المنذر ہشام بن محمد بن السائب الکلبی کی شہرہ آفاق تصنیف "کتاب الاصنام" سے لیا ہے۔

[2] کتاب الاصنام صہ

اس انقلاب کے بعد عمرو بن لحی پر اچانک بیماری کا حملہ ہوا اور اس بیماری نے بڑی سرعت کے ساتھ شدت اختیار کی۔ موت و حیات کی اس کشمکش میں کسی حکیم و دانا نے اسے بتایا کہ شام میں البلقا کے مقام پر گرم پانی کا ایک چشمہ موجود ہے۔ اگر وہ وہاں پہنچ کر اس کے پانی سے غسل کرے، تو وہ جلد صحت یاب ہو جائے گا۔ اس نے اس مشورے کو پوری خوشدلی سے قبول کیا اور البلقا کے لیے رخت سفر باندھا قدرت کو اس کی صحت منظور تھی۔ چنانچہ اس نے جب اس چشمے کے پانی سے غسل کیا تو جلد شفایاب ہو گیا۔

صحت بحال ہو جانے کے بعد اس نے کچھ دنوں کے لیے وہاں مزید قیام کیا تاکہ اس کی قوت و توانائی معمول پر آ جائے اور وہ آسانی کے ساتھ سفر کے مصائب اور صعوبتوں کو برداشت کر سکے۔ اس عرصۂ قیام میں اس نے دیکھا کہ وہاں کے باشندے بتوں کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں اور ان کے حضور سر نیاز خم کر کے دعائیں مانگتے ہیں۔ اس قسم کی حرکات و سکنات سے وہ پہلے قطعاً ناآشنا تھا۔ اس کے دل میں فطری طور پر یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ ان کے بارے میں اُن سے استفسار کرے۔ جستجو کرنے پر اسے بتایا گیا کہ یہ ان کے معبود ہیں، جن کی طرف وہ بارش اور دشمنوں پر فتح حاصل کرنے کے لیے رجوع کرتے ہیں۔ عمرو بن لحی نے ان سے درخواست کی کہ پتھر کے کچھ معبود اسے بھی دے دیے جائیں۔ چنانچہ بلقا کے باشندوں نے اس کے اس مطالبہ کے احترام میں چند بت اس کی خدمت میں بطور نذرانہ پیش کر دیے۔ یہ شخص پتھر کی ان مورتیوں کو لے کر مکہ واپس چلا آیا اور انھیں خانہ کعبہ کے ارد گرد رکھ دیا۔[1]

اسی سلسلہ میں ابن عباس سے جو روایت منقول ہے، وہ یہ ہے کہ قبیلۂ جُرہم سے تعلق رکھنے والے ایک شخص اساف اور ایک عورت نائلہ کے درمیان سرزمین یمن میں معاشقہ شروع ہوا۔ حج کے موسم میں یہ دونوں خانہ کعبہ کی زیارت کے لیے مکہ روانہ ہوئے جب وہ اللہ کے مقدس گھر میں داخل ہوئے تو اتفاق سے اس وقت وہاں ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا شخص موجود نہ تھا۔ سفلی جذبات سے مغلوب ہو کر انہوں نے منہ کالا کیا۔ اس ذلیل اور مذموم حرکت کی وجہ سے ان پر اللہ تعالیٰ کی پھٹکار پڑی اور وہ بے جان پتھروں میں تبدیل کر دیے گئے۔ لیکن عربوں کی "ذہانت" کی داد دیجیے کہ انہوں نے ان سے عبرت پکڑنے کے بجائے ان کی پرستش شروع کر دی۔ خزاعہ اور قریش کے قبائل اس معاملے میں پیش پیش تھے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اولادِ اسمٰعیلؑ میں سے پہلا شخص جس نے بت پرستی کی رسم کو رواج دیا اور لوگوں کو اپنی اولاد کے نام بتوں کے ناموں پر رکھنے کی تلقین کی اور اس طرح اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ دین میں تحریف کا مرتکب ہوا۔ وہ ہذیل بن مدرکہ تھا۔

عرب کے مشہور بُت اور بُت کدے

ذیل میں ہم عرب کے مشہور بُتوں اور بت کدوں کے نام اور ان کے مختصر حالات درج کرتے ہیں:

قبیلۂ ہذیل سُواع کا پرستار تھا اور اس بت کو اہل قبیلہ نے مدینہ کے ایک گاؤں ینبع کے نزدیک "برھاط" کے مقام پر نصب کر رکھا تھا۔ اس صنم خانہ کی تولیت بنو لحیان کے سپرد تھی۔

قبیلۂ کلب کے لوگ وَدّ کے سامنے اظہارِ عبودیت کرتے تھے۔

---

[1] کتاب الاصنام ص ۸

اسی طرح عرب کے دو مشہور قبائل مَذحج اور اہلِ جُرَش یغوث سے وابستہ تھے۔ ان بتوں سے ان قبائل کی عقیدت کا اظہار بعض اشعار سے بھی ہوتا ہے۔ مثلاً:

حَیَّاكَ وَدٌّ فَإِنَّا لَا یَحِلُّ لَنَا

لهوالنسا وان الدین قد عزمنا

"اے وَدّ! تمہیں حیاتِ جاوداں نصیب ہو۔ ہمارے لیے یہ جائز نہیں کہ ہم عورتوں کے ساتھ دل بہلائیں۔ ہمارا دین پختہ اور مضبوط ہے۔"

قبیلہ خیوان کے لوگ یعوق کے حضور میں سرِ تسلیم خم کرتے تھے۔ ابن کلبی کے قول کے مطابق اسے کسی ایسے قبیلے کا ذکر نہیں ملتا، جس کے افراد نے اپنے نام اس بُت کے نام پر رکھے ہوں۔ اسی طرح اس بُت کا تذکرہ شعراء کے کلام میں بھی ناپید ہے۔ اس کی وجہ ابن کلبی کے نزدیک یہ ہے کہ خیوان، ہمدان اور اسی طرح کے دوسرے قبائل چونکہ صنعاء کے نزدیک آباد تھے اور حمیر سے اختلاط کی وجہ سے انہوں نے یا تو یہودیت کو قبول کر لیا تھا یا اس سے کافی متاثر تھے۔ اس لیے انہیں اس بت سے کوئی گہری وابستگی باقی نہ رہی تھی۔ یہ سرد مہری ہمیں قبیلہ حمیر کے افراد میں ان کے بت "نسر" کے بارے میں بھی دکھائی دیتی ہے اور اس کی وجہ بھی وہی ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ یہ قبیلہ تُبّع کے عہدِ حکومت میں بت پرستی کو ترک کر کے دینِ موسوی میں داخل ہو گیا تھا۔

دینِ موسوی میں داخلے سے قبل حمیر نے صنعاء کے مقام پر ایک صنم کدہ تعمیر کر رکھا تھا جو ریام کے نام سے اہلِ عرب میں مشہور تھا۔ لوگ اس کی بڑی تعظیم و توقیر کرتے۔ یہاں آکر نذرانے چڑھاتے اور بتوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جانوروں کی قربانیاں دیتے تھے۔

یہ صنم کدہ مکر و فریب کی آماجگاہ تھا، جس میں سادہ لوح عوام کو ان کی ضعیف الاعتقادی سے فائدہ اٹھا کر مختلف قسم کے فریب دیے جاتے تھے۔ ایک روایت کے مطابق جب تبع عراق کی مہم میں کامیاب ہو کر اپنے مستقر پر واپس آیا، تو اس نے دو مذہبی رہنماؤں کی مدد سے اس بُت خانہ کو نیست و نابود کروا دیا۔ اس لیے قدیم عرب شاعری میں ریام اور نسر کا کہیں نام و نشان نہیں ملتا۔

یہ پانچ بُت یعنی وَدّ، سُواع، یغوث، یعوق اور نسر، جن کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں کیا گیا ہے، قومِ نوح کے نہایت معظم و محترم اصنام تھے۔ ان سے اسے گہری وابستگی تھی اور وہ اپنے جذبۂ عبودیت کی تسکین کے لیے زیادہ تر انھی کی طرف رجوع کرتی تھی قرآن مجید میں ان بتوں کی پرستش کا ذکر یوں کیا گیا ہے:

قَالَ نُوحٌ رَّبِّ إِنَّهُمْ عَصَوْنِي وَاتَّبَعُوا	نوح نے کہا اے میرے پروردگار! ان لوگوں نے
— — — — — — — — —	میری نافرمانی کی اور ان کی پیروی کی، جن کے مال
— — — — — — — — —	اور اولاد نے انہیں سوائے نقصان کے اور کچھ نہ دیا
— — — — — — — — —	اور جنھوں نے بڑی بڑی تدبیریں کیں اور جنھوں نے
— — — — — — — — —	کہا کہ تم اپنے معبودوں یعنی وَدّ، سُواع، یغوث،

— — — — — — — — — — يعوق اور نسر سے کبھی منہ نہ موڑنا ۔ ان لوگوں نے
— — — — — — — — — — بہتوں کو گمراہ کر دیا ۔

وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا ۔ (نوح ۔ ۲۱ ۔ ۲۴)

یہ پانچوں بُت یعنی ودّ ، سواع ، یغوث ، یعوق اور نسر عمرو بن لحی کی وساطت سے عربوں میں مقبول ہُوئے ۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے ، تو معلوم ہوگا کہ یہ اصنام غیر ملکی تھے جنھیں باہر سے پرستش کے لیے درآمد کیا گیا تھا ۔

عربوں کی قومی بت پرستی عربوں کے قومی بتوں میں مناۃ کی شہرت بہت زیادہ ہے ۔ وہ نہ صرف اس بُت کی پُورے جذبۂ عبودیت کے ساتھ پرستش کرتے بلکہ عقیدت اور احترام کی وجہ سے اپنی اولاد کو ایسے ناموں سے پکارتے ، جو ہر لحاظ سے ان کی اس بت کے ساتھ گہری وابستگی کے آئینہ دار ہوتے تھے ۔ عربی ادب میں ہمیں اس قسم کے کئی نام ملتے ہیں ، جن میں عبد مناۃ اور زید مناۃ خاص طور پر مشہور و معروف ہیں ۔ یہ بُت مکہ اور مدینہ کے درمیان مشلّل کے قریب قُدید کے مقام پر رکھا ہوا تھا ۔

اس بُت کی تقریب قریب سارے عرب قبائل میں پرستش ہوتی تھی اور اس کی خوشنودی کے حصول اور اس کی ناراضگی سے بچنے کے لیے عرب جانوروں کی قربانیاں دیا کرتے تھے ۔ مگر اس معاملے میں اوس اور خزرج سب پر سبقت لے گئے تھے ۔ ابن کلبی ، عمار بن یاسر کا ، جو اوس اور خزرج کے حالات کے متعلق سب سے زیادہ اور مستند معلومات رکھتے تھے ، ایک قول نقل کرتے ہیں ، جس سے ان قبائل کی مناۃ کے ساتھ غیر معمولی وابستگی کا پتا چلتا ہے :

> " یہ لوگ جب حج کی غرض سے دُوسرے حجّاج کے ساتھ روانہ ہوتے تو وہ تمام ان مقامات پر ٹھہرتے ، جن پر کہ عرب عام طور پر قیام کیا کرتے تھے اور وہ ساری رسوم ادا کرتے ، جو اس وقت رائج تھیں ، لیکن وُہ اپنے سروں کو منڈانے سے اجتناب کرتے ۔ واپسی پر جب وہ اس مقام پر پہنچتے ، جہاں مناۃ کا بُت نصب تھا ، تو وہاں کچھ وقفہ کے لیے قیام بھی کرتے اور اپنے سر بھی منڈاتے ، کیونکہ ان کے نزدیک مناۃ کی زیارت بھی حج کا ایک نہایت ضروری حصّہ تھا ، اور جب تک اس رکن کو پوری طرح ادا نہ کیا جائے ، اس وقت تک ان کی نظر میں حج کی تکمیل نہ ہوتی تھی ۔"

اس بُت اور اس سے عربوں کی غیر معمولی عقیدت اور وابستگی کا ذکر قرآن مجید میں یُوں آتا ہے :

اَفَرَاَيْتُمُ اللّٰتَ وَ الْعُزّٰى وَ مَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ۔ (النجم ۔ رکوع ۱)	کیا تم نے لات اور عزّٰی اور تیسرے منات کے حال میں غور نہیں کیا ہے ؟ کیا تمہارے لیے تو بیٹے ہوں اور خدا کے لیے بیٹیاں ۔ اس اعتبار سے تو یہ بڑی بے ڈھنگی تقسیم ہے ۔

عربوں کے ہاں مناۃ کی عرصہ دراز تک تعظیم و تکریم ہوتی رہی یہاں تک کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سنہ آٹھ ہجری میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ذریعہ اسے یکسر مسمار کروا دیا۔ اس مہم میں مسلمانوں کو کافی مال و اسباب ملا، جس میں وہ دو تلواریں بھی شامل تھیں جو شاہ غسان حارث بن ابی شمر نے مناۃ کے حضور میں بطور نذرانہ پیش کی تھیں۔ ان میں سے ایک تلوار کا نام "مخذم" اور دوسری کا "رسوب" تھا۔ ان تلواروں کا ذکر علقمہ نے ایک شعر میں اس انداز میں کیا ہے: ؎

مظاهر سربالی حديد عليهما
عقيلاً سيوفٍ : مخذمٌ و رسوب

"زرہ بکتر پہننے کے ساتھ ساتھ اس نے دو مرصع تلواریں بھی یعنی مخذم اور رسوب بھی سجا رکھی تھیں۔"

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دونوں تلواریں حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو عطا فرمائیں۔ بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ انہی میں سے ایک تلوار کو حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذوالفقار کے نام سے موسوم فرمایا تھا۔

لیکن اسی سلسلہ میں ایک دُوسرا قول یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جب حضورؐ نے "فلس" کی مہم پر روانہ کیا تو اس وقت طئی کے صنم کدے سے یہ تلواریں امیر المومنین کے ہاتھ آئیں۔

مناۃ کے علاوہ عربوں کا دوسرا واجب التعظیم بت اللات تھا، جس نے طائف کی سرزمین میں کفر و شرک کی ظلمتیں پھیلا رکھی تھیں۔ اس صنم کدے کی تولیت ثقیف والوں کے سپرد تھی جن میں عتاب بن مالک کا خاندان سب سے نمایاں تھا۔ لات کا بُت بھی مناۃ کی طرح عرب کے سارے قبائل میں معظم اور مکرم تھا اور لوگ خیر و برکت کے حصول اور آسمانی اور ارضی آفات سے بچنے کے لیے اپنی اولاد کے نام اس بُت کے نام پر رکھتے تھے۔ اسلام سے قبل کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ "زید اللات" اور "تیم اللات" زبان زد عام تھے۔

طائف کے میدان میں جو مسجد آج موجود ہے، اس کے بائیں مینار کے بالکل ساتھ ہی یہ بت کبھی نصب تھا۔

عرب کی جاہلی شاعری میں ہمیں بے شمار مقامات پر اس بت اور اس سے لوگوں کی عقیدت و محبت کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً عمرو بن الجُعَید نے اپنے ایک شعر میں لات کا ذکر یُوں کیا ہے:

فَإِنِّيْ و تَرْكِيْ وَصْلَ كَأْسٍ لَكَالَّذِي
تبرّأ من لاتٍ و كان يدينها

"میرا ترکِ شراب بلاشُبہ اس شخص کی مانند ہے، جو لات سے بیزاری کا اظہار کرے، درآنحالیکہ وہ اسے اپنا دین و ایمان سمجھتا تھا۔"

لات کا بُت ایک مدّت دراز تک عربوں خصوصاً اہلِ طائف کی عقیدت کا مرکز و محور رہا۔ پھر جب ۹ ہجری میں بنو ثقیف نے اسلام قبول کر لیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مغیرہ بن شعبہ کو اس صنم کدے کے انہدام کے لیے بھیجا، چنانچہ انھوں نے اسے منہدم کر دیا۔

جس وقت شرک اور بُت پرستی کے اس مرکز کا استیصال کیا جا رہا تھا، اُس وقت شدّاد بن عارض الجشمی نے ثقیف والوں کو مخاطب کر کے بآوازِ بلند فرمایا :

لا تنصروا اللات ان اللّٰہ مھلکھا
وکیف نصرکم من لیس ینتصر
ان التی حُرّقت بالنار فاشتعلت
ولم تقاتل لدی احجارھا ، ھذر
ان الرسول متٰی ینزل بساحتکم
یظعن ولیس بھا من اھلھا بشر

"لات کی مدد نہ کرنا، کیونکہ لات کو برباد کرنے والا خود اللہ تعالیٰ ہے جس کی قسمت میں کامیابی نہ ہو، تمہاری مدد سے کیا ہوگا۔ جو چیز آگ میں بھسم ہو کر راکھ ہو گئی اور اپنی کوئی مدافعت نہ کر سکی، وُہ یقیناً ناکارہ شے ہے جب حضور سرورِ عالمؐ آپ کی سرزمین میں اپنے مبارک قدم رکھیں گے اور پھر یہاں سے واپس تشریف لے جائیں گے تو ایک متنفس بھی لات کا حامی نہ ہوگا۔"

اہلِ عرب کی تیسری مشہور دیوتی[۱] کا نام عزّٰی تھا۔ اس کی پرستش لات و منات کے بعد شروع ہُوئی۔ جاہلی عرب کی تاریخ اس حقیقت کی واضح طور پر نشان دہی کرتی ہے کہ اس دیوی کے نام پر عربوں نے اپنی اولاد کے نام بہت بعد میں رکھنے شروع کیے تھے۔ چنانچہ عبدالعزّٰی جیسا مرکب اسم پہلے دور میں کہیں نظر نہیں آتا۔ اس کا تذکرہ عام طور پر ان شعراء کے کلام میں ملتا ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے ذرا پہلے پیدا ہُوئے۔

عزّٰی کی پرستش کا آغاز ظالم بن اسعد کے ہاتھوں ہُوا۔ مکّہ سے جو راستہ عراق کی طرف جاتا ہے، اُس پر بُستان سے نو میل کے فاصلہ پر سڑک کے دائیں جانب اس دیوی کا بت نخلۃ الشامیہ کے مقام پر جسے حراض بھی کہتے ہیں، نصب تھا۔ اس بُت کے اردگرد ایک وسیع عمارت تعمیر کی گئی تھی، جسے بُس کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اس عمارت میں اس دیوی کے حضور میں نذرانے پیش کیے جاتے، اس کی پرستش ہوتی اور غیب سے پُراسرار آوازیں سنانے کے عجیب و غریب انتظام کیے جاتے تھے۔

اس دیوی کا وقار اور احترام مسلسل بڑھتا رہا۔ لوگوں نے دوسرے ناموں کو چھوڑ کر آہستہ آہستہ اپنی اولاد کے نام اسی دیوی کے نام پر رکھنے شروع کیے۔ چنانچہ ایک ایسا وقت بھی آیا، جب سب سے زیادہ مقدس نام عبدالعزّٰی خیال کیا جانے لگا۔ عرب کا کوئی قبیلہ ایسا نہ تھا، جس نے اس بُت کی بندگی پر فخر نہ کیا ہو۔ لیکن اس معاملہ میں جتنی فدائیت اور جاں نثاری

---

[۱] حقیقت میں لات و منات بھی ان کی دیویاں ہی تھیں۔

قریش کے ہاں دیکھنے میں آتی ہے، اس کی نظیر ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔

عرب کے اس سب سے زیادہ طاقت ور اور با اثر قبیلے کے افراد کعبہ کے گرد طواف کرتے وقت اس بُت کی تعریف و توصیف ان الفاظ میں کرتے:

واللات والعزی ومناۃ الثالثۃ الاخری فانھن الغرانیق العلیٰ وان شفاعتھن لترتجیٰ۔

"قسم ہے لات وعزیٰ کی اور ان دو کے علاوہ تیسرے منات کی۔ یہی حسین وجمیل رفیع الشان لڑکیاں ہیں، انہی سے شفاعت کے لیے التجا کی جاتی ہے۔"

ان تینوں بُتوں یعنی لات، منات اور عزیٰ کو اہلِ عرب خدا کی بیٹیاں تصوّر کرتے تھے اور اس بات پر پختہ ایمان رکھتے تھے کہ ان کی شفاعت کے بغیر وہ دنیا اور آخرت میں کامیاب و کامران نہیں ہو سکتے۔ قرآن مجید نے بڑے زور دار الفاظ میں ان کے اس باطل عقیدہ کی تردید کی ہے:

اَفَرَاَيْتُمُ اللّٰتَ وَ الْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ــ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى۔ (النجم رکوع ۱-۲)

کیا تم نے لات، عزیٰ اور تیسرے منات کے حال پر غور نہیں کیا ہے؟ کیا تمہارے لیے تو بیٹے ہوں اور خدا کے لیے بیٹیاں؟ اس اعتبار سے تو یہ بڑی بے ڈھنگی تقسیم ہے، یہ نرے نام ہی نام ہیں، جنھیں تم نے اور تمہارے باپ دادا نے ٹھہرا لیا ہے۔ خداوند تعالیٰ نے تو کوئی دلیل نہیں بھیجی۔ یہ لوگ بے بنیاد خیالات اور اپنے نفس کی پیروی کرتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آ چکی ہے۔ کیا انسان کی ہر خواہش اور تمنّا پوری ہو جاتی ہے۔ سو اللہ ہی کے اختیار میں ہے دنیا اور آخرت اور بہت سے فرشتے جو آسمانوں میں موجود ہیں۔ ان کی سفارش ذرا بھی کام نہیں آ سکتی مگر اللہ تعالیٰ جس کے معاملہ میں چاہیں اور جس سے راضی ہوں، اجازت فرما دیں اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، وہ فرشتوں کو بیٹی کے نام سے نامزد کرتے ہیں۔

قریش نے حُریض کے قریب ایک پوری وادی جسے سُقام کے نام سے یاد کیا جاتا ہے عزّٰی کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ اس وادی کو یہ لوگ بڑی عزت و توقیر سے دیکھتے اور اسے خانہ کعبہ کا ہی ایک حصہ خیال کرتے تھے۔ چنانچہ عزّٰی کے ذکر کے ساتھ ساتھ اس "وقف" کا ذکر بھی عربی اشعار میں کئی جگہ ملتا ہے۔ ابوجندب الہذلی اپنی محبوبہ کا تذکرہ کرتے ہوئے عزّٰی اور سقام دونوں کی طرف اپنے ایک شعر میں یوں اشارہ کرتا ہے:

لَقَدْ حَلَفَتْ جهداً يميناً غليظةً
بفرع التي أحمت فروع سُقَامِ

"اس نے اس ذات کی پختہ اور سچی قسم کھائی، جس کے لیے سُقام کی وادی وقف کی گئی تھی۔"

اسی طرح درہم بن زید الاوسی نے ایک شعر میں کہا ہے:

اني و رب العزى السعيده
و الله الذي دون بيته سَرِف

"خوش بخت عزّٰی کے رب کی قسم، اس اللہ کی قسم جس کے گھر (اور سقام) کے درمیان سَرِف موجود ہے۔"

عزّٰی کے صنم کدے میں ایک قربان گاہ بھی تھی جسے غبغب کہا جاتا تھا اور جہاں زائرین ہدیے کے جانور لا کر ذبح کرتے تھے۔ ایک شاعر کہتا ہے:

لَقَدْ اُنكِحَتْ اَسْمَاءُ لَحْيَ بُقَيْرَةٍ
من الْاُدْمِ اهداها امرؤٌ من بني غنمِ
رأى قدعًا في عَينها اِذ يَسُوقُها
اِلى غَبْغَبِ العُزّٰى وضّع في القَسَمِ

"اسماء کا نکاح اس بچھڑی کے جبڑے سے کر دیا گیا جسے بنی غنم کے کسی شخص نے چڑھاوا دیا تھا اور جب وہ اسے غبغب عزّٰی کی جانب لے جا رہا تھا اور اسے تقسیم کے لیے کاٹا، تو اس وقت اسے اس کی آنکھ میں عیب نظر آیا۔"

عزّٰی کا صنم کدہ عربوں کے ہاں کتنا مشہور و مقبول اور کس قدر واجب التعظیم تھا، اس کا ہلکا سا اندازہ قیس بن الحدادیۃ الخزاعی کے اس شعر سے لگایا جا سکتا ہے:

تَلَيْنَا بِبَيْتِ اللهِ اَوّل حَلْفَةٍ
وَ اِلَّا فَاَنْصَابٍ يَسُرْنَ بِغَبْغَبِ

"ہم سب سے پہلے قسم اللہ کے گھر کی کھاتے ہیں۔ لیکن اگر وہ موثر نہ ہو تو پھر ان مقدس پتھروں کی، جو غبغب کے مقام پر نصب ہیں۔"

اس امر کا فیصلہ کرنا قدرے مشکل ہے کہ لات، منات اور عزّٰی میں عربوں کے نزدیک کونسی دیوی سب سے زیادہ قابلِ تکریم تھی۔ لیکن ایک بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ قریش کو عزّٰی سے ایک خاص قلبی لگاؤ تھا اور وہ اس کی عزّت و تکریم کو اپنا جزوِ ایمان سمجھتے تھے۔

زید بن عمرو بن نُفیل کا شمار ان سعید روحوں میں ہوتا ہے، جن کی فطرتِ سلیم نے انھیں بُت پرستی سے اسلام کا آفتاب طلوع ہونے سے پہلے ہی بیزار کر دیا تھا۔ انھوں نے اپنے اشعار میں بُت پرستی کی پُرزور مذمت کی ہے اور اس سے برأت کا کھلے بندوں اظہار کیا ہے۔ ان کے اشعار کے مطالعہ سے یہ بات بڑی آسانی سے اخذ کی جا سکتی ہے کہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عربوں کی عقیدت کے کون کون سے مرکز و محور تھے اور وہ کن آستانوں پر اپنی جبینِ نیاز جھکا کر اپنے جذبۂ عبودیت کی تسکین کیا کرتے تھے۔ اس ضمن میں زید بن عمرو بن نُفیل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں: ؎

ترکت اللات و العزّٰی جمیعاً
کذالك یَفعلُ الجلدُ الصبورُ
فلا العزّٰی أدین و لا ابنتیها
ولا صنمی بنی غنم ازورُ
ولا هُبلاً ازورُ و کان رباً
لنا فی الدّهر اذ حلمی صغیر

"میں نے لات اور عزّٰی دونوں کی پرستش سے منہ موڑ لیا ہے اور جری اور بہادر آدمی اسی طرح کرتا ہے۔ میں اب نہ تو عزّٰی کا پرستار ہوں اور نہ ہی اس کی دونوں بیٹیوں کا۔ میں بنی غنم کے دونوں بُتوں کی بھی زیارت نہیں کرتا۔ میں ہُبل کی زیارت اور اس کی پرستش کے لیے بھی نہیں جاتا حالانکہ جب میں سنِ بلوغ کو نہ پہنچا تھا اُس وقت ہم اسے اس دنیا میں اپنا رب تصور کیا کرتے تھے۔"

عزّٰی کے صنم کدہ کی تولیت عرصہ دراز تک مجموعی طور پر بنی سُلیم کے پاس رہی لیکن اس بُت خانہ کی حفاظت اور دربانی میں بنو شیبان پیش پیش تھے اور اس کام کو اپنے لیے ایک غیر معمولی اعزاز سمجھ کر اسے بڑے خلوص کے ساتھ سرانجام دیتے رہے۔ اس کی پرستش بھی دوسرے بتوں کی طرح حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک جاری رہی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی بربادی کا حکم صادر فرما دیا۔ اس دیوی کے بارے میں عربوں کے جذبات کتنے نازک تھے اور اس کے ساتھ ان کی وابستگی کتنی گہری تھی۔ اس کا اندازہ اُس صدمے سے لگایا جا سکتا ہے، جو اُنھیں اُس کی مذمت سے پہنچا۔ سورہ النجم کی مشہور آیت اَفَرَءَیۡتُمُ اللّٰتَ وَالۡعُزّٰی جب نازل ہوئی تو اس سے کفّار کو شدید اذیت ہوئی اور اس کے نتیجہ میں ابو اُجیحہ (عبد مناف کا پڑپوتا) سخت بیمار پڑ گیا۔ یہی بیماری بالآخر اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی۔ اسی دوران میں ابولہب اس کی عیادت کے لیے اس کی خدمت میں پہنچا تو اس نے اسے آہ و فغاں کرتے ہوئے دیکھا۔ ابولہب نے ابو اُجیحہ سے

کہا، "کیا تو موت سے خوفزدہ ہو کر آنسو بہا رہا ہے حالانکہ اس سے کوئی مفر نہیں" اس پر ابواحیحہ نے جواب دیا: "نہیں مجھے موت کا قطعاً کوئی خوف نہیں اور اس کی وجہ سے میں بالکل پریشان نہیں۔ البتہ مجھے صرف ایک ہی غم کھائے جا رہا ہے کہ میرے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد عزیٰ کی پرستش ختم ہو جائے گی" ابولہب نے اسے تسلی دی اور کہا: "یہ محض تمہاری خام خیالی ہے کہ عزیٰ کی تعظیم و تکریم یا اس کی پرستش تمہاری ذات سے وابستہ ہے اور اس بنا پر یہ صرف تمہاری زندگی تک محدود رہے گی اور تمہارے چلے جانے کے بعد لوگ اس دیوی سے منہ موڑ لیں گے"

ابواحیحہ نے جب یہ الفاظ سُنے تو اسے بڑی مسرت ہوئی کہ عزیٰ سے عربوں کو خاص طور پر ابولہب کو غیر معمولی عقیدت اور وابستگی ہے۔

تجارت العرب قبل الاسلام

سیّد شمس اللہ قادری

تجارتِ عرب کی قدامت

نہایت ہی قدیم زمانے میں جن اقوام نے ایک ملک کی پیداوار کو دوسرے ملک کی پیداوار سے پہلے پہل بدل کیا ہے، ان میں خصوصیت کے ساتھ عربوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

اہلِ عرب حضرت مسیح علیہ السلام سے صدیوں پیشتر تجارت میں مشغول تھے۔ تورات اور نیز یونان کے نہایت قدیم تصنیفات میں عربوں کی تجارت کے بے شمار حالات موجود ہیں، جس سے ان کے اس پیشہ کی قدامت بہت ہی واضح طور پر معلوم ہوتی ہے۔

ایک نہایت ہی قدیم روایت[1] ہے کہ جن لوگوں نے حضرت یُوسف علیہ السلام کو ان کے نامہربان اور سنگدل بھائیوں سے خرید کر مصر کے رئیس فوطیفار کے ہاتھ بیچا تھا، وہ عرب کے قبائل اسماعیل اور مدیان کے تاجر تھے۔

تجارتِ عرب کی وسعت

عربوں کی تجارت جیسی کہ قدیم تھی، ویسی ہی وسیع اور عالمگیر تھی، جیسا کہ ڈاکٹر گستاولی بان نے لکھا ہے کہ "اس کی انتہا رُبع مسکون تک پہنچ گئی تھی"۔ چین کے مشرقی سواحل اور مجمع الجزائر سے لے کر جبل الطارق تک عربی تجار کے جہازات کا بیڑا الغرضِ تجارت پھرا کرتا تھا۔ افریقہ، ایران، ہندوستان، خطا، ترکستان، روس، ایشیائے کوچک وغیرہ کی سرزمین ان کے قافلوں کی جولان گاہ تھی۔

غرض اقصائے عالم کی تجارت عربوں کے ہاتھ میں تھی اور دو ہزار برس تک ملک عرب تمام عالم کا مرکز تجارت بنا رہا تھا۔[2] اور اسی وجہ سے سکندرِ اعظم نے ارادہ کیا تھا کہ اپنے ملک کا مستقر اور حدِ وسط عرب کو بنائے[3] بقول ڈاکٹر لی بان کے زمانہ قدیم

---

[1] تمام علمائے یورپ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ واقعہ حضرت مسیحؑ سے سترہ سو سال پیشتر کا ہے۔

[2] ڈاکٹر لیبان کی فرانسیسی کتاب ص ۶۸

[3] صناجۃ الطرب فی تقدمات العرب مطبوعہ بیروت ص ۲۹۶

میں عرب نے تمام دُنیا میں وہی کام کیا، جو یورپ میں وینس نے نشئۃ الثانیہ کے زمانہ میں کیا تھا۔[1]

دنیا کے وہ ممالک جہاں عرب تجارت کیا کرتے تھے

عربوں کو نہایت قدیم زمانہ سے مصر، ہندوستان، ایران، چین، روم، یونان، افریقہ بابل، فینیکینیا، شام وغیرہ ممالک سے تجارتی تعلق تھا۔ عرب ان ممالک میں بحر و بر دونوں راہوں سے آیا جایا کرتے تھے۔ بری تجارت کاروانوں کے ذریعہ کی جاتی تھی۔ بحری تجارت کے لیے دور دراز مقامات پر جہازات کے ذریعہ سے آیا جایا کرتے تھے اور قرب و جوار میں کشتیوں سے کام لیتے۔ عربوں کی بحری تجارت بری تجارت سے بڑھی ہوئی تھی۔

مصریوں کے عربوں سے تجارتی تعلقات

عصر قدیم میں مصریوں کی تجارت عربوں کے ہاتھ میں تھی۔ نیز عربوں کا تجارتی تعلق بہ نسبت دیگر ممالک کے مصریوں سے نہایت قدیم ہے۔ عنطف[2] رابع نے اپنے زمانہ میں بحر احمر کے سواحل پر ایک تجارتی مشن روانہ کیا تھا، جس کے ساتھ بیش قیمت اشیا، جواہرات، نادر حیوانات تھے۔ اسی طرح مصر کی ملکہ ہتشو نے بھی جہازوں کا ایک بیڑا اس ملک میں بغرضِ تجارت بھیجا تھا۔[3]

عربوں کی تجارت ملکہ ہتشو[4] کے زمانہ میں اور نیز اس کے جانشینوں کے ایامِ حکومت میں نہایت چمکی ہوئی تھی۔ عرب اکثر بحر احمر سے مصر میں جایا کرتے تھے۔ نیز خلیج سوئس سے رودِ نیل تک بھی انھوں نے ایک گزرگاہ بنا لی تھی۔ اہلِ یمن کی تجارت مصر میں انیسویں[5] خاندان کے خاتمہ تک باقی رہی۔ پھر مصریوں نے اپنے ملک میں تاجروں کے لیے بازار بنا لیے۔[6]

---

[1] ڈاکٹر لی بان کی فرانسیسی کتاب کا صفحہ ۶۸ دیکھیے۔

[2] عنطف رابع مصر کا بادشاہ تھا جو عہد مینا رین کے بعد گزرا ہے۔ اور یہ مصر کے گیارھویں شاہی خاندان سے تھا۔ اس خاندان میں نو فرمانروا گزرے ہیں، جن میں پہلے (۶) کا لقب عنطف تھا اور آخر (۳) کا منطوہتپ۔ یہ خاندان بقول پیٹری ۳۰۰۵ء سے ۲۷۷۸ء قبل مسیح تک فرمانروائی کرتا رہا۔

[3] تاریخ القدیم مطبوعہ بیروت ص ۱۹۶

[4] ملکہ ہتشو جس کا پورا نام ہتشت ہے، مصر کے اٹھارھویں شاہی خاندان سے ہے۔ اس خاندان کا پہلا بادشاہ آمس اوّل ہے جس نے ۱۵۸۶ء سے ۱۵۶۲ء تک محکم حکومت کی۔ اس کے بعد امینوس تھوتمس اوّل و دوم حکمران ہوئے جن میں تھوتمس دوم کی حکمرانی چند ہی یوم کی تھی تھوتمس دوم کے بعد ملکہ ہتشو کی حکومت کا زمانہ آتا ہے۔

[5] مصر کے انیسویں شاہی خاندان کا آغاز ۱۳۷۵ء ق م سے اور خاتمہ ۱۲۰۰ء ق م میں ہوا ہے۔ اسی خاندان کے (باقی بر صفحہ آئندہ)

مصری ہندوستانیوں سے براہِ راست تجارت نہیں کرتے تھے، بلکہ ہند کا مال واسباب عربوں سے خرید کرتے تھے۔ عرب مصر سے غلوں کے دانے، مویشی، برتن، شیشہ وغیرہ ہندوستان میں لایا کرتے تھے اور ہند سے خوشبو، پنبہ، یاقوت وغیرہ اشیا مصری چیزوں کے تبادلہ میں لیا کرتے تھے[۱]

صورئین اور عربوں کے تجارتی تعلقات

صور[۲] کے باشندوں اور عربوں کے درمیان بھی قدیم الایام سے تجارتی تعلقات ہیں۔ اس ملک میں عرب خشکی اور تری کے دونوں راستوں سے آیا جایا کرتے تھے۔ اہلِ یمن کی تجارت عرب والوں کے ساتھ کئی راستوں سے تھی۔ خشکی کے راستہ سے حجاز سے ہوتے ہوئے قافلوں کے ذریعہ اپنے مال واسباب لے جایا کرتے تھے اور ان کا بحری راستہ خلیج عقبہ سے تھا۔ کبھی کبھی صور وصیدا کے راستوں سے بھی جایا کرتے تھے۔ صورئین اگرچہ فنِ جہاز رانی کے خوب ماہر تھے تاہم بحر احمر اور بحر ہند کے خطرات سے خائف تھے۔ اس وجہ سے ان ممالک کی پیداوار عربستان بالخصوص جنوبی عرب (یمن) کے باشندوں سے لے جایا کرتے تھے[۳]

یمن اور عدن والے صور میں جن اشیا کی تجارت کرتے تھے وُہ ہر قسم کے نفیس اور خوشبودار مصالحے اور طرح طرح کے قیمتی پتھر، کمخواب، سونا، چوغے ارغوانی، منقش پوشاکیں اور سب طرح کے بُوٹی دار کپڑے تھے[۴] اہلِ حجاز کی تجارت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ایامِ حکومت میں حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لے گئے۔ بیسویں خاندان کے زمانہ حکومت میں سے جس کی مدتِ حکومت ۱۲۰۰ ق م سے ۱۰۹۰ ق م تک ہے۔ مصریوں کی تجارت اہلِ فینیکیہ کے ہاتھوں میں تھی اور یہ لوگ مصر کے تاجروں کو دور دراز ممالک سے اشیا لا کر دیا کرتے تھے فینیکیہ کی تباہی کے بعد سے پھر عرب تاجروں کو مصر میں عروج ہوا۔ [۶] تاریخ القدیم مطبوعہ بیروت صفحہ ۱۹۶

[۱] سیاحۃ المعارف مطبوعہ بیروت کا صفحہ ۵۔

[۲] صور، ساحل شام پہ کوہ البنان اور بحر الابیض کے درمیان واقع ہے۔ اس کا طول ایک سو پچاس میل اور عرض چوبیس میل ہے اس ملک کے بیت السلطنت کا نام صور تھا۔ اسی مناسبت سے تمام ملک کو عبرانی اور عربی صور کہتے ہیں۔ یونانی اس کو فینیکیہ کہتے ہیں اسی لفظ سے انگریزی کا لفظ فونیشیا نکلا ہے اور صورئین قدیم الایام سے معاملات داد وستد میں مشغول پائے جاتے ہیں (یعنی بیت السلطنت) جو لبِ دریا تھا۔ اپنی تجارت اور رونق کے لحاظ سے ملک صور کے تمام شہروں سے نامور اور مشہور تھا۔ حضرت حزقیلؑ نے جو مسیح سے چھ سو برس قبل گزرے ہیں، صور کی تجارت اور اس کی رونق وخوبصورتی کا نہایت دلچسپ اور حیرت انگیز تذکرہ کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اقصائے عالم کے تجار بغرض لین دین کے آیا کرتے تھے (صحیفہ حزقیل کا باب ۲۷ ملاحظہ کیجیے) صور حضرت مسیحؑ سے چھ سو برس قبل تباہ ہوگیا۔

[۳] تاریخ القدیم ص ۱۹۶ [۴] کتاب مقدس میں حزقیلؑ کی کتاب کا باب ۲۷ آیۃ ۲۲ سے ۲۴ تک۔

بھیڑ، مینڈھے، بکریوں کی تھی[۱] گوہر، شب چراغ، ارغوانی اور زر دوزی کتان مرجان وغیرہ کو ادوم[۲] کے باشندے صور کے بازاروں میں لایا کرتے تھے[۳]

بنی اسرائیل[۴] سے عربوں کے تعلقات

بنی اسرائیل کے دُور دراز ممالک سے تجارتی تعلقات نہیں تھے وہ صرف اپنے ہمسایہ ممالک سے لین دین کیا کرتے تھے۔ رومانی یونانی اشیا کی خرید کے لیے فینیکیا تھا۔ ایرانی اسباب خالدیا سے لیا کرتے تھے اور عربی پیداوار ہند اور چین کے سامان عربوں سے لیتے تھے۔

بنی اسرائیل اور عربوں کے مابین جو تجارت ہوتی تھی اس کا ذکر تورات میں کئی مقام پر آیا ہے۔ منجملہ ان کے ایک نہایت مشہور واقعہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا حیرام کی شرکت سے براہ سمندر اوفیر[۵] سے سونا منگوانا ہے[۶]

بابل[۷] والوں سے عربوں کے تعلقات

بابل کو اہلِ عرب کاروانوں کے طریقہ سے آیا جایا کرتے تھے۔ ان کے کاروان عرصہ دراز تک مقیم رہا کرتے تھے[۸]

---

[۱] حزقیلؑ کی کتاب باب ۲۷ آیۃ ۲۱۔

[۲] ادوم کو، جسے دومہ بھی کہتے ہیں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے چھٹے فرزند دومہ نے آباد کیا تھا۔ عرب اس کو دومۃ الجندل کہتے ہیں اور یہ نجد میں واقع ہے۔

[۳] صحیفہ حزقیلؑ باب ۲۷ آیت ۱۶۔

[۴] بنی اسرائیل کا ملک وُہ ہے جس کو عرب کنعان اور یہودی خنعن اور یونانی فلسطین اور فلسطیا کہتے ہیں۔ یہ ملک ان کے جنوب، بیرشبع کے شمال، بحر الابیض کے مشرق، صحرائے آرام کے جنوب میں واقع ہے۔

[۵] اوفیر کے جائے وقوع میں اکثر علما اختلاف کرتے ہیں لیکن عام طور پر یہ شہر حضر موت میں تسلیم کیا جاتا ہے۔

[۶] دوم تواریخ باب ہشتم آیۃ ۱۷ سے ۱۹ تک۔

[۷] بابل، جس کو ایرانی کسدیم اور یونانی خالدیا اور اسوریا کہتے ہیں، وہ ملک ہے جو سواحلِ فرات اور دجلہ پر واقع ہے۔ بابل والوں کے تجارتی تعلقات، جو ہندوستانیوں اور ایرانیوں سے تھے وہ قابلِ بیان ہیں۔ یہ لوگ ہندوستان کے شمالی ممالک سے براہ بحر و بر تجارت کیا کرتے تھے۔ بحری راستہ خلیج فارس سے تھا، جس کے درمیان شیراز پڑتا تھا۔ اس راہ سے سندھ، ملتان، گجرات وغیرہ ممالک میں آیا جایا کرتے تھے۔ ان کا بری راستہ ایران اور افغانستان سے ہوتا ہوا جاتا ہے۔

[۸] یشعیا علیہ السلام کی کتاب۔ باب ۱۳۔ آیت ۲۰۔

خالدین عربوں سے عرب کی پیداوار، جنوبی ہندوستان، چین، افریقہ وغیرہ ممالک کی اشیا خرید کیا کرتے تھے[1] اور عرب ان سے شمالی ہند، ایران، ترکستان وغیرہ ممالک کی پیداوار تبادلہ میں لیا کرتے تھے۔ عربوں کی تجارت خالدین سے تباہیِ بابل تک نہایت عروج پر تھی۔

ایرانیوں سے عربوں کے تجارتی تعلقات

قدیم زمانہ میں اہلِ عرب جنوب کے ایرانیوں سے براہ بحرین شہر گرا سے تجارت کیا کرتے تھے[2] تباہیِ بابل کے بعد شمالی ایران میں عربوں کی آمد و رفت کو ترقی ہوئی ہے۔ زمانۂ وسطیٰ[3] میں، جب کہ عراق عرب دولت عجم کے ماتحت ہو گیا تھا، عربوں کو ایرانی تجارت میں نہایت عروج حاصل تھا، چنانچہ ان ایام میں شہر مداین[4]، جو عراق عرب میں ہے ایران کی تجارت کا مرکز تھا۔

چین سے عربوں کے تجارتی تعلقات

اہلِ عرب چین[5] کو بحری اور برّی دونوں راستوں سے آیا جایا کرتے تھے۔ ان کا بحری راستہ سواحل عرب یا

---

[1] تاریخ قدیم ص ۸۰۔

[2] مورّخ استرابو کی یونانی زبان کی تاریخ ص ۱۱۱۰۔

[3] زمانہ وسطیٰ سے حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسیح علیہ السلام کے مابین کا زمانہ اور بالخصوص چوتھی اور چھٹی صدی مسیحی کا درمیانی زمانہ مراد ہے۔

[4] مداین بغداد سے ایک منزل کے فاصلہ پر جانبِ جنوب آباد تھا۔ زمانہ قدیم میں اس کو طیسیفون کہتے تھے۔ نوشیروان نے اس کو اپنا مستقر قرار دیا تھا۔ اسی شہر میں ایوانِ کسریٰ کے کھنڈرات تھے۔ صناجۃ الطرب والا لکھتا ہے کہ اس کے ایک ستون سے دوسرے ستون تک ۹۵ ہاتھ کا فاصلہ تھا اور اس کی بلندی ۸۰ ہاتھ تھی۔

[5] مورخ رشید الدین لکھتا ہے کہ ملک چین کے دو حصے تھے۔ خطا و صین الصین دریائے ہوانگ ہو کے شمال میں، جو ایک ملک ہے وہ خطا کہلاتا تھا اور اس کا بیت السلطنت خان بالغ تھا۔ ہوانگ ہو کے جنوبی ملک کو صین الصین کہتے تھے اور اس کا دار السلطنت خنسا تھا۔ خنسا میں جو عرب آیا کرتے تھے وہ زیادہ تر ایران، ترکستان، منگولیا وغیرہ ہوتے ہوئے خشکی کے راستہ آتے تھے۔ خان بالغ، ابنِ بطوطہ وغیرہ اور صاحبِ تقویم البلدان (کے مولف) نے اس مقام کا نام خانقو بھی لکھا ہے۔ حال کے جغرافیہ میں اس کو پیکن کہتے ہیں۔ صین الصین، اس کو عرب صین الکبیر بھی کہتے ہیں۔ مارکوپولو نے اس کا نام ماچین لکھا ہے۔ حال کے جغرافیہ میں اس کا نام کینٹن لکھتے ہیں۔ خنسا جس کو اس وقت ہوانگ چو کہتے ہیں چین کا بہت بڑا اور بارونق شہر ہے۔ پہلی صدی میں جو عربی تاجروں کے جہازات چین میں آتے تھے ان کے قیام کی جگہ یہی شہر تھا۔

خلیج فارس کے سواحل سے شروع اور براہِ راست چین تک منتہی ہوتا تھا، جس کے اثنائے راہ میں سواحل ہند، سیلان، سیام، مجمع الجزائر وغیرہ پڑتے تھے۔ بری راستہ ایران، دشت قفچاق، ترکستان، بکتریا وغیرہ ممالک سے ہوتا ہوا جاتا تھا۔[1]

عرب مسیح سے صدیوں پیشتر چین میں بغرضِ تجارت آیا جایا کرتے تھے۔ مسٹر آرنولڈ لکھتا ہے کہ عربوں کی تجارت کو مسیح سے ایک صدی پیشتر چین میں کمال عروج تھا۔

عربوں کی تجارت چین کے اور شہروں کی بہ نسبت زیادہ تر صین الصین میں تھی۔ اس شہر میں اس وقت بھی قدیم عربوں کے بلیے ایک آثار موجود ہیں، جن کے منجملہ ایک حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کا مرقد مبارک ہے۔[2]

چین[3] میں عربوں کی تجارت جواہرات، مرجان، فرش اور سوتی کپڑے کی تھی اور ان اشیا کے تبادلہ میں وہاں سے اطلس، کمخواب، ظروفِ چینی، چائے، ادویہ وغیرہ لیتے تھے اور صین الصین سے چائے، افیون، سیماب، شورہ، ٹین، جواہرات لیا کرتے تھے۔[4]

ہندوستان اور سیلان سے عربوں کے تجارتی تعلقات

عرب ہندوستان کو بری اور بحری دونوں راستوں سے آیا جایا کرتے تھے۔ بری راستہ ایران، سمرقند، کشمیر سے ہوتا ہوا ہند کو جاتا تھا۔ بحری راستہ سراف اور عدن سے تھا۔[5]

خشکی کے راستہ سے ان لوگوں کی تجارت، کشمیر، قنوج وغیرہ ممالک میں ہوتی تھی۔ بحری راستہ سے سندھ، ملیبار[6]

۱؎ یہ راستہ ڈاکٹر لی بان کی کتاب لا سویلزیشن اور نخبۃ الدہر فی عجائب البر و البحر مطبوعہ پیٹرس برگ سے اخذ کیا گیا ہے۔

۲؎ ملاحظہ کیجیے ٹائمز آف انڈیا مطبوعہ ۱۲ ستمبر ۱۸۹۵ء میں عماد نواز جنگ بہادر کی بیوی جمیلہ بیگم صاحبہ کا مضمون "ایک ترکی سلطانہ کی ملاقات"۔ بیگم صاحبہ نے اس قبر کو بچشم خود دیکھا ہے۔ نیز اس شہر کے متعلق یہ بھی لکھتی ہیں کہ یہاں سات لاکھ مسلمان آباد ہیں اور نیز چار نہایت قدیم مسجدیں ہیں، جن کو یہاں کے مسلمان کعبۂ شرقی خیال کرتے ہیں۔

۳؎ ڈاکٹر لی بان کی کتاب لا سویلزیشن دس عربس ص ۶۰۳۔

۴؎ تاریخ چین ص ۱۴۔

۵؎ لا سویلزیشن دس عربس ص ۶۰۲۔

۶؎ لفظ "ملیبار" کے معنی "پہاڑی ملک" ہیں۔ اس کو قدیم زمانہ میں "کرالہ" کہتے تھے۔ راس کماری سے گوا تک کا مشرقی ساحل ملیبار کہلاتا ہے۔

سیلان[1] وغیرہ ملکوں میں تجارت کیا کرتے تھے۔ عرب شمالی ہند اور کشمیر وغیرہ سے بارود، پنبہ، افیون، اون، حریر، مُشک، ریوند چینی اور پشمینہ وغیرہ خرید کرتے تھے[2] اور جن چیزوں کو ملیبار اور سیلان سے خرید کرتے تھے، وہ طرح طرح کے گرم مصالحے، لونگ، الائچی، مرچ، زیرہ، عطریات، دارچینی، جواہرات، نیز دیگر معدنیات، حیوانات اور ناریل وغیرہ اشیا تھیں[3]۔

عربوں کا تجارتی تعلق ہندوستان سے نہایت قدیم ہے۔ بقول ڈاکٹر گستاولی بان کے جس کا آغاز ابتدا زمانہ تاریخی سے ہوتا ہے[4]، عرب ہندوستان کے جن شہروں میں سب سے پہلے تجارت کی غرض سے آئے وہ سندھ، ملیبار، سیلان تھے اور یہ ہی مقامات ان کی خاص تجارت گاہیں تھیں۔

افریقہ اور عربوں کے تجارتی تعلقات

عرب قدیم الایام سے سواحلِ افریقہ پر تجارت کیا کرتے تھے۔ یہاں حبشہ[5] اور کارتھیج[6] ان کی تجارت کے مشہور مقامات تھے[7]۔ اہلِ یمن حبشہ کو عدن سے اور اہلِ حجاز جدّہ سے آیا جایا کرتے تھے۔ کارتھیج کا بحری راستہ بحر الردم سے تھا[8]۔ مورخ استرابو[9]

---

[1] سیلان ہندوستان کے جنوب میں ایک جزیرہ ہے۔ اس کے اور ہندوستان کے درمیان چالیس میل کا فاصلہ ہے۔ رامچندر جی کی بیوی سیتا کو، جو راون چرا کر لے گیا تھا، وہ اسی جزیرہ کا بادشاہ تھا۔ ہندو لوگ اس کو لنکا کہتے ہیں۔ سراندیپ بھی اسی کا نام ہے۔

[2] سیاحۃ المعارف ص ۱۰۰

[3] تحفۃ المجاہدین

[4] لاسویلزیشن دیس عربس ص ۵۰۶

[5] عرب جس کو حبشہ کہتے ہیں، وہ ملک اس وقت ابی سینا اور نوبیہ کہلاتا ہے۔ یونانیوں نے اس کا نام ایتھوپیا رکھا ہے۔ ایتھوپیا دو لفظوں سے مرکب ہے جس کے معنی ہیں "جلا ہوا چہرہ"۔ یہ نام انھوں نے اس کو اس وجہ سے دیا ہے کہ یہاں کے لوگوں کے چہرے تمازتِ آفتاب کی وجہ سے سیاہ ہو جایا کرتے ہیں۔ یہ حبشی اور سیاہ فام مخلوق قدیم زمانہ میں مہذب تھی اور ہندوستان اور عرب سے اس کی بہت بڑی تجارت تھی۔ زمانہ وسطیٰ میں عربوں کو حبشیوں سے خاص تعلق تھا کیونکہ ان لوگوں کی یمن میں عرصہ تک حکومت رہی تھی۔

[6] کارتھیج ایک قدیم شہر ہے جو افریقہ کے شمال میں واقع تھا، جہاں اب ٹیونس آباد ہے۔ صورئین نے ۵۵۳ء قبل مسیح اس کی بنا ڈالی تھی۔ ۱۴۶ء میں رومیوں نے اس کو برباد کیا۔ وہ عربی تجار، جو یونان کو آیا جایا کرتے تھے، یہاں بھی جاتے تھے۔ [7] تاریخ الاسلام ص ۶، مطبوعہ گورکھپور

[8] استرابو یونان کا مشہور جغرافیہ دان ہے۔ ۵۴ء قبل مسیح میں پیدا ہوا ۲۴ء میں مرا۔

نے کہا ہے کہ افریقہ میں عربوں کی آمد و رفت جیرہ[1] کی طرف سے ہوتی تھی[2]

عربوں اور یونانیوں کے تجارتی تعلقات

عربوں اور یونانیوں[3] کے مابین جو تجارتی تعلق تھا، نہایت قدیم تھا۔ مورخ ہیرودوٹس[4] کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے زمانہ میں یونان میں عربوں کی تجارت عروج پر تھی۔

یونانیوں کے ہاتھ عرب قسم قسم کے مصالحے، خوشبودار اشیا، ملبوسات، جواہرات وغیرہ فروخت کیا کرتے تھے۔ جن کو وہ لوگ ہندوستان، چین اور اپنے ملک سے لاتے تھے[5] مورخ ہیرودوٹس لکھتا ہے کہ ایلوا اور لوبان کی تجارت یونانیوں سے صرف عرب ہی کرتے تھے اور یہ اشیا ان کو عربوں کے سوا کسی اور سے نہیں ملتی تھیں[6]

استرابو نے بھی یونانیوں اور عربوں کے تجارتی تعلقات کا ذکر کیا ہے اور ان تمام اشیا کو جن کی تجارت اہل عرب یونان میں کیا کرتے تھے، عربستان کی پیداوار بتلاتا ہے۔

عربستان کی تجارت گاہیں

عربستان کے کئی شہر تجارت کی منڈیاں تھے، جہاں اقصائے عالم سے مال و اسباب آیا جایا کرتا تھا۔

ملک یمن: عرب میں یمن کی تجارت نہایت قدیم ہے[7] نیز یہاں کے سوداگر جیسے اعلیٰ درجے کی اشیا فروخت کرتے تھے ویسے

---

[1] استرابو نے اس کا تلفظ گیرا لکھا ہے۔ جرمنی کے ضمیمہ مراصد الاطلاع سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا عربی تلفظ جیرہ ہے اور یہ شہر بحرین میں خلیج فارس کے کنارے واقع تھا۔

[2] دیکھیے استرابو کی یونانی زبان کی تاریخ کا صفحہ ۱۱۱۰۔

[3] یونانی اپنے ملک کو جسے انگریز گریک بولتے ہیں، ہیلاس کہتے تھے (دیکھیے یونانی اور فارسی زبانوں میں اعمال الرسل باب ۲۰ آیۃ ۲) اور خود کو ہیلانسس کہا کرتے تھے۔ اور یونان ان نوآبادیوں کا نام رکھا تھا، جن کو انھوں نے بحرالاسود اور بحرالروم کے مابین آباد کیا تھا۔ اس کو وہی لوگ ہی منگر آسیا بھی کہتے تھے۔ عرب اس کو جزآسیا، الصغرا کہتے ہیں۔ وہ لعینہٖ منگر آسیا کا ترجمہ ہے۔ عرب ہیلاسس کو یونان کہتے ہیں لیکن ہمارے اس مضمون میں یونان سے ہیلاس اور ایطالیہ دونوں ملک مراد ہیں۔

[4] ہیرودوٹس یونان کا مشہور مورخ ہے جس کو ابوالمورخین کہتے ہیں۔ ۴۲۴ ق م میں فوت ہوا۔

[5] لاسویلزلیشن دس عربس۔

[6] تاریخ ہیرودوٹس کا فرنچ ترجمہ صفحہ ۲۰۰۰۔

[7] لاسویلزلیشن دس عربس۔

اقصائے عالم کے تمام سوداگروں سے بھی میسر نہیں آتی تھیں [1]

عدن : عدن یمن کی مشہور تجارت گاہ ہے۔ ڈاکٹر گستاولی بان ادریسی کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ عدن میں سندھ، ہندوستان اور چین سے طرح طرح کے بیش قیمت اسباب آیا کرتے تھے۔ جوہر دار تلواروں کے پھل، رنگا اور پکایا ہوا چمڑا، زرہ، مشک، زین، فلفل سیاہ، ناریل، پوست، الائچی، دارچینی، گلنگہ، جوزی، ہڑ، آبنوس، سنگ پشت کی ہڈی، کافور، جائفل، لونگ، کباب چینی اور انواع واقسام کے نباتات کے ریشوں کا بنا ہوا کپڑا، اعلیٰ درجے کا مخمل، عاج رانگا، بید، مختلف اقسام کے گیا اور ایلوا۔

جیرہ : یہ شہر بحرین میں تھا اور بہت بڑی تجارت گاہ تھا۔ یہاں ایران، شیراز، سندھ، ہندوستان، افریقہ سے سامان آیا جایا کرتا تھا۔

فجا[2] : یہ شہر قہوہ کی مشہور تجارتی منڈی تھا اور یہاں سے اقصائے عالم میں قہوہ جایا کرتا تھا۔

صنعا[3] : یہ شہر عرب کے مشہور بلاد سے ہے قدیم زمانہ میں شاہانِ یمن کا بیت السلطنت ہونے کی وجہ سے بہت بڑی تجارت[4] گاہ تھا۔

احسا[4] : اس شہر میں خرموں کی تجارت ہوتی تھی۔

قطیب[5] و کاظمہ : ان دونوں شہروں میں موتی کی تجارت ہوتی تھی۔

ظفار[6] : یہ شہر بھی مشہور تجارتی مقام ہے۔ اہلِ یمن یہاں سے ہندوستان کے ساتھ تجارت کیا کرتے تھے[7] اسی وجہ سے اس علاقہ میں ہندوستان کے اکثر درخت مثل ناریل، پان وغیرہ پائے جاتے ہیں۔

ملک حجاز : حجاز میں دو شہر تجارت کے لیے نہایت مشہور تھے : مکہ، جدہ۔

مکّہ : شہر مکہ حجاز میں بہت بڑی تجارت گاہ تھا۔ یہاں قریش کے بڑے بڑے تجار رہتے تھے اور نیز یمن، شام، عراق، مصر وغیرہ ممالک سے تجارتی کارواں آیا جایا کرتے تھے۔

جدّہ : اس شہر سے اہلِ حجاز بحری تجارت کیا کرتے تھے اور یہیں سے ان لوگوں کی تجارت حبشہ، مصر، صور، افریقہ وغیرہ ممالک سے ہوتی تھی۔

---

[1] دوم سفر الایام۔ باب ۹ - آیۃ ۹ -

[2] لا سویلزیشن دس عربس ص ۲۱، اور صناجۃ الطرب ص ۱۲

[3] صناجۃ الطرب ص ۱۱

[4] ایضاً ص ۱۲

[5] ایضاً

[6] یہ شہر حضرموت میں بحرِ ہند پہ واقع ہے۔

[7] صناجۃ الطرب ص ۱۳

خیبر[1]: خیبر میں خرموں کی تجارت ہوا کرتی تھی۔ یہاں خرمے اس کثرت سے ہوتے تھے کہ ان کی کثرت ضرب المثل ہوگئی تھی۔ ایک شاعر کہتا ہے:

فانك واستبضاعك الشعر نحوا
لمستبضع تمرالی ارض خیبرا

عراق عرب: عراق عرب کے بھی کئی ایک شہر بڑے بڑے تجارت گاہ تھے۔ حیرہ، ابلہ وغیرہ۔

حیرۃ[2]: عراق میں تجارت کے لیے یہ شہر سب سے زیادہ مشہور مقام تھا۔ یہاں ہندوستان، چین، ایران وغیرہ ممالک کے مال و اسباب آیا کرتے تھے[3]

ابلہ[4]: یہ شہر فرات اور دجلہ میں چلنے والے جہازوں کا لنگر گاہ تھا۔ یہاں بھی سندھ، ہندوستان، شیراز سے مال و اسباب آیا کرتا تھا۔[5]

مدائن: یہ شہر خاص کر ایرانی اشیا کی تجارت کے لیے نہایت مشہور تھا۔

ارض شام: زمانہ قدیم میں شام کی تجارت گاہ تدمور، بعلبک، دمشق وغیرہ تھا۔

تدمور[6] و بعلبک[7]: یہ دونوں شہر شام کے نہایت مشہور تجارت گاہ ہیں۔ ان کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا۔ ڈاکٹر لی بان[8] لکھتا ہے کہ خالدین کا ہندوستان سے خشکی کی راہ نیز خلیج فارس کی طرف سے تجارتی تعلق تھا۔ یہ لوگ وہاں سے

---

[1] خیبر نہایت قدیم شہر ہے۔ اس کو عمالقہ نے آباد کیا تھا۔ ایام وسطی میں یہاں یہودی بستی تھی۔

[2] حیرہ سواد عراق کے کنارے آباد تھا، جس کو تبع نے، جو یمن میں عمالقہ کے بعد بادشاہ ہوا ہے، بخت نصر کے زمانہ میں آباد کیا تھا۔ نعمان بن منذر کی اولاد سے جتنے بادشاہ لخمئین گزرے ہیں، ان کا پائے تخت رہا ہے۔ یہاں کے بادشاہ اردشیر بابکان کے وقت سے دولتِ عجم کے ماتحت ہوگئے تھے۔

[3] دیکھیے سید علی صاحب بلگرامی کا مضمون عربوں کی تجارت پر۔

[4] ابلہ دریائے فرات اور دجلہ کے مقام اتصال پر واقع ہے۔

[5] دیکھیے سید علی صاحب کا مضمون عربوں کی تجارت۔

[6] تدمور عبرانی لفظ ہے جس کے معنی ہیں کھجور۔ یونانی اس شہر کو پالمیرا کہتے ہیں۔ یونانیوں نے گویا تدمور کا ترجمہ کر دیا ہے۔ کیونکہ پالمیرا کے معنی مدینۃ النخل ہیں۔ تدمور حضرت سلیمانؑ کے زمانہ سے ملکہ زنوبیا کے عہد تک یعنی تیسری صدی عیسوی تک آباد تھا۔ پھر ویران ہوگیا ہے۔

[7] اس کا قدیم نام بعلت ہے۔ یونانی اس کو ہیلیوپوس کہتے ہیں۔ یہ شہر ویران ہوگیا ہے۔ لیکن اس کے آثار موجود ہیں۔

[8] دوم کتاب ایام باب ہشتم ص ۴-۶

جو مال واسباب لاتے تھے شام میں بھیج دیا کرتے تھے۔اور یہ کارواں قدیم بعلبک تدمور زیروما کے تجارت گاہوں میں آیا کرتا تھا۔[1]

تدمور کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس غرض سے تعمیر کیا کہ تجارت گاہ کا کام دے۔ جہاں آرام، فرات کے سوداگر مصری تاجروں کے ساتھ اپنے تجارتی مال واسباب بدلا کریں۔ رومیوں کے زمانہ میں ہندوستان کی پیداوار بھی اسی شہر سے روم میں جایا کرتی تھی۔[2]

عربستان: عربستان کے بازار عرب میں کئی ایک بازار بھی تھے۔ان میں اگرچہ باہمی تفاخر اور شعر خوانی وغیرہ کا بھی بازار گرم رہا کرتا تھا، لیکن ان کے کھولنے کی اصلی غرض سلسلہ خرید و فروخت تھی۔

سوقِ دومۃ الجندل: یہ بازار ماہ ربیع الاول کی پہلی تاریخ کو دومۃ الجندل میں لگا کرتا تھا۔

سوقِ ہجر: یہ بازار ارض حمیر میں ۹ ربیع الثانی میں کھولا جاتا تھا۔

سوقِ عمّان: یہ بازار جمادی الاوّل کے آخر ایام میں ارض حمیر میں کھولا جاتا تھا۔

سوقِ مشقر: یہ بازار قلعہ مشقر[3] میں بماہ جمادی الاخریٰ میں ہوتا تھا۔

سوقِ صحار: صحار[4] میں ماہ رجب میں کھولا جاتا تھا اور ۵ ایوم تک رہتا تھا۔

سوقِ عدن: یہ بازار اوائل رمضان میں کھلتا تھا۔

سوقِ صنعا: یہ بازار اواخر رمضان میں ہوتا تھا۔

سوقِ حضرموت: یہ بازار ذیقعد میں لگتا تھا۔یعقوبی نے اس کا نام الرابیۃ لکھا ہے۔[5]

سوقِ حباشہ: یہ بازار دیار بارق[6] میں سال میں دو مرتبہ: ایک موسم حج میں اور دوسرا رجب میں ہوتا تھا۔

سوقِ عکاظ: یہ بازار عرب کے تمام بازاروں سے بڑا اور مشہور تھا۔اس کا افتتاح طائف میں[7] ذیقعدہ کی پہلی تاریخ سے ہوتا تھا اور کامل ایک ماہ بیس روز تک کھلا رہتا تھا، جس میں عرب کے تمام قبیلے جمع ہوا کرتے تھے۔ علاوہ اس کے ہفتہ میں ایک دفعہ یک شنبہ کے روز بھی کھلتا تھا جس میں قریب قریب کے لوگ آتے جاتے تھے۔عکاظ میں سوداگروں سے

---

[1] لا سویلزیشن دس عربس۔

[2] دیکھیے بلائیکس بائبل ہسٹری کا باب نہم فصل چہارم فقرہ ۶۔

[3] یہ قلعہ ملک بحرین کا ایک مشہور قلعہ ہے۔

[4] صحار شہر عمان کا قصبہ ہے اور بحرین میں واقع ہے۔ (تقویم البلدان مطبوعہ یورپ کا صفحہ ۴۸ دیکھیے)

[5] تاریخ یعقوبی مطبوعہ یورپ صفحہ ۳۱۲ جلد اوّل۔

[6] دیار بارق قنونا میں واقع ہے اور قنونا مکہ سے یمن کی طرف ہے۔

[7] صناجۃ الطرب مطبوعہ بیروت صفحہ ۲۹۹

ایک قسم کا ٹیکس بھی لیا جاتا تھا جس کو عرب مکس کہتے تھے۔

علاوہ ان بازاروں کے اور دو بازار ہیں : ایک سوق مجنۃ ۔ دوسرا سوق الشحر۔ ان کی تاریخ افتتاح وغیرہ معلوم نہیں۔ لیکن بلوغ الارب سے اتنا معلوم ہوتا ہے پہلا بازار قصبہ مجنۃ میں، جو مکّہ کے قریب ہے لگتا تھا۔ اور سوق الشحر کے دو مقام تھے، ایک ملبع جو بحرین میں ہے، دُوسرا احصات [2]

عربوں کے تجارت پیشہ قبائل

عربوں کی معاش کا سب سے بڑا ذریعہ تجارت تھا۔ اس لیے کم و بیش تمام عرب تجارت پیشہ پائے جاتے تھے۔ لیکن خصوصیت کے ساتھ حجاز، یمن، عمان، بحرین کے باشندوں کی تجارت بہت بڑھی ہوئی تھی [3]

عرب بائدہ : ہم نہیں بتلا سکتے کہ عرب بائدہ کی کون کون سی قومیں تجارت پیشہ تھیں کیونکہ ان کا زمانہ ہم سے نہایت دور ہو گیا ہے جس سے ان کا کوئی حال معلوم نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ عمالقہ، عاد، ثمود، حمیر وغیرہ، جو عرب بائدہ کے مشہور متمدن اقوام ہیں، ضرور تجارت کرتے ہوں گے۔

بنی قحطان : بنی قحطان (یہ لوگ تورات میں یقطان کہلاتے ہیں) جو عرب بائدہ کے بعد آکر نواحی یمن میں آباد ہوئے۔ ان کے بیشتر قبائل تجارت و زراعت پیشہ تھے۔ ان لوگوں کی تجارت نہایت وسیع تھی اور ایسی اعلیٰ اشیا کی تجارت کیا کرتے تھے، جو اقصائے عالم میں کمیاب ہوتی تھیں [4]

بنی اسمٰعیل : بنی اسمٰعیل بھی تجارت پیشہ تھے۔ یہ لوگ مسیح سے سترہ سو سال قبل ایک ملک کی پیداوار کو دوسرے ملک کی پیداوار سے تبادلہ کرتے ہوئے پائے گئے ہیں چنانچہ ایک قدیم روایت کے مطابق، جس قافلہ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے سنگدل بھائیوں سے خرید کر مصر میں فروخت کیا تھا وہ اسماعیلیوں ہی کا قافلہ تھا جو جلعاد سے گرم مصالحے، روغن بلسان لے کر مصر جا رہا تھا[5] بنی اسمٰعیل اپنی تجارت کی بدولت اس قدر مالدار تھے کہ ان کی دولت و حشمت ضرب المثل ہو گئی تھی [6]

---

[1] طائف نامی مکّہ سے ۴۰ میل پر ایک پُرفضا قصبہ ہے۔

[2] بلوغ الارب فی احوال العرب مطبوعہ بغداد جلد اوّل صفحہ ۳۸۳، ۳۸۴۔

[3] ایضاً جلد ثالث ص ۴۰۵

[4] سفر الایام باب ۹ آیۃ ۹

[5] سفر تکوین باب ۳۷

[6] سفر یشعیاہؑ۔ باب ۲۱۔ آیۃ ۱۶

بنی اُدوم : بنی اُدوم بھی عرب کے مشہور سوداگر تھے۔ چنانچہ ان کا شہر دومۃ، جس کو دُومۃ الجندل بھی کہتے ہیں، زمانۂ قدیم سے شمال اور جنوب کے درمیان یعنی ایک سمت آرام اور بابل اور دُوسری طرف ہند اور مصر کے سلسلہ تجارت کو جاری رکھنے کے لیے شاہراہ کا کام دیتا رہا۔[1]

قبیلہ قریش : ایام وسطیٰ میں تمام عرب میں اسمٰعیلیوں کے قبیلہ قریش کی تجارت نہایت وسیع تھی جس کی وجہ سے یہ قبیلہ تمام عرب میں نہایت دولت مند اور صاحب ثروت مانا جاتا تھا۔

اس قبیلہ کا لقب قریش اس کے تجارت پیشہ ہونے کی وجہ سے ہوا ہے۔ مورخ ابن خلدون قریش کی وجہ تسمیہ میں لکھتا ہے کہ قرش کے لغوی معنی کسب اور جمع کے ہیں۔ چونکہ یہ لوگ تجارت اور کسب کیا کرتے تھے اس وجہ سے ان کا نام قریش ہوا۔[2]

قریشیوں کی تجارت کے مرکز شام، یمن، حبشہ، فارس، مصر وغیرہ ممالک تھے۔ قریش شام کو موسم گرما میں جایا کرتے تھے۔ کیونکہ گرمی کا زمانہ شام میں کسی قدر آرام سے گزرتا تھا۔ اور وہاں اس فصل میں آب و ہوا اچھی ہوتی تھی۔ اور موسم سرما میں یمن کا سفر کرتے تھے کیونکہ عرب کی بہ نسبت یمن کا ملک گرم ہے اور اسی وجہ سے گرمیوں میں وہاں کا رہنا دشوار سمجھا جاتا تھا۔[3]

مورخ ابن ہشام لکھتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد ہاشم بن عبد المناف نے پہلے پہل یمن و شام کے سفر مقرر کیے تھے[4] لیکن ابن خلدون اس قول کی تکذیب کرتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ یہ رسم عرب میں ابتدائے زمانہ آبادی سے چلی آتی ہے۔[5]

قبیلہ قریش کے چند مشہور تجار

چھٹی صدی مسیحی کے وسطی ایام میں یا ظہورِ اسلام سے تھوڑا عرصہ پیشتر قبیلہ قریش کے جو بڑے بڑے تجار تھے ان کے نام یہ ہیں:

ہاشم بن عبد المناف : ان کی تجارت کا مرکز ملک شام تھا۔

عبد الشمس : ان کی تجارت کا مرکز حبشہ تھا۔

عبد المطلب : ان کی تجارت کا مرکز یمن تھا۔

نوفل : ان کی تجارت کا مرکز فارس تھا۔[6]

---

[1] ملاحظہ کیجیے پلیکس بائبل ہسٹری۔ باب چہارم فصل دوم فقرہ چہارم

[2] ابن خلدون۔ جلد ثانی ص ۳۲۴

[3] صناجۃ الطرب مطبوعہ بیروت ص ۲۹۸

[4] سیرت ابن ہشام ج ا مطبوعہ یورپ ص ۸۷

[5] ابن خلدون ج ا مطبوعہ مصر

[6] بلوغ الارب جلد ثالث مطبوعہ بغداد

قبولِ اسلام سے پیشتر قریش کا مشہور سپہ سالار ابُوسفیان ملک شام میں اور مصر کا نامور فاتح عمرو بن عاص مصر کو بغرضِ تجارت جایا کرتے تھے[1] حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اسی تجارت کی بدولت بعثت سے پیشتر دو مرتبہ ملک شام کے سفر کا اتفاق ہوا ہے[2]

حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی بچپن سے تجارت کا پیشہ کرتے تھے۔ آپ کی تجارت ایک طرف یمن اور دوسری طرف شام تک پھیلی ہوئی تھی[3] حضرت عمرؓ بن الخطاب کا ذریعہ معاش بھی تجارت کا پیشہ تھا اور آپ نے قبول اسلام سے پیشتر تجارت کی غرض سے دور دراز ممالک کے سفر بھی کیے تھے۔ مسعودی لکھتا ہے کہ آپ نے جاہلیت کے زمانہ میں عراق اور شام کے ممالک کا سفر کیا اور وہاں کے عرب و عجم کے بادشاہوں سے بھی ملے تھے[4]

علاوہ ازیں اور کئی ایک صحابہ کرام بھی ایامِ جاہلیت و زمانہ اسلام میں تجارت پیشہ تھے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عثمانؓ بزازی کی دُوکان کرتے تھے۔ سعدؓ بن ابی وقاص تیر بنا کر بیچا کرتے تھے۔ زبیر بن عوامؓ لحم فروش تھے[5]

وہ اشیا جن کی تجارت اہلِ عرب کیا کرتے تھے

عربوں کی تجارت محض عرب کی پیداوار تک ہی محدود نہ تھی بلکہ وہ ان اجناس کی بھی تجارت کیا کرتے تھے جو افریقہ، ہندوستان، چین وغیرہ ممالک سے پیدا ہوتے تھے اور ان کی تجارت میں اکثر وہ اشیا ہوا کرتی تھیں جو سامانِ عیش و عشرت سے متعلق ہیں۔ عاج، مصالحہ جات، خوشبویات، عطریات، جواہرات، سونا، لونڈی، غلام وغیرہ۔

عربوں کی تجارتی اشیا کی مفصل فہرست بیان کرنا محالات سے ہے۔ تاہم جن اشیا کا ذکر اکثر کتبِ تواریخ میں آیا ہے، وہ یہ ہیں:

دارچینی، فلفل، ناریل، گوگل، عنبر، لونگ، جوز، جوتری، الائچی، لوبان، کافور، عود، بید، ریشم، ظروف چینی، عاج، اون صوف، بانس، تمر ہندی، گھوڑے، گدھے، اونٹ، اعلیٰ درجے کے قیمتی کپڑے اور پوشاکیں، معدنیات یعنی ٹین، سیماب، سونا، چاندی، قہوہ، بخُور، مُشک وغیرہ وغیرہ۔

تورات میں بھی عربوں کی تجارتی اشیا کا ذکر ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ میں عرب کے مختلف حصّوں کے

---

[1] سید علی صاحب کا مضمون "عربوں کی تجارت"

[2] سیرۃ ابن ہشام جلد اول، مطبوعہ یورپ، ص ۱۱۵ و ۱۱۹

[3] الصدیق، مطبوعہ امرت سر صٖ

[4] الفاروق مصنفہ شبلی نعمانی ج ۱، ص ۳۰

[5] فلاحِ دارین مصنفہ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب۔

باشندے مختلف اشیا کی تجارت کیا کرتے تھے۔ ادومیوں کی تجارتی اشیا گوہر شب چراغ قرمزی اور زردوزی کتان موتی اور لعل تھے[۱]

بنو اسمٰعیل روغن بلسان، گرم مصالحے، مر بریٰ[۲]، بکروں اور مینڈھوں کی تجارت کیا کرتے تھے[۳]۔

یمن کے سوداگروں کے جو تجارتی اجناس تھے وُہ یہ ہیں:

کمخواب[۴]، چوغے، ارغوانی اور منقش پوشاکیں، بُوٹی دار نفیس کپڑے، نقیس اور خوشبودار مصالحے، جواہرات، سونا[۵]،

چاندی[۶]، چندن کے درخت کی لکڑی[۷]

عربوں کی وہ تجارتی اجناس جو خاص خاص ممالک کی پیداوار ہیں

عربوں کے تجارتی اجناس سے بعض ایسے تھے، جیسے جواہرات اور کپڑے وغیرہ اور بعض اشیا کی پیداوار اور ساخت مختلف ممالک سے مخصوص تھی۔

دار چینی: اس کو عربی میں قرفہ کہتے ہیں۔ فقط ملیبار اور سیلان میں پیدا ہوتی ہے۔ قدیم الایام میں حبشہ میں بھی پیدا ہوتی تھی مگر اب نہیں۔

فلفل: اس کو مرچ کہتے ہیں۔ بلادِ ہند، بنگالہ، دکن میں پیدا ہوتی ہے۔ ہند کے دیگر شہروں کے بہ نسبت ملیبار میں اس کی پیدائش بہت ہی زیادہ ہے۔ اسی وجہ سے عرب اس کو دار الفلفل[۸] کہتے ہیں۔ مارکوپولو، جو تیرھویں صدی مسیحی کا مشہور سیاح ہے، لکھتا ہے کہ چین میں بہت ہی بڑی گول سفید مرچ پیدا ہوتی ہے[۹]

ناریل: ناریل صرف ملیبار اور سیلان میں پیدا ہوتا ہے۔ گوگل (مقل عربی، بوے جھووان فارسی) صرف جنوبی ہند میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کی خوشبو کو یہودی لوگ استعمال کرتے ہیں۔ یہ رسم ان میں قدیم الایام سے ہے۔ اس کی وجہ سے ایرانی اس کو بوئے جھووان کہتے ہیں۔ اہلِ عرب اس کو یہودیوں کے لیے مخصوص لے جایا کرتے تھے[۱۰]

---

[۱] صحیفہ حزقئیل ۲۷ باب ۱۶ آیۃ
[۲] سفر تکوین ۳۷ باب ۲۵ آیت
[۳] صحیفہ حزقئیل ۲۷ باب ۲۱ آیت

[۴] اصل عبرانی زبان کی کتاب میں کمخواب کے لیے گلیم ہے جس کا مادہ گلم ہے اور جس کے معنی ہیں لپیٹنا۔ چونکہ جمع کا صیغہ ہے، اس لیے اس کے معنی ہیں لپیٹنے کی اشیا۔ سُریانی زبان میں اس کا ترجمہ کملات ہے اور یونانی زبان کے ترجمہ سپٹواجنٹ میں جس کو مسیح سے تین سو برس قبل یہودیوں کے ستّر علما نے اسکندریہ میں ترجمہ کیا تھا۔ اس کا ترجمہ ماخالیم کیا گیا ہے جس کے معنی کمخواب ہیں۔

[۵] صحیفۂ حزقئیل ۲۷ باب ۲۲ سے ۲۴ تک
[۶] دوم کتاب تواریخ ۹ باب ۱۳ آیت
[۷] دوم سفر الملوک ۱۰ باب ۱۱ آیت
[۸] تقویم البلدان مطبوعہ پیرس ص ۳۵۴۔ مصنفہ ابوالفدا
[۹] مارکوپولو کا سفر نامہ۔ مطبوعہ لاہور
[۱۰] مخزن الادویہ

لوبان : لوبان کی پیدائش بھی ہندوستان جنوبی سے مخصوص ہے۔ لوبان ایک قسم کا خوشبودار گوند ہے۔ آگ پر رکھنے سے کافور کی طرح اڑجاتا ہے۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ لوبان یمن میں بھی پیدا ہوتا ہے، جو کندر کہلاتا ہے۔ لیکن اس میں خوشبو نہیں ہوتی ہے[1]۔

عنبر : جزائرالہند اور میدغاشفار (میڈگاسکر) میں ہوتا ہے۔ اگرچہ یمن میں بھی اس کی پیدائش ہے لیکن بہت ہی کم۔ عنبر کی ماہیت میں اختلاف ہے۔ بوعلی سینا لکھتا ہے کہ سمندر کی تہ میں پتھر کی تہ سے کوئی چیز مومیائی یا قر کی طرح ابل کر نکلتی ہے اور تلاطم امواج مدوجزر کے باعث سے اوپر آجاتی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ دریا میں ایک گائے ہوتی ہے اس کے گوبر کو عنبر کہتے ہیں۔ چنانچہ سعدی کہتا ہے : ؎

گر بے ہنر بہ مال کند کبر بر حکیم
کون خرش شمار و گر گاؤ عنبر است

لونگ ، جوز ، جوتری ، الائچی : ملیبار میں ہوتی ہیں۔

کافور : کافور جزائرالہند اور صین الصین میں ہوتا ہے۔

عود : عود کی پیدائش ہندوستان جنوبی اور سیام سے مخصوص ہے۔ چونکہ عرب اس کو ہند سے لیتے تھے، اس وجہ سے اس کا نام ہی انھوں نے عود ہندی رکھ دیا تھا۔

ریشم : ریشم چین میں ہوتا ہے۔ یہ چین کی قدیم اور وطنی پیداوار ہے۔ مسیح سے اڑھائی ہزار برس قبل بھی چین میں اس کا رواج پایا گیا ہے[2]۔ قدیم زمانہ میں ریشمی کپڑے صرف چین ہی میں بنتے تھے۔

عاج : عاج صرف سیلان، جنوبی ہند، افریقہ میں ہوتا ہے۔

اون : اون ترکستان، تبت، مغربی چین میں ہوتا ہے۔

تمر ہندی : اس کی پیدائش جنوبی ہند سے مخصوص ہے۔

ٹین[3] : ٹین کی کانیں قدیم زمانہ میں مشرقی چین، ہندوستان میں تھیں۔

سیماب : سیماب چین میں ہوتا ہے۔

چینی کے برتن : چینی کے برتنوں کی ساخت قدیم الایام سے چین سے مخصوص چلی آتی ہے۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ صین الصین میں چینی کے کاریگر قدیم زمانہ سے ہیں اور یہیں ظروف چینی بنتے ہیں۔

---

[1] آئین اکبری

[2] سفرنامہ ابن بطوطہ مطبوعہ لاہور

[3] ٹین کو عربی میں اُسرب تنک اور سنسکرت میں رانگ کہتے ہیں۔ یہ ایک سفید اور نرم دھات ہے۔

عربستان کی پیداوار

قدیم زمانہ میں شیشہ و آلات یونان و روم میں بنتے تھے [1] عرب کا بیشتر حصہ پتھریلا اور ریتلا ہے۔ جنوبی اور مغربی کناروں پر کوہستان کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ جس میں کہیں کہیں سرسبز نخلستان بھی ہیں۔ جو حصے قدرتی زرخیز ہیں وہ زیادہ وسط اور جنوب میں واقع ہیں۔ عرب میں زیادہ تر قطعات ہیں جو کثیر النمو نباتات کی بہتات کی وجہ سے بارآور اور سرسبز ہیں اور یہاں انسان و حیوان کی نسل بھی ترقی پذیر ہے۔

قہوہ، خرما، بخور، بلسان: عرب کی مخصوص پیداوار ہیں۔ علاوہ ان کے مختلف قسم کے درخت خوشبودار بوٹیاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ نیز قیمتی معدنیات کی کانیں بھی اس سرزمین میں پائی جاتی ہیں۔

سونا وغیرہ: تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ یمن میں جو سونا، خوشبودار اشیا، جواہرات پیدا ہوتے تھے۔ نہایت عمدہ اور نایاب ہوتے تھے۔ ان کی مثل عمدہ اشیا اقصائے عالم میں نہیں ملتی تھیں [2]۔

نباتات: مصنف صناجۃ الطرب نے عرب کے نباتاتی پیداوار کی جو فہرست دی ہے، وہ یہ ہے:

طرفا، صفصاف، جھاؤ، بید، دوم، حنا، گوگل، مہندی، زنجبیل، فل، نخل، حنظ، فوہ، تیغ، فلفل، صبر، جوز، مشمش، سفرجل، تین، شقائق، نیلہ، بنفسج، قثا، موز، طلع، لبان، سونٹھ، نیلو فر، خرما، گیہوں، مجیٹھ، تمباکو، مرچ، ایلوا، بادام، زردآلو، بہی، انجیر، لالہ، بنفشہ، کریلہ، کیلہ، کھجور کی گدر پھلیاں، لوبان، یاسمین، تمر ہندی، قصب، شعیر، بن، عفص، بادنجان، رمان، ملتی، تفاح، لیموں، ورد، حزام، نرجس، خروع، بطیخ، منقے، نارجیل، عدس، چنبیلی، املی، بانس، جو، قہوہ، ڈبی (مازو)، بینگن، انار، پستہ، سیب، گلاب، نرگس، سن یا خوشبودار گھاس، ارنڈ، خربزہ، مشہور، ناریل، مسور۔

بلسان: بلسان ایک درخت ہوتا ہے۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ بلسان صرف جلعاد [3] میں پیدا ہوتا ہے۔ بلسان سے

---

[1] صناجۃ الطرب فی تقدمات العرب

[2] یہ مضمون تورات کے صحیفہ وبری ایام کی دوسری جلد کے نویں پسرق سے لیا گیا۔ اس کی اصل عبارت عبرانی ہے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے:

ملکہ سبا نے ایک سو بیس قنطار سونا اور بہت سے خوشبویات، قیمتی جواہرات اپنے ملک کے سلیمان بادشاہ کو دیے۔ اور پھر ایسی عمدہ خوشبویات، جواہرات وغیرہ سلیمان کو کہیں سے میسر نہ ہوئیں جیسے ملکہ سبا نے دی تھیں۔

[3] جلعاد (گلعاد) کا وہ ملک کہلاتا ہے، جو شمال عرب میں ہے۔ اس کے مشرق میں حجاز ہے۔ مغرب میں دریائے یردن، شمال میں باشان، جنوب میں سرزمین بنی عمون۔ یہ ملک صحرائی اور کوہستانی ہے۔ اس میں وادیاں اور نخلستان بہت ہیں۔ بلسان اسی میں پیدا ہوتا ہے۔
(ملخص از بائبیلکل گزیٹیر مطبوعہ یورپ)

جو روغن بنایا جاتا ہے، اس کا ذکر تورات میں بار بار آتا ہے اور ہر کہیں بھی وہ جلعاد کا روغن بلسان کہلاتا ہے۔ روغن بلسان قدیم زمانہ میں بطور دوا کے استعمال کیا جاتا تھا اور اکثر زخموں پر اس کو لگاتے تھے۔[1]

خرما: عرب میں عام طور پر ہوتا ہے اور اس کے نخلستان تمام عربستان میں ہیں۔

قہوہ: قہوہ صرف یمن میں ہوتا ہے۔ قدیم الایام سے دنیا میں یہیں سے جاتا ہے۔ یمن کا بندر مخا قہوہ کا مشہور تجارت گاہ تھا اگرچہ قہوہ کی زراعت فرانس، فلنک، انگلینڈ وغیرہ میں شروع ہوگئی ہے۔ لیکن یمنی قہوہ اور یورپی قہوہ میں بڑا فرق ہے۔[2]

بخور[3]: بخور بھی عرب کی مخصوص پیداوار ہے۔ اس کی تجارت دنیا میں سوائے عربوں کے کوئی نہیں کرتا تھا۔ ہیرو ووطس لکھتا ہے کہ یونانیین کو بخور سوائے عربوں کے کسی اور کے یہاں سے نہیں ملتا تھا۔ ایک مورخ لکھتا ہے بخور وہی ہے جس سے یونانی لوگ اپنے مکانوں اور معابد میں اور رہبانی اپنے کاہنوں کی قبروں پر دھونی دیتے تھے۔ مصر کے بطلیموسی اور رومی بادشاہوں کے عہد میں مصر کے باشندے اس کو عرب کے تجار سے، جو بحر احمر کی راہ سے آیا کرتے تھے، خریدتے تھے اور عرب اس کے معاوضہ میں جواہرات اور عمدہ عمدہ قسم کے معدنیات لیتے تھے، جس سے اپنے شہروں اور معابد کی عمارتوں کو آراستہ کرتے تھے۔[4]

عرب میں کئی ایک ایسے اجناس بھی ہوتے ہیں جو مختلف ممالک کی مخصوص پیداوار ہیں۔ مثلاً مرچ، ناریل وغیرہ۔ مگر ان کی پیدائش عام طور سے نہیں ہے، بلکہ صرف یمن کے بعض شہروں میں، جو مثل ظفار وغیرہ کے تھے، پیدا ہوتے تھے۔[5] ان اجناس کو سوداگروں نے مختلف ملکوں سے، جہاں ان کی پیدائش مخصوص تھی، لاکر رواج دیا ہے۔

حیوانات: عرب کے حیوانات سے گھوڑا، اونٹ، بھیڑ، بکرے، بینڈھے، ہرن، گدھے مشہور ہیں۔ حکمائے علم حیوانات کی رائے میں عرب گھوڑے کی اصلی اور حقیقی جائے پیدائش ہے۔ عربی گھوڑوں میں تیزی، چالاکی، وفاداری، جاں نثاری فطرتاً ودیعت ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان گھوڑوں کی شہرت تمام عالم میں ہے اور ہر ایک ان کا خواہاں ہوتا ہے۔ عرب کا گدھا مشہور ہے۔ یہ قوت میں قریباً خچر کے برابر ہوتا ہے۔ حاجیوں کا جو قافلہ مکہ معظمہ کو جاتا ہے وہ انھیں گدھوں پر جاتا ہے۔ تخمینہ کیا گیا، تو معلوم ہوا ہے کہ عربی گدھا ایک گھڑی میں ڈیڑھ ہزار قدم چلتا ہے۔[6] عرب کے گھوڑے اور گدھے قدیم زمانہ میں ممالک غیر میں بہت جاتے تھے اور عربوں کو ان سے بڑی بڑی قیمتیں ملتی تھیں۔ اب بھی عرب میں گھوڑوں اور گدھوں کی تجارت بہت ہوتی ہے۔[7]

---

[1] صحیفہ یرمیاہ علیہ السلام

[2] صناجۃ الطرب

[3] بخور ایک قسم کی گھاس ہوتی ہے اس کو ایرانی چنگ مریم اور پنجہ مریم کہتے ہیں (منتخب اللغات) یہ گھاس زیادہ تر حجاز میں ہوتی ہے۔

[4] صناجۃ الطرب

[5] صناجۃ الطرب مطبوعہ بیروت صفحہ ۲۰۲

[6] صناجۃ الطرب مطبوعہ بیروت ص ۲۰۳

[7] انسائیکلوپیڈیا برٹینکا میں دیکھو "عربیا"

اونٹ عربوں کی تجارت کا بہت بڑا جزو ہے۔ یہ لوگ اس پر اپنے تجارتی اجناس کو لاد کر ریگستانی دشوار گزار راستوں کو طے کرتے اور غیر ممالک میں آیا جایا کرتے ہیں۔ یہ طریقہ ان میں قدیم الایام سے مروّج ہے۔[۱]

معدنیات و جواہرات

قدیم الایام میں عرب میں قیمتی معدنیات کی بے شمار کانیں تھیں۔ بلادِ یمن سونے چاندی کی ہمہ تن کان تھی۔[۲] زمانہ قدیم میں اوفیر کا سونا نہایت مشہور تھا۔ حضرت یشعیاہ علیہ السلام کہتے ہیں کہ اوفیر کے سونے کے مثل سونا دُوسرے ملکوں میں کمیاب ہے۔[۳]

عرب کے جواہرات میں زبرجد، زمرد، حدید نہایت مشہور ہیں۔ جزع، عقیق صرف یمن میں پیدا ہوتے ہیں۔ اسی لیے جزعِ یمانی اور عقیق یمنی مشہور ہیں۔

موتی: موتی خلیج فارس سے عمان اور بحرین کے شہروں میں نکلتا ہے۔ جزائر بحرین قدیم زمانہ میں اپنے نایاب موتیوں کے باعث نہایت مشہور تھے۔ اب بھی ان سے ایسے ایسے موتی نکلتے ہیں جن کی نظیر عالم میں نہیں ملتی۔[۴]

صنعت و حرفت

قدیم زمانہ میں اہلِ یمن کو صنعت و حرفت میں کمال حاصل تھا۔ چنانچہ شداد کا عدیم المثال باغ، جو باغِ ارم یا بہشتِ شداد کہلاتا ہے اور جس کا مثل و نظیر آج تک نہیں دکھلا سکا اور جس کی نسبت صانع ہستی ارشاد فرماتا ہے:

لم یخلق مثلها فی البلاد۔

انہی لوگوں کی صنعت کا نمونہ تھا۔

مورخین نے عربوں کی صنعت و حرفت کا بہت ہی کم ذکر کیا ہے۔ ایک مسیحی مصنف لکھتا ہے کہ یمن میں قدیم زمانہ میں کپڑے بننے کے کارخانے، شیشہ بنانے اور آلات کے کارخانے تھے اور یہاں کے لوگ سونے چاندی کے ظروف اور زیور بھی بناتے تھے، جو نہایت خوب صُورت اور قابلِ قدر ہوتے تھے۔ آلاتِ موسیقی سے طنبور اور ستار نہایت خوبصورت بناتے تھے اور زنبیل انھیں کی صنعتوں سے ہے۔[۵]

قدیم عربوں کو کپڑا بننے میں بھی کمال حاصل تھا۔ وشی، قصب، حریر، قالین نہایت عمدگی سے بناتے تھے۔[۶] سامانِ چوبی مثل کرسی وغیرہ بھی نہایت خوبی سے تیار کرتے تھے۔ صاحبِ بلوغ الارب نے ان کے آلات نجاری کی جو

---

[۱] سفر تکوین باب ۳۷۔ آیت ۲۵

[۲] صناجۃ الطرب۔ مطبوعہ بیروت

[۳] صحیفہ حضرت یشعیاہ، باب ۱۳۔ آیت ۱۲

[۴] صناجۃ الطرب ص ۱۲

[۵] صناجۃ الطرب ص ۳۰۱

[۶] بلوغ الارب ج ۳

طول وطویل فہرست بیان کی ہے، اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں فنِ نجاری میں یدِ طُولیٰ حاصل تھا۔[1]
عربوں اور بالخصوص اہلِ حجاز کو بہادری میں بہت کچھ حصہ ملا تھا اور ان میں ہمیشہ میدان کا رزار گرم رہا کرتا تھا۔ اس وجہ سے ان کو آلاتِ حرب کی ساخت میں بھی خاص ملکہ تھا۔[2] چنانچہ سلوق (یہ شہر یمن میں ہے) کی زرہ اور کٹّان اور خط (یہ شہر بحرین میں ہے) کے نیزے، حجاز کے تیر، عرب کی شمشیر مشہور ہے۔

---

[1] بلوغ الارب مطبوعہ بغداد

[2] صناجۃ الطرب

اسلامی انقلاب کا اثر جاہلی معاشرے پر

حبیب احمد

کتنا عظیم الشان تھا وہ انقلاب، جو فتح مکہ کے بعد —— پندرہ برس کے اندر اندر —— تمام جزیرۃ العرب میں برپا ہو گیا۔ اس کی عظمت کو دیکھتے ہوئے اگر آپ یہ کہیں کہ اسے انقلاب سے بڑھ کے کوئی نام دینا چاہیے، تو مبالغہ نہ ہو گا۔ یہ ایک نئی تہذیب تھی، جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی، اس مختصر زمانے میں عرب بت پرستی سے نکل کر اسلام کی طرف آئے اور ان کی قبائلی ناانصافی اور قومی نفرت ایک ایسی وحدت میں بدل گئی، جو ہمہ گیر سیاست اور مشترک غرض کے بل پر قائم تھی۔ اس سے پہلے وہ جزیرہ نمائے عرب کی حدود میں سمٹے ہوئے تھے اور اس کے بعد یہ ایک ایسی وسیع سلطنت کے مالک بن گئے، جس میں رومی اور ایرانی دونوں سلطنتیں تحلیل ہو گئی تھیں۔ پہلے ان کی اکثر آبادیوں پر بدویت کی سختی و تنگ دستی چھائی ہوئی تھی اور اب وہ ایک ایسی آسودگی و خوش حالی کی زندگی بسر کرنے لگے، جو اس سے پہلے ان کے لیے اجنبی تھی۔ ان حالات میں کوئی تعجب نہیں، اگر ان کی اجتماعی زندگی ان برق رفتاریوں سے متاثر ہو جاتی اور زندگی اور مطالبِ زندگی کے متعلق ان کا نقطۂ نظر بدل جاتا۔

اور ہوا بھی یہی —— وہ تمام محرکات جنھوں نے عربوں میں اس نئی تہذیب کو جنم دیا، ان کی انفرادی اور جماعتی دونوں زندگیوں پر اپنا اپنا اثر پہلے سے کسی حد تک رکھتے تھے۔ مذہبی محرک کا اپنا اثر، سیاسی محرک کا اپنا اثر اور اقتصادی محرک کا اپنا اثر۔ یہ اثرات بعض اوقات متناقض ہوتے تھے، لیکن وہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہو کر آپس میں گھل مل گئے اور انہوں نے اجتماعی زندگی میں کچھ ایسی تبدیلی پیدا کر دی کہ اس کا جو اثر بعد کو اسلام اور مسلمانوں کی زندگی پر مترتب ہوا، وہ نگاہوں کو اپنی طرف کھینچتا اور دماغ کو اپنے متعلق سوچنے کی دعوت دیتا ہے۔

اس انقلاب کی وسعت کا اندازہ کرنے کے لیے مناسب یہ ہے کہ ہم عربوں کی اسلام سے پہلے کی اجتماعی زندگی پر نظر ڈالیں۔ عربوں کی اکثریت صحرا میں زندگی بسر کرتی تھی۔ شہری آبادی بہت کم تھی، جس کا سبب یہ تھا کہ جزیرہ نمائے عرب میں باقاعدہ بہنے والی نہریں نہ تھیں اور نہ وہاں سال بسال وہ موسمی بارشیں ہوتی تھیں، جو زمین کو سرسبز و زرخیز بناتی ہیں۔ چند علاقوں کو چھوڑ کے پورے جزیرۃ العرب میں کھیتی باڑی کا کوئی نظام نہ تھا۔ پھر شہر اور بستیاں ان مقامات پر آباد تھیں، جہاں چشموں کی بہتات ہوتی تھی۔ باقی جو کچھ تھا، ریگستان ہی ریگستان تھا۔ جہاں بارشیں ہوتیں، سبزہ اُگ آتا ورنہ زمین بے آب و گیاہ رہتی۔ اس لیے یمن کے ریگزار بھی دوسرے ریگزاروں کی طرح اہلِ یمن کے ایک بڑے حصے کو شامل تھے۔ البتہ نجد، حجاز اور عرب کے دوسرے تمام علاقوں میں شہری اور صحرائی آبادی کا جو تناسب تھا، اسی کے لحاظ سے یمن کی شہری آبادی اس کی صحرائی آبادی سے زیادہ تھی۔

ریگستان میں اجتماعی زندگی کی اساس قبیلہ تھا۔ قبیلہ خاندانوں سے ترکیب پاتا تھا اور خاندان افراد کے نسبی اور قرابتی تعلقات سے وجود میں آتے تھے۔ خاندان کا ہر گھر نمدے کے خیمے میں رہتا تھا تاکہ جب کوئی قبیلہ اپنے اونٹوں کے لیے چراگاہ اور اپنے

بال بچوں کے لیے رزق کی تلاش میں کوچ کرنا چاہے تو اسے اٹھا کر لے جانے میں سہولت رہے قبیلے اکثر گرمی اور بہار کے موسم میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جایا کرتے تھے۔ جب ریگستان کے چھوٹے چھوٹے چشموں کے گرد گھاس کثرت سے اُگ آتی تھی لیکن موسم سرما کی آمد پر چراگاہیں خشک ہو جاتی تھیں، تو یہ لوگ شہروں کا رُخ کرتے تھے اور ان کے قریب ڈیرے ڈال دیتے تھے۔ پیٹ بھر روٹی حاصل کرنے کے لیے وُہ اہلِ شہر کے ساتھ مل کر کام کرتے تھے، یا ان پر چھاپے مارتے تھے اس لیے کہ ان کی کفیل وہ آزادی تھی، جو انہیں اچھے سے اچھے کھانے اور بہتر سے بہتر کپڑے سے زیادہ عزیز تھی۔

یہ ہے بدوی زندگی کے خاندانی اور گھریلو نظام کا مختصر سا خاکہ، جس میں بحیثیت مجموعی عرب کی شہری زندگی کے خاندانی اور گھریلو نظام کی تصویر بھی شامل ہے۔ اس لیے کہ شہروں کے رہنے والے بھی بدویوں کی طرح قبیلوں ہی میں منقسم تھے اور ان میں سے اکثر بدوی الاصل تھے جن کے دلوں میں شہری زندگی کا شوق پیدا ہُوا اور وُہ شہروں میں آ کے رہ بس گئے۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد شاید آپ آج بھی ان بدویوں میں جنہیں ہنوز تہذیب و تمدن کی ہوا نہیں لگی، اس نظام کے بچے کھچے آثار کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ اگرچہ اسلام نے بہت کچھ اسے مٹا دیا تھا۔

عرب کے بدویوں اور شہریوں کا خاندانی اور گھریلو نظام آپس میں ملتا جلتا تھا لیکن زندگی کے سرو سامان اور اس چیز میں، جسے آج ہم "اقتصادی نظام" سے موسوم کرتے ہیں، وُہ ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔ اہلِ شہر اپنی زندگی تجارت اور اپنے ان باغوں، نخلستانوں اور کھیتوں کی پیداوار کے سہارے بسر کرتے تھے، جن میں بونے، جوتنے اور دیکھ بھال کے کام وہ کرایہ کے آدمیوں سے لیتے تھے اور اپنی اس تجارت و زراعت سے انھیں بہت زیادہ آمدنی ہوتی تھی۔ ان میں سے اکثر اپنا روپیہ سُود پر چلاتے تھے اور جو لوگ کاروبار وغیرہ کرنا چاہتے تھے، انھیں بھاری منافع پر قرض دے کر اپنی رقم تھوڑی سی مدت میں دُگنی کر لیتے تھے۔ یہ سب لوگ زندگی کی ان راحتوں اور آسائشوں میں کھیلتے تھے، جن سے اہلِ بادیہ واقف بھی نہ تھے۔ شراب، موسیقی اور جُوا، ان کے لیے دن رات کا مشغلہ تھا اور خواہشوں کی شکم سیری نے زندگی کو ان کی نظر میں محبوب اور اطمینان افزا بنا دیا تھا۔ تجارت اور سُود سے جو بے شمار نفع انھیں ہوتا تھا اس کی وجہ سے وہ لذتوں میں ڈوب گئے تھے اور بلند اخلاقی کی بہت سی خوبیاں ان کی کتابِ زیست سے محو ہو گئی تھیں۔

لیکن خانہ بدوشی کی زندگی چراگاہوں کی تلاش اور اونٹ کے گوشت اور دودھ سے ترکیب پاتی تھی۔ ایک بدوی کی ملکیت نمدے کا ایک خیمہ ہوتا تھا جس میں وُہ اپنی زندگی بسر کرتا تھا یا وُہ غلّہ اور پھل جو اپنے گردوپیش کی زمین میں وُہ بوتا تھا۔ کیونکہ قاعدہ یہ تھا کہ کھیت اس کا ہے جو اس کو بوئے۔ لیکن یہ ملکیت برائے نام ہوتی تھی۔ اس لیے کہ بدوی زراعت کو پسند نہ کرتے تھے اور کھیتی باڑی کو اپنے مرتبے سے کم تر سمجھتے تھے۔ لیکن قبیلے کی آبادی کے اردگرد جو چراگاہ ہوتی تھی، وہ قبیلے کی مشترکہ ملکیت سمجھی جاتی تھی۔ یہی حال اس گھاس کا تھا، جو ریگستانی آبادی کی ان محفوظ چراگاہوں میں پیدا ہوتی تھی اور ہمسایہ قبائل کو یہ حق حاصل تھا کہ باہمی مفاد کے پیشِ نظر ایک قبیلہ اپنی زمین کا تبادلہ دُوسرے قبیلے کی زمین سے کرے۔

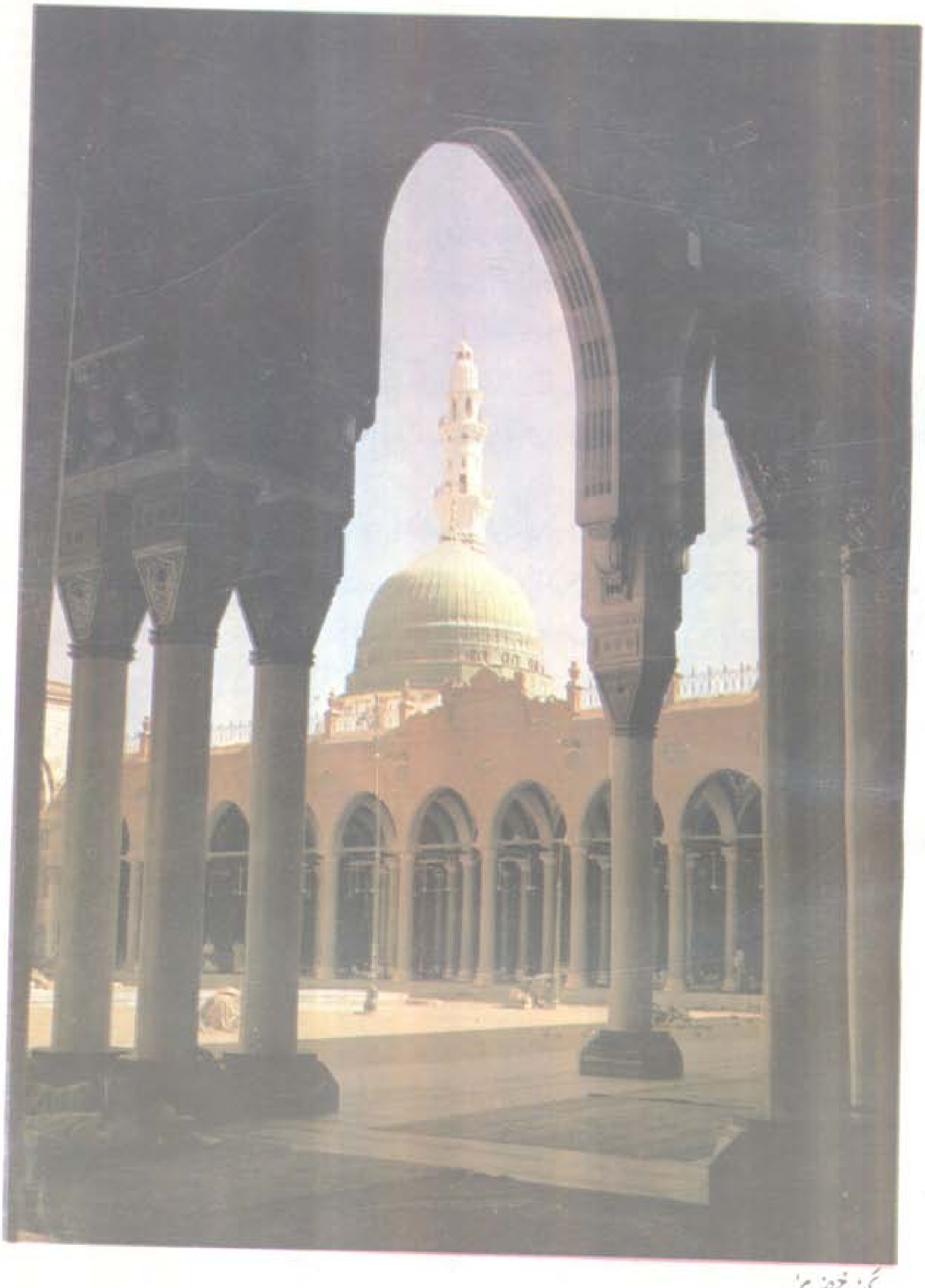
قبائلی بستیوں کی حد بندی آپس کے اتفاق اور رواجی یکسانی سے ہوتی تھی اور جب کوئی قبیلہ چراگاہ کی تلاش میں نکلتا تھا، تو کسی دُوسرے قبیلے کے لیے جائز نہ تھا کہ اس کی جگہ آباد ہو جاتے یا اس کے رشتہ داروں اور ساتھیوں سے خُون خرابہ کرے۔ لیکن

اس قسم کی دراز دستیاں عام تھیں اور ان کے نتیجے میں قبائل کی باہمی پیکار کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ اس لیے ایک بدوی پیدائشی طور پر شمشیر آزما اور قبائل کی زندگی اکثر اوقات مار دھاڑ اور چھینا جھپٹی کی زندگی ہوتی تھی۔

حملہ اور انتقام کے خوف کا یہ فطری اثر تھا کہ وہ قبیلے کی یک جہتی میں اضافہ کر دیتا اور اس یک جہتی کی مزید تقویت کے لیے اس قبیلے کے افراد کو ماضی کی یادوں اور اپنے اسلاف کے جرأت آموز اور شجاعت انگیز کارناموں کے طلسم زار میں پہنچا دیتا اور یہی راز تھا عربوں کی اپنے نسب سے غیر معمولی دلچسپی کا کہ اس کے ذریعے وہ دُوسروں پر اپنی بڑائی جتائیں۔ اپنی یک جہتی کو تقویت دیں اور اپنے اسلاف کی بلندیوں تک پہنچیں جو شجاعت، سخاوت، پناہ گیری کی حمایت اور اسی قسم کی ان دوسری خوبیوں کے لیے مشہور تھے، جن کا بیج بدوی زندگی نے ان کی فطرت میں بویا تھا اور جو ان کی سیرت و کردار کا ایک مستقل جزو تھیں اور اخلاف کا یہ فرض تھا کہ ان خوبیوں سے اپنے اسلاف کی تقلید کریں کہ انہی خوبیوں کے سہارے وہ بدوی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ ایک بدوی ہمیشہ دوسروں کے حملے کی زد میں رہتا تھا اور بدویانہ زندگی عسرت و تنگ دستی کی زندگی تھی، جو کبھی کبھی فاقہ کشی تک پہنچ جاتی تھی۔ اس لیے اگر اہلِ بادیہ شریف و سخی نہ ہوتے، مہمانوں کی مدارات اور پڑوسیوں کی حمایت نہ کر سکتے، تو ان میں سے اکثر ہلاک ہو جاتے۔ پھر صحرا کی زندگی خطرات پر غالب آنے اور حملہ آوروں کو شمشیر بشمشیر جواب دینے کی زندگی تھی۔ اس لیے اگر اہلِ صحرا بہادر، زیرک اور توانا نہ ہوتے، تو زندگی کا بوجھ انھیں کچل ڈالتا اور اگر ان میں مدافعت کی وہ صلاحیت نہ ہوتی، جو دوسروں کو ان سے خوفزدہ کر دیتی تو انھیں شر و فساد میں مبتلا ہو جانا پڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظم و نثر کا بیشتر حصہ فخر و شجاعت اور سخاوت و مکارم کے ذکر پر مشتمل ہے اور ان میں مختلف فضیلتوں کا بیان پایا جاتا ہے، جو خانہ بدوشی کی زندگی کا لازمہ تھیں اور جو اہلِ صحرا کو اپنے اعادہ و تکرار پر مجبور کرتی تھیں۔ وہ صرف انہی لوگوں کے خلاف نہیں بھڑکتے تھے، جو ان کی بستیوں پر حملہ آور ہوں بلکہ جان و مال، عزت و ناموس غرض یہ کہ ہر قدر کو ٹھیس لگنے پر بھڑک اٹھنا ان کا عام دستور تھا۔ قبیلہ اپنے ہر فرد کا انتقام لینا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ جو لڑائیاں عزّت اور ناموس کے انتقام میں شروع ہوتیں، ان کی آگ برسوں تک سُلگتی رہتی۔ اگر کوئی قبیلہ بطور خود انتقام لینے کے قابل نہ ہوتا تو وُہ اپنے حلیف یا ہمسایہ قبائل سے درخواست کرتا کہ وہ اس کا ساتھ دیں۔ اس قسم کے معاہدے عرب میں عام تھے اور ان معاہدوں کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ حلیف قبیلے مظلوم کا ساتھ دیں گے اور اس وقت تک تلوار نیام میں نہ رکھیں گے جب تک مظلوم اپنا حق نہ پا لے۔

ان کے ہر قبیلے بلکہ ہر گھر کا ایک الگ بت تھا، جس کی وہ پرستش کرتے تھے لیکن بتوں کو پوجتے وقت وُہ اللہ کے وجود سے انکار نہ کرتے تھے بلکہ انھیں اللہ کے ساتھ شریک کرتے اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ وہ حجِ کعبہ کے وقت لبیک کہتے ہُوئے اللہ کا نام لیتے اور ان بتوں کا اس کے شریک کی حیثیت سے ذکر کرتے تھے۔ بعض قبائل کہتے: ”حاضر ہوں یا اللہ! میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں سوائے اس کے جو تیرا شریک ہے۔ تو اس کا اور دوسری چیزوں کا مالک ہے۔“ قریش کعبہ کا طواف کرتے اور کہتے: ”قسم ہے لات و عزّیٰ اور تیسرے منات کی۔ یہ اعلیٰ غرانیق ہیں اور ان کی شفاعت قابلِ اعتماد ہے۔“ قرآن کہتا ہے: ”وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ۔“

یہ ہے اسلام سے پہلے عربوں کی اجتماعی زندگی کے عقاید و عادات کی اجمالی تصویر، جسے دیکھ کر آپ بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ



گنبد خضریٰ

اسلام نے ان میں سے کن کن چیزوں کو مٹایا۔ فطری طور پر شرک ہی تھا، جس کا اثر سب سے پہلے عربی ذہن سے محو ہوا، عربوں نے شرک کے متعلق وہ آیات سنیں، جنھوں نے قبولِ اسلام کے بعد انھیں شرک کا سب سے بڑا دشمن بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت جن لوگوں نے راہِ ارتداد اختیار کی یا نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا، انھوں نے بھی اللہ کا کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا بلکہ ہر جھوٹے نبی نے یہی اعلان کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی قوم کے نبی تھے اور وُہ اپنی قوم کا نبی ہے اور جب ارتداد کا خاتمہ ہو گیا تو سارا عرب لا الٰہ الا اللّٰہ و انّ محمّد رسول اللّٰہ پر ایمان لے آیا۔

شرک کے اس خاتمے کا عربوں کے ذہن اور ان کی اجتماعی زندگی پر بڑا گہرا اثر پڑا۔ اب مسلمانوں کا خدا کے سوا کوئی آقا نہ تھا، بلکہ ان کی تمام تر عقیدت صرف اللہ جل شانہ کے لیے مخصوص ہو گئی تھی۔ اب کوئی مسلمان اپنی زندگی کے مسائل میں غیر خدا سے مدد کا طالب نہ ہوتا تھا۔ اب وُہ خدا سے لَو لگاتے تھے، اسی پر بھروسہ کرتے تھے اور اسی سے مدد چاہتے تھے۔ اس سے عربی عقل اور عربی ضمیر پر بت پرستی کی جو بیڑیاں تھیں، وُہ کٹ گئیں اور یہ دونوں انسان کے لیے ترک و اختیار کی کسوٹی بن سکے اس کے اور خدا کے درمیان تنہا وسیلہ ہو گئے۔

عربی عقل بت پرستی کی زنجیروں سے آزاد ہو کر اللہ پر ایمان لے آئی، جو ہر چیز کا خالق ہے اور اسے وہم کی غلامی اور ان رسوم کی بندگی سے نجات مل گئی جو اس پر جاہلیت نے فرض کر رکھی تھیں۔ اللہ کی طرف سے آیا ہوا پیغام اب اس کی نگاہوں کے سامنے تھا، اور وہ اسے اپنانے کے لیے آمادہ تھی۔ عقل کی اس آزادی کا مذہبی زندگی کی طرح اجتماعی زندگی پر بھی بہت گہرا اثر پڑا۔

آبائی رسم و رواج کے خلاف یہ بغاوت واقعی اپنے اندر اتنی جان رکھتی تھی کہ عربی زندگی میں اساسی طور پر ایک ایسا اجتماعی انقلاب برپا کر دیتی، جو بدویّت اور مدنیت دونوں کو شامل ہوتا۔ یہ بغاوت وحی کے ذریعہ آئی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی۔ اس لیے وہ اللہ کا ایک حکم تھی، جس سے بچنے کا کوئی رستہ نہ تھا اور جس کی تعمیل بہر صورت ہوتی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عربی ذہن پر اس بغاوت کا اثر اس فعلی بغاوت کے اثر سے زیادہ شدید تھا، جس نے بتوں کو ڈھا کر اور شرک سے انکار کر کے اللہ کی وحدانیت کا اقرار کیا جب کبھی عقل و دل غلامی کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہُوئے ہیں، آزادی کے نور سے ضیا اندوز ہونے کے لیے اسی کی طرف دوڑے ہیں۔ یہی حال ہماری فکر اور ہمارے ذاتی عقاید کا ہے۔ لیکن جہاں زندگی پر ہمارے اختیارات اور دوسروں سے ہمارے تعلقات کا سوال آتا ہے، اطاعت و تسلیم کی ڈوری میں تردّد اور ہچکچاہٹ کی گرہیں پڑنے لگتی ہیں اور عقل کی سرافرازی کے باوجود چاہتے ہم یہی ہیں کہ ہمارا اقتدار بہر صورت قایم رہے اور جو کچھ اس میں کمی آ گئی ہے، وہ کسی نہ کسی طرح پوری ہو جائے اس لیے کہ ہماری خواہشوں کا مقتضا یہی ہے عقل جتنی چاہے خواہشوں سے بلند ہو جائے اور آزادیِ فکر جتنا چاہے بلند معانی پر عبور حاصل کر لے۔ انسان پر حکومت وہی جبلت کرتی ہے جو تمام خواہشوں کا مدار ہے۔

آجکل کی اصطلاح میں جسے "اکتسابی حقوق" سے موسوم کیا جاتا ہے، وُہ دراصل مادی منفعتیں ہیں، انسانی فطرت مادی منفعتوں سے غیر معمولی تعلق رکھتی ہے اور باقی تمام چیزوں سے زیادہ ان سے چمٹی رہتی ہے۔

قرآن جو اقتصادی انقلاب لے کر آیا تھا، اس کا اثر اجتماعی انقلاب سے کم نہ تھا دولت مند تاجر اور سردار وغیرہ جنھیں

زمانۂ جاہلیت میں امتیازی مقام حاصل تھا، محتاجوں اور مزدوروں سے غرور و تبختر کے ساتھ پیش آتے تھے اگرچہ یہ غرور و تبختر ان کی آزادی و خودداری کا گلا نہیں گھونٹ سکتا تھا اس لیے مالدار لوگ جب کسی محتاج کو کچھ دیتے تھے، تو رس کھا کے دیتے تھے اور پھر احسان جتا جتا کے اپنی عطا و بخشش کو مرتبے کی بلندی کا ذریعہ بناتے تھے۔

اسلام نے نزولِ وحی کے آغاز ہی میں انانیت کے اس جذبے کا مقابلہ کیا۔ لوگوں میں اخوت و مساوات کی بنیاد رکھی مال داروں کو اس خیرات پر سرزنش کی، جس کے نتیجے میں وہ احسان جتا جتا کے کچھ دیتے تھے اور محتاجوں کے لیے مالداروں پر زکوٰۃ فرض کی:

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى۔

(۲ : ۲۶۳-۲۶۴)

ایک میٹھا بول اور کسی ناگوار بات پر ذرا سی چشم پوشی اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ ہو۔ اللہ بے نیاز ہے اور بردباری اس کی صفت ہے۔ اے ایمان والو! اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دکھ دے کر خاک میں نہ ملاؤ۔

اور فرمایا:

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ۔

اگر اپنے صدقات علانیہ دو تو یہ بھی اچھا ہے لیکن اگر چھپا کر حاجت مندوں کو دو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے۔

صدقہ مالداروں کا فقیر پر احسان نہیں بلکہ فقیر کا مالدار کی دولت میں حق ہے:

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا — — — — — —
— — — — — — — — — —
— — — — — — — — — —
— — — — — — — — — —
— — — — — — — — — —
— — — — — — — — — —
وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۔ (۹ : ۶۰)

یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو صدقات کے کام پر مامور ہیں اور ان کے لیے جن کی تالیفِ قلوب مطلوب ہو۔ نیز گردنوں کے چھڑانے اور قرضداروں کی مدد کرنے میں اور راہِ خدا میں اور مسافر نوازی میں استعمال کرنے کے لیے ہیں۔ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا و بینا ہے۔

اور فقیر کا یہ حق مساوی ہے والدین کے اس حق کے، جو ضرورت کے وقت انہیں اپنے بیٹے کے مال میں حاصل ہوتا ہے:

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ

لوگ پوچھتے ہیں ہم کیا خرچ کریں؟ جواب دو کہ جو

خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ - (۲ : ۲۱۵)

مال بھی تم خرچ کرو، اپنے والدین پر، اپنے رشتہ داروں پر، یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کرو اور جو بھلائی بھی تم کرو گے، اللہ اس سے باخبر ہوگا۔

یہ ایک نئی تعبیر ہے، جس کی اساس پر آپ بآسانی اسلامی نظم معیشت کی مکمل عمارت کھڑی کر سکتے ہیں، پھر یہ ایک ایسی تعبیر ہے کہ اس قسم کی قوت سے عرب پہلے ناآشنا تھے ہر زمانے میں لوگ احسان وعطا کے متعلق یہ کہتے رہے ہیں کہ وہ دینے والے کا کرم ہے، لینے والے کا حق نہیں۔ لیکن قرآن احسان وعطا کو حق سمجھتا ہے اور صرف یہ حق ہی ہے جو مالداروں کی دولت کو گناہ کی آمیزش سے پاک کرتا ہے۔ اسی لیے شروع شروع اس نغمے کے جاندار اثر نے اسلام کی اشاعت میں کام کیا اور بعد کو اسلامی جماعت میں وہ برق رفتار تبدیلیاں پیدا کیں، جو اسی نظم معیشت کا لازمی ثمرہ تھیں۔

سُود کے خلاف اسلام نے نہایت شدید جنگ کی۔ ارشادِ الٰہی ہے:

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيْمٍ - (۲ : ۲۷۶)

اللہ تعالیٰ سُود کو ہلاک کرتا ہے اور صدقات کو نشوونما دیتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے بدعمل انسان کو پسند نہیں کرتا۔

اور ارشاد ہے:

اَلَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ إِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ - (۲ : ۲۷۵)

وہ لوگ جو سُود کھاتے ہیں، ان کا حال اس شخص کا سا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر باؤلا کر دیا ہو۔

بلکہ قرآن نے سُود کو لوگوں کے مال ناجائز طریقوں پر کھانے سے تعبیر کیا:

وَأَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَأَكْلِهِمْ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيْمًا - (۴ : ۱۶۱)

اور وہ سُود لیتے ہیں جس سے انھیں منع کیا گیا تھا اور لوگوں کے مال ناجائز طریقوں سے کھاتے ہیں اور جو لوگ ان میں سے کافر ہیں، ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں سُود کا جو رواج تھا، اللہ نے اسے حرام قرار دے دیا اور تاکید فرما دی کہ جو شرائط پہلے طے پائی تھیں، ان کے مطابق کوئی شخص ایک حبہ بھی وصول نہ کرے:

يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ فَإِنْ

اے ایمان والو! خدا سے ڈرو اور جو کچھ تمھارا سُود لوگوں پر باقی ہے، اُسے چھوڑ دو، اگر واقعی تم

02063

لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۔ (۲: ۲۷۸-۲۷۹)	ایمان لائے ہو، لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلانِ جنگ ہے اب بھی توبہ کر لو اور سود چھوڑ دو تو اصل لینے کے تم حقدار رہو نہ تم ظلم کرو، نہ تم پر ظلم کیا جائے

اس اقتصادی و معاشی تنظیم کا اجتماعی زندگی پر اس قدر قوی اور گہرا اثر پڑا کہ سُود خواری جاہلی معاشرے سے کلیتہً مٹ گئی، جسے مسلمانوں کی عظیم اکثریت کی پُرجوش تائید نے اپنے معاشرے میں کہیں بھی اور کسی زمانے میں بھی ابھرنے کا موقع نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس آخری زمانے تک مسلمان اپنی پوری قوتوں کے ساتھ اس معاشی مفسدے سے نفرت کرتے چلے آئے ہیں۔

دنیا کی تاریخ میں کوئی نظیر اس قدر عظیم، مستحکم، ہمہ گیر اور پائندہ انقلاب کی نہیں ہے۔

بعثتِ محمدیؐ سے پہلے

سیّد ابوالحسن علی ندوی

چھٹی صدی مسیحی کی دُنیا

چھٹی صدی مسیحی بلا اختلاف تاریخِ انسانی کا تاریک ترین و پست ترین دَور تھا، صدیوں سے انسانیت جس پستی و نشیب کی طرف جارہی تھی اس کے آخری نقطہ کی طرف پہونچ گئی تھی، روئے زمین پر اس وقت کوئی ایسی طاقت نہ تھی جو گرتی ہوئی انسانیت کا ہاتھ پکڑ سکے اور ہلاکت کے غار میں اس کو گرنے سے روک سکے، نشیب کی طرف جاتے ہوئے روز بروز اس کی رفتار میں تیزی پیدا ہو رہی تھی، انسان اس صدی میں خدا فراموش ہو کر کامل طور پر خود فراموش بن چکا تھا وہ اپنے انجام سے بالکل بے فکر اور بے خبر اور بُرے بھلے کی تمیز سے قطعاً محروم ہو چکا تھا، پیغمبروں کی دعوت کی آواز عرصہ ہوا دب چکی تھی۔ جن چراغوں کو یہ حضرات روشن کر گئے تھے وہ ہواؤں کے طوفان میں یا تو بجھ چکے تھے یا اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اس طرح ٹمٹما رہے تھے جن سے صرف چند خداشناس دل روشن تھے، جو شہروں کو چھوڑ کر چند پورے پورے گھروں میں بھی اُجالا نہیں کر سکتے تھے۔ دیندار اشخاص دین کی امانت کو اپنے سینہ سے لگائے ہوئے زندگی کے میدان سے کنارہ کش ہو کر دَیر و کلیسا اور صحراؤں کی تنہائیوں میں پناہ گزیں ہو گئے تھے اور زندگی کی کش مکش، اس کے مطالبات اور اس کی خشک و تلخ حقیقتوں سے دامن بچا کر دین و سیاست اور روحانیت و مادیت کے معرکہ میں شکست کھا کر اپنے فرائضِ قیادت سے سبکدوش ہو گئے تھے اور جو زندگی کے اس طوفان میں باقی رہ گئے تھے انھوں نے بادشاہوں اور اہلِ دنیا سے ساز باز کر لی تھی اور ان کی ناجائز خواہشات اور ظالمانہ نظامِ سلطنت و معیشت میں ان کے دستِ راست اور باطل طریقہ پر لوگوں کا مال کھانے اور ان کی قوت و دولت سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں ان کے شریک و سہیم بن گئے تھے۔

رومی اور ایرانی اس وقت مغرب و مشرق کی امامت اور دنیا کی قیادت کے اجارہ دار بنے ہوئے تھے۔ وہ دنیا کے لیے کوئی اچھا نمونہ ہونے کے بجائے ہر قسم کی خرابی اور فساد کے علمبردار و ذمّہ دار تھے، مختلف اجتماعی اور اخلاقی امراض کا عرصہ سے یہ قومیں آشیانہ بنی ہوئی تھیں، ان کے افراد تعیش و تکلفات کی زندگی اور مصنوعی تمدن کے سمندر میں سرتاپا غرق تھے، بادشاہ اور حکّام خوابِ غفلت میں مدہوش اور نشۂ سلطنت میں سرشار تھے۔ کام و دہن کی لذّت اور خواہشاتِ نفس کی تسکین کے سوا ان کو دنیا میں کوئی فکر اور زندگی میں کوئی مشغلہ نہ تھا، زندگی کی ہوس اور لذّت کی حرص اتنی بڑھ گئی تھی کہ ان کو کسی طرح سیری نہیں ہوتی تھی۔ متوسط طبقہ کے لوگ (ہر زمانہ کے دستور کے مطابق) اس اعلیٰ طبقہ کے قدم بقدم چلنے کی کوشش کرتے تھے اور

اس کی نقالی کو سب سے بڑا فخر سمجھتے تھے، باقی رہے عوام تو وہ زندگی کے بوجھ اور حکومت کے مطالبات اور محصولات کے بار میں ایسے دبے ہوئے اور غلامی اور قانون کی زنجیروں اور بیڑیوں میں ایسے جکڑے ہوئے تھے کہ ان کی زندگی جانوروں اور چوپایوں سے ذرا مختلف نہ تھی، دوسروں کی راحت کے لیے محنت کرنے اور دوسروں کے عیش و عشرت کے لیے بے زبان جانوروں کی طرح ہر وقت جُتے رہنے اور جانوروں کی طرح اپنا پیٹ بھر لینے کے سوا ان کا کوئی حصہ نہ تھا، کبھی اگر وہ اس خشک و بے مزہ زندگی اور اُس کے یکساں چکر سے اُکتا جاتے تو نشہ آور چیزوں اور سستی تفریحات سے اپنا دل بہلا لیتے اور اگر کبھی زندگی کے اس عذاب سے ان کو سانس لینے کا موقع ملتا تو فاقہ زدہ اور ندیدہ انسان کی طرح مذہب و اخلاق کی پابندیوں سے آزاد ہو کر حیوانی لذتوں پر آنکھیں بند کر کے گرتے۔

دنیا کے مختلف حصوں اور ملکوں میں ایسی ذہنی غفلت و خود فراموشی، اجتماعی بے نظمی و انتشار اور اخلاقی تنزل و زوال رُونما تھا کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ ممالک تنزل و انحطاط اور شر و فساد میں ایک دُوسرے سے بازی لے جانا چاہتے ہیں اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کون سا ملک دُوسرے سے بڑھا ہوا ہے۔

اقوام و مذاہب پر ایک نظر

اس دور میں بڑے بڑے مذہب بازیچۂ اطفال اور منافقین کا تختۂ مشق بن گئے تھے، ان مذاہب کی صورت و حقیقت دونوں اس درجہ مسخ ہو گئی تھیں کہ اگر یہ ممکن ہوتا کہ کسی طرح ان مذاہب کے پیشوا دُنیا میں آکر اپنے دین کا حال دیکھ سکیں تو قطعاً وہ اپنے مذاہب نہ پہچان سکتے۔

تہذیب و تمدّن کے گہواروں میں خود سری، بے راہ روی اور اخلاقی پستی کا دور دورہ تھا، نظامِ حکومت میں حد درجہ ابتری تھی، حکّام کی سخت گیری اور عوام کی اخلاقی گراوٹ کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام قومیں اپنے اندرونی مسائل ہی میں اُلجھ کر رہ گئی تھیں، دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لیے ان کے پاس نہ کوئی پیغام تھا اور نہ انسانیت کے لیے کوئی دعوت تھی، درحقیقت یہ اقوام و مذاہب اندر سے کھوکھلے ہو چکے تھے، ان کی زندگی کا سوتا خشک ہو چکا تھا، ان کے پاس نہ دینی ہدایات تھیں اور نہ نظامِ حکومت کے لیے مستحکم و معقول اصول۔

مسیحیت چھٹی صدی عیسوی میں

مسیحی مذہب میں کبھی بھی اس درجہ تفصیل و وضاحت نہ تھی کہ جس کی روشنی میں زندگی کے اہم مسائل سلجھائے جا سکیں یا اس کی بنیاد پر تمدن کی تعمیر ہو سکے، یا اس کے زیرِ ہدایت کوئی سلطنت چل سکے۔ جو کچھ تھا وہ صرف حضرت مسیحؑ کی تعلیمات کا ایک ہلکا سا خاکہ تھا جس پر توحید کے سادہ عقیدہ کا کچھ پرتو تھا۔ مسیحیت کا یہ امتیاز بھی اس وقت تک قائم رہا جب تک کہ یہ مذہب سینٹ پال کی دست بُرد سے بچا رہا، اس نے تو آکر رہی سہی روشنی بھی گُل کر دی کیونکہ جس بُت پرستانہ ماحول میں

اس کی پرورش ہوئی تھی اور جن جاہلی خرافات سے وُہ نکل کر آیا تھا، اس نے مسیحیت میں ان تمام جہالتوں اور لغویات کی آمیزش کر دی۔ اس کے بعد قسطنطین کا زمانہ آیا جس نے اپنے دورِ حکومت میں رہی سہی اصلیت بھی کھو دی۔ غرض یہ کہ چوتھی صدی ہی میں مسیحیت ایک معجون مرکب بن کر رہ گئی تھی، جس میں یونانی خرافات، رومی بت پرستی، مصری افلاطونیت (NEO- PLATIONISM; M) اور رہبانیت کے اجزا شامل تھے۔ حضرت مسیحؑ کی سادہ تعلیمات کا عنصر اس مجموعہ میں اس طرح گم ہو کر رہ گیا تھا جیسے کہ ایک قطرہ کا وجود سمندر میں گم ہو جاتا ہے۔ بالآخر مسیحیت چند بے جان مراسم اور بے کیف عقائد کا نام رہ گیا تھا جو نہ روح میں گداز پیدا کر سکتے تھے نہ عقل کی افزائش کا سبب بن سکتے تھے، نہ جذبات کو حرکت میں لا سکتے تھے اور نہ ان میں اس کی صلاحیت تھی کہ زندگی کے اہم مسائل میں انسانی قافلہ کی رہبری کر سکیں۔ اس پر تحریف و تاویل کی مصیبت مستزاد تھی، جس کا انجام یہ ہوا کہ بجائے اس کے کہ نصرانیت علم و فکر کے دروازے کھولتی، وہ خود علم و فکر کی راہ میں چٹان بن کر کھڑی ہو گئی اور صدیوں کے مسلسل انحطاط کے باعث محض ایک بُت پرستی کا مذہب بن کر رہ گئی۔ سیل (SALE) جس نے انگریزی میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا ہے، چھٹی صدی عیسوی کے عیسائیوں کے بارے میں کہتا ہے:

"مسیحیوں نے بزرگوں اور حضرت مسیحؑ کے مجسموں کی پرستش میں اس درجہ غلو کیا کہ اس زمانہ کے رومن کیتھولک بھی اس حد کو نہیں پہنچے۔"[1]

رومی سلطنت میں مذہبی خانہ جنگی

پھر نفس مذہب سے متعلق کلامی مباحث اُبھر آئے اور بے نتیجہ اختلافات کی شورش نے قوم کو اُلجھا دیا جس میں ان کی ذہانتیں ضائع ہوئیں اور قوائے عملیہ شل ہو گئے۔ بیشتر ان خانہ جنگیوں نے بڑے پیمانہ پر خونی معرکہ کی شکل اختیار کر لی۔ مدارس، کلیسا اور لوگوں کے مکانات حریف کیمپ بن گئے تھے اور پُورے کا پُورا ملک خانہ جنگی (CIVIL WAR) کا شکار تھا۔ بحث یہ تھی کہ حضرت مسیحؑ کی فطرت کیا ہے اور اس میں الٰہی اور بشری جز و کس تناسب سے ہیں! روم و شام کے ملکانی (MALKITE) عیسائیوں کا مذہب یہ تھا کہ حضرت مسیحؑ کی فطرت مرکب ہے، اس میں ایک جزوِ الٰہی ہے اور ایک بشری۔ لیکن مصر کے منوفیشی (MONOPHYSITES) عیسائیوں کا اصرار تھا کہ حضرت مسیحؑ کی فطرت خالص الٰہی ہے اس میں ان کی فطرت بشری اس طرح فنا ہو گئی ہے جیسے سرکہ کا ایک قطرہ سمندر میں پڑ کر اپنی ہستی کو گم کر دیتا ہے۔ پہلا مسلک گویا حکومت کا سرکاری مسلک تھا، بازنطینی سلاطین و اہلِ حکومت نے اس کو عام کرنے اور پُوری مملکت کا واحد مذہب بنانے میں پوری قوت صرف کی اور مخالفین مذہب (بدعتیین) کو سخت ترین سزائیں دیں جن کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مگر اختلاف اور مذہبی کشاکش بڑھتی ہی رہی، دونوں فریق ایک دُوسرے کو ایسا ہی خارج از مذہب اور بددین سمجھتے تھے۔ جیسے دو

---

[1] S/ SALE'S TRANSLATION. P.62 (1896)

متضاد مذہب کے پیرو، قیرس (CYRUS) کی نیابت مصر کے دس سال (۶۳۱ء-۶۴۱ء) کی تاریخ وحشیانہ سزاؤں اور لرزہ خیز مظالم کی داستانوں سے لبریز ہے۔[۱]

اجتماعی بدنظمی اور معاشی بے چینی

روم کی مشرقی ریاست میں اجتماعی بدنظمی انتہا کو پہونچ گئی تھی باوجود اس کے کہ عام رعایا بے شمار مصائب کا شکار تھی، ٹیکس اور محصول دوگنے چوگنے بڑھ گئے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے باشندے حکومت سے نالاں تھے اور اپنے ملکی حکمرانوں پر بدلیسی حکومتوں کو ترجیح دیتے تھے۔ اجارہ داریاں (MONOPOLIS) اور ضبطیاں مصیبت بالائے مصیبت تھیں، ان اسباب کی بنا پر بڑے پیمانہ پر فسادات اور بغاوتیں رُونما ہوئیں۔ چنانچہ ۵۳۲ء کے فساد میں تیس ہزار افراد دارالسلطنت میں ہلاک ہوئے[۲] اور ہرچند کہ وقت اور مصلحت کا تقاضا تھا کہ اخراجات میں کفایت شعاری سے کام لیا جاتا لیکن لوگ اسراف اور فضول خرچی سے باز نہیں آتے تھے اور اخلاقی گراوٹ کی جو سب سے پست سطح ہو سکتی ہے اس حد تک پہونچ چکے تھے، صرف ایک ہی لگن سب کے دل سے لگی تھی کہ جس طرح ممکن ہو زیادہ سے زیادہ مال سمیٹنا چاہیے اور اس کو فیشن پرستی، عیش پسندی اور اپنی من مانی خواہشات کے پورا کرنے میں خرچ کیا جائے۔ انسانیت وشرافت کی بنیادیں اپنی جگہ سے ہل چکی تھیں، تہذیب واخلاق کے ستون اپنی جگہ چھوڑ چکے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ لوگ ازدواجی زندگی پر تجرد کی زندگی کو ترجیح دیتے تھے تاکہ آزادی سے انھیں کھل کھیلنے کا موقع ملے۔[۳] انصاف کا حال یہ تھا کہ بقول سیل (SALE) جس طرح اشیا کی خرید و فروخت ہوتی ہے اور ان کے دام ٹھیرائے جاتے ہیں اسی طرح انصاف بھی فروخت ہوتا، رشوت وخیانت کی ہمت افزائی خود قوم کی طرف سے ہوتی تھی۔[۵] گبن کہتا ہے:

"چھٹی صدی عیسوی میں سلطنت کا زوال اور اس کی پستی انتہا پر تھی۔ اس کی مثال اس بڑے تناور اور گھنے درخت کی تھی جس کے سائے میں دنیا کی قومیں کبھی پناہ لیتی تھیں اور اب اس کا صرف تنا رہ گیا ہو جو روز بروز سوکھتا جا رہا ہو۔"[۶]

---

[۱] ALFRED J BUTLER' ARABS CONQUEST OF EGYPT AND THE LAST THIRTY YEARS OF THE ROMAN DOMINION P. 23-30.

[۲] P. 183 - 189.

[۳] ENCYCLOPAEDIA BRITANICA CHAP JUSTIN.

[۴] THE HISTORY OF THE DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE V. 3 P. 327.

[۵] SALE'S TRANSLATION P. 72.

[۶] GIBBON V. V P. 31.

"تاریخِ عالم برائے مورخین" کے مصنفین لکھتے ہیں:

"بڑے بڑے شہر جن میں تیزی کے ساتھ بربادی آئی اور پھر وہ سنبھل نہ سکے اور نہ اس لائق ہو سکے کہ اپنی عظمتِ رفتہ کو پھر زندہ کر سکیں وہ گواہ ہیں کہ بازنطینی حکومت اس زمانہ میں انتہائی انحطاط و تنزل کے عالم میں تھی اور یہ تنزل ٹیکس اور محصول میں زیادتی، تجارت میں پستی، زراعت سے غفلت، شہروں کی آبادی میں روز افزوں کمی کا نتیجہ تھا۔"[1]

یورپ کی شمالی و مغربی قومیں

وُہ مغربی قومیں جو بالکل شمال و مغرب میں آباد تھیں۔ جہالت و ناخواندگی کا شکار اور خونی جنگوں سے زار و نزار تھیں۔ وہ جنگ و جہالت کی پیدا کی ہوئی تاریکی میں ہاتھ پاؤں مار رہی تھیں۔ ان ممالک میں اب تک علم و تمدن کی صبح نمودار نہیں ہوئی تھی۔ اسلامی و عربی اندلس (SPAIN) اس وقت تک منصۂ شہود پر نہیں آیا تھا کہ علم و تمدن سے روشناس کرائے۔ نیز مصائب و حوادث نے بھی ان کی آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔ غرض ہر طرح یہ قومیں تمدنِ انسانی کے قافلہ کی شاہراہ سے الگ تھلگ تھیں، بہت حد تک یہ دنیا سے بے خبر تھیں اور دنیا ان سے تقریباً ناآشنا تھی۔ مشرق و مغرب کے ممالک میں جو انقلاب انگیز واقعات و تغیرات پیش آ رہے تھے۔ ان سے ان قوموں کو دُور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ عقاید کے لحاظ سے یہ قومیں نوخیز مسیحیت اور فرسودہ بت پرستی کے درمیان میں تھیں۔ دین سے متعلق ان کے پاس کوئی پیغام تھا اور نہ سیاست کے میدان میں ان کا کوئی مقام تھا۔ ایچ جی ویلز (H.G. WELLS) کا بیان ہے:

"اس زمانہ میں مغربی یورپ کے اندر یک جہتی اور نظام کے کوئی آثار نہ تھے۔"[2]

رابرٹ بریفالٹ (ROBERT BRIFFAULT) لکھتا ہے:

"پانچویں صدی سے لے کر دسویں صدی تک یورپ پر گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی اور یہ تاریکی تدریجاً زیادہ گہری اور بھیانک ہوتی جا رہی تھی۔ اس دور کی وحشت و بربریت زمانہ قدیم کی وحشت و بربریت سے کئی درجہ زیادہ بڑھی چڑھی تھی۔ کیونکہ اس کی مثال ایک بڑے تمدن کی لاش کی تھی جو سڑ گئی ہو۔ اس تمدن کے نشانات مٹ رہے تھے اور اس پر زوال کی مُہر لگ چکی تھی۔ وہ ممالک جہاں یہ تمدن برگ و بار لایا اور گزشتہ زمانہ میں اپنی انتہائی ترقی کو پہونچ گیا تھا جیسے اٹلی، فرانس۔ وہاں تباہی، طوائف الملوکی اور ویرانی کا دور دورہ تھا۔"[3]

---

[1] HISTORIAN'S HISTORY OF THE WORLD. V. VII. P. 175.

[2] A SHORT HISTORY OF THE WORLD.

[3] THE MAKING OF HUMANITY V. P.164.

یہود

یورپ، ایشیا، افریقہ میں بسنے والی یہود نام کی قوم دنیا کی تمام قوموں میں اس لحاظ سے ممتاز تھی کہ اس کے پاس دین کا بہت بڑا سرمایہ تھا اور اس میں دینی تعبیرات و اصطلاحات سمجھنے کی سب سے زیادہ صلاحیت تھی، لیکن یہ یہودی مذہب تمدن یا سیاست میں وُہ مقام نہیں رکھتے تھے کہ دوسروں پر اثر ڈال سکیں بلکہ اُن کے لیے مقدر ہو چکا تھا کہ ہمیشہ ان پر دوسرے لوگ حکومت کریں اور ہمیشہ ظلم و استبداد، سزا و جلاوطنی اور مصائب و مشقت کے ہدف بنے رہیں، عرصہ دراز تک غلام رہنے اور انواع و اقسام کی سختیاں اور سزائیں جھیلنے کے سبب ان کا ایک خاص مزاج بن گیا تھا، قومی غرور، نسبی تکبر، حرص اور مال و دولت کی حد سے بڑھی ہوئی طمع، مسلسل سود کے لین دین سے ان میں مخصوص ذہنیت و سیرت اور قومی خصائل و عادات پیدا ہو گئے تھے جن میں وُہ ہمیشہ منفرد رہے۔ کمزور یا مغلوب ہونے کے وقت ذلت و خوشامد، اور غالب ہونے کی صورت میں انتہائی بے رحمی اور بد معاملگی اور عام حالات میں دغا بازی اور نفاق، سنگدلی و خود غرضی، مفت خوری و حرام خواری، راہِ حق سے لوگوں کو روکنا ان کا قومی کردار تھا۔ قرآن کریم نے ان کی اس صورت حال کا جو چھٹی اور ساتویں صدی میں تھی بہت واضح اور مکمل نقشہ کھینچا ہے اور بتلایا ہے کہ اخلاقی انحطاط، انسانی پستی اور اجتماعی فساد میں وہ کس منزل میں تھے اور کیا اسباب تھے جن کی بنا پر وُہ ہمیشہ کے لیے عالم کی قیادت اور اقوام کی امامت سے معزول کر دیے گئے۔

چھٹی صدی کے آخر میں یہودیوں اور عیسائیوں کی باہمی رقابت و منافرت اس حد کو پہونچ گئی تھی کہ ان میں سے کوئی دوسرے فریق کو ذلیل کرنے اور اس سے اپنی قوم کا انتقام لینے اور مفتوح کے ساتھ غیر انسانی سلوک کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا تھا۔ سنہ ۶۱۰ء میں یہودیوں نے انطاکیہ میں عیسائیوں کے خلاف بلوہ کیا۔ شہنشاہ فوقا (PHOCAS) نے ان کی سرکوبی کے لیے مشہور فوجی افسر ابنوسوس (BONOSUS) کو بھیجا۔ اس نے پُوری یہودی آبادی کا اس طرح خاتمہ کیا کہ ہزاروں کو تلوار سے، سینکڑوں کو دریا میں غرق کر کے، آگ میں جلا کر اور درندوں کے سامنے ڈال کر ہلاک کر دیا۔ سنہ ۶۱۵ء میں جب ایرانیوں نے شام کو فتح کیا تو یہود ہی کے مشورہ و ترغیب سے خسرو نے عیسائیوں پر وحشیانہ مظالم کیے اور بیشتر عیسائیوں کو تہ تیغ کیا۔ ایرانیوں پر فتح حاصل کرنے کے بعد ہرقل (HERACLIUS) نے زخم خوردہ عیسائیوں کے مشورہ سے سنہ ۶۳۰ء میں یہودیوں سے سخت انتقام لیا اور ان کا اس طرح قتل عام کیا کہ رومی مملکت میں صرف وہ یہود ہی بچ سکے جو ملک چھوڑ کر چلے گئے یا کہیں چھپے رہے۔[1]

اس سفاکی و بربریت اور اس خُون آشام ذہنیت کے ساتھ جس کا مظاہرہ ساتویں صدی کے ان دو عظیم ترین مذاہب

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب الخطط المقریزیہ ج ۴ ص ۳۹۲، اور THE ARAB'S CONQUEST OF EGYPT P. 133-134. HISTORIAN'S HISTORY OF THE WORLD V.8 - P.84.

نے کیا۔ اس کی کیا توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنے دورِ حکومت میں انسانیت کے پاسبان ثابت ہوں گے۔ حق و انصاف اور امن و صلح کا پیغام دُنیا کو سنائیں گے۔

ایران اور وہاں کی تخریبی تحریکات

متمدن دُنیا کی تولیت و انتظام میں ایرانؔ رومؔ کا شریک نہیں تھا۔ لیکن بدقسمتی سے وہ دشمنِ انسانیت افراد کی سرگرمیوں کا پرانا مرکز تھا وہاں کی اخلاقی بنیادیں زمانۂ دراز سے متزلزل چلی آ رہی تھیں، جن رشتوں سے ازدواجی تعلقات دنیا کے متمدن معتدل علاقوں کے باشندے ہمیشہ ناجائز اور غیر قانونی سمجھتے رہے ہیں اور فطری طور پر اس سے نفرت کرتے ہیں۔ ایرانیوں کو ان کی حرمت و کراہت تسلیم نہیں تھی۔ یزدگرد دوم جس نے پانچویں صدی کے وسط میں حکومت کی ہے۔ اس نے اپنی لڑکی کو زوجیت میں رکھا پھر قتل کر دیا[1]۔ بہرام چوبین جو چھٹی صدی عیسوی میں حکمران تھا اس نے اپنی بہن سے اپنا ازدواجی تعلق رکھا[2]۔ پروفیسر ارتھر کرسٹن کے مطابق اس قسم کا رشتہ ایران میں کوئی ناجائز فعل تصور نہیں کیا جاتا تھا بلکہ ایک عبادت اور کارِ ثواب سمجھا جاتا تھا۔ مشہور چینی سیاح (ہونؔ سیانگ) کا بیان ہے کہ ایرانی قانون و معاشرت میں ازدواجی تعلقات کے لیے کسی رشتہ کا بھی استثنا نہ تھا[3]۔

تیسری صدی عیسوی میں مانیؔ دنیا کے سامنے آیا۔ اس کی تحریک دراصل ملک کے بڑھتے ہوئے شدید شہوانی رجحان کا ایک غیر فطری اور سخت ردِّ عمل اور نور و ظلمت کی مفروضہ کش مکش کا (جو ایران کا قدیمی فلسفہ ہے) نتیجہ تھا۔ چنانچہ اس نے تجرد کی زندگی اختیار کرنے کی دعوت دی تاکہ دُنیا سے شر و فساد کے جراثیم ناپید ہو جائیں۔ اس نے اعلان کیا کہ نور و ظلمت کا امتزاج ہی شر کا باعث ہے اس سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس بنا پر اس نے نکاح کو حرام قرار دیا کہ انسان جلد سے جلد فنا ہو جائے اور نسلِ انسانی منقطع ہو کر نور و ظلمت پر دائمی فتح حاصل ہو۔ بہرامؔ نے ۲۷۶ء میں مانیؔ کو یہ کہتے ہوئے قتل کر ڈالا کہ یہ شخص دُنیا کی تباہی کی دعوت دیتا ہے اس لیے قبل اس کے کہ دنیا ختم ہو اور اس کا مقصد پورا ہو اس کو خود ہلاک ہونا چاہیے۔ لیکن بانیِ مذہب کے قتل کے باوجود اس کی تعلیمات عرصہ تک زندہ رہیں اور اسلامی فتح کے بعد تک ان کے اثرات باقی رہے۔

ایران کی افتادِ طبع نے پھر ایک مرتبہ مانی کی دشمنِ فطرت تعلیمات کے خلاف بغاوت کی۔ یہ بغاوت مزدک (پیدائش ۴۸۷ء) کی دعوت کی شکل میں سامنے آئی۔ اس نے اعلان کیا کہ تمام انسان یکساں طور پر پیدا ہوئے ہیں ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں ہے۔ لہٰذا ہر ایک کو دوسرے کی ملکیت میں مساوی حقوق حاصل ہیں اور چونکہ مال اور عورت ہی وہ ایسے عنصر ہیں جن کی حفاظت و نگرانی کا انسان اہتمام کرتا ہے لہذا انھیں میں مساوات و اشتراک کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ شہرستانی کا

---

[1] و [2] تاریخ طبری، ج ۳، ص ۱۳۸

[3] ایران بعہد ساسانیاں ص ۴۳۰

بیان ہے :

"مزدک نے تمام عورتوں کو سب کے لیے حلال قرار دے دیا اور مال و زن کو مثل آگ، پانی اور چارہ کے مشترک اور عام کر دیا۔"[1]

نوجوانوں اور عیش پسندوں کی مراد بر آئی اور انھوں نے اس تحریک کا پُر جوش خیر مقدم کیا۔ طرفہ تماشہ یہ ہُوا کہ شاہِ ایران قبادؔ نے اس کی سرپرستی قبول کی اور اس کی اشاعت و تبلیغ میں بڑی سرگرمی دکھائی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ یہ تحریک آگ کی طرح ملک میں پھیل گئی۔ پُورے کا پُورا ایران جنسی انارکی اور شہوانی بحران میں ڈوب گیا۔ طبرانی کا بیان ہے کہ :

"اوباش اور آوارہ مزاج لوگوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور مزدک اور مزدکیوں کے پُرجوش ساتھی اور دست و بازو بن گئے۔ عام شہری اس بلائے ناگہانی کا شکار تھے۔ اس تحریک کا آغاز در ہُوا کہ جو چاہتا جس کے گھر میں چاہتا گھس آتا اور مال و زن پر قبضہ کر لیتا اور صاحبِ مکان کچھ بھی نہ کر سکتا۔ ان مزدکیوں نے قبادؔ کو اُبھارا اور اس کی معزولی کی دھمکی دے کر تیار کر لیا کہ وہ بھی اس دعوت کو اپنا لے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے یہ عالم ہوگیا کہ نہ باپ اپنے لڑکوں کو پہچان سکتا تھا اور نہ لڑکا اپنے باپ کو۔ کسی کا بھی اپنی کسی ملکیت پر اختیار اور قبضہ نہیں تھا۔"[2]

طبری کا بیان ہے کہ :

"اس تحریک سے پہلے قبادؔ ایران کے اچھے فرمانرواؤں میں تھا۔ لیکن مزدک کی پیروی کی وجہ سے حدودِ مملکت اور سرحدوں میں پراگندگی اور ابتری پھیل گئی۔"[3]

ایران کی شاہ پرستی

ایران کے سلاطین جن کا لقب کسریٰ (خسرو) ہُوا کرتا تھا اس بات کے مدعی تھے کہ ان کی رگوں میں خدائی خون ہے۔ اہلِ ایران بھی انھیں اسی نظر سے دیکھتے تھے کہ گویا وُہ خدا ہیں۔ ان کا اعتقاد تھا کہ ان سلاطین کی فطرت میں ایک مقدس آسمانی چیز ہے۔ چنانچہ یہ لوگ ان کے آگے سربسجود ہوتے، ان کی اُلوہیت کے ترانے گاتے اور انھیں قانون سے، تنقید سے بلکہ بشریت سے بالاتر تصور کرتے تھے۔ فرطِ ادب سے ان سلاطین کے نام بھی اپنی زبان پر نہ لاتے اور نہ کوئی شخص ان کی مجلس میں بیٹھنے کی ہمت کر سکتا تھا۔ اہلِ ایران کا عقیدہ تھا کہ ان سلاطین کا ہر انسان پر پیدائشی حق ہے، اور کسی انسان کا ان سلاطین پر حق نہیں۔ شاہِ ایران اپنی دولت میں سے جو تھوڑا بہت کسی کو دے دے یا اپنے دسترخوان سے کوئی ٹکڑا

---

[1] الملل والنحل للشہرستانی ص ۸۶

[2] و [3] تاریخ طبری ج ۲ ص ۸۸

اٹھا کر کسی کو عطا کر دے وہ اس کا احسان و صدقہ ہے، کسی کا استحقاق نہیں، لوگوں کو سوائے احکام کی بجا آوری کے کسی امر میں دخل نہ دینا چاہیے۔ ملک و قوم پر حکومت کرنے کے لیے ایک خاص گھرانہ (کیانی خاندان) متعین تھا۔ اہلِ ایران سمجھتے تھے کہ صرف اسی گھرانے کے افراد تخت و تاج کے وارث اور ملک و سلطنت کے مالک ہو سکتے ہیں اور یہ حق وراثتاً بیٹے کو باپ سے نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا رہے گا۔ اس حق میں کسی کو دست درازی کی مجال نہیں۔ چنانچہ یہ لوگ بادشاہِ وقت پر ایمان رکھتے تھے کہ حکومت کو شاہی خاندان کا موروثی حق سمجھتے تھے کہ جس میں کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ اگر اس خاندان میں کوئی سن رسیدہ نہ ملتا تو بچہ ہی کو اپنا شہنشاہ تسلیم کر لیتے۔ اور اگر کوئی مرد باقی نہ رہتا تو عورت ہی کو تاج شہنشاہی پہناتے۔ چنانچہ شیرویہ کے بعد اس کے ہفت سالہ بچہ اردشیر کو شہنشاہ تسلیم کیا گیا اور خسرو پرویز کے بیٹے فرخ زاد خسرو کو طفلی کی حالت میں لوگوں نے بادشاہ بنایا اور کسریٰ کی لڑکی بوران بھی تخت نشین ہوئی اور دوسری بیٹی جس کا نام آزرمی دخت تھا وہ بھی حکومت کر چکی ہے[1] کسی کو اس کا تصور بھی نہیں آیا کہ کسی سپہ سالار یا بڑے سردار یا کسی دوسرے لائق اور آزمودہ کار شخص کو (جیسے رستم و جابان تھے) انتظام سلطنت سپرد کر دیں چونکہ وہ شاہی گھرانے سے تعلق نہیں رکھتے تھے اس لیے ان کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

مذہبی گھرانوں اور سرداروں کے بارہ میں ان کا عقیدہ یہی تھا کہ یہ لوگ عام انسانی سطح سے بلند ہیں اور ان کی شخصیتیں اور ان کے دل و دماغ دوسرے انسانوں سے الگ ہیں۔ ان اشخاص کو اہلِ ایران نے غیر محدود اختیارات دے رکھے تھے اونچ نیچ کا فرق، طبقوں کا تفاوت اور پیشوں کی تقسیم ایرانی سوسائٹی اور نظامِ زندگی کا اٹل قانون تھا جس میں ردّ و بدل ممکن نہ تھا پروفیسر ارتھر کرسٹن سین کا بیان ہے:

"سوسائٹی کے مختلف طبقوں کے درمیان ناقابلِ عبور فاصلہ تھا[2] حکومت کی طرف سے عوام الناس کو ممانعت تھی کہ وہ طبقۂ امرا میں سے کسی کی جائداد کو خرید سکیں[3]۔ سیاست ساسانی کا یہ محکم اصول تھا کہ ہرگز کوئی شخص اپنے اس رتبہ سے بلند تر رتبہ کا خواہاں نہ ہو جو اس کو پیدائشی طور پر یعنی از روئے نسب حاصل ہے[4] کوئی شخص مجاز نہ تھا کہ سوائے اس پیشہ کے جس کے لیے خدا نے اسے پیدا کیا ہے کوئی دوسرا پیشہ اختیار کر سکے[5] شاہانِ ایران حکومت کا کوئی کام کسی نیچ ذات کے آدمی کے سپرد نہیں کرتے تھے[6] عوام الناس کی مختلف جماعتوں میں نہایت صریح امتیاز تھا، سوسائٹی میں ہر شخص کی ایک معین جگہ تھی"[7]

ایرانیوں کی قوم پرستی

اہلِ ایران اپنی ایرانی قومیت کو عظمت و تقدیس کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ اپنے تئیں یہ سمجھ بیٹھے کہ دنیا کی

[1] تاریخ طبری ج ۲ و تاریخ ایران از مکاریوس ایرانی

[2] ایران بعہد ساسانیاں ص ۹۰ د [3] ص ۳۴۲ [4] ص ۴۱۸ [5] ص ۴۲۳ [6] ص ۴۲۲ [7] ص ۴۲۱

ہر قوم اور ہر نسل پر اس قومیت و نسل کو فضیلت و برتری حاصل ہے، اور اللہ تعالیٰ نے انھیں وہ خصوصی صلاحیتیں اور فطری قابلیتیں بخشی ہیں جن میں ان کا کوئی شریک و ہمسر نہیں۔ یہ لوگ اپنے گرد و پیش کی قوموں کو بڑی حقارت و ذلت آمیز نگاہوں سے دیکھتے تھے اور ان کے لیے ایسے ایسے نام تجویز کرتے تھے جن میں توہین یا تمسخر پایا جاتا۔

آتش پرستی اور انسانی زندگی پر اس کے اثرات

چونکہ آگ اپنے پجاریوں کو ہدایت دینے اور اپنا پیغام پہنچانے کی صلاحیت نہیں رکھتی اور نہ اس میں یہ قدرت ہے کہ اپنے پجاریوں کے مسائلِ زندگی کو حل کر سکے، ان میں دخل دے اور مجرموں، گنہگاروں اور مفسدوں کا ہاتھ پکڑ سکے، اس لیے اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مجوسیوں کا مذہب چند مراسم و روایات کا نام رہ گیا تھا جنھیں مخصوص اوقات اور خاص خاص مقامات پر ادا کر لیا کرتے تھے، رہا عبادت گاہوں سے باہر اپنے گھروں اور بازاروں، دائرۂ اثر اور سیاسی و اجتماعی امور میں، تو اس میں یہ بالکل آزاد تھے، اپنی من مانی کرتے، ان کے خیالات جس رُخ پر چاہتے انھیں موڑتے رہتے یا پھر جو مصلحت اور وقت کا تقاضا ہوتا اس پر کاربند ہوتے، جیسا کہ ہر زمانہ اور ہر ملک میں عام طور پر مشرکوں کا حال رہا ہے۔

غرض اہلِ ایران ایسے مکمل اور جامع دین سے یکسر محروم تھے جو اُن کے باطن کی اصلاح کرتا، ان کے اخلاق سنوارتا، نفسیاتی خواہشات کو دبانے اور نیک خواہشات کو اُبھارنے کی اس میں طاقت ہوتی، وہ خاندان کا نظامِ زندگی ملک کا دستورِ حکومت ہوتا، جو سلاطین کی چیرہ دستیوں اور حکام کی زیادتیوں کی روک تھام کر سکتا، ظالم کا ہاتھ پکڑ سکتا اور مظلوم کے حق میں انصاف کرا سکتا، لیکن جیسا کہ اوپر گزر چکا آتش پرست ایرانیوں کو ایسا دین نصیب نہ تھا۔ اور اس طرح ایران کے مجوسیوں اور دُنیا کے دُوسرے لامذہب و لاقانون افراد میں اخلاق و اعمال کے لحاظ سے کوئی فرق نہ تھا۔

بودھ مت اور اس کے تغیرات

بودھ مت اپنی سادگی اور اپنی انفرادیت عرصہ ہوا کھو چکا تھا، بودھ مذہب نے ہندوستان کے برہمنی مذہب کو اپنے میں شامل کر کے اور اس کے اوتاروں اور دیوتاؤں کو اختیار کر کے (جیسا کہ ڈاکٹر گستاولی بان مصنف تمدنِ ہند کا رجحان معلوم ہوتا ہے) اپنی ہستی کو گم کر دیا تھا برہمنیت نے (جو عرصہ سے خار کھائے بیٹھی تھی) اس کو ہضم اور اپنے میں ضم کر لیا تھا۔ بہرحال یہ دونوں مذاہب جو عرصہ سے ایک دوسرے کے حریف چلے آ رہے تھے باہم شیر و شکر ہو چکے تھے اور بدھ مت اب عرصہ سے بت پرستی کا ایک مذہب تھا، جن ممالک میں بھی اس مذہب کے پیرو گئے بُت ان کے ساتھ رہے۔ یہ لوگ جہاں جاتے اور جس ملک میں پہنچتے گوتم کے مجسمے نصب کرتے اور اس کی شبیہیں تیار کرتے۔ ان کی مذہبی اور تمدنی زندگی ان مجسموں سے ڈھکی ہوئی نظر آتی ہے[1]۔ یہ مجسمے زیادہ تر بودھ مت کے دورِ ترقی میں تیار ہُوئے تھے۔ پروفیسر ایشور اٹوپا اپنی کتاب

---

[1] ٹکسلا (قدیم بدھ دار السلطنت) کے عجائب خانہ کی سیر کرنے والا ان مجسموں اور مورتوں کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے (باقی بر صفحۂ آئندہ)

"ہندوستانی تمدن" میں لکھتے ہیں :

"بدھ مت کے سایہ میں ایسی حکومت قایم ہوئی جس میں اوتاروں کی بھرمار اور مورت پرستی کا دور دورہ دکھلائی دینے لگا، سنگھوں کی فضا بدل رہی تھی۔ اس میں بدعتیں اور جدتیں یکے بعد دیگرے نظر آ رہی تھیں"۔ [۱]

پنڈت جواہر لال نہرو اپنی کتاب "تلاش ہند" (DISCOVERY OF INDIA) میں بدھ مت کے بگاڑ اور تدریجی زوال کے متعلق لکھتے ہیں :

"برہمنیت نے بودھ کو اوتار بنا دیا، بدھ مت نے بھی یہی کیا، سنگھ بہت دولت مند ہو گئے اور ایک خاص جماعت کے مفاد کے مرکز بن کر رہ گئے اور ان میں ضبط و قاعدہ بالکل نہیں رہا۔ عبادت کے طریقوں میں سحر اور اوہام داخل ہو گئے اور ہندوستان میں ایک ہزار سال تک باقاعدہ رائج رہنے کے بعد بودھ مت کا تنزل شروع ہو گیا۔ اس عہد میں اس کی جو مریضانہ کیفیت تھی مسز رائس ڈیوڈس (RHYSE DAVIDS) نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے :

"ان مریضانہ تخیلات کے گہرے سائے میں آ کر گوتم کی اخلاقی تعلیم نظر سے اوجھل ہو گئی۔ ایک نظریہ پیدا ہوا اور اس نے فروغ پایا، اس کی جگہ دوسرے نے لے لی، اور ہر ایک قدم پر ایک نیا نظریہ پیدا ہونے لگا، یہاں تک کہ ساری فضا ہی ذہن کی ان پرفریب تخلیقوں سے گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا اور بانیٔ مذہب کے سادہ اور بلند اخلاقی درس ان الٰہیاتی موشگافیوں کے انبار کے نیچے دب کر رہ گئے۔ [۲]

مجموعی حیثیت سے بودھ مت اور برہمنیت دونوں ہی میں گراوٹ پیدا ہو گئی اور ان میں اکثر مبتذل رسوم داخل ہو گئیں دونوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا، بدھ مت برہمنیت میں گھل مل گیا"۔ [۳]

خلاصہ یہ کہ چین اور ان تمام ممالک کے پاس (جو بودھ مت کے پیرو تھے) دنیا کے لیے کوئی پیغام نہیں تھا جس کی روشنی میں دنیا اپنے مسائل کا حل تلاش کر سکتی اور خدا کا سیدھا راستہ پاتی۔ اہل چین متمدن دنیا کے بالکل مشرقی کنارہ پر اپنی علمی اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) جو بدھ مذہب کے مٹے ہوئے شہروں کی کھدائی کے بعد نکلے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مذہب اور اس کا تمدن خالص بت پرستانہ مذہب و تمدن بن گیا تھا۔ ڈاکٹر گستاولی بان نے بھی ہندوستان میں بدھ عمارتوں اور یادگاروں کو دیکھ کر یہی نتیجہ نکالا ہے۔ وہ "تمدن ہند" میں لکھتا ہے :

"اصلی بدھ مذہب کو سمجھنے اور جاننے کے لیے اس مذہب کی یادگاروں کا مطالعہ کرنا چاہیے نہ کہ کتابوں کا۔ جو سبق ہمیں ان یادگاروں سے ملتا ہے وہ ان کتابی مسائل سے جن کی تعلیم یورپی مصنفین کرتے ہیں بالکل علٰحدہ ہے۔ یہ یادگاریں ثابت کرتی ہیں کہ جس مذہب کو یورپی علماء الحادی مذہب بتاتے ہیں وہ فی الواقع بت پرست اور کثیر الالٰہ مذاہب کا سرتاج ہے"۔ (تمدن ہند ص ۲۴۵)

[۱] ہندوستانی تمدن (اردو) ایشوراٹوپا [۲] تلاش ہند ص ۲۰۱ - ۲۰۳ [۳] ایضاً

مذہبی میراث کو سینہ سے لگائے بیٹھے تھے، جس میں نہ خود وہ کسی اضافہ کے خواہشمند تھے اور نہ دُوسروں کے ذخیرہ میں اضافہ کرنے کے اہل تھے۔

وسطِ ایشیا کی قومیں

مشرقِ اور وسط ایشیا کی دُوسری قومیں (مغل، ترک، جاپانی) وغیرہ بگڑے ہُوئے بودھ مت اور وحشیانہ بت پرستی کے درمیان تھیں، نہ کوئی علمی دولت ان کے پاس تھی اور نہ سیاست کا کوئی ترقی یافتہ نظام ان کے یہاں تھا، دراصل یہ قومیں اپنے عبوری دور میں تھیں، جاہلانہ بُت پرستی سے نکل کر تمدّن کی طرف آ رہی تھیں اور چند قومیں ایسی بھی تھیں جو اس وقت تک شہریت اور زندگی کی ابتدائی منزل میں تھیں اور عقلی و تمدّنی حیثیت سے ان کا دورِ طفولیت تھا۔

ہندوستان، مذہبی، اجتماعی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے

ہندوستان کے مورخین کا اس نقطہ پر اتفاق ہے کہ چھٹی صدی عیسوی سے جو زمانہ شروع ہوتا ہے وہ مذہبی، اجتماعی اور اخلاقی لحاظ سے اس ملک کی تاریخ کا (جو کسی زمانہ میں علم و تمدّن اور اخلاقی تحریکات کا مرکز رہا ہے) پست ترین دَور تھا۔ ہندوستان کے اردگرد دوسرے ممالک میں جو اجتماعی اور اخلاقی انحطاط رونما تھا اس میں یہ ملک کسی سے پیچھے نہ تھا۔ اس کے علاوہ بھی کچھ خصوصیات تھیں جن میں اس ملک کو شانِ یکتائی حاصل تھی۔ ان خصوصیات کو تین عنوانات کے ذیل میں بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ معبودوں کی حد سے بڑھی ہوئی کثرت
۲۔ جنسی خواہشات کی ہیجانی کیفیت
۳۔ طبقاتی تقسیم اور معاشرتی امتیازات

نِت نئے دیوتا

چھٹی صدی عیسوی میں بُت پرستی پُورے عروج پر تھی۔ وید میں دیوتاؤں کی تعداد ۳۳ تھی۔ اس صدی میں تینتیس کروڑ ہوگئی۔ اس عہد میں ہر پسندیدہ شے، ہر کشش رکھنے والی اور زندگی کی کوئی ضرورت پُوری کرنے والی چیز دیوتا بن گئی تھی جس کی پُوجا کی جاتی تھی۔ اس طرح بتوں اور مجسموں، دیوتاؤں اور دیویوں کا کوئی شمار نہ تھا۔ ان دیوتاؤں اور قابلِ پرستش اشیا میں معدنیات و جمادات، اشجار و نباتات، پہاڑ اور دریا، حیوانات حتّٰی کہ آلاتِ تناسل سب ہی شامل تھے۔ اس طرح یہ قدیم مذہب افسانوی روایات اور عقاید و عبادات کا ایک دیومالا بن کر رہ گیا۔ ڈاکٹر گستاولی بان "تمدّنِ ہند" میں لکھتا ہے:

"دنیا کی تمام اقوام میں ہندو کے لیے پرستش میں ظاہری صورت کا ہونا لازمی ہے، اگرچہ مختلف ازمنہ

میں مذہبی اصلاح کرنے والوں نے ہندو مذہب میں توحید کو ثابت کرنا چاہا ہے۔ لیکن یہ کوشش بالکل بے فائدہ ہے۔ ہندو کے نزدیک کیا ویدی زمانہ میں اور کیا اس وقت ہر چیز خدا ہے جو کوئی چیز اس کی سمجھ میں نہ آئے یا جس سے وہ مقابلہ نہ کر سکے اس کے نزدیک پرستش کے لائق ہے۔ برہمنوں اور فلسفیوں کی نہ صرف کل کوششیں جو انھوں نے توحید قائم کرنے کے لیے کیں بلکہ کل وہ کوششیں بھی جو وہ دیوتاؤں کی تعداد گھٹا کر تین پر لانے کے لیے عمل میں لائے، محض بیکار اور رائیگاں گئیں۔ عوام الناس نے ان کی تعلیم کو سنا اور قبول کیا۔ لیکن عملاً یہ تین خدا تعداد میں بڑھتے گئے اور ہر ایک چیز میں، ہر ایک رنگ و بو میں اُن کے اوتار نظر آنے لگے۔"[1]

چھٹی ساتویں صدی میں بُت سازی کے فن نے بڑی ترقی کی۔ اس عہد میں یہ فن اپنے کمال کو پہنچ گیا تھا سارے ملک میں بت پرستی کا دور دورہ تھا، حتیٰ کہ بودھ مت اور جینی مذہب کو بھی مذاق عام کا ساتھ دینا پڑا اور اپنی زندگی اور مقبولیت کو قائم رکھنے کے لیے اسی روش کو اختیار کرنا پڑا۔ بُت پرستی کے اس عروج اور مورتیوں اور مجسموں کی کثرت کا اندازہ چینی سیاح ہیون سیانگ (جس نے ۶۳۰ء اور ۶۴۴ء کے درمیان ہندوستان کی سیاحت کی ہے) کے اس بیان سے ہو سکتا ہے جس میں اس نے راجہ ہرش (۶۰۶ - ۶۴۷) کے جشن کی کیفیت سنائی ہے۔

ہیون سیانگ لکھتا ہے:

"راجہ ہرش نے قنوج میں علمائے مذہب کا مجمع کرایا، کوئی پچاس ہاتھ اونچے مینار پر گوتم بدھ کی طلائی مورت نصب کی گئی تھی۔ اس کی دوسری چھوٹی مورت کا بڑی دھوم دھام سے جلوس نکالا گیا جس میں ہرش نے سکر دیوتا کے لباس میں چتر برداری کی اور اس کے حلیف راجہ دائی کامروپ نے مگس رانی کی۔"[2]

ہیون سیانگ نے ہرش کے خاندان یا درباریوں کے متعلق لکھا ہے کہ کوئی تو شیو کا پرستار تھا اور کوئی بودھ مت کا پیرو ہو گیا تھا۔ بعض لوگ سورج کی پوجا کرتے تھے بعض وشنو کی۔ ہر شخص آزاد تھا کہ جس دیوی دیوتا کو چاہے اپنی پرستش کے لیے مخصوص کرے اور چاہے تو سب کی پوجا کرے۔[3]

جنسی بحران

شہوانی جذبات اور جنسی (SEXUL) میلان کو اُبھارنے والے عناصر مذہبی صورت میں جس قدر ہندوستان کے

---

[1] تمدنِ ہند ص ۴۴۰ - ۴۴۱

[2] ہیون سیانگ کا سفرنامہ "فوکوٹی کی" (مغربی سلطنت) [3] ایضاً

قدیم مذہب و تمدن میں ہی کسی دوسرے ملک میں نہیں پائے جاتے۔ ملک کی مقدس کتابوں اور مذہبی حلقوں نے اہم واقعات حوادث کے وقوع اور موجودات کے وجود کی توجیہ کے سلسلہ میں دیویوں اور دیوتاؤں کے باہم اختلاط اور بعض اونچے گھرانوں پر ان کی توجہات کے بعض ایسے واقعات اور روایتیں بیان کی ہیں جن کو سُن کر آنکھیں نیچی اور پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے۔ ان حکایتوں کا سادہ لوح اہلِ مذہب پر جو بڑے اخلاص اور جوشِ ایمانی کے ساتھ ان کہانیوں کو دُہراتے ہیں جو کچھ اثر پڑ سکتا ہے اس کا قیاس کرنا کچھ مشکل نہیں ظاہر ہے کہ ان کے اعصاب اور جذبات پر یہ روایتیں غیر شعوری طور پر اثر انداز ہوں گی۔ اس کے علاوہ بڑے دیوتا (شیو) کے آلۂ تناسل (لنگم) کی پُوجا ہوتی تھی اور بچے، جوان، مرد، عورت، سب اس میں شریک ہوتے تھے۔ ڈاکٹر گستاولی بان اس کی اہمیت اور اس کے ساتھ اہلِ ہند کے شغف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> "ہندوؤں کو مورتوں اور ظاہری علامات سے بے انتہا اُنس ہے۔ اُن کا کوئی مذہب کیوں نہ ہو اس کے اعمال کو یہ نہایت اہتمام سے بجا لاتے ہیں ان کے مندر پرستش کی چیزوں سے بھرے ہوئے ہیں جن میں سب سے مقدم لنگم اور یونی ہیں، جن سے مراد مادہ خلقت کے دونوں جزو ہیں، اشوک کے ستونوں کو بھی عام ہندو لنگم خیال کرتے ہیں اور اسطوانہ اور مخروطی شکلیں ان کے نزدیک واجب التعظیم ہیں۔"[1]

بعض مورخین کا بیان ہے کہ ایک مذہبی فرقہ کے مرد برہنہ عورتوں کی اور عورتیں برہنہ مردوں کی پرستش کرتے تھے۔[2] مندروں کے محافظ و منتظم بد اخلاقی کا سرچشمہ تھے اور بہت سی عبادت گاہیں اخلاقی جرائم (CORRUPTION) کا مرکز تھیں۔ راجاؤں کے محل اور بادشاہوں کے درباروں میں بے تکلف شراب کا دَور چلتا اور سرمستی میں اخلاقی حدود برقرار نہ رہتے۔

اس تن پروری و نفس پرستی کے بالکل متوازی نفس کشی، ریاضت و مجاہدہ (یوگ اور تپسیا) کا سلسلہ بھی جاری تھا جس میں حد درجہ غلو اور انتہا پسندی سے کام لیا جاتا تھا۔ ملک ان دونوں سروں کے درمیان اعتدال و توازن سے محروم تھا چند افراد نفس کشی اور روحانی ترقی میں مصروف تھے اور عام آبادی شہوانیت اور نفس پرستی کے دھارے میں بہی چلی جا رہی تھی۔

طبقہ واریت

کسی قوم کی تاریخ میں اس قدر بیّن طبقہ واری امتیاز اور پیشوں اور زندگی کے مشغلوں کی ایسی انمٹ اور اٹل تقسیم کم دیکھنے میں آئی ہے جیسی ہندوستان کے قدیم مذہبی و معاشرتی قانون میں ہے۔ ذات پات کی تفریق اور پیشہ کی جکڑ بندیوں کی ابتدا وید کے آخری زمانہ سے شروع ہو جاتی ہے۔ آریوں نے اپنی نسل اور اس کی خصوصیات کو محفوظ

---

[1] تمدنِ ہند ص ۴۴۷

[2] ستیارتھ پرکاش (دیانند سرسوتی) ص ۳۴۴

رکھنے اس ملک میں اپنی فاتحانہ حیثیت قائم رکھنے اور اپنا تفوق و برتری برقرار رکھنے کے لیے اس طبقہ واری تقسیم اور نسلی امتیاز کو ضروری سمجھا۔ ڈاکٹر گستاولی بان لکھتا ہے:

"ویدی زمانہ کے آخر میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ مختلف پیشے کم و بیش آبائی ہوتے جا رہے تھے اور ذات کی تقسیم شروع ہو چکی تھی اگرچہ تکمیل کو نہیں پہنچی تھی۔ ویدی آریوں کو یہ خیال پیدا ہو چکا تھا کہ وُہ اپنی پرانی نسل کو اقوام مفتوحہ کے میل جول سے محفوظ رکھیں، اور جس وقت یہ قلیل التعداد فاتحین مشرق کی طرف بڑھے اور انھوں نے دیسی اقوام کے ایک بہت بڑے گروہ کو فتح کر لیا تو یہ ضرورت اور بھی زیادہ ہو گئی اور مقننوں کو اس کا لحاظ کرنا لازمی ہو گیا۔ نسل کے مسائل کو آریہ سمجھ چکے تھے۔ انھیں معلوم ہو چکا تھا کہ اگر کوئی قلیل التعداد فاتح قوم اپنی پُوری حفاظت نہ کرے تو وُہ بہت جلد مفتوح اقوام میں کھپ جاتی ہے اور اس کا نام ونشان باقی نہیں رہتا۔" [1]

لیکن اس کو ایک مرتب و مفصل قانون کی شکل دینے کا سہرا منوجی کے سر ہے۔ منوجی نے پیدائشِ مسیح سے تین سو برس پہلے (جب ہندوستان میں برہمنی تہذیب عروج پر تھی) ہندوستانی سماج کے لیے اس قانون کو مرتب کیا اور تمام اہلِ ملک نے اس کو بالاتفاق قبول کیا اور اس نے بہت جلد ملکی قانون اور ایک مذہبی دستاویز کی حیثیت اختیار کر لی۔ یہ وہی قانون ہے جس کو ہم آج "منوشاستر" کے نام سے جانتے ہیں۔

منوشاستر میں چار ذاتیں بیان کی گئی ہیں:

۱۔ برہمن یعنی مذہبی پیشوا
۲۔ چھتری لڑنے والے
۳۔ ویش زراعت و تجارت پیشہ، اور
۴۔ شودر جن کا کوئی خاص پیشہ نہ تھا۔ اور جو دُوسری ذاتوں کے صرف خادم تھے۔

منوشاستر میں ہے:

"قادرِ مطلق نے دنیا کی بہبودی کے لیے اپنے مُنھ سے اور اپنے بازوؤں سے اور اپنی رانوں سے اور اپنے پیروں سے برہمن، چھتری، ویش اور شودر کو پیدا کیا۔" [2]

اس دُنیا کی حفاظت کے لیے اس نے ان میں سے ہر ایک کے لیے علٰحدہ علٰحدہ فرائض قرار دیے۔" [3]

برہمنوں کے لیے وید کی تعلیم اور خود اپنے لیے اور دوسروں کے لیے دیوتاؤں کے چڑھاوے دینا اور دان دینے کا فرض قرار دیا۔ [4]

---

[1] تمدنِ ہند ص۲۱۱ [2] منوشاستر باب اوّل ص۳۱ [3] باب اوّل ص۸۷ [4] باب اول ص ۸۸

چھتری کو اس نے حکم دیا کہ خلقت کی حفاظت کرے، دان دے، چڑھاوے چڑھائے، وید پڑھے اور خواہشاتِ نفسانی میں نہ پڑے۔[1]

ویش کو اس نے حکم دیا کہ مویشی کی سیوا کرے، دان دے، چڑھاوے چڑھائے، وید پڑھے، تجارت، لین دین زراعت کرے۔[2]

شودر کے لیے قادرِ مطلق نے صرف ایک ہی فرض بنایا وہ ان تینوں کی خدمت کرنا ہے۔"[3]

اس قانون نے برہمنوں کو دوسری ذاتوں کے مقابلہ میں اتنا امتیاز اور تفوق و تقدس عطا کیا تھا کہ وہ دیوتاؤں کے ہمسر بن گئے۔ منوشاستر میں ہے،

"جب کوئی برہمن پیدا ہوتا ہے تو وہ دنیا میں سب سے اعلیٰ مخلوق ہے۔ وہ بادشاہ ہے کل مخلوقات کا اور اس کا کام ہے شاستر کی حفاظت[4]

جو کچھ اس دنیا میں ہے برہمن کا مال ہے چونکہ وہ خلقت میں سب سے بڑا ہے، کل چیزیں اسی کی ہیں[5]

برہمن کو ضرورت ہو تو وہ بلا کسی گناہ کے اپنے غلام شودر کا مال بہ جبر لے سکتا ہے۔ اس غصب سے اس پر کوئی جرم عائد نہیں ہوتا، کیونکہ غلام صاحبِ جائداد نہیں ہو سکتا۔ اس کی کل املاک مالک کا مال ہے[6]

جس برہمن کو رگ وید یاد ہے وہ بالکل گناہ سے پاک ہے اگرچہ وہ تینوں عالم کو ناس کیوں نہ کر دے یا کسی کا بھی کھانا کیوں نہ کھائے[7]

بادشاہ کو کیسی ہی سخت ضرورت ہو اور وہ مرتا بھی ہو تو بھی اسے برہمنوں سے محصول نہ لینا چاہیے اور نہ اپنے ملک کے کسی برہمن کو بھوک سے مرنے دینا چاہیے[8]

سزائے موت کے عوض میں برہمن کا صرف سر مونڈا جائے گا لیکن اور ذات کے لوگوں کو سزائے موت دی جائے گی[9]

اس قانون میں چھتری اگرچہ ویش اور شودر کے مقابلہ میں بلند ہیں لیکن برہمنوں کے مقابلہ میں وہ بھی ہیچ ہیں۔ منو لکھتے ہیں،

"دس سال کی عمر کا برہمن اور سو سال کی عمر کا چھتری گویا آپس میں باپ بیٹے کا رشتہ رکھتے ہیں۔ لیکن ان دونوں میں برہمن باپ ہے۔"[10]

---

[1] منوشاستر باب اول ۸۹ [2] باب اول ۹۰ [3] باب اول ۹۱ [4] باب اول ۹۹ [5] باب اول ۱۰۰
[6] باب ہشتم ۴۱۷ [7] باب نہم ۲۶۲ [8] باب ہفتم ۱۳۳ [9] باب ہشتم ۳۷۹
[10] باب دوم ۱۳۵

بدقسمت شودر

باقی رہے اچھوت شودر، تو وہ ہندوستانی سماج میں اس شہری و مذہبی قانون کی رُو سے جانوروں سے پست درجہ کے، اور کُتوں سے زیادہ ذلیل تھے۔ منوشاستر میں ہے:

"برہمن کی خدمت کرنا شودر کے لیے نہایت قابلِ تعریف بات ہے اور اس کے سوا کسی اور چیز سے اسے اور کوئی اجر نہیں مل سکتا۔[1]

شودر کو اگر موقع ملے تو اُسے نہیں چاہیے کہ مال و دولت جمع کرے۔ کیونکہ شودر دولت جمع کرکے برہمنوں کو دکھ دیتا ہے۔[2]

اگر شودر دُوجوں پر ہاتھ یا لکڑی اٹھائے تو اس کا ہاتھ کاٹ ڈالا جائے گا۔ اور اگر وہ غصے میں لات مارے تو اس کا پیر کاٹ ڈالا جائے گا۔[3]

اگر کوئی شودر کسی دوج کے ساتھ ایک ہی جگہ بیٹھنا چاہے تو بادشاہ کو چاہیے کہ اس کے سُرین کو دغوا دے اور اسے ملک بدر کر دے یا اس کے سرین کو زخمی کرا دے۔[4]

اگر کوئی شودر کسی برہمن کو ہاتھ لگائے یا گالی دے تو اس کی زبان تالو سے کھینچ لی جائے اگر اس کا دعویٰ کرے کہ اس کو وہ تعلیم دے سکتا ہے تو کھولتا ہوا تیل اس کو پلایا جائے۔[5]

کُتے، بلی، مینڈک، چھپکلی، کوّے، اُلّو اور شودر کے مارنے کا کفارہ برابر ہے۔"[6]

ہندوستانی سماج میں عورت کی حیثیت

برہمنی زمانہ اور تہذیب میں عورت کا وہ درجہ نہیں رہا تھا جو ویدی زمانہ میں تھا۔ منو کے قانون میں (بقول ڈاکٹر لی بان) عورت ہمیشہ کمزور اور بے وفا سمجھی گئی ہے اور اس کا ذکر ہمیشہ حقارت کے ساتھ آیا ہے۔[7]

شوہر مر جاتا تو عورت گویا جیتے جی مر جاتی اور زندہ درگور ہو جاتی۔ وہ کبھی دُوسری شادی نہ کر سکتی تھی۔ اس کی قسمت میں طعن و تشنیع اور ذلت و تحقیر کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ بیوہ ہونے کے بعد اپنے متوفی شوہر کے گھر کی لونڈی اور دیوروں کی خادمہ بن کر رہنا پڑتا۔ اکثر بیوائیں اپنے شوہروں کے ساتھ ستی ہو جاتیں۔ ڈاکٹر لی بان لکھتا ہے:

"بیواؤں کو اپنے شوہروں کی لاش کے ساتھ جلانے کا ذکر منوشاستر میں نہیں ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ

---

[1] باب دہم ۱۲۹ [2] باب دہم ۱۲۹ [3] باب ہشتم ۲۸۰ [4] باب ہشتم ۲۸۱ [5] R.C. DUTT P. 342-343.

[6] منوشاستر [7] تمدنِ ہند ۲۳۶

یہ رسم ہندوستان میں عام ہو چلی تھی، کیونکہ یونانی مورخین نے اس کا ذکر کیا ہے۔"[1]

غرض یہ سرسبز و شاداب ملک جو فطرت کے خزانوں سے مالا مال تھا، سچے آسمانی مذہب کی تعلیمات سے عرصہ سے محروم ہونے اور مذہب کے مستند ماخذوں کے گم ہو جانے کی وجہ سے قیاسات و تحریفات کا شکار اور رسوم و روایات کا پرستار بنا ہوا تھا، اور اس وقت کی دنیا میں جہالت و توہم پرستی، پست درجہ کی بُت پرستی، نفسانی خواہشات اور طبقہ داری ناانصافی میں پیش پیش تھا اور دُنیا کی اخلاقی و روحانی رہبری کے بجائے خود اندرونی انتشار اور اخلاقی بدنظمی میں بتلا تھا۔

عرب

دورِ جاہلیت میں عرب اپنی فطری صلاحیتوں اور بعض عادات و اخلاق میں تمام دنیا میں ممتاز تھے۔ فصاحت و بلاغت اور قادر الکلامی میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ آزادی و خودداری ان کو جان سے زیادہ عزیز تھی، شہسواری و شجاعت میں وہ بے بدل تھے، عقیدہ کے پرجوش، صاف گو اور جری، حافظہ کے قوی، مساوات، بے تکلفی اور جفاکشی کے عادی، ارادہ کے پکے، زبان کے سچے، وفاداری اور امانت داری میں ضرب المثل تھے۔

لیکن انبیا اور اُن کی تعلیمات سے بُعد ایک جزیرہ نما میں صدیوں کے مقید رہنے کی وجہ سے اور باپ دادا کے دین اور قومی روایات پر سختی سے قائم ہونے کے سبب وہ دینی و اخلاقی حیثیت سے بہت گر چکے تھے۔ چھٹی صدی میں وہ تنزل و انحطاط کے آخری نقطہ پر تھے، کھلی ہوئی بُت پرستی میں مبتلا، اور اس میں دنیا کے امام تھے۔ اخلاقی و اجتماعی امراض ان کی سوسائٹی کو گُھن کی طرح کھا رہے تھے، غرض مذاہب کے اکثر محاسن سے وہ محروم اور جاہلی زندگی کی بدترین خصوصیتوں اور معائب میں مبتلا تھے۔

دورِ جاہلیت کے بُت

جہالت و جاہلیت کی ترقی کے ساتھ ساتھ غیر اللہ کی پرستش کا عقیدہ مقبول و عام اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت و ربوبیت کا تصور کمزور اور خواص میں محدود ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ رفتہ رفتہ پوری قوم بُتوں اور مورتیوں کی (جن کو کسی زمانہ میں شفیع اور واسطہ یا مرکز توجہ بنانے کے لیے اختیار کیا گیا تھا) صاف صاف پرستش میں مشغول ہو گئی اور اللہ تعالیٰ سے (جس کا خالق کائنات اور رب الارباب کی حیثیت سے اب بھی اقرار تھا[2]) عملاً و قلباً تعلق منقطع ہو کر دوسرے معبودوں اور بتوں سے قائم ہو گیا تھا اور عبودیت و بندگی کے اظہار کے طریقے اور اعمال (سجدہ، قربانی، حلف، دعا و استعانت) انھیں کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ گئے تھے اور ملک میں کھلی بت پرستی، خدا سے بے تعلقی اور صریح شرک کا

---

[1] تمدنِ ہند ص ۲۳۸   [2] ولئن سالتھم من خلق السمٰوٰت والارض لیقولن اللہ

دَورِ دورہ تھا۔[۱]

عرب میں ہر ہر قبیلہ ، ہر ہر شہر اور ہر ہر علاقہ کا ایک خاص بُت تھا ، بلکہ ہر گھر کا بُت جُدا تھا ۔ کلبی کا بیان ہے کہ مکہ مکرمہ کے ہر گھر کا ایک بُت تھا جس کی گھر والے پرستش کرتے تھے ۔ جب کوئی شخص سفر کا ارادہ کرتا تو روانگی کے وقت گھر پر اس کا آخری کام یہ ہوتا کہ اپنے بُت کو حصولِ برکت کے لیے چھُوتا اور جب سفر سے واپس آتا تو گھر پہنچ کر پہلا کام یہ کرتا کہ اپنے بُت کو تبرکاً ہاتھ لگاتا۔[۲] بتوں کے بارے میں بڑا غلو اور انہماک تھا ۔ کسی نے تو ایک بت خانہ بنا رکھا تھا کسی نے بُت تیار کر لیا تھا جو بت خانہ نہیں بنا سکتا تھا یا بت نہیں تیار کر سکتا تھا وہ حرم کے سامنے ایک پتھر گاڑ دیتا یا حرم کے علاوہ جہاں بہتر سمجھتا پتھر گاڑ کر اس کے اردگرد اس شان سے طواف کرتا جس طرح بیت اللہ کے گرد طواف کیا جاتا ہے ان پتھروں کو وہ انصاب کہا کرتے تھے[۳] خود خانہ کعبہ کے اندر (وہ خانہ کعبہ جو صرف اللہ کی عبادت کے لیے بنایا گیا تھا) اور اس کے صحن میں ۳۶۰ بُت تھے[۴]۔ بتوں اور دیوتاؤں کی پُوجا کرتے کرتے یہ لوگ اس حد تک بڑھ گئے کہ پتھر کی قسم سے جو کچھ مل جاتا اس کو پُوجتے ۔

بخاری میں ابو رجاؔ العطاردی سے روایت ہے کہ " ہم لوگ پتھر کو پُوجتے تھے اگر کوئی اس سے اچھے قسم کا پتھر مل جاتا تو اس کو پھینک کر اس نئے پتھر کو لے لیتے اور اگر پتھر نہ پاتے تو مٹی کا ایک ڈھیر بناتے اور اس پر بکری کو لا کر دوہتے پھر اسی کا طواف کرتے "۔[۵]

کلبی کا بیان ہے کہ " کوئی شخص سفر میں کسی نئے مقام پر اُترتا تو چار پتھر لے آتا جو پتھر اس کو اچھا معلوم ہوتا اس کو معبود قرار دیتا اور باقی تین پتھروں کو اپنی ہانڈی کا پتھر بناتا اور جب وہاں سے جاتا تو سب پتھروں کو چھوڑ جاتا "۔[۶]

معبودوں کی کثرت

مشرکوں کا ہر زمانہ اور ہر ملک میں جو حال رہا ہے وہی حال عرب کا تھا ۔ ان کے متعدد اور مختلف معبود تھے جن میں فرشتے ، جن ، ستارے سب شامل تھے ۔ فرشتوں کے بارہ میں ان کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں اس لیے ان سے

---

[۱] عرب جاہلیت کے عقائد کی حقیقت اور مشرکانہ عقیدہ کے تدریجی ارتقا کو معلوم کرنے کے لیے ملاحظہ ہو شامی فاضل محمد عزت دروزہ کی کتاب بیئۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم من القرآن (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وطن اور ماحول قرآن کی روشنی میں)

[۲] کتاب الاصنام ص ۳۳ [۳] ایضاً

[۴] صحیح بخاری کتاب المغازی باب فتح مکہ ۔ [۵] ایضاً باب وفد بنی حنیفہ

[۶] کتاب الاصنام

شفاعت کے طلبگار رہوتے، ان کی پرستش کرتے اور ان کو وسیلہ بناتے۔ جِنّوں کو اللہ کا شریک کار سمجھتے، ان کی قدرت اور اثراندازی پر ایمان رکھتے اور ان کی پرستش کرتے[۱]

کلبی کا بیان ہے کہ قبیلہ خزاعہ کی ایک شاخ بنو ملیح تھی جو جِنّوں کو پُوجتی تھی[۲]

صاعد کی روایت ہے کہ قبیلہ حمیر آفتاب کی پرستش کرتا، کنانہ کا قبیلہ چاند کا پرستار تھا، بنو تمیم دبران کی، لخم و جذام مشتری کی، قبیلہ طے سہیل کی، بنو قیس شعریٰ اور بنو اسد عطارد کی پرستش کرتا تھا[۳]

اخلاقی و اجتماعی امراض

اخلاقی اعتبار سے ان کے اندر بہت سی بیماریاں اور امراض گھر کیے ہوئے تھے اور اس کے اسباب واضح ہیں۔ شراب عام طور سے پی جاتی تھی اور ان کی گھُٹی میں پڑی تھی۔ اس کا تذکرہ ان کی ادبیات اور شاعری کی بہت بڑی جگہ کو گھیرے ہوئے ہے۔ عربی زبان میں اس کے نام جس کثرت سے ہیں اور ان ناموں میں جن باریک فرقوں اور پہلوؤں کا لحاظ رکھا گیا ہے اس سے اس کی مقبولیت و عمومیت کا اندازہ ہوسکتا ہے[۴] شراب کی دکانیں برسرِ راہ تھیں اور علامت کے طور پر ان پر پھریرا لہراتا[۵] جُوا جاہلی زندگی میں بڑائی اور خوبی کی بات تھی اور اس میں شرکت نہ کرنا پست ہمتی اور مردہ دلی کی دلیل تھی[۶]

تابعی عالم قتادہ کا بیان ہے کہ زمانہ جاہلیت میں ایک شخص اپنے گھر بار کو داؤں پر رکھ دیتا۔ پھر لٹا ہوا حسرت سے اپنے مال کو دُوسروں کے ہاتھ میں دیکھتا۔ اس سے نفرت و عداوت کی آگ بھڑکتی اور جنگوں کی نوبت آتی[۷]

حجاز کے عرب اور یہودی سُودی لین دین اور سُود در سود کا معاملہ کرتے۔ اس سلسلہ میں بڑی بے رحمی اور سخت دلی کے مظاہرے ہوتے[۸] زنا کو کچھ زیادہ معیوب بات نہ سمجھا جاتا اور اس کے واقعات عربوں کی زندگی میں کمیاب نہ تھے اس کے بہت سے اقسام اور طریقے رائج تھے۔ زنانِ بازاری اور پیشہ ور عورتوں کے اڈے بھی موجود تھے اور شراب خانوں میں بھی اس کا انتظام تھا[۹]

---

[۱] کتاب الاصنام ص ۳۴ [۲] ایضاً ص ۳۴ [۳] طبقات الامم (صاعد اندلسی) ص ۴۳۰

[۴] ملاحظہ ہو کتاب المخصص (ابن سیدہ) الخمر ج ۱۱ ص ۷۲، ۸۲ [۵] سبع معلقات معلقہ شعر قدبت سامرھا الخ

[۶] دیوان الحماسہ قصیدۂ حجر بن خالد شعر و اذا ھلکت فلا تریدی عاجز الخ

[۷] ملاحظہ ہو تفسیر طبری تفسیر آیت انما یرید الشیطان ان یوقع بینکم العداوۃ والبغضاء

[۸] تفسیر طبری ج ۳ ص ۵۹ - ۶۹

[۹] ملاحظہ ہو العقد الفرید کتاب اخبار زیاد (ابن عبد ربہ)

عورت کا درجہ

جاہلی معاشرہ میں عورت کے ساتھ ظلم و بدسلوکی عام طور سے روا سمجھی جاتی تھی۔ اس کے حقوق پامال کیے جاتے۔ اس کا مال مرد اپنا مال سمجھتے وہ ترکہ اور میراث میں کچھ حصہ نہ پاتی۔ شوہر کے مرنے یا طلاق دینے کے بعد اس کو اجازت نہیں تھی کہ اپنی پسند سے دوسرا نکاح کر سکے[۱]۔ دوسرے سامان اور حیوانات کی طرح وہ بھی وراثت میں منتقل ہوتی رہتی تھی[۲]۔ مرد تو اپنا پورا پورا حق وصول کرتا لیکن عورت اپنے حقوق سے مستفید نہیں ہو سکتی تھی۔ کھانے میں بہت سی ایسی چیزیں تھیں جو مردوں کے لیے خاص تھیں اور عورتیں ان سے محروم تھیں[۳]۔

لڑکیوں سے نفرت اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ انھیں زندہ درگور کرنے کا بھی رواج تھا۔ ہیثم بن عدی نے ذکر کیا ہے کہ زندہ درگور کرنے کا اصول عرب کے تمام ہی قبائل میں رائج تھا۔ ایک اس پر عمل کرتا دس چھوڑتے تھے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک رہا جب تک کہ اسلام نہیں آیا[۴]۔ بعض ننگ و عار کی بنا پر، بعض خرچ و مفلسی کے ڈر سے اولاد کو قتل کرتے۔ عرب کے بعض شرفا و رؤسا ایسے موقعہ پر بچوں کو خرید لیتے اور ان کی جان بچاتے[۵]۔ صعصعہ بن ناجیہ کا بیان ہے کہ اسلام کے ظہور کے وقت تک میں تین سو زندہ درگور ہونے والی لڑکیوں کو فدیہ دے کر بچا چکا تھا[۶]۔ بعض اوقات کسی سفر یا مشغولیت کی وجہ سے لڑکی سیانی ہو جاتی اور دفن کرنے کی نوبت نہ آتی جاہلی باپ دھوکہ دے کر اس کو لے جاتا اور بڑی بے دردی سے اس کو زندہ درگور کر آتا۔ اسلام لانے کے بعد بعض عربوں نے اس سلسلہ کے بڑے اندوہ ناک اور رقت انگیز واقعات بیان کیے ہیں[۷]۔

قبائلی و خاندانی عصبیت و امتیاز

قبیلے اور رشتہ داریوں کی بنیاد پر عصبیت اور جتھہ بندی عرب میں بڑی سخت تھی۔ اس عصبیت کی بنیاد جاہلی مزاج تھا جس کی روح اس مشہور جملہ سے ظاہر ہوتی ہے:

انصر اخاك ظالماً او مظلوماً۔

یعنی اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔

چنانچہ وہ اپنے حلیف اور بھائی کی ہر حال میں مدد کرنا ضروری سمجھتے تھے خواہ وہ برسر حق ہو یا برسر باطل۔

عربی معاشرہ مختلف طبقات اور الگ الگ حیثیت کے خاندانوں اور گھرانوں پر مشتمل تھا۔ ایک خاندان دوسرے سے اپنے کو بلند و برتر سمجھتا تھا۔ بعض خاندان دوسرے خاندانوں یا عام انسانوں کے ساتھ بہت سی رسوم و عادات میں شرکت پسند

---

[۱] سورۃ البقرہ آیت ۲۳۲ [۲] سورۃ النسا، آیت ۱۹ [۳] سورۃ الانعام، آیت ۱۴۰ [۴] میدانی [۵] ملاحظہ ہو بلوغ الارب فی احوال العرب۔ آلوسی [۶] کتاب الاغانی [۷] ملاحظہ ہو سنن الدارمی ۱۷ باب ما کان علیه الناس قبل مبعث النبی صلی اللہ علیه وسلم من الجهل والضلالة۔ ص ۳

نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ حج کے بعض مناسک میں قریش عام حجاج سے الگ تھلگ اور ممتاز رہتے تھے۔ وہ عرفات میں عام لوگوں کے ساتھ ٹھہرنا عار کی بات سمجھتے تھے۔ آنے جانے میں پیش قدمی کرتے تھے[1] ایک طبقہ پیدائشی آقاؤں کا تھا، ایک طبقہ کم حیثیت لوگوں کا جس سے بیگار لیا جاتا اور کام پر لگایا جاتا۔ کچھ عوام اور بازاری لوگ تھے۔

جنگجو فطرت

عرب فطرۃً جنگجو واقع ہوئے تھے اور ان کی صحرائی اور غیر متمدن زندگی کا تقاضا بھی یہی تھا، جنگ ان کے لیے زندگی کی ایک ضرورت سے آگے بڑھ کر تفریح اور دل بستگی کا سامان بن گئی تھی جس کے بغیر ان کا جینا مشکل تھا، ایک شاعر فخریہ کہتا ہے کہ اگر ہم کو کوئی حریف قبیلہ نہیں ملتا تو اس خواہش کی تسکین کے لیے ہم اپنے برادر و حلیف قبیلہ پر حملہ کر دیتے ہیں[2] ایک عرب شاعر دُعا کرتا ہے کہ:

"میرا گھوڑا سواری کے قابل ہو جائے تو اللہ قبائل میں جنگ کی آگ بھڑکا دے تاکہ مجھے اپنے گھوڑے اور اپنی تلوار کے جوہر دکھانے کا موقع ملے۔"[3]

جنگ کرنا اور خون بہانا ان کے لیے معمولی کام تھا۔ جنگ کو بھڑکانے کے لیے معمولی واقعات کافی تھے۔ وائل کی اولاد، بکر و تغلب کے درمیان چالیس سال تک جنگ جاری رہی جس میں پانی کی طرح خون بہا۔ ایک سردار مہلہل نے اس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ دونوں خاندان مٹ گئے۔ ماؤں نے اپنی اولاد کھوئی۔ بچے یتیم ہوئے، آنسو خشک نہیں ہوتے، لاشیں دفن نہیں کی جاتیں[4] پورا جزیرۂ عرب گویا شکاری کا جال تھا، کوئی شخص نہیں جانتا تھا کہ کہاں لوٹ لیا جائے گا اور کب دھوکہ سے قتل کر دیا جائے گا، لوگ قافلوں میں اپنے ساتھیوں کے درمیان سے اُچک لیے جاتے تھے، یہاں تک کہ عظیم الشان سلطنتوں کو اپنے قافلوں اور سفارتوں کے لیے چوکی پہرہ اور مضبوط بدرقہ اور قبائل کے سرداروں کی ضمانت کی ضرورت پڑتی تھی[5]

دنیا کا عمومی جائزہ

ایک انگریز سیرت نگار آر، وی، سی، بوڈلے (R.V.C. BODLEY) اپنی کتاب "پیغامبر" (THE MESSENGER) میں زمانۂ بعثت کی دنیا کا عمومی جائزہ لیتے ہوئے اس وقت کے قابل ذکر ممالک و

---

[1] سورۃ البقرہ، آیت ۱۹۹ [2] و احیانا علی بکر اخینا اذا ما لم نجد الا اخانا (حماسہ) [3] اذا المهرة الشقراء ادرك ظهرها، فشب الاله الحرب بين القبائل (حماسہ) [4] ملاحظہ ہو کتاب ایام العرب

[5] ملاحظہ ہو تاریخ طبری ج ۲ ص ۱۴۳

اقوام کا تذکرہ کرتا ہے:

"قدیم روایات کے باوجود چھٹی صدی عیسوی کی اس دنیا میں عربوں کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی حقیقت میں تو کسی کی بھی کوئی اہمیت نہ تھی۔ یہ ایک نزاع کا دور تھا جب کہ مشرقی یورپ اور مغربی ایشیا کی عظیم سلطنتیں اوّل ہی تباہ ہو چکی تھی یا اپنے شاہی دَور کے اختتام پر تھیں۔ یہ ایک ایسی دنیا تھی جو اب بھی یُونان کی فصاحت، ایران کی عظمت اور روما کی شوکت و جلال سے متحیر تھی اور کوئی ایسی ایک شے یا کوئی ایسا ایک مذہب بھی نہ تھا جو ان میں سے کسی کی جگہ لیتا۔

یہودی تمام دُنیا میں مارے مارے پھر رہے تھے ان کو کوئی مرکزی رہنمائی حاصل نہ تھی۔ حالات کے مطابق یا تو ان کو محض برداشت کیا جاتا یا اذیتیں دی جاتیں، کوئی ملک اُن کا اپنا ذاتی نہ تھا اور ان کا مستقبل اسی قدر غیر یقینی تھا جس طرح کہ آج ہے۔

پوپ گرگیری اعظم (GRIGORY THE GREAT) کے حلقۂ اثر سے باہر مسیحی اپنے سہل عقائد کے ہر قسم کے پیچیدہ معانی ایجاد کر رہے تھے اور اس سلسلہ میں ایک دُوسرے کا گلا کاٹنے میں مصروف تھے۔

ایران میں تعمیر سلطنت کی صرف ایک کرن رہ گئی تھی۔ خسرو ثانی اپنی سلطنت کی توسیع میں مصروف تھا اس نے روما کو شکست دے کر کیپدوشیا (CAPPADOCIA) مصر و شام پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس نے ۶۲۰ء میں (جب کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت رہنما ظاہر ہونے والے تھے) بیت المقدس کو تاراج کر کے مقدس صلیب کو چُرا لیا تھا اور دارائے اوّل کی زبردست عظمت و شوکت کو دوبارہ قائم کر دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا مشرقِ وسطیٰ کی عظمت کو زندگی کی ایک نئی قسط مل گئی ہے۔ لیکن یہی نہ تھا بازنطینی رومی اب بھی اپنی گزری ہوئی چستی رکھتے تھے جب خسرو اپنی فوج کو قسطنطنیہ کی فصیلوں پر لایا تو انھوں نے ایک آخری کوشش کر دکھائی۔

مشرق بعید میں حالات کوئی نمایاں اثرات نہیں چھوڑ رہے تھے، ہندوستان اب بھی چھوٹی چھوٹی غیر اہم ریاستوں پر مشتمل تھا جو سیاسی اور حربی حیثیت سے ایک دُوسرے پر فوقیت کے لیے جد و جہد میں مصروف تھیں۔

چینی ہمیشہ کی طرح آپس میں نبرد آزما تھے۔ خاندان سوئی آیا اور گیا اور اس کی جگہ ٹینگ نے لے لی جو تین صدیوں تک حکمران رہا۔

جاپان میں پہلی مرتبہ ایک عورت تخت نشین ہُوئی۔ بدھ مت جڑ پکڑنے لگا تھا اور جاپانی تصورات اور مقاصد پر اثر انداز ہونے لگا تھا۔

اسپین اور انگلستان غیر اہم چھوٹے چھوٹے ملک تھے۔ اسپین وسی گوتھوں (VISI GOTHS) کے زیر اثر تھا جو کچھ عرصہ پہلے ہی فرانس سے جس پر انھوں نے لوائر (LOIRE) تک قبضہ کر رکھا تھا نکالے گئے تھے وہ ان یہودیوں پر مظالم ڈھا رہے تھے جن کو اس مسلم حملہ کے لیے جو ابھی سو برس بعد ہونے والا تھا آسانیاں پیدا کرتی تھیں۔

جزائر برطانیہ آزاد ریاستوں میں تقسیم تھا۔ ڈیڑھ سو (۱۵۰) سال رومیوں کو روانہ ہوئے ہو چکے تھے جن کی جگہ نارڈک لوگوں کی آمد نے لی تھی، خود انگلستان سات مختلف بادشاہتوں پر مشتمل تھا۔[۱]

زمانہ جاہلیت کا سیاسی و معاشی نظام

جاہلی دنیا کی دینی، روحانی، اخلاقی و اجتماعی صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سیاسی و معاشی نقشہ پر خصوصی نظر ڈال لی جائے کہ دینی و اخلاقی اور اجتماعی ترقی و انحطاط میں سیاسی و معاشی حالات اور رائج الوقت سیاسی و معاشی تصورات اور قوانین کا بہت بڑا دخل ہے اور وہ قومی زندگی کی تعمیر و تشکیل کا ایک اہم و فعال عنصر (FACTOR) ہے۔

مطلق العنان بادشاہت

زمانہ جاہلیت میں خالص آمرانہ حکومت کا دور دورہ تھا۔ اس زمانہ کی سیاست مطلق العنان بادشاہت تھی۔ یہ بادشاہت اکثر مخصوص خاندانوں کی عظمت پر قایم ہوتی تھی جیسا کہ ایران میں تھا۔ وہاں آلِ ساسان کا یہ عقیدہ تھا کہ حکومت پر اُن کا موروثی حق ہے اور انھیں تائیدِ الٰہی حاصل ہے۔ عام رعایا کو بھی پوری کوشش کرکے اس کا یقین دلایا گیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے بھی اس اصول کو تسلیم کر لیا تھا اور حکومت کے بارہ میں ان کا یہی عقیدہ ہو گیا تھا جو کبھی متزلزل نہیں ہوتا تھا۔

کبھی یہ بادشاہت محض سلاطین کی عظمت پر قایم ہوتی تھی۔ اہلِ چین اپنے بادشاہ کو "شہنشاہ فرزند آسمان" کہتے تھے۔ کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ آسمان "نر" ہے اور زمین "مادہ"، اور کائنات کو انھیں نے جنم دیا ہے اور شہنشاہ ختا اول زمین و آسمان کے جوڑے کی سب سے پہلی اولاد ہے۔[۲] اسی بنا پر شاہِ وقت کو قوم کا تنہا باپ تصور کیا جاتا تھا، اس کو حق تھا کہ جو چاہے کرے۔ لوگ اس سے کہتے تھے کہ "آپ ہی قوم کے مائی باپ ہیں"۔ شہنشاہ لی یاں یا تائی تسنگ جب مرا ہے تو اہلِ چین نے سخت ماتم برپا کیا اور حد سے زیادہ غم کیا کسی نے سوئیوں سے اپنا چہرہ خون آلود کیا، کسی نے اپنے بال کاٹے۔ کسی نے جنازہ سے اپنے کان مار مار کر زخمی کر لیے۔

---

[۱] ۱۸۔۱۹ (باختصار) ترجمہ سید قاسم حسنی [۲] تاریخ چین از جیمس کارکرن

کبھی بادشاہت کسی خاص گروہ یا کسی مخصوص وطن کا حق سمجھی جاتی تھی جیسا کہ مملکتِ روما میں اعتقاد تھا وہاں رومی وطن اور رومی قومیت کی عظمت بنیادی قانون تھا۔ دوسری قومیں اور دوسرے ملک اس قومیت کے غلام تھے۔ ان کی حیثیت ان رگوں اور شرائین کی سی تھی جن سے خون جاری ہو کر اپنے مرکز کو پہونچتا ہے۔ سلطنت روما ہر قانون اور ہر ایک کے حق کو نظر انداز کر سکتی اور ہر ایک کی عزت و ناموس پامال کر سکتی تھی۔ وہ ہر ظلم و ستم کو جائز سمجھتی تھی۔ رومیوں کا ہم عقیدہ اور ہم مذہب ہو کر اور حکومت کے ساتھ خلوص اور وفاداری کا اظہار کر کے بھی کوئی قوم یا فرد رومیوں کے ظلم و ستم سے بچ نہیں سکتا تھا۔ کسی قوم کو حکومت خود اختیاری یا اندرونی خود مختاری کا حق نہیں تھا اور نہ اس کا موقع تھا کہ اپنے ملک میں اپنے واجبی حقوق سے مستفید ہو سکے، ان محکوم قوموں اور مفتوح ملکوں کی مثال اس اونٹنی کی سی تھی جس پر بوقتِ ضرورت سواری کی جاتی اور اس کا دودھ دوہا جاتا اور صرف اسی قدر اس کو چارہ دیا جاتا جو اس کی پیٹھ کو مضبوط اور تھن کو دودھ سے بھرا رکھ سکے۔ رابرٹ بریفالٹ (ROBERT BRIFFAULT) رومی سلطنت کے بارہ میں لکھتا ہے:

"رومی سلطنت کی تباہی کا سبب وہاں کی بڑھتی ہوئی خرابیاں (مثلاً رشوت وغیرہ) نہ تھیں بلکہ اصلی بُرائی اور بنیادی خرابی فساد و شر اور حقائق سے گریز کی عادت تھی جو اس سلطنت کے قیام اور نشوونما میں پہلے ہی دن سے موجود تھی۔ یہ خرابی سلطنت کے اندر جڑ پکڑ چکی تھی، کسی انسانی جماعت کی تعمیر جب کبھی اس طرح کی کمزور اور کج بنیاد پر کی جائے گی تو اس کے گرنے سے صرف ذہانتیں اور عملی سرگرمیاں نہیں بچا سکتیں۔ اور چونکہ خرابیوں ہی پر اس سلطنت کی بنیاد تھی اس لیے اس کا خاتمہ اور زوال بھی ضروری تھا، کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ رومی سلطنت صرف ایک چھوٹے سے طبقہ کے عیش اور راحت رسانی کا ذریعہ تھی اور جمہور عوام سے ناجائز منفعت اندوزی اور رعایا کا خون چوس کر شاہی قومیت کو غذا پہونچانا اس حکومت کا کام تھا، بلاشبہ روم میں تجارت امانت داری اور انصاف کے ساتھ جاری تھی اور یہ بات حکومت کی بنیادی خصوصیات میں سمجھی جاتی تھی اور اس سے بھی انکار نہیں کہ حکومت اپنی طاقت و قابلیت میں نیز اپنے عدالتی نظام میں ممتاز تھی۔ لیکن یہ تمام خوبیاں حکومت کو تباہی سے نہیں بچا سکتی تھیں اور نہ اساسی غلطیوں کے سخت انجام سے محفوظ رکھ سکتی تھیں۔"[۱]

مصر و شام کی رومی حکومت

ڈاکٹر الفرڈ بٹلر (ALFRED BUTLER) رومی حکومت کے بارہ میں لکھتا ہے:

"مصر میں رومی حکومت صرف ایک ہی غرض و غایت اپنے سامنے رکھتی تھی اور وہ یہ تھی کہ جس طرح

---

[۱] ROBET BRIFFAULT. THE MAKING OF HUMANITY. P.159.

ممکن ہو رعایا سے مال لوٹ کھسوٹ کر حکام کو فائدہ پہونچایا جائے۔ رعایا کی بہبودی اور خوشحالی اور عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کا خیال تک نہیں آتا تھا، رعایا کی تہذیب اور اخلاق کو درست کرنا اور ترقی دینا تو بڑی چیز ہے، ملک کے مادی وسائل کو ترقی دینے کی بھی اس کو فکر نہ تھی، مصر پر ان کی حکومت ان پر دلیسیوں کی سی حکومت تھی جو صرف اپنی طاقت پر بھروسا کرتی ہے اور محکوم قوم کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کرنے تک کی بھی ضرورت نہیں سمجھتی ہے۔[1]

ایک عرب شامی مورخ شام میں رومی حکومت کے بارہ میں کہتا ہے:

"ابتدا میں رومیوں کا شامیوں کے ساتھ اچھا اور منصفانہ برتاؤ تھا۔ اگرچہ ان کی سلطنت میں اندرونی طور پر خلفشار رہتا لیکن جب ان کی حکومت بُوڑھی ہوگئی تو اس نے بدترین قسم کی غلامی کی شکل اختیار کر لی اور بدترین معاملہ جو غلام اور رعیت کے ساتھ کیا جا سکتا ہے اس نے اپنی محکوم رعایا کے ساتھ کیا، روم نے براہِ راست شام کا کبھی الحاق نہیں کیا اور شام کے باشندوں کو کبھی بھی رومیوں کی طرح شہری حقوق نہیں حاصل ہوئے، نہ ان کے ملک کو رومی سلطنت اور سرزمین کا درجہ ملا۔ شامی ہمیشہ غریب الوطن افراد کی طرح رعایا بن کر رہے، اکثر سرکاری ٹیکس ادا کرنے کے لیے اپنی اولاد کو بیچ دینے پر مجبور ہوئے، مظالم کی زیادتی تھی، غلام بنانے اور بیگار لینے کا عام رواج تھا، اسی بیگار سے رومی حکومت نے وہ ادارے اور کارخانے تعمیر کیے جو رومیوں کا کارنامہ سمجھے جاتے ہیں"۔[2]

رومیوں نے شام پر سات سو سال تک حکومت کی۔ ان کے آتے ہی ملک میں اختلافات، خود سری اور جبر کی بنیاد پڑ گئی تھی اور قتل کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا، یونانیوں نے شام پر ۳۶۹ سال حکومت کی اس پُورے عہدِ حکومت میں بڑی سخت جنگیں ہوئیں، رعایا پر مظالم ہوئے اور یونانیوں کے حرص و ہوس کی پُوری کیفیت کھل کر ظاہر ہوگئی شامی قوم پر ان کی سلطنت بدترین نحوست اور سخت ترین عذاب تھی۔[3]

خلاصہ یہ کہ بدلیسی سامراج کے ہاتھوں روم و ایران کے ممالک انتہائی تکلیف و مصیبت میں تھے اور سیاسی، مالی، اقتصادی ہر لحاظ سے ملک کے تمام مرکز اور دار السلطنت حد درجہ ابتری کی حالت میں تھے۔

ایران میں خراج اور ٹیکس وصول کرنے کا انتظام

ایران میں سیاسی و معاشی نظام نہ عادلانہ تھا نہ مستحکم، بلکہ اکثر حالات میں بہت ہی ناہموار اور ظالمانہ تھا۔

---

[1] ARAB'S CONQUEST OF EGYPT AND THE LAST THIRTY YEARS OF THE ROMAN DOMINION. P.42.

[2] خطط الشام (محمد کرد علی) ج ۱ ص ۱۰۱ [3] ایضاً ج ۱ ص ۱۰۲

خراج اور ٹیکس وصول کرنے والے عملہ کے اخلاق، ان کی خواہشات اور ملک کے جنگی اور سیاسی حالات کے مطابق یہ نظام بدلتا رہتا۔ "ایران بعہد ساسانیاں" کا مولف لکھتا ہے:

"خراج اور ٹیکس کے لگانے اور وصول کرنے میں محصلین خیانت اور استحصال بالجبر کے مرتکب ہوتے تھے، چونکہ مالیات کی رقم سال بسال مختلف ہوتی رہتی تھی۔ یہ ممکن نہ تھا کہ سال کے شروع میں آمدنی اور خرچ کا تخمینہ ہوسکے۔ علاوہ اس کے ان چیزوں کو ضبط میں رکھنا بھی بہت مشکل تھا، بسا اوقات نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ادھر تو جنگ چھڑ گئی ادھر روپیہ ندارد۔ ایسی حالت میں پھر غیر معمولی ٹیکس کا لگانا ضروری ہوجاتا تھا اور تقریباً ہمیشہ اس کی زد مغرب کے مالدار صوبوں خصوصاً بابل پر پڑتی تھی۔"[1]

شاہی خزانے اور ذاتی دولت

پبلک کے فائدے کے لیے جتنا روپیہ شاہی خزانے سے خرچ ہوتا تھا وہ کچھ زیادہ نہ تھا۔ شاہانِ ایران کے یہاں ہمیشہ یہ دستور رہا کہ جہاں تک ممکن ہوتا اپنے خزانہ میں نقد روپیہ اور قیمتی اشیا جمع کرتے[2] خسرو دوم نے ۶۰۷ - ۶۰۸ء میں طیسفون (مدائن) میں اپنے خزانہ کو نئی عمارت میں منتقل کیا تو اس میں چھیالیس کروڑ اسی لاکھ (۴۶۸۰۰۰۰۰۰) مثقال سونا تھا۔ یعنی تقریباً سینتیس کروڑ پچاس لاکھ فرانک طلائی (چار ارب اڑسٹھ کروڑ روپے)۔ حکومت کے تیرھویں سال کے بعد اس کے خزانہ میں اسی کروڑ مثقال وزن کا سونا تھا[3] خسرو دوم کے تاج میں ۲۰۱ پونڈ (یعنی ڈیڑھ من) خالص سونا تھا۔[4]

طبقاتی تفاوت

ایران کی قومی زندگی میں دولت وخوشحالی مخصوص افراد کے اندر محدود تھی، معدودے چند اشخاص نہایت دولتمند تھے باقی نہایت تنگ دست اور پریشان حال۔ ایرانی تاریخ میں نوشیرواں کا زمانہ حسنِ انتظام اور عدل گستری کے لیے ضرب المثل ہے۔ "ایران بعہد ساسانیاں" کا مصنف اس عہد کے متعلق لکھتا ہے:

---

[1] ایران بعہد ساسانیاں ص ۱۶۳ [2] ایضاً ص ۱۶۲ [3] ایضاً ص ۶۱۱

[4] ایضاً ص ۶۲۷ تاج جو سونے اور چاندی کا بنا ہوا، اور زمرد، یاقوت اور موتیوں سے مرصع تھا بادشاہ کے سر کے اوپر چھت کے ساتھ ایک سونے کی زنجیر کے ذریعے لٹکا رہتا تھا جو اس قدر باریک تھی کہ جب تک تخت کے بالکل قریب آکر نہ دیکھا جائے نظر نہیں آتی تھی۔ اگر کوئی شخص دور سے دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ تاج بادشاہ کے سر پر رکھا ہوا ہے۔ لیکن حقیقت میں اس قدر بھاری تھا کہ کوئی انسانی سر اس کو نہیں اٹھا سکتا تھا۔ کیونکہ اس کا وزن ۹۱½ کیلو تھا (تقریباً ۲½ من ہوا)

ایران بعہد ساسانیاں ص ۵۳۱

"خسرو (نوشیرواں) کی مالی اصلاحات میں بیشک رعایا کی نسبت خزانے کے مفاد کو زیادہ ملحوظ رکھا گیا تھا، عوام الناس اسی طرح جہالت وعسرت میں زندگی بسر کر رہے تھے جیسا کہ زمانہ سابق میں بازنطینی فلسفی جو شہنشاہ کے یہاں آکر پناہ گزیں ہوگئے تھے ایران سے جلد برداشتہ خاطر ہوگئے۔ یہ سچ ہے کہ وہ اتنے بلند نظر فلسفی نہ تھے کہ ایک غیر قوم کی عادات و رسوم کو غیر جانب داری کی نظر سے دیکھ سکتے اور جن باتوں کو وہ ایک فلسفی بادشاہ کی سلطنت میں دیکھنے کے خواہاں تھے وہ ان کو نظر نہ آئیں، اور چونکہ علم الاقوام کے مطالعہ کا انھیں ذوق نہ تھا اور ان کی ذہنیت ایسی نہ تھی جو اس علم کے جاننے والے کی ہوتی ہے لہٰذا ایرانیوں کی بعض رسموں مثلاً ترویج محرمات کی رسم یا لاشوں کو زخمیوں پر کھلا چھوڑ دینے کی مذہبی رسم نے ان کو برہم کیا، لیکن محض یہ رسمیں نہ تھیں جن کی وجہ سے ان کو ایران میں رہنا ناگوار ہوا بلکہ ذات پات کی تمیز اور سوسائٹی کے مختلف طبقوں کے درمیان ناقابلِ عبور فاصلہ اور خستہ حالی جس میں نچلے طبقہ کے لوگ زندگی بسر کر رہے تھے۔ یہ وہ چیزیں تھیں جن کو دیکھ کر وہ آزردہ خاطر ہوئے۔ طاقتور لوگ کمزوروں کو دباتے تھے اور ان کے ساتھ بہت ظلم اور بے رحمی کا سلوک کرتے تھے۔" [۱]

یہ حال صرف ایران ہی میں نہ تھا اس کی معاصر وحریف بازنطینی سلطنت میں بھی سخت قسم کا طبقاتی نظام اور امتیازی سلوک رائج تھا۔ رابرٹ بریفالٹ (ROBERT BRIFFAULT) لکھتا ہے:

"یہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی اجتماعی ادارہ زوال پذیر ہوتا ہے تو اس کے چلانے والے اس کی حرکت اور ارتقا کو روک دینے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں پاتے، اسی لیے رومی معاشرہ (اپنے انحطاط کے دور میں) سخت درجہ کی ظالمانہ طبقہ واریت کے شکنجہ میں کسا ہوا تھا۔ سوسائٹی میں کسی کی مجال نہ تھی کہ اپنا پیشہ بدل سکے۔ ہر لڑکے کے لیے ضروری تھا کہ اپنے باپ کا پیشہ اختیار کرے۔" [۲]

دونوں سلطنتوں میں بڑے بڑے عہدے، بڑے خاندانوں اور گھرانوں کے لیے مخصوص تھے جو جاہ وحشم رکھتے اور حکام میں ان کا رسوخ تھا۔

ایران کے کسان

نت نئے ٹیکسوں نے عوام کی کمر توڑ دی تھی، بہت سے کسانوں نے کھیتی باڑی چھوڑ دی تھی، ان ٹیکسوں سے بچنے اور اس حکومت کی فوجی خدمت کرنے سے نجات حاصل کرنے کے لیے جس سے انھیں دلی لگاؤ نہ تھا، انھوں نے عبادت گاہوں

---

[۱] ایران بعہد ساسانیاں بحوالہ اگاتھیاس ۳۷-۳۰

[۲] THE MAKING OF HUMANITY. P. 160.

اور خانقاہوں میں پناہ لی تھی، نہ ان کو اس مقصد سے کچھ دلچسپی تھی جس کے لیے بار بار جنگیں کی جاتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیکاری اور جرائم کی گرم بازاری ہوئی اور ناجائز طریقوں سے روپیہ پیدا کرنے کا مرض عام ہو گیا۔[۱] "ایران بعہد ساسانیاں" کا مصنف ایران کے کاشتکار طبقہ کے متعلق جو ملک کی خوراک اور آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ تھا، لکھتا ہے:

"کسانوں کی حالت بہت بدتر تھی وہ اپنی زمین کے ساتھ بندھے رہتے تھے اور ان سے ہر طرح کی بیگار اور خدمت لی جاتی تھی۔ مورخ امیان مارسلینوس لکھتا ہے کہ "ان بچارے کسانوں کے بڑے بڑے گروہ فوج کے پیچھے پیچھے پیادہ کوچ کرتے تھے، گویا کہ ابدی غلامی ان کی تقدیر میں لکھی ہے اور کسی قسم کی تنخواہ یا اُجرت سے ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی تھی۔"[۱] کسانوں کا تعلق زمینداروں کے ساتھ تقریباً ویسا ہی تھا جیسا کہ غلاموں کا تعلق آقا کے ساتھ۔"[۲]

حکّام کا رویّہ

حکومت کے اہل کار و عہدہ دار عام رعایا اور ملک کے باشندوں کے ساتھ ایسی سخت گیری اور بیدردی کا برتاؤ کرتے کہ اہل ملک ان سے عاجز تھے ان حکام اور عہدہ داروں کو نہ عوام کی جان و مال کی پڑا تھی، نہ ان کی عزت و آبرو کا پاس، لوگ شکایتیں کرتے، لیکن جن لوگوں کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور تھی ان کے کانوں پر جوں نہ رینگتی، یہاں تک کہ لوگوں نے سمجھ لیا کہ یہ اندھیر نگری ان کے لیے مقدر ہو چکی ہے اور اس سے نجات کی کوئی صورت نہیں۔ بعض اوقات وہ ایسی زندگی پر موت کو ترجیح دیتے۔

مصنوعی معاشرت اور پُرعشرت زندگی

روم و ایران دونوں جگہ عام طور سے لوگوں پر عیش پرستی کا بھوت سوار تھا۔ مصنوعی تہذیب اور پُرفریب زندگی کا سیلاب اُمنڈ آیا تھا جس میں وہ سر سے پاؤں تک غرق تھے۔ سلاطینِ روم اور شاہانِ ایران اور ان کے امرا و رؤسا خوابِ غفلت میں پڑے تھے، لذت اندوزی کے سوا انھیں کسی بات کی فکر نہ تھی۔ عیاشی کی وہ انتہا تھی کہ قیاس کام نہیں کرتا، تکلفاتِ زندگی، تعیشات اور سامانِ آرائش کی وہ بہتات تھی اور اس میں ان باریکیوں اور نکتہ سنجیوں سے کام لیا جاتا تھا کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔[۳] پارسی مورخ شاہین مکاریوس کے بیان کے مطابق "کسرٰی پرویز کے پاس بارہ ہزار عورتیں تھیں، پچاس ہزار اصیل گھوڑے، اس قدر سامانِ تعیش، محلات، نقد و جواہرات تھے کہ ان کا اندازہ مشکل ہے اس کا

۱؎ ایران بعہد ساسانیاں ص ۴۲۴ ۲؎ ایضاً

۳؎ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "ایران بعہد ساسانیاں" کا باب نہم "آخری شاندار عہد"۔

محل اپنی شان وشکوہ اور عظمت میں جواب نہیں رکھتا تھا[۱]۔ مکاریوس لکھتا ہے کہ تاریخ میں مثال نہیں ملتی کہ کسی بادشاہ نے ان شاہانِ ایران کی طرح دادِ عیش دی ہو جن کے پاس تحائف اور خراج کی رقمیں ان تمام شہروں سے آتی تھیں جو شرق اوسط اور مشرق اقصیٰ کے درمیان واقع تھے[۲]۔ اسلامی فتوحات کے بعد جب ایرانی عراق سے بے دخل ہوئے تو انھوں نے وہ اندوختہ چھوڑا جس کی قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ ان چھوڑے ہوئے سامانوں میں بیش قیمت جوڑے، طلائی ظروف، سنگار کا سامان، عطریات وغیرہ تھے۔" طبری کی روایت ہے کہ عربوں کو مدائن کی فتح میں ترکی خیمے ملے جو سربمہر ٹوکروں سے بھرے ہوئے تھے۔ عرب کہتے ہیں کہ ہم سمجھے کہ اس میں کچھ کھانے کا سامان ہوگا، کھولنے سے معلوم ہوا کہ سونے چاندی کے برتن ہیں[۳]۔ مورخین نے فرشِ بہار کی (جس پہ بیٹھ کر امراءِ ایران موسمِ خزاں میں شراب پیتے تھے) تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "یہ ساٹھ گز مربع تھا، تقریباً ایک ایکڑ زمین کو گھیر لیتا۔ اس کی زمین سونے کی تھی جس میں جابجا جواہرات اور موتیوں کی گلکاری تھی، چمن تھے جن میں پھولدار اور پھل دار درخت قائم تھے۔ درختوں کی لکڑی سونے کی، پتے حریر کے، کلیاں سونے چاندی کی اور پھل جواہرات کے بنائے گئے تھے، گرد ہیرے کی جدول تھی، درمیان میں روشیں اور نہریں بنائی گئی تھیں اور یہ سب جواہرات کی تھیں۔ موسمِ خزاں میں تاجدارانِ ساسان اس گلشنِ بے خزاں میں بیٹھ کر شراب پیا کرتے اور دولت کا ایک حیرت انگیز کرشمہ نظر آتا جو زمانہ نے کبھی اور کہیں نہ دیکھا تھا۔"[۴]

رومی حکومت کے عہد میں شام اور اس کے مرکزی شہروں کا بھی یہی حال تھا۔ یہ دونوں حکومتیں عیش پسندی اور تمدن کی باریکیوں میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھیں۔ شہنشاہانِ روم ان کے شامی رؤسا و حکام نے کھل کر دادِ عیش دی۔ ان کے عالی شان محل اور دیوان خانے اور نا ؤنوش کی مجلسیں عیش کے ساز و سامان اور دولت و فراغت کے اسباب سے لبریز تھیں۔ تاریخ و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ عیش پسندی اور نفاست میں بہت آگے نکل چکے تھے۔ حضرت حسان بن ثابتؓ (جنھوں نے اسلام سے پہلے غسانی امراءِ شام کی مجلسوں میں شرکت کی تھی) جبلہ بن الایہم غسانی کی مجلس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

> "میں نے دس باندیاں دیکھیں جن میں پانچ رومی تھیں جو بربط پر گا رہی تھیں اور پانچ وہ تھیں جو اہل حیرہ کے دھن میں گا رہی تھیں جنھیں عرب سردار ایاس بن قبیصہ نے تحفۃً بھیجا تھا، اس کے علاوہ عرب کے علاقہ مکہ وغیرہ سے بھی گویّوں کی ٹولیاں جاتی تھیں، جبلہ جب شراب نوشی کے لیے بیٹھتا تو اس کے نیچے فرش پر

---

[۱] تاریخ ایران (شاہین مکاریوس) طبع مصر ۱۸۹۰ء ص ۹۰ [۲] ایضاً ص ۲۱۱ [۳] تاریخ طبری
[۴] تاریخ اسلام از مولوی عبدالحلیم شرر، ج ۱، ص ۳۵۴ ماخوذ از تاریخ طبری وغیرہ

قسم قسم کے پھول چمبیلی، جوہی وغیرہ بچھا دیے جاتے اور سونے چاندی کے ظروف میں مشک و عنبر لگائے جاتے، چاندی کی طشتریوں میں مشک خالص لایا جاتا، اگر جاڑوں کا زمانہ ہوتا تو عود جلایا جاتا، اگر گرمیوں کا موسم ہوتا تو برف بچھائی جاتی، اور اس کے ہمنشینوں کے لیے گرمیوں کا لباس آتا جس کو وہ اپنے اوپر ڈال لیتا، جاڑوں میں سمور، قیمتی کھالیں اور دوسرے گرم لباس حاضر کیے جاتے۔"[۱]

والیانِ ریاست، شاہزادے، امرا، اونچے گھرانوں کے افراد نیز متوسط طبقہ کے لوگ بادشاہوں کے نقشِ قدم پر چلنے اور کھانے پینے، پوشاک اور طرزِ رہائش میں ان کی نقل کرنے کی کوشش کرتے اور ان کے عادات و اطوار اختیار کرتے معیارِ زندگی بہت ہی زیادہ بلند ہوگیا تھا اور معاشرت بہت زیادہ پیچیدہ بن گئی تھی۔ ایک ایک شخص اپنی ذات پر اور اپنے لباس کے کسی ایک حصہ پر اس قدر خرچ کرتا تھا جس سے پوری ایک بستی کی پرورش ہوسکے یا جو پورے ایک گاؤں یا آبادی کی پوشاک اور ستر پوشی کے مصارف کے لیے کافی ہو، ایسا کرنا ہر ایک ممتاز اور شریف آدمی کے لیے ناگزیر تھا کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو سوسائٹی میں انگشت نمائی ہوتی اور وہ اپنے ہم چشموں میں ذلیل ہوتا، یہاں تک کہ یہ بھی زندگی کی ایک ضرورت اور سوسائٹی کا ایک قانون بن گیا جس میں تبدیلی نہیں ہوسکتی تھی۔

شعبی کہتے ہیں کہ اہلِ ایران اپنے سروں پر جو کلاہ رکھتے تھے وہ ان کی اس حیثیت کے مطابق ہوتی تھی جو انھیں اپنے قبیلہ میں حاصل تھی۔ چنانچہ جو اپنے قبیلہ میں شرافت و عزت کے لحاظ سے معیاری ہوتا تھا اس کی کلاہ ایک لاکھ کی قیمت کی ہوتی تھی۔ ہرمز کا شمار انھیں افراد میں تھا جن کی سیادت تسلیم شدہ تھی لہٰذا اس کی کلاہ ایک لاکھ کی تھی جس میں جواہرات جڑے ہوئے تھے[۲]۔ شرافت و وجاہت کا معیار یہ تھا کہ وہ ایران کے سات اونچے گھرانوں میں سے کسی ایک خاندان کا فرد ہو۔ ازاذبہ (زادویہ) شہر حیرہ کا کسریٰ کے عہد میں حاکم تھا۔ وہ سیادت میں دوسرے نمبر کا سمجھا جاتا تھا اس لیے اس کی ٹوپی کی قیمت پچاس ہزار تھی[۳]۔ رستم کی کلاہ ستر ہزار میں فروخت ہوئی اور اس کی قیمت ایک لاکھ تھی[۴]۔

لوگ اس انتہا پسندانہ معاشرت اور اس کے تباہ کن لوازم و ضروریات کے اس طرح عادی ہوگئے تھے اور یہ تمدن ان کے رگ و پے میں اس طرح سرایت کر گیا تھا کہ یہ تکلفات ان کی طبیعتِ ثانیہ بن گئے تھے اور ان سے علٰحدہ ہونا ان کے لیے ناممکن سا ہوگیا تھا۔ نازک سے نازک وقت میں اور مجبوری کی حالت میں بھی سادہ زندگی اور نیچی سطح پر اتر آنا ان کے لیے دشوار تھا۔

مدائن کی فتح کے وقت شہنشاہِ ایران یزدگرد جس بے سروسامانی اور پریشانی میں دارالسلطنت چھوڑ کر بھاگا ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں، مگر اس عجلت و پریشانی میں وہ اپنے ساتھ جو سامان لے گیا ہے اس سے اس ذہنیت اور معیارِ تمدن کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ "ایران بعہد ساسانیاں" کا مصنف لکھتا ہے:

"یزدگرد اپنے ہمراہ ایک ہزار باورچی، ایک ہزار گویّے، ایک ہزار چیتوں کے محافظ، ایک ہزار بازدار،

---

[۱] تاریخ طبری ج ۴ ص ۱۷۰ [۲] ایضاً ص ۶ [۳] ایضاً ص ۱۱ [۴] ایضاً ص ۱۳۴

اور بہت سے دُوسرے لوگ لیتا گیا۔ اور یہ تعداد اس کے نزدیک ابھی کم تھی۔"[1]

ہرمزان شکست کھانے کے بعد جب پہلی بار مدینہ آیا اور حضرت عمرؓ کی مجلس میں حاضر ہوا تو اس نے پانی مانگا۔ پانی ایک موٹے سے پیالہ میں لایا گیا۔ اس نے کہا کہ چاہے مَیں پیاسا مر جاؤں مگر اس بھدّے پیالے میں پانی پینا میرے لیے ممکن نہیں۔ چنانچہ اس کے لیے تلاش کرکے دُوسرے برتن میں پانی لایا گیا جس کو وُہ پی سکا۔[2]

ان دو واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ایرانیوں کی عادتیں کس قدر بگڑ گئی تھیں اور وہ مصنوعی زندگی اور تکلفات کے کس قدر عادی اور سادہ اور فطری زندگی سے کس قدر دور ہو چکے تھے۔

حکُومت کی دولت ستانی

اس عیش پسند اور مسرفانہ زندگی کا لازمی نتیجہ تھا کہ ٹیکسوں میں اس قدر اضافے ہو جائیں جو رعایا کے لیے ناقابلِ برداشت ثابت ہوں، نئے نئے قوانین بنائے جائیں۔ جن کی رو سے کسانوں، تاجروں، کاریگروں اور اہلِ حرفہ سے زیادہ سے زیادہ مال گھسیٹا جا سکے۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ آئے دن کے ان اضافوں اور بھاری بھاری ٹیکسوں نے رعایا کی کمر توڑ دی اور حکومت کے مطالبات سے ان کی پیٹھ بوجھل گئی۔ "ایران بعہد ساسانیاں" کا مولف لکھتا ہے:

"باقاعدہ ٹیکسوں کے علاوہ رعایا سے نذرانے لینے کا بھی دستور تھا جس کو آئین کہتے تھے۔ اسی آئین کے مطابق عید نوروز اور مہرگان کے موقعوں پر لوگوں سے جبراً تحائف وصول کیے جاتے تھے۔ خزانہ شاہی کے ذرائع آمدنی میں سے ہمارا خیال ہے کہ سب سے اہم ذریعہ جاگیر ہائے خالصہ کی آمدنی اور وہ ذرائع تھے جو بادشاہ کے لیے حقوق خسروی کے طور پر مخصوص تھے، مثلاً فارنگیوں (علاقہ آرمینیہ) کی سونے کی کانوں کی ساری آمدنی بادشاہ کی ذاتی آمدنی تھی۔"[3]

مورخ شام رومی حکومت کے طرزِ عمل اور اس کی مدوں اور آمدنیوں کے متعلق لکھتا ہے:

"شامی رعایا پر لازم تھا کہ وہ حکومت کا ٹیکس ادا کرے اور اپنی تمام پیداوار اور آمدنی کا دسواں حصہ اور راس المال کا ٹیکس داخل کرے، فی کس ایک رقم مقرر تھی جس کا ادا کرنا لازمی تھا۔ اس کے علاوہ رومی قوم کے کچھ دُوسرے اہم ذرائع آمدنی تھے۔ مثلاً چنگی، کانیں، محاصل، اس کے علاوہ جو قطعات گندم کی کاشت کے قابل ہوتے، اور چراگاہیں ٹھیکہ پر اٹھا دی جاتیں ان ٹھیکہ داروں کو "عشارین" کہتے تھے۔ یہ لوگ حکومت سے تحصیل وصول کے اختیارات خرید لیتے اور رعایا سے مطالبات وصول کرتے۔ ہر صوبہ میں ان ٹھیکیداروں کی متعدد کمپنیاں قائم تھیں، ہر کمپنی کے پاس کچھ منشی اور محصل

---

[1] ایران بعہد ساسانیاں ص ۱۰۸ [2] تاریخ طبری ج ۴ ص ۱۶۱ [3] ایران بعہد ساسانیاں ص ۱۶۱

ملازم تھے جو اپنے افسروں اور مالکوں کے انداز میں پیش کرتے اور جس قدر ان کو لینے کا حق تھا اس سے زیادہ وصول کرتے، وہ لوگوں کو فراغت و راحت کے وسائل سے محروم کرتے اور اکثر ان کو غلاموں کی طرح فروخت بھی کر دیتے۔"[1]

رومیوں کے سیاسی طرز کا اور ان کی پالیسی کا کسی نے خلاصہ یہ بیان کیا ہے:

"اچھا گلہ بان وُہ ہے جو اپنی بھیڑوں کا اُون کاٹ لیتا ہے نوچتا نہیں۔" واقعہ یہ ہے کہ دُو صدیاں گزر گئیں اور شہنشاہانِ روم اپنی مملکت کے باشندوں کا اُون کاٹتے رہے (نوچنے کی کوشش نہیں کی) وہ ان سے بہت بڑی دولت وصول کرتے رہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ بیرونی دشمن سے ان کی حفاظت کرتے رہے۔"[2]

عوام کی خستہ حالی

روم و ایران دونوں مملکتوں میں اہلِ ملک دو علیحدہ طبقوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ان دونوں طبقوں کے درمیان واضح اور بیّن فرق تھا، ایک طبقہ بادشاہوں، شاہزادوں، اہلِ دربار، اُن کے خاندانوں، عزیزوں اور ان کے متعلقین و وابستگان اور جاگیرداروں اور دولت مندوں کا تھا۔ یہ لوگ سدا بہار پھولوں کی سیج پر زندگی گزارتے، ان کے گھر کے لوگ اور بچے سونے چاندی سے کھیلتے اور دُودھ اور گلاب میں نہاتے یہ اپنے گھوڑوں کی نعلیں بھی جواہرات سے جڑتے اور در و دیوار کو بھی ریشم و کمخواب سے سجاتے تھے۔

دوسرا طبقہ کاشتکاروں، کاریگروں، اہلِ حرفہ اور چھوٹے تاجروں کا تھا، جن کی زندگی سراپا کلفت و مصیبت تھی۔ یہ زندگی کے بوجھ ٹیکسوں اور نذرانوں کے بار سے کچلے جا رہے تھے ان کا جوڑ جوڑ اور بند بند مطالبات کے اندر جکڑا ہوا تھا۔ وہ اس جال کو توڑنے کی جس قدر کوشش کرتے اور جس قدر ہاتھ پاؤں مارتے وہ جال اور کس جاتا۔ اس کٹھن اور پُر مصیبت زندگی پر دوسری مصیبت یہ تھی کہ وُہ اونچے طبقہ کی بہت سی باتوں میں نقل اتارنے کی کوشش بھی کرتے جس سے اور زیادہ پریشان ہوتے، ضروریاتِ زندگی کی فراہمی میں ان کو وہ وقت اور پریشانی لاحق نہ ہوتی جو اس نقالی اور اونچے طبقہ کی ریس کرنے میں ان کو پیش آتی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کی زندگی تلخ اور سراپا کوفت تھی، ان کا دماغ ہر وقت پریشان و پراگندہ رہتا اور ان کو حقیقی سکون اور اطمینانِ قلب کبھی میسر نہ آتا۔

سرکش دولتمند اور خود فراموش مفلس

سرمایہ داری کی سرکشی و خدا فراموشی اور افلاس کی بے بسی اور خود فراموشی کے دو انتہائی سروں کے درمیان

---

[1] خطط الشام (محمد کرد علی) ج ۵ ص ۴۷ [2] ایضاً

انبیا علیہم السّلام کی دعوت وتعلیم کسمپرسی کی حالت میں پڑی ہوئی تھی، اخلاقِ عالیہ اور زندگی کے بلند اصول پوری متمدن دنیا میں متروک و ناقابلِ عمل سمجھ لیے گئے تھے۔ دولت مندوں کو اپنے تفریحی مشاغل اور تعیشات سے اس کی فرصت نہ تھی کہ وہ دین یا آخرت کے بارہ میں کچھ سوچیں۔ کاشت کاروں اور محنت کش کو اس کے افکار و آلام اور زندگی کے بڑھتے ہوئے مطالبات اس کی مہلت نہیں دیتے تھے کہ وہ روز کی خوراک اور ضروریات کے علاوہ کسی اور طرف توجہ کرے۔ غرض یہ زندگی اور زندگی کے مطالبات نے امیر و غریب سب کو اُلجھا رکھا تھا اور اسی میں ہر ایک سرگرداں تھا۔ زندگی کی چکی اپنی پوری قوت کے ساتھ گردش کر رہی تھی جس کی وجہ سے انھیں مطلق مہلت نہ تھی کہ وہ دین کی طرف توجہ کریں اور روح و قلب کے بارہ میں اور انسانیت کی بلند قدروں کے متعلق غور کر سکیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۱۷۶ھ) نے اپنی جلیل القدر تصنیف (حجۃ اللہ البالغہ) میں ماقبل اسلام کی اس صورتِ حال کی پوری تصویر کھینچی ہے، وہ فرماتے ہیں:

"صدیوں سے آزادانہ حکومت کرتے کرتے اور دُنیا کی لذتوں میں منہمک رہنے، آخرت کو یکسر بھول جانے اور شیطان کے پُورے اثر میں آجانے کی وجہ سے ایرانیوں اور رومیوں نے زندگی کی آسانیوں اور سامانِ آرائش میں بڑی مُوشگافی اور نازک خیالی پیدا کر لی تھی، اور اس میں ہر قسم کی ترقی اور نفاست میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے اور فخر کرنے کی کوشش کرتے تھے، دنیا کے مختلف گوشوں سے ان مرکزوں میں بڑے بڑے اہلِ ہُنر اور اہلِ کمال جمع ہو گئے تھے جو اس سامانِ آرائش و راحت میں نزاکتیں پیدا کرتے تھے اور نئی نئی تراش خراش نکالتے تھے، ان پر عمل فوراً شروع ہو جاتا تھا اور اس میں برابر اضافے اور جدتیں ہوتی رہتی تھیں، اور ان باتوں پر فخر کیا جاتا تھا، زندگی کا معیار اتنا بلند ہو گیا تھا کہ امرا میں سے کسی کا ایک لاکھ درہم سے کم کا پٹکا باندھنا اور تاج پہننا سخت معیوب تھا، اگر کسی کے پاس عالی شان محل، فوارہ، حمام، باغات، خوش خوراک اور تیار جانور، خوش رو جوان اور غلام نہ ہوتے۔ کھانے میں تکلفات اور لباس و پوشاک میں تجمّل نہ ہوتا تو ہم چشموں میں اس کی کوئی عزت نہ ہوتی، اس کی تفصیل بہت طویل ہے، اپنے ملک کے بادشاہوں کا جو حال دیکھتے اور جانتے ہو اس سے قیاس کر سکتے ہو۔[1] یہ تمام تکلفات اُن کی زندگی اور معاشرت کا جزو بن گئے تھے، اور ان کے دلوں میں اس طرح رچ گئے تھے کہ کسی طرح نکل نہیں سکتے تھے، اس کی وجہ سے ایک ایسا لاعلاج مرض پیدا ہو گیا تھا جو ان کی پوری شہری زندگی اور ان کے پورے نظامِ تمدن میں سرایت کر گیا تھا۔ یہ ایک مصیبتِ عظمیٰ تھی جس سے عام و خاص اور امیر و غریب میں سے کوئی محفوظ نہیں رہا تھا۔ ہر شہری پر بے پُر تکلف اور امیرانہ زندگی ایسی مسلط

---

[1] شاہانِ دہلی اور مغل بادشاہوں کی طرف اشارہ ہے۔

ہوگئی تھی جس نے اس کو زندگی سے عاجز کر دیا تھا اور اس کے سر پر غم و افکار کا ایک پہاڑ ہر وقت رکھا رہتا تھا۔ بات یہ تھی کہ تکلفات بیش قرار رقمیں صرف کیے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے تھے اور یہ رقمیں اور بے پایاں دولت کاشت کاروں، تاجروں اور دُوسرے پیشہ وروں پر محصول اور ٹیکس بڑھانے اور ان پر تنگی کیے بغیر دستیاب نہیں ہوسکتی تھیں اگر وہ ان مطالبات کے ادا کرنے سے انکار کرتے تو اُن سے جنگ کی جاتی اور ان کو سزائیں دی جاتیں، اور اگر وہ تعمیل کرتے تو ان کو گدھے اور بیلوں کی طرح بنا لیتے جن سے آب پاشی اور کاشتکاری میں کام لیا جاتا اور صرف خدمت کرنے کے لیے ان کو پالا جاتا ہے اور محنت و مشقت اور حیوانی زندگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو کسی وقت سر اٹھانے اور سعادتِ اُخروی کا خیال بھی کرنے کا موقع اور مہلت نہیں ملتی تھی، بسا اوقات پُورے ملک میں ایک فردِ بشر بھی ایسا نہ ملتا جس کو اپنے دین کی فکر اور اہمیت ہوتی۔"[1]

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ باب اقامۃ الارتفاقات و اصلاح الرسوم۔

ابتدائے اسلام میں اخلاقی فکر کا ارتقاء

ڈاکٹر محمد عبد الحق انصاری

ابتدائے اسلام میں اخلاق بحیثیت ایک علم کے وجود میں نہیں آیا تھا مگر بعض اخلاقی مسائل پر مختلف حلقوں میں غور و فکر کا آغاز ہو چکا تھا۔ اخلاقی آئیڈیل کی تشکیل کا عمل بھی شروع ہو چکا تھا۔ تیسری صدی کے اواخر اور چوتھی صدی کی ابتدا میں اخلاقی نظریات بہت حد تک واضح اور مرتب ہو چکے تھے مگر اخلاقیات کو ابھی سیاسیات ہی کا جز سمجھا جا رہا تھا۔ بحیثیت ایک مستقل علم کے اخلاقیات کا آغاز اسلام میں سب سے پہلے مسکویہ (م ۴۲۱ھ) سے ہوتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے اخلاقی نظریات اور آئیڈیل کے نشوو ارتقاء پر دوسرے افکار و رجحانات، مذاہب اور قوموں نے بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ لیکن اخلاقی زندگی کی تعمیر اور اخلاقی قدروں کی تشکیل میں جو مقام قرآن و سنت کا ہے، وہ کسی دوسرے عامل کا نہیں ہے۔ اخلاقی فکر میں نئے مسائل کی آمد، پرانے تصورات کی نئی تشکیل اور اخلاقی آئیڈیل کی نئی تعبیر اس وقت تک بخوبی سمجھی نہیں جا سکتی، جب تک کہ قرآن و سنت کی اخلاقی تعلیمات پیش نظر نہ ہوں۔ بالخصوص جب تک کہ خدا، آخرت اور رسالت کے بارے میں اسلامی عقاید سامنے نہ ہوں، جو اخلاقی زندگی کی تعمیر اور اخلاقی قدروں کی اضافی قدر و قیمت کے تعین میں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔

قرآن و سنت کے اخلاق کا بیان مختلف کتابوں میں ملتا ہے۔ اس مقصد کے لیے اکثر قرآن مجید کی ایسی آیات اور ایسی حدیثیں جمع کر دی جاتی ہیں، جن میں کوئی اخلاقی حکم ہوتا ہے۔ اس کی کوشش نہیں ہوتی کہ مختلف اخلاقی مسائل پر قرآن و سنت کا نقطۂ نظر معلوم کیا جائے اور یہ تو بہت کم ہوتا ہے کہ اسلامی عقاید۔ اخلاقی فکر اور اخلاقی زندگی کو جس طرح متاثر کرتے ہیں ان کی وضاحت کی جائے۔ عام طور پر قرآن و سنت کے اخلاق کے ذیل میں جو چیزیں پیش کی جاتی ہیں ان سے صدر اسلام کی اخلاقی زندگی کا ایک نقشا سامنے ضرور آ جاتا ہے۔ مگر یہ نقشا بھی نامکمل اور غیر متوازن ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں اخلاقی زندگی کا ہر پہلو اپنی اضافی اہمیت کے ساتھ اُبھر نہیں آتا۔ بسا اوقات ان پہلوؤں کو اجاگر کر کے پیش کیا جاتا ہے، جو جاہلیت یا مغرب کی اخلاقی زندگی سے نمایاں طور پر مختلف ہوتے ہیں۔

علم کلام کا اوّلین مقصد اسلامی عقاید کی توجیہہ و تفہیم تھی۔ لیکن عقاید کے ضمن میں بعض اخلاقی مسائل پر بھی اچھی بحثیں کلام کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ اسلامی اخلاق کے مطالعہ میں عموماً اخلاقی فکر کا یہ پہلو نظر سے اوجھل رہا ہے۔ اس کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی گئی ہے۔ اس گوشے کا مطالعہ مسلمانوں کے اخلاقی فکر پر قرآن و سنت کے اثرات دریافت کرنے کے سلسلے میں بے حد اہم ہے۔ اس پہلو سے غفلت کی وجہ سے عموماً یہ سوچا جانے لگا ہے کہ اسلامی آئیڈیل اور قدروں کے مطالعہ کے لیے طالب علم کو یا تو فلسفہ کی طرف توجہ کرنی چاہیے یا تصوّف کی طرف۔

ذیل کے صفحات میں اسلام کے ابتدائی ساڑھے تین سو سال سے اخلاقی فکر کا ایک مربوط مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ وہ

دور ہے، جب تک علم اخلاقیات بحیثیت ایک مستقل علم کے وجود میں نہیں آیا تھا۔ صفحات ذیل میں اتنی گنجایش نہیں ہے کہ تفصیل سے باتیں کی جائیں۔ ہم صرف اختصار کے ساتھ بعض اہم تصورات اور رجحانات کی وضاحت پر اکتفا کریں گے۔

قرآن وسنت میں اخلاق

قرآن وسنت کی نظر میں زندگی دو مرحلوں میں منقسم ہے مگر دونوں مرحلے ایک دُوسرے کے ساتھ بے حد مربُوط ہیں۔ ایک موت سے پہلے کا مرحلہ، دوسرا موت کے بعد کا۔ بلا شبہ موت ایک عظیم تغیر ہے لیکن زندگی موت پر ختم نہیں ہوتی۔ دوسری زندگی ایک نئی زندگی ہوتی ہے، لیکن پہلی زندگی کے منافی ہوتی ہے اور نہ اس سے یکسر مختلف۔ دراصل زندگی ایک وحدت اور ایک تسلسل ہے، اس وحدت و تسلسل کا تقاضا ہے کہ زندگی کا خیر اعظم نہ صرف اس دنیا سے متعلق ہو اور نہ محض اُس دنیا سے، بلکہ دونوں کی بھلائی پر حاوی ہو۔ قرآن مجید نے اہلِ ایمان کو جو تعلیم دی ہے، وُہ یہ ہے:

ربنا اتنا فی الدنیا حسنة وفی الأخرة حسنة وقنا عذاب النار۔	اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرمائیے اور آخرت میں بھی۔ اور ہم کو آگ کے عذاب سے محفوظ رکھیے۔
(۲ : ۲)	

اس تعلیم کا تقاضا یہ ہے کہ دنیا کی بھلائی کو آخرت کی بھلائی کا محض ذریعہ قرار نہ دیا جائے بلکہ اس کو بذاتِ خود مقصود سمجھا جائے۔ اسلام نے خیر کا جو تصور پیش کیا ہے، دنیا کی فلاح اس کا جزو لاینفک ہے۔ قرآن وسنت میں زندگی کے مختلف پہلوؤں (سماجی، معاشی اور سیاسی) کی تعمیر و اصلاح کا جو اہتمام ملتا ہے، وہ اس حقیقت پر شاہد ہے۔ اسلامی آئیڈیل کسی ایسے فرد کا آئیڈیل نہیں ہے، جو سماج سے الگ رہتا ہو بلکہ ایسے فرد کا ہے جو سماج کا فعال اور سرگرم کارکن ہے۔ انسان کی ذاتی زندگی اور سماجی زندگی دونوں کو قرآن وسنت میں ایک کل سمجھا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن وسنت کا تصورِ فلاح انفرادی ہی نہیں بلکہ سماجی بھی ہے۔ حیاتِ دنیا میں سماج کی جو اہمیت ہے، وُہ تو ہے ہی۔ آخرت کی زندگی کا نقشا بھی جو قرآن وسنّت میں ملتا ہے، وُہ بالکل انفرادی نہیں ہے بلکہ ایک طرح کی سماجی زندگی ہے[1]۔ اسلام میں جو اہمیت سماجی تعلقات، جماعتی فرائض اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور جہاد کو حاصل ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اسلام کا خیر کا تصور اجتماعی ہے۔ سماج سے گریز یا اجتماعی فلاح سے بے تعلقی ایک جُرم قرار دیا گیا ہے۔ اس کی اجازت صرف ان انتہائی حالات میں دی گئی ہے جن میں دینی فرائض و ارکان کی ادائیگی ناممکن ہو جاتی ہے، مگر ایسے حالات میں بھی ظلم و فساد کے خلاف جہاد کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمیشہ عزیمت ہی قرار دیا ہے[2]۔

---

[1] قرآن مجید واضح طور پر بتاتا ہے کہ ایک خاندان کے افراد آباء، ابناء اور ازواج جنت میں ایک ساتھ رکھے جائیں گے بشرطیکہ وہ صالح ہوں (۱۳ : ۲۳؛ ۴۰ : ۸؛ ۵۲ : ۲۱)۔ قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ رفقاء اور اصحاب اجتماعی طور پر رہیں گے، ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف کوئی بغض نہ ہوگا۔ ایک دوسرے کو تحیات پیش کریں گے (۱۵ : ۴۵ - ۴۸) ان کا معاشرہ برائیوں سے پاک اور باہمی الفت اور محبت سے سرشار ہوگا (۷۸ : ۳۵؛ ۵۶ : ۲۵ - ۲۶؛ ۱۰ : ۱۰) چونکہ جنت کی زندگی مثالی زندگی ہوگی۔ لازم ہے کہ اس میں انسان کے سماجی جذبات کی تسکین کا موقع ہو۔ [2] اس مفہوم کی حدیثیں بہت ہیں۔ یہاں صرف ایک حدیث نقل کی جاتی ہے۔ رسول اللہ سے سوال کیا گیا (باقی بر صفحہ آیندہ)

اگرچہ دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی فی نفسہٖ مقصود ہے، لیکن دنیا کی بھلائی کو آخرت کی بھلائی کے مقابلہ میں ترجیح حاصل ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ فلاحِ دنیا فی نفسہٖ مقصود نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ دنیا کی زندگی آخرت کی ابدی زندگی کے مقابلہ میں چند روزہ ہے۔ مزید یہ کہ دنیا کی زندگی دو اعتبار سے محدود ہے: ایک یہ کہ اس میں دین کے بہت سے حقایق کا مشاہدہ نہیں ہو سکتا۔ دوسرے یہ کہ اس میں اعمال کے پورے نتائج برآمد نہیں ہوتے ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ اس دوگونہ حقیقت کے نتیجہ میں دنیا کی زندگی ایک آزمایش ہے چونکہ انسان کی آزمایش اس میں ہے کہ وہ زمین پر خدا کی خلافت کے فرائض انجام دے۔ اس لیے دنیا کی بھلائی آخرت کی بھلائی کے لیے شرط لازم بن جاتی ہے۔ دنیا کی بھلائی سے بے اعتنائی آخرت کی فلاح کے امکانات ختم کر سکتی ہے۔

قرآن و سنت کے خیر میں جسم و روح دونوں کی رعایت ہے۔ بعد کے فکر نے جسم و روح اور مادی و روحانی خیر میں جو تضاد نمایاں کیا ہے، اس کی تائید قرآن مجید سے نہیں ہوتی۔ حسّی لذات اور روحانی مسرتیں دونوں ہی خیر کا جز ہیں۔ جسمانی لذتوں میں فی الحقیقت کوئی برائی نہیں ہے۔ دنیا فی نفسہٖ نہ بھلی ہے اور نہ بُری۔ اس کی برائی اور بھلائی اس طریقۂ زندگی پر منحصر ہے جسے انسان اختیار کرتا ہے۔ مسیحیت کا یہ تصور کہ زمین پر انسان کا ورود سقوط کے ہم معنی ہے اور گناہ اوّل کی سزا ہے۔ اسلامی عقیدے کے منافی ہے۔ قرآن مجید حیاتِ دنیا کی تعمیر و اصلاح کو سعادت کا لازمی جز قرار دیتا ہے۔ اسلام میں نہ ترکِ دنیا کی کوئی گنجایش ہے اور نہ ہی دنیا کی لذتوں سے بالکلیہ دست کش ہونا جائز۔ قرآن مجید نے رہبانیت کو بدعت قرار دیا ہے[1] اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اسلام سے خارج قرار دیا ہے: "لا رهبانية في الاسلام"[2]

قرآن و سنت نے جو آئیڈیل پیش کیا ہے، اس میں انسانی شخصیت کے کسی جز کی نفی نہیں کی گئی ہے۔ عقل و وجدان، ذوق و تخیل، جذبہ و احساس، سب کو اس کے صحیح مقام پر رکھا گیا ہے۔ اگرچہ افراد کی زندگیوں میں ان عناصر کی اضافی اہمیت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے، لیکن انفرادی حالات و صلاحیتوں کی رعایت کے باوجود اسلام نے یہ کبھی نہیں پسند کیا کہ ایک جز کو دوسرے جز پر قربان کر دیا جائے یا زندگی کے ایک پہلو کو اس قدر ابھارا جائے کہ دوسرا پہلو کچل کے رہ جائے۔ خدا کے رسول نے اس امر کی طرف خصوصی توجہ فرمائی ہے کہ آپ کے اصحاب زندگی کے کسی پہلو کو ایک خاص حد سے زیادہ نہ دبائیں[3]۔ اسلامی آئیڈیل میں جذبہ اور عمل، فکر اور احساس، رُوح اور جسم کا ایک حسین امتزاج ہے۔ مثال کے طور پر محبت کو لیجیے۔ اسلامی آئیڈیل میں حبِ الٰہی کو جو بلند مقام حاصل ہے، وُہ ظاہر ہے مگر جس محبت کی تعریف قرآن و سنت میں آئی ہے، وہ نرا جذبہ ہی نہیں ہے بلکہ وُہ قوت ہے، جو ان گوناگوں اعمال کی محرک ہوتی ہے، جو اسلام کو پسند اور مطلوب ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) کون لوگ سب سے بہتر ہیں؟ فرمایا: وہ جو خدا کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں۔ پھر سوال کیا گیا: ان کے بعد کون لوگ بہتر ہیں؟ فرمایا: وہ لوگ جو تنہا پہاڑوں پر رہتے ہیں اور اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں دوسری روایت میں ہے کہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ امام نووی: ریاض الصالحین، باب استحباب العزلة عند فساد الناس والازمان، بحوالہ بخاری و مسلم۔

[1] قرآن مجید (۵۷ : ۲۷)

[2] مسند دارمی: باب النکاح

[3] امام نووی نے اعتدال و توسط کے ذیل میں بہت سی حدیثیں پیش کی ہیں۔ ریاض الصالحین: باب الاقتصاد فی الطاعة۔

قرآن وسنت نے ہمہ جہتی شخصیت کا جو آئیڈیل پیش کیا ہے، اس میں اور مخصوص انفرادی صلاحیتوں اور رجحانات کی تکمیل میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اسلام میں شخصیت کا ایسا بے لچک تصور نہیں ہے، جس کی ہو بہو نقل ہر شخص سے مطلوب ہو۔ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ، ابوہریرہؓ وابوذرؓ، خالدؓ اور علیؓ، عثمانؓ بن عفان اور عبدالرحمٰنؓ بن عوف، ابن مسعودؓ اور ابن عباسؓ، عائشہؓ اور حفصہؓ کی شخصیتوں میں اگرچہ بنیادی یکسانیت ہے لیکن اس کے باوجود ہر ایک کی قوتیں اور صلاحیتیں، مشاغل و رجحانات، اطوار و عادات مختلف ہیں بلکہ بسا اوقات ایک دوسرے سے متضاد ہیں[1]۔ خدا کے رسول کو انفرادی قویٰ اور رجحانات کی اہمیت کا بخوبی احساس تھا۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر آپ نے یہ فرمایا: اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم[2] (میرے اصحاب ستاروں کی طرح ہیں۔ ان میں سے جس کسی کی روش تم اختیار کروگے، راہِ راست پر رہو گے) افراد کو فرداً فرداً اس ارشاد کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ لیکن اگر کوئی سماج بحیثیت مجموعی کسی ایک صحابی یا ایک جماعت صحابہ کو اپنا آئیڈیل بنا لے اور دوسروں سے صرف نظر کر لے تو وہ راہِ راست سے ہٹ جائے گا، کیونکہ خدا کے رسول کے علاوہ کسی کی زندگی ہر نوع جامع نہیں ہے۔ سماج کو تو پوری جماعت صحابہ کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

مسلمان کی زندگی ذمہ داری اور جواب دہی کے ایک گہرے احساس سے سرشار رہوتی ہے۔ یہ عقیدہ کہ ہر فرد کو جسم و دماغ کے ہر فعل کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہونا ہے۔ اس کے شعور پر حاوی رہتا ہے، جس کے نتیجے میں اس کی پوری زندگی خواہ وہ ذاتی ہو یا سماجی، ایک فریضہ بن جاتی ہے مگر مسلمان اس فریضہ کو خارج سے ڈالا ہوا ایک بار نہیں سمجھتا بلکہ یہ تو اس کے داخلی احساس ذمہ داری کی ترقی یافتہ اور فعال صورت ہے، جو انسان کو دوسرے جانوروں سے ممتاز کرتی ہے، ناممکن ہے کہ ذمہ داری اور جواب دہی کا یہ گہرا شعور اسلام کے تصورِ خیر کو متاثر نہ کرے۔

خدا کے ساتھ انسان کا تعلق اگرچہ بہت وسیع ہے، لیکن اس تعلق کا ایک مخصوص پہلو بھی ہے، جس میں نماز اور دُعا، ذکر و فکر وغیرہ اعمال شامل ہیں۔ زندگی کے آئیڈیل میں عام انسانی اخلاق کے علاوہ تعلق باللہ کا یہ مخصوص پہلو بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انسان ابتداء میں تعلق باللہ کے مختلف طریقے اخلاقاً واجب سمجھ کر اختیار کرتا ہے۔ مگر روحانی ترقی کی بلند منزلوں میں یہ طریقے اور اعمال تقاضائے طبیعت بن جاتے ہیں اور جواب دہی اور خوف کی جگہ ارادت و محبت لے لیتے ہیں۔

قرآن وسنت کے اخلاق کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ ان میں جہاں اخلاق کے متعین اصول و ضوابط ملتے ہیں۔ انسان سے یہ مطلوب ہوتا ہے کہ وہ ان اصولوں کی پابندی کرے۔ بظاہر اسے اخلاق کا فقہی تصور کہا جا سکتا ہے، لیکن اسلامی اخلاق اس تصور سے بہت مختلف ہے۔ اسلامی اخلاق میں فرد کا محض یہ کام نہیں ہے کہ وہ قرآن وسنت کے اخلاقی احکامات حفظ کر لے اور بغیر غور و فکر کیے انھیں

---

[1] حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ بڑے صائب الرائے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مختلف دینی، سیاسی اور سماجی مسائل میں ان سے مشورے کرتے تھے حضرت ابوہریرہؓ اور ابوذرؓ اپنے زہد و فقر کے لیے مشہور تھے۔ حضرت علیؓ اور خالدؓ اسلام کے بہترین قائدینِ جیش تھے۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ ابن عوف اپنی ثروت اور خدمتِ اسلام میں فائق تھے۔ حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس علم و تفقہ میں ممتاز تھے۔ حضرت عائشہؓ و حفصہؓ بھی دین علم و بصیرت میں مشہور تھیں۔

[2] مشکوٰۃ، باب مناقب الصحابہ

جوں کا توں اپنے حالات پر منطبق کر دے۔ قرآن و سنت میں عموماً جو اخلاقی اصول و ضوابط ملتے ہیں، وہ بہت عام ہیں۔ مثال کے طور پر:

ان اللّٰہ یامر بالعدل والاحسان وایتآء ذی القربٰی وینھٰی عن الفحشآء والمنکر والبغی۔ (۱۶ : ۹۰)	بے شک اللہ تعالیٰ عدل اور احسان اور اہل قرابت کو دینے کا حکم دیتا ہے اور فحش، منکر اور ظلم سے منع کرتا ہے۔

اس ہدایت پر عمل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان کو مثلاً یہ معلوم ہو کہ عدل کے کیا معنی ہیں۔ اگرچہ انسان کو عدل کے مفہوم کے تعین میں قرآن و سنت سے بیش قیمت ہدایت ملے گی لیکن بدلتے ہوئے حالات میں عدل کے تقاضے معلوم کرنے کے لیے ہمیشہ غور و فکر کی ضرورت پڑے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ ضرورت زندگی کے ارتقاء اور نئے نئے حالات کے ظہور سے بڑھتی ہی چلی جائے گی۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ کسی موقع پر صحیح طرز عمل متعین کرنے کے لیے عموماً کسی ایک اصول سے منطقی استنباط کرنے کا مسئلہ نہیں ہوتا، بلکہ مختلف اصولوں کے تقاضوں کو تولنا اور ان کے نتائج کو پرکھنا اور جانچنا پڑتا ہے۔

کسی موقع پر صحیح طرزِ عمل متعین کرنے کے لیے نتائج اور عواقب کو ملحوظ رکھنا قرآن و سنت سے ثابت ہے۔ قرآن مجید کی یہ آیت مثلاً اس اصول کی نشان دہی کرتی ہے:

ولا تجعل یدك مغلولة الٰی عنقك ولا تبسطھا کل البسط فتقعد ملومًا محسورًا۔ (۱۷ : ۲۹)	نہ تو اپنا ہاتھ گردن ہی سے باندھ لینا چاہیے اور نہ بالکل ہی کھول دینا چاہیے تاکہ پچھتانے اور تہی دست ہونے کی نوبت نہ آئے۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ متوقع نتائج کی سنگینیت حرام کے ارتکاب کو جائز قرار دے دیتی ہے۔ جیسا کہ بعض شدید حالات میں لحم خنزیر یا شراب کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے یا جیسا کہ قتل ناحق کو روکنے کے لیے غلط بیانی کی یا دوسروں کو شر سے محفوظ رکھنے کے لیے غیبت کی یا روایات کی صحت معلوم کرنے کے لیے تجسس کی یا باہمی تعلقات کی اصلاح کے لیے کذب کی اجازت دی گئی ہے۔[۱]

قرآن و سنت کی نظر میں وہ عمل صائب نہیں ہے، جو اس کی ہدایت کے بظاہر مطابق ہو بلکہ اس عمل کا محرک بھی صحیح ہونا ضروری ہے: "انما الاعمال بالنیات" مشہور حدیث ہے، وہی اعمال حقیقت میں صائب اور حسن ہیں، جو خدا کی رضا کے لیے کیے جائیں۔ لیکن اس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ اگر نیت درست ہو تو اعمال بھی لازماً صحیح ہوں گے۔ نیت کی صحت کے ساتھ عمل کا اخلاقی اصولوں کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ اس دوسری شرط کی ایک شق یہ بھی ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ عمل اپنے نتائج اور عواقب کے اعتبار سے صائب اور حسن ہو۔

---

[۱] اضطرار کی حالت میں لحم خنزیر کے استعمال کی اجازت قرآن مجید میں ہے (۶ : ۱۴۹؛ ۵ : ۳؛ ۲ : ۱۷۳) شراب کے استعمال کی اجازت فقہ کا مشہور مسئلہ ہے۔ ناحق قتل سے بچانے کے لیے جھوٹ بولنے کی اجازت کے لیے ملاحظہ ہو امام غزالی: احیاء العلوم، دارالکتب العربیۃ الکبریٰ، مصر ۳: ۱۱۹-۱۲۱ اور امام نووی: ریاض الصالحین، باب بیان مایجوز من الکذب۔ غیبت کے جائز مواقع کے سلسلے میں ملاحظہ ہو ریاض الصالحین: باب بیان مایباح من الغیبۃ۔

رضائے الٰہی کے صحیح معنی اور عام اخلاقی محرکات سے اس کا تعلق وغیرہ ایسے سوالات ہیں، جو اگرچہ قرآن و سنّت کے اخلاقی نظریہ کے فہم کامل کے لیے نہایت ضروری ہیں مگر ان پر گفتگو کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

اعمال کی ذمہ داری کے بارے میں قرآن مجید کا نظریہ قابلِ تحقیق ہے۔ اشاعرہ کسی فعلِ حسن کے سلسلے میں انسان کو اس لیے ذمہ دار سمجھتے ہیں کہ شرع نے اس کے کرنے کا حکم دیا ہے۔ معتزلہ انسان کو اس لیے ذمہ دار قرار دیتے ہیں کہ یہ عقل کا حکم ہے۔ دونوں گروہوں کے نظریات ان کے مابعد الطبیعیاتی اور دینی تصورات سے اس قدر مربوط ہیں کہ آزادانہ طریقہ سے اس سوال پر قرآن و سنّت کا موقف متعین نہیں کیا جا سکتا ہے۔ بظاہر قرآن مجید کی آیات دونوں ہی خیالات کی تائید کرتی ہیں اور غالباً صحیح نظریہ ان دونوں نظریات کا امتزاج ہوگا۔ ایسی آیات تو بے شمار ہیں، جن میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں اور فلاں عمل کو واجب قرار دیا ہے اور فلاں فلاں عمل یا شئے کو حرام کر دیا ہے۔ دُوسرے نظریہ کی تائید میں یہ آیت بہت واضح ہے: "ولا اقسم بالنفس اللوامة" (۷۵: ۲) نفس لوامہ یا ضمیر کے وجود کی تائید سے یہ بات لازم آتی ہے کہ انسان کے اندر ایک قوت ایسی ہے، جو نہ صرف شر کے ارتکاب پر ملامت کرتی ہے بلکہ خیر کا حکم بھی دیتی ہے۔ مذکورہ بالا آیت کے چند آیات کے بعد ہی یہ آیت ملتی ہے: "بل الانسان علیٰ نفسه بصیرة ولو القی معاذیره" (انسان اپنے نفس پر آپ سمجھ بُوجھ رکھتا ہے، اگرچہ وُہ اپنے اوپر طرح طرح کے بہانوں کے پردے ڈال لیتا ہے)

خیر و شر صائب وغیر صائب کے علم کے بارے میں بھی قرآن مجید کا نقطۂ نظر اشاعرہ اور معتزلہ کے نظریات کے درمیان معلوم ہوتا ہے۔ حسن و قبح کے علم کا انحصار نہ تو محض شرع پر ہے اور نہ عقل ہی ان کے ادراک کے لیے کافی ہے۔ قرآن و سنّت کی واضح تعلیمات کی موجودگی میں اشاعرہ کے اس نظریہ کی تائید کی ضرورت نہیں ہے کہ بعض حسن و قبح کا علم شرع سے ہوتا ہے مگر معتزلہ کی اس رائے کے حق میں کہ بعض حسن و قبح کا علم عقل سے ہوتا ہے، صرف ایک آیت پیش کی جا رہی ہے:

ونفس وما سوّٰها فالهمها فجورها و تقوٰنها۔	قسم ہے (انسان کے) نفس کی کہ اسے درست بنایا اور اس کو اس کی نیکی اور بدی الہام کر دی۔

ایک حدیث بھی اس نظریہ کی تائید میں بہت واضح ہے:

یا وابصة استفت قلبك واستفت نفسك البر ما اطمان الیه القلب واطمانیت الیه النفس والاثم ماحاك فی صدرك و تردد فی النفس وان افتاك الناس۔ (مسند احمد ابن حنبل ۴: ۲۲۸)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے وابصہ! اپنے دل سے پوچھا کر اور اپنے نفس سے فتویٰ لیا کر۔ نیکی وُہ ہے جس سے دل اور نفس میں طمانیت پیدا ہو اور گناہ وُہ ہے جو دل میں کھٹکے اور نفس کو ادھیڑ بن میں ڈال دے۔ اگرچہ لوگ تجھے اس کا کرنا جائز ہی کیوں نہ بتائیں۔

ان دونوں نظریات کی تطبیق کے لیے یہ حدیث قابلِ غور ہے۔

ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے ایک مثال بیان کی: ایک راستہ سیدھا ہے اور اس کے

دونوں طرف دیواریں ہیں اور دیواروں میں کھلے ہوئے دروازے ہیں اور دروازوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور راستہ کے سرے پر ایک داعی کھڑا ہوا ہے، جو پکار کر کہہ رہا ہے، سیدھے راستہ پر چلے جاؤ، اِدھر اُدھر منہ نہ کرو اور اس داعی کے علاوہ ایک اور داعی ہے۔ جب کوئی بندہ ان دروازوں میں سے کوئی دروازہ کھولنا چاہتا ہے، تو دوسرا داعی پکار کر کہتا ہے کہ افسوس ہے تجھ پر، اس کو نہ کھول۔ اگر تو اس کو کھولے گا، اس کے اندر داخل ہو جائے گا۔ یہ مثال بیان کرکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر اس طرح فرمائی: سیدھا راستہ تو اسلام ہے اور دیواروں کے دروازوں سے مراد وہ چیزیں ہیں جنھیں خدا نے حرام قرار دیا ہے اور ان کے پردوں سے مراد اللہ کی حدود ہیں اور وہ داعی جو راستے کے سرے پر کھڑا ہے، قرآن ہے اور وہ دوسرا داعی اللہ کا واعظ ہے، جو ہر مومن کے دل میں موجود ہے (مشکوٰۃ: باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ بحوالہ احمد، ترمذی اور بیہقی)

انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔ اس حقیقت کی وضاحت مختلف آیات میں کی گئی ہے:

کل نفس بما کسبت رهينة (۷۴: ۳۸)	ہر شخص اپنے اعمال کے بارے میں ماخوذ ہوگا۔
اليوم تجزى كل نفس بما كسبت لا ظلم اليوم ان الله سريع الحساب - (۴۰: ۱۷)	آج ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ دیا جائے گا۔ آج (کسی پر) کوئی ظلم نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔

انسانی ذمہ داری کے اس نظریے کے خلاف بعض گروہوں نے قرآن مجید کی وہ آیات نقل کی ہیں، جن میں خدا کی غیر محدود قدرت کا ذکر آیا ہے۔ مگر اس سلسلے میں دو باتیں پیش نظر رہنی چاہئیں، یہ خیال کہ اللہ تعالیٰ کی غیر محدود قدرت والی آیات انسانی ذمہ داری کی تائید کرنیوالی آیات سے متضارب ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ایک استخراجی نتیجہ ہے۔ قرآن مجید نے اعمال انسانی کی ذمہ داری کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کی ہے۔ دُوسری بات یہ کہ جب کبھی انسانوں نے اپنے اعمالِ بد کی ذمہ داری خدا پر ڈالی ہے اور اس کے لیے خدا کے غیر محدود علم و قدرت کا سہارا لیا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اس فعل کو ظن و تخمین اور افترا ہی قرار دیا ہے:

سيقول الذين اشركوا لو شاء الله ما اشركنا و لا آباؤنا و لا حرمنا من شئ كذلك كذب الذين من قبلهم حتى ذاقوا بأسنا قل هل عندكم من علم فتخرجوه لنا ان تتبعون الا الظن و ان انتم الا تخرصون- (۶: ۱۴۹)	جن لوگوں نے شرک کا ڈھنگ اختیار کیا ہے، وُہ کہیں گے اگر اللہ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا شرک نہ کرتے اور نہ کسی چیز کو (اپنی رائے سے) حرام ٹھہراتے سو (دیکھو) اسی طرح ان لوگوں نے بھی (سچائی کو) جھٹلایا تھا، جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ یہاں تک کہ انھیں (بالآخر) ہمارے عذاب کا مزہ چکھنا پڑا (اے پیغمبر!) تم کہو کہ کیا تمہارے پاس علم کی روشنی ہے، جسے ہمارے سامنے پیش کر سکتے ہو؟ اصل یہ ہے کہ تم پیروی نہیں کر رہے ہو مگر وہم

اور اٹکل کی اور تم اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو کہ
بے سمجھے بوجھے باتیں بنانے والے ہو۔

قرآن وسنت کے اخلاق کے یہ چند بنیادی نکات ہیں۔ رسولِ خدا کی زندگی اس آئیڈیل کی کامل تصویر تھی۔ آپ نے قرآن مجید کے اخلاقی اصولوں کو زندگی کے سارے شعبوں میں نافذ فرمایا۔ ذاتی زندگی ہو یا سماجی، قومی مسائل ہوں یا بین الاقوامی آپ نے ان اصولوں پر ان کی نئی تشکیل کی۔ وُہ افراد جو آپ کی رہنمائی اور تربیت میں اس عظیم اخلاقی تجربے سے گزرے۔ ان کے اندر ایک تیز اخلاقی بصیرت پیدا ہوگئی۔ جس کو اگرچہ اپنے نظریاتی مفروضات اور مضمرات کا بخوبی شعور نہ تھا لیکن وہ ایک طویل عرصہ تک زندگی کی اسلامی تشکیل کے لیے کافی ثابت ہُوئی۔

اسلام جس تیزی کے ساتھ پھیلا، اسی تیزی کے ساتھ مسلم معاشرے کو نئے نئے مسائل پیش آئے۔ جو اس کی اخلاقی بصیرت کے لیے چیلنج تھے۔ دوسری اور تیسری صدی کے فقہا نے ان مسائل کو بڑے کامیاب طریقے پر حل کیا۔ اس عمل میں اصحابِ فقہ دھیرے دھیرے ان نظریاتی مفروضات سے واقف ہونے لگے۔ جو ان کی اخلاقی بصیرت کی بنیاد میں تھے۔ ان نظریاتی مسائل کے شعوری فہم کی ضرورت بعض دوسرے عوامل کے نتیجہ میں بڑھتی گئی۔ جو لوگ نئے نئے اسلام لائے تھے، وہ ان مسائل کو فراموش نہ کر سکتے تھے۔ جنہوں نے صدیوں پریشان رکھا تھا، وہ ان مسائل کا حل اسلام سے چاہتے تھے۔ نئے دین وعقیدہ سے گہری اور مخلصانہ وابستگی کے لیے اس کی قدروں اور اس کے آئیڈیل کا بہتر فہم ضروری تھا۔ پھر دُوسرے مذاہب کے جو لوگ اسلام نہیں لائے تھے، یا اس کے مخالف تھے، وُہ اپنے آبائی دین پر قائم رہنے کے لیے اور اپنی مدافعت کے لیے اسلامی عقاید پر اعتراض کر رہے تھے۔ اسلام کی اشاعت اور اس کے خلاف اعتراض کے جواب کے لیے بھی ضروری تھا کہ اسلامی فکر کے دُوسرے گوشوں کی طرح اس کے اخلاقی اصول ونظریات کو بھی مدلّل طریقہ پر پیش کیا جائے۔ مگر سب سے زیادہ اہم عامل یونانی علوم وفنون کی اشاعت ثابت ہُوئی جس کے اثر سے عقلیت پسندی کا رجحان ترقی پا گیا اور اخلاقی مسائل کی قابلِ فہم توجیہہ کی ضرورت شدید ہوگئی۔

مگر اخلاقی فکر کی تحریک جس فوری سبب سے ہُوئی، وہ سیاسی تھا۔ بنواُمیّہ نے اپنی حکومت کی توسیع اور استحکام کے لیے ظالمانہ طریقے اختیار کیے۔ دشمنانِ عوام اور غالباً اپنے ضمیر کی ملامت سے بچنے کے لیے انہوں نے اپنے مظالم کو خدا کی مشیت اور اپنے کارناموں کو تقدیرِ ازلی قرار دیا[۱]۔ اس نظریہ کی مخالفت ہُوئی۔ ایک گروہ نے انسانی ذمہ داری اور آزادیِ ارادہ کا نظریہ پیش کیا اور اس کی اشاعت شروع کر دی مگر دونوں گروہوں کو اپنے فکر کی تنظیم میں کوئی نہ کوئی زحمت پیش آئی۔ اگر انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے، تو اس کا ارادہ آزاد ہونا چاہیے۔ مگر کیا اس صورت میں خدا کی غیر محدود قدرت محدود نہیں ہو جاتی؟ یہ تھا وُہ سوال جو آزادیِ ارادہ کے قائلین کو پیش آیا۔ لیکن اگر خدا کی قدرت ساری چیزوں پر حاوی ہے اور سب کچھ اس کے ارادہ اور قدرت سے ہوتا ہے، تو انسان کو اپنے اعمال کا ذمہ دار کیوں گردانا جائے؟ کیا اس سے عدلِ الٰہی کی نفی نہیں ہوتی؟ یہ تھا وُہ سوال جسے ان لوگوں کو حل کرنا تھا، جو خدا کی قدرت کو غیر محدود

۱۔ DONALDSON, STUDIES IN MUSLIM ETHICS, (LONDON, 1953), P. 98 — 100

اور مطلق قرار دیتے تھے۔

آزادیِ ارادہ کے نظریہ کی تائید معتزلہ نے کی اور خدا کی قدرت کو برملا محدود قرار دیا۔ انہوں نے اپنے خیالات جس زبان اور انداز میں بیان کیے، وہ عامۃ المسلمین کے لیے تکلیف دہ ثابت ہوئے۔

ابوالحسن اشعری پہلے اعتزال کے پُرجوش مبلّغ تھے۔ بعد میں ان کو اس سے بے اطمینانی پیدا ہوئی، جو اس حد تک بڑھی کہ ۳۰۰ھ میں انہوں نے برسرِعام اس سے اپنی برأت کا اظہار کیا اور اپنے نئے خیالات کی تبلیغ و اشاعت شروع کر دی۔ مگر اشعری نے جن مسائل میں دلچسپی لی وُہ عقاید سے متعلق تھے۔ اخلاقی مسائل کی طرف ان کی توجہ مبذول نہیں ہوئی۔ ابوبکر باقلانی (م ۴۰۳ھ) وہ پہلے شخص ہیں، جنھوں نے اخلاقی مسائل کی تنقیح کی اور اشعری اصولوں پر ان کا حل پیش کیا۔ بعد کو دُوسرے ائمہ اشاعرہ نے ان مسائل پر فکر کو آگے بڑھایا۔ ان میں امام الحرمین جوینی (م ۴۷۸ھ) اور امام غزالی نمایاں ہیں۔ جن اخلاقی مسائل سے متکلمین نے بحث کی، وُہ دو تھے: ایک یہ کہ اخلاقی اصولوں کے علم کا ذریعہ کیا ہے؛ شرع یا عقل۔ دوسرا سوال یہ تھا کہ اخلاقی اصولوں کے علم کی پابندی کی بنیاد کیا ہے؛ مثال کے طور پر اگر ہمیں سچ بولنا چاہیے، تو کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ شریعت نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے یا یہ ہے کہ سچ بولنا عقل کا فیصلہ اور حکم ہے؛ خیر اور اخلاقی آئیڈیل سے متعلق متکلمین کے یہاں کوئی بحث نہیں ملتی۔ اگرچہ ان کی کتابوں میں رویتِ باری کے مسئلہ پر طویل بحثیں ضرور موجود ہیں۔ لیکن یہ بحثیں اس نکتہ پر مرکوز تھیں کہ رویتِ باری کا امکان ہے یا نہیں؛ ان بحثوں کا تعلق اس بات سے کچھ نہ تھا کہ رویتِ باری اور سعادتِ انسانی میں کیا تعلق ہے۔

اخلاقی آئیڈیل کے ارتقا کے مطالعہ کے لیے ہمیں تصوّف اور فلسفہ کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ نئے حالات کے اندر ایک نیا آئیڈیل وجود میں آ رہا تھا۔ تیسری اور چوتھی صدی کے سیاسی اور سماجی حالات کا نقشہ پہلے پیش کیا گیا ہے[1]، ان حالات نے اخلاقی آئیڈیل کے ارتقا کو بیحد متاثر کیا۔ قرآن مجید نے زندگی کا جو آئیڈیل پیش کیا، وہ بڑا متوازن تھا۔ اس میں ہر چیز کو مناسب مقام حاصل تھا، مگر ان بدلے ہُوئے حالات میں یہ توازن باقی نہیں رہا۔ بعض پہلو زیادہ اُبھر آئے اور بعض دب گئے۔ سماج سے گریز اور کنارہ کشی کو اس کے مسائل میں دلچسپی لینے کے مقابلے میں ترجیح دی گئی۔ زہد کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ توکّل علی اللہ کے غلط تصوّر نے بے عملی اور جمود کو تقویت دی اور حقیقت کی فکری جستجو اور مطالعہ و تفکر کو عمل و تجربہ کے مقابلہ میں برتر سمجھا گیا۔ عشقِ الٰہی کا نظریہ اسی دور میں پیدا ہُوا، جس کا حاصل یہ تھا کہ خدا کا ذکر اس کثرت سے کیا جائے کہ انسان اس کی یاد میں گم ہو جائے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا وجدانی ادراک ما سوا کا احساس ہی مٹا دے۔ دینی جذبے کی تسکین کے لیے عزلت کے گوشے تلاش کیے گئے۔ شر و فساد کے خلاف جہاد اس جذبہ کی تسکین کا اب ذریعہ نہیں رہا۔ دوسرا اہم عامل جس نے اس رجحان کو تقویت دی اور جس نے اس کے اظہار اور اشاعت میں بڑی خدمت انجام دی، وُہ یونانی فلسفہ تھا۔ یونانی فلسفہ کی بیشتر کتابیں سریانی سے عربی میں منتقل ہُوئیں۔ عیسائی مترجمین اور مستفین نے جو ترجمے کے کام میں پیش پیش تھے، اس آئیڈیل کے ارتقاء میں اہم پارٹ ادا کیا۔

---

[1] ملاحظہ ہو: "چوتھی صدی ہجری میں عراق اور مغربی ایران کی معاشی، سیاسی اور معاشرتی حالت" مجلہ علوم اسلامیہ (۱/۳) علی گڑھ، جون ۱۹۶۲ء

اور مطلق قرار دیتے تھے۔

آزادیٔ ارادہ کے نظریہ کی تائید معتزلہ نے کی اور خدا کی قدرت کو برملا محدود قرار دیا۔ انہوں نے اپنے خیالات جس زبان اور انداز میں بیان کیے، وہ عامۃ المسلمین کے لیے تکلیف دہ ثابت ہُوئے۔

ابوالحسن اشعری پہلے اعتزال کے پُرجوش مبلغ تھے۔ بعد میں ان کو اس سے بے اطمینانی پیدا ہُوئی، جو اس حد تک بڑھی کہ ۳۰۰ھ میں انہوں نے برسرِ عام اس سے اپنی برأت کا اظہار کیا اور اپنے نئے خیالات کی تبلیغ و اشاعت شروع کر دی۔ مگر اشعری نے جن مسائل میں دلچسپی لی وُہ عقاید سے متعلق تھے۔ اخلاقی مسائل کی طرف ان کی توجہ مبذول نہیں ہوئی۔ ابوبکر باقلانی (م ۴۰۳ھ) وہ پہلے شخص ہیں، جنھوں نے اخلاقی مسائل کی تنقیح کی اور اشعری اصولوں پر ان کا حل پیش کیا۔ بعد کو دُوسرے ائمہ اشاعرہ نے ان مسائل پر فکر کو آگے بڑھایا۔ ان میں امام الحرمین جوینی (م ۴۷۸ھ) اور امام غزالی نمایاں ہیں۔ جن اخلاقی مسائل سے متکلمین نے بحث کی، وُہ دو تھے؛ ایک یہ کہ اخلاقی اصولوں کے علم کا ذریعہ کیا ہے؛ شرع یا عقل۔ دوسرا سوال یہ تھا کہ اخلاقی اصولوں کے علم کی پابندی کی بنیاد کیا ہے؛ مثال کے طور پر اگر ہمیں سچ بولنا چاہیے، تو کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ شریعت نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے یا یہ ہے کہ سچ بولنا عقل کا فیصلہ اور حکم ہے؛ خیر اور اخلاقی آئیڈیل سے متعلق متکلمین کے یہاں کوئی بحث نہیں ملتی۔ اگرچہ ان کی کتابوں میں رویتِ باری کے مسئلہ پر طویل بحثیں ضرور موجود ہیں۔ لیکن یہ بحثیں اس نکتہ پر مرکوز تھیں کہ رویتِ باری کا امکان ہے یا نہیں؛ ان بحثوں کا تعلق اس بات سے کچھ نہ تھا کہ رویتِ باری اور سعادتِ انسانی میں کیا تعلق ہے۔

اخلاقی آئیڈیل کے ارتقا کے مطالعہ کے لیے ہمیں تصوّف اور فلسفہ کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ نئے حالات کے اندر ایک نیا آئیڈیل وجود میں آرہا تھا۔ تیسری اور چوتھی صدی کے سیاسی اور سماجی حالات کا نقشا پہلے پیش کیا گیا ہے[1]، ان حالات نے اخلاقی آئیڈیل کے ارتقا کو بے حد متاثر کیا۔ قرآن مجید نے زندگی کا جو آئیڈیل پیش کیا، وہ بڑا متوازن تھا۔ اس میں ہر چیز کو مناسب مقام حاصل تھا۔ مگر ان بدلے ہُوئے حالات میں یہ توازن باقی نہیں رہا۔ بعض پہلو زیادہ اُبھر آئے اور بعض دب گئے۔ سماج سے گریز اور کنارہ کشی کو اس کے مسائل میں دلچسپی لینے کے مقابلے میں ترجیح دی گئی۔ زہد کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ توکل علی اللہ کے غلط تصوّر نے بے عملی اور جمود کو تقویت دی اور حقیقت کی فکری جستجو اور مطالعہ و تفکر کو علم و تجربہ کے مقابلہ میں برتر سمجھا گیا۔ عشقِ الٰہی کا نظریہ اسی دور میں پیدا ہُوا، جس کا حاصل یہ تھا کہ خدا کا ذکر اس کثرت سے کیا جائے کہ انسان اس کی یاد میں گم ہو جائے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا وجدانی ادراک ما سوا کا احساس ہی مٹا دے۔ دینی جذبے کی تسکین کے لیے عزلت کے گوشے تلاش کیے گئے۔ شر و فساد کے خلاف جہاد اس جذبہ کی تسکین کا اب ذریعہ نہیں رہا۔ دوسرا اہم عامل جس نے اس رجحان کو تقویت دی اور جس نے اس کے اظہار اور اشاعت میں بڑی خدمت انجام دی، وُہ یونانی فلسفہ تھا۔ یونانی فلسفہ کی بیشتر کتابیں سریانی سے عربی میں منتقل ہُوئیں۔ عیسائی مترجمین اور مستفین نے جو ترجمے کے کام میں پیش پیش تھے، اس آئیڈیل کے ارتقا میں اہم پارٹ ادا کیا۔

---

[1] ملاحظہ ہو: "چوتھی صدی ہجری میں عراق اور مغربی ایران کی معاشی، سیاسی اور معاشرتی حالت" مجلہ علوم اسلامیہ (۱۱۳) علی گڑھ، جون ۱۹۶۲ء

یونانی فلسفہ کے ان چند اہم نظریات پر ایک نظر ڈال لیجئے، جنھوں نے اخلاقی آئیڈیل کے ارتقاء پر گہرا اثر ڈالا۔ خدا کی حیثیت یونانی فلسفہ میں ایک مابعد الطبیعیاتی تصور کی تھی۔ جسے یا تو علت اوّل سمجھا گیا، جو کائنات کی حرکت کو آغاز میں لانے کے لیے ضروری تھا یا مصدر اوّل قرار دیا گیا، جس سے سارا نظام وجود درجہ بدرجہ صادر ہوا۔ نو فلاطونی فلسفہ میں، جو مسلمانوں پر صدیوں غالب رہا، خدا عقل کی رسائی سے بلند، صفات سے عاری اور فوق العقلی وجدان کا موضوع تھا۔ انسان کی رُوح جو ذات واحد سے صادر ہوتی تھی موت کے بعد جسم سے علیحدہ ہوکر پھر اپنے مصدر کو لوٹ جاتی تھی۔ رُوح کا اپنے مصدر کی طرف رجوع اور اس سے اتصال آخری مقصد تھا۔ اس منزل تک پہنچنے کے لیے سب سے پہلے انسان کو اپنے نفس کی تطہیر کرنی چاہیے تھی۔ مادی آلائشوں سے پاکی اور خدا کی ذات میں تفکر اس کے لیے ضروری تھا۔ یونانی فلسفہ میں خدا کی ذات قانون کا مصدر نہ تھی اور نہ ہی عبادات کا موضوع خدا، وحی و ہدایت سے بلند تھا۔ وہ نہ مختسب تھا اور نہ مجازی۔ رُوح کا تصور یونانی فلسفہ میں یہ تھا کہ رُوح ایک غیر مادی جوہر ہے، جو جسم سے نہ صرف بالکل مختلف ہے بلکہ اس سے متضاد اور متضارب بھی ہے۔ بعد میں جسم اور رُوح کا تضاد نمایاں اور وسیع ہوتا چلا گیا بالآخر جسم کے خلاف ایک شدید نفرت پیدا ہوگئی فرفوریوس کو اپنے جسم سے اس قدر نفرت تھی کہ اس نے خودکشی کرنے کا ارادہ کر لیا مگر اس کا استاد افلاطین (PLOTINUS) مانع آیا۔ اس نے اسے یہ سمجھایا کہ جسم رُوح کے لیے ایک تربیت گاہ کی بھی حیثیت رکھتا ہے جس سے گزرے بغیر وہ ترقی و کمال تک نہیں پہنچ سکتی۔ جسم فی الحقیقت ایک ناگزیر شر ہے[1]

افلاطون اور ارسطو سماج کے مسائل میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ ان کے فکر میں انسان کی سماجی زندگی اس کی ذاتی زندگی کے مقابلہ میں زیادہ اہم تھی۔ سماج کی یہ اہمیت بعد کے رواقی اور لذتی فکر میں قائم رہی مگر نو فلاطونی فلسفہ میں سماج کی اہمیت گھٹتی چلی گئی بالآخر نوبت سماج سے بے تعلقی اور بیزاری تک پہنچی۔

سقراط نے علم کو عقل اور فضیلت کو علم کا شعبہ قرار دیا۔ یہ دونوں بنیادی نظریات قدرے ترمیم کے ساتھ یونانی فلسفہ کی پوری تاریخ میں نظر آتے ہیں۔ سقراط نے حواس کی اہمیت جس طرح گرائی، اس کی تلافی پھر نہیں ہوئی۔ افلاطون نے فلسفہ کا آئیڈیل پیش کیا کہ انسان اپنے غیر عقلی وجود کو فنا کر دے۔ نو فلاطونی فلسفہ میں عقل کی جگہ وجدان نے لے لی جس کے نتیجے میں فلسفہ تصوّف کی ایک قسم بن گیا اور حقیقت کی عقلی جستجو کی جگہ "ذات واحد" کا وجدانی عرفان مقصد قرار پایا۔

یونانی اخلاقیات کا مرکزی تصور خیر کا تصور تھا۔ فرض کا تصور اس میں سرے سے موجود نہیں تھا۔ اس میں نہ تو کوئی الہامی ضابطۂ اخلاق تھا اور نہ ہی خدا کے سامنے جواب دہی کا کوئی خیال۔ فضیلت خیر اعلیٰ یا سعادت کے حصول کا ذریعہ تھی۔ ابتداء میں سعادت انسان کی ہمہ جہتی ترقی و تکمیل کے ہم معنی تھی لیکن فلاسفہ کے نزدیک سعادت عقل کی تکمیل قرار پائی کیونکہ عقل ہی انسان کا مابہ الامتیاز تھی اور حقیقی انسانیت اسی سے عبارت تھی، عقل کے دو پہلو تھے؛ نظری اور عملی۔ لیکن نظری عقل کو عملی عقل پر فوقیت حاصل تھی۔ عملی زندگی حقائق عقلی کی تحصیل کا ذریعہ تھی۔ مابعد الطبیعیات علم کی منتہا تھی اور اس کی تحصیل زندگی کی آخری غایت۔

---

[1] ALICE ZIMMERU: THE LETTER OF PROPHYRY TO MARCELLA, (LONDON, 1696), P. 27, 35.

فضیلت کے درجات تھے، جن میں فضائل عقلی کو بلند ترین درجہ حاصل تھا۔ نوفلاطونی اخلاقیات میں فضائل کی صعودی ترتیب یہ تھی، سیاسی، تطہیری CARTHARIC، عقلی اور PARADIGMATIC یعنی ذات واحد میں فکری محویت اور استغراق [۱]

یونانی فلسفے کے یہ دُو اہم نظریات ہیں، جنھوں نے مسلمانوں کے اخلاقی فکر کو بیحد متاثر کیا۔ تیسری اور چوتھی صدی کے حالات میں جن کا ذکر پہلے آیا ہے اس فلسفے کی اثر انگیزی کی توجیہہ کی ضرورت نہیں۔ ایک طرف اخلاقی آئیڈیل کی تشکیل کے لیے حالات بڑے سازگار تھے۔ دُوسری طرف اس تشکیل کے لیے جن تصوّرات اور فکری آلات کی ضرورت تھی، انھیں یونانی فلسفے نے مہیا کر دی۔

متکلمین کے اخلاقی تصوّرات

ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ اخلاقی فکر کا آغاز انسانی ذمہ داری کے سوال سے ہوا۔ آزادی ارادہ کے اوّلین علمبردار وُہ تھے، جنھیں قدریہ کہا گیا۔ ان کے فکر کی اشاعت بعد میں معتزلہ نے کی۔ معتزلہ نے آزادی ارادہ کے مضمرات واضح کرنے میں جرأت دکھائی، اگر انسان اپنے ارادہ کا مالک ہے اور اپنے اعمال کی حقیقی علّت وہی ہے۔ ان کے الفاظ میں وہی ان کا خالق ہے [۲] تو ظاہر ہے کہ خدا کی قدرت غیر محدود نہیں رہ جاتی۔ معتزلہ کا خیال تھا کہ خدا کی قدرت کو محدود کیے بغیر نہ تو انسانی ذمہ داری اور مسئولیت کو بچایا جا سکتا ہے اور نہ ہی خدا کے عدل و انصاف کو [۳] قدریہ کے مخالفین کو "جبریہ" کہا گیا۔ یہ لوگ خدا کی غیر محدود قدرت کو محدود کرنے کے لیے تیار نہ تھے اور آزادی ارادہ کے منکر تھے۔ مگر اعمال کی ذمہ داری اور خدا کے عدل کے مسئلہ کا کوئی حل انہوں نے پیش نہیں کیا۔ [۴]

اشاعرہ نے کسب کا نظریہ پیش کیا، جس سے ان کا مقصد ایک طرف خدا کی غیر محدود قدرت اور عدل کو محفوظ کرنا تھا اور دُوسری طرف آزادی ارادہ اور انسانی ذمہ داری کو باقی رکھنا تھا۔ ان کے خیال میں انسان اپنے اعمال کا خالق نہیں تھا، اسے اختیار و ارادہ کی آزادی ضرور حاصل تھی لیکن اختیار و ارادہ کی قوت بھی اللہ تعالیٰ کی تخلیق کردہ تھی۔ انسان ان کا خود خالق نہیں تھا۔ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار اس لیے تھا کہ وُہ ارادہ اور اختیار کا مالک تھا۔ اس نظریہ کی بنا پر خدا کا عدل بھی مجروح نہیں ہوتا تھا اور چونکہ ہر چیز اور ہر فعل کا خالق خدا ہے، اس لیے اس کی قدرت محدود بھی نہ ہوتی تھی [۵]

---

[۱] THOMAS WHITTAKER, THE NEO-PLATONISTS, (CAMBRIDGE, 1928) P. 91-49

[۲] شہرستانی: کتاب الملل والنحل ص ۶۲، شائع کردہ محمد بن فتح اللہ، الازہر مصر، ۱۹۴۷ء؛ زہدی حسن جاراللہ: المعتزلہ: ۹۲، ۹۷، ۹۹، قاہرہ ۱۹۴۷ء۔

[۳] شہرستانی: الملل والنحل، ص: ۶۲، واتفقوعلی ان العبد قادر خالق لافعاله خیرها وشرها مستحق علی ما یفعله ثوابا وعقابا فی الدار الآخرة والرب تعالیٰ متنزه ان یضاف الیه شر وظلم وفعل هو کفر و معصیة لانه لوخلق الظلم کان ظالما کما لوخلق العدل کان عادلا۔ [۴] ایضاً: ۱۳۳، الاشعری: مقالات الاسلامیین، استانبول، ۱۹۲۹ء، (۱: ۲۷۹)

[۵] ایضاً: ۱۵۶؛ شہرستانی: نہایۃ الاقوام، آکسفورڈ، ۶۷: ۸۰؛ الغزالی: الاقتصاد فی الاعتقاد، مصر ۱۳۲۷ھ، ۳۷-۴۰

عدل الٰہی اور قدرت الٰہی میں توافق کا مسئلہ شر کے وجود کے ضمن میں بھی اٹھتا ہے۔ معتزلہ اوّل تو اس کے انکاری تھے کہ خدا شر کا خالق ہو سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ وُہ کسی معصوم کو مبتلائے عذاب کرتا ہے۔ اشاعرہ خدا ہی کو خیر و شر کا خالق سمجھتے تھے۔ وہ مثال کے طور پر معصوم انسانوں کی مصیبت کو اسی کی طرف سے سمجھتے تھے۔ معتزلہ شر اور تعذیب معصوم کو خدا کی طرف منسوب کرنے سے اس لیے انکار کرتے تھے کہ یہ بات ان کے خیال میں خدا کی معقولیت اور عدل کے منافی تھی۔ اگر بالفرض کوئی معصوم مبتلائے تکلیف ہو بھی تو ان کا خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ پر اس کی تلافی دوسری دنیا میں لازم ہے[1] اشاعرہ ہر طرح کے شر کو من اللہ سمجھتے تھے چنانچہ انہوں نے عدل کے تصور ہی کو چیلنج کیا۔ ان کے خیال میں عدل وہ نہیں ہے، جو ہماری عقل بتائے بلکہ وُہ ہے جو اللہ تعالیٰ کرے[2] معتزلہ عدل کو ایک عقلی تصور سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں خدا کی طرف عدل کی نسبت اسی معنی میں ہوتی ہے، جس معنی میں وہ انسان کی طرف ہوتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ خدا کے اعمال عقل انسانی کے مطابق ہوتے ہیں بلکہ انھیں لازماً مطابق ہونا چاہئے خدا عقل کے اصولوں کا ویسا ہی پابند ہے جیسا کہ کوئی دُوسرا صاحب عقل۔

اس اختلاف سے دُو اہم اخلاقی مسائل پیدا ہُوئے: ایک یہ کہ اخلاقی معلومات کا ذریعہ کیا ہے، عقل یا شرع؛ اور دوسرا سوال یہ کہ اخلاقی ذمہ داری (OBLIGATION) کی بنیاد کیا ہے؛ ان سوالات نے بڑی اہمیت اختیار کر لی کیونکہ ان کے ساتھ بعض دوسرے اہم مسائل وابستہ تھے جن میں سے ایک مسئلہ نبوت کی ضرورت اور جواز کا تھا۔ اگر عقل خیر و شر کے ادراک کے لیے بالکل کافی ہو، تو وحی کی ضرورت ہی کیا باقی رہ جاتی ہے۔

معتزلہ کے پاس ان دونوں سوالات کا جواب ایک تھا عقل۔ حسن ان کی تنقیح کے مطابق تین معنوں میں بولا جاتا تھا: ایک وہ جس میں نماز، روزہ اور دُوسرے دینی فرائض حسن کہے جاتے تھے۔ دُوسرا وُہ جس میں حسن سے مفید اور مسرت بخش امور مراد لیتے تھے اور تیسرا وہ جس میں عدل، شکر اور سخاوت کو حسن کہا جاتا تھا۔ معتزلہ کو تسلیم تھا کہ پہلے معنی میں حسن کے علم کے لیے شرع ضروری ہے[3] حسن بھی دوم و سوم کے علم کے لیے جس میں اخلاقی حسن بھی آتا ہے عقل بالکل کافی ہے ———— ان کا خیال تھا کہ عقل ہمیں بتاتی ہے کہ شکر اور سچائی وغیرہ حسن ہیں اور ناشکری اور جھوٹ وغیرہ قبیح ہیں۔ ان کے حسن کا علم شرع سے نہیں ہوتا۔ شرع صرف اس علم کی تصدیق کرتی ہے، جو عقل سے حاصل ہوتا ہے۔ معتزلہ اس خیال کو اس طرح ادا کرتے تھے۔

اشیاء اور افعال فی نفسہٖ حسن یا قبیح ہوتے ہیں اور ان کے حسن و قبح کا ادراک عقل کرتی ہے[4] اس قول کے یہ معنی تھے کہ خیر و شر کلیتہً عقلی (RATIONAL) ہیں۔ لیکن یہ سوال کہ خیر و شر کے کیا معنی ہوتے ہیں، یا اخلاقی طور پر حسن ہونے کا مفہوم کیا ہے؛

اس دور میں جس کے اخلاقی فکر کا جائزہ ہمارے پیش نظر ہے اب تک پیدا نہیں ہُوا تھا، غزالی سب سے پہلے شخص ہیں، جنھوں نے

---

[1] الاشعری: مقالات اسلامیین (۱: ۲۵۳ - ۲۵۴)

[2] شہرستانی: الملل والنحل (۱۶۷، ۵۸)

[3] الغزالی: المستصفیٰ (۱: ۵۶) المطبعۃ الامیریہ، بولاق ۱۳۲۲ھ

[4] ایضاً (۱: ۵۰)؛ الاشعری: مقالات الاسلامیین (۲: ۳۵۶)؛ شہرستانی: نہایۃ الاقدام، ص ۳۷۱

یہ سوال اٹھایا[1] مگر وہ پانچویں صدی کے ہیں۔ معتزلہ کا یہ بھی خیال تھا کہ عقل ہی اخلاقی ذمہ داری کا مصدر ہے۔ یعنی یہ کہ عقل حسن و قبح کا علم ہی نہیں دیتی بلکہ حسن کے انجام دینے اور قبح سے اجتناب کرنے کا حکم بھی دیتی ہے۔ مختصر یہ کہ اخلاقی ذمہ داری (وجوب) عقلی ہے اور عقل کے احکامات ہر ذی عقل ذات پر واجب ہیں۔ معتزلہ کے اس نظریہ کا ایک لازمہ یہ تھا کہ شرع کے پہنچنے سے پہلے انسان اپنے اعمال کے لیے جوابدہ ہوتا ہے[2]

معتزلہ نے اخلاقی مسائل میں عقل کے کافی ہونے کے جو دلائل دیئے ہیں، وہ مختصراً یہ ہیں: اخلاقی فضائل مثلاً شکر کا حسن ہونا ہم ضرورۃً جانتے ہیں۔ انسان خواہ وہ وحی و الہام سے آشنا ہوں یا نہ ہوں، اس میں یقین رکھتے ہوں یا اس کے منکر ہوں بالعموم ان فضائل کے حسن ہونے کے قائل ہیں۔ جب بھی کوئی مقصد صائب اور غیر صائب دونوں طریقوں سے یکساں حاصل ہو سکتا ہے تو انسان نمایاں طور پر محسوس کرتا ہے کہ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ صائب طریقہ ہی کو اختیار کرے۔ اگر اعمال کا حسن عقل سے معلوم نہ ہو سکتا تو ایک سچے نبی اور ایک جھوٹے متنبی میں فرق کرنا ناممکن ہوتا۔ اس آخری استدلال کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ شرع کی اتباع اور اطاعت کی ذمہ داری بھی بالآخر عقلی ہے[3]

اشاعرہ کو یہ تسلیم تھا کہ حسن بمعنی دوم عقلی ہے[4] مگر حسن بھی اول و سوم (دینی اور اخلاقی) کے علم کو وہ عقلی تسلیم نہیں کرتے تھے درحقیقت وہ ان دونوں معنی میں کوئی امتیاز ہی نہیں کرتے تھے۔ ان کے خیال میں افعال اور اشیاء کا حسن و قبح ذاتی نہیں ہوتا۔ کوئی چیز حسن ہے تو اس لیے ہے کہ شرع نے اس کے کرنے کا حکم دیا ہے۔ بالفاظِ دیگر شرع حسن و قبح کی اطلاع دینے والی نہیں بلکہ خالق ہے۔ اس نظریہ کا لازمی نتیجہ ہے کہ اخلاقی ذمہ داری عقلی نہیں ہو سکتی کیونکہ جب تک کہ شرع کا حکم کسی کو نہ پہنچے، اس وقت تک وہ نہ صرف ذمہ دار نہیں ہوتا، بلکہ کسی چیز کے حسن و قبح کا علم بھی اس کو نہیں ہوتا۔

باقلانی (۴۰۳ھ) نے معتزلہ کے دلائل کی تردید میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے: حسن و قبح کا علم بدیہی نہیں ہے۔ ورنہ اختلاف نہ ہوتا، عمومی بھی نہیں ہے کیونکہ خیر و شر کے بارے میں انسانوں میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے اور بسا اوقات متضاد خیالات ملتے ہیں۔ حسن و قبح کا علم عقلاً ضروری بھی نہیں ہے کیونکہ ضروری ہونے کے لیے شرط یہ ہے کہ جن مقدمات سے یہ علم مستخرج ہو، وہ بدیہی ہوں اور ایسا ہے نہیں۔ یہ بات کہ جب حسن اور غیر قبیح دونوں ہی اعمال سے مقصد یکساں طور پر حاصل ہوتا ہے تو انسان حسن کو ترجیح دیتا ہے تو اس کی وجہ یا تو یہ ہو سکتی ہے کہ انسان قبیح کا ارتکاب کر کے سماج کی ملامت مول نہیں لینا چاہتا، یا حسن کو انجام دینے سے اس کا مقصد تعریف حاصل کرنا ہوتا ہے، یا وہ اس لیے کار حسن کرتا ہے کہ کسی وحی میں یقین رکھتا ہے یا اس کے زیر اثر ہوتا ہے۔ باقلانی کے خیال میں کوئی اور صورت اس حقیقت کی توجیہ کی نہیں ہے۔ معتزلہ کی آخری دلیل کے جواب میں باقلانی کا خیال ہے کہ نبی کی پہچان کی حقیقی دلیل اس کے معجزات ہوتے ہیں[5]

---

[1] الغزالی: المستصفیٰ (۱: ۵۶)   [2] شہرستانی: الملل والنحل: ۴۷، ۸۴، ۱۰۴، ۱۰۶، ۱۲۰

[3] باقلانی: التمہید، ص ۱۰۰ شائع کردہ محمد الکدی اور محمد عبدالهادی ابوریده، قاہره، ۱۹۴۷ء   [4] الغزالی: المستصفیٰ (۱: ۵۶-۵۷)

[5] باقلانی: التمہید، ص ۱۱۴، شہرستانی: الملل وا[illegible] ص ۱۶۸

اشاعرہ اور معتزلہ کے انتہا پسند خیالات کے برخلاف ایک درمیانی مکتب فکر ابوحنیفہ اور ان کے شارح اور مفسر ابومنصور ماتریدی کا ہے۔ یہ مکتب فکر اخلاقی اصولوں کے علم کے مسئلہ میں معتزلہ کے ساتھ ہے۔ لیکن اخلاقی وجوب کے مسئلہ میں اشاعرہ کا ہم نوا ہے[1] اس کے خیال میں، دونوں سوالات ایک دوسرے پر منحصر نہیں ہیں۔

فلسفیانہ اخلاقیات

جب ہم کلامی اخلاقیات سے فلسفیانہ اخلاقیات کی طرف رجوع کرتے ہیں تو نہ صرف اخلاقی مسائل ہی بدلے نظر آتے ہیں بلکہ اصطلاحات بھی نئی ہوتی ہیں۔ متکلمین حسن کو خیر اور صائب کے معنی میں استعمال کرتے تھے، جن کے درمیان وہ کوئی تمیز نہیں کرتے تھے اور قبیح کو شر اور غیر صائب کے معنی میں استعمال کرتے تھے اور وجوب کا لفظ اخلاقی ذمہ داری کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے بولتے تھے۔ فلسفیانہ اخلاقیات میں ان الفاظ کی جگہ خیر، فضیلت اور سعادت اور ان کے مخالف الفاظ مروج ملتے ہیں۔ فلسفیانہ اخلاق کا مرکزی مسئلہ خیر کا مسئلہ تھا۔ عموماً بحث خلق کے تصوّر کی وضاحت سے شروع ہوتی ہے، جو اخلاقی تصورات کا موضوع ہے۔ خلق کی دو قسمیں کی جاتی ہیں، ایک خیر، دوسرے شر۔ خلق کا خیر یا شر ہونا نفس کے قوٰی کے باہمی تعامل کی نوعیت پر منحصر ہوتا تھا۔ فضیلت اچھے خلق سے عبارت تھی لیکن فضیلت کا تصور خلق تک محدود نہیں رہتا تھا بلکہ عقل کے کمال پر بھی صادق آتا تھا، بشرطیکہ وہ مستقل ہو۔ سعادت فاضلانہ افعال پر مشتمل ہوتی تھی اور ہر طرح کے خیر کا جامع تھی لیکن سعادت کی آخری قسم وُہ تھی جو فلسفی کو حاصل ہوتی تھی، یعنی جو عقل اور بالخصوص عقل نظری کی تکمیل سے عبارت تھی۔ مسلمانوں کے فلسفیانہ اخلاقیات کا یہی عام نقشا تھا۔

فلسفیانہ اخلاقیات کے مطالعے کے لیے ہمیں کندی (م ۲۶۰ ھ) سے ابتدا کرنی چاہیے۔ کندی ابتداء میں اعتزال کا حامل تھا بعد میں کلام سے فلسفہ کی طرف رُخ کیا اور یونانی علوم کی کتابوں کے مطالعہ، ترجمہ اور تشریح میں مصروف ہوگیا۔ فلسفہ میں مابعد الطبیعیات اور نفسیات اس کے اہم موضوعات تھے۔ اخلاق میں کندی نے ایک رسالہ "دفع الاحزان" کے نام سے لکھا ہے، جس میں حزن و لم کے وجوہ اور ان کے دُور کرنے کے عملی طریقوں کی نشان دہی کی ہے۔ کندی نے نفس کا جو نظریہ پیش کیا وہ اخلاقیات کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کا نظریہ نفس بعد کے نفسیاتی اور اخلاقی فکر دونوں کے لیے اہم بنیادی حیثیت رکھتا ہے جو مختصراً یہ ہے:

نفس ایک بسیط روحانی جوہر ہے۔ اس کی حقیقت ربانی ہے۔ خدا سے اس کا صدور اس طرح ہُوا ہے، جس طرح کہ سورج سے روشنی نکلتی ہے[2] نفس مادی جسم سے نہ صرف کلیۃً مختلف ہے بلکہ متضاد بھی ہے۔ اس کی ایک نمایاں وجہ یہ ہے کہ نفس جسم کی خواہشات پر پابندی اور قیود عائد کرتا ہے[3]۔ اس تاریک دنیا میں نفس جب جسم سے متصل ہوتا ہے تو جسم کی ضروریات اور خواہشات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اس تاثر کے نتیجہ میں عقل کے علاوہ شہوت اور غضب کی قوتیں پیدا ہوتی ہیں۔ عقل، شہوت اور غضب کو بادشاہ، خنزیر اور کتے سے بالترتیب تشبیہہ دی جاسکتی ہے[4]۔ انسان فضیلت کی تحصیل اس وقت کرتا ہے جب کہ عقل کی حکمرانی بقیہ دونوں قوتوں پر مکمل ہوتی ہے۔

---

[1] ابو علی محمد بن نظام الدین انصاری ؛ فواتح الرحموت بر حاشیہ المستصفیٰ (۲۵ - ۲۶) ابوعذبہ : الروضۃ البہیۃ (۳۴ - ۳۹) حیدر آباد

[2] رسائل الکندی الفلسفیہ (۱۹۵۰) (۱: ۲۷۴) شائع کردہ ابوریدہ مطبعۃ الاعتماد، مصر

[3] ایضاً : ۲۷۳   [4] ایضاً : ۲۷۴

انسان کا آخری کمال تفکر میں ہے، جس کا موضوع اعلیٰ خدا کی ذات ہے۔ خدا کا حقیقی علم صرف اس نفس کو حاصل ہوسکتا ہے، جو آلائشوں سے پاک ہو[1] اخلاقی فلسفیانہ کمال کے لیے ناگزیر شرط اور ذریعہ ہے۔ کمال کا انتہائی درجہ اس وقت حاصل ہوگا جب کہ رُوح جسم سے الگ ہو کر عالمِ روحانی میں داخل ہوجائے گی، جہاں اسے خدا کا دیدار ہوگا[2] یہ کمال انسانی کی معراج ہے۔ یہاں پہنچ کر انسان پر سارے حقایق اس طرح منکشف ہوں گے، جیسے کہ وُہ علم الٰہی میں ہیں[3] حقایق روحانیہ کا یہ انکشاف انتہائی مسرت انگیز ہوگا[4]

"دفع الاحزان" میں کندی نے حزن وغم کے اصل سبب کی نشان دہی کی ہے۔ انسان کو رنج والم اس لیے ہوتا ہے کہ وہ مادی چیزوں سے محبت کرتا ہے اور ان کے حصول میں پریشان رہتا ہے۔ لیکن مادی چیزیں فاسد ہونے والی ہیں۔ ان کے بجائے اگر انسان ہمیشہ رہنے والی روحانی چیزوں کی خواہش کرے اور انھیں محبوب رکھے، تو وہ کبھی حزن ویاس سے دوچار نہیں ہوگا[5] روحانی حقایق کے حصول ہی میں انسان کی حقیقی سعادت ہے۔ موت کا خیال بھی اکثر آدمیوں کے لیے پریشانی اور غم کا باعث ہوتا ہے۔ اس کی وجہ موت کی حقیقت سے ناواقفیت ہے۔ اگر انسان یہ جان لے کہ موت سعادت ابدی کے لیے فتح باب کا حکم رکھتی ہے، تو انسان اس کے خیال سے رنجیدہ اور غمگین نہ ہوگا[6]

فارابی (م ۳۳۹ھ) کی دلچسپی کے اہم ترین موضوعات منطق، مابعد الطبعیات اور سیاسیات تھے۔ فارابی نے ارسطو کی NICOMACHEAN ETHICS شرح لکھی تھی۔ مگر اخلاق کے موضوع پر اس کی کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے۔ اس کے اخلاقی نظریات اس کی سیاسی کتابوں سے مستخرج کیے جاسکتے ہیں، جن میں "آراء اہل المدینۃ الفاضلۃ"، "السیاسۃ المدنیۃ"، "تحصیل السعادۃ" اہم ہیں۔ اس کی "التنبیہ علیٰ سبیل السعادۃ" بھی اس سلسلے میں اہمیت رکھتی ہے۔ اگرچہ "تحصیل السعادۃ" اور "التنبیہ علیٰ سبیل السعادۃ" دونوں کا موضوع سعادت کی تحصیل ہے، لیکن دونوں میں ایک فرق نمایاں ہے۔ "تحصیل" میں ریاست اور معاشرہ کی سعادت زیر بحث ہے۔ "التنبیہ" میں فرد کی سعادت پیش نظر ہے۔

کندی کا نظریہ رُوح یکسر نوفلاطونی ہے۔ فارابی، نوفلاطونی اور مشائی نظریات کو ملانے کی کوشش کرتا ہے۔ فارابی اس مشائی نظریہ سے ابتدا کرتا ہے کہ جسم اور نفس میں مادہ اور صورت کا تعلق ہے[7] پھر وہ نفس اور عقل کے تعلق کو بھی مادہ اور صورت کا تعلق قرار دیتا ہے۔ نفس رُوح کی تکمیل ہے اور عقل نفس کا کمال۔ مگر یہاں ایک فرق ملحوظ رہنا چاہیے۔ نفس جسم کی ترقی سے وجود میں آتا ہے مگر عقل، عقل فعال سے صادر ہوکر نفس سے متصل ہوتی ہے[8] بعد کی کتابوں میں فارابی نفس کو مادہ سے الگ ایک روحانی جوہر قرار دیتا ہے[9] مگر اس نظریہ میں نفس کو

---

[1] رسائل الکندی الفلسفیہ (۱۹۵۰) (۱: ۲۷۳) شائع کردہ ابوریدہ مطبعۃ الاعتماد، مصر، ص ۲۷۶، ۲۷۸

[2] ایضاً: ۲۷۴، ۲۷۶ [3] ایضاً: ۲۷۵، ۲۷۶ [4] ایضاً: ۲۷۷

[5] ایضاً: ۲۱ [6] ایضاً: ۲۲-۲۳

[7] آراء اہل المدینۃ الفاضلۃ، ص ۲۵، ۲۸، ۳۹

[8] السیاسیات المدنیۃ، ص ۳۴، حیدر آباد

[9] اثبات المفارقات، ص ۷، حیدر آباد، التعلیقات، ص ۱۲ حیدر آباد

عقل سے ممتاز کرنا دشوار ہے۔ بہر حال نفس اور جسم کا جو بھی تعلق ہو، انفساخ ہے کہ موت کے بعد جو نفس کے عمل کے انقطاع سے عبارت ہے۔ عقل جہاں سے آئی تھی، وہاں لوٹ جاتی ہے، موت کے بعد عقل کا فعل کس طرح باقی رہتا ہے۔ یہ بات واضح نہیں ہوتی مگر یہ کہ ایسا ہوتا ہے اور عقل فعال میں ضم نہیں ہو جاتی۔ فارابی کے فکر میں اس مسئلہ پر کوئی ابہام نہیں ہے۔

کندی اور فارابی میں ایک اور فرق ہے۔ کندی افلاطون کی پیروی میں روح کی تین قوتیں بتاتا ہے، شہویہ، غضبیہ اور ناطقہ۔ لیکن فارابی ارسطو کی اتباع کرتا ہے۔ فارابی نے مختلف کتابوں میں نفس کی جو قوتیں گنائی ہیں، ان میں کسی قدر اختلاف ہے۔ عام طور پر پانچ قوتیں بیان کی ہیں: غذائیہ، حاسہ، متخیلہ، ناطقہ اور نزوعیہ[۱] نزوعیہ ہر خیر و شر کا ارادہ کرتی ہے، خواہ اس فعل کا تعلق حس سے ہو یا تخیل سے یا عقل سے[۲] ان ساری قوتوں میں وہی تعلق ہے جو مادہ اور صورت میں ہوتا ہے، غذائیہ اولین مادہ ہے اور عقل آخری صورت۔ مگر نزوعیہ دوسری قوتوں کے اندر اس طرح جاری و ساری ہے، جیسے گرمی آگ میں[۳] نفس کی قوتوں میں درجہ بندی ہے۔ عقل ان میں سب سے بلند اور سب کی حاکم ہے اور وہی ساری قوتوں کی علت غائی ہے۔ وہی ان کی وہ انتہائی صورت ہے جس میں ان کی تکمیل ہوتی ہے اور عقل ہی وہ مقصود ہے، جس کے لیے انسان پیدا کیا گیا ہے[۴] انسان کا خیر اعلیٰ یا سعادت قصویٰ عقل ہی کی تکمیل میں ہے۔

عقل دو طرح کی ہوتی ہے، ایک نظری اور دوسری عملی۔ عقل نظری کی تکمیل موجودات کے علم سے ہوتی ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ عقل کی تکمیل کے لیے سارے علوم صحیحہ کا اکتساب لازمی ہے۔ علم کی غایت خدا کی معرفت ہے[۵] یعنی یہ کہ وہ واحد، غیر متحرک اور ساری چیزوں کی علت ازلی ہے۔ سارا نظام کائنات اس کی رحمت، حکمت اور عدل سے قایم ہے[۶] مابعد الطبعیات اور دینیات (THEOLOGY) منتہائے علم ہیں۔ عقل عملی کی تکمیل صائب اور غیر صائب میں تمیز، فضائل کی تحصیل، حسن و قبح کے علم و اختیار اور تعمیر و تخلیق سے ہوتی ہے۔ مگر عقل عملی کی تکمیل فی نفسہٖ مطلوب نہیں ہے۔ عقل عملی، عقل نظری کی خادم اور علم حقیقی کی تحصیل کا ذریعہ ہے[۷]

فارابی لکھتا ہے، حقیقی سعادت، نفس کی وہ حالت ہے، جس میں وہ ہر طرح کے مادی علایق سے پاک ہو کر ان روحانی جواہر کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ جو مادہ کے ادنیٰ شائبہ سے بھی بلند ہوتے ہیں[۸] خدا جو صورۃ الصور ہے فلسفہ کا آخری موضوع ہے۔ اعمال میں خدا کی مشابہت اختیار کرنا فلسفہ کی منزل ہے۔ تشبہ باللہ ہی انسان کا آخری کمال اور حقیقی سعادت ہے[۹]

اس مقصد تک پہنچنے کے لیے نفس کا تزکیہ اور فضائل کا اکتساب ضروری ہے۔ فضیلت عقل کی رہنمائی میں نفس کی قوتوں کے صحیح تعامل سے عبارت ہے۔ فارابی نے قوی نفس کے صحیح تعامل کا قیاس جسمانی صحت پر کیا ہے۔ جسم اسی وقت صحت مند ہوتا ہے، جب

---

۱ المدینۃ الفاضلہ، ۴۸ - ۴۹ مطبعۃ النیل، مصر — ۲ ایضاً: ص ۵۰
۳ ایضاً: ص ۵۲ — ۴ تحصیل السعادۃ ص ۳۲، حیدرآباد: المدینۃ الفاضلہ: ص ۶۷
۵ رسالہ فی ماینبغی ان یقدم قبل تعلم الفلسفہ، ص ۵۳ (یہ رسالہ الثمرات المرضیہ فی لبعض الرسالات الفارابیہ، لائڈن، ۱۸۹۰ء میں شامل ہے)
۶ المدینۃ الفاضلہ: ۱۰ - ۱۷ — ۷ ایضاً: ص ۶۷
۸ ایضاً: ص ۶۶ — ۹ رسالہ فی ماینبغی ان یقدم قبل تعلم الفلسفہ: ص ۵۳

اس کے اعضاء کا تعامل صحیح ہوتا ہے۔ اسی طرح نفس اسی وقت صحت مند ہوتا ہے، جب اس کی قوتیں صحیح طریقے پر ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرتی ہیں[۱] اعتدال اور توسط فضیلت کا لازمی جز ہے۔ کسب فضیلت کے لیے انسان کو اپنے اعمال میں درمیانی راہ اختیار کرنی چاہیے۔ مگر توسط کا جو تصور فارابی نے پیش کیا، وہ ریاضیاتی نہیں ہے بلکہ زمان و مکان، حالات و ظروف اور فرد و معاشرہ کی ضروریات کے لحاظ سے اضافی ہے[۲]

فضائل کی تفصیلی بحث میں فارابی نے ارسطو کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ وہ افلاطون کی طرح فضائل کو نفس کے قوی ثلاثہ سے مستنبط نہیں کرتا بلکہ ہر فضیلت کو علیحدہ لیتا ہے اور اس کا نفسیاتی اور اخلاقی تجزیہ کرتا ہے[۳]

تزکیہ نفس اور کسب فضائل کے بعد فارابی انسان کو عقل فطری کی تکمیل کی طرف متوجہ کرتا ہے اس کے لیے وہ سب سے پہلے علم البرہان کی تحصیل ضروری قرار دیتا ہے تاکہ انسان استدلال کی غلطیوں اور بھول بھلیوں سے محفوظ رہ سکے۔ علم البرہان کے دو حصے ہیں: ایک ریاضی اور دوسرا منطق۔ انسان کو ریاضی سے ابتدا کرنی چاہیے، پھر منطق سیکھنی چاہیے۔ اس کے بعد مختلف علوم کی تحصیل کرنی چاہیے اور آخر میں دینیات کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے، جو تاج العلوم ہے[۴]

فارابی کا یہ پختہ یقین ہے کہ سعادت تنہا حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے ایسا معاشرہ اور ریاست ناگزیر ہے، جس کے افراد کے درمیان تعاون ہو[۵] فارابی کی مثالی ریاست وہ ریاست ہے جس کے شہری ان ذرائع اور وسائل کی تحصیل میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں، جن سے سعادت حاصل ہوتی ہے[۶] تعاون بین الناس کا نظریہ فارابی کے خیال میں دو بنیادوں پر قائم ہے؛ ایک بقائے حیات کی ضروریات کی فراہمی، دوسرے افراد کی صلاحیتوں میں بے حد تفاوت۔ انسانوں کی کثیر جماعت اس لائق نہیں ہوتی کہ حقیقی سعادت کو پہچان سکے، کجا کہ تن تنہا اسے حاصل کرلے[۷] حقیقت یہ ہے کہ ریاست کا وہ طبقہ جسے ذی عقل کہا جاتا ہے، وہ بھی مل کر اس لائق نہیں ہوتا کہ عوام کی صحیح رہنمائی کرسکے۔ اس کام کے لیے تو ایک عظیم ہوشمند اور ذی علم حاکم کی ضرورت ہے[۸] کوئی پیغمبر، فلسفی یا امام ہی اس کارِ عظیم کو انجام دے سکتا ہے۔ ان کے علاوہ کوئی اور رئیس اول ہونے کا مدعی نہیں ہو سکتا۔ اگر رئیس اول موجود نہ ہو تو پھر اس کے قانون اور سنت کی اتباع کرنی چاہیے۔ فارابی نے جس حکومت کا تصور پیش کیا ہے، وہ دینی جماعت بھی ہے۔

اس کا رئیس اول بیک وقت دینی پیشوا اور دنیاوی بادشاہ ہوتا ہے۔ ریاست شہریوں کی دنیاوی حالت ہی متعین نہیں کرتی؛ ان کی آخرت کا فیصلہ بھی کرتی ہے[۹]

---

۱ التنبیہ علی سبیل السعادۃ: ص ۱، حیدر آباد ۔ ۲ ایضاً: ص ۱۰ - ۱۱ ۔ ۳ ایضاً: ص ۱۱ - ۱۲

۴ رسالہ ما ینبغی ان یقدم قبل تعلم الفلسفہ: ص ۵۲ - ۵۳؛ فصول المدنی: ص ۴۷، انگریزی ترجمہ کے ساتھ شائع کردہ D.M. DUNLOP کیمبرج، ۱۹۶۱ء ۔ ۵ تحصیل السعادۃ: ص ۱۰۵، ۱۴ ۔ ۶ المدینۃ الفاضلہ: ص ۸۷

۷ ایضاً: ص ۷۷، السیاسات المدینہ: ص ۴۷، ۴۸ ۔ ۸ السیاسات المدینہ: ص ۴۸ - ۴۹

۹ ROSENTHAL, THE POLITICAL THOUGHT IN MEDIEVAL ISLAM, P. 131.

اخوان الصفاء بظاہر اخوان الصفاء کے پیش نظر شریعت کی تطہیر تھی۔ ان کے خیال میں شریعت حقہ میں جاہلی توہمات داخل ہو گئے تھے۔ ان مفسدات سے شریعت کو پاک کرنے کے لیے وہ فلسفہ یونانی کی روشنی میں شریعت کی تعبیر پیش کرنا چاہتے تھے۔ اسی شریعت اور یونانی فلسفہ کے امتزاج ہی میں وہ کمال کا امکان دیکھتے تھے[۱] مگر ان کے رسالوں کے گہرے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، ان کا یہ اظہار و اعلان ان کے دوسرے پنہاں مقاصد کے لیے نقاب تھا۔ وہ نہ کسی مذہب پر ایمان رکھتے تھے اور نہ ہی کسی نظام فکر میں یقین۔ ہر فکر اور ہر مذہب سے کچھ تصورات و خیالات منتخب کر کے انھوں نے اپنا ایک نیا نظام فکر و عمل تیار کر لیا تھا، جس کے اجزا میں توافق کا ہونا لازمی نہ تھا[۲]

مختلف اطراف سے خوشہ چینی اخوان الصفا کے اخلاقی فکر میں بھی نظر آتی ہے۔ ان کے خیال میں اخلاق دو طرح کے ہوتے ہیں: برے اور بھلے۔ دونوں طرح کے اخلاق میں انسانوں کے اندر شدید تفاوت پایا جاتا ہے۔ اس تفاوت کی وجہ ان کے نزدیک جسمانی حالات، آب و ہوا، مقام رہائش اور تعلیم و تربیت کا اختلاف ہے۔ لیکن تفاوت اخلاق کا سب سے زیادہ موثر سبب ستاروں کا عمل ہے اور سارے دوسرے عوامل ستاروں کے عمل پر منحصر اور ان کے تابع ہیں[۳]۔ ستاروں کی تاثیر کا عنصر اخوان الصفاء کا اضافہ ہے اور غالباً ایرانی ماحول اور روایات کی وجہ سے ہے۔

خلق طبعی بھی ہوتا ہے اور کسبی بھی۔ اکثریت طبعاً بری ہوتی ہے، جس کی اصلاح کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں، ایک قلیل تعداد طبعاً بھلی ہوتی ہے۔ مگر یہ نظریہ اخوان الصفاء کے اس نظریہ سے متضارب ہوتا ہے، کہ سارے انسان فی الحقیقت بھلے ہوتے ہیں[۴]

خلق کو اخوان نفس کی ایک مستقل کیفیت بتاتے ہیں اور اس کی پانچ قسمیں کرتے ہیں: نفس نباتیہ شہوانیہ، نفس حیوانیہ غضبیہ، نفس انسانیہ ناطقہ، نفس عاقلہ حکمیہ، نفس ناموسیہ ملکیہ[۵]۔ نفس کی یہ تقسیم مشائی اور فلاطونی نظریات کے امتزاج سے عمل میں آئی ہے۔ مگر آخر کے دونوں نفوس کا اضافہ اخوان کا اپنا ہے اور یہ اُن کے اس نظریہ سے ماخوذ ہے کہ انسان عالم اصغر ہے۔ اس لیے اس میں عالم (انسان اکبر) کی ساری قوتیں چھوٹے پیمانہ پر موجود ہوتی ہیں[۶]۔ ان نفوس میں درجہ بندی ہے، جس کے اعتبار سے عقل عام کو جسمانی قوتوں پر فوقیت حاصل ہے اور فلسفیانہ عقل کو عقل عامہ پر اور سب کے اوپر ناموس کی حکمرانی ہے۔ نفس کی ہر قوت اس وقت تک صحیح کام کرتی رہتی ہے، جب تک کہ وہ اوپر کی قوت کی اطاعت کرتی ہے۔ بظاہر اس سکیم سے اشاعرہ کے اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے کہ خیر و شر شرعی ہیں۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ اخوان الصفاء کا خیال تھا کہ اگرچہ ہر شخص اس لائق نہیں ہوتا کہ خیر و شر میں تمیز کر سکے لیکن چند لوگ ایسے ضرور

۱۔ DE BOER, HISTORY OF PHILOSOPHY IN ISLAM, ENG. TR. P. 123.

۲۔ احمد امین، ظہر الاسلام (۲: ۱۵۱) ۳۔ رسائل اخوان الصفا: (۱: ۳۹-۴۰) بمبئی ۱۹۰۵ء

۴۔ عمر فروخ: اخوان الصفاء، ص ۱۲۴، بیروت ۱۹۵۳ء ۵۔ رسائل ۴۸-۴۹ بمبئی

۶۔ ایضاً: ص ۲، رسالہ (۱۲: ۳): رسالہ ۳

ہوتے ہیں، جنھیں خیر و شر اور فرائض و واجبات کا صحیح ادراک ہوتا ہے[1]

خیر اعلیٰ یا سعادت حقیقی فضیلت سے عبارت ہے اور فضیلت قوی نفس کے صحیح تعامل کے مرادف ہے، جس کے لیے اعتدال اور توسط لازمی شرط ہے۔ سعادت درحقیقت اللہ کا کرم ہے اور اس کے فیضان نور کا مرہون منت ہے، جو نو فلاطونی حقایق ابدیہ، عقل کل اور نفس عالم کے ذریعہ سے انسان تک پہنچتا ہے[2] افراد کے نفوس نفس عالم کے اجزاء ہیں اور نفس عالم کی طرح مادی جسم میں رہتے ہیں، جو حقیقت میں شر ہے۔ رُوح جب جسم میں داخل ہوتی ہے، تو سکون و چین کو خیر باد کہہ دیتی ہے[3] مگر جسم میں نفس کے داخل ہونے کی غایت یہ ہے کہ نفس اس مسکن میں رہ کر سعادت ابدی کی تیاری کرے۔ جسم نفس کی تربیت گاہ ہے۔ جس طرح کہ مادی عالم نفس عالم کا مکتب ہے[4] نفس کو جسم میں اس لیے رکھا جاتا ہے کہ وُہ اپنی کوشش سے اپنی پنہاں قوتوں کو عمل میں لائے اور علم و فن، خلق و فضیلت کی جو صلاحیتیں اس میں بالقوہ موجود ہیں، انہیں بالفعل کرے[5] نفس کی تکمیل اخلاقی فضائل اور صحیح عقاید کی تحصیل حق و صداقت کے علم اور حکومت اور ریاست کے فہم سے ہوتی ہے[6]

اخوان الصفا نے جس مثالی انسان کا تصور پیش کیا ہے، وُہ ان کے الفاظ میں اپنی نسبت میں ایرانی، دین میں عربی، مذہب میں حنفی، آداب و اطوار میں عراقی، ذکاوت میں عبرانی، رہایش میں عیسائی، زہد میں شامی، علم میں یونانی، بصیرت میں ہندوستانی، سیرت میں صوفی، اخلاق میں فرشتہ اور فکر و خیال میں ربانی ہے[7] وہ سقراط کے علم، مسیح کے زہد و تصوّف اور مسلمانوں کی دینی عقیدت کا جامع ہے[8] مگر دین سے عقیدت کا مفہوم اخوان کے نزدیک یہ نہیں ہے کہ اس کے قوانین و شرائع کی پابندی کی جائے بلکہ یہ ہے کہ اس کے مغز و جوہر کو حاصل کیا جائے، جو ان کے خیال میں مخلصانہ دوستی، اخلاق حسنہ، تحصیل علوم، تزکیۂ نفس اور حقایق روحانیہ کے عرفان سے عبارت ہے[9] عبادت کے طریقے اور مراسم مقصود بالذات نہیں ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ ظواہر باطنی حقایق کے اشارات ہیں۔ آخرت کی نجات کا انحصار عبادت اور کسبِ فضائل پر نہیں ہے بلکہ علم و صداقت کے حصول پر ہے[10] اخوان الصفا اپنے قریبی کارکنوں کو جس ضابطے کی پابندی کا حکم دیتے ہیں۔ اس میں دینی فرائض کا کوئی مقام نہیں ہے، انھیں فی الحقیقت مذہب سے یک گونہ نفرت ہے۔ مذہب پر فلسفہ کو ترجیح دینا ان کا طے شدہ مسلک ہے[11] المقدسی کا قول ہے: "شریعت بیماروں کے لیے دوا ہے اور فلسفہ صحت مندوں کے لیے قوت ہے۔"[12]

---

[1] عمر فروخ: اخوان الصفاء، ص ۱۳۷

[2] ایضاً: ص ۱۳۹

[3] رسائل (۲: ۳۴۲)

[4] ایضاً: (۲: ۳۴۳)

[5] ایضاً ۲: ۳۴۶

[6] ایضاً ۲: ۳۴۶

[7] عمر فروخ: اخوان الصفاء، ص ۳۷

[8] رسائل ۲: ۳۱۵

[9] عمر فروخ: اخوان الصفاء، ص ۲۰

[10] ایضاً ۲۰

[11] ایضاً ۲۷

[12] احمد امین: ظہر الاسلام ۲: ۱۵۵

انسان کی اعلیٰ ترین زندگی وُہ ہے، جو ہر طرح کے مادی علایق سے پاک ہو۔ مگر دوسری دنیا سے پہلے اس پاک زندگی کا کوئی امکان نہیں۔ موت کے بعد فلسفی کی زندگی کامل ہوتی ہے۔ اس زندگی میں فلسفی کو پاک روحوں کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ اس عالمِ روحانی میں وُہ خدا اور عقل کے تفکر میں غرق ہو جاتا ہے اور سعادتِ عظمیٰ سے سرفراز ہوتا ہے۔[1] اخوان حشر و نشر اور جنت و دوزخ کے بارے میں معروف عقیدہ کو جہالت قرار دیتے ہیں۔[2]

اخوان کے سامنے ایک روحانی معاشرہ کی تشکیل کا نصب العین تھا، جسے وہ اخلاص و محبت اور کامل تعاون و ہمدردی کے اصولوں پر قایم کرنا چاہتے تھے۔ وہ اس معاشرے کے ضوابط کو عام نہیں کرتے تھے۔ ان کا علم صرف قریبی کارکنوں کو ہوتا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ جب ہم مخلصانہ اخوت کے تصور پر اتفاق کر چکے تو ہمیں اپنی ساری قوتوں اور صلاحیتوں کو اپنے نصب العین کے لیے لگا دینا چاہیے اور متحد اور یک جان ہو کر اپنے مثالی روحانی معاشرہ کی تشکیل کرنی چاہیے۔[3]

تصوّف کا اخلاقی آیڈیل

چوتھی صدی ہجری میں تصوّف اپنی تاریخ کے تیسرے مرحلے میں داخل ہو چکا تھا۔ یہ تیسرا مرحلہ تنظیم و تعمیر افکار کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ تیسری صدی میں تصوّف نے ایسے بلند افراد جنم دیے، جو جدتِ فکر اور قوتِ عمل میں ممتاز تھے۔ انھیں کے افکار و اعمال پر تصوّف کی بنیاد قایم ہے۔ مگر ان اکابر نے تصوّف کو منظم نہیں کیا۔ ان کے افکار کی تنظیم، ان کے نظریات کی تفصیل، ان کے اشارات کی توضیح اور ان کے اقوال کو اسلامی مآخذ سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش چوتھی صدی کے افراد نے انجام دی۔ اس اہم کام کے علاوہ چوتھی صدی کے صوفیہ نے اپنے شیوخ کی تعلیمات کو جمع کیا اور ان کے حالاتِ زندگی قلمبند کیے۔

۳۰۹ھ میں منصور بن حلّاج کو دار پر چڑھایا گیا۔ اس واقعے کے بعد تصوف کو قرآن و سنّت سے ہم آہنگ کرنے اور اس کی تعلیمات اور اسلامی عقاید میں توافق پیدا کرنے کی ضرورت شدید تر ہو گئی۔ صوفیہ نے یہ ثابت کرنے کے لیے کتابیں لکھیں کہ وہ اصولِ دین میں عام متکلمین اسلام کے نظریات سے سرِ مو تجاوز نہیں کرتے۔ مثلاً یہ کہ معتزلہ کے اس نظریہ کی انھوں نے اشاعرہ کی طرح تردید کی کہ اللہ تعالیٰ کے لیے بندوں کے بہتر سے بہتر مصالح پیشِ نظر رکھنا لازم ہے۔[4] اشاعرہ ہی کی طرح انھوں نے بھی اللہ تعالیٰ کے افعال کو ہر علت و غایت سے بلند رکھا۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ کے افعال لازماً انسانوں کی فلاح و بہبودی کے لیے ہوں، بلکہ فی الحقیقت اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں ہوتی۔ وُہ چاہے تو نیکوں کو سزا اور بُروں کو انعام دے سکتا ہے۔ اس کے افعال میں مقصد اور علت کی تلاش ہی سرے سے غلط ہے۔ اس نظریہ کی تائید میں صوفیہ نے اشاعرہ کی طرح قرآن مجید کی یہ آیات پیش کیں۔[5]

ولقد ذرأنا لجہنم کثیرا من الجن ۔۔۔ اور کتنے ہی جن اور انسان ہیں، جنھیں ہم نے

---

[1] رسائل ۲ : ۳۳۹ - ۳۴۰ [2] ایضاً ۳ : رسالہ ۷؛ ۲ : رسالہ ۱۶

[3] کمال الیازجی و انطون غطاس کرم : اعلام الفلسفۃ العربیہ ، ص ۳۸۳

[4] کلاباذی: کتاب التعرف لمذہب اہل التصوف ، ص ۳۵ انگریزی ترجمہ اے۔ جے۔ آربری، کیمبرج ، ۱۹۳۵ء

[5] ایضاً : ص ۳۵ - ۳۶

والانس - (۷ : ۱۷۹)

جہنم کے لیے پیدا کیا۔

لاملئن جھنم من الجنۃ والناس اجمعین - (۱۱ : ۱۱۹)

یں جہنم کو کیا جن اور کیا انسان سب سے بھر دوں گا۔

کلاباذی[1] (م ۳۸۰ھ) ان باتوں میں کوئی بات ایسی نہیں دیکھتے جسے ظلم کہا جائے۔ کیونکہ جور کسی ایسے فعل کے ارتکاب سے عبارت ہے جس کی ممانعت کی گئی ہو اور ظلم کے معنی اس راہِ راست سے انحراف کے ہیں، جسے اس ہستی نے تجویز کیا ہو، جو سب کے اوپر حکمران ہے اور سب جس کے محکوم ہیں۔ خدا نہ کسی ہستی کے زیرِ اثر ہے اور نہ کسی کا محکوم۔ اس لیے وُہ جو کچھ بھی کرے، اس کے لیے ظلم کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ وُہ جو فیصلہ کرتا ہے، وہی صحیح ہے اور جو وہ کرتا ہے وہی حسن ہے۔ بری وُہ شے ہے جسے اس نے برا بنایا اور بھلی وُہ ہے جسے اس نے بھلا بنایا[2]

حسن و قبح کا یہ صوفیانہ نظریہ مقبول عام کلامی نظریہ کے مطابق تھا۔ مگر کلاباذی نے حسن و قبح کی ایک اور تعریف نقل کی ہے، جو مذکورہ بالا عبارت کے فوراً بعد پیش کی گئی ہے اس تعریف سے صوفیہ کے اصل طرزِ فکر اور رجحان کا پتا چلتا ہے۔ مشہور صوفی محمد بن موسیٰ کے الفاظ ہیں:

" جو چیزیں حسن ہوتی ہیں وہ خدا کی تجلی کے اظہار سے حسن ہوتی ہیں اور جو چیزیں قبیح ہوتی ہیں، وہ خدا کی تجلی کے اخفا سے قبیح ہوتی ہیں یہ دونوں صفات ازلی اور ابدی ہیں۔"

کلاباذی اس عبارت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جو چیز تمہیں خدا سے دور اور اشیاء سے قریب کرے وہ قبیح ہے اور حسن و قبح کی یہ صفت اللہ تعالیٰ نے ازل ہی میں تخلیق کر دی تھی[3]۔ خدا سے قلبی تعلق اور اس کے اندر محویت اور فنائیت وہ آئیڈیل ہے جسے صوفیہ نے اپنے سامنے رکھا اور اسے خیرِ اعلیٰ اور سعادت سمجھا اور یہی ان کے لیے ہر چیز کی بھلائی اور برائی جانچنے کا معیار قرار پایا۔

اس دور کے صوفیہ نے جن کا مطالعہ ہمارے پیشِ نظر ہے۔ اپنے آئیڈیل کی باقاعدہ تشریح نہیں کی۔ ان کے آئیڈیل کے اہم نکات ذیل میں بیان کیے جاتے ہیں اور فلاسفہ کے آئیڈیل سے اس کا مقابلہ بھی کیا جاتا ہے۔

صوفیہ کے خیال میں انسان کی رُوح خدا کا فیضان ہے جیسا کہ کندی اور فارابی کے نوفلاطونی فلسفہ میں ہے۔ لیکن نوفلاطونی فلسفہ

---

[1] ابوبکر ابن ابی اسحاق محمد بن ابراہیم بن یعقوب کلاباذی۔ کلاباذ (بخارا) کے رہنے والے تھے۔ صوفیاء ان کی کتاب "التعرف لمذہب اہل التصوف" کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ سہروردی مقتول (م ۱۱۹۱ء) نے اس کتاب کے بارے میں کہا ہے: اگر یہ نہ ہوتی تو ہم تصوف کو نہ جان سکتے۔ جن صوفیہ نے اس پر شرحیں لکھی ہیں، ان میں عبداللہ بن محمد الانصاری الہروی (م ۱۰۰۸ء) علاء الدین علی بن اسمٰعیل القناوی (م ۱۳۲۹ء) اور اسمٰعیل بن محمد بن عبداللہ المستملی جیسے افراد ہیں۔

[2] التعرف لمذہب اہل التصوف، انگریزی ترجمہ آربری، ص ۳۶

[3] ایضاً: ص ۳۶

میں خدا اور روح انسانی کے درمیان جن تنزلات کا سلسلہ ہے، صوفیہ ان کی جگہ دوسرا سلسلہ پیش کرتے ہیں، جس کی وجہ سے خدا اور روح انسانی کا تعلق زیادہ قریبی اور گہرا ہوجاتا ہے۔ ارسطو نے عقل (NOUS) کو جو مقام دیا تھا، اس کی جگہ نو فلاطونی فلاسفہ نے وجدان کو فائز کیا، جس کے نتیجے میں عرفان کی بلند ترین صورت عقلی کے بجائے وجدانی قرار پائی۔ مسلم فلسفیوں میں کہیں عقل کو بلند کیا گیا ہے اور کہیں وجدان کو۔ متکلمین اسلام کے اس نظریہ کا حاصل کہ افعال خداوندی عقل معروف کے مطابق نہیں ہوتے، یہ تھا کہ خدا عقل کے ذریعہ جانا نہیں جا سکتا۔ ان ساری باتوں نے مل کر صوفیہ کے تصور وجدان و انکشاف کے لیے راہ ہموار کر دی۔ چنانچہ انہوں نے حتمی طور پر یہ بات رکھی کہ عقل روحانی اور الٰہی معاملات میں ناکافی بلکہ گمراہ کن ہے۔ "عقل مخلوقات کا طواف تو کر لیتی ہے، لیکن جب وہ خالق کا ارادہ کرتی ہے تو خود تحلیل ہو جاتی ہے"[1] کلامی نظریہ منفی تھا کیونکہ اس کا حاصل یہ تھا کہ افعال الٰہی کی کنہ و حقیقت عقل سے ماورا ہے۔ صوفیہ اس منفی مقام پر کب ٹھہر سکتے تھے۔ انہوں نے اثبات میں یہ کہا کہ خدا کے علم و عرفان کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ عشق و وجدان کا راستہ ہے۔ صوفیہ نے عشق پر زور دیا ہے۔ اس سے دینی زندگی میں نئی جان پڑ گئی۔ اتباع شریعت میں وہ جوش و گرمی آ گئی جس کی بے حد ضرورت تھی۔ یہی سوز عشق، یہی والہیت اور تفویض اور یہی سرگرمی اور بے تابی صوفی آئیڈیل کا وہ اہم عنصر ہے، جو اسے فلاسفہ کے ٹھنڈے عقلی آئیڈیل سے ممتاز کرتا ہے۔ فلاسفہ کی عقل اگرچہ ان قیدوں سے باہر نکل چکی تھی جنہیں ارسطو نے عقل پر عاید کر دی تھیں، لیکن جذب و شوق کی بلندیوں سے وہ ابھی تک ناآشنا تھی۔

صوفیہ نے خیر اعلیٰ یا سعادت کا جو تصور پیش کیا ہے، وہ فلاسفہ کے تصور سے بہت مختلف نہ تھا۔ پانچویں صدی میں غزالی نے اس کی جو تشریح کی، اس کے مطابق سعادت تکمیل نفس کا نام تھی۔[2] افلاطون کے نظریہ وظیفہ (FUNCTION) کو غزالی بنیاد بنا کر لکھتے ہیں کہ نفس کا کمال اس میں ہے کہ وہ معقولات کو سمجھے، حقایق روحانیہ میں تفکر کرے اور انہیں اپنے اندر ایسا جذب کرے کہ ان سے کامل ہم آہنگ ہو جائے۔[3] اس آئیڈیل کے حصول کے لیے علم و عمل دونوں ضروری ہیں۔ جہاں تک عمل کا تعلق ہے، غزالی کہتے ہیں کہ صوفیہ اور فلاسفہ متفق ہیں کہ عمل سے مقصد نفس کو صفات خبیثہ اور عادات رذیلہ سے پاک کرنا ہے۔[4] دوسرے الفاظ میں اخلاق کی غایت تزکیہ نفس ہے۔ غزالی مزید لکھتے ہیں کہ فلاسفہ اور صوفیہ دونوں علم کو انسان کی غایت قرار دیتے ہیں۔ اختلاف اگر ہے تو وہ علم کی نوعیت میں ہے۔[5]

صوفیہ کو علوم و فنون کی تحصیل سے دلچسپی نہیں ہے اور نہ ہی حقیقت کی عقلی جستجو سے کوئی تعلق۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ برائیوں کا ازالہ کیا جائے تعلقات کم رکھے جائیں اور ساری قوت خدا کی تجلی کی انتظار میں لگا دی جائے، جس کے ظہور سے سارے حقایق روشن ہو جاتے ہیں۔[6] غزالی لکھتے ہیں، صوفیہ کے علم کا حاصل نفس کی رکاوٹوں کو دور کرنا اور مذموم اخلاق اور بری صفات سے پاک کرنا ہے" تاکہ قلب غیر اللہ سے خالی

---

[1] التعرف لمذہب اہل التصوف، انگریزی ترجمہ آربری : ۴۷

[2] الغزالی : میزان العمل ص ۱۵، الطبعۃ المصریہ، ۱۳۴۲ھ

[3] ایضاً : ۱۵، ۳۲ "فقد عرفت ان سعادۃ النفس وکما لہا ان تنتقش بحقایق الامور الالٰہیۃ وتتحد بہا کانہا ھی"

[4] ایضاً : ۳۴، ۳۰-۳۲ "اعلم ان جانب العمل متفق علیہ وانہ مقصود لمحو صفات الردیہ وتطہیر النفوس من الاخلاق السیئۃ ولکن جانب العلم مختلف فیہ" [5] ایضاً : ۳۴ [6] ایضاً : ۳۴

ہوجائے اور اللہ کے ذکر سے لبریز ہوجائے۔[۱]

صوفیہ اپنے قلب کو آئینے کی طرح پاک اور روشن بنا کر حقایق روحانیہ کے انکشاف کے لیے ہمہ تن شوق و انتظار بنے رہتے ہیں جب خدا کا نور ظاہر ہوتا ہے، تو ان کے قلب کی آنکھیں روشن ہوجاتی ہیں اور حقایق و اسرار بے نقاب ہوجاتے ہیں۔ فلاسفہ کی علمی کاوش اور ادبی سرگرمی کے بجائے صوفیہ ترک دنیا، زہد و ورع اور ذکر الٰہی پر زور دیتے ہیں۔

اگرچہ عمل اور فضیلت کی غایت کے بارے میں صوفیہ اور فلاسفہ میں اتفاق تھا لیکن عمل کی تفصیلات میں ان دونوں گروہوں میں خاصا اختلاف تھا۔ فلاسفہ اجتماعی عمل میں یقین رکھتے تھے زندگی سے کنارہ کشی اور گوشہ گیری کا ان کے یہاں کوئی تصوّر نہیں تھا۔ ان کے خیال میں فضیلت کی تکمیل فرد کے تزکیہ تک محدود نہ تھی، بلکہ خاندان اور معاشرہ کی اصلاح و تعمیر بھی فضیلت کا لازمی جز تھی۔ فلاسفہ سعادت کو اجتماعی فعل قرار دیتے تھے، جس میں سب کا تعاون ضروری تھا۔ صوفیہ اس کے برعکس انفرادیت اور گوشہ نشینی کے علمبردار تھے۔ معاشرے کے مسائل میں دلچسپی اور اس کی اصلاح کی کوشش سے دُور رہتے تھے۔ ان کا خیر اعلیٰ انفرادی تھا اور اجتماعی زندگی سے علیحدگی کو وہ اپنے خیر اعلیٰ کے حصول کے لیے ضروری قرار دیتے تھے۔

فلاسفہ عقلی محاسن کو اخلاقی فضائل پر ترجیح دیتے تھے۔ صوفیہ کے نزدیک عقلی محاسن کی کوئی اہمیت نہ تھی، بلکہ انھیں علمی اور فلسفیانہ کاوشوں سے یک گونہ نفرت تھی۔ فلاسفہ کے نظام فضائل کی جگہ صوفیہ ایک دوسرا نظام فضائل رکھتے تھے، جن میں سے بیشتر اسلامی عقاید سے ماخوذ تھے۔ مثلاً اخلاص، یقین، خوف و رجاء، توکل اور محبّت وغیرہ[۲] یہ فضائل جن کی صوفیہ کے یہاں بڑی اہمیت تھی، فلاسفہ کے فکر و تخیل سے نہ صرف دُور تھے بلکہ ان سے بالکل مطابقت نہیں رکھتے تھے۔

تصوّف نے بہت سے عام اخلاقی فضائل کو نئی شکل دی۔ صوفی کی داخلی زندگی فلسفی کی داخلی زندگی سے بہت مختلف ہوتی تھی۔ صوفی کے نفسیاتی ماحول میں سب سے زیادہ مؤثر اور ہمہ وقت موجود ذات خدا کی ہوتی تھی۔ خدا کے حضور میں حاضر ہونے کا گہرا شعور اس کے سوچنے کے طریقوں، اس کی دلچسپیوں، اس کے نظام فضائل اور اس کے پسند و اختیار کے معیار کو بیحد متاثر کرتا تھا۔ یہاں صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ سید الطائفہ حضرت جنیدؒ حیا کی تعریف کرتے ہیں: حیا وہ جذبہ ہے جو دو احساسات سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک طرف یہ احساس کہ انسان پر خدا کے بے شمار احسانات ہیں اور دوسری طرف یہ احساس کہ انسان اللہ تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی سے قاصر ہے۔[۳]

---

[۱] المنقذ من الضلال ص ۲۸، المطبعۃ الامیریہ، قاہرہ، ۱۳۰۳ھ

[۲] اخلاص، یقین، خوف، محبّت، توکل وغیرہ کو فضائل کہا جاسکتا ہے۔ اوّلاً اس لیے کہ یہ نفس کے مستقل حالات ہیں اور ان سے ایک مخصوص طرزِ عمل کا ظہور ہوتا ہے۔ ثانیاً اس لیے کہ نفس کی یہ صفات کسبی ہوتی ہیں اور فضیلت کے لیے یہی دونوں باتیں شرط ہیں۔ عام اخلاقی فضائل سے ممتاز کرنے کے لیے انہیں دینی فضائل کہا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہ ان کا مرکز و محور خدا کی ذات ہے ان صفات کو فضائل کہنے سے صوفیہ کے اس تصوّر کی نفی یا مخالفت نہیں ہوتی کہ یہ مقامات و احوال ہیں۔

[۳] القشیری: الرسالہ فی التصوف ص ۱۰۹ (مصر ۱۹۵۹ء)

فضائل کے اکتساب کے باب میں فلاسفہ اور صوفیہ کا اختلاف اور زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔ صوفیہ کے تزکیہ نفس کی کوشش میں ذمہ داری کا گہرا احساس، رضائے الٰہی کی بےتاب جستجو، ارتکاب گناہ کا شدید خوف اور ذات الٰہی کی بےپناہ محبت وہ عناصر تھے، جو فلاسفہ کے کسب فضائل میں بالکل نہیں تھے۔ فلاسفہ کا ذات حق کا شعور بہت دھندلا ہوتا تھا اور صرف عقلی اور اک تک محدود رہتا تھا۔ وُہ جذبات کو متاثر نہیں کرتا۔ فلسفی فضیلت کو بالذات مقصود قرار دیتا تھا اور خدا کے گہرے شعور کے بغیر اس کا حصول ممکن سمجھتا تھا۔ مگر صوفی کے لیے فضائل بے انتہا اہمیت کے حامل تھے۔ چونکہ وہ عقلی محاسن اور علم و فن کی تحصیل کی کوششوں سے منہ موڑ کر نفس کے تزکیہ ہی کو اپنی سعادت کا واحد ذریعہ سمجھتا تھا، اس لیے فضائل اس کی زندگی میں بےحد اہمیت اختیار کر لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیانہ لٹریچر میں فضائل اور رذائل کی جو تفصیلی بحثیں اور دقیق تجزیے ملتے ہیں، فلسفیانہ اخلاق کی کتابوں میں ان کا عشر عشیر بھی نہیں ملتا۔ حارث بن اسد محاسبی کی "الرعایہ لحقوق اللہ"، ابوطالب مکی کی "قوت القلوب" اور پانچویں صدی میں غزالی کی "احیاء العلوم" اس حقیقت پر شاہد ہیں۔

اگرچہ تصوف کی بنیاد قرآن و سنت پر ہے لیکن تفصیلات میں تصوّف کا آئیڈیل قرآن و سنت کے آئیڈیل سے کسی قدر مختلف ہے۔ دونوں کے تقابلی مطالعے سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ تصوف کے آئیڈیل میں اسلامی آئیڈیل کے بعض پہلو دب گئے ہیں اور بعض زیادہ اُبھر آئے ہیں۔ بعض رجحانات کو تیز اور شدید اور بعض کو کمزور اور کم کر دیا گیا ہے۔ بعض تصورات نے نئے معنی اختیار کر لیے ہیں اور بعض کے مفہوم میں جزوی تبدیلی ہوگئی ہے اور بعض پہلوؤں کو تصوّف نے بالکل نظرانداز کر دیا ہے اور بعض نئے اجزا شامل کر لیے ہیں۔ اس مقالہ میں اتنی گنجائش نہیں کہ ان اشاروں کی وضاحت کی جائے، لیکن انہیں ذہن سے قریب کرنے کے لیے بعض مثالیں دی جاتی ہیں۔

ابتدائے اسلام میں عمل کا دائرہ بہت وسیع تھا مگر تصوّف میں تنگ ہوگیا۔ مثال کے طور پر اجتماعی مسائل صوفی کی دلچسپی کے دائرے سے خارج ہو گئے۔ اسلام کے ابتدائی آئیڈیل میں فکر، جذبہ اور عمل کے درمیان ایک توازن تھا۔ لیکن صوفیہ نے جذبات و کیفیات پر اس قدر زور دیا کہ عمل اور بالخصوص فکر کی اہمیت کم ہوگئی۔ خدا کی محبت مذہب کی رُوح رہی ہے۔ لیکن ابتدائے اسلام میں محبت کو عمل سے الگ کسی جذبہ کی پرورش نہیں سمجھا گیا، بلکہ اس کی حیثیت اس روح کی تھی، جو ان سارے اعمال حسنہ میں یکساں جاری و ساری تھی، جو انسان کو زمین میں خدا کے خلیفہ ہونے کی حیثیت سے انجام دینے تھے۔ صوفیہ کے آئیڈیل میں عمل کا دائرہ نہ صرف تنگ ہوگیا، بلکہ محبت کا عمل سے تعلق بھی کمزور ہوگیا۔ چنانچہ جذبہ محبت کی تحریک اور تقویت کے لیے صوفیہ نے مختلف طریقے (مثلاً سماع) اختیار کیے، جن سے وہ اعمال سرزد نہیں ہوتے تھے، جن کے ساتھ ابتدائے اسلام میں محبت کا جذبہ وابستہ تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رہبانیت کے رجحان کو روکا اور کم کیا لیکن تصوّف نے اس رجحان کو تقویت دی۔ اکابر صوفیہ میں جسم کی لذتوں اور اجتماعی تعلقات کے بارے میں ایک شدید منفی رجحان پایا جاتا ہے، جو ابتدا میں نہیں تھا۔ قرآن و سنت میں ذکر الٰہی کو تزکیہ نفس میں ایک خاص مقام حاصل تھا مگر ذکر الٰہی کے ساتھ دوسرے طریقے اور ذرائع بھی تھے۔ مثال کے طور پر جہاد[1]۔ مگر صوفیہ نے

---

[1] تزکیہ نفس اور صبر و توکل، تسلیم و رضا جیسے عظیم فضائل کے اکتساب اور دنیا کی محبت کم کرنے کے سلسلے میں جہاد کو جو اہمیت حاصل ہے، وُہ ظاہر ہے۔ قرآن مجید میں مختلف مواقع پر جہاد کے اس وظیفے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً: ۳: ۱۴۰-۱۴۱ اور ۳۳: ۲۲ وغیرہ۔

ساری قوت ذکر الٰہی میں صرف کر دی اور اسی کو تزکیہ کا واحد موثر ذریعہ قرار دیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ذکر کے آداب اور طریقوں میں نئی نئی اختراعات ہوئیں۔

صوفیانہ تصورِ مجاہدۂ نفس کی خواہشات کے خلاف جنگ سے عبارت تھا۔ خدا کے دشمنوں کے خلاف جنگ سے اس مجاہدہ کو کوئی واسطہ نہ تھا۔ چنانچہ جنگوں میں استقامت اور پامردی کا وہ عنصر جو قرآن کے تصورِ صبر[1] میں نمایاں ہے، صوفیہ کے صبر میں تقریباً ناپید ہے۔ یہی حال توکل[2] اور دوسرے دینی فضائل کا ہے۔

زندگی کے آئیڈیل میں یہ تبدیلی جو تصوف نے پیدا کی، اس کا جواز کیا ہے؛ یہ ایک ایسا سوال ہے، جس کا تعلق اس جائزہ سے نہیں ہے جو ہمارے پیشِ نظر ہے مگر یہ مسئلہ جس قدر اہم ہے، اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ حلاج کی سُولی کے بعد اس مسئلہ کی اہمیت اور بڑھ گئی۔ صوفیہ نے اس سلسلہ میں جو کوشش کی اور اپنے موقف کی وضاحت اور مدافعت میں جو کارنامے انجام دیئے ان کی اسلامی فکر کی تاریخ میں بڑی اہمیت ہے۔ ہم اس کوشش کے ایک پہلو کی طرف نشان دہی کرنا چاہتے ہیں، جو مذکورہ بالا مشاہدات کی تائید کرتا ہے۔

صوفیہ نے اپنے عمل کے جواز میں انتخاب و اختیار کا طریقہ اپنایا۔ مثلاً رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اصحاب میں ان بزرگوں کو انہوں نے اپنا آئیڈیل بنایا، جو ان کی زندگی سے زیادہ قریب تھے، جیسے اصحابِ صُفّہ اور دُوسرے اصحاب کی زندگی کے ان گوشوں کو نمایاں کیا اور پیشِ نظر رکھا، جو ان کے رجحانات کی تائید کرتے تھے۔ حضرت جنید سے پُوچھا گیا کہ تصوف کیا ہے؟ فرمایا: تصوف کی بنیاد آٹھ چیزوں پر ہے، جو آٹھ پیغمبروں کی زندگی میں نمایاں ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کی سخاوت، حضرت اسمٰعیلؑ کی رضا و تسلیم، حضرت یعقوبؑ کا صبر، حضرت زکریاؑ کی اشارت، حضرت یحییٰؑ کی اجنبیت، حضرت عیسیٰؑ کی مسافرت، حضرت موسیٰؑ کی صوف پوشی اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فقر[3]۔

کلاباذی صوفیہ کا پیشوا اور امام اصحابِ صفہ کو قرار دیتے ہیں[4] اور علی ہجویری بھی "کشف المحجوب" میں اس کی تائید کرتے ہیں۔ وُہ خلفاء اربعہ کی زندگی کے اس پہلو کو پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، جو ان کے زہد، ایثار، سخاوت اور ریاضت سے متعلق ہے[5] لیکن ان اکابر کے ان مجاہدانہ کارناموں کو بھول جاتے ہیں، جو انھوں نے معاشرہ کی تعمیر، ریاست کی تشکیل، حدود والٰہی کے نفاذ اور دشمنانِ خدا کے خلاف جنگ وغیرہ معاملات میں انجام دیئے۔

---

[1] قرآن مجید کے تصورِ صبر کے ان عناصر کے لیے ملاحظہ ہو: ۸ : ۴۶، ۶۶؛ ۱۳ : ۲۴؛ ۲۲ : ۱۴؛ ۱۶ : ۱۲؛ ۱۶ : ۴۲؛ ۱۱۰ : ۱۲۶؛ ۳۱ : ۴۷؛ ۳۰ : ۶۰؛ ۳۱ : ۱۷ وغیرہ۔

[2] خطرات اور آزمائشوں اور خوفناک جنگوں میں توکل کرنے کی طرف قرآن مجید کی مختلف آیتوں میں ذکر ہے مثلاً ۸ : ۲، ۴۹، ۶۱-۶۲؛ ۹ : ۵۱؛ ۱۰ : ۸۳-۸۶؛ ۱۱ : ۷۱؛ ۱۱ : ۵۴-۵۶، ۸۸؛ ۱۴ : ۱۲؛ ۱۶ : ۴۲؛ ۱۷ : ۱۳-۱۶؛ ۲۲ : ۱۱؛ ۱۵-۱۶ وغیرہ۔

[3] علی ہجویری: کشف المحجوب ص ۳۹-۴۰، انگریزی ترجمہ لندن ۱۹۳۶ء

[4] کلاباذی: کتاب التعرف، انگریزی ترجمہ، ص ۲

[5] کشف المحجوب ص ۷۰-۷۴، انگریزی ترجمہ

اسلام میں اخلاقی فکر کی ابتدا

پروفیسر عمرالدین

اسلام کی عمارت اخلاقی اصولوں پر قایم ہے اور اخلاقی روح اسلامی نظامِ حیات کے ہر ہر شعبہ میں جاری وساری ہے۔ اسلامی فقہ زندگی کے ہر پہلو پر حاوی اور اخلاقی قدروں کی حامل ہے۔ اسلام حقیقت میں ایک اخلاقی دین ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ قرآن وسنت نے اخلاقی فلسفہ بھی دیا ہے۔ اخلاقی بصیرت اور عملی اخلاق اور شے ہے اور اخلاقی فلسفہ سے دیگر اسلامی تاریخ میں اخلاقی فکر کی ابتدا شروع کی چند صدیوں کے گزر جانے پر ہوتی ہے اور ایک ساتھ سارے ہی بنیادی اور اہم مسائلِ اخلاقیات زیرِ بحث نہیں آتے بلکہ آہستہ آہستہ یکے بعد دیگرے مختلف مسائل پیدا ہوتے ہیں، جن پر مفکرین اور فلاسفہ اسلام نے غور و فکر کیا ہے اور اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ چوتھی صدی ہجری کے اختتام تک اسلامی اخلاقیات کے تینوں مکاتب' کلامی' فلسفیانہ اور صوفیانہ اخلاق کے بنیادی تصورات مرتب ہو چکے تھے۔ بعد کے آنے والوں نے ان بنیادوں پر اپنی اپنی عمارتیں تعمیر کی ہیں۔ ذیل میں اسلامی اخلاقیات کا جو جائزہ پیش کیا جا رہا ہے وہ انھیں ابتدائی صدیوں تک محدود ہے۔

اخلاق قبل اسلام

اسلامی اخلاقیات کی ابتدا دوسرے علوم اسلامیہ کی طرح قرآن وسنت سے ہوتی ہے۔ اہلِ عرب، جن میں قرآن مجید اوّل اوّل نازل ہوا تھا، تہذیب وتمدن کے ابتدائی مراحل میں تھے جن کے اخلاقی فضائل و مکارم کا تذکرہ یا تو ان کے اشعار میں ملتا ہے، یا ان کے حکما کے مختصر اور جامع کلمات ہیں۔ ان فضائل کے تحفظ و اشاعت اور ان مکارم کی تعلیم و ترویج کا کام یا تو شاعر و خطیب انجام دیتے یا سردارِ قبیلہ اور بزرگِ خاندان۔ اور یہ کام عرب معاشرہ میں کچھ اس طرح ہو رہا تھا کہ ہر نو وارد فرد ان قدروں کا انتہائی معتقد، عاشق اور علمبردار بن جاتا۔ کسی کو ان پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس ہوتی اور نہ اس کے لیے فضا ہی سازگار تھی۔ قبائلی عصبیت کی عظیم قوت ہر خیر و شر اور ہر صحیح و غلط کی یکساں حمایت کرتی تھی۔ ایک سادہ اور تمدن کے بُرے اثرات سے محفوظ قوم اپنے اخلاقی اقدار پر عمل کرنا جانتی تھی۔ ان کی بنیادوں پر سوچنا، ان کے لوازمات اور مضمرات پر غور کرنا اور اپنے پیمانوں کی صحت اور عدمِ صحت پر تدبر کرنا اس کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آیا۔

قرآن مجید کا اخلاق

یُوں تو قرآن مجید کے نزول سے کچھ پہلے ان قدروں کی طرف سے چند سنجیدہ افراد میں ایک بے اطمینانی پیدا

ہو رہی تھی۔ لیکن ان کا کوئی اثر معاشرہ پر مرتب نہیں ہو سکا تھا۔ قرآن مجید نے پہلی بار اس پُرسکون سمندر میں تموّج پیدا کیا۔ انفرادی اور اجتماعی اخلاق کا جائزہ لیا اور ایک نئے فکر کی روشنی میں ان پر تنقید کی۔ عرب کے مجموعہ اخلاق میں جو بات درست تھی اس کی تائید اور تاکید کی اور جو غلط نظر آئی اس کی تردید فرمائی اور اس سے احتراز کو لازم قرار دیا اور جن باتوں کی کمی تھی، ان کا اضافہ کیا اور انھیں واجب ٹھہرایا۔ پروفیسر مارگولیتھ نے لکھا ہے کہ قرآن مجید نے مسلمانوں میں دو خوبیوں کو پروان چڑھایا ہے: ایک شجاعت اور دوسرے نظم اِ ڈسپلن۔ اسی طرح میئرز (MAYERS) نے اسلامی اخلاق کو فوجی اخلاق قرار دیا ہے مگر ان باتوں میں صداقت کا صرف ایک جُز ہے۔ ان حضرات نے حقیقت کے ایک ہی پہلو کا مشاہدہ کیا ہے۔ اس تصور کے بالکل برعکس گرونوبایم (GRUNEBAUM) نے اسلام کے انسانی آئیڈیل اور اس کے اخلاقی مکارم و فضائل کو شہری (CIVILIAN) تسلیم کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید نے اخلاقی نظام پر گہرے، وسیع اور دیرپا اثرات مرتب کیے ہیں۔ اس کا یہ کارنامہ ہے کہ اس نے اخلاق کو قبائلی پابندیوں سے آزاد کر کے صحیح معنیٰ میں عالمی اور آفاقی بنایا اور یہ کام خیال و تصور کی دنیا میں نہیں بلکہ واقعات کی دنیا میں انجام پایا۔ عرب کی اخلاقی قدروں کے پیچھے یا معاشرتی تحسین و تقبیح کی قوت کارفرما تھی یا ضمیر کی آواز۔ اسلام نے ان قوتوں سے بلند تر ایک نئے احساسِ ذمہ داری، ایک جاندار خوفِ آخرت اور ایک قومی جذبۂ محبتِ الٰہی کو اُبھارا۔ اس نے اخلاقی زندگی کو تعلق باللہ کے ساتھ ایسا وابستہ کیا کہ ساری زندگی عبادت بن گئی۔ اخلاق و مذہب ایک دُوسرے کے معاون اور شریک ہو گئے۔ توحید اور آخرت کے تصور نے نگاہ کو خوردبینی کی وہ صلاحیت بخشی، جو نفس کی تاویلات کے پردوں کو چاک کرتی ہوئی دل کی گہرائیوں میں اُتر جاتی۔ اسلام نے اخلاق کو پُوری زندگی پر وسیع کر دیا۔ کوئی شعبۂ زندگی ایسا نہ رہا، خواہ وُہ انفرادی ہو یا اجتماعی، ملکی ہو یا بین الاقوامی جس میں اس کی اخلاقی اسپرٹ یکساں طور پر جاری و ساری نہ ہو گئی ہو۔ قرآن مجید اور بالخصوص سنّت نے احسان کے مدارج کو ایسا بلند کیا اور مکارم و فضائل کی سطح کو اتنا اونچا اٹھایا جو علمِ انسانی اخلاق کے تصور میں بھی بمشکل آ سکتا۔ خیر و شر کا ایک ایسا متوازن تصور پیش کیا، جس میں احساس، ہر جذبہ اور ہر خواہش کی یکساں رعایت تھی۔ لذّت و مسرّت کے ساتھ فضائل و مکارم کی فی نفسہٖ مطلوبیت اور توقیر و احترام کا شدید احساس بھی اس میں داخل تھا اور جذبہ کمال کی تسکین کے ساتھ فرض و ذمہ داری کا گہرا شعور بھی شامل تھا۔ اس میں آخرت کی سعادت کے ساتھ دنیا کی کامیابی اور تعمیر بھی مضمر تھی۔

قرآن مجید نے جو اخلاقی نظام دیا ہے، اس کی مکمل تشریح تو یہاں ممکن نہیں، البتہ اس کے اخلاقی اصولوں میں سے چند مثال کے لیے بیان کیے جاتے ہیں:

— والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک سے پیش آؤ اور اعزہ و اقارب، یتیم و محتاج، پڑوسی اور رفیقِ سفر، مسافر اور غلام کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔

— اہلِ ایمان کی صفت یہ ہے کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل، بلکہ درمیانی راہ اختیار کرتے ہیں۔

——— اللہ تعالیٰ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔ اعزہ اور اقارب پر خرچ کرنے کی تاکید فرماتا ہے اور فحش، منکر اور زیادتی سے منع کرتا ہے۔

——— جو لوگ خوشحالی اور تنگی دونوں میں انفاق کرتے ہیں، غصہ کو ضبط کرتے ہیں، عفو و درگزر سے کام لیتے ہیں، انھیں اللہ تعالیٰ محبوب رکھتا ہے۔

——— ایمان لانے والوں کو حکم دو کہ وُہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور عفت اختیار کریں۔

——— کسی قوم سے عناد تمھیں عدل کی راہ سے نہ بھٹکا دے۔

——— قسط و عدل پر قایم رہو۔

——— سارے مسلمان بھائی ہیں، اس لیے ان میں صلح و آشتی پیدا کرو اور اگر کوئی دو گروہ آپس میں جھگڑا کر لیں تو ان میں صلح کرادو۔

——— تم میں سے خدا کی نگاہ میں افضل وُہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

پورا قرآن مجید ایسی ہی بلند اخلاقی تعلیمات سے پُر ہے۔

سنّت کا اخلاق

قرآن مجید نے اخلاق کے جو تصورات دیے ان کی تفصیل حدیث نے پیش کی۔ سنّت نے قرآن مجید کے اشاروں کی وضاحت، اس کے کلیات کی تصریح، اس کے اصولوں کا عملی انطباق اور اس کے احکامات کی تشریح کی خدمت انجام دی۔ محمد رسول اللہ (اللہ کی رحمت ہو اس مبارک ذات پر) کی ذات ان تصورات کی واضح مثال اور ان مکارم و فضائل کی زندہ مجسمہ تھی۔ جس نے آپ کی صحبت سے فیض اٹھایا وہ انھیں اقدار کے رنگ میں رنگ گیا۔ مزدور اور کسان سے لے کر پولیس اور فوج، قاضی اور امیر سبھی ان فضائل کے علمبردار بن گئے۔

اس انسان عظیم کی زندگی کی ایک اچھی تصویر امام غزالیؒ نے "احیاء العلوم" میں کھینچی ہے۔ یہ وہ آئیڈیل ہے جس کی قرآن مجید نے ان الفاظ میں تصدیق کی ہے:

"بیشک تم عظیم اخلاق کے مالک ہو"

خدا کے رسولؐ گہرے احساس بندگی اور بڑے ہی عجز و انکسار کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے عظیم دربار میں مکارم و فضائل کی دعا کیا کرتے تھے۔ وُہ بڑے ہی نرم دل، خاشع اور متواضع تھے۔ اس کے باوجود شیر کی طرح دلیر اور بلند حوصلہ تھے۔ فرمایا کرتے کہ:

"میں مکارمِ اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں"

اور آپؐ کی پوری زندگی اس دعوے کی تصدیق تھی۔ خود انتہائی خداترس اور انصاف پسند تھے اور اپنے پیروؤں کو خوفِ خدا،

بنی نوع انسان کی خیر خواہی، ہمدردی و محبت، صدق و امانت، ایفائے عہد و تکمیل پیمان کی تلقین کرتے اور آخرت سے ڈراتے، اعمال کے احتساب پر ابھارتے، ذمہ داری کے احساس کو بیدار کرتے، پڑوسیوں کے حق کی ادائیگی، یتیموں سے محبت، کمزوروں کی امداد، مظلوموں کی دادرسی، فقیروں کے اطعام پر ترغیب اور خوشی اور غم، رضا اور ناراضی میں انصاف پر ثابت قدم رہنے کی تاکید کرتے۔ اسلام کی تعلیمات کو دوسرے انسانوں تک پہنچانے کی ہدایت فرماتے اور خود ہر کام میں اپنی مثال پہلے پیش کرتے۔

آپ کی زندگی سادہ تھی۔ بڑے قانع اور غنی القلب تھے۔ غذا معمولی ہوتی، جَو کی روٹی، کدو کا سالن یا چھوہارے، مگر اچھے کھانوں سے پرہیز نہ تھا۔ کسی چیز کو جسے کتاب اللہ نے جائز قرار دیا ہو، اسے ترک نہ کرتے اور نہ حرام ٹھہراتے۔ ٹھنڈے پانی کو اللہ کی نعمت سمجھتے۔ عطر و خوشبو کا بھی اکثر استعمال کرتے۔ اپنے جُوتے اپنے ہاتھوں گانٹھ لیتے اور کپڑوں میں پیوند خود لگاتے۔

ہر شخص سے مساوات کا سلوک کرتے، کسی کو حقارت سے نہ دیکھتے۔ آزاد ہو یا غلام ہر ایک سے یکساں محبت سے پیش آتے، سلام کرتے، تحفہ دیتے اور ربط پیدا کرنے میں دوسروں سے سبقت کرتے۔ ہر امیر و غریب کی دعوت یکساں قبول کرتے۔ ہر شخص سے خندہ پیشانی سے ملتے۔ تکبر اور خود بینی کا آپ کی سیرت میں شائبہ تک نہ تھا۔ لوگوں کی زیادتیاں انگیز کرتے۔ مگر کسی سے ذاتی معاملہ میں کبھی انتقام نہ لیتے۔ انتہائی عالی ظرف تھے۔ ظلم کا بدلہ عفو سے اور زیادتی کی جزا احسان سے دیتے۔ پس ماندوں کی امداد کرتے، بیواؤں کی خدمت کرتے اور ضرورت کا سامان بازار سے لا دیتے۔ مہمانوں کی ضیافت اور مریضوں کی عیادت کرتے اور ہر شخص کے دکھ درد میں شریک ہوتے۔ انسان کی خیر خواہی کو دین قرار دیتے۔ فرمایا کہ:

"تم میں سے کوئی اس وقت تک سچا مومن نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وُہ اپنے بھائی کے لیے وہی نہ چاہے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔"

یہ اصول اسلامی اخلاق کا سنگِ بنیاد ہے۔

خدا کی نصرت میں کامل یقین رکھتے، ہر آزمائش میں صابر اور ثابت قدم رہتے۔ اپنے اصولوں کی صداقت پر ایسا اذعان تھا کہ کسی بھی سمجھوتے کے لیے تیار نہ ہُوئے اگرچہ بارہا اس کی نوبت آئی۔ باطل کے مقابلہ میں ہمیشہ سینہ سپر رہے اور ظلم کے مقابلہ میں کبھی ہمت نہ ہاری۔ مظلوم کی حمایت اپنا فرض اور ظالم سے انصاف طلبی اپنا شعار سمجھتے۔

آپ بیک وقت ایک شفیق باپ، ایک محب خاوند، ایک بہترین معلّم، ایک بصیرت مند عربی، ایک پُرجوش داعی، ایک عظیم قائد، ایک پُرہیبت امیر، ایک ماہر سیاستدان، ایک تجربہ کار سپہ سالار، ایک بلند حوصلہ فاتح، ایک انصاف پسند قاضی، ایک دیانت دار مفتی، ایک فصیح و بلیغ خطیب، ایک بصیر و مستبصر حکیم، ایک فقیر بے نوا اور ایک شاہ پر جلال تھے۔ غرضکہ آپ اپنی ذات میں ایک اُمت تھے۔

اسلام نے جو آئیڈیل پیش کیا، یہ بیان اس کی ایک غیر مکمل تصویر ہے۔ آپؐ کی ذات بہت بلند اور بڑی مثالی تھی

اس نمونہ اور اس مثال کے علاوہ قرآن و سنّت نے دو چیزیں اور دیں :
ایک اخلاق کا ایک مکمل ضابطہ جو آیات قرآنی یا احادیث نبوی ؐ کی شکل میں مکتوب یا غیر مکتوب تھا۔
دوسری چیز وہ اخلاقی بصیرت تھی جو رسول اللہ ؐ کی نگرانی اور قرآن مجید کی تئیس سالہ تربیت کے نتیجہ میں مسلمانوں میں پیدا ہوگئی تھی۔

زمانے کے گزرنے کے ساتھ اخلاقی ضوابط کا وہ جُزء جو غیر مکتوب تھا قلمبند ہو رہا تھا اور اخلاقی بصیرت صحابہ کے زیر تربیت افراد اور جماعتوں میں پیدا ہو رہی تھی۔ انھیں دونوں چیزوں سے کام لے کر بعد میں جتنے مسائل مسلمانوں کو پیش آئے ، ان کا حل انھوں نے تلاش کیا۔ ابتدائی دو صدیوں کے فقہا نے انھیں دونوں چیزوں کی مدد سے اسلامی معاشرہ اور افراد کے لیے زندگی کے مختلف مسائل میں بروقت رہنمائی کی۔

قرآن و سنّت نے ایک ضابطۂ اخلاق دیا ، لیکن کوئی فلسفۂ اخلاق نہیں دیا ، مگر فلسفہ اخلاق کی بنیادیں قرآن و سنّت میں ملتی ہیں۔ ان بنیادوں پر اخلاق کی تعمیر کا کام زمانہ کی ضروریات کے تحت ہوتا رہا لیکن موجودہ دور میں چند صدیوں سے ان بنیادوں اور اصولوں کو دورِ حاضر کی اصطلاحات اور تصورات کے مطابق سمجھنے اور سمجھانے کا کام نہیں ہوا ہے۔

اخلاقی فکر کا پس منظر

صحابہ کے دور میں جب اسلام عرب سے نکل کر ایران، عراق، شام اور مصر میں پہنچا تو مختلف اسباب نے اخلاقی فکر کو حرکت دی۔ جو لوگ نئے نئے اسلام میں داخل ہو رہے تھے، وہ ان اخلاقی سوالات کا اسلام میں جواب تلاش کرنا چاہتے تھے، جنھوں نے صدیوں ان کے اور ان کے آبا کے ذہنوں کو پریشان کر رکھا تھا۔ پھر اپنے دین میں خلوص اور اپنے عقاید میں یقین پیدا کرنے کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ یہ نئے افرادِ دین کو اور اس کے اخلاقی ضوابط اور ہدایات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ جو مذاہب اسلامی آبادی میں مامون تھے وہ اپنا تشخص برقرار رکھنے کے لیے مدافعتی جدوجہد کر رہے تھے اور اس کوشش میں اسلام کی اخلاقی ہدایات کے بارے میں سوالات اور شبہات پیدا کر رہے تھے۔ بنی امیہ کے دَور کے اختتام اور عباسی دور کے شروع میں یونانی فلسفہ اور علوم کی جو اشاعت ہوئی، اس نے اخلاقی مسائل بھی اٹھائے اور ان پر سوچنے کی تحریک بھی کی۔ مگر فوری طور پر جن حالات نے ایک اخلاقی مسئلہ پیدا کر دیا اور سارے سوچنے والے ذہنوں کو متوجہ کر لیا، وہ سیاسی تھے۔ بنی امیہ نے اپنا اقتدار مستحکم کرنے ، بغاوتوں کو سختی سے فرو کرنے اور مخالفت کا خاتمہ کرنے کے لیے جس ظلم و سفاکی کا ثبوت دیا، اس نے دلوں کو لرزا دیا اور نفرت و ندامت کے جذبات بھڑکا دیے۔ بنی اُمیہ نے ان اعمال کی ذمہ داری سے سبکدوش ہونے اور غالباً اپنے ضمیر کی ملامت سے بچنے کے لیے جبریت کا عقیدہ عام کرنا شروع کیا۔ یعنی یہ خیال پھیلانا شروع کیا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہر شے، ہر فعل و عمل پر حاوی ہے۔ جو کچھ ہوتا ہے برا ہو یا بھلا، وہ سب اسی کی طرف سے ہوتا ہے۔ انسان اس کے ہاتھ میں ایک کٹھ پتلی ہے۔ اعمال کی ذمہ داری اس پر

عائد نہیں ہوتی۔

یہ خیال جب بصرہ میں پہنچا اور لوگوں نے حضرت حسن بصریؒ سے اس کے بارے میں سوال کیا، تو انھوں نے جواب میں کہا: "ظلم و تشدد خدا کی طرف سے نہیں ہوتا۔ وہ منکرات و خواہش کا حکم نہیں دیتا۔ اس کی ذات ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ خطا کاری کی ذمہ داری انسان کی اپنی ذات پر ہے۔" قدرت کے اس تصور کو عام کرنے کا کام معبد الجہنی اور اس کے شاگردوں نے انجام دیا اور بنی امیہ کے عتاب کے شکار ہوئے۔

جبریت اور قدریت کے دونوں داعی اپنے خیال کی تائید کے لیے قرآن و حدیث پیش کرتے۔ اگرچہ یہ مسئلہ کوئی نیا مسئلہ نہ تھا، لیکن حالات نے اسے از سرِ نو زندہ کیا اور اس کو اہم بنا دیا۔ خود قرآن مجید نے مشرکین کا وہ استدلال نقل کیا ہے جو وہ اپنے شرک پر ثابت قدم رہنے اور تحلیل و تحریم کے آبائی ضابطہ کی پابندی کے لیے بطور جواز پیش کرتے، وہ کہا کرتے اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ہی ٹھہراتے۔ مگر قرآن مجید نے خدا کی مشیت اور قدرت مطلقہ سے یہ استدلال صحیح قرار دیا اور جواب میں فرمایا کہ "ایسی ہی باتیں بنا کر ان سے پہلے کے لوگوں نے بھی حق کو جھٹلایا ہے۔ یہاں تک کہ آخر کار ہمارے عذاب کا مزا انھوں نے چکھ لیا۔ ان سے کہو کہ کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے جسے ہمارے سامنے پیش کر سکو۔ تم تو محض گمان پر چلتے اور نری قیاس آرائیاں کرتے ہو۔" (سورہ انعام)

قدر و جبر کے دونوں ہی فریقوں کو اس مسئلہ کے حل میں دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے، تو اسے اپنے اعمال کے ارادہ اور کرنے کی آزادی ہونی چاہیے۔ لیکن کیا پھر اس سے قدرت خداوندی کی تحدید لازم نہیں آتی؟ اور اگر قدرت خداوندی کو محدود نہ کیا جائے اور سارے افعال، خیر و شر کو اللہ تعالیٰ کے ارادہ کی طرف منسوب کر دیا جائے، تو کیا اس صورت میں انسان کی ذمہ داری ختم نہیں ہو جاتی؟ اور کیا اعمال پر آخرت کی بازپرس خلافِ عدل نہیں قرار پاتا؟ درانحالیکہ اللہ تعالیٰ کوئی کام عدل کے خلاف نہیں کرتا۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت مطلقہ کو اس کے عدل و انصاف سے ہم آہنگ کرنے کا سوال ایک اور مسئلہ میں پیدا ہوا۔ ایک فریق نے کہا کہ اللہ تعالیٰ معصوموں کو عذاب نہیں دیتا، اس لیے کہ وہ عادل ہے۔ دوسرے گروہ نے کہا کہ یہ بات کہ بہت سے معصوم مختلف مصائب اور آلام کے شکار ہوتے ہیں، مشاہدے کی چیز ہے اور یہ آلام خدا کی قدرت اور اس کے ارادہ کے تحت ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ معصوموں کو بھی عذاب میں مبتلا کرتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ شبہ پیدا ہوا کہ کیا یہ اللہ تعالیٰ کے عدل کے خلاف نہیں؟ اس گروہ نے جواب دیا کہ نہیں۔ یہ ظلم نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جو کچھ کرتا ہے، سراسر عدل ہوتا ہے بلکہ عدل اس کا نام ہے جو وہ کرتا ہے یا کہتا ہے۔ پہلا گروہ اسلامی تاریخ میں معتزلہ کے نام سے مشہور ہے اور دوسرا اشاعرہ کے نام سے۔ معتزلہ جو پہلے مسئلے میں قدر کے قائل تھے، انھوں نے یہ کہا کہ عدل و انصاف تو وہ ہے جو عقل بتاتی ہے اور اللہ تعالیٰ عقل کے فیصلوں کا پابند ہے۔ اس کے افعال کو عقل کی روشنی میں پرکھا جا سکتا ہے۔ اس طرح دو نئے سوالات پیدا ہوئے: ایک یہ کہ خیر و شر اور صحیح و غلط کو جاننے کا ذریعہ کیا ہے، عقل یا شرع؟

اس کے ساتھ یہ بات بھی متعلق تھی کہ صحیح و غلط کو پرکھنے کا معیار کیا ہے؟ جس طرح سے یہ سوال اٹھایا گیا، اس میں ان دونوں باتوں کو ایک دوسرے سے ممیز نہیں کیا گیا۔ دُوسرا سوال یہ تھا کہ اخلاقی وجوب عقلی ہے یا شرعی؟ یعنی یہ کہ اگر معلوم بھی ہو جائے کہ سچ بولنا (مثال کے طور پر) صحیح ہے تو یہ بات کہ سچ بولنا لازمی اور واجب ہے کہاں سے آئی؟ کیا عقل نے واجب قرار دیا یا شرع نے؟

کلامی اخلاقیات

اخلاقی اقدار کے علم اور وجوب کے یہ دو مسائل ایسے تھے جن پر متکلمین اسلام نے نہایت نفیس بحثیں کی ہیں خصوصیت سے وجوب کا مسئلہ تو ایسا ہے، جو اخلاقی فکر کی تاریخ میں نیا مسئلہ تھا۔ اسلام میں یہ مسئلہ اس لیے پیدا ہوا کہ اسلام نے اخلاق کا ایک ضابطہ دیا اور اس کو خدا کا فرمان بتایا اور اسی کی اتھارٹی کو ان ضوابط کا سرچشمہ قرار دیا۔ اس کے سامنے ذمہ داری اور جواب دہی کا احساس اسی اتھارٹی سے پیدا ہوتا ہے، جو لوگ اخلاقی وجوب کو شرعی قرار دے رہے تھے انھیں اسی اتھارٹی اور اسی جواب دہی کا تحفظ مدِّنظر تھا اور یہ بات صرف اخلاقی ضوابط تک محدود نہ تھی بلکہ اس کا تعلق سارے ضابطہ تحلیل و تحریم اور پورے اسلامی قانون سے تھا اور جو گروہ اسے عقلی قرار دے رہا تھا، وہ ہر ضابطہ اور قانون کو عقل کے ماتحت کرنا چاہتا تھا اور جو بات بھی اس کے تصور عقلی کے مطابق صحیح نہیں اُترتی اسے وہ بغیر نتائج و عواقب کا لحاظ کیے رد کر دینے کے لیے تیار رہتا۔ اس گروہ کی زحمت یہ تھی کہ اسے اپنی عقل کے حدود کی خبر نہ تھی۔ اس کا بنیادی مفروضہ یہ تھا کہ عقل حقیقت اور صداقت کے ہر پہلو کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔

پہلا سوال کہ کیا انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے اور کیا خدا کی قدرت مطلقہ کے تصور کے ساتھ انسان کے آزادی ارادہ و عمل کو ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے؟ دراصل اخلاقیات کا براہِ راست سوال نہیں بلکہ اس کا تعلق اخلاقی مابعدالطبیعیات سے ہے۔ لیکن خیر و شر کے علم اور اخلاقی وجوب کے دوسرے اور تیسرے سوالات حقیقی معنی میں اخلاقیات کے مسائل ہیں۔

معتزلہ

پہلے سوال سے متعلق معتزلہ کا خیال یہ تھا کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار بھی ہے اور ان کا خالق بھی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ایسی صُورت میں وہ خدا کے عدل و انصاف کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔ اس تصور کے نتیجہ میں وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کو محدود کرنے کے لیے تیار تھے، قدرتِ خداوندی ان کے نزدیک غیر محدود اور مطلق نہ تھی۔ خیر و شر کے علم کے بارے میں ان کی زیادہ سوچی اور سمجھی رائے یہ تھی کہ حسن اور قبح (جو متکلمین کی بول چال میں خیر و شر کے لیے مستعمل ہوتے ہیں)، تین طرح کے ہوتے ہیں، ایک مفید اور مضر کے معنی میں، دوسرے قابل اجر اور تعذیب کے

معنی میں ۔وہ حسن اور قبح کو شرعی مانتے لیکن بقیہ دونوں معنی میں عقل کو علم کا کافی
معنی میں اور تیسرے عام اخلاقی خیر و شر کے معنی میں ۔ اس بات کو وہ اس طرح
ذریعہ سمجھتے۔ اخلاقی حسن اور قبح کا علم عقل سے ہوتا ہے اور شرع صرف اس علم کی تصدیق کرتی ہے ۔شرع کسی چیز میں حسن یا قبح
پیش کرتے کہ حُسن اور قبح اشیا کے ذاتی صفات ہیں اور عقل ان صفات ذاتیہ کا ادراک کرتی ہے ۔
پیدا نہیں کرتی ۔تیسرے سوال یعنی اخلاقی وجوب کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ وہ بھی عقلی ہے ۔یعنی یہ کہ عقل ہی فعل حسن کے
کرنے اور فعل قبیح سے بچنے کا حکم دیتی ہے ۔عقل ہی حاکم اور موجب ہے ۔
دوسرے اور تیسرے مسئلہ میں ان کی دلیل یہ تھی کہ عام اخلاق کا علم ہر انسان کو ہوتا ہے ۔مثلاً یہ بات کہ شکر حسن ہے،
ہم کو عقل سے ضرورۃً معلوم ہوتی ہے ۔ ہر انسان خواہ وہ کسی مذہب کا ماننے والا ہو یا نہ ہو، اس کے حسن ہونے کو جانتا ہے۔
ایسے مواقع پر جب کہ سچ اور جھُوٹ دونوں سے یکساں طور پر مقصد حاصل ہو، انسان سچ بولنا ضروری سمجھتا ہے ۔اگر اخلاقی
فضائل و رذائل کا علم عقل سے نہ ہوتا تو انسان نبی اور متنبی میں فرق نہ کر پاتے ۔حقیقت میں شرعی ذمہ داری بھی آخری طور
پر عقلی ذمہ داری ہے ۔

اشاعرہ

پہلے سوال کے سلسلے میں اشاعرہ نے کسب کا نظریہ پیش کیا ہے ۔ان کے خیال کے مطابق انسان اپنے اعمال کا
خالق نہیں کاسب ہے ۔خلق تو تنہا اللہ کا کام ہے ۔ انسان صرف کسب کرتا ہے ۔یہ تصور قرآن مجید کی اس طرح کی آیات
سے لیا گیا تھا:

لھا ما کسبت و علیہا ما اکتسبت ۔

اشاعرہ کے خیال میں اسی کسب کی وجہ سے انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہوتا ہے ۔کسب انسان کے ارادہ کرنے میں
ہوتا ہے ۔ وہ صرف ارادہ کا مالک ہے ۔فعل انجام دینے کی جو قدرت وُہ رکھتا ہے، وُہ اللہ کا عطیہ ہے ۔حقیقی فاعل
اللہ تعالیٰ ہے ، انسان محض کاسبِ ارادہ ہے ۔
دوسرے سوال سے متعلق ان کی رائے یہ تھی کہ افعال اور اشیا بجائے خود حسن اور قبیح نہیں ہوتے ۔ حسن اور
قبح ان کی ذاتی صفات نہیں ہیں ۔شرع جن چیزوں کو حسن قرار دیتی ہے ، وہ حسن ہیں اور جنھیں قبیح ٹھہراتی ہے ، وہ قبیح ہیں۔
وہ اس کی اطلاع سے پہلے نہ حسن تھے اور نہ قبیح ۔ دُوسرے الفاظ میں شرع افعال اور اشیاء کو حسن اور قبیح بناتی ہے ۔
اخلاق وجوب کے بارے میں ان کا خیال یہ تھا کہ وہ بھی شرعی ہے ۔مثلاً سچ بولنا شرع ہی واجب قرار دیتی ہے اور
جھوٹ بولنا حرام بتاتی ہے ۔
ابوبکر باقلانی (م ۴۰۳ھ / ۱۰۱۲ء) نے معتزلہ کے مذکورہ بالا رسائل کی تردید اس طرح سے کی ہے ۔حسن اور قبح
کا علم نہ تو ضروری ہے اور نہ بدیہی ۔ بدیہی اس لیے نہیں کہ ہزاروں انسان اختلاف رکھتے ہیں ۔جس کو ایک حسن قرار دیتا ہے،

دُوسرا اسے قبیح سمجھتا ہے اور ضروری اس لیے نہیں کہ حسن و قبح کا علم مبادی اولیہ سے مستنبط نہیں کیا جا سکتا۔ درحقیقت انسان اگر سچ بولنا ضروری سمجھتے ہیں، تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کی عقل کا فیصلہ ہے۔ بلکہ وہ ایسا یا تو معاشرہ کی زجر و توبیخ سے بچنے کے لیے کرتے ہیں یا اس کی تحسین و تعریف کی خاطر۔ یا اس کے زیر اثر ان تصورات کو اپنا لیتے ہیں۔ معتزلہ کی آخری دلیل کے بارے میں باقلانی کا خیال یہ ہے کہ پیغمبر کی پہچان معجزہ سے ہوتی ہے۔

ماتریدیہ

معتزلہ اور اشاعرہ کے درمیان کلام کا وہ مکتبِ فکر ہے، جو امام ابوحنیفہ اور ان کے شارع ابومنصور ماتریدی کی طرف منسوب ہے۔ اخلاقی فضائل و رذائل، حسن اور قبیح کے علم میں تو وہ معتزلہ کے ساتھ ہیں، یعنی یہ کہ حسن و قبح عقلی ہیں۔ اشاعرہ کے ناقدین میں امام ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد رشید امام ابن قیم بھی ہیں اور اس مسئلہ میں ان کی رائے معتزلہ اور ماتریدیہ کے ساتھ ہے۔ لیکن اخلاقی وجوب کے تصوّر میں ماتریدیہ مکتب فکر کی رائے اشاعرہ کے ساتھ ہے، یعنی یہ کہ اخلاقی شرعی ہوتا ہے۔ ان کے خیال میں ان دونوں مسائل کو الگ کیا جا سکتا ہے اور ایک کو عقلی ماننے سے دوسرے کا عقلی ماننا لازم نہیں آتا۔

فلسفہ اخلاقیات

جب ہم کلام سے فلسفہ کا رُخ کرتے ہیں، تو وہاں نہ صرف سوالات بدلے ہوئے ملتے ہیں بلکہ اصطلاحات بھی تبدیل ہو جاتی ہیں۔ کلامی حلقہ میں حسن و قبح اور وجوب کے الفاظ مستعمل تھے مگر فلسفیانہ بحثوں میں خیر و شر، سعادت و فضیلت جیسی اصطلاحات ملتی ہیں۔ فلاسفہ کے نزدیک انسانی ارادہ کی آزادی اور انسانی اعمال کی ذمہ داری ایک بنیادی مفروضہ ہے جس کے قدرتِ الٰہی کے تصوّر سے ہم آہنگ ہونے کے مسئلہ میں وہ پڑنا نہیں چاہتے۔ اسی طرح ان کے یہاں یہ بات بھی مسلّمات میں تھی کہ عقل خیر و شر اور فضیلت و سعادت کا علم حاصل کر سکتی ہے اور اس کام میں وحی سے بے نیاز ہے۔ جہاں تک اخلاقی وجوب کا سوال ہے، تو یہ بات ان کے یہاں سرے سے زیر بحث ہی نہیں آتی۔

کندی (ف ۲۵۹ھ/۸۷۳ء)

اسلام میں فلسفہ کا بانی ابواسحٰق کندی ہے۔ اس کی توجہ زیادہ تر مابعد الطبیعیات اور نفسیات پر مرکوز رہی۔ عملی اخلاقیات میں اس نے ایک مختصر سی کتاب "دفع الاحزان" کے نام سے لکھی ہے۔ مگر کندی نے نظری اخلاقیات پر کوئی رسالہ تحریر نہیں کیا۔ البتہ اس نے نفس یا روح کا جو تصور پیش کیا، وہ بعد میں فلسفیانہ اخلاق کا جز بن گیا۔ کندی نے نفس کے اس تصور پر فضیلت و سعادت کے بارے میں نتائج نکالے ہیں۔ اس کے خیال میں

انسانی روح کے دو ماخذ ہیں، اسی کا ایک جز جسم کے ساتھ ارتقا پاتا ہے اور دوسرا جز خدا کی ذات سے آتا ہے۔ چونکہ انسانی رُوح کا تعلق بدن سے بہت گہرا ہے اس لیے جب تک اس کا قیام بدن میں رہتا ہے، اس وقت تک رُوح علت و اسباب کے سلسلے سے آزاد نہیں ہو سکتی۔ لیکن دوسری طرف چونکہ انسانی روح عالمِ روحانی سے تعلق رکھتی ہے، اس لیے اس اعتبار سے اسے آزادی اور بقائے سرمدی حاصل ہے۔ انسان تقویٰ و پرہیزگاری اور علم و حکمت کی تحصیل سے ہی مادّی قیود سے بلند ہو سکتا ہے لیکن مادی قیود سے مکمل آزادی بعد موت ہی نصیب ہو سکتی ہے۔ کندی کے نزدیک سعادت قصویٰ کے لیے اخلاق کے ساتھ ساتھ علم و دانش ناگزیر ہیں بلکہ اخلاق علم و حکمت کے حصول کے لیے ابتدائی مرحلہ ہے۔

فارابی (ف ۳۳۹ھ / ۹۵۰ء)

کندی کے بعد فارابی نے فلسفہ اخلاق کو آگے بڑھایا لیکن اس نے فلسفۂ اخلاق کو سماجی اور سیاسی فلسفے سے الگ کر کے نہیں دیکھا۔ افلاطون اور ارسطو کی طرح اخلاق فارابی کے نزدیک بھی سیاست کا ایک جز رہا۔

فارابی کے خیال میں صرف فلاسفہ کو نظمِ حکومت چلانے اور لوگوں کی زندگیوں کی تشکیل و تعمیر کا حق پہنچتا ہے۔ کیونکہ حقیقت کا علم انھیں کو حاصل ہوتا ہے اور وہی انسانوں کو حیاتِ دنیا کی کشمکش میں مبداء اوّل کی طرف رجوع کی صحیح راہ کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ پوری کائنات ایک وحدت ہے اور خدا اس کا حاکم ہے۔ اسی طرح انسانی جسم بھی ایک اکائی ہے، جس کی حکومت دل کے سپرد ہے۔ پھر اسی طرح ریاست بھی ایک عضویاتی وحدت ہے، جس کا حاکم ایک ایسے شخص کو ہونا چاہیے، جو ذہن و دل کی ساری خوبیوں کا مالک ہو، جس کے عزائم بلند، جس کی فکر رسا، جس کا قلب حقیقت آشنا، جس کی سیرت مکارم و فضائل سے آراستہ اور جس کا ذہن حکمت و دانش کے نور سے منور ہو۔ فارابی نے اپنی مثالی ریاست کی تشریح اپنی ایک مشہور کتاب میں کی ہے۔

انسان دو طرح کی قوتوں کا مجموعہ ہے: حیوانی اور عقلی۔ عقل ہی صحیح کو غلط سے اور خیر کو شر سے ممتاز کرتی ہے اور اس سے حقیقت کے اسرارِ پنہاں سے آگاہی ہوتی ہے۔ حقیقت کی معرفت ہی انسان کا اصل کمال ہے اور ساری چیزیں اسی ایک مقصد کی خادم اور تابع ہیں۔ انسان میں صرف اس غایت کی معرفت کی صلاحیت ہی نہیں ہے بلکہ اس میں ایک جذبہ بھی ہے جو اسے ہمیشہ برتر اور بہتر کی طرف سرگرمِ عمل رکھتا ہے۔ کمال کے حصول کا یہ جذبہ ہی ساری سعادتوں کا سرچشمہ ہے۔ انسان کو کامل آزادی اور مکمل سعادت اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی، جب تک کہ وہ مادی علائق سے نجات نہیں پا لیتا۔ فارابی کی مثالی ریاست کا حاکم فلسفی ہے، جس کی خصوصیات کی تشریح فارابی نے اس طرح کی ہے جس سے اس کے فکر و کردار کی معصومیت کا تصور پیدا ہونے لگتا ہے۔ یہ فارابی کا مثالی انسان ہے، جو افلاطون کی حکمت اور غالباً حضرت علیؓ کی سیاست اور اخلاق کا پیکر ہے۔ ریاست عام انسانوں کے لیے اخلاقی فضائل کی تکمیل کے لیے ناگزیر ہے۔ اخلاق کی تربیت، تشکیل و ترقی ریاست سے باہر انجام نہیں پا سکتی۔

ابن سینا (ف ۴۲۸ھ/ ۱۰۳۶ء)

ابن سینا کی توجہات کا مرکز بھی مابعد الطبیعیات اور طبعیات ہی کے مسائل رہے۔ اخلاقیات میں اس نے زیادہ دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ اس کے اخلاقی نظریات اس کی دو کتابوں سے ملتے ہیں: ایک "کتاب السیاستہ" اور دوسرے "کتاب البر و الاثم"۔

ابن سینا کا خیال تھا کہ انسان خیر و شر اور صحیح و غلط میں تمیز کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اخلاقی اصولوں اور فضائل پر ابن سینا نے کوئی تفصیلی بحث نہیں کی۔ عام انسانوں کے لیے وہ اس نظام اخلاق کی پابندی کی ہدایت کرتا ہے، جو ان کے معاشرہ میں مقبول و رائج ہوں۔ لیکن جو لوگ اونچی ذہنی اور فکری صلاحیتوں کے مالک ہوں اور بہتر سیرت و کردار رکھتے ہوں، ان کے لیے ابن سینا نے دوسرا آئیڈیل تجویز کیا ہے اور یہ آئیڈیل اس کے فلسفہ مابعد الطبیعیات سے ماخوذ ہے۔ ساری کائنات عشق کی قوت کی محکوم ہے۔ عشق پوری کائنات میں جاری و ساری ہے۔ وہی ارتقا اور ہر تغیر کا سبب اور زندگی کی اصل روح ہے۔ اس عشق کا مقصود اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، جو اس دنیا کا خالق ہے اور جو کمال حسن اور غایت اولیٰ ہے، اسی حسن ازلی کی محبت انسان اور ساری کائنات کی زندگی کا راز ہے اور اس کی طرف رجوع اور اسی سے اتحاد و قرب انسان کی غایت کمال اور سعادت تامہ ہے۔ مگر جب تک انسان ان مادی علائق میں رہتا ہے، اس وقت تک مقصود ازلی کا کماحقہٗ حصول نہیں ہو سکتا۔ فلسفی اور حکیم ہی اس غایت قصویٰ تک پہنچ سکتے ہیں، یا نبی اور اولیا۔ عام انسانوں کو حرمان و ناکامی کے علاوہ کچھ اور نہیں حاصل ہوتا۔

اخوان الصفاء

اخوان الصفا ایک جماعت تھی جو چوتھی صدی ہجری کے اواخر میں بغداد میں ظہور میں آئی، جس کا مقصد شریعت اسلامیہ کو فلسفہ کے ذریعہ پاک کرنا تھا۔ مگر اس زمانہ کے حالات اور ان کے رسائل کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شریعت اور حکمت میں تطبیق کا یہ دعویٰ ایک مدافعتی تدبیر تھی۔ اخوان الصفا نے باطنی طرز کی تاویلات سے کام لے کر نماز، روزہ اور دوسری عبادات، آخرت، رسالت اور دوسرے ایمانیات کی ایسی توجیہات پیش کیں، جن سے دین بالکل مسخ ہو کر رہ گیا۔ وہ حقیقت میں جیسا کہ انھوں نے اپنے رسائل میں ایک جگہ پر خود لکھا ہے، نہ کسی مذہب کے وفادار تھے اور نہ کسی فلسفہ کے پابند۔ ان کے فلسفہ میں ہر طرح کے عناصر اسلامی اور غیر اسلامی، یونانی اور ایرانی، یہودی اور نصرانی، شیعی اور سنی اور بت پرستوں اور مجوسیوں کی مختلف باتیں شامل تھیں مگر ان کا غالب رجحان شیعیت کی طرف تھا۔

ان کا زیادہ زور اخلاق پر تھا اور انھوں نے اپنی ایک خفیہ جماعت بھی منظم کی تھی جس میں کئی مدارج تھے۔ ایک نووارد کو ان مدارج سے گزرے بغیر اس جماعت کے اصل اسرار و رموز سے واقفیت نہیں ہوتی تھی۔ جو رسائل انھوں نے

ترتیب دیے، وہ اپنے فکر کو عام ممبروں تک پہنچانے اور ان کے ذہن میں اپنے خیالات اتارنے کے لیے لکھے گئے تھے اور اسی سبب سے ان کے بیانات میں بسا اوقات تضاد ملتا ہے۔

ان کا فلسفہ اخلاق ان کے عام فلسفہ کی طرح مختلف نظریات کا مجموعہ تھا، جو مختلف فرقوں اور مکاتب فکر سے ماخوذ تھے۔ انسانی روح اصلاً خدا کی ذات سے صادر ہوئی۔ اگرچہ یہ صدور درمیان کے کئی واسطوں سے ہوا۔ روح کا تعلق مادہ کے ساتھ عارضی ہے۔ علم و دانش اور ایمان و یقین، اخلاق و کردار کے ذریعہ انسانی روح اس مادی تعلق سے اپنے کو آزاد کرنے کی سعی کرتی ہے۔ انسانی زندگی کی غایت اسی مادی چکر سے نجات حاصل کرنا اور مبداء اول میں جذب ہو جانا ہے۔ ان کا اخلاقی ضابطہ زُہد و ورع کی تعلیم دیتا ہے اور ایک روحانی نظام ہے۔ انسان کا فعل قابلِ تحسین اس وقت ہوتا ہے، جب کہ وہ اپنی فطرت کے قانون کی پابندی کرتا ہے۔ یہ قانون فطرت عقل کی ارتقاء اور اس کی حکمرانی کا قانون ہے۔ عقل کی نشو و نما علوم و حقایق کے حصول میں ہے اور روح کے دوسرے اجزا پر اس کی حکمرانی سے آداب و فضائل اور مکارم کا وجود ہوتا ہے۔

انسان کو خدا سے ایک فطری محبت ہے۔ اس لیے جذبۂ فطرت کو ابھارنا، ترقی دینا اور تکمیل تک پہنچانا انسان پر فرض ہے۔ سب سے اعلیٰ اخلاق محبت اور عشق ہے، اس لیے کہ عشق و محبت ہی سے انسان کو مبداء اوّل سے وابستگی کی سعادت حاصل ہوتی ہے۔

اخلاق کی تکمیل معاشرہ میں ہوتی ہے۔ یہ معاشرہ فارابی کی ریاست نہیں بلکہ ایک روحانی معاشرہ ہے، جو جماعت اخوان کے ہم معنی ہے۔ بغیر اس تنظیم میں منسلک ہوئے اور بغیر اس روحانی ریاست میں داخل ہوئے انسان سعادت تامہ سے محروم ہی رہے گا۔

کندی سے لے کر اخوان الصفاء تک میں اخلاقیات کو عام فلسفہ سے الگ ایک مضمون کی حیثیت حاصل نہیں ہوئی، فلاسفہ نے نظری اخلاقیات پر جو کچھ لکھا، وہ نفسیاتی مباحث کے تکملہ کے طور پر یا سیاسی نظریات کے جزء اور ضمیمہ کی حیثیت سے لکھا۔ کلامی حلقوں میں بھی اخلاقی نظریات کی حیثیت ثانوی تھی۔ یہ مسائل عقائد اور ایمانیات کی بحثوں میں ضمناً آجاتے تھے۔

مسکویہ (ف ۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء)

وہ پہلا فلسفی ہے، جس نے اخلاقیات کو اپنے فکر کا مرکز بنایا اور اس موضوع پر مستقل کتاب لکھی، جو "تہذیب الاخلاق" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر جامع اور مانع ہے۔ اس کا اسلوب سلیس اور بیان واضح ہے اور طریقہ بحث منظم و مربوط اور فلسفیانہ ہے۔

مسکویہ بحث کا آغاز نفس کی روحانی حقیقت کے اثبات سے کرتا ہے۔ مختلف دلائل کی روشنی میں اس نے یہ ثابت کیا ہے کہ نفس انسانی بسیط، باشعور، ایک روحانی وجود ہے جو اپنے مبداء و منتہا سے آشنا ہے۔ اخلاق نام ہے نفس کی

اس حالت کا جس کی وجہ سے اعمال و افعال بغیر فکر و تدبیر کے سرزد ہونے لگتے ہیں۔ خلق بار بار کی مشق و تربیت کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے بچوں میں خلق کی تشکیل غیر شعوری ہوتی ہے۔ لیکن بڑے ہو کر انسان کا ارادہ اور اس کا فکر خود خلق کی تشکیل کرتا ہے۔ اس منزل پر پہنچ کر ہی عادات و اطوار پر خلق کے لفظ کا صحیح اطلاق ہوتا ہے۔

مگر خلق کی تشکیل خلاً میں نہیں ہوتی بلکہ فطرت میں جو صلاحیتیں ہوتی ہیں، انھیں کو مشق و تربیت اور فکر و ارادہ کی قوت ایک خاص ڈھنگ پر ڈال دیتی ہے اور اسی کا نام خلق ہے۔ خلق نہ تو خلافِ فطرت ہوتا ہے اور نہ فطرت سے بنا بنایا ہی ملتا ہے۔ انسان کی فطری صلاحیتوں میں اختلاف ہوتا ہے۔ اسی لیے لوگوں کے اخلاق مختلف ہوتے ہیں۔ کسی کو زیادہ اور بہتر صلاحیتیں ملتی ہیں اور کسی کو کم اور گھٹیا۔ مگر اس کے باوجود اخلاق میں تغیر ہوتا ہے اور تبدیلی ممکن ہے۔ اخلاق چونکہ انسان ماں کے پیٹ سے لے کر نہیں آتا بلکہ معاشرہ اور فرد کی کوششوں سے بنتا ہے، اس لیے متغیر ہو سکتا ہے۔ انبیاء کی تعلیم، اساتذہ و والدین کی تربیت، سزا اور جزا کا قانون، ترغیب اور ترہیب کے ذرائع، یہ سب چیزیں عبث قرار پاتیں اگر اخلاق اٹل اور فطری ہوتے اور ان میں کوئی تبدیلی ممکن نہ ہوتی۔

خلق دو طرح کے ہوتے ہیں: اچھے اور بُرے۔ اچھے اخلاق فضائل کہلاتے ہیں اور بُرے رذائل۔ اچھے اور بُرے کا معیار کیا ہے۔ اس کے لیے نفس انسانی کے نفسیاتی مطالعہ کی ضرورت ہے۔ انسانی نفس کے تین اجزا یا اس کی تین قوتیں ہوتی ہیں:

عقل، غضب اور شہوت۔

غضبی اور شہوانی نفس جب عقل کی حکمرانی قبول کر لیتے ہیں اور ان کا ہر فعل عقل کے فیصلوں کے مطابق ہوتا ہے، تو ان سے فضائل پیدا ہوتے ہیں۔ نفس غضبیہ کی فضیلت شجاعت اور نفس شہوانیہ کی عفت ہے اور عقل جب اپنی روشنی میں ترقی کرتی جاتی ہے اور افعال کی تنظیم اور قوتوں پر حکمرانی میں کامیاب ہوتی جاتی ہے، تو ایک تیسری فضیلت پیدا ہوتی ہے، جسے حکمت کہتے ہیں۔ یہ عقل کی فضیلت ہے۔ دراصل یہی حکمت وہ اصل فضیلت ہے جس کی وجہ سے شجاعت شجاعت ہے اور عفت عفت۔ مگر شجاعت، عفت اور حکمت اس وقت تک نہیں پیدا ہو سکتے جب تک کہ ان میں باہمی ہم آہنگی نہ ہو۔ اور سب کا فعل توازن سے انجام نہ پائے۔ یہ توازن اور اعتدال راس الفضیلت ہے اور یہ ان ساری قوتوں کے باہمی تعامل اور توافق سے وجود میں آتی ہے۔ اس فضیلت کو عدالت کہتے ہیں۔

غرضکہ روح انسانی کے نفسیاتی مطالعہ سے چار فضائل کا اثبات ہوا۔ لیکن اگر نفوس ثلاثہ کا فعل مخالف سمت میں ہو اور عقل کی حکمرانی نہ ہو تو پھر رذائل پیدا ہوتے ہیں۔ نفوس ثلاثہ کی یہ مخالفت دو طرح کی ہوتی ہے: ایک افراط اور دوسرے تفریط کی جانب۔ اس طرح چار امہات فضائل کے مقابلہ میں آٹھ بنیادی رذائل وجود میں آتے ہیں۔ مسکویہ نے بڑی تفصیل سے ہر ہر فضیلت اور اس کے مخالف رذائل کا ذکر کیا ہے۔

انسان کی سعادت جو فی نفسہٖ خیر ہے، انھیں فضائل کے حصول میں مضمر ہے۔ سعادت کوئی خارجی شے نہیں بلکہ عقل کی روشنی میں ارتقا و تکمیل کا دوسرا نام ہے۔ اسی سعادت میں انسان کی بہترین مسرت پنہاں ہے۔

یہ سارے فضائل عقل عملی کے مظاہر اور پیداوار ہیں۔ لیکن انسان کی عقل کا ایک جز نظری بھی ہے اس کا مقصد حقیقت کی معرفت اور علوم کا حصول ہے اور اسی میں نظری عقل کا کمال اور سعادت مضمر ہے۔ انسانی سعادت دونوں عقلوں نظری اور عملی کی تکمیل کا نام ہے۔ لیکن عقل نظری کو عقل عملی پر ترجیح حاصل ہے۔ اس لیے سعادت علمی و نظری سعادت عملی کے مقابلہ میں برتر اور بلند تر ہے بلکہ سعادت علمی سعادت عملی کی غایت اور مقصود ہے۔ اخلاق فلسفہ و حکمت کا خادم ہے۔

یہ سعادت ظاہر ہے کہ چند انسانوں کے نصیب میں آ سکتی ہے مگر عام انسان باہمی تعاون اور مشارکت سے اس سعادت میں ایک حد تک حصہ لے سکتے ہیں اور اپنی انفرادیت کو مکمل کر سکتے ہیں۔ معاشرہ انسانی کی بنیاد انسانی محبت اور ہمدردی پر قایم ہے۔ انسان، انس (یعنی محبت) سے مشتق ہے۔ یہ انس اس کی فطرت میں داخل ہے۔ اس لیے مواخات اور ہمدردی، دوستی اور خیر خواہی ذاتی اغراض کی تکمیل کے ذرائع نہیں بلکہ فطرت انسانی کی پکار، اس کے داعیہ کی تکمیل کا نام ہیں۔ معاشرہ اسی جذبہ انس کو ترقی دیتا اور منظم کرتا ہے۔ ریاست اس کی مکمل ترین شکل ہے اور فرد کی طرح معاشرہ اور ریاست کا مقصد بھی سعادت کا حصول ہے۔ معاشرتی اور ریاستی زندگی ہر انسان کے لیے ضروری ہے۔ عزلت و گوشہ نشینی نفس کی قوتوں کا اہمال اور جذبہ انس کا قتل اور اجتماعی ذمہ داری سے فرار کا دوسرا نام ہے۔ معاشرہ اور ریاست کو شریعت اور قانونِ الٰہی کا پابند ہونا چاہیے۔ بغیر اس کے نہ خواص سعادت حاصل کر سکتے ہیں اور نہ عوام۔

صوفیانہ اخلاق

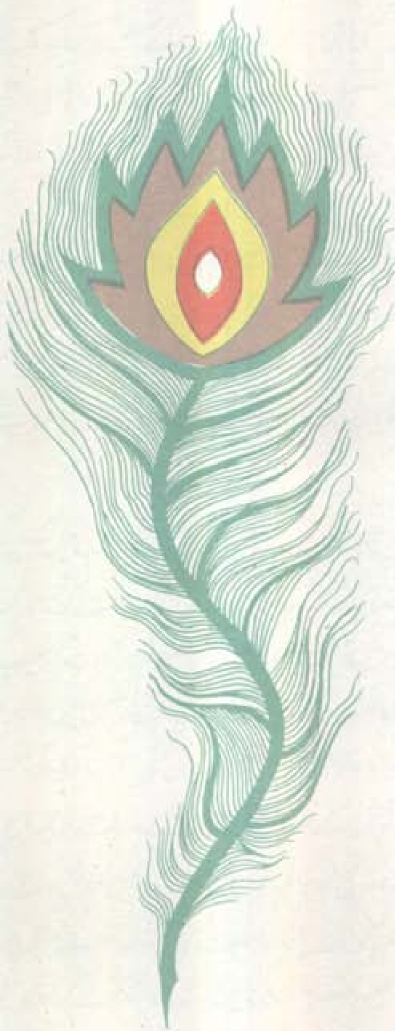
مسکویہ کی اخلاقیات کے ساتھ فلسفیانہ اخلاق کا پہلا دور ختم ہو جاتا ہے۔ کندی، فارابی، ابن سینا اور مسکویہ کے دور میں فلسفہ کے ساتھ ساتھ تصوف کا ارتقا بھی ہو رہا تھا۔ ابتدائی دور کے صوفیہ میں خوف و خشیت کا غلبہ تھا اور اس کے بعد کے صوفیہ میں محبت و عشق کا بلکہ حقیقی معنی میں تصوف اسی محبت و عشق والے دور سے شروع ہوتا ہے، شروع شروع میں صوفیہ نے اخلاق کی جو تعلیم دی اور ان کی زندگیوں نے جس کی ترجمانی کی اس میں زہد، دنیا سے کنارہ کشی، صبر و توکل، تسلیم رضا، محبتِ الٰہی اور رویت باری کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ بعد کے آنے والوں نے انھیں کی تعلیمات کو منظم کیا اور ان کو ترقی دی۔ چنانچہ ابو طالب مکی نے ایک مشہور کتاب "قُوت القلوب" کے نام سے لکھی جس میں تعلق باللہ کے ان مدارج کا تفصیلی تذکرہ کیا۔ تصوّف کے نظریات پر سب سے اچھی کتاب کلاباذی کی "التعرف لمذہب التصوف" ہے۔ کلامی اخلاقیات میں جن جن مسائل کا ذکر اُوپر کیا گیا ہے، ان مسائل کے بارے میں صوفیہ نے انھیں خیالات کو اپنایا ہے جنھیں اشاعرہ نے پیش کیا ہے۔ صوفیانہ اخلاق اعمال کے باطن کی اہمیت، نیت کے اخلاص اور داخل کی صفائی اور قلب کی تطہیر پر زیادہ زور دیتا ہے۔ اس کا مقصد خدا کی ہمہ وقتی یاد، اس کے ساتھ قلبی وابستگی و محبت اور اس کی ذات میں فنا ہو جانا ہے۔ مگر اس فنائیت میں فرد کی شخصیت کی علٰحدہ حیثیت ختم نہیں ہوتی، باقی رہتی ہے۔

اسلام کے ابتدائی چار صدیوں میں اخلاقی فکر کا یہ ایک ہلکا سا جائزہ ہے۔ اس دور میں تینوں مکاتب الگ الگ ترقی پا رہے تھے۔ ان کو ملا کر ایک جامع نظامِ اخلاق کی شکل دینا امام غزالی کا کام تھا اور ان کی ذات سے اخلاقی فکر کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ

اور ہم نے آپ کو تمام عالموں کے لیے صرف رحمت بنا کر بھیجا ہے

(الانبیآء: ۱۰۷)



رحمۃ للعالمین

اسمِ پاک محمد صلی اللہ علیہ وسلم

مولانا عبد الرحمٰن ندوی

حضورؐ کا نام نامی آپؐ کے دادا "عبد المطلب" نے رکھا تھا۔ عام طور پر اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ رجاء ان یحمد عبد المطلب نے آثارِ نیک دیکھ کر محمدؐ نام رکھا کہ مستقبل میں یہ مولود سعید آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم مجموعۂ محامد اور مرجع خلائق بنے۔ اربابِ تصوف موشگافی کی انتہا کر دیتے ہیں۔ اور بتلاتے ہیں کہ یہ لفظ "محمد" خدا کے نام "احد" سے مشتق ہے۔

اگرچہ عام طور پر نام کی صرف اس قدر ضرورت سمجھی جاتی ہے کہ چند چیزوں میں باہم امتیاز قائم رہے، لیکن نام کی صحیح اور حقیقی غرض یہ نہیں۔ اسم کو اپنے مسمّٰی کی صفات، خواص اور حالات کا آئینہ ہونا چاہیئے۔ افراد کے نام رکھنے میں تو اس کا کم لحاظ کیا جاتا ہے، لیکن عموماً انواع و اجناس کے نام اسی مقصد کو پورا کرتے ہیں۔ مثلاً انسان، مسلم، قوم۔ شاذونادر طریقے پر افراد و اشخاص کے ناموں میں بھی اس کا لحاظ کر لیا جاتا ہے جیسے "مسیح" اور "بدھ" یہ دونوں نام اپنے مسمّٰی کے اوصاف اور خواص کو بتلاتے ہیں۔

یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جیسا کہ تاریخی طور پر ثابت ہے کہ آپ سے پہلے عرب میں کہیں اس نام کا پتا نہیں چلتا۔ مورخین اکثر لکھتے ہیں۔ ولم یکن شائعاً بین العرب ھٰذا الاسم۔ اس حالت کو تسلیم کرتے ہوئے دیکھا جائے تو اتفاقی طور سے "نامِ مبارک" کا "عبد المطلب" کے ذہن میں آنا منشاء خداوندی معلوم ہوتا ہے کہ جب اس نام کا محل کامل دنیا کو اپنے وجودِ گرامی سے مشرف کر چکا تو پھر اسم بھی فطری طور سے نام رکھنے والے کے ذہن میں وارد ہوا۔

نامِ مبارک کا عام اور سادہ ترجمہ یہی کیا جاتا ہے کہ "وہ ذات جس کی تعریف کی گئی"۔ اس ترجمہ کی صحت میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن اس جامعیتِ کبرٰی، برزخ کامل اور مقصودِ آفرینش کے فضائل و کمالات کے سامنے ترجمہ ہیچ ہے خدا کے تمام نبی اس کے نزدیک موجب توصیف ہیں۔ دنیا کے تمام حکیم، فاتح عام انسانوں کی نظروں میں لائق مدح و ستائش ہیں۔ اس لیے اس ترجمہ کی صحت کو پورے طور پر تسلیم کرتے ہوئے تفحص کو اور زیادہ وسعت دیں۔ صاحب مفردات "محمدؐ" کے معنی لکھتے ہیں الذی اجمعت فیہ الخصال المحمودۃ یعنی مختصر لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ لفظ "محمدؐ" کے معنی مجموعۂ خوبی کے ہیں۔

اے کہ تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم

کارسازِ قدرت کی وسعت لامحدود اس کے کرشمے ناقابل شمار اس کی خلقت کا دروازہ ہمیشہ کے لیے وا ہے۔

غور کرنے سے ہم اپنی عقل کے مطابق اس فیصلے پر پہنچتے ہیں کہ قدرت نے تخلیق انواع کے لیے ایک معیار مقرر کیا ہے۔ مخلوقات کی ہر نوع کا ایک درجہ کمال ہے کہ جس کے آگے اس کا قدم نہیں بڑھتا۔ "حیوانات" "نباتات" اور "جمادات" تک میں اس کے شواہد مل سکتے ہیں۔ صورتیں ایک ہیں، شکلیں متحد ہیں، اوصاف مختلف ہیں، لیکن ان مختلف اوصاف کی ایک انتہا ہے، جسے جنس اعلیٰ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ جس کے آگے کوئی درجہ نہیں۔ ہر نوع میں جنس اعلیٰ کو جس پر اوصاف جامعیت کے ساتھ جا کر ختم ہوتے ہیں، ہم مقصود فطرت اور نقطہ تخلیق کہہ سکتے ہیں۔ اس نقطہ تخلیق کی اصطلاح کو پوری تشریح کے ساتھ ذہن میں رکھنا چاہیئے۔ یہ بات تھوڑے سے غور اور مشورے سے بہ آسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔ تفحص اور تفتیش کے بعد تمام انواع مخلوقات کے اوصاف کا ایک درجہ اعلیٰ پاتے ہیں۔ کہ جس کے آگے انسانی معلومات میں کوئی درجہ نہیں۔

دوسرے تمام انواع کی طرح اس مقصود فطرت کو انسانوں کی جماعت میں بھی تلاش کرنا ضروری ہے۔ دوسری مخلوقات اور انسانوں میں ایک عام اور بیّن فرق یہ ہے کہ وہاں نوع کے سیکڑوں افراد ہیں اور یہاں اوصاف و خصوصیات کے اعتبار سے ہر ہر فرد اپنے مقام پر نوعِ مستقل ہے۔ آفرینش انسان کی مجمل یا مفصل تاریخ پر ایک اجمالی نظر بتلا سکتی ہے کہ آج بھی انسان کی شکل و شباہت، اس کے اعضاء و جوارح، اس کا ڈھانچہ جسمانی ساخت ٹھیک وہی ہے، سب چیزیں وہی ہیں جو دنیا کے پہلے انسان کی تھیں لیکن دماغی کیفیتوں کا حال ان سے جُدا گانہ ہے۔ ان میں برابر ارتقاء و اختلاف جاری ہے۔ اب اگر انسان کی اس ارتقائے دماغی پر غور کیا جائے، تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ماقبل و مابعد ادوار، زبانوں کی تاریخ میں ارتقاء دماغی کی آخر ترین سرحد اگر کوئی معلوم ہو سکتی ہے، تو وہ ذات قدسی صفات آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ لغات قاموس نے لفظ "حمد" کے ایک معنی قضاء الحق کے بھی بتلائے ہیں۔ پس لفظ "محمد" کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ وہ جس کا حق پورا کر دیا گیا ہو۔ یعنی قدرت کی جانب سے نوع انسان کو جس سرحد کمال تک پہنچانا مقصود تھا اور انسان کا اپنے خالق پر جو حق تخلیق مقرر تھا، وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر پورا کر دیا گیا۔ علم و عمل، خلق و خُلق، دماغ و کیرکٹر ارتقائے ذہنی و ارتقائے عملی یہی دو چیزیں انسان کا خلاصہ اور اس کی کائنات تخلیق کا لب لباب ہیں۔ اول ثانی کے لیے بنیاد ہے عمل علم پر کیرکٹر دماغ پر، خُلق خَلق پر قائم ہے۔ یہ ایک عجیب نکتہ ہے جس کی تشریح کسی دوسرے مقام پر آئے گی کہ جتنی ہی کسی انسان کی حالت مکمل ہو گی، اسی قدر اس کی خلقی کیفیت راسخ و مستحکم ہو گی۔ ایک کا کمال دوسرے کے کمال کی علامت اور ایک کا نقصان دوسرے کے نقصان کی نشانی ہے۔ تاریخی طور پر یہ امر ثابت ہے کہ کیرکٹر اور اخلاق کی جملہ شاخوں کی پختگی اور تکمیل کا جو نمونہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک نے پیش کیا، عالمِ انسانی اس کی نظیر سے عاجز ہے۔ حتیٰ کہ خود دشمنوں کے اقرار سے اس کو فرما دیا گیا انك لعلیٰ خلق عظیم

محاورات عرب سے حمد کے یہ بھی معنی معلوم ہوتے ہیں کہ کسی کام کو اپنی قدرت کے مطابق انجام دینا حماسیات میں نیزہ کے بھرپور پڑنے کے وقت حمدت بلاءہ (میں نے وار پورا کیا) کا محاورہ بہت مشہور ہے۔ اس معنی کو سامنے رکھتے ہوئے اور اوپر کے مضمون کو پیش نظر رکھ کر بے تامل کہا جا سکتا ہے کہ لفظ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معنی مخلوق کامل کے بھی ہیں۔

منجملہ دیگر کمالات نبوت و معجزات رسالت کے ایک معجزہ گرامی حضورؐ اقدس کا نامِ نامی بھی ہے یہ زندہ جاوید معجزہ بعثت کے وقت سے تا ہنوز اپنے فضائل کی شہادتیں پیش کر رہا ہے۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے کہ محمد الذی یحمد مرۃ بعد مرۃ جس کی تعریف کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہو۔ تعریف کے بعد تعریف اور توصیف پر توصیف ہوتی رہے۔ زمانہ جوں جوں بڑھتا جاتا ہے اور انسان اپنی سعی و کوشش کے مطابق جس درجہ ترقی کرتا جاتا ہے، محض اعتقاداً نہیں بلکہ واقعتہً رسالتماب روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کما... سے پردہ اٹھتا جاتا ہے۔ علماء و فضلاء یورپ کی اکثریت تاریخ اسلام کے ماتحت اپنا مطالعہ جس قدر گہرا کرتی جاتی ہے، دنیا کی مختلف پریشانیوں اور بیقراریوں کو معدوم کرنے کی ضرورت ان کے نزدیک جتنی ہی بڑھتی جاتی ہے۔ بادلِ ناخواستہ انہیں اسی راہ کی طرف آنا پڑتا ہے اور زبان اعتراف کھولنا پڑتا ہے کہ بے شبہ پیغمبرِ عرب کے قانون و دنیا کی ضرورتوں کے کفیل اور ان کی زندگی عالم انسان کے لیے ایک بہترین نمونہ ہے۔ اہلِ ایشیا کا رجحان طبعی جتنا روحانیت اور سادگی کی طرف بڑھ رہا ہے، اسی قدر وہ پیغمبر عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب تر ہوتا جاتا ہے۔" یہ دنیا کا صرف واحد معجزہ ہے کہ نام مبارک تیرہ سو برس پہلے سے اس آنے والی حالت کا پتا دے رہا ہے۔ مستقبل میں دنیا کی عمر جس قدر دراز ہوگی خواہ وہ اپنی موجودہ حالت میں ترقی کرے جس کی بظاہر امید نہیں اور خواہ اپنے پچھلے سبق دہرائے دونوں حالتوں میں اسے کمالاتِ نبوت کے اعتراف سے چارہ نہ ہوگا۔ اس حیثیت سے نام مبارک کا ترجمہ سلسلۂ اوصاف و محامد ہوگا۔

جیسا اوپر کہا گیا ہے، عام طور سے اشخاص کے نام اور اوصاف باہم کوئی نسبت نہیں رکھتے، شاذ و نادر اتفاقی حیثیت سے تناسب بھی مل جاتا ہے اور ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ کسی انسان کا وہ نام رکھا گیا ہو جو اس کی تمام زندگی کا آئینہ دار اور اس کے شعبہائے حیات کی تفصیل ہو، مگر نامِ نامی آقائے نامدارؐ اس سے مستثنیٰ ہے۔ اسی مطابقت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس خاص نام کے رکھنے کے متعلق ضرور عبدالمطلب کو ایک غیبی تحریک ہوئی۔ اب غور کیا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا خلاصہ دوست و دشمن کی یکساں تنقید حاضر و غائب کی رائے زنی کا ماحصل اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ علم و عمل، ظاہر و باطن، خلق و خُلق ہر حیثیت سے حضور کی زندگی قابلِ تعریف تھی اور اسی خلاصہ حیات کا ترجمہ ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

اور اس سے بھی زیادہ عجیب امر یہ ہے کہ نام مبارک حضورؐ کے نہ صرف نبی بلکہ خاتم النبین ہونے کی دلیل بھی ہے کمال و کمالِ اخلاق بھی انبیاء علیہم السلام کی مخصوص اور ممتاز صفات میں سے ہیں۔ دوسرے انبیاء علیہم السلام کا کمال علمی و عملی کسی ایک خاص صفت میں مخصوص تھا۔ لیکن حضورؐ کی جامعیت آپؐ کی سوانح و تعلیمات سے معلوم کی جا سکتی ہے۔ لفظ "محمد" کے معنی مجموعۂ خوبی اور "مخلوق کامل" کے جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں، اس کے آگے کوئی نقطہ ہی نہیں ہے۔ اسی حالت پہ کمال کلی کی انتہا اور معارف کا اختتام ہے جس کے بعد نہ کسی نبی کی حاجت، نہ کسی نبی کا وجود ممکن ہے۔ مستشرقین یورپ میں سے جن لوگوں نے آنحضرتؐ کی سیرت پاک کا مطالعہ کیا ہے، وہ باوجود ہزار سعی

تنقیص اعتراف کمال پر مجبور ہوئے ہیں۔ سرولیم میور اور مارگولیتھ جیسے سخت لوگوں کو بھی کھلے اور چھپے لفظوں میں اس کا اقرار کرنا پڑا کہ پیغمبر اسلامؐ کی تعلیم انتہائی سچائی اور حقیقی صداقت پر مبنی نظر آتی ہے۔ عہد نبوت میں بھی اسی قسم کے واقعات پیش آ چکے ہیں۔ کہ بعض سخت ترین منکر ایک توجہ نظر اقدس کی تاب نہ لا سکے۔ عبد اللہ بن سلام، جو نامور علماء یہود میں سے تھے، وہ جس طرح اسلام لائے معلوم ہے۔ بعثت کے حالات، سیرت طیبہ، تعلیم و تلقین اپنے اندر کچھ ایسی کشش رکھتی ہے کہ مخالف سے مخالف اور سخت سے سخت حریف اعتراف پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس خاصیت اور بے اختیار کشش کو نام مبارک میں بیان کیا گیا۔ لفظ "محمدؐ" عربی زبان میں تحمید سے مشتق ہے، جو باب تفصیل کا مصدر ہے اس باب کے معنی کے خواص میں سے ہے کہ کسی کام کا وجود میں آنا اس طور پر مانا جائے کہ گویا کسی مخفی یا ظاہر طاقت نے اس کو وجود میں آنے کے لیے مجبور کیا۔ جیسے صَرّفَ (پھیر دیا) یعنی کسی طاقت نے بے اختیار کرکے پھیر دیا۔ اسی طرح "محمدؐ" کے معنی ہیں، وہ جس کی تعریف بے اختیار کی گئی ہو۔ اس معنی سے اسی قوت جاذبہ اور کشش اصلی کی طرف اشارہ ہے۔ عبد اللہ بن سلام کے متعلق مروی ہے کہ وہ چہرۂ اقدس کو دیکھتے ہی پکار اٹھے ھٰذا لیس بوجہ کذاب یورپ میں بڑی ہوشیارانہ تدبیر سے محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بدترین پیرایوں میں دکھلانے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ لیکن اب آج کل بعض جماعتوں اور خدا ترس بندوں کی طرف سے جو مساعی جمیلہ کی جا رہی ہیں، انہوں نے تجربہ کرا دیا کہ جب کبھی اصل صورت ان کے سامنے پیش کی گئی ہے، تو انہوں نے یہی کہا کہ یہی تو ہمارا کعبہ مقصود ہے۔

اس باب کی دوسری خاصیت یہ بھی ہے کہ وہ کسی کام کے اس طور پر ہونے کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے تمام پہلوؤں کا استقصاء کیے ہوئے ہے۔ کوئی جزء اس سے چھوٹا ہوا نہیں استعمال میں آتا ہے قَتَّلَہٗ تَقْتِیْلاً یعنی خوب خوب قتل کیا۔ اس خاصیت کا لحاظ رکھتے ہوئے نام مبارک کے یہ معنی معلوم ہوتے ہیں کہ "محمدؐ" یعنی جس کا جزء جزء قابل تعریف ہے "اصلاح نفس" تدبیر منزل اور تدبیر مدن کی وہ کون سی شاخ ہے جس کا عملی نمونہ ذات قدسی صفات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش نہیں کر دیا۔ انبیاء علیہم السلام کا تمام تر سلسلہ عالم میں ایک خاص ترتیب، نظام کے ساتھ آیا اور ہر ایک اپنے اندر کوئی نہ کوئی کمال اخلاقی یا عرفانی یا انتظامی لایا۔ یہ بابرکت سلسلہ جب اپنی حد و نہایت کو پہنچا، ضرورت ہوئی کہ عالم انسان کے سامنے ایک ایسا نمونہ کامل پیش کیا جائے، جو ان تمام صفات کا مجمع اور رفضائل کا آئینہ ہو جس کی زندگی کو سامنے رکھنے سے موسویانہ متی، مسیحانہ اخلاق، ابراہیمی محبت بیک وقت نظر کے سامنے آ جائے اور پھر ان تمام اوصاف میں وہ اپنے متقدمین سے بالاتر ہو۔ وہ ہستی کا جامع اور یہ رخ کامل ذات پاک حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے اسی لیے حضرت مسیح نے اپنی بشارت میں لفظ "احمد" فرمایا یعنی وہ آئے گا جو اپنے تمام پہلے آنے والوں کا سردار اور سب پر فائق ہوگا۔ دنیا کے تمام بڑے بڑے مذاہب نے اپنی کامل نشوونما جب ہی پائی ہے، جب وہ معرفت و روحانیت کی آغوش سے نکل کر سلطنت اور حکومت کی گود میں چلے گئے ہیں۔ مسیحی مذہب کی ترقی رومی بادشاہوں کی رہین احسان ہے۔ بودھ نے بہت کچھ تبلیغ کی لیکن اس کا عالمگیر مذہب بھی اسی وقت بنی

تکمیل کر سکا، جب وہ اشوک خاندان کی سرپرستی میں آگیا، لیکن اسلام اپنی تاریخ میں بالکل علیحدہ ہے۔ وہ جن جن ملکوں میں گیا اور جن جماعتوں میں پھیلا، اخلاق و روحانیت سے گیا۔ بغیر تلوار اسلام میں روحانیت اور مذہب کے داخلہ کے بعد گئی ہے۔ افریقہ اور ہندوستان کی نظیریں اس بارہ میں بہت صاف ہیں۔ اس خاص نعمت تبلیغ کو بھی نام مبارک میں ظاہر کر دیا گیا۔ فقطع دابر القوم الذین ظلموا والحمد للہ رب العالمین بظاہر اسباب ان مفاسد کے مٹنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی، لیکن فطرت کی تدبیریں اندر اندر جاری رہتی ہیں اور ایک وقت معین پر ظاہر ہو جاتی ہیں۔ فطرت کی رفتار ہوا کی طرح تیز اور سیلاب کی طرح نرم ہوتی ہے۔ خوش تدبیری اور حسن اسلوب کے موقع پر بھی حمد کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ لفظ "محمدؐ" کے ایک یہ بھی معنی قرار دیئے جا سکتے ہیں کہ وہ جس کے ساتھ خوش تدبیری نے ترقی کی۔ آپؐ کی تعلیم کا انتشار آپ کا لایا ہوا دین خدا کی خاص مرضی اور خاص تدبیر سے عالم میں پھیل گیا، جس کی سرعت اور بغیر جدوجہد رفتار ترقی سے اس وقت بھی دنیا متحیر ہے۔

الغرض اسلام کی تمام معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ پیغمبر اسلام کا نام مبارک بھی اپنے معانی کے لحاظ سے مختلف خوبیوں کا مرقع، بہتیرے فضائل کا خلاصہ ہے۔ ایک طرف وہ اپنے مسمیٰ کے کام اور کام کے انجام کی پیش گوئی ہے۔ دوسری طرف اس کے کاموں کی تاریخ اور اس کی تعلیم کا لب لباب ہے۔

پاک ہے وہ اللہ جس نے اپنے نبی کا ایسا پاک نام رکھا اور پاکیزہ ہے وہ نبی جسے اس کے معبود نے ایسی فضیلتوں سے آراستہ کیا۔ والحمد للہ رب العالمین۔

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

مالکِ رام

قرآن میں جن و انس کی تخلیق کی غرض و غایت اور ان کا مقصدِ حیات یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نیک اور عبادت گزار بندے بنیں:

وما خلقت الجن و الانس الّا لیعبدون - (۵۱ : ۵۶)

جب تخلیق کی علتِ غائی یہ ٹھہری تو یہ کیونکر تصور کیا جا سکتا ہے کہ خداوند کریم نے بندوں کے لیے ایک منزل تو مقرر کر دی، لیکن اس تک پہنچنے کے لیے کوئی رستہ نہیں بتایا اور کوئی اس رستے کا بتانے والا پیدا نہیں کیا۔ انہی دونوں شکوک کا ازالہ یوں کیا کہ فرمایا:

انّ الدّین عند اللہ الاسلام (۳ : ۱۹)

کہ ہم تک پہنچنے کا راستہ اسلام کہلاتا ہے اور مسلمان کون ہے:

الذین یؤمنون بالغیب و یقیمون الصّلٰوۃ و ممّا رزقنٰھم ینفقون و الذین یؤمنون بما انزل الیک و ما انزل من قبلک و بالاٰخرۃ ھم یوقنون -(۲ : ۳-۴)

مسلمان وہ ہیں، جو اَن دیکھے خدا پر ایمان لاتے ہیں اور اسی کی عبادت میں مشغول رہتے ہیں۔ اپنی مادی، ذہنی، اخلاقی اور روحانی، غرض ان تمام صلاحیتوں کو، جو خدا نے ان میں ودیعت فرمائی ہیں، اس کی اور اس کے بندوں کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ صرف یہی نہیں، ان کا یہ بھی ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابتدائے آفرینش سے مخلوق کی ہدایت کے لیے نبی بھیجے اور ان پر اپنی وحی نازل کی۔ اس لیے وہ تمام گزشتہ نبیوں اور اُن کی وحی کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ پھر انھیں اس کا بھی یقین ہے، کہ ہم اس زندگی میں جن اعمالِ نیک و بد کے مرتکب ہو رہے ہیں، ایک نہ ایک دن ان کی جزا و سزا بھی ضرور ملے گی۔ یہی تعلیم ازل سے بنی نوع انسان کی طرف آتی رہی اور یہی وہ رستہ ہے جو منزلِ مقصود تک پہنچانے والا ہے۔ اسی کا نام اسلام ہے۔

پھر صرف رستے ہی کی نشان دہی نہیں کی، بلکہ ایسے لوگ بھی پیدا کیے، جو اس راہ کے ہر پیچ و خم سے واقف تھے، جو جانتے تھے کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے سے پہلے کہاں کہاں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان سے بچاؤ کی صورت کیا ہے۔ راہِ راست پر چلانے والے یہ ہادی ہر قوم میں پیدا ہُوئے:

لکلّ قومٍ ھادٍ - (۱۳ : ۷)

انھوں نے لوگوں کو تعلیم و تلقین کی اور انھیں بتایا کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا ہے؛ نیکی پر عمل اور بدی سے اجتناب کی ہدایت کی۔ یہی لوگ خدا کے نبی اور رسول تھے، جو خدا کی وحی و الہام کی روشنی میں مختلف قوموں کی رہنمائی کرتے رہے۔

ہر ایک نبی اپنی قوم میں سب سے پہلے اپنی نبوت کی صداقت اور خدا کی ہدایت کی حقیقت پر ایمان لاتا ہے۔ دُوسرے لفظوں میں وُہ اوّل المسلمین ہوتا ہے۔ وہ گویا نمونہ ہے اسلام اور اسلامی تعلیم اور اعمال کا۔ دوسرے لوگ اس کا تتبع کرتے ہیں۔ یہی گروہ اس کے پیرو اور اس کی امت کہلاتے ہیں۔

اب ظاہر ہے کہ اسلام، مسلم، نبی، رسول، وحی، الہام وغیرہ ذالک، یہ سب الفاظ عربی زبان کے ہیں اور تمام ملکوں میں یہ اصطلاحیں جاری نہیں رہی ہوں گی۔ خواہ عربی ام الالسنہ ہی کیوں نہ ہو۔ کسی نہ کسی مرحلے پر دنیا میں مختلف زبانیں رائج ہوگئیں اور پھر جس ملک، یا قوم میں کوئی نبی آیا، اس کی وحی بھی اس قوم کی زبان ہی میں رہی ہوگی، تاکہ وہ لوگوں کو راہِ ہدایت دکھا سکے:

وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ لیبین لھم ۔ (۱۴: ۴)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وحی صرف عربی میں نہیں ہوسکتی تھی۔ اس سے تو اس کی بعثت کا مقصد ہی فوت ہو جاتا، کیونکہ اس کی بات کسی کی سمجھ میں نہ آتی۔ اگر طالب عالم استاد کی گفتگو سمجھ ہی نہ سکے، تو وہ تعلیم کیا حاصل کرے گا۔ حاصل کلام یہ کہ اگرچہ نبی مختلف اقوام میں آئے اور ان کی وحی کی زبان بھی الگ تھی، لیکن اس کا مفاد اور مقصد یکساں تھا۔

غرض اللہ تعالیٰ کی ہدایت تمام قوموں کی طرف آئی اور اس کا ذریعہ انبیاء ربانی تھے۔ جب منبع ہدایت ایک تھا اور ذریعہ ہدایت ایک، تو یہ لازمی بات ہے کہ اس کے نتیجے میں ہدایت یا دین بھی ایک ہی ہوتا اور دنیا کبھی گمراہ نہ ہوتی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے باوجود قومیں راہِ راست سے بھٹک گئیں۔ انھوں نے طرح طرح کے معبود گھڑ لیے اور ان کی پُوجا کرنے لگیں۔ ان معبودوں نے مختلف جگہوں پر مختلف شکلیں اختیار کیں۔ مثلاً ہندوستان اور عراق قدیم (بابل) میں یہ اجرام فلکی، سورج، چاند، ستارے تھے۔ بلکہ ان سے بھی گزر کر ہر قسم کے دیوی دیوتا بنا لیے گئے۔ زمین، پانی، آگ، بارش، بجلی، رعد، غرض ہر ایک چیز کی دیوی تھی یا دیوتا۔ ان کی مورتیاں بنائی گئیں۔ اور ان کے لیے خاص مندر تعمیر ہُوئے، جہاں اُن کی پُوجا ہوتی تھی اور ان کو خوش رکھنے کو چڑھاوے چڑھائے جاتے۔ چین اور جاپان میں متوفی بزرگوں کی پرستش بھی ہوتی تھی وعلیٰ ذالک، ہر جگہ کا یہی حال تھا۔

لیکن اس راہ کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ متعدد قوموں نے ان انبیاء اللہ ہی کو معبود کا درجہ دے دیا۔ جو مخلوق خدا کو اپنے خالق اور رب کی طرف بلانے کے لیے آئے تھے۔ اپنے منصب کی رعایت سے ان کی مثالی زندگی میں تو شبہ ہو نہیں سکتا۔ تائیدِ ایزدی سے وُہ گناہ سے بھی معصوم تھے۔ بس یہی بات ان کے پیرؤں کی سمجھ میں نہ آئی۔ انھوں نے خیال کیا کہ یہ لوگ ہماری طرح کے گوشت پوست کے معمولی انسان نہیں ہوسکتے۔ ورنہ ان میں بھی وہی کمزوریاں ہوتیں، جن میں ہم سب مبتلا ہیں۔

انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے اور عبادت کا نتیجہ ہونا چاہیے کہ جہاں تک ہوسکے، انسان اپنے آپ کو صفاتِ الٰہی کا مظہر بنائے۔ ہم میں سے ہر ایک شخص اپنے ماحول میں رہنے پر مجبور ہے اور مختلف اوقات میں اس ماحول کے مقتضیات بھی مختلف ہوں گے۔ جو شخص کسی خاص حالت میں بطور ردِّ عمل کسی صفت الٰہیہ کا سب سے زیادہ مظاہرہ کرتا ہے، وہ اتنا ہی اپنے مقصدِ حیات میں کامیاب گردانا جائے گا:

و من احسن من اللہ صبغۃ ۔ (۲: ۱۳۸)

انبیاء الٰہی سے زیادہ اور کون موید من اللہ اور ان سے زیادہ اپنے قول و فعل پر کون قادر ہو گا پس جب انھوں نے ہر ایک موقع پر عام انسانی سطح سے بلند ہو کر کلام کیا اور اس پر عمل کر کے دکھا دیا، تو ظاہر بین نظروں نے یہ تو نہ دیکھا کہ یہ غیر معمولی عمل تائید خداوندی کا نشان ہے، بلکہ اس سے یہ غلط نتیجہ نکالا کہ یہ شخص ہماری نوع کا نہیں۔ انسانی بھیس میں خود خدا نے جنم لے لیا ہے۔ بعضوں نے اسے ابن اللہ (یا بنت اللہ) بنا دیا۔ یہ چلن کسی ایک ملک یا قوم تک محدود نہیں رہا، الا ماشاء اللہ دنیا کی اکثر قومیں اس گمراہی کا شکار ہو گئیں، کہ انھوں نے کسی نہ کسی رنگ میں اپنے انبیاء کو ان کے اصل مقام سے زیادہ دے دیا اور انھیں خدائی صفات میں برابر کا شریک اور ند و مثل بنا دیا۔ ہندوستان کے اوتار اور دیوتا بھی اسی قبیل سے ہیں۔ عیسائیوں نے تو حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا ہی بنا دیا اور وہ بھی اکلوتا۔

مراد یہ ہے کہ ایسی صورت حال اتنی مرتبہ پیش آ چکی تھی کہ آیندہ بھی اس کے اعادے کا یقین کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی تھی کہ اس امکان کا ہمیشہ کے لیے قلع قمع کر دیا جائے۔ چنانچہ اسلام نے اپنے کلمے میں اسی کا سدِ باب کیا ہے۔

مخالف اعتراض کرتا ہے کہ خود اسلامی کلمے میں شرک ہے۔ مثلاً ایک صاحب لکھتے ہیں :

"جب حضرت محمدؐ صاحب دنیا میں تھے تو ان کی تعظیم و تکریم ہمارا عین فرض تھا لیکن آج مسلمانوں نے اپنے کلمے کے اندر محمدؐ صاحب کو بھی شامل کر رکھا ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے سوا ہمارا کوئی معبود نہیں، تو اللہ حاضر و ناظر ہے، وہ ہماری بات سنتا ہے۔ لیکن جب ہم کہتے ہیں کہ محمدؐ صاحب ہمارے رسول ہیں اور اس جملے کو اللہ کے کلمہ کے ساتھ وابستہ کر دیتے ہیں، تو حضرت محمدؐ صاحب ہماری بات سنتے نہیں۔ اللہ کے تصور کے ساتھ محمدؐ صاحب کا بھی تصور اسی وقت ہمارے دل کے سامنے آ جاتا ہے پھر توحید کہاں رہی؟" ("مصابیح الاسلام"۔ گنگا پرشاد اوپادھیائے ص ۲۷)

یہ اعتراض بہت لوگوں نے کیا ہے۔ الفاظ بدلتے رہے ہیں، لیکن مفاد سب کا یہی ہے کہ کلمے میں رسول کے نام کی شمولیت توحید کے منافی اور ایک نوع کا شرک ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس اعتراض کی بنیاد ہی غلط ہے اور یہ قلتِ تدبر کا نتیجہ ہے۔ کلمہ خدا یا اس کے رسول کو سنانے کے لیے نہیں پڑھا جاتا بلکہ یہ تو اپنے ایمان کا اعلان ہے۔ کلمہ جزوِ عبادت نہیں، بلکہ یہ صرف پڑھنے والے کی اعتقادی کیفیت اور جماعتی تعلق کی شہادت ہے۔ جب کوئی آدمی " لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کہتا ہے، تو وہ اس بات کا اشتہار دے رہا ہے کہ میں آج سے خدا کے سوا کسی اور معبود کی عبادت نہیں کروں گا، یہاں تک کہ محمدؐ کی بھی نہیں، کیونکہ وہ بھی صرف اس کے رسول ہیں، نہ کہ معبود۔

یہ تو عین توحید پر ایمان اور ایقان کا اعلان ہے، اس میں شرک کہاں سے آ گیا اور اس کی ضرورت جیسا کہ بیان ہو چکا، اس لیے پیش آئی کہ ماضی میں بارہا یہ تلخ تجربہ ہو چکا تھا کہ اُمتوں نے مرور زمانہ کے ساتھ اپنے نبیوں ہی کو معبود بنا لیا تھا۔ حالانکہ نبی یہ کہتے ہی رہے کہ عبادت کے لایق صرف خدائے واحد کی ذات ہے، ہم بھی تمھاری ہی طرح کے انسان ہیں، تمھاری ہی طرح سے ماں، باپ سے پیدا ہوتے اور تمھاری ہی طرح کھاتے پیتے، گلی کوچوں میں چلتے اور پھرتے، کاروبار کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہمیں خداوند تعالیٰ نے اپنی وحی سے نوازا ہے، ورنہ ہم بھی معمولی بشر ہیں۔

(انما انا بشرٌ مثلکم یوحیٰ الیّ انما الٰھکم الٰہٌ واحدٌ - (۱۸ : ۱۱۰)

پس اسلامی کلمے کا مقصد یہ تھا اور ہے کہ کہیں مسلمان بھی اُممِ سابقہ کی طرح اپنے نبی کو معبود نہ بنا لیں۔ معاذ اللہ یہ گویا توحیدِ خالص کا اعلان ہے۔ اس کا پڑھنے والا عہد کرتا ہے کہ آج سے میں کسی غیر اللہ کی عبادت نہیں کروں گا۔ وہ علی الاعلان شہادت دیتا ہے کہ خدا کے علاوہ دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی ہستی بھی لائقِ عبادت نہیں اور محمدؐ اس کے رسول ہیں۔

وما علینا الا البلاغ۔

رحمۃ للعالمین ﷺ

قائدِ اعظم محمد علی جناح

حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سب سے بڑے صاحبزادہ حضرت اسمٰعیل علیہ الصلوٰۃ تھے۔ بائیبل اور تورات کے بیان کے مطابق پھر ان کے ہاں بارہ لڑکے پیدا ہوئے۔ جن میں سے ایک کا نام قیدار تھا۔ جن کی اولاد عرب کے صوبہ حجاز میں آباد ہوئی۔ اہل عرب قیدار کی اولاد ہیں۔ تمام مورخین اس امر پر متفق ہیں کہ حضورؐ قائے عرب وعجم کا سلسلہ نسب عدنان سے ملتا ہے، جو چالیسویں پشت میں حضرت اسماعیلؑ سے جا کر ملتے ہیں۔ اور اس حقیقت سے آج تک کسی نے انکار نہیں کیا کہ حضورؐ کا سلسلہ نسب حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ملتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی نویں پشت میں نضر بن کنانہ کا نام ملتا ہے جو قریش مکہ کے مورث اعلیٰ تھے۔ گویا شرافت اور وجاہت کے اعتبار سے بھی حضورؐ کا خاندان معزز اور باوقار تھا۔ جغرافیہ کا ایک مبتدی طالب علم بھی جانتا ہے کہ جزیرۃ العرب برّاعظم ایشیا کے جنوب مغرب میں واقع ہے جہاں تین برّاعظم ایشیا، یورپ اور افریقہ آپس میں ملتے ہیں۔ آفتابِ اسلام کی ضیا باریوں سے پیشتر دنیا جہالت اور خود ناشناسی کی تاریکیوں میں روپوش تھی۔ اور عرب کی حالت کا تو پوچھنا ہی کیا، وہاں پر لوگوں کا جُدا جُدا اور مختلف مذاہب پر اعتقاد تھا لیکن بُت پرستی سب میں مشترکہ چیز تھی حتیٰ کہ کعبہ مقدس میں بھی ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، عیسیٰؑ اور مریم صدیقہ کے بتوں کی بے محابہ پرستش ہوتی تھی۔

عہدِ جاہلیت

عرب لوگوں کی زندگی کا دارومدار تیغ آزمائی پر تھا۔ اور چونکہ وہ ایسی ہی فضا میں پلتے تھے۔ اس لیے خونخواری اور سفاکی ان کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی۔ ان کے دن رات کے چوبیس گھنٹے باہمی جنگ وقتال میں صرف ہوتے تھے اور ذراسی بات پر تلوار میان سے تڑپ کر نکلتی تھی اور دم بھر میں کشتوں کے پشتے لگ جاتے تھے۔ ان حالات میں انسانی خون کی پاکیزگی کا کسے خیال آسکتا تھا۔ اس کے علاوہ لڑکیوں کو زندہ درگور کر دینا۔ شراب اور عیاشی کی گود میں زندگی بسر کرنا ایسے واقعات ہیں جن پر تاریخ عالم کے اوراق گواہ ہیں۔ مولانا حالیؒ علیہ الرحمہ نے اس صورتِ حالات کا نقشہ کن موثر الفاظ میں کھینچا ہے:

جُوا ان کی دن رات کی دل لگی تھی شراب اُن کی گھٹی میں گویا پڑی تھی
تعیش تھا، غفلت تھی، دیوانگی تھی غرض ہر طرح ان کی حالت بُری تھی

ولادتِ قدسی

لیکن یہ قانونِ قدرت ہے کہ جب موسم خزاں میں درختوں کے پتے خشک ہو کر جھڑ جاتے ہیں تو بہار کی دلفریب ہوائیں بھی بہت دور پیچھے نہیں ہوتیں۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ مُردہ درختوں کے جسم سے لہلہاتی ہوئی

کونپلیں پھُوٹتی ہیں اور قدرت پھر ایک دفعہ دلفریب دُلہن کی طرح حسن کی آرائشوں سے مالا مال ہو جاتی ہے ۔

طلوعِ اسلام

اسی طرح جب عرب گمراہی کی ضلالتوں میں ٹھوکریں کھا رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل نے ایک ایسے سورج کا طلوع کیا جس کی درخشانی اور تابانی نے تاریک ترین راہگزروں کو بھی بقعۂ نور بنا دیا ۔ یعنی ۲۲۔اپریل ۵۷۱ء کو مکہ میں آفتابِ رسالت کا طلوع ہُوا۔ آپؐ کے والد محترم عبداللہ آپ کی پیدائش سے پہلے ہی اس جہان سے رخصت ہو چکے تھے اور آپ ابھی چھ سال کے ہی تھے کہ آپ ماں کی شفقت سے بھی محروم ہو گئے۔ یہی نہیں بلکہ جب آپ کا سن شریف آٹھ سال کا تھا، آپ کے دادا عبدالمطلب نے بھی سفرِ آخرت اختیار کیا۔ اور آپؐ کی پرورش کا تمام بوجھ آپؐ کے چچا ابُوطالب کو برداشت کرنا پڑا۔ اس دوران میں اور جوانی کے آغاز تک آپ گلہ بانی کا کام کیا کرتے تھے۔ گویا اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ آپ جس طرح بھیڑوں اور بکریوں کو درندوں اور خونخوار جانوروں سے محفوظ رکھتے ہیں اسی طرح آپؐ انسانیت کے گلّہ کے بھی راعی ہیں ۔ ۱۳ سال کی عمر میں آپؐ ایک تجارتی قافلہ کے ہمراہ شام کو بغرض تجارت تشریف لے گئے اور اس کے چند سال بعد سرزمین عرب میں قریش اور بنی قیس میں خوفناک جنگ شروع ہو گئی۔ حضور فخرِ دوعالم نے اس خونریزی کو دیکھا اور آپؐ کے حساس دل پر گہرا اثر ہوا۔ اور آپؐ نے حق و صداقت کو بلند رکھنے اور امن عامہ کی حفاظت کا تہیہ کر لیا اور بالآخر آپؐ فریقین میں صلح و صفائی کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ تاریخ میں اس صلح کو "حلف الفضول" کے نام سے یاد کرتے ہیں جس کی رو سے کمزوروں اور مظلوموں کی امداد اور حفاظت کا عہد کیا گیا۔

آپؐ جس وقت سن بلوغت کو پہنچے تو آپؐ نے اپنے آباؤ اجداد کی اقتدا میں تجارت شروع کر دی۔ آپؐ کی دیانت، صداقت، خلوص اور ایمانداری سے حضرت خدیجہؓ اس قدر متاثر ہُوئیں کہ اُنھوں نے آپؐ کو معمول سے دُگنا حصّہ دینے پر اصرار کیا۔

اصحابِ فیل کا واقعہ

یہاں پر تفصیل کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے تمام واقعات کو رقم کرنے کی گنجائش نہیں لیکن ایک واقعہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ آپؐ کی ولادت کے سال میں یمن کے عیسائی حاکم ابرہہ نے اپنے دارالخلافہ میں ایک عظیم الشان گرجا اس ارادہ سے تعمیر کیا کہ خلقِ خدا کا اژدہام کعبہ کی بجائے اس گرجا میں ہو تاکہ کعبہ کی روحانی اور دنیاوی عظمت کا قصرِ رفیع زمین پر آرہے۔ در اصل اس عزمِ مشومہ کی تہہ میں تثلیث کو کامرانی اور کامیابی سے ہمکنار دیکھنا مقصود تھا۔ چنانچہ اس ناپاک مقصد کی تکمیل کے ارادے سے کعبہ پر ایک جرار فوج کے ساتھ حملہ آور ہُوا۔ وُہ مکہ سے تین میل کے فاصلہ پر ٹھہر گیا اور اہلِ مکہ کو اپنے ارادہ سے آگاہ کرنے کے لیے ایلچی روانہ کر دیا۔ اسی اثناء میں ابرہہ کے سپاہیوں نے عبدالمطلب کے بہت سے اونٹوں کو قبضہ میں لے لیا۔ حضرت عبدالمطلب اس سلسلہ میں اس کے پاس چل کر آئے۔ ابرہہ ان کی عظمت و جلالت کو دیکھ کر سخت متحیر ہُوا۔ اور ان کی تشریف آوری کا سبب دریافت کیا۔ اس کا خیال تھا کہ عبدالمطلب الحاح و زاری سے کعبہ کے استحفاظ کی درخواست کریں گے۔ لیکن اس کی امیدوں کے برعکس عبدالمطلب نے اپنے اونٹوں کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ اس پر ابرہہ نے متعجب ہو کر پُوچھا کہ "آپ کو اپنے اونٹوں کی تو بڑی فکر ہے مگر کعبہ کے متعلق جس کو میں گرانے آیا ہُوں، آپ کو کوئی فکر ہی نہیں"۔ عبدالمطلب نے

بلاجھجک جواب دیا کہ "میں اونٹوں کا مالک ہوں ۔ مجھے ان کی حفاظت مطلوب ہے ، کعبہ کا مالک خود اپنے گھر کی حفاظت پر قادر ہے۔ اور وہی اس کا بندوبست کرے گا۔" از لیسکہ قریش ابرہہ کے فشون قاہرہ کا مقابلہ کرنے سے عاجز تھے ۔ اس لیے وہ گرد و نواح کی پہاڑیوں میں رُوپوش ہوگئے ۔ عبدالمطلب کعبہ کو چھوڑنے سے پہلے کعبہ میں گئے اور اس کی چادر کو تھام کر یوں دُعا کی : "اے اللہ ! یہ تیرا گھر ہے ، ہم اس کی حفاظت سے عاجز ہیں تو اپنے گھر کا آپ نگہبان ہو۔" یہ کہہ کر وہ وہاں سے رخصت ہو گئے ۔ اور مورخین کا اتفاق ہے کہ ابرہہ کی فوج پر اتنی زبردست تباہی آئی کہ اس کے لشکر کا کثیر حصہ تباہ و برباد ہوگیا ۔ باقی ماندہ بے سروسامانی میں تتر بتر ہوگیا ۔ قرآن حکیم میں بھی مندرجہ ذیل آیات بینات میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے :

الم ترکیف فعل ربك باصحاب الفیل ۔ الم یجعل کیدھم فی تضلیلٍ وارسل علیھم طیراً ابابیل ترمیھم بحجارۃٍ من سجیلٍ فجعلھم کعصفٍ ماکول ۔

صحرائی تربیت

عرب شرفا میں دستور تھا کہ مائیں اپنے بچوں کو چھاتیوں سے دُودھ پلانے کی بجائے انھیں دیہات کی تندرست عورتوں کے سپرد کر دیتی تھیں ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے چند دن بعد تک آپؐ کی والدہ محترمہ نے آپؐ کو دُودھ پلایا اور اس کے بعد چند دن ثوبیہ نے جو ابولہب کی لونڈی تھیں ، آپؐ کو دُودھ پلایا ۔ زاں بعد آپؐ حلیمہ سعدیہؓ کی تحویل میں دے دیے گئے دو سال بعد آپؐ پھر اپنی والدہ مکرمہ کے پاس تشریف لے آئے ۔ لیکن فوراً ہی پھر دیہات میں بھیج دیے گئے ۔ کیونکہ مکہ میں وبا پھیلی ہوئی تھی ۔ آپؐ چھ سال تک دائی حلیمہ کے گہوارہ میں پرورش پاتے رہے اور اس کے بعد واپس تشریف لے آئے ۔ اس دوران میں آپؐ کی والدہ محترمہ مدینہ کی طرف اپنے خاوند کی قبر کی زیارت کے لیے سفر کر رہی تھیں کہ راستہ میں ہی آپ کا انتقال ہوگیا ۔ اس کے بعد آنحضرتؐ کی خبر گیری کا بار آپ کے دادا عبدالمطلب نے اپنے ذمے لے لیا ۔ بچپن سے ہی آنحضرتؐ میں محبت ، امانت اور صداقت کے جوہر نمایاں تھے جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے ۔ حضرت خدیجہؓ آپ کی امانت اور دیانت سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ انھوں نے خود آپ کے حبالۂ عقد میں آنے کی خواہش ظاہر کی ، حالانکہ اس سے پیشتر عرب کے بڑے بڑے سردار حضرت خدیجہؓ سے نکاح کی خواہش ظاہر کر چکے تھے جسے آپ نے رد کر دیا تھا ۔

حضرت خدیجہؓ

شادی کے وقت آپ کی عمر پچیس سال کی تھی اور حضرت خدیجہؓ آپؐ سے پندرہ سال بڑی ، یعنی چالیس سال کی تھیں ۔ لیکن عمر میں اس تفاوت کے باوصف ان کی آپس میں بیحد محبت تھی ، حالانکہ اس وقت ہر شخص کو اجازت تھی کہ وہ جتنی عورتوں سے چاہے شادی کر لے ۔ حضورؐ نے حضرت خدیجہؓ کی زندگی میں کسی دُوسری عورت سے شادی نہیں کی ۔ وہ لوگ جو کورباطنی سے حضور صلعم کی شادیوں پر اعتراض کیا کرتے ہیں ۔ وُہ خدارا بتلائیں کہ ایک شخص جو عین شباب کے عالم میں ایک چالیس سالہ

بیوہ سے شادی کرتا ہے اور اس کی زندگی میں دُوسرے نکاح کا دل میں خیال تک نہیں لاتا۔ کیا اس کے متعلق بد باطن سے بد باطن شخص بھی کہہ سکتا ہے کہ اس کی بعد کی شادیوں میں دنیاوی دلچسپیوں کو دخل حاصل تھا شادی کے پندرہ سال بعد آپ کو منصبِ نبوت عطا ہوا۔

حضرت خدیجہؓ سے زیادہ کوئی اور شخص آنحضرتؐ کے قلبِ مبارک کی عمیق ترین گہرائیوں سے واقف نہیں تھا۔ انھوںؓ نے آنحضرتؐ کی زندگی کے ہر ایک پہلو کو خلوتوں میں باریک نگاہوں سے دیکھا تھا اور جس وقت آنحضرتؐ نے حضرت خدیجہؓ سے اپنے منصبِ نبوت کا ذکر کیا۔ وہ آپ کی دیانت کو جانتی ہُوئی فوراً آپ پر ایمان لے آئیں۔

صلح و امن کا داعی

شادی کے کچھ عرصہ بعد مکہ میں ایک واقعہ پیش آیا جس سے لوگوں پر آپؐ کی معاملہ فہمی اور اصابت رائے کی دھاک بیٹھ گئی۔ اس زمانہ میں قریش کعبہ کی تعمیر میں مصروف تھے۔ اور جس وقت سنگِ اسود کو اس کی اصلی جگہ رکھنے کا سوال درپیش ہُوا تو ہر ایک قبیلہ اپنا حق مقدم سمجھتا تھا کہ وہ سنگِ اسود کو اس کی جگہ نصب کرے۔ اس قبائلی نزاع کے نتائج سخت خوفناک معلوم ہوتے تھے۔ بالآخر یہ طے ہُوا کہ جو شخص علی الصبح سب سے پہلے کعبہ کی چار دیواری میں داخل ہو وہ اس جھگڑے کو جس طرح چاہے چکا دے۔ خوبیِ قسمت سے سب سے پہلے جو شخص کعبہ کی چار دیواری میں داخل ہُوا، وُہ حضرت محمدؐ تھے۔ اس سے سب بہت خوش ہُوئے۔ اگر آپؐ چاہتے تو خود سنگِ اسود کو اٹھا کر اُس کی جگہ نصب کر دیتے۔ مگر آپؐ کی طبیعت میں خود غرضی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ چنانچہ آپ نے اپنی چادر مونڈھوں سے اتار کر زمین پر بچھا دی اس میں سنگِ اسود رکھا اور تمام قبیلوں کو چادر کے کونے پکڑنے کو کہا۔ اور خود بعد میں اُسے اٹھا کر اپنی جگہ نصب کر دیا۔ اور اس طرح ملکِ عرب کو ایک بہت بڑی خانہ جنگی سے نجات مل گئی۔ اس واقعہ سے آنحضرت کی معاملہ فہمی، وسعتِ خیال اور بے مثل رواداری کا ثبوت ملتا ہے۔

سیرت اور اخلاق کا معجزہ

حضورؐ کی زندگی کے دو پہلو بہت زیادہ جاذبِ نظر ہیں۔ پہلے تو یہ کہ آپؐ اُمّی شخص تھے۔ لیکن خدا کی قدرت ہے کہ اسی اُمّی نے علم و حکمت، تمدّن و معاشرت کا وُہ عظیم الشان مینار تعمیر کیا جس کی روشنی نے جہالتوں اور تاریکیوں کے تمام پردے چاک چاک کر دیے۔ دوسرے یہ کہ آپؐ نے اپنی عمر عزیز کے چالیس سال ایسے ماحول میں بسر کیے جس میں شراب خوری، بُت پرستی اور عیاشی کا دور دورہ تھا لیکن آپؐ کا دامن ان آلائشوں سے ہمیشہ پاک رہا۔ آپ کے بدترین دشمن کو کبھی آپ کی اخلاقی زندگی میں عیب جوئی کا حوصلہ نہیں ہُوا۔ منصبِ نبوت پر فائز ہونے سے پیشتر آپ کی زندگی سراسر معجزہ تھی۔ اور ہر وُہ شخص جس نے حضورؐ کی زندگی کا بہ نظرِ تعمق مطالعہ کیا ہے۔ ابوطالب کی طرح یہ رائے قایم کرنے پر مجبور ہو گا۔

"میں نے محمدؐ کو کبھی جھُوٹی بات کہتے نہیں سُنا۔ اُس کے لب کبھی غیر مہذب اور ناپسندیدہ الفاظ سے آشنا

نہیں ہوئے۔ اور وہ آج تک کسی غیر پسندیدہ مجلس میں نہیں بیٹھا۔"

حضرت محمدؐ کی زندگی ضبطِ نفس، پاکیزگی اور صداقت کا نمونہ تھی۔ آپ نے اپنی ضروریات کو اپنے خاندان کی ضروریات پر کبھی بھی مقدم نہ جانا۔ آپؐ کا خاندان تمام عرب بھر میں موقر اور معزز تھا۔ جب کبھی قریش آپ پر معترض ہوتے اور مخالفت کرتے تھے تو آپؐ انھیں برملا کہا کرتے تھے :

"اے قریش! میری زندگی کا ایک ایک لمحہ تمہارے سامنے بسر ہوا ہے، مجھے بتاؤ تو سہی کہ کیا تم نے اس عرصہ میں مجھ میں کوئی بھی نقص دیکھا۔"

یہ چیلنج آج بھی اسی طرح مشرق و مغرب میں گونج رہا ہے۔ اور حضورؐ کے بدترین دشمن کو بھی یہ جرأت نہیں ہوتی کہ وہ آپؐ کی زندگی کے کسی ایک واقعہ پر بھی حرف گیری کر سکے۔

بچپن میں ہی لوگ حضور صلعم کی شخصیت سے اس قدر متاثر تھے کہ وہ آپ کو "الامین" کے معزز خطاب سے مخاطب کیا کرتے تھے۔" الامین" کا مفہوم محض روپیہ پیسہ میں امانت تک ہی محدود نہیں بلکہ صداقت کے ہمہ گیر مفہوم کے مترادف ہے۔

اولاد

حضرت خدیجہؓ کے بطن سے چار لڑکیاں اور دو لڑکے پیدا ہوتے۔ آپؐ کے سب سے بڑے صاحبزادہ کا نام قاسمؓ تھا جن کی نسبت سے حضورؐ کو ابو القاسمؓ بھی کہا جاتا ہے۔ قاسمؓ دو سال کی عمر میں ہی آپؐ کو داغِ مفارقت دے گئے آپؐ کی سب سے بڑی صاحبزادی زینبؓ ابو العاص کے حبالۂ عقد میں تھیں۔ رقیہؓ کی شادی حضرت عثمانؓ سے ہوئی۔ لیکن آپؐ جنگِ بدر کی فتح کے موقع پر انتقال فرما گئیں اور بعد ازاں اُمّ کلثومؓ حضرت عثمانؓ کے نکاح میں آئیں۔ آپؐ کی سب سے چھوٹی صاحبزادی حضرت فاطمۃ الکبریٰؓ تھیں، جن کی اولاد تاریخ اسلام میں سید کہلاتی ہے۔ آپؓ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے عقد میں تھیں۔ حضرت خدیجہؓ کی اولاد میں سے صرف حضرت فاطمۃ الزہراؓ ہی زندہ رہیں۔ ایک دوسری بیوی سے حضورؐ کے ہاں ایک صاحبزادہ پیدا ہوئے جن کا نام ابراہیمؓ تھا۔ لیکن وُہ بھی عالمِ طفولیت میں ہی انتقال فرما گئے۔ حضورؐ کو خدیجہؓ سے بے حد الفت تھی اور ان کی وفات کے بعد بھی وُہ انھیں محبت سے یاد فرمایا کرتے تھے۔

انقلاب عظیم

اسلام کے فاتحانہ سیلاب میں دنیا کی توہم پرستیاں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئیں۔ اور جس جگہ بُت پرستی اور شرک و طغیان کی خار دار جھاڑیاں تھیں، وہاں گلشنِ توحید لہلہانے لگا۔ اسلام دنیا میں ایک پاکیزہ تہذیب کا درخشاں باب ہے۔ ایک یتیم جس کی مخالفت میں طاغوتی طاقتوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ جس کو گھر سے بے وطن کیا گیا اور جسے طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں۔ بالآخر عزم الامور کے طفیل ایک وحشی قوم کو فتح و نصرت کی بلندیوں تک پہنچانے میں بے مثل طور پر کامیاب ہوا اور

جو لوگ سیاسی، معاشی، عمرانی تاریکیوں کے گڑھوں میں گرے ہوئے تھے۔ وہی پاکیزگی، توحید، حریت، صداقت اور شجاعت میں ضرب المثل ہو گئے۔ ایک ربع صدی میں ایسے زبردست انقلاب کو پیدا کرنا تاریخ کا ایک اہم ترین واقعہ ہے۔ آنحضرتؐ ایک ہی وقت میں مصلحِ اعظم، کمانڈر انچیف، حاکم، مجسٹریٹ، اور قوموں کی زندگی میں انقلاب پیدا کرنے والے تھے۔

از لبسکہ انسانیت جہاں تک بنیادی اصولوں کا تعلق ہے اس چرخ نیلوفری کے نیچے ہر ایک جگہ ایک جیسی ہے۔ اس لیے زندگی کے تمام مسائل کم و بیش ہر ایک جگہ یکساں ہوتے ہیں جس طرح آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پیشتر چند الٰہی قوانین کی تاثیر نے عربوں کی مُردہ قوم کو از سرِ نو زندگی کے بلند ترین مقام پر پہنچا دیا تھا۔ اسی طرح آج ان قوانین کی برکت سے غلام ہندوستان[1] کی قسمت بدلی جا سکتی ہے۔ اسلامی قوانین آج بھی ہندوستان ہی نہیں بلکہ دُنیا بھر کی بین الاقوامی مصائب کو حل کر سکتے ہیں۔

حضور نبی کریمؐ کی تعلیم نے ایک ایسے سیاسی مذہب کی بنیاد رکھی جس نے دہلی سے غرناطہ تک زندگی کے ہر شعبہ میں ایک خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا اور روحانی، دماغی، سوشل، سیاسی اور اقتصادی پستیوں کو چشم زدن میں رفعت سے آشنا کر دیا۔ آج بھی ہمیں حضور رحمۃ للعالمینؐ کی تعلیم پکار پکار کر اپنی طرف بلا رہی ہے۔ کاشکے ہم اس آواز کو سُن سکیں۔

حضورؐ کی بعثت سے قبل دُنیا کے مختلف حصوں اور مختلف وقتوں کے لیے انبیاءِ کرامؑ تشریف لاتے رہے۔ ان کی تعلیم عالمگیر نہ تھی، اور عالمگیر ہو بھی کیسے سکتی تھی جبکہ انسانیت کو ارتقائی منازل طے کرنے میں ابھی بہت وقت درکار تھا۔ بالآخر ہمارے ہادیِ عالم صلعم کا ورودِ مقدس اس وقت ہوا جب دُنیا ایک ایسی منزل پر پہنچ چکی تھی جہاں سے وہ حقائق و معارف کے تمام امور کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اسی لیے ہمارے پیغمبر آخر الزماںؐ کو "رحمۃ للعالمین" کے معزز لقب سے خالقِ اکبر نے سرفراز فرمایا۔

---

[1] بحمد اللہ ۱۴ اگست، ۱۹۴۷ء کو پاکستان عالمِ وجود میں آ گیا۔ (ادارہ)

ذکر الحبیب صلی اللہ علیہ وسلم

محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وردِ زباں جناب محمد کا نام ہے

قابل درود پڑھنے کے اپنا کلام ہے

اللہ اللہ کیا شرافت ہے اُس محفل ہمایوں کی جس میں جناب محبوب کبریا سرورِ اصفیا سید المرسلین خاتم النبیین حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ علیہ افضل الصلوٰۃ والثناء کا ذکرِ خیر ہو اور سبحان اللہ کیا سعادت ہے اُن اہل ایمان کی جو اس مجلس مبارک میں حُسنِ عقیدت اور خلوصِ نیت سے حاضر ہوں۔ یہ وہ بزمِ باصفا ہے جس میں انوارِ عالمِ قدس سے نازل ہوتے ہیں اور یہ وہ بیان روح افزا ہے جسکے سننے کو فرشتے آسمان سے اترتے ہیں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فیوض الحرمین میں لکھتے ہیں کہ میں بارھویں ربیع الاول کو اُس مجلسِ پاک میں حاضر ہُوا جو مکہ معظمہ میں خاص مکانِ ولادت شریف میں منعقد تھی اور اُس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تولد کا مذکور تھا۔ دفعتاً کچھ انوار وہاں بلند ہُوئے۔ میں نے جو بہ نظرِ تامّل دیکھا تو معلوم ہُوا کہ وہ انوار تھے اُن ملائکہ کے جو ایسی متبرک محفلوں میں حاضر ہوا کرتے ہیں اور وہ انوار تھے رحمتِ الٰہی کے۔ پس اے مسلمانو! تم کو چاہیے کہ اس انجمن عالی میں بصد ادب بیٹھو اور خوب ذوق وشوق سے احوال خیر اشتمال سنو اور حاضرین پر یہ بھی واجب ہے کہ درود شریف کی کثرت رکھیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں آنحضرتؐ پر درود پڑھنے کا امر فرمایا ہے اور حضرت سرورِ کائناتؐ نے فرمایا ہے کہ جو میرے ذکر کو سُن کر درود نہ بھیجے وہ بخیل ہے۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ۔ حدیث میں آیا ہے کہ اَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِیْ یعنی سب مخلوق سے پہلے خدا نے میرے نور کو پیدا کیا۔ روایت ہے کہ وہ نور عالمِ وجود میں آکر ستر ہزار برس تسبیح میں مصروف رہا اور پھر اس سے ملائکہ عرش وکرسی لوح وقلم آسمان وزمین جنّ وانس غرض جملہ عالم کا ظہور ہوا۔ ازاں بعد حضرت آدم علیہ السلام کی پیشانی اُس نور سے نورانی فرمائی گئی۔ اُسی نور کی تعظیم منظور تھی جو ربّ العرش نے فرشتوں کو حضرت آدمؑ کے سجدے کا حکم دیا اور یہی وہ گرانبہا امانت تھی جس کے تحمل سے پہاڑ اور زمین وآسمان عاجز ہوگئے اور انسان کے حوصلۂ بلند نے بسر وچشم کہہ کر اُٹھا لیا۔ ؎

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید

قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ زدند

یہ نور رحمت ظہور پُشت ہائے پاک سے ارحام طیبہ میں نقل کرتا رہا یہاں تک کہ عرب کی عزت افزائی منظور ہُوئی اور یہ ودیعت بدیع حضرت اسماعیلؑ سے بنی اسمٰعیلؑ کو اور بنی اسمٰعیل میں قریش کو اور قریش میں بنی ہاشم کو اور بنی ہاشم میں عبدالمطلب کو نصیب ہُوئی۔

آنحضرتؐ کے والدِ ماجد عبداللہ عبدالمطلب کے بیٹے تھے۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ چاہِ زمزم حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کی ایڑیوں سے کھُد گیا تھا ایک مدت تو وہ کنواں بدستور رہا لیکن پھر اَٹ گیا اور اُس کا نشان تک باقی نہ رہا۔ عبدالمطلب نے اُس کنوئیں کی جگہ خواب میں دیکھی اور ارادہ کیا کہ اُس کو پھر کھُدوائیں۔ قریش سدِّ راہ ہوئے اور لڑائی کی نوبت پہنچی۔ بمصداق چاہ کن را چاہ در پیش۔ قریش اُس معرکہ میں مغلوب ہوئے اور عبدالمطلب غالب۔ عبدالمطلب کے اُس وقت ایک ہی بیٹا تھا اُنھوں نے نذر کی کہ اگر پروردگار مجھ کو دس بیٹے عطا فرمائے اور چاہِ زمزم بھی بن جائے تو میں اپنا ایک بیٹا قربان کردوں۔ خدائے تعالیٰ نے اپنے فضل سے عبدالمطلب کا مطلب پُورا کر دیا۔ دس بیٹے بھی ہوئے اور چاہِ زمزم بھی درست ہوگیا۔ اب انھوں نے ارادہ کیا کہ نذر پوری کریں، قرعہ جو ڈالا تو عبداللہ کا نام نکلا۔ عبدالمطلب اُن کو ذبح کرنے لے چلے۔ چُونکہ اُن کے چہرہ میں نور احمدیؐ کی درخشانی تھی اس لیے سب کو اُن کا ذبح ہونا ناپسند تھا آخر سو اُونٹ اُن کے سر پر سے قربان کرکے قربانی کر دی۔ عبداللہ کی شادی بی بی آمنہ سے ہُوئی جو وہب ابن عبدالمناف کی بیٹی تھیں جس سال نورِ محمدیؐ صلبِ پدر سے منتقل ہوکر بطنِ مادر میں آیا قریش صدمۂ قحط سے سینہ ریش تھے آپ کے قدم میمنت لزوم کی برکت سے مینہ خوب برسا اور ساری سرزمین عرب سرسبز اور سیراب ہوگئی حتیٰ کہ اس برس کا نام قریش نے سنۃ الفتح والابتہاج رکھا یعنی فتح اور خوشی کا سال۔ آپؐ کی والدہ ماجدہ کو خواب میں آنحضرتؐ کی ولادت باسعادت کی بشارت ہُوئی اور بشارت دینے والے نے آپؐ کے واسطے نامِ محمدؐ بتایا۔ بارھویں ربیع الاوّل کو پیر کے دن صبح صادق کے وقت حضرت سرورِ کائنات فخرِ موجودات نے اس عالمِ خاک کو اپنے وجودِ باجود سے رشکِ افلاک بنایا۔

شعر

یکایک ہُوئی غیرتِ حق کو حرکت ‌ ‌ ‌ بڑھا جانبِ بُوقبیس ابرِ رحمت
ادا خاکِ بطحانے کی وہ ودیعت ‌ ‌ ‌ چلے آتے تھے جس کی دیتے شہادت
ہُوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا ‌ ‌ ‌ دعائے خلیلؑ اور نویدِ مسیحا
وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا ‌ ‌ ‌ مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا ‌ ‌ ‌ وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماوٰے ‌ ‌ ‌ یتیموں کا والی غلاموں کا مولا
خطا کار سے درگزر کرنے والا ‌ ‌ ‌ بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا ‌ ‌ ‌ قبائل کا شیر و شکر کرنے والا

اشعار

تو محبوب جانی و جانِ جہانی ‌ ‌ ‌ فدائے تو صد عمر و صد زندگانی

بہ نورِ ہدایت چراغِ زمینی | برفعت فزوں تر ز ہفت آسمانی
علیہ صلواتی علیہ سلامی | امینِ زمینی امانِ زمانی
تو سلطانِ جودی و شاہِ وجودی | بنورِ جبیں رہبرِ کامرانی
چو شوقِ تو دیدم فراموش کردم | جمالِ جوانی سماعِ اغانی
تو ساقیِ حقی و جانِ جہاں را | ز فیضِ تو باشد شرابِ مغانی
امانِ دیاری شریعت دثاری | طریقت تو داری حقیقت تو دانی
شریعت چہ گوید حقیقت چہ جوید | معانِ المبادی مبادِ المعانی
ز سیرِ سلوکِ تو جبریلؑ وا ماند | کہ با تو نیارد کسے ہمعنانی

جمیلی کریمی جزیلی کفیلی
ترا قاسمی بندۂ جاودانی

خالق اکبر جل جلالہٗ نے اس لیے کہ غافل ہوشیار و خبردار ہو جائیں آنحضرتؐ کے تولّد کے وقت بہت سے امورِ عجیبہ ظاہر فرمائے۔ اُمِّ عثمان بن ابی العاص سے روایت ہے کہ جب حضرت پیدا ہُوئے تو تارے جُھک کر زمین سے ایسے قریب ہو گئے تھے کہ گمان ہوتا تھا کہ گر پڑیں گے۔ اس میں یہ ایما تھا کہ حضرت سرورِ کائنات کُل انوار کے مرکز ہیں اور ہر شے اپنے مرکز کی طرف مائل ہوا کرتی ہے۔ ملک فارس کے آتشکدوں کی آگ جو ہزار برس سے دہک رہی تھی بُجھ گئی اس میں یہ رمز تھی کہ دینِ حق کے جلوہ سے آتش پرستی کی گرم بازاری نہ رہے گی۔ دریائے ساوا سُوکھ گیا اس میں یہ اشارہ تھا کہ اب آب پرستی اور پرستشِ دریا پر پانی پھر جائے گا۔ تمام رُوئے زمین کے بُت اوندھے گر پڑے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آپؐ کی رسالت سے بُت پرستی کا مُنہ کالا ہوگا۔ نوشیرواں بادشاہِ ایران کے محل میں زلزلہ پیدا ہُوا اور اُس کے چودہ کنگورے ٹوٹ گئے۔ ؎

لرز کر گر پڑے چودہ کنگورے قصرِ کسریٰ کے
اُٹھا جب شور عالم میں نبی کی آمد آمد کا

چنانچہ آج تک وہ محل جس کا نام طاق کسرائے ہے بغداد کے قریب شہر مداین کے ویرانہ میں پھٹا کھڑا ہے۔ سیاح وہاں جا کر اب تک اس معجزے کو دیکھتے ہیں اس میں یہ راز تھا کہ آپؐ کی برکت سے شُجاعانِ عرب کے قدم تختِ جم پر جم گئے اور شاہانِ عجم کی حکومت کی بنیاد ہل گئی۔ چودہ کنگورے گرنے میں یہ سِرّ تھا کہ اس کے بعد چودہ بادشاہ اس خاندان نوشیروانی میں اور فرمانروائی کریں گے پھر قصرِ ابیض کا خزانہ غازیانِ عرب کا مال ہوگا۔ آپ کے والد ماجد تولّد شریف سے پہلے وفات پا گئے تھے چھ برس کی عمر تھی کہ آپ کی والدہ ماجدہ نے رحلت کی اور جدِ امجد عبد المطلب پرورشِ ظاہری کے متکفل ہُوئے۔ جب سِنِ اقدس آٹھ پر پہنچا وہ بھی دنیا سے اُٹھ گئے پھر آپ کے عمِ بزرگوار ابو طالب نے سرپرستی اپنے ذمہ لی۔ بارہ برس کی عمر میں ابو طالب کے ساتھ آپ ملکِ شام کو تشریف لے گئے۔ راستہ میں ایک نصرانی عابد نے جس کا نام بحیرا تھا اُن علامتوں سے جو اُس نے اپنی کتابوں میں دیکھی تھیں آپ کو

پہچانا اور دستِ مبارک اپنے ہاتھ میں لے کر کہنے لگا کہ یہ بے شک رسولِ ربّ العالمین ہیں۔ آپ کے ہمراہیوں نے پُوچھا: تم نے کیسے جانا تو اس نے جواب دیا کہ جس وقت تم یہاں آئے میں نے دیکھا کہ شجر و حجر نے آپ کو سجدہ کیا۔ ۲۵ برس کی عمر میں آنحضرتؐ نے حضرت خدیجۃ الکبریٰ سے شادی کی۔ اکتالیسویں سال حضرت جبریلؑ وحی لے کر آپ کی خدمت میں آئے اور سورۂ اقرا نازل ہوئی جب سن شریف پچاس کا ہوا، معراج واقع ہوئی۔ نزولِ وحی کے بعد تیرہ برس مکہ معظمہ میں قیام فرمایا پھر ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے اور دس برس مدینہ منورہ آپ کے جمال باکمال سے منور و مشرف رہا۔ ۲۷ غزووں میں بنفسِ نفیس شریک ہوئے اور نو لڑائیوں میں تلوار چلائی۔ تین حج ادا فرمائے، دو حج کے فرض ہونے سے پہلے اور ایک اس کے بعد۔ یہ اخیر حج حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔ خالق اکبر عزّ نوالہ نے آپ کو جمال ظاہری بھی کامل عطا فرمایا تھا ؎

وہ نبیوں میں ہُوئے ایسے کہ ختم الانبیاء ٹھہرے
حسینوں میں ہوئے ایسے کہ محبوبِ خدا ٹھہرے

حلیہ اشرف یہ ہے: قدِ اقدس میانہ۔ رنگ ہمایوں سُرخ و سفید بانمکینی و ملاحت، سرِ بزرگ بڑا، موئے شریف سیاہ و نرم اور کسی قدر گھونگر والے کبھی گردن تک اور کبھی کان کی لو تک، بالوں میں مانگ نکلی رہتی اور تیسرے روز تیل پڑتا۔ گوشِ حق نیوش متوسط، پیشانی نورانی کشادہ و تاباں، ابروئے مبارک باریک و خمیدہ اور کسی قدر ایک دوسرے سے جدا دونوں ابروؤں کے بیچ میں رگ ہاشمی تھی جو غصہ کے وقت اُبھر آتی تھی، چشم خدا بیں بڑی پتلیاں خوب سیاہ اور سپیدی میں سُرخی کے ڈورے، مژگاں شریف بڑی، رخسارِ معلّی نرم اور پُر گوشت لیکن نہ پھولے ہُوئے، بینی پاک بلند اور روشن، دہنِ مقدس بڑا مگر نہ ایسا فراخ جو بدنما ہو، دندان مبارک تابدار اور کچھ کچھ جدا، وقتِ تکلم یہ معلوم ہوتا تھا کہ دانتوں میں سے نور نکلتا ہے اور ہنگام تبسم بجلی کی سی جلا محسوس ہوتی، چہرہ نہ لانبا نہ بالکل گول۔ ریش احسن خُوب بھری ہُوئی اور اس کے گھنے بال سینہ کو پُر کرتے۔ گردنِ نور معدن صاف و شفاف گویا سانچے میں ڈھلی۔ دوشِ اقدس پُر گوشت باہم پیوستہ نہ تھے اُن کے بیچ میں مہر نبوت، دست حق پرست لانبے، انگلیاں لمبی اور خوشنما، تمام بدن کے جوڑ خوب قوی اور مضبوط، کفِ دست کشادہ اور نہایت نرم، بغلیں سپید خوشبو جن میں بالوں کا نام نہیں، سینہ صفا، گنجینہ چوڑا، پنڈلیاں گول ہموار اور صاف اور فی الجملہ باریک۔ کفِ پا (خاکش آبروئے سرمہ) پُر گوشت اور بیچ میں خالی، پاؤں کی انگلیاں مضبوط انگوٹھے کے پاس کی انگلی انگوٹھے سے بڑی، جن خوش قسمت بزرگوں نے وہ جمال جہاں آرا دیکھا اُن سب کی رائے اس پر متفق ہے کہ ایسی پاکیزہ شکل نہ آپ سے پہلے دیکھی نہ آپ کے بعد، مزاج عالی میں نفاست بہت تھی ہمیشہ صاف سُتھرے رہنے کو پسند فرماتے اور میلے کچیلے آدمی سے ناخوش ہوتے۔ جسم اطہر سے بُوئے جان پرور آتی جس راہ سے آپؐ تشریف لے جاتے خوشبو سے مہک جاتی اور جو وہاں سے گزرتا اُس کو معلوم ہو جاتا کہ حضور اس طرف سے تشریف لے گئے ہیں۔ آپ کا سایہ نہ تھا۔ سایہ تو اجسام کثیف کا ہوتا ہے، آپؐ تو سراپا نور تھے پھر سایہ کس کا ہوتا ؎

یہ تھی رمز جو اُس کا سایا نہ تھا
کہ رنگِ دوئی واں سمایا نہ تھا

آنحضرتؐ کو جو دفعتاً دیکھتا جلالِ نبوت سے اُس پر ہیبت طاری ہوجاتی مگر جب حضور میں رہتا اور لطف و مدارا دیکھتا اُس کا قلب آپ کی محبت سے مالا مال ہوجاتا۔ معجزات آپ کی ذاتِ بابرکات سے بہت صادر ہوئے چند یہاں تحریر ہوتے ہیں۔

جب آپ نے مکہ معظمہ سے ہجرت فرمائی حضرت ابوبکر صدیقؓ ہمرکاب تھے۔ راستہ میں سراقہ ابن مالک کافروں کے بھیجے ہوئے سوار نے آ لیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے دیکھ کر کہا کہ یا رسول اللہؐ! کافر آن پہنچے۔ آپ نے فرمایا: لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا اے ابوبکر! کچھ رنج نہ کرو خدا ہمارے ساتھ ہے۔ پھر آپ نے بددعا فرمائی فوراً اُس سوار کا گھوڑا پیٹ تک زمین میں دھنس گیا۔ وہ فریاد کرنے لگا کہ مجھ کو اس بلا سے نجات دیجیے جو کافر راہ میں ملے گا اُس کو لوٹائے جاؤں گا۔ آپ نے دعا کی اُس کا گھوڑا نکل آیا اور اُس راستہ میں جو کافر اس کو ملا یہ کہہ کر لوٹاتا گیا کہ میں دیکھ کر آیا ہوں اِدھر کوئی نہیں گیا۔

دوسرا معجزہ: غزوۂ حدیبیہ میں پانی نبٹ گیا اور پیاس کی شدت ہوئی۔ آنحضرتؐ کے پاس ایک لوٹے میں پانی تھا، جس سے آپ نے وضو فرمایا اہلِ لشکر حاضرِ خدمت ہوئے اور عرض کیا کہ سوائے اس لوٹے کے پانی کے فوج میں پانی بالکل نہیں نہ پینے کو اور نہ وضو کرنے کو۔ آپ نے دستِ مبارک اُس لوٹے میں رکھ دیا اور آپ کی اُنگلیوں سے پانی چشمہ کی طرح اُبلنے لگا۔ سب نے خوب پیا اور وضو کیا۔ حضرت جابرؓ سے جو اس حدیث کے راوی ہیں لوگوں نے پوچھا کہ اس روز سب کتنے آدمی وہاں تھے؟ انھوں نے کہا کہ اگر لاکھ آدمی ہوتے تو بھی سیراب ہوجاتے، ہم سب پندرہ سو آدمی تھے۔

تیسرا معجزہ: حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے ہمراہ ایک مرتبہ چلے، اک کھلے میدان میں منزل ہوئی، آپؐ قضائے حاجت کے واسطے تشریف لے گئے، اتفاقاً وہاں کچھ آڑ نہ تھی میدان کے کنارے پر دُور دُور البتہ دو درخت تھے آپؐ اُن کے پاس تشریف لے گئے اور ایک درخت کی شاخ پکڑ کر فرمایا: اِنْقَادِیْ عَلَیَّ بِاِذْنِ اللّٰهِ یعنی خدا کے حکم سے میرے ساتھ چلا آ۔ وہ درخت اس طرح آپ کے ساتھ ہولیا جیسے کوئی اُونٹ کی نکیل پکڑے لاتا ہے۔ پھر آپ نے دُوسرے درخت کی طرف قدم رنجہ فرمایا اور اُس کو بھی وہی ارشاد کیا، وہ بھی ہمراہ ہولیا۔ جب بیچ میدان میں آئے آپ نے حکم دیا کہ خدا کے حکم سے دونوں مل جاؤ۔ دونوں مل گئے۔ اُن کی آڑ میں بیٹھ کر آپ نے فراغت حاصل کی۔ پھر وہ دونوں الگ الگ ہو گئے۔

چوتھا معجزہ: حضرت سلمہ بن اکوع کے پاؤں میں زخم کا نشان تھا۔ کسی نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ انھوں نے کہا کہ خیبر کی لڑائی میں میرے زخم لگا تھا اُسے دیکھ کر ساتھ والوں نے کہا کہ اب سلمہؓ نہ بچیں گے۔ میں حضور نبوی میں حاضر ہوا اور آپؐ نے تین بار لعابِ دہن اُس میں ڈال دیا اور سب شکایت جاتی رہی۔

پانچواں معجزہ: حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میری والدہ مشرکہ تھیں اور میں ہمیشہ اسلام لانے کے واسطے اُن سے کہا کرتا تھا، ایک دن میں نے انکو دعوت اسلام کی اُنھوں نے آں حضرتؐ کی شان میں کچھ کلماتِ مکروہ استعمال کیے۔ میں روتا ہوا درِ اقدس پر حاضر ہوا اور گزارش کی کہ یا رسول اللہؐ! میری ماں کے لیے دعائے ہدایت فرمائیے۔ آپؐ نے فرمایا: اللّٰھمّ اھد اُمّ ابی ھریرۃ۔ یعنی اے اللہ! ابوہریرہؓ کی ماں کو ہدایت دے۔ میں آپؐ کی دعا سے خوش ہو کر چلا آیا۔ گھر کے دروازہ پر جو پہنچا تو دروازہ بند۔ میری والدہ نے میرے پاؤں کی آہٹ سُن کر کہا کہ اے ابوہریرہؓ! وہیں کھڑے رہو۔

میں کھڑا ہوگیا اور پانی کے گرنے کی آواز سُنی۔ والدہ نہا کر اور کپڑے پہن کر کواڑ کھولنے آئیں اور ایسے جلد کہ دوپٹا بھی نہ اوڑھا دروازہ کھولا اور مجھ کو مخاطب کر کے کہنے لگیں اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ۔ میں دیکھ کر آپؐ کو خوشخبری سُنانے دوڑا اور جوشِ خوشی سے میرے آنسو جاری تھے۔ آپؐ نے سُن کر شکر ادا کیا اور کلمات خیر فرمائے۔

چھٹا معجزہ: ایک شخص آپ کا منشی تھا۔ شامتِ اعمال سے مرتد ہوگیا اور مشرکوں میں جا ملا۔ آپ نے سُن کر فرمایا: زمین اس کو نہ لے گی۔ حضرت ابوطلحہؓ کہتے ہیں کہ اتفاقاً میرا گزر اُس سرزمین پہ ہوا جہاں وہ مرا تھا، کیا دیکھتا ہوں کہ اُس کی لاش باہر پڑی ہے۔ میں نے پوچھا، لوگوں نے کہا کہ ہم نے بہت دفعہ دفن کیا، زمین اس کو قبول نہیں کرتی۔

ساتواں معجزہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آپ خطبہ فرمانے کے وقت ایک چوبی ستون سے تکیہ لگا کر کھڑے ہوا کرتے تھے۔ جب منبر تیار ہُوا اور آپ نے اس پر استادہ ہو کر خطبہ ارشاد فرمایا تو وہ لکڑی کا ستون اس طرح چیخنے لگا کہ گمان ہوتا تھا شق ہو جائے گا۔ آپؐ منبر سے اُترے اور اُس کو پکڑ کر چپٹا لیا، تب وہ چُپ ہوا اور ایسی سسکیاں بھرنے لگا جیسے کسی بچّے کو رونے سے چُپ کراتے ہیں اور وہ سسکتا ہے۔ حضرت جابرؓ نے کہا ہے کہ وہ اُس بیان کے شوق میں رویا جو آپ سے سُنا کرتا تھا۔

آٹھواں معجزہ: حضرت ابوبکرؓ سے روایت آئی ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ میری اُمت کے لوگ ایک وسیع زمین پر آباد ہوں گے جس کا نام بصرہ ہے۔ اُس دریا کے کنارے پر جس کا نام دجلہ ہے دریا پر پُل ہوگا وہاں آبادی بکثرت ہوگی اور وہ شہر منجملہ اُن شہروں کے ہوگا جو مسلمان آباد کریں گے۔ آخر زمانے میں قنطورا نام کی ایک قوم کی اولاد جن کے مُنہ چوڑے اور آنکھیں چھوٹی ہوں گی، حملہ کرے گی اور لبِ دریا اُترے گی۔ اہلِ شہر کے تین حصّے ہو جائیں گے۔ ایک حصّہ جان بچانے کو بھاگے گا اور جنگل میں ہلاک ہوگا۔ دُوسرا فرقہ امان لے گا وہ بھی قتل ہوگا۔ تیسرے فریق کے آدمی اپنے اہل و عیال کی حفاظت کے لیے لڑیں گے وہ شہید ہیں۔ سُبحان اللہ! یہ پیش گوئی ہمارے ختم المرسلین کی کیسی سچّی ہُوئی۔ دجلہ کے کنارے پر خلفائے عباسیہ نے متصل بصرہ شہر بغداد آباد کیا اُس کی رونق اور آبادی عروجِ کمال پر پہنچی۔ آپؐ کی وفات کے چھ سو چالیس برس بعد تاتاری ترکوں نے ہلاکو خاں کی ماتحتی میں بغداد پر حملہ کیا۔ بڑے بڑے علماء اور خلیفہ مستعصم باللہ اماں لے کر باہر نکلے تاتاریوں نے سب کو ذبح کر ڈالا۔ ہزاروں مسلمان لڑ کر شہید ہُوئے۔ بہت سے بیچارے جان بچا کر بھاگے۔ خدا جانے غربت اور پریشانی میں کس مصیبت میں بیچارے مرے۔ حضرت کی ذات بابرکات جامع جمیع صفات و کمالات تھی۔ خالق عالم جلّ جلالہٗ اپنے کلامِ پاک میں فرماتا ہے: اِنّکَ لَعَلٰی خلقٍ عظیم۔ اے محمدؐ! تمہارا اخلاق بہت بڑا ہے۔ آپ کے حلم اور عفو کا یہ عالم تھا کہ جب جنگِ اُحد میں مشرکین سے لڑائی ہُوئی تو آپ کا نیچے کا ایک دانت پتھر کے صدمہ سے شہید ہوگیا۔ سرِ گنجینۂ اسرار میں ایک زخم لگا اور چہرۂ مبارک پر خون بہنے لگا۔ اصحابؓ نے جو یہ رنگ دیکھا اُن کو بہت شاق ہوا اور عرض کرنے لگے کہ یارسول اللہؐ! ان کافروں کے حق میں دعاءِ بد فرمائیے۔ آپ نے جواب دیا کہ میں بددعا کرنے کے واسطے نہیں بھیجا گیا ہُوں خدا نے مجھ کو اپنی مخلوق کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے پھر اُن کافروں کے

حق میں یہ دُعا زبان حق ترجمان پر جاری ہوئی اللّٰھم اھد قومی فھم لا یعلمون - یعنی اے خدا! میری قوم کو ہدایت دے وُہ جانتے نہیں ہیں۔ اللہ اللہ یہ بلندیٔ حوصلہ کفار کی وہ شقاوت اور آپ کی یہ شفقت ، انھوں نے زحمت پہنچائی آپ نے دُعائے خیر سے اُن کو یاد کیا اور پھر اُس لُطف سے کہ قومی کہہ کر اور بارگاہِ الٰہی میں اُن کی طرف سے عذرخواہی بھی کر دی کہ وہ یہ جہالت اس لیے کرتے ہیں کہ میرا مرتبہ نہیں سمجھتے ہیں۔ ؎

لا یمکن الثناء کما کان حقہٗ
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

جُود و سخاوت کا یہ حال کہ حضرت جابرؓ بن عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے کبھی سوال کے جواب میں " لا " نہیں فرمایا۔ ایک مرتبہ نوّے ہزار درہم آپ کے پاس آئے اُن کو آپ نے بانٹنا شروع کیا جو سامنے آیا اُسی کو عطا فرماتے گئے۔ یہانتک کہ سب اُسی وقت بانٹ دیئے۔ ؎

بر روئے زدہ کفِ خجالت
با جود کفِ تو بحرِ موّاج

شجاعت اور بہادری کی یہ کیفیت تھی کہ حضرت علی شیرِ خداؓ فرماتے ہیں کہ جب لڑائی کا معرکہ گرم ہوتا تھا تو آں حضرتؐ سب سے آگے ہوتے تھے۔ ایک شب مدینہ والوں کو کچھ خوف پیدا ہُوا اور آدمی باہر دوڑے کہ دیکھیں کیا ہے وہاں کیا دیکھتے ہیں کہ آپ سب سے پہلے مقامِ خطرناک پر اس شان سے پہنچ گئے تھے کہ ابوطلحہؓ کے گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سوار تھے اور تلوار شانہ سے آویزاں تھی۔ ان لوگوں کو آپ یہ فرما کر تسلّی دینے لگے لم تراعوا مت گھبراؤ مت گھبراؤ۔ ؎

در صفِ ہیجا بوقت صولتِ اعدا
کوہ خجل ماند از ثباتِ محمدؐ

حیا کا یہ نقشہ کہ اگر کوئی شخص بُرا کام کرتا اور آپؐ اُس کو سُنتے تو نصیحت فرمانے کے وقت اُس آدمی کا نام نہ لیتے بلکہ یُوں فرماتے کہ لوگوں کو کیا ہوگیا ہے جو ایسے بُرے کام کرتے ہیں۔ خلقِ خدا پر عنایت و شفقت کا یہ حال تھا کہ آپ کی رافت و مہربانی اپنے بندوں کے حال پر ملاحظہ فرما کر خود خدا تعالیٰ نے اپنے دو نام نامی آپ کو بطور خطاب عطا فرمائے یعنی وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ، دوسری جگہ فرمایا ہے : وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ اُس رحمت پر روح فدا ہو جس کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے کافروں پر بھی اگلی امتوں کے گنہگاروں کی طرح عذاب نازل نہیں فرمایا اور منافق بدسرشت آفتِ قہر سے بچے رہے۔ آپ کے پاس بیٹھنے والے سب یہی خیال کرتے کہ سب سے زیادہ نظرِ عنایت مجھی پر ہے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ میں آٹھ برس کی عمر سے اٹھارہ سال کی عمر تک آپ کی خدمت کرتا رہا کبھی آپ نے ہوں نہیں کہا۔ اگر میں نے کوئی کام کیا تو یہ نہ فرمایا کہ کیوں کیا اور نہ کیا تو یہ نہ پُوچھا کہ کیوں یہ کام نہیں کیا۔ اگر نماز میں کسی بچے کے رونے کی آواز گوشِ مبارک میں چلی جاتی تو غایتِ لطف سے آپ نماز جلد ختم فرما دیتے تاکہ اُس بچے کے مربّی اُس کی تسکین و تشفّی کر سکیں۔ بلّی پیاسی آتی تو آپ پانی کا برتن اُس کی طرف جُھکا دیتے اور جب تک

وہ خوب نہ پی لیتی آپ برتن جھکائے رکھتے۔ عہد کی استواری اور وفاداری اس قدر تھی کہ ایک یہودی کا قرض آپ کے ذمہ تھا ایک دن اُس نے تقاضا کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اس وقت تو میرے پاس کچھ نہیں ہے اُس نے کہا کہ اے محمدؐ! میں تم کو یہاں سے بے لیے نہ جانے دُوں گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اچھا میں تمھارے پاس بیٹھا جاتا ہوں یہ کہہ کر آپ وہاں بیٹھ گئے اور پانچوں وقت کی نمازیں آپ نے پڑھی۔ صحابی اس یہودی کو ڈراتے اور دھمکاتے تھے۔ آخر آپ سے عرض کرنے لگے کہ یا رسول اللہؐ! ایک یہودی آپ کو روکے بیٹھا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ خدا نے مجھ کو عہد شکنی سے منع فرمایا ہے۔ جب دن چڑھا تو وہ یہودی کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوگیا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ گستاخی میں نے اس واسطے کی کہ دیکھوں تورات میں جو صفت نبی آخرالزماں کی ہے آپ میں پائی جاتی ہے یا نہیں اب مجھ کو معلوم ہوگیا کہ بیشک آپ سچے نبیؐ ہیں۔ وہ یہودی بڑا مالدار تھا اپنا سب مال لاکر آپ کی خدمت میں پیش کیا کہ اس کو راہِ خدا میں صرف کر دیجیے۔ آپ کو حضرت حلیمہ نے دُودھ پلایا تھا جب کبھی وُہ آتیں تو آپ اپنی چادر بچھا دیتے کہ وُہ اس پر بیٹھ جائیں۔ حضرت خدیجہؓ آپ کی بیوی تھیں، اگرچہ ان کا انتقال ہوگیا لیکن جب آپ کے پاس ہدیہ آتا تو آپ فرما دیتے یہ فلاں عورت کے گھر دے آؤ خدیجہؓ کو اس سے محبت تھی۔ جب حضرت خدیجہؓ کی کوئی ملنے والی دولت خانہ پر آنکلتی تو آپ بڑی نوازش و نرمی سے اُس کا حال پُوچھتے۔

تمکین و وقار ایسا کہ آپ کبھی قہقہہ نہ مارتے، صرف تبسم فرماتے، اکثر سکوت میں رہتے اور بے ضرورت کلام نہ فرماتے مجلس ہمایوں میں بآواز بلند کوئی بات نہ کرتا حاضرین اس طرح ساکت بیٹھتے جیسے اُن کے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہیں۔

آپ کے زہد کی یہ کیفیت تھی کہ اگرچہ اخیر زمانے میں آپ حجاز، یمن و دیگر ممالک عرب اور عراق و شام کے سرحدی ملکوں کے بادشاہ تھے لیکن حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپ نے کبھی دُو دن برابر جَو کی روٹی بھی پیٹ بھر کر نہیں کھائی یہاں تک کہ آپ دنیا سے رحلت کر گئے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ ایک ایک مہینے گھر میں چُولھے میں آگ نہ جلتی اور مع اہل و عیال کے صرف سُوکھی کھجوروں پر قناعت فرماتے۔ آپ اپنا جُوتا اپنے ہاتھ سے گانٹھ لیتے، اپنی بکریوں کا دُودھ خود دوہ لیتے، پھٹے پُرانے کپڑے سی لیتے۔ غرض اپنا اکثر کام خود اپنے ہاتھ سے کرلیا کرتے اور فرماتے تھے کہ اپنا کام اپنے آپ کرنا چاہیے۔ کسی دُوسرے کی مدد کا محتاج اتنا بھی نہ رہے کہ مسواک کے ٹکڑے کی برابر اُس سے مدد مانگے۔ ایک دفعہ سفر میں آپ نے بکری ذبح ہونے کا حکم دیا۔ ایک نے کہا ذبح میں کروں گا دُوسرا بولا کھال مَیں اتاروں گا۔ تیسرے نے کہا میں پکاؤں گا۔ آپ نے فرمایا لکڑیاں میں لاؤں گا۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت! آپ کی طرف سے ہم لے آئیں گے۔ آپؐ نے فرمایا: یہ سچ ہے لیکن میں نہیں چاہتا کہ اپنے آپ کو سب یاروں سے ممتاز بنالوں۔ خدا اس بات کو پسند نہیں فرماتا۔ یہ کہہ کر آپ لکڑیاں لینے تشریف لے گئے۔ حضرت ابوطلحہؓ کہتے ہیں کہ ابتدائے عہد میں ہم نے فقر و فاقہ کی شکایت کی اور اپنے پیٹ کھول کر دکھائے کہ ایک ایک پتھر ہم سب کے پیٹ سے بندھا ہُوا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اپنا شکم مبارک دکھایا تو اُس پر دُو پتھر بندھے ہُوئے تھے۔ روحی فداک یا رسول اللہ۔

تواضع اور انکسار آپ کے مزاج میں ایسا تھا کہ مجلس میں جہاں جگہ مل جاتی بیٹھ جاتے۔ اہل محفل کے زانو سے اپنا زانو آگے نہ بڑھاتے۔ اگر صحابہؓ آپ کی تعظیم کو اُٹھ کھڑے ہوتے تو آپ ان کو منع فرمادیتے کوئی مسکین بیمار ہوتا تو آپ اس کی عیادت کو تشریف لے جاتے۔ اگر کوئی غلام بھی دعوت کرتا تو آپ قبول فرمالیتے۔ آپ کی شان جلال دیکھ کر اکثر آدمی خائف ہوجاتے، تو آپ انکی

یُوں تسکین فرماتے کہ میں کوئی بادشاہ قہار نہیں ہُوں۔ قریش کی ایک عورت کا بیٹا ہُوں تم مطمئن رہو۔

امانت آپ میں ایسی تھی کہ خدا تعالیٰ قرآن پاک میں آپ کی امانت کی مدح فرماتا ہے۔ مُطاع ثم امین۔ اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہوگا کہ کفار مکہ ہر چند آپ کے سخت دشمن تھے مگر جب کوئی اُن سے آپ کی نسبت سوال کرتا تو یہی کہتے کہ چاہے کچھ ہو آپؐ امین اور سچے تو ضرور ہیں۔ جب آپ کا فرمان ہرقل بادشاہ قسطنطنیہ کے پاس پہنچا تو اس نے اہل دربار کو حکم دیا کہ دیکھو آجکل ہمارے شہر میں عرب بھی ہیں یا نہیں اگر ہوں تو میرے سامنے لاؤ تاکہ اُن سے آپ کے حالات دریافت کروں۔ اتفاقاً قریش کا ایک کارواں وہاں گیا ہوا تھا۔ ابوسفیانؓ قافلہ سالار تھے۔ بادشاہ نے اُن سے پُوچھا کہ یہ نبی کبھی جھُوٹ بھی بولتے ہیں، تو ابوسفیانؓ نے باوجود کافر ہونے کے کہا کہ نہیں آپؐ نے آج تک کبھی خیانت نہیں کی اور نہ کبھی جھُوٹ بولتے ہیں۔ ؎

حق جلوہ گر ز طرزِ بیانِ محمدؐ است
آرے کلامِ حق بزبانِ محمدؐ است (غالبؔ)

اپنے رب کا خوف اس قدر تھا کہ شب کو نماز میں یہاں تک قیام فرماتے کہ پائے مبارک وَرم کر جاتے۔ آپ کی یہ جفاکشی دیکھ کر صحابیوںؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ آپ کے تو اگلے پچھلے سب گناہ خدا نے عفو فرما دیے پھر کیوں اس قدر تکلیف اور زحمت آپ اٹھاتے ہیں، آپؐ نے جواب میں فرمایا: افلا اکونُ عبداً شکوراً یعنی جب خدا نے مجھ پر اتنے احسان کیے ہیں تو کیا میں شکر بھی نہ ادا کروں۔

روایت ہے کہ آپ ایک ایک دن میں ستّر ستّر دفعہ استغفار فرماتے۔ نماز میں خشوع قلب کا یہ عالم تھا کہ فرطِ جوش سے سینۂ انوار خزینہ سے ایسی آواز نکلتی جیسے دیگچی جوش کھا رہی ہو۔ ؎

غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ۔

نبیِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم

مولانا محمد اشرف

نبوت سراسر رحمت ہے، ہر نبی رحمت بن کر آیا، چنانچہ آیت :-

وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ط (البقرہ) — اور اللہ تعالیٰ خاص کرتا ہے اپنی رحمت (نبوت) سے جس کو چاہتا ہے۔

کا یہی مراد ہے، لیکن وہ ذاتِ پاک جسے اللہ تعالیٰ نے "رحمۃ للعٰلمین" کے نام سے نوازا، وہ صرف ہمارے آقا و مولا حبیبِ خدا حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے، قولِ خداوندی ہے :

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ — ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

آپ کی رحمت زمان و مکان کی وسعتوں پر چھائی ہوئی اور ازل و ابد پر محیط ہے۔ آپ کا ہر قول و فعل، ہر ارادہ و عمل، ہر حرکت و سکون، ہر تکلّم و سکوت، ہر نظریہ و فکر، غرض زندگی کا ہر جزو کل رحمت ہی رحمت ہے، نہ صرف آپ کی ذات بابرکات ہی سراپا رحمت ہے بلکہ آپ کا دیا ہوا صحیفۂ الہٰی، آپ کا پہنچایا ہوا دین، آپ کی لائی ہوئی عبادات، آپ کی شریعت اور اس کا ایک ایک حکم، آپ کا پیش کردہ طرزِ ماندو بود، نظامہائے معیشت و معاشیات، و اقتصاد و سیاسیات، عدل و معاشرت اور انسان کے جملہ طبقات اور مختلف شعبہ ہائے زندگی کے بارے میں ہدایات سب نری رحمت ہی ہیں صحیفۂ اسلام کے بارے میں قرآن خود گویا ہے :-

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ۔ (سورۂ بنی اسرائیل ۸۲) — اور ہم قرآن میں ایسی چیزیں نازل کرتے ہیں کہ وہ ایمان والوں کے حق میں شفا اور رحمت ہیں۔ (بیان القرآن)

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ۔ (النحل) — اور ہم نے آپ پر قرآن اُتارا ہے کہ تمام (دین کی) باتوں کا بیان کرنے والا ہے اور (خاص) مسلمانوں کے واسطے بڑی ہدایت اور بڑی رحمت اور بڑی خوشخبری سُنانے والا ہے۔

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسّلام کے پیام میں سب سے پہلی بات جس کی طرف دعوت دی جاتی ہے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات ہوتی ہیں، اس لیے تصوّرِ الہٰی اور صفاتِ خداوندی، مذہبی نقطۂ نظر سے نہایت ہی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں مصرِ قدیم نے خدا کی

ذات کو نو کروڑ خداؤں میں تقسیم کر دیا۔ ہندوؤں نے خدا کی صفات کو لاکھوں دیوتاؤں میں بانٹ دیا۔ یونان قدیم مختلف پہاڑوں پر اپنے مختلف دیوتاؤں اور خداؤں کی جلوہ سامانیاں دیکھتا رہا۔ بدھ کی تعلیمات خدا کے ذکر سے ساکت ہیں۔ زردشت کو آگ میں یزداں کا جلوہ دکھائی دیا اور سلبی صفات اہرمن کے حوالے کر دی گئیں۔ یہودی صحیفے اور موجودہ تورات عموماً اللہ تعالیٰ کی صفات کے تذکرہ سے خالی ہیں۔ یہود کے ہاں اللہ کا خصوصی نام "یہواہ" اور عام نام "الوہیم" ہے۔ لیکن صفات میں اگر کسی صفت کا ذکر ہوتا ہے تو وہ جلال کا مظہر "غیور والا خداوند" ہے۔ موجودہ عیسائیت خدائی صفات کو "اقانیم ثلاثہ" کے فلسفہ کے عقدۂ لاینحل میں گم کر بیٹھی، خدا کو "باپ" کا نام دے کر مادی صفات سے تنزیہِ خداوندی کو آلودہ کر دیا گیا۔

"حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پہاڑی وعظ بے شک محبت و پیار کا پیام ہے۔ لیکن اس وعظ کو اگر عیسیٰ علیہ السلام کے قول پر پرکھا جائے کہ "جیسے درخت پھل سے پہچانا جاتا ہے، انسان عمل سے پہچانا جاتا ہے"، عیسائیوں کا عمل ثابت کرتا ہے کہ مسیح علیہ السلام کی وہ تعلیم کوہ زیتون کی فضاؤں میں تحلیل ہو کر رہ گئی۔

اب آیئے اس پیغمبر (روحی فداہ) صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آخری وصیت اور تورات کے آخری کلمات اور پیشگوئی کے مطابق کوہ فاران پر دس ہزار قدسیوں[1] کے ساتھ آیا اور جس کے منہ میں خداوند نے اپنا کلام ڈالا اور جو کچھ خدا نے اس سے کہا وہ سب اس نے لوگوں سے کہا۔[2] اور وہ رسولؐ جس کا وعدہ عیسیٰ علیہ السلام کر گئے تھے، کہ وہ سچائی کی روح آئے گی، اور وہ تمہیں ساری سچائی کی بات بتائے گی، اس لیے کہ وہ اپنی نہ کہے گی، لیکن جو کچھ وہ سنے گی، سو کہے گی۔" (انجیل یوحنا باب ۱۶ - ۷)

وہ بشارت عیسوی کے مطابق اللہ تبارک و تعالیٰ کی سب سے زیادہ حمد و ثنا کرنے والا احمد (فارقلیط) آیا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی رحمانیت و رحیمی، ربوبیت و کریمی، ستاری و غفاری کے نغموں کے ساتھ آیا اور اللہ تعالیٰ کے جود و سخا، بخشش و عطا، غفران کی نغماسے عالم پرشور تھا، اس کا پیام سراپا محبت، شفقت اور رحمت تھا، آپؐ نے اللہ تبارک و تعالیٰ کی حمد و ستائش، تنزیہہ

---

[1] عہد نامہ قدیم استثناء ۳۳ - ۱، ۲، ۳ میں ہے: "یہ وہ برکت ہے جو موسیٰ مرد خدا نے اپنے مرنے سے پہلے بنی اسرائیل کو بخشی اور اس نے کہا کہ خدا سینا سے آیا اور سعیر سے ان پر طلوع ہوا، اور فاران کے پہاڑ سے جلوہ گر ہوا، دس ہزار مقدسوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت ان کے لیے تھی، ہاں وہ اپنے لوگوں سے بڑی محبت رکھتا ہے۔ اس کے سارے مقدس ہمراہی تیرے ہاتھ میں ہیں، اور وہ تیرے قدموں کے پاس بیٹھے ہیں، اور تیری باتوں کو مانیں گے۔" اس پیش گوئی کا تذکرہ قرآن کریم کی آیت میں یوں ہے:-

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ...... ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ

[2] "میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا، اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا، اور جو کچھ میں اس سے کہوں گا وہ سب اُن سے کہے گا۔" (استثناء ۱۸/۱۹)

تقدیس، جمال و نوال، جمال و کمال و صفات و شئون کی رنگا رنگی اور بے چونی و بے چگونی کی تعلیمات سے معرفت ربانی و عرفان الٰہی کے تو برتو پردوں کو یکسر چاک کر دیا اور باری تعالیٰ کی صفات عالیہ اپنی پوری جلوہ سامانیوں، جمال آرائیوں، حسن و جمال کی تابانیوں اور محبت و لطف، عطا و بخشش کی ارزانیوں کے ساتھ مخلوق سے روشناس کرا دیا، جس کا عشر عشیر تو کیا اقل قلیل بھی دوسرے مذاہب ادیان کی تاریخ میں نہیں ملتا، رحمۃ للعالمین صلے اللہ علیہ وسلم نے اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفات کی جو پردہ کشائی اور مستور ازل کی جو رہنمائی فرمائی۔ اس میں خالق کائنات کی ذات عالی کسی ظالم و جابر، حاکم و مالک کی صورت میں ظاہر نہیں ہوتی، بلکہ حسن وجمال جود ونوال، لطف و عطا، عفو و درگذر، رحم و کرم کا سراپا، اپنی عزت و اجلال کبریائی و کمال کے ہالہ میں پرتو فگن ہے، جس کا مقصد ہی نوازش و بخشش ہے اور جو پیہم پکار رہا ہے۔ ؎

من نہ کردم خلق تا سودے کنم ‏ ‏ ‏ ‏ بلکہ تا بر بندگاں جودے کنم

چنانچہ گو اللہ کے بیے جملہ اچھے نام و صفات ہیں، لیکن علَم کے طور پر جو نام اسلام نے چُنے وہ "اللّٰہ" اس کے بعد "رحمٰن" کا نام ہے، قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:-

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۔ (بنی اسرائیل - ۱۲)

آپؐ فرما دیجئے کہ خواہ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمان کہہ کر پکارو جس نام سے بھی پکاروگے، پس اُسی کے واسطے بہت اچھے نام ہیں۔

اللہ کا معنی عربی لغت کے لحاظ سے دلوں کے اس محبوب اور پیارے کے ہیں جو قلوب کو موہ لے اور جس کی محبت میں لوگ حیران و سرگرداں ہوں۔ گویا "اسلام کا خدا" نرا محبت ہی محبت اور پیار ہی پیار ہے۔ قرآن کریم میں اللہ کا لفظ ۲۶۹۷ مقامات پر آیا ہے، گویا رحمت و پیار کے اس جامع و مانع لفظ سے قرآن کا صفحہ صفحہ روشن ہے۔ الرحمٰن دوسرا اسم علَم ہے۔ جو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں ۱۱۴ بار ویسے ۵۵ بار قرآن کریم کی زینت بنا ہے۔ الرحمٰن کا معنی نہایت مہر و رحمت اور رحم کرنے والے کے ہیں۔ اس سے ملتا جلتا دوسرا نام الرحیم ہے، جس کا معنی بار بار اور بہت ہی رحم کرنے والے کے ہیں تسمیہ کے علاوہ یہ نام قرآن کریم میں ۹۳ بار آیا ہے۔ خیال رہے کہ محققین کے نزدیک "رحمٰن و رحیم" دونوں الفاظ رحمت سے مشتق ہیں اور رحمت اس جذبہ و نرمی کو کہتے ہیں، جس سے کسی دوسری ہستی کے ساتھ محبت و شفقت، لطف و احسان اور فضل و کرم کرنے کا داعیہ غالب آجائے مشہور عالم و بزرگ ابن مبارک کا قول ہے کہ "رحمان وہ ذات ہے کہ جب اس سے مانگا جائے تو عطا فرمائے اور رحیم وُہ ذات ہے کہ اس سے مانگا نہ جائے، تو غضب میں آئے"

چوتھا نام جس سے صحیفۂ الٰہیہ سورۂ فاتحہ سے لے کر سورۂ النّاس تک منوّر ہے، الرّب ہے، جو مختلف اضافتوں کے ساتھ قرآن کریم میں ۹۰۲ بار آیا ہے۔ الرّب پرورش کرنے والی وہ ذات ہے جو عدم سے وجود میں لا کر ہستی کے جملہ مراحل اور ابد الآباد تک موجودات کے وجود و پرورش کی ذمہ دار ہو۔ عیسائیت رب کو اب جیسا مادّی نام دے کر فخر کرتی ہے لیکن اب (باپ) کا تعلق اولاد سے ایک حادثہ کا نتیجہ ہے "باپ" پیدائش و پرورش کے تمام مراحل میں مجبور و معذور رہے ہے، لیکن رَبّ کا تعلق

پلنے والے کے ساتھ عدم و عالمِ ارواح سے لے کر پیدائش اور موت اور ابد الآباد تک محیط ہے، اور وہ اس پرورش پر مجبور نہیں بلکہ اپنے لطف و رحمت اور شانِ ربوبیت کی وجہ سے پالتا ہے، یہ تعلق ہمہ گیر، ازلی و ابدی ہے۔

نبی الرحمت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا صحیفۂ آسمانی اسی طرح اللہ تعالیٰ کے رحمت و شفقت، محبت و احسان سے بھرپور ناموں سے منوّر ہے۔ تفصیل کا موقع نہیں ورنہ بتایا جاتا کہ رحمت مجسّم صلی اللہ علیہ وسلّم نے اللہ تعالیٰ کی جن صفات کو کھولا وہ اکثر "رحمت و محبت، شفقت و کرم ہی سے عبارت ہیں، اور جہاں "تدبیر و انتظام" اور "جلال و کمال" کی حکمت کی وجہ سے سزا اور وعید کا تذکرہ آیا ہے وہ بھی رأفت و رحمت و عطا و بخشش وغیرہ کے لیے اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام لیتا ہے۔ لیکن عذاب و انتقام کے لیے اکثر اضافت کے ساتھ اپنی نسبت کرتا ہے، مثلاً:

إِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيعُ الْعِقَابِ ۖ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ۚ

(الاعراف آیت ۱۶۷)

بلا شبہ آپؐ کا رب واقعی (جب چاہے) جلدی ہی سزا دے دیتا ہے اور بلا شبہ وہ غفور (بڑی مغفرت والا) اور رحیم (بڑی رحمت والا) ہے، مہربانی کرنے والا (بھی) ہے۔

إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ الْعِقَابِ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ۚ

(الانعام ۱۶۶)

بالیقین آپ کا رب جلد سزا دینے والا (بھی) ہے اور بالیقین وہ واقعی غفور بڑی مغفرت کرنے والا رحیم، مہربانی کرنے والا (بھی) ہے۔

اعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ وَأَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۚ

(المائدۃ آیت ۹۸)

تم یقین جان لو کہ اللہ تعالیٰ سزا بھی سخت دینے والے ہیں، اور اللہ تعالیٰ (غفور) بڑے مغفرت والے اور (رحیم) بڑی رحمت والے بھی ہیں۔

نَبِّئْ عِبَادِي أَنِّي أَنَا الْغَفُورُ الرَّحِيمُ وَأَنَّ عَذَابِي هُوَ الْعَذَابُ الْأَلِيمُ

(الحجر ۴۹ - ۵۰)

اے محمدؐ! آپؐ میرے بندوں کو اطلاع دے دیجیے کہ میں بڑا مغفرت (غفور) اور رحمت والا (رحیم) بھی ہوں اور (نیز) یہ کہ میری سزا دردناک سزا ہے۔

وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انتِقَامٍ

(المائدہ ۹۵)

اور اللہ تعالیٰ عزیز یعنی زبردست ہیں، انتقام لے سکتے ہیں۔

غرض نبی الرحمۃ صلی اللہ علیہ وسلم کا پروردگار رحمت ہی رحمت ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بارے میں بار بار آتا ہے:

كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ

(الانعام : ۵۴)

تمہارے رب نے رحمت فرمانا اپنے ذمہ مقرر کر لیا ہے۔

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۚ (الانعام ۱۳۴)

اور آپؐ کا رب بالکل غنی ہے، رحمت والا ہے۔

فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْرَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۔ (الانعام ۱۴۵)
تو آپؐ فرما دیجئے کہ تمہارا رَبّ بڑی وسیع رحمت والا ہے ۔

وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُوالرَّحْمَةِ ۔ ط (الکہف آیت ۵۸)
اور آپؐ کا رَبّ بڑا مغفرت کرنے والا (اور) بڑا رحمت والا ہے ۔

اللہ تعالیٰ کی یہ رحمت ہر چیز سے وسیع ہے ۔ ارشادِ ربّانی ہے :۔

رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۔ (الاعراف ۱۵۶)
اور میری رحمت تمام اشیاء کو محیط ہو رہی ہے ۔

رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا ۔ (المومن ۸۰)
اے ہمارے پروردگار! آپ کی رحمت (عامہ) اور علم ہر چیز کو شامل ہے ۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت کے فیضان کو کوئی روک نہیں سکتا ۔

مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ط ۔ (فاطر ۲)
اللہ تعالیٰ جو رحمت لوگوں کے لیے کھول دے ، سو اس کا کوئی بند کرنے والا نہیں ۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت سے نا اُمید ہونا گمراہی اور کفر ہے ۔

قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ۔ (الحجر ۵۶)
ابراہیمؑ نے فرمایا کہ بھلا اپنے رَبّ کی رحمت سے کون نا اُمید ہوتا ہے بجز گمراہ لوگوں کے ۔

اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا کون اندازہ کر سکتا ہے ؟ حضرت محمدؐ صلے اللہ علیہ وسلم کا دیا ہوا صحیفۂ آسمانی میں اللہ تعالیٰ اپنے گنہگار بندوں کو محبت و پیار سے اپنا بندہ کہہ کر پکارتا ہے اور کیا نوید جانفزا سناتا ہے ۔!

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ط اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۔ (الزمر ۵۳)
آپ کہہ دیجئے کہ اے میرے بندو ! جنھوں نے (کفر و شرک کرکے) اپنے اُوپر زیادتیاں کی ہیں ، کہ تم خدا کی رحمت سے نا اُمید مت ہو ، بالیقین خدا تعالیٰ تمام (گزشتہ) گناہوں کو معاف کر دے گا ۔ واقعی وہ بڑا بخشنے والا بڑی رحمت والا ہے ۔

اس آیت کا شانِ نزول بھی جو طبرانی نے نقل کیا ہے ، رحمت مجسم حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے حلم و رأفت اور اللہ تعالیٰ کی مغفرت و رحمت اور گنہگاروں کی رعایت و ناز برداری کا اچھوتا نمونہ ہے ۔

بدر کے ہیرو ، عمِ رسولؐ سید الشہداء حمزہ رضی اللہ عنہ کے قاتل وحشی ابن حرب تھے جنھوں نے چھپ کر وار کرکے اللہ کے اس شیر کو شہید کر دیا تھا ، اور پھر جس بے دردی سے ان کے ناک کان کاٹے گئے اور دل کو نکال کر چبایا گیا ، تاریخ کا ایک رُوح فرسا واقعہ ہے ، جس کا اثر آخر تک حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک پر رہا ، لیکن یہ جذبۂ دعوت و شفقت تھا ، وحشی کو اسلام کا

پیغام دے کر بھیجتے ہیں، وہ قرآن کریم کی آیتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواباً کہلواتے ہیں :-

یا محمد کیف تدعونی وانت تزعم ان من قتل او اشرک اوزنی یلق اثاما، یضاعف لہ العذاب یوم القیامۃ ویخلد فیہ مھانا، وانا صنعت ذلک فھل تجد لی من رخصۃ۔

اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ مجھے اسلام کی دعوت کیسے دیتے ہیں، اور آپ کا دعویٰ ہے کہ جس نے قتل کیا یا شرک کیا یا زنا کیا، وہ گناہ میں جا پڑا، اور قیامت میں اُسے دوتا عذاب ہوگا، اور اس میں خوار پڑا رہے گا، اور میں نے یہ تمام کام کئے ہیں، پس کیا میرے لیے کوئی چھٹکارا کی صورت آپ پیدا کر سکتے ہیں۔

وحشی کے اس پیام پر رحمت حق جوش میں آتی ہے اور کیا عجیب استثنا کی آیت نازل ہوتی ہے :

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ط وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ط - (الفرقان)۔

مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا، اور نیک عمل کئے تو ایسے لوگوں کے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دے گا، اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

وحشی رضی اللہ عنہ کہنے لگا، اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم یہ توبہ، ایمان اور عمل صالح کی شرط سخت ہے، شاید میں یہ پوری نہ کر سکوں، اس پر دوسری آیت نازل ہوئی۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ۔ (النساء ۴۸)

بے شک اللہ تعالےٰ اس بات کو نہ بخشیں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے، اور اس کے سوا اور جتنے گناہ ہیں جس کے لیے منظور ہو گا، وہ گناہ بخش دیں گے۔

وحشی نے اب اور بات نکالی اور کہا :

اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس بات میں بھی مجھے مغفرت اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع دکھائی دیتی ہے پس میں نہیں جانتا کہ مجھے بھی بخشے گا یا نہیں، پس اس کے علاوہ کوئی بات ہوسکتی ہے؟ اس پر اللہ تعالیٰ کی رحمت نے یہ آیت نازل فرمائی :-

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ط اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ط اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ۔ (الزمر)

آپ کہہ دیجئے کہ اے میرے بندو جنھوں نے (کفر، شرک کرکے) اپنے اوپر زیادتیاں کی ہیں کہ تم خدا کی رحمت سے ناامید مت ہو، بالیقین خدا تعالےٰ تمام (گزشتہ) گناہوں کو معاف فرما دے گا، واقعی وہ بڑا بخشنے والا، بڑی رحمت والا ہے۔

وحشی نے کہا اب بات درست ہوئی اور اسلام لے آئے۔ بعض لوگوں نے پوچھا، ہم بھی وحشی کی طرح ان باتوں کے مرتکب

ہو چکے ہیں، آپؐ نے فرمایا، یہ بشارت اور حکم عام ہے۔

(مجمع الزوائد ص۲۱۰ جلد ۷، بخاری میں بھی یہ روایت موجود ہے۔ ص۷۱۵ ج ۲ بروایت ابن عباس)

کیا رحمت کا ٹھکانہ ہے؟ ایک گنہگار کے کیا کیا ناز اُٹھائے جاتے ہیں! اور رحمت نہ صرف گناہوں کو معاف کرنے کی بشارت دیتی ہے، بلکہ گناہوں کو نیکیوں میں تبدیل کرنے کا بھی اعلانِ عام دیتی ہے۔ کیا اس عفو عام اور رحمتِ بے پایاں کی نظیر کسی اور جگہ مل سکتی ہے؟ ابوسعید ابوالخیر نے اس پیام کو کیا خوب الفاظ میں ادا فرمایا ہے۔

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ　　گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ

ایں درگہِ ما درگہِ نومیدی نیست　　صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

بخاری وغیرہ کی صحیح حدیثوں میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس عالم کو پیدا کیا تو خود اپنے اُوپر رحمت کی پابندی عاید کر لی۔ اور رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پاک سے گنہگاروں اور سیہ کاروں کو بخشش و رحمت کا مژدہ، عفو عام کا اعلان بار بار سنوایا گیا' تفصیلات کا وقت نہیں، ایک حدیث پر اکتفا کرتا ہوں کہ:۔

"اے آدمؑ کے بیٹو! جب تک تم مجھے پکارتے رہو گے اور مجھ سے آس لگائے رہو گے، میں بخشتا رہوں گا، خواہ تم میں کتنے ہی عیوب کیوں نہ ہوں۔ مجھے پروا نہیں۔ اے آدمؑ کے بیٹو! اگر تمہارے گناہ آسمان کے بادلوں تک بھی پہنچ جائیں، اور پھر تم مجھ سے معافی مانگو، میں تم کو معاف کر دوں، خواہ تم میں کتنے ہی عیب کیوں نہ ہوں، مجھے پروا نہیں، اے آدمؑ کے بیٹو! اگر پوری سطح زمین بھی تمہارے گناہوں سے بھری ہو' پھر تم میرے پاس آؤ۔ اس حال میں کہ کسی کو میرا شریک نہ بناتے ہو، تو میں بھی تمہارے پاس پوری سطح زمین بھر مغفرت لے کر آؤں گا۔"

(جامع ترمذی ابواب الدعوات، جمع الفوائد ص۲۵۶ جلد ۲)

اللہ تعالیٰ نے اپنی اس رحمت بے پایاں کو صرف اپنی ذات تک محدود ہی نہیں رکھا، بلکہ اپنے بندوں اور خواص پر اس کا پرتو ڈال کر انھیں بھی بقدر بشری اور حسب استعداد و ظرف اپنی رحمت کا مظہر بنایا، جس کا سب سے بڑا حصہ اس شاہکارِ خلق، زبدۂ نبوت' فخر کون و مکان، مقصودِ آفرینش، خاتم الرسل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ملا، جنھیں خداوند قدوس نے خود تمام جہانوں کے لیے رحمت یعنی رحمۃ للعلمین کہہ کر پکارا اور اپنے اسماء خاصہ میں سے رأفت و رحمت سے بھرپور دو ناموں سے اس کی ذاتِ عالی کو نوازدیا، اور ارشاد فرمایا:۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔ (التوبہ ۱۲۸)

(لوگو!) تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک پیغمبر آتے ہیں، تمہاری تکلیف اُن کو گراں معلوم ہوتی ہے اور تمہاری بھلائی کے بہت خواہشمند ہیں' اور مؤمنوں پر نہایت شفقت کرنے والے اور مہربان ہیں۔

کیا احسان الٰہی ہے، اس کی ذات بھی رؤف و رحیم اور اس کا بندۂ خاص بھی اس کا مظہر اتم بن کر رؤف رحیم ؎

تو کریمی و رسولؐ تو کریم　　صد شکر کہ ہستیم میان دو کریم

یہ نبی الرحمۃ صلّی اللہ علیہ وسلم آئے اور دنیا کو ایسا دین دے گئے، جو ہر رنگ و صورت میں رحمت و رأفت کا شاہکار تھا، اپنے

رسم ورواج کے نیچے دبی ہوئی دنیا کو ان نامناسب بوجھوں سے نجات دلائی۔ مذہب کے نام پر تجرد، ترک لذائذ اور ریاضات شاقہ، رہبانیت، ترک دنیا، نفس کشی اور ایذا رسانی جسم کی جو سوئیاں اٹکی تھیں، ان کو ایک ایک کرکے توڑا، اور سہولت و راحت، نرمی و اعتدال، دین و دنیا کی وحدت والا ایک ایسا روشن دین پیش کیا جس پر ہر طبقہ اور ہر قوم، ہر فرد خواہ عورت ہو یا مرد، ہر حال میں اور ہر وقت میں عمل پیرا ہو سکے، رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کارنامہ کو قرآن نے ان الفاظ میں پیش فرمایا:-

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔

(الاعراف آیت ۱۵۷)

جو لوگ کہ ایسے رسول نبی امی کا اتباع کرتے ہیں جن کو وہ لوگ اپنے پاس تورات و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں (جن کی صفت یہ ہے) وہ ان کو نیک باتوں کا حکم فرماتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں اور پاکیزہ چیزوں کو ان کے لیے حلال بتلاتے ہیں اور گندی چیزوں کو (بدستور) ان پر حرام فرماتے ہیں، اور ان لوگوں پر جو بوجھ اور طوق تھے ان کو دور کرتے ہیں، سو جو لوگ اس نبی (موصوف) پر ایمان لاتے ہیں اور اُن کی حمایت کرتے ہیں، اور اُن کی مدد کرتے ہیں اور اس نور کا اتباع کرتے ہیں جو ان کے ساتھ بھیجا گیا ہے۔ ایسے لوگ پوری فلاح پانے والے ہیں۔

اسلام آسان ہے، اس میں کسی قسم کی تنگی و سختی اور تکلیف، لایطاق نہیں، ہر شخص اپنی ہمت اور وسعت کے بقدر اس پر عمل پیرا ہو سکتا ہے، یا یوں کہیے کہ دین ہر ایک کے بس کی بات ہے، اپاہج و بیمار، غنی و نادار، حاکم و محکوم، سرمایہ دار و مزدور، زمیندار و کسان، عورت و مرد، بوڑھا و بچہ، ہر طبقہ و ہر فرد، ہر حال و وقت اس پر عمل پیرا ہو سکتا ہے کہ دین کے احکام ہر شخص کی گنجائش و وسعت کے مطابق ہی آئے ہیں، یہی وہ رحمت ہے جس کا نام و نشان شاید ہی کسی دوسرے مذہب میں ملتا ہو۔ قرآن کریم نے نبی الرحمۃ صلی اللہ علیہ وسلم کے لاتے ہوئے دین کی سہولتوں کا تذکرہ مختلف مقامات پر کیا ہے، نمونتاً چند پیش کرتا ہوں:-

لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ (البقرہ آیت ۲۸۶)

خدا کسی کو اس کی گنجائش سے زیادہ کی تکلیف (حکم) نہیں دیتا۔

لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ اِلَّا مَآ اٰتٰهَا۔ (الطلاق ۷)

خدا تعالیٰ کسی شخص کو اس سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا جتنا اس کو دیا ہے۔

یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ۔ (البقرۃ ۱۸۵)

اور تمھارے ساتھ آسانی چاہتا ہے، سختی نہیں۔

وَمَا جَعَلَ عَلَیْكُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ (حج ۷۸)

اور تمھارے لیے دین میں اس نے (خدا نے) تنگی نہیں کی۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

ن ھذا الدین یسر ولن یشاد الدین احد الا غلبہ ۔ | یہ دین آسان ہے، جو کوئی شخص دین سے سختی میں مقابلہ کرے گا تو دین اس کو مغلوب کر دے گا۔

(جمع الفوائد ص ۳۴ ج ۱ بحوالہ بخاری)

ایک دوسرے مقام پر فرمایا :

ایھا الناس خذوا من الاعمال ما تطیقون فان اللہ لا یمل حتی تملوا وان احب الاعمال الی اللہ ما دام وان قل ۔ | اے لوگو اتنا ہی عمل کرو جتنا برداشت کر سکو کیونکہ جب تک تم نہ اُکتا جاؤ خدا نہیں اُکتاتا ۔ خدا کے نزدیک سب سے پسندیدہ وہی عمل ہے، جو دائمی ہو گو تھوڑا ہو۔

(جمع الفوائد ص ۳۴ ج ۱ بحوالہ بخاری ونسائی وترمذی وابن ماجہ)

ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا :

لا تشددوا علی انفسکم فانما ھلک من کان قبلکم بتشدیدھم علی انفسھم | اپنے نفسوں پر (دین کے بارے میں) سختی نہ کرو کہ تم سے پہلے لوگ اپنے اپنے نفسوں پر سختی کی وجہ سے ہلاک ہوئے۔

(جمع الفوائد ص ۳۵ ج ۱)

ایک جگہ ارشاد ہے :۔

انما بعثت بالملۃ السمحہ او السھلۃ الحنیفۃ البیضاء ۔ (مسند ابن حنبل ص ۲۶۶ ج ۵) | میں تو سہل اور آسان روشن حنفی دین دے کر بھیجا گیا ہوں۔

دین کی یہ سہولت اور درمیانہ روی جملہ عبادات ومعاملات، اخلاق ومعاشرت، انفرادی واجتماعی اعمال میں ساری و طاری ہے۔ جس کی تفصیل کی قلتِ وقت کی وجہ سے گنجائش نہیں۔

'رحمت محمدیہ' کا پرتو اس نظام اقتصاد و معاشیات میں بھی نمایاں ہے جو آپ نے پیش فرمایا۔ جس میں سرمایہ دارانہ ظلم نہیں، مالی رقابت کی بنا پر طبقاتی کشمکش و گروہی کشاکش نہیں، بلکہ ہر طبقۂ انسانی دوسرے طبقہ کا ہمدرد و غمگسار، معاون و مددگار، خیر خواہ و خدمت گار اور بھائی بھائی بن کر زندگی گذارنے والا ہے۔ اسی طرح جو قانون اور نظام عدل دیا گیا، وہ ساری انسانیت کے لیے رحمت و فلاح و بہبود کا الٰہی دستور ہے۔ جس میں کسی خاص طبقے، گروہ، جماعت یا فرد کے لیے ظالمانہ مراعات و تحفظات کا کوئی چور دروازہ نہیں بلکہ اس میں ہر ایک کے حقوق کی حفاظت، اس کی دارین کی ترقی کا انتظام ہے جس میں نہ کسی پر ظلم ہے اور نہ کسی کو ظلم کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔

نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم ایک حدیث قدسی میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :۔

یاعبادی انی حرمت الظلم علی نفسی وجعلتہ | اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کیا ہے اور اس کو

محرما فلا تظالموا۔ — تمھارے درمیان بھی حرام کیا ہے۔ تو تم آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔

(صحیح مسلم)

عدل میں اپنے پرائے، دوست و دشمن، شاہ و گدا کا امتیاز روا نہیں رکھا گیا، بلکہ ہر ایک کے لیے عدل کا ترازو برابر ہے، قرآن بار بار گویا ہے :۔

وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ (الشوریٰ) — اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمھارے درمیان عدل کروں

وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ۔ (المائدہ ۸) — اور کسی قوم کی دشمنی تم کو اس پر باعث نہ ہو جائے کہ تم عدل نہ کرو، عدل کیا کرو، کہ وہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ کَانَ ذَا قُرْبٰی (الانعام ۱۵) — اور جب بات کہو پس انصاف کرو، گو وہ شخص قرابت دار ہی ہو۔

رحمۃ للعٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانیت پر ایک بڑا اکرم یہ کیا کہ ملکوں، قوموں اور قبائل میں بٹی ہوئی انسانیت کو "وحدت آدمیت" کا سبق دیا، اور رنگ و نسل، وطن و قوم، امیر و غریب، سرمایہ دار و مزدور، زمیندار و کسان اور دیگر انسانی عصبیتوں اور گروہوں میں بٹی ہوئی انسانیت کو اخوت کا ایسا پیغام دیا کہ جس کے اپنا لینے کے بعد دنیا امن و چین، محبت و الفت، مواسات و ہمدردی کا گہوارہ بن جاتی ہے اور علاقائی اور ملکی یا عالمگیری جنگیں ہوں یا طبقاتی جھگڑے، سب ختم ہو جاتے ہیں۔ اس ترقی یافتہ دور میں بھی اقوام متحدہ قوموں کے اتحاد کا نشان ہے، لیکن وحدتِ انسانی کا نظریہ، رحمت محمدیہ کا وہ عطیہ ہے، جس سے پوری نسل انسانی جسد واحد بن جاتی ہے اور حسد و منافست، تنافر و غضب کے جذبات ختم ہو جاتے ہیں۔

قرآن کریم نے ارشاد فرمایا ہے :۔

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ؕ ۔ (الحجرات، ۲۳) — اے انسانو! بتحقیق ہم نے تم کو ایک مرد و عورت سے پیدا کیا ہے، اور ہم نے تم کو (مختلف) قومیں اور قبیلے بنا دیا، تاکہ ایک دوسرے کو پہچانو۔ اللہ کے نزدیک تم سب میں بڑا شریف وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔

دوسری جگہ فرمایا :

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَبَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّنِسَآءً ۔ (النساء) — اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار (آدم) سے پیدا کیا، اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا، اور ان دونوں سے بہت مرد اور عورتیں پھیلائیں۔ (یعنی نسل انسانی اسی ایک جوڑے سے وجود میں آئی)

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِی الْمُتَّقُوْنَ مَنْ کَانُوْا وَحَیْثُ کَانُوْا۔ (کنز العمال)

مجھ سے قریب وہ لوگ ہیں، جو متقی ہوں، جو بھی ہوں اور جہاں بھی ہوں (یعنی جنس و وطن و مقام کی قید نہیں)

حجۃ الوداع میں اعلان فرمایا :-

ایھا الناس الا ان ربکم واحد وان اباکم واحد، الا لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی احمر الا بالتقوی۔ (مسند احمد)

لوگو! ہاں بیشک تمہارا رب ایک ہے اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے، ہاں عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، سُرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سُرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے۔

اخوت عامہ کی دعوت دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں :-

لا تباغضوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا وکونوا عباد اللہ اخوانا۔ (بخاری و جمع الفوائد ص۳۹۵ ج ۲، بحوالہ صحاح)

آپس میں ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو، ایک دوسرے سے حسد نہ کرو، اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو۔ اور سب مل کر خدا کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔

یگانگت و بھائی چارے کا یہ پیام صرف رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلّم کی زبان سے ادا ہُوا جن کا کام ہی یہ تھا۔ ؎

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ایک ابرِ رحمت تھا، جو پیہم موسلا دھار بارش کی طرح برستا رہا، گلزار و خارزار، دوست و دشمن اس افادۂ رحمت میں برابر کے شریک تھے۔ آپؐ ہدایاتِ ربّانی کے سب سے بڑے مبلّغ اور توحیدِ الٰہی کے داعی اکبر ہیں، سب جانتے ہیں کہ تبلیغ پھولوں کی سیج نہیں اور کسی آبلہ پا کا اس سے سلامت گذر جانا آسان نہیں، لیکن رحمت للعلمین صلی اللہ علیہ وسلم باوجود ہر قسم کی اذیت و تکلیف سہنے کے سراپا لطف و رحمت، نرمی و ملاطفت و عفو و درگذر تھے، قرآنِ کریم نے گواہی دی۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۔ (آل عمران ۱۵۹)

اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سبب آپؐ ان کے واسطے نرم ہوئے، اور آپؐ اگر تُندخُو اور سخت طبیعت ہوتے تو یہ آپؐ کے پاس سے منتشر ہو جاتے ؛

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ذاتی معاملہ میں کبھی کسی سے بدلہ نہیں لیا۔ (بخاری کتاب الآداب)

یہی سبب ہے کہ زہر ہلاہل کھلا دینے والی یہودیہ کو درگذر فرما دیا، قریش مکّہ نے وہ کونسا ظلم، کونسی تکلیف تھی جو نہ پہنچائی ہو؟ کون سی اذیت تھی جس سے دریغ کیا ہو؟

مکہ کی زندگی میں شعبِ ابی طالب کی المناک محصوری، پتھروں کی بارش، کانٹوں کا بچھایا جانا، فرقِ اقدس پر (العیاذ باللہ) خاک گندگی تک ڈال دینا، سجدہ کی حالت میں اُونٹ کی بچہ دانی اور اوجھ کو سر پہ ڈال دینا، ہر قسم کی ملامتیاں، غرض وہ کیا ستم نہیں تھا جو ظالم ایجاد نہ کرتے ہوں، اپنا مولد و منشا اور اللہ تعالیٰ کا محبوب گھر ان کی وجہ سے چھوڑنا پڑا، اور ہجرت کے بعد بھی ایک دن چین کا سانس نہ لینے دیا گیا، لیکن واہ ری رأفت و رحمت جب کہ کعبۂ نبوت اپنے پورے جلال و عظمت کے ساتھ فتحِ مکہ کے دن حرم میں داخل ہوتا ہے تو خون کے پیاسوں کو یہ کہہ کر درگذر کر دیا جاتا ہے:۔

لا تثریب علیکم الیوم، یغفر اللہ لکم وھو ارحم الراحمین۔ (الکنز ص۲۹۲، ج ۲)

آج کے دن تم پر کوئی الزام نہیں۔ اللہ تعالیٰ تمہارا قصور معاف فرمائے۔ وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے۔

اذھبوا انتم الطلقاء (حیاۃ الصحابہ ص۱۵۴، ج ۱)

جاؤ تم سب کے سب آزاد ہو۔

سفرِ طائف کا دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا شدائد کے لحاظ سے سخت ترین دن تھا، غیرتِ حق جوش میں آکر اہلِ طائف کو ان کی گستاخی پر پہاڑوں کی چکی میں پیس دینا چاہتی تھی، لیکن رحمتِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تکلیف کو بھول جاتے ہیں، اہلِ طائف کو ہلاکت سے یہ کہہ کر بچا دیتے ہیں کہ:۔

بل ارجو ان یخرج اللہ عزوجل من اصلابھم من یعبد اللہ عزوجل وحدہ لا یشرک بہ شیئا۔ (بخاری ص۴۵۸، ج ۱ و مسلم وغیرہ)

(میں ان کی ہلاکت نہیں چاہتا) بلکہ اُمید رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی نسل سے ایسے لوگ پیدا فرمائے جو ایک اللہ عزوجل کی عبادت کرنے والے ہوں اور اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہرائیں۔

اُحد میں خون میں نہا کر دانت شہید، زبانِ مبارک سے صرف یہی کلمات نکلے:۔

اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون۔

”اے اللہ میری قوم کو ہدایت دے کہ وہ نہیں جانتے کہ میں کون ہوں“۔

ایک دفعہ چند لوگوں نے کفار کے ظلم سے تنگ آکر درخواست کی کہ ان کے حق میں بددعا فرما دیجئے، جواباً فرمایا۔ میں دنیا کے لیے لعنت نہیں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں، (مشکوٰۃ کتاب الاخلاص)

غرض ہر حال میں رأفت و رحمت کا دریا بہتا رہا، اور صرف اسی پر اکتفا نہیں فرمایا، اُمت کی ہدایت کے لیے فرطِ شفقت و رحمت میں گھلتے رہے، دائم الاحزان ہونا آپؐ کی صفت بن گئی۔ یہاں تک کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات کو کہ جس نے مبعوث فرمایا تھا، بار بار اس اندوہ و غم سے چھٹکارا دلانے کے لیے کہنا پڑا،

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۔ ط (الکھف ۶)

سو شاید آپؐ ان کے پیچھے اگر یہ لوگ اس بات (قرآن) پر ایمان نہ لائے تو غم سے اپنی جان دے دیں گے (یعنی اتنا غم نہ کریں کہ آپؐ کی جان پر بن جائے۔)

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۔ ط (الشعراء ۳)

شاید آپؐ ان کے ایمان نہ لانے پر (رنج کرتے کرتے) اپنی جان دے دیں گے۔

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ (النحل ۷۰-۱۲۷) ان پر غم نہ کیجئے۔

یہ غم آپ کا کفار کے لیے تھا، پھر مسلمانوں پر شفقت کا کیا عالم ہوگا! اُمت کے غم میں راتوں کو روتے روتے ہچکی بندھ جاتی، اُبلتی ہوئی ہنڈیا کی طرح بلکنے کی آواز آتی۔

ایک یہودی کا بچہ مسلمان ہوا، خوشی سے بے اختیار پکار اُٹھے:۔

الحمد لله الذى انقذنى بنسمة من النار۔ سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے میرے ذریعے ایک جان کو جہنم کی آگ سے آزادی دی۔

ایک چور کا ہاتھ کٹتا ہے۔ رنگ متغیر ہو جاتا ہے۔

(مستدرک حاکم ص ۳۸۳۔ ج ۴)

(بعض کا قول ہے رو پڑتے ہیں) قربان جائیے رحمت کا کیا ٹھکانہ ہے!

رحمت للعٰلمین شفیع المذنبین صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت کا تذکرہ و احاطہ کسی شخص کی بساط نہیں، چند باتیں نمونۃً اس تھوڑے وقت میں پیش کر دی گئیں۔ سلام ہو اس رحمت مجسم پر اور درود ہو اس آیۂ رأفت و شفقت پر جو آیا، اور اپنی رحمت سے کونین کو پر بہار بنا گیا۔ اپنی بات کو اقبال سہیل کے چند اشعار پر ختم کرتا ہوں۔

خلق خدا کا داعیٔ آخر، دین ہدیٰ کا داعیٔ آخر ——— جس کی دعوت اَسلِم تَسلَم صلی اللہ علیہ وسلم

ارض و سما میں آیۂ رحمت، روزِ جزا میں سایۂ رحمت ——— اس کی لوائے حمد کا پرچم، صلی اللہ علیہ وسلم

راہ میں کانٹے جس نے بچھائے، گالی دی پتھر برسائے ——— اس پر چھڑکی پیار کی شبنم، صلی اللہ علیہ وسلم

سم کے عوض دارو ئے شفا دی، طعن سنے اور نیک دُعا دی

زخم سہے اور بخشا مرہم، صلی اللہ علیہ وسلم

اللّٰهم صلّ وسلّم وبارك على سيدنا ومولانا محمّد امام الخير وقائد الخير ورسول الرحمة

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ عبداللہ یوسف علی

شخصیت اور کامیابی

دنیا میں تمام بلند انسانوں کی کامیابی اور شخصیت کے دو پہلو ہوتے ہیں یعنی وہ خود کیا ہے اور اس کے کام کی نوعیت کیا ہے۔ بعض اوقات ایک آدمی اپنے ملک اور دنیا کی تمام تاریخ بدل دیتا ہے۔ اور اس کے کارناموں سے فضائے لبسیط گونج اٹھتی ہے۔ مگر اس کے باوصف اس کی شخصیت اس کے کام کی نسبت زیادہ دلچسپی کا باعث ہوتی ہے۔ کیونکہ شخصیت ہی وُہ بیج ہے جس سے کامیابی کا پودا پھُوٹتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ملحوظ خاطر رکھنی چاہیے۔ اور وہ یہ کہ بعض اوقات ایسے بلند انسان یا تو اپنے وقت سے آگے ہوتے ہیں یا پیچھے۔ کیونکہ بسا اوقات ایسے انسانوں کے خیالات اور اثرات بیرونی حالات کی وجہ سے توقع کے مطابق پھل پھول نہیں لاتے۔ لیکن اگر وہ کارزارِ حیات میں جی توڑ کر لڑے ہوں اور انہوں نے ناسا عد حالات کے علی الرغم جادہ مستقیم پر غیر متزلزل رہنا سیکھ لیا ہو تو بھی ان کے متبعین کے لیے ان کی ناکامیوں اور ہزیمتوں میں عبرت اور موعظت کے بے شمار دفتر پنہاں ہوتے ہیں۔

یہاں یہ بات یاد رہے کہ صفحۂ تاریخ پر سنہری حروف میں لکھے جانے والے کارنامے باعثِ اختلاف ہوسکتے ہیں۔ کیونکہ عین ممکن ہے کہ ایسے کارنامے اگر ایک طبقہ کی نظر میں قابل تحسین و ستائش ہوں تو دوسرے گروہ کی نگاہ میں ان کے تخریبی پہلو نمایاں ہوں۔ لیکن ایک دلربا سیرت ایسی سیرت جو خاکساری، بلند فہمی، پاکیزگی اور انصاف کی مظہر ہو ہر ایک انسان کے لیے نیکی اور پاکیزگی کی محرک ہوسکتی ہے۔ اور ایسے انسان مصیبت، رنج اور ناکامی میں پرکھے جاتے ہیں۔ کامیابی اور فتح میں ان کی رحم دلی اور خدا ترسی کی آزمائش ہوتی ہے۔ آپ حقانیت، انصاف، صبر اور استقلال کی محک پر معلوم کرسکتے ہیں کہ آیا وہ آدمی روحانی پاکیزگی کا مظہر ہے اور اس کی زندگی الٰہی ہدایت کی تجلیوں کا مرقع ہے یا اس کی زندگی صفحۂ ارض پر ایک عام نقش کی مانند ہے۔ جو لحظہ کے لیے ہویدا ہوتا ہے اور پھر ہمیشہ کے لیے مٹ جاتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اس نقطۂ نگاہ سے میں جو کچھ کہوں گا آپ کو اس سے گونا دلچسپی ہوگی اور آپ اس بلند ترین شخصیت کی دلربا جھلک محسوس کرنے کے قابل ہوسکیں گے، جس کی چوکھٹ پر ہم جبینِ عشق و نیاز رگڑنا اپنی سب سے بڑی سعادت سمجھتے ہیں۔

غیر مسلموں سے استدعا

اس وقت میرا روئے سخن صرف ان کی طرف ہی نہیں جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ دیارِ ہندوستان میں ایسے ہندو

موجود ہیں جو یہاں کی دو بڑی قوموں کے درمیان اتحاد قائم کرنے کے لیے خیالات اور سوشل زندگی کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم بنانا چاہتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ایسے مخلص لوگوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ہمارا یہ اولین فرض ہونا چاہیے کہ ہم بھی اپنے خیالات اور احساسات کی اس طرح ترجمانی کر سکیں کہ باہمی افہام و تفہیم کی زنجیریں اور مضبوط ہو سکیں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت بڑے بڑے مذاہب موجود ہیں جو روحانی وحدت اور ہم آہنگی کے پاکیزہ عزائم رکھتے ہیں۔ میرے دل میں ایسے عیسائی بھائیوں کا تصور موجود ہے جن کی نگاہ میں اسلام کی حقیقت مذہب کی دنیا میں ایک دُور افتادہ نخلستان سے زیادہ نہیں جو دنیا کی نئی تحریکوں سے کوئی خاص مناسبت نہیں رکھتا۔ اس وقت میں آپ کے سامنے چند حقائق پیش کرنا چاہتا ہوں جن کی روشنی میں آپ محسوس کر سکیں گے کہ جس شخصیت کے متعلق میں آپ کے سامنے کچھ کہنے والا ہوں، اس کی زندگی پاکیزگی اور بلند نگاہی کا مظہر تھی۔ اور آج دنیا جن مسائل سے دوچار ہے ان کی عقدہ کشائی میں اس کی زندگی کو بہت دخل ہے۔

مناظر قدرت کا اثر

اس مقدس موقع پر میری طرف سے یہ حقیر پیش کش ہے۔ اس وقت جبکہ شمالی آب و ہوا میں موسم بہار کی مسرت بخش ہواؤں نے بُوٹے بُوٹے اور پتہ پتہ پر جوبن اور نکھار پیدا کر دیا ہے۔ ہماری خوشی میں اس احساس سے دوگونہ اضافہ ہو جاتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود مناظرِ قدرت کی دلبستگیوں سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ اور وُہ اپنی روحانی اور اخلاقی تعلیم میں لوگوں کی توجہ قدرت کے مناظر کی طرف مبذول کروایا کرتے تھے اور قدرت کی دلفریب تبدیلیوں سے وُہ خدا کی عظمت و جلالت محسوس کرنے کے عادی تھے۔ ہم بھی آج اس نیلگوں آسمان کی چھت کے نیچے اور اس ہری بھری مخملی گھاس پر بیٹھ کر جاودانی لذت محسوس کرتے ہیں۔

خاندانی وجاہت

ہمارے بعض دوست جنھیں اسلامی تہذیب اور اسلامی آئین سے گونا دلبستگی ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے واقعات کو اس زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کے عادی نہیں۔ جس کی وُہ مستحق ہے۔ مجھے ایسے لوگوں کی خبر ہے جو نہایت نیک نیتی اور عزت و احترام سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ساربان اور ان کی تہذیب کو "صحرائی تہذیب" سے موسوم کرنے کے عادی ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان تمام عرب بھر میں بہت جاہ و جلال کا خاندان مانا جاتا تھا، اور کعبہ کے متولی ہونے کی وجہ سے وُہ مذہبی اور سوشل معاملات میں قائد کی حیثیت سے مانے جاتے تھے۔ محمد صلعم کے والد ان کی پیدائش سے پہلے ہی دارالبقا کو سدھار چکے تھے اس لیے عبدالمطلب آپ کے دادا جو تمام قبیلوں میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ آپ کے لیے بمنزلہ والد کے تھے۔ قبیلہ کا ہر ایک فرد اپنے آپ کو ایک دُوسرے کے برابر سمجھتا تھا، تاہم ان میں امارت کا احساس بہت زیادہ تھا۔ افراد کی طرح قبیلوں کا بھی یہی حال تھا۔ اور قریش تمام قبیلوں میں ممتاز تصور کیے جاتے تھے۔

اگرچہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی سیرت کی پاکیزگی اور سادگی کی وجہ سے کوئی کام کرنا عار نہیں سمجھتے تھے حتیٰ کہ آپ بھیڑ بکریوں

کی رکھوالی کرتے تھے، اُونٹ چرایا کرتے تھے۔ اپنے کپڑے خود سی لیا کرتے تھے اور اپنے قبیلہ کی عورتوں کے کام میں ان کا ہاتھ بٹا دیا کرتے تھے۔" تاہم ان تمام باتوں سے اگر آپ ان کے عالیشان گھرانہ کو نظرانداز کر دیں گے تو ان کے عظیم الشان کام کو جانچنے ہوئے سخت غلط فہمی کا احتمال ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم غریبوں کے دُکھ درد میں اُن کے ساجھی ہوتے تھے۔ اور عربی مقولہ کے مطابق اگر امرا ان کے دست نگر تھے تو وُہ غربا کی دلجوئی سے کبھی غافل نہ ہوتے تھے جس وقت ہم اپنی آنکھوں کے سامنے اس عریاں حقیقت کو لاتے ہیں کہ محمد صلعم کا لائحۂ عمل اپنے معزز قبیلہ کی دیرینہ روایات کو جو کعبہ کے متولی ہونے کی حیثیت سے بہت زیادہ اہمیت رکھتی تھیں ملیا میٹ کرنے میں مضمر تھا تو ان کے عظیم الشان کام کی اہمیت اور عظمت بہت بڑھ جاتی ہے جس وقت سے انہوں نے طول و عرض عرب میں صورِ حق پھونکا۔ لوگوں نے ان الفاظ میں اس کا مضحکہ اڑانا شروع کر دیا: " تو کیا تو ہمارے باپ دادا سے زیادہ عقلمند ہے کہ تو انہیں بُرا بھلا کہتا ہے اور ہمارے بتوں کی بھی تفضیک کرتا ہے۔ یاد رکھ کہ عبدالمطلب نے تیری پرورش کی ہے اور تو اسی دیوار کو ڈھا رہا ہے جس کو وہ مقدس سمجھتا تھا، اور یہ بات ہرگز تیرے شایانِ شان نہیں۔"

صحرائی تہذیب

دُوسرا اہم پہلو جس کی طرف میں آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہُوں، وُہ یہ ہے کہ نہ تو جس تہذیب کو پیغمبر علیہ السلام نے مٹایا صحرائی تہذیب تھی۔ اور نہ ہی کسی ایسی تہذیب کی بنیاد ڈالی جسے ہم صحرائی تہذیب سے تعبیر کر سکیں۔ ارباب خبر کی نظر سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہوگی کہ مکہ اور مدینہ عرب کے وسطی صحرائی جغرافیائی حدود سے باہر ہیں اور آجکل کی طرح اس وقت بھی یہ دونوں شہر عظمت و شہرت کے مالک تھے۔ اگر ہم ان میں طائف کو بھی جو مکہ سے مشرق کی جانب ساٹھ میل کے فاصلہ پر پُر فضا نخلستان ہے، اور جو پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی مبارک کے سلسلہ میں کافی اہمیت رکھتا ہے، تو ہم تین شہروں کے نام لے سکتے ہیں، جو عربی ثقافت کے مرکز تھے۔ اس کے علاوہ اور کسی جگہ تہذیب و تمدن کا نام و نشان نہ تھا۔ زمانہ جاہلیت کا عرب زرا پرا وحشی تھا۔ اس کی شاعری تشدد اور دختر کشی کے جذبات سے مملو تھی۔ فریب کاری، تفاخر، بدکاری اور خانہ جنگی اس کا امتیازی نشان تھے۔ آج بھی ہم اگر زمانۂ جاہلیت کی شاعری کا بنظرِ امعان مطالعہ کریں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ ان لوگوں کا معیارِ ثقافت ایسا نہ تھا جو کسی دوسری قوم کے نزدیک قابلِ قبول ہوتا۔ اس کے علاوہ دُوسرا نظام جو مکہ، مدینہ اور طائف میں مروّج تھا۔ متذکرہ بالا حالات سے بدتر تھا۔ توہمات، بھوت پریتوں کے قصے، اخلاقی پستی اور خود غرضانہ روایتیں اور انسانوں اور قبیلوں کی باہمی رقابتیں اس سلسلہ نظام کی مختلف کڑیاں تھیں۔ جن کا پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ایک جھٹکے سے ٹوٹنا مقدر ہو چکا تھا اور دنیا کی حیرت یافتہ آنکھوں نے سچ مچ دیکھ لیا کہ محمد صلعم نے نہ صرف ان طاغوتی طاقتوں کے نقوش کو حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے ہی مٹا دیا بلکہ ایک ایسا پاکیزہ نظام قایم کیا، جس کی روشنی سے چار دانگ عالم جگمگا اُٹھا۔ میں یہاں غیر مبہم الفاظ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہُوں کہ یہ نیا نظام ورونِ عرب کا اس قدر رہینِ منت نہیں۔ جس قدر کہ بیرونِ عرب کا ہے۔ اس کی اخلاقی اپیل بہت بلند معیار کے لیے تھی۔ آج بھی اگرچہ بدو لوگ برائے نام مسلمان ہو چکے ہیں۔ لیکن ان کے افعال و اعمال پر اسی جہالت و بربریت کے پردے

پڑے ہوئے ہیں، جن کو آقائے نامدار نے آج سے ساڑھے تیرہ سو سال قبل چاک کیا تھا۔

والدین

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں سات سال تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی پر عبدالمطلب کا گہرا اثر رہا۔ آپ کے والد عبداللہ آپ کی پیدائش سے قبل ہی رحلت فرما چکے تھے۔ آپ کی والدہ محترمہ کی شخصیت بھی تاریخ کی روشنی میں دھندلی سی نظر آتی ہے اسلام میں دو تین بہت بڑی اور کامل عورتیں ہوئی ہیں۔ لیکن پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام مہر مادری اور شفقت پدری دونوں سے ہی محروم تھے آپ کی والدہ ماجدہ چھ سال کی عمر میں انتقال فرما گئی تھیں۔ عرب کے رواج کے مطابق آپ نے اس چھ سال کے عرصہ میں اپنی والدہ کو بہت کم دیکھا تھا۔ اور یہ اس طرح ہوا کہ مکہ کے جلیل القدر قبیلے موسم گرما میں اپنے بچوں کو سخت گرمی سے بچانے کے لیے اندرونِ ملک میں جہاں نسبتاً کم گرمی ہوتی ہے، بھیج دیا کرتے تھے۔ اس لیے جونہی بچے توتلی زبان سے باتیں کرنے کے قابل ہوتے اس وقت سے الھڑ پن تک دُو دائیوں کی گود میں ہی پلتے تھے۔ اسی رواج کے مطابق رضاعت کے فرائض کا زیادہ حصہ بی بی حلیمہؓ نے جو محمد صلعم کی زندگی میں بہت اہمیت رکھتی ہیں سر انجام دیا۔ بی بی حلیمہؓ کا خاندان غربت اور بے کسی سے دوچار تھا۔ آپ کے قبیلہ کی دُوسری عورتیں امیر گھرانوں کے بچوں کی تلاش میں ماری ماری پھرتی تھیں۔ مگر حلیمہؓ کی بلند نصیبی دیکھیے کہ اُسے دُودھ پلانے کو ایک یتیم بچہ ملا، جس کے سر سے ماں کا سایہ بھی بہت جلد اُٹھنے والا تھا۔ عبدالمطلب کے سولہ بچے تھے اور عبداللہ ان کے آٹھویں لڑکے تھے، اس لیے وہ کوئی بہت امیر نہ تھے اور ان کی بیوہ حلیمہؓ کو بہت زیادہ معاوضہ دینے کے قابل نہ تھیں۔ لیکن جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے اس خوش بخت دُودھ پلانے والی نے اس بچہ کو اٹھایا جس کی آنکھوں سے روشنی اور پاکیزگی چھن چھن کر نکل رہی تھی۔ اس پاکیزہ جوہر کو اس طرح اٹھا کر وہ شاداں و فرحاں اپنے قبیلے میں واپس چلی آئی اور دو سال تک تن دہی سے رضاعت کے فرائض سر انجام دیے۔ رواج کے مطابق اب اُسے بچہ کو واپس کرنا تھا با دلِ ناخواستہ وہ اسے واپس لے کر آئی، لیکن فراق کے خیال سے اُس کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ بالآخر اس نے آنسو بھری آنکھ اور لجاجت بھرے دل سے درخواست کر دی کہ مجھے ایک دو سال کے لیے اور اس بچہ کو دُودھ پلانے کی اجازت دی جائے کیونکہ "یہ پیارا بچہ ہمک کر جب میری چھاتی سے چمٹ جاتا ہے تو میری رگوں میں اطمینان و سرور کی مقدس لہریں دوڑ جاتی ہیں" اس کی اس بے تابانہ درخواست کو ٹھکرایا نہیں گیا اور وہ خوشی خوشی بچہ کو واپس لے آئی۔ لیکن آخر کار وہ وقت آ گیا کہ وہ اس کو اور زیادہ اپنے پاس نہ ٹھہرا سکتی تھی۔ اس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر چار سال کے قریب تھی۔

بی بی حلیمہؓ

انسانی تاریخ میں اس پیارے بچہ اور دائی حلیمہؓ کے درمیان بے حد محبت تھی۔ بی بی حلیمہؓ کے دو لڑکے بھی تھے۔ اور یہ رضاعی بھائی محمد صلعم کو بہت پیار کرتے تھے۔ محمد صلعم ان کے ساتھ باہر جایا کرتے تھے۔ ایک دن حلیمہؓ کے دونوں لڑکے اپنی بھیڑیں چرانے باہر لے گئے تھے۔ آپ نے حلیمہؓ سے پوچھا: "اماں! میرے بھائی کہاں ہیں؟" حلیمہؓ نے محبت بھری نظر سے

دیکھ کر جواب دیا: "میرے لال! مجھے پتا ہے تجھے ان سے بھائیوں کی طرح محبت ہے۔ کیا تو بھی ان کے ساتھ جانا چاہتا ہے؟" محمد صلعم نے بھولے انداز سے کہا: "ہاں"۔ اس کے بعد جیسا کہ روایت میں بیان کیا جاتا ہے۔ حلیمہؓ نے نہایت محبت سے اس بھولے بھالے معصوم بچّہ کو اُجلے کپڑے پہنائے۔ اور اس خیال سے کہ مبادا کوئی بدرُوح اسے تکلیف پہنچائے آپ کے بازو پر ایک تعویذ باندھ دیا اور آپ کی آنکھیں اور پیشانی چُومتے ہُوئے کہا "جا میرے لال۔ اپنے بھائیوں سے جا کر کھیل۔ اللہ تیرا نگہبان ہو"۔ محمد صلعم نے تعویذ کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے بھولے انداز سے پُوچھا: "اماں! یہ کیا ہے؟" حلیمہؓ نے کہا: "لال! یہ تعویذ ہے تاکہ بدروحیں تجھے تکلیف نہ پہنچا سکیں"۔ یہ بات سُن کر ننھے محمد صلعم نے تعویذ اتار کر پھاڑ پھینکا اور عجب شانِ دلربائی سے کہا: "مجھے ایسی چیزوں کی حفاظت پسند نہیں، خدا خود میری حفاظت کرے گا"۔ مدتوں بعد محمد صلعم نے دعوتِ حق بلند کی۔ تو حلیمہؓ نے شہادت دی کہ چھوٹی سی عمر میں بھی ننھے محمد صلعم نے جہالت کی قبا چاک کر ڈالی تھی اور اُس وقت بھی اُسے خدا پر کامل یقین تھا۔

قلب میں انوارِ تجلیات

اس کے علاوہ ایک اور کہانی بھی بیان کی جاتی ہے جس کے متعلق ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ آیا یہ تمثیل ہے یا امرِ واقعہ ہے وھو ھذا۔ جس وقت حضورؐ کی عمر تین سال کی تھی اور آپ اپنے رضاعی بھائیوں سے کھیل رہے تھے آپ یکایک غائب ہو گئے دوسرے لڑکے سخت متعجب ہُوئے، ان میں سے ایک بانپتا کانپتا حلیمہؓ کے پاس آیا اور کہا: "اماں! کچھ خبر بھی ہے محمدؐ کو کیا ہو گیا ہے، جلدی آ، دیکھ، تجھے تو بہت دیر ہو گئی ہے۔" حلیمہؓ بھاگتی بھاگتی آئی اور تلاش کے بعد محمدؐ کو ایک درخت کے نیچے بیٹھا دیکھا، ان کو حیران و پریشان دیکھ کر اُس نے معصومانہ انداز سے پوچھا: "آپ حیران کیوں ہیں؟" انہوں نے مسرت آمیز تعجب سے کہا: "واہ! ہم حیران کیوں نہ ہوں، تُو تو غائب ہو گیا تھا۔" حلیمہؓ نے پیار سے پُوچھا: "تُو یہاں کیا کر رہا تھا؛ اور تیرے ساتھ کیا ہُوا؟" محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: "میں نے دو آدمی فرشتوں کی مانند دیکھے جنہوں نے مجھے اُٹھا لیا اور پھر میرا دل چیر کر اسے برف سے دھو ڈالا۔ اور اس میں پاکیزہ خوشبُو بھر دی۔"

ان واقعات سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بچپن سے ہی آنحضرتؐ میں خیالات، حسیات اور مناظرِ قدرت سے لگاؤ کی جھلک نظر آتی تھی اور خدا کی قدرتِ کاملہ جو مردوں، عورتوں، بچّوں، پرندوں غرض ہر ایک حقیر جاندار کی خبر گیری کرتی ہے۔ اور جو ہمیں پاکیزگی اور روشنی کی طرف رہنمائی کرتی ہے ہم پر بالکل روشن ہو جاتی ہے۔

ابُو طالب

جسمانی ترقی کے ساتھ ساتھ محمد صلعم کی انسانی محبت اور رحم دلی میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ اور لوگ اُسے دیکھ کر بے ساختہ پکار اُٹھتے تھے کہ "یہ کس قدر پیارا اور رحم دل بچّہ ہے!" پانچ سال کی عمر میں آپؐ کی والدہ کا انتقال ہُوا۔ لیکن آپؐ کے دادا تمام خاندان سے آپؐ کو زیادہ پیار کرتے تھے۔ اور جب ان کے ملنے جلنے والے ملاقات کی غرض سے آتے تو عبد المطلب محمد صلعم کو

نہایت شفقت سے "میرے بیٹے" کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ چنانچہ بہت سے مفسرین یہ لکھا دیکھ کر متعجب ہُوا کرتے ہیں کہ محمد صلعم عبدالمطلب کے پوتے نہ تھے بلکہ بیٹے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد عبدالمطلب کا بھی انتقال ہوگیا۔ اور آپؐ کی پرورش کا ذمّہ ابوطالب نے لیا جو آپ کے حقیقی چچا تھے۔ اور اگرچہ ابوطالب نے آباو اجداد کے مذہب کو نہ چھوڑا، تاہم آپ نے اپنے عظیم الشان بھتیجے کو دشمنوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ہر ممکن سعی کی۔ جس وقت ابوطالب کا انتقال ہُوا، اس وقت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا سن شریف پچاس سال تھا۔ ابوطالب کے اور بھی لڑکے بالے تھے۔ لیکن ان میں کبھی رقابت کا جذبہ پیدا نہیں ہُوا کیونکہ محمد صلعم بہت زیادہ پیارے تھے اور ان کے چچازاد بھائی ان کو عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھنے کے عادی تھے۔ ابوطالب کے لختِ جگر علیؓ تو جو حضرت محمد صلعم سے بیس سال چھوٹے تھے اپنے چچازاد بھائی پر پروانہ وار نثار تھے۔

تجارتی مراکز کا سفر

محمد صلعم کسی منزل میں اپنے خیالات اور دلچسپیوں کو وسیع کرنے کے موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ ابوطالب تجارت کی غرض سے مصر اور شام کو جایا کرتے تھے۔ جس وقت آنحضرتؐ کی عمر بمشکل بارہ تیرہ سال کی تھی آپؐ نے بھی ساتھ جانے کا شوق ظاہر کیا۔

ہم قوتِ تخیل کے ذریعہ چچا اور بھتیجے کی گفتگو کا تصور کر سکتے ہیں۔ ابوطالب کہتا ہوگا "لیکن تُو تو ابھی چھوٹی عمر کا بچّہ ہے۔" محمد صلعم جو اپنی عمر کے لحاظ سے بہت زیادہ عقلمند اور دھن کے پکّے تھے جواب میں کہتے ہوں گے: "یہ ٹھیک ہے کہ میں عمر کے لحاظ سے بہت کم سن ہُوں لیکن خدا کی وسیع و عریض دنیا جس طرح بڑوں، بوڑھوں اور مردوں عورتوں کے آگے پھیلی ہُوئی ہے۔ اسی طرح کم سن بچّوں کے آگے بھی کتابِ عالم کھلی ہُوئی ہے۔ میں دنیا کے آدمیوں اور عورتوں کو دیکھنا چاہتا ہُوں کہ وہ کس طرح کاروبار اور تجارت میں مصروف ہیں۔ میں ان کے طور طریقوں اور ان کے دلوں سے واقف ہونا چاہتا ہُوں تاکہ مجھے معلوم ہو سکے کہ وہ کس طرح خدا کی طرف جھکتے ہیں۔" کہا جاتا ہے کہ تیرہ سال سے پچیس سال کی عمر تک محمد صلعم مصر، شام اور یمن کے سفروں کے درمیان جو اس وقت عرب کے گردو نواح میں تہذیبی مراکز تھے۔ عیسائی رہبانوں اور یہودی علماء سے عموماً ملا کرتے تھے۔ وہ ان کے پاس بحث و مباحثہ کے لیے نہیں بلکہ نہایت محبت اور شریفانہ طریقہ سے گفت گو کرنے کے لیے جایا کرتے تھے اور ان کے دلوں پر اپنی نیک نیتی اور شرافت کا غیر فانی نقش چھوڑ آیا کرتے تھے۔ شیکسپیئر میں ایک ناقابلِ فراموش محاورہ ہے جس کا مفہوم یہ ہے:

"ہماری خامیوں کی تلافی اپنے تخیل کی مدد سے کر لو۔"

محمد صلعم ایک ایسے انسان تھے جنہوں نے اپنی قسمت اور حالات کی خامیوں کی تلافی اپنی بے مثل شخصیت سے کی۔ اگرچہ بچپن میں ہی شفقتِ پدری اور مہرِ مادری سے محروم ہوگئے تھے تاہم انہیں دو ماؤں کی محبت نصیب تھی، اور انہوں نے انسانوں کے لیے ان غیر فانی الفاظ میں ماں کی عظمت و رفعت کا سبق چھوڑا ہے "زیرِ قدمِ والدہ فردوس بریں ہے۔" وہ مصائب و نوائب کے بے پناہ سختیوں سے واقف ہونے کے باوصف بھی بچّوں اور بیکسوں پر معصوم تبسم کے پھول نثار کیا کرتے تھے۔ "الفقر فخری"

ان کی کتاب زندگی کا سنہری باب تھا۔ تنہائی ان کی زندگی کا جزو تھی۔ مگر لوگوں کی مجلسوں میں وُہ اپنے آپ کو اجنبی محسوس نہ کرتے تھے وہ لوگوں سے مل کر عقل و فراست کے موتی حاصل کرتے تھے۔ وُہ کم گو تھے۔ مگر ان کے الفاظ موزونیت اور فصاحت و بلاغت کا مرقع ہوتے تھے۔ اگرچہ وُہ اُمّی محض تھے۔ مگر عام اشیاء کی حقیقت اور لوگوں کے دل کی عمیق گہرائیوں سے واقف تھے۔ وہ وسیع القلب تھے جو ہر وقت جاگتا رہتا تھا۔ انہوں نے فرمایا ہے:

"میری آنکھیں سو جاتی ہیں مگر میرا دل ہر وقت بیدار رہتا ہے۔"

دیانت و امانت

آپ ان حالات میں جوان ہونے گئے۔ اور اسی عمر میں آپ کی صداقت و حقانیت، عزم و ارادہ کی پختگی اور بے مثل امانت کا شہرہ تھا۔ لوگ کہا کرتے تھے: "ان میں صداقت کی جھلک نظر آتی ہے۔" جس وقت آپ کی عمر پچیس سال تھی۔ مکہ کی ایک امیر عورت نے جس کے تجارتی قافلے شام اور مصر کو جایا کرتے تھے اپنے دل میں کہا کہ "اگر میں اس دیانتدار اور باوفا شخص کو اپنی تجارت میں شامل کر سکوں تو میرے لیے بہت فائدہ مند ہوگا۔ میں نے اس کی دیانت اور امانت کا بہت شہرہ سنا ہے۔ اچھا میں اُسے پیغام بھیجوں گی۔" چنانچہ اس خاتون نے لرزتے ہوئے پیغام بھیجا کہ وہ اس کے تجارتی قافلہ کی سرداری قبول کر لیں۔ انہوں نے اس کو قبول کر لیا۔ اور کہا جاتا ہے کہ اس خاتون نے اس قافلہ میں بہت سا مال لگا دیا۔ اور جب محمد صلعم سفر سے واپس تشریف لائے تو انہوں نے کوڑی کوڑی کا حساب دیا۔ یہ سفر تجارتی نقطۂ نگاہ سے بہت کامیاب رہا۔ اور وُہ خاتون محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت زیادہ قدر دان ہوگئیں۔

حضرت خدیجہؓ اور حضرت فاطمۃ الزہراؓ

حضرت خدیجہؓ بہت امیر اور با اثر خاتون تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حُسنِ سیرت کی طرح حسنِ صورت سے بھی نوازا تھا۔ آپ اکثر محمد صلعم سے تجارتی امور کے علاوہ دُوسری باتوں کے متعلق گفتگو فرمایا کرتی تھیں۔ اور محمد صلعم ان حیرت انگیز باتوں کے متعلق انہیں آگاہ کرتے جو انہوں نے چشمِ بصیرت سے دیکھی تھیں۔ حضرت خدیجہؓ کو محمد صلعم کی مذہبی شیفتگی کا علم تھا اس لیے وُہ نہایت احترام سے ان مذہبی معارف کو سنا کرتی تھیں، جن کے متعلق وُہ عیسائی رہبانوں اور یہودی علماء اور عرب کے سرداروں سے باتیں کیا کرتے تھے۔ علاوہ بریں محمد صلعم نے اپنے خواب بھی ان سے بیان کیے اور غارِ حرا میں شب بیداری اور ستاروں کے نکلنے اور چھپنے کے دل آویز اثرات بھی سنایا کرتے تھے۔ محمد صلعم کا مذہبی رجحان دیکھ کر حضرت خدیجہؓ کو آپ سے بہت محبت ہوگئی اور وُہ آپ کے عقد مبارک میں آگئیں۔ آپ نے ان کی زندگی بھر ایک باوفا شوہر کی مانند ان کے ساتھ زندگی بسر کی۔ حضرت خدیجہؓ بے حد نیک اور پاکیزہ بیوی تھیں، جو اپنے شوہر کی فطرت سے آگاہ اور ان کی اخلاقی اور روحانی تکلیفوں کو سمجھتی تھیں۔ جس وقت تمام دنیا نے انہیں ماننے سے انکار کر دیا۔ تو حضرت خدیجہؓ نے انہیں نبی تسلیم کیا۔ انھوں نے کبھی ایک بار بھی اپنے پاکیزہ شوہر

کے کام میں بارج ہونے کے خیال سے اور ان کے لائحۂ عمل میں رکاوٹ پیدا کرنے کے اندیشہ سے اپنی شخصیت کو ان کی شخصیت پر فنا نہ کیا۔ پچیس سال سے چالیس سال کی عمر تک محمد صلعم تمام بیرونی تفکرات سے بہت حد تک آزاد ہو کر روحانی ارتقا کی منازل طے کرتے رہے، تاکہ وُہ اپنے عظیم الشان فرض سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہو سکیں۔

حضرت خدیجہؓ اسلامی تاریخ میں چار مکمل پاکیزہ عورتوں میں سے تسلیم کی جاتی ہیں۔ آپ کی صاحبزادی حضرت فاطمۃ الزہراؓ بھی آپ کے پایہ کی تھیں جو بعد میں حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کے حبالۂ عقد میں آئیں۔ حضرت فاطمہؓ مکمل باپ اور پاکیزہ ترین ماں کی پاکیزہ بیٹی تھیں۔

جس وقت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا دعویٰ کیا، اور اس پر تمام عرب ان کی مخالفت پر کمر باندھ کر کھڑا ہو گیا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی عمر سات آٹھ سال کے قریب تھی۔ وہ اپنے والد محترم کے ساتھیوں کو استبداد کی چکی میں پستا دیکھتی تھیں اور آنسو پی کر چُپ ہو رہتی تھیں۔ مگر ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے والد کے دعویٰ کو شک کی نگاہ سے دیکھنے کے لیے تیار نہ تھیں۔

جنگِ اُحد کے بعد جب حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کی عمر اکیس سال تھی تو انہوں نے میدانِ جنگ میں پیغمبر علیہ الصلوٰۃ و السلام کے زخم دھو کر پٹی باندھنے میں بہت بڑی حاضر دماغی کا ثبوت دیا۔ آپ محبت اور شفقت کا سرچشمہ اور پاکیزگی کا اعلیٰ ترین نمونہ تھیں۔

جس وقت آنحضرت کا سن شریف ۳۵ سال تھا، اس وقت ایک معاملہ پیش آیا، جس سے لوگوں کے دلوں میں آپ کی دیانت و امانت کا سکہ بیٹھ گیا۔ اور اس واقعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ برائے نام مذہبی اور دنیاوی عقل کی خشک اور سخت روایتوں سے بالاتر رہ کر انسانی دل کی گہرائیوں سے واقف ہو سکتے تھے۔

اس وقت کعبہ کی دوبارہ تعمیر ہو رہی تھی اور تمام قبیلوں میں حجرِ اسود کو نصب کرنے پر سخت جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ ہر ایک قبیلہ یہی سمجھتا تھا کہ حجرِ اسود کو نصب کرنے کا ہمارا مقدم حق ہے۔ قریش کے مختلف قبیلوں میں اس پر فساد کی چنگاریاں بھڑک رہی تھیں اور قریب تھا کہ تلواریں تڑپ کر میانوں سے نکلتیں اور دم بھر میں کشتوں کے پشتے لگ جاتے۔ اسی اثناء میں محمد صلعم جنہیں "الامین" کے معزز لقب سے پکارا جاتا تھا، ادھر آ نکلے۔ وہ بنی نوع انسان کی ہر مصیبت کے وقت اپنے سر اور دھڑ کی بازی لگا دینے سے گریز نہ کرنے والے تھے۔ چنانچہ اس وقت بھی انہوں نے اس تشویشناک نزع کو نہایت احسن طریقہ سے نپٹا دیا۔

اگرچہ قریش کے تمام قبیلوں نے انہیں ثالث مقرر کر دیا تھا، مگر محمد صلعم نے کوئی ایسا قدم نہ اٹھایا جس سے کسی قبیلہ کی طرفداری کا شبہ ہو سکے یا ان کی اندرونی رقابت کی چنگاریاں بھڑک اٹھیں۔

چنانچہ آپ نے اپنی چادر زمین پر بچھا دی۔ اور اس پر حجرِ اسود رکھ کر لوگوں سے کہا: "ہر ایک قبیلہ اپنا ایک ایک نمائندہ بھیج دے۔" جب تمام قبیلوں کے نمائندے آ گئے تو آپ نے ان کو چادر کے کونے پکڑا دیے اور اس طرح خود حجرِ اسود اٹھا کر اس کی جگہ نصب کر دیا اور عربوں کو ہولناک خونریزی سے بچا لیا۔ یہ تو ایک معمولی واقعہ تھا، مگر اس کے بعد ان سے ایسے امور سرزد

ہونے والے تھے جن نے تمام دنیا کو غرقِ ورطۂ حیرت کر دیا۔

نبوّت کا اعلان

جس وقت آپ کی عمر چالیس سال کی تھی تو آپ نے نبوّت کا اعلان کیا۔ یہ بہت نازک وقت تھا۔ تشکک و شبہات کی تاریک بجلیاں گھر رہی تھیں، مصائب و نوائب کے جھکڑ چل رہے تھے مگر ان سب کے با وصف آفتابِ نبوت چمکا اور اس طرح کہ تمام دنیا کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ آپ غارِ حرا میں (جو کہ کے نزدیک ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی) اکثر تشریف لے جایا کرتے تھے وہاں آپ متعدد راتیں عبادت اور تفکر میں گزارتے تھے۔ اور اکثر اس بات پر غور کرتے کہ میں اپنی قوم کو ان کی ہلاکتوں سے کیسے آگاہ کروں۔ ایک رات تجلیات سے ان کا سینہ مطلع انوار ہوگیا اور وہ قریب قریب بے ہوش ہو گئے۔ انہوں نے ایک فرشتہ دیکھا جو انہیں "اقرأ" یعنی "پڑھ" کہہ رہا ہے۔

محمد صلعم نے کہا: "میں کیسے پڑھوں، مجھے پڑھنا نہیں آتا۔"

لیکن پھر وہی "اقرأ" کی آواز ان کے کان میں گونجنے لگی اور انہوں نے سنا "اُٹھ اور لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچا، خدا جو خالق ہے جس نے آدمی کو لکھنا پڑھنا سکھایا اور اس کو نیا علم سکھایا۔"

اس پیغام کو سُن کر آپ اپنی بیوی خدیجہؓ کے پاس تشریف لائے اور اُن سے کہا:

"مجھ پر اس قدر بوجھ آپڑا کہ مجھے کچھ خبر نہ رہی، یہ مجھ پر کیا آیا تھا؟ یہ مجھ پر کیا بوجھ آپڑا ہے؟ کیا میں اس کو سہار سکوں گا؟ کیا یہ کوئی خبیث رُوح تو نہیں؟"

خدیجہؓ نے انہیں اطمینان دلایا اور کہا:

"آپ صادق ہیں، دنیا آپ کو ایماندار اور صادق کی حیثیت سے جانتی ہے، اور آج تک آپ کے لبوں سے کوئی جھوٹا لفظ نہیں نکلا۔ اللہ تعالیٰ کی یہی مشیّت ہے کہ آپ دنیا کو اس کا پیغام پہنچائیں۔"

اس کے بعد حضرت خدیجہؓ آپ پر ایمان لے آئیں وُہ اپنے چچازاد بھائی ورقہ کے پاس بھی گئیں اور انہیں تمام سرگزشت سے مطلع کیا۔ اس وقت دنیا "مسیح" کے انتظار میں کروٹیں بدل رہی تھی اور ان میں بہت سے لوگوں نے کہا کہ "آپ درحقیقت خدا کے پیغمبر ہیں"۔ یہ آپ پر پہلی وحی ہُوئی تھی اور اس کے بعد مایوسی اور تکلیف، خطرہ اور مصیبت کے لمحوں میں خدائے واحد پر آپ کامل ایمان رکھتے تھے، اور آپ پر الہام ہوتا تھا جو قرآن شریف کی شکل میں محفوظ ہے۔

صبر و استقلال کی مستحکم چٹان

اس واقعہ کے بعد مخالف طاقتیں آنکھیں مل مل کر بیدار ہونی شروع ہوگئیں اور وُہ لوگ جو آپ کو محبت کرتے تھے اور آپ کی تعریف میں رطب اللسان رہتے تھے۔ آپ کے مخالف ہوگئے۔ آپ کے رشتہ دار بھی آپ کی مخالفت پر کمربستہ

ہوگئے" یہ مجنون ہے، یہ ہمارے بتوں پر سب و شتم کیوں کرتا ہے؟"

عربوں کا دستور تھا کہ وہ ناپاک اور غیر صالح اعمال میں اپنے بتوں کو پشت و پناہ بنایا کرتے۔ لیکن محمد صلعم نے ببانگِ دہل کہا:

"کہ یہ سب تمہارے ذاتی تصرفات ہیں۔ خدا تو صرف ایک ہے جو اسود و احمر، آقا اور غلام، مرد اور عورت، بچّہ اور بوڑھے میں فرق نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک عربی اور عجمی، قریش اور غیر قریش ایک کانٹے میں تُلتے ہیں۔"

یہ انقلابی پیغام ان کے نزدیک آسانی سے قابل قبول نہ تھا۔ جب تک ان لوگوں کے سیم و زر کو کوئی خطرہ نہ تھا محمد صلعم کے پیغام کو مجذوب کی بڑ سمجھتے رہے۔ لیکن جب بہت سے لوگوں نے اسلام کا جوّا اپنی گردن میں ڈال لیا اور ان کے ذرائع آمدنی میں خطرہ پیدا ہُوا تو ان کی آنکھوں سے غیظ و غضب کے شعلے برسنے لگے۔ از بسکہ کعبہ کے متولی چڑھاوا اور نذر و نیاز کی فراوانیوں سے محروم ہورہے تھے اس لیے وہ اور بھی برافروختہ ہوگئے۔ محمد صلعم کی تعلیم انقلاب انگیز تھی کیونکہ وُہ انسانوں میں تفریق مٹانے آئے تھے۔

انہوں نے بلال حبشیؓ اور خباب کو عربوں کے شانہ بشانہ کھڑا کر دیا تھا جس پر عربوں نے بیک آواز کہا کہ: "یہ آدمی تو ہمارے آباؤ اجداد کی ریت مٹانے آیا ہے۔ اس کے خاندان کے لوگ بھی کیسے ہیں کہ اس کا دماغ بھی درست نہیں کر سکتے۔" انہوں نے حیلہ و حوائج اور لالچ و فریب سے انہیں جادۂ مستقیم سے متزلزل کرنا چاہا۔ مگر خدا کے مامور کی نگاہ میں سونے چاندی کے انبار اینٹوں سے زیادہ حقیقت نہ رکھتے تھے۔ جب کفارِ عرب نے دیکھا کہ وُہ کسی طرح سے بھی ڈھب پر نہیں آتے۔ تو انہوں نے ان کے عزیز و اقربا پر ستم توڑنے شروع کیے۔ مگر جو شخص دنیا میں خدا کا نام بلند کرنے نکلا ہو۔ اُسے کون ڈھیل دے سکتا ہے۔

دنیا نے پیغامِ حق کیسے سُنا

محمد صلعم نے جو بیج بویا تھا آخر بار آور ہونا شروع ہُوا۔ اور تمام قبیلوں کے لوگ ان پر ایمان لانے لگے۔ ابو بکرؓ نے جو عرب میں بااثر تھے، علی الاعلان کہہ دیا:

"یہ شخص اپنے دعوٰی میں بالکل سچّا ہے اور میں اس پر ایمان لاتا ہُوں۔"

ابوطالب جو محمد صلعم کے انقلاب آفریں پیغام کا مفہوم نہ سمجھتا تھا اور اپنے آباؤ اجداد کے مذہب پر قایم تھا، تادمِ آخر اپنے بھتیجے کی امداد پر کمربستہ رہا۔ محمد صلعم نے عورتوں کو جو عربوں کی مخصوص ذہنیت کی وجہ سے ذلت و نکبت کے تاریک گڑھوں میں گری ہوئی تھیں۔ از سرِ نو انسانیت کے زمرہ میں شریک کرنے کے لیے سعی مشکور کی جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ بہت سی عورتوں نے آپ کی صدا پر لبیک کہی جن میں حضرت خدیجہؓ آپ کی زوجہ محترمہ ہی سب سے پیش پیش تھیں۔ ان کے علاوہ ایک اور خاتون بھی تھیں جن کا میں ابھی ذکر کروں گا اور جنھوں نے اسلام کی گراں بہا خدمات سرانجام دیں۔ امیر و غریب آدمی اور عورت، بچّے اور بوڑھے اسلام کے جھنڈے تلے اکٹھے ہونے شروع ہوگئے۔ وہ لوگ جن کے حقوق کچلے جاتے تھے اور جن کے سروں پر ظلم و ستم کے آرے چلتے تھے بیک آواز پکار اُٹھے "یہ انسان تو ہمارے لیے رحمت کا سرچشمہ ہے۔ دُوسرے لوگ کبر و نخوت میں ہماری

ہستی سے ہی انکار کرتے ہیں۔ سخت گیر آقاؤں کے ستائے ہوئے غلام ان کے پاس آتے اور آقا بن کر واپس جاتے۔ سرزمین مکہ میں زید بن حارث ایک غلام تھا، جسے بعد میں آزاد کر دیا گیا تھا۔ اس کا باپ اس کو لینے کے لیے آیا لیکن اس غلام نے جس کی آنکھیں آفتاب نبوت سے مستفید ہو چکی تھیں، کہا: "اگرچہ میں آزاد ہوں اور میں آپ کو اپنے والد کی طرح محبت کرتا ہوں۔ مگر میرا ایک رُوحانی باپ بھی ہے جس کی محبت میرے جسم کے رونئیں رونئیں میں بسی ہُوئی ہے۔"

زید نے اپنے باپ کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور آستانۂ نبوت پر قربِ حقیقی کے لطف اٹھاتا رہا۔ زید تمام عمر آقائے نامدار رحمتِ عالمیان فخرِ عالم محمد صلعم کے ساتھ رہا۔ اور بعض اوقات اسے زید بن محمد بھی کہتے ہیں۔ سچ پوچھو تو اس وقت ہی غلامی کی زنجیریں کاٹ ڈالی گئی تھیں نہ کہ بارہ سو سال بعد۔

عمرؓ بن الخطاب

اب میں عمرؓ بن الخطاب کے اسلام لانے کے واقعہ پر ایک چھپلتی ہُوئی نظر ڈالنا چاہتا ہوں۔ آغاز اسلام میں عمرؓ ان لوگوں میں تھے جنہوں نے محمد صلعم کے آوازۂ حق کو دبانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ وہ لوگوں کو جو اسلام لا چکے تھے تپتی ہُوئی چٹانوں پر ننگا بدن لٹا دیتے تھے تاکہ موسم گرما کے گرم سُورج کی حدت ان کے دلوں سے اسلام کا جذبہ مٹا دے۔ مگر اسلام وُہ نشہ ہے جسے سختی کی کوئی ترشی اتار نہیں سکتی۔ اسلام کی پہلی جانباز شہید ایک خاتون تھیں جن کو دو اونٹوں کے درمیان باندھ کر نیزے سے دو نیم کر دیا گیا اور ان کے خاوند کو بھی شہید کر دیا گیا۔

ایک دفعہ کسی شخص نے عمرؓ سے کہا کہ "خیر آپ اسلام کو تو خوب مٹا رہے ہیں مگر پہلے ذرا اپنے گھر کی خبر تو لیں، آپ کی بہن تو مسلمان ہو چکی ہیں۔"

یہ سُن کر عمر کا پارہ غیظ و غضب کھولاؤ کے درجہ پر پہنچ گیا اور کہا: "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میری بہن اس مجنون پر ایمان لے آئے۔" اور سخت جوش میں بھرے ہُوئے اپنی بہن کے گھر گئے جہاں وہ، ان کا خاوند اور ایک اور آدمی موجود تھے۔ عمرؓ کو دیکھ کر وہ بہت متردّد ہُوئے۔ عمرؓ نے غصہ میں بھری ہُوئی آواز میں کہا:

"کیا تم اس سڑی پر ایمان لے آئے ہو، کہہ دو کہ یہ سب جھوٹ ہے، تم اس جادوگر کے سحر سے آزاد ہو۔"

اگرچہ وُہ دونوں عمرؓ کے رعب سے خوفزدہ تھے لیکن انہوں نے صاف کہہ دیا کہ:

"ہم تو محمد صلعم پر ایمان لے آئے ہیں اور اب خواہ ہمارے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں ہم ابدًا اس سے مُنہ نہیں موڑ سکتے۔"

عمرؓ اپنے بہنوئی پر ٹوٹ پڑے اور جب ان کی بہن نے بیچ بچاؤ کرنا چاہا تو اس کے گال پر ایسے زور سے تھپڑ مارا کہ خون جاری ہو گیا۔ ان سب باتوں کے باوصف وہ اپنے ایمان میں غیر متزلزل رہے۔ اس پر معاً عمرؓ کے دل میں خیال پیدا ہوا آخر وہ کون سی چیز ہے جس نے ان کے دلوں میں استقامت اور فروتنی کُوٹ کُوٹ کر بھر دی ہے اور اس نے اپنی بہن کو قرآن کا وہ صفحہ دکھانے کو کہا جو وہ تلاوت

کر رہی تھیں۔ ان کی بہن نے کہا: "بھائی! اس پاکیزہ چیز کو ہاتھ لگانے سے پہلے تُو پاک تو ہو لے۔" اس کے بعد جب انہوں نے قرآن سُنا تو ان پر عجیب اثر ہُوا، اور وہ ایمان لے آئے۔ اور ان کے شاندار کارناموں سے تاریخ اسلام کے زرّیں باب روشن ہیں۔

ظلم وستم کا دور

جُوں جُوں اسلام لانے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا تھا کفارِ عرب بھی زیادہ سے زیادہ ظلم کرنے لگے۔ ہمیں اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، بہت سے مسلمانوں کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔ کچھ حبشہ میں چلے گئے جہاں عیسائی بادشاہ نے ان کی خوب آؤ بھگت کی۔

جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۵۲ سال تھی مدینہ منورہ کے گردونواح میں اسلام پھیلنا شروع ہوگیا۔ مدینہ میں اسلام لانے کا پہلا اثر تو یہ ہوا کہ وُہ قبیلے جو پہلے ہمیشہ برسرِپیکار رہتے تھے شیر وشکر ہوگئے اور ان کی اخلاقی حالت بہت بلند ہوگئی۔ بہت سے مسلمان مکّہ سے ہجرت کرکے مدینہ چلے آئے۔ اس پر سرداران مکہ اور بھی برافروختہ ہوگئے اور انہوں نے یہ سازش کی کہ جس طرح بھی محمدؐ کو قتل کر دیا جائے۔ مدینہ والے محمد صلعم کو دعوت دے چکے تھے کہ وُہ مکّہ چھوڑ کر ان کے ہاں تشریف لے آئیں۔ چنانچہ آپ نے ان کی دعوت قبول فرمالی اور اپنے متبعین کو پہلے مدینہ بھیجنا شروع کر دیا۔ اس طرح دو دو اور تین تین کی پارٹیوں میں مسلمان مدینہ شریف کی طرف ہجرت کرنے لگے۔ جس رات کفار آنحضرت صلعم کو قتل کرنے کا منصوبہ باندھ چکے تھے۔ حضرت علیؓ نے آپ سے کہا: "میں آج رات آپ کے بستر پر سوؤں گا، میں نوجوان ہوں، اپنی حفاظت کرسکتا ہوں۔ اس کے بعد میں آپ سے جلدی آملوں گا" جیسا کہ کہا جاتا ہے محمد صلعم حضرت ابوبکرؓ کی معیت میں مدینہ شریف کو ہجرت فرما گئے اور ان کے بستر میں شیرِ خدا حضرت علی کرم اللہ وجہہ سو گئے۔ جس وقت کفار آئے اور انہوں نے محمد صلعم کی جگہ علیؓ کو دیکھا تو پیچ وتاب کھا کر واپس چلے گئے۔

مدینہ شریف کو ہجرت

مدنی زندگی گیارہ سال تھی۔ اور ان گیارہ سالوں میں عرب کی تمام تاریخ بدل گئی۔

اہلِ مدینہ نے ان کی راہ میں آنکھیں بچھادیں اور تمام عرب ان کے جھنڈے تلے جمع ہونے شروع ہو گئے۔ قریش دل ہی دل میں پیچ وتاب کھا رہے تھے اور چاہتے تھے کہ مدینہ کو فتح کرکے محمد صلعم کو اس جسارت کا مزا چکھائیں۔ ان کے یہ مذموم عزائم معلوم کرکے حضورؐ نے دفاعی تدابیر شروع کر دیں اور دنیا کو بتلا دیا کہ محمدؐ صرف رسول ہی نہیں، جس کا کام صرف دعوتِ حق ہی ہو بلکہ وُہ ایک شجاع سپاہی، ایک زبردست منتظم، پاکباز تاجر، صالح سیاست دان، بلند نگاہ مفکر اور حق پسند ثالث بھی تھے۔ اور ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان تمام حیثیتوں سے محمد صلعم نے ایک نئی رُوح اور ایک نیا جذبہ پیدا کرکے دنیا کا زاویۂ نگاہ بہت بلند کر دیا۔ میں ان کی تفصیلات کے بحرِ بیکراں میں جانا نہیں چاہتا کیونکہ سیرت کی بہت سی کتابوں میں ان کے متعلق تفاصیل کے دفتر موجود ہیں۔

رحم

دس سال تک قریش نے پے بہ پے کوششیں کیں کہ محمد صلعم کی طاقتوں کا تیا پانچا کرکے انہیں ایسا مزا چکھایا جائے کہ چھٹی کا

دُودھ یاد آجائے۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ وہ جو محمد صلعم اور ان کے پاکباز ساتھیوں کو گھائل کرنے کے دن رات منصوبے سوچتے رہتے تھے ان کے جگر میں ایسا تیر پیوست ہونے والا تھا کہ ان کے لیے ہائے ہائے کر کے بیٹھ جانے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ تھا۔

قریش کی دست درازیوں کے دن بیت گئے اور عرب میں ایک نئے سلسلے کا آغاز ہُوا۔ یعنی محمد صلعم مظلومی اور مجبوری کی زنجیروں کو توڑ کر مکّہ کی طرف ایک جرّار لشکر کے ساتھ بڑھے اور بغیر خونریزی کے اُسی سرزمین میں

"قل جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا"

کہتے ہُوئے داخل ہُوئے، جہاں سے دس سال پہلے رات کی سیاہ ظلمت میں مدینہ کی طرف ہجرت فرمانے پر مجبور ہُوئے تھے۔ وہ لوگ جن کے دن اور راتیں حضور اور آپ کے ساتھیوں کو قتل کرنے کے منصوبوں پر بسر ہوتی تھیں ان کے سامنے بیکسی کی تصویر بنے کھڑے تھے۔ آپ نے ان سے پوچھا" بتاؤ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟" شرم و حیا سے ان کی آنکھیں زمین پر گڑی ہُوئی تھیں اور وہ زبانِ حال سے کہہ رہے تھے کہ تیرے جیسے بے مثل انسان کے لیے انتقام روا نہیں تُو ہمارے ساتھ وہی سلوک کر جو یُوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کیا تھا۔ محمد صلعم کا دل انسانی ہمدردی سے اُمنڈ آیا اور ان سب کو معاف کر دیا۔ آپ کی درخشاں شخصیت کی روشنی سے جہالت اور گمراہی کی تاریکیاں کافور ہوگئیں، اور جہاں باہمی رقابت، کینہ اور انتقام کے بوجھ سے زمین کی کمر ٹیڑھی ہو رہی تھی، وہاں اخوت و محبت کا دریا ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ تمام عربوں نے پیغمبرِ اسلام کی قیادت سے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ لیکن یہ صرف اس سلسلہ کی پہلی ہی کڑی تھی، جس کا مقصد انسانیت کو اخوت کی سنہری زنجیروں میں جکڑنا تھا۔

غزوات

اب میں غزوات کے متعلق چند الفاظ کہنا ضروری سمجھتا ہُوں۔ غزوات سے مراد ایسی لڑائی نہیں جس کا مقصد مالِ غنیمت کا اکٹھا کرنا یا ملک غصب کرنا ہو، بلکہ محمد صلعم نے اعمال اور افعال سے ثابت کر دیا کہ انسانی کاروبار میں ہم بےحد صبر و سکون اور بےحد استقلال برت سکتے ہیں اور انہوں نے اصلاح میں بےحد استقامت کا ثبوت دیا۔ کون نہیں جانتا کہ لوگوں نے ان پر طرح طرح کے مظالم توڑے۔ ان پر کوڑا کرکٹ پھینکا گیا اور ان کو گالیاں دی گئیں اور ان پر قاتلانہ حملے کیے گئے۔ تو وہ ان کی تنظیم میں مصروف ہوگئے۔ بزدلی ان کو چھُو بھی نہ گئی تھی مدافعت کے لیے انہوں نے دشمن کے چیلنج کو قبول بھی کیا۔ اور اس سلسلہ میں سعی و کاوش اور جنگ و جدل بھی کی۔

جس وقت مکّہ فتح ہوگیا، اس وقت انہوں نے قتل و غارت سے نہ صرف پرہیز ہی کیا بلکہ ان کی جان و مال کی حفاظت بھی اپنے ذمہ لی۔ آج تخفیف اسلحہ کی کانفرنسوں میں جنگ کے بدنتائج کو دُور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے مگر ایسی کوششیں ناکامی پر ہی ختم ہوتی ہیں۔

عالمگیر اخوت

حضرت ختم الانبیاءؐ ۶۳ سال کی عمر میں رحلت فرما گئے۔ انھیں اپنے انتقال کی پہلے ہی سے خبر تھی۔ اور وُہ جانتے تھے کہ میں اپنا کام ختم کر چکا ہُوں۔ آپؐ نے آخری حج کے موقع پر جو رُوح پرور خطبہ دیا تھا اس میں عالمگیر اخوت، انسانی خون کی پاکیزگی، عورتوں اور

غلاموں کے حقوق کے متعلق بہت زور دیا۔ غلاموں کے متعلق آپ نے فرمایا کہ:

"جو خود کھاتے ہو، وہی انہیں کھلاؤ۔ اور جو خود پہنتے ہو وہی انہیں پہناؤ۔"

اور آپ نے تاکید فرمائی کہ اس اعلان کو دوسرے لوگوں تک پہنچا دیا جائے شاید ان پر زیادہ اثر ہو۔

موجودہ زمانہ کا پیغام

آنحضرتؐ کے انتقال کو آج تیرہ سو سال بیت چکے ہیں۔ جو آخری پیغام انہوں نے حج کے موقع پر دیا تھا اس کے ہم وارث ہیں اگرچہ ہم نے ان پاک الفاظ کو ان کی پاک زبان سے خود نہیں سُنا۔ لیکن وُہ آج بھی ہمارے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ شاید آنے والی نسلیں میرے پیغام کو کما حقہٗ سمجھ سکیں۔ در اصل محمدؐ کا پیغام تمام نوعِ انسان کے لیے ہے آپؐ کے پیغام نے "آزادی اور دلیل" کی تنگ وادیوں کو بے پایاں وسعتوں سے بدل دیا تھا۔ اور آج جبکہ ہماری "آزادی" اور "دلیل" کا مفہوم سمٹ سمٹا کر بہت محدود ہو رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ اسی پیغام کو پھر گوشِ ہوش سے سُنا جائے۔

آہ! آج ہم اس کے متبعین اس کی صداقت اور اس کی روحانی عظمتوں سے بہت دُور جا پڑے ہیں۔ کاش! ہم آپ کے عظیم الشان بلند ترین اور پاکیزہ پیغام کو سُنیں اور حضورؐ کے اُسوۂ حسنہ کو حرزِ جاں بنائیں تاکہ دُوسرے لوگوں سے ہمارا سلوک نیک ہو۔ اور ہم اپنے عظیم الشان پیغمبر (بابانا و اُمھاتنا) کی طرح جس کی عالمگیر رحمت اور نورِ ہدایت سے تمام نسلِ انسانی فیضیاب ہو رہی ہے۔ اپنے دشمنوں سے بھی حُسنِ سلوک روا رکھیں ورنہ اس پاک انسان کی عالمگیر تعلیم کے بنیادی اصول، ابوتِ الٰہی اور اخوتِ انسانی سے ہم ابداً آشنا نہیں ہو سکتے۔ صلوا علیہ و آلہ۔

رحمۃ للعٰلمینؐ بحیثیت انسان کامل

خلیفہ عبدالحکیم

اس اہم اور مقدس مضمون پر اظہارِ خیال کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ از رہِ تمہید انسان اور کمال کے تصورات کی نسبت مختصراً کچھ عرض کیا جائے۔ اس کائنات میں مخلوقات کے جو لاتعناہی اقسام ہیں ان میں سب سے زیادہ عسیر الفہم ہستی انسان ہے۔ انسان نے خاک و باد و آب و آتش اور مظاہر فطرت کی نسبت بہت کچھ یقینی علم حاصل کر لیا ہے اور اس یقینی علم کی بدولت انسان خارجی فطرت کا مسخر بنتا چلا جاتا ہے۔ لیکن خود اپنی نسبت اس کا علم ابھی ابجد سے آگے نہیں بڑھا۔ اپنی نسبت اس کا علم ابھی تک ظنی ہے۔ مگر جنون کی طرح ظنون کے بھی بے شمار اقسام ہیں۔ انسان نے اپنی نسبت متضاد تصورات قائم کر رکھے ہیں اور اس تضاد کو رفع کرنا مقصودِ عقل و حکمت اور غایتِ اخلاق و ایمان ہے۔ مگر یہ کام نہایت درجہ دشوار اور محال معلوم ہوتا ہے۔ طبیعی حکمائے مادیین نے انسان کو لامحدود مادی کائنات کا ایک اتفاقی مظہر اور آنی جانی کیفیت قرار دیا۔ ہستئ بے مقصود کے بحرِ متلاطم میں چند لمحوں کے لیے اُبھرنے اور جلد بے پروا موجوں سے دوبارہ ہمکنار ہونے والا حباب ناپائدار، زمان و مکان کی آفاقیت کا ایک تغیر پذیر اور بے ثبات شائبہ۔ دُوسری طرف آئیڈیالسٹوں نے اس کو مصدر و محورِ ہستی بنا دیا۔ بقول عارفِ رومی:

غالب از ما ہست شد نے ما ازو
بادہ از ما مست شد نے ما ازو

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ یہ جہانِ بے پایاں بظاہر ہم ایام میں غرق معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ زمان و مکانِ لامحدود سب کا سب اس ایک جام میں غرق ہے، جو انسان کا نفس یا دل ہے۔ مذاہب حکماء ہوں یا ادیان عالیہ، سب کے سب انسان کی متضاد فطرت کو علی الاعلان پیش کرتے ہیں۔ انسان ایک طرف مسجودِ ملائک ہے، تو دُوسری طرف مردود خلائق۔ یہ احسن تقویم والی مخلوق گرتی ہے، تو اسفل السافلین کی تاریک گہرائیوں میں پہنچ جاتی ہے اور اوپر اُٹھتی ہے تو اس کے ڈانڈے الوہیت سے جا ملتے ہیں اور تخلقوا باخلاق اللہ کا کٹھن راستہ طے کرنے کے بعد مجاہدہ اور معرفت اس کو حقیقتِ ازلی کا اس درجہ ہم صفت بنا دیتے ہیں کہ آگ میں پڑے ہُوئے لوہے کی طرح بشریت اور الوہیت کا امتیاز دشوار ہو جاتا ہے۔ ایک طرف وہ اس امانت کا امین ہے، جس کو قبول کرنے میں ارض و سما لرز گئے۔ لیکن یہ اہم امانت قبول کرنے والا ظلوماً جہولا اور دیوانہ بھی ہے۔ بقول غالب:

بُرد آدم از امانت ہرچہ گردوں بر نتافت
ریخت می برخاک چوں در جام گنجیدن نداشت

یا بقول حافظ:

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

کسی نے اس کو مجبورِ محض قرار دیا اور کسی نے اس کو اپنی تقدیر کا معمار تصور کیا۔
میر تقی کہتا ہے: ؎

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
جو چاہیں سو آپ کرے ہیں، ہم کو عبث بدنام کیا

آزاد کا یہ فتویٰ ہے: ؎

جہازِ عمرِ رواں پر سوار بیٹھے ہیں
سوار خاک ہیں بے اختیار بیٹھے ہیں

اس جبر کے مقابلے میں علامہ اقبال کی تلقینِ خودی ہے: ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

منطق خواہ کچھ ہی کہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ اختیار کے بغیر چارہ اور نہ صبر سے گریز۔ انسان کی نسبت جتنی باہم متضاد باتیں کی گئی ہیں، ان سب میں ہر ایک جزئی صداقت کی حامل ہے۔ انسان عقل کے جوہر سے مشرف ہے، لیکن اس عقل کو عنان گسیختہ جذبات کا غلام بھی انسان ہی بناتا ہے۔ انسان فطرت کا عظیم الشان شاہکار بھی ہے اور فطرت کی سب سے خطرناک لغزش بھی۔ قرآن کریم کو اس نظر سے پڑھیے تو اس مخلوق کا عجیب نقشہ نظر آتا ہے، از رُوئے قرآن یہ بھی درست ہے کہ انسان کو خدا نے اپنی فطرت کے مطابق بنایا۔ فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا۔ لیکن یہ انسان ناشکرا لربّہٖ لکنود بھی ہے۔ خلق من عجل جلد باز بھی ہے۔ کبد یا درد و کرب بھی اس کی فطرت کا لازمی جزو ہے۔ انسان کی زندگی کا سودا زیادہ تر گھاٹے ہی کا سودا ہے۔ ان الانسان لفی خسر۔ انسان آزادی کا خواہاں ہے اور دین بھی حریت کی طرف اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن وُہ خود اپنے آپ کو توہمات اور حرص و ہوس کی زنجیروں میں جکڑتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ انسان عقل و ایمان اور جذباتِ شہوانیہ کی مخالف لہروں میں پڑا ہُوا ایک بھنور رہ جاتا ہے۔

اسلام اور اس کی کتابِ حکیم نے انسان کی یہ تمام کیفیتیں بیان کی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ تلقین کی ہے کہ انسان کا وظیفہ زندگی اور مقصودِ حیات یہی ہے کہ وہ زندگی کے تضاد کو رفع کرتا ہُوا مسلسل اس وحدت کی طرف قدم بڑھائے، جو مصدرِ حیات و کائنات ہے۔ اس لحاظ سے دین اور حکمتِ عقلی میں کوئی تضاد نہیں۔ دین کی تعلیم بھی یہی ہے کہ تمام ہستی اپنی کثرت و تنوع کے باوجود ایک وحدت سے سرزد ہُوئی ہے، جو کثرتِ موجودات اور ظاہری تنوع کی شیرازہ بند ہے۔ انّا للہ و انّا الیہ راجعون کا یہی گہرا مفہوم ہے کہ ہمارا ماخذ ایک وحدت خلاق ہے اور مقصودِ حیات پھر اسی کی طرف عود کرنا ہے، کلّ شیئ

یرجع الی اصلہ:

ہر کسے کو دور ماند از اصلِ خویش
باز جوید روزگارِ وصلِ خویش

عقل و حکمت کا بھی یہی وظیفہ ہے کہ مظاہرِ فطرت خارجی ہوں یا مظاہرِ نفسِ انسانی، غرضیکہ ہر جگہ انفس و آفاق میں ان قوانین کی جستجو کرے، جن کی نسبت قرآنِ حکیم نے لا تبدیل لخلق اللہ کہا اور اسی کو دین قیم قرار دے کر دین اور حکمت کو ہم آغوش کر دیا ہے۔ دین ہو یا علم یا اخلاق سب رفع اضداد کی مختلف کوششیں ہیں۔

آیئے اس لحاظ سے اسلام اور اس کے پیش کرنے والے رحیم و حکیم نبی کی تعلیم اور زندگی پر ایک طائرانہ نظر دوڑائیں۔

بہت سے فلسفے اور کئی ادیان زندگی کے ظاہری اور باطنی اضداد سے گھبرا گئے۔ کسی نے کہا کہ یہ متغیّر عالم غیر حقیقی اور فریب ادراک یا مایا ہے۔ اور گیان کے ذریعے سے اس فریب سے نجات حاصل کرنا زندگی کی غایت ہونی چاہیے۔ کسی نے آرزوؤں کی اطمینان ناپذیر کشاکش سے بیزار ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ یہ درد سر ایسا ہے کہ سر جائے تو جائے، اس لیے اچھی اور بری تمام آرزوؤں کی بیخ کنی ہی سے نروان حاصل ہو سکتا ہے۔ یونانیوں نے کہا کہ عالمِ حقیقی اعیانِ ثابتہ کا عالمِ عقلی ہے اور متغیّر مظاہر کا عالم بے حقیقت اور بے ثبات ہونے کی وجہ سے قابلِ اعتنا نہیں۔ کسی نے ایک عالم کی بجائے خیر و شر کے آفریدہ دو عالم بنا دیے۔ ان میں سے ایک آفریدۂ یزداں اور دوسرا آفریدۂ اہرمن۔ اسلام نے سورۂ فاتحہ کی پہلی ہی سطر میں ان تمام باطل نظریات کی تنسیخ کر دی۔ خالقِ کائنات کو رب یا پروردگار قرار دیتے ہوئے یہ بتا دیا کہ یہ رب کسی ایک عالم کا رب نہیں بلکہ رب العالمین ہے۔ تمام عوالم ایک ہی خالق کے آفریدہ اور ایک ہی پروردگار کے پروردہ ہیں۔ عالمِ جماد، عالمِ نبات، عالمِ حیوان، عالمِ انسان، عالمِ افلاک، عالمِ ملائکہ ایک ہی ہستی کے آفریدہ ہیں، جو رحمان و رحیم ہے۔ رحمانیت میں رحمت کا جو مظہر ہے، اس کا تعلق آفرینش سے ہے۔ جس کی نعمتیں اور برکتیں مخلوقات کے اعمالِ حسنہ کا اجر نہیں بلکہ رحمت خلاقی کا نتیجہ ہیں۔ اس کے بعد شانِ رحیمی ہے جس کا ظہور انسانوں کی غلط روی کے بعد ہوتا ہے۔ اگر انسانوں کی ہر لغزش پر گرفت اور عذاب ہوتا تو زندگی محال ہو جاتی۔ خدا کے ہاں عدل بھی ہے، لیکن اس کی رحمت اس کے عدل کو بھی محیط ہے۔ اسی لیے رب العالمین کو رحمٰن و رحیم کے بعد مالکِ یوم الدین کہا گیا تاکہ رحمت کی سبقت انسان پر واضح ہو جائے۔ جس طرح اسلام کا پیش کردہ خدا رحمۃ للعالمین ہے، اسی طرح اس کا نبی کامل بھی رحمتِ کل کا مظہر ہے۔ کئی مذاہب و ادیان نے اس کائنات ہی کو ملعون قرار دیا تھا۔ نبی حکیم نے کہا کہ یہ کائنات نہ غیر اصلی ہے اور نہ باطل و مردود۔ ربنا ما خلقت ھذا باطلا۔ خدا کی رحمت کل کائنات میں جاری و ساری ہے، وہ کسی ایک عالم تک محدود نہیں۔ حقیقی معرفت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر عالم کو خدا کا ایک مظہر سمجھا جائے اور ہر مظہر میں خدا کی حکمتیں اور نعمتیں تلاش کی جائیں۔ رہبانیت کے مذاہب عالم مادی و جسمانی کو ملعون سمجھ کر فکر و عمل میں اس سے نجات حاصل کرنے میں کوشاں تھے اور روحانیت کی تکمیل کے لیے دنیا سے روگردانی اور بدن آزاری کو لازم گردانتے تھے۔ نبی حکیم و رحیم نے یہ اعلان کر دیا کہ لا رھبانیۃ فی الاسلام کوئی انسان دنیا کو رد کر کے نہ روحانیت میں ترقی کر سکتا ہے اور نہ خدا تک اس کی رسائی ہو سکتی ہے۔ انسان کے مقاصد اور جذبات میں بے شبہ تضاد پیدا ہوتا ہے لیکن اس کا علاج

جذبات کشی سے نہیں بلکہ حدود و عمل سے ان میں توازن پیدا کرنا ہے، تاکہ جذبات کی قوتیں نہ باہم برسرپیکار ہوں اور نہ عقل و ایمان سے دست و گریباں ہوں۔ قرآن و حدیث میں کئی جگہ نفسِ امارہ اور جذبات کی سرکشی کے لیے شیطان کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ نبی کریمؐ نے فرمایا کہ ہر شخص کے ساتھ اس کا ایک شیطان لگا ہوا ہے۔ سننے والے صحابی نے پوچھا کہ کیا حضورؐ کے ساتھ بھی ہے۔ اس کا جو بصیرت افروز جواب دیا، اسلام کی تمام امتیازی شان اس کے اندر موجود ہے۔ فرمایا کہ ہاں میرے ساتھ بھی ہے، لیکن میں نے اس کو مسلمان بنا کر اس کو اپنے ساتھ رکھا ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ازروئے اسلام دنیا میں کوئی قوت ایسی نہیں، جسے شرِ مطلق کہہ سکیں۔ زندگی کی اکثر قوتیں خواہ وہ مادی و طبعی ہوں یا نفسی، بجلی کی طرح بے طرف قوتیں ہیں۔ خیر و شر کا مدار ان کے صحیح یا غلط استعمال پر ہے۔ دیکھیے رسولِ کریمؐ کی رحمتِ کلی کی تعلیم جس میں جذبات و شہوات کی شیطنت بھی زاویۂ فکر و عمل کی تبدیلی سے معاونِ حیات اور ذریعہ ارتقا بن سکتی ہے۔

کمالِ صفات کا تصور خدا کی ذات کے ساتھ وابستہ ہے۔ خدا کی ذاتِ کاملہ کا فہم انسان کے لیے ممکن نہیں۔ خدا علیم ہے لیکن اس کا علم انسانی قسم کا علم نہیں ہو سکتا، جو مشاہدہ اور استقراء و استخراج اور علت و معلول کے روابط سے آشنا ہونے کا نام ہے وہ سمیع ہے لیکن اس کا سننا اس قسم کی شنوائی نہیں ہو سکتا، جو ہمارے آلۂ سماعت کی پیداوار ہے۔ وہ بصیر ہے، لیکن اس کی بصارت ہماری آنکھوں کی بصارت کے انداز کی نہیں ہو سکتی۔ وہ رحیم ہے، لیکن اس کے رحم میں وہ انفعالی کیفیت نہیں ہو سکتی جو انسان کے جذبۂ رحم میں پائی جاتی ہے۔ سہ

> ہیچ ماہیاتِ اوصافِ کمال
> کس نداند جز باثار و مثال

ان صفات کا کمال صرف خدا ہی میں ہو سکتا ہے۔ بہت سے ادیان اس غلطی میں مبتلا ہو گئے کہ پیشوایانِ دین کو کامل ثابت کرنے کے لیے ان کو خدا کے صفاتِ کاملہ سے متصف کر دیا اور ان کو خدا کا اوتار بنا دیا۔ اس غلط انگاری سے نبوت الوہیت بن گئی۔ ان مذاہب نے یہ نہ سوچا کہ جب خود خدا ہی انسان کا روپ اختیار کر کے دنیا کی ہدایت کے لیے نازل ہو گیا، تو انسانوں کے لیے وہ کس طرح نمونہ اور حسنہ بن سکتا ہے۔ انسان کی رہنمائی کے لیے تو انسان ہی کی اعلیٰ مثال کام آ سکتی ہے۔ ان ادیان کے مقابلے میں محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کمال انسانیت کا کمال ہے۔ یہ ایسے انسان کا کمال ہے جو انسانوں کے سامنے اپنے آپ کو بندۂ خدا کے طور پر پیش کرتا ہے اور خود معبود بننے کا خیالِ باطل اس کے واہمہ میں بھی نہیں گزر سکتا۔ وہ لوگوں سے کہتا ہے کہ میں عرصۂ دراز تک طالبِ حق اور سوچنے والا انسان تھا اور مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ایمان کسے کہتے ہیں۔ وہ ہدایت یافتہ ہونے کے بعد اپنے آپ کو خدا کا پیغام رساں کہتا ہے۔ وہ عالم الغیب ہونے کا مدعی نہیں۔ وہ راست بازی سے کہتا ہے کہ مجھے غیب کا بس اتنا ہی علم ہے، جتنا کہ خدا مجھے بخش دے۔ وہ خدا کی معرفتِ کلی کا دعویٰ بھی نہیں کرتا۔ باقی انسانوں کے مقابلے میں بے حد حصولِ بصیرت و معرفت کے بعد بھی ما عرفناك حق معرفتك پکارتا ہے۔ اے خدا تیری ذاتِ مطلقہ کو کماحقہٗ جاننے کا دعویٰ کون کر سکتا ہے، وہ اپنے پیرؤوں سے کہتا ہے کہ امورِ دنیا کا علم تم کو مجھ سے زیادہ ہو سکتا ہے۔ بشریت کے تقاضے سے مجھ سے بھی غلطی ہو سکتی ہے۔ ان اعترافات سے

کسی مخلص اور راستباز انسان کے کمال میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔ درحقیقت کسی انسان کے لیے دعویٰ کمال خود نقص کی علامت ہے۔ رسولِ کریمؐ کا کمال بشریت اور عبودیت کا کمال ہے۔ رسولِ کریم خدا کامل نہیں بلکہ انسان کامل ہیں۔ اس برگزیدہ ہستی کا کمالِ صفات کی ہمہ گیری اور عمل کی جامعیت ہے۔ جو خدا ان کو تمام عالم کے لیے ہمیشہ کے لیے اُسوۂ حسنہ بنانا چاہتا تھا۔ اس کی مشیت نے ان کو زندگی کے تمام مراحل میں سے گزارا اور ہر شعبہ حیات اور ہر مرحلے میں ان کے فکر و عمل کا انداز اس شعبے میں انسانوں کے لیے شمع ہدایت بن گیا۔ بیکسی اور یتیمی سے لے کر سلطانی تک انسانی زندگی کے تمام مراحل طے کر ڈالے۔ وُہ ایک مزدور کی زندگی بھی بسر کر چکے تھے۔ اس لیے مزدور کے حقوق و فرائض سے بخوبی آگاہ تھے۔ مزدوروں کو دنیا حقیر سمجھتی تھی لیکن سب سے پہلے اس نبیؐ نے اعلان کیا کہ الکاسب حبیب اللہ، جائز پیشہ اور مزدوری سے روزی پیدا کرنے والا خدا کا حبیب ہے، خدا کا حبیب ہونے سے اونچا درجہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ ہر قسم کے مصائب اور مخالفت کے مقابلے میں اٹل صبر و استقلال، ناکامیوں میں کبھی مایوس نہ ہونا اور کامیابی میں نخوت و غرور کو نفس کے قریب بھٹکنے نہ دینا، دیانت داری اور حکمت عملی سے ایک کامیاب تاجر کے لیے مثال بننا۔ ایک معمر بیوہ سے شادی کر کے آخر دم تک محبت و وفا کی مثال پیش کرنا، کامیاب فاتح بن کر اذیت کیش سنگدل مجرموں کو لا تثریب علیکم الیوم کہہ کر معاف کر دینا۔ صلح و امن کو اپنی مساعی کی غایت بتاتے ہُوئے اگر جنگ کی ضرورت پیش آجائے، تو شجاعت کی داد دیتے ہُوئے بھی انسانیت کے اقدار کو نظر انداز نہ کرنا۔ ع

با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

ایک مقنن کی حیثیت سے ایسے عادلانہ قوانین پیش کرنا، جن کی مثال اس سے قبل موجود نہ تھی۔ زندگی کا کون سا شعبہ ہے، جس کی نسبت بنیادی ہدایت اس اسوۂ حسنہ میں نہ مل سکے۔ یار و اغیار کے ساتھ خوبی کا برتاؤ۔ اختلاف مسلک کے باوجود دوسری ملتوں کے ساتھ حُسنِ سلوک کی تاکید، تمام افراد و اقوام کے لیے مذہب و ضمیر کی آزادی، لا اکراہ فی الدّین کا اعلانِ عام۔ سوا ان امور کے جن میں خود فطرت نے تفاوت پیدا کر دیا ہے۔ مردوں اور عورتوں کے حقوق و فرائض میں عام مساوات، حصولِ علم کی فضیلت اور اس کی ترغیب، افزونی علم کی مسلسل کوشش اور دعا، ارتقاے حیات کا یہ تصور کہ جس شخص کے دو دن ایک جیسے رہے اور اس نے کسی اچھے پہلو میں ترقی نہیں کی، تو وہ گھاٹے میں رہا۔ من استوا یوماہ فھو مغبونٌ۔ روحانیت، حکمت اور اخلاق کی اچھی باتیں ان سے پہلے بھی انبیاء، اولیاء، صلحاء، حکماء کہتے چلے آئے تھے لیکن ایمان و حکمت و عمل کی یہ جامعیت کہیں نہیں ملتی ؎

حُسنِ یوسف دمِ عیسیٰ یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند، تو تنہا داری

نبوت ایسے ہی شخص پر ختم ہو سکتی تھی، جس کی زندگی کسی پہلو میں تشنہ نظر نہ آتے۔ جو مزدور و کسان کے لیے بھی نمونہ ہو اور حاکم و حکیم کے لیے بھی۔ جو پیکارِ حیات اور اضداد افکار و جذبات میں صلح جوئی اور وحدت آفرین کے ڈھب صرف نظری طور پر نہ بتائے بلکہ نصب العین کو عملی جامہ پہنا کر افراد و اقوام کے لیے بلند ترین نمونہ پیش کرے۔ اس جامعیت کا انسان نہ تاریخِ عالم نے بعثتِ محمدیؐ سے پہلے پیش کیا اور نہ آیندہ اس کا امکان ہے۔ محض افکار عالیہ کے مقابلے میں زندہ عملی مثال کہیں زیادہ موثر ہوتی ہے،

انسانوں کے اخلاق اچھے نمونوں سے متاثر ہو کر عمدہ سانچوں میں ڈھلتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ تعداد میں اچھے نمونے محمد رسول اللہ ہی کی زندگی میں مل سکتے ہیں۔ ایسے ہی انسان کو انسانِ کامل کہہ سکتے ہیں، جس کا کمال ہر شعبۂ زندگی میں نظر افروز اور ہمت افزا ہو اور جس کی جامعیت سے انسانیت کا کوئی شعبہ خارج نہ ہو۔

محمد عبدہٗ و رسولہٗ

ماہر القادری

آسمان و زمین میں کسی مخلوق کی اتنی توصیف و ستائش نہیں کی گئی جتنی محمد عربی ﷺ کی مدح و ثنا کی گئی ہے۔ "محمد" مشتق ہی حمد سے ہے جس کے معنی تعریف کے ہیں! محمدؐ وہ عبد کامل اور انسانیت کا محسنِ اعظم ہے جس کی تعریف ہمیشہ ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی! عبدالمطلب کو جب یہ خوشخبری ملی کہ اُن کے پوتا پیدا ہوا ہے تو اُن کو القا کیا گیا کہ نومولود کا نام "محمد" رکھنا، عرب میں اس سے پہلے کسی بچّہ کا نام محمد نہیں رکھا گیا، تمام مخلوقات میں جو اپنی ذات سے بے مثال و یکتا تھا اس کے نام میں بھی انفرادیت اور شانِ یکتائی پائی جانی چاہیے تھی۔ اس نام کی تقدیس کا کیا پوچھنا — یہ نام اذان و تکبیر میں شامل ہے، دن رات میں پانچ وقت لاکھوں مسجدوں سے

"اَشْہَدُ اَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰہ"

کی ایمان افروز اور دلنواز صدا بلند ہوتی ہے اور اس آواز سے فضا میں ایسی حرکت پیدا ہو جاتی ہے جس پر قلب و ضمیر جھومتے اور ذوق و وجدان وجد کرتے ہیں اس نام میں جو نغمگی ملتی ہے اُس کی کوئی حد و نہایت نہیں! "محمدؐ" کے "میم" کی تشدید کا جو لہجہ ہے اُس کے زیر و بم سچ مچ فردوسِ گوش ہیں پھر اس نام کی شیرینی کا یہ عالم کہ "محمد" (صلی اللہ علیہ وسلم) کہتے ہوئے دونوں ہونٹ ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں اور لبوں کا ایک دوسرے سے پیوست ہونا اور چپک جانا انتہائے حلاوت کی دلیل ہے!

نبیؐ کے نام کی لذت یہ ہو درود و سلام
زباں کو لطفِ شرابِ طہور ملتا ہے

محمدؐ وہ نام ہے جو شیریں بھی ہے مترنم بھی ہے اور مُقدس بھی ہے۔ یہ نام ہی خود بتا رہا ہے کہ میں اُس عظیم ترین انسان کا نام ہُوں جس کی نعت ستائش اور توصیف ارض و سما پر واجب قرار دی گئی ہے!

حضورؐ دعائے خلیلؑ بھی ہیں اور نوید مسیحا بھی ہیں! انجیل میں جس نبیؐ آخر کے ظہور کی خوشخبری دی گئی ہے اس کا نام "فارقلیط" بتایا گیا ہے، "فارقلیط کے معنیٰ ہیں "محمدؐ اور احمدؐ" یونانی میں یہ لفظ (فارقلیط) "پیر یکلوتاس" بن گیا: علم السنہ (فلالوجی) اس کی گواہی دیتا ہے کہ آدمیوں اور شہروں کے ناموں میں اس قسم کے تغیر ہوتے رہتے ہیں شلاً لاہور کو قدیم نظموں میں "لہاور" اور ملتان کو "مولتان" باندھا گیا ہے! آئین کے مشہور شہر "MADRID" کو عربی میں مجریط کہتے ہیں۔

توریت کے باب استثنار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ آخری کلام درج ہے۔

"خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے اُن پر طلُوع ہُوا اور فاران کے پہاڑ سے جلوہ گر ہوا دس ہزار مقدسوں کے ساتھ"

سیدنا محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے تو دس ہزار جاں نثار صحابہؓ حضورؐ کے جلو میں تھے۔ کوہِ "فاران" مکہ کی

پہاڑیوں کو کہتے ہیں۔

حبقوقؑ نبی نے بھی اس بشارت کو دہرایا — " خدا تیمان سے اور وہ جو قدوس ہے کوہ فاران سے آیا" اس کی شوکت سے زمین آسمان چھپ گئے اور اس کی حمد سے زمین معمور ہو گئی "

تاریخ بتاتی ہے اور دنیا جانتی ہے کہ جس کی حمد کی گئی ہے اُس کا نام محمدؐ ہے اور محمدؐ ہی کی حمد سے زمین معمور ہو گئی (صلی اللہ علیہ وسلم)

انبیاء کرام کی پیشن گوئیوں میں جو نام ملتا ہے وہ حمد (PRAISE) سے مشتق ہے اور یہ ذات گرامی احمد مجتبےٰ اور محمد مصطفےٰ (روحی لہ الفدا) کی ہے۔ سامنے کی بات یہ ہے کسی انسان پر اتنی کتابیں نہیں لکھی گئیں جتنی کتابیں سیدنا محمد عربی نبی آخر صلی اللہ علیہ وسلم پر لکھی گئی ہیں اور ان کتابوں میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ حضورؐ کے ذکر اور تعریف و ستائش نے شعر و ادب کو زندگی بخشی ہے۔

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے یہ دو شعر نام محمدؐ ہی کی عظمت و تقدیس کے ترجمان ہیں ؎

وضمّ الالٰہ اسم النبی الی اسمہٖ   اذ قال فی الخمس المؤذن اشھد

(اللہ نے اپنے نام کے ساتھ اُن کے نام کو جوڑ دیا ہے   جب کہ پانچ وقت مؤذن اشہد کہتا ہے)

وشقّ لہٗ من اسمہٖ لیجلّہٗ   فذوالعرش محمودٌ وھذا محمدٌ

(اللہ نے اُن کا نام اُن کے اجلال کے لئے اپنے نام سے مشتق کیا ہے جو صاحب عرش محمود ہے اور یہ محمد ہیں)

جب سیدنا محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے سلاطین کو اسلام کی دعوت دی ہے اور اُن کو خطوط بھیجے ہیں تو قیصر کو بھی نامہ مبارک ملا، قیصر نے حکم صادر کیا کہ عرب کا کوئی رہنے والا مل جائے تو اُسے میرے دربار میں حاضر کرو، میں اُس سے کچھ پوچھنا اور معلوم کرنا چاہتا ہوں، اتفاق کی بات کہ اُن دنوں عرب کے تاجر غزہ میں ٹھیرے ہوئے تھے اور ابوسفیان جو ابھی تک ایمان نہیں لائے تھے، اُن تاجروں میں شامل تھے، قیصر کے ملازمین اور پیادے ابوسفیان کو اپنے ہمراہ لے کر دربار میں پہونچے، قیصر نے دربار کو بڑی شان و شوکت کے ساتھ آراستہ کیا تھا، قیصر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ابوسفیان سے متعدد سوالات پوچھے جن میں سے دو سوال یہ تھے۔

قیصر: — کبھی تم لوگوں کو اس کی نسبت جھوٹ کا بھی تجربہ ہوا ہے۔

ابوسفیان — نہیں۔

قیصر — وہ کبھی عہد و پیمان کی خلاف ورزی بھی کرتا ہے۔

ابوسفیان — ابھی تک تو ایسی کوئی بات اُس نے نہیں کی، لیکن اب جو نیا نیا صلح کا معاہدہ ہوا ہے، اس میں دیکھیں وہ اپنے عہد پہ قائم رہتا ہے؟

قیصر کے دربار میں ابوسفیان کی زبان سے یہ درحقیقت محمدؐ عربی کی تعریف تھی جو بیساختہ ابوسفیان کی زبان سے نکلی اور تمام درباری کہنے والے کا منہ تکنے لگے۔ ابوسفیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شدید دشمن تھا، ایمان و اسلام کی دولت ابھی اُسے نصیب نہیں ہوئی تھی وہ قیصر کے سامنے جھوٹ بھی بول سکتا تھا مگر محمدؐ کے نام کی عظمت و تقدیس نے اُس کو سچ بولنے پر مجبور کر دیا۔ ابوجہل جیسا شدید دشمن کہا کرتا تھا کہ

" محمد! میں تم کو جھوٹا نہیں کہتا مگر تم جو کلام سناتے ہو اُس کو دُرست نہیں سمجھتا "

حق اور صداقت کی یہ خوبی ہے کہ دشمن بھی اُس کی گواہی دیتے ہیں۔ اور اس گواہی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ قریش حضورؐ کی دیانت و امانت کا تجربہ کرنے کے بعد آپ کو "الامین" کہتے تھے اور حضورؐ کے اعلانِ نبوت کرنے کے بعد قریش نے دشمنی، عداوت اور ایذا رسانی کی حد کر دی تھی اُس وقت بھی وہ اپنی امانتیں محمدؐ عربی "الامین" ہی کے پاس رکھتے تھے۔ ہجرت کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو ہدایت فرمائی تھی کہ تم قریش کی امانتیں واپس کرنے کے بعد مدینہ کا رُخ کرنا۔

سنہ ۱۲ نبوی کا واقعہ ہے جب عقبۂ ثانیہ میں مدینہ کے انصار حضورؐ سے بیعت کر رہے تھے، اس موقع پر حضرت سعدؓ بن زرارہ کھڑے ہو گئے اور اپنے ساتھیوں سے بولے :-

"یا ایہا الاخوان! تمھیں کچھ پتہ بھی ہے؟ تم کس چیز پر بیعت کر رہے ہو۔ یہ تو عرب و عجم سے اعلانِ جنگ ہے"

یہ بھی محمدؐ کی شانِ اقدس میں منثور قصیدہ تھا۔ سعدؓ بن زرارہ نے انصار کو بتایا کہ یہ اُس کی بیعت ہے جو دُنیا کے عظیم ترین اور آخری انقلاب کا داعی اور نقیب ہے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ پہونچے ہیں پورا مدینہ حضورؐ کے استقبال کے لئے اُمڈ آیا تھا اور انصار نے اپنے دیدہ و دل فرشِ راہ کر دیئے تھے۔ خیر مقدم کے اس موقع پر مخدرات یعنی پردہ نشین خاتونیں مکانوں کی چھتوں پر یہ اشعار ترنم سے پڑھ رہی تھیں۔

طلع البدر علینا	ہم پر چودھویں رات کا چاند طلوع ہوا ہے
مِن ثنیات الوداع	کوہ وداع کی گھاٹیوں سے
وَجب الشکر علینا	ہم پر شکر واجب ہے
ما دعیٰ للّٰہ داع	جبتک اللہ سے دعا مانگنے والے دعا مانگیں

اور بنو نجار کی معصوم لڑکیاں دف پر گا رہی تھیں :

نحن جوار من بنی النجار	ہم خانوادہ نجار کی لڑکیاں ہیں
یا حبذا محمداً من جار	محمدؐ کتنے اچھے ہمسائے ہیں

اس طرح اللہ تعالیٰ نے نبیوں کی پیش گوئی کو صحیح ثابت کر دکھایا اور "محمدؐ کی توصیف و ثنا سے زمین معمور ہو گئی!

عبداللہ بن سلام یہودیوں کے بہت بڑے عالم تھے اور یہودی اُن کا بڑا احترام کرتے تھے، انہوں نے پہلی بار حضرت سیدنا محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دیکھا، تو بے اختیار پکار اُٹھے :

"خدا کی قسم جھوٹے کا یہ چہرہ نہیں ہو سکتا"

حضرت انسؓ نے حضورؐ کی سخاوت، سیر چشمی اور ایثار کی کتنی جامع تعریف کی ہے۔

ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم لا یدخر لغدٍ — رسول اللہ کل کے لئے کوئی چیز اٹھا کر نہیں رکھتے تھے۔

حضرت عدی بن حاتم نے عیسائی مذہب اختیار کر رکھا تھا لوگوں کی زبانی اُن تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو حالات پہنچے تو وہ اس تذبذب میں مبتلا ہو گئے کہ حضور بادشاہ ہیں یا پیغمبر ہیں، ایک بار ایسا ہوا کہ وہ اپنے قبیلہ کے وفد کے ترجمان کی حیثیت سے بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئے، انہوں نے دیکھا کہ ایک مسکین صورت عورت وہاں آئی، اس کے آنے کا مقصد حضورؐ کی خدمت میں کچھ عرض معروض کرنا تھا حضور نے گلی میں کھڑے ہو کر اُس کی عرضداشت کو سنا اور اُس وقت تک وہاں کھڑے رہے جب تک وہ عورت خود نہیں چلی گئی عدی بن حاتم کا یہ منظر دیکھ کر وہ تذبذب اور شک دور ہو گیا اُن کا ضمیر پکار اٹھا کہ حضور پیغمبر ہیں بادشاہ نہیں ہیں۔

قرآن نے حضرت محمد بن عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق کی ان لفظوں میں تعریف کی :

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۔ اے محمد! تم اخلاق کے بڑے درجہ پر ہو

اور حضرت عائشہ صدیقہؓ نے ایک شخص کے دریافت کرنے پر جواب دیا :

اِنَّ خلق رسول الله كانَ خلقه القرآن

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق سراپا قرآن تھا)

حضرت عائشہؓ نے اس طرح قرآن کی تصدیق بھی کر دی اور اپنے عملی تجربہ کا خلاصہ اور لب لباب بھی بیان کر دیا۔

اب سے کوئی چالیس برس پہلے کی بات ہے شہر مدراس میں سیرت النبیؐ کے ایک بڑے اجتماع میں ایک اونچے درجہ کے ہندو لیڈر اور دانشور نے تقریر کرتے ہوئے کہا — ہماری پوری قوم برس ہا برس سے مورتی کھنڈت کی کوشش کر رہی ہے مگر اُسے کامیابی نہیں ہوئی۔ ہندو مورتیوں کی پوجا آج بھی کر رہے ہیں اس کے برخلاف عرب میں تنہا ایک شخص اٹھتا ہے اور بت پرستی کے خلاف آواز بلند کرتا ہے، اس کی آواز اتنی اثر انگیز اور انقلاب آفریں ثابت ہوتی ہے کہ ملک عرب کے ہر گوشہ سے بت پرستی کا وجود ہی سرے سے مٹ جاتا ہے۔ بت پرست، بت شکن بن جاتے ہیں۔ دنیا کے پردے پر جہاں جہاں مسجدیں پائی جاتی ہیں اُن میں بت تو ایک طرف رہے کسی جاندار کی تصویر تک دکھائی نہیں دیتی — تو ایسے شخص کو میں نبی نہیں خدا کہوں گا۔

مگر ہم حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی حضورؐ کے معجزات، کارناموں اور فضائل و کمالات کو واقعہ کے طور پر تسلیم کرتے ہوئے — اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ — ہی کہتے ہیں! حضورؐ کمال عبدیت کے اس مقام پر فائز ہیں جس سے بلند تر کوئی مقام نہیں اور یہی انسانیت کی معراج ہے۔

انسانِ کامل

خواجہ غلام السیدین

جو لوگ خدا کو مانتے ہیں وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ اپنے بندوں کی طرف سے غافل نہیں بلکہ اس نے ان کی اصلاح اور ہدایت کے لیے شروع ہی سے وقتاً فوقتاً اپنے خاص اور نیک بندوں کو بھیجا تاکہ وہ انھیں نیکی کی طرف بلائیں اور بدی کے راستے پر چلنے سے منع کریں۔ جو اس کو قادرِ مطلق سمجھتے ہیں اُنھیں یہ بھی معلوم ہے کہ اگر اس کی مشیت ہوتی وہ انسان کی فطرت میں بدی کا مادہ ہی نہ رکھتا۔ بلکہ فرشتوں کی طرح وہ بھی ہر وقت عبادتِ الٰہی میں سرگرم رہتا۔ لیکن پھر انسانوں کی ضرورت ہی کیا رہتی، فرشتوں کی مخلوق ہی کافی ہوتی۔

انسان کا امتیاز اور امتحان تو یہی ہے کہ اس کو آزادی اور اختیار کا عطیہ دیا گیا ہے، اس کو نیکی اور بدی کی پہچان ہے اور وہ ان میں سے جس کو چاہے اپنا سکتا ہے۔ ہم نے اس کو (صحیح) راستہ دکھایا، اب اس کا کام ہے کہ خواہ وہ شکر اختیار کرے یا ارادۂ کفر۔ یہی اس کا کمال ہے۔

شکر کا راستہ اس کو اخلاق کی انتہائی معراج تک پہنچا دیتا ہے۔ کفر کا راستہ اختیار کر کے وہ "اسفل السافلین" کی پستی میں جا گرتا ہے۔ خدا نے اس کو ارادہ اور فکر و عمل کی یہ آزادی تو ضرور بخشی ہے لیکن وہ اس کی طرف سے بے نیاز نہیں ہوا۔ اس کی طرف سے اپنے ہاتھ نہیں دھوئے۔ اس کو بالکل اس کے حال پر نہیں چھوڑ دیا گیا بلکہ نظامِ کائنات کی تخلیق کچھ اس اصول پر کی ہے کہ یہ انسان تسلیم و رضا اور انکار و بغاوت کی کش مکش میں حصہ لے، حق و باطل کی مسلسل نہ ختم ہونے والی جنگ میں کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف شریک ہو اور رفتہ رفتہ اپنے علم اور وجدان اور اخلاقی شعور میں ترقی کرے۔ اور بحیثیت مجموعی باوجود شکستوں اور ناکامیوں اور نافرمانیوں کے خدا کے بڑھتے ہوئے مقصد کی تحصیل کا ذریعہ بن جائے۔ اس غرض سے خدا کے نبیوں، پیغمبروں اور اوتاروں کا ایک سلسلہ اس کو برابر صراطِ مستقیم کی طرف بلاتا رہا ہے۔ انسان کی بے بصری اور عجلت پسندی کو اکثر یہ گہری مصلحت نظر نہیں آتی اور بعض دفعہ اس کے بہترین افراد بھی دنیا میں ظلم و جور کی کثرت دیکھ کر، طاقت کو حق کے مقابلے میں کامیاب پا کر یقین کر لیتے ہیں کہ یہاں نہ کوئی نظم و تربیت ہے نہ زندگی کی اخلاقی اہمیت ہے، نہ حق کا بول بالا ہونا قرینِ قیاس ہے۔ وہ اس ذہنی اور جذباتی کیفیت میں گرفتار ہو کر یا تو امید کا دامن ہاتھ سے بالکل چھوڑ دیتے ہیں یا دنیا کی طرف سے مایوس ہو کر محض اپنی روحانی عفت کو بچانے کی فکر کرتے ہیں اور اس غرض سے کوئی گوشۂ عافیت تلاش کر کے ریاضت یا عبادت، گیان و دھیان میں لگ جاتے ہیں۔ لیکن ایک حساس دل و دماغ کے لیے یہ راہ فرار ہے، اس مسئلہ کا حل نہیں۔ اندھیرے کا مقابلہ آنکھیں بند

کر لینے سے نہیں ہو سکتا، اس کے لیے چراغ جلانے کی ضرورت ہے اور چراغ کی یہ صفت ہے کہ خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا ہو ساری دُنیا کا اندھیرا ابھی اسے بجھا نہیں سکتا۔ بیشک ایک چھوٹے چراغ کی روشنی تھوڑی دُور تک پہنچے گی۔ ایک بڑا چراغ زیادہ دُور تک روشنی پہنچائے گا اور آفتاب عالم تاب کی زد میں سارا جہاں ہے۔ لیکن چراغ بہرحال انسان کی ضرورت ہے، جس کو وہ ترک نہیں کر سکتا سوائے اس کے کہ وہ اپنے بنیادی انسانی شرف کو تج دینے پر تیار ہو۔

۲

آج سے کوئی چودہ سو برس پہلے عرب کی سرزمین پر قریش کے ایک معزز خاندان میں ایک ایسا انسان کامل پیدا ہوا جس کی تعلیم اور مثال اس طویل مدّت میں کروڑوں انسانوں کو صراطِ مستقیم دکھاتی ہے۔ اور ان کو حیات کے ایک بہتر تصوّر سے آشنا کیا ہے۔ جب تک دنیا قائم ہے اس چراغ کی جوت بھی قائم رہے گی۔

اس بچے کا نام محمدؐ رکھا گیا۔ کس کو اندازہ ہو سکتا تھا کہ دنیا کی تاریخ میں اس کا نام اس قدر احترام اور عقیدت کے ساتھ لیا جائے گا اور بے شمار انسان اس کے نام کا کلمہ پڑھیں گے۔ اس کی ابتدائی زندگی کا پس منظر غور کے قابل ہے۔ اس میں ایسے ظاہری اسباب اور حالات نہیں ملتے جو ابتدائی تربیت میں معیّن ہوتے ہیں۔

بچّہ کی پیدائش سے چند ماہ پہلے اس کے باپ کا انتقال ہو جاتا ہے اور ابھی اس کی عمر چھ سال کی بھی نہیں کہ شفیق ماں کا سایہ بھی سر سے اُٹھ جاتا ہے۔ اب اس یتیم کی نگرانی اس کے دادا کے حصّہ میں آتی ہے۔ لیکن اس نئی ولایت کو دو سال بھی نہیں گزرے کہ یہ سایہ بھی سر سے اُٹھ جاتا ہے۔ جیسے قدرت کو یہ دکھانا مقصود ہو کہ اس کے پالنے والے اس کی نگرانی کرنے والے اس کے عزیز نہیں بلکہ قدرتِ الٰہی ہے جو کسی خاص مقصد کے لیے اس کی تربیت کر رہی ہے!

ابھی ایک چچا کا دم باقی تھا اور انھوں نے ہی بھتیجے کی سرپرستی کا فرض اپنے ذمّہ لیا اور وہ تجارت کے سلسلے میں شام وغیرہ کا سفر کیا کرتے تھے۔ اس میں انھوں نے اس عزیز اور ہونہار بھتیجے کو اپنے ساتھ لیا اور اس طرح اسے اپنے گرد و پیش کی دُنیا کو دیکھنے اور اس کی مادی، سماجی، اخلاقی اور روحانی حالت کا مطالعہ کرنے کا موقعہ بھی ملا۔

دل کی آنکھیں تو قدرت نے ابتدا سے روشن کر رکھی تھیں اب باہر کی آنکھوں نے بھی انسان کی گمراہی اور زوال کے منظر دیکھے جس سے دل پر چوٹ پڑی اور وہ سوچ بیدار ہوئی جو معلمینِ اخلاق اور انسان کے ہادیوں کے حصّہ میں آئی ہے یعنی انسان کی زندگی کو کس طرح بہتر بنایا جائے۔ ان کے کردار میں کس طرح پاکیزگی اور شرافت پیدا ہو۔

لیکن یہ زمانہ تیاری کا تھا، سیرت کے نقوش کو تربیت دینے اور اُبھاگر کرنے کا تھا، دنیا کو دیکھنے اور انسانوں کے برتنے کا، ابھی اعلان کا پیغام پہنچانے کا دُور نہیں آیا تھا اس لیے انھوں نے تجارت کا شغل اختیار کیا جس میں مفید مطلب تجربے حاصل ہو سکتے تھے۔ ان کے پاس دولت نہ تھی۔ لیکن نوجوانی ہی میں ان کی ذہانت، امانت اور سمجھداری کا شہرہ پھیل چکا تھا۔ اس شہرت سے متاثر ہو کر عرب کی ایک شریف اور بیوہ خاتون نے اپنی تجارت کا انتظام ان کے سپرد کر دیا

اور اس فرض کو انھوں نے ایسی ایمانداری، سلیقے اور کامیابی کے ساتھ انجام دیا کہ اس محترم خاتون بی بی خدیجہؓ نے اپنی طرف سے شادی کی خواہش ظاہر کی۔ اور یہ مبارک رشتہ آیندہ پچیس برس یعنی ان کے انتقال تک قائم رہا۔ اس طرح انھیں خاندانی زندگی کے آداب اور شرافتوں کو برتنے اور دنیا کے سامنے ان کی عملی مثال پیش کرنے کا موقعہ حاصل ہوا۔

اس وقت ان کی کیا پوزیشن تھی؟ انھوں نے دنیاوی زندگی کے مختلف پہلو دیکھ لیے تھے۔ کاروبار کا تجربہ حاصل کیا تھا۔ اپنی شرافت، دیانت، مروت، انسان دوستی، ہمدردی کی بدولت لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا تھا۔ ان کی ساری زندگی ان کی نظروں کے سامنے گزری تھی اور انھوں نے اس میں کوئی کمزوری، کوئی جھول نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے دوستوں اور دشمنوں مخالفوں سب نے انھیں اتفاق رائے کے ساتھ صادق اور امین کا خطاب دیا تھا۔ وہ ان کی سچائی کے قائل تھے اور ان کی سیرت و کردار کی بلندی کے گواہ۔ اہلِ وطن کو اس نوجوان سے بہت سی امیدیں تھیں وہ اسے اپنا قائد اور لیڈر ماننے کو تیار رہتے تھے۔ ان کے پاس اس وقت کیا کچھ نہ تھا! عزت، نیک نامی، دولت، خاندانی زندگی کی آسائشیں اور آرام کی زندگی گزارنے کی توقع، بیشک یہ سب چیزیں تھیں، ایک معنی میں آرام بھی نصیب تھا، لیکن اطمینان نہ تھا۔

اطمینان تو دل کی تسکین اور روح کی مسرت سے حاصل ہوتا ہے۔ جس کا سرچشمہ ذاتی فراغت نہیں بلکہ معرفتِ الٰہی اور خدمتِ خلق ہے۔ اس قلبِ صافی کو حق کی تلاش تھی اور معرفتِ الٰہی کی لگن، ساتھ ہی انھیں فکر تھی کہ یہ دنیا جس میں بے شمار مرد اور عورتیں زندگی کے اعلیٰ تقاضوں اور قدروں سے ناآشنا، جانوروں کی سی بلکہ بعض لحاظ سے اس سے بھی بدتر زندگی بسر کر رہے تھے۔ کس طرح خالقِ کائنات کی مشیت کی تکمیل کر سکتے ہیں۔ اس گھُپ اندھیرے میں کہ چاروں طرف چھایا ہوا تھا، اپنی کُٹیا میں چراغ جلانے سے اس جذبہ خدمت کی تشفی کس طرح ہو سکتی ہے، جو ان کو بے چین رکھتا ہے، ان کو ہر وقت دُھن تھی کہ کسی طرح اپنے ہم جنسوں کو اس سیدھے اور سچے راستے پر لگائیں جس سے وہ بھٹک گئے تھے۔

۳

مکہ سے چند میل کے فاصلے پر ایک سنسان علاقہ میں ایک غار ہے جو تاریخ میں غارِ حرا کے نام سے مشہور ہے۔ اُن کا دستور تھا کہ وہ بعض اوقات کئی کئی دن تک اس غار میں مقیم رہتے۔ خدا سے لو لگا کر اس کی عبادت اور حمد و ثنا کرتے۔ اور اپنے نفس کی گہرائیوں میں اس روشنی کی تلاش کرتے جس کے بغیر دنیا کو ہدایت کا راستہ دکھانا ممکن نہیں۔ اس طرح کی تخلیقی تنہائی کا لطف جس میں بندہ اپنے معبود کے ساتھ براہِ راست رشتہ قائم کرتا ہے اور جزوی اور غیر ضروری باتوں کو بھلا کر حقیقت کا چہرہ بے نقاب دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ کسی نہ کسی شکل میں تمام خاصانِ خدا نے اٹھایا ہے۔

ایک روز کوئی چالیس سال کی عمر میں جب وہ غارِ حرا میں مصروفِ عبادت تھے نورِ حقیقت نے قلبِ صافی پر جلوہ کیا اور انھیں بشارت ہوئی کہ خدا نے انھیں اپنا رسول بنا کر دنیا میں بھیجا ہے تاکہ بھٹکتے ہوئے انسانوں کو اس کا ابدی پیغام دوبارہ یاد دلائیں، ان کو نیکی کی تعلیم دیں، بدی سے روکیں اور خدا کے سچے اور سیدھے راستہ کی طرف ان کی رہبری کریں۔

"(اے رسول!) پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے ساری کائنات بنائی ہے، جس نے انسان کو خون کی ایک جمی ہوئی بُوند سے بنایا، پڑھو' اور تمھارا پروردگار بڑا صاحبِ کرامت ہے، اسی نے قلم کے ذریعہ (انسان کو) علم سکھایا۔ وہ سب کچھ سکھایا جسے وہ نہ جانتا تھا۔"

یہ تھی پہلی وحی یا فرمانِ الٰہی جو ان پر نازل ہوا اور جس میں سب سے پہلے انسان کو علم حاصل کرنے یعنی دماغ کی کھڑکیاں کھولنے کی، زبان اور قلم کے ذریعہ ملکِ معنی کی تسخیر کرنے کی ہدایت کی گئی ہے تاکہ وہ زندگی جہالت کی تاریکی میں یا باپ دادا کے بنائے ہوئے طریقوں پر بسر نہ کریں جن کی افادیت ختم ہو چکی ہے بلکہ غور و فکر یا تدبر اور تفکر کے ذریعہ زندگی کے معنی اور مقصد کو سمجھیں اور اس کو حاصل کرنے کے لیے صحیح ذریعہ اختیار کریں۔ انسان اس منزل پر پہنچ گیا تھا جب وہ عقل خداداد کی روشنی میں اپنا راستہ تلاش کر سکتا تھا۔

خدا کے رسول کا پہلا کلام یہ تھا کہ وُہ انسان کے سامنے اس چیلنج کو پیش کرے کہ علم و حکمت تمھاری کھوئی ہوئی پونجی ہے جہاں کہیں ملے اس کو اپناؤ اور جس کو حکمت مل گئی اس کو ہر طرح کی خوبیاں اور بھلائیاں مل گئیں۔ علم حاصل کرو خواہ اس کے لیے تمہیں چین ہی جانا پڑے۔ یعنی دماغ کو قفل نہ لگاؤ اس کو زندگی کے مسئلوں کو حل کرنے کی کنجی سمجھو۔

یہ بڑا سخت وقت تھا خدا کے رسول پر، بشارت اپنے جلو میں آزمائش لے کر آئی تھی۔ چالیس سال تک انھوں نے اپنی قوم کے سامنے ایک بے داغ اور بے لوث زندگی گزاری تھی اور اس میں مقبولیت حاصل کی تھی۔ اب انھیں ان کی گمراہی پر تنبیہ کرنی تھی۔ گمراہی جس کی جڑیں ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بہت گہری چلی گئی تھیں۔ سچائی کی خاطر عمر بھر کی ہر دلعزیزی کو قربان کر کے ہر قسم کی مخالفتوں اور بدگمانیوں کو جھیلنا اور اپنی جان کو جوکھوں میں ڈالنا تھا لیکن جب خدا کے کسی منتخب بندے کو یہ بشارت ملتی ہے تو اس کے لیے کوئی دُوسرا راستہ نہیں ہوتا۔ وہ بہت خوشی اور آمادگی کے ساتھ تمام آزمائشوں اور مصیبتوں کو خاطر نشان کرتا ہے اور خدا کے پیغام کو اس کے بندے کے سامنے جرأت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ اس مردِ مجاہد کو اندازہ تھا کہ اب اس کے سامنے کس قسم کا خارزار ہے لیکن ان کی ہمت کے قدم نہیں ڈگمگائے۔ انھوں نے اپنی بیوی سے اس بشارت کا ذکر کیا اور کہا کہ میرے دل پر خدا کا خوف اور رعب طاری ہے کہ ایک بہت بڑی ذمہ داری کو ادا کرنا ہے۔

وُہ ان کو اپنے عزیز ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو ایک معمر اور صاحبِ بصیرت عیسائی عالم تھے۔ انھوں نے اس عجیب واقعہ کو سُنا۔ حضرت محمدؐ کے رخِ زیبا پر ایک نظر ڈالی اور کہا:

"بے شک یہ خدا کا پیغام ہے جو آپ پر نازل ہوا ہے۔ یہ وہی پیغام ہے جو آپ سے پہلے دوسرے بہت سے نبیوں پر حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہو چکا ہے۔ میری نظریں اس مستقبل کو دیکھ رہی ہیں جو آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ کاش! میں اس وقت زندہ ہوتا جب قوم آپ کو وطن سے نکال دے گی اور اس وقت آپ کی کچھ خدمت کر سکتا۔"

پوچھا: "کیا قوم مجھے مکہ سے نکال دے گی؟"

جواب ملا: "ہاں اس دنیا میں جس کسی نے ایسی انقلابی تعلیم پیش کی ہے اس کو یہی صورتِ حال پیش آئی ہے اور ہر قسم کی مخالفتیں جھیلنی پڑی ہیں۔"

دل نے کہا یہ سب منظور ہے اب کہ دل کی کشتی اس طوفان میں ڈال دی ہے تو فکر کیا ہے۔ اس کا کھویا وہی پروردگار ہے جس نے مجھے اس کام کے لیے چھانٹا ہے۔

دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا

۴

جب اُنھوں نے خدا کا یہ پیغام، جس کو پہنچانے والے آفرینشِ عالم سے مختلف لفظوں اور صورتوں میں پہنچانے آتے تھے پھیلانے کا بیڑا اٹھایا تو عرب اور اس کے گردو پیش کی دنیا کی کیا حالت تھی؟ پرانے پیغام کتابوں میں محفوظ تھے۔ لیکن اس کی رُوح غائب ہو چکی تھی۔

رہ گئی رسمِ اذاں رُوحِ بلالی نہ رہی

اور جاننے والے جانتے ہیں کہ لفظی پابندی (مذہب کی) موت ہے، اس کی روح ہے جو زندہ رکھتی ہے۔ اس زمانہ ہیں کہ عرب کی تاریخ میں جاہلیت کا زمانہ کہلاتا ہے۔ ہر طرف بُت پرستی کا دَور دورہ تھا۔ ایک خدا کو بھُول کر لوگوں نے اپنے بنائے ہوئے معبودوں کی پرستش شروع کر دی تھی۔ یورپ میں علم و فضل کے جو چراغ یُونانی تہذیب نے جلائے تھے وہ جہالت اور توہمات کی آندھی نے گُل کر دیے تھے۔ تباہی، تعصب اپنے پُورے شباب پر تھا اور پیغمبرِ امن، مسیح کے پیرو مذہب میں نہ صرف ہر قسم کا جبرو اکراہ بلکہ ظلم و ستم کو روا سمجھتے تھے جس کی وجہ سے مذہبی عدالت کی ستم آرائیاں انسانی تہذیب کی پیشانی پہ ایک داغ بن گئی تھیں۔ ہندوستان، چین، مصر جہاں ایک زمانہ میں مذہب اور فلسفہ کا بہت چرچا رہ چکا تھا اب محض علمی مُوشگافیوں کا مرکز تھا۔ مذہب کی حقیقی شرافتوں اور رواداریوں کو بھلا کر ان کے عالم ایک دوسرے کی تکفیر اور مخالفت میں لگے ہوئے تھے اور بجائے تلاشِ حقیقت میں تعاون کرنے کے ایک دوسرے کی راہ کاٹنے کی فکر میں تھے۔

خود عرب میں اس وقت نہ کوئی منظم حکومت تھی نہ قانون کی کارفرمائی، نہ سماج میں انصاف اور مساوات کا احترام۔ شاید وہاں فنِ خطابت، آدابِ شجاعت اور مہمان نوازی کے سوا تہذیب کے کوئی دُوسرے دلپذیر عناصر باقی نہ رہے تھے۔ جہالت عام تھی، لوگ بے شمار قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے جن کے الگ الگ "خدا" تھے جو ان سے قربانیوں کے طالب تھے اور دُوسرے خداؤں سے برسرِ پیکار۔ ان قبیلوں کے تعلقات کا یہ عالم تھا کہ ذرا ذرا سی بات میں لڑائی آگ کی طرح بھڑک اُٹھتی اور جائداد کی طرح یہ نفرت اور مخالفت ایک نسل سے دُوسری نسل کو منتقل ہوتی اور کشت و خون کا بازار گرم رہتا۔

خانہ کعبہ جس کو حضرت ابراہیمؑ نے "خدا کا گھر" بنایا تھا۔ یعنی اس کی عبادت کے لیے مخصوص کیا تھا اب کئی سَو بُتوں کا مسکن تھا۔ اس طرح توحیدِ الٰہی اور انسانی وحدت دونوں کا تصور پاش پاش ہو چکا تھا۔ باہمی مروّت اور سماجی وضع داریاں ختم ہو چکی تھیں۔

عورت کی حیثیت جانوروں سے بدتر تھی، گھوڑوں اور اُونٹوں سے تو یقیناً بدتر، جن کی عرب عام طور پر بہت قدر کرتے تھے۔ اس کی نہ کوئی سماجی پوزیشن تھی نہ اقتصادی، اس کو اس درجہ ذلیل سمجھا جاتا تھا کہ اگر کسی کے گھر میں لڑکی پیدا ہوتی تو وہ اس کو ایک شرمناک بات سمجھ کر پوشیدہ رکھتا۔ اور بعض سنگدل تو اس معصوم کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیتے۔

شراب خوری، قمار بازی، بے شرمی کے بہت سے اور مظاہر ان کی زندگی کا جزو بن گئے تھے اور ہر اعتبار سے تہذیب و تمدن کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی تھیں۔

یہ تھی وہ دنیا اور وہ ملک جس میں مشیت الٰہی نے اس بندۂ خدا کو بھیجا۔ انھیں پوری طرح اندازہ تھا کہ سچ کی حمایت کی کس قدر گراں قیمت ادا کرنی ہوتی ہے اور اس راستہ میں کس قدر کٹھنائیاں پیش آتی ہیں۔ ایک جابر مطلق العنان حاکم اپنی مرضی زبردستی لوگوں پر عائد کر سکتا ہے، لیکن یہاں تو دلوں اور دماغوں کو بدلنے یعنی ایک زیادہ بنیادی انقلاب لانے کا سوال تھا کیونکہ خدا کسی قوم کی (خارجی) حالت نہیں بدلتا جب تک وہ اپنے ضمیر کی گہرائیوں میں انقلاب پیدا نہ کرے۔

ایک مصلح کو یہ کام محبت، ہمدردی، دل سوزی، صبر اور نفسیاتی سوجھ بوجھ کے ذریعہ کرنا پڑتا ہے۔ اور کام کیا تھا، ابدی صداقتوں کے حسین چہروں پر سے اس دھول کو صاف کرنا جو صدیوں کی بھول اور گمراہی نے اس پر جما رکھی تھی۔ یہ سماج کی پوری طاقت کے خلاف ایک تنہا اور نہتے مردِ مجاہد کا جہاد تھا۔ بہت ہمت شکن تھا یہ مرحلہ لیکن جب عشقِ الٰہی کی آگ کسی دل میں روشن ہو جاتی ہے اور بندوں کی خدمت اور اصلاح کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے تو کوئی خوف اس آگ کو بجھا نہیں سکتا۔ کوئی مصلحت اندیشی اس جذبہ کو سلا نہیں سکتی۔

چنانچہ انھوں نے بہت مضبوطی، لیکن ملائمت کے ساتھ اپنی اس نئی تعلیم کو ان کے سامنے رکھا جو ان کی پرانی روایتوں اور عقیدوں کو چیلنج کرتی تھی اور اس کا ردِ عمل وہی ہوا جو تاریخ میں ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔ یعنی یہ ہمارے باپ دادا کے طور طریقوں کی مخالفت ہے جس کو ہم گوارا نہیں کر سکتے۔ اگر سچ کی آواز مصلحت اندیشی کے واسطوں اور دنیادی لالچوں کی تحریص سے خاموش نہیں ہو گی تو اس کو اکثریت کی مخالفت سے دبایا جائے گا۔

مطلب یہ ہوا کہ اس نئی تعلیم کے ماننے والوں کو یہ آزادی نہیں دی جائے گی کہ وہ اس پر عمل کریں یا اس کی تبلیغ کریں۔ وہی آزادی ضمیر کا مطالبہ اور مفادِ مخصوصہ کی پرانی ضد کہ اس کی اجازت نہیں ملے گی۔

لیکن اس تحریک کو کون سی طاقت کچل سکتی تھی، جب خلوص اور ایمان کی بے پناہ قوت اس کی پشت پر ہو۔ انھوں نے گلی گلی، کوچہ کوچہ اس پیغام کو سنایا۔ میلوں اور منڈیوں میں اس کی اشاعت کی۔ زبان سے اس کا اقرار کیا۔ دل سے اس کی تصدیق کی، عمل سے اس کا اظہار کیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوگوں نے انھیں صادق اور امین کا خطاب دیا تھا، جو ان کی دیانت کی قسم کھاتے تھے انھوں نے ہی شروع میں ان کا مذاق اڑایا اور بعد میں ان کو ہر طرح کی تکلیفیں پہنچائیں اور ان کی تعلیم کو

خطرناک قرار دیا اور کیوں نہ دیتے!

وہ زندگی کو اخلاقی پابندیوں سے آزاد کر کے عیش و عشرت اور نفس پرستی میں گزارنا چاہتے تھے اور یہ شخص ایسے دین کو لے کر آیا تھا جس میں سارا زور اعتدالِ اخلاق اور شرافت پر تھا۔ ان کی وفاداری قبیلوں کی چار دیواری کے اندر محصور تھی اور وُہ ایک خدا اور انسانیت کے عالمگیر تصوّر کا قائل تھا۔ وہ لوگوں کو بتاتا تھا کہ زندگی ایک امانت ہے جس کے لیے اس دُنیا میں بھی جواب دہی ہے اور آخرت میں بھی۔ اور ان لوگوں میں سرے سے نہ احساسِ فرض کا تصوّر تھا اور نہ جواب دہی کا۔

وہ اخوت، امن اور مساوات کا پیغامبر تھا۔ اور یہاں چھوٹے چھوٹے نسلی امتیازات اور جھوٹے بزرگوں کے بُت دلوں میں بیٹھے ہُوئے تھے۔ وہ کہتا تھا کہ انسانوں میں افضلیت کا معیار تقویٰ اور پرہیز گاری پر ہے اور ایک حبشی غلام جو یہ صفات رکھتا ہے ایک قریشی سیّد سے کہیں بہتر ہے جو ان صفات سے محروم ہو۔ لیکن عرب کے سردار جو احساسِ برتری کا شکار تھے "گھٹیا" لوگوں کو اپنا ہم پلّہ ماننے کو تیار نہ تھے کیونکہ یہ بات ان کے سارے نظامِ فکر کے خلاف تھی۔ لہٰذا یہ زندگی کے دو متضاد تصوروں کی ٹکر تھی جن میں کسی سمجھوتہ کا امکان نہ تھا۔ فرق یہ تھا کہ ایک طرف قدامت کا استحکام اور جمود کی طاقت تھی اور دُوسری طرف صرف حق پرستی کا صلہ۔

لیکن نہ معلوم اس شخص کی زبان میں کیسا جادو اور سیرت میں کیا کشش تھی کہ باوجود "خواص" کی مخالفت اور ایذا رسانی کے بہت سے عام لوگ اور خود ان کے خاندان اور قبیلے کے افراد ان کی طرف جھکنے لگے۔ ان کی صداقت کا ایک ثبوت یہ ہے کہ سب سے پہلے اس تعلیم کا خیر مقدم ان لوگوں نے کیا جو ان سے سب سے زیادہ قریب تھے۔ یعنی ان کی بیوی حضرت خدیجہؓ، ان کے نوعمر چچا زاد بھائی علیؓ، ان کے دوست حضرت ابوبکرؓ، ان کے متبنیٰ زیدؓ بن حارث اور ایک سیاہ رنگ روشن قلب حبشی غلام بلالؓ جو اسلام کے پہلے موذن بنے۔

اب مدینہ کے ارباب کو پریشانی ہُوئی اور یہ فکر کہ یہ فتنہ محض ہنسی اڑانے یا جبر کرنے سے نہیں رکے گا۔ لہٰذا پہلا مدافعانہ حربہ یہ اختیار کیا گیا کہ ان کو لالچ دے کر اس خطرناک تعلیم کی اشاعت سے باز رکھا جائے۔ چنانچہ قریش کے ایک بااثر اور دولتمند سردار عتبہ نے پوری آبادی کی نمائندگی کرتے ہوئے ان سے کہا:

> "اے میرے عزیز! تم کیوں یہ سب حرکتیں کر رہے ہو؟ کیوں ہمارے معبودوں کو نہیں مانتے اور ان کی بجائے ایک اَن دیکھے، اَن جانے خدا کے وکیل بنے ہو؟ کیوں ہمارے پرانے طور طریقوں کو رد کرتے ہو؟ اگر ان تمام باتوں سے تمہارا مقصد مال اور دولت جمع کرنا ہے تو ہم تمہیں تمہاری خواہش سے زیادہ مالامال کر دیں گے۔ اگر عزت چاہتے ہو تو اپنا رئیس اور سردار مان لیں گے۔ اگر حکومت کی آرزو ہے تو تمہیں عرب کا بادشاہ تسلیم کرنے کو تیار ہیں۔ اگر تمہارا یہ سب دھندا خللِ دماغ کا نتیجہ ہے تو ہم تمہارے علاج کا بہترین انتظام کرا دیں گے۔"

مگر اس ایلچی کو کیا خبر تھی کہ عشقِ الٰہی کا یہ "نشہ" یا "جنون" ایسا نہیں جو کسی دوا یا علاج سے دور ہو سکے۔

بڑی نرمی لیکن یقین کے ساتھ جواب ملا:

"آپ کا خیال صحیح نہیں۔ مجھے نہ مال و دولت چاہیے نہ دنیاوی عزّت و حکومت، نہ میرے دماغ میں کوئی خلل ہے۔ میں تو خدا کا ایک سیدھا سادا اور سچا پیغام لے کر آیا ہُوں۔ اس میں بشارت ہے ان لوگوں کے لیے جو اس کے فرمان کو مانیں اور تنبیہ ان کے لیے جو اس سے انکار کریں۔

میں بھی آپ سب کی طرح اس کا ایک معمولی بندہ ہُوں۔ بس اتنی سی بات ہے کہ مجھ پر اس نے اپنی رحمت سے وحی کے ذریعہ سچائی کو واضح کر دیا ہے۔ میں جانتا ہُوں کہ تمام انسانوں کا معبود ایک خدا ہے اسی سے لو لگانی چاہیے، اسی سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنا چاہیے۔ جو لوگ شرک کرتے ہیں، خیرات نہیں دیتے، آخرت پر یقین نہیں رکھتے وہ بہت گھاٹے میں ہیں۔ برخلاف اس کے جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں ان کے لیے آخرت میں بڑا اجر ہے۔"

کچھ ایسا اثر تھا اس بیان کے خلوص اور یقین میں کہ عقبہ پر ایک محویت کا عالم طاری ہو گیا اور اس نے جا کر لوگوں سے کہا کہ میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے باتیں کیں اور اس کا کلام سُنا، اس میں نہ کہانت ہے نہ شعر ہے نہ جادو، نہ منتر، بلکہ محض عقیدے اور دل کی بات کا اظہار ہے۔ اس لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ تم انھیں اس کے حال پر چھوڑ دو۔ ان کی مخالفت نہ کرو۔

چنانچہ ترکش کا یہ تیر بیکار گیا۔ اب لالچ کے بعد خوف کا حربہ استعمال کرنے کی منزل آئی۔ انھوں نے رسولؐ کے عمِ محترم حضرت ابُو طالب کو پیغام بھیجا کہ ہم آپ کی بزرگی کے خیال سے اب تک چُپ ہیں، اپنے بھتیجے کو سمجھا لیجیے کہ وہ اس کام سے باز آئے ورنہ ہم اسے جان سے مار ڈالیں گے۔

"ہم اسے جان سے مار ڈالیں گے!"

یہ وہ دھمکی ہے جو قوّت نے حق کے خلاف ہمیشہ استعمال کی ہے۔ سچ کے پرستاروں کے سامنے موت کبھی زہر کا پیالہ بن کر آئی، کبھی اس نے صلیب کی شکل اختیار کی، کبھی آگ بن کر جلایا، کبھی آری اور خنجر بن کر سر کو تن سے جُدا کیا۔ لیکن اس نے کبھی ان عاشقانِ صادق پر فتح نہیں پائی، ان کے دل کی پکار ہمیشہ یہی رہی ہے کہ یا تو اپنے مقصودِ حقیقی کو حاصل کریں یا اس کشمکش میں جان جانِ آفریں کے سپرد کر دیں۔ یہی محمدؐ عربی کے دل کی پکار تھی۔ جب ان کے سامنے خوف اور لالچ کے سارے واسطے رکھ دیے گئے اور محبّت کرنے والے چچا نے بھی کہا کہ جو کچھ کر رہے ہو اس کے سارے نتیجہ کو سوچ لو۔ تو انھوں نے جواب دیا، اور یہ جواب انسانی فضیلت کی تاریخ میں اپنا خاص مقام رکھتا ہے:

"اگر یہ لوگ سورج کو میرے داہنے ہاتھ پر لا کر رکھ دیں اور چاند کو بائیں ہاتھ پر، تب بھی میں اپنے کام سے نہیں ہٹوں گا اور خدا کے حکم میں ایک حرف کی کمی بیشی نہیں کروں گا خواہ اس کوشش میں میری جان ہی جاتی رہے۔"

پھر اُنھوں نے مطالبہ کیا کہ اگر تم خدا کے رسول ہو تو کوئی معجزہ دکھاؤ۔ پہاڑوں کو سامنے سے ہٹا دو، ہمارے باپ دادا کو زندہ کر دکھاؤ۔ سونے چاندی کے خزانے، محل اور باغ بنا کر دکھاؤ۔

لیکن انھوں نے جواب دیا کہ:

"میں شعبدہ دکھلانے کے لیے نہیں بھیجا گیا۔ سچائی خود اپنی شہادت ہے اس کے لیے معجزوں اور خلافِ فطرت مظاہروں کی ضرورت نہیں۔ اگر تم میری تعلیم قبول کرو گے تو یہ تمھارے لیے دنیا اور آخرت کا سرمایہ ثابت ہوگی۔ اگر رد کرو گے تو انتظار کرو اس فیصلے کا جو خدا میرے اور تمھارے درمیان کرے گا۔"

اب سمجھوتہ کی کوئی صورت باقی نہ رہی تھی لیکن ایذارسانی کے ہاتھ کون باندھ سکتا ہے۔ لوگ فرداً فرداً اور ٹولیاں بنا کر ان پر کیچڑ پھینکتے، پتھر مارتے، راستے میں کانٹے بچھاتے، کھانا پانی بند کر دیتے۔ وعظ کے دوران انؐ کی زبان بندی کی کوشش کرتے، لعن وطعن کرتے، ان کو دیوانہ مشہور کرتے۔ انؐ کے قتل کے منصوبے بناتے۔ لیکن انؐ کی زبان سے اپنے بدترین دشمنوں کے لیے بھی کوئی سخت کلمہ نہ نکلا، جب کہا یہی کہا:

"یا اللہ! ان لوگوں کو معاف کر دے، یہ نہیں جانتے کہ کیا کر رہے ہیں۔"

ایک دفعہ لڑائی میں اُن کے جسم پر بہت سخت زخم لگے اور انؐ کے احباب نے کہا کہ آپؐ ان لوگوں کے لیے بددعا کیوں نہیں کرتے؟ تو جواب ملا:

"میں لعنت کرنے کے لیے نبی نہیں بنایا گیا، مجھے تو خدا کی طرف بلانے والا سراپا رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔

اے خدا! میری اس گمراہ قوم کو ہدایت فرما کیونکہ وہ جاہل اور بے خبر ہیں۔"

یہ وہی پیغمبرانہ جذبہ ہے جس کا اظہار مسیحؑ نے اپنی زندگی میں بار بار کیا تھا۔ چنانچہ کفار اپنی ان حرکتوں میں لگے رہے اور خدا کا رسول ذاتی خطروں اور تکلیفوں سے بے نیاز اپنے کام میں مصروف رہا اور کام بھی انھیں کی خدمت اور ہدایت، جنھوں نے اسؐ پر عرصۂ حیات کو تنگ کر دیا تھا۔ یہ تھی اس کی اخلاقی عظمت اور کردار کی بلندی۔

۵

ایک مختصر سے مضمون میں اس عظیم المرتبت انسان کی اخلاقی اور روحانی خوبیوں کا کس طرح احاطہ ہو سکتا ہے! دریا کو کوزے میں کس طرح بند کیا جا سکتا ہے! انسان کی حیثیت سے انھوں نے ایک مثال دنیا کے سامنے پیش کی کہ ہر شخص کو اس کی تقلید کا حوصلہ ہو سکتا ہے حالانکہ اس کمال تک پہنچنے کا کوئی امکان نہیں ان کی شخصیت اور زندگی رعب وجلال کی کیفیت سے زیادہ محبت اور یگانگی کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ ایک موقع پر فرمایا:

"مجھ سے نہ ڈرو میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں، قریش کی ایک غریب عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی۔"

انؐ کی روزمرہ کی زندگی غریبوں اور مسکینوں کی سی تھی اور انھی کے ساتھ ان کو خاص طور پر محبت اور یک جہتی کا احساس تھا۔ ہر قسم کا ہاتھ کا کام خود کر لیتے تھے۔ اس میں کسی طرح کی عار نہ تھی۔ گھر کی صفائی کرتے، مویشیوں کو چارہ ڈالتے، بازار سے سامان خریدتے، پھٹے کپڑوں کو پیوند لگاتے، ٹوٹے جوتے کو گانٹھتے، نوکروں کے ساتھ بیٹھ کر اکٹھے کھانا کھاتے۔ اور اگر بعض دفعہ کچھ بھی کھانے کو میسر نہ ہوتا تو خدا کا شکر کرتے اور بھوکے ہی سو جاتے۔ کبھی کئی کئی ہفتے چولھے میں آگ نہ جلتی اور پانی اور کھجوروں پر گزارا ہوتا۔

یہ حالت تھی اس زمانہ میں بھی جب اس سرزمینِ عرب میں انؐ کو دنیاوی حیثیت سے بھی ایک بادشاہ کا مقام حاصل تھا لیکن خود اپنی دولت اور جو دولت بیت المال میں آتی، سب ضرورت مندوں اور غریبوں کی نذر تھی اپنی ذات کے لیے صرف نہ ہوتی تھی۔ ایسا شخص کس طرح عرب کے مغرور اور امتیاز پسند سرداروں کو گوارا ہو سکتا تھا۔

کوئی غریب انؐ کے دربار میں چھوٹا نہ تھا، نہ کوئی دولت مند اور ذی وجاہت شخص امتیازی سلوک کا مستحق۔ سلام میں ہمیشہ سبقت کرتے تھے اور بچوں سے ہمیشہ شفقت، اور عورتوں سے عزت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ انھوںؐ نے کبھی کسی انسان کی دل شکنی نہیں کی، کسی کو ذلیل نہیں کیا۔ ہر کسی کو اونچا اٹھانے کی کوشش کی۔ شیریں کلامی کے ساتھ بات کرتے، رحم دلی کا سلوک کرتے۔ جو لوگ ان کے ساتھ بدی کا سلوک کرتے اس کا جواب نیکی سے دیتے۔ اگر بھولے سے بھی کسی کو ان کی وجہ سے تکلیف پہنچتی تو اس کی معافی مانگنے میں اتنی ہی عجلت کرتے جس قدر دوسروں کی زیادتیوں کو معاف کرنے میں۔ انتقام کا جذبہ کبھی اس قلبِ پاک میں پیدا نہیں ہوا۔ مخالفوں کے ظلم و ستم کی وجہ سے کئی سال تک اپنے وطن سے باہر رہے۔ جب ایک کامیاب فاتح کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہوئے تو وہاں کے شریر اور مفسد لوگوں کو، جنھوں نے انھیںؐ اور انؐ کے ساتھیوں کو ہر قسم کی تکلیفیں پہنچائی تھیں، اندیشہ تھا کہ انھیں اپنی بداعمالیوں کی سزا ملے گی۔ لیکن ان کی حیرت کی انتہا نہیں رہی حالانکہ انھیں حیرت نہ ہونی چاہیے تھی، جب انھوں نے دیکھا کہ اُنؐ کی زبان پر قرآن کی یہ آیت ہے:

”آج کے دن میری جانب سے تم پر کوئی سرزنش نہیں (جو ہونا تھا وہ ہو چکا) اللہ تمھارا قصور بخش دے۔ وہ رحم کرنے والوں میں سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔“

یہی رحم دلی، ہمدردی، محنت، امن پسندی اس پیغمبرِؐ امن کی سیرت کی مرکزی صفات تھیں۔ لیکن کسی شخص کے کردار کا پورا اندازہ اس کے کارناموں سے نہیں ہوتا یہ بھی دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ اس کا اثر اس کے عزیزوں، دوستوں، ساتھیوں بلکہ مخالفوں کی زندگی پر کیا ہوا۔

اس اعتبار سے محمد عربیؐ کا اثر معجزے کا حکم رکھتا ہے۔ جو لوگ ایک دفعہ انؐ کی صحبت کا پورا فیض پاتے، ہمیشہ کے لیے ان کے اثر میں آجاتے اور ان کی دنیا ہی بدل جاتی، زندگی کا تصور بدل جاتا، اس کی قدریں بدل جاتیں، کامرانی اور ناکامی کے اندازے بدل جاتے۔ گویا خرد کا نام جنون ہو جاتا ہے اور جنون کا خرد!

عقل، جس نے اب تک عیش و عشرت کی جستجو کو مقصودِ حیات سمجھا تھا اب خدا کی رضا اور رسول کے عشق

میں خوشی اور اطمینان کو تلاش کرتی اور راستہ کے کانٹوں کو پھول سمجھ کر چن لیتی۔

بلال (رضی اللہ عنہ) ایک حبشی غلام تھا، نور کی چنگاری اس کے دل میں چمکی اور وہ مسلمان ہوگیا۔ اس جرم کی پاداش میں کیا کیا "سلوک" ان کے ساتھ نہیں ہوئے۔ گردن میں رسّی ڈال کر انھیں مدینہ کی گلیوں میں کھینچتے ہوئے تپتی ہوئی ریت پر بٹھاتے اور گرم گرم پتھر کی سلیں چھاتی پر رکھتے۔ ان کا کھانا پانی بند کیا جاتا اور لکڑیوں سے پیٹا جاتا۔ لیکن ان کے ایمان میں خلل نہ آیا، اور زبان سے خدا کے نام کے سوا کچھ نہ نکلا۔

جنگِ اُحد کے دوران ایک مسلمان عورت کو خبر ملتی ہے کہ اس کا بھائی شہید ہوگیا ہے۔ اس نے کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ راہِ خدا میں کام آیا۔ پھر باپ کی شہادت کی خبر ملی۔ اس نے دوبارہ خدا کا شکر ادا کیا۔ پھر شوہر کی سنائی ملی۔ اس نے کمالِ صبر کے ساتھ اِنّا للہ و اِنّا الیہِ راجعون کہا اور اشتیاق کے ساتھ پوچھا کہ خدا کا رسولؐ بھی زندہ ہے؟ جب انؐ کی خیریت کی طرف سے اطمینان ہوگیا تو کہا: "الحمد للہ! اب ہر مصیبت برداشت کرسکتی ہوں۔"

ایک صحابی تھے حضرت خبیبؓ۔ ان کے جگر کو نیزہ سے چھید کر کافروں نے پوچھا کہ کیا تم یہ پسند کرو گے کہ تمھیں چھوڑ دیا جائے اور محمدؐ تمھاری جگہ لے لیں۔ جواب ملا: خدا واقف ہے کہ میں اس بات کے لیے بھی تیار نہیں ہوں کہ میری جان بچ جائے اور اس کے بدلے رسولؐ کے پاؤں میں ایک کانٹا بھی چُبھ جائے۔

اور جب خبیبؓ کو پھانسی دی جا رہی تھی تو ان کی زبان پر یہ الفاظ تھے:

"یہ لوگ کہتے ہیں کہ کفر اختیار کرو تو آزادی مل سکتی ہے مگر میرے لیے اس کے مقابلہ میں موت زیادہ آسان اور قابلِ قبول ہے۔ میں نہ ان کے سامنے عاجزی کروں گا نہ گریہ زاری۔ کیوں کہ میں تو اپنے خدا کے پاس جا رہا ہوں (میرے لیے یہ باعثِ فخر ہے کہ) عرش عظیم کے مالک نے مجھ سے کوئی خدمت لی۔ اور مجھے اس حالت میں صبر کی توفیق دے۔"

یاد رہے کہ یہ ذکر صرف رسولؐ کے جلیل القدر صحابیوں کا نہیں جن کے کارنامے تاریخ میں موجود ہیں اور جن کے فضائل سے دنیائے اسلام واقف ہے ان میں ان کے معمولی عقیدت مند بھی شامل ہیں جن کے دل میں ایک بجلی چمکتی تھی اور ان کی دنیا بدل جاتی تھی۔

طے می شود ایں رہ بہ درخشیدن برقے
ما بے خبراں منتظرِ شمع و چراغیم

مسیحؑ کو عمر بھر کی ریاضت اور تلقین کے بعد بارہ[۱] حواری ملے تھے۔ اور ان میں سے ایک یہوداہ تھا جس نے آخری وقت میں رہبر کے ساتھ دغا کی۔ ایک مبصّر نے لکھا ہے کہ تعجب تعداد کی کمی پر نہیں بلکہ اس بات پر ہے کہ مسیحؑ کو اتنے وفادار اور مخلص بھی مل گئے لیکن رسولِ عربیؐ کا کارنامہ یہ ہے کہ ان کو سیکڑوں ایسے ساتھی ملے جنھوں نے اپنی جان و مال، اولاد، عزّت، عیش و عشرت ہر چیز کو رسولؐ کی خوشنودی پر قربان کر دیا۔ تاریخ ایک بھی ایسے شخص کا نام نہیں بتاتی جس نے

انعام کے لالچ میں یا مصیبتوں کے خوف سے اپنے راستہ کو چھوڑا یا صداقت سے منہ موڑا ہو ۔ بقول مولانا آزاد کے انھوں نے اپنے پچھلے سارے رشتے بھلا دیے تھے اور صرف ایک ہی رشتہ کی لگن باقی رہ گئی تھی ۔ یعنی سب اللہ کے رسول کے فدائی اور اس کے حُسنِ جہاں آرا پر اپنا سب کچھ نثار کر دینے والے تھے ۔

تو نخل خوش ثمر کیستی کہ باغ و چمن
ہمہ ز خویش بریدند و در تو پیوستند

۶

آپ نے دیکھیں اس برگزیدہ رسول اور احباب کی سیرت کی چند جھلکیاں ۔ ان کی تعلیم کے چند انقلابی پہلو بھی دیکھ لیجیے جو ایک لحاظ سے آج بھی اتنے ہی انوکھے ہیں جس قدر چودہ سو برس پہلے تھے انہیں مخالفوں کی سرکشی اور حق ناشناسی کی وجہ سے کئی مرتبہ لڑائیوں میں شریک ہوئے تھے ۔ لیکن کسی موقعہ پر انھوں نے عدل اور رحم و شرافت کے ان آداب کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا جو انھوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں برتے تھے ۔ اس کے مقابلہ میں تہذیب کے اس دَور میں جب انسان کو علم اور اس کی قدر کمال کو پہنچ گئی ہے اور مذہب ، فلسفہ اور اخلاق کی تمام نسلی دولت اس کا سرمایہ ہے جنگ کے سلسلہ میں کیا کیا بربریت روا نہیں رکھی گئی اور انسان نے انسان کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا جس کی وجہ سے ہمارا سر خونخوار درندوں کے سامنے شرم سے جھک جاتا ہے ۔

عرب کے اس نبیِ رحمت نے اپنے ساتھیوں کو ایسے آدابِ جنگ کی تعلیم دی جنھوں نے جنگ کو بھی گویا ایک تعلیمی ادارہ بنا دیا ۔ جنگ میں جو قیدی ہاتھ آتے ان کی خبر گیری مہمانوں کی طرح کی جاتی اور ان کی خوراک اور لباس کا مناسب انتظام کیا جاتا ۔ جس وقت رسولِ خدا فاتح کی حیثیت سے مکے میں داخل ہُوئے تو فوج کو مندرجہ ذیل احکام دیے گئے ان کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دراصل ہر شخص کی جان بخشی کا اعلان ہوتا ۔

۱ ۔ جو شخص ہتھیار پھینک دے اس کو قتل نہ کیا جائے ۔
۲ ۔ جو شخص خانہ کعبہ میں داخل ہو جائے اس کو قتل نہ کیا جائے ۔
۳ ۔ جو شخص ایک مقامی باشندے حکیم بن حزام کے گھر میں پناہ لے اس کو قتل نہ کیا جائے ۔
۴ ۔ زخمی کو قتل نہ کیا جائے ۔
۵ ۔ اسیر کو قتل نہ کیا جائے ۔
۶ ۔ بھاگ جانے والے کا پیچھا نہ کیا جائے ۔

قیدیوں کے ساتھ حُسنِ سلوک کی وہ مثال قائم کی کہ جس قدر لوگ حنین میں گرفتار ہوئے تھے ان میں سے جتنے اپنے یا حضرت مُطلب کے خاندان والوں کے حصہ میں آئے تھے ان سب کو علی الاعلان بلا کسی معاوضہ کے آزاد کر دیا ۔ چنانچہ انصار اور مہاجرین کو

بھی ان کی پیروی میں ایسا ہی کرنا پڑا۔ چند لوگ ایسے بھی تھے جو اس بات پر آمادہ نہ ہوئے ان کے حصّے کے قیدیوں کو رسولؐ خدا نے خود چھ اونٹ فی نفر کے حساب سے خرید کر آزاد کر دیا۔ یاد رہے کہ ان میں سے بہت سے لوگ وُہ تھے جو انھیں ایذا پہنچانے اور ان پر پتھر برسانے میں پیش پیش رہے تھے۔

جب اسلام کے دورِ اوّل میں مسلمان مکّہ سے ہجرت کر کے مدینہ یا حبش چلے گئے تو ان کی غیر حاضری میں ان کے مکانوں اور جائدادوں پر اہلِ مکّہ نے قبضہ کر لیا۔ مدینہ میں فاتح کی حیثیت سے واپس آکر اُنھوں نے رسولِ خدا سے درخواست کی کہ ہماری جائدادیں واپس دلائی جائیں۔ جواب ملا:

"جن چیزوں کو تم راہِ خدا میں چھوڑ چکے ہو ان کی واپسی کا سوال کیوں کرتے ہو۔"

اور ان کی درخواست منظور نہیں ہُوئی۔ کس قدر مختلف ہے یہ اندازِ نظر اس رویّہ سے جو اس دورِ تمدن میں رائج ہے۔

بہت سے مواقع ایسے پیش آئے جب انھوں نے اپنے عقیدت مندوں کو اپنے خطبوں میں نہ صرف اسلام کے بنیادی اصولوں کی تعلیم دی بلکہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی جن کی اہمیت بہت زیادہ ہے ان کو جینے کا سلیقہ سکھایا، ایک دوسرے سے اور تمام انسانوں سے میل جول کی شرافتیں سکھائیں۔ جس طرح اشوکِ اعظم کے فرمودات لوہے اور پتھروں کے میناروں پر کندہ ہیں اسی طرح ان کے فرامین ثقہ راویوں کے ذریعہ صحت کے ساتھ ہم تک پہنچے ہیں۔ کتابوں اور لوگوں کے دلوں میں محفوظ ہیں۔ مکّے سے ہجرت کا پہلا سال تھا مہاجرین نے ایک چھوٹی سی مسجد کی بنیاد ڈالی تھی۔ پہلے تاریخی خطبہ کے موقعہ پر کئی سَو مسلمان وہاں جمع تھے اور خدا کا یہ رسولؐ اپنے خطاب کے دوران زندگی کے بھید ان پر کھول رہا ہے:

میں شہادت دیتا ہُوں کہ خدا کے سوا کوئی دُوسرا عبادت کے لائق نہیں، وہ یکتا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، محمدؐ اس کا بندہ اور رسولؐ ہے جس کو اس نے ہدایت، نور اور نصیحت دے کر بھیجا ہے ایک ایسے زمانے میں جب کہ مدّت سے کوئی رسول نہیں آیا۔ علم گھٹ گیا اور پھر انسانوں کی گمراہی بڑھ گئی تھی۔ جو شخص خدا اور رسول کی تائید کرتا ہے یعنی نیکی کے راستہ پر چلتا ہے وہ ہدایت پاتا ہے اور جو ان کا حکم نہیں مانتا وہ راستے سے بھٹک جاتا ہے۔ اے مسلمانو! خدا کی نعمتوں سے لطف اٹھاؤ لیکن اس کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرو۔ اس نے تمہارے لیے ایک کتاب بھیجی ہے اور تمھیں اپنا سیدھا راستہ دکھایا ہے تاکہ راست بازوں اور باطل پرستوں میں تمیز ہو سکے۔ اے لوگو! خدا کو یاد کرو اور آیندہ زندگی کو پیشِ نظر رکھ کر (نیک) کام کرو۔ کیونکہ جو شخص اپنا معاملہ اللہ کے ساتھ درست کر لیتا ہے اللہ اس کے اور دوسرے لوگوں کے باہمی معاملات کو بھی درست کر دیتا ہے۔"

اس مختصر سے آخری جملے میں اُنھوں نے اس گہری حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ دین اور دُنیا میں اور روحانی اور مادی قدروں میں کوئی تضاد نہیں۔ اور جو شخص دین کے معاملہ میں شرافت کے اصول کا پابند رہے گا اور مسجد اور منڈی کے لیے دو مختلف طریقِ فکر و عمل اختیار نہیں کرے گا اس کے دل کی پکار یہی ہوگی کہ "اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا کی نیکیاں اور

بھلائیاں بھی دے، اور آخرت کی بھی، کیوں کہ یہ دنیا ہی زندگی آخرت کی کھیتی ہے۔ جیسا ہم بوئیں گے ویسا وہاں کاٹیں گے۔"

دنیا کے معاملات میں بھی ان ہی اصولوں کو مدِّنظر رکھنا چاہیے۔

آپؐ کی نظرِ حقیقت شناس نے انسانی فطرت کی چھپی ہوئی کمزوریوں کو تلاش کیا۔ بڑی دل سوزی اور وضاحتِ خیال کے ساتھ ان کی طرف توجہ دلائی اور ان کا علاج تجویز کیا۔ ایک خطبہ میں جو خطبۂ تبوک کے نام سے مشہور ہے زندگی کے لیے ہدایتیں موتیوں کی لڑی کی طرح پروئی ہیں اور ان میں ایک ایسا اعجازِ بلاغت شامل ہے جو عربی زبان کا مخصوص حصّہ ہے۔ ان میں نمونہ کے طور پر چند کے تیور ملاحظہ ہوں:

- سب باتوں سے بڑھ کر بھروسا کی بات تقویٰ ہے۔ اور سب باتوں پر اللہ کے ذکر کو شرف حاصل ہے۔ تمام اعمال میں افضل عمل وُہ ہے جس سے دُوسروں کو فائدہ پہنچے۔
- دل کا اندھا ہونا سب سے بڑی کور ہے۔
- سب سے بڑی دولت دل کی دولت ہے۔ دولت زر و مال کی کثرت نہیں۔ غنی وہ ہے جس کا دل غنی ہے۔
- بلند ہاتھ (یعنی دینے والا) پست ہاتھ (یعنی لینے والا) سے بہتر ہے۔
- دانائی کا سرچشمہ دل میں خوفِ خدا کا ہونا ہے۔
- جو دوسروں کے عیب چھپاتا ہے خدا اس کے عیب ڈھانپتا ہے۔
- جو شخص چغلی پھیلاتا ہے خدا اس کی رسوائی عام کرتا ہے۔
- قابلِ رشک ہے وہ مالدار جس کو دولت کے صحیح مصرف کی توفیق ہو۔
- قابلِ رشک ہے وہ شخص جس کو خدا نے حکمت دی ہو، اس پر خود بھی عمل کرے اور دوسروں کو اس کی تعلیم دے۔
- پیٹھ پر لکڑیوں کا گٹھا لادنا بھیک مانگنے سے بہتر ہے۔ محنت کر کے کمانے والا خدا کا دوست ہے۔

یہ ہیں وہ اصول جو فرد کی سیرت کو سنوارتے ہیں اور اُنھیں کا پرتو فرد اور جماعت کے تعلقات کی تفسیر میں بھی نظر آتا ہے۔ عرب کے اس رسولِ اُمّی کی حدیثیں (جس نے کسی مدرسہ میں یا کسی استاد سے باضابطہ تعلیم نہیں پائی) اس پر ہر پہلو سے کیسی دل نشین روشنی ڈالتی ہیں:

- مسلمان وُہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان بچے رہیں۔
- تم میں سے کوئی مومن نہیں بن سکتا جب تک اپنے بھائی کے لیے وہ کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

یاد رہے کہ اس تصورِ حیات میں ہر انسان دوسرے تمام انسانوں کا بھائی ہے کہ سب ایک خدا کے

بندے اور ایک آدم کی اولاد ہیں)

- خبردار ! بدگمانی کو اپنی عادت نہ بناؤ کہ وہ جھوٹ ہی جھوٹ ہے ۔ بے بنیاد باتوں پر کان نہ لگاؤ ۔ اے اللہ کے بندو ! آپس میں بھائی بھائی بن کر رہو ۔
- دوسروں کے عیب تلاش نہ کرو ، آپس میں بُغض اور نفرت نہ رکھو ، کسی انسان سے منہ نہ موڑو ۔
- جو شخص خدا اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے اسے لازم ہے کہ وہ اپنے ہمسایہ کو ایذا نہ پہنچائے (اور آج کی دنیا میں کون کس کا ہمسایہ نہیں ہے) ، اپنے مہمان کی عزت کرے ، بات کہے تو اچھی کہے ورنہ خاموش رہے ۔ (آدابِ کلام کا اس سے بہتر گُر اور کیا ہو سکتا ہے)
- قوت کا ثبوت یہ نہیں کہ دُوسروں کو زیر کرے بلکہ غصہ میں اپنے نفس کو قابو میں رکھے ۔ نیکی اس میں ہے کہ اسیروں کو رہائی دلاؤ ، بھُوکوں کو کھانا کھلاؤ اور بیماروں کی خبر گیری کرو ۔
- قیامت کے دن خدا کا سایہ ہوگا اس شخص پر جو چھپ کے خیرات کرتا ہے اس شان سے کہ بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا ۔
- عرب کو عجم پر اور عجم کو عرب پر ، کالے کو گورے پر اور گورے کو کالے پر کوئی افضلیت نہیں کیونکہ فضیلت کا معیار تقویٰ یعنی خدا ترسی ہے ۔
- اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم معاہد (رعایا) کو قتل کرے گا وہ بہشت کی خوشبو بھی نہ سُونگھ پائے گا ۔ حالانکہ یہ خوشبو چالیس سال کے فاصلہ سے آنے لگتی ہے ۔

یہ ہیں وہ قدریں جو ذاتی اور اجتماعی زندگی کی صالح تشکیل کے لیے ضروری ہیں ، جو دیکھنے میں بالکل واضح اور بدیہی معلوم ہوتی ہیں لیکن سوائے ان لوگوں کے جن کو توفیقِ الٰہی اور ضمیر کی دولت حاصل ہے کس قدر دور ہیں یہ عام لوگوں کی زندگی اور عمل سے ! جب تک یہ ہمارے فکر و نظر میں ، ہمارے قول و فعل میں رچ نہ جائیں ہم زندگی کا کوئی بڑا یا چھوٹا مسئلہ خوش اسلوبی اور سلامتی سے طے نہیں کر سکتے ۔ جب کبھی دنیا کی تاریخ میں یہ چراغ ٹمٹمانے لگتے ہیں ان کی حفاظت کے لیے ایسے ہی روحانی سرچشموں سے ہدایت حاصل کرنی پڑتی ہے ۔

۷

ایک اور مخصوص پہلو اس رسولِ اکرمؐ کی تعلیم کا یہ ہے کہ جیسا میں نے اس باب کے شروع میں ذکر کیا کہ انھوں نے دنیا کے سامنے ادب کا ایک ارتقائی نظریہ پیش کیا یعنی مختلف مذہب خدا کے بھیجے ہوئے نیک بندے مختلف زمانوں میں لائے وہ ایک دوسرے کے نقیض یا رقیب نہیں بلکہ ایک زریں سلسلہ کی کڑیاں ہیں اور کوئی اُمت ایسی نہیں گزری جس میں خدا کا پیغام بر نہ آیا ہو کہ لوگوں کو بداعمالیوں کے نتیجے سے خبردار کرے اور ان کو راہِ راست پر چلنے کی ترغیب دے ۔

ان سب کی تعلیم بنیادی اعتبار سے یکساں ہے۔ ان کے اصول ابدی اور مستقل ہیں۔ گو ان کی تفسیر اور تعبیر میں ان کی فروع شاخوں میں زمانہ کے حالات اور ضرورتوں اور نفس انسانی کی تربیت اور ترقی کے مطابق تبدیل ہوتی رہی ہے اس لیے لازم آتا ہے کہ ہم سب مذہبوں کے بانیوں اور خدا کے پیغامبروں کا دل سے احترام کریں اور ان کی تعلیم کا ادب سے مطالعہ کریں۔

یہ در اصل ایسا اصول ہے جو رواداری کو مصلحت پسندی سے بلند کر کے ایک قدر مستقل بنا دیتا ہے اور نام نہاد مذہبی لڑائیوں اور فسادوں کی بیخ کنی کرتا ہے۔ محمد عربی کی دینی دعوت کے تصور پر جبر کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی بلکہ انھوں نے ہر موقع پر بار بار بہت اصرار کے ساتھ کہا کہ دین کے معاملہ میں کوئی جبر و اکراہ نہیں۔ ہر قوم کی اپنی شریعت اور زندگی ہے جس پر قائم رہنے کا اسے حق ہے اسے مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اسے ترک کر کے کوئی دوسرا راستہ اختیار کرے۔ سچائی اسی وقت سچائی ہے جب ہم دل کی گہرائیوں سے اس پر ایمان لائیں ورنہ کسی لالچ یا دباؤ سے اس کا زبانی اقرار کرنا بالکل بے معنی ہے۔

اختلاف تو انسانی فطرت کا جزو ہے اس کو کیسے دُور کیا جا سکتا ہے! سچائی کی تلاش میں تبادلۂ خیال کی ضرورت ہے اور دل کو تعصب، تنگ نظری اور قدامت پرستی کے بندھنوں سے آزاد کرنے کی۔ اس کے بعد عقلِ خداداد خود اپنا راستہ ڈھونڈ لیتی ہے۔ خدا کا رسول راستہ کی نشان دہی کرتا ہے۔ وہ ٹھیکہ دار بنا کر نہیں بھیجا گیا کہ زبردستی سب کو ایک ڈگر پر چلائے۔

اگر تیرا پروردگار چاہتا تو دنیا کے تمام سننے والے ایمان لے آتے (لیکن اس نے ایسا نہیں کیا) پس اے رسول! تم ان لوگوں پر جبر کر سکتے ہو کہ وہ ایمان لائیں؟ (ہرگز نہیں)۔

تمہارا فرض تو ذکرِ الٰہی کرنا اور خدا کے راستہ کی طرف حکمت اور شیریں کلامی کے ساتھ بلانا ہے اور بس۔ اگر کوئی مشرک بھی تمہارے پاس آ کر پناہ مانگے تو سب سے پہلا کام یہ ہے کہ تم اس کو پناہ دو پھر اس کو کلام الٰہی سناؤ۔ اس کے بعد اسے (احتیاط کے ساتھ) اس کے مسکن پر پہنچاؤ۔ یعنی علم و اخلاق کی جو روشنی خدا کی رحمت سے تمہارے نصیب میں آئی ہے اس کو دوسروں کے سامنے پیش کرنا تمہارا کام ہے لیکن تم اسے زبردستی کسی پر عائد نہیں کر سکتے۔ پھر خدا سمجھے ان انصاف نشناسوں کو جو ان صریح حکموں کی موجودگی میں یہ ثابت کرنے کی فکر کرتے ہیں کہ اسلام شمشیر کے زور سے پھیلا ہے اور یہی اسلام کی تعلیم ہے اس تعلیم کے بنیادی اصول اور عقائد جن کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ دراصل انسان کے اخلاقی اور روحانی شعور کی تفسیر ہیں۔ اس میں پہلا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ ایک قادر مطلق خدا کے وجود کا اعتراف کیا جائے جو ہر جگہ موجود ہے، جس کی ہر جگہ حکمرانی ہے جس کی عبادت اور اطاعت ہر انسان کا فرض ہے جو خدائے رحمت و محبت، خدائے غضب و انتقام نہیں۔ جس نے انسان کو عقل اور ضمیر کی دولت دی تاکہ وہ خیر اور شر میں تمیز کر سکے۔

دوسرا عقیدہ عقیدۂ عدل ہے۔ یعنی خدا ظالم نہیں بلکہ صاحبِ انصاف ہے اور جس طرح اس کے ہاں ہر معاملہ میں انصاف کی کارفرمائی ہے (خواہ ظاہر بین نگاہیں اس کو نہ دیکھ سکیں) اس طرح انسانی رشتوں اور تعلقات میں انصاف برتنا انسان کا فرض ہے۔ اسلام نے حُسن، خیر اور حق کی قدروں کے ساتھ جو قدیم یونانی تہذیب کا امتیاز ہیں، عدل کو ایک بلند مقام بخشا ہے۔

تیسرا عقیدہ جس کی طرف اُوپر اشارہ ہو چکا ہے خدا کے رسولوں پر ایمان ہے جو ابتدائے آفرینش عالم سے انسان کی ہدایت کے لیے آتے رہے ہیں اور جن کی عزت صرف حق کا احترام ہے۔ اور دوسری طرف مذہبی رواداری کی بنیاد۔ مسلمانوں کے آخری نبی محمدؐ عربی ہیں جن کے پیام اور کلام کو ان کے بعد اماموں اور خدا کے نیک بندوں نے دنیا میں قائم کیا اور پھیلایا ہے۔ اور اس کے لیے ہر طرح کی قربانیاں دی ہیں۔ زمانہ آج بھی صداقت پرستوں سے مختلف شکلوں میں قربانیوں کا مطالبہ کرتا ہے۔

پھر قیامت پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے یعنی انسان کی زندگی تاریکی کے سمندر میں شرارے کی سی عارضی چمک نہیں کہ ایک لمحہ کے لیے روشن ہوئی اور ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی بلکہ اس کے لیے مکافاتِ عمل کا قانون ہے، کام اور خیال اور نیت کے نتیجوں کی جواب دہی ہے اس دنیا میں بھی اور دُوسری دنیا میں بھی۔ یہ ہی ذمہ داری کاموں کے تول، نیکی اور بدی کی پرکھ اور ان کا مناسب بدلہ زندگی کا تانا بانا ہے۔

جو شخص ایک رائی کے دانے کے برابر نیکی کرے گا وہ دیکھی جائے گی اور جو ایک رائی کے دانے کے برابر بدی کرے گا وہ بھی دیکھی جائے گی۔ یہ کھاتہ بند نہیں ہوتا کبھی گم نہیں ہوتا۔ قیامت ایک روزِ موعود تک محدود نہیں بلکہ ہماری زندگی کے ایک ایک قدم پر اس کا سایہ ہے۔ ہمارے علم اور اخلاق پہ ہماری دینی اور دُنیوی کاروبار پہ، ہماری ذاتی اور اجتماعی زندگی پہ اور ہماری عقل خود پسند پہ جس کا غرور اکثر خدا کو بھی بھلا دیتا ہے۔

گمان مبر کہ خرد را حساب میزان نیست

نگاہ بندۂ مومن قیامت خرد است

اسی تعلیم کا فیض تھا کہ عرب میں اور اس کے بعد دُوسرے ملکوں میں جہاں جہاں اس برگزیدہ بندۂ خدا کی آواز پہنچی اور اس کی چوٹ حساس دلوں پہ پڑی ان کی زندگی اور زندگی کے تعلقات میں ایک انقلابِ عظیم پیدا ہو گیا خصوصاً ان طبقوں کی آزادی اور انسانی حقوق کا ایک نیا چارٹر مل گیا جن کو سماج کے ظلم اور بے حسی نے جانوروں کی حیثیت دے رکھی تھی۔ تاریخ میں مدت تک یہ بحث چلتی رہی کہ مردوں کی طرح عورتوں میں بھی روح ہے یا نہیں!

مگر انھوں نے عورتوں کو مردوں کا ہم دوش قرار دیا۔ تعلیم کے دروازے ان پر کھولے۔ ماں باپ کی جائداد میں ان کا حصہ تسلیم کیا۔ شوہروں کی طرف سے مہر کا ادارہ قائم کیا۔ خلافِ مرضی شادی کو ممنوع کیا۔ طلاق اور خلع کے ذریعہ صحبت ناجنس کے عذاب کو دُور کرنے کا بھی راستہ نکلا۔ بیواؤں کی شادی کو کہ سماج کی نظر میں مردود تھی جائز قرار دیا۔

غرض ہر حیثیت سے ان کے جائز حقوق ان کو دلانے کی کوشش کی۔ اسی طرح غلاموں کی حالت ناقابلِ بیان تھی۔ انھوں نے نہ صرف غلامی کے تصور کو خلافِ انسانیت قرار دے کر اسے مسترد کیا بلکہ اس پر ایسی پابندیاں لگائیں اور حسنِ سلوک کے ایسے نمونے اور اصول قائم کیے کہ یہ دستور رفتہ رفتہ ناپید ہوتا گیا اور جہاں کہیں غلام باقی رہے وہ بھی گویا خاندان کا جزو بن گئے اور ان پر سے ایک مستقل کمتری اور ذلت کا کلنک دُور ہو گیا۔ خادموں کے ساتھ سلوک اور احسان اور انصاف کی ایسی سنت قائم کی کہ رسولؐ کے گھر میں آقا اور غلام کی تمیز بالکل اُٹھ گئی۔ رسولؐ کی چہیتی بیٹی فاطمہ زہراؓ نے ساری عمر اپنے

گھر میں محنت مزدوری کی، ہاتھ سے سب کام کیے، کھانا پکایا۔ جھاڑو دی، کپڑے سیے۔ اور جب ایک خادمہ "فضہ" ہاتھ بٹانے کے لیے میسر ہوئیں تو بندھا ہوا معمول یہ تھا کہ ایک دن سارا کام خود کرتیں اور دُوسرے دن فضہ کی باری آتی۔ رشتہ مساوات کا تھا آقائی نہ تھا۔ لیکن اسی کا فیض تھا کہ فضہ نے اپنی محبت، جاں نثاری اور وفاداری کے ذریعہ اسلام کی ابتدائی تاریخ میں اپنے لیے ایک ایسا مقام حاصل کر لیا کہ فاطمہؓ کے ساتھ ان کا نام بھی عزت اور عقیدت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ یہی صورت اسلام کے مؤذن اوّل بلالؓ کی تھی جو ابتداء میں ایک حبشی غلام تھے۔ لیکن ان کا نام آج تک منارہ عظمت کی زینت ہے۔

اس تعلیم کا شاید سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے نسل و رنگ، دولت اور ذات پات کے جھوٹے امتیازوں کو دُور کر کے اخوت اور مساوات کو اجتماعی زندگی کا بنیادی اصول قرار دیا۔ اس کے اثر سے ایک حد تک مختلف نسلوں، قبیلوں اور مذہبوں کے لوگ جو ایک دوسرے سے برسرِپیکار رہتے تھے، محبت کے ایک سلسلہ میں گُندھ گئے ایک خدا کی عظمت اور کبریائی کا نقش انسان کے دل پر بٹھایا اور دُوسری طرف انسان کو اس کا صحیح مقام دکھایا جو نیابتِ الٰہی کا مقام ہے جہاں انسان اپنی ذاتی جدوجہد کے ذریعہ دنیا میں مشیّتِ الٰہی کی تکمیل کرنے کا حوصلہ دکھاتا ہے اس نے خیر و شر کا ایک عالم گیر تصور انسان کے سامنے پیش کیا جس نے جغرافیائی حد بندیوں کو نظر انداز کر کے انسان کو شرافت اور امن دوستی کی بنیادوں اور قدروں پر جمع کرنے کی کوشش کی ہے وہی اتحاد اور محبت کا راستہ ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر کے آخری باب میں اس سورت کی "تعلیمی روح" بیان کی ہے جو در اصل اسلام کی تعلیمی روح ہے۔ پیغمبرِ اسلام کے عالمگیر تصورِ انسانیت کی تفسیر پہلے اس سورہ کا ترجمہ پیش کرتا ہوں اور پھر مولانا کی تفسیر کے چند جملے جو محمدؐ عربی کی تعلیم اور ہر شریف انسان اور سچے مسلمان کے دل اور دماغ کی بہت مؤثر تصویر کشی کرتے ہیں۔ اس سے بہتر خاتمہ اس مضمون کے لیے میرے ذہن میں نہیں آسکتا۔

ہر طرح کی ستائشیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو تمام کائنات خلقت کا پروردگار ہے، جو رحمت والا ہے اور جس کی رحمت تمام مخلوقات کو اپنی بخششوں سے مالا مال کر رہی ہے، جو اس دن کا مالک ہے جس دن (اپنے) کاموں کا بدلہ لوگوں کے حصے میں آئے گا (خدایا!) ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور صرف تُو ہی ہے جس سے اپنی ساری احتیاجوں میں مدد مانگتے ہیں (خدایا!) ہم پر (سعادت کی) سیدھی راہ کھول دے، وہ راہ جو ان قوموں کی راہ ہے جن پر تُو نے انعام کیا۔ اُن کی نہیں جو پھٹکارے گئے اور نہ اُن کی جو راہ سے بھٹک گئے۔

آخری تین آیتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا آزاد لکھتے ہیں:

پھر وہ خدا سے سیدھی راہ چلنے کی توفیق طلب کرتا ہے یہی ایک مدعا ہے جس سے زبانِ احتیاج آشنا ہوتی ہے۔ لیکن کون سی سیدھی راہ؟ کسی خاص نسل کی سیدھی راہ، کسی خاص قوم کی سیدھی راہ، کسی خاص مذہبی طبقہ کی سیدھی راہ؟ نہیں، وہ راہ جو تمام رہنماؤں اور تمام راست باز انسانوں کی متفقہ راہ ہے خواہ کسی عہد یا کسی قوم میں ہوئے ہوں اسی طرح وہ محرومی اور گمراہی کی راہوں سے پناہ مانگتا ہے۔ لیکن یہاں بھی کسی خاص نسل یا قوم یا کسی مذہبی گروہ کا ذکر نہیں کرتا

بلکہ ان راہوں سے بچنا چاہتا ہے جو دنیا کے تمام محروم اور گمراہ انسانوں کی راہیں رہ چکی ہیں۔

گویا جس بات کا طلب گار ہے وہ بھی نوعِ انسان کی عالمگیر اچھائی ہے اور جس بات سے پناہ مانگتا ہے وہ بھی نوعِ انسان کی عالمگیر بُرائی ہے۔ نسل، قوم، ملک یا مذہبی گروہ بندی، تفرقہ و امتیاز کی کوئی پرچھائیں اس کے دل و دماغ پر نظر نہیں آتی۔

غور کرو مذہبی تصور کی یہ نوعیت انسان کے ذہن اور عواطف کے لیے کس طرح کا سانچہ مہیا کرتی ہے۔ جس انسان کا دل و دماغ ایسے سانچے میں ڈھل کر نکلے گا وہ کس قسم کا انسان ہوگا۔

کم از کم دُو باتوں سے انکار نہیں کر سکتے کہ یہ ایک کہ اس کی خدا پرستی۔ خدا کی عالمگیر رحمت و جمال کے تصور کی خدا پرستی ہوگی۔ دُوسری یہ کہ کسی معنی میں بھی وہ نسل، قوم یا گروہ بندیوں کا انسان نہیں ہوگا۔ عالمگیر انسانیت کا انسان ہوگا۔ اور دعوتِ قرآن کی اصل رُوح یہی ہے۔

جانتا ہُوں کہ اس رُوح کو مسلمانوں اور دوسرے انسانوں نے بڑی حد تک بُھلا رکھا ہے۔ لیکن کون اس سے انکار کر سکتا ہے کہ تاریخ کے اس دور میں جہاں بعض مرتبہ تہذیب اور بربریت کی حدوں میں امتیاز ناممکن ہوجاتا ہے دنیا کو اس پیغامِ محبت اور تصورِ انسانیت کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم

مولانا عبد الستار خاں

نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا وَمَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (السبا)

تمہید

اس مقالے کا موضوع ہے پیغمبرِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم۔

حضور سرورِ دوجہاں، فخرِ موجودات، خلاصۂ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ جہاں ہر مسلمان وسیلۂ نجات سمجھتا ہے وہاں میرے جیسا ایک عامی اس تقریب پر لبِ گستاخی کی ذمہ داری کے احساس سے بھی لرزتا ہے ؎

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب کی حقیقت کا بیان کچھ انھیں لوگوں کو زیب دیتا ہے جو اس تذکرے میں الفاظ کے گورکھ دھندے سے آزاد ہو کر ایمان کی آنکھ سے واقعات کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ شہبازانِ معرفت نعت کے میدان میں سبقت رکھتے ہیں تو از روئے شریعت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام کو پہچاننے کی کوشش کرنا علمائے کرام کا حق ہے۔ میں مشائخ عظام اور علمائے کرام کا خادم ہونے کی حیثیت میں اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں پاتا کہ معرفت کی چاشنی یا شریعت کی روشنی سے پیغمبرِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی توصیف میں کچھ کہنے کی جرأت کر سکوں۔ روحانیت اور الٰہیات کے زاویۂ نگاہ سے میں اپنے عجز کا اقرار ہی باعثِ سعادت تصور کرتا ہوں ؎

ہزار بار بشویم دہن ز مشک و گلاب
ہنوز نامِ تو گفتن کمال بے ادبی است

میں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ادنیٰ حلقہ بگوش غلام غلاماں کی حیثیت سے آج اپنی معروضات کو صرف اس دائرے تک محدود رکھوں گا کہ اپنی عقلِ ناقص سے جب عہدِ حاضر کی انسانی معاشرت پر نگاہ دوڑاتا ہوں تو موجودہ دنیا کے تمام مسائل کا حل مجھے کس طرح زندگی کے ہر پہلو میں خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو حتمی، قطعی اور آخری حجت تسلیم کر لینا نظر آتا ہے ؎

بمصطفیٰ برساں خویش راکہ دیں ہمہ اوست
اگر باؤ نہ رسیدی تمام بولہبی است

آغازِ کلام

عہدِ حاضر کا انسان جب مسائل کو اپنی عقل سے جانچنے کا زعم لے کر نکلتا ہے تو اس عقل کی حدود اربعہ کیا ہیں؟ آج کل کے سائنسدانوں کو زعم ہے کہ ہم آباؤ اجداد کی طرح صرف آنکھ کی طاقت سے نہیں بلکہ دوربین اور خوردبین لگا کر حقائق کائنات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ماضی کا انسان صرف کان سے سنتا تھا، ہمارے گوشِ ہوش کی سماعت ریڈیائی لہروں پر حاوی ہے۔ گذشتہ تہذیبیں صرف قدم قدم چلتی تھیں۔ ہم سپٹنک سرپٹ دوڑاتے ہیں۔ اس کا انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ سات ہزار سال کی مستند تاریخ کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ بشری کمالات نے بعض جزئیات میں ضرور ایک حد تک ترقی کر لی ہے لیکن اس ترقی سے آفرینشِ کائنات اور غایتِ موجودات کا تو کیا ذکر انسان ابھی تک غیب اور آخرت کی کنہ تک بھی نہیں پہنچ سکا۔ بیشک انسان کو اب معلوم ہو گیا کہ سورج زمین کے گرد نہیں گھومتا، زمین نظامِ شمسی میں گردش کرتی ہے۔ لیکن یہ تو اب بھی پتہ نہ چلا کہ افلاک کے ماورا کیا ہے۔ خلا کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں ختم ہوتی ہے۔ نظامِ شمسی کی حرکات کا حاصل کیا ہے اور انسان جس پر یہ تمام اسرارِ کائنات منکشف ہو رہے ہیں اس کی منزل کیا ہے اور اس کے ترددات کی غایتِ اولیٰ کیا ہے؟

فقط یہی نہیں کہ انسان جب اپنے نفس سے باہر جھانکتا ہے تو اسے افق کے کناروں سے پرے غیب کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا ایک قلزم ظلمات دکھائی دیتا ہے، جس کا اور چھور اس کی عقل کو معلوم نہیں بلکہ وہ اپنے نفس کے اندر بھی جھانکتا ہے تو اسے آغاز و انجام ایک پہیلی کی طرح نظر آتا ہے جس کی آخری حقیقت اس کی ظاہر بیں عقل سے پوشیدہ ہے نہ صرف انسان کا عقلی علم، لاعلمی سے شروع ہو کر لاعلمی پر ختم ہو جاتا ہے بلکہ انسانی عزائم کی ابتدا و انتہا بھی بے خبری سے شروع ہو کر بے خبری پر ختم ہو جاتی ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا تھا:

عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمْ

ترجمہ: انسانی ارادوں کے ٹوٹ جانے سے مجھے پتہ چل گیا ہے کہ اس کائنات پر اصل حکمرانی انسان سے ایک بالاتر ہستی اور طاقت کی ہے۔

نہ صرف یہ عقلِ ناقص اپنی ابتدا و انتہا کے لحاظ سے ناقص ہے بلکہ اس علمِ ناقص کا نشۂ پندار عرصۂ نفس پر حاوی رہتا ہے تب بھی اس سے سوائے تصادم، تضاد اور سعیٔ لاحاصل کے کچھ نہیں نکلتا۔ آسمان پر سپٹنک (SPUTNIK) سے ایکسپلورر (EXPLORER) لڑ رہا ہے۔ زمین پر سٹالن کو خروشچیف موردِ الزام قرار دے رہا ہے۔ ایک معاشرتی طبقہ دوسرے معاشرتی طبقے سے برسرِ پیکار ہے۔ وطن سے وطن کی ٹکر ہو رہی ہے۔ جمہوریت سے جمہوریتیں بیزار ہیں۔ غرض دو بادشاہوں کا ایک تخت پر بیٹھنا قرونِ مظلمہ (DARK AGES) میں ایسا ناممکن نہ تھا۔ جتنا فی زمانہ عقل کی عقل سے صلح ہو جانا محال دکھائی دیتا ہے۔ کیا خوب کہا تھا اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے ؎

عوض لٹھ کے چلتے ہیں آپس میں دوٹ

اور حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ فلسفہ کے طومار سے سرگرداں ہو کر اس نتیجے پر پہنچے تھے۔

خرد واقف نہیں ہے نیک و بد سے
بڑھی جاتی ہے ظالم اپنی حد سے
خدا جانے مجھے کیا ہو گیا ہے
خرد بیزار دل سے دل خرد سے

نیز فرمایا تھا کہ ؎ حکمت و فلسفہ کرد است گراں خیز مرا   خضر من از سرم ایں بارِ گراں پاک انداز

عقل کی حد کا تقاضہ عقل کرتی ہے

غرض عقل کے حدود دارِبعہ کا اگر عقل سے جائزہ لیا جائے تو اس کی سرحدات سے پرے ماورائے عقل کی مملکت صاف دکھائی دیتی ہے۔ اگرچہ اس کے نقوش دھندلے ہیں عقل کی تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ عقل کی اس حد پر پہنچ کر اقلیم عقل کے سیاحوں نے تین راہیں اختیار کی ہیں۔ (۱) ایک قافلہ تو وہ تھا جنھوں نے غیب اور آخرت کی دھندلاہٹ سے جھنجھلا کر عقل کی محدود روشنی سے بھی انکار کر دیا اور لاادریت کی تاریکی میں کھو گئے۔ انھوں نے کہا کہ کایا تو چھایا ہے اور یہ کائنات فقط مایا کا جال ہے۔

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

قرآن مجید کی تاریخی اصطلاح میں ایسے حقیقت کو جھٹلانے والوں کا نام منکرین ہے۔ چاہے متشککین ہوں یا خیالیتین IDEALISTS ہوں یا SKEPTICS۔

(۲) دوسرے گروہ نے کہا کہ عقل سے پرے جب کچھ صاف دکھائی نہیں دیتا تو عقل پر کیوں نہ اکتفا کریں۔ قرآنی اصطلاح میں ہر زمانے اور ساری کائنات پر حاوی عقل کی بجائے مختلف زمانوں اور مختلف قسموں کی چھوٹی چھوٹی اور عارضی عقول کو اس طرح برحق مان لینے والوں کا نام مشرکین ہے۔ چاہے وہ MATERIALISTS ہوں یا PRAGMATIC یعنی مادیت پرست ہوں یا افادیت پرست (انھیں مصیبت یہ پیش آئی کہ جب عقل پر توجہ مرکوز کی جائے تو اس کی وسعتیں ناگہاں پھیلنے لگتی ہیں، جو کل عقل تھی وہ آج بے عقلی دکھائی دیتی ہے اور پرسوں حماقت سے بھی زیادہ ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے۔ اس لئے ماورائے عقل کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے سے عقل کی آنکھیں چندھیانے لگتی ہیں تو ماورائے عقل کی جانب پیٹھ موڑنے سے بھی عقل کے پاؤں تلے کی زمین مسلسل سرکتی جاتی ہے۔ لہٰذا جہاں عقل سے روگردانی کرنے والے اور سراسر عقل پر انحصار کرنے والے دونوں قافلے مسافتِ ہستی میں سرگرداں اور گمراہ ہو گئے (قرآنی اصطلاح میں انکارِ حقیقت یا شرک کا ارتکاب کر کے زندگی کی اصلیت سے یوں روگرداں رہنے والوں کا نام کفار ہے) وہاں تیسری جماعت ان لوگوں کی تھی، جن پر انسانیت کے ارتقاء کا ہمیشہ سے انحصار رہا ہے اور ہمیشہ انحصار رہے گا۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے عقل کا اقرار کرتے ہوئے بھی غیب اور آخرت کا انکار نہ کیا۔ قرآنی اصطلاح میں یہ جماعتِ مومنین ہے جن کا نعرہ ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ ؎

عقل است چراغ تو در رہگذارے نہ
عشق است ایاغ تو با بندۂ محرم زن

اور

من بندۂ آزادم عشق است امام من
عشق است امام من عقل است غلام من

اس جماعت کی رہنمائی ہر خطۂ زمین اور ہر عہدِ تاریخ میں ان برگزیدہ شخصیتوں سے کی جو عقل اور ماورائے عقل کی سرحد پر روشنی کے مینار کی طرح سربلند اور متوّر کھڑی دکھائی دیتی ہیں۔ یہی وہ شخصیتیں ہیں جو اپنے اپنے دور میں عقل کے بشری تقاضے پورے کرتے ہوئے غیب اور آخرت سے ہدایت کی وحی کا مہبط قرار پاتی رہیں۔

انبیاء علیہم السلام کا تاریخی اور عقلی منصب

موجودہ زمانے کا انسان نبی کے مفہوم کو سمجھنے میں بسا اوقات یوں ٹھوکر کھا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے معاشرے کی اس بنیادی اصطلاح کو بیان کرنے کے لیے رائج الوقت غیر مسلموں کی زبانوں سے ایسے الفاظ مستعار لئے جا چکے ہیں جن کے ساتھ ساتھ انبیاء علیہم السلام کے متعلق غیر مسلموں کے تعصبات اور توہمات کا ایک عنصر بھی ان الفاظ کے معنوں میں شامل ہو گیا ہے۔ یورپین زبانوں کا لفظ پرافٹ (PROPHET) اس یونانی مصدر سے مشتق ہے جو غالباً یہود کے دورِ زوال میں سُریانی زبان سے مستعار لیا گیا تھا اور جس کا بنیادی تصور اس مفہوم کے گرد گھومتا ہے کہ پیغمبر کبھی کبھی آنے والے زمانے کی باتیں بھی قبل از وقت بتا دینا اپنے حقیقی مشن کی تکمیل کے لئے مناسب سمجھتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ عہدِ جاہلیت میں عرب کے اندر بھی کاہن کی اصطلاح کے ماتحت اس قسم کا ایک مفہوم موجود تھا جس کا تصور پیشین گوئی اور دانشمندانہ اقوال تک محدود تھا۔ قرآن مجید نے وضاحت سے اس غلط توقع کی تردید کر دی ہے:۔

وَ قَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَ اِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

ترجمہ: اور یہ (منکرینِ حق) یوں کہتے ہیں کہ اس پر اپنے پروردگار کی طرف سے نشانیاں کیوں نہیں اتریں۔ (اے پیغمبرِ اسلامؐ) تم فرماؤ کہ نشانیاں تو خدا ہی کے پاس ہیں اور میں تو یہی صاف ڈر سنانے والا ہوں۔

پیغمبر کا منصب یہ نہیں کہ وہ جوتشیوں کی مانند مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کی بابت ٹپے (GUESSES) لگاتا رہے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ۝ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ۝ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (الحاقہ)

ترجمہ: تو مجھے قسم ہے ان چیزوں کی جنہیں تم دیکھتے ہو اور جنہیں تم نہیں دیکھتے بے شک یہ قرآن ایک کرم والے رسول سے بتایا

ہیں اور وہ کسی شاعر کی بات نہیں۔ کتنا کم یقین رکھتے ہو۔ اور نہ کسی کاہن کی بات۔ کتنا کم دھیان کرتے ہو۔ اس نے اُتارا ہے جو سارے جہان کا رب ہے۔

عربی لفظ نبی جو مذکورہ بالا قدیم سُریانی مصدر سے ہی مشتق ہے لُغت کے اعتبار سے خبر دینے والے کا تصور پیش کرتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے یہ خبر دینے والا کس چیز کی خبر دیتا ہے یہ تو ہم جانتے ہیں کہ اس کی جمع نبأ (انبا) خوشخبری پر بھی دلالت کرتی ہے اور ڈرائی بھی ہوتی ہے لیکن امید و بیم تو اس پیغام کے اثر سے تعلق رکھتے ہیں۔ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کا بنیادی مفہوم کیا ہے۔ اس پیغام کا بنیادی مقصد ہوئی اور ان ہونی، بُرے اور بھلے، حرام اور حلال کی تمیز سکھانا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (الاعراف)

ترجمہ: وہ لوگ جو پیروی کرتے ہیں۔ اس رسول کی جو نبی اُمّی ہے اور جسے اپنے ہاں توریت اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں وہ انھیں نیک کام کرنے کا حکم دیتا ہے اور بُرے کاموں سے منع کرتا ہے، وہ حلال کرتا ہے ان کے لئے سب پاک چیزیں اور حرام کرتا ہے اُن پر ناپاک چیزیں اور اُتارتا ہے ان سے بوجھ ان کے اور وہ قیدیں جو ان پر تھیں۔ سو جو لوگ اس پر ایمان لائے اور اس کا ساتھ دیا اور اس کی مدد کی اور اتباع کی اس نور کی جو اس کے ساتھ اترا ایسی وہی لوگ کامیاب ہیں۔

اللہ کے پیغمبر ہر زمانے میں انسان کو یہ سکھاتے ہیں کہ غیب اور آخرت کی وہ کونسی حدود ہیں جن کے اندر انسان اپنے شعور اور عقل کے استعمال سے مفید نتائج مرتب کر سکتا ہے۔ عقل کا موضوع تو شاید اس کائنات میں انسان کے بغیر بھی قائم رہ سکتا ہے۔ لیکن خود عقل اپنے وجود کے لئے انسانی ذہن کی محتاج ہے۔ انسانی ذہن کی نشوونما اور بلوغت اسی صورت میں ممکن ہے جب انسانی معاشرہ ایک صحت مندانہ نہج پر موجود ہو۔ انسان حیوانِ مدنی الطبع ہے۔ بغیر دوسرے کے نہ وہ اپنی فطری حالت میں زندہ رہ سکتا ہے اور نہ پروان چڑھ سکتا ہے۔ جس طرح معاشرے کو جنم دینے اور قائم رکھنے کے لیے اقل قلیل مادی ضروریات لابدی ہیں، اسی طرح افراد کی شخصیتوں میں بعض تعمیری عناصر کے بغیر سوسائٹی قائم نہیں رہ سکتی۔ ممکن ہے سورج کی کھولتی ہوئی حرارت میں کسی اور نوع کی مخلوق زندہ رہ سکتی ہو۔ لیکن وہاں انسانی جامے میں انسان آباد نہیں ہو سکتا۔ اس طرح جن انسانوں کے ذہن سے تعمیری میلانات اور فطری احساسات بالکل مٹ جائیں ان کی زندگی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ جس طرح افراد میں دیوانگی کا غلبہ ایک حد سے بڑھ جائے تو ان کی موت واقع ہو جاتی ہے اور جس طرح خاندان میں مُروّت باہمی نہ رہے تو خاندان بکھر جاتا ہے۔ اسی طرح انسانی معاشرے کے اندر بُرے اور بھلے کی تمیز بالکل ختم ہو جائے تو قومیں منتشر ہو جاتی ہیں اور امتیں مٹ جاتی ہیں۔

نبی اپنی اُمّت کی مساعی کا میدان ظاہر اور غیب اور موجود و آخرت کی حدود کے اندر مُعیّن کرتا ہے۔ تاریخ کی ابتدا میں ہم دیکھتے ہیں کہ دو ہزار سال قبل مسیح کے لگ بھگ جبکہ مصر میں صنائع اور حرفت کی ابتدا ہو چکی تھی۔ جس نے آگے جا کر یونانی حکمت اور یونانی علوم و فنون کی بنیادیں رکھی تھیں اور دوسری جانب مشرقِ وسطیٰ میں وہ بلدیاتی ریاستیں (CITY STATES) قائم ہو چکی تھیں جنہوں نے یونان

کی سٹی سٹیٹس (CITY STATES) کے لئے نمونہ بنا تھا تو اس وقت انسان کے ذہن میں یہ خلجان پیدا ہو رہا تھا کہ کیا شجر و حجر اور شمس و قمر خود انسان کی طرح ایک ایسی شخصیت رکھتے ہیں جس کے ساتھ شعوری ربط پیدا کر کے انسے راضی کیا جا سکتا ہے یا یہ وہ ادنیٰ طاقتیں ہیں جنھیں اشرف المخلوقات نے اظہارِ عبودیت و جستجوئے رضامندی کے بجائے اپنی استعداد اور قوت سے مُسخر کرنا ہے۔ قرآن مجید شاہد ہے کہ اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اُمت کو یہ تعلیم دی کہ ستارے، چاند یا سورج انسان کی تقدیر کے مالک نہیں۔

قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ...... اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝

فطری قوتوں کو تصور کی آنکھ سے دیکھ کر انسان نے ان کے جو مجسمے بُت یا نقشے ڈھال لئے ہیں وہ اس پر حاکم نہیں۔ سلطنتوں کے وہ بادشاہ جو نمرود و شداد کی طرح حکم چلاتے ہیں یہ بھی عام انسانوں سے بالاتر نہیں۔ بلکہ کائنات کا رب تو وہ اَن دیکھی ہستی اور طاقت ہے جو کائنات اور کائنات کی ہر شے کو اپنی اَن دیکھی قوتوں اور غیبی ترکیبوں سے وجود میں لاتا ہے۔ انسان کی جبینِ عبودیت صرف اسی کی بارگاہ میں جھکنی چاہیے اس ایک سجدے سے وہ قبلہ تعمیر ہو گیا، جس نے سابقہ شعوبی عصبیتوں کو مٹا کر ایک نئی ملت پیدا کر دی ؎

بتانِ شعوب و قبائل کو توڑ ‏ ‏ رسومِ کہن کے سلاسل کو توڑ!
یہی دینِ محکم یہی فتح باب ‏ ‏ کہ دُنیا میں توحید ہو بے حجاب

اکثر مؤرخ بھول جاتے ہیں کہ صدیوں بعد یونان میں جو حریت، حکمت، سیاست اور فنون کے نمونے پیدا ہوئے، اگر انہوں نے مصر کے سائنس (سائنٹفک علوم) اور صنعت سے ورثہ حاصل کیا اور مشرقِ وُسطیٰ کی بلدیاتی ریاستوں کے نمونے کو سامنے رکھا۔ تو ان سب سے زیادہ ملتِ ابراہیمی کی روشنی تھی جس نے ظلمت کدۂ یونان میں سحر کی ابتدا کی۔

قریباً ایک ہزار سال بعد جب فرعون کی سیاسی قوت اور قارون کی اقتصادی طاقت نے انسانیت کے متمدن گوشے کو اپنے پنجۂ استبداد میں جکڑ رکھا تھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے احکامِ عشرہ کی تختیاں ہیکل بیت المقدس میں سجا کر اپنی اُمت کو یہ پیغام دیا کہ قانون خالی جبر یا دولت سے استخراج نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اس کا سرچشمہ انسانی معاشرے کی ہدایت ہے۔ لکھے ہوئے قانون اور معاشرتی فلاح کا نمونہ یہی تھا جس کا چربہ صدیوں بعد رومن لا کی تختیوں پر اُتارا گیا۔

جب انسان قانون کی شوکت کو فانی حاکموں کی غیر فطری بالادستی کی آڑ بنانے لگا اور عسکری قوت لے کر معاشرے کی حفاظت کے بجائے رعایا سے استحصال کا برتاؤ کیا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی اُمت کو یہ تعلیم دی کہ انسان صرف موجودہ قوت یا اجتماعی شوکت کے بل پہ صحت مند معاشرہ قائم نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس کے سامنے موجودہ سے بہتر ایک مستقبل کا نصب العین بھی ہونا چاہیے۔ آسمانی بادشاہت کا یہی آئیڈیل تھا۔ جس نے کئی صدیوں تک زمین کی سلطنت کو بھی تہذیب کی نعمتوں، تمدن کی ترقیوں اور ثقافت کی برکتوں سے مالا مال کیا۔

غرض عقلِ انسانی نے جب کبھی اپنی جلوہ آرائی کا سامان پیدا کیا تو اس کے مظاہرے کے لیے میدان قبل ازیں پیغمبرانہ تعلیمات سے مہیا ہو چکا تھا۔ عقل کی کشتی اپنی سُبک روی کا تماشا تبھی دکھا سکتی ہے، جب معاشرہ غیبی طاقتوں کے ساتھ سازگاری پیدا کر کے وہ ہموار سطح فراہم کر دیتا ہے جس پر اس کشتی کو چلنا ہے اور آخرت کی منزل کی جستجو اس کشتی کے لیے ایک روشنی کا مینار تعمیر کر چکی ہے۔ ورنہ ممکنات کے اتھاہ

سمندر کی حد بندی اگر شریعت کے ساحل سے نہ ہو چکی ہو اور آخرت کا کوئی نقشہ کسی منزل کا تعین نہ کر چکا ہو، تو عقل بے چاری اس استدلال کی طرح "ناک ٹوئیاں مارتی اور حیران و پریشان رہ جاتی ہے۔ جس کا کبریٰ مجہول ہو، صغریٰ نامعلوم ہو اور نتیجہ ظاہر ہے کہ سوائے لاطائل ہونے کے اور کیا ہو سکتا ہے۔

مؤرخین نے عقل کی حدود اربعہ کے قیام کے لئے اقوام کے ارتقاء اور تہذیبوں کے نشو و نما کا سہارا بھی لیا ہے لیکن وہ یہ واضح نہیں کر سکتے کہ قوم کو کیا چیز قوم بناتی ہے اور تہذیب کو کونسی قوت تہذیب کے درجے تک پہنچاتی ہے، قوم اور تہذیب دونوں کا تصور معاشرے کے تصور کے بغیر محال ہے اور معاشرہ صرف اسی اُمت کے اندر ممکن ہے جو غیب اور موجود اور حاضر و آخرت کی حدود کا تعین کر چکی ہو۔ جو انسان یہ نہیں جانتا کہ وہ جو کچھ نہیں جانتا اس کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے جو کچھ کہ وہ جانتا ہے اور جسے یہ معلوم نہیں کہ جو کچھ وہ جانتا ہے اس کا مصرف مطلب اور غایت کیا ہے۔ ایسا انسان حیوانیت کی اس سطح پر جس کے ریوڑ دوسری طاقتیں ہانکتی ہیں۔ نہ صرف غیب اور آخرت کے تصورات کا مجرد تعین معاشرے کے قیام کی پہلی شرط ہے، بلکہ تصورات جو کچھ بھی ہوں تمام معاشرے میں ان کی یکسانیت بھی شرط ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ایسی یکسانیت کا پیغام ہمیشہ کوئی پیغمبر ہی لایا کرتا ہے۔ چاہے اس پیغام کی یاد اس پیغامبر کی اُمت کی آئندہ پشتیں فراموش ہی کیوں نہ کر چکی ہوں۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ مؤرخین اور عمرانی محققین نے معاشرے کی تشکیل کے اجزاء کو غیب و آخرت اور حرام و حلال کی اصطلاحات میں بیان کرنے کے بجائے نظریۂ ارتقاء (EVOLUTION THEORY) کا سہارا بھی لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح موسم برسات میں زمین سے گھاس اُگتی ہے اور فصل پک جانے پر پھل بلوغت کی عمر کو پہنچ جاتے ہیں اور جس طرح موسم بہار میں پرندے خود بخود چہچہانے لگتے ہیں اسی طرح معاشرہ بھی بغیر احساس شعوری کے پروان چڑھ جاتا ہے۔ افسوس ہے کہ جمادات کا ارتقاء نباتات میں دیکھنے والے اور نباتات کا ارتقاء حیوانات میں تلاش کرنے والے جب انسان کو تختۂ مشق بناتے ہیں تو اس کی ترقی کمالات و مقامات کی منزلیں آخرت میں تلاش کرنے کے بجائے اسے تنزل و انحطاط کی راہ دکھا کر اس کے ارتقاء کو تسفل کے مدارج میں ڈھونڈتے ہیں۔ مان لیا کہ برسات میں خود رَو گھاس اُگ آتی ہے، لیکن کیاریوں کی چمن بندی تو دستِ مشاطر کی محتاج رہتی ہے۔ یقیناً پرندے موسم بہار میں خود بخود چہچہانے لگتے ہیں، لیکن طوطی و مینا کو طرزِ تکلم سکھانے کے لیے تو کسی متکلم کی حاجت باقی رہتی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ انسانی تمدن کا کھوج، ہم بن مانسوں اور بندروں کے جبلی میلانات اور وحشیوں کی شہوات میں تلاش کریں اور ملائکہ کی وساطت سے نازل ہونے والی وحی سے غفلت کی آنکھ بند کر لیں۔

اُصول سے قطع نظر تفصیل میں دیکھئے تو مذہب سے ہٹ کر تمدن کی اساس سوائے نسل یا وطن کے اور کہیں متعین نہیں کی جا سکتی۔ آج رُوئے زمین پر تمام نسلی ریاستیں مٹ چکی ہیں اور جو ایک نسلی ریاست فنا نہیں ہوئی، اس کی نسل کی بنیاد دین نے محفوظ کر رکھی ہے۔ اگرچہ اس دین کو مسخ کر دیا گیا ہے۔ وطنی ریاستوں کی تاریخ شاہد ہے کہ اوطان کی حفاظت کے لیے اقوام کو وطن پرستی کی عصبیتیں ترک کر کے بین الاقوامی جتھوں کی تلاش ہے۔ یہ بین الاقوامی ٹولیاں جب ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے مفاخرے کی زبان کھولتی ہیں تو اپنی وطن پرستی کو گناہ کی طرح چھپا کر اس پر انسان دوستی کا ملمع چڑھاتی ہیں۔ اس انسان دوستی کے پیچھے انسان کا تصور تلاش کیا جائے، تو پھر

الہامی کتابوں سے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں، حتیٰ کہ مسٹر خروشچیف نے بھی ایک حالیہ تقریر میں انجیل کے حوالے پیش کئے کہ یہ سرمایہ دارانہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے فقر کی نسبت قارون کی زرپرستی سے مشابہ ہیں۔

موضوع یہ تھا کہ انسانی کمالات کا جوہر پیغمبرانہ تعلیمات کے دائرے کے اندر محدود ہو کر ہی کھلتا ہے چاہے جوہر دکھانے والے زبان سے اُن تعلیمات کا جزوی انکار ہی کیوں نہ کر رہے ہوں۔ رسالت کا یہ مفہوم تعین کرنے کے بعد ہمارے لئے آسان ہو گیا ہے کہ ہم عہدِ حاضر کے انسان کی مشکلات کا حل پیغمبرِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے نسبت قائم کرنے میں تلاش کریں۔

پیغمبروں کے مابین تفریق نہیں لیکن فضیلت ہے

انسان کے عہدِ طفولیت میں مختلف انسانی معاشروں کو اسی طرح قدم قدم پر فطرت کے سہارے اور امداد کی ضرورت تھی جس طرح ایک طفلِ شیرخوار ماں اور انا کا محتاج ہوتا ہے، جب گھٹنوں کے بل چلنے والا بچہ قدم قدم چلنے لگا اور پھر رفتہ رفتہ بلوغت کی عمر کو پہنچ گیا تو آج سے ساڑھے تیرہ سو سال قبل وہ وقت بھی آ گیا، جب کائنات کی ترقی اُمتوں کے بجائے ایک اُمت اور اجتماعی کوششوں کے ساتھ انفرادی فضیلتوں کے سپرد کر دی جائے۔ یہی وہ مرحلہ تھا جہاں دوسری ملتوں پر بنی اسرائیل کے یہودا (JAHOVA) کی فضیلت کے بجائے اللہ کی توحید نے تمام باطل معبودوں کو اس طرح ملیامیٹ کر دیا کہ اب روئے زمین پر الفاظ تو شاید مختلف باقی ہوں، لیکن خدا کے اقرار سے کسی کو مفر نہیں۔ تمام قدیم شریعتیں منسوخ کر کے ایک شریعت نے دین کی تکمیل کر دی:

"اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ

اور

وَتَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ ۚ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ؕ

میں قرآن کریم نے اس جانب واضح اشارے فرمائے ہیں۔

حیات بعد ممات کے مختلف اور اُلجھے ہوئے تصورات کے بجائے معاد اور آخرت کا ایک ایسا تصور سامنے آ گیا جس نے زندگی اور موت کو ایک ہی تسلسل کی لڑی میں پرو دیا۔

اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ لَھِیَ الْحَیَوَانُ اور خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ سے واضح ہے اور اس میں اس حقیقت کو نہایت ہی دل نشیں پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ پس یوں اُخروی فضیلتیں دنیاوی برکتوں کے حصول کا وسیلہ بن گئیں۔ تب بنی نوعِ انسان کو پہلی مرتبہ " یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ " کے خطاب سے نوازا گیا اور " اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ " کی نعمت تمام کر کے ربّ العٰلمین کی جانب سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کل کائنات کی رہنمائی کا منصب عطا ہوا۔

قُلْ یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا ؕ

ترجمہ: تمام نوعِ انسانی کو کہہ دو کہ میں سب کی طرف رسول ہوں۔

وَمَاۤ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ؕ

ترجمہ: اور آپ کو ہم نے تمام انسانوں کے لئے بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا۔

یَوْمَ نَبْعَثُ فِیْ کُلِّ اُمَّۃٍ شَہِیْدًا عَلَیْہِمْ مِّنْ اَنْفُسِہِمْ وَجِئْنَا بِکَ شَہِیْدًا عَلٰی ھٰٓؤُلَآءِ ط
وَنَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ وَّھُدًی وَّرَحْمَۃً وَّبُشْرٰی لِلْمُسْلِمِیْنَ ط

ترجمہ: جس دن ہم ہر اُمّت میں سے ان کے اندر ہی سے گواہ کھڑے کریں گے اور تمھیں اے رسول ان تمام اقوام و امم اور ان کے شاہدین پر گواہ کھڑا کریں گے، اس لیے کہ ہم نے تم پر وہ کتاب اُتاری ہے جو ہر چیز کو کھول کر بیان کرنے والی ہے اور ان پر جو اس کتاب (احکامِ الٰہی) کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں ان کے لئے ہدایت، رحمت اور خوش خبری ہے۔"

پہلی مرتبہ حکومت کا ایک ایسا نظریہ پیش ہوا جس میں ابیض و اسود اور احمر و اصفر سب کے لیے اہل الرائے کا منصب حاصل کرنے کا معیار تقوٰی طے پا گیا۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ہ اور خطبۂ حجۃ الوداع میں مزید وضاحت فرماتے ہوئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرما دیا:

یا ایھا الناس الا ان ربکم واحد وان اباکم واحد الا لا فضل لعربی علی العجمی ولا لعجمی علی العربی ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی احمر الا بدین والتقوٰی ؎

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم! ‌ ‌ ‌ چمن زادیم و از یک شاخساریم!
تمیزِ رنگ و بُو برما حرام است ‌ ‌ ‌ کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم!

وحی کی راہ آئندہ کے لئے مسدود کر کے علم اور تحقیق کی ایسی شاہراہیں کھول دی گئیں جن پر چل کر ظاہر اور غیب، موجود اور مقصود، حاضر اور آخرت کے سنگم کو پُل صراط کی طرح عبور کرنا ہر طالب کے لیے طریقۂ سلوک کی مانند ممکن ہو گیا۔

پیغمبر کی سُنّت سے اجماعِ اُمّت کا رشتہ

عقل اور ماورائے عقل کے مابین جو حجاب حائل تھا وہ معراج والے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث "اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ" سے دُور ہو گیا، لیکن عقل پر ماورائے عقل ۔ تمام راستے کھل جانے کے ساتھ یہ شرط عائد رہی کہ تمام راستے ایک دروازے سے ہو کر گزریں گے جس کا نام توحید ہے۔ علم جو کچھ جاننا چاہے جان سکتا ہے، فن جو کچھ بنانا چاہے اور جو کچھ حاصل کرنا چاہے حاصل کر سکتا ہے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ جان پہچان میں یہ امر محفوظ رہے کہ سب جانچ پڑتال کی اصلیت ایک رَبّ کی محتاج ہے۔ اگر علم نے یکسانیت اور یک جہتی کا اسلوب ترک کر دیا تو ایسا علم متضاد اور منتشر ہو کر باطل ہو جائے گا۔ اگر کسی فرد نے اپنی مختلف معلومات کو ایک توحید پر مرکوز نہ کیا تو اس کی شخصیت کے پُرزے پُرزے ہو کر اس کے اعمال رائیگاں ہو جائیں گے۔ جہاں علم کے لیے تمام راستے کھول کر ان کو توحید کے دروازے سے گزرنا لازمی قرار پایا۔ وہاں اس دروازے کی کلید اقرارِ رسالتِ خاتم النبییّن صلی اللہ علیہ وسلم قرار پائی۔ انسان ضعیف البنیان کو کائنات کے تمام اسرار و رموز سے دوچار ہونے کی اجازت اس شرط پر ملی ہے کہ ظاہر پر غیب کے دریچے کھول دیتے ہوئے پیغمبرؐ کی سنت کا دامن کسی حالت میں ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ اگر اُمّت نے اس سُنّت کا دامن تھام لیا تو پھر اس سُنّت کا اجماع، سُنّتِ سلف صالحین کا منصب حاصل کرے گا اور اگر فرد کے اجتہاد نے اتباعِ سلف صالحین، اجماعِ اُمّت اور سنّتِ رسولؐ کی پیروی میں کامیابی حاصل کر لی تو اس انفرادی اجتہاد کے لیے اہل الرائے

کے اجماع کے مقام سے گزر کر خود اجماعِ اُمّت کا مقام حاصل کر لینے کی راہ بھی کھلی ہے ؎

وہ دانائے سُبل، ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسین وہی طٰہٰ

اور عقیدۂ ختمیت کے صدقے اُمّت کو مقامِ خویش سے یوں آگاہ کر دیا گیا ہے ؎

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد ۔۔۔ بر رسولِ ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفلِ ایّام را ۔۔۔ او رُسل را ختم و ما اقوام را

عالمی مسائل اور پیغمبرِ عالم

آج رُوئے زمین کی انسانی آبادیوں پر نگاہ دوڑائی جائے تو تین بنیادی مسائل نے ہر جگہ انسان کو لاچار، مضمحل، پریشان اور دُکھی بنا رکھا ہے۔

پہلا مسئلہ اخوتِ انسانی کا ہے۔ آج انسان کی ترقی کا راستہ بُتوں، چڑیلوں، بدرُوحوں، درندوں اور بلاؤں نے نہیں روک رکھا۔ بلکہ آج انسان کی ترقی اور حُریت کے راستے میں سب سے بڑی رُکاوٹ وہ پلید انسان ہیں، جنھوں نے ان تمام بدارواح اور خبیث قوتوں کی خصلتیں اپنا لینے کی قسم کھا رکھی ہے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ انسان کا سہارا انسان بنتا، انسان کی رہنمائی انسان کرتا، انسان کا ہاتھ انسان بٹاتا اور انسان کی مشکلات کو انسان حل کرتا۔ لیکن آج انسان کو سب سے بڑی فکر ہے تو انسان پر ایٹم بم، ہائیڈروجن بم، زہریلی گیس اور زہریلے جراثیم برسانے کی۔ اگر انسان قمر و مریخ کا عزم کرتا ہے تو افلاک سے رحمتیں حاصل کرنے کے لیے نہیں بلکہ بنی نوعِ انسان پر جنگ کے مکروہ دیوتا کے ساتھ سازش کر کے ہلاکت و مصیبت اور آگ برسانے کی خاطر۔ یہ صورتِ حال ان منافقین کی مساعی سے کبھی اصلاح پذیر نہیں ہوگی، جو جمعیت اقوام بناتے ہیں تو کمزور کا گھر لوٹ لیتے ہیں طاقتور کی خونخواری کی تسکین کی غرض سے اور تو یُو۔ این۔ او (U.N.O.) بناتے ہیں تو کشمیر اور فلسطین کی قسمت سے کھیلنے کے واسطے، جو جنیوا میں اکٹھے ہوتے ہیں تو مشرقِ وسطیٰ کی بندر بانٹ کی نیت سے اور جو دول کبیر کی مجلس کا اہتمام کرتے ہیں تو مِلل صغیر کو اپنا نخچیر بنائے رکھنے کی خاطر ؎

درجنیوا چیست غیر از مکر و فن
صیدِ تو ایں میش و آں نخچیرِ من!

اور

خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے ۔۔۔ کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اسی سے ۔۔۔ اور قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اسی سے

انسانی اخوّت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک تمام انسانوں کے مابین کوئی بنیادی قدرِ مشترک دریافت نہ کر لی جائے انسانی معاشرہ کے مابین کوئی بنیادی قدرِ مشترک اس وقت تک دریافت نہیں ہو سکتی جب تک انسان ایک پیدا کرنے والے ایک پالنے والے اور ایک جان قبض

کرنے والے کی توحید پر متفق نہیں ہو جاتے۔ نظریاتی توحید اس وقت تک قانون اور شریعت کی توحید پر منتج نہیں ہو سکتی جب تک کہ توحید کا سبق آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے حاصل نہ کر لیا جائے ؎

دل بہ محبوبِ حجازی بستہ ایم
زیں جہت با یک دگر پیوستہ ایم

اخوتِ انسانی کے بعد آج انسانیت کو جو دوسری حاجت لاحق ہے، وہ جابرانہ اور مستبدانہ حکومت کی اصلاح ہے۔ انسانوں نے اپنی اپنی کمائی حسبِ توفیق ٹیکس ادا کر کے حکومت کا خزانہ اس لئے بنایا تھا کہ محتاجوں کی حاجت روائی ہو سکے اور اجتماعی ضروریات کی کفالت مشترکہ جدوجہد سے ہو جائے۔ انسان نے اپنی حریت سے چند جگر کی بوٹیاں نوچ کر حکومت کو اس لیے اقتدار سونپا تھا کہ فرد کے ناموس اور وقار کا قرار واقعی تحفظ ہو سکے۔ لیکن آج امریکہ ہو یا روس، جاپان ہو یا چین حکومتیں انسان کے سر پر سندباد جہازی کے پیر تسمہ پا کی مانند اس طرح مسلط ہوئی ہیں کہ غریب کو دوڑا دوڑا کر ہلکان کر دیا ہے۔ خود گردوں اقتدار سے پی پی کر مست ہو جاتے ہیں۔ غریب سندباد کو لقمۂ حلال بھی حلق سے اتارنے کی مہلت نہیں ملتی۔ اس مرض کا تدارک بھی کسی ایک پیرِ اقتدار کی گدی پر کسی دوسرے پیرِ اقتدار کو بٹھا کر ممکن نہیں بلکہ اس کا ایک ہی اصولی حل ہے کہ اقتدار کے بتوں کو ان کے سنگھاسن سے اتار کر چکنا چور کر دیا جائے۔ انسان پر کسی انسان کو اپنی رائے سے حکم چلانے کا حق نہیں۔ حکومت صرف اللہ ہی کی ہے۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ ؎

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی، باقی بتانِ آذری

اللہ کے اختیارات کی تعمیل آخری رسولؐ کو سونپی گئی تھی۔ اب انسان کے لئے سوائے رسولؐ کا نائب بن کر کچہری یا دربار میں احکام جاری کرنے کی کوئی وجہ جواز نہیں ؎

خلافت بر مقامِ ما گواہی است | حرام است آنکہ بر ما پادشاہی است
ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ | خلافت حفظِ ناموسِ الٰہی است

انسانیت کا تیسرا اہم مسئلہ آج کل یہ ہے کہ حریتِ فکر کی تحریک اس لئے چلائی گئی تھی تاکہ انسانوں کو چھوٹے آقاؤں اور ظالم فرماں رواؤں کی اطاعت سے نجات ملے۔ ہر انسان کو حق حاصل ہے کہ جو چاہے اور جس طرح سے چاہے سوچے، یقین کرے اور عمل کرے۔ لیکن مصیبت یہ لاحق ہو گئی ہے کہ پابندیٔ افکار سے نجات دلانے کے لئے حریتِ افکار کا جو داعی اٹھتا ہے۔ نمرود، شداد، ہامان و فرعون بن کر بنی نوع انسان پر اپنے ذاتی، طبقاتی، نسلی اور خیالی اوہام و تعصبات مسلط کرنے کے درپے ہو جاتا ہے ؎

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

جب لینن اور سٹالن کروڑوں انسانوں کو فنا کے گھاٹ اتار چکے، جب انقلاب کے نامور ترین علمبردار عمریں تعذیب، تعزیر اور زنداں و سلاسل میں گزار چکے تو اب کمیونسٹ لیڈروں پر یہ راز کھلا کہ مارکس کی تعلیمات کا نفاذ متشددانہ انقلاب اور قتل و غارت کے بغیر جمہوری طریقوں

سے بھی ہو سکتا ہے۔ امریکی سفاک جب ریڈ انڈین (RED INDIANS) کی نسلوں کا صفایا کر چکے اور حبشی غلاموں کی کثیر آبادی کو زیردست بنا چکے تو انھیں غلاموں کو آزاد کرانے، نو آبادیات کو ڈومینین سٹیٹس (DOMINION STATUS) دلانے اور حریت وجمہوریت کے متعلق وعظ کرنے میں بڑی راحت محسوس ہوتی ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ یہ حریت فلسطین میں امریکہ کے متبنّیٰ (اسرائیل) کو ضرر نہ پہنچائے اور الجزائر میں غلاموں کو جب آزادی عطا کی جائے تو وہ رضامندانہ طور پر اپنے آقاؤں کا طوق اپنے گلے میں ڈالنے پر آمادہ رہیں ورنہ جمہوریت کا غلط استعمال کرنے والوں کے علاج کے لئے کنٹرولڈ اور گائیڈڈ ڈیماکریسی (CONTROLLED AND GUIDED DEMOCRACY) کا پورا "عطار خانہ" موجود ہے ؎

تہذیب کا کمال شرافت کا ہے زوال — غارتگری جہاں میں ہے اقوام کی معاش
ہر گرگ کو ہے برّۂ معصوم کی تلاش

تحریک حریت فکر کی اس بے راہ روی کا علاج فقط یہ ہے کہ انسان پر کسی دوسرے انسان کے افکار کی پیروی کی پابندی نہیں۔ البتہ تمام اُمتی انسانِ کامل صلی اللہ علیہ وسلم کے افکار کے مطیع رہنے کے پابند ہیں۔ کیونکہ اس کے بغیر دوسرے انسانوں کی حریتِ فکر قائم نہیں رہ سکتی

ع دل بحق بر بند و راہِ مصطفےٰ رو!

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ط (انفال-ع)

ترجمہ: اے پیروانِ دعوت ایمانی! اللہ اور اس کے رسولؐ کی پکار کا جواب دو جب وہ پکارتا ہے۔ تاکہ تمہیں موت کی حالت سے نکال کر زندہ کر دے ؎

محمدؐ کی غلامی ہے سند آزاد ہونے کی — خدا کے دامنِ توحید میں آباد ہونے کی

انسانیت کی نجات رحمۃ للعٰلمین کی پیروی میں ہے

مجمل طور پر ہم دیکھ چکے ہیں کہ انسان کے علم کا آغاز ایسے حالات و کوائف کے ماتحت ہوتا ہے جن کی تحقیق و تفتیش وہ ایک حد سے آگے نہیں کر سکتا۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ انسان کا علم ایک ایسی حد پر ختم ہو جاتا ہے جس سے آگے کے مسائل فقط انسانی جستجو سے حل نہیں ہو سکتے۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ آغاز و انتہاء کی ان دو لاعلمیوں کے مابین انسانی علم کی جو مختصر سی زندگی ہے اس کے دوران میں بھی علم کی بقا انسانی معاشرے کی بقا کی محتاج ہے۔ جب علم سے علم ٹکرا جاتا ہے، جب پیچیدہ معاشرتی مسائل کا حل معلومات سے فراہم نہیں ہوتا تو اس وقت انسان کو کائنات کی اس فطری ہدایت کی جانب سے راہنمائی کی حاجت ہوتی ہے جس کا پیغام صرف نبی بتا سکتے ہیں۔ جہاں علم کی حد ختم ہوتی ہے وہاں سے نبوت کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ لیکن ابتدائے آفرینش سے علم کی سرحد آگے ہی آگے بڑھتی چلی گئی حتیٰ کہ خلائق کائنات کو ایک حد تک پہنچ کر نبوت کی مرحلہ ختم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی کیونکہ محمد کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی ذاتِ اقدس میں کائنات کے لئے ایک ایسا اُسوۂ کاملہ وجود میں آ گیا جس کی کامل رہنمائی سے زندگی کے تمام مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر لحاظ سے رضائے الٰہی کے حصول کا مکمل نمونہ پیش کیا۔ بحیثیت ایک جج بحیثیت ایک کمانڈر ان چیف، بحیثیت ایک معلمِ اخلاق، بحیثیت ایک مصلحِ معاشرہ، بحیثیت ایک قانون ساز، بحیثیت ایک ماہرِ معاشیات و اقتصادیات،

غرضیکہ انسانی زندگی کے ہر پہلو سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قائدانہ صلاحیتیں اس مقام پر ہیں کہ انسانیت اپنی تکمیل کے لیے ہر وقت انھیں ذروۂ کمال پر دیکھے گی۔ بلکہ مقامِ نبوت کی وسعتیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے انسانی ترقی کے لیے دامن کھلا رکھیں گی ؎

هر کجا بینی جهانِ رنگ و بو　　آنکه از خاکش بروید آرزو!
یا ز نورِ مصطفےٰ اُو را بہاست　　یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفےٰ است
خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست　　رحمۃ للعٰلمینی انتہاست

آج امکانی لحاظ سے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت پر علم کے تمام دروازے اس طرح سے کھلے ہیں کہ انبیائے بنی اسرائیل جن مسائل کو وحی سے حل کرنے کے محتاج تھے وہ آج علمائے اُمتِ محمدیؐ اتباعِ سُنتِ محمدی کے ذریعے حل کر سکتے ہیں لیکن حصولِ کمالات و ترقی مقامات کے ان لامحدود امکانات میں اپنی ہستی گم نہ کر بیٹھنے اور ہدایت کے بجائے گمراہی سے بچنے کے لیے یہ لازمی ہے کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو زندگی کے ہر شعبے میں ہر پہلو سے آخری حجت تسلیم کیا جائے۔ ایسا نہ کیا گیا تو خود علم علم سے ٹکرا جائے گا۔ ایک معاشرتی طبقے سے دوسرے معاشرتی طبقے کا فساد ہو جائے گا۔ اہلِ عالم اخوت و مساواتِ محمدی سے بہرہ مند ہونے کے بجائے اس قسم کی ہلاکت آفرین جنگوں، اقتصادی رقابتوں اور معاشرتی تسفل میں گرفتار ہو جائیں گی۔ جن کا مشاہدہ ہم دو عالمگیر جنگوں کے زمانے میں خود اپنی آنکھوں سے کر چکے ہیں اور تیسری عالمگیر جنگ کی تیاریاں ہر لحظہ ہمیں یاد دلاتی ہیں کہ رحمۃ للعالمین کی غلامی سے انکار کرنے والی قومیں اسی طرح ایک دوسرے کو چیر پھاڑ کر کھا جائیں گی جس طرح بچھو کے بچے خود ماں کے پیٹ کو نوچ کر پیدا ہوتے ہیں اور ان کی اولاد خود ان کے لئے فرشتۂ اجل کا حکم رکھتی ہے۔

یہی احساس تھا جس نے حضرت سید جمال الدین افغانی علیہ الرحمۃ کو اتحادِ عالمِ اسلامی کی مساعی میں عمر صرف کر دینے پر مجبور کیا۔ یہی وہ احساس تھا جس کے ماتحت برصغیر کے مسلمانوں نے تحریکِ خلافت، تحریکِ ہجرت، تحریکِ شہید گنج اور بالآخر تحریکِ پاکستان میں ہر قسم کی قربانیاں دیں، یہی وہ احساس تھا جس نے بالآخر مجسّم ہو کر آج سے تئیس[۲۳] سال قبل دُنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کی بنیاد ڈالی۔

سرورِ کونین رحمۃ للعالمین اور عالمِ غیب و شہود کے لئے یکساں پیغمبری کا پیغام لانے والے نبی کے اس مختصر تذکرے میں نامناسب نہ ہو گا۔ اگر میں اختتام علمی مسائل کے تذکرے کے بعد ان کے عملی پہلوؤں کی مقتضیات پر کروں۔ قیامِ پاکستان کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہ تھی کہ مسلمان بجز خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے اپنی ذاتی اور اجتماعی زندگی، اپنی قومیت اور اپنی سیاست، اپنے وطن اور ترقی کے لیے کسی اور معیار کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے، آج تک پاکستان میں جو خلل پیدا ہوا اس کی کوئی بنیادی وجہ سوائے اس کے نہ تھی کہ ہم نے اپنے ہر مسئلے میں ہر پہلو سے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں کچھ کوتاہی کی۔ پاکستان میں کوئی موجودہ خلل اس وقت تک دُور نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہم اس کو دُور کرنے کے لئے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی جانب رجوع نہیں کرتے۔ آئندہ بھی پاکستان کو سوائے اس کے کسی خلل کا اندیشہ نہیں ہو سکتا کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں خدانخواستہ کسی کوتاہی کے مرتکب ہوں۔

ایک وقت تھا جب دُنیا میں اسلامی مبلّغین کے لیے سب سے اہم مسئلہ توحید کی تبلیغ تھی۔ ایک وقت تھا جب نظریۂ توحید اقطاعِ عالم میں تعلیم کر لیا گیا۔ تب مسلمانوں نے توحید کی تبلیغ کے لئے مبلّغین پیدا کرنے کے بجائے ان اولیاء اللہ اور عارفین کی تربیت کی حاجت زیادہ محسوس کی جو تالیفِ قلوب کے ذریعے مجوس و ہنود کے موحدین کو اسلامی تربیت کے زیور سے آراستہ کرتے رہے۔ پھر ایک ایسا دور بھی تھا جب توحید

کا تبلیغ یا شریعت کے نفاذ کے مقابلہ میں مسلمانوں کو جہاد بالسیف، کشورکشائی اور جدال و قتال کی جانب زیادہ توجہ دینی پڑی۔ ایک دور وہ بھی تھا جب مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی لیکن شعائر و عبادات اسلامی کی پابندی میں کوتاہی کی جاتی تھی۔ لہٰذا معلمین اسلام کو عقائد و اعمال کی نسبت عبادات پر زیادہ زور دینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ آج انسانیت اس مرحلے پر پہنچ چکی ہے کہ اسلامی تعلیمات کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس کا کوئی متمدن معاشرہ اصولی انکار کر سکے۔ آج عالمگیر غلبۂ اسلام اور تسخیرِ کائنات میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ آخری نبی کی تعلیمات کو توڑ مروڑ کر یا مسخ کر کے بعض متنبیین (کذابین) اُمتِ محمدیہ کے قلب سے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو زائل نہ بھی کر سکیں تو تضعیف یا محجوب کرنا چاہتے ہیں۔

ختمِ نبوّت

اس لیے چودھویں صدی میں تمام عالمِ اسلام کے اندر ہر محبِ اسلام کا یہ فرض ہے کہ ختم نبوت کے مسئلہ کو تمام دوسرے مسائل پر ترجیح دے اگر ہم ناموسِ ختمِ نبوت کو محفوظ رکھنے کے ذریعے اپنی بقا کا اہتمام کر لیتے ہیں تو توحید، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، قرآن شریف، شریعت کسی اصول دین کو ضعف نہیں پہنچ سکتا، لیکن خدانخواستہ مستشرقین یا منافقین اس تعریف کو ہماری لوحِ قلب سے ذرا بھی اوجھل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ اسلام محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام پر جو کچھ نازل ہوا اس کی غیر مشروط اتباع کا نام ہے تو پھر نہ ہمیں ناموسِ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ہمارا ایمان برقرار رکھنے میں مدد دے سکتا ہے۔ نہ ولائے اہلِ بیت ہماری نجات کے لیے کافی ہو سکتی ہے، نہ ہی قرآن کے اوراق میں ہمارے لئے ہدایت باقی رہ جاتی ہے، نہ ہی مساجد کے محراب و منبر میں کوئی تقدیس باقی رہ جاتی ہے اور نہ ہی اولیاء اللہ اور مشائخ عظام کی نسبتیں جاری رہ جاتی ہیں، نہ ہی علمائے کرام کی تدریس و وعظ میں اثر باقی رہ جاتا ہے، نہیں نہیں صرف یہی نہیں خاکم بدہن اُمتِ محمدیہ کے تسمیہ اور وجود دونوں پر زد پڑتی ہے اُمتِ محمدیہ ملل میں تقسیم ہو جاتی ہے، ملتیں حکومتوں میں بٹ جاتی ہیں اور حکومتیں گروہوں کی سازشوں کا شکار ہو جاتی ہیں، فقط اتنا ہی نہیں خاندان ملت سے خارج ہو جاتے ہیں، خود خاندان کے اندر صلہ رحمی قطع رحمی سے مبدل ہو جاتی ہے۔ اس لئے اگر خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم ایک نہیں تو پھر شریعت ایک نہیں، جب شریعت ایک نہیں تو حرام و حلال بھی ایک نہیں، جب حرام و حلال میں یکسانیت نہیں تو باپ بیٹے، ماں بہن، خاوند اور بیوی غرض دُنیا کے سب رشتے اپنی تقدیس سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ختمِ نبوت کا انکار آسمان پر فرشتوں کا انکار ہے، زمین پر قبلہ اور حج کا انکار ہے، سیاست میں مسلمانوں کے غلبے اور خدا کا نہ وجود کا انکار ہے۔ غرض ختمِ نبوت سے انکار خود مسلمان کے مسلمان ہونے سے انکار ہے، یہاں پہنچ کر زبان گنگ ہو جاتی ہے، قلم ٹوٹ جاتا ہے اور الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو جاتا ہے ؎

ہے یہ وہ نام خاک کو پاک کرے نکھار کر — ہے یہ وہ نام خار کو پھول کرے سنوار کر
ہے یہ وہ نام ارض کو کر دے سما اُبھار کر — اکبرؔ اسی کا ورد تو صدق سے بےشمار کر

صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ

سیرتِ نبویؐ کی روشنی میں سچی باتیں

مولانا عبدالماجد دریابادی

بابرکت نکاح حدیث نبویؐ کی معتبر کتاب مشکوٰۃ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی یہ روایت محدث بیہقی کی شعب الایمان کے حوالے سے نقل ہوئی ہے:

قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اعظم النکاح برکۃ السیرہ مؤنۃً۔ (کتاب النکاح باب اوّل فصل ۳)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے زیادہ برکت والا نکاح وُہ ہے جو محنت کے لحاظ سے آسان ترین ہو۔

سُن لیا آپ نے کہ سرور دوسرا کا ارشاد کیا ہو رہا ہے؟ نکاح بہترین وُہ نہیں جو خوب دُھوم دھام سے کیا جائے، جس میں دل کے حوصلے جی بھر کر نکالے جائیں، جس میں روشنی ہو، آتش بازی ہو۔ نام و نمود کی نمایش مسرفانہ غیر اسلامی رسموں پر ہزاروں لاکھوں لٹا دیے جائیں۔ ناچ رنگ کی محفلیں جمیں یا کم سے کم فلمی یا غیر فلمی، نیم فحش و عریاں گانوں کے ریکارڈوں سے آسمان سر پہ اٹھا لیا جائے؟ بہترین تقریب عقد وُہ ہے جو بالکل سادہ طریقہ سے انجام دی جائے۔ بغیر مشقت میں ڈالنے والے جھمیلوں اور مسرفانہ و مشرکانہ رسوم کی منزلوں سے گزرنے کے اس ایک چھوٹی سی اور آسان حدیث پر اُمت کا اگر آج عمل ہو جائے تو اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی کتنی عصبیتوں اور زحمتوں سے نجات ہو جائے۔ محفل آرائی کے لیے سامان دوسروں کے ہاں سے مانگ کر لانے کی ذلت، قرضہ داری کا چکر، تقریب کے دنوں میں شدید جسمانی محنت اور تکان۔ آپس کی رنجشیں اور بدمزگیاں۔ غرض دنیا اور آخرت کے کتنے ہی مخمصے اور مواخذے بس ایک دم سے ختم ہو جائیں! کیا زمانہ کا انقلاب ہے۔ شرافت اور بڑائی کا معیار اب اُمت کا حدیثِ رسول پر عمل کرنا نہیں بلکہ ٹھیک اس کے برعکس طرزِ عمل اختیار کر لینا عین اُس کی مخالفت کرنا ہی اپنے لیے ٹھہرا لیا ہے۔

دورِ جاہلیت کی واپسی سیرت رسولؐ میں سیرت ابن ہشام ایک قدیم و مستند ماخذ ہے۔ غزوۂ احد کے مشہور معرکہ کے سلسلہ میں اس کا بیان ہے کہ:

"جب قریش اپنے حلیفوں اور مددگاروں کے ساتھ چلے تو ان کے ہمراہ عورتیں بھی سوار ہو کر چلیں تاکہ ان کے جوش کو بڑھاتی رہیں اور بھاگ نکلنے سے انہیں روکے رہیں۔"

پھر جب صفیں مقابل ہوئیں تو ان کی سردارنی ہند بنت عتبہ اپنی زنانی ٹولی کے ساتھ کھڑی ہو گئی اور ہاتھوں میں ڈفلیاں لے لے کر ان سب نے مردوں کے پیچھے بجانا اور انھیں جوش دلانا شروع کیا اور ہند یہ ترانہ گاتی جاتی تھی،

"اے قبیلہ عبدالدار کے فرزندو! آگے بڑھو، ہمارے عقب کے محافظو! آگے بڑھو۔ تیز نیزوں کے خوب وار کرو۔"

اور یہ گیت بھی گایا:

"اگر آگے بڑھو گے تو ہماری ہم آغوشی نصیب ہوگی اور ہم تمہارے لیے نرم قالینوں کا بستر بنا کر دیں گے۔ اگر تم پیچھے ہٹے تو ہم تم سے جُدا ہو جائیں گے اور جدائی بھی ایسی جس میں محبت کا کوئی شائبہ نہ ہوگا۔"

دوسری مستند تاریخ عہدِ نبوت طبقات الکبیر ابن سعد میں اسی موقع پر ہے کہ:

"مشرک عورتوں نے ڈھول تاشے اور ڈفلے بجانے شروع کیے۔ وہ انھیں ابھار رہی تھیں اور انھیں بدر کے مقتولین کی یاد دلا رہی تھیں اور یہ گاتی جاتی تھیں۔"

آگے وہی شعر اوپر والے نقل ہیں ——— کتنی آزاد، کتنی روشن خیال اور کیسی جوانمرد تھیں یہ قریش کی خاتونیں! نہ علانیہ گانے بجانے میں انھیں عار!! نہ فوجیوں کے دوش بدوش، صف بصف رجز پڑھنے میں انھیں کوئی تکلف یا جھجک!!! بیسویں صدی عیسوی کے نقشِ ثانی کا نقشِ اوّل ساڑھے تیرہ سو سال قبل! ——— لیکن اس پر حیرت کیوں کیجئے، مرد وزن میں آزادانہ میل جول، بے محابا اختلاط۔ کہنا چاہیے کہ نئی ہوں یا پرانی، ساری ہی جاہلی تہذیبوں میں جزو مشترک رہا ہے۔ یہ تو اسلام ہی کی کرامت تھی کہ اس نے دونوں جنسوں کی مادی، ذہنی، اخلاقی ساخت و ترکیب کے عین مطابق پابندیاں عاید کیں اور قیدیں لگائیں ——— جاہلیت کے قدر دانوں اور پرستاروں کو مبارک ہو کہ ان کی تہذیب نے پھر نیا جنم لینا شروع کر دیا ہے۔ ؏

ہاں خدایانِ کہن وقت است وقت

نیت عمل کا فرق

جنگِ اُحد شدید ترین جنگوں میں سے تھی۔ ابن ہشام میں ابن اسحاق کی روایت ہے کہ:

"لوگ خوب خوب لڑے اور جنگ نے شدت اختیار کر لی۔"

دونوں فریق پوری دادِ شجاعت دے رہے تھے۔ اسی زمانے میں مسلمانوں کے لشکر میں ایک اجنبی شخص آملا تھا۔ اس کا نام قزمان تھا۔ حضور کے سامنے جب اس کا ذکر آتا تو آپ فرماتے کہ وہ اہلِ جہنم میں سے ہے لیکن

"جب احد کا معرکہ ہوا، تو یہ شخص بڑی شجاعت سے لڑا، یہاں تک کہ اس نے اکیلے ہی سات آٹھ مشرکوں کو قتل کر دیا۔" (ابنِ ہشام)

قدرتاً سب نے اس کے جوشِ غزا کی داد دی اور جب وہ آخر زخمی ہو کر گرا اور موت کے قریب پہنچا تو مسلمان اس کے گرد جمع ہو کر اسے جنت کی بشارت دینے لگے، تو وہ بدنصیب بولا کہ

"بشارت کیسی؟ میں تو محض اپنی قوم کی عصبیت میں لڑا ہوں۔ اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا تو میں ہرگز نہ جنگ کرتا۔"

زخموں کی تکلیف بڑھی، تو اس نے اپنے ترکش سے ایک تیر نکال کر اس سے خودکشی کر لی اور رسولؐ کا کشفی نظارہ ایک حقیقت بن کر رہا۔

اسی جنگ کا ایک اور منظر۔ بنی عبدالاشہل کے لوگ مسلمان ہو چکے تھے۔ لیکن اصیرم نامی ایک شخص اسی قبیلہ کے تھے، جنھوں نے اپنے ہم قوموں کے باوجود اسلام لانے سے انکار کر دیا تھا لیکن عین معرکۂ اُحد کے دن یہ اسلام لے آئے۔ پھر تلوار لے معرکہ میں گھس پڑے۔ یہاں تک کہ زخموں سے چور ہو کر گر پڑے۔

قبیلہ کے لوگ اپنے مقتولوں کو ڈھونڈتے ہُوئے آئے تو ان کو بھی ڈھیر میں پڑا ہوا پایا اور ابھی جان باقی تھی۔ حیرت سے ان لوگوں نے پوچھا کہ تم یہاں کیسے پہنچے؟ اپنی قوم کی حمیت میں یا اسلام کی کشش میں؟ بولے: اسلام ہی کی کشش سے! توحید و رسالت کی تصدیق کی اور معاً روح پرواز کر گئی۔

رسولؐ کے گوشِ مبارک تک خبر پہنچی تو ارشاد ہوا کہ "وہ جنتی ہے"۔

دیکھئے صورتِ عمل دونوں مثالوں میں بالکل ایک تھی، یعنی کمال شجاعت و جانبازی۔ لیکن نیتِ عمل کے فرق نے ایک کو جہنم پہنچایا اور ایک کو جنت! ایک کے پیشِ نظر محض قوم و وطن کی محبت رہی اور دوسرے کا مقصود رضائے الٰہی۔

مثالی ایفائے عہد سیرۃ نبویؐ کے معمولی طالب علم بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفرِ حدیبیہ کے واقعہ سے ضرور واقف ہوں گے آنحضورؐ کی جو مصالحانہ روش شروع سے رہی، اس میں کیسے کیسے پیچیدہ مرحلوں اور منزلوں سے گزرنے کے باوجود آخر تک بھی فرق نہ آنے پایا۔ قریش کی اشتعال انگیزیوں کی حد ہی نہ تھی۔ قدم قدم پر وہ روبہ رکھا کہ سالارِ اسلام کو غصہ آ کر رہے۔ تفصیل بیان ہو تو ایک مستقل مقالہ بن جائے۔ نظر میں صرف آخری مرحلہ کو لایئے ——— عین جس وقت صلح نامہ کی تحریر ہو رہی تھی، مسلمانوں کے جذبات کے خلاف، محض رسولؐ کے حکم سے یہ لکھا جا رہا تھا کہ مسلمان اس وقت واپس جائیں اور آیندہ دس سال تک ایک دوسرے سے رُکے رہیں۔ اس درمیان میں قریش کا کوئی شخص اگر اُدھر آ جائے گا تو اسے واپس کر دیا جائے گا اور اگر اِدھر کا کوئی شخص قریش کے پاس پہنچ جائے تو وہ اسے واپس نہ کریں گے ——— تو عین اس وقت ایک نومسلم ابوجندل زنجیروں سے بندھے ہُوئے رسولؐ کی خدمت میں آئے، اور مسلمانوں کے جذبات میں اس وقت جو شدید تلاطم تھا ظاہر ہی ہے۔ مورخ ابن ہشام کے الفاظ ہیں قریب تھا کہ مسلمان رنج و افسردگی سے ہلاکت کو پہنچ جائیں۔

اس وقت نومسلم پناہ طلب کرنے والے کا مشرک باپ سہیل بن عمرو بھی موجود تھا۔ اس نے سب کے سامنے لڑکے کے منہ پر طمانچہ مار کر رسولِ خدا سے کہا کہ یہ تو ابھی ابھی طے ہو چکا ہے۔ میں ابوجندل کو تمہارے ساتھ نہیں جانے دینے کا۔ آپ نے فرمایا: تو نے سچ کہا۔ اس جواب سے شیر ہو کر سہیل نے ابوجندل کو پیچھے کھینچنا شروع کیا کہ اسے قریش سے ملا دے۔ اب اس پر قدرۃً ابوجندل نے چیخ چیخ کر کہنا شروع کیا کہ اے مسلمانو! کیا میں مشرکین کی طرف واپس کر دیا جاؤں گا؟ کہ وہ مجھے میرے دین کی خاطر جی بھر کر تکلیفیں پہنچائیں؟ راوی کہتا ہے کہ مسلمانوں کا دل غم و غصہ سے لبریز تو پہلے سے تھا۔ اب اس میں اور اضافہ ہُوا۔ لیکن رسول اللہؐ نے ابوجندل ہی کو سمجھایا اور تسکین دی کہ اللہ عنقریب ہم لوگوں کے لیے کشایش کی راہ پیدا کر دے گا لیکن

"اس وقت تو ان لوگوں سے عہد کر چکا ہُوں اور صلح نامہ پر اللہ کو گواہ کر چکا ہُوں اور عہد کے خلاف نہیں کیا جا سکتا۔"

دنیا کی تاریخ کے ورق اُلٹ ڈالیے۔ اتنے شدید صبر آزما موقع پر اس حلم کی، اس ظرف کی، اس ایفائے عہد کی، اللہ پر اس توکل و اعتماد کی نظیر کسی سردارِ فوج، کسی بادشاہ کے ہاں ملے گی ——— صبر و ظرف کے یہ معجزے، کسی بڑے سے بڑے مادی معجزے سے کچھ کم ہیں؟

حبِ دنیا حدیث کی کتابوں میں، اخیر زمانے کے متعلق ایک پیش خبری حضرت ثوبان صحابی کے واسطے سے حضورؐ کی زبان سے ملتی ہے کہ "اُس وقت قومیں مسلمانوں پر اس طرح ٹوٹ پڑیں گی جیسے کھانے کے حریص کھانے کے بڑے سے بڑے برتن پر آگر گرتے ہیں"۔ کسی صحابی نے عرض کیا کہ کیا ہم اس وقت بہت قلیل تعداد میں ہوں گے؟ جواب میں ارشاد ہوا کہ "نہیں، تعداد میں تم کثیر ہو گے لیکن اس جھاگ کی طرح جو سیلاب میں پانی کے اُوپر آجاتی ہے (یعنی اتنے کمزور و بے بساط) اور بڑی بات یہ ہے کہ اللہ تمہارے دشمنوں کے سینوں سے تمہاری ہیبت اور تمہارا رعب نکال دے گا اور خود تمہارے دلوں میں "وھن" ڈال دے گا"۔ پوچھنے والے نے پُوچھا کہ یا رسول اللہ! یہ "وھن" (کمزوری) کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا "دنیا سے محبت اور موت سے کراہت"۔

سُن لیا آپ نے اپنے رسول کریمؐ کی زبانی ملت کے اجتماعی زوال و پستی کا اصل راز؛ چھوٹے بڑے اور بھی اسباب یقیناً بہت ہوں گے، لیکن اصلی اور حقیقی سبب بس یہی ہے۔ دنیوی زندگی کی حرص اور شوق۔ آخرت کے بجائے اس سے گریز و بیزاری۔ حضرات صحابہ میں اور کیا بات تھی؟ جنگی ساز و سامان، آلات حرب، تعداد لشکر وغیرہ کے لحاظ سے تو وہ معاصر سلطنتوں سے کہیں پیچھے تھے بس اسی یقین آخرت میں سب سے آگے تھے۔ آخرت ان کے لیے کوئی دور دراز کا مفروضہ، نظریہ نہیں، ایک زندہ حقیقت تھی اور یہی موت سے بے خوفی ہی تھی جس نے بے جگری کے ساتھ انھیں روم و ایران کے سے زبردست حریفوں سے جا بھڑایا تھا۔ اور اسی نے مصر، عراق، شام، فلسطین، فارس سب کہیں کی دولتیں ان کے قدموں میں لا ڈالی تھیں ———— آج جب ہم عملاً دوسری بے یقین اور آخرت فراموش قوموں کے ہم سطح ہو چکے ہیں، تو تکوینی قانون فطرت ہماری کسی طرح کی مروّت و رعایت کیوں کرنے لگا؟ اب تو ہر معرکہ میں لازماً فتح اس فریق کو نصیب ہو گی جو عقل و تدبیر اور مادی لحاظ سے قوی تر ہو گا۔ اس سارے نظام کو شکست دینے کا اگر داعیہ ہے تو لازمی ہے کہ اسی جذبۂ یقین آخرت اور بے خوفیٔ موت کو از سرِ نو اور پُوری قوت کے ساتھ بیدار کیجئے۔

پابندیٔ عہد سیرت نبویؐ کے سلسلہ میں ایک مشہور واقعہ کا ذکر حلف الفضول کے نام سے آتا ہے۔ بعثت نبویؐ ابھی ہُوئی نہ تھی مگر ہونے ہی کو تھی کہ قریش کے قبیلوں نے مظلوموں کی امداد و فریادرسی کی غرض سے ایک دوسرے کو حلف اٹھانے کے لیے طلب کیا۔ مجمع عبداللہ بن جدعان کے گھر پر ہوا، جو قبیلہ بنی تمیم کے ایک معمر سردار تھے۔ بنی ہاشم، بنی مطلب وغیرہ جمع ہُوئے اور سب نے مل کر قسمیں کھائیں اور معاہدہ کیا کہ مکہ میں وُہ جس مظلوم کو بھی پائیں گے اس کی مدد پر کھڑے ہو جائیں گے خواہ وہ مظلوم مکہ کا رہنے والا ہو یا دُوسرے لوگوں میں سے وہاں آیا ہو اور جس نے ظلم کیا اس کا مقابلہ کریں گے، یہاں تک کہ وہ مظلوم کو اس کا حق پھیر دے۔"

(سیرت ابن ہشام)

محمد بن عبداللہ بھی اس مجمع اور حلف میں شریک تھے اور بعد بعثت رسول اللہؐ نے جو کچھ فرمایا بیان کرنا اسی کو مقصود ہے:

عبداللہ بن جدعان کے گھر حلف کے وقت میں موجود تھا۔ اس کے بدلے میں بہت سے سُرخ اُونٹوں کے ملنے کو بھی پسند نہ کروں گا (یعنی بڑی سے بڑی دولت بھی اس کا معاوضہ نہیں ہو سکتی) اس معاہدہ کی رُو سے کوئی اسلام میں بھی دعوٰی ہو، تو ضرور اس کو قبول کرلُوں گا۔"

ارشاد یہ نہیں ہُوا کہ کافروں، مشرکوں، بے دینوں کے کسی حلف، کسی معاہدہ کا اعتبار ہی کیا۔ زمانۂ جاہلیت کے ساتھ

اس کا وہ معاہدہ بھی گیا۔ ارشاد بجائے اس کے یہ ہو رہا ہے کہ (وہ معاہدہ آج بھی وہی قیمت) وہی اہمیت رکھتا ہے جو زمانۂ جاہلیت میں اس کی تھی، اور میں آج بھی اس کے پورے نفاذ پر تیار ہوں ـــــ اتنا ہی نہیں، بلکہ اسی کتاب میں اس ذکر سے معاً پہلے ارشاد نبویؐ ایک عمومی صورت میں ہر معاہدہ سے متعلق ملتا ہے کہ:

"جاہلیت میں جو کچھ معاہدہ تھا، اسلام نے اس کی قوت و استحکام کو بڑھا ہی دیا ہے۔"

کتنی جچی تلی تعلیم اس کو مل رہی ہے کہ نیکی ہر حال میں قابل قدر اور عہد ہر صورت میں قابل احترام ہے۔ بلا لحاظ اس کے کہ ان کے عامل کن عقیدوں اور کس کیش و مذہب کے ہیں ـــــ مسلمان اگر اس حقیقت کو دل میں اتار لیں تو غیر مسلموں کے ساتھ نیکی، بھلائی، خوش چلنی اور رفاہ عام کے کاموں میں تعاون کی راہ کتنی آسان ہو جاتی ہے۔

مقصود زندگی حدیث نبویؐ میں جو اہم دعائیں آئی ہیں ان میں سے ایک لمبی دعا کا ایک آخری ٹکڑا یہ ہے:

ولا تجعل الدنیا اکبر ھمنا ولا مبلغ علمنا ولا غایۃ رغبتنا۔ (ترمذی و نسائی عن ابن عمرؓ)

اے اللہ! دنیا کو نہ ہمارا مقصود اعظم بنا دینا اور نہ ہمارے معلومات کی انتہا اور نہ ہمارے شوق، خواہش کی منزل مقصود۔

اسے پڑھنے کے بعد سوچیے کہ ہمارا آپ کا عمل کسی درجہ بھی اس کے مطابق و مماثلت ہے؟ جس دن سے بھی ہمارے اولاد ہوتی ہے۔ اس کے لیے ہماری بڑی سے بڑی کوشش اور خواہش کیا رہنے لگتی ہے؟ یہی نہ کہ یہ اونچی سے اونچی ڈگری حاصل کرے۔ اونچے سے اونچے امتحان مقابلہ میں کامیاب ہو اور اونچی سے اونچی ملازمت، فلاں سررشتہ یا پیشے میں حاصل کرے۔ نمبر اول نہ سہی، دوسرے تیسرے درجہ کسی نمبر پر بھی کوئی خیال اس کا آتا ہے کہ آخر زندگی کا مقصد کیا ہے اور تعلیم و تربیت اور ہر قسم کی "ترقی" کی آخری منزل آخر کیا ہونا ہے؟

یہ ہر قسم کے اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں میں اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کو اندھا دھند جھونکتے رہنا اور ترقی اور اونچی تنخواہ کے ہر راستہ پر آنکھ بند کر کے اپنی اولاد کو ڈال دینا کس ذہنیت کی علامت ہے؛ مآل اندیشی اور عافیت بینی کا شائبہ بھی اپنے اندر رکھتا ہے؛ ہر مومن اور مومن زادہ اور مومن زادی کی جو شعوری اور مقصدی زندگی ہونا چاہیے۔ اس سے کسی طرح بھی ہماری بے شعوری اور بھیڑ چال میل کھاتی ہے؟ نسلوں پر نسلیں گزر گئیں حکومتیں بدلیں۔ انقلابات آئے۔ لیکن دنیا کی اس ناز برداری اور اس کے ساتھ اس مستقل نیازمندی کی روش میں ہم نے اپنی روش میں کوئی فرق آنے دیا؟ بلکہ دنیا پرستی کے اس انہماک میں نئی نسل تو اپنے سے پرانی پر او ر سبقت لیے ہی جاتی ہے؟ ـــــ جس قوم کو دیدۂ بینا دے کر بتایا گیا تھا کہ سفر ہستی نہایت طویل ہے اور یہ عالم ناسوت اس کا ایک بہت ہی محدود، مختصر اور صرف ابتدائی حصہ ہے۔ محرومی اور کور بختی کی انتہا ہے کہ اسی نے اپنی آنکھیں پھوڑ کر اندھی قوموں کی تقلید میں اسی دنیا کو سب کچھ سمجھ رکھنے پر قناعت کر لی ہے اور اپنی اس "روشن خیالی" پر اسے فخر و اطمینان ہے۔

جذبۂ حب زر سیرت کی روایتوں میں بعض الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ بیان یہ ملتا ہے کہ "رسول اللہؐ نے اپنی وفات کے

بعد ترکہ میں نہ کوئی بکری چھوڑی، نہ کوئی اُونٹ، نہ کوئی درہم، نہ کوئی دینار، نہ کوئی کنیز، نہ کوئی غلام!" ——— اور جس وقت آپ نے وفات فرمائی ہے آپ کی حیثیت دنیوی اعتبار سے ایک بڑے رئیس بلکہ پورے بادشاہ کی تھی۔ حجاز پورا قبضہ میں آچکا تھا۔ نجد، یمن، عمان وغیرہ اطراف کی ساری ریاستیں زیرنگیں آچکی تھیں۔ شام تک کا جنوبی علاقہ پرچم اسلام کے تحت آچکا تھا اور کئی لاکھ مربع میل پر اب حکومت اسلام کا سکہ رواں تھا ——— بہرقبہ تو پھر بڑا ہوا۔ دنیا کے معمولی اور چھوٹے رئیس بھی کیا اس طرح خالی ہاتھ دنیا سے روانہ ہوتے ہیں؛ پرانے شہنشاہوں، کجکلاہوں، سلطانوں، قیصروں کو چھوڑیے، آج کے بڑے بڑے جمہوریت پسند، جمہوریت دوست، سرمایہ بیزار و اشتراکیت نواز سرداروں، روس، امریکہ، برطانیہ کے والیان ملک بلکہ ان کے نائبوں اور نائب در نائب سرداروں کی دولت و جائداد کے کیا اندازے ہیں؛ ان کے زر و جواہر کے خزانوں کے کیا تخمینے ہیں۔ ان میں سے کوئی ادنیٰ نسبت بھی اس بندۂ غنی سے رکھتا ہے؛

غیروں کو چھوڑیے، وہ اپنے فعل کے مختار ہیں۔ ہم اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور دیکھیں کہ ہم کوئی مناسبت ترک دولت میں اپنے آقا و سردار سے رکھتے ہیں ——— جب حب مال کا جذبہ ہمارے اندر جوش زن ہوتا ہے، جب تصور امارت و ثروت کے خیالی محل تیار کرنے لگتا ہے یا واقع میں ہم زر و جواہر کے مالک ہو کر مسرت کی مستی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ تو اس وقت بس اتنی سی بات سوچ لیا کریں کہ اس حالت میں مشابہت کس سے پیدا ہو رہی ہے! قیصر و کسریٰ سے، راتشچائلڈ اور فورڈ سے، فلاں کروڑپتی اور ارب پتی سے یا اپنے اس آقا و سردار سے، جس کے نام کا کلمہ پڑھتے ہیں اور جس کے قدموں کے طفیل آسمانی بادشاہت میں داخلہ کی تمنا اور حوصلہ رکھتے ہیں؛ ایک یہی مراقبہ ان شاء اللہ حبِ زر، حبِ مال، حرص و طمع کا کافی علاج ثابت ہو جائے گا۔

سہل الحصول نسخہ رسول انامؐ کی مشہور دعاؤں میں سے ایک دعا یہ بھی ہے جو صحابی حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے منقول ہے:

اللھم احینی مسکیناً و امتنی مسکیناً و احشرنی فی زمرۃ المساکین۔

اے اللہ! مجھے زندگی میں مسکین رکھیو اور مسکینی ہی میں میری موت لائیو! اور حشر میں مجھے مسکینوں ہی کے گروہ میں اٹھائیو۔

"مجھے زندگی میں مسکین رکھیو" تاکہ مالی ذمہ داریاں مجھ پر کم سے کم عاید ہو سکیں۔ مالی ذمہ داریوں کا بوجھ تو مال و دولت کے جلو میں چلتا ہے۔ زکوٰۃ دینا واجب اور نفل صدقوں کی فکر میں لگے رہنا۔ عزیزوں، قریبوں، محلہ والوں، بستی والوں، ملت والوں سب کے مالی حقوق درجہ بدرجہ ادا کرتے رہنا۔ ان سے بچے رہنے میں زندگی کیسی ہلکی پھلکی گزر جائے گی۔ راحت و سکون قلب کے اسباب کتنے زاید فراہم رہیں گے۔ لوگوں کے رشک و حسد سے کس درجہ نجات رہے گی۔

"مسکینی میں میری موت لائیو" اور زندگی کی یہ مسکینی عارضی اور وقتی نہ ہو، اخیر وقت تک یہی حالت قایم رہے تاکہ جب موت اسی حالت میں آئے تو زر و مال کی ذمہ داریوں کی گرانباری سے امن رہے اور ان سوالوں کی نوبت ہی نہ آئے جو امراء و اغنیاء سے ہوتے ہیں۔

"اور میرا حشر مسکینوں کے گروہ میں کیجیو" کہ یہی گروہ تو حشر میں رحمت خصوصی اور مکرمت امتیازی کا حقدار رہے گا۔ بڑے لوگوں کو تو خدا جانے کن کن مرحلوں سے گزرنا اور کیسی کیسی گھاٹیوں کو طے کرنا ہوگا جب کہیں جاکر نجات نصیب میں آئے گی۔ بغریب غربا بے کھٹکے

ان وادیوں سے دامن جھٹکتے گزر جائیں گے۔

امت کے لیے کتنا آسان، کتنا سہل الحصول نسخہ رسول انامؐ نے پیش فرما دیا ہے۔ کتنے جھگڑوں، مخمصوں سے نجات دلا دینے والا! کیسے کیسے پتھروں، چٹانوں کو پانی کرنے والا ——— اللہ عمل کی توفیق ہم کو، آپ کو سب کو دے۔ آمین

جشنِ ولادت ربیع الاول کا مہینہ ختم ہُوا اور اس ماہ مبارک میں مسلمانوں نے پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں میں اپنے ہادیِ اعظمؐ اور سرورِ عالمؐ کا جشنِ ولادت خوب جی کھول کر منا لیا! نمازیں پڑھ کر نہیں، روزے رکھ کر نہیں، توبہ و استغفار کر کے نہیں، دلوں میں جہاد کا ولولہ و داعیہ پیدا کر کے نہیں، کبائر و صغائر سے بچنے کا عہد کر کے نہیں۔ شراب نوشی، حرام کاری، سود خواری کا بائیکاٹ کر کے نہیں ——— بلکہ جلوس پر جلوس نکال کر گیس کے ہنڈوں اور بجلی کے قمقموں سے رات کو دن بنا کر اور خوب گا بجا کر! ڈنکے کی چوٹ پر نہیں، ہارمونیم کی الاپ اور ڈھولک کی تھاپ پر! اکیلے شہر لاہور سے متعلق اخباری تخمینہ ہے کہ ۱۲ لاکھ روپیہ (۱۹۶۲ء میں) اٹھا۔ اس کو پیمانہ قرار دے کر اب کس کی ہمت ہے کہ ہندو پاکستان کے سارے شہروں کی اولوالعزمیوں کی میزان لگائے؟

یہ کوئی قدیم اور فرسودہ قسم کی "بارہ وفات" تھوڑے ہی تھی کہ مولویوں کے فتوے کام دیتے اور میلاد و قیام کے جواز و عدمِ جواز پر موشگافیاں ہوتیں۔ یہ ماڈرن "یوم النبی" تھا۔ اس کے رعب و جلال کے سامنے اچھے اچھوں کے قدم اکھڑ گئے اور بڑے بڑے مانعین خود آ کر واعظانِ شیوا بیان اسٹیج کی زینت بن گئے۔ لاہور کے زندہ دلوں نے اپنی کمالِ جدت سے شب برات اور محرم والوں کو مات دے دی اور ایک نقلی روضۃ النبی مع زندہ پتلوں کے تیار کر دکھایا۔ یہ کوئی ضریح یا شبیہہ نہ تھی جس کے بدعت ہونے کا سوال پیدا ہوتا۔ یہ تو ماڈل تھا ماڈل! اور ماڈل کو روک کر کون اپنے کو کٹھ ملا کہلانا گوارا کرتا!!

اکبرؔ تو بزرگوں اور اللہ والوں ہی کی تقدیس کو دیکھ کر کہہ گئے تھے: ع

یاروں نے بت شکن کو بُت ہی بنا کے چھوڑا

آج سید الانبیاءؐ کی اس انوکھی تعظیم و تکریم پر کیسے کیسے خون کے آنسو بہاتے۔

اللہ کے بندو! ذرا سوچو تو سہی کہ جس رسولؐ کی زندگی کا سب سے بڑا عملی سبق سادگی تھا۔ اس سے کوئی نسبت اس پُر تکلف اور جگمگاتی ہوئی مسرفانہ، رئیسانہ بلکہ شاہانہ تقریب کو باقی رہی ہے؟ اور کبھی حساب لگا کر دیکھو کہ ان تکلفات کی مدہیں خرچ کی میزان لکھو کھا تک پہنچ جاتی ہے یا نہیں؟ اس سارے دھوم دھڑکے سے چلن سادگی کا بڑھا، یا اس کے برعکس بے تحاشا اسراف کا۔ اور طبیعتیں جو راتیں سینما قسم کی لذتوں میں گزارنے کی حریص اور مریض تھیں۔ ان او نگھنتوں کے ٹھیلتوں کو ایکٹ مقدس، بہانہ ہاتھ آ گیا یا نہیں؟ ——— ان ہجوموں، مجمعوں، جمگھٹوں میں کتنوں کو نظمیں پڑھنے یا تلاوتِ قرآن کی توفیق ہُوئی؟ بلکہ کتنوں کو نماز عشاء اور نماز فجر کے فرض بھی نصیب ہوئے۔ یہ جشن یوم النبی اس صورت میں منانے کا طریقہ آخر صحابہ میں، تابعین میں، کس کا تھا۔ یہ تمام تر فتح بھلا بدعت کی "سنت" پر ہے یا نہیں؟

جنتی بیوی ایک حدیث نبوی، جسے محدث جلیل، امامِ فقہ، احمد بن حنبل اپنی مسند میں لائے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

"جب عورت پانچوں نمازوں کو ادا کرتی رہے اور ماہِ رمضان کے روزے رکھتی رہے اور اپنی عصمت کی حفاظت کرتی رہے اور اپنے شوہر کی فرمانبرداری کرتی رہے تو اس سے (قیامت میں) کہا جائے گا کہ جنت کے

جس دروازے سے چاہو، جنت میں داخل ہو جاؤ۔"

جنتی بیوی کی نشانیاں آپ نے قول رسولؐ کی روشنی میں معلوم کر لیں؛

کتنی صاف ستھری، سادہ، آسان اور مطابق فطرت زندگی جنتی بیوی کی ہوتی ہے۔ وہ نمونہ جس پر شروع سے اب تک بے شمار جنتی بیویوں نے چل کر دکھا دیا۔ کوئی محض خیالی اور فرضی نقشۂ زندگی نہیں، اپنی عزت و آبرو کا لحاظ رکھا، شوہر کی خدمت کی، فرض عبادتیں پابندی سے ادا کیں۔ چلیے بس جنت پر استحقاق قائم ہو گیا۔

کوئی وقت ایسی بیویوں کے روزانہ پروگرام میں "میک اپ" کرتے رہنے، ہونٹوں پر لالی تھوپنے، خوب بن ٹھن کر باہر نکلنے، سینما جانے، گندے ناول پڑھنے، گندی سے گندی تصویریں دیکھنے، کلب میں جا کر رقص پارٹی میں شریک ہونے، مردوں سے بے تکلف اور بے محابا ہنسنے بولنے، زیادہ سے زیادہ چست و عریاں لباس پہن کر غیروں کے سامنے چٹکنے مٹکنے اور ان کے ساتھ ڈانس کرنے کا نکلتا ہے؟ اس "ماڈرن" اور "اپ ٹو ڈیٹ" نقشۂ زندگی کی کوئی مناسبت اس جنتی نقشۂ زندگی سے ہے؟

حقیقتِ دُنیا

جامع ترمذی میں حضرت عایشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا:

"اگر تم لپک کر مجھ سے ملنا چاہتی ہو تو تم کو دنیا اس مقدار میں کافی ہو جانا چاہیے جیسے سوار کا ناشتہ! اور مالداروں کے پاس بیٹھنے اُٹھنے سے بہت بچو!! اور دُوسرا کپڑا نہ بدلو جب تک کہ اس میں پیوند نہ لگا لو یعنی جب تک بھی وُہ چل سکے، اسی کو چلاؤ۔"

سُن لیا آپ نے، یہ ارشاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ہمارے آپ کے عقیدہ میں دین و دنیا کے بادشاہ) اپنی محبوب ترین رفیقۂ حیات حضرت عایشہؓ سے ——— دنیا اور سامانِ دنیوی سے اپنا تعلق بس محض بقدر ضرورت رکھو اور اہلِ ثروت سے انتہائی کنارہ کشی رکھو کہ حرص اور محرکاتِ حرص بھی نہ پیدا ہونے پائیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جوڑا روز بدلنا اور جلد جلد بدلنا کیا معنی۔ کپڑا اس وقت تک چلاؤ جب تک وُہ کچھ بھی قابلِ استعمال رہے اور پھٹ پھٹا کر اس میں نوبت پیوند لگانے کی نہ آجائے۔

اس ارشاد پر اس محبوبۂ سیدِ عالمؐ نے عمل بھی یُوں کیا کہ بقول ایک دُوسرے محدث کے:

عُروہ روایت کرتے ہیں کہ بس حضرت عایشہؓ جب تک کپڑے کو پیوند نہ لگا لیتیں اور اسے اٹا کر کے نہ پہن لیتیں نیا کپڑا نہ بدلتیں۔"

حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ عورت کو زیور اور خوش لباسی سے کس درجہ محبت ہوتی ہے! ایک اور روایت میں انھیں حضرت عایشہؓ سے یہ بھی منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کپڑے کبھی اتنے ہُوئے ہی نہیں کہ انھیں کہیں رکھنے کی ضرورت پڑے، نہ کپڑوں کی الماریاں، نہ کپڑوں کے صندوق، نہ کپڑوں کے لیے کھونٹیاں۔

اب اگر آپ کو اپنے کپڑوں کے ذخیرہ پر، اپنی پوشاک کی نفاست پر، بیش قیمتی پر، باوضعی (فیشن نوازی) فخر ہے تو خود ذرا سوچ لیجیے کہ اپنے سردار و پیشوا سے کوئی بھی مناسبت آپ کو باقی رہی ہے؟ ——— اور پاکستان کی ذی شان "مسلمان" بیگمات عالیہ کی نظر سے کبھی یہ تاریخی تحقیقیں گزری ہیں۔

رنگ و نسل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری خطبۂ حج اپنی اہمیت کے لحاظ سے کہنا چاہیے کہ پیغمبر کا وصیت نامہ ہے، جس میں اہم ترین وصیتیں آپ نے اُمت کو فرما دی ہیں۔ اس کے بعض لفظ آج پھر دُہرا لیجیے:

لا فضل لعربي علی عجمي۔ آج کے دن سے کوئی بڑائی کسی عرب کو غیر عرب کے مقابلہ میں نہیں۔

جاہل دنیا اس وقت آج ہی کی طرح قومی مفاخرت کے نشہ میں سرشار تھی۔ روم والوں کو یہ غرہ تھا کہ ایران والوں کی کیا ہستی ہے، اور ایران والے اس پندار میں مست تھے کہ یونان ہمارے سامنے کیا مال ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے ہر قوم فخر بس اپنے ہی خطۂ زمین پر کرتی ہے اور بغیر کسی تائید و دلیل عقلی کے محض اس بنا پر کہ انگریز اتفاق سے سرزمینِ انگلستان پر پیدا ہو گیا ہے۔ اپنی قوم کو جرمن اور فرنچ، ہندوستانی اور افغانی، چینی اور جاپانی ساری ہی قوموں سے افضل و اشرف سمجھتا ہے۔ اور یہی حال ہر دُوسری قوم کا ہے ہر ملک والا محض دُوسری زبان یا دوسرے خطۂ زمین کی بنا پر اپنے دل میں برتری کا تصوّر قایم کیے ہُوئے ہے۔ نسل پرستی، لسان پرستی، ملک پرستی کا نام فخر کے ساتھ وطنیت (نیشنلزم) رکھ لیا ہے اور ہر ملک والا اپنے کو اس کا حقدار سمجھتا ہے کہ جتنا چاہے، دوسرے کا ملک دبا لے اس کی زمین کا حصّہ کاٹ لے اور آج قوموں کے "ہیرو" وہی بنے ہُوئے ہیں، جن کے کارنامے بس دُوسروں پر دست درازی ہی کے ہیں۔

اسلام نے اس وطن پرستی ہی کی جڑ نہیں کاٹی بلکہ شارع اسلام کی زبان سے اسی خطبہ میں یہ فقرہ بھی ادا کر دیا ہے:

لا لاسود علی احمر۔ اور نہ آج سے کسی سیاہ رنگ والے کو کوئی فضیلت کسی سُرخ رنگ پر ہے۔

خوب غور کر کے دیکھ لیجئے کہ دنیا پر آج جو دوسرا بڑا فتنہ مسلط ہے وہ نسل پرستی اور قوم پرستی کے ساتھ رنگ پرستی کا ہے۔ گوروں کی بستی کالوں سے الگ آباد ہے اور پیلے رنگ والوں کا اگر ایک گروہ ہے تو کالے رنگ والے (نیگرو) کا دُوسرا۔ اور سفید فاموں (whites) کا تیسرا۔ سب آپس میں ایک دُوسرے سے ٹکرانے والے اور دُوسرے کو بدگمانی اور حقارت سے دیکھنے والے ——— اسلام ہی نے آ کر بتایا کہ غیر اختیاری چیزیں جتنی بھی ہیں چاہے وہ رنگ ہو یا نسل، زبان ہو یا ملک، ان میں سے کوئی چیز افضلیت کا معیار یا پیمانۂ فساد نہیں بن سکتی۔ بزرگی کا معیار تو صرف اختیاری و ارادی چیز یعنی ایمان و عمل صالح ہے:

ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم۔ اللہ کے ہاں تم میں سے زیادہ پسندیدہ وُہ ہے جو سب سے زیادہ صاحبِ کردار ہو۔

اگر آج دنیا اس معیار کو قبول کر لے تو دنیا میں کہیں بھی قومی، نسلی اور فرقہ وارانہ ہنگامے اور فساد باقی رہ سکتے ہیں؟ بلکہ خود شخصی، انفرادی جھگڑوں اور قضیوں کا بھی وجود کہیں قایم رہے گا؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ کے سترہ نکات

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر ایم اے ڈی لٹ

ربِ علیم وحکیم نے چودہ صدیاں پہلے اپنے آخری نبی ورسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق فرمایا تھا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا۔

(الاحزاب ۳۳ : ۲۱)

بلاشبہ تمھارے لیے (محمد) رسول اللہ (کی سیرت) میں (فکر و عمل کے لیے) حسین نمونہ ہے اس کے لیے جو اللہ تعالیٰ کے ملنے اور آخرت کی امید رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرتا ہے۔

غور کریں تو اس ارشادِ قرآنی میں زندگی کی دُنیوی واُخروی کامیابی کا اصل الاصول اس اعجازِ بلاغت سے بیان کیا گیا ہے کہ پیچ پچ دریائے معانی کو کُوزے میں بند کر دیا گیا ہے۔ اصل الاصول یہ ہے کہ زندگی کی حقیقی کامیابی (دُنیوی واُخروی) اُنھیں حاصل ہوسکتی ہے جو اپنی فکری وعملی زندگی اس طرح بسر کریں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معاشرے میں بسر کی تھی۔ وجہ یہ ہے کہ حسین ومطمئن اور سچی زندگی گزارنے اور اپنی حقیقی منزلِ مقصود پر پہنچنے کی ایک ہی راہِ مستقیم ہے جو آپؐ کی راہِ فکر وعمل تھی۔ یہاں اس ازبس اہم نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ انسان کی حقیقی منزلِ مقصود جنّت ہے، جو اس کا حُسن المآب بھی ہے اور اپنے الٰہ یعنی معبود ومحبوب اور مطلوب ومقصود کے قُرب وحضوری اور احسان ورضوان کا حُسن المقام بھی ہے۔ اس ارشادِ قرآنی میں آرزوئے حُسن وحق رکھنے والوں کے لیے نویدِ جانفزا بھی ہے اور اہلِ تکفیر وتکذیب کے لیے تنذیر اور چیلنج بھی ہے۔ نیز اس میں پیش گوئی بھی ہے جس کی تصدیق تاریخ نے ہر زمان ومکان میں کی ہے۔ آپؐ کی سیرتِ طیبہ سے متعلق تاریخ کا یہ فیصلہ قولِ فیصل اور حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے کہ:

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دُنیا کے عظیم ترین انسان تھے اور ہیں، نیز آپ امام الصالحین بھی تھے اور امام النبیین والمرسلین بھی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یتیم، گمنام اور اُمّی چرواہے سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا، لیکن آپؐ میں آرزوئے حُسن وحق اس قدر شدید وحرکی تھی کہ آپؐ نے ایسی پاکیزہ، سچّی اور حسین زندگی بسر کی کہ افرادِ معاشرہ آپؐ کو صادق وامین سمجھنے اور کہنے لگے۔ لیکن ربِّ علیم وخبیر نے آپؐ سے فرمایا کہ آپؐ بلاشبہ صادق وامین ہیں، لیکن آپؐ کی شخصیت جملہ مکارمِ اخلاق اور صفاتِ حسنہ کی مظہر ہے۔ چنانچہ ایک تو آپ صاحبِ خُلقِ عظیم ہیں۔

وَ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ ۔ (القلم ۶۸ : ۴) بے شک آپ اخلاق کے عظیم مرتبے پر ہیں۔

اور دُوسرے آپؐ کی زندگی تمام جہانوں کے لیے رحمت ہی رحمت ہے۔

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ۔ (الانبیاء ۲۱ : ۱۰۷) اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمتِ محض بنا کر بھیجا ہے۔

سیرتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ربّ ذوالجلال والاکرام کے ان دو ارشادات پر غور کرنا چاہیے کہ جس خُلق کو ربِ اکبرو اعظم "عظیم" کہے وہ اہلِ دنیا کے حوالے سے کتنا عظیم ہوگا۔ عقلِ انسانی تو اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتی۔ اسی طرح ربِ رحمٰن ورحیم اپنے جس بندے اور رسول سے یہ فرمائے ؛

"آپ جملہ جہانوں کے لیے رحمتِ محض ہیں۔"

اس برگزیدہ ہستی کی رحمت کے بے پایاں و لاتمنا ہی ہونے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔

کتبِ سیرت و تاریخ اِس حقیقت کی شاہد ہیں کہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق آپ کے اہلِ وطن کا متفقہ طور سے یہ فتویٰ تھا کہ ؛

"آپؐ صادق و امین ہیں۔"

اگرچہ معاشرہ آپؐ کے دیگر اوصاف کا بھی معترف تھا، لیکن صداقت و امانت ایسی دو امتیازی اخلاقی خصوصیات تھیں جو انھیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیتی تھیں کہ ایک شخص جو اُن میں پیدا ہوا، اُن میں اس نے بچپن، لڑکپن اور شباب گزارا، اور اس حسین و پاکیزہ طریقے سے گزارا کہ کسی نے کبھی اُس پر انگشت نمائی نہیں کی۔ سب نے "محمّد" کو اسم بامسمّٰی تسلیم کیا۔ چالیس برس کی عمر تک آپؐ نے کبھی کسی معاملے میں نہ جھوٹ بولا اور نہ امانت میں خیانت کی۔ ایسا بلند کردار، محسن و مخلص اور صادق و امین انسان کیسے یکایک دین کے معاملے میں جھوٹ بول سکتا ہے! وہ کیسے جھوٹ موٹ یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ "میں اللہ تعالیٰ کا نبی و رسول ہوں اور قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو مجھ پر بذریعہ وحی نازل ہوتا ہے"۔ تاریخ بتاتی ہے کہ آپؐ کے دعوائے نبوت کے بعد جب اہلِ عرب آپؐ کے جانی دشمن بن گئے، پھر بھی وہ آپؐ کے خُلقِ عظیم اور رحمۃٌ للعالمینی کی صفات کے معترف و قائل تھے۔ چنانچہ قرآن مجید نے ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کیا ہے کہ آپؐ نے اپنی ان صفاتِ حسنہ ہی کی بدولت اہلِ عرب کے دلوں کو مسخر کر کے انھیں اپنے رنگِ الٰہی میں رنگ دیا' اور اس طرح اُنھیں ایک عظیم و مثالی قوم بنا دیا، جس نے دنیا کو توحید و محبت، اخوت و مساوات اور آزادی کا درس دیا۔ اور اس کے لیے رحمت ثابت ہوئی۔ اسلام دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی تھی، اور جو شخص ایمان لا کر اُس میں کلیتہً داخل ہو جاتا، وہ انسانوں، حیوانوں اور دیگر مخلوقات کے لیے رحمت بن جاتا۔ اس میں آرزوئے حسن زندہ و فعّال ہو جاتی، وہ خود بھی صاحبِ حُسن و سرور بننے کی کوشش کرتا اور دُوسروں کو بھی ایسا بنانے کی کوشش کرتا۔ اسی کوششِ جمیلہ کا دُوسرا نام "جہاد" ہے اور اسی کوشش میں جان دینے کے لیے شہادت کی تعبیر اختیار کی جاتی ہے۔ یہ آرزوئے

حُسن تھی جس نے مسلمانوں میں ذوقِ وشوقِ جہاد و شہادت پیدا کیا اور اس کی بدولت اُنھوں نے وہ عظیم الشان اور حیرت انگیز سیاسی وعسکری اور ثقافتی و دینی فتوحات حاصل کیں، جن کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔

قرآن مجید ایسا حسین و انقلاب آفرین کلامِ الٰہی ہے، جس کے بنیادی مقاصد میں ایک تو انسان میں آرزوئے حُسن کو زندہ وفعّال کرنا، دُوسرے مکارمِ اخلاق کی تکمیل کرنا اور انسان کو صاحبِ حُسنِ کردار بنانا، نیز اس کے قلب کو نورِ علم و حکمت سے منوّر کرنا اور اس میں مضمر شرارِ محبتِ الٰہی کو شعلہ فگن کر کے شمعِ رحمت بنانا ہے تاکہ اس کے نور و فیضان سے بنی نوعِ انسان بالخصوص اور دیگر مخلوقات بالعموم مستفیض ہوں۔ اگر یہ کہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی سیرتِ طیبہ اسی کلامِ الٰہی کی عملی تفسیر ہے تو یہ مبالغہ نہیں بلکہ ایسی زندہ حقیقت کا اظہار ہوگا جس کا اعتراف تاریخ مسلسل کرتی رہتی ہے۔ یہ مقولہ جتنا مشہور ہے اتنا سچا بھی ہے کہ:

عورت اپنے مرد کے اخلاق کی سب سے زیادہ محرم ہوتی ہے اور اس کی رائے اس معاملے میں قولِ فیصل کی حیثیت رکھتی ہے۔

چنانچہ ایک دن چند صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پُوچھا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کا خُلق کیسا تھا؟"

اُمّ المومنین نے، جو نہ صرف آپ کی رفیقۂ حیات اور مزاج دان و محرمِ راز تھیں، فراست و حکمت میں عبقری اور روحِ قرآن کی شناسا بھی تھیں، جواباً پُوچھا:

"کیا تم نے قرآن پڑھا ہے؟"

اُنھوں نے جواب دیا: "ہاں"۔

اس پر مزاج دانِ رسالت و قرآن نے برجستہ فرمایا:

انّ خُلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کان القرآن۔ (ابو داؤد۔ باب الصلٰوۃ)	بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خُلق قرآن تھا۔

قرآن حکیم بلاشُبہ ربّ الحیّ والقیوم کا زندہ و ناطق کلام ہے اور اس کی بے شمار خوبیوں میں سے ایک از بس فکرانگیز و بصیرت افروز خوبی یہ ہے کہ اس کا موضوع "انسان" ہے، جس کی طرف خود اس نے مندرجہ ذیل آیت میں انسان کی توجّہ مبذول کرائی ہے تاکہ وہ اس پر غور و فکر کرے۔ موضوع کے اعتبار سے اسے ہم "کتاب الانسان" کہہ سکتے ہیں جس طرح موضوع کے لحاظ سے "کتاب الحیوان" کہنے کا دستور ہے۔ اللہ تعالیٰ جملہ بنی نوعِ انسان سے خطاب کر کے فرماتا ہے:

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکُمْ کِتٰبًا فِیْهِ ذِکْرُکُمْ ط اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ (الانبیاء ۲۱ : ۱۰)	ہم نے یقیناً یہ کتاب تمھاری طرف نازل کی ہے جس میں تمھارا ذکر ہے، کیا تم یہ بات نہیں سمجھتے؟

حُسن تھی جس نے مسلمانوں میں ذوقِ وشوقِ جہاد وشہادت پیدا کیا اور اس کی بدولت اُنھوں نے وہ عظیم الشان اور حیرت انگیز سیاسی وعسکری اور ثقافتی و دینی فتوحات حاصل کیں، جن کی نظیر تاریخِ عالم میں نہیں ملتی۔

قرآن مجید ایسا حسین و انقلاب آفرین کلامِ الٰہی ہے، جس کے بنیادی مقاصد میں ایک تو انسان میں آرزوئے حُسن کو زندہ وفعال کرنا، دُوسرے مکارمِ اخلاق کی تکمیل کرنا اور انسان کو صاحبِ حُسنِ کردار بنانا، نیز اس کے قلب کو نورِ علم و حکمت سے منوّر کرنا اور اس میں مضمر شرارِ محبتِ الٰہی کو شعلہ فگن کر کے شمعِ رحمت بنانا ہے تاکہ اس کے نور وفیضان سے بنی نوعِ انسان بالخصوص اور دیگر مخلوقات بالعموم مستفیض ہوں۔ اگر یہ کہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرتِ طیبہ اسی کلامِ الٰہی کی عملی تفسیر ہے تو یہ مبالغہ نہیں بلکہ ایسی زندہ حقیقت کا اظہار ہوگا جس کا اعتراف تاریخ مسلسل کرتی رہتی ہے۔ یہ مقولہ جتنا مشہور ہے اتنا سچا بھی ہے کہ:

عورت اپنے مرد کے اخلاق کی سب سے زیادہ محرم ہوتی ہے اور اس کی رائے اس معاملے میں قولِ فیصل کی حیثیت رکھتی ہے۔

چنانچہ ایک دن چند صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے امّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پُوچھا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا خُلق کیسا تھا؟"

اُمّ المومنین نے، جو نہ صرف آپ کی رفیقۂ حیات اور مزاج دان ومحرمِ راز تھیں، فراست وحکمت میں عبقری اور روحِ قرآن کی شناسا بھی تھیں، جواباً پُوچھا:

"کیا تم نے قرآن پڑھا ہے؟"

اُنھوں نے جواب دیا: "ہاں"۔

اس پر مزاج دانِ رسالت و قرآن نے برجستہ فرمایا:

انّ خُلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کان القرآن۔ (ابُو داؤد۔ باب الصّلوٰۃ)	بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خُلق قرآن تھا۔

قرآنِ حکیم بلاشُبہ ربّ الحیّ والقیوم کا زندہ وناطق کلام ہے اور اس کی بے شمار خوبیوں میں سے ایک از بس فکر انگیز وبصیرت افروز خوبی یہ ہے کہ اس کا موضوع "انسان" ہے، جس کی طرف خود اس نے مندرجہ ذیل آیت میں انسان کی توجہ مبذول کرائی ہے تاکہ وہ اس پر غور وفکر کرے۔ موضوع کے اعتبار سے اسے ہم "کتاب الانسان" کہہ سکتے ہیں جس طرح موضوع کے لحاظ سے "کتاب الحیوان" کہنے کا دستور ہے۔ اللہ تعالیٰ جملہ بنی نوعِ انسان سے خطاب کر کے فرماتا ہے:

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ (الانبیآء ۲۱ : ۱۰)	ہم نے یقیناً یہ کتاب تمھاری طرف نازل کی ہے جس میں تمھارا ذکر ہے، کیا تم یہ بات نہیں سمجھتے؟

بلاشبہ قرآن حکیم میں انسان کا اپنا ذکر ہے۔ یہ ذکر کیا ہے؟ نور و ہدایت اور شفا ہے؛ نیز حسین و کامیاب انفرادی و اجتماعی زندگی گزارنے کا دستور ہے۔ یہ افراد و اقوام کے عروج و زوال کی ایک عبرت انگیز و سبق آموز تاریخی داستان ہے۔ چنانچہ ربِ ذوالجلال والاکرام نے اس کے ذریعے انسان کو اس اصل الاصول سے آگاہ کیا ہے کہ ہر زمان و مکان میں اللہ تعالیٰ کے انبیا و رسل علیہم السلام ہی اس کے انعام یافتہ، ہدایت یافتہ، کامیاب، عظیم اور مثالی انسان ہوئے ہیں اور ان کی سیرتِ حسنہ ہی میں انسان کے لیے اُسوۂ حسنہ تھا، اور اب اللہ تعالیٰ کے پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ ہی میں ہر زمان و مکان کے انسان کے لیے حسین و کامیاب زندگی گزارنے کا اُسوۂ حسنہ یا حسین نمونہ ہے۔ قرآن مجید کے اس دعوے کا ثبوت خود قرآن مجید بھی ہے، آپ کی سیرت طیبہ اور تاریخ کی کتب میں بھی ہے۔

ان تینوں کتب کے آئینے میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نے بچپن میں بکریاں چرائیں اور اکتسابِ علم و ہنر نہ کیا۔ میرے نزدیک اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ پیدائشی نبی و رسول اور معلّم و مزکّی نوعِ انسانی تھے، لہٰذا ربِ جلیل کو گوارا نہ ہوا کہ اُس کے حبیب و پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کسی شخص کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کریں اور اُسے اپنا استاد و معلّم بنائیں۔ چنانچہ اس اعتبار سے آپ عمر بھر اُمّی رہے۔ یہ اور بات ہے کہ خود ربِ علیم و حکیم نے آپ کا شق الصدر بھی کیا اور شرح الصدر بھی، اور بذریعہ وحی آپ کے سینہ مبارک کو علم و حکمت کے نور سے معمور و منیر کر دیا۔ وجہ یہ تھی کہ آپ نے منصبِ نبوت و رسالت پر متمکن ہو کر اولادِ آدم کو علم و حکمت سکھانا، اُن کا تزکیہ کرنا اور مکارمِ اخلاق کی تکمیل کرنا تھی۔ بالفاظِ دیگر آپ چونکہ خاتم النبیین تھے، اس لیے آپ نے قیامت تک کے لیے اقوامِ عالم اور افرادِ نسلِ انسانی کا معلّم و مزکّی اور ہادی و مربّی بننا تھا۔ آپ نے پہلے اپنا تزکیۂ نفس کیا اور اپنے مکارمِ اخلاق کی تکمیل کی؛ نیز اپنی آرزوئے حسنِ حق اور نورِ باطنی کی تکمیل کی اور صاحبِ جمال و جلال بن گئے۔ آپ کی خودی کی تحسین و تکمیل ہو گئی اور وہ محکم و ناقابلِ تسخیر بن گئی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو رسمی طور پر خلعتِ نبوت و رسالت سے مزیّن کر دیا۔ اُس وقت آپ کا سنِ رشید چالیس برس کا تھا اور آپ کا پیشہ سوداگری تھا۔

جس معاشرے میں آپ نے مہد سے کہولت تک عمر گزاری تھی اور جس کے افراد نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایک چرواہا اور سوداگر، ایک اُمّی و بے ہنر شخص کبھی اپنے علم و فضل کا دعویٰ کر سکتا ہے، اس معاشرے میں آپ نے "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ" کا نعرہ مار کر اپنی نبوت و رسالت کا اعلان کیا تو اس میں تہلکہ مچ گیا۔ یہ نعرۂ توحید جس پر اسلام کی بنیاد استوار ہے اور جو تحریکِ اسلام کی رُوحِ رواں ہے، اہلِ قریش کے دلوں پر برق بن کر گرا اور ان کے صبر و شکیب کو خاکستر کر گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نعرے کو کوئی سمجھا تو وہ قریش تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اس کا مطلب شرک و بت پرستی اور فرعونیت و ہامانیت اور قارونیت و آزریت کی ہر شکل و صورت کا استیصال ہے، اور ایک اللہ تعالیٰ کی حاکمیت و معبودیت کا اقرار و اثبات ہے۔ یہ نعرہ ان کے لیے ایسا چیلنج تھا جسے وہ نہ قبول کر سکتے تھے اور نہ انھوں نے کیا۔ یہ نعرۂ توحید در اصل ہر زمان و مکان کے فرعونوں، ہامانوں، قارونوں اور آزروں کے لیے چیلنج تھا اور ہے اور قیامت تک رہے گا۔ اس نعرے

حق و باطل، حُسن و قُبح، ایمان و کفر اور توحید و شرک میں ٹھن گئی اور سرد جنگ کا آغاز ہو گیا۔ چند اہلِ صدق و صفاؓ نے پہلی ہی دعوتِ اسلام پر لبیک کہا اور تحریکِ اسلام میں شامل ہو گئے۔ تقریباً بارہ برس تک آپؐ مکہ مکرمہ میں "لا الٰہ الا اللہ" کا نعرہ لگاتے رہے؛ اس کی صدا اہلِ مکہ کے کانوں میں گونجتی اور ان کے دلوں میں آتشِ انتقام بھڑکاتی رہی۔ مخالفت کے طوفان چلتے رہے؛ آپؐ اور آپؐ کے صحابۂ کرامؓ صبر آزما امتحانوں سے گزرتے رہے، ان پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹتے رہے، لیکن آپؐ تحریکِ اسلام چلاتے رہے، رضا کاروں کا تزکیہ کرتے، ان کو علم و حکمت سکھاتے اور ان کے اخلاق کی تہذیب و تحسین کرتے رہے؛ نیز ان کی آرزوئے حسن و حق کو فعال و حرکی بناتے اور ان کے نورِ باطنی کی تکمیل کرتے رہے۔ تحریکِ اسلام کا پہلا مرحلہ ختم ہوا تو آپؐ نے تحریک کے نشو و ارتقا کے لیے یثرب کی آزاد سرزمین منتخب کی۔ آپ وہاں کے چند جویانِ حق کو تحریکِ اسلام میں شامل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے ساتھ وہاں تحریکِ اسلام چلانے کے لیے زمین ہموار اور فضا کو سازگار بنانے کا کام شروع ہو گیا۔ یہ بھی بڑا کٹھن مرحلہ تھا، لیکن فرزندانِ توحید کی مساعیِ جمیلہ اور تائیدِ ایزدی سے یہ مرحلہ بھی کامیابی سے طے ہو گیا۔

آپؐ نے مسلمانوں کو ہجرت کر کے وہاں تحریکِ اسلام چلانے کا حکم دیا؛ امتثالِ امر میں مسلمانوں کی اکثریت ہجرت کر گئی لیکن جو مجبور و معذور تھے، وہ قریش کے مظالم سہتے رہے۔ آخر کار آپ کو بھی اللہ تعالیٰ کا اذنِ ہجرت ملا۔ ہجرت کی شب قریش نے آپؐ کو شہید کرنے کی غرض سے قاتل مقرر کیے جنھوں نے آپؐ کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن آپؐ صاف بچ کر نکل گئے اور سفرِ ہجرت کے اوّلیں مقام پر پہنچ گئے، جو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا گھر تھا۔ ہجرت میں ہمسفری اور مصاحبت کا شرف بھی اسی پیکرِ صدق و صفا کو ملا، جو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عزیز ترین و وفا شعار دوست، معتمد و مقرب اور ہمراز مشیر تھے۔

تاریخ شاہد ہے کہ ایک عشرہ بھی نہ گزرا تھا کہ آپؐ نے تاریخ کا رُخ صحیح سمت موڑ دیا؛ باطل قوّتوں کو شکستِ فاش دی؛ تمام جزیرہ نماعرب کو فتح ہی نہیں کیا بلکہ اُن کے باشندوں کے دلوں کو بھی مسخّر کر لیا اور وہ جوق در جوق تحریکِ اسلام میں شامل ہونے لگے۔ اس طرح آپؐ نے عرب کو متحد کر کے ایک ناقابلِ تسخیر قوّت بنا دیا، اور اسلامی حکومت کی قوّت سے قیصر و کسریٰ کی ایسی عظیم سلطنتیں بھی خوف کھانے لگیں۔

میرے نزدیک آپؐ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپؐ نے عرب کے وحشی و خونخوار بدوؤں کو مہذب و متمدن انسان بنایا؛ مشرکوں اور بُت پرستوں کو مومن موحّد بنایا؛ نجس و ناپاک لوگوں کو مطہر و پاکباز بنایا، عباد الشیطان کو عباد الرحمان بنایا؛ ظالموں، جاہلوں اور ناخواندہ لوگوں کو علم و حکمت سکھائی، ان کو متقی و سعید بنایا؛ اُن کے اخلاق کی تہذیب و تحسین کی، ان میں شوقِ جہاد و شہادت پیدا کیا؛ ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوقات کی محبت کی شمع روشن کی اور انھیں اقوامِ عالم کے لیے باعثِ رحمت بنا دیا؛ انھیں رموزِ خلافت و جہانبانی سے آگاہ کیا؛ ان کے دلوں میں اطاعت و اتحاد اور تنظیم کی اہمیت کا حق الیقین پیدا کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انتہائی قلیل مدت میں اُن میں ایسے ایسے عالم و حکیم اور فقیہ و مجتہد پیدا ہوئے، جن کے علمی و تحقیقی کارناموں پر آج بھی علمی دُنیا فخر کرتی ہے اور اُن کے علم و حکمت کے

چراغوں کی روشنی سے آج بھی طالبانِ علم اکتسابِ فیض کرتے ہیں۔ ان میں ایسے ایسے سپہ سالار و فاتح پیدا ہوئے جو تاریخ ساز و عہد آفرین ثابت ہوئے۔ علاوہ بریں، ان میں ایسے ایسے عظیم الشان منتظم پیدا ہوئے جن کے حُسنِ انتظام کی تعریف میں تاریخ رطب اللسان ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ ان اور دیگر عظیم و بے مثال کارناموں کی بدولت تاریخ نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بجا طور سے ہر زمان و مکان کا عظیم ترین مثالی انسان تسلیم کیا اور ربِ علیم و حکیم نے آپؐ کی شخصیت و سیرت کو بنی نوعِ انسان کے لیے حسین نمونہ قرار دیا۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپؐ نے یہ عظیم و بے مثال اور عہد آفرین و تاریخ ساز کارنامے کیسے سرانجام دیے؟ بالفاظِ دیگر آپؐ کی سُنّتِ حسنہ کیا ہے؟ اس کا جواب آپؐ ہی کی زبانِ مبارک میں پیش کیا جاتا ہے جو ایجاز بلاغت کا بہترین نمونہ ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ، سے مروی ہے کہ" میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: آپؐ کی سنّت یا طریقۂ زندگی کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا:

۱۔ المعرفۃ راس المالی۔ (معرفت و عرفان میرا راس المال یا سرمایۂ حیات ہے)

۲۔ والعقل اصل دینی۔ (عقل میرے دین کی اصل ہے)

۳۔ والحبُّ اساسی۔ (محبّت میری (زندگی کی) اساس یا بنیاد ہے)

۴۔ والشوق مرکبی۔ (شوق میرا راہوار یا سواری ہے)

۵۔ وذکر اللہ انیسی۔ (ذکرِ الٰہی میرا مونس ہے)

۶۔ والثقۃ کنزی۔ (اعتماد میرا خزانہ ہے)

۷۔ والحزن رفیقی۔ (غمِ (عشقِ الٰہی) میرا رفیق ہے)

۸۔ والعلم سلاحی۔ (علم میرا ہتھیار ہے)

۹۔ والصبر ردائی۔ (صبر میرا لباس ہے)

۱۰۔ والرضا غنیمتی۔ (رضا میرا مالِ غنیمت ہے)

۱۱۔ والعجز فخری۔ (تواضع و انکساری میرا فخر ہے)

۱۲۔ والزھد حرفتی۔ (زُہد میرا پیشہ ہے)

۱۳۔ والیقین قوّتی۔ (یقین میری طاقت و توانائی ہے)

۱۴۔ والصّدق شفیعی۔ (صدق میرا حامی و شفیع ہے)

۱۵۔ والطّاعت حسبی۔ (طاعتِ (الٰہی) میری کفایت کرنے والی ہے)

۱۶۔۔۔ والجہاد خُلقی ۔ (جہاد میرا خُلق ہے)

۱۷۔۔۔ و قُرّۃُ عینی فی الصلوٰۃ ۔ (نماز میں میری آنکھ کی ٹھنڈک ہے) [بحوالہ قاضی عیاض، کتاب الشفا]

دیکھنے میں یہ سترہ انتہائی مختصر جملے ہیں، لیکن یہ کتابِ حیات کے جملہ سترہ ابواب ہیں اور ہر باب اپنے موضوع کا آئینہ ہے۔ اب آپؐ کے ان ارشاداتِ عالیہ کو واضح طور سے سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے :

۱۔ معرفت میرا راس المال ہے :

معرفت کے معنیٰ ہیں : پہچاننا ۔ معرفت دو قسم کی ہے :
معرفتِ نفس اور معرفتِ الٰہی ۔

(ا) معرفتِ نفس کے متعلق علامہ اقبال فرماتے ہیں : ؎

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تُو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن ، اپنا تو بن

معرفت کا سرچشمہ غور و فکر ہے ۔ انسان خلوصِ نیت کے ساتھ پہلے سوچے سمجھے نظریات و معتقدات، علمی و مذہبی تعصبات وغیرہ سے دل کو صاف کر کے اپنی ہستی پر غور و فکر کرے تو اسے اپنی ذات میں مضمر صلاحیتوں کا پتا چلتا ہے ، اس پر اس کا مقصدِ حیات منکشف ہوتا ہے ۔ اسے کائنات اور اپنے الٰہ و رب کے رشتے کی نوعیت کا علم ہوتا ہے ۔ اس طرح معرفتِ نفس سے معرفتِ الٰہی حاصل ہوتی ہے ۔ صوفیہ کے مندرجہ ذیل قول کا یہی مطلب ہے :

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ ۔ جس کسی نے اپنے نفس کو پہچان لیا ، اس نے اپنے رب کو پہچان لیا ۔

معرفتِ نفس سے انسان میں اپنی حیثیتِ عبدیت اور اللہ تعالیٰ کے مقامِ اُلوہیت کا ایقان و اذعان پیدا ہوتا ہے ۔ اس سے نہ تو اس میں فرعونیت ، ہامانیت اور قارُونیت پیدا ہوتی ہے اور نہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کبھی اور کو اپنا الٰہ ہی بناتا یا سمجھتا ہے ۔ علاوہ ازیں جب وہ اپنی ذات میں مضمر صلاحیتوں کو دریافت کرتا ہے تو اس کے دل میں ان کو کام میں لانے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے اور وہ انھیں قوت سے فعل میں لانے کی کوشش کرتا ہے ۔ یہ کوشش اس کی عظمت و کامیابی کی ضامن بن جاتی ہے ۔

(ب) معرفتِ الٰہی سے انسان مُوحّد بنتا ہے ۔ شرک و بُت پرستی سے اسے سخت نفرت ہو جاتی ہے ۔ اللہ تعالےٰ جمیل و جلیل ہے ۔ اس کے جمال و جلال کے مشاہدے سے اس پر نہ صرف حقیقتِ حُسن آشکارا ہوتی ہے بلکہ اس میں جمالیاتی ذوق بھی پیدا ہوتا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُسے ایک تو حُسن سے محبت ہو جاتی ہے ، لہٰذا وہ قُبح سے نفرت کرنے لگتا ہے اور دوسرے اس میں حُسن و قبح اور خیر و شر میں تمیز کرنے کی حس بیدار ہو جاتی ہے ۔ عارف میں جوں جوں صفاتِ الٰہی

کی پہچان بڑھتی جاتی ہے، اس میں ان صفات کو اپنے اندر پیدا کر لینے کا شوق پیدا ہوتا جاتا ہے۔ اس شوق کی بدولت ہی عارف صفاتِ الٰہی سے اپنی شخصیت کو متصف کر لیتا ہے۔ دُوسرے لفظوں میں وُہ اپنی زندگی کو رنگِ الٰہی (صبغۃ اللہ) میں رنگ لیتا ہے۔ یہی دین کی غایت، رُوحِ انسانی کی آرزو اور اللہ تعالیٰ کی مشیّت ہے۔ اس لحاظ سے معرفت حیاتِ انسانی کا حقیقی سرمایہ ہے، جس کی بدولت وہ اپنے لیے زیادہ سے زیادہ نیکیاں کما سکتا ہے۔ راس المال اس مال و دولت کو کہتے ہیں جو صنعت و حرفت اور تجارت میں سرمائے کے طور پر لگایا جاتا ہے۔

۲۔ عقل میرے دین کی اصل ہے:

اصل کے معنی 'جڑ' ہیں۔ پودا یا درخت اصل ہی پر قائم ہوتا ہے اور اسی پر اس کی نشوونما اور بقا کا دارومدار ہوتا ہے۔ اس منطقی قیاس کی بنا پر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہوا کہ دینِ اسلام کی بقا اور نشوونما ارتقا کا دارومدار عقل پر ہے۔ بالفاظِ دیگر عقل کے بغیر دین بے اصل ہے۔ اس سے یہ مستنبط ہوا کہ بے عقل لوگوں کا دین بے اصل ہوتا ہے، لہٰذا جو قوم عقل سے کام لینا چھوڑ دیتی ہے، اس کے دین کا شجر برگ و بار لانا چھوڑ دیتا ہے اور وہ صرف بے ثمر ہی نہیں ہوجاتا بلکہ بے بنیاد بھی ہوجاتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بے عقل فرد کی طرح بے عقل قوم کی زندگی بھی بے مقصد ہوتی ہے اور اس کے فکر و عمل کی نہ تو کوئی منزل ہوتی ہے اور نہ جہت۔ وُہ اپنی خواہشوں کو اپنا الٰہ بنا لیتی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وُہ اپنے نفس امارہ کی محکوم و مطیع بن جاتی ہے۔ اس کا ضمیر کمزور بلکہ مُردہ ہوجاتا ہے۔ بے عقل لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"اور اللہ تعالیٰ بے عقل لوگوں پر نجاست ڈالتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے دُوسرے مقام پر اس نفسیاتی حقیقت کی صراحت کر دی ہے کہ عقل سے کام نہ لینا در اصل بیماریٔ دل کی وجہ سے ہوتا ہے، اور جن لوگوں کے دلوں میں بیماری ہوتی ہے ان کے دل و دماغ بلکہ ساری زندگی ناپاک و پلید ہوتی ہے اور ان کی موت کفر پر ہوتی ہے، اور جن لوگوں کے دلوں میں بیماری ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کی پلیدی پر پلیدی کو زیادہ کیا اور وُہ کفر کی حالت ہی میں مر گئے۔

عقل اس لیے بھی دین کی اساس ہے کہ قرآن مجید کو عقل ہی کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید اور حدیث پاک سے ثابت ہُوا کہ عقل اور دین لازم و ملزوم ہیں۔ عقل ہی کے ذریعے انسان دین کے اغراض و مقاصد، قرآنِ مجید اور احادیثِ طیّبہ کے معارف، اسرار و رموز اور علوم وغیرہ سے آگاہی حاصل کر سکتا، حکمت سیکھ سکتا اور اس کا اظہار و ابلاغ کر سکتا ہے۔ یعنی تبلیغ کا فریضہ ادا کر سکتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید نے عباد الرحمٰن یعنی اللہ تعالیٰ کے بندوں کی ایک پہچان یہ بتائی ہے کہ انھیں اللہ تعالیٰ کی باتیں سمجھائی جاتی ہیں تو وہ ان پر اندھے اور بہرے ہو کر نہیں گرتے بلکہ عقل و ہوش سے ان پر غور و فکر کرتے ہیں۔ عقل ہی وہ غوّاص ہے جو آیاتِ الٰہی کے بحرِ زخّار میں سے گوہرِ معانی کو نکالتی ہے۔ لہٰذا جو

لوگ فہمِ قرآن میں عقل سے کام نہیں لیتے اور آیاتِ الٰہی میں غور و فکر نہیں کرتے وہ کُفرانِ نعمت کرتے ہیں اور یہ حقیقت بھول جاتے ہیں کہ فرد ہو یا قوم، جو بھی اللہ تعالیٰ کی جس نعمت سے کام لینا چھوڑ دیتا ہے، قدرت اس سے وہ نعمت چھین لیتی ہے۔ زوالِ اُمّت کے بعد اس کا سب سے بڑا زیاں یہ ہوا ہے کہ اس سے عقل چھین لی گئی ہے، اور وہ اُس کے دین کی اساس نہیں رہی۔ حاصلِ کلام یہ کہ ملّتِ اسلامیہ کی نشاۃِ ثانیہ اور احیائے علوم اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک وہ سُنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر عمل کرتے ہُوئے عقل کو اپنے دین کی اساس نہیں بناتی۔

۳۔ محبّت میری بنیاد ہے:

اسلام کا یہ بنیادی عقیدہ ہے کہ محبّتِ الٰہی انسان کو طبعاً و دلیعت کی گئی ہے، اور اسے اس حقیقت کا فطری اذعان ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس کا اِلٰہ یعنی معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود ہے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت کا یہ اقتضا بھی ہے اور خاصّہ بھی، کہ اس کی مخلوقات خصوصاً بنی نوعِ انسان سے محبت کی جائے۔ محبّت انسانی کا مطلب یہ ہے کہ بنی نوعِ انسان سے ہمدردی غمگساری اور عدل و احسان کیا جائے اور ان کی خاطر ایثار و قربانی سے دریغ نہ کیا جائے۔ محبّت جب حیاتِ انسانی کی اساس بن جاتی ہے تو وہ اپنی ذات، نیز اپنوں اور بیگانوں سب کے لیے رحمت بن جاتی ہے۔ چونکہ محبّت (اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کی) آپؐ کی حیاتِ طیّبہ کی بنیاد تھی، اس لیے آپؐ نہ صرف عالمِ انسانی بلکہ تمام عالموں کے لیے بھی رحمت تھے اور ہیں۔

تقویٰ یا خشیّتِ الٰہی محبّت ہی کی پیداوار ہے، اور تقویٰ ایک طرف اللہ تعالیٰ کے قانونِ مکافاتِ عمل کے شعُور پر اور دُوسری جانب انسان کے اپنی ذات سے سچّی محبّت پر دلالت کرتا ہے، جس کی بدولت ایک تو وُہ اپنے نفس اور اپنے اہل و عیال کو آتشِ خوف و حُزن سے بچانے کی کوشش کرتا ہے اور دُوسرے اپنے اِلٰہ کے قرب و رضوان کی خاطر اسے اپنی حقیقی راہ و منزل کی طلب و جستجو ہوتی ہے۔

حُسن چونکہ معروضِ محبّت ہے اس لیے حُسن و محبّت لازم و ملزوم ہُوئے۔ اس سے یہ کُلیہ مستخرج ہُوا کہ جس دل میں جس قدر حُسن ہوگا، اسی قدر اس میں محبّت ہوگی اور یہی مثل معاشرے پر بھی صادق آتی ہے۔ اس کا نقیض یہ ہُوا کہ جس دل یا معاشرے میں محبّت نہیں ہوگی وہ حسین بھی نہیں ہوگا۔ چونکہ آپؐ کی حیاتِ طیّبہ کی اساس محبّت تھی، اس لیے آپ پیکرِ حُسن و محبّت تھے۔ محبّت جب حُسنِ عمل یا انسان کے ذریعے قوّت سے فعل میں آتی ہے تو رحمت بن جاتی ہے۔ لہٰذا آپؐ کے رحمۃٌ للعالمین ہونے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ آپؐ کی ذاتِ اقدس حُسن و محبت کا جہانِ بیکراں تھی۔

۴۔ شوق میرا مرکب (سواری) ہے:

شوق سے آپؐ کی مُراد طلب و جستجو یا آرزو ہے، جس سے زندگی میں حرکی فعالیت پیدا ہوتی ہے۔ "شوق میرا مرکب" کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ کی تمام انقلابی و تعمیری سرگرمیوں کا محرک حقیقی شوق یا سوزِ آرزو تھا۔ آپؐ کی بعثت کا

جو مقصد تھا یا بالفاظِ دیگر قدرت کی طرف سے آپؐ کو جو مشن تفویض کیا گیا تھا، اس سے آپؐ کو عشق بھی تھا اور اُسے پُورا کرنے کی طلب و جستجو تھی۔ چنانچہ یہ عشق و آرزو ہی آپؐ کے عظیم الشان مشن میں کامیابی کے بنیادی عوامل تھے۔

آرزو و جستجو کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاتا ہے کہ اس کے فقدان سے حیاتِ انسانی میں جمود و تعطّل پیدا ہو جاتا ہے اور یہ منفی عمل اس کے انحطاط و اضمحلال اور ضُعف و زوال پر منتج ہوتا ہے۔ کسی فرد یا قوم کی یہ حالت ہو تو اُسے مجازاً مُردہ کہتے ہیں۔ یہیں یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ اگر کوئی قوم فقدانِ آرزو کے باعث مُردہ ہو جاتی ہے تو سوزِ آرزو ہی کے ذریعے وہ دوبارہ زندہ بھی ہو جاتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ آرزو حیاتِ انسانی کے ارتقاء کی ایک ناگزیر پیش شرط ہے یا بالفاظِ دیگر سوزِ آرزو اور ارتقائے حیات لازم و ملزوم ہیں۔ حاصلِ کلام یہ ہے کہ اپنے نصب العین یا مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اپنے اندر آرزو کو زندہ و بیدار کرنا اور پھر سوزِ آرزو سے اپنی ذات کو زندہ رکھنا ناگزیر بھی ہے اور آپؐ کی سنّتِ حسنہ بھی۔

۵۔ ذکرِ الٰہی میرا انیس ہے:

اصل جُملہ جتنا مختصر ہے، معانی و مطالب اتنے ہی وسیع و بلیغ ہیں۔ انیس کے معانی ہیں اُنس رکھنے اور محبت کرنے والا۔ یہ مقولہ بھی جتنا مشہور ہے اتنا سچا ہے کہ:

"دل را بدل رہیست"۔ یعنی دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔

چنانچہ جب ایک دوست دُوسرے دوست کو یاد کرتا ہے تو اُس کے دل میں بھی اپنے دوست کی یاد آتی ہے۔ یہ تو انسانی دل کا حال ہے۔ لیکن جب ایک بندہ اپنے الٰہ (معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود) کو یاد کرتا ہے جو دلوں کا حال جانتا ہے، تو وہ اپنے بندے کو کتنا یاد کرتا ہو گا۔ اس کا اندازہ اس کی رحمتِ بے پایاں سے لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کس پیار سے اپنے بندے سے کہتا ہے:

"مجھے یاد کرو، میں تمھیں یاد کروں گا۔"

ظاہر ہے جس بندے کو اُس کا الٰہ یاد کرے، جو خدائے متعال و ربّ جلیل ہے، اس سے بڑھ کر بندے کی اور خوش قسمتی کیا ہو سکتی ہے!

دوست وجہِ طمانیت و مسرت ہوتا ہے اور ذکرِ الٰہی بھی وجہِ طمانیت ہے۔ لٰہذا وہ بھی انسان کا دوست ہوا۔

آپؐ کے زیرِ نظر جُملے میں یہ بھی ایک بلیغ و بصیرت افروز نکتہ ہے کہ آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ کو بہت یاد کرتا ہُوں۔ بلکہ یہ فرمایا کہ ذکرِ الٰہی میرا انیس ہے۔ اور اس میں یہ نکتہ مضمر ہے کہ ایک تو اللہ تعالیٰ کا ذکر مجھے محبوب و مرغوب ہے، دُوسرے اس سے مجھے اُس کا پیار ملتا ہے جو سامانِ طمانیتِ دل ہے۔ تیسرے محبوب کو دل ہر وقت یاد کرتا رہتا ہے، کیونکہ اُس کی یاد تو تیرِ نیم کش کی طرح دل میں پیوست ہوتی ہے۔ صوفیہ کا یہ قول کہ "جو دم غافل سو دم کافر" اسی حقیقت کا

غماز ہے۔

۶۔ اعتماد میرا خزانہ ہے:

اصل میں ہے: الثقۃُ کنزی۔

یہ دو لفظی جُملہ معانی کا گنجینہ ہے۔ کلام کے سیاق و سباق اور آپؐ کی سیرتِ طیبہ کے لحاظ سے آپؐ کے اعتماد کی نوعیت سہ گونہ تھی۔ آپؐ کو ایک تو ذاتِ الٰہی پر، دُوسرے اپنی ذات پر اور تیسرے اپنے صحابہؓ یعنی اسلام کی تحریکِ انقلاب کے رُفقا پر اعتماد تھا۔ اللہ تعالیٰ پر اعتماد عبارت ہے توکلِ الٰہی سے۔ توکلِ الٰہی عبارت ہے انسان کے اس ایقان و اُمید سے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرتا ہے جو آپ اپنی مدد کرتے ہیں، اور وہ کسی کی محنت رائیگاں نہیں کرتا ہے۔ جدّو جہد اور مساعیِ جمیلہ کے بعد نُصرتِ الٰہی کی امید رکھنا توکل سے عبارت ہے۔ توکلِ الٰہی تین چیزوں پر دلالت کرتا ہے:

ایمان باللہ، یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات، مثلاً قدرت، علم، رحمت وغیرہ پر،

دوم قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل پر،

اور تیسرے انسان کی رجائیت پسندی پر۔

ان تینوں چیزوں میں ایسی قوت مضمر ہے جو انسان کی شخصیت کو عظیم و ناقابلِ تسخیر بناتی ہے۔

خود اعتمادی کامیابی کی ایک پیش شرط ہے۔ انقلابی عمل جو آپؐ کی بعثت کا بنیادی مقصد تھا اور جس کے ذریعے آپؐ ایک عظیم و ہمہ گیر جمالیاتی معاشرتی انقلاب لانے میں کامیاب ہُوئے، اس کی اساس خود اعتمادی پر ہے۔ خود اعتمادی کے بغیر شخصیتِ انسانی کٹے پتنگ کی طرح ہوتی ہے، لہٰذا اس میں بادِ مخالف کا مقابلہ کرنے کی قوت نہیں ہوتی۔ زمانے کی حریف قوتوں کا کامیابی سے مقابلہ کرنے، کوئی عظیم کارنامہ سرانجام دینے اور زندگی کے تجربات سے گزرنے کے لیے خود اعتمادی ناگزیر ہے۔

رفقا پر اعتماد کا مطلب سہ گونہ ہے۔ ان میں خود اعتمادی پیدا کرنا، ان کا اعتماد حاصل کرنا اور انھیں اپنا معتمد اور قابلِ اعتبار بنانا۔ ظاہر ہے اس اعتماد کے بغیر نہ تو کوئی قائد اپنے مشن میں کامیاب ہو سکتا ہے اور نہ کوئی سپہ سالار کامیابی سے جنگیں لڑ سکتا ہے۔ سیاسی اور عسکری میدان میں رفقا پر اعتماد کامیابی کی ایک لازمی پیش شرط ہے۔

مختصر یہ کہ اعتماد اپنی کُلی حیثیت میں قوت کا خزینہ ہے اور یہ قوت شخصیتِ انسانی کو ناقابلِ تسخیر بناتی ہے، نیز اس کی عظمت و کامیابی کی ایک پیش شرط اور قیادت کی ایک لازمی صفت ہے۔

۷۔ غم میرا رفیق ہے:

غم دو قسم کا ہوتا ہے: ایک غمِ ذات اور دُوسرا غمِ انسانیت، جسے غمِ روزگار اور غمِ عشق بھی کہتے ہیں۔ اپنی ذات کا

غم شخصیت کو مضمحل و ناتواں اور محدود و سوگوار بنا تا ہے اور اگر یہ بہت بڑھ جائے تو زندگی کا بارِ گراں بن جاتا ہے۔اس غم سے دل کو آتش خاموش لگ جاتی ہے اور وہ اذیت ناک عذاب بن جاتا ہے۔اس کے برعکس غمِ انسانیت میں ایک توذاتی و دُنیوی تمام غموں کو مٹا ڈالنے اور دوسرے شخصیت کو بے کراں بنانے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔علاوہ ازیں اس غم کی بدولت انسان میں بڑے سے بڑے امتحان سے بے خطر گزر جانے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔

قرآن مجید، احادیثِ طیّبہ اور کتبِ سیرت سے ثابت ہے کہ آپؐ کو اپنی ذات کا نہیں، انسانیت کا غم تھا اور اس غمِ انسانیت کی نوعیت محض مادی یا دُنیوی نہیں تھی بلکہ مادّی، روحانی یا دُنیوی، اُخروی تھی۔آپؐ ایک تو بنی نوعِ انسان کو ہر قسم کی استحصالی و طاغوتی (مثلاً فرعونی، ہامانی اور قارونی) قوتوں سے، نیز شرک وبُت پرستی کے عقاید و عبادات سے نجات دلانا چاہتے تھے۔ اور دُوسرے ان کے لیے اخوت و محبت اور آزادی و مساوات کی بنیادوں پر ایک حسین و مثالی معاشرہ تشکیل و تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ آپؐ کا یہ مشن تھا اور اس کی تکمیل کا آپؐ کو غم تھا۔اس غم کی شمع ہر وقت آپؐ کے قلب مبارک میں فروزاں رہتی تھی جس کی روشنی میں حُسن کی تابانی اور سوز میں آنکھوں کی ٹھنڈک تھی۔آپؐ کا غم آپؐ کی رحمت کی طرح عالمِ انسانی کو ہی نہیں تمام عالموں کو محیط تھا۔اس سے آپؐ کی شخصیت کی عظمت و بے کرانی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

۸ - علم میرا ہتھیار ہے :

اسلام میں علم کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، جس کا اندازہ مندرجہ ذیل امور سے لگایا جاسکتا ہے :

اوّل، نبی کی حیثیت سے آپؐ کا اہم ترین فریضہ بنی نوعِ انسان کو علم و حکمت سکھانا تھا۔

دوم، قرآن مجید جو علم و حکمت کا سرچشمہ اور مرشد و ہادی ہے، اس سے متقی لوگ ہی ہدایت و روشنی حاصل کرتے ہیں اور اہلِ علم ہی میں خشیتِ الٰہی یا تقوٰی ہوتا ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ تقوٰی، ایمان اور علم ایک ہی سلسلے کی تین کڑیاں ہیں۔

سوم، علم میں قوتِ تسخیر پائی جاتی ہے جس کے سامنے ملائکہ سربسجود ہیں اور اس کو تسلیم نہ کرنا شیطنت کا خاصّہ ہے۔

علم تین قسم کا ہے :

موضوعی، معروضی اور ماورائی۔

موضوعی علم سے مراد معرفتِ نفس ہے۔اس سے انسان کو اپنے اندر مضمر قوتوں کے خزینوں کا پتا چلتا ہے، جن کو فعل میں لاکر وہ عظیم و کامیاب بن سکتا ہے۔اگر انسان اپنی ان قوتوں سے بے خبر رہے تو ظاہر ہے وہ ان سے کام نہیں لے گا اور وہ ضائع ہوجائیں گی، جسے کفرانِ نعمت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔قرآن مجید اسے "خسران" یا نقصان پذیری بھی کہتا ہے۔

معروضی علم کا مطلب حقائقِ اشیا کو جاننا ہے۔ اس علم سے انسان میں تخلیق و تعمیر، ایجاد و اختراع اور زمان و مکان کو تسخیر کرنے کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ علاوہ بریں معروضی علم سے انسانوں اور قوموں کے نفسیاتی حقائق، دشمنوں کے منصوبوں اور ان کی مادی و اخلاقی قوت کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ معلومات فتح و کامرانی کی پیشں شرائط ہیں۔

ماورائی علم سے مراد اللہ تعالیٰ کی صفات و آیات کی معرفت ہے۔ اس کے من جملہ دیگر فوائد کے ایک یہ ہے کہ اس سے فکر و نظر میں تاریخ کے تیور پہچاننے کی صلاحیت اور زمان و مکان کی حدود سے ماوراء جانے کی قوت پیدا ہوتی ہے، جسے اصطلاحِ قرآنی میں "سلطان" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس علم سے انسان میں مستقبل بینی کی صلاحیت کے علاوہ قدرت کے قانونِ مکافات اور اُخروی زندگی کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ حکمت، جسے قرآن حکیم نے خیرِ کثیر کہا ہے، اس کی ناگزیر پیش شرط علم ہے۔ لہٰذا علم و قوت اور حکمت و خیرِ کثیر ایک ہی سلسلے کی مربُوط و لاینفک کڑیاں ہیں۔

آپؐ اسلام کی تحریکِ انقلاب کے علمبردار تھے، اور اس انقلابی عمل میں آپؐ کو کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ کی اجتماعی قوتوں کا مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ اور یہ مقابلہ آپؐ نے علم کی قوت سے کیا تھا۔ جیسا کہ آپؐ کے ارشاد اَلْعِلْمُ سِلَاحِی (علم میرا ہتھیار ہے) سے ثابت ہے۔ آپؐ کے اس ارشاد میں یہ از بس اہم نکتہ بھی مضمر ہے کہ آپؐ نے تلوار کے ذریعے نہیں بلکہ علم کی قوت سے اسلام دشمن قوتوں پر کامیابی حاصل کی اور ان کے دلوں کو مسخر کر کے انھیں اپنی تحریکِ اسلام میں شامل کیا۔ اس سے صلیبی و صیہونی مستشرقین کے اس غلط اور گمراہ کن پروپیگنڈے کی تردید ہوجاتی ہے کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے۔

۹۔ صبر میرا لباس ہے:

لباس عریانی اور جسمانی معائب کی پردہ پوشی کرنا، شدایدِ موسم سے بچاتا، نیز آراستگی و تزئین کے کام بھی آتا ہے۔ لہٰذا صبر بھی انسان کی کئی قسم کی نفسیاتی و مادی کمزوریوں اور عیوب کی پردہ پوشی کرتا، اسے خوف و غم کی اذیتوں، اغیار کی شماتت و تشنیع اور طنز و استہزا سے بچاتا اور عزتِ نفس کی حفاظت کرتا ہے۔ نیز وہ انسان کا بھرم قایم رکھتا اور اس کی ہوا اُکھڑنے نہیں دیتا۔

آپؐ اسلام کی تحریکِ انقلاب کے قائد تھے اور اس راہ میں آپؐ کو قدم قدم پر خطرناک اور شکیب ربا دشواریوں اور مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن آپؐ نے نہ تو کبھی کسی قسم کی کمزوری، بزدلی اور خوف و خطر کا مظاہرہ کیا، نہ آپؐ کے پائے عزم و ثبات میں لغزش آئی اور نہ کبھی راہِ فرار اختیار کرنے کی کوشش ہی کی، بلکہ شجاعت و مردانگی سے ان کا مقابلہ کیا اور تیروں اور تلواروں کے سائے میں بھی آپؐ چٹان کی طرح ثابت قدم رہے۔ نتیجۃً نصرتِ الٰہی ہمیشہ ہی آپؐ کے شاملِ حال رہی۔

قرآن مجید نے بار بار یہ حقیقت بے نقاب کی ہے کہ نصرتِ الٰہی صبر کرنے والوں کے شاملِ حال ہوتی ہے۔ صبر

ان چار چیزوں میں سے ہے جو انسان کو انفرادی اور اجتماعی طور پر تاریخ کی حریف قوتوں کی مضرتوں، معاشرتی و نفسیاتی اور اخلاقی و روحانی بیماریوں اور زندگی کے جمود و تعطل کے نتائج سے محفوظ رکھتا ہے۔ صبر کو لباس بنانے میں یہ نکتہ مضمر ہے کہ انسان کو حسین انداز میں صبر کرنا چاہیے یا دُوسرے لفظوں میں اس کو صبرِ جمیل کرنا چاہیے۔

۱۰- رضا میرا مالِ غنیمت ہے:

رضا سے مراد رضائے الٰہی ہے، اور جنگ میں دشمن کا جو ساز و سامان اور مال و دولت ہاتھ لگے، اسے مالِ غنیمت کہتے ہیں۔ قرونِ وسطیٰ میں فوجی سپاہیوں کو مالِ غنیمت کا لالچ تھا اور یہ لالچ جنگ و جدال کا ایک زبردست محرک تھا۔ اسلام نے ایسی جنگوں کے خاتمے اور پائیدار بین الاقوامی امن کی خاطر مالِ غنیمت کے لالچ کو بڑے حکیمانہ طریق سے ختم کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس نے اہلِ ایمان میں اس حقیقت کا اذعان و ایقان پیدا کیا کہ جنگ فقط اللہ تعالیٰ کی راہ اور رضا کے لیے ہونی چاہیے جسے جہاد فی سبیل اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نیز مالِ غنیمت کے لالچ میں لڑنے والوں کو کوئی اجر نہیں ملتا، چاہے وہ جان ہی کیوں نہ دے ڈالیں۔ اسلام کے نزدیک مجاہد وُہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد و قتال کرتا ہے اور اگر اس میں ہلاک ہو جاتا ہے تو وہ شہید ہوتا ہے اور شہادت کا اجر جنّت کی حیاتِ ابدی ہے۔

"رضائے الٰہی میرا مالِ غنیمت ہے۔"

آپؐ کے اس ارشاد سے مستشرقین اور دیگر اعدائے اسلام کے اس گمراہ کن پروپیگنڈے کا بطلان ہو جاتا ہے کہ آپؐ مالِ غنیمت اور کشور کشائی کے لیے جنگیں لڑتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض جنگوں میں مالِ غنیمت بھی ہاتھ لگا، لیکن آپؐ نے ہمیشہ اسے لوگوں میں تقسیم کر دیا اور اپنے لیے کچھ نہ رکھا۔ کتبِ حدیث و سیرت شاہد ہیں کہ آپؐ اور آپؐ کے اہل و عیال نے عمر بھر فقر و فاقہ میں زندگی بسر کی۔ آپؐ کی انقلابی اور تعمیری سرگرمیوں کی غایتِ حقیقی فقط رضائے الٰہی تھی۔ صحابہ کرامؓ جو آپؐ کی سنّتِ طیبہ کی بڑی سختی سے پیروی کرنے والے تھے اُن کی زندگی کا مقصودِ حقیقی بھی رضائے الٰہی تھا۔

۱۱- عجز میرا فخر ہے:

انسان خلقی طور پر کمزور، اللہ تعالیٰ کا محتاج اور اس کا بندہ ہے، اس لیے بندۂ محتاج کو عجز و تواضع ہی سزاوار ہے۔ کبریائی کا سزاوار فقط اللہ تعالیٰ ہے۔ انسان کا حقیقی مقام عبدیت ہے اور یہ مقام حاصل کرنا ہی اس کی سب سے بڑی کامیابی ہے اور عظمت کی دلیل بھی۔ اِنسان جب اس مقام پر متمکن ہو جاتا ہے تو اس کا دل غرور و تکبّر سے پاک صاف اور عجز و انکسار سے معمور ہو جاتا ہے، اور یہ متاعِ عجز و انکسار ہی اس کا سرمایۂ عزت و افتخار ہے۔

تقویٰ اور ایمان لازم و ملزوم ہیں اور تقویٰ یا خشیتِ الٰہی کا خاصّہ عجز و انکسار ہے، لہٰذا مومن کے کردار، گفتار میں عجز و انکسار ہوتا ہے جو ایمان کا خاصّہ بھی ہے اور اس کی شناخت بھی۔ اور مومن اسے حُسنِ خلق اور سرمایۂ افتخار

سمجھتا ہے۔ چونکہ آپؐ تقویٰ اور ایمان میں سب افرادِ نسلِ انسانی سے افضل تھے، اس لیے عجز و انکسار میں بھی آپؐ سب پر افضلیت و فوقیت رکھتے تھے حالانکہ آپؐ بیک وقت پیغمبرِ اعظم و آخر بھی تھے اور حکمران بھی، ہادی و مُرشد بھی تھے اور معلّم و سپہ سالار بھی تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلمان آپؐ کے ایک اشارے پر مال و جان اور اہل و عیال قربان کر دینے کو اپنی خوش قسمتی سمجھتے تھے۔

عظمتِ انسانی کے بلند ترین مقامِ محمود پر متمکن پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلّم کا اپنے عجز و انکسار کو اپنا سرمایۂ افتخار سمجھنا، ہمیں اس حقیقت کی یاد دہانی کراتا ہے کہ بندے کو عجز ہی سزاوار ہے اور اسی کو اپنے لیے وجۂ افتخار سمجھنا چاہیے۔

۱۲- زُہد میرا پیشہ ہے:

زُہد کی حقیقت آپؐ کی سیرت کے حوالے سے مندرجہ ذیل آیات سے واضح ہوجاتی ہے:

"جب تم فراغت پاؤ تو عبادت میں لگ جاؤ اور اپنے رب ہی کی طرف راغب رہو۔"

چنانچہ آپؐ کا عمر بھر یہ شعار رہا کہ آپؐ تحریکِ اسلام و تبلیغ کے امور سے فارغ ہوتے تو اپنے الٰہ (معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود) کی رضا و دید کے لیے اس کی بارگاہِ حسن میں پہنچ جاتے۔ اس کی یاد تیرِ نیم کش کی طرح آپؐ کے قلبِ مبارک میں پیوست تھی، اس لیے کہ دوست کے بغیر کسی کروٹ آپؐ کو قرار نہ تھا۔ لہٰذا راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر "بارگاہِ دوست" میں حاضر ہونا، اس کی حمد و ثنا میں رطب اللسان رہنا، کبھی عجز و نیاز سے رکوع و سجود کرنا اور کبھی آہ و فغاں اور گریہ و زاری سے دردِ محبت کا اظہار کرنا آپؐ کا دستورِ زندگی تھا۔

۱۳- یقین میری قوّت ہے:

یقین کی تین قسمیں ہیں:

علم الیقین، عینُ الیقین اور حق الیقین۔

اور یہی اس کے ارتقائی مدارج ہیں۔ علم الیقین عقل سے، عین الیقین مشاہدے سے اور حق الیقین تجربے سے حاصل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر دُھواں نظر آئے تو عقل آگ پر قیاس کرتی ہے اور اسے علم الیقین کہتے ہیں، لیکن آگ نظر آئے تو اسے عین الیقین اور جب آگ کے لمس سے اس کی حدّت و سوزش محسوس ہو تو اسے حق الیقین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یقین چونکہ عقل، مشاہدے اور تجربے سے حاصل ہوتا ہے، اس لیے اس میں علم، واقعیت اور صداقت کی قوّت ہوتی ہے۔ اس قوّت سے دل میں صدق و طمانیت، عزم و ہمّت اور صبر و استقامت ایسے خصائص پیدا ہوتے ہیں جن کی بدولت انسان بڑی سے بڑی قربانی کرنے سے دریغ نہیں کرتا اور بڑے سے بڑے امتحان و تجربے سے گزر جاتا ہے۔ یقین کی قوّت ہی سے عقاید میں جلالت و حرکت پیدا ہوتی ہے، اور عقایدِ جلیلہ و محرّکہ ہی فرد و قوم کی قوّت و عظمت اور

ترقی و کامیابی کے ضامن ہوتے ہیں۔ ہمیں یہ اصل یاد رکھنی چاہیے کہ یقین کی قوت کے بغیر عقاید و ایمانیات بے جان ہوتے ہیں اور ان کی حیثیت نظریات و خیالات کی سی ہو جاتی ہے۔ مُردہ عقاید کی نوعیت "مردہ بدستِ زندہ" کی سی ہوتی ہے۔ اس سے اس امر کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ مُردہ قومیں کیوں زندہ اقوام کی تقلید کرتی ہیں۔ قوتِ یقین سے محروم ہونے کے باعث جب کسی قوم کے عقاید مُردہ یا بے جان ہو جاتے ہیں تو اسے "مُردہ قوم" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس قوتِ یقین کی بدولت جس قوم کے عقاید زندہ، جلیل اور حرکی ہوتے ہیں، وہ زندہ کہلاتی ہے، اور زندہ قومیں ہی قوت و سطوت کی مالک، ترقی کی راہ پر گامزن، زمانے کی راکب اور مُردہ قوموں کی قائد ہوتی ہیں۔

بحیثیت پیغمبرِ اعظم و آخرؐ اور رحمۃ للعالمینؐ کے آپؐ کا مشن ہمہ گیر و عالمگیر تھا اور آپؐ کو اس کی صداقت و اہمیت کا حق الیقین تھا، اس لیے آپؐ کا یقین اور اس کی قوت بھی اسی نسبت سے غیر محدود تھی۔ اس یقین نے بلاشبہ آپؐ کی عظیم و بے مثال کامیابیوں میں ازبس اہم کردار ادا کیا تھا۔

۱۴۔ صدق میرا حامی و سفارشی ہے :

امام راغب اصفہانیؒ کے نزدیک الصّدق کے معنی ہیں : دل و زبان کی ہم آہنگی اور بات کا نفسِ واقعہ کے مطابق ہونا۔ اگر دونوں میں کوئی ایک شرط نہ پائی جائے تو کامل صدق باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ صدیق اس شخص کو کہتے ہیں جو طبعاً سچا ہو اور سچ بولنا اس کی عادت ہو۔ اصل یہ ہے کہ قلب اپنی فطری یعنی خالص و حسین حالت پر ہو تو اس میں صدق ہوتا ہے۔ یہ موضوعی صدق ہے جو معرضِ اظہار میں آئے تو معتبر بنتا ہے۔

انسان طبعاً سچ کو پسند کرتا اور اس سے مثبت طور پر متاثر ہوتا ہے، کیونکہ سچ میں حُسن کی تاثیر ہوتی ہے۔ چنانچہ جس بات اور کام میں صدق ہو، اُس میں قوتِ اثر و نفوذ ہوتی ہے، جو اس کے فاعل یا کرنے والے کی حامی و ناصر (شفیع) بن جاتی ہے۔ یہ مقولہ کہ "سچ کو آنچ نہیں" اسی حقیقت کا غماز ہے۔

جس طرح صِدّیق قرآن مجید کی رُو سے صالح و شہید بھی ہوتا ہے، اسی طرح نبی کا صِدّیق ہونا بھی ناگزیر ہے۔ چونکہ انبیاء علیہم السّلام انسان کے معلّم و ہادی اور مرشد و مربّی بن کر مبعوث ہوتے تھے، لہٰذا قدرت ان کے قلوب کی حفاظت کرتی اور انھیں ان کی فطری یعنی حُسن و صدق کی حالت پر رکھتی تھی۔ چنانچہ آپؐ بعثت سے پہلے بھی صِدّیق تھے اور "صادق و امین" کے لقب سے معروف تھے۔ آپؐ چونکہ اسلام کی انقلابی تحریک کے بانی و علمبردار تھے، جو دنیا کے تمام معاشروں کے لیے ایک چیلنج تھی، اس لیے آپؐ کو اپنے زمانے کی طاغوتی و فرعونی اور ہامانی و قارونی قوتوں کی زبردست مزاحمت و مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، اور ازبس خطرناک امتحانوں اور تجربوں میں سے گزرنا پڑا تھا، اور جیسا کہ آپؐ کا ارشاد ہے، آپؐ کا یہ صدق تھا جس نے قدم قدم پر آپؐ کی حمایت و تائید کی اور لوگوں کے دلوں کو مرعوب و مسخر کرنے اور رام کرنے میں ازبس اہم کردار ادا کیا۔

۱۵۔ طاعت میری کفایت کرنے والی ہے :

طاعت سے مراد اطاعتِ الٰہی ہے اور اس کے معنیٰ ہیں : فرماں برداری ، نظم وضبط کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے احکام (اوامر و نواہی) کی تعمیل اور عبادت کرنا۔ اللہ تعالیٰ کی طاعت کا مطلب اس کا بندہ بن جانا ہے ، اور بندگی سے خدا ملتا ہے ، اور جسے خدا مل جائے وہ اس کے لیے کافی ہوجاتا ہے اور اسے دنیا سے مستغنی کر دیتا ہے۔ اسے تصوّف میں فقر و غنا سے تعبیر کیا جاتا ہے آپؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ اللہ میرے لیے کافی ہے ، بلکہ یہ فرمایا کہ اس کی طاعت میرے لیے کافی ہے۔ اس میں دو لطیف نکات مضمر ہیں ،

ایک یہ کہ آپؐ کے اس ارشاد میں عجز و انکسار پایا جاتا ہے ، جو آپؐ کا حُسنِ شعار تھا۔

اور دوسرا یہ کہ طاعت سے خدا ملتا ہے ۔

بہرحال آپؐ کی ساری زندگی طاعتِ الٰہی میں گزری اور آپؐ کی سیرتِ طیّبہ طاعتِ الٰہی کا حسین نمونہ ہے ، اسی لیے طاعتِ الٰہی کے ساتھ آپؐ کی اطاعت کو بھی مسلمانوں پر فرض قرار دیا گیا ۔

۱۶۔ جہاد میرا خُلق ہے :

جہاد مقدور بھر جدّ وجہد اور مساعیِ جمیلہ سے عبارت ہے ۔ امام راغب اصفہانیؒ لکھتے ہیں : الجِہادُ والمُجاھدۃ کے معنی دشمن کے مقابلے میں پُوری طاقت صرف کرنے کے ہیں ۔ جہاد کی تین قسمیں ہیں :

۱۔ کفار سے ۲۔ شیطان سے اور ۳۔ اپنے نفس سے ۔

اس کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال وجان کے ساتھ جدّ وجہد کرنا ، جس میں جنگ و قتال بھی شامل ہے ۔

خَلق اور خُلق اصل میں دونوں ایک ہی ہیں ، جیسے شَرب و شُرب ۔ مگر ان میں فرق یہ ہے کہ خَلق بمعنی خلقت یعنی ہیئت اور شکل وصورت پر بولا جاتا ہے جس کا تعلق اور اک بصر سے ہوتا ہے ۔ خُلق کا لفظ عادت اور خصلت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جس کا تعلق بصیرت سے ہوتا ہے ۔ آپؐ کی سیرتِ طیّبہ شاہد ہے کہ آپؐ کی ساری عمر مسلسل جدّ وجہد ، مقدور بھر محنت ومشقت اور مساعیِ جمیلہ میں گزری ۔ بعثت سے پہلے آپؐ کا جہاد نفس و شیطان کے خلاف تھا اور بعثت کے بعد اس میں کفار و مشرکین کے خلاف جہاد کا بھی اضافہ ہوگیا ۔ لہٰذا آپؐ کی عظیم وکامیاب اور بے نظیر و مثالی زندگی ہمیں اس حقیقت کی یاد دلاتی ہے کہ عظمت و کامیابی کی راہ مسلسل جدّ وجہد ، مقدور بھر محنت ومشقت اور مساعیِ جمیلہ کی مرہونِ منت ہوتی ہے ۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جہاد کو اسلام میں از بس اہمیت حاصل ہے ۔

۱۷ - نماز میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے :

اصل میں ہے : قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ ۔ قرّۃ کے لغوی معنی ہیں ٹھنڈک، جو طمانیت و مسرّت کا حاصل ہے۔ الصّلٰوۃ کے معنی نماز ہیں ، لیکن جس نماز سے دل کو طمانیت و مسرّت کی ٹھنڈک پہنچتی ہے اسے حدیثِ طیبہ میں " احسان " سے تعبیر کیا گیا ہے۔ احسان مقامِ شہود ہے ۔ آپؐ نے اس کی حقیقت اس طرح بیان فرمائی ہے کہ عبادت کے وقت انسان یہ محسوس کرے کہ گویا وہ اپنے الٰہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے ۔ اگر یہ مقام حاصل نہ ہو تو وہ یہ محسوس کرے گویا اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے ۔

اللہ تعالیٰ کے متعلق اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ حُسنِ حقیقی ہے اور بنی نوع انسان کا الٰہ اور ربِ رحیم ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے جذبۂ محبت کی تشفّی اپنے حقیقی الٰہ کے قُرب و حضوری اور دید و لقا سے حاصل ہوتی ہے اور اس کا ایک بہترین ذریعہ نماز ہے ۔ نیز اس جذبۂ محبت کی تشفّی سے انسان کو ایسی طمانیت و مسرّت ملتی ہے جس کا حاصل ٹھنڈک ہوتا ہے آپ چونکہ مستقلاً احسان یعنی مقامِ شاہدیت پر متمکن تھے جسے " مقامِ محمود " سے تعبیر کیا گیا ہے ، اس لیے آپؐ کو نماز میں ہمیشہ ہی " دیدِ الٰہ " میسر آتی تھی ، اور اس کی بدولت آپؐ کا قلبِ مبارک کیف و سرور سے معمور ہو جاتا تھا ۔ اس سے یہ نتیجہ مستنبط ہوا کہ نماز اصل میں وُہ ہے جو آنکھوں کی ٹھنڈک ہو اور نماز کو اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک بنانا آپؐ کی سُنّتِ حسنہ ہے ، اور زندگی کا مقصود اور عبادات کا حاصل ہے ۔ چنانچہ مولانا رومؒ فرماتے ہیں : ؎

آدمی دید است باقی پوست است ۔۔۔ دید آں باشد کہ دیدِ دوست است

جُملہ تن را در گداز اندر بصر ۔۔۔ در نظر رو ، در نظر رو ، در نظر

یعنی انسان حقیقت میں شہود یا دید ہے ۔ دید کا مطلب رُویتِ الٰہی ہے یعنی اپنے الٰہ کا دیدار ۔ لہٰذا اپنے اندر دیکھنے کی قوت پیدا کرنے کی خاطر ریاضت و مشقّت کے ذریعے اپنے وجود کو شمع کی طرح گُھلا ڈالو (اور پھر مقامِ شاہدیت پر متمکن ہو کر) ہمیشہ اسے دیکھتے رہو ۔

حاصلِ کلام یہ کہ آپؐ کے محوّلۂ بالا اخلاقِ حسنہ کو اپنے اندر پیدا کرنا اور انھیں معرضِ اظہار میں لانا ، نیز آپؐ کی سیرتِ طیّبہ کے سانچے میں اپنی زندگی کو ڈھالنا ہی اصل میں سُنّتِ حسنہ کی پیروی کرنا ہے اور یہی آرزوئے اسلام ، غایتِ زندگی ، مشیّتِ ایزدی اور فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے ۔ وجہ یہ ہے کہ اس طرح ہی انسان عظیم و کامیاب اور صاحبِ حُسن و سرور بن سکتا ہے ۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

محمدؐ اللہ کے رسولؐ ہیں

"آیتِ بالا میں نبی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا نام بھی ہے اور حضورؐ کا منصب بھی بتایا گیا ہے، ہر دو اعتبار سے آیتِ بالا خصوصیّاتِ نبویّہ کی مظہر ہے۔"

واضح ہو کہ انبیائے کرام علیہم السّلام میں سے کسی نبی کا نام بھی ایسا نہیں پایا جاتا کہ وُہ نام ہی اپنے مسمّٰی کے کمالاتِ نبوّت کا شاہدِ عدل ہو، بہ طورِ نمونہ چند اسمأ کا ذکر کیا جاتا ہے:

آدمؑ : کے معنی گندم گوں ہیں، ابوالبشر کا یہ نام اُن کے جسمانی رنگ کو ظاھر کرتا ہے۔

نوحؑ : کے معنی آرام ہیں، باپ نے ان کو آرام و راحت کا موجب قرار دیا۔

اسحٰقؑ : کے معنی ضاحک، یعنی ہنسنے والا ہیں، ہشاش بشاش چہرہ والے تھے۔

یعقوبؑ : پیچھے آنے والا، یہ اپنے بھائی عیسو کے ساتھ توام پیدا ہوئے تھے۔

موسٰیؑ : پانی سے نکالا ہُوا، جب ان کا صندوق پانی میں سے نکالا گیا، تب یہ نام رکھا گیا۔

یحیٰیؑ : عمردراز، بُڈھے ماں باپ کی بہترین آرزوؤں کا ترجمان ہے۔

عیسٰیؑ : سُرخ رنگ، چہرہ گلگوں کی وجہ سے یہ نام تجویز ہُوا۔

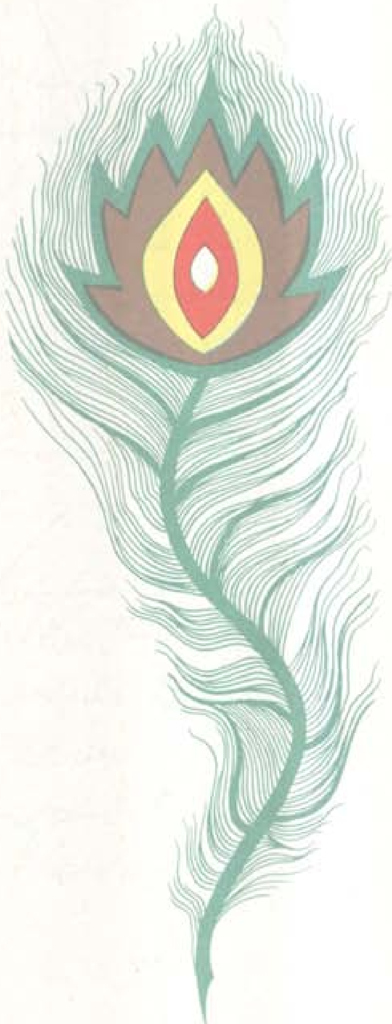
اسمأبالا کو دیکھو اور ان کے معانی پہ غور کرو کہ وہ کسی طرح مسمّٰی کی عظمتِ رُوحانی یا نبوّت کی طرف ذرا سی بھی اشارت نہیں رکھتے۔

مگر اسمِ محمّدؐ کی شان خاص ہے۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم

تم میں سے ایک رسول تمہارے پاس آیا ہے۔ جس کو تمہارا دکھی ہونا بہت شاق ہے اور جو تمہارا سکھ چاہتا ہے

(التوبۃ: ۱۲۹)



اصلاحِ معاشرہ

کارنامۂ سیرت، بے رحم تاریخ کی کسوٹی پر

مولانا ابوالکلام آزاد

وجودِ مقدس کی لاانتہائیت

آپ کو معلوم ہے کہ اس موضوع کی اہمیت۔ اہمیت کا لفظ کافی نہیں، لاانتہائیت کا کیا حال ہے؛ جس وجودِ مقدس کے تذکار کے لیے ہم جمع ہوئے ہیں، تاریخِ انسانیت کی کامل تیرہ[13] صدیاں اس پر گزر چکی ہیں اور شاید کوئی انسانی ہستی اس ذاتِ گرامی کے سوا ایسی نہیں گزری، جس کے تمام گوشہ ہائے زندگی کا عقلِ انسانی نے اس قدر سراغ لگایا ہو، جس قدر اس مقدس و عظیم الشان ہستی کے لیے لگایا جارہا ہے مگر داستانِ حیات اس ذاتِ گرامی کی ہنوز نامکمل ہے۔ وجودِ مقدس کی حقیقت کا پتا لگانے کے لیے سمندر کی موجوں کو ایک کُوزہ میں اور دریاؤں کی روانی کو اگر قطرے میں بند کیا جاسکتا ہے تو شاید ہی کوئی اس کا کھوج لگا سکے۔ میں کوشش کروں گا کہ اسی ایک قطرے کے حسن و وصف کے تذکارِ اقدس میں یہ وقت گزارا جائے۔

مطالعۂ سیرت کے طریقے

میں آپ کو جس رُخ پر لے جانا چاہتا ہوں وہ رُخ کون سا ہے؛ سیرتِ پاک پر نظر ڈالنے کے لیے ایک نہیں، بیشمار دروازے ہیں، جن کے ذریعے سے اس کی کبریائی کی سراغ رسانی کی جاسکتی ہے۔ لیکن میں کوشش کروں گا کہ کم سے کم اور قریب ترین راستے سے اس کی عظمتوں کا مطالعہ کرا سکوں۔ میں اس امر کی کوشش کروں گا کہ وہ تمام اوصاف و واقعات جو سیکڑوں بار دُہرائے جاچکے ہیں اور جن کو صدہا بار آپ کے کانوں نے سنا ہوگا انھیں نظر انداز کردوں۔ میں کوشش کروں گا کہ کوئی ایسا نقطۂ نگاہ آپ کے سامنے پیش کروں کہ اس کے اعمالِ عظیمہ کو یقینی معیار پر رکھ کر آسانی سے جانچ سکے۔ ایسا معیار ہم اپنی طرف سے بنانا نہیں چاہتے، ہمیں دیکھنا ہے کہ قرآنِ حکیم نے کیا کوئی ایسا معیار بیان کیا ہے، اگر بیان کیا ہے تو اس کے ماتحت اس کے اعمالِ حسنہ کا کیا حال ہے!

قرآنی معیار

جب ہم قرآنِ حکیم کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس وجودِ گرامی اور زندگیِ مقدس کے لیے بے شمار معیار ملتے ہیں، جس کو

خود آپ نے بھی بارہا سُنا ہوگا۔ ہاں! سنا ہوگا، لیکن اس کی گہرائیوں تک غور نہ کیا ہوگا۔

اچھا سُنو، ان میں سے ایک معیار وہ ہے جو سورۂ انبیاءؑ میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے:

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ۝ إِنَّ فِي هَٰذَا لَبَلَاغًا لِّقَوْمٍ عَابِدِينَ ۝ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ۝

(۲۱ ـ ۷ ـ ۱۰۵)

اور (دیکھو) ہم نے زبور میں تذکیر و نصیحت کے بعد یہ بات لکھ دی تھی کہ زمین کی وراثت انھی بندوں کے حصے میں آئے گی جو نیک ہوں گے۔ اس بات میں ان لوگوں کے لیے جو عبادت گزار ہیں، یہ ایک بڑا ہی پیام ہے۔ اور (اے پیغمبر!) ہم نے تجھے نہیں بھیجا ہے مگر اس لیے کہ تمام دنیا کے لیے رحمت کا ظہور ہو۔

اس آیت میں ایک معیار بتایا گیا ہے ہر معتقد کے لیے جو دیکھ لینا چاہے اور ہر منکر کے لیے جو پرکھنا چاہے۔

رحمۃ للعالمین

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس وجودِ گرامی کا ظہور کس ماحول میں ہوا اور اس نے کیا نتائج نکالے! میں ابھی آپ کے سامنے چند کارنامے اس وجودِ مقدس کے پیش کروں گا فیصلہ خود آپ کے سامنے آجائے گا۔ "وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ" اس کا ظہور اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ رحمۃ للعالمین تمام نوعِ انسانی کے لیے رحمت۔ کسی ایک ٹکڑے، کسی ایک گوشے کے لیے نہیں تمام نوعِ انسانی کے لیے، مشرق و مغرب کے لیے، اسود و احمر کے لیے۔ کسی ایک خاص قوم کے لیے نہیں، اقوامِ عالم کے لیے اللہ کا یہ اعلانِ حق ہے۔ قرآن کے اس اعلانِ حق سے آج تک کوئی منکر بھی انکار نہیں کر سکا، بلکہ تاریخ کے جتنے ابواب و اوراق اُلٹے گئے اس اعلان کی صداقت و حقانیت واضح بلکہ واضح تر ہوتی گئی اور اس وجودِ گرامی کا رحمۃ للعالمین ہونا ہر اعتبار سے اور ہر نوعیت سے ثابت و درست ہوتا گیا۔ کسی محقق کی بھی خواہ وہ کتنا ہی مخالف ہو یہ مجال نہیں ہوئی کہ قرآن کریم کے اس معیار کو غلط ثابت کر سکے اور اس وجودِ اقدس کے اعمالِ حسنہ پر حرف رکھ سکے، اس کا ہر عمل بجائے خود دلیل بن کر پکارا کہ ہاں میں رحمت ہوں۔

اگر کسی نوعیت سے یہ رحمت نہ ہو تو پھر رحمت ہوتا کون اور ہے کیا؟ تاریخ کو کون جھٹلا سکتا ہے، کوئی بھی تاریخ اٹھاؤ تم دیکھو گے کہ ہر امتیاز، ہر پرکھ ایک اُبھری ہوئی نشانی ہے۔ ہر عمل عملِ خیر اور معیارِ رحمت ہے، ایسا کہ ہر نظر، ہر نگاہ، ہر دل، ہر دماغ اعتراف و تسلیم کرے گا کہ بلا شک و شبہ یہی وجودِ گرامی رحمتِ الٰہی ہے۔

بے کس اور مجبور انسان

دوسرا معیار، اس ذاتِ اقدس کے رحمۃ للعالمین ہونے کا قرآن حکیم کی ایک دوسری آیت سے ثابت ہے جو سورہ

اعراف میں ملتی ہے۔ وہاں فرمایا:

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ [1]

اس آیت کا مقصد و نتیجہ کیا ہے؟ پہلے تم کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ "اصر" کے معنی کیا ہیں۔ عربی میں "اصر" کے معنی بوجھ کے ہیں۔ معمولی قسم کا بوجھ نہیں بلکہ ایسا ناقابلِ برداشت بارِ شدید جو کسی کو تہ کر دے۔ اکثر آپ نے دیکھا ہوگا کہ کوئی شخص سر پر بوجھ اٹھائے چلا جا رہا ہے لیکن شدتِ بار سے اس کی کمر جھکی چلی جا رہی ہے، خم ہوئی جاتی ہے۔ پھر اس طرح کی حالت کو عربی زبان میں اِصر کہتے ہیں۔

"اغلال"، اغلال کے معنی ہیں محنت و مشقت میں مبتلا، مفہومِ عام میں جکڑ بند رہنا، طرح طرح کے شدائد اور سختیوں میں، مصائب و آلام میں محصور اور قسم قسم کے دام، بیڑیاں، پھندے، جن میں انسان قید و بند میں مبتلا رہے۔

غور کرو! قبل ظہورِ اسلام کیا اقوامِ عالم کی بالکل یہی حالت نہ تھی؟ تاریخ کے اوراق سے پوچھو کیا وہ انہی آلام و مصائب کا علی الاعلان ثبوت پیش نہیں کر رہے؟ قبلِ بعثت کیا انسانی گردنوں میں طرح طرح کے پھندے، ان کے پاؤں میں قسم قسم کی بیڑیاں نہیں پڑی ہوئی تھیں؟ نسلِ انسانی کیا رنگ رنگ کی جکڑ بندیوں میں جکڑی ہوئی نہ تھی، ایسی کہ ان کی کمریں دوتہہ ہوئی جاتی تھیں اور اس وقت انسانی کاندھوں پر جو بوجھ لدے ہوئے تھے کیا اُنھوں نے ان کی زندگی کو تلخ نہیں بنا ڈالا تھا؟ قانون کے جو پھندے ان کی گردنوں میں، مذہبی آستانوں کے جو حلقے ان کے جسموں میں لپٹے ہوئے تھے، کیا ان سے ان کی جسمانی و روحانی تسکین پامال نہیں ہو رہی تھی؟ ہاں ایسا ہی تھا اس وقت کی صدہا اقسام کی مذہبی و قانونی جکڑ بندیاں ایک لعنت بن کر نسلِ انسانی و نوعِ بشری کے ساتھ چپک گئی تھیں اور انسانوں کے ساتھ انسانیت کا بھی خون ہو رہا تھا اور یہ میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا، مستشرقین یورپ کی تحقیقی رپورٹ اور تاریخ کے اوراق بھی یہی کہتے ہیں۔

ظہورِ نبویؐ اور نویدِ امن

عین اسی عالمِ یاس و آہ میں سرزمینِ مکہ سے ایک آواز بلند ہوتی ہے جو طالبانِ نجات کے لیے وجہِ نجات ثابت ہوتی ہے۔ یہ اعلان کوئی معمولی اعلان نہیں تھا۔ کیا اعلان؟ اعلان کہ ایک ہستی آئی ہے، کیوں آئی ہے؟ کرۂ ارضی پر بسنے والی نوعِ انسانی کے لیے پیامِ رحمت لے کر، زمین کی پیٹھ پر، اس طبقہ انسانی کے لیے، جس کی گردنوں میں ظالمانہ قانون کے پھندے اور پاؤں میں بے رحمانہ احکام کی بیڑیاں، کندھوں پر مصائب و آلام کے اور مشقت و مصیبت کے

---

[1] سورۂ اعراف کی آیت، ۱۵۷ جس کا ترجمہ یہ ہے: جو الرسول کی پیروی کریں گے کہ نبی اُمّی ہوگا اور اس کے ظہور کی خبر اپنے یہاں تورات اور انجیل میں لکھی پائیں گے، وہ انھیں نیکی کا حکم دے گا، برائی سے روکے گا، پسندیدہ چیزیں حلال کرے گا، گندی چیزیں حرام ٹھہرائے گا۔ اس بوجھ سے نجات دلائے گا جس کے تلے دبے ہوں گے اور ان پھندوں سے نکالے گا جس میں وہ گرفتار ہوں گے۔

ناقابلِ برداشت بوجھ لدے ہوئے ہیں، پیغامِ آزادی لے کر ہر اس کمر کے لیے جو بوجھ سے دوتہہ اور ہر اس گردن کے لیے جو طرح طرح کی ظالمانہ جکڑ بندیوں میں جکڑی ہوئی ہے، نویدِ امن لے کر آئی ہے۔

تاریخ کی شہادت

یہ دو معیارِ تفتیش ہیں جن کو لے کر میں بحث و نظر کے میدان میں آتا ہوں، حُسنِ اعتقاد کے ساتھ نہیں، تحقیق و تدقیق کے اصول پر، اپنا نظریہ نہیں' تاریخ کا بے رحمانہ فیصلہ' بے لاگ فیصلہ، وہ تاریخ جو کبھی کسی کے سامنے نہ جُھک سکے، جس کو دنیا کی کوئی قوت متاثر نہ کر سکے، جس کو دنیا کی کوئی دولت خرید نہ سکے، جس کو دنیا کی کوئی طاقت مٹا نہ سکے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس تاریخ کا فیصلہ کیا ہے؟ وہ فیصلہ جو حقیقت و تفصیل کی بنیاد پر ہو، وہ فیصلہ نہیں جو اعتقاد و تاویل کی بنا پر ہو۔ پس اس سلسلے میں تمھارے سامنے دو معیاری چیزیں آئیں:

۱۔ ایک تمام کُرۂ ارض کے لیے رحمت

۲۔ دُوسرے وہ تمام بوجھ جن سے نوعِ انسانی کو جکڑ بند کر دیا گیا تھا اس سے نجات۔

یہ دو بنیادیں' یا قرآن کی بولی میں دو معیار ہاتھ آ گئے، دو کسوٹیاں مل گئیں، ہم دیکھیں گے کہ بے رحم تاریخ کا اس معیار و کسوٹی کے مطابق فیصلہ کیا ہے؟

سیلابِ ہستی میں چند حبابوں سے زیادہ حقیقت نہیں اگر ہم اپنے جذبات، اعتبار، پرستش و اعتقاد کو کام میں لائیں، بلکہ ہمیں حقیقت اور صرف حقیقت کی رُو سے معاملے کی چھان بین کرنی ہے۔ تاریخ کا یہ ایک کھلا ہوا باب اور عریاں حقیقت ہے کہ قرآن حکیم نے چند لفظوں میں جو نقشہ کھینچ دیا ہے، ساتویں صدی عیسوی میں نسلِ انسانی کا ہُوبہو وہی نقشہ، وہی فوٹو اور وہی حالتِ زار تھی۔ شاہانہ اقتدار بےجا اور قانونِ وقت نے نوعِ انسانی کو بے طرح جکڑ بند کر دیا تھا، بس تمھیں بتانا چاہتا ہُوں کہ اس کے ثبوت کے لیے تمھیں بہت دُور اور تاویلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ صرف تاریخ کے چند اوراق کی ورق گردانی کے بعد ہی تمھارے سامنے اس وقت کا پُورا نقشہ آ جائے گا۔ اور ان جگر خراش واقعات کی صورت پر بھروسا کرتے ہوئے حیاتِ جنابِ محمد رسول اللہ ؐ کے ساتھ اس کا مقابلہ کرو تو تمہارے سامنے امن و راحت کی جو تصویر آئے گی کیا اس پر رحمت کے سوا کسی دوسری چیز کا اطلاق ہو سکتا ہے؟ نوعِ انسانی کی دونوں حالتیں جب موازنے کے لیے ترازو کے دو پلڑوں میں رکھی جائیں، پھر ہم تاریخ کا دروازہ کھٹکھٹائیں، اس سے پوچھیں حقیقت کیا ہے؟ انصاف کیا کہتا ہے؟ اس وقت اقوامِ عالم کا کیا حال تھا؟ ظہورِ اسلام کے بعد صورتِ معاملہ کیا ہے؟

دورِ شہنشاہیت

تاریخ کا ناطق فیصلہ خود حقیقت بتلا دے گا۔ یہ کوئی پیچیدہ راز نہیں، اُبھری ہُوئی خصوصیت ہے۔ جب

دعوتِ اسلام کا نمود ہوا، اس وقت اُمم عالم کا کیا حال تھا؟ انھوں نے تمدن کی جو بنیاد رکھی تھی، کیا رکھی تھی، کس نے رکھی تھی؟ جواب صاف ہے کہ وُہ لاطینی قوم تھی، اسی کا تمدن اقوامِ عالم پر چھایا ہُوا تھا۔ روما تمدن ترقی پر تھا، قدیم یونانی ضوابط و قوانین، رسم و رواج، تمدن و معاشرت کا دور دورہ تھا اور ان تمام اقوام کا یہ حال تھا کہ آسمانی حکومت کا خاکہ تک برباد کر رہا تھا۔ نام نہاد قیصر تو تھا مگر حقیقت میں قیصر کا سایہ تک نہ تھا، مسیحی مذہب انتہائی عروج تک پہنچ چکا تھا، بجائے اس کے کہ غریبوں کی حکومت حق و صداقت کی سلطنت ہوتی، شہنشاہی مذہب ہو چکا تھا، ساتویں صدی عیسوی ہیں جب کہ عیسوی مصلحین کا ظہور ہوا تھا، اخوت، ایثارِ نفس، ہمدردی کے بجائے تمام و کمال جابرانہ نظام نافذ تھا، عقل و فہم اور ادراک کا نام لینا ان کی مجلسِ ملّی کے سامنے کفر تھا بلکہ صرف مختلف آسیب زدہ روحوں کی شہادت پر تمام معاملاتِ ملّی و مذہبی کا فیصلہ کیا جاتا اور جب یہ فیصلہ کرنا ہوتا تھا کہ سچائی کیا ہے، تو تمام تحقیقات کا دار و مدار آسیب زدہ انسان کی شہادت پر تھا۔ وُہ اعلان کرتا تھا کہ فلاں گروہ کے ساتھ سچائی ہے، بس وہی فیصلہ، فیصلۂ ناطق تھا جو ان کی مجلسِ ملّی کے اعلان کی صورت میں نافذ ہو جاتا تھا۔

پاپائیت اور عقلِ انسانی کی مجبوری

پھر جب قیصریت کا منبر پوپ کو حاصل ہوا تو اس وقت سچائی کی شناخت کا معیار کیا قرار پایا؟ مختلف قسم کی جسمانی سزائیں، عقوبتیں اور اذیتیں، اگر کسی فرد یا جماعت نے سچائی کا دعویٰ کیا، پارلیمنٹ نے آزمائش کا معیار کیا منتخب کیا؟ کبھی لوہے کو آگ میں تپایا گیا اور ان کے جسم داغے گئے اس شدید عذابِ اذیت سے اکثر جان بحق ہو گئے۔ اگر کوئی بچ رہا تو قید کی کڑیاں جھیلنے کو، جیلوں کی کوٹھڑیاں آباد کرنے کو، مسیحی معیار اور کیا تھا؟ دریا میں ڈبویا جاتا تھا، ہاتھ پاؤں باندھ کر کبھی بند بکسوں میں اور بوریوں میں تھا، کبھی وزن کے لیے پتھروں کے ساتھ، یہ اور اسی قسم کے اور صدہا اور ہزارہا ظالمانہ طریقے تھے ان کے معیارِ شناخت کے۔ بہرحال جس نے اقانیم ثلاثہ سے انکار کیا یا توحید کی دعوت دی، فیصلہ ہوا کہ سچائی کے دعوے کو جانچا جائے اور کس طرح جانچا اور پرکھا جائے؟ آگ اور پانی کے ذریعے، نہ عقل، نہ فہم، نہ ادراک، نہ بصیرت، بس آگ اور پانی۔ یہ تھے آسیب زدہ انسان کے فیصلے کے مطابق سچائی کے معیار، ان میں سے جو نہ جلتا یا کم جلتا یا نہ ڈوبتا یا ڈوب کر اُبھر آتا اس کے حق پر ہونے کی مُہر لگ جاتی۔ عقلِ انسانی کسی گوشے میں بھی کارگر نہ تھی۔

سرچشمۂ ضلالت

پس بتاؤ کیا خدا کی مخلوق اسی شدائد و مصائب کے لیے پیدا ہوئی تھی، کیا کوئی عقل ایک لمحے کے لیے تسلیم کر سکتی ہے کہ کسی مذہب اور توحید کی سچائی کی جانچ کے لیے یہ معیار صحیح ہے؟ اگر نہیں اور ہرگز نہیں تو پھر کیا قرآن کی بولی میں یہ عذاب الیم اور محن و مصائب، زنجیریں اور بوجھ نہ تھے، جو مسیحی نظامِ حکومت نے نوعِ انسانی کے پاؤں میں اور گردنوں پر ڈال رکھے تھے؟ تاریخ کے اوراق پہ ایک اچٹتی ہُوئی نظر ڈالو، ساتویں صدی عیسوی کے مسیحی نظامِ سلطنت کو پڑھ جاؤ،

تمھیں ان کے مذہبی اعمال وعقاید کی کیفیت، ان کے اوہام وظنون کی داستان، ان کی وحشت وبربریت، درشتگی و درندگی کا حال معلوم ہوجائے گا۔ میں نے تو صرف ایک اشارہ کردیا ہے کتاب اللہ، اناجیل جس کی بنیاد وحیِ الٰہی پر تھی، باقی نہ رکھی گئی بلکہ چند انسانوں کے ہاتھ کی ایک تصنیف وتالیف ہوکر رہ گئی جو ہر وقت وہر لمحہ ذاتی ونفسانی ضروریات کے لیے تبدیل وتحریف کی جاسکتی تھی۔ پوپ جو پطرس کا جانشین تسلیم کرلیا گیا تھا، چرچ اور تختِ روما کا مالک تھا اور اناجیلِ مقدس کی کتربیونت کا بااختیار حاکم۔

ضلالتِ عیسائیت کا سرچشمہ کون تھا، کیا کتاب اللہ؟ نہیں۔ کیا عقل وفہم؟ نہیں۔ پھر کیا تھا؟ چند انسانوں کا غلط فیصلہ۔ وہ فیصلہ جو نفس وجنون کے زیرِ اثر نافذ ہوتا تھا۔ دلیل واجتہاد سے معرّا فیصلہ۔ یہ بات سننے میں اتنی ہلکی معلوم ہوتی ہے اور آپ کے چہروں کے مشاہدے سے میں اس نتیجے پر پہنچ رہا ہوں کہ آپ نے بھی اس کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ غور کرو! میں نے کتنی عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے جس کا آپ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

وہ انسان جن کی عقل کے دروازے پر قفل لگ گیا اور جن کی قوتِ ادراک نابود ہوگئی طرح طرح کے توہماتِ نفسانی کا شکار ہوگئے۔ آسیب زدگی ان کے ہر ہر قدم، ہر ہر فعل وقول سے واضح ہے۔ کیا وہ اس قابل ہیں کہ عقولِ انسانی ان کے سامنے جھک جائیں؟ اور اگر عقلیں ان کے سامنے جھک جائیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ عقولِ انسانی ایک لمحے کے لیے ترقی و نشوونما پاسکتی ہیں؟ ہرگز نہیں۔ یہی حال تھا جب کہ قوانینِ الٰہی وشریعتِ نبوی مٹاڈالی گئی تھی، اغراض وہوائے نفس کا دوردورہ تھا۔ پس غور کرو جب عقل بالکل بیکار کردی جائے، جب کتاب اللہ میں تحریف کرکے انصاف کے دروازے بند کردیئے جائیں، جب معیارِ حق وصداقت، چند آسیب زدہ انسانوں کے نفس پرورانہ احکام، فیصلے ہوں، تو نتیجہ کیا ہوگا؟ یہی حقیقت تھی چرچِ روما کی، ایک آسیب زدہ انسان کے ہاتھ میں سررشتۂ حکم آگیا تھا اور نظامِ سلطنت فطری آزادیوں پر نہیں، ظالمانہ قوانین پر تھا۔ جب تم نے یہ اصل تسلیم کرلی تو نتیجہ نکال لوگے کہ ہر قسم کے ذہنی ارتقاء، عقلی نشوونما، یکسر یکقلم رُک گئی تھی۔ یقیناً افرادِ انسان کی ترقی رک گئی تھی، کیوں؟ تمام دینی ودنیوی معاملات کا دارومدار چند انسانوں اور پوپ ماؤف الدماغ پوپ پر تھا۔ یہود ونصاریٰ سب کے سب یکساں گمراہی میں مبتلا تھے۔ یہ تھا مسیحی نظامِ مذہب کا حال، جس نے نسلِ انسانی کی عقلی ترقی، رشد وہدایت کو یکسر روک دیا تھا، ضروری نہ رہا تھا کہ یہ دیکھا جائے کہ انجیل کا کیا مطلب ہے۔ اس کے سمجھنے اور اس کے فیصلے کا اختیار پوپ یا اس کی مجلس کو تھا۔ اپنی عقل کو تج کر، کتاب اللہ سے منہ موڑ کر! انسان، چند انسانوں کے ہاتھ میں جکڑبند ہوگیا تھا۔ پوپ کی طرف سے احکام نافذ ہوا کرتے تھے کہ ہر انسان بطورِ خود معاملاتِ شرع میں غور وفکر کرنے کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ کام چرچ کا ہے، عوام کو اسی کے تابع رہنا چاہیے۔ اور یہی ہے وہ حقیقت جو آج بھی یورپ میں بطورِ اصل کام کررہی ہے، عقولِ انسانی کو معطّل کرکے اس کا فرمان یہ تھا کہ جس کو میں حلال کروں وہ حلال اور جس کو میں حرام کروں وہ حرام۔ یہی تھی اور ہے وہ بنیادی خرابی جو نسلِ انسانی کی ترقیاتِ ذہن وعقل کو کھائے جارہی تھی، اور ان کے نشوونما ارتقا کی جڑوں کو کھوکھلی کرچکی تھی اور اس کی طرف قرآنِ حکیم نے

"اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ[1]" والی آیت میں اشارہ کیا ہے۔ یہ اعجاز و بلاغت قرآن ہے کہ بڑے بڑے اہم واقعات و حالات کو مختصر و جامع الفاظ میں بیان کر کے وقت کا نقشہ کھینچ دیتا ہے۔

مسیحی دنیا کے نام اسلام کا پیام

کوئی غیر طرفدار مورخ ہو، آئے اور جانچے، کیا سورۂ اعراف میں اللہ تعالیٰ کا وہ ارشاد جو اس وقت کی حالت کا نقشہ کھینچ رہا ہے "وَیَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَالۡاَغۡلٰلَ الَّتِیۡ کَانَتۡ عَلَیۡهِمۡ[2]" کی صداقت سے انکار کر سکے گا؟ اسی قدر نہیں قرآن نے جابجا اس طرف اشارہ کیا ہے۔ یمن کے بشپ و بطریق کی معرفت مسیحی دنیا کو جو پیغام دیا تھا، کیا تھا؟ تم نے اگر کبھی قرآن کھول کر پڑھا ہو گا اور ساتھ ہی غور کرنے کی تکلیف بھی کی ہو گی تو سورۂ آل عمران میں اس پیام کو پایا ہو گا:

قُلۡ یٰۤاَهۡلَ الۡکِتٰبِ تَعَالَوۡا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَیۡنَنَا وَبَیۡنَکُمۡ اَلَّا نَعۡبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشۡرِکَ بِهٖ شَیۡئًا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعۡضُنَا بَعۡضًا اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ۔

(۶۴ : ۳)

(اے پیغمبرؐ! تم یہود اور نصاریٰ سے کہہ دو کہ اے اہل کتاب! (اختلاف و نزاع کی ساری باتیں چھوڑ دو اور) اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے دونوں کے لیے یکساں طور پر مسلّم ہے یعنی اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، کسی کی ہستی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔ ہم میں سے ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ ایسا برتاؤ نہ کرے گویا خدا کو چھوڑ کر اسے اپنا پروردگار بنا لیا ہے۔

یہود و نصاریٰ دونوں جماعتوں سے خطاب ہے، طلب کسی اور چیز کی نہیں ہے، دنیا کی امداد، نہ ذات کے لیے فائدہ کی، بلکہ مطالبہ ہے۔

اشتراکِ عقیدہ کے لیے، توحید پر اتفاق کے لیے، یعنی اَلَّا نَعۡبُدَ اِلَّا اللّٰہَ، خدا کی چوکھٹ کے سوا کسی انسانی بارگاہ پر خواہ وہ ظاہری ٹھاٹھ میں کتنی ہی عظیم کیوں نہ ہو، عبادت کی پیشانی نہ جھکائیں۔

دوسرے "لَا نُشۡرِکَ بِهٖ شَیۡئًا" عقیدتاً بھی، باطن میں بھی اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ گویا ظاہر ہو

---

[1] سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۳۱ کا ابتدائی حصہ۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: "ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اپنے علما و مشایخ کو پروردگار بنا لیا۔"

[2] سورۂ اعراف کی آیت ۱۵۷، جس کا ترجمہ گزشتہ صفحات میں گزر چکا ہے۔

تب، باطن ہو تب، دونوں حالتوں میں اسی کی عظمت، اسی کی کبریائی، اسی کی الوہیت کے سامنے، نیاز کا سر یا اعتراف کا قلب جھکے، اور تمام باطل و خود ساختہ معبودوں اور مدعیانِ جبروت طاقتوں کو ٹھکرا دیا جائے، خواہ یہ آواز چرچوں سے بلند کی جائے یا تخت ہائے شہنشاہی سے۔ اور یہ کہ اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا معبود نہ بنائیں۔ وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔

اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کی تفسیر

قرآن کی بولی میں رب بنا لینے کا کیا مطلب ہے؟ میں خود نہیں بلکہ اللہ کے رسولؐ نے اس کا جو مطلب بیان فرمایا ہے اور اس سے جو مراد لی ہے میں وہی تمھیں بتاؤں گا۔

عدیؓ بن حاتم کی روایت ہے جو پہلے عیسائی تھے، فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ شام کے عیسائیوں کے وفد کے ساتھ میں بھی حاضرِ خدمت ہوا۔ حضورؐ کے اعتراض پر میں نے عرض کیا کہ یہ بات تو ٹھیک نہیں ہے کہ ہم پادریوں اور راہبوں کو رب بنا لیتے ہیں۔ فرمایا: کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ جس چیز کو اللہ نے تم پر حلال کیا تھا، تمھارے احبار و رہبان نے اپنے نفس کی خاطر اس کو حرام کر دیا ہے اور جس چیز کو اللہ نے تم پر حرام ٹھہرایا تھا، انھوں نے اپنی لذتِ چشم و جسم کے لیے اسے حلال کر لیا ہے اور اللہ کے ٹھیرائے ہوئے قانونِ حلال و حرام کو بالکل بدل ڈالا ہے؟ عدی نے کہا: ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ فرمایا: بس یہی مطلب رب بنا لینے کا ہے۔ ناقص کو کامل سمجھ کر اختیار کر لیا ہے اور یہ اس لیے کہ جو اوصاف ہمیں اللہ کے لیے خاص رکھنے چاہییں تھے۔ انسانی عقل کے ہاتھ میں تسلیم کر لیے گئے۔ ذرا غور تو کرو کیا یہ چیز خود نیچر کے بھی صاف و صریح خلاف نہیں ہے؟ اچھا یہ تمام تصرفات جو تم نے دینِ الٰہی میں کر لیے ہیں، کیا اس کی دلیل بھی تمھارے پاس ہے؟ اللہ کے کسی کلام میں، کسی نوشتۂ وحی میں کسی پیغمبر کی تعلیم میں، رسولوں کی کسی تبلیغ میں، کہیں سے بھی کوئی دلیل ہمیں دکھاؤ کہ چرچ کے اربابِ اختیار نے احکامِ الٰہی کو نہیں بدلا، اور وہ اس کی بے چون و چرا تعمیل کر رہے ہیں۔ مگر تم نہیں دکھا سکتے، بلکہ اس کے برخلاف ہزارہا سند و دلیل بتائی جا سکتی ہیں کہ پوپ اور دوسرے احبار و رہبان ارباباً من دون اللہ کے زعمِ باطل میں نت نیا قانون فطرت و نیچر و حکمِ الٰہی کے خلاف وضع کرتے اور امت پر مسلط کرتے رہے ہیں۔ مگر سرِ دست میں ان گوشوں میں نہ جاؤں گا۔

یورپ کا دورِ نشاۃِ ثانیہ

بہر حال، چند قدم اور آگے بڑھیے، نتیجہ بہت جلد سامنے آ جائے گا۔ مورخینِ ازمنۂ وسطیٰ کہتے ہیں کہ سولھویں صدی عیسوی، اصلاحاتِ چرچ کا اور امنِ عالم و تغیرِ معتقدات کا زمانہ ہے، جس میں پوپ، شاہ اور عوام کے لیے قوانین نافذ ہوئے اور اس دور کو نشاۃِ ثانیہ کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، اسے موجودہ دور سے بہتر کہتے ہیں۔ لیکن یہ تاریخ کی دہرائی ہوئی اور پامال حقیقت ہے اور جسے میں واقعات و تفاصیل کے ساتھ دہرانے کی ضرورت نہیں سمجھتا،

تم کالج کے طالب علم ہو تمھارے سامنے لائبریری کی کتابیں موجود رہتی ہیں کسی ایک تاریخ کو اٹھا کر دیکھ لو اس میں مندرج واقعات و حقایق اس کی تائید کرتے ہیں؛ ہرگز نہیں۔ بلکہ خونریزی کے حوادث، ظلم کی کہانیوں اور ستم رانیوں کے احوال سے ہر تاریخ بھری پڑی ہے پوپ اور چرچ نے جتنے ستم یہودیوں اور عام باشندگانِ ملک پر اس وقت توڑے شاید ہی کسی زمانے میں ایسا ظلم و ستم ہوا ہو، اور یہ سب مذہب و اصلاحِ عقیدہ کے نام پر ہوا، اور میں بے سند و بے دلیل نہیں کہتا، بلکہ یہ مورخینِ یورپ کے قلم کے بکھرے ہوئے حقایق ہیں۔

کلیسا کا مصلح

غور کرو، سب سے پہلی دستک کون سی تھی جو یورپ کے سامنے علم و عقل نے اصلاحِ کلیسا یا چرچ ریفارم کے نام سے دی؛ سولھویں صدی عیسوی میں، اس بارے میں لوتھر کی پہلی آواز تھی جو اس راہ میں اُٹھی۔ تمام مورخ متفق ہیں کہ عمل و علم کی راہ میں لوتھر کی آواز پہلی روشنی تھی جو کلیسا کی سیہ کاریوں، ستم رانیوں کے بالمقابل عوام کے سامنے آئی، لیکن دیکھو کہ اس تعلیم کا ماحصل کیا ہے؛ لوتھر نے للکارا، دین کی تعلیم کے بارے میں چرچ کا رویہ غلط ہے۔ اس کو خلش پیدا ہوئی کہ حق کا معیار اور سچائی کا راستہ کون سا ہو سکتا ہے، کتاب اللہ یا پوپ کی ذاتی رائے اور اس کے احکام؛

دراصل اس کی ابتدا یُوں ہوتی ہے کہ پوپ نے مغفرت کے پروانے دینے شروع کیے، یعنی جتنی معصیت کریں، کوئی فکر نہیں، جتنا بھی کوئی فسق و فجور، عیش پرستی، نفس پروری کرنا چاہے کرے، پوپ سے مغفرت کے پروانے نقد قیمت دے کر خرید لے اور فکرِ عقبیٰ سے آزاد ہو جائے۔ مغفرت کی یہ نقد تجارت اتنی بُری اور بڑھی ہوئی تھی اور یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہیں بلکہ امرِ واقع ہے کہ تمام گوشہ ہائے ملک میں باقاعدہ ایجنٹ پوپ کے پھیل گئے تھے اور انھیں پوپ کے پروانے کے ماتحت ہر قسم کے سفید و سیاہ کا اختیار تھا۔

نظامِ عالم یکسر درہم برہم ہو گیا تھا احکام و قوانینِ الٰہی پس پشت ڈال دیئے گئے تھے، کلیسا کے اربابِ حل و عقد، بست و کشاد اپنی من مانی کارروائیوں کا ایک جال تمام ملک میں بچھائے ہوئے تھے اور دادِ عیش دے رہے تھے۔ ان کے خود ساختہ قوانین نے ایک اصولی شکل اختیار کر لی تھی جس کی پابندی ہر متنفس کے لیے لازمی تھی۔ لوتھر نے اسی کے خلاف عَلَمِ بغاوت بلند کیا، بحث و مناظرہ کی نوبت پہنچی، اربابِ کلیسا کے شکنجے میں تنگ آئے ہوئے لوگوں نے جن کی تعداد قلیل تھی، لوتھر کا ساتھ دیا مگر اس طرح کہ خوف و ہراس سے ان کا بُرا حال تھا۔ خوف بھی ان کا جو زمین پر مظہرِ خدا ہونے کے مدعی تھے، اختیارِ مکمل کے مالک تھے۔ پھر ان کے کارپردازوں کا، پھر ان کے متبعین کا، بدقسمتی سے جن کی تعداد شمار سے خارج تھی۔

بہرحال بحث یہ تھی کہ احکام کس کے قابلِ قبول ہیں؛ چرچ کے یا انجیل کے؛ لوتھر نے کہا نہیں ہم اللہ، اس کی کتاب، اس کے رسولؐ کے فرمان کی فرمانبرداری کے مکلف ہیں۔ ایمان یہی ہے خدا اور اس کے رسول کے مان لینے کے معنی یہی ہیں، کسی انسانی رائے کو، خواہ وُہ انسان کتنا ہی عظیم المرتبت کیوں نہ ہو، اگر صاحبِ وحی نہیں ہے تو اس کا کوئی درجہ ماننے کے لیے تیار نہیں۔ ہمارا اعتقاد اللہ اور اللہ کی کتاب پر ہے، اور عقلاً ہونا بھی چاہیے۔ کلیسا اور کلیسا پرستوں میں ایک

جلسۂ عام کے اندر لوتھر کی یہ تقریر آگ کا کام کر گئی۔ طے کر لیا گیا کہ اس نئی دعوت و اصلاح کو پامال کرنا چاہیے، خون بہا اور بے شمار کلیسائی تلواریں کھینچ گئیں اور ادنیٰ اشتباہ پر لوگوں کی زندگی موت سے تبدیل ہوگئی۔ سر قلم ہوئے، گھر کے گھر برباد کر دیے گئے، بستیاں کی بستیاں ویران کر دی گئیں تاہم تاریخ کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ارباب کلیسا کے ظلم و جبر کے باوجود مُصلح لوتھر کی دعوت پامال نہ کی جا سکی، مخالفت و شرارت کے باوجود یہ صدا اٹھی، بلند ہوئی اور پھیلی تا آنکہ تقریباً نصف مسیحی دنیا پر چھا گئی۔

ساتویں صدی عیسوی کا عہدِ سعادت

لیکن سوال سولھویں صدی عیسوی کا نہیں ساتویں صدی عیسوی[1] کا ہے جبکہ یہ اصلاح و دعوت ہی فنا ہوگئی تھی۔ شہنشاہ لوئی اور ایڈرین (ADRIAN) نے کلیسا کے اختیار میں سب کچھ دے دیا تھا اور ہر طرف پوپ و چرچ کا دور دورہ تھا۔ ظلم و شرارت، طغیانی و سرکشی اپنی ہولناکیوں اور ہوسناکیوں کے ساتھ پھیل پڑی تھی کہ ناگاہ صحرائے عرب کے دامن سے ایک مصلح کی آواز بلند ہوتی ہے۔ یہ پکار محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صدا تھی:

"یٰاَھْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍۭ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ ط"

دراصل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ صدا جو اللہ تعالیٰ کی آواز اس کی تائید و نصرت کے ساتھ بلند ہوئی تھی، رافتِ نبوی اور رحمتِ الٰہی کا ایک عام اعلان تھا بے چین و مضطر دنیا کے لیے ایک پیامِ امن تھا، اشرار کے لیے ایک طبلِ جنگ تھا۔ مسیحی دنیا میں ایک برگزیدہ کی دُعا اور دُوسرے مقرب کی بشارت کے ظہور کی نشانی تھی۔ قبولِ عام بڑھ بڑھ کر قدم لیتی ہے، حقانیت و سچائی کے متلاشی جوق در جوق آتے ہیں، تسکین و تشفی ہوتی ہے۔ خیالات میں، اعتقادات میں تبدیلی ہوتی ہے۔ سعید ارواح پرچم نبوی کے نیچے جمع ہوتی چلی جاتی ہیں یدخلون فی دین اللہ افواجًا کی شان متشکل ہوتی ہے۔ ذاتِ نبوی کا ظہور، قرآن کا نزول اپنے جلووں کی تابانی سے مشرق سے مغرب، شمال سے جنوب، کوہ و صحرا، دشت و جبل منور ہو رہے ہیں عجیب ساعت ہے عجیب عہدِ سعادت ہے، عجیب خیر و برکت اور امن و امان کا دور دورہ ہے۔ جان محفوظ، مال محفوظ، عزت محفوظ، آبرو محفوظ۔

تاریخِ عالم کی مسلّمہ حقیقت

خونخوار و باطل پرست سایۂ رحمت میں آ گئے یا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حرفِ غلط کی طرح مٹ گئے۔ امن و آسائش کی بسائی ہوئی یہ نئی دنیا جس ذات کی رہینِ منت ہے اس کا نام محمد رسول اللہ ہے۔ اور تنہا میں نہیں کہتا، اپنی طرف سے

---

[1] ساتویں صدی عیسوی بعثتِ نبوی کے لحاظ سے ہوئی ورنہ ولادت باسعادت تو چھٹی صدی عیسوی (یعنی ۵۷۱ء) کا عظیم الشان واقعہ ہے۔

نہیں کہتا۔ تاریخ عالم کی اور بے مہر تاریخ عالم کی مسلمہ و مصدقہ حقیقت بیان کرتا ہوں جس کو بے گانوں اور اغیار نے بھی مانا اور تسلیم کیا ہے۔

ایک گوشہ اس سلسلہ میں تاریخ کا اور آپ کے سامنے بے نقاب کر دوں کہ موجودہ مسیحی دنیا انجیل کو، اور موسائی تورات کو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ سبب ہے نوعِ انسانی کے تہذیب و تمدن اور امن و امان سے آشنا بنانے کا، حالانکہ ان کے اپنوں تک کی تاریخ ان کے اس قول کی تصدیق نہیں کرتی، جس کا ایک نمونہ میں اوپر بیان کر آیا ہوں، مزید توضیح کا نہ جلسہ حامل ہے نہ وقت مقتضی، نہ میری صحت کی اجازت۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کے اُفق پر بجز دستِ محمدیؐ کے کوئی دوسرا ہاتھ نہیں۔

قدیم ہندوستان

جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے ہندوستان ایک قدیم تمدن کا گہوارہ ملک ہے۔ اس کی تمدن و تہذیب کی اولیت و عروج تاریخ عالم کے نزدیک، تمام ممالکِ آباد و سطحِ ارضی سے ممتاز اور سابقون الاوّلون میں شمار ہوتا ہے۔ تاریخ نے اس کے حالات کو جب سے احاطہ کیا ہے، اس کے دورِ اوّل پر جو روشنی پڑتی ہے اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ برہمنی رسم و رواج وہ طریقِ حکمرانی تھا کہ جس کا نظم و نسق اور عزل و نسخ برہمن مدبرین اور پیشواؤں کے ہاتھوں رہا۔ اس تہذیب و تمدن کے آثار اب بھی بعض مقامات سے ظاہر ہیں۔ بعض کتابوں میں درج ہیں اور متعدد زبانوں پر جاری، برہمنی تہذیب کو جب زوال آیا تو گوتم بُدھ کی تعلیمات اور اس کا مذہب ملک و مذہب پر غالب آیا اور تمام ہندوستان میں پھیل گیا۔ ابھی یہ تہذیب و تعلیم اپنے پاؤں مضبوط نہ کر سکی تھی کہ پھر انقلاب ہُوا، کشت و خون کا بازار گرم، اور دار و گیر، رسن و زنجیر کی ہنگامہ آرائی مدت تک رہی، بالآخر یہ بلوہ ایک نئے مذہب و نئی تہذیب کے جنم پر منتج ہوا جو برہمنی دور کی ایک ترقی یافتہ تحریک و تعلیم تھی۔ یہ تحریک شنکر اچاریہ کی تحریک تھی اور اس کا ظہور دکن میں ساتویں صدی عیسوی میں ٹھیک اس وقت ہوا جو اسلام کے ظہور کا زمانہ تھا۔

اس تعلیم نے بھی برہمنی قوانین کے مطابق تقسیم ذات کو تسلیم کر لیا۔ نوعِ انسانی کی اس تقسیم پر، جو بالکل غیر فطری و غیر قدرتی تقسیم تھی۔ اقوام و افراد میں برتری و تفوق کا مُردہ تخیل پھر عود کر آیا، نسلی امتیاز اصلی اور عملی اعزاز بے اصل و بے قدر ہو گیا حالانکہ شرف و خصوصیت عمل پر موقوف ہے، نسل و غرورِ نسل کوئی چیز نہیں، بخلاف اس کے اسلام نے اعلان کیا ہے کہ جسمانی و روحانی اوج و عروج عمل پر منحصر ہے نسل کی کوئی گنتی نہیں۔ عمل میں جو شخص یا جماعت جتنی پاکباز ہے اس کا درجہ بھی اتنا ہی بلند و بالا ہے اِعْمَلُوْا اٰلَ دَاوٗدَ۔۔ [1] میں اس کی طرف اشارہ ہے اور "اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللہِ اَتْقٰکُمْ" اس پر ایک مہرِ تصدیق۔

---

[1] آیت اور اس کا ترجمہ یہ ہے: اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُکْرًا ؕ وَقَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّکُوْرُ (۳۴-۱۳) اے آلِ داؤد! شکر گزاری کے کام کرو اور میرے بندوں میں سے بہت کم شکر گزار ہیں۔

بہر حال فطری حقیقت کے خلاف اس تعلیم نے ذات پات (CAST SYSTEM) کو اپنے یہاں جائز تسلیم کیا، اور بنیادی عقیدہ کے طور پر اسے داخلِ مذہب کیا۔ تفریقِ نسل و تقسیم ذات کے اس منظر کو سامنے لاؤ اور اس کا خلاصہ نکالو۔ خلاصہ یہ نکلا کہ تقسیم ذات جس نے اب غلو کر کے عصبیت کا درجہ لے لیا ہے۔ غرورِ نسل کے نتیجہ، افتراق و انشقاق پر منتج ہوئی ہے۔ وہ ابتداءً پیشوں کی تقسیم اور عمل کی بنا پر ممکن ہے کہ پیدا ہوئی ہو۔ ایک عمل لڑائی کا، ایک عمل تجارت کا، ایک عمل نچلے کاموں کا، یہ تقسیم گویا ایک بہت زیادہ گہری اعتقادی نیت پر تھی حالانکہ دنیا نے کہیں اپنے اصول، دنیاوی امور کے لیے کبھی نہیں وضع کیے، مذہب تو ایک بالاتر اعتقادی اور روحانی چیز تھی۔ پھر ان کی ایک ایسی بھی جماعت پیدا ہوئی جس نے معاشرتی و دینی اصلاح کے سلسلے میں تناسخ کا عقیدہ قایم کیا۔

عقیدۂ تناسخ

تناسخ کیا ہے؟ بار بار آنے کا عقیدہ، کیوں اور کس طرح؟ اپنے کرم کے اعتبار سے عذاب کے طور پر انسان مختلف جسموں میں، جن میں حیوانات اور نجس و ناپاک جانور بھی شامل ہیں، مرنے کے بعد اس کی روح جنم لیتی رہے۔ عذاب و ثواب کے بارے میں یہ ان کی بنیادی اینٹ تھی۔ کرم اچھے ہوتے ہیں تو کسی اچھے جنم کے لیے اچھا جانور منتخب ہوتا ہے، بلحاظ عہدہ جو خاندان اونچا ہے اس میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ راجہ ہو سکتا ہے، برہمن ہو جا سکتا ہے یہ اس کی معراج اور حدِ کمال ہے، اگر اس کی ساری عمر پاپوں میں بسر ہوئی ہے تو اسے شودر اور نیچی قوم میں جنم ملے گا۔ اور اگر معصیت اس سے زیادہ ہے تو نجس جانوروں تک میں اس کو داخل ہونا پڑے گا۔ ان کا یہ اعتقادی اصول اور جزا د سزا کا تصور کسی بہت ہی گہرے لیکن گمراہ و خود غرض نے ایجاد کیا۔ مزید جسارت بھی اس درجہ کی کہ کہہ دیا کہ یہ خدائی اصول ہیں اور فطرت نے اُن پر مُہر لگا دی ہے۔

یہی وہ ناقابلِ فہم اور ناقابلِ تسلیم اصول و ضوابط مذہب تھے جن کے خلاف حال میں ڈاکٹر امبیدکار نے آواز بلند کی ہے۔ ڈاکٹر امبید ایک تعلیم یافتہ اور روشن دماغ مدبر و مفکر ہے اس نے سمجھ لیا کہ جو اصول اور اصول بھی وہ جو مذہب کے نام پر وضع کیے گئے ہوں، ہرگز مذہبی بنیادی اصول ہو ہی نہیں سکتے، نہ فطرت کی ایسی تعلیم ہو سکتی ہے، نہ فطرت کا یہی نشا ہے یہ یقیناً انسانی تقسیم ہے اور خود غرض انسانوں کا وضع کردہ غلط و غلط ضابطۂ تفوق پسندی و قانونِ حکمرانی، ڈاکٹر امبیدکار کے اس اعلانِ عام نے ہندو دنیا میں جو کرب و اضطراب پیدا کر دیا ہے وہ کسی پر پوشیدہ نہیں اور نفس و غرض کے بندوں کو اس اعلان پر حواس باختہ ہونا بھی چاہیے۔ مدتِ مدید سے جس قوم نے ایک طبقۂ انسانی کو غلام اور بندۂ بے اختیار بنا رکھا ہو ان میں بیداری پیدا کر کے ان میں اپنی قیمت و قدر کا احساس پیدا کرنا، جرم ہی ایسا ہے جسے کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن بحیثیت قائدِ قوم و پست اقوام کے نمائندے کے ڈاکٹر امبیدکار کا یہ اعلان رنگ لائے بغیر بھی نہیں رہ سکتا۔ ہندوستان میں تاریخِ انسانیت کا یہ انقلاب یقیناً اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک اہم انقلاب ہو گا۔ اگر ڈاکٹر امبیدکار کے استقلال نے

نوعِ انسانی کے پاؤں سے غلامی و پستی کی ان بوجھل زنجیروں کو کاٹ ڈالا۔

بیسویں صدی کا یہ اعلان کہ ہر انسان' انسان ہے اور خدا نے ترقی کا دروازہ ہر شخص پر برابر کھول دیا ہے، تقریباً نصف صدی یعنی گزشتہ پچاس برس سے یہ آواز جو مختلف گوشوں، مختلف پلیٹ فارموں سے وقتاً فوقتاً اٹھتی رہی ہے، بلا شبہ اصلاحِ عقیدہ میں یہ کوشش نہایت قیمتی ہے لیکن شودر کے لیے عام مجرمانہ خاموشی بدستور قایم ہے، پس اس لحاظ سے یہ کوشش بھی بے سُود ہے، اس سے کیا ہوتا ہے؛ بنیاد پر جو مُہر ہو چکی ہے اس کو کوئی مٹائے۔

ہندوستان کا عہدِ سعادت

ہندوستان کا یہ اعتقاد کہ ہمارے مذہبی اصول پر فطری مُہر لگ چکی ہے اصل زمانہ اس کی نشوونما کا گیا ہے؛ ٹھیک وہی جو ظہورِ اسلام کا زمانہ ہے۔ پیروانِ بُدھ بھی تناسخ کے قائل ہیں۔ پس مسئلۂ تناسخ جب تک بایں بال و پر موجود ہے وہ نہیں مٹ سکتی۔ نہ ان کی اصلاحی کوئی کوشش کامیاب ہو سکتی ہے تا آنکہ انسان کا درجہ بحیثیت ایک انسان کے آزاد اور برابر کا نہ تسلیم کر لیا جائے اور نوعِ انسانی میں پستی و بلندی، اونچ نیچ کی تقسیم کو اٹھا نہ دیا جائے اور ترقی کی راہوں کو ہر شخص پر کھلی ہُوئی تسلیم نہ کر لیا جائے۔ پس گویا اسلام کی نمود کے وقت ہندوستان بھی گوناگوں سختیوں اور جکڑ بندیوں میں مبتلا تھا اپنی ساری سختیوں کے ساتھ ہندوستان میں تاریخ کی اُبھری ہُوئی حقیقت کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ ظلم و تعصب، تنگدلی و مذہبی گمراہی کی وجہ سے نوعِ انسانی پر سب سے گہری ضرب کون سی لگائی گئی؛ تاریخِ انسانیت پر زبردست انقلابی و اصلاحی کیفیت کب ثبت ہُوئی؛ ایک انسان کا درجہ بحیثیت انسان کے دوسرے انسان کے برابر تسلیم کیا گیا؟ تب جب کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ۔ (۴۹: ۱۳)

اے لوگو! ہم نے دنیا میں تمھاری خلقت کا وسیلہ مرد اور عورت کا اتحاد رکھا اور نسلوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا اس لیے کہ باہم پہچانے جاؤ (ورنہ دراصل یہ تفریق و انشعاب کوئی ذریعۂ امتیاز نہیں) اور امتیاز و شرف اس لیے ہے جو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ متقی ہے بلا شبہ اللہ علیم و خبیر ہے۔

اپنی پیدائش و خلقت کے اعتبار سے نسلِ انسانی ایک ہے، کسی کو کسی قسم کی ترجیح نہیں۔ البتہ شعوب و قبائل میں تقسیم اس لیے کر دیے گئے ہو کہ تمھاری شناخت ہو سکے کیسی شناخت، صرف یہ کہ یہ شخص ہندی ہے، یہ مصری ہے، یہ یورپین ہے۔ باقی رہا یہ کہ کسی انسان کو اپنی نسل پر دوسرے انسانوں کے مقابلے میں فخر و غرور ہو تو یہ منشائے فطرت نہیں،

گمراہی ہے، ضلالت ہے، اس کی تردید بھی فرما دی۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ذاتی وجاہت و نسلی غرور کوئی چیز نہیں تم میں سب سے زیادہ معزز و مکرم وہ ہے جو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ راست باز و پاکباز ہے۔ کوئی قید نہیں، کوئی تخصیص نہیں کہ کون خصوصیت کے ساتھ اعزاز و اکرام کا مستحق ہوگا، مگر وہ جو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ راستباز، اور اپنے عمل میں پاکباز ہے۔

پس جتھوں اور گروہوں کی تقسیم اس بنا پر ہے، لتعارفوا۔ کس ملک و خطہ کا باشندہ ہے! اس لیے نہیں کہ شودر و برہمن کا امتیاز ہو، اس پہچان کے واسطے کہ اس کی نسل فلاں ہے اس کی نسل فلاں، پس ذاتی امتیاز کیوں ہو۔ کیا اس امتیاز کی بنا پر کسی کو حقیقت مل جاتی ہے؛ نہیں، ایک منٹ کے لیے نہیں۔ بزرگی اور امتیاز کس انسان کے حصہ میں آیا ؛ ایک اور صرف ایک اس انسان کے حصے میں جو "عند اللہ اتقاکم" کے ماتحت آگیا ہو۔

عرب کا عہدِ جاہلیت

اب ہمیں وہ گہرائیاں دیکھنی چاہئیں جو اس حکم و حقیقی فطری تقسیم میں مضمر ہیں، خود عرب کا ظہورِ اسلام کے وقت کیا حال تھا؛ عرب کی سرزمین، عربِ جاہلیت کا اتنا گھمنڈ تھا کہ ایک ایک بچے کو دعوائے فضیلت و تمکنتِ خاندان تھا کہ ہم شرافت و بسالت کے پیکر اور اصیل ترین نسل و خاندان کے افراد ہیں، انھیں غرورِ نسلی میں اس طرح غلو تھا کہ اظہارِ حال و بیانِ حقیقت کے لیے گڑے ہوئے مُردے قبروں سے اکھاڑ کر فخریہ بوسیدہ ہڈیوں کی نمود و تشہیر سے بھی باز نہ رہتے تھے۔ اسی قسم کی اور صدہا نسلی غرور کی مثالیں مستند تواریخ کے اوراق میں آج بھی موجود و محفوظ ہیں۔ وقت نہیں ہے ورنہ میں ان پر زیادہ تفصیل سے روشنی ڈالتا۔ عقلی و نسلی فخر و غرور کا یہ عالم تھا کہ ایک معمولی بات پر چھپن برس تک خونریزی و خونخواری کا میدان گرم رہا۔ مرتے وقت لوگ اس بارے میں وصیت تک کر جاتے۔

قرآن کے اس اعلان پر ان کی ذہنیت، ان کے نسلی غرور، ان کے طبعی نقائص اور وحشت و درندگی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور ان کی تمدنی، معاشرتی و مذہبی ہر قسم کی زندگی بآسانی سمجھ لی جا سکتی ہے جب ان کے اعمال کے پیشِ نظر وحیِ الٰہی نے کہا:

وَاذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖٓ اِخْوَانًا وَکُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَۃٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَکُمْ مِّنْہَا۔ (۳ : ۱۰۳)

اللہ نے تمھیں جو نعمت عطا فرمائی ہے اس کی یاد سے غافل نہ ہو، تمھارا حال یہ تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے تھے لیکن اس کے فضل و کرم سے ایسا ہوا کہ بھائی بھائی بن گئے (دشمنی کی وجہ سے) تمھارا حال یہ تھا کہ آگ سے بھری ہوئی خندق ہے اور اس کے کنارے کھڑے ہو (ذرا پاؤں پھسلا اور شعلوں میں جا گرے) لیکن اللہ تعالیٰ نے تمھیں ان حالات سے نکال لیا۔

قرآن تاریخ یا قصہ کی کتاب نہیں، وہ واقعہ بیان کرتا ہے مگر اشارۃً۔ اس لیے بھی کہ عرب کا ہر فرد تاریخ عرب کی ایک مجلد کتاب تھا۔ ذرا سا اشارہ انھیں حالات و معاملات معلوم کرانے کے لیے کافی تھا۔ جنھیں فہم قرآن بخشا گیا ہے ان کے لیے بھی اتنا اشارہ عرب کی پوری تاریخ پیش کر دیتی ہے۔

عرب کا عظیم الشان انقلاب

لیکن بعثت محمد رسول اللہ و نزول قرآن کے بعد انہی اہل عرب کا کیا حال تھا؟ قلب بدل گئے تھے، ماہیت بدل گئی تھی، ذہنیت بدل گئی تھی، یکسر انقلاب ہو گیا تھا، یکسر انسان بن گئے تھے اور اس تبدیلی و انقلاب کے بارے میں اکابر عرب کے اقوال مختلف تاریخی کتابوں میں آج بھی محفوظ ہیں، دیکھے جاتے ہیں اور دیکھے جا سکتے ہیں، غصب و قزاقی کے خوگر عرب انقلاب کے بعد ایسے انسان و نمونۂ انسانیت بن گئے تھے کہ اپنی زندگی کے آخری لمحات ہیں، غلاموں اور غلام زادوں کے نام اپنے ترکے کی وصیت کرتے تھے، یا اپنی اولاد کے ساتھ ساتھ انھیں بھی ترکے میں حصہ دیتے تھے۔

ابوبکر صدیقؓ، ان کی شرافت و نجابت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے، اشراف عرب، اصیل قریش، نسلی غرور کر سکتے تھے، ایک منٹ کے لیے بھی یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ یہ کس کی رکاب پکڑ کر چلنے والے لوگ ہیں مگر یہ تاریخ کی ایک دہرائی ہوئی حقیقت ہے اور تہذیب جدید بھی جس سے انکار نہ کر سکی کہ حضرت اسامہؓ[1] سالار لشکر بن کر جب احاطۂ شہر سے نکلتے ہیں تو دور تک آپ ان کے گھوڑے کی رکاب تھامے ہوئے انھیں سمجھاتے چلے گئے اور وہ بار بار معذرت کرتے رہے، لیکن آپ کا ضمیر اور حقیقی صحبت نبویؐ سے مجلٰی قلب آمادہ نہ ہو سکا کہ ان کی معذرت کو قبول کیا جائے۔

سلمانؓ بن اسلامؓ[2] کی کیفیت مورخین نے جو کچھ تاریخ میں قلم بند کر کے خلف کے لیے چھوڑی ہے دیدۂ عبرت کے لیے

---

[1] اسامہؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام حضرت زیدؓ کے صاحبزادے تھے۔ حضرت زیدؓ کو حضورؐ نے آزاد فرما دیا تھا اور انھیں اپنے عزیزوں کے ساتھ گھر چلے جانے کی اجازت عطا فرما دی تھی لیکن انھوں نے حضورؐ کے قدموں سے جدائی گوارا نہ فرمائی۔ حضرت اسامہؓ کی والدہ اُمّ ایمن برکتہ تھیں جو حضور کے والد ماجد حضرت عبد اللہ بن عبد المطلب کی لونڈی تھیں۔ گویا اسامہؓ والد اور والدہ دونوں کی جانب سے غلام زادے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے بہت محبت فرماتے تھے۔ قبیلہ مخزوم کی ایک عورت چوری کے الزام میں پکڑی گئی اور بعض صحابہؓ نے حضورؐ کی خدمت میں اس کی سفارش کرنی چاہی تو انھوں نے حضرت اسامہؓ کو سفارشی بنایا تھا۔ حضورؐ کے وصال کے بعد وادی القریٰ میں رہنے لگے تھے۔ ابن عبد اللہ کی رائے کے مطابق ۵۴ھ ہجری میں انتقال فرمایا۔ صحابہ و تابعین کی ایک جماعت نے ان سے روایت کی ہے۔

[2] حضرت سلمانؓ اصفہان کے مضافات کے رہنے والے تھے۔ سلمان فارسی کے نام سے مشہور ہوئے۔ تلاش حق میں گھر بار چھوڑا، عیسائی مذہب اختیار کیا لیکن طبیعت مطمئن نہ ہوئی۔ بالآخر نصیبے کی یاوری نے حضورؐ کی خدمت میں پہنچایا اور (باقی بر صفحہ آئندہ)

ہمیشہ سبق آموز رہے گی۔ بلالؓ[1] حبشیؓ سے اکنافِ عالم میں بسنے والوں سے کون واقف نہیں، کیا ان کا حال و مقام ہمارے درسِ عبرت کے لیے کافی نہیں؟ ایک حبشی اسود، سیاہ فام لیکن مقام کیا تھا! صحابہ کرام خوشامد کے ساتھ ان سے عرض کرتے تھے کہ اذان دے کر ہمارے دلوں کو خوش کرو۔

حضرت عمرؓ جیسا جلالی خلیفہ، اور محترم ترین صحابی رسول اللہ، جن کے عدل، دانش اور تدبّر نے اقوامِ عالم سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ ان کی ذات پر فخر کرتے تھے اور انھیں "سیّدنا" کے لقب سے یاد کر کے خوش ہوتے اور فخر کرتے تھے۔

حضرت صہیبؓ[2] رومی کا حال کس نے نہیں سنا!

بہرحال، ہر ولایت و ملک کے لوگ جو معلّمِ اخلاق و انسانیت کے دربار میں پہنچے، انسان بن گئے۔ ہے کوئی انسان تاریخِ انسانیت میں موجود؟ جس کو مثال کے طور پر بھی اس انسانیتِ کبریٰ کے مقام پر فائز انسانِ کامل کے سامنے لایا جا سکے؟ تاریخ اس کے جواب و مثال سے آج تک قاصر ہے اور قاصر رہے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تاریخ نے ہیبت و دبدبہ، رعب و جلال والی سیکڑوں ہستیاں اور ان کے کارنامے اپنے صفحات میں محفوظ رکھے ہیں، مگر انسانِ کامل، جو ایک طرف شہنشاہ تو دوسری طرف بوریہ نشین مسکین، ایک طرف فوجی جرنل و قائد تو دوسری طرف داعیِ امن و سلامتی انسان، صفحۂ ہستی پر ہویدا نہیں کیا، نہ زمانے نے پیدا کیا ہے۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ) جمالِ جہاں فدا دیکھتے ہی اسلام قبول کر لیا۔ عربوں نے انھیں پکڑ کر ایک یہودی کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا اور تقریباً دس بار خرید و فروخت کا عمل دُہرایا گیا۔ بالآخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ و امداد سے غلامی سے نجات پائی۔ حضورؐ سے ان کی تعریف میں متعدد حدیثیں مروی ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ سلمان ہمارے اہلِ بیت سے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ تقریباً ڈھائی سو برس کی عمر پائی۔ ۳۵ ہجری میں مدائن میں انتقال فرمایا۔ حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت انسؓ ان سے روایت کرتے ہیں۔

[1] بلال بن رباح جو بلالِ حبشیؓ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موذّن کی حیثیت سے مشہور ہوئے امیہ بن خلف جمحی کے غلام تھے۔ یہ پہلے شخص تھے جنھوں نے مکّہ میں اپنے اسلام کو ظاہر کیا۔ قریش نے ان پر سخت ستم توڑے۔ خود ان کے مالک نے طرح طرح کی اذیتیں پہنچائیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انھیں خرید کر آزاد کر دیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی آپ پر بہت شاق تھی۔ آپ کے وصال کے بعد مدینہ چھوڑ کر شام چلے گئے تھے۔ ۲۰ ہجری میں وہیں انتقال فرمایا۔ صحابہ و تابعین کی ایک جماعت نے ان سے روایت کی۔

[2] صہیبؓ کے والد کا نام سنان تھا، آبائی وطن موصل تھا، رومیوں نے ان کی آبادی پر حملہ کیا، یہ بھی قیدی بنا لیے گئے۔ یہ اس وقت بچے تھے۔ نشو و نما روم میں ہوئی اس لیے صہیب رومی کے نام سے مشہور رہیں۔ ان کے مالک نے مکّہ کے ایک مزار کلب کے ہاتھ فروخت کر دیا، کلب نے عبداللہ بن جدعان تیمی کے ہاتھ بیچ ڈالا، انھوں نے آزاد کر دیا۔ بلکہ بعض شروع دور میں اسلام قبول کیا کفارِ مکّہ کے ہاتھوں سخت تکالیف برداشت کیں۔ قرآن کی آیت "وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ" (۲ : ۲۰۷) (کچھ آدمی ایسے ہیں جو اللہ کی خوشنودی کی طلب میں اپنی جانیں تک بیچ ڈالتے ہیں) انھیں کے بارے میں ہے۔ ۳۸ھ میں مدینہ میں انتقال فرمایا۔

نسلی عصبیت کا پیکرِ خاکی دُوسروں کے جان و مال، عزّت و آبرو کا پاسبان بن جائے، وہ یا ظلم و استبداد سے اقوام کے گلے میں غلامی کا طوق اور ان کی پیٹھ پر پابندیوں کا بوجھ ڈال کر سرِ غرور فخر سے بلند کرنے والا، دونوں میں کون افضل ہے؟ تاریخ کا فیصلہ موجود ہے میرے کہنے کی ضرورت نہیں، جس قوم کا وطیرہ قتل و غارت ہو، فخر و غرور ہو اس میں یہ انقلاب ایّام ہو جائے کہ قریشی ہاتھ باندھ کر پیچھے کھڑا ہو، اور غلام قوم کا ایک فرد ان کا امام ہو۔ اُمّ المومنین عائشہ صدیقہؓ کی روایت ہے اگر زید زندہ ہوتے تو خلافت میرے باپ کی بجائے انھیں ملتی۔ مسلم کی حدیث میں محمد رسول اللہ کی ایک دُعا ضبطِ تحریر میں آئی ہے آپؐ کی زبانِ مبارک پر جورات کو پچھلے پہر اکثر جاری رہتی تھی کہ اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْئَلُکَ[1] الخ

نہ تفرقہ ہے نہ پارٹی اور جتھہ بندی ہے، نہ گروہ پسندی۔ بس اسلام ملّت ہے، اللہ کی بندگی ہے اور رسول کی اطاعت۔ ہر مسلمان بلکہ ہر انسان بھائی بھائی ہے ان العباد کلھم اخوان۔ کوئی انسان بحیثیت انسان کے اچھوت نہیں ہے، اعمال کیسے ہوں، عقیدے کیسے ہوں، بحث یہ ہے ناپاکی جسم میں نہیں ہے عقیدے میں ہوتی ہے جسم ہر انسان کا پاک ہے۔

"تاریخ و اقوامِ عالم کی اجمالی کیفیت اور ساتویں صدی تک کے وہ تمام بوجھ جو نوعِ انسانی کی پیٹھ پر ڈال دیے گئے تھے اور ظہورِ اسلام کے بعد کی دنیا کا حال مختصراً آپ نے سُن لیا۔ نتیجہ کیا نکلا؟ نتیجہ یہ نکلا کہ آپؐ رحمت تھے، نشانِ رحمتِ الٰہی اور سببِ رحمتِ ایزدی تھے۔

ساتویں صدی میں نوعِ انسانی کی حالت آپ سُن چکے، تہذیب و سلطنت کا حال معلوم کر چکے، کلیسائی احکام، پاپائی نظام، رومہ کی سعادت، ہندی احکام و قوانین، رسم و رواج، پابندی و جکڑ بندی دیکھ لی۔ فیصلہ یہ ہوگا کہ نسلِ انسانی یکسر گرفتارِ بلا و معذب تھی عقل گرفتار، جسم گرفتار، غاصبانہ ذہنیت، غلامانہ عقیدت، جسم میں ظالمانہ شرارت، رُوح میں بزدلانہ خباثت، بادشاہتوں اور مذہبی مسندوں نے طرح طرح کی عقوبتیں ڈال رکھی تھیں۔ بس بحالات ایں، تاریخ کا بے لاگ، اٹل، بے پناہ فیصلہ یہی ہوگا اور ہے کہ نوعِ انسان عذاب و ذلّت کے عذاب میں گرفتار تھی۔

غیرتِ خداوندی جوش میں آتی ہے آیۂ رحمت بن کر محمد رسول اللہ کا ظہور ہوتا ہے۔ عیسائی و موسائی سب کو پیامِ رحمت ملتا ہے، انقلاب ہوتا ہے، دنیا بدلتی ہے۔ کل جو سورج نسلِ انسانی پر ایک نئے ظلم کی خبر لاتا تھا آج اس کی ہر شعاع دامنِ انسان کو امن و راحت، رافت و رحمت سے مالا مال کر رہی ہے، غلامی کی بیڑیاں کٹ جاتی ہیں، پیٹھ کا بوجھ گر جاتا ہے، ذہنی بندشیں اور فکری بندھن ٹوٹ جاتے ہیں۔ نسلِ انسانی ہر قسم کے ظلم و عذاب سے نجات پاتی ہے اور ہر قسم کی جتھہ بندی، نسلی غرور و ذاتی وجاہت کی جکڑ بندیوں سے نجات پا کر بھائی بھائی بن جاتی ہے۔ مشرق و مغرب میں بجز اس نعرہ کے اور کچھ نہیں سنا جاتا کہ وما ارسلنٰک الا رحمۃ للعٰلمین ط عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم بالمؤمنین رءوف رحیم ط فبشر عبادی الذین یستمعون القول و یتبعون ما احسنہ ط

[1] مسلم میں متعدد دعائیں مروی ہیں۔ میں نے سرسری طور پر نظر ڈالی لیکن دماغ فیصلہ نہیں کر سکا کہ مولانا کا اشارہ کس حدیث کی طرف ہے خصوصاً ایسی جس کے ابتدائی الفاظ اللھم انا نسئلك ہوں۔

پیغامِ محمدؐ

ابوالکلام آزاد

(۱)

عالمگیر دعوت

پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت کسی خاص قوم اور ملک کے لیے نہیں، تمام نوعِ انسانی کے لیے ہے (سورۂ اعراف) کی آیت (۱۵۰)[1] جوامع آیات میں سے ہے، جس نے دعوتِ اسلام کی پوری حقیقت واضح کر دی:

۱۔ یہ دعوت یکساں طور پر تمام نوعِ انسانی کے لیے ہے۔

۲۔ یہ ایک خدا کے آگے سب کے سروں کو جھکا ہوا دیکھنا چاہتی ہے، جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

۳۔ ایمان باللہ وکلماتہ اس کا شعار ہے، یعنی خدا پر اور اس کے تمام کلماتِ وحی پر ایمان۔

فرمایا: خدا نے مجھے تم سب کی طرف بھیجا ہے۔ وہ خدا کہ آسمان و زمین کی بادشاہت اسی کے لیے ہے۔ یعنی جب تمام کائناتِ ہستی میں ایک ہی خدا کی فرمانروائی ہے تو ضروری ہوا کہ اس کا پیغامِ ہدایت بھی ایک ہی ہو اور سب کے لیے ہو۔

پیامِ زندگی

پیغمبرِ اسلام (صلعم) کی دعوت اس لیے ہے کہ تمھیں زندہ کر دے[2]۔ یعنی وہ انسانیتِ اعلیٰ کے انبعاث و قیام کی

---

[1] سورۂ اعراف کی آیت ۱۵۰ ہے:

قل یٰایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا الذی لہ ملک السمٰوٰت والارض، لا الٰہ الا ھو یحیی و یمیت فاٰمنوا باللہ و رسولہ النبی الامی الذی یؤمن باللہ وکلمتہ واتبعوہ لعلکم تھتدون۔

(اے پیغمبر!) کہو: اے افرادِ نسلِ انسانی! میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں، وہ خدا کہ آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہت اسی کے لیے ہے، کوئی معبود نہیں مگر اسی کی ایک ذات، وہی جلاتا ہے، وہی مارتا ہے پس اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول نبی امی پر کہ اللہ اور اس کے کلمات (یعنی اس کی تمام کتابوں پر) ایمان رکھتا ہے۔ اس کی پیروی کرو تاکہ کامیابی کی راہ تم پر کھل جائے۔

(باقی بر صفحہ آیندہ)

[2] اشارہ ہے سورۃ انفال کی آیت: ۲۴ کی طرف۔ یعنی:

دعوت ہے۔ غور کرو اس دعوت نے وقت کی تمام مُردہ جماعتوں کو کس طرح قبروں سے اٹھا کر زندگی کے میدانوں میں متحرک کر دیا تھا۔ اس سے بڑھ کر مُردوں کو جلانا کیا ہوگا کہ عرب کے ساربانوں میں ابوبکر، عمر، علی، عائشہ، خالد، ابن ابی وقاص، ابن العاص (رضی اللہ عنہم) جیسے اکابر پیدا ہو گئے اور پچاس برس کے اندر عرب کے وحشی کُرۂ ارضی کی سب سے بڑی اور مہذّب قوم تھے۔

توحید

خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ مالک الملک ہے، حی و قیوم ہے، اس کی حکومت سے کوئی گوشہ باہر نہیں۔ اس کے علم سے کوئی شے مخفی اور اوجھل نہیں۔ وہ غفلت سے منزّہ اور نسیان سے پاک ہے۔ جس ہستی کی ایسی صفتیں ہوں اس کے سامنے کسی کی سعی و سفارش کی کیا گنجایش ہے! اور اس کے احکام و قوانین کے نفاذ میں کون ہے جو دخل دینے کی جُرأت کر سکتا ہو؟

بعض ضروری نکتے

قرآن مجید میں توحید فی الذّات کے ساتھ توحید فی الصفات بھی کمال پر پہنچا دی گئی۔ انسان کے لیے دینی عقاید و اعمال کا جو تصوّر قایم کیا، اس کی بنیاد تمام تر رحمت و محبت پر رکھی۔ سورۂ فاتحہ میں ربوبیت و رحمت کی صفتوں کے بعد "مالك يوم الدّين" (جو اس دن کا مالک ہے جس دن کاموں کا بدلہ لوگوں کے حصّے میں آئے گا) کہہ کر صفت عدالت کا ذکر کیا اور تمام صفات جلال کو عدالت ہی کے تابع رکھا۔

۱۔ فطرت کائنات میں ربوبیت و رحمت کے ساتھ مجازات بھی ہیں۔ انسان نے مجازات کو قہر و غضب پر محمول کر لیا۔ اس طرح خدا کی صفات میں خوف و دہشت کا تصوّر پیدا ہو گیا حالانکہ جن مظاہر کو قہر و غضب پر محمول کیا گیا وہ عین مقتضائے رحمت ہیں۔ تعمیر کی تحسین و تکمیل کے لیے تخریب نہ ہوتی تو میزانِ عدل قایم نہ رہتی اور نظامِ ہستی درہم برہم ہو جاتا۔

۲۔ صفاتِ الٰہی میں قہر و غضب کے لیے کوئی جگہ نہیں، البتہ عدالت ضرور ہے اور صفاتِ قہریہ جس قدر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

يٰايها الّذين اٰمنوا استجيبوا لله وللرسول اذا دعاكم لما يحييكم۔

مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول کی پکار کا جواب دو جب وہ پکارتا ہے تاکہ تمھیں (روحانی موت کی حالت سے نکال کر) زندہ کر دے۔

بیان کی گئی ہیں در اصل اسی (عدالت ہی) کے مظاہر ہیں۔

(توحید فی الصفات میں صرف توحید ہی پر زور نہیں دیا بلکہ شرک کی تمام راہیں بند کر دیں)

(ا) عبادت اور نیاز کی مستحق صرف خدا کی ذات ہے۔ اگر تم نے عابدانہ عجز و نیاز کے ساتھ کسی دوسری ہستی کے سامنے سر جھکایا تو توحیدِ الٰہی کا اعتقاد باقی نہ رہا۔

(ب) صرف خدا ہی کی ذات انسانوں کی پکار سُنتی اور دُعائیں قبول کرتی ہے۔ اگر تم نے دُعاؤں اور طلبگاریوں میں کسی دُوسری ہستی کو بھی شریک کر لیا تو گویا تم نے اسے خدا کی خدائی میں شریک کر لیا۔

(ج) اسی طرح عظمتوں، کبریائیوں، کارسازیوں اور بے نیازیوں کا جو اعتقاد تمھارے اندر خدا کی ہستی کا تصوّر پیدا کرتا ہے وہ صرف خدا ہی کے لیے مخصوص رہنا چاہیے۔ اگر تم نے ویسا ہی اعتقاد کسی دوسری ہستی کے لیے پیدا کر لیا تو توحید کا اعتقاد درہم برہم ہو گیا۔

(د) یہی وجہ ہے کہ سورہ فاتحہ میں" ایاك نعبد و ایاك نستعین" میں اوّل عبادت کے ساتھ استعانت کا ذکر بھی کیا گیا۔ پھر دونوں جگہ مفعول کو مقدم کیا، جو مفید حصر ہے یعنی "صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھی سے مدد طلب کرتے ہیں۔

(ہ) سب سے زیادہ اہم مسئلہ شخص نبوّت کی حد بندی کا تھا۔ پیغمبرِ اسلام کی بشریت اور بندگی پر زور دیا اور اپنی تعلیم کا بنیادی کلمہ یہ قرار دیا: اشھد ان لا الٰہ الّا اللّٰہ و اشھد ان محمّداً عبدہٗ و رسولہٗ۔ یعنی میں اقرار کرتا ہُوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور مَیں اقرار کرتا ہُوں کہ محمد (صلعم) خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ اس میں جس طرح خدا کی توحید کا اعتراف کیا گیا اسی طرح پیغمبرِ اسلامؐ کی بندگی اور رسالت کا بھی اعتراف ہے (اور بندگی کا اقرار رسالت کے اقرار پر مقدم ہے)

نبوّت کی روشن ترین دلیل

سُورۂ یونس میں ہے:

قل لو شاء اللّٰہ ما تلوتہ علیکم ولا ادرٰکم بہٖ فقد لبثت فیکم عمراً من قبلہٖ افلا تعقلون۔ (آیت ۱۶)

تم کہو اگر اللہ چاہتا تو میں قرآن تمھیں سناتا ہی نہیں اور تمھیں اس سے خبردار ہی نہ کرتا (مگر اس کا چاہنا یہی ہوا کہ تم میں اس کا کلام نازل ہو اور تمھیں اقوامِ عالم کی ہدایت کا ذریعہ بنائے) پھر دیکھو یہ واقعہ ہے کہ میں اس معاملے سے پہلے تم لوگوں کے اندر ایک پوری عمر بسر کر چکا ہوں۔ کیا تم سمجھتے بُوجھتے نہیں؟

صداقتِ نبوت کی سب سے زیادہ واضح اور وجدانی دلیل بیان کی ہے کہ میں تم میں کوئی نیا آدمی نہیں، جس کے فضائل و حالات کی تمھیں خبر نہ ہو۔ تمھیں میں سے ہوں اور اعلانِ وحی سے پہلے ایک عمر تم میں بسر کر چکا ہوں۔ یعنی چالیس سال کی مدت تک کہ عمرِ انسانی کی پختگی کی خاص مدت ہے۔ اس تمام مدت میں میری زندگی تمھاری آنکھوں کے سامنے رہی، بتلاؤ اس تمام عرصے میں کوئی ایک بھی بات تم نے سچائی اور امانت کے خلاف دیکھی؟ پھر اگر اس تمام مدت میں مجھ سے یہ نہ ہو سکا کہ کسی انسانی معاملے میں جھوٹ بولوں تو کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اب خدا پر بہتان باندھنے کے لیے طیار[1] ہو جاؤں اور جھوٹ موٹ کہنے لگوں، مجھ پر اس کا کلام نازل ہوتا ہے۔ کیا اتنی موٹی سی بات بھی تم نہیں پا سکتے؟

تمام علماے اخلاق و نفسیات متفق ہیں کہ انسان کی عمر میں ابتدائی چالیس سال کا زمانہ اس کے اخلاق و فضائل کے ابھرنے اور بننے کا اصل زمانہ ہوتا ہے، جو سانچا اس عرصے میں بن گیا وہ بقیہ زندگی میں بدل نہیں سکتا۔

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ۔ (یونس: ۱۷)

بتلاؤ اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو اپنے جی سے جھوٹ بنا کر اللہ پر افترا کرے اور اس آدمی سے جو اللہ کی سچی آیتیں جھٹلائے؟ یقیناً جرم کرنے والے کبھی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔

دو باتوں سے تم انکار نہیں کر سکتے، جو شخص اللہ پر افترا کرے اس سے بڑھ کر کوئی شریر نہیں۔ جو صادق کو جھٹلائے وہ بھی سب سے زیادہ شریر ہے۔ اگر میں مفتری علی اللہ ہوں تو مجھے ناکام و نامراد ہونا پڑے گا۔ اگر تم سچائی کے مکذّب ہو تو تمھیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ فیصلہ اللہ کے ہاتھ ہے اور اس کا قانون ہے کہ مجرموں کو فلاح نہیں دیتا۔

چنانچہ اللہ کا فیصلہ صادر ہو گیا، جو مکذّب تھے ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔ جو صادق تھا اس کا کلمۂ صدق آج تک قایم ہے اور قایم رہے گا۔

پیغمبرِ اسلام کی صداقت

پیغمبرِ اسلام کی صداقت کی اس سے بڑھ کر دلیل کیا ہو سکتی ہے کہ ان کے سخت سے سخت معاند بھی اس عجیب و غریب کشش و تاثیر سے انکار نہیں کر سکتے تھے جو آپ کی شخصیت اور آپ کی تعلیم میں پائی جاتی تھی؛ چونکہ اعترافِ حقیقت کے لیے طیار نہ تھے اس لیے مجبور ہو جاتے تھے کہ اسے جادو سے تعبیر کریں۔

”الانبیا“ کی آیت ۳[2] میں فرمایا: وہ پیغمبرِ اسلام کے پاس جانے سے لوگوں کو روکتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم ان کے

[1] مولانا کا املا ”تیار“ کے متعلق یہی تھا۔

[2] سورہ انبیا کی آیت ۳ یہ ہے:

لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ۖ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ هَلْ — دل ہیں کہ یک قلم غافل اور (دیکھو) ظلم کرنے والوں نے چپکے

(باقی برصفحہ آیندہ)

پاس گئے اور جادو میں پھنسے۔ یہ ہماری طرح ایک آدمی ہے، پس جو کچھ اس کا اثر و نفوذ ہے وہ جادو ہی کی وجہ سے ہے۔

سچائی کی سب سے بڑی شناخت یہ ہے کہ اسے سچائی کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا اگر اور کچھ کہنا چاہو گے تو کتنا ہی زور لگاؤ، بات بنے گی نہیں۔ بنے گی اسی وقت جب سر جھکاؤ گے کہ ہاں یہ سچائی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ نفس انسانی کی گمراہی و سرکشی پر حقیقت کا اعتراف ہمیشہ گراں گزرتا ہے۔ وہ بغیر لڑے کبھی ہتھیار نہیں رکھے گی وہ مانے گی (کیونکہ سچائی منوائے بغیر رہ نہیں سکتی) مگر اس وقت جب ماننے پر مجبور ہو جائے گی۔

پیغمبرِ اسلام نے جب کلامِ حق کی منادی شروع کی تو قریشِ مکہ کا یہی حال ہوا۔ وہ سچائی دیکھ رہے تھے، مگر اسے سچائی سمجھنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ کبھی کہتے یہ مجنون ہو گیا ہے، خواب و خیال کو وحی و نبوت سمجھتا ہے۔ پھر تاثیر و نفوذ دیکھتے تو کہتے جادوگر ہے۔

ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش دارالندوہ میں جمع ہوئے اور یہ ساری باتیں آپس میں کہیں۔

(ابن ہشام)

دین میں جبر نہیں

اس اصل عظیم کا اعلان کہ دین و اعتقاد کے معاملے میں کسی طرح کا جبر و استکراہ جائز نہیں۔ دین کی راہ دل کے اعتقاد و یقین کی راہ ہے اور اعتقاد دعوت و موعظت سے پیدا ہوتا ہے نہ کہ جبر و اکراہ سے۔

قریش مکہ کا فتنہ کیا تھا؟ یہ کہ ظلم و تشدد سے دین و اعتقاد کا فیصلہ کرنا چاہتے تھے۔ قرآن نے اس کے خلاف جنگ کا حکم دیا، پس جس بات کے خلاف اس نے جنگ کا حکم دیا، خود اسی بات کا منکر کیونکر ہو سکتا ہے؟

دعوت کی راہ تلقین و ہدایت کی راہ ہے، جدل و خصومت کی راہ نہیں۔ داعیِ حق کا طریقہ یہ نہیں ہوتا کہ مخاطب کو دلیلوں کے الجھاؤ میں پھنسا دے یا کسی خاص دلیل پر اڑ کر اس کا ناطقہ بند کر دے، بلکہ وہ چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس کے دل میں سچائی اتار دے۔

خدا پرستی اور نیک عملی

خدا پر، خدا کے فرشتوں پر، خدا کی کتابوں پر، خدا کے تمام رسولوں پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھنا سچا اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

هَلْ هٰذَا اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ۔

سرگوشیاں کیں۔ یہ آدمی اس کے سوا کیا ہے کہ ہماری ہی طرح کا ایک آدمی ہے، پھر کیا تم جان بوجھ کر ایسی جگہ آتے ہو جہاں جادو کے سوا اور کچھ نہیں؟

کامل ایمان ہے۔ خدا کی ہستی، اس کی وحدانیت، اس کی صفات اور آخرت دین کے بنیادی حقایق ہیں۔

خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ ہم تمھیں روزی دیتے ہیں انھیں بھی دیں گے۔ بے حیائی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ، کھلے طور پر ہوں یا چھپی ہوں۔ کسی جان کو قتل نہ کرو، جسے خدا نے حرام ٹھہرا دیا ہے۔ یتیموں کے مال کی طرف نہ بڑھو۔ جب کبھی کوئی بات کہو انصاف کی کہو، اگرچہ معاملہ اپنے قرابت دار ہی کا کیوں نہ ہو۔ اللہ کے ساتھ جو عہد و پیمان کیا ہے اسے پورا کرو۔

خدا پرستی اور نیک عملی کی یہی راہ میری (خدا کی) ٹھہرائی ہوئی سیدھی راہ ہے۔ اسی پر چلو، اور راہوں پہ نہ چلو کہ خدا کی راہ سے بھٹکا کر تمھیں تتر بتر کر دیں۔

جو کوئی اللہ کے حضور نیکی لائے گا تو اس کے لیے اس نیک عمل سے دس گنا زیادہ ثواب ہوگا۔ اور جو کوئی برائی لائے گا تو اس کے بدلے اتنی ہی سزا پائے گا۔ مجھے تو میرے پروردگار نے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے، وہی درست اور صحیح دین ہے، ابراہیمؑ کا طریقہ کہ ایک خدا کے لیے ہو جانا۔ میری نماز، میرا حج، میرا جینا، میرا مرنا صرف اللہ ہی کے لیے ہے، جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں خدا کے فرمانبرداروں میں پہلا فرمانبردار (یعنی مسلم) ہوں۔

اوامر و نواہی

۱۔ توحید فی العبادت کی تلقین۔ کیونکہ نفس توحید کا اعتقاد تو تمام پیروانِ مذاہب میں موجود تھا، لیکن توحید فی العبادت کی حقیقت مفقود ہو گئی تھی۔

۲۔ پھر والدین کے حقوق پر توجہ دلائی گئی۔ انسان کے لیے والدین کی ربوبیت، ربوبیت الٰہی کا پرتو ہے۔ والدین کی خدمت و اطاعت کی آزمائش کا اصلی وقت ان کے بڑھاپے میں آتا ہے، جب کمزوریاں انھیں دوسروں کی خدمت کا محتاج بنا دیتی ہیں۔

انسان کی احتیاج کے دو ہی وقت ہیں: طفولیت اور بڑھاپا۔ طفولیت میں ماں باپ نے خدمت کی تھی، بڑھاپے میں اولاد کو خدمت کرنی چاہیے۔

۳۔ ماں باپ کے بعد ان سب قرابت داروں کے حقوق ہیں جو ہماری خبرگیریوں کے محتاج ہوں۔ ساتھ ہی "تبذیر" یعنی بے محل خرچ کرنے سے روکا۔ فرمایا: مال و دولت بے محل خرچ نہ کرو۔ خرچ کرنے کا صحیح محل ارباب حقوق ہیں۔

۴۔ مال و دولت خرچ کرنے میں اور ہر بات میں اعتدال کی راہ اختیار کرو۔ کسی ایک طرف نہ جھک پڑو کہ خرچ کرنے پر آئے تو سب کچھ اڑا دیا۔ احتیاط کرنی چاہی تو کنجوسی پر اتر آئے۔

۵۔ اولاد کو افلاس کے ڈر سے ہلاک نہ کرو، ہم تمھیں بھی روزی دیتے ہیں اور انھیں بھی۔
۶۔ زنا سے دُور رہو یہ بڑی بے حیائی کی بات اور بڑی بُرائی کا چلن ہے۔
۷۔ کسی جان کو ناحق قتل نہ کرو، جسے قتل نہ کرنا اللہ نے حرام ٹھہرا دیا ہے۔ ہم نے مقتول کے وارث (یا وارثوں) کو مطالبۂ قصاص کا اختیار دے دیا ہے۔ پس چاہیے کہ خونریزی میں زیادتی نہ کی جائے۔
۸۔ یتیموں کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ (یعنی اسے خرچ کرنے کا ارادہ نہ کرو) مگر ایسے طریقے پر جو ان کے لیے بہتر ہو۔ جب یتیم جوان ہو جائیں تو امانت ان کے حوالے کر دو۔
۹۔ عہد پورا کرو اس کے بارے میں تم سے باز پرس کی جائے گی۔
۱۰۔ جب کوئی چیز ناپو تو پیمانہ بھرپور رکھا کرو۔ تولو تو صحیح ترازو سے۔ (یعنی نہ ماپ میں کمی کرو اور نہ تول میں ڈنڈی وباؤ)

فرمانبرداروں کے نشان

ان لوگوں کے اعمال و اوصاف (کی مجمل سی کیفیت) جنھوں نے احکامِ حق قبول کیے اور دنیا کے لیے نافع بن گئے:

ﺍ۔ اللہ کی بندگی کا عہد پورا کرتے ہیں اور اپنی عبودیت میں سچے اور کامل ہیں۔
ب۔ اللہ نے جو رشتے جوڑ دیے انھیں ظلم و ناانصافی سے توڑتے نہیں، بلکہ ہر رشتے کا پاس کرتے اور ہر علاقے کا حق ادا کرتے ہیں۔ اس عمل میں تمام حقوق العباد آ گئے جس طرح "ا" میں حقوق اللہ آ گئے۔
ج۔ آخرت کی فکر سے بے پروا نہیں ہوتے۔ جو کچھ کرتے ہیں اس میں خوفِ آخرت کی کھٹک موجود ہوتی ہے۔ یقین رکھتے ہیں کہ ایک روز کسی کے آگے پیش ہونا ہے اور حساب کی سختی سے بچنا ممکن نہیں۔
د۔ اللہ کی محبت میں ہر طرح کی ناخوشگوار حالتیں صبر و ثبات کے ساتھ جھیل لیتے ہیں۔ شدتوں اور محنتوں سے منہ نہیں موڑتے، آزمائشوں کو پیٹھ نہیں دکھاتے۔
ہ۔ نماز اس کی ساری شرطوں کے ساتھ قایم کرتے ہیں۔
و۔ جو کچھ کماتے ہیں اسے صرف اپنے ہی نفس پر خرچ نہیں کرتے، دوسروں پر بھی خرچ کرتے ہیں اور ہر حال میں خرچ کرتے ہیں، کھلے طور پر بھی اور پوشیدہ طور پر بھی۔
ز۔ بدی کے بدلے بدی کرنا ان کا شیوہ نہیں۔ کوئی ان کے ساتھ کتنی ہی برائی کرے وہ بھلائی ہی سے پیش آئیں گے۔

ایمان والوں کے پانچ وصف

مومنوں کے پانچ وصف خصوصیت سے بیان کیے گئے۔ گویا قرآن کے نزدیک ایمان و عمل کے مرقع میں سب سے



مسجدِ نبوی کا بیرونی منظر

زیادہ نمایاں خط و خال یہی ہیں جس زندگی میں یہ خصائص نہ ہوں وہ مومن کی زندگی نہیں ہو سکتی :

ا ۔ نماز کی محافظت اور اس کا خضوع و خشوع سے ادا کرنا۔ کسی باہیبت و جلال مقام پر کھڑے ہو جاؤ، تمہارے ذہن و جسم پر کیسی حالت طاری ہو جائے گی ؟ ایسی ہی حالت کو عربی میں "خشوع" کہتے ہیں۔

ب ۔ ہر اس بات سے مجتنب رہنا جو نکمی ہو۔ صرف انھی باتوں کا اشتغال رکھنا جو دین و دنیا میں نافع ہوں۔

ج ۔ کمائی میں سے اپنے محتاج بھائیوں کے لیے خرچ کرنا۔

د ۔ زنا سے کبھی آلودہ نہ ہونا۔

ہ ۔ امانت دار ہونا اور اپنے عہدوں کو پورا کرنا۔

راہِ حق کے پیشرو

راہِ حق میں سب سے آگے نکل جانے والے وہ ہیں :

ا ۔ جو اپنے پروردگار کے خوف سے ڈرتے ہیں اور اس کی نشانیوں پر یقین رکھتے ہیں۔

ب ۔ جو پروردگار کے ساتھ کسی ہستی کو شریک نہیں ٹھہراتے۔

ج ۔ جو اس کی راہ میں جتنا کچھ دے سکتے ہیں، بلا تامل دے دیتے ہیں۔ ان کے دل ترساں رہتے ہیں کہ اپنے پروردگار کے حضور انھیں لوٹنا ہے۔

طریق خیر و سعادت

ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو، قرابت داروں کے حقوق سے غافل نہ ہو۔ یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور پڑوسیوں کی خبر گیری کرتے رہو۔ پڑوسی خواہ قرابت دار ہو خواہ اجنبی، ہر حال میں اچھے برتاؤ کا مستحق ہے۔ اسی طرح جو لوگ تمہارے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے والے ہوں نیز لونڈی، غلام جو تمہارے قبضے میں ہیں ان سب کے بھی تم پر حقوق ہیں۔ ضروری ہے کہ سب کے ساتھ محبت اور احسان سے پیش آؤ۔

بخل نہ کرو، خدا نے جو کچھ عطا فرمایا ہے اس کے بندوں کی خدمت میں خرچ کرو۔ جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے اس کا ہاتھ انفاق فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں خرچ کرنے) سے کبھی رک نہیں سکتا۔ البتہ جو کچھ خرچ کرو اللہ کے لیے کرو نام و نمود کے لیے نہ کرو۔

نظم و فلاح میں اصل اصول

اجتماعی زندگی میں نظم و فلاح کے لیے اصل اصول یہ ہے کہ جو جس بات کا حقدار ہو، اس کے حق کا اعتراف کرو

اور جو چیز جسے ملنی چاہیے وہ اس کے حوالے کر دو، وارث کا حق ہو، یتیم کا مال ہو، قرضدار کا قرض ہو، امانت رکھنے والے کی امانت ہو، اہلیت رکھنے والے کے لیے منصب اور عہدہ ہو، جو جس کا حق ہو اور جو جس کا اہل ہو اُسے ملنا چاہیے۔

جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو صرف عدل و انصاف پیشِ نظر ہو، کسی حالت اور کسی صورت میں بھی یہ جائز نہیں کہ فیصلہ انصاف کے خلاف کیا جائے۔

مسلمانوں کے لیے اصل دین

مسلمانوں کے لیے اصل دین یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت کریں، اللہ کے رسول کی اطاعت کریں اور جو لوگ ان میں سے صاحبِ حکم و اختیار ہوں ان کی اطاعت کریں (بشرطیکہ اصحابِ حکم و اختیار کی طرف سے کوئی ایسی بات پیش نہ ہو جو اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کے خلاف ہو) بصورتِ نزاع اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کی طرف رجوع کیا جائے اور جو فیصلہ ملے، اس کے آگے سب سرِ تسلیم خم کر دیں۔

قوّامونَ بالقسط

مسلمانوں کو چاہیے کہ "قوّامون بالقسط" ہوں۔ یعنی حق و راستی پر اس مضبوطی سے قایم رہنے (اور جم جانے والے) کہ کوئی بات بھی انھیں جگہ سے ہلا نہ سکے۔ چاہیے کہ وہ اللہ کے لیے گواہی دینے والے ہوں۔ دُنیا کی کوئی چیز انھیں سچ کہنے سے روک نہ سکے۔ اگر کسی معاملے میں سچائی خود ان کی ذات کے خلاف ہو یا ان کے ماں باپ اور اعزّہ و اقربا کے خلاف ہو جب بھی انھیں سچی ہی بات کہنی چاہیے، وہ صرف سچائی ہی کے لیے دل و زبان رکھتے ہیں۔[1]

بنیادی دستورالعمل

مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ خدا کے شعائر کی بے حُرمتی روا نہ رکھیں۔ دوسروں کے معاملے میں ان کا دستورالعمل

---

[1] سورۂ مائدہ میں صاف صاف فرمایا گیا ہے کہ:

لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭاِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۔ (آیت ۸)

ایسا نہ ہو کہ کسی گروہ کی دشمنی تمھیں اس بات کے لیے ابھار دے کہ اس کے ساتھ انصاف نہ کرو۔ ہر حال میں انصاف کرو کہ یہی تقویٰ سے لگتی ہوئی بات ہے اور اللہ کی نافرمانی کے نتائج سے ڈرو۔ تم جو کچھ کرتے ہو وہ اس کی خبر رکھنے والا ہے۔

یہ ہونا چاہیے کہ نیکی کے کاموں میں سب کی مدد کریں۔ بُرائی کے کاموں میں کسی کی بھی مدد نہ کریں۔ کوئی ظلم کرے تو یہ برائی ہے اس سے بچیں۔ کوئی حج و زیارت کو جائے تو یہ بھلائی ہے اس کے معاون بنیں۔ (گویا نیکی اور پرہیزگاری کی ہر بات میں تعاون، گناہ اور ظلم کی ہر بات میں لاتعاون ہر مسلمان کے لیے بنیادی اصل کار ہے)

دین کی تکمیل اور نعمت کا اتمام چاہتا ہے کہ ہم اپنی سیرت میں سرتاسر حق و صداقت کے پیکر بن جائیں۔

(۲)

انسانی مساوات

نسلِ انسانی کی مساوات کا اعلان اور نسل و شرف کے تمام امتیازات سے انکار جو لوگوں نے بنا رکھے تھے اور جن کی وجہ سے انسانی حقوق پامال ہو رہے تھے۔ آزاد ہو یا غلام، مرد ہو یا عورت، بڑا ہو یا چھوٹا، وضیع ہو یا شریف، انسان ہونے کے لحاظ سے سب برابر ہیں۔

[رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد جو خطبہ ارشاد فرمایا، اس میں قریش کو خطاب کرتے ہوئے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح آشکارا فرما دی تھی۔ فرمایا:

> "اے جماعتِ قریش! خدا نے تمھاری جاہلانہ نخوت اور آباؤ اجداد پر اترانے کا غرور آج توڑ دیا (سچ تو یہ ہے) سب لوگ آدم کے فرزند ہیں اور آدم مٹی سے بنایا گیا تھا۔ خدا فرماتا ہے: لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد و عورت سے پیدا کیا ہے۔ گوت قبیلے سب پہچان کے لیے بنا دیے ہیں اور خدا کے ہاں تو اس کی زیادہ عزت، جس میں تقویٰ زیادہ ہے۔"[۱]

جب تمام انسان ایک ہی ماں باپ (آدم و حوا) کی اولاد ہیں تو انسان ہونے میں امتیازات کی کون سی وجہ ہے؟ پھر خدا کے ہاں عزت کا جو معیار قرار پایا یعنی تقویٰ، وہ ایسا ہے کہ اس میں انسانوں کے درمیان حسد و رقابت ہو ہی نہیں سکتی، کیونکہ منافیِ تقویٰ ہوگی۔ باقی ہر معیار یعنی دولت، عہدہ، رنگ وغیرہ میں حسد و رقابت کے سوا اور کسی بات کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا]

دین کی اصلِ عظیم

دین کی اصلِ عظیم کا اعلان کہ سعادت و نجات کی راہ سچی خدا پرستی اور نیک عمل کی زندگی سے حاصل ہوتی ہے۔

---

[۱] رحمۃ للعالمین ج ا ص ۱۰۶۔ جس آیت کا ترجمہ دیا گیا ہے وہ سورۃ حجرات کی تیرھویں آیت ہے۔ یعنی: یٰاَیُّھا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ وجعلنا کم شعوباً و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔

اصل شے دل کی پاکی اور عمل کی نیکی ہے۔ شریعت کے ظاہری احکام و رسوم بھی اسی لیے ہیں کہ یہ مقصود حاصل ہو۔

نزولِ قرآن کے وقت دنیا کی ایک عالمگیر مذہبی گمراہی یہ تھی کہ لوگ سمجھتے تھے دین سے مقصود محض شریعت کے ظواہر و رسوم ہیں اور انھیں کے کرنے نہ کرنے پر نجات و سعادت موقوف ہے۔ پس جہاں تک دین کا تعلق ہے، ساری طلب مقاصد کی ہونی چاہیے، نہ کہ وسائل کی۔

ابراہیمؑ کی راہ

دین کی جو راہ حضرت ابراہیمؑ نے اختیار کی تھی، وہ کیا تھی؛ ان کے بعد ان کی اولاد جس طریقے پر چلتی رہی، وہ کون سا طریقہ تھا؛ خود حضرت یعقوبؑ نے بسترِ مرگ پر جس دین کی وصیت کی تھی وہ کون سا دین تھا؛ یقیناً وہ یہودیت اور مسیحیت کی گروہ بندی نہ تھی (اس وقت تک یہودیت اور مسیحیت کا تو وجود بھی نہ تھا) وہ صرف خدا پر ایمان لانے اور اس کے قانونِ سعادت کی فرمانبرداری کرنے کی فطری اور عالمگیر سچائی تھی۔ اسی کی دعوت قرآن نے دی۔

دینِ الٰہی کو "الاسلام"[1] کے نام سے تعبیر کیا گیا جس کے معنی اطاعت کرنے کے ہیں یعنی ہر طرح کی نسبتوں اور گروہ بندیوں سے الگ ہو کر صرف اطاعتِ حق کی طرف انسانوں کو دعوت دی جائے۔

عمل کی کمائی

قانونِ الٰہی یہ ہے کہ ہر فرد کو وہی پیش آتا ہے جو اس نے اپنے عمل سے کمایا ہے۔ نہ تو ایک کی نیکی دوسرے کو بچا سکتی ہے اور نہ ایک کی بدعملی کے لیے دوسرا جواب دہ ہو سکتا ہے۔

انسان کے لیے قدامت پسندی کا پھندا بڑا ہی سخت ہے، اس کے پیچ سے وہ نکل نہیں سکتا۔ وہ ہمیشہ ماضی کے افسانوں میں گم رہے گا۔ ہندو ہزاروں برس سے مہابھارت اور پرانوں کے افسانوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کے دو فرقے آج تک اس نزاع سے فارغ نہیں ہوئے کہ تیرہ سو برس پہلے سقیفۂ (بنو ساعدہ) میں خلافت کا جو انتخاب ہوا تھا وہ صحیح تھا یا غلط؛ قرآن کہتا ہے:

"تلك امة قد خلت لها ما كسبت ولكم ما كسبتم۔" (پ ۱، س البقرہ ۱۴۱)

اب اس کے پیچھے پڑے رہنے سے تمھیں کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا، تم اپنی خبر لو۔ ان کے اعمال ان کے لیے تھے اور تمھارے

---

[1] ملاحظہ فرمائیے: ان الدین عند اللہ الاسلام (بلا شبہ اصل دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے) (آل عمران: ۱۹) ومن یبتغ غیر الاسلام دیناً فلن یقبل منہ (جو کوئی الاسلام کے سوا کسی دوسرے دین کا خواہشمند ہوگا تو وہ کبھی قبول نہیں کیا جائے گا) (آل عمران: ۸۵) ورضیت لکم الاسلام دینا (تمھارے لیے پسند کر لیا کہ دین الاسلام ہو) (مائدہ: ۲)

تمھارے لیے ہیں۔

دنیا پرستی کا غرور

دین حق دنیا کا نہیں، دنیا پرستی کے غرور و سرشاری کا مخالف ہے۔ یہی دنیا پرستی کا غرور انسان کو خدا پرستی اور راست بازی سے بے پروا کر دیتا ہے۔ جب اسے طاقت اور حکومت مل جاتی ہے تو غرض و نفس کی پرستش میں وہ سب کچھ کر گزرتا ہے جو دنیا میں انسان کا ظلم و فساد کر سکتا ہے۔ جو لوگ سچے خدا پرست ہیں وہ دنیا میں کتنے ہی مشغول ہوں، مگر ان کے پیشِ نظر نفس پرستی نہیں، صرف رضائے الٰہی ہوتی ہے۔

آخرت کی نجات

آخرت کی نجات کا دارومدار تمام تر ایمان و عمل ہے۔ وہاں نہ تو نجات کی خرید و فروخت ہو سکتی ہے نہ کسی کی دوستی اور آشنائی کام دے سکتی ہے، نہ کسی کی سفارش سے کام نکالا جا سکتا ہے۔ کسی نیک اور بزرگ ہستی سے حسنِ عمل کا سبق لیا جا سکتا ہے، اس کی صحبت میں بیٹھ کر اپنی اصلاح کی جا سکتی ہے۔ اہلِ علم سے مسائل پُوچھے جا سکتے ہیں لیکن نجات کا انحصار اپنے ہی ایمان و عمل پر یا اللہ کی رحمت پر ہے۔ کسی کی سعی و سفارش کچھ اعانت نہیں کر سکتی۔ ایسا تصوّر ہی سراسر غیر اسلامی ہے۔

حق و باطل کا معیار

حق و باطل کے معاملے میں انسانوں کی قلت و کثرت معیار نہیں۔ گمراہی و حق فراموشی کے ایسے اوقات بھی آجاتے ہیں کہ نوعِ انسانی کی اکثریت حق و یقین کی روشنی سے محروم ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی دورِ نزولِ قرآن کے وقت بھی دنیا پر چھایا ہُوا تھا۔ گمراہوں کی کثرت نہ دیکھو۔ یہ دیکھو کہ کون سی راہ یقین اور بصیرت کی راہ ہے اور کون سی جہل و گمان کی؟ حق کی راہ یقین و بصیرت ہی کی راہ ہے نہ کہ جہل و گمان کی۔ اگرچہ بہت تھوڑے آدمی اس راہ پر کاربند ہوں آج دنیا کی آبادی میں اکثریت غیر مسلموں کی ہے، نہ کہ مسلمانوں کی۔ پھر کیا اس بنا پر اکثریت کے مطابق حق کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے؟ ابتدائی دور میں مسلمان بہ مشکل چند لاکھ ہوں گے لیکن انھوں نے حیرت انگیز سعی و ہمت اور نادیدہ جوشِ فداکاری سے چند سال کے اندر روئے زمین کے گوشے گوشے میں نورِ حق کا اجالا کر دیا۔ آج ان کی بھیڑ ساٹھ کروڑ بتائی جاتی ہے لیکن وہ اپنے آپ کو باطل کی ظلمت کاریوں سے محفوظ رکھنے میں بے بس نظر آتے ہیں بلکہ وہ گروہ در گروہ ایسے طور طریقے اختیار کیے بیٹھے ہیں جنھیں حق نہیں، باطل کے شاخسانے ہی کہا جا سکتا ہے۔

منکرینِ آخرت

جو لوگ منکرینِ آخرت ہیں یعنی محاسبۂ اعمال پر اعتقاد نہیں رکھتے، ان کی ذہنیت چار حال سے خالی نہیں :

ا۔ انھیں خدا سے ملنے کی توقع نہیں۔

ب۔ وہ صرف دنیوی زندگی میں خوشنود ہوتے ہیں۔

ج۔ اس حالت کے خلاف ان کے اندر کوئی خلش پیدا نہیں ہوتی۔ اسی پر وہ مطمئن ہو گئے ہیں۔

د۔ ان کے ذہن و ادراک میں اس درجہ تعطل پیدا ہو گیا ہے کہ قدرت کی تمام نشانیاں جو چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں، انھیں بیدار نہیں کر سکتیں۔

ان میں سے ہر بات نہ صرف بیانِ حال ہے بلکہ بجائے خود ایک دلیل بھی ہے۔ اور یہی قرآن کی معجزانہ بلاغت ہے۔

مشکلیں اور آزمائشیں

کتاب و حکمت کی تعلیم، شخص نبوت کی پیغمبرانہ تربیت (تزکیہ)، مرکزِ ہدایت کا قیام (کعبہ مکرمہ) اور بہترین امت (خیر امۃ اخرجت للناس) ہونے کا نصب العین، یہی وُہ بنیادی عناصر تھے جو موعودہ امت کی نشوونما کے لیے ضروری تھے۔

یہ تمام مراتب ظہور میں آ گئے تو پیروانِ دعوتِ قرآنی کو سرگرمِ عمل ہو جانے کا حکم مل گیا۔

سرگرمِ عمل ہو جانے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مشکلیں اور آزمائشیں پیش آتیں، اس لیے صبر و استقامت اور جاں فروشی کی بھی دعوت دی گئی۔

صبر و ثبات

فرمایا :

ا۔ صبر اور نماز کی قوتوں سے مدد لو۔ صبر کی حقیقت یہ ہے کہ مشکلات کو مصائب کو جھیلنے اور نفسانی خواہشوں سے مغلوب نہ ہونے کی قوت پیدا کی جائے۔ نماز کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے ذکر و فکر سے روح کو تقویت ملتی ہے۔ جس جماعت میں یہ دو قوتیں (صبر اور نماز) پیدا ہو جائیں گی، وہ کبھی ناکام نہیں ہو سکتی۔

ب۔ جو جماعت موت سے ڈرتی ہے وہ کبھی زندگی کی کامرانیاں حاصل نہیں کر سکتی۔ راہِ حق میں موت، موت نہیں سر تا سر زندگی ہے۔

کتنی ہی چھوٹی جماعتیں ہیں جو بڑی جماعتوں پر غالب آ جاتی ہیں اور کتنی ہی بڑی جماعتیں ہیں جو چھوٹی جماعتوں سے شکست کھا جاتی ہیں۔ فتح و شکست کا مدار افراد کی قلت و کثرت پر نہیں، دلوں کی قوت پر ہے۔ اللہ کی مدد انھیں لوگوں کا

ساتھ دیتی ہے جو صابر اور ثابت قدم ہوتے ہیں۔

مسلمانوں کا نصب العین

مسلمانوں کا جماعتی نصب العین یہ نہیں قرار دیا گیا کہ وہ طاقت ور قوم بنیں یا سب سے برتر گروہ ہوں کیونکہ طاقت و برتری میں جماعتی گھمنڈ اور قومی حرص و آز کا لگاؤ تھا اور یہ بات انسانیت کے امن و سلام اور مساوات و اخوت کے منافی تھی۔ پس صرف "خیر" اور "بہتر" ہونے پر زور دیا گیا (کنتم خیر امة اخرجت للناس) جس کی تمام تر روح اخلاقی اور معنوی محاسن پر مبنی ہے۔ جس جماعت کا نصب العین یہ ہوگا کہ وہ سب سے اچھی اور نیک ہو، وہ طاقتوں کے غرور اور قومی نخوت و برتری کے مفاسد سے آلودہ نہیں ہو سکتی (اور حق یہ ہے کہ خیر و سعادت میں سب سے بڑھ کر ہونے کے بعد کسی جماعت کی معنوی قوت میں کون سی چیز کی کمی رہ سکتی ہے اور معنوی قوت سے بڑھ کر کون سی قوت ہے جو امن و سلام کی ضامن ہو؟)

وحدت دعوت

قرآن مجید نے دین حق کی اس اصل عظیم کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ تمام نبی صرف ایک ہی دین کے داعی تھے۔ جب اللہ کا دین ایک ہے تو تمام رہنما ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں ہیں۔ جو ان میں تفریق کرتا ہے وہ پورے سلسلۂ ہدایت ہی کا منکر ہے۔ اللہ کا دین اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس کے ٹھہرائے ہوئے قوانینِ فطرت کی اطاعت کی جائے اور آسمان و زمین میں جس قدر مخلوق ہے سب قوانینِ الٰہی کی اطاعت کر رہی ہے۔ پھر اگر تمھیں اللہ کے قوانینِ فطرت سے انکار ہے تو اللہ کے قانون کے سوا کائناتِ ہستی میں اور کون سا قانون ہو سکتا ہے؟

ایمان اور محبت

اللہ پر ایمان اور اللہ کی محبت دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اگر اللہ کے سوا کسی دوسری ہستی کو بھی ویسی ہی چاہت سے ماننے لگے، جیسی چاہت سے ماننا صرف اللہ کے لیے ہے تو یہ اللہ کے ساتھ دوسرے کو ہم پلہ بنا دینا ہوا اور توحیدِ الٰہی کا اعتقاد درہم برہم ہو گیا۔ مومن وہ ہے جو سب سے زیادہ اللہ کی محبت رکھنے والا ہو۔ (والذین امنوا اشد حباً للہ)

جو کوئی اللہ سے محبت رکھنے کا دعویدار ہے اسے چاہیے کہ اللہ کے رسول کی پیروی کرے۔ اللہ کی محبت کا دعوٰے اور اس کی راہ بتلانے والے کی پیروی سے انکار ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے (رسول صلعم کی پیروی کرنے والوں سے اللہ بھی محبت کرنے لگے گا اور ان کی خطائیں بخش دے گا)

قرآن مجید کے چار وصف

سُورۂ یونس میں ہے:

یَآاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْکُمْ مَّوْعِظَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ وَھُدًی وَّرَحْمَۃٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ۔ (آیت ۵۷)

لوگو! تمھارے پاس پروردگار کی جانب سے ایک ایسی چیز آگئی ہے، جو موعظت ہے۔ دل کی بیماریوں کے لیے شفا ہے اور ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو اس پر یقین رکھتے ہیں۔

اس میں قرآن کے چار وصف بیان کیے:

ا۔ "موعظت" ہے یعنی دل میں اتر جانے کی دلیلوں اور رُوح کو متاثر کرنے والے طریقوں سے ان تمام باتوں کی ترغیب دیتا ہے، جو خیر و حق کی باتیں ہیں اور ان تمام باتوں سے روکتا ہے جو شر و بطلان کی باتیں ہیں کیونکہ عربی میں وعظ کا مفہوم صرف نصیحت نہیں بلکہ ایسی نصیحت ہے جو موثر دلائل اور دل نشیں دلیلوں سے کی جائے۔

ب۔ "شفآءٌ لما فی الصدور" دل کی تمام بیماریوں کے لیے نسخۂ شفا ہے، جو فرد یا گروہ اس نسخے پر عمل کرے گا، اس کے قلوب ہر طرح کے مفاسد و رذائل سے پاک ہو جائیں گے۔ یاد رہے عربی میں قلب، فواد اور صدر کے الفاظ جب کبھی ایسے موقع پر بولے جائیں، جیسا یہ موقع ہے تو ان سے مقصود انسان کی معنوی حالت ہوتی ہے۔ یعنی ذہن و فکر کی قوّت، عقلی ادراک، جذبات و عواطف، اخلاق و عادات، اندرونی حسیات۔ وہ عضو مقصود نہیں ہوتا، جو فنِ تشریح کا دل اور سینہ ہے۔

ج۔ "ھُدًی" یعنی یقین کرنے والوں کے لیے ایک ہدایت۔

د۔ "رحمۃ للمؤمنین" یقین کرنے والوں کے لیے پیامِ رحمت ہے، یعنی ظلم و قساوت اور بغض و تنفر سے دُنیا کو نجات دلاتا ہے۔ رحم و محبّت اور امن و سلامتی کی رُوح سے معمور کرتا ہے۔

اعلان ہی نہیں دلیل بھی

یہ محض قرآن کے اوصاف کا مدعیانہ اعلان ہی نہ تھا، بلکہ اس کی صداقت کی سب سے زیادہ موثر دلیل بھی تھا۔ اگر ایک شخص دعویٰ کرے کہ وہ طبیب ہے تو اس کے دعوے کی جانچ کا سب سے زیادہ سہل اور قطعی طریقہ یہ ہوگا کہ دیکھا جائے کہ اس کے علاج سے بیماروں کو شفا ملتی ہے یا نہیں؛ قرآن نے بھی جا بجا یہی جانچ منکروں کے سامنے پیش کی ہے۔ اس نے کہا، میں نسخۂ شفا ہوں۔ ثبوت میں مومنوں اور متقیوں کی جماعت پیش کر دی، جو اس کے دار الشفا

میں طیار ہوئی تھی۔ آج بھی اس کی یہ دلیل اسی طرح قاطع ہے جس طرح عہدِ نزول میں تھی۔ اگر اس نے عرب جاہلیت کے مریضان روح و دل میں سے ابوبکرؓ، عمرؓ، علیؓ، خالدؓ، سلمانؓ، ابوذرؓ وغیرہ جیسی تندرست رُوحیں پیدا کر دی تھیں تو کیا اس کے نسخۂ شفا میں شک کیا جا سکتا ہے؟

صراطِ مستقیم اور دینِ قیّم

سورۃ بنی اسرائیل میں فرمایا:

ان ھٰذا القراٰن یھدی للتی ھی اقوم۔ (۹)

بلاشبہ یہ قرآن اس راہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھی راہ ہے۔

قرآن نے اپنے جس قدر اوصاف بیان کیے ہیں، ان میں جامع ترین وصف یہی ہے کہ زندگی اور سعادت کے ہر گوشے میں اس کی رہنمائی سیدھی سے سیدھی بات کے لیے ہے۔ کسی طرح کی کجی، کسی طرح کا پیچ و خم، کسی طرح کا الجھاؤ، کسی طرح کی افراط و تفریط اس کی رہنمائی میں نہیں ہو سکتی۔ یہی حقیقت دوسری جگہ "صراط مستقیم" اور "الدین القیم" سے تعبیر کی گئی۔

(۲)

دین حق کے تین بنیادی اصول

سورۃ اعراف میں ہے:

قل امر ربی بالقسط واقیموا وجوھکم عند کل مسجد وادعوہ مخلصین لہ الدین۔ (آیت ۲۹)

تم کہو میرے پروردگار نے جو حکم دیا ہے وہ تو یہ ہے کہ ہر بات میں اعتدال کی راہ اختیار کرو۔ اپنی تمام عبادتوں میں خدا کی طرف توجہ درست رکھو اور دین کو اسی کے لیے خالص کر کے اسے پکارو۔

اس آیت میں دین حق کے تین بنیادی اصول واضح کر دیے: عملؔ میں اعتدال، عبادتؔ میں توجہ اور خداؔ پرستی میں اخلاص۔

یہ آیت باب توحید میں اصل اصول ہے۔ دین کو خدا کے لیے خالص کر کے پکارو، یعنی دین کی جتنی باتیں ہیں وہ صرف خدا ہی کے لیے مخصوص کر دو۔

"خلق" اور "امر" دونوں اللہ ہی کی ذات سے ہیں۔ یعنی وہی کائنات ہستی کا پیدا کرنے والا ہے اور اسی کے حکم و قدرت سے اس کا انتظام ہو رہا ہے۔

دکھاوے کی خیرات

دکھاوے کی خیرات اکارت جاتی ہے۔ جو شخص نیکی کے لیے نہیں، نام و نمود کے لیے خیرات کرتا ہے اور خدا کی جگہ انسانوں میں بڑائی چاہتا ہے وہ یقیناً خدا پر سچا ایمان نہیں رکھتا۔ ایسی خیرات سے روکا گیا ہے، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ جب تک پوری چھپے خیرات نہ کر سکو خیرات کرو ہی نہیں یا پوشیدگی کا تعلق بجائے خود عمل خیر سے مانع ہو جائے (چھپائے رکھنا ممکن ہو تو نہ چھپانا رفتہ رفتہ ریا و نمائش کا باعث بن سکتا ہے۔ نیت پاک ہو اور خدا کی رضا کے سوا کچھ منظور نہ ہو تو کسی کے سامنے بھی خیرات کر دینا نامناسب نہیں بلکہ بعض اوقات کھلم کھلا خیرات دوسروں کے لیے وسیلہ ترغیب بن جاتی ہے۔ مقصود حقیقی یہ ہے کہ نمود و نمائش سے نیت کا آئینہ آلودہ نہ ہونے پائے)
نکمی اور بیکار چیزیں خیرات کے نام سے محتاجوں کو نہ دو۔ سوچو کہ اگر تمھیں کوئی ایسی چیز دے تو لینا پسند کرو گے؟

محبت و ہمدردی کے تقاضے

نیکی کی راہ میں خرچ کرنے کی استعداد نشوونما نہیں پا سکتی تھی۔ اگر اس کو حکم دیتے ہوئے ایسی باتوں سے روک نہ دیا جاتا جو ٹھیک ٹھیک اس کی ضد ہیں۔ پس انفاق فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں خرچ کرنا) کے ساتھ ساتھ سود کی بھی ممانعت کر دی گئی۔

دینِ حق انسانوں میں محبت و ہمدردی پیدا کرنا چاہتا ہے اسی لیے خیرات کا حکم دیا کہ ہر انسان دوسرے کی احتیاج اپنی احتیاج سمجھے۔ سود خوار کی ذہنیت بالکل اس کی ضد ہے۔ وہ چاہتا ہے دوسرے کی احتیاج سے خود انتہائی فائدہ اٹھائے اور محتاج کو دولت جمع کرنے کا ذریعہ بنائے (گویا سود خوار کے دل میں ہم جنسوں کے لیے محبت و ہمدردی کا کوئی احساس باقی ہی نہیں رہتا)

مومن اور امید و یقین

قرآن نے ہر جگہ یہ حقیقت واضح کی کہ ایمان امید اور یقین ہے، کفر شک اور مایوسی ہے۔ وہ بار بار اس بات پر زور دیتا ہے کہ مایوس نہ ہو۔ امید کا چراغ روشن رکھو، ہر حال میں امیدوارِ فضل و سعادت رہو۔ یہی مقتضائے ایمان ہے۔ یہی سرچشمۂ زندگی ہے۔ اسی سے تمام دنیوی اور اُخروی کامرانیوں کی دولت حاصل ہو سکتی ہے۔
جس انسان نے امید و یقین کی جگہ شک و مایوسی کی راہ اختیار کی، خواہ دنیا کی زندگی کے لیے ہو، خواہ آخرت کے لیے، اسے سمجھ لینا چاہیے کہ اب اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ ایسے آدمی کے لیے صرف یہی چارۂ کار رہ جاتا ہے کہ گلے میں پھندا ڈالے اور زندگی ختم کر دے۔

ایمان نام ہی امید کا ہے اور مومن وہ ہے جو مایوسی سے کبھی آشنا نہیں ہو سکتا۔ اس کا ذہنی مزاج کسی چیز سے اتنا بیگانہ نہیں جس قدر مایوسی سے۔ زندگی کی مشکلیں اسے کتنا ہی ناکام کریں لیکن وہ پھر سعی کرے گا۔ لغزشوں اور گناہوں کا ہجوم اسے کتنا ہی گھیر لے لیکن وہ پھر توبہ کرے گا۔ نہ تو دنیا کی کامیابی سے وہ مایوس ہو سکتا ہے نہ آخرت کی نجات سے۔ وُہ جانتا ہے کہ دنیا کی مایوسی موت ہے اور آخرت کی مایوسی شقاوت۔ وہ دونوں جگہ رحمتِ الٰہی کو دیکھتا اور اس کی بخششوں پر یقین رکھتا ہے کہ لا تقنطوا من رحمۃ اللہ، ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا، انہ ھو الغفور الرحیم (اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اللہ سبھی گناہ بخش دیتا ہے، ہاں وُہ بخشنے والا اور رحمت کرنے والا ہے۔ (سورہ زمر : ۵۳)

قبولِ حق کی استعداد

بارش سے صرف وہی زمین فائدہ اٹھا سکتی ہے جس میں اس کی استعداد ہو۔ شور زمین پر کتنی ہی بارش ہو سر سبز نہ ہوگی۔ اسی طرح قرآن کی ہدایت سے بھی وہی روحیں شاداب ہوں گی جن میں قبولیتِ حق کی استعداد ہے۔ جنھوں نے استعداد کھو دی ان کے حصے میں محرومی و نامرادی کے سوا کچھ نہیں آئے گا۔

قبولِ حق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ آباؤ اجداد کی اندھی تقلید، گھڑی ہوئی بزرگیوں اور روایتی عظمتوں کی پرستش ہے۔ ابتدا میں جہل و فساد سے کوئی عقیدہ گھڑ لیا جاتا ہے۔ ایک مدت تک لوگ اسے مانتے رہتے ہیں۔ جب ایک عرصے کے اعتقاد سے اس میں شانِ تقدیس پیدا ہو جاتی ہے تو اسے شک و شبہ سے بالاتر سمجھنے لگتے ہیں اور عقل و بصیرت کی کوئی بھی دلیل اس کے خلاف تسلیم نہیں کرتے۔ قرآن اسی کو" اسماءً سمیتموھا انتم و اٰباؤکم" (نام ہیں جو تم نے اور تمھارے آباؤ اجداد نے گھڑ لیے ہیں) سے تعبیر کرتا ہے کیونکہ بنائے ہوئے ناموں کے سوا وہ کوئی حقیقت اور معقولیت پیش نہیں کر سکتے۔

دعوتِ اسلام کی تین خصوصیتیں

سورۂ اعراف کی آیت [1] ۱۵۶ میں پیغمبر اسلام کی دعوت کی تین خصوصیتیں بیان کیں:

---

[1] اس آیت کا متعلقہ حصہ یہ ہے:

یامرھم بالمعروف وینھٰھم عن المنکر و یحل لھم الطیبات و یحرم علیھم الخبآئث و یضع عنھم اصرھم والاغلل التی کانت علیھم۔

(پیغمبرِ اسلام، جس کی صفات تورات و انجیل میں یُوں مکتوب تھیں کہ) وہ نیکی کا حکم دے گا، برائی سے روکے گا، پسندیدہ چیزیں حلال کرے گا، گندی چیزیں حرام ٹھہرائے گا، اس بوجھ سے نجات دلائے گا جس کے تلے وہ دبے ہوں گے، ان پھندوں سے نکالے گا جن میں گرفتار ہوں گے۔

۱۔ نیکی کا حکم دیتا ہے، بُرائی سے روکتا ہے۔

۲۔ پسندیدہ چیزوں کا استعمال جائز ٹھہراتا ہے، ناپسندیدہ چیزوں کے استعمال کو روکتا ہے۔ قرآن نے اس معنی میں "طیبات" اور "خبائث" کا لفظ اختیار کیا ہے۔

۳۔ جو بوجھ اہلِ کتاب پر پڑ گیا تھا اور جن پھندوں میں وہ گرفتار ہو گئے تھے، ان سے نجات دلاتا ہے۔

یہ بوجھ کیا تھا اور یہ پھندے کیا تھے جن سے قرآن نے نجات دلائی؛ قرآن نے دوسرے مقامات پر اسے واضح کر دیا ہے: مذہبی احکام کی بے جا سختیاں، مذہبی زندگی کی ناقابلِ عمل پابندیاں، ناقابلِ فہم عقیدوں کا بوجھ، وہم پرستیوں کا انبار، عالموں اور فقیہوں کی تقلید کی بیڑیاں، پیشواؤں کے تعبد کی زنجیریں۔ پیغمبرِ اسلامؐ کی دعوت نے ان سب سے نجات دلادی۔ سچائی کی ایسی سہل و آسان راہ دکھادی جس میں عقل کے لیے کوئی بوجھ اور عمل کے لیے کوئی سختی نہیں۔

درخشاں حقائق

چند حقایق ملاحظہ فرمایئے:

۱۔ قرآن کے نزدیک کسی جماعت کے مسلمان ہونے کی عملی شناخت دو باتیں ہیں: نماز کا اہتمام اور زکوٰۃ کا نظام۔ جو جماعت یہ دو عمل ترک کر دے گی وہ (عملاً) مسلمان متصور نہ ہوگی۔ زکوٰۃ کے نظام سے مراد ہے کہ حکومت یہ انتظام نہ کر سکے یا کسی جگہ مسلمان خدانخواستہ محکوم ہو جائیں تو وہ خود زکوٰۃ کا نظام سنبھالیں۔

۲۔ شرف و بزرگی کے رسمی مناصب کوئی چیز نہیں، بزرگی اسی کے لیے ہے جو عمل و ایمان کی بزرگی رکھتا ہے۔

۳۔ قرآن کے نزدیک سب سے بڑا درجہ ان انسانوں کا ہے جو ایمان و حق پرستی کی راہ میں قربانیاں کرنے والے ہیں، نہ کہ ان لوگوں کا جو رواجی نیکیوں اور رسمی نمائشوں میں سرگرم نظر آتے ہیں۔

۴۔ مومن وہ ہے جس کی حُبِّ ایمانی پر دنیا کی کوئی محبت غالب نہ آسکے۔

۵۔ جماعت کی زندگی اور فتح و کامرانی کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی خطرہ نہیں کہ مذبذب اور دو دِلے آدمی اس میں موجود ہوں۔

۶۔ کاروبارِ حق میں دارومدار شخصیتوں پر نہیں۔ شخصیت اس لیے ہے کہ بیج بو دے۔ باقی رہے برگ و بار، تو ہو سکتا ہے اس کی زندگی میں ہی سب نمودار ہو جائیں۔ ہو سکتا ہے کچھ زندگی میں، کچھ اس کے بعد ہوں۔ اس تاخیر سے کاروبارِ حق پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

۷۔ حلت و حرمتِ اشیاء میں قرآن کے اصول اربعہ:

ا۔ اصل اباحت ہے نہ کہ حرمت، اِلّا یہ کہ وحیِ الٰہی نے کسی چیز کو حرام ٹھہرا دیا ہو۔

ب۔ کسی چیز کو حرام ٹھہرا دینے کا حق خدا کی شریعت کو ہے۔

ج - محض اپنی رائے اور قیاس سے کوئی چیز حرام ٹھہرانا افترا علی اللہ یعنی خدا پر بہتان باندھنا ہے۔
د - انسان کے عقاید و اعمال کی بنیاد علم و یقین پر ہونی چاہیے، نہ کہ وہم و گمان پر۔

تذکیر و توکیل

پیغمبر کا کام "تذکیر" و "تبلیغ" ہے "تبشیر" و "تنذیر" ہے۔ وہ داعی اور مذکر ہے۔ "وکیل" یعنی نگہبان نہیں جو زبردستی کسی راہ میں کھینچ لے جائے، پھر اس سے نکلنے نہ دے۔ سورۂ یونس میں ہے:

وما انا علیکم بوکیل۔ (میں تم پر نگہبان نہیں۔ یونس: ۱۰۷)

دوسری جگہ پیغمبرِ اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے یہی مطلب یوں ادا کیا:

وما انت علیھم بجبار (تو ان لوگوں پر حاکم جابر کی طرح مسلط نہیں کہ جبراً و قہراً بات منوا دے۔ ق: ۴۵)

نیز فرمایا:

لست علیھم بمصیطر (تجھے ان پر داروغہ بنا کر نہیں بٹھا دیا ہے کہ مانیں یا نہ مانیں لیکن تو انھیں راہِ حق پر چلا دینے کا ذمہ دار ہو۔ غاشیہ: ۲۲)

پھر فرمایا:

فانما علیك البلٰغ وعلینا الحساب (جو کچھ تیرے ذمے ہے یہی ہے کہ پیغام پہنچا دیا جائے۔ ان سے ان کے کاموں کا حساب لینا ہمارا کام ہے۔ رعد: ۴۰)

قرآن صاف صاف کہتا ہے کہ خدا کے رسولوں کا منصب "تذکیر و تبلیغ" کے اندر محدود تھا حالانکہ وہ خدا کی طرف سے مامور تھے۔ پھر ظاہر ہے کہ کسی دُوسرے شخص کے لیے وہ کب گوارا کر سکتا ہے کہ وکیل، مصیطر اور جبّار بن جائے!

تذکیر و تبلیغ اور پسند و قبول

دراصل اعمالِ انسانی کے تمام گوشوں میں اصل سوال حدود ہی کا ہے اور ہر جگہ انسان نے اسی میں ٹھوکر کھائی ہے، یعنی ہر بات کی جو حد ہے اس کے اندر نہیں رہنا چاہتا۔ دو حق ہیں۔ دونوں کو اپنی اپنی حدود کے اندر رہنا چاہیے۔ ایک حق ہے تذکیر و تبلیغ کا، ایک پسند و قبولیت کا۔ ہر انسان کو اس کا حق ہے کہ جس بات کو درست سمجھتا ہے اسے دوسروں کو بھی سمجھائے لیکن اس کا حق نہیں کہ دُوسروں کے حق سے انکار کر دے، یعنی یہ بات بُھلا دے کہ جس طرح اسے ایک بات کے ماننے نہ ماننے کا حق ہے، ویسا ہی دوسرے کو بھی ماننے نہ ماننے کا حق ہے اور ایک فرد دوسرے کے لیے ذمہ دار نہیں۔

تاریخ کو بارہ صدیوں تک اس بات کا انتظار کرنا پڑا کہ ایک انسان دوسرے انسان کو محض اختلافِ عقاید کی بنا پر

ذبح نہ کرے۔ اتنی بات سمجھ لے کہ "تذکیر" و "توکیل" میں فرق ہے۔ اب ڈیڑھ سو برس سے یہ بات دُنیا کے عقلی مسلمات میں سے سمجھی جاتی ہے، لیکن اسے معلوم نہیں کہ اس کے اعلان کی تاریخ امریکہ اور فرانس کے "اعلان حقوق انسانی" سے شروع نہیں ہوئی۔ اس سے بارہ سو برس پہلے (نزولِ قرآن کے ساتھ) شروع ہو چکی تھی۔

خوف و حُزن

قرآن نے اہلِ ایمان کی نسبت جو کچھ کہا ہے اس میں کوئی بھی بات اس قدر نمایاں نہیں جس قدر یہ کہ " لاخوفٌ علیھم ولاھم یحزنون" (اور یہ قرآن میں کئی مقامات پر ارشاد ہوا ہے) یعنی وہ خوف اور غم دونوں سے محفوظ ہو جائیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کی سعادت کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا اور اس کی شقاوت کی ساری سرگزشت انھی دو لفظوں میں سمٹی ہوئی ہے؛ خوف اور دُکھ۔ جُونہی ان دو باتوں سے اسے رہائی مل گئی اس کی ساری سعادتیں اس کے قبضے میں آگئیں۔ زندگی کے جتنے کانٹے بھی ہو سکتے ہیں سب کو ایک ایک کر کے چنو، خواہ جسم میں چُبھے ہوں، خواہ دماغ میں۔ خواہ موجودہ زندگی کی عافیت میں خلل ڈالتے ہوں خواہ آخرت کی۔ تم دیکھو گے کہ ان دُو باتوں سے باہر نہیں۔ یا خوف کا کانٹا ہے یا غم کا۔ قرآن کہتا ہے کہ ایمان کی راہ سعادت کی راہ ہے۔ جس کے قدم اس راہ میں جم گئے اس کے لیے دونوں کانٹے بے اثر ہو جاتے ہیں۔ اس کے لیے نہ تو کسی طرح کا اندیشہ ہوگا نہ کسی طرح کی غمگینی۔

عقل اور ماورائے عقل

قرآن اس بات کی بھی مذمت کرتا ہے کہ علم و بصیرت کے بغیر کوئی بات مان لی جائے اور اسی کی بنی پر محض عدم ادراک کی بنا پر کوئی بات جھٹلا دی جائے۔ اگر غور کرو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ انسان کی فکری گمراہیوں کا سرچشمہ یہی بات ہے۔ یا تو وہ عقل و بینش سے اس قدر کورا ہو جاتا ہے کہ ہر بات بے سمجھے بُوجھے مان لیتا ہے اور ہر راہ میں آنکھیں بند کیے چلتا رہتا ہے، یا پھر سمجھ بوجھ کا غلط استعمال کرتا ہے۔ جہاں کوئی حقیقت اس کی شخصی سمجھ سے بالاتر ہوئی، جھٹلا دی۔ اس طرح حقیقت کے اثبات و وجود کا مدار صرف ایک خاص فرد کی سمجھ پر رہ گیا۔

صورتیں دُو ہیں اور دونوں کا حکم ایک نہیں۔ ایک یہ کہ کوئی بات عقل کے خلاف ہو۔ ایک یہ کہ تمھاری عقل سے بالاتر ہو۔ بہت سی باتیں ایسی ہو سکتی ہیں، جن کا احاطہ تمھاری سمجھ نہیں کر سکتی، لیکن تم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ وہ سرے سے خلافِ عقل ہیں۔ اولاً افراد کی عقلی قوت یکساں نہیں۔ ثانیاً عقل انسانی برابر نشو و ارتقا کی حالت میں ہے۔ ایک عہد کی عقل جن باتوں کا اثبات نہیں کر سکتی دوسرے عہد کے لیے وہ عقلی مسلمات بن جاتی ہیں۔ ثالثاً انسانی عقل کا ادراک ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا اور عقل ہی کا فیصلہ ہے کہ حقیقت اسی حد پر ختم نہیں ہو جاتی۔

مرد عورت کی اخلاقی مساوات

قرآن نے مرد اور عورت دونوں کا مساویانہ حیثیت سے ذکر کیا ہے اور فضائل و خصائل کے لحاظ سے وہ دونوں میں کسی طرح کی تفریق نہیں کرتا۔ سورۂ نسأ میں جہاں ازدواجی زندگی کے احکام کی تشریح ہے وہاں صاف صاف تصریح کر دی ہے کہ فضائل و محاسن کے لحاظ سے دونوں یکساں طور پر اپنی اپنی راہیں رکھتے ہیں اور دونوں کے لیے ایک ہی طرح پر فضیلتوں کا دروازہ کھول دیا گیا ہے[1]۔ چنانچہ جس طرح وہ نیک مردوں کے فضائل و مدارج بتلاتا ہے اسی طرح نیک عورتوں کے بھی بتلاتا ہے یعنی جس طرح مردوں میں مسلم و مومن ہیں اسی طرح عورتوں میں بھی قانت عورتیں ہیں۔ جس طرح مردوں میں صادق مرد ہیں اسی طرح عورتوں میں بھی صادقہ عورتیں ہیں۔ جس طرح مردوں میں اللہ کا خوف رکھنے والے اور بہ کثرت اس کا ذکر کرنے والے ہیں' اسی طرح عورتوں میں بھی اللہ کا خوف رکھنے والیاں اور بہ کثرت ذکر کرنے والیاں ہیں۔

قرآن کریم کی شہادت

مردوں کے لیے فرمایا:

التائبون العابدون الحامدون السآئحون الراکعون الساجدون الاٰمرون بالمعروف والناھون عن المنکر والحافظون لحدود اللہ۔

(سورۃ توبہ: ۱۱۲)

(اپنی لغزشوں اور خطاؤں سے) توبہ کرنے والے، عبادت میں سرگرم رہنے والے، اللہ کی حمد و ثنا کرنے والے، سیر و سیاحت کرنے والے، رکوع و سجود میں جھکنے والے، نیکی کا حکم دینے والے، برائی سے روکنے والے اور اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حد بندیوں کی حفاظت کرنے والے۔

عورتوں کے لیے بھی فرمایا:

مُسلماتٌ، مؤمناتٌ، قانتاتٌ، تائباتٌ، عابداتٌ، سائحاتٌ۔ (سورہ تحریم: ۵)

مسلم عورتیں، مومن عورتیں، فرمانبردار، توبہ کرنے والیاں عبادت کرنے والیاں، سیر و سیاحت کرنے والیاں۔

---

[1] اشارہ ہے اس آیت کی طرف:

للرجال نصیبٌ مما اکتسبوا وللنسآء نصیبٌ مما اکتسبن۔

مردوں نے اپنے عمل سے جو کچھ حاصل کیا اس کے مطابق (ثمرات و نتائج میں) ان کا حصّہ ہے اور عورتوں نے اپنے عمل سے جو کچھ حاصل کیا اس کے مطابق (ثمرات و نتائج میں) ان کا حصہ ہے۔

منافقوں کا ذکر کیا تو دونوں جنسوں کا کیا :

المنافقون والمنافقات بعضهم من بعضٍ یأمرون بالمنکر و ینهون عن المعروف۔ (سورۃ توبہ : ۶۷)

منافق مرد اور منافق عورتیں، سب ایک دوسرے کے ہم جنس برائی کا حکم دیتے ہیں اور اچھی باتوں سے روکتے ہیں۔

پھر فرمایا :

ان المسلمین والمسلمٰت والمؤمنین والمؤمنٰت والقٰنتین والقٰنتٰت والصّٰدقین والصّٰدقٰت والصّٰبرین والصّٰبرٰت والخٰشعین والخٰشعٰت والمتصدّقین والمتصدّقٰت والصّآئمین والصّٰئمٰت والحافظین فروجھم والحٰفظٰت والذّٰکرین اللہ کثیراً والذّٰکرٰت اعدّ اللہ لھم مغفرۃً و اجراً عظیماً۔

(سورۃ احزاب : ۳۵)

مسلم مرد اور مسلم عورتیں اور مومن مرد اور مومن عورتیں اور فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں اور صدق پر کاربند مرد اور صدق پر کاربند عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور فروتنی کرنے والے مرد اور فروتنی کرنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزے رکھنے والے مرد اور روزے رکھنے والی عورتیں اور اپنی حفاظت کرنے والے پاکباز مرد اور اپنی حفاظت کرنے والی پاکباز عورتیں اور اللہ کا بہت ذکر کرنے والے مرد اور بہت ذکر کرنے والی عورتیں۔ ان کے لیے اللہ کے ہاں مغفرت اور بہت بڑا درجہ ہے۔

غور کرو کسی وصف میں تفریق نہیں، کسی فضیلت میں امتیاز نہیں، کسی بڑائی میں عدم مساوات نہیں۔ پھر کیا ممکن ہے کہ جس قرآن نے مردوں اور عورتوں کی اخلاقی مساوات اس درجہ ملحوظ رکھی ہو اسی قرآن کا یہ فیصلہ ہو کہ عورتوں کی جنس مردوں کے مقابلے میں زیادہ بد اخلاق ہے؟

صبر اور شکر

"صبر" کے معنی ہیں مشکلوں اور مصیبتوں کے مقابلے میں جمے رہنا۔ "شکر" کے معنی ہیں اللہ کی بخشی ہوئی قوتوں (اور نعمتوں) کی قدر کرنا اور انھیں ٹھیک ٹھیک کام میں لانا۔ خدا کا یہ مقررہ قانون ہے کہ جو قوم (مشکلوں اور مصیبتوں کے مقابلے میں ثبات و استقامت پر استوار رہتی ہے اور) خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کی قدر بجا لاتی ہے اور ان سے ٹھیک طور پر کام لیتی ہے۔ خدا اسے اور نعمتیں عطا فرماتا ہے، لیکن جو کفرانِ نعمت کرتی ہے یعنی قدر شناسی نہیں کرتی، محرومی و نامرادی کے عذاب میں گرفتار ہو جاتی ہے اور یہ اللہ کا سخت عذاب ہے، جو کسی انسانی گروہ کے حصے میں آتا ہے۔
غور کرو یہ حقیقتِ حال کی سچی تعبیر ہے۔ جو فرد یا گروہ خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کی قدر کرتا ہے۔ مثلاً خدا نے اسے فتحمندی و کامرانی عطا فرمائی ہے وہ اس نعمت کو پہچانتا، اسے ٹھیک طور پر کام میں لاتا اور اس کی حفاظت سے غافل

نہیں ہوتا ۔ وہ اور زیادہ نعمتوں کے حصول کا مستحق ہو جاتا ہے یا نہیں ؛ جو ایسا نہیں کرتا ، اس کی نامرادی و تباہی میں کوئی شک ہو سکتا ہے ؛

اکتسابِ مال اور انفاقِ مال

ہر انسان کی ذہنی و جسمانی استعداد یکساں نہیں ہوتی ، اس لیے وسائل معیشت کے حصول کے اعتبار سے بھی سب کی حالت یکساں نہ ہُوئی ۔ کسی کو کمانے کے زیادہ مواقع حاصل ہو گئے ، کسی کو تھوڑے ۔ پہلے قوت میں مقابلہ ہوا ۔ طاقتور نے کمزور کو مغلوب کر لیا ۔ پھر ذہن و جسم کا مقابلہ شروع ہوا اور ذہنی قوت نے جسمانی قوت کو مقہور کر لیا ۔

قرآن اس صورت حال سے تو تعرض نہیں کرتا کہ حیثیت کے اعتبار سے تمام انسانوں کی حالت یکساں نہیں ، لیکن یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ حصولِ رزق کے اعتبار سے لوگوں کی حالت یکساں نہ ہو ۔ کسی کو ملے کسی کو نہ ملے ۔ وہ کہتا ہے ہر انسان جو دنیا میں پیدا ہوا ، دنیا کے سامان رزق سے حصہ پانے کا یکساں طور پر حقدار ہے ۔

دراصل قرآن کی اس تہ میں یہ بنیادی اصل کام کر رہی ہے کہ وہ نوعِ انسانی کے مختلف افراد اور جماعتوں کو ایک دوسرے سے الگ اور منقسم تسلیم نہیں کرتا ، بلکہ سب کو ایک ہی گھرانے کے مختلف افراد قرار دیتا ہے ۔ ایسے افراد جو آپس میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں ، ایک دوسرے کے شریک حال ہیں ۔

(قرآن) کہتا ہے کمائی کے حق کا دامن انفاق کی ذمہ داری سے بندھا ہوا ہے ۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں ۔ تم انھیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے ۔ یہاں کمائی کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خرچ کرنے کی ذمہ داری اٹھائی جائے ۔ تم جس قدر کما سکتے ہو کماؤ ، بلکہ چاہیے زیادہ سے زیادہ کماؤ ، لیکن یہ نہ بھولو کہ زیادہ سے زیادہ کمانا ، زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے کو کہتے ہیں ۔ وُہ کہتا ہے افراد کے ہاتھ کمائی کے لیے ہیں ، لیکن جماعت کا حق خرچ کرانے کا ہے ۔

غرض جہاں تک نظامِ معیشت کا تعلق ہے ، قرآن نے اکتسابِ مال کا معاملہ انفاقِ مال کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے کوئی کمائی جائز نہیں تسلیم کی جا سکتی ، اگر انفاق سے انکار کرتی ہو ۔ ہر وہ کمائی جو محض اکتناز کے لیے ہو اور انفاق کے لیے دروازہ کھلا نہ رکھے قرآن کے نزدیک ناجائز ، ناپاک اور مستحق عقوبت ہے ۔

بدعملی کا بڑا مرکز

انفرادی زندگی میں بدعملی کا بڑا مرکز دنیوی خوشحالی کی زندگی ہے ۔ خوشحالی و ثروت کی حالت ایک ایسی حالت ہے کہ اگر کسی جماعت میں پھیلی ہوئی ہو تو اس سے بڑھ کر کوئی برکت نہیں اور اگر صرف چند افراد میں سمٹی ہوئی ہو تو اس سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں ، کیونکہ جب دولت صرف چند افراد کے قبضے میں آگئی ، باقی افرادِ جماعت محروم رہ گئے تو قدرتی طور پر ہر طرح کا غلبہ و تسلط چند افراد کے ہاتھ میں آ جائے گا اور ایسے غلبہ و تسلط کا نتیجہ غرورِ باطل اور استکبار عن الحق ہے (اس

صورت حال کی الم انگیز مثالیں ہر طرف موجود ہیں)

یہی وجہ ہے کہ قرآن جس جماعتی خوشحالی کو اللہ کا سب سے بڑا افضل قرار دیتا ہے ، اسی کو انفرادی حالت میں " فتنہ " اور " متاع غرور " بھی کہتا ہے ۔

آج تمام دنیا میں شور مچ رہا ہے کہ انفرادی سرمایہ داری دنیا کے لیے مصیبت ہے ، لیکن قرآن چودہ سو برس پہلے اسے " فتنہ " قرار دے چکا اور اس کے لیے اکتناز کا لفظ بول چکا ہے ۔

والذین یکنزون الذھب و الفضة و لا ینفقونھا ۔ (سورۃ توبہ : ۳۴)

اور جو لوگ چاندی اور سونا اپنے ذخیروں میں جمع کرتے رہتے ہیں اور اللہ کی راہ میں اسے خرچ نہیں کرتے ۔

مشکل یہ ہے کہ جب تک قرآن کی صدا ہے تمھاری نظروں میں جچتی نہیں ۔ جب وہی بات وقت کے ذہن و فکر سے اٹھنے لگتی ہے تو فوراً اس کی پرستش شروع کر دیتے ہو ۔

(۴)

۴۴

فضیلت و کامرانی کے طریقے

سورۂ اعراف میں ہے :

و ان تدعوھم الی الھدی لا یسمعوا و تراھم ینظرون الیك وھم لا یبصرون خذ العفو و امر بالمعروف و اعرض عن الجاھلین ۔ (۱۹۸ - ۱۹۹)

(اے پیغمبر!) اگر تم ان لوگوں کو سیدھے راستے کی طرف بلاؤ تو ہرگز تمھاری پکار نہ سنیں ۔ تمھیں ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تمھاری طرف تک رہے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دیکھتے نہیں (بہرحال) نرمی و درگزر سے کام لو ، نیکی کا حکم دو ، جاہلوں کی طرف متوجہ نہ ہو ۔

(دیکھیے) چند لفظوں کے اندر زندگی کی اخلاقی مشکلات کا پورا حل اور فضیلت و کامرانی کے تمام طریقے واضح کر دیے ۔ " اخذ بالعفو " ، " امر بالمعروف " اور " اعراض عن الجاھلین " یعنی ناسمجھوں کی ناسمجھی بخش دینا ، نیکی کی دعوت میں سرگرم رہنا اور جاہلوں کے پیچھے نہ پڑنا ۔ سرسری نظر میں پتا نہیں لگے گا ، اچھی طرح اور بار بار غور کرو ۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا کون سا گوشہ ہے جس کی ساری عملی مشکلات ان تین اصولوں سے حل نہیں ہو جاتیں ؟

آیت ۱۹۸ میں فرمایا : حقیقت یہ ہے کہ تجھے دیکھتے نہیں کیونکہ اگر دیکھتے تو کبھی انکار نہ کرتے ۔ سو ایک دیکھنا سلمان فارسی کا تھا ، جو پہلی ہی نگاہ میں پکار اٹھا :

واللہ ماھذا الوجہ کذاب (خدا کی قسم یہ صورت جھوٹے آدمی کی ہو نہیں سکتی)

اور ایک دیکھنا ابوجہل کا تھا کہ مالھذا الرسول یاکل الطعام و یمشی فی الاسواق (یہ کیسا نبی ہے کہ آدمیوں کی طرح

غذا کا محتاج ہے اور بازاروں میں پھرتا ہے؟ (الفرقان : ۷)

ذات وصفات

خدا کی ہستی کا اعتقاد انسانی فطرت کے اندرونی تقاضوں کا جواب ہے۔ اسے حیوانی سطح سے بلند ہونے اور انسانیت اعلیٰ تک پہنچنے کے لیے بلندی کے ایک نصب العین کی ضرورت ہے۔ اور اس نصب العین کی طلب بغیر کسی ایسے تصور کے پوری نہیں ہو سکتی جو کسی نہ کسی شکل میں اس کے سامنے آئے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ مطلق کا تصور سامنے آ نہیں سکتا (جب تک ایجابی صفتوں کے تشخص کا کوئی نہ کوئی نقاب چہرے پر نہ ڈال دے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے (صفاتِ باری تعالیٰ میں) جو راہ اختیار کی وہ ایک طرف تو تنزیہ[1] کو اس کے کمال کے درجے پر پہنچا دیتی ہے۔ دوسری طرف "تعطیل"[2] سے بھی تصور کو بچا لیتی ہے۔ وہ فرداً فرداً تمام صفات و افعال کا اثبات کرتا ہے مگر ساتھ ہی مشابہت کی قطعی نفی بھی کرتا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے خدا حسن و خوبی کی ان تمام صفتوں سے جو انسانی فکر میں آ سکتی ہیں، متصف ہے۔ وہ زندہ ہے، قدرت والا ہے، رحمت والا ہے۔ لیکن اسی طرح صاف صاف اور بے لچک کہہ دیتا ہے کہ اس سے مشابہ کوئی چیز نہیں، جو تمہارے تصور میں آ سکتی۔ وہ عدیم المثال ہے۔

درماندگیوں کا ایک ہی حل

غرض قرآن کے تصورِ الٰہی کا یہ پہلو فی الحقیقت اس راہ کی تمام درماندگیوں کا ایک ہی حل ہے اور ساری سرگردانیوں کے بعد بالآخر اسی منزل پر پہنچ کر دم لینا پڑتا ہے۔ یہاں ایک طرف بامِ حقیقت کی بلندی اور فکرِ کوتاہ کی نارسائیاں ہوئیں، دوسری طرف ہماری فطرت کا اضطرابِ طلب اور ہمارے دل کا تقاضائے دید ہوا۔ بام اتنا بلند کہ نگاہِ تصور تھک تھک کے رہ جاتی ہے۔ تقاضائے دید اتنا سخت کہ بغیر کسی کا جلوہ سامنے لائے چین نہیں پا سکتا۔ اگر "تنزیہ" کی طرف زیادہ جھکتے ہیں تو "تعطیل" میں جا گرتے ہیں اگر اثباتِ صفات کی صورت آرائیوں میں دور نکل جاتے ہیں تو "تشبیہ" اور "تجسیم" میں کھوئے جاتے ہیں۔ پس نجات کی راہ صرف یہی ہوئی کہ دونوں کے درمیان قدم سنبھالے رہیں۔ "اثبات" کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے، "تنزیہ" کی باگ بھی ڈھیلی نہ پڑنی پائے۔

---

[1] "تنزیہ" سے مقصود یہ ہے کہ جہاں تک عقل بشری کی پہنچ ہے، صفاتِ الٰہی کو مخلوقات کی مشابہت سے پاک و بلند رکھا جائے۔

[2] "تعطیل" کے معنی یہ ہیں کہ "تنزیہ" کے منع و نفی کو اس حد تک پہنچا دیا جائے کہ فکر انسانی کے تصور کے لیے کوئی بات باقی نہ رہے قرآن کا تصورِ صفات تنزیہ کی تکمیل ہے، تعطیل کا آغاز نہیں۔ اسی طرح قرآن نے تشبیہ و تمثیل و تجسیم کا بھی خاتمہ کر دیا۔

محکمات و متشابہات

قرآن نے مطالب کی دو بنیادی قسمیں قرار دیں۔ ایک کو "محکمات" سے تعبیر کیا، دوسری کو "متشابہات" سے۔ محکمات سے وہ باتیں مقصود ہیں، جو صاف صاف انسان کی سمجھ میں آجاتی ہیں اور اس کی عملی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں اور اس لیے ایک سے زیادہ معانی کا دل میں احتمال نہیں۔ متشابہات وُہ ہیں جن کی حقیقت وہ پا نہیں سکتا اور اس کے سوا چارہ نہیں کہ ایک خاص حد تک جا کر رک جائے اور بے نتیجہ باریک بینیاں نہ کرے۔

هو الذی انزل علیك الكتاب فیه ایاتٌ محكماتٌ هنّ امّ الكتاب واخر متشبهٰت فاما الذین فی قلوبهم زیغٌ یتبعون ماتشابه منه ابتغآء الفتنة وابتغاء تاویله وما یعلم تاویله الّا الله والرّسخون فی العلم یقولون اٰمنّا به كلٌّ من عند ربنا وما یذّكّر الا اولوا الالباب۔

(آل عمران : ۳)

(اے پیغمبر!) وہی (حیّ و قیوم) ہے جس نے تم پر الکتاب نازل فرمائی ہے۔ اس میں ایک قسم تو محکم آیتوں کی ہے (یعنی ایسی آیتوں کی جو اپنے ایک ہی معنیٰ میں اٹل اور ظاہر ہیں) اور وہ کتاب کی اصل و بنیاد ہیں۔ دوسری قسم متشابہات کی ہے (یعنی ان کا مطلب کھلا اور قطعی نہیں) تو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے، وہ (محکم آیتیں چھوڑ کر) ان آیتوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں جو کتاب اللہ میں متشابہ ہیں، اس غرض سے کہ فتنہ پیدا کریں اور ان کی حقیقت معلوم کرلیں حالانکہ ان کی حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا مگر جو لوگ علم میں پختے ہیں کہتے ہیں ہم ان پر ایمان رکھتے ہیں کیونکہ یہ سب کچھ ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے اور مصیبت یہ ہے کہ (تعلیم حق سے) دانائی حاصل نہیں کرتے مگر وہی جو عقل و بصیرت رکھنے والے ہیں۔

متشابہات کی حقیقت کا ادراک عقل انسانی کی پہنچ سے باہر ہے۔ وہ خلافِ عقل نہیں (بلکہ) ماوراے عقل ہیں۔ انسان ان پر یقین کر سکتا ہے، مگر ان کی حقیقت نہیں پا سکتا۔

وفائے عہد اور قرآن

عہدِ جاہلیت کے عرب وفائے عہد کی اخلاقی قدر و قیمت سے بے خبر نہ تھے، ان میں ایسے لوگ بھی تھے، جو اپنے اور اپنے قبیلے کے مفاخر میں سب سے زیادہ نمایاں جگہ وفائے عہد کو دیتے تھے، لیکن جہاں تک جماعتی معاہدوں کا تعلق ہے وفائے عہد کا عقیدہ کوئی عملی قدر و قیمت نہیں رکھتا تھا۔ آج ایک قبیلہ ایک قبیلے سے معاہدہ کرتا تھا، کل دیکھتا تھا کہ اس کے

مخالف زیادہ طاقت ور ہوگئے ہیں تو بے دریغ ان سے جا ملتا تھا اور معاہد و حلیف پر حملہ کر دیتا تھا۔ اگر کسی دشمن فریق سے (عہد جاہلیت کے عرب) امن کا معاہدہ کرتے، پھر دیکھتے کہ اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا موقع پیدا ہوگیا ہے تو ایک لمحے کے لیے بھی معاہدے کا احترام انھیں حملہ کر دینے سے نہیں روکتا تھا اور بے خبر دشمن پر جا گرتے تھے۔

قرآن راستبازی کی جو رُوح پیدا کرنا چاہتا تھا وہ ایک لمحے کے لیے بھی ایسی بد اخلاقی گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے وفائے عہد اور احترامِ پیمان کا جو معیار قایم کیا ہے وہ اس درجہ بلند، قطعی، بے لچک اور عالمگیر ہے کہ انسانی اعمال کا کوئی بھی گوشہ اس سے باہر نہیں رہ سکتا۔ وہ کہتا ہے کہ فرد ہو یا جماعت، ذاتی معاملات ہوں یا سیاسی، عزیز ہوں یا اجنبی، ہم قوم و مذہب ہوں یا غیر ہم قوم و مذہب، دوست ہوں یا دشمن، امن کی حالت ہو یا جنگ کی، لیکن کسی بھی حال میں عہد شکنی جائز نہیں، وہ ہر حال میں جُرم ہے، معصیت ہے، اللہ کے ساتھ ایک بات کر کے اسے توڑ دینا ہے۔ عذابِ عظیم کا اپنے کو مستحق ثابت کرنا ہے۔

قرآنی ارشادات

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جا بجا وفائے عہد پر زور دیا ہے اور جہاں کہیں مومنوں کے ایمانی فضائل کی تصویر کھینچی ہے یہ وصف سب سے زیادہ اُبھرا ہوا نظر آتا ہے:

۱۔ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا۔ (البقرہ: ۱۷۷)

اور جب قول و قرار کر لیتے ہیں تو اس کا پاس کرتے ہیں۔

۲۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ۔ (المومنون: ۸)

نیز جن کی حالت یہ ہے کہ اپنی امانتوں اور عہدوں کا پاس رکھتے ہیں۔

احادیث میں منافق کی یہ پہچان بتلائی گئی ہے:

اذا وعد اخلف۔

جب وعدہ کرے گا پُورا نہ کرے گا۔

(سورۃ نحل آیت: ۹۲ میں فرمایا):

تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ۭ اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ۭ

تم آپس کے معاملے میں اپنی قسموں کو مکر و فساد کا ذریعہ بناتے ہو اس لیے کہ ایک گروہ کسی دوسرے گروہ سے (طاقت میں) بڑھ چڑھ گیا ہے (یاد رکھو) اس معاملے میں اللہ تمھاری (راست بازی اور استقامت) کی آزمایش کرتا ہے۔

پھر اس طرح کی بدعہدی کی مثال کیا ہے، فرمایا: کالتی نقضت غزلها من بعد قوة انکاثا۔ النحل (اس عورت کی سی ہے جس نے بڑی جانفشانی سے سُوت کاتا، پھر خود ہی اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے برباد کر دیا) یعنی جب ایک

شخص یا ایک گروہ کوئی معاہدہ کرتا ہے تو اس کی پختگی کے لیے بڑی باتیں کرتا ہے۔ ہر طرح دوسرے فریق کو یقین دلاتا ہے۔ پھر اگر ایک بات اتنی کوشش کے بعد پختہ کی گئی ہے تو کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ جس نے کل پختہ کی تھی وہی آج اسے اپنے ہاتھوں سے توڑ کر رکھ دے۔

رسولِ اکرم صلعم کی شانِ رافت و رحمت

سُورۃ توبہ کی آخری دو آیتوں[1] میں عرب کی اس نسل سے خطاب ہے جو اس وقت مخاطب تھی۔ فرمایا: اللہ کا رسول تم میں آگیا۔ اس نے اپنا فرضِ رسالت ادا کر دیا۔ وہ کسی دوسری جگہ سے تم میں نہیں آنکلا تھا۔ سنّت الٰہی کے مطابق خود تمھیں میں پیدا ہوا، اور چونکہ تمھیں میں سے ہے اس لیے اوّل سے آخر تک اس کی ساری باتیں تمھاری نگاہوں کے سامنے رہی ہیں اس کا لڑکپن بھی تم میں گزرا۔ اس کی جوانی کے دن بھی تم میں بسر ہوئے۔ پھر اس نے نبوت کا اعلان کیا تو اس نے تم سے کہیں چھُپ کر زندگی بسر نہیں کی۔ اس کی ساری باتیں تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے۔ پھر جو کچھ گزرنا تھا، گزرا تم نے مظلومی و بیکسی کے اعلان بھی سُن لیے۔ فتح و کامرانی میں ان کی تصدیق بھی کر لی۔ تم میں کوئی نہیں جو اس کی بے داغ زندگی کا شاہد نہ ہو اور کوئی نہیں جس نے اس کی ایک ایک بات کی سچائی آزمانہ لی ہو۔

پھر (رسول صلعم کے) ایک ایسے وصف پر زور دیا، جو منصبِ رسالت کے لیے اور ہر اُس انسان کے لیے جو قوم کی رہنمائی و قیادت کا مقام رکھتا ہو، سب سے زیادہ ضروری ہے، یعنی ابنائے جنس کے لیے شفقت و رحمت۔ فرمایا: اس سے زیادہ کوئی بات تمھارے لیے یقینی نہیں ہو سکتی کہ وہ سرتاپا شفقت و رحمت ہے۔ وہ تمھارا دُکھ برداشت نہیں کر سکتا۔ تمھاری ہر تکلیف خواہ جسم کے لیے ہو خواہ روح کے لیے، اس کے دل کا درد و غم بن جاتی ہے۔ وہ تمھاری بھلائی کی خواہش سے لبریز ہے۔ وہ اس کے لیے ایسا مضطرب قلب رکھتا ہے کہ اگر اس کی بن پڑتی تو ہدایت و سعادت کی ساری پاکیاں پہلے ہی دن گھونٹ بنا کر پلا دیتا۔ پھر اس کی یہ شفقت و محبت تمھارے ہی لیے نہیں وہ تو تمام مومنوں کے لیے خواہ عرب کے

---

[1] لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ۔ (۱۲۸ - ۱۲۹)

تمھارے پاس اللہ کا رسول آگیا ہے جو تم ہی میں سے ہے۔ تمھارا رنج و کلفت میں پڑنا اس پر بہت شاق گزرتا ہے۔ وہ تمھاری بھلائی کا بڑا ہی خواہشمند ہے۔ وہ مومنوں کے لیے شفقت اور رحمت رکھنے والا ہے۔ اگر اس پر بھی یہ لوگ سرتابی کریں تو ان سے کہہ دو "میرے لیے اللہ کا سہارا بس کرتا ہے کوئی معبود نہیں مگر اس کی ذات۔ میں نے اسی پر بھروسا کیا وہ تمام عالم ہستی کی جانداری کے عرش عظیم کا خداوند ہے۔

ہوں یا عجم کے "رَؤُوفٌ رَّحِیم" ہے۔

"رؤف" "رافت" سے ہے اور اس کا اطلاق ایسی رحمت پر ہوتا ہے جو کسی کی کمزوری اور مصیبت پر جوش میں آئے۔ پس رافت رحمت کی ایک خاص صورت ہے اور رحمت عام ہے۔ دونوں کے جمع کر دینے سے رحمت کا مفہوم زیادہ قوت و تاثیر کے ساتھ واضح ہوگیا۔

خدا نے یہ دونوں وصف جا بجا اپنے لیے فرمائے ہیں اور یہاں اپنے رسولؐ کے لیے بھی فرمائے۔

پیام موعظت کی ضرورت

اس کے بعد مجمع مخاطبین یہ سب کچھ دیکھ لینے اور تجربہ کر لینے کے بعد بھی اداے فرض سے اعراض کرے تو اے پیغمبر! تم آخری اعلان کر دو کہ میرے لیے اللہ بس کرتا تھا اور اب بھی بس کرتا ہے۔ وہ اپنے کلمۂ حق کا محافظ ہے اور اس کی مشیّت نے جو فیصلہ کر دیا ہے بہر حال ہو کر رہنے والا ہے۔ اس کا قیام و عروج کسی خاص ملک اور قوم کی پشت پناہی پر موقوف نہیں۔ میرا بھروسا اللہ ہی پر تھا، اسی پر ہے، میں اپنے فرض سے سبکدوش ہوگیا۔

یہ پیام موعظت یہاں کیوں ضروری ہوا؟ اس کے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ دو باتیں سامنے رکھ لی جائیں۔ سورت (یعنی سورۂ توبہ) کے نزول کا وقت اور سورت کے مطالب۔ یہ سورت اس وقت نازل ہوئی جب تمام عرب میں کلمۂ حق سربلند ہو چکا تھا اور گو قرآن کی عالمگیر فیروزمندیوں کی خبر دے دی تھی، تاہم ان لوگوں کے لیے جو کل تک غربت و بیکسی کی انتہائی مصیبتوں میں رہ چکے تھے۔ تمام عرب کا مسلمان ہو جانا بڑی سے بڑی کامرانی تھی اور اس لیے ناگزیر تھا کہ ایک طرح کی فارغ البالی اور بے پروائی طبیعتوں میں پیدا ہو جائے۔ غزوۂ تبوک کی تیاریوں میں بعض سے جو تساہل ہوا، اس کی تہ میں بھی اس حالت کی جھلک صاف دکھائی دے رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس صورت میں اس تفصیل اور شدّت کے ساتھ استعداد کار اور عزم و ہمت کی تلقین کی گئی ہے کہ اس کی نظیر کسی دوسری صورت میں نہیں ملتی۔

تاریخ انسانیت کے نوادر

کوئی شخص کتنے ہی مخالفانہ ارادے سے مطالعہ کرے، لیکن تاریخ اسلام کے چند واقعات اس درجہ واضح اور قطعی ہیں کہ ممکن نہیں ان سے انکار کیا جا سکے۔ از اں جملہ یہ کہ جو جماعتیں پیغمبر اسلام صلعم کی مخالف تھیں، ان کے تمام کام اوّل سے آخر تک ظلم و تشدد، دغا و فریب اور وحشت و تشدّد پر مبنی رہے اور پیغمبر اسلام صلعم اور ان کے ساتھیوں نے جو کچھ کیا اس کا ایک ایک فعل، صبر و تحمل، راستی و دیانت اور عفو و بخشش کا اعلیٰ سے اعلیٰ نمونہ تھا:

۱۔ مظلومی میں صبر،

۲۔ مقابلے میں عزم،

۳۔ معاملے میں راستبازی،

۴۔ طاقت و اختیار میں درگزر۔

تاریخ انسانیت کے وہ نوادر ہیں، جو کسی ایک زندگی کے اندر اس طرح کبھی جمع نہیں ہوئے (جس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کے اندر جمع ہوئے اور پورا عہد مبارکہ نبوت ان نوادر کی درخشانیوں سے جگمگا رہا ہے۔ گویا سیرۃ طیبہ کا نچوڑ یہی ہے جو حقیقت میں انسانیت عالیہ وعظمیٰ کا سدرۃ المنتہیٰ ہے)

"نذیر" و "بشیر"

انسان کی ایک عالمگیر گمراہی یہ رہی ہے کہ جب کوئی انسان روحانی عظمت کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے تو چاہتے ہیں کہ اسے انسانیت و بندگی کی سطح سے بلند کر کے دیکھیں، لیکن قرآن نے پیغمبر اسلام صلعم کی حیثیت صاف اور قطعی لفظوں میں واضح کر دی کہ ہمیشہ کے لیے اس گمراہی کا ازالہ ہوگیا۔ صرف یہی ایک بات ان کی صداقت کے اثبات کے لیے کفایت کرتی ہے۔

جو دنیا پیشواؤں کو خدا اور خدا کا بیٹا بنانے کی خواہشمند تھی، اسلام کے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس سے اتنا بھی نہ چاہا کہ کاہنوں کی طرح مجھے غیب دان تسلیم کر لو۔ زیادہ سے زیادہ اپنی نسبت جو بات سنائی، یہ تھی کہ میں انکار و بدعملی کے نتائج سے خبر کر دینے والا ("نذیر") اور ایمان و نیک عملی کی برکتوں کی بشارت دینے والا ("بشیر") ایک بندہ ہوں، اگر غیب داں ہوتا تو زندگی کا کوئی گزند مجھے نہ پہنچتا۔

کیا ایسے انسان کی زبان سے سچائی کے سوا کوئی بات نکل سکتی ہے؛

چہ عظمت دادہ ای یارب بخلق آں عظیم الشاں
کہ "انی عبدہٗ" گوید بجائے قول "سبحانی"

سورۃ فاتحہ کی تعلیمی روح

سورۃ فاتحہ "ام القرآن" ہے "الکافیہ" ہے "اساس القرآن" ہے "السبع المثانی" ہے۔ قرآن کی تمام سورتوں میں دین حق کے جو مقاصد بہ تفصیل بیان کیے گئے ہیں۔ سورۂ فاتحہ میں انھی کا بہ شکل اجمال بیان موجود ہے۔ اس کا پیرایہ دعائیہ ہے اور اسے روزانہ عبادت (نماز پنجگانہ) کا ایک لازمی جزو قرار دیا گیا ہے۔ ذرا اس کی تعلیمی رُوح کا اندازہ فرمایئے:

۱۔ وہ خدا کی حمد و ثنا میں زمزمہ سنج ہے، لیکن اس خدا کی حمد میں نہیں جو نسلوں، قوموں اور مذہبوں کی گروہ بندیوں کا خدا ہے بلکہ "رب العلمین" کی حمد میں جو کائنات خلقت کا پروردگار ہے اور تمام نوع انسانی کے لیے یکساں طور پر پروردگاری و رحمت رکھتا ہے۔

۲۔ پھر وہ اسے (خدا کو) اس کی صفتوں کے ساتھ پکارنا چاہتا ہے لیکن اس کی تمام صفتوں میں سے صرف "رحمت" و

"عدالت" ہی کی صفتیں اسے (حمد وثنا کرنے والے کو) یاد آتی ہیں۔ گویا خدا کی ہستی کی نمود اس کے لیے سرتا سر رحمت و عدالت کی نمود ہے۔

۳۔ وہ اپنا سرِ نیاز جھکاتا اور اس کی عبودیت کا اقرار کرتا ہے۔ کہتا ہے صرف تیری ہی ایک ذات ہے جس کے آگے بندگی و نیاز کا سر جھک سکتا ہے اور صرف تو ہی ہے جو ہماری ساری درماندگیوں اور احتیاجوں میں مددگاری کا سہارا ہے وہ اپنی عبادت اور استعانت دونوں کو صرف ایک ہی ذات کے ساتھ وابستہ کر دیتا ہے۔ دُنیا کی ساری قوتوں اور ہر طرح انسانی فرمانروائیوں سے بے پروا ہو جاتا ہے۔

۴۔ پھر وہ خدا سے سیدھی راہ چلنے کی توفیق طلب کرتا ہے۔ یہی ایک مدعا ہے جس سے زبان احتیاج آشنا ہوتی ہے لیکن کون سی سیدھی راہ ؟ کسی خاص نسل، خاص قوم یا خاص مذہبی حلقے کی سیدھی راہ ؟ نہیں وہ راہ جو دنیا کے تمام مذہبی رہنماؤں اور تمام راستباز انسانوں کی متفقہ راہ ہے۔

۵۔ اسی طرح وہ محرومی اور گمراہی کی راہوں سے پناہ مانگتا ہے۔ یہاں بھی ان راہوں سے بچنا چاہتا ہے جو دنیا کے تمام محروم اور گمراہ انسانوں کی راہیں رہ چکی ہیں۔

۶۔ گویا جس بات کا طلبگار ہے وہ بھی نوعِ انسانی کی عالمگیر اچھائی ہے اور جس بات سے پناہ مانگتا ہے، وُہ بھی نوعِ انسانی کی عالمگیر برائی ہے۔ نسل، قوم، ملک یا مذہبی گروہ بندی کے تفرقہ و امتیاز کی کوئی پرچھائیں اس کے دل و دماغ پر نظر نہیں آتی۔

۷۔ غور کرو مذہبی تصور کی یہ نوعیت انسان کے ذہن و عواطف کے لیے کس طرح کا سانچا مہیا کرتی ہے ! جس انسان کا دل و دماغ ایسے سانچے میں ڈھل کر نکلے گا وہ کس قسم کا انسان ہوگا ! کم از کم دو باتوں سے تم انکار نہیں کر سکتے:

اوّل اس کی خدا پرستی خدا کی عالمگیر رحمت و جمال کے تصور کی خدا پرستی ہوگی۔

دُوسری یہ کہ کسی معنی میں بھی وہ نسل، قوم یا گروہ بندیوں کا انسان نہ ہوگا۔ عالمگیر انسانیت کا انسان ہوگا۔ دعوت قرآنی کی اصل رُوح یہی ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلّق کی بُنیادیں

ڈاکٹر اسرار احمد

ربیع الاوّل کے مہینہ میں چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ باسعادت ہوئی تھی، لہٰذا اس مہینہ میں خاص طور پر سیرت کی مجالس اور جلسے منعقد ہوتے ہیں جن میں عموماً حضورؐ کی سیرتِ مطہرہ پر تقاریر ہوتی ہیں، حضورؐ کی خدمت میں سلام پڑھے جاتے ہیں اور نذرانۂ عقیدت کے طور پر نعتیں بھی پیش کی جاتی ہیں۔ اظہارِ محبت وعقیدت کے یہ طور طریقے اختیار کر کے ہم مسلمانوں کو عام طور پر یہ مغالطہ لاحق ہو جاتا ہے اور ہم یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ ہم نے بحیثیت اُمتی اپنی ذمہ داری پُوری کر دی اور حضورؐ کے جو حقوق ہم پر عائد ہوتے ہیں وہ ہم نے ادا کر دیے۔ یہ جھُوٹا اطمینان عام طور پر ہمیں اس طرف متوجہ نہیں کرتا کہ ہم یہ بات معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ از روئے قرآن حکیم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی حقیقی اساسات اور صحیح بنیادیں کیا ہیں؟ حالانکہ سیرت کی مجالس کا اصل حاصل یہ ہونا چاہیے کہ ہم یہ سوچیں اور طے کریں کہ نبی اکرمؐ سے ہمارے تعلق کی صحیح نوعیت کیا ہے؟ ہم سے خدا کے ہاں آنحضورؐ کے بارے میں کس بات کا محاسبہ ہوگا؟ کس چیز کی پُوچھ گچھ ہوگی؟ پھر اس علم کی روشنی میں حضورؐ کے ساتھ اپنے تعلق کو صحیح بنیادوں پر استوار اور قائم کریں۔ جہاں جہاں کمی اور جس جس پہلو سے کوتاہی نظر آئے اس کو پُورا کرنے اور دُور کرنے کی کوشش کریں۔ اگر اس کا ارادہ لے کر ہم کسی سیرت کی مجلس میں شریک ہوں اور ایسا کوئی عزم لے کر اُس مجلس سے اُٹھیں تو یقیناً وہ فائدہ کی بات ہے، نفع بخش کام ہے، آخرت میں کام آنے والا عمل ہے۔

آج کی صحبت میں اسی موضوع پر قدرے تفصیل سے میں آپ سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہُوں کہ از رُوئے قرآن مجید نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی صحیح بنیادیں کیا ہیں؟ اس بات ہی کے سلسلے میں سورۂ اعراف کی ۱۵۷ویں آیت کا ایک جزو تلاوت کرتا ہُوں۔ یہ پُوری آیت نہیں بلکہ آیت کا آخری جزو ہے۔ فرمایا کہ:

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

ترجمہ یہ ہے کہ "پس جو لوگ ایمان لاتے ان (نبی اکرمؐ) پر اور جنھوں نے اُنؐ (نبی اکرم) کی تعظیم و توقیر کی، اور جذبۂ احترام کے ساتھ جنھوں نے ان (نبی اکرمؐ) کی مدد اور حمایت کی، اُنؐ کے کام اور انؐ کے مشن میں انؐ کے دست و بازو بنے، اور انؐ کے مقاصد کی تکمیل میں اپنی قوتوں اور صلاحیتوں اور توانائیوں کو کھپایا، اور جنھوں نے اُس نور اور روشنی کا اتباع کیا، پیروی کی جو اُن کے ساتھ نازل

کی گئی ہے۔ تو یہی ہیں وُہ لوگ جو خدا کے ہاں فلاح پانے والے، کامیاب ہونے والے اور کامران و شادکام ہونے والے قرار پائیں گے۔"

جس آیت کریمہ کے آخری جزو کو میں نے پیش کیا ہے، وہ پُوری آیت اگر سامنے ہو تو معلوم ہوگا کہ اس میں اصل تخاطب اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ سے ہے اور ان کو مخاطب کرکے فرمایا گیا ہے کہ:

"یہی وہ الرسول النبی الاُمّی ہیں جن کے بارے میں پیشین گوئیاں تمہاری کتابوں تورات اور انجیل میں موجود ہیں، جن کی خوش خبریاں انبیاء سابقین دیتے چلے آرہے ہیں، ہمارے یہ رسولؐ تمہارے پاس آگئے ہیں، یہ تم کو نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائیوں سے تم کو روکتے ہیں اور تم نے شریعت کے نام سے اپنے اوپر جو بوجھ لاد رکھے ہیں اور بیڑیاں پہن رکھی ہیں، ان سے تم کو نجات دلا رہے ہیں۔ تمہارے لیے پاکیزہ چیزوں کو حلال اور ناپاک چیزوں کو حرام فرما رہے ہیں"

اس کے بعد اس آیت میں وہ الفاظ آئے ہیں جن کی میں نے ابھی تلاوت کی کہ:

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

برادرانِ دین! آیت کریمہ کے اس حصہ پر غور کرنے سے بہ ادنیٰ تامل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق کی جو چار بنیادیں ہمارے سامنے آتی ہیں، وُہ یہ ہیں:

—— پہلی یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا جائے، اُنؐ کی تصدیق کی جائے۔

—— دُوسری یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توقیر و تعظیم کی جائے۔

—— تیسری یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت و حمایت کی جائے۔ اور

—— چوتھی یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جو نورِ ہدایت یعنی قرآن مجید نازل ہوا ہے اُس کا اتباع اور پیروی کی جائے اور اپنی زندگی کے ہر عمل کے لیے اس روشنی کے مینار سے ہدایت و رہنمائی حاصل کی جائے۔

اب میں چاہوں گا کہ ان چاروں بنیادوں کے متعلق علیحدہ علیحدہ کچھ وضاحتیں آپ کے سامنے پیش کروں۔ یہ وضاحتیں کافی تفصیل چاہتی ہیں لیکن میں وقت کی کمی کے باعث کوشش کروں گا کہ اختصار کے ساتھ وہ باتیں بیان کروں جو آپ کے لیے غور و فکر کی راہیں کھول سکیں۔

ایمان

اس آیت کے حوالہ سے جو سب سے پہلی بات ذہن نشین کرنی ضروری ہے وُہ یہ ہے کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی اوّلین اور بنیادی نوعیت یہ ہے کہ ہم انؐ پر ایمان لاتے ہیں اور انؐ کی تصدیق کرتے ہیں نیز

اُنؐ کو اللہ کا نبیؐ، اللہ کا رسولؐ، اللہ کا فرستادہ اور اللہ کا پیغامبر تسلیم کرتے ہیں۔ اِس اقرار و یقین کا نام ہے "ایمان"۔ یہاں سے ہمارے اور حضورؐ کے مابین ایک تعلق اور ایک رشتہ کا آغاز ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم میں سے بہت سوں کا آں حضورؐ سے کوئی نسلی تعلق نہ ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے یہاں سادات اور ہاشمی بھی موجود ہوں، لیکن عظیم اکثریت یقیناً اُن لوگوں کی ہوگی جن کا کوئی نسل اور خون کا تعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں ہے، بایں ہمہ ایک تعلق ہے، سب سے اہم، سب سے مضبوط تعلق ہے اور وہ تعلق ہے ایمان کا، اس یقین کا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم اللہ کے رسول، نبی، پیغمبر ہیں جو پوری نوعِ انسانی کے لیے ہادی بنا کر مبعوث کیے گئے اور جو بنی نوع آدم کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجے گئے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا ط

حضرات گرامی! مجھے یقین ہے کہ آپ کو معلوم ہوگا کہ اس ایمان کے دو درجے ہیں۔ آپ میں سے اکثر حضرات کو ایمان مجمل کے الفاظ یاد ہوں گے[1] اس میں دو اصطلاحیں آئی ہیں، ایک اقرار باللسان اور دوسری تصدیقٌ بالقلب۔ زبان سے اس امر کا اقرار کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم اللہ کے رسول ہیں، اور دل سے اسی بات کی تصدیق اور اسی پر یقینِ کامل رکھنا۔ انہیں آپ ایمان کے دو درجے کہہ لیجئے، دو مراتب کہہ لیجئے، دو پہلو کہہ لیجئے، جب یہ دونوں باہم دگر ایک وحدت بنیں گے، تب ہی درحقیقت ایمان مکمل ہوگا۔ اگر صرف زبان سے اقرار ہے اور دل سے یقین نہیں تو یہ ایمان نہیں بلکہ اسے نفاق کہا جائے گا۔ مدینہ طیبہ کے منافقین زبان سے حضورؐ پر ایمان لانے کا اقرار کرتے تھے، بلکہ نمازیں پڑھتے تھے، روزے رکھتے تھے، زکوٰۃ ادا کرتے تھے، لیکن دل نورِ یقین سے خالی تھے۔ دل والا ایمان ان کو حاصل نہ تھا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا ٹھکانا جہنم قرار پایا اور جہنم کا بھی سب سے نچلا حصہ۔ اسی طرح کوئی شخص دل میں تو حضورؐ کی رسالت کا یقین رکھتا ہو، لیکن زبان سے اقرار نہ کر رہا ہو تو شریعت کے قاعدہ کی رُو سے وہ شخص کافر قرار پائے گا۔ زبان سے اقرار لازم ہے دنیا میں وہی شخص مسلم قرار پائے گا جو زبان سے اقرار کرے اور کلمۂ شہادت ادا کرے کہ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ط اور آخرت میں وہی شخص مومن قرار پائے گا جو اقرار باللسان کے ساتھ تصدیق بالقلب کی دولت سے بھی مالا مال ہو، جو دل والے یقین کے ساتھ یہ ایمان رکھتا ہو کہ بے شک محمدؐ بن عبداللہ بن عبدالمطلب اللہ کے آخری نبی اور رسول ہیں، اور اُنؐ پہ اللہ کا آخری کلام، اللہ کی آخری کتاب نازل ہوئی ہے جو ابدالآباد تک محفوظ رہے گی۔ غرضیکہ اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب لازم و ملزوم ہیں اور ایمان کی تکمیل ان دونوں کے ارتباط و اشتراک سے ہوگی۔

توقیر و تعظیم

اب یہ بات خود بخود منطقی طور پر سمجھ آجائے گی کہ جب ایمان یقین قلبی کے درجہ تک پہنچتا ہے تو اس سے چند

---

[1] اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ كَمَا هُوَ بِاَسْمَآئِهٖ وَصِفَاتِهٖ وَقَبِلْتُ جَمِيْعَ اَحْكَامِهٖ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَ تَصْدِيْقٌ بِالْقَلْبِ۔

لازمی مقتضیات عائد ہوتے ہیں جن کے نتیجہ میں چند مضمرات اُبھرتے اور کچھ لازمی اثرات پیدا ہونے چاہئیں۔ اس ایمان کا پہلا لازمی نتیجہ تو وہ ہے جو اسی آیت میں ایمان کے ذکر کے بعد آیا ہے فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ "پس وہ لوگ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور جنھوں نے ان کی توقیر و تعظیم کی" گویا ایمان کا پہلا تقاضا توقیر و تعظیم ہے۔ جب حضورؐ کے بارے میں یہ یقین حاصل ہوگیا کہ آپؐ ہمارے خالق، ہمارے مالک، ہمارے آقا اور ہمارے پروردگار کے فرستادہ ہیں، اس کے پیغامبر ہیں، اس کے رسول ہیں، ہماری ہدایت و رہنمائی کے لیے مبعوث ہوئے ہیں۔ اور حضورؐ نے جو کچھ پیش فرمایا ہے، جو تعلیم دی ہے، جو احکام دیے ہیں، جو خبریں دی ہیں، جو اوامر و نواہی بتائے ہیں، حلال و حرام کی جو قیود عائد فرمائی ہیں ان میں سے کوئی بات بھی اُنھوں نے اپنے جی سے پیش نہیں کی ہے بلکہ اللہ کی طرف سے پیش فرمائی ہے، جیسا کہ سورہ النجم میں فرمایا کہ:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰى ۝

"اور یہ رسول اپنی خواہشِ نفس سے نہیں بولتے ان کا ارشاد صرف وحی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے۔"

پس معلوم ہوا کہ ایمان کا پہلا فطری اور لازمی نتیجہ حضورؐ کی توقیر، تعظیم، احترام اور ادب ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں سورۂ حجرات میں اس احترام، ادب، توقیر اور تعظیم کی شرح بیان ہوئی ہے جو مسلمانوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے اور جو مطلوب ہے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ؕ

"اے ایمان والو! مت بلند کرو اپنی آوازوں کو نبیؐ کی آواز پر اور نہ اُن سے گفتگو میں اپنی آواز کو اس طرح نمایاں کرو جس طرح تم باہم ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہوئے بلند آوازی اختیار کرتے ہو مبادا تمہارے سارے اعمال حبط اور برباد ہو جائیں، ساری نیکیاں اکارت ہو جائیں، اب تک کے کیے کرائے پر پانی پھر جائے اور تمہیں شعور اور احساس تک نہ ہو۔"

شعور و احساس جب ہوتا ہے، جب انسان یہ سمجھے کہ وہ حضورؐ کی کسی نافرمانی کا مرتکب ہو رہا ہے۔ غور کیجیے کہ یہاں نافرمانی اور معصیتِ رسولؐ کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوا بلکہ مجرد سوءِ ادب کی وجہ سے سارے اعمال کے حبط ہونے کی وعید سنائی جا رہی ہے "لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ" حضورؐ کی نافرمانی، حکم عدولی، حضورؐ کی رائے کو پسِ پشت ڈال دینا، یہ تو بڑی دُور کی بات ہے۔ اس کے معصیت ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ یہ سوءِ ادب کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر اپنی آواز کو محض بلند کر دیا جائے تو اس پر کیسی دھمکی دی گئی ہے، کیسی زبردست تنبیہ کی گئی ہے کہ صرف اس سوءِ ادب اور بے احتیاطی کے سبب سے تمام کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا، سب اعمال اکارت، سب نیکیاں برباد ہو جائیں گی، اور تمہیں معلوم تک نہ ہو گا کہ تم نے اس بے احتیاطی سے کیا کچھ

کھو دیا۔ تم کیسے عظیم نقصان اور خسارہ سے دوچار ہوگئے۔ اس لیے کہ تم اس مغالطہ میں رہوگے کہ میں نے کوئی حکم عدولی تو نہیں کی کسی معصیتِ صریحہ کا ارتکاب تو مجھ سے نہیں ہوا۔ میں نے اختصار کے ساتھ حضورؐ کی عزت، توقیر اور تعظیم کی اہمیت ظاہر کرنے کے لیے سورۂ حجرات کی یہ آیت آپ کو سنائی جس سے اُمید ہے کہ یہ بات واضح طور پر آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ ایمان بالقلب کا پہلا لازمی نتیجہ ہے حضورؐ کا ادب، توقیر اور تعظیم۔ اب اسی ایمان کے دو مضمرات ہیں جو میں دو مشہور احادیث کے حوالہ سے آپ کے سامنے لانا چاہتا ہوں۔ ان میں سے ایک ہے اطاعتِ رسولؐ اور دُوسرا ہے محبّتِ رسولؐ۔

اطاعت

آں حضور صلی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں:

"لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ ھَوَاہُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِہٖ۔"

"تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک اُس کی خواہشِ نفس اس (ہدایت) کے تابع نہ ہوجائے جو مَیں لایا ہوں۔"

اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ وہ احکام، وہ اوامر و نواہی، وہ شریعت، وہ قوانین و تعزیرات، وہ حدود و قیود اور خدا کے وہ فیصلے جو بذریعہ کتاب (قرآن مجید) اور بذریعۂ سنّت (احادیث) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمائے ہیں۔ جب تک ان کے لیے کامل اطاعت کا جذبہ اور سرِتسلیم خم کرنے کی کیفیت قلب میں پیدا نہیں ہوتی اور عمل کی تحریک بیدار نہیں ہوتی، اور نفس کی خواہشات کو کچل دینے کا ولولہ نہیں ابھرتا، تب تک ایمان کا تقاضا پُورا نہیں ہوتا۔ پس معلوم ہوا کہ اس ایمان بالقلب کی شرطِ لازم ہے، اطاعت اور سرِتسلیم خم کرنا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں اللہ کی اطاعت کا حکم ملے گا وہاں اللہ کے رسول کی اطاعت کا بھی ساتھ ساتھ ہی حکم موجود ہوگا۔ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ۔ جب محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کو خدا کا رسول، اس کا نمایندہ، اس کا فرستادہ مان لیا ہے اور تسلیم کرلیا ہے تو اب تمہارے لیے سوائے اس کے کوئی چارہ کار ہی نہیں ہے کہ اُنؐ کا ہر حکم تم کو ماننا پڑے گا۔ ہر حکم کے آگے سرِتسلیم خم کرنا لازم ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنّت ہے کہ وہ جو رسول بھی بھیجتا ہے' اِس مقصد کے لیے اور اس حکم کے ساتھ بھیجتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ جیسا کہ سورۃ النساء میں فرمایا:

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ

"اور ہم نے تمام رسولوں کو خاص اسی واسطے مبعوث فرمایا ہے کہ بحکمِ خداوندی ان کی اطاعت کی جائے۔"

اسی سورۂ مبارکہ میں آگے فرمایا:

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ۔

"جس شخص نے رسول کی اطاعت کی اُس نے خُدا کی اطاعت کی۔"

ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے پاس اپنا حکم دینے کے لیے خود نہیں آتا۔ اُس نے اپنے حکم کو پہنچانے کے لیے نبی اور رسول کو وسیلہ، ذریعہ اور واسطہ بنایا ہے، لہٰذا اب خدا کی اطاعت کا ذریعہ بھی رسول کی اطاعت ہے۔ اسی بات کو حضورؐ نے اس طرح فرمایا کہ:

"جس نے میری اطاعت کی اُس نے خدا کی اطاعت کی، اور جس نے میری نافرمانی کی اُس نے خدا کی نافرمانی کی۔" (حدیث)

نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت کے لزوم کے لیے سورۂ نساء کی ایک آیت کا حوالہ مزید دوں گا۔ فرمایا:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝

"پس نہیں، تیرے رب کی قسم! یہ لوگ ہرگز مومن نہیں ہیں جب تک اپنے نزاعات میں تم ہی کو حکم نہ مانیں اور جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس کیے بغیر اس کے آگے سرِ تسلیم خم نہ کردیں، دل کی پُوری آمادگی اور خوشی کے ساتھ اس فیصلہ کو قبول نہ کرلیں۔"

یہ آیت مبارکہ حضورؐ کے واجب الاطاعت ہونے کے لیے نصِّ قطعی ہے۔ رسول محض مان لینے کے لیے نہیں بھیجا جاتا بلکہ وہ اس لیے مبعوث کیا جاتا ہے کہ اس کی کامل اطاعت کی جائے، اس کے تمام فیصلے تسلیم کیے جائیں۔ اس کے جملہ احکام کی تعمیل کی جائے، اس کی سنّت کی پیروی کی جائے، اس کے نقشِ قدم کو رہنما بنایا جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف مرکزِ عقیدت سمجھ لینا ہرگز کافی نہیں بلکہ آپ کو مرکزِ اطاعت تسلیم کرنا ایمان اور توقیر و تعظیم کا لازمی عملی نتیجہ نکلتا ہے۔ اس اطاعتِ کُلّی کے بغیر ایمان کا اقرار ایک زبانی دعویٰ تو قرار پائے گا، لیکن حقیقی ایمان کے اعتبار سے خُدا کے ہاں معتبر نہیں ہوگا۔ جیسا کہ اس حدیث شریف میں حضورؐ نے واضح طور پر فرمادیا جو میں نے اس پہلو پر گفتگو کے آغاز میں آپ کو سنائی تھی کہ:

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ۔

"تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک اس کی خواہشِ نفس اس ہدایت کی تابع نہ ہوجائے جو میں لے کر آیا ہوں۔"

محبّت

اسی ایمان اور توقیر کا دُوسرا لازمی نتیجہ محبت ہے۔ صرف مارے باندھے کی اطاعت، مجبوری کی اطاعت، زبردستی کی اطاعت کسی جابر حکمران اور جابر اقتدار کی بھی کی جاسکتی ہے بلکہ کی جاتی ہے، لیکن جب یہ اطاعت رسولؐ کے لیے مطلوب ہو تو وہ مارے باندھے کی اطاعت، مجبوری اور زبردستی کی اطاعت مطلوب نہیں ہوتی بلکہ

وہ اطاعت مطلوب ہوتی ہے جو دل کی انتہائی گہری محبت کے ساتھ ہو، دل کی پُوری آمادگی کے ساتھ ہو، پورے انبساطِ قلب اور شرحِ صدر کے ساتھ ہو۔ یہ مطلوبہ محبت لوازمِ ایمان میں سے ہے۔ میں نے اس موضوع پر گفتگو کے آغاز میں عرض کیا تھا کہ اطاعت اور محبت کے مضمرات کے بیان کے لیے میں دو مشہور احادیث کے حوالے آپ کے سامنے رکھوں گا۔ اطاعت والی حدیث آپ سُن چکے ہیں، اب محبت والی حدیث پیش کرتا ہُوں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّلَدِہٖ وَوَالِدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ۔

"تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا، جب تک میں اُسے محبوب ترنہ ہوجاؤں، اُس کے اپنے بیٹے سے، اس کے اپنے باپ سے، اور تمام انسانوں سے۔"

یعنی اگر ایک مومن کے دل میں حضورؐ کی محبت اپنے تمام اعزہ و اقارب اور تمام انسانوں سے بڑھ کر جاگزیں نہیں ہوتی ہے تو وہ شخص حقیقتاً مومن نہیں۔ ان الفاظ میں کوئی ابہام نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ بات واضح نہ ہو، بلکہ صاف صاف اور دو ٹوک انداز میں ارشاد ہوا کہ لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّلَدِہٖ وَوَالِدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ۔ اگر رسول کی محبت ان تمام محبتوں پر غالب نہیں آتی تو درحقیقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جس معنی پر ایمان مطلوب ہے وہ ایمانِ حقیقی ابھی حاصل نہیں ہوا جو خدا کے ہاں معتبر ہے اور جس کی بنیاد پر اس کی عدالت سے جزا و سزا کے فیصلے صادر ہوں گے۔ اسی موقع پر دل چاہتا ہے کہ وہ واقعہ بھی سُنا دوں جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آیا تھا، ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے سوال کیا "عمر! تمھیں مجھ سے کتنی محبت ہے؟" ذرا اندازہ لگائیے کہ اس طرح کی بھی گفتگو ہوتی تھی، کتنی اپنائیت کا احساس اس گفتگو سے اُبھرتا ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ حضورِ اقدسؐ اور عمر فاروقؓ کے مابین کس قدر قربِ قلبی اور ذہنی موجود تھا، حضورؐ حضرت عمرؓ سے دریافت فرماتے ہیں کہ "عمرؓ! تمھیں مجھ سے کتنی محبت ہے؟"

یہ انداز خود بتا رہا ہے کہ یہ سوال اُسی ہستی سے کیا جاسکتا ہے جس کی محبت اور شیفتگی مسلّم ہو۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ :

"حضورؐ! آپ مجھے دُنیا کے ہر انسان اور ہر شے سے زیادہ محبوب ہیں۔"

حضورؐ نے پھر دریافت فرمایا کہ :

"اور خود اپنی جان سے؟"

اس پر حضرت عمرؓ نے کچھ توقف کیا اور پھر عرض کیا : "الاٰن۔ ہاں حضورؐ! اب میں یہ بھی کہتا ہُوں کہ آپ مجھے میری جان سے بھی زیادہ محبوب اور عزیز ہیں۔"

سوچ سمجھ کر جواب دیا، اپنا جائزہ لے کر کہا، دل کے اندر جھانک کر کہا۔ ہمارے نعت گو حضرات کی طرح نہیں

کہ زبانی جمع خرچ کرنے پر ہی اکتفا ہو اور دعویٰ محبت میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے جائیں۔ اِلّا ما شاء اللہ۔
حضورؐ نے فرمایا کہ "ہاں اب تم مقامِ مطلوب تک پہنچے ہو، اگر میں تمہیں ہر چیز، ہر انسان یہاں تک کہ اپنی جان سے بھی محبوب تر ہو گیا ہوں تو اب وہ صحیح تعلق پیدا ہوا ہے جو اللہ کو مطلوب ہے۔"

حضراتِ گرامی! اب تک کی میری اس گفتگو کا خلاصہ یہ نکلا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے از روئے قرآن مجید ہمارے تعلق کی پہلی اساس اور بنیاد ہے "ایمان"۔ اقرارٌ باللسان بھی اور تصدیقٌ بالقلب بھی۔ دوسری بنیاد ہے "توقیر و تعظیم"۔ اور ان دو بنیادوں کے لوازم میں سے دو اہم لوازم ہمارے سامنے آئے: ایک اطاعتِ کُلّی اور دوسرے محبتِ قلبی۔ اب اگر موخر الذکر دونوں چیزوں کا اجتماع ہو جائے تو ایک نیا لازمہ بن جاتا ہے اور اس کے لیے قرآنِ کریم کی اصطلاح ہے اتباع۔

اتباع

قلبی یقین، دل کی حقیقی محبت اور طبیعت کی پوری آمادگی اور ایک گہرے قلبی لگاؤ کے ساتھ جب انسان کسی کی پیروی کرتا ہے تو وہ صرف اس حکم کی پیروی نہیں کرتا جو وہ اپنی زبان سے واضح الفاظ میں دے رہا ہو۔ بلکہ وہ اس کی ہر ادا کی پیروی کو اپنے لیے سعادت سمجھے گا، اس کے چشم و ابرو کے اشاروں کا منتظر رہے گا۔ وہ یہ دیکھے گا کہ میرے محبوب کو کیا پسند ہے اور کیا ناپسند۔ ان کی نشست و برخاست کا طریقہ کیا ہے، ان کی گفتگو کا انداز کیا ہے، وہ چلتے کس طرح ہیں، وہ لباس کون سا پہنتے ہیں، انھیں کھانے میں کیا چیز مرغوب ہے، چاہے ان کے بارے میں کبھی کوئی حکم نہ دیا گیا ہو، لیکن جس کے دل میں حقیقی محبت جاگزیں ہو جائے گی، جو والہ و شیفتہ ہو جائے گا اس کے لیے وہ احکام جو الفاظ میں دیے گئے ہوں، زبان سے ارشاد فرمائے گئے ہوں، یا وہ کام جن کو کرنے کی ترغیب و تشویق دلائی گئی ہو، وہ تو بہت دُور کی بات ہے وہ تو ہیں ہی واجب التعمیل۔ اس کے لیے تو چشم و ابرو کا اشارہ بھی حکمِ قطعی کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کی ہر ہر ادا کی نقالی، اس کے ہر ہر قدم کی پیروی وہ اپنے اوپر لازم کر لیتا ہے۔ گویا: ؎

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

اس طرزِ عمل کا نام ہے "اتباع" جس کی بڑی تابناک مثالیں ہمیں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگیوں میں نظر آتی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے بہت سے واقعات سیر کی کتب میں مرقوم ہیں۔ وہؓ ایک سفر میں حضورؐ کے ساتھ تھے، اتفاق سے حضورؐ کا گزر ایک خاص درخت کے نیچے سے ہوا ہے، لیکن حضرت ابن عمرؓ نے ہمیشہ کے لیے لازم کر لیا کہ جب کبھی اُس راستہ سے گزرنا ہُوا تو وہ اس درخت کے نیچے سے ہو کر نکلے ہیں۔ اسی طرح حجۃ الوداع کے سفر میں حضورؐ نے دورانِ سفر جہاں جہاں پڑاؤ کیا، جہاں جہاں استراحت فرمائی، حوائجِ ضروریہ سے

فراغت پائی ۔ حضرت ابنِ عمرؓ نے سفرِ حج میں وہاں وہاں پڑاؤ، استراحت اور رفعِ حاجت کا التزام کیا اگرچہ کوئی حکم نہیں ۔شریعت کے لحاظ سے یہ عمل سنّت میں شامل نہیں، بلکہ خالص عقلیت پسند (RATIONALIST) لوگ تو شاید اس کو جنون کہیں، ممکن ہے کہ وہ اس کو خواہ مخواہ کا (FANATICISM) کہیں۔ لیکن یہ معاملہ محبت کا معاملہ ہے، عشق کا معاملہ ہے جس میں محبوب کے ہر نقشِ قدم کی پیروی دستورِ محبت میں شمار ہوتی ہے ۔ اگر کوئی فنا فی حُبّ ِرسولؐ ہو جائے تو اس کا طرزِ عمل اور رویّہ بھی ہونا چاہیے ۔ یہ دل کا معاملہ ہے اور اس کی قدردانی بھی وہی ہستی فرمائے گی جس کے حکم کے مطابق یہ اتباع لازم کیا جارہا ہو۔ اسی طرح سیرِ صحابہؓ میں ایک صحابیؓ کا ذکر ملتا ہے، وہ کہیں دُور دراز علاقہ سے آئے ہیں، حضورؐ کے ہاتھ پر مشرف بالاسلام ہوتے ہیں۔ حضورؐ کو ایک ہی موقع پر دیکھا ہے اور اتفاق سے اس وقت حضورؐ کا گریبان کھلا تھا۔ ان صحابیؓ نے پھر ساری عمر اپنے گریبان کے بٹن نہیں لگائے، اس لیے کہ اُنھوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی حال میں دیکھا تھا، حالانکہ کوئی حکم نہیں، شریعت کا کوئی امر نہیں، کوئی فرض نہیں، واجب نہیں۔ کسی ادنٰی درجہ میں بھی حضورؐ کا اشارہ موجود نہیں، لیکن یہ محبت کے لوازم میں سے ہے کہ محبوب کی ہر ہر چیز کی پابندی، ہر ہر نقشِ قدم کی پیروی اور ہر ہر ادا کی نقّالی اپنے اُوپر لازم کرلی جائے، اس طرزِ عمل کا قرآن مجید کی اصطلاح میں نام ہے "اتباع"۔

حضرات! اس اتباعِ رسول کا قرآن مجید میں جو مقام ہے اس کو بھی دیکھ لیجئے۔ سورۂ آل عمران کی ۳۱ ویں آیت میں صاف صاف کھول کر کہہ دیا گیا کہ:

> قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ ط وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ہ
>
> "اے نبی! آپ فرما دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میرا اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا، تمھاری خطاؤں کو ڈھانپ لے گا اور اللہ بہت معاف کرنے والا اور بہت رحم فرمانے والا ہے۔"

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کا لازمی تقاضا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہے۔ اس اتباع کا ایک نتیجہ تو یہ نکلے گا کہ ہم اللہ کی محبت میں پختہ تر اور مضبوط تر ہوتے چلے جائیں گے۔ اور دوسرا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہم اللہ کے محبوب اور اس کی مغفرت و رحمت کے سزاوار قرار پائیں گے۔ جن کو یہ مرتبہ مل جائے کہ وہ اللہ کے محبوب قرار پائیں اُن کی خوش نصیبی اور خوش بختی کا کیا کہنا!

برادرانِ دین! میں چاہتا ہُوں کہ اس مقام تک کی گفتگو کا ایک خلاصہ آپ کے سامنے پھر پیش کردوں۔ اور آپ سے درخواست کروں کہ آپ اس بات کو الجبرا کی (EQUATION) کی طرح اچھی طرح ذہن نشین کرلیں۔ ایمان اور توقیر و تعظیم کے دو اور ناگزیر لوازم ہیں، ایک اطاعتِ کُلّی اور دوسرے محبت، جو ہر دوسری چیز کی محبت پر غالب ہو۔ اور

جب یہ دونوں جمع ہوں گی یعنی اطاعتِ کُلّی اور محبتِ قلبی، تو اس کا نام ہے "اتباع"۔ اور خدا کے ہاں اصلاً یہی مطلوب ہے۔ اس اتباع کا وہ مقام اور مرتبہ ہے کہ جس کا سورہ آلِ عمران کی ۳۱ ویں آیت میں ذکر کیا گیا جو ابھی میں نے آپ کو سنائی اور جس کا مفاد یہ ہے کہ "اگر تم خدا سے محبّت کرتے ہو تو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع اپنے اوپر لازم کر لو اللہ تم سے محبت کرے گا، تم اللہ کے چہیتے بن جاؤ گے۔"

حضرات! اس بات کو بھی اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ان دونوں ناگزیر لوازم اور اساسات میں اگر ایک بھی غائب اور ساقط ہو تو اس ادھورے طرزِ عمل سے آخرت میں نجات کی توقع ایک امیدِ موہوم سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ ایمان کا دعویٰ ہے۔ مارے باندھے کی اطاعت بھی ہو رہی ہے، لیکن محبّت نہیں ہے، دل کی آمادگی نہیں ہے، یُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا کی کیفیت نہیں ہے، دل میں تنگی ہے، اُپراہٹ ہے، تو اس طرزِ عمل میں منافقین کے ساتھ ایک مشابہت اور ایک مماثلت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایمان لانے کے وہ بھی مدعی تھے، اطاعت وہ بھی کرتے تھے، مجبوراً کرتے تھے، اس لیے کہ اس کے بغیر وہ مسلم معاشرہ کے فرد کی حیثیت اختیار کر ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ معاشرہ آج جیسا تو نہیں تھا کہ مسلمان کہلانے والے اطاعت تو درکنار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کا استہزاء کریں۔ جنت و دوزخ اور جزا و سزا کا مذاق اڑائیں، ملائکہ اور نزولِ وحی کے منکر ہوں، سنّتِ رسولؐ کے التزام سے انکار کریں۔ اسلام کے نظامِ زندگی کو ناقابلِ عمل اور اساطیر الاوّلین قرار دیں، لیکن پھر بھی مسلمان کہلائیں اور ان کا شمار مسلمانوں میں کیا جائے۔ اُس معاشرہ کا حال تو یہ تھا کہ جس کسی نے اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار کرانا تھا، خود کو مسلمان کہلانا تھا، اُس پر لازم تھا کہ اطاعت کرے، اطاعت سے سرتابی ممکن ہی نہیں تھی، نمازیں پڑھے، شعائرِ دین کا احترام کرے اور فرائضِ دین کی ادائیگی کا اہتمام کرے۔ لہٰذا منافقین یہ سارے عمل کرتے تھے بلکہ قسمیں کھا کھا کر اپنے صادق و مخلص ہونے کا حضورؐ کو یقین دلاتے تھے لیکن ان کو جو متاعِ عزیز حاصل نہیں تھی، وہ تھی یقینِ قلبی اور حقیقی و واقعی محبّت۔ چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے سورہ منافقون میں فیصلہ فرما دیا کہ:

إِذَا جَاءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ط وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝

"اے نبیؐ! جب منافق آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ بے شک اللہ کے رسول ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ درحقیقت آپ اللہ کے رسول ہیں (کیونکہ اُسی اللہ ہی نے تو آپ کو مبعوث فرمایا ہے) اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق بلاشُبہ اپنے قول میں جھوٹے ہیں۔"

یعنی اُن کی یہ بات تو اپنی جگہ سچّی اور صداقت پر مبنی ہے کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں، لیکن چونکہ یہ منافق لوگ دل سے آپ کی رسالت کے قائل نہیں، ان کے دلوں میں آپ کی حقیقی محبّت موجود نہیں، صرف زبان سے اقرار کرتے ہیں، ان کا باطن کچھ اور ہے اور ظاہر کچھ اور۔ اس لیے یہ جھوٹے ہیں اور ان کے قول کا کوئی اعتبار نہیں۔ پس ثابت ہوا کہ محبّت

اور یقین قلبی کے بغیر اگر اطاعت ہو رہی ہے تو اس میں منافقین کے ساتھ ایک مشابہت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اگر محبتِ رسولؐ کے دعوے ہیں، لیکن اطاعت نہیں۔ فرائض کی ادائیگی نہیں، اوامر و نواہی کی پروا نہیں۔ احکام کا سرے سے کوئی لحاظ نہیں۔ تو یہ طرزِ عمل سراسر معصیت ہے، فسق ہے، فجور ہے۔ یہ دعویٰ محبت خدا کے ہاں سرے سے قبول ہی نہیں ہوگا۔ اس دنیا میں ایسا دعویٰ قبول نہیں ہو سکتا، مہمل قرار پاتا ہے کہ ایک طرف محبت کا دعویٰ ہو اور دوسری طرف اطاعت اور رضا جوئی کا سرے سے کوئی اہتمام نہ ہو۔ والد کی محبت کا دعویٰ ہو، لیکن ان کا کہنا نہ مانا جا رہا ہو بلکہ ہر عمل اور ہر فعل والد کی مرضی کے خلاف انجام دیا جا رہا ہو، تو معقول بات یہ ہے کہ بیٹے کے اس دعویٰ محبت کو دنیا میں کہیں تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ عشقِ رسولؐ اور محبتِ رسول کے بلند بانگ دعاوی اور بڑی وجد آفریں نعتیں اور بڑے لمبے چوڑے سلام اور بڑے ہی عمدہ اور شاندار طریقہ سے نکالے ہوئے جلوس اور بڑے ہی اہتمام کے ساتھ منعقد کی ہوئی میلاد کی محفلیں اور مجالس سیرت اگر جذبۂ اطاعت سے خالی ہیں، پیرویِ سنّت کے جذبہ سے عاری ہیں تو سراپا ڈھونگ ہے، فریبِ نفس ہے۔ اُن کا کوئی وزن نہیں، اُن کی کوئی حقیقت نہیں۔ خدا کے ہاں ان کی پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں، بلکہ یہ سب قابلِ مواخذہ ہیں۔ دو چیزیں' اطاعت اور محبت دونوں یکساں مطلوب۔ دونوں جمع ہو گئیں تو اتباع۔ اطاعت ہے، محبت نہیں تو مشابہت منافقین کے ساتھ۔ محبت کا دعویٰ ہے، لیکن اطاعت نہیں ہے تو دعویٰ ناقابلِ قبول، مسترد اور خارج۔ خدا کے ہاں اس کی کوئی قدر اور وقعت نہیں اور میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں۔ پس حضرات! فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ کے حوالے سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کی دو بنیادیں واضح ہوئیں۔ اب تیسری بنیاد کو لیجئے جو وَنَصَرُوْهُ کی اصطلاح میں بیان ہوئی یعنی "جن لوگوں نے حضورؐ کی مدد اور حمایت کی۔"

نُصرتِ رسُولؐ

برادرانِ دین! اس موضوع پر آگے بڑھنے سے پہلے یہ بات طے کیجیے کہ رسول کی نصرت و حمایت اور رسول کی مدد کس کام میں اور کس مقصد کے لیے مطلوب ہے۔ رسالت و نبوت ایک فریضہ منصبی ہے جو خدا کی طرف سے رسولؐ نبی کو تفویض کیا جاتا ہے۔ بھٹکے ہوؤں کو سیدھی راہ سوجھانا، نیند کے ماتوں کو جگانا، شرک کی اندھیاریوں میں سے انسان کو نکال کر توحید کی روشن صراطِ مستقیم پر لا کھڑا کرنا، اعمالِ صالح اور مکارمِ اخلاق کا انسان کو خوگر بنانا، انسان پر سے انسان کی خدائی کو ختم کرنا، معاشرہ میں سے ہر قسم کے جور و استبداد اور استحصال کا خاتمہ کرنا، انسان کو یہ یقین دلانا کہ ایک دن وہ بھی آنے والا ہے کہ جس روز انسان کو اپنے مالک و آقا اور خالق کے سامنے محاسبہ کے لیے کھڑا ہونا ہوگا يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ؕ اور يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ؕ وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ۝ جس روز لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے اور جس روز کسی کا کوئی بھلا نہیں کر سکے گا، کوئی کسی کے کام نہیں آ سکے گا

اور جس دن تکوینی حاکمیت کے ساتھ تشریعی حکومت بھی اللہ اپنے ہاتھ میں لے لے گا۔

جس روز انسان کی اس دنیا کی کمائی اور سعی و جہد کا نتیجہ اُس کے سامنے ہوگا بُرے اعمال اور طغیانی و سرکشی کی پاداش میں جہنم اس کے سامنے پیش ہوگی اور جس نے اللہ کے سامنے کھڑے ہوکر جواب دہی کے خوف کے پیش نظر اپنے نفس کے بے لگام گھوڑے کو قابو میں رکھا ہوگا تو جنت اس کا ٹھکانا ہوگا:

یَوْمَ یَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰی ۝ وَبُرِّزَتِ الْجَحِیْمُ لِمَنْ یَّرٰی ۝ فَاَمَّا مَنْ طَغٰی ۝ وَاٰثَرَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ۝ فَاِنَّ الْجَحِیْمَ هِیَ الْمَاْوٰی ۝ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰی ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰی ۝
(النّٰزِعٰت)

جس روز انسان اپنا سب کیا دھرایاد کرے گا اور ہر دیکھنے والے کے سامنے دوزخ کھول کر رکھ دی جائے گی، تو جس نے سرکشی کی تھی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تھی تو دوزخ ہی اس کا ٹھکانا ہوگا اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا تھا اور نفس کو بُری خواہشات سے باز رکھا تھا تو جنت اُس کا ٹھکانا ہوگی!

تبلیغ کا بارِگراں

تبلیغ کا یہ بارِگراں، دعوت کا یہ کٹھن کام، شرک کے اندھیروں کو دُور کرکے نورِ توحید پھیلانے کی یہ بھاری ذمہ داری، بدمستوں اور مدہوشوں کی اصلاح کا یہ مشکل کام، طاغوت سے پنجہ آزمائی اور باطل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حق کی سربلندی اور بول بالے کے جان جوکھوں کے یہ مراحل طے کرنا۔ یہ تھا وہ بارِگراں جو رسالت و نبوت سے سرفراز ہونے کے نتیجہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاندھوں پر آیا تھا۔ یہ تھے وہ فرائض منصبی جو آنحضورؐ کے سپرد ہونے تھے۔ چنانچہ ابتدا ہی میں حضورِ اکرمؐ کو خبر دے دی گئی تھی اور سورۂ مزمّل میں کہہ دیا گیا تھا کہ:

اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ۝

"ہم عنقریب تم پر ایک بھاری فرمان نازل کریں گے ایک بھاری بوجھ ڈالیں گے۔"

اور یہ بھاری فرمان اور بھاری بوجھ چند دنوں بعد ہی حضورؐ کے شانوں پر رکھ دیا گیا۔ چنانچہ سورۂ مدثّر میں حکم آگیا:

یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝

"اے کپڑا اوڑھ کر لیٹنے والے! کھڑے ہوجاؤ اور نیند کے ماتوں کو جھنجھوڑو، ان کو خبردار اور چوکنا کرو، ان کو ہوشیار کرو، ان کو غلط عقیدہ اور غلط اعمال کے انجامِ بد سے ڈراؤ، اور اپنے رب کی کبریائی کا اعلان کرو، نہ صرف اعلان کرو بلکہ اپنے رب کی کبریائی کا عملاً نفاذ کرو۔"

تکبیر کے معنی صرف اللہ اکبر کہہ دینا اور بڑائی بیان کر دینا ہی نہیں بلکہ فی الواقع وہ نظام قائم و برپا کر دینا ہے، جس میں تشریعی حیثیت سے بھی خدا ہی مقتدرِ اعلیٰ ہو وہی سپریم (SUPREME) تسلیم کیا جائے اُسی کا حکم حرفِ آخر ہو۔ اُسی کی مرضی تمام مرضیوں پر حاوی ہو جائے اور سیدنا حضرت مسیح علیہ السلام کے بقول جس طرح اس کی مرضی آسمانوں میں پوری ہوتی ہے اُسی طرح زمین پر بھی پوری ہو۔ اُسی کا جھنڈا تمام جھنڈوں سے بلند تر ہو جائے۔ تاکہ اُسی کی بات سب باتوں پر غالب ہو جائے اور بات تو اللہ ہی کی غالب و بلند ہے وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ط یہ ہے تکبیرِ رب کا اصل اور حقیقی مفہوم۔ اور یہ ہے وہ قولِ ثقیل، وہ بھاری بوجھ جس کی سورۂ مزمل میں خبر دی گئی تھی۔ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ○

برادرانِ دین! جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ تکبیر کے معنی صرف زبان سے اللہ کی بڑائی بیان کرنا نہیں بلکہ اس کے مفہوم میں اپنے رب کی کبریائی کا اعلان اور اس کا عملاً نفاذ بھی شامل ہے۔ کبریائی تو واقعتہً وہ کبریائی ہے جو عملاً نافذ ہو۔ محض کتابوں میں لکھی ہوئی کبریائی تو کوئی کبریائی نہیں۔ محض زبان سے کہہ دینے سے تو کسی کی بڑائی اور کبریائی قائم نہیں ہوتی بلکہ کبریائی اور بڑائی تو دراصل وہی ہے جس کو بالفعل بڑائی اور کبریائی مانا گیا ہو تسلیم کیا گیا ہو جس کے احکام جس کی ہدایات اور جس کے اوامر و نواہی کی تعمیل کی جا رہی ہو، جس کا آئین اور جس کا قانون عملاً نافذ ہو، جو حقیقی طور پر سپریم تسلیم کیا گیا ہو۔ یہ ہے وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ کا حقیقی مفہوم۔ مدنی دور میں اسی بات کو مزید کھول دیا گیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ خاتم المرسلین والنبیین ہیں لہٰذا دعوت و تبلیغ کے ساتھ ہی اظہارِ دینِ حق اور غلبۂ دینِ متین بھی آپؐ کے فرائضِ رسالت میں شامل ہے اور آپؐ کی بعثت کی غایتِ اُولیٰ ہے۔ چونکہ تا قیامِ قیامت کوئی اور رسول اور نبی آنے والا نہیں لہٰذا بنی نوعِ انسان پر اتمامِ حجت کے لیے جہاں اللہ نے اپنی آخری کتاب، مکمل ہدایت نامے قرآن مجید کی حفاظت کا خود ذمہ لیا[1] وہاں ضروری ہوا کہ دینِ حق بتمام و کمال قائم و نافذ بھی ہو تاکہ انسان کے لیے کوئی عذر پیش کرنے کا موقع باقی نہ رہے اور اتمامِ حجت ہو جائے۔ یہ مضمون مدنی دور کی تین سورتوں سورۂ توبہ، سورۂ فتح اور سورۂ صف میں وضاحت کے ساتھ کھول دیا گیا۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ

وہی اللہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ (رسول) اس ہدایت اور دینِ حق کو ہر جنس دین (یا کُل ادیان، نظام ہائے حیات) پر غالب کر دے۔"

یہ ہے وہ بھاری بوجھ جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کاندھوں پر رکھا گیا تھا اور صورتِ حال یہ تھی کہ آپ پورے عالمِ انسانی میں اس وقت اس دعوت کے علمبردار کی حیثیت سے بالکل تنہا اور اکیلے تھے۔ دنیا کے بتکدہ میں توحید کا غلغلہ بلند کرنا، تکبیرِ رب کا نعرہ لگانا، خدا کی کبریائی کو عملاً نافذ کرنے کی جدوجہد کرنا، اظہار و غلبۂ دین کے لیے کشمکش کرنا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا داعی بن کر کھڑا ہونا۔ اعمالِ صالح اور مکارمِ اخلاق کی دعوت کا عَلَم بلند کرنا۔ ظلم و جور، تعدّی و

---

[1] اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ○

ستم اور استبداد و استحصال کے خلاف سینہ سپر ہونا کوئی آسان کام تو نہیں تھا؛ چنانچہ اسی لیے اسے "قولِ ثقیل" بھاری بوجھ سے تعبیر کیا گیا۔ تکبیرِ رب کے لیے کھڑے ہونے کا مطلب تھا پورے معاشرہ سے جنگ۔ اور حضورؐ کو حکم تھا کہ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝

اور فرمایا گیا کہ:

وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ط وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ط

"اور چاہے مشرکوں کو اور کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔"

وہ لوگ جن کے مفادات پر ضرب پڑ رہی تھی، وہ کتنا ہی راستہ روکیں، مزاحمت کریں۔ وہ لوگ جن کی جھوٹی مذہبی قیادتیں خطرہ میں پڑ گئی ہوں، وہ چاہے کتنی مخالفتیں کریں، کتنی ہی صعوبتیں پہنچائیں۔ ظلم و تشدد کا کتنا ہی بھیانک مظاہرہ کریں، جور و تعدی کے کتنے ہی پہاڑ توڑیں۔ ان تمام مخالفتوں، مظالم اور استبداد کے علی الرغم، ان تمام موانع کے باوجود اور ان شدائد و مصائب کے باوصف نبیِ اکرمؐ، سرورِ عالم، محبوبِ خدا، رحمۃٌ للعالمین، خاتم المرسلین والنبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ منصبی میں شامل تھا کہ تکبیرِ رب کا جھنڈا بلند کریں۔ طاغوتی طاقتوں سے پنجہ آزمائی کریں۔ باطل کی قوتوں سے نبرد آزما ہوں۔ استہزاء اور طعن و تشنیع کے وار سہیں۔ حکم تھا اللہ کی کبریائی کے بالفعل نفاذ اور دینِ حق کے اظہار[1] کے لیے جد و جہد کرو، کشمکش کرو، اور ہر نوع کے استہزاء، طنز و تعریض اور شدائد و مصائب کو انگیز کرو۔ یہ بھاری بوجھ تھا اور یہ بھاری ذمہ داری تھی جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاندھوں پر رکھی گئی تھی۔

حضراتِ گرامی! اب آپ خود غور کیجئے، دو اور دو چار کی طرح اس حقیقت کا ادراک فرمالیجئے کہ جو شخص حضورؐ پر ایمان لائے اور اقرار و تصدیق کرے کہ محمد اللہ کے رسول ہیں، اس کے لیے لازم ہے کہ اب فریضۂ رسالت و نبوت کی ادائیگی میں، تکبیرِ خداوندی کی کٹھن مہم میں، اظہارِ دینِ حق کے جان جوکھوں کے کام میں، دعوت و تبلیغ کے راہِ خارزار میں، حق و باطل کے معرکۂ کارزار میں اور جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے میدانِ جنگ و جدال میں وہ حضورؐ کا دست و بازو بنے، سہارا بنے، رفیق و ناصر بنے، حامی کار و مددگار بنے، جہاں حضورؐ کا پسینہ گرے وہاں اپنا خون بہانے کو اپنے لیے باعثِ فخر و سعادت سمجھے۔ حضورؐ کے مشن کی تکمیل کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے اور اس بازی میں نقدِ جان کی نذر گزارنے میں فوز و فلاح اور کامیابی و کامرانی کا ایقان رکھے، اس کا جینا اور مرنا حضورؐ کی دعوت کی تبلیغ و اشاعت کے لیے ہو، اس کا مال، اس کی صلاحیتیں اور توانائیاں اس دینِ حق کے غلبے کے لیے وقف ہوں جو خالقِ کائنات اور رب العالمین کی طرف سے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا ہے۔ اگر حضورؐ پر ایمان لانے والوں کا نصب العین اور مقصدِ حیات اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ط نہ ہو تو اس کا ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت غیر معتبر ہے؛

---

[1] عربی میں اظہار کا مفہوم غلبہ و فوقیت ہے۔ (مرتب)

جھوٹ ہے، مغالطہ اور فریبِ نفس ہے۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی تیسری بنیاد نصرتِ رسول ہے۔ لفظِ نصرت سے مبادا آپ کو یہ خیال ہو کہ نبی اور رسول کو کسی انسان کی مدد کی کیا حاجت! نبی کا مقام اور اس کا مرتبہ تو یہ ہے کہ اللہ خود ان کا ولی، مولا اور ناصر ہے۔ نبی کی پشت پناہ ملائکہ اللہ ہیں وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ نبی کو تو رُوح القدس کی تائید حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا نبی کو اہلِ ایمان کی مدد و حمایت کی کیا ضرورت! پس اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اس عالمِ اسباب میں اور عالمِ تشریعی میں دینِ حق کے غلبہ کی جدوجہد انسانوں ہی کو کرنی ہے، جن کو خلیفۃ اللہ فی الارض کے شرف سے نوازا گیا ہے۔ الہدیٰ اور دینِ حق کے ساتھ اللہ اپنے رسولوں کو مبعوث فرماتا ہے۔ قبولِ حق کی استعداد فطرتِ انسانی میں پہلے سے ودیعت شدہ ہوتی ہے۔ پھر آفاق وانفس میں اللہ کی آیات نبی کی دعوت قبول کرنے میں مددگار ہوتی ہیں۔ نبی اور رسول کی صداقت کے ثبوت کے لیے انزالِ کتب ہوتا ہے، جس کی ایک ایک آیت فرقانِ مبین اور برہانِ قاطع ہوتی ہے۔ وہ اپنے رسولوں کو حسّی معجزات سے بھی نوازتا اور سرفراز فرماتا ہے، لیکن قبولِ حق اور انکار کا فیصلہ کرنے کے لیے وہ انسان کو آزاد چھوڑ دیتا ہے اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا اقامتِ دین، شہادتِ حق، دعوت و تبلیغ کی جدوجہد بہرحال انسانوں ہی کو کرنی ہوتی ہے اور نبی اس دعوت و تبلیغ کا داعیِ اوّل ہوتا ہے اور سب سے پہلے رسول ہی دنیا کے سامنے شاہد بن کر کھڑا ہوتا ہے۔ جیسا کہ سورۂ احزاب میں فرمایا گیا:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ	اے نبی! ہم نے تمھیں بھیجا ہے گواہ بنا کر
مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ۝ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ	بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر،
بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝	اللہ کی اجازت سے اس کی طرف دعوت
(احزاب)	دینے والا بنا کر اور روشن چراغ بنا کر۔

پھر جو لوگ نبی کی دعوت قبول کریں، ان پر ایمان لائیں، اللہ تعالیٰ عزّ وجل اس عالمِ اسباب میں ان کو جانچنا ہے، ان کا امتحان لینا ہے، اس عالمِ علت ومعلول اور عالمِ اسباب میں اگر دین پھیلے گا تو اللہ پر، رسول پر اور آخرت پر یقین رکھنے والے مومنین صادقین کی جانفشانیوں اور سرفروشیوں کے ایثار و قربانی اور جدوجہد سے پھیلے گا، دنیا میں تشریعی طور پر اللہ کی کبریائی اگر فی الواقع قائم ہوگی تو ان ہی کی کشمکش، محنت اور جدوجہد اور جہاد وقتال سے قائم ہوگی۔ وہ خاک وخون میں لوٹیں گے۔ راہِ حق میں نقدِ جان کا نذرانہ گزاریں گے تو اللہ کی تائید و نصرت سے اللہ کا دین غالب اور قائم ہوگا۔ یہی سنّتِ اللہ ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ۔ (الصف)

بنا کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اسی ابتلا اور کشمکش میں مومنین صادقین کی آزمایش ہے، امتحان ہے۔ اسی سے معلوم ہوگا کہ کون واقعتاً ایمان رکھتا ہے۔ جدّوجہد اور جہاد و قتال میں، حضور کے مشن کی تکمیل میں سر دھڑ کی بازی لگانے کے عمل کو اللہ نصرت سے تعبیر کرتا ہے اور یہ نصرتِ رسول ہی وہ کسوٹی ہے جس پر اس عالمِ رنگ و بُو میں سچے اور کھوٹے پرکھے جاتے ہیں۔ جیسا کہ سورۂ عنکبوت میں فرمایا:

وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ○

"یقیناً اللہ تعالیٰ کھول کر رکھ دے گا کہ کون حقیقتاً ایمان رکھتے ہیں اور کون جھوٹ موٹ کے مومن بنے پھرتے ہیں جو حقیقت نفس الامری کے لحاظ سے حقیقتاً منافق ہیں۔"

ایمان و نفاق کا اس دُنیا میں انھی آزمائشوں سے، ان ہی سرفروشیوں سے اور ان ہی جانفشانیوں سے فیصلہ ہوتا ہے رسولؐ کے جھنڈے کو اٹھایا یا نہیں اٹھایا۔ رسول کے مشن کو اپنی زندگی کا مشن بنایا یا نہیں بنایا۔ محمد رسول اللہ کے منصبِ رسالت کی تکمیل میں کھپے یا نہیں کھپے۔ دعوتِ الی اللہ کے مراحل میں صبر و استقامت دکھائی یا نہیں دکھائی۔ اگر یہ نہیں تو پھر کچھ بھی نہیں پھر تو رسول پر ایمان کا دعوٰی ناقابلِ قبول، رسول سے محبت کا دعوٰی بھی مسترد، رسول اللہ کی اطاعت کا دعوٰی بھی غیر معتبر اور محض ریا، محض دکھاوا، اس لیے کہ آپ خود سوچیے اور ذرا چشمِ تصوّر میں لائیے کہ محبوبِ خدا، سرورِ عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُحد کے میدان میں جان کی بازی لگا رہے ہیں، اس کشمکش میں رحمۃٌ للعالمین زخمی ہوگئے ہیں، خود کی کڑیاں سرِ مبارک میں گھس گئی ہیں، رُخسارِ مبارک بھی مجروح ہوگیا ہے، دندانِ مبارک بھی شہید ہو چکے ہیں، مقدس خون راہِ حق میں بہہ رہا ہے اور عین اُس وقت کوئی مدعیِ عشقِ رسولؐ مدینہ میں کہیں اپنے گھر میں بیٹھا درود کی تسبیحیں پڑھ رہا ہو، حضورؐ پر سلام پڑھ رہا ہو، حضورؐ کی شان میں نعتیں پڑھ رہا ہو، تو یہ کتنی مضحکہ خیز بات ہوگی۔ کوئی تعلق اور کوئی نسبت ہے اس طرزِ عمل کی، اس دعوئے ایمان بالرسول اور دعوئ محبتِ رسولؐ کے ساتھ۔ آپ درود کی تسبیح پر تسبیح پڑھے جا رہے ہوں سلام پہ سلام بھیجے جا رہے ہوں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کارزارِ اُحد میں، خاک و خُون کے میدان میں، اس وادیِ پُرخطر میں جہاں پہ ہر چہار طرف موت کا رقص ہو رہا ہو، اپنے جاں نثاروں کے ساتھ خونیں کشمکش اور جدوجہد فرما رہے ہوں، زندگی اور موت کا درس دے رہے ہوں۔ اللہ کے جھنڈے کو تھامنے کے لیے، اس کو سربلند کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا رہے ہوں اور کوئی عاشقِ رسول کہیں کسی گوشہ میں بیٹھا درود و سلام پڑھ رہا ہو۔ جتنی عجیب بات یہ اُس وقت ہوتی اُتنی ہی عجیب بات یہ آج بھی اور اس وقت بھی ہے۔ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ حضورؐ کا مشن مُردہ نہیں ہوا، زندہ ہے، تابندہ ہے اور تا قیامِ قیامت زندہ رہے گا۔ حضورؐ کی بعثتِ رسالت تا قیامِ قیامت ہے۔ بنی نوعِ انسان آج بھی ہدایتِ ربّانی کے محتاج ہیں۔ دنیا آج بھی طاغوتی شکنجے میں گرفتار ہے اور یہ فرض اُمّتِ مسلمہ کو بحیثیت اُمّت ادا کرنا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو بھی خود کو مسلمان سمجھتا ہے اس پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ بنی نوعِ انسان تک حق کا پیغام پہنچائے۔ حضورؐ کی بعثت صرف اہلِ عرب کے لیے نہ تھی بلکہ پُوری بنی نوعِ انسان کے لیے ہے۔ حضورؐ کی

بعثت ایک مخصوص زمانہ اور وقت کے لیے نہ تھی بلکہ قیامِ قیامت تک کے لیے ہے۔ توحید کی دعوت دینا، شرک کا ابطال کرنا اور اللہ کے دین کو عملاً غالب، قائم اور نافذ کرنا محمد رسول اللہ کا مقصدِ بعثت تھا، جیسا کہ فرمایا:

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق اس آیت کی کامل شان کا ظہور باقی ہے اس کا ظہور اس وقت تک نہ ہوگا جب تک اس پورے کرۂ ارضی پر اسی طرح خدا کے دین کا جھنڈا نہیں لہراتا اور ادیانِ باطل کے جھنڈے سرنگوں نہیں ہو جاتے۔ جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیئیس سال کی محنتِ شاقہ کے نتیجہ میں شدائد و مصائب، استہزاء و طنز و تعریض، شعبِ ابی طالب، سفرِ طائف، ہجرت، بدر و اُحد، احزاب و حنین اور تبوک کے مراحل سے گزر کر جزیرہ نمائے عرب میں لہرایا تھا اور طاغوتی نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا۔ خوب اچھی طرح سمجھ لیجیے جب تک یہ کام انجام تک نہ پہنچے نبی اکرمؐ کا مقصدِ رسالت و بعثت ابھی شرمندۂ تکمیل ہے اور اب کارِ رسالت کی انجام دہی کی ذمہ داری اُمتِ مسلمہ پر ہے ؎

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

پس اب اُس مدعیِ ایمان، اس عاشقِ رسول اور اس محبِ رسول کو خوب اچھی طرح اپنے دل میں جہاں تک کر اپنا جائزہ لینا چاہیے جسے حضورؐ کے اس مشن، اس مقصدِ بعثت سے سرے سے کوئی دلچسپی نہ ہو اور اُسے فیصلہ کرنا چاہیے کہ اس کے ان دعاوی میں کتنی صداقت ہے۔ آج عملاً یہ صورتِ حال رونما ہو چکی ہے کہ: ؎

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وُہ آج غریب الغربا ہے

یہی وُہ صورتِ حال ہے جس کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی تھی، صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

بَدَءَ الاسلامُ غریبًا وسیعود کما بدء فطوبیٰ للغرباء۔	اسلام کی ابتدا غربت کی حالت میں ہُوئی اور غربت کی یہ حالت پھر اسلام پر طاری ہوگی تو مبارکبادی ہے "غربا" کے لیے۔

غریب کے صرف اردو معنی مفلس و نادار کے نہ سمجھیے بلکہ اس کے مفہوم کو لغتِ حدیث سے معلوم کیجئے۔ جہاں اس کی تشریح اس طرح ملتی ہے کہ "اسلام غربت سے شروع ہُوا جیسے غریب مسافر اپنے اہل و عیال سے دُور اور اپنے وطن سے دُور رہ کر تنہائی میں زندگی بسر کرتا ہے، اسی طرح اسلام بھی ابتدا میں غریب اور تنہا تھا، کوئی غم خوار نہ تھا یعنی مسلمان بہت کم تھے۔ ایک زمانہ میں وہ پھر "غریب" ہو جائے گا۔ کفار، ملحدین اور مبتدعین کی کثرت ہوگی۔ نام کے

مسلمان کثیر التعداد ہوں گے۔ سچے، موحد، دیندار، متقی افراد کم سے کم ہوتے چلے جائیں گے۔ تو ان کم اور قلیل "غرباء" کے لیے طوبیٰ ہے، یعنی مبارکباد اور بہشت۔"

مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

اَلْغُرَبَآءُ الَّذِیْنَ یُحْیُوْنَ سُنَّتِیْ وَیُعَلِّمُوْنَہَا النَّاسَ۔ — غرباء وہ ہیں جو میری سنت کو زندہ کریں گے اور لوگوں کو اس کی تعلیم دیں گے۔

اور حضورؐ کی سب سے بڑی، سب سے اہم سنت سُنّتِ دعوت و تبلیغ ہے جس پر میں ان شاء اللہ آگے روشنی ڈالوں گا۔

ایک اور روایت میں حضورؐ نے خبر دی کہ:

لَا یَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اِسْمُہٗ وَلَا یَبْقٰی مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُہٗ۔ — اسلام میں سے اس کے نام کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا اور قرآن میں سے اس کے حروف کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا۔

اس حدیث کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ اسلام کہیں زمین پر فی الواقع قائم و نافذ نظر نہیں آئے گا۔ کردار اور شخصیتوں میں اسلام کو فی الواقع کارفرما اور موجود دیکھنے کے لیے نگاہیں ترسیں گی۔ قرآن محض ایک مقدس کتاب کی حیثیت سے ریشمیں جزدانوں میں لپیٹ کر رکھ دیا جائے گا۔ اس نورِ ہدایت سے رہنمائی کی طلب مفقود ہو جائے گی۔ تلاوت صرف رسماً اور وہ بھی زیادہ سے زیادہ حصولِ ثواب یا ایصالِ ثواب کے لیے باقی رہ جائے گی۔

برادرانِ دین! یہ صورتِ حال عملاً پیدا ہو چکی ہے جس کی خبر ان احادیث میں دی گئی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھنے کے لوازم میں سے ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنا جائزہ لے کر فیصلہ کرے کہ اگر حضورؐ سے محبت ہے، اگر حضورؐ سے کوئی مخلصانہ تعلق ہے، اگر حضورؐ کے ساتھ ہمارا رشتہ صحیح بنیادوں پر قائم ہے تو وہ ہی ہمارا مقصدِ زندگی، مقصودِ حیات اور نصب العین ہے یا نہیں کہ جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصدِ بعثت تھا، یعنی لِتَکُوْنَ کَلِمَۃُ اللّٰہِ ھِیَ الْعُلْیَا ط اور اظہارِ دینِ حق علی الدین کلّہٖ، تکبیرِ رب اور اللہ کے دین کو دنیا میں غالب کرنے کی سعی و جہد کرنے اور نورِ توحید سے پورے کرۂ ارضی کو منور کرنے کا عزم۔ اگر ہم میں سے کسی کے مقاصدِ زندگی میں شامل نہیں، اگر وہ حضورؐ کے مشن کی تکمیل میں حضورؐ کا دست و بازو نہیں بن رہا، حضورؐ کا ساتھی نہیں بن رہا تو اس کا حضورؐ سے تعلق درست نہیں جس کی اُسے فکر کرنی چاہیے۔ یہ ہے حضورؐ کے ساتھ ہمارے صحیح تعلق کی تیسری بنیاد جو وہ نَصَرُوْہُ کی تشریح میں ہمارے سامنے آتی ہے۔

اتباع کا اقتضا

اسی نصرتِ رسول کے مسئلہ کو میں "اتباعِ رسول" کے حوالہ سے مزید واضح کرنا چاہتا ہوں۔ اتباع کے

معنی ہیں حضورؐ کے نقشِ قدم کی پیروی، جو حضورؐ نے کیا وہ ہم کریں۔ یہ ہے اتباع، یہ ہے سنّت پر عمل۔ اب ذرا غور کیجئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ طیبہ میں جو عمل تواتر کے ساتھ ہوا ہے، پیہم و مسلسل ہوا ہے، جو پورے تیئیس برس ہوا ہے، شب و روز ہوا ہے، جس میں ایک لمحہ اور ایک گھڑی کا وقفہ نہیں، وہ عمل کیا ہے؟ نماز کے بارے میں آپ پُوچھ سکتے ہیں کہ کب فرض ہوئی؟ رکعتوں کا تعیّن کب ہوا؟ کب دو تھیں؟ کب چار بنیں؟ کب روزوں کی فرضیت ہوئی؟ زکوٰۃ کا نظام اور مقدارِ نصاب کب متعیّن ہوا؟ شراب و قمار کب حرام ہوئے؟ سود کی حرمت کب نازل ہوئی؟ ان سب کے لیے احادیث اور تاریخ و سیرت سے اوقات اور زمان متعین کیے جا سکیں گے۔ ان میں اختلاف بھی ہو سکتا ہے، لیکن ایک بات متفق علیہ ہے جس میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں، کسی قیل و قال کا موقع نہیں، اور وہ بات یہ ہے کہ

اوّل یومِ بعثت سے لے کر اس حیاتِ دنیوی کے آخری سانس تک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے جو عمل پیہم کیا ہے، مسلسل کیا ہے، متواتر کیا ہے، شب و رُوز کیا ہے، جلوت و خلوت میں کیا ہے وہ عملِ دعوت ہے۔ وہ عملِ تبلیغ ہے، وہ تکبیرِ رب کی سعی و جہد ہے، وہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جہاد ہے، وہ دینِ حق کے سربلند کرنے کی تگ و دَو ہے، وہ اظہار و اقامتِ دین کے لیے مجاہدہ، کشمکش اور تصادم ہے۔

اس سعی و جہد اور مجاہدہ کی شکلیں بدلی ہیں، صورتوں میں تبدیلی آئی ہے، بتدریج مختلف مراحل آئے ہیں، کہیں وہ مکّی دَور میں دعوت و تبلیغ اور شدائد و مصائب کے برداشت کرنے کے درجہ میں تھی۔

مکّہ کی اور طائف کی گلیوں کُوچوں میں پتھر کھانے اور استہزا کے تیر انگیز کرنے کے مرحلہ میں تھی۔ کہیں وہ مدنی دَور میں ایک مسلّح تصادم، بدر و اُحد اور خندق کے معرکوں کی صورت میں ہویدا تھی۔ کہیں قبائلِ عرب اور قُرب وجوار کے سلاطین کو وفود و خطوط کے ذریعہ دعوت دینے کے مراحل میں تھی، کہیں صُلح حدیبیہ اور فتح مکّہ نیز غزوۂ حنین کی صورت میں جاری و ساری تھی۔ لیکن جو عمل تیئیس سال کے عرصہ پر پھیلا ہوا ہے، ہر لمحہ، ہر گھڑی اور ہر آن انجام دیا جاتا رہا ہے، وہ ہے عملِ دعوت و تبلیغ۔ اب جو شخص بھی متبع رسول ہونے کا مدعی ہو، جو یہ سمجھتا ہو کہ سنّتِ رسول لازم ہے، اس کے بارے میں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کی زندگی میں سب سے بڑی، سب سے زیادہ متواتر، متفق علیہ اور ثابت شدہ سنّت کس حال میں ہے؟ دعوت و تبلیغ کی اس کے اندر کتنی تڑپ اور کتنی لگن ہے؟ کتنا رجحان ہے اور وہ اس کام میں کتنا وقت خرچ کر رہا ہے؟ کتنا مال لگا رہا ہے۔

متفقہ سنّتِ رسولؐ

میری اس گفتگو سے مجھے اُمید ہے کہ یہ بات آپ پر واضح ہوگئی ہوگی کہ وُہ سنّت جس کے بارے میں سرے سے کوئی اختلاف نہیں اور نہ اختلاف کی کوئی گنجائش ہے وہ سنت سنّتِ دعوت و تبلیغ ہے، وہ مجاہدہ فی سبیل اللہ ہے،

وہ تکبیر رب کی عملی جدوجہد ہے۔ وہ غلبۂ دین کی سعی و کوشش ہے۔ وہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے سرفروشی اور جاں نثاری ہے۔ اسی سُنت میں جان و مال کھپانا ہے، صلاحیتیں اور توانائیاں صرف کرنی ہیں۔ اسی کو مقصدِ حیات قرار دینا ہے۔ اگر یہ نہیں تو اطاعت، محبت اور اتباع کے تمام دعاوی غلط ثابت ہوں گے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہُوں اور اسی بات کا اعادہ کرتا ہُوں کہ حضورؐ کا مشن زندہ ہے، حضورؐ کا مقصدِ بعثت تابندہ ہے، لیکن اُسے شرمندۂ تکمیل کرنے کا مرحلہ ابھی باقی ہے۔ یہ مرحلہ طے کرنا، اس کے لیے جدوجہد کرنا، محنتیں کرنا، ہر اس شخص پر لازم ہے بلکہ فرض ہے جو حضورؐ کے ساتھ مخلصانہ تعلق رکھتا ہو۔ یہ کام ہم کو، آپ کو، سارے مسلمانوں کو کرنا ہوگا۔ اسی مقصد کو اپنا نصب العین اور مقصودِ اوّلین سمجھنا اور بنانا ہوگا۔ اسی کے لیے اپنی تمام صلاحیتوں، توانائیوں کو وقف کرنا ہوگا۔ اسی طرح وہ تقاضا پورا ہوگا جو وَنَصَرُوْہُ کے حوالے سے ہمارے سامنے آتا ہے۔

نُصرت کا قرآن میں مقام

اسی نُصرت کو قرآن مجید کے ایک اور حوالہ سے بھی سمجھ لیجیے۔ قرآن مجید میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کا ایک قول نقل ہوا ہے کہ آنحضرتؑ نے اپنے حواریوں سے دریافت فرمایا:

مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ۔

"خدا کی راہ میں میرا مددگار کون ہے؟"

تکبیرِ رب، دعوتِ توحید، ہدایت کی توسیع، نورِ خداوندی سے دُنیا کو منوّر کرنے کا کام میرے سپرد ہوا ہے۔ اس مشن کے لیے میں نے جدوجہد کرنی ہے۔ اب کون ہے جو اس راہ میں میرا مددگار بنے؟ کون ہے جو میرا دست و بازو بنے؟ حواریین کے جواب کو قرآن مجید یُوں نقل فرماتا ہے:

قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ۔

"حواریوں نے کہا ہم ہیں اللہ کے انصار اللہ کے مددگار"

جواب میں نصرت کی نسبت بدل گئی۔ حضرت مسیحؑ نے دریافت کیا تھا مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ۔ جواب میں کہلوایا گیا نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ۔ اس نسبت کی تبدیلی میں حکمت ہے۔ رسول کی نُصرت خدا ہی کی نصرت ہے۔ اس کو یُوں سمجھیے کہ غلبۂ دین جو مقصودِ حقیقی ہے، اس کو غالب کرنے کی کوشش کرنا رسول کا بحیثیت رسول فرضِ منصبی ہے۔ اب اس فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں جو شخص رسول کا حامی، مددگار اور دست و بازو بنتا ہے، اپنے آپ کو کھپاتا ہے، جانفشانی اور سرفروشی کا مظاہرہ کرتا ہے، وہ اللہ کے رسول کی نصرت بھی کر رہا ہے اور خدا کی نصرت میں بھی لگا ہوا ہے۔ پس اللہ کے دین کے غلبہ کی جدوجہد کو اللہ اپنی اور اپنے رسول دونوں کی نصرت سے تعبیر فرماتا ہے۔ یہاں وَنَصَرُوْہُ کا بیان ختم ہُوا۔ اب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم سے ہمارے تعلق کی چوتھی صحیح بنیاد کا ذکر شروع ہوتا ہے اور وہ ہے نورِ قرآن مجید کو

حرزِ جان بنانا، رہنما قرار دینا اور اس نُور کا اتباع کرنا۔

اتباعِ قرآن مجید

فرمایا:

وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَہٗٓ۔

"اور اتباع کیا اس نُور کا جو اُن (نبی اکرمؐ) کے ساتھ یا اُن پر نازل کیا گیا"۔

یہ نورِ قرآن یہ نورِ کتاب، یہ نورِ ہدایت جو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہُوا، اس کا اتّباع لازم ہے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جو تین اصطلاحات پہلے بیان ہو چکیں۔ یعنی اٰمَنُوْا بِہٖ وَعَزَّرُوْہُ وَنَصَرُوْہُ۔ تو وہ انتہائی جامع تھیں۔ اب اس کا مزید اضافہ کس مقصد کے لیے کیا جا رہا ہے کہ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَہٗٓ۔ یہ اس لیے ضروری تھا کہ نبی اکرمؐ بہرحال اس دنیا سے تشریف لے جانے والے تھے۔ ایک مدّتِ معیّنہ ہی تھی جس میں صحابہ کرام رضؓ کو حضورؐ کے وجودِ قدسی کی معیت اور صحبت حاصل رہنی تھی،

> آنحضورؐ کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ابد الآباد تک کے لیے جس چیز کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین اور قائم مقام بننا ہے وہ ہے قرآن مجید، فرقانِ حمید، کتابِ مبین، نورِ خداوندی، اللہ کا کلام۔ یہ وہ نُور ہے جو دائم و قائم ہے اور جو محمد رسول اللہ کے ساتھ اُترا۔

چنانچہ حجۃ الوداع کے خطبہ میں حضورؐ نے جو آخری بات فرمائی ہے وہ اسی قرآن مجید کے متعلق ہے۔ مسلم شریف کی روایت میں خطبہ حجۃ الوداع کے اختتامی اور آخری الفاظ یہ ہیں:

وَقَدْ تَرَکْتُ فِیْکُمْ مَا اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِہٖ فَلَنْ تَضِلُّوْا اَبَدًا۔ کِتَابُ اللّٰہِ۔

اور میں تمہارے درمیان وہ چیز چھوڑے جا رہا ہوں جس کا سررشتہ اگر تم مضبوطی سے تھامے رکھو گے تو تم تا ابد (کبھی) گمراہ نہیں ہو گے، وہ چیز ہے کتابُ اللہ۔

اس سے قبل کہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے اس ارشادِ گرامی کے بارے میں کچھ عرض کروں، میں چاہتا ہوں کہ آپ اس ارشادِ گرامی کا موقع اور محل اچھی طرح سمجھ لیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی حجۃ الوداع کے موقع پر حضورِ اکرمؐ نے یہ محسوس فرما لیا تھا کہ آپ کشمکشِ حیات کی آخری منزلیں طے فرما رہے ہیں۔ اس احساس کا اظہار پُورے خطبہ میں موجود ہے، بلکہ خطبہ کا آغاز ہی آپؐ نے ان الفاظ سے فرمایا:

اَیُّھَا النَّاسُ اِسْمَعُوْا قَوْلِیْ فَاِنِّیْ لَا — لوگو! میری بات غور سے سُنو، کیونکہ شاید اس

أَدْرِيْ لَعَلِّيْ لَا أَلْقَاكُمْ بَعْدَ عَامِيْ هٰذَا بِهٰذَا الْمَوْقِفِ أَبَدًا۔ سال کے بعد اس مقام پر میں تم سے پھر نہ مل سکوں۔

چنانچہ اس خطبہ میں حضورؐ کے ارشادات کا انداز وصیّت کا سا ہے یعنی ان امور کی تاکید جن کی دین و شریعت میں اساسی حیثیت ہے۔ اسی خطبہ میں حضورؐ نے آخر میں تاکید فرمائی کہ میرے بعد قرآن کو تھامنا، اسے حرزِ جان بنانا، اس سے چمٹنا، میں تم کو بے یار و مددگار چھوڑ کر نہیں جا رہا۔ میں تمہاری ہدایت اور تمہاری رہنمائی کے لیے اپنے پیچھے اللہ کی کتاب چھوڑے جا رہا ہوں، جو تمھیں کفر و شرک کے اندھیروں سے نکال کر توحید کی صراطِ مستقیم کی طرف لے جائے گا۔ اگر تم اس قرآن کو مضبوطی سے تھامے رہو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔

حَبْلُ اللّٰہِ

یہی اللہ کی کتاب ہے جس کو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حَبْلُ اللّٰہ قرار دیا۔ قرآن مجید میں سورۂ حج کے آخر میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ:

وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ۔

"خدا کے ساتھ چمٹ جاؤ، خدا کے دامن سے وابستہ ہو جاؤ۔"

سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ خدا سے کیسے چمٹیں، خدا کے دامن سے کیسے وابستہ ہوں؟ سورۂ آل عمران میں اس کو مزید کھولا گیا:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ۔

"اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھامو۔ اللہ کی رسّی کے ساتھ چمٹ جاؤ۔"

پھر ایک اشکال رہ گیا کہ حبل اللہ سے کیا مراد ہے، کیسے تھامیں؟ کس سے جُڑیں؟ اس کی شرح و توضیح نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں اور وحی غیر متلو کے ذریعہ خبر دے رہے ہیں کہ اللہ کی یہ کتاب قرآن مجید ہی درحقیقت اللہ کی وہ مضبوط رسّی ہے جس سے اعتصام کا، چمٹ جانے کا، جُڑ جانے کا اور جس کو تھام لینے کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کے متعلق حضورؐ نے فرمایا:

هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ۔

یہ ایک بڑی مفصل اور مشہور حدیث کا ایک جزو ہے جس کے راوی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں اور جس میں قرآن مجید کی عظمت و شوکت، اُس کے مرتبہ و مقام اور اُس کی اہمیت کا بیان ہُوا ہے، اسی طویل حدیث میں حضورؐ کا یہ ارشاد بھی مذکور ہے کہ:

"قرآن مجید وہ کتاب ہے جس سے علماء کبھی سیری محسوس نہیں کریں گے، یعنی اس کتاب پر کبھی

باسی پن طاری نہیں ہوگا۔ نہ کثرت اور تکرارِ تلاوت سے اس کے لطف میں کوئی کمی آئے گی اور نہ ہی اس کے عجائبات ختم ہوں گے۔"

یعنی نئے نئے علوم و معارف کا خزانہ کبھی ختم نہ ہو سکے گا۔ وَلَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ وَلَا يَخْلَقُ عَنْ كَثْرَةِ الرَّدِّ وَلَا تَنْقَضِي عَجَائِبُهُ۔

اسی حدیث میں قرآن مجید کے متعلق حضورؐ فرماتے ہیں کہ: هُوَ حَبْلُ اللهِ الْمَتِيْنُ۔

اور اسی کو اللہ تعالیٰ اس طرح بیان فرما رہا ہے: وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْ أُنْزِلَ مَعَهُ۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں فرمایا تھا کہ قرآن کو مضبوطی سے تھامو گے تو تا ابد گمراہ نہیں ہو گے۔ جیسا کہ میں ابھی آپ کو خطبہ کا آخری حصہ مسلم شریف کے حوالہ سے سُنا چکا ہوں۔ بدقسمتی سے اسی حبل اللہ سے ہم اپنا تعلق توڑتے چلے گئے۔ جب مضبوطی سے حبل اللہ کو تھامنے کا نتیجہ گمراہی سے حفاظت تھی تو لازماً اس کو چھوڑنے کا نتیجہ گمراہی ہونا چاہیے۔ اپنی تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھیے۔ آپ کو واضح طور پر نظر آئے گا کہ جب تک مسلمانوں نے قرآن کو مضبوطی سے تھامے رکھا، اسی کو اپنا ہادی و رہنما حقیقی معنوں میں سمجھا، اُسی پر اپنے سارے عمل، اخلاق اور معاملات کا انحصار رکھا تو انفرادی اور اجتماعی طور پر ان کا رعب اور دبدبہ قائم رہا، دُنیا میں وہ سربلند اور غالب رہے، اور اسلام کا جھنڈا چہار دانگِ عالم میں لہراتا رہا، لیکن جیسے جیسے وہ کتاب اللہ سے بے پروا ہوتے چلے گئے اور نور و حکمت کے اس خزینہ سے بے نیاز ہوتے چلے گئے ویسے ویسے ان پر زوال آتا چلا گیا۔ وہ فساد اور انحطاط میں مبتلا ہوتے چلے گئے، مغلوب و مقہور ہو گئے۔ اُن کے عقائد خراب ہوئے، اعمال بگڑے اور ان میں بدعات اور ہوائے نفس کو قبضہ جمانے کا موقعہ مل گیا۔ ان کا اتحاد پارا پارا ہوا اور وہ بنیانِ مرصوص کے بجائے فرقوں میں، گروہوں میں، قومی و نسلی اور لسانی و جغرافیائی تفریقوں میں تقسیم ہو گئے۔ قرآن سے ہمارا جو حقیقی تعلق ہونا چاہیے، وہ ترک ہو چکا۔ اب ہمارا اس سے تعلق اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہم اسے حصولِ برکت کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں، ہم میں سے گنتی کے چند لوگ اس کی تلاوت بھی کرتے ہیں تو سمجھنے اور اخذِ ہدایت کے لیے نہیں بلکہ حصولِ ثواب کے لیے بلکہ میں تو کہا کرتا ہوں کہ اب تو حصولِ ثواب کا معاملہ بھی ختم ہوا۔ اب تو صرف ایصالِ ثواب کی مجالس کے لیے قرآن خوانی رہ گئی ہے۔ اپنے لیے بھی اب ہم قرآن کے ثواب کی کوئی خاص حاجت محسوس نہیں کرتے۔ اب تو قرآن مجید گویا صرف مُردوں کو ایصالِ ثواب کا ذریعہ بن کر رہ گیا ہے۔ بقول علامہ اقبال: ؎

با یاتش ترا کارے جز ایں نیست
کہ از یٰسین اُو آساں بمیری

سورۂ فرقان میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک استغاثہ نقل فرمایا ہے:

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ۝	اور کہا رسول نے اے میرے رب! میری قوم نے اس قرآن کو پسِ پشت ڈال دیا تھا، نظرانداز کر دیا تھا۔

علامہ اقبال مرحوم نے اس مفہوم کو یوں ادا کیا ہے :

خوار از مہجوریِ قرآں شدی　　شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی
اے چو شبنم بر زمیں اُفتندۂ　　در بغل داری کتابِ زندۂ

اگرچہ اس آیت کے سیاق و سباق کے لحاظ سے اس میں اصلاً تذکرہ ان کفار کا ہے جن کے نزدیک قرآن مجید سرے سے کوئی قابلِ التفات چیز ہی نہیں تھی اور جو قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ کا کلام اور وحیِ ربانی تسلیم ہی نہیں کرتے تھے؛ تاہم قرآن کے وہ ماننے والے بھی اس کے ذیل میں آتے ہیں جو عملاً قرآن کے ساتھ عدمِ توجہ و التفات کی روش اختیار کریں اور اسے اپنی زندگی کا لائحہ عمل نہ بنائیں۔ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْ اُنْزِلَ مَعَہٗ اس حصہ میں "اتباع" کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں پیروی کرنا، ہر حکم، ہر ہدایت، ہر امر اور ہر نہی کی تعمیل کرنا۔ ہمارا قرآن کے ساتھ یہ تعلق ہوگا تو ہم گمراہی سے محفوظ رہ سکیں گے۔ جیسا کہ حضور نے حجۃ الوداع میں فرمایا: اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِہٖ فَلَنْ تَضِلُّوْا اَبَدًا۔

حضرات! کتاب اللہ کو مضبوطی سے تھامنا۔ اس کو اپنی زندگی کے ہر معاملہ میں ہادی، حکم اور رہنما قرار دینا، اس کی تعلیمات پر عمل کرنا، اس کی صبح و شام تلاوت کرنا، اس میں تدبر اور غور و فکر کرنا، اس کو حرزِ جان بنانا، اس کا اتباع کرنا۔ یہ ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے از روئے قرآن مجید ہمارے صحیح تعلق کی چوتھی بنیاد۔ اگر ہم اس کتاب سے جڑے تو محمدؐ سے جڑ گئے، اور اس سے کٹے تو محمدؐ سے کٹ گئے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

قرآن مجید کی اہمیت کے بارے میں ایک حدیث شریف مزید سناتا ہوں جو حضرت عبیدہ مُلیکی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور جس کے مطابق آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

یٰاَھْلَ الْقُرْاٰنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْاٰنَ وَاتْلُوْہُ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ مِنْ اٰنَاءِ اللَّیْلِ وَالنَّھَارِ وَاَفْشُوْہُ وَتَغَنَّوْہُ وَتَرَتَّلُوْہُ وَتَدَبَّرُوْا فِیْہِ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ۔	اے قرآن والو! قرآن کو بس اپنا تکیہ ہی نہ بناؤ بلکہ دن اور رات کے اوقات میں اس کی تلاوت کیا کرو، جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے اور اس کو (چہار دانگِ عالم میں) پھیلاؤ اور اس کو خوش الحانی سے حظ لیتے ہوئے پڑھا کرو اور اس میں تدبر، غور و فکر کیا کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

اس حدیث مبارک میں مسلمانوں کو حضورؐ نے خطاب دیا ہے "یٰاَھْلَ الْقُرْاٰن"۔ یہ خطاب ہم وزن ہے اس خطاب کے جو قرآن یہود و نصاریٰ کو دیتا ہے "یٰاَھْلَ الْکِتَاب"۔ الکتاب کا آخری، مکمل اور جامع ایڈیشن ہے "القرآن" جس کی حامل اُمتِ مسلمہ ہے۔ اس لیے حضورؐ نے ہمیں خطاب دیا "یٰاَھْلَ الْقُرْاٰن"۔ سبحان اللہ کتنا پیارا خطاب ہے جو اس امت کو ملا۔ میں اس سے قبل بھی کسی تقریر میں عرض کر چکا ہوں اور اب پھر اعادہ کرتا ہوں کہ ہماری بہت سی غلطیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جن لوگوں نے غاصبانہ طور پر اپنے لیے یہ نام "اَھْلُ الْقُرْاٰن" اختیار کیا۔ ہم

نے بھی ان کو اسی نام سے پکارنا شروع کر دیا۔ حالانکہ یہ نام انھوں نے اپنے انکارِ حدیث پر پردہ ڈالنے کے لیے اختیار کیا تھا۔ اُن کا اصل نام ہونا چاہیے تھا " منکرینِ سنّت " " منکرینِ حدیث "۔ ہماری یہ بڑی نادانی ہے کہ ہم نے ان کے اس قبضۂ غاصبانہ کو تسلیم کر لیا اور ان کو یہ نام الاٹ کر دیا، حالانکہ اہلِ قرآن وہ نہیں، ہم ہیں۔

اس حدیث کے ایک ایک لفظ پر غور کیجیے۔ کتنے جامع ہیں یہ الفاظ، جن میں مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق کا کمال اختصار کے ساتھ احاطہ کر لیا گیا ہے۔ فرمایا:

"یَاَھْلَ الْقُرْاٰنِ لَا تَتَوَسَّدُ وا الْقُرْاٰنَ۔"

"اے اہلِ قرآن! اس قرآن کو تکیہ نہ بنا لینا"۔

تکیہ کمر کے پیچھے رہتا ہے لہٰذا ایک مطلب تو یہ ہُوا کہ اس قرآن کو پسِ پشت نہ ڈال دینا۔ دُوسرا مفہوم یہ ہے کہ اس قرآن کو محض ایک سہارا نہ بنا لینا کہ بس اپنے ذہن میں اس کتاب کی تقدیس کا ایک گوشہ کھول رکھا ہے۔ اچھے سے اچھے جُزدان میں اونچے طاق پر رکھ چھوڑا ہے اور سمجھ لیا ہے کہ اس کی موجودگی باعثِ برکت ہے۔ نیز اس سے عملی تعلق بس اتنا باقی رہ گیا ہے کہ کہیں قسم کھانے کی ضرورت پڑی، چاہے وہ جھُوٹی قسم ہو تو اس کتاب اللہ کی آڑ میں کھائی جائے گی۔ جھُوٹی شہادتوں کے لیے اس کی آڑ لی جائے گی۔ میں نے اشارتاً ایک لفظ کی کچھ شرح کی ہے۔ آپ اس حدیث کے ایک ایک لفظ پر خود غور کیجئے گا معارف کا ایک سمندر ہے جو ہر لفظ میں آپ کو موجزن نظر آئے گا۔

حضرات! اللہ کے اس نور کا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے ہم کو ملا تھا (اُنْزِلَ مَعَهٗ) ہم نے اتباع چھوڑ دیا تو اس کا اس دنیا میں یہ نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ ہم دنیا میں رُسوائی کا ایک عبرتناک مرقع بنے ہوئے ہیں۔ رہا عذابِ اُخروی، تو اس کے سزاوار بننے میں بھی ہم نے کوئی کسر اٹھا نہیں چھوڑی ہے۔ یوں اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم، اُس کی رحمت دستگیری فرمائے تو دُوسری بات ہے۔ اللہ اکبر! کیسی صادق آتی ہے ہمارے حال پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث مبارکہ جس کو حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے امام مسلم نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْكِتٰبِ اَقْوَامًا وَّیَضَعُ بِهٖ اٰخَرِیْنَ ٥ " اللہ تعالیٰ اس کتابِ عزیز کی وجہ سے کچھ قوموں کو عزّت وسربلندی عطا فرمائے گا اور دوسروں کو (اس کتابِ ہدایت کو چھوڑنے کے باعث) ذلّت و نکبت سے دوچار فرمائے گا۔

ع وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور "ہم" خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ۔ آیت کے اس حصہ پر غور کیجئے، آپ یقیناً اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اس میں ایمان بالرسالت، توقیر وتعظیم رسول اور نُصرتِ رسول کی ان تینوں بنیادوں کا بھی پُوری طرح احاطہ کر لیا گیا ہے جو پہلے بیان ہوئیں اور اسی طرزِ عمل اور اسی روش کو اللہ تعالیٰ نے فوز وفلاح کا ضامن قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس آیت کے آخر میں فرمایا: وَاُولٰٓئِكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ٥ آیت کے اس حصے سے صاف طور پر مترشح ہے کہ فلاح وصلاح اور

نجات، نبیِ اکرمؐ سے تعلق کی اِن چار بنیادوں کی درستی پر موقوف ہے۔

حضرات! اس موضوع پر گفتگو ختم کرنے سے قبل میں آپ سے یہ عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ میرے نزدیک مسلمانوں کی زبوں حالی، اُن کا زوال اور اُن کی رُسوائی در اصل قرآن مجید سے بُعد کا نتیجہ ہے۔ یہی بات بلندپایہ علمائے اسلام اپنی تقریر و تحریر میں کہتے چلے آئے ہیں، جن میں سے ایک بزرگ ہستی کا حوالہ میں اس وقت پیش کروں گا جو مجھ سے لاکھوں درجہ بلند و برتر شخصیت ہیں اور وہ ماضی بعید کی شخصیت نہیں بلکہ ماضی قریب کی ایک مسلّمہ محترم شخصیت ہیں اور وُہ ہیں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیو بندی رحمۃ اللہ علیہ۔ پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) کے دوران حکومتِ برطانیہ نے شیخ الہندؒ کو مالٹا میں اسیر کر دیا تھا۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے اپنی "تالیف" وحدتِ اُمّت" میں لکھا ہے کہ شیخ الہندؒ جب اسارتِ مالٹا سے واپس آئے تو ایک دن دارالعلوم دیو بند کے اکابر اور علماء کو شیخ الہندؒ نے جمع کیا اور فرمایا:

"میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پُوری دُنیا میں مسلمان دینی اور دُنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں، تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے، ایک اُن کا قرآن کو چھوڑ دینا، دوسرے آپس کے اختلاف اور خانہ جنگی۔ اس لیے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے۔ بچوں کے لیے لفظی تعلیم کے مکاتب بستی بستی قایم کیے جائیں۔ بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے رُوشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے اور مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔"

حضرات! میں شیخ الہندؒ کی تشخیص کو صد فیصد صحیح سمجھتے ہوئے اور موجودہ تمام حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہُوں کہ جو لوگ حقیقی معنوں میں اسلام کی روشنی میں پاکستان میں اصلاحِ احوال کے آرزو مند ہیں ان کی تمام تر توجّہ اللہ تعالیٰ کی اِس کتابِ عزیز کی خدمت کی طرف مرتکز ہو جانی چاہیے۔ قرآن مجید کو پڑھنے اور پڑھانے، سمجھنے اور سمجھانے اس کو اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنانے کی دعوت کو کامیاب کرنے کے لیے اپنی بہترین عملی جدّ و جہد اور قوتوں کو صرف کرنا ہمارا نصب العین بن گیا اور ہمارے معاشرہ میں یہ بات ایک تحریک کی صورت میں چل نکلی تو جملہ مسائل حل ہوتے چلے جائیں گے۔ ایمان و یقین اسی کتاب سے حاصل ہو گا، عقاید اسی سے درست ہوں گے، جاہلیتِ قدیمہ و جدیدہ کا ابطال اسی فرقانِ حمید سے ہو گا۔ شرک و بدعت کے اندھیرے اِسی نورِ ہدایت کی ضیا پاشی سے دُور ہوں گے، عمل و اخلاق کی اصلاح اور اِن میں تبدیلی اسی کی تعلیمات سے ہو گی۔ معاملات سنوریں گے تو اسی کتابِ مبین کی رُشد و ہدایت سے سنوریں گے۔

ہمارے ملک میں اسلامی نظام بھی اسی حبل اللہ کے اعتصام اور اس سے تمسک کے نتیجہ میں قائم و نافذ ہو گا۔

اس کے سوا اصلاح اور تبدیلی کی کوئی صورت میرے نزدیک ممکن نہیں۔ اس کام کو شریعت میں کیا مقام حاصل ہے؟ اس کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تین احادیث سے سمجھیے۔ پہلی کے راوی ہیں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ۔ صحیح بخاری میں مروی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ ۔

"تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھتے اور سکھاتے ہیں۔"

دوسری حدیث طبرانی کبیر میں حضرت جبیرؓ ابن مطعم سے مروی ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَيْسَ تَشْهَدُوْنَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَاَنَّ الْقُرْاٰنَ جَآءَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ؟ قُلْنَا: بَلٰى۔ قَالَ: فَاَبْشِرُوْا فَاِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ طَرَفُهٗ بِيَدِ اللّٰهِ وَطَرَفُهٗ بِاَيْدِيْكُمْ فَتَمَسَّكُوْا بِهٖ فَاِنَّكُمْ لَنْ تَهْلِكُوْا وَلَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهٗ اَبَدًا ۝

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم اس کی گواہی نہیں دیتے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ تنہا ہے اور اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور یہ کہ قرآن اللہ کے پاس سے آیا ہے؟ ہم نے عرض کیا 'یقیناً'۔ تب آپ نے فرمایا 'پس تم خوشیاں مناؤ، اس لیے کہ اس قرآن کا ایک سرا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور ایک سرا تمہارے ہاتھ میں۔ پس اسے مضبوطی سے تھامے رکھو۔ (اگر تم نے ایسا کیا) تو تم اس کے بعد نہ کبھی ہلاک ہوگے نہ کبھی گمراہ۔

تیسری حدیث کے راوی ہیں حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: كِتَابُ اللّٰهِ هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَمْدُوْدُ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی کتاب ہی اللہ کی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک پہنچی ہوئی ہے۔

حرفِ آخر

برادرانِ دین! اب اختتام پر آج کی ساری گفتگو کا اعادہ کر لیجئے۔ حضورؐ کے ساتھ ہمارے صحیح تعلق کی اوّلین بنیاد "ایمان" ہے۔ ایمان کے لازمی تقاضے کے طور پر دوسری بنیاد توقیر و تعظیم ہے۔ اسی دوسری بنیاد کے مقتضیات "اطاعت و محبت" ہیں۔ اور ان دونوں کے اجتماع کا نام "اتباعِ رسول" ہے جو اصل مطلوب ہے۔ حضور سے صحیح تعلق کی

تیسری بنیاد "نصرتِ رسولؐ" ہے جس کا مفاد یہ ہے کہ حضورؐ کے مقصدِ بعثت کی حضورؐ کی حیاتِ طیبہ میں تکمیل ایک درجہ میں ہوئی یعنی جزیرہ عرب کی حد تک۔ اس کا علی الاطلاق اور وسیع تر سطح پر، آفاقی سطح پر دعوت و تبلیغ کا کام ہنوز شرمندۂ تکمیل ہے۔ یہ قرض اُمّت کے ذمہ ہے۔ یہ بوجھ اُمّت کے کاندھوں پر ہے۔ یہ امانت نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہر اس شخص کی طرف منتقل ہوتی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے دامن سے وابستہ ہے، حضورؐ کا نام لیوا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے صحیح تعلق کی چوتھی بنیاد وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗ ہے۔ اس آخری بنیاد میں ہمارے لیے اس طریقِ کار کی طرف بھی رہنمائی کر دی گئی ہے، جس پر کاربند ہو کر دعوتِ الی اللہ کا فریضہ اور تواصی بالحق کی ذمّہ داری ادا کرنی ہے۔ اس کتاب کو مضبوطی سے تھام کر اس کا داعی، علمبردار اور پیغامبر بن کر ہم کو دنیا کے سامنے کھڑے ہونا ہے۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے مشن کی تکمیل کے لیے جدّ وجہد کا یہی صحیح طریقہ ہے اور اسی میں دُنیوی اُخروی فلاح و فوز مضمر ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ٥ اَقُوْلُ قَوْلِیْ هٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَكُمْ وَلِسَآئِرِ الْمُسْلِمِیْنَ ٥

(تقریر)

سیرتِ نبویؐ کا پیغام عصرِ حاضر کے نام

ڈاکٹر سیّد محمد عبد اللہ

حمدِ رب العالمین کے بعد ہزاراں ہزار صلوٰۃ وسلام حضورؐ کے لیے کہ مدعائے سخن وہی ہیں ؎

ہزار بار بشویم دہن ز مشک وگلاب
ہنوز نامِ تو گفتن کمال بے ادبی است

وہی حضورؐ جن کے حق میں وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ کی آیت نازل فرما کر خود اللہ تعالیٰ نے گویا سب سے پہلی نعت ارشاد فرمائی۔ جب حالت یہ ہے تو یہ خاکسار بے مقدار حق درود وسلام کا کیا ادا کر سکے گا۔ اس لیے اسد اللہ خاں غالب کا ہمنوا ہو کر معاملہ اسی پر چھوڑتا ہوں کہ: ؎

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

موضوع ہے "سیرتِ نبویؐ کا پیغام عصرِ حاضر کے نام"۔ یہ پیغام وہی ہے جو اسلام کا پیغام ہے اور یہ صرف عصرِ حاضر کے لیے نہیں بلکہ آنے والے ہر عصر اور ہر دور کے لئے ہے، جو رب المشارق والمغارب نے اپنے آخری نبیؐ کے ذریعے بھیجا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ صرف جامع ترین شخصیت کے مالک تھے ذہم تو خاکِ پاک کے بھی عاشق ہیں [1]۔ بعض غیر مسلم مفکرین نے بھی یہی تسلیم کیا ہے۔ مثلاً جیسا کہ دوسروں کے علاوہ پروفیسر آر، ڈبلیو، جے، آسٹن[1] نے اپنے ایک مضمون میں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا:

"..... HE IS THE ARCHETYPE OR NORM OF HUMANITY PAR EXCELLENCE IN WHOM ALL ASPECTS OF BEING UNIQUE (UNITE) AT THE CENTRE ARE IN PERFECT HARMONY AND BALANCE."

(P.68, 'The Prophet of Islam' IN THE BOOK THE CHALLENGE OF ISLAM ED. BY ALTAF GOHAR, 1978.)

بلکہ آپ کو خاتم النبیینؐ ہونے کے لحاظ سے جملہ علوم نبوت بدرجہ اتم حاصل تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی تحقیق وتشریح کے

---

[1] فاضل مضمون نگار یونیورسٹی آف ڈرہم (یو، کے) میں تقابلِ مذاہب اور تصوف کے استاد ہیں۔

مطابق جملہ علومِ نبوت یا کمالاتِ نبوت آپ کو عطا ہوئے۔ یہ کمالات ہیں رشد و ہدایت، علم و حکمت اور تدبیرِ سیاست و ملکداری، اور یہ وہ کمالات ہیں جو عطیۂ ایزدی ہیں اکتسابی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سوشیالوجی کے جدید نامور ماہرین ان کمالات کو 'CHARISMA' کا نام دے کر اسے محیّر العقول سمجھتے ہیں۔ دراصل ان علوم کی دریافت کے لیے وہ آنکھ اور دل مطلوب ہیں جو علمِ ظاہری سے نہیں نورِ ایمان سے منوّر ہوں۔

آج حضورِ پُرنورؐ کا یومِ ولادت باسعادت ہے۔ اس کا تقاضا ہے نیز اس فضا کا بھی ہے جو مملکتِ خداداد پاکستان میں پیدا ہو چکی ہے۔ تقاضا ہے کہ حضورؐ کی تعلیمات کو داخلی اور خارجی طور سے سارے عالم میں پھیلایا جائے۔ اگرچہ چودہ صدیاں گزر کر اب اسلام پندرھویں صدی میں داخل ہو چکا ہے، لیکن دنیا کو (اور خود عالمِ اسلام کو) علومِ نبوت یعنی نبوی رشد و ہدایت، علم و حکمت، تدبیرِ ملکداری اور نظامِ معاشرت و سیاست کی بالکل اسی طرح ضرورت ہے جس طرح ظہورِ قدسی کے وقت تھی کیونکہ آپ تاقیامت بشیر بھی ہیں اور نذیر بھی۔ چونکہ حضورؐ کی نظر میں دین خیر خواہی کا نام ہے۔ (چنانچہ فرمایا: اَلدِّیْنُ نَصِیْحَۃٌ) اس لیے اس خیر خواہی کے ساتھ یہ امر لازم ہو جاتا ہے کہ مذکورہ سعادتوں کو تمام عالم میں پھیلا دیا جائے جو حضورؐ کی سیرت اور اسوۂ حسنہ اور تعلیم میں ہیں تاکہ دنیا راحت و اطمینان اور فلاحِ دارین حاصل کر سکے۔

یاد رہے کہ عصرِ حاضر کی ترکیب میں مغربی تہذیبی دنیا بھی شامل ہے اور سارا مشرق اور عالمِ اسلام بھی۔ اسی سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو دو آیتوں میں سمیٹا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کے لیے لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ اور باقی عالم (عامۃ الناس) کے لیے وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ۔ جہاں تک خاص مسلمانانِ عالم کا تعلق ہے ان کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ایک بنیادی پیغام دو نکتوں میں جمع کیا جا سکتا ہے:

پہلا نکتہ یہ ہوگا کہ اے مسلمانانِ عالم! متفق و متحد ہو جاؤ، تفریق و انتشار سے بچو۔ آیت وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا۔

بقول اقبالؒ: ؎

ایک ہوں مُسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر

اس وقت عالمِ اسلام کی جو حالت ہے وہ یقیناً تشویشناک ہے۔ مسلم اقوام اپنی داخلی کوتاہیوں اور زیادہ تر درآمدی اجنبی تصورات سے مغلوب ہو کر شقاق و افتراق کی بری حالت میں ہیں جو اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً کی روح کے منافی رویہ ہے۔ اس وقت مسلم ممالک نے جن بنیادوں پر خود کو تقسیم کیا ہوا ہے وہ سراسر غیر مناسب ہیں۔ چنانچہ افغانستان سے لے کر عرب اور افریقہ تک عام طور پر باہمی بےتعلقی کا عالم ہے، لہٰذا قدرتی طور سے حضورؐ اپنی امت کو آج بھی وہی فرمائیں گے جو عربوں سے فرمایا تھا اور اتحاد کی نعمت کی بشارت دے کر افتراق سے بچنے کی تلقین کریں گے۔ اور یہ حسنِ اتفاق ہے کہ حال ہی میں صدرِ مملکت، جنھیں قدرت نے بہت سی جگہ اپنے دین کی پاسبانی اور ترجمانی کا شرف بخشا ہے

بتقاضائے آیہ کریمہ وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا ایران اور عراق کے مابین مصالحت کروانے کے لیے ایک اور خیر سگالی مشن انجام دے کر واپس آئے ہیں۔ اللہ انھیں جزائے خیر دے۔ جس طرح حضورؐ کے زمانے میں اتحاد واقعی ایک نعمتِ عظمیٰ ثابت ہوا تھا اور آپؐ کی اُمت دیکھتے دیکھتے ساری دنیا پر چھا گئی تھی۔ آج بھی نعمتِ اتحاد و اتفاق اپنے اندر ویسے ہی روشن امکانات رکھتی ہے۔ بلاشبہ چودھویں صدی میں زوال کے سائے گھرے رہے۔ مگر پندرھویں صدی جملہ قرائن کی رُو سے امید افزا صدی ہے۔ یہ اس شرط سے ہے کہ مسلمان اپنے روحانی رشتوں کو اپنے اتحاد کی اساس قرار دے لیں۔ اور ان رشتوں کے تابع وسائل مادی کی عقلی تنظیم کر کے خود کو ایک بنیانٌ مرصوص بنا لیں۔

دُوسرا نکتہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے پیغام کا یہ ہوگا کہ اے مسلمانانِ عالم! اپنے اصلی نصب العین یعنی دعوتِ حق کو فراموش نہ کرو اور موعظہ حسنہ اسلام کو آج کے دَور میں آج کی زبان اور آج کے محاورے میں پیش کرو اور حکمتِ تسخیرِ کائنات سے بہرہ مند ہو جاؤ، دُوسروں کی ٹکنالوجی سے مرعوب ہو کر نہیں بلکہ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ کے علاوہ ایمان و یقین، اعمالِ صالحہ اور یومِ آخرت کے ایقان سے مستحکم ہو کر، اس اصول پر آگے بڑھو جس کا درس سیرتِ نبویؐ میں ملتا ہے وہ درسِ خدا کے ارشاد وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا میں ہے۔

یہ تو رہا سادہ سا پیغام حضورِ انورؐ کی طرف سے مسلمانانِ عالم کے نام، جس کی تفصیلات قرآن مجید میں الگ الگ بھی ہیں اور یکجا بھی، جنھیں مصری فاضل محمد حسین ہیکل نے اپنی کتاب 'حیاتِ محمدؐ' میں یکجا جمع کر دیا ہے (دیکھیے مذکورہ کتاب کا صفحہ ۵۴۴-۵۲۵)

یہ گویا ایک منشورِ انسانیت ہے جو مسلمانوں کے علاوہ سارے عالم کے لیے بھی ہے۔ اس میں سب نیکیاں جمع ہیں اور اسلام عبارت اسی عمل بالمعروف اور اجتناب عن المنکر سے ہے۔ اس میں حقوق اللہ، حقوق العباد اور دیگر اکثر معاشرتی تلقینات موجود ہیں جو زندگی میں پاکیزگی، توسط، حسنِ معاملہ اور ثروت القلوب پیدا کرتی ہیں اور معاشرے کو اس بے آہنگی سے بچاتی ہیں جو مغربی دنیا میں روز بروز بڑھتی جاتی ہے مگر اس کا ذکر آگے آئے گا (حضورؐ کے دوسرے معاشرتی و اخلاقی احکام کے لیے یکجا دیکھیے مولانا بدرِ عالم کی کتاب ترجمان السنۃ جلد دوم و سوم)

حضرات! ہمارے موضوع کا عنوان تقاضا کرتا ہے کہ حضورؐ کی سیرتِ پاک کے حوالے سے عصرِ حاضر (یعنی مغرب) کے فکری و معاشرتی احوال پر بھی کچھ گفت گو کی جائے اور یہ بتایا جائے کہ حضورؐ کی تعلیمات سے مغرب کس طرح مستفید ہو سکتا ہے!

یہ امر واقعہ ہے کہ مغرب سائنس اور ٹیکنالوجی میں انتہائی ترقی تک پہنچ چکا ہے لیکن ان عظیم الشان ترقیات کے باوجود جیسا کہ ان کے ادب اور فکری کتابوں سے معلوم ہوتا ہے وہاں کے افراد سخت بے اطمینانی میں مبتلا ہیں، ایسا نظر آتا ہے کہ ان کے بنیادی تصورات کسی خاص قسم کے عدمِ توازن کا شکار ہو چکے ہیں اور انھیں واقعی کسی ایسے پیغام کی ضرورت ہے جس سے ان کے معاشرے کا توازن بحال ہو جائے۔ اور ہمارا الیقین یہ ہے کہ وہ پیغامِ رحمت حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی تعلیمات (قرآن مجید اور سیرت نبویہؐ) میں موجود ہے۔ رحمت سے مراد کیا ہے؟ اس لفظ کا مادہ رحم (ر ح م) ہے، اور رحیم، رحمان بھی مفسرین اور علماء عرب زبان شناسوں کے نزدیک اسی مادے سے ہیں۔

"رحم مادر" کی ترکیب کے حوالے سے اس کے مفہوم میں بہت سے جذباتِ محبت و تربیت آ گئے ہیں۔ اس کے معنی محبت، شفقت، نرمی اور عفو و درگزر ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ اس کے محدود معنی ہیں۔ رحمت بہت وسیع لفظ ہے جو خداوند تعالیٰ نے اپنے لیے بھی اور حضورؐ کے لیے بھی ارشاد فرمایا ہے۔ غور و تدبّر سے یہ نتیجہ نکالنا بے جا نہ ہوگا کہ اس لفظ میں جملہ پدرانہ اور مادرانہ، معلّمانہ اور مربیانہ محبتیں اور شفقتیں جمع ہیں جن کا مکمل احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ مختصراً رحمت، شواہد ربوبیت کا مظہر اور سرمایۂ بہجتِ سعادت بھی ہے اور فرد اور معاشرہ کے جملہ دکھوں کی دوا بھی، اس میں تسلّی اور مداوائے غم بھی ہے مگر مربیانہ تربیت اور معلّمانہ بشارت کے ساتھ انذار بغرضِ اصلاح بھی ہے بہرحال رحمت کا غالب عنصر وہ سلوک ہے جس سے قلبِ انسانی دُکھ سے نجات پا کر اطمینان حاصل کر سکے بلکہ اس سے بڑھ کر قلوب میں شادابی کی کیفیت پیدا ہو جائے، جو یک گونہ توانائی اور نشو و نما کی صلاحیت کی بھی ضامن ہو۔ لہٰذا حضورؐ کے پیغام میں یہ سب باتیں موجود ہیں جن کا ذکر ہوا۔

"رحمۃٌ للعالمین" کے مصنف قاضی سلیمان منصور پوری نے اپنی کتاب کی جلد سوم (صفحہ ۹۲ و بعد) میں حضورؐ کی سیرت طیبہ سے حضورؐ کے رحمۃ للعالمین ہونے کے ۴۶ سوانحی نمایاں شواہد پیش کیے ہیں جن میں آپؐ نے ان سب غیر معمولی شفقتوں اور بے نظیر مہربانیوں کا تذکرہ کیا ہے جو خدائے تعالیٰ کے آخری پیغمبرؐ نے کیں۔ اور ان سے ان سب کمالاتِ نبوت (رُشد و ہدایت اور خیر خواہی عام) کا ثبوت ملتا ہے جن کا اس سے قبل ذکر آ چکا ہے۔ چند مثالیں ہی کافی ہوں گی۔ آپؐ وہی تھے کہ آپ نے اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ پر عمل کیا اور کرایا۔ آپؐ نے وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا پر عمل کیا اور کرایا۔ آپؐ نے فتح مکّہ کے بعد فرمایا:

فَاذْهَبُوْا اَنْتُمُ الطُّلَقَآءُ۔

ان مثالوں کے علاوہ حضورؐ کی جملہ تعلیمات میں تسلّی، آسودگی، عدل اور رواداری جیسے شواہد رحمت پائے جاتے ہیں۔

سوال کیا جا سکتا ہے کہ مغرب سائنس اور ٹیکنالوجی میں ناقابلِ یقین کمال تک پہنچ چکا ہے تو اس صورت میں مغرب کو کسی بیرونی پیغام کی ضرورت ہی کیا ہے؟ یہ دعویٰ مغرب کے اکثر مفکّر کرتے بھی ہیں لیکن خود مغربی ادب یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان سب مذکورہ ترقیات کے باوجود مغرب قلبی اطمینان سے محروم ہے اور امریکہ و یورپ کے معاشروں میں کجروی اور بے یقینی کے بحران بھی پیدا ہو گئے ہیں جو پریشانیوں کا موجب ہیں اس لیے پیغام اور رہنمائی کی ضرورت واضح ہے۔

اگر مجھ سے پُوچھا جائے کہ مغرب کی یہ پریشانیاں کیا ہیں (جن سے ان کے اپنے مصنّفوں کے بیان کے مطابق بھی انکار نہیں کیا جا سکتا) تو میں عرض کروں گا کہ اس وقت مغرب کی بڑی اور مرکزی پریشانیاں دو ہیں، جو باقی سب پر محیط ہیں:

اوّل خوف یعنی کسی خوفناک عالمگیر جنگ کا مسلسل خوف اور اس کے ہمراہ وسائلِ زندگی کا تدریجی طور پر کم ہو کر ختم ہو جانے کا اندیشہ۔

دوم قحطِ الفت و رفاقت و محبّت جو کربِ تنہائی اور خود بیزاری (ALIENATION) پر منتج

ہو رہا ہے اور بقول غالب: ؎

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دُود بھاگے ہے اسدؔ
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

اب ان دونوں خوفوں کے اسباب کیا ہیں ؟
ٹوائن بی نے مغربی انتشارِ قلبی کی صرف دو علامتوں کا ذکر کر کے بات ختم کر دی ہے کہ مغرب کی صرف دو بڑی کمزوریاں ہیں:

ایک RACIAL DISCRIMINATION

اور دوسری ALCOHOLISM -

اور شپنگلر نے تو اپنی دَوری (CYCLIC) فلسفۂ اقوام سے زوالِ مغرب کی اصل بیماری کا ذکر گول ہی کر دیا ہے -
لیکن بات اتنی ہی نہیں یہ کہانی طویل ہے۔ علامہ اقبال کہہ گئے ہیں : ؎

عجب آں نیست کہ اعجازِ مسیحا داری
عجب آنست کہ بیمارِ تو بیمار تر است

دراصل مغربی بیماری کا آغاز اس تصورِ زندگی سے ہُوا کہ دین اور دُنیا دو الگ الگ حقیقتیں ہیں۔ رفتہ رفتہ مادّی فلسفوں کی بدولت ماورائی روحانی سب سلسلوں کا انکار ہوتا گیا۔ دیکارت نے ہر وسیلۂ علم و زندگی کو مسترد کر کے جزا و سزا اور عقبیٰ اور رحمت کے چھپے ہُوئے جملہ وسائل سے انسان کو مایوس و محروم کر دیا۔
اور اب آخری نقطۂ نظر ہے AUTONOMY OF MAN اور خواہشاتِ نفس کی بے روک تسکین۔ یہ دراصل انسان کا غرورِ نفس ہے جس کا ذکر قرآن مجید کی اس آیت میں ہے :

يَآيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ -

قدرت نے مغرب کو ایک نعمت سے نوازا تھا جس کا نام سائنس ہے۔ لیکن اس نے سائنس کو بے محور فلسفہ بنا کر اپنی خدائی کے دعوے شروع کر دیے اور کہا کہ مذہب اور دین کی ضرورت نہیں کیونکہ سائنس ہر شے کے لیے کافی ہے۔ (فاضل محمد قطب نے اسے یُوں ادا کیا ہے کہ خرابی کی انتہا یُوں ہُوئی کہ مغرب کے فلسفیوں نے سائنس کو MYTH بنا دیا (دیکھیے ان کا مضمون درکتاب THE CHALLENGE OF ISLAM مرتّبہ الطاف گوہر صفحہ ۲۱۴، جہاں ڈاروِن، فرائیڈ اور مارکس کے خیالات کا تجزیہ کیا گیا ہے)
بہرحال جب تجربے سے ثابت ہوا کہ سائنس برحق تو ہے لیکن صرف جزوی حقیقتوں کا ادراک کر سکتی ہے یعنی کُلّی حقیقت کا نہیں (جس کا احاطہ مذہب ہی کر سکتا ہے) تو اس تجربے سے آہستہ آہستہ ضمیر دار اہلِ فکر کو محسوس ہوا کہ انسان ایک نہایت ہی وسیع دنیا ہے۔ اس کے داخلی قلبی دکھوں کا علاج سائنس کے پاس نہیں تو مایوسی پھیلنے لگی۔ جان و تن کی تفریق بڑھتی گئی اور دل پژمُردہ ہوتے گئے۔ اب قریب ہو کر آپ دلوں کو ٹٹولیں گے تو اکثر مغربی لوگ اندر سے دُکھی نظر آئیں گے (چنانچہ ۱۹۶۰ء تا ۱۹۸۰ء

کا مغربی ادب اسی کرب و اضطراب کا آئینہ دار ہے) معاشرتی اور تخلیقی ادب کے آئینے میں یہ تصویر دیکھنی ہو تو ہارورڈ کے پروفیسر T.W. BELL کی کتاب CULTURAL CONTRADICTIONS OF CAPITALISM، تھیابالڈ کی کتاب BEYOND DESPAIR اور MAGEE کی کتاب RELIGION AND THE MODERN MIND کے اوراق پر نظر ڈالیے اور خود دیکھ لیجئے کہ پریشانی، کجروی اور تخریبی احساس کس خطرناک حد تک بڑھ چکا ہے۔

غرض مغرب یا عصرِ حاضر کے دو بڑے بحران یہی ہیں اوّل خوفِ جنگ اور اندیشۂ قحطِ وسائل۔ دوم کربِ تنہائی اور خاتمۂ محبت و رفاقت۔ یہ سب مادی فلسفوں کے نتائج ہیں جن میں خدا کا سہارا ختم کر دیا گیا اور تن کی خواہشات کی تسکین اور عیشِ امروز ہی کو سب کچھ سمجھ لیا گیا۔ ایمان باللہ اور ایمانیات سے انکار، دین اور دنیا کی جدائی مغرب کا سب سے بڑا المیہ ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بنیادی پیغام مغرب (عصرِ حاضر) کے نام عَوْد الی الایمان (RETURN OF FAITH) ہے۔

ایمان (FAITH) کی اس ضرورت کا احساس دوسری جنگِ عظیم کے فوراً بعد کی مغربی شعوریات میں آہستہ آہستہ پیدا ہوتا گیا تھا جس کا ظہور کئی شکلوں میں ہوا ہے۔ اس کے علمبردار پال ٹلش (PAUL TILLICH) جیسے مغربی مفکر بھی ہیں اور دِاخلیت کے فلسفی بیوبر (BUBER) جیسے بھی ہیں۔ ایک مذہبی مفکر J.B. MAGEE نے ایک مبسوط کتاب RELIGION AND THE MODERN MIND میں جدید ذہن کا شرح و بسط سے تجزیہ کر کے FAITH کو مغرب کی سب سے بڑی ضرورت قرار دیا ہے۔ اور ایک اور مصنّف نے اپنے ایک مضمون IT IS TIME TO REMIND WEST کے عنوان سے یورپ کو تنبیہ کی ہے کہ تباہی سے بچنا ہے تو خدا سے تعلق پیدا کرو۔ غرض ایمانیات کے حق میں آمادگی پائی جاتی ہے اور حضورؐ کے پیغام کے لیے یہ وقت ہر طرح موزوں معلوم ہوتا ہے کاش عصرِ حاضر دینِ اسلام اور سیرتِ رسولِ پاکؐ پر ٹھنڈے دل اور بے تعصبی سے نظر ڈال سکے۔

حضورؐ کی تعلیم و تلقین کلیت (TOTALIZY) (دین اور دنیا، تن اور روح کی جامعیت) کی طرف رجعت کی دعوت دے رہی ہے تاکہ مغرب نے سخت محنت کے بعد جو مادی ترقی کی ہے وہ ضائع نہ ہو جائے۔

میں نے اوپر جس تفریق کا ذکر کیا ہے وہ صرف نظری معاملہ نہیں بلکہ اس کے عملی نتائج و ثمرات نے ساری دنیا کو عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اسی تفریق کے تصور سے قومیت (NATIONALISM) کا تصور پیدا ہوا ہے جس نے نسلِ انسانی کو پارہ پارہ کر دیا ہے اور اب ہر قومیت دوسری قومیت سے گرم یا سرد جنگ میں مبتلا ہے۔ سرمایہ داری اور اشتراکی استبداد بھی اسی کے نتیجے ہیں۔ قرآن مجید کی تعلیمات میں شعوب و قبائل کی عصبیت اور ان کی باہمی جنگ کو (جن کی بنیاد پر آج قومیتیں اُبھر رہی ہیں) "آگ" قرار دیا گیا ہے اور الفت و رفاقت باہمی کو (بربنائے وحدتِ انسانی) نعمت قرار دیا گیا ہے۔ آج بھی دنیا حضورؐ کی دی ہوئی اس نعمت کی بڑی شدّت سے ضرورت مند ہے۔ آیتِ قرآنی یہ ہے:

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ (آل عمران ۱۰۳)

(ترجمہ:) اور خدا کے اس احسان کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ پھر خدا نے اپنی مہربانی سے تم کو آپس میں بھائی بھائی بنا دیا اور پھر تم جہنم کے کنارے پر پہنچ چکے تھے پھر خدا نے تم کو اس سے نجات بخشی۔

اس مسئلے کا ایک پہلو اور بھی ہے اور وہ یہ کہ صرف تن اور حواس کی زندگی پر زور دینے کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ اخلاقیات میں ABSOLUTES کا انکار کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا اخلاقی اقدار ختم ہو گئی ہیں۔ لہٰذا جبلتوں اور نفسانی خواہشات پر کوئی کنٹرول نہیں رہا اسی سے وہ معاشرتی اور انفرادی انارکی (ANARCHY) نمودار ہوئی ہے جو مغرب میں عریانی، جنس پرستی اور "اینگری برائے" اور "باربیرک ڈراما" جیسی کجروی کو جنم دے رہی ہے۔ اب زندگی چونکہ تعیش کا دوسرا نام ہے اس لیے دولت پرستی اور زراندوزی (سرمایہ داری یا "تکاثر") واحد مقصدِ حیات بن گیا ہے۔ چنانچہ اسی کے نتیجے میں استعمار، استحصال عام ہو کر اب دنیا رقابتوں کا مرکز ہے اور دنیا دو مستقل بلاکوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔

قرآن مجید نے تکاثر، اسراف و ترف کی سخت مذمت کی ہے اور اب بھی دنیا کو معاشرتی امن کی ضرورت ہو گی تو اسے تن پرستی اور تکاثر سے اجتناب کر کے توسط کی زندگی کو اپنانا ہو گا۔ اور اقتصاد کو جس کے معنیٰ ہی میانہ روی ہیں اقوامِ عالم کا ضروری معاشرتی معاشی رویّہ بنانا پڑے گا۔

مقصد یہ کہ حضورؐ کی تعلیمات کی رُو سے ایک متوسط معاشی نظام ہی دُنیا کے معاشی و معاشرتی مصائب کا علاج ہے اسلام کے نزدیک مال و دولت یا مناسب سرمایہ کا حصول بُری چیز نہیں لیکن سرمایہ داری فی الحقیقت بری ہے۔ اسی طرح انسان کی آزادیِ معاش کو سلب کر لینا بھی مذموم ہے۔ حضورؐ کی معاشی تعلیم میانہ روی کی دعوت دیتی ہے اور مغرب کے ان دونوں دبستانوں کو حضورؐ کی دعوت پر غور کرنا چاہیے۔

لہٰذا اسلام اور حضورؐ کی تعلیم اقتصادیات کی طرف بلاتی ہے جس میں سرمایہ داری کے وہ ہولناک مظاہر بھی نہ ہوں جو یورپ اور امریکہ میں نمودار ہوئے ہیں اور اجتماعی پیداوار کے نام سے فرد کی آزادی اور اس کی محنت کا جس طرح استحصال کیا جا رہا ہے وہ بھی نہ ہو۔

اس کے لیے حضورؐ کے قائم کردہ نظام کو کیوں نہ دیکھ لیا جائے، اس پر یقیناً ایک عادلانہ عالمگیر معاشی نظام تیار کیا جا سکتا ہے جس میں ہر کوئی خوش دلی سے کمائے اور بانٹ کر کھائے۔

میرا خیال ہے کہ مغربی مفکرین نے اسلام کے خاندانی نظام کا بغور مطالعہ نہیں کیا ورنہ یہ محبت و تعاون کے علاوہ معاشی کفالت عمومی کی ایک عملی صورت ہے۔ اس کے علاوہ مغرب اگر اسلامی شورائی اصول کی روشنی میں اپنی جمہوریت کا بھی تجزیہ کرے تو وہ یقیناً اس نتیجے پر پہنچے گا کہ اقتدار کی پسند یا تقویٰ پر یا عقل پر ہونی چاہیے۔ اکثریت کا اصول طفل تسلی سے کم نہیں۔ اس معاملے میں اسلام کا مطالعہ یقیناً زیادہ عملی اور منصفانہ نتائج پیدا کرے گا۔

اسلام کا ایک اہم عقیدہ وحدتِ نسلِ انسانی ہے۔ آیت:
یٰاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً۔ (۴ النساء ۱)

حضورؐ کی تعلیم اسی عظیم تصور پر زور دیتی ہے اور اس معاشرتی اشتراک کی قائل ہے جس میں کوئی غیر مسلم معاشرہ بھی مشترک اصولوں پر مسلمانوں سے تعاون کرنے پر قبول کیا جا سکتا ہے۔

اس کا ثبوت میثاقِ مدینہ ہے (جس کے ذریعے آپؐ نے یہودیوں کے ساتھ شہریت میں اشتراک کیا) اس کے علاوہ آپ نے معاصر سلاطین کے نام جو مکاتیب لکھے ان میں کَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمْ کے اصول کو دُہرایا۔

آپؐ نے قرآن مجید کی مشہور آیت کریمہ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ کے مضمون کے مطابق انسان کی اکرمیت کی بنیاد تقوٰی اور شرافت کو بنایا اور خطبۂ حجۃ الوداع میں تو صاف اعلان کیا کہ کسی عربی کو عجمی پر اور کسی احمر کو اسود پر ترجیح حاصل نہیں صرف تقوٰی کی بنیاد پر ہر کوئی شخص افضلیت حاصل کر سکتا ہے۔ محض رنگ و نسل وغیرہ کافی نہیں۔ اسلام کی تاریخ میں ہندوستان اور مصر کے غلام بھی سلاطین بنتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ اسی قرآنی تعلیم کا نتیجہ تھا۔

آج کے دَور میں کبھی کھلا اور کبھی کنایۃً سفید فام اقوام اپنے رنگ اور دوسرے اوصاف کو وجہِ تفاخر بناتی ہیں لیکن حضورؐ کی تعلیم اس کے خلاف ہے اور آپؐ نے اپنی زندگی میں اس کے عملی ثبوت بھی پیش کیے ہیں۔ اسی اصول یا عقیدے کی بنیاد پر اسلام کو PLURALISM جیسی کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ امریکہ چاہے تو نسلی مسئلے کا حل اسلام کی تعلیم کے ذریعے کر سکتا ہے۔

وحدتِ نسلِ انسانی کے تصور کے اندر سے مغرب کے بعض مفکر تمام عالم کی واحد ریاست کا تخیل پیش کرنے کے مدعی ہیں اور حقوقِ عامہ کے معاملے میں سبقت کا دعوٰی بھی کرتے ہیں اور کنگ جان کے میگنا کارٹا (۱۲۱۵ء) کو اوّلین دستاویز حقوق اور بعد کی متعدد وحدت آفریں تجویزوں مثلاً یورپین لیگ آف نیشنز اور موجودہ یونائیٹڈ نیشنز وغیرہ کا بطور مثال تذکرہ کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ واحد عالمی ریاست کے نصب العین کا سنگِ بنیاد حضورؐ نے میثاقِ مدینہ کے علاوہ خصوصی طور سے خطبہ حجۃ الوداع میں رکھا تھا۔ جن مثالوں کا ذکر اُوپر آیا ہے وہ یا تو محدود تھیں یا ناقابلِ عمل تھیں کیونکہ ان کی بنیاد صرف مادّی تھی اور وہ اس روحانی کشش سے خالی تھیں جو قلوب میں پائیدار الفت پیدا کر سکتی ہوں۔ (کتاب UNIFICATION OF MANKIND کے آخری باب کے دلائل اسلامی تعلیمات سے متاثر ہیں)

بالیقین حضورؐ کی دعوت اور سیرت ہی ایک پائیدار دستور العمل ہے جو کسی واحد عالمی ریاست کے خواب کی عملی تشکیل کر سکتی ہے۔ کیونکہ یہ رب العالمین اور جمیع الناس کے اصول پر مبنی ہے۔

جس دن مغرب ان بنیادی اصولوں کو تسلیم کرلے گا اس کے جملہ اقتصادی، معاشرتی، معاشی اور تعزیراتی نظام خود بخود خدا ترسی، انصاف، عدل، رفاقت، مساوات اور توسّط کے اصولوں پر چلنے لگیں گے۔ گویا زمین پر اللہ کی

حاکمیت ہو جائے گی۔

اس خاکسار بے مقدار نے ڈرتے ڈرتے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ میں برابر سوچتا رہا کہ اگر نوکِ سوزن کے برابر بھی بے اعتدالی ہوگئی تو دنیا و آخرت کا خسارہ یقینی۔ آج کا دن ۱۲ ربیع الاول ——— حضورؐ کے پاسِ ادب کے نیچے دبا جا رہا ہوں۔ قلم پر جو عمر بھر ایک مدرس و معلّم کا قلم رہا ہے آج اسے بڑی مشکل سے گزرنا پڑا۔ پلکوں سے سوئیاں چننی پڑیں۔

بہرحال معذرت ہے حضرت رسالتمآبؐ سے کہ میں ذرا بھی حق ادا نہ کر سکا ؎

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حُسن تو بسیار
گل چینِ بہارِ تو ز دامان گلہ دار

اور آخر میں پھر حمدِ پروردگار ہے اور اس کے بعد صلوٰۃ و سلام حضورِ پُرنور پر۔ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ اٰلِہٖ وَسَلَّمَ۔

نبوت کا عطیہ

سید ابو الحسن علی ندوی

دنیا کی تاریخ میں کثرت سے ایسے افراد اور جماعتیں گزری ہیں جنھوں نے انسانیت کی خدمت کی ہے اور دنیا کی تعمیر و ترقی میں حصہ لیا ہے۔ اس موقعہ پر وہ سب تاریخ کی سطح سے اُبھر آتے ہیں اور اپنے کو انسانیت کا معمار و خدمت گزار کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں اور وہ امیدوار ہوتے ہیں کہ ان کو بھی اس معیار سے جانچا اور پرکھا جائے گا، یہ ٹھیک ہے ان کو بھی موقع دینا چاہیے اور ان کی خدمات و احسانات کا موازنہ کرنا چاہیے پھر فیصلہ کرنا چاہیے کہ کون اس معیار پر پُورا اترتا ہے۔

سب سے پہلے ہمارے سامنے ایک سنجیدہ اور باوقار گروہ آتا ہے، یہ حکماء و فلاسفہ کی جماعت ہے، ان میں یونان کے بڑے بڑے فلسفی بھی ہیں اور ہندوستان کے بلند پایہ حکیم بھی۔ ہمارا ذہن حکمت و فلسفہ سے شروع سے مرعوب رہا ہے، ہم ان کو دیکھ کر کہہ اُٹھتے ہیں کہ انھوں نے انسانیت کا سر اونچا کیا ہے اور اس کا دامن حکمت کے موتیوں سے بھر دیا ہے لیکن تعصّبات اور عقیدت مندی سے ذرا آزاد ہو کر غور کیجیے کہ کیا ان کی طرف سے یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے اور کیا ان کا یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ انسانیت کے حق میں رحمت ثابت ہوئے ہیں؛ میں پُوچھتا ہُوں کہ انسانیت نے ان سے کیا پایا، اس کی کون سی پیاس بجھی، انھوں نے اس کے کس درد کا مداوا کیا؛ غور کرنے پر ہم کو مایوسی ہوتی ہے! ذرا آپ فلسفہ کا مطالعہ کیجیے اور فلاسفہ کی زندگی پر نظر ڈالیے۔ صاف معلوم ہو گا کہ فلسفہ زندگی کے سمندر میں ایک مختصر سا جزیرہ تھا، ایک محفوظ جگہ تھی، ایک محدود دائرہ تھا۔ یہ حکمأ و فلاسفہ اپنی تمام ذہنی صلاحیتیں، خدا کی دی ہوئی طاقتیں اس محدود دائرے کے اندر صرف کر رہے تھے۔ انسانیت کے وہ مسائل جن کو ذرا دیر کے لیے بھی ٹالا نہیں جاسکتا اور جو فوری حل کے محتاج ہیں، جن کے بغیر انسانیت کی گاڑی ایک قدم بھی نہیں چل سکتی، ان حکمأ نے نہ ان مسائل کو چھیڑا نہ ان سے بحث کی اور نہ ان مسائل میں انسانیت کی کوئی مدد کی، وہ اپنے اس علمی جزیرے کے اندر عافیت کی زندگی گزارتے رہے، لیکن انسانیت تو ان چھوٹے چھوٹے جزیروں میں بند نہیں تھی، یونان جہاں فلاسفہ بہت گزرے ہیں، اس یونان میں بھی سارے کے سارے فلسفی ہی تو نہیں تھے۔ ان فلسفیوں نے کواکب سیارات سے تو بحث کی اور فلکیات پر مُوشگافیاں کیں، مگر زندگی کے لیے کیا ہدایات دیں اور علمی طبقہ کو چھوڑ کر دوسرے طبقات کی کیا رہنمائی کی؛ انھوں نے بھٹکتی ہوئی انسانیت اور سسکتی ہُوئی زندگی کے لیے کیا کیا؛ اور زندگی میں رہتے ہوئے بھی زندگی سے بے تعلق تھے۔ انھوں نے اپنے گرد علم و حکمت کا ایک حصار کھینچ لیا تھا اور صرف چند علمی مسائل سے تعلق رکھا تھا۔

یہ ایک سیاسی دور ہے اور ہمارا ملک اب آزاد ہے، شاید آپ اس مثال سے فلاسفہ کی صحیح پوزیشن سمجھ سکیں۔ دیکھیے آپ کے ملک میں مختلف بیرونی ممالک کے سفارت خانے ہیں۔ کوئی امریکی سفارت خانہ ہے، کوئی روسی سفارت خانہ ہے،

کوئی مصر کا ہے، کوئی ایران کا۔ ان سفارت خانوں کے اندر بھی زندگی اور حرکت ہے، ان کے اندر بھی بہت سے لوگ لکھتے پڑھتے رہتے ہیں، بڑے بڑے فاضل اور سیاسی مبصر بھی ہیں لیکن ان کو ہمارے ملک کے اندرونی مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں، ہمارے آپس کے تعلقات اور باہمی کشاکش سے کوئی واسطہ نہیں، یہاں کی غریبی، امیری، اخلاقی ترقی و انحطاط سے ان کو بحث نہیں، ان کا ایک محدود و مخصوص کام ہے اور وہ صرف وہی کام انجام دیتے ہیں، اس لیے وہ یہاں ہو کر بھی ایسے ہیں گویا وہ یہاں نہیں ہیں۔ بس اسی طرح حکمت و فلسفہ ایک غیر ملکی سفارت خانہ کی طرح قائم تھا اور یہ حکماء و فلاسفہ ان سفارت خانوں کی چار دیواری کے اندر علم و حکمت کی نمائندگی کر رہے تھے اور زندگی کے مسائل سے بے تعلق تھے۔

دوسری جماعت جو اس سلسلہ میں ہمارے سامنے آتی ہے وہ ادباء و شعراء کی جماعت ہے ہم کو اور آپ کو ادب و شاعری کا ذوق ہے اور ہم ادب و شعر کی تحقیر نہیں کرتے، لیکن بے ادبی معاف! کہ ادباء و شعراء نے بھی انسانیت کے دُکھ کا علاج نہیں کیا۔ انھوں نے ہمارے لیے تفریح کا سامان بہم پہنچایا، ہمارے ادب و زبان کو مالا مال کیا۔ لیکن انسانیت کی اصلاح کا دردِ سر مول نہیں لیا اور نہ یہ ان کے بس کی بات تھی، زندگی بنتی اور بگڑتی رہی، انسانیت گرتی اور سنبھلتی رہی اور یہ اپنے میٹھے میٹھے بول سناتے رہے، اس کی مثال یوں سمجھیے کہ لوگ اپنی اپنی مصیبتوں میں مبتلا ہوں، کہیں لڑائی جھگڑا ہو رہا ہو، کہیں زندگی کے مسائل درپیش ہوں اور کوئی بانسری بجانے والا بڑی سُریلی آواز میں بانسری بجاتا گزر جائے۔ آپ تھوڑی دیر کے لیے اس کا لطف لے سکتے ہیں، آپ اس کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں، مگر اس ترنم سے آپ زندگی کے مسائل تو حل نہیں کر سکتے اور نہ اس سے کوئی پیغام حاصل کر سکتے ہیں، شعر و ادب ہماری زندگی کے لیے کتنا ہی ضروری سہی اور اس سے ہماری رُوح کی بالیدگی اور اس سے ہمارے دماغ کو کیسی ہی تازگی حاصل ہو، لیکن یہ ہمارے مسائل کا حل اور ہمارے درد کی دوا تو نہیں۔ پھر ان ادباء و شعراء کو کسی چیز پر اصرار بھی نہیں تھا۔ وہ کسی مقصد کے لیے جدوجہد بھی نہیں کرتے تھے اور نہ اس کے لیے قربانیاں کرنا ان کے بس کی بات تھی اور اصلاح و انقلاب اس کے بغیر ہُوا نہیں کرتا۔

تیسرا گروہ جو ہمارے سامنے آتا ہے وہ فاتحین کا ہے جنھوں نے ملکوں کو فتح کیا اور اپنے زورِ شمشیر سے قوموں کو تسخیر کیا اس گروہ سے بھی ہم اچھے خاصے مرعوب ہیں، ان کی تلواروں کی جھنکار ابھی تک ہمارے کانوں میں آ رہی ہے، بظاہر ان کے شور سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے انسانیت کی بڑی خدمت کی مگر ان کے نام کے ساتھ کون سی تاریخ وابستہ ہے؛ کیا عدل و انصاف کی یا درندگی و سفاکی کی؟ سکندر کا نام آتا ہے تو اس کے مظالم کی داستان تازہ ہو جاتی ہے، کیا وہ انسانیت کا محسن تھا، اس نے یونان سے ہندوستان تک تمام ملکوں کو زیر و زبر کر دیا، ملک کے ملک اس کی وجہ سے امن و امان اور زندگی کے لطف سے محروم ہو گئے۔ اس کے چلے جانے کے بعد بھی سیکڑوں برس تک یہ ملک سنبھل نہ سکے۔ یہی حال سیزر، چنگیز خاں اور دوسرے بڑے بڑے فاتحین کا ہے، فاتح چاہے اپنے ملک کا محسن ہو یا اپنی قوم کے لیے رحمت ہو مگر دوسری قوموں کے لیے عذاب اور مصیبت ہے۔

چوتھا گروہ ان لوگوں کا آتا ہے جو ملک کے آزاد کرانے والے ہیں اور قومی لیڈر ہیں۔ اس گروہ کا جب نام آتا ہے

تو احترام سے ہماری گردنیں جھک جاتی ہیں۔ حقیقتاً انھوں نے اپنے ملک کے لیے بڑا کام کیا مگر اس ملک کے باہر بسنے والے انسانوں کے لیے کیا کیا آپ ابراہیم لنکن کے نام سے واقف ہوں گے وہ جدید امریکا کا معمار ہے، مگر بتائیے کہ ہندوستان، مصر و عراق اور ان جیسے اور ملکوں کو اس سے کیا فائدہ پہونچا؟ نتائج پر نظر کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس نے ایک امپیریلسٹ طاقت پیدا کر دی اور دُنیا کی غلامی کی زنجیر میں ایک اور کڑی کا اضافہ کر دیا۔ سعد زاغلول کون تھا؟ مصر کا محسن اور وہاں کی تحریکِ آزادی کا سب سے مشہور رہنما، مگر مصر سے باہر اس نے کیا کیا اور اس کا ہم پر کیا احسان ہے؟ یہ قوم پرستی تو دراصل دوسرے ملکوں اور قوموں کے لیے مصیبت ہے اس لیے کہ اس کی بنیاد ہی اپنی قوم کی برتری اور دوسری قوموں کی تحقیر پر ہے اور اکثر اس کو اپنی قوم کا پایہ بلند کرنے کے لیے دوسری قوموں کو غلام بنانا پڑتا ہے۔

پانچواں گروہ وہ ہے جو سائنٹسٹ کہلاتا ہے جس نے نئی نئی ایجادیں کیں اور بہت سی کارآمد چیزیں بنائیں۔ بلاشبہ اس گروہ نے انسانوں کی بڑی خدمت کی۔ یہ تمام ایجادیں جو ہمارے کام آتی ہیں جیسے بجلی، ہوائی جہاز، ریل اور ریڈیو، انھیں سائنٹسٹ حضرات کی مرہونِ منت ہے، اس کے لیے انھوں نے بڑی محنتیں کیں اور اس میں شک نہیں کہ یہ انسانوں کے بڑے کام آ رہی ہیں۔ مگر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایجادیں تنہا کافی نہیں، ان ایجادوں کے ساتھ اگر نیک ارادے نہ ہوں، صبر و ضبط نہ ہو، خدمتِ خلق کا جذبہ نہ ہو، اس سے اگر انسانیت کے ضروری مسائل حل نہ ہوں تو بتائیے کہ یہ ایجادیں انسان کے لیے رحمت ہیں یا زحمت؟ انھوں نے یہ ایجادیں تو انسان کو دے دیں مگر ان کے استعمال کا صحیح جذبہ نہیں دیا، وہ ذہن و ضمیر نہیں پیدا کیا جو ان سے فائدہ اٹھاتے اور ان کو ٹھکانے لگائے اور ان سے غلط کام لینے سے پرہیز کرے۔ گزشتہ دو جنگوں کا تجربہ بتلاتا ہے کہ اخلاقی تربیت اور خدا ترسی کے بغیر یہ ایجادیں اور یہ وسائل انسانیت کے حق میں قہر و عذاب ہیں، رحمت و راحت نہیں۔ میں ان سائنس دانوں کی تحقیر نہیں کرتا مگر یہ ضرور کہوں گا کہ یہ ایجاد کا کارنامہ نیک مقاصد، اخلاقی طاقت اور دماغی توازن کے بغیر مکمل نہیں ادھورا ہے، جب تک انسان کے دل میں نیک خواہش نہ ہو اور خود اس کے اندر نیک کام کرنے کی تحریک اور تقاضا نہ پیدا ہو اس کو وسائل و آلات، مواقع و امکانات اور سہولتیں اور آسانیاں نیک نہیں بنا سکتیں، فرض کیجیے میرے پاس دینے کو روپیہ بھی ہے لینے کو بہت سے محتاج بھی ہیں، میرا کوئی ہاتھ نہیں پکڑتا، مگر میرے اندر فیاضی کا جذبہ اور مدد کرنے کی خواہش نہیں تو مجھے کون دینے پر آمادہ کر سکتا ہے؟

اب ایک دوسرا گروہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ پیغمبروں کا گروہ ہے۔ یہ گروہ ایجادات و اکتشافات کا دعویٰ نہیں کرتا نہ وہ علوم میں مہارت کا مدعی ہے، نہ اس کو ادب و شاعری پر ناز ہے۔ وہ اپنے متعلق نہ مبالغہ آرائی سے کام لیتا ہے نہ بے ضرورت خاکساری سے، وہ بڑی صفائی اور سادگی سے کہتے ہیں کہ دُنیا کو وہ تین چیزیں عطا کرتے ہیں:

۱۔ صحیح علم

۲۔ اس علم پر یقین

۳۔ اس علم پر عمل کرنے اور اس یقین کے مطابق زندگی گزارنے کا جذبہ اور خواہش۔

یہ ہے حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک کی تعلیم کا نچوڑ۔

اب میں بتاتا ہوں کہ وُہ صحیح علم کیا ہے جو پیغمبر انسانوں کو دیتے ہیں، وہ علم اس کا کہ دنیا کو کس نے بنایا؟ پیغمبر کہتے ہیں کہ سب سے پہلے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہم کو کس نے پیدا کیا اور کیوں پیدا کیا؟ اس کے معلوم کیے بغیر ہمارا ہر قدم غلط ہے۔ ہم کو اس دنیا کی کسی چیز سے فائدہ اٹھانے کا کوئی حق نہیں، اس لیے کہ اس زندگی میں جو کچھ ہو رہا ہے، چلنا پھرنا، کھانا پینا وہ سب اس عظیم کُل کا ایک حقیر جُز ہے، جب تک کہ ہم کو اس کائنات کا مرکز معلوم نہیں اور ہم اس کے مقصدِ کلی سے اتفاق نہیں رکھتے کہ ہم کو اس کے اجزا سے فائدہ اٹھانے کا کیا حق ہے؟ اس کے بغیر تو روٹی کا ایک ٹکڑا توڑنا حرام ہے، ہم بھی اس کائنات کا ایک حقیر جُز ہیں اور غلّہ کا جو دانہ ہم استعمال کرتے ہیں وہ بھی اس مجموعہ کی ایک بہت حقیر کسر اور ایک ادنیٰ ذرّہ ہے۔ بلکہ ہم جس سیارہ (زمین) پر بس رہے ہیں وہ بھی اس کائنات کا حقیر ذرّہ ہے۔ ہماری اس زمین کی اس نظامِ فلکی میں کیا حیثیت ہے؟ اگر آپ کو وہ نسبت معلوم ہو جائے جو آپ کی اس سرزمین اور سورج کے درمیان ہے یا دوسرے سیاروں اور ثوابت سے ہے تو آپ کو اپنے وجود سے بھی شرم آنے لگے گی اور اپنے عظیم الشان وطن سے بھی۔ آپ کے اور اس کائنات کے دوسرے اجزا کے درمیان کس نے ربط پیدا کیا؟ اسی خالقِ کائنات نے اور اسی مقصدِ کلّی نے! اگر آپ اس خالقِ کائنات کو نہیں جانتے یا نہیں مانتے اور اس مقصدِ کُل سے آپ کو اتفاق نہیں ہے تو آپ کو اس کائنات کے کسی ذرّے یا دوسرے جز سے فائدہ اٹھانے کا کیا حق ہے؟ میں پُوچھتا ہوں کہ اگر روٹی کا وہ ٹکڑا جو آپ کے ہاتھ میں ہے آپ سے سوال کرے کہ میں نے تو اپنے خالق کو پہچان لیا اور اس کے حکم کے مطابق میں نے اپنے مخدوم (انسان) کے لیے اپنے وجود کو قربان کر دیا لیکن اے انسان! تُو نے نہ اپنے خالق کو جانا نہ اس کی بندگی کی، تجھے مجھ سے فائدہ اٹھانے کا کیا حق ہے؟ تو آپ کیا جواب دیں گے؟ اسی طرح اس دنیا کی کسی چیز کا استعمال غلط ہے جب تک یہ جان نہ لیا جائے کہ اس کا پیدا کرنے والا کون ہے اور اس کا مقصد کیا ہے؟ مگر یہ عجیب ٹریجڈی ہے کہ آج دنیا میں تمام کام ہو رہے ہیں، بازار میں چہل پہل ہے، تعلقات قائم ہو رہے ہیں، سواریاں چل رہی ہیں، بڑے بڑے کام ہو رہے ہیں مگر کسی کو یہ معلوم کرنے کی فرصت نہیں کہ جس دنیا میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے اس کا پیدا کرنے والا کون ہے، اس کی پیدائش کا مقصد کیا ہے؟ جب پیغمبر دنیا میں تشریف لاتے انسانیت کی گاڑی بے مقصد جا رہی تھی۔ فلاسفہ، علماء، ادباء، شعراء، فاتحین، حکمرانوں، کاشتکاروں اور تاجروں کو اپنے کاموں سے فرصت نہ تھی، حاکم بھی تھے اور محکوم بھی تھے، ظالم بھی تھے اور مظلوم بھی تھے۔ مگر سب اصل مقصد سے غافل اور اپنے پیدا کرنے والے سے ناواقف، ان چھوٹے چھوٹے بالشتیوں جیسے انسانوں میں ایک بلند قامت انسان آتا ہے اور جن لوگوں کے ہاتھ میں انسانیت کی باگ ڈور تھی، ان سے سوال کرتا ہے کہ جواب دو کہ تم نے انسانوں پر یہ کیا ظلم کیا ہے کہ ان کو اپنے مالک اور اس دُنیا کے بادشاہ سے ہٹا کر اپنا غلام بنا لیا ہے؟ تم کو کیا حق تھا کہ نابالغ انسانیت کا ہاتھ پکڑ کر تم نے اس کو غلط راستہ پر ڈال دیا ہے؟ اے ظالم ڈرائیور! تو نے مسافروں سے پوچھے بغیر زندگی کی گاڑی کس طرف چلانی شروع کر دی؟ وہ زندگی کے قلب و ضمیر میں کھڑے ہو کر انسانیت کو خطاب کرتا ہے

اور اس کو پکارتا ہے، اس کے سوال کو ٹالا نہیں جاسکتا، اس کی دعوت اور اس کی پکار پر دو گروہ ہو جاتے ہیں:

ایک اس کی بات مانتا ہے۔

ایک انکار کرتا ہے۔

دنیا کو ان دونوں راستوں میں سے ایک راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔

پیغمبر کبھی نہیں کہتے کہ ہم قدرت کے رازہائے سربستہ کا انکشاف کرنے آئے ہیں، ہم طبعی طاقتوں کو مسخر کرنے آئے ہیں، ہم کچھ نئی ایجادیں کریں گے، وہ جغرافیہ و معدنیات میں مہارت کا دعویٰ نہیں کرتے، وہ کہتے ہیں کہ ہم اس دنیا کے بنانے والے اور اس کی ذات و صفات کا صحیح علم عطا کرتے ہیں جو ہم کو اس دنیا کے مالک نے اور انسان کے خالق نے عطا کیا ہے اور اب ہمارے ہی ذریعہ سے وہ دوسروں کو مل سکتا ہے۔

وہ بتاتے ہیں کہ اس دنیا کا بنانے والا ایک ہے اور اسی کی مرضی و حکمت سے یہ دنیا چل رہی ہے، وہ بلا شرکت غیرے اس کو چلا رہا ہے۔ یہ دنیا بے مقصد نہیں پیدا کی گئی اور نہ بے مقصد چل رہی ہے۔ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی ہوگی جس میں اس پہلی زندگی کا حساب دینا ہوگا، وہاں اچھے اعمال کا انعام ملے گا، بُرے اعمال کی سزا ملے گی، قانون لانے والے اور خدا کا منشا بتلانے والے پیغمبر ہیں جو ہر ملک اور ہر قوم میں آئے اور خدا کا پیغام لائے، خدا کا راستہ ان کے بغیر طے نہیں ہوسکتا۔ یہ وہ باتیں ہیں جن پر تمام پیغمبر متفق ہیں ان میں کسی کا اختلاف نہیں، فلاسفہ و حکمأ میں سخت اختلاف ہے ان میں سے دو بھی کسی ایک بات پر متفق نہیں لیکن یہاں کسی ایک بات پر بھی دو پیغمبروں میں اختلاف نہیں۔

لیکن تنہا علم کے لیے یقین ضروری نہیں، آج ہمارے معلومات کتنے زیادہ ہیں مگر ہمارا یقین کتنا کم ہے، علم ہمیشہ یقین پیدا نہیں کرتا، قدیم زمانہ کے فلاسفہ میں سے بہت سے یقین سے محروم تھے اور شک کے مریض۔ آج بھی ان کا علم یقین پیدا کرنے کے بجائے الٹا شک پیدا کرتا ہے۔ آج بھی بڑے بڑے صاحبِ علم یقین کو ترستے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام تنہا صحیح علم نہیں دیتے تھے اس پر یقین بھی عطا کرتے تھے۔ علم بڑی دولت ہے مگر اس پر یقین اس سے بڑی دولت ہے۔ علم بغیر یقین کے زبان کی ورزش ہے، دماغ کا تعیّش اور دل کا نفاق۔ پیغمبروں نے اپنے ماننے والوں کو صحیح علم عطا کیا اور مضبوط یقین، انھوں نے جو کچھ جانا اس کو مانا، پھر اپنے کو اس پر قربان کر دیا۔ ان کے دماغ اس علم سے روشن ہوئے اور ان کے دل اس یقین سے طاقتور۔ ان کے یقین کے قصّے تاریخ میں پڑھیے، ان کے یقین کے نتائج اپنی گرد و پیش کی دنیا میں دیکھیے۔

آج اگر یقین ہوتا تو بداخلاقی کیوں ہوتی؟ ظلم کیوں پھیلتا؟ رشوت کا بازار کیوں گرم ہوتا؟ کیا یہ تمام خرابیاں اس لیے ہیں کہ علم نہیں، لوگوں کو معلوم نہیں کہ چوری جُرم ہے، رشوت حرام ہے، اگر کٹی بداخلاقی ہے؟ یہ کون کہہ سکتا ہے ہم تو دیکھتے ہیں کہ جہاں علم زیادہ ہے وہاں خرابیاں بھی زیادہ ہیں، جو لوگ رشوت کی بُرائی پر کتاب لکھ سکتے ہیں اور اس کی تاریخ مرتب کر سکتے ہیں، وہ زیادہ رشوت لیتے ہیں، جو چوری کی خرابی سے اور اس کے انجام سے زیادہ واقف ہیں

وہ چوری زیادہ کرتے ہیں۔ گرہ کٹوں کو دیکھیے ان میں سے بہت سے ایسے ملیں گے جو گرہ کٹی کے الزام میں کئی کئی بار سزا بھگتے ہوئے ہوتے ہیں، کیا ان سے زیادہ کوئی گرہ کٹی کے انجام اور سزا سے واقف ہوگا۔ اگر صرف علم کافی ہوتا تو چوری کی سزا کے بعد چوری چھُٹ جاتی اور ایک بار جُرم کرنے اور سزا بھگتنے کے بعد کوئی جُرم نہ کرتا لیکن ایسا نہیں ہو رہا ہے۔ معلوم ہوا علم تنہا کافی نہیں۔

پھر علم ضروری اور یقین ضروری۔ مگر اس کی کیا ضمانت کہ اس پر عمل کا تقاضا بھی پیدا ہوگا۔ بہت سے لوگ جانتے بھی ہیں اور یقین بھی رکھتے ہیں کہ شراب بُری چیز ہے، اس کے نقصانات کا تجربہ بھی ہے، یقین بھی، مگر پیتے ہیں۔ آپ کے شہر میں بہت سے ڈاکٹر حکیم ہوں گے جو بدپرہیزی کرتے ہیں۔ ان کو یقین ہوتا ہے کہ بدپرہیزی خطرناک ہے مگر وہ بدپرہیزی کر گزرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ عمل کا تقاضا نہیں ہوتا اور ان کے اندر پرہیز کی خواہش اور بدپرہیزی سے نفرت نہیں ہوتی بلکہ بدپرہیزی کی خواہش ہوتی ہے اور وہ اس خواہش کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

انبیاء کرام علم و یقین کے ساتھ یہ تیسری طاقت بھی عطا کرتے ہیں، یعنی اپنے علم و یقین پر عمل کرنے کی رغبت اور اپنی غلط خواہشات کا مقابلہ کرنے کی طاقت۔ اس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے علم و یقین سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان کے مطابق زندگی گزارتے ہیں، ان کا ضمیر ان کی نگرانی کرتا ہے اور غلط کام کرنے کے وقت ان کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔

ہر پیغمبر نے یہ تینوں دولتیں اپنے اپنے زمانہ والوں اور اپنی اپنی اُمتوں کو عطا کیں اور ان کی بدولت لاکھوں انسانوں کی زندگی بن گئی اور زندگی کی چول اپنی جگہ پر آ گئی۔ انسانیت پر حقیقی احسان انھیں پیغمبروں کا ہے، اللہ کا درود و سلام ہو ان پر کہ انھوں نے انسانیت کی دستگیری کی اور اس کو عین وقت پر ہلاکت سے بچا لیا۔

لیکن رفتہ رفتہ یہ دولتیں دنیا سے ناپید ہونے لگیں۔ علم صحیح گم ہوگیا، یقین کا چراغ بجھ گیا، نیک عمل کی خواہش مُردہ ہوگئی۔ چھٹی صدی مسیحی آئی تو یہ تینوں دولتیں اتنی نایاب ہو چکی تھیں کہ ان کا سراغ لگانا مشکل تھا، پورے پورے ملک اور پورے پورے برِاعظم میں بھی ڈھونڈے سے ایک اللہ کا بندہ نہ ملتا جو علم صحیح اور ایمان قوی کی دولت سے مالا مال ہو، انبیاء کا لایا ہوا دین اور پھیلایا ہوا یقین سمٹتے سمٹتے ایک نقطہ بن گیا تھا۔ شک و بےعملی کی ظلمتوں میں علم و یقین کا یہ نور اس طرح کہیں کہیں چمکتا تھا جیسے برسات کی اندھیری رات میں جگنو چمکتے ہیں، اہلِ یقین کا ایسا قحط تھا کہ ایران کا ایک نوجوان سلمان فارسی یقین اور حُسنِ عمل کی تلاش میں نکلتا ہے تو ایران سے شام اور وہاں سے حجاز پہونچ جاتا ہے اور ان تین ملکوں میں اس کو صرف چار صاحبِ یقین ملتے ہیں۔

اس گھٹا ٹوپ اندھیرے اور اس عالمگیر ظلمت میں خدا کا آخری پیغمبر آتا ہے وہ ان تینوں دولتوں کو اتنا عام کر دیتا ہے کہ اس سے پہلے کبھی اتنی عام نہیں ہوئی تھیں۔ جو دولت کسی کسی سینہ اور کسی کسی سفینہ میں تھی جو گھروں سے نکل کر محلّوں میں بھی اور محلّوں سے نکل کر شہروں میں بھی نہیں پھیلی تھی وہ گھر گھر عام ہو جاتی ہے اور مشرق سے لے کر مغرب تک پھیل جاتی ہے:

رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی
ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی

وہ ان تینوں حقیقتوں کی تلقین ہی نہیں کرتا، ان کا صور پھونک دیتا ہے، دنیا میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک کوئی کان والا ایسا نہیں جو کہہ سکے کہ اس نے اس صور کی آواز نہیں سنی اور جس نے نہیں سُنی اس کے کان کا قصور ہے، اس کے اعلان کا قصور نہیں۔ آج دنیا کا کون سا گوشہ ہے جہاں اشھد ان لا الٰہ الا اللہ اور اشھد ان محمد رسول اللہ کا ترانہ سُننے میں نہیں آتا، جب دُنیا کی تمام آوازیں تھک کر سو جاتی ہیں، جب جیتے جاگتے شہر پر موت کی سی نیند طاری ہو جاتی ہے، جب زبانوں پر قفل پڑ جاتے ہیں اس وقت بھی کانوں میں یہی صدا آتی ہے کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے پیغمبر ہیں۔

آج ریڈیو کے ذریعہ دنیا کے کونہ کونہ میں آواز پہونچتی ہے اور گھر گھر پیغام پہونچ جاتا ہے۔ لیکن کیا کسی ریڈیو نے، خواہ وہ امریکہ کا ہو یا برطانیہ عظمیٰ کا، کسی حقیقت کو کسی علم کو اس طرح دنیا میں عام کیا ہے جس طرح یہ علم عام ہوا ہے جس کی صدا نبیِ امّی نے کوہِ صفا کی چوٹی پر چڑھ کر لگائی تھی!

انسان کبھی ترنگ میں آتا ہے اور طفلانہ معصومیت کے ساتھ کچھ کہنے لگتا ہے۔ ایسی ہی ترنگ میں اقبال نے انسانوں کی طرف سے اپنے مالک کی بارگاہ میں عرض کیا تھا:

ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد

اگر آج محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ادنیٰ غلام عرض کرے تو کیا بے جا ہے کہ خدایا تیری خدائی برحق، تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خالق اور اس ساری دنیا کا خالق و مالک اور ہر شے پر قادر ہے، لیکن کیا تیرے بندوں اور تیری مخلوقات میں سے کسی نے تیرا نام اس طرح پھیلایا اور دنیا کے کونہ کونہ میں پہنچایا جس طرح تیرے بندے اور پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے؟ یہ کوئی بے ادبی اور سرکشی نہیں، اس میں بھی تعریف اسی خدا کی ہے جس نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا پیغمبر بھیجا اور ان کو اپنا نام پھیلانے اور اپنا دین چمکانے کی یہ طاقت اور توفیق عطا فرمائی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے میدان میں جب اپنی چودہ پندرہ سال کی کمائی اللہ کے دین کی مدد کے لیے سامنے رکھ دی اور ۳۱۳ کو ایک ہزار کے مقابلہ میں لا کر کھڑا کر دیا تو زمین پر سر رکھ کر اپنے مالک سے یہی کہا تھا کہ "اے اللہ! اگر تو اس مٹھی بھر جماعت کو آج ہلاک کر دینے کا فیصلہ فرماتا ہے تو قیامت تک تیری عبادت نہ ہو سکے گی۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کی جو صدا لگائی تھی اس سے دنیا کا کوئی مذہب، کوئی فلسفہ اور کوئی دماغ غیر متاثر نہیں رہا۔ جب سے دنیا نے سُنا کہ انسان کے لیے خدا کے سوا کسی اور کے سامنے جھکنا ذلت اور عار ہے۔ خدا نے فرشتوں کو آدمؑ کے سامنے اس لیے جھکایا تاکہ سب سجدے اس کی اولاد پر حرام ہو جائیں، وہ سمجھ لے کہ جب اس کارخانۂ قدرت کے کارندے ہمارے سامنے جھکا دیے گئے تو ہم کو اس دنیا کی کسی چیز کے سامنے جھکنا کب زیب دیتا ہے، جب سے دنیا نے توحید کی حقیقت اور انسان نے اپنی یہ حیثیت سُنی اس وقت سے شرک خود اپنی نگاہ میں ذلیل ہو گیا۔ اس کو احساسِ کمتری نے گھیر لیا۔ آپ کو بعثتِ محمدی کے بعد اس کے لب و لہجہ میں فرق محسوس ہوگا۔ اب وہ

اپنے عمل پر نازاں نہیں ، وہ اس کی تاویل اور فلسفیانہ تعبیر کرتا ہے ۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ توحید کی آواز نے دل میں گھر کر لیا ہے۔

پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس علم و یقین کے ساتھ وہ طاقت بھی پیدا کر کے دکھا دی جس میں ہزار پولیس ، سیکڑوں عدالتوں اور بیسیوں حکومتوں سے زیادہ طاقت ہے ۔ یعنی ضمیر کی طاقت ، نیکی کی رغبت ، گناہ سے نفرت اور نفس کا خود احتساب ۔

یہ اسی طاقت کا کرشمہ تھا کہ ایک صحابی جن سے ایک بڑا گناہ سرزد ہو جاتا ہے وہ بے تاب ہو جاتے ہیں ۔ ضمیر چٹکیاں لینے لگتا ہے اور وہ حضورؐ کی خدمت میں آتے ہیں اور عرض کرتے ہیں : حضور ! مجھ کو پاک کر دیجیے ، آپ رُخِ انور پھیر لیتے ہیں وہ اسی طرف آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ آپ دُوسری طرف رُخ کر لیتے ہیں ، وُہ اس طرف آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں ، آپ تحقیق کرواتے ہیں کہ ان کی دماغی حالت خراب تو نہیں ، جب معلوم ہوتا ہے کہ وہ صحیح الدماغ آدمی ہیں تو آپ ان کو سزا دلواتے ہیں ۔ کس چیز نے ان کو سزا پر آمادہ کیا اور کون سی چیز ان کو کھینچ کر لائی ؟

آگے چلیے غامدیہ ایک اَن پڑھ عورت تھیں کسی گاؤں کی رہنے والی ، وہ ایک بار بڑے گناہ میں مبتلا ہو جاتی ہیں ، نہ کوئی دیکھنے والا تھا نہ سننے والا ۔ مگر ان کے دل میں ایک پھانس تھی جو ان کو چین نہ لینے دیتی تھی ۔ ان کو کھانے پینے میں مزا نہ آتا تھا ۔ وہ کھانا کھاتیں تو ان کا دل کہتا کہ تم ناپاک ہو ، ناپاک کا کیا کھانا پینا ، تمھیں پہلے پاک ہونا چاہیے ، اس گناہ کی پاکی سزا کے بغیر ممکن نہیں ، وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتی ہیں اور تقاضا کرتی ہیں کہ ان کو پاک کر دیا جائے ۔ اور اس پر اصرار کرتی ہیں ، یہ معلوم کر کے کہ ان کے پیٹ میں بچّہ ہے ۔ آپ فرماتے ہیں کہ اس بچّہ کا کیا قصور ، اس کی جان تمھارے ساتھ کیوں جائے ، جب یہ ہو جائے تب آنا ، خیال کیجیے ان کو ضرور اس میں کچھ عرصہ لگا ہو گا ، کیا اُنھوں نے کھایا پیا نہ ہو گا ، کیا زندگی نے خود ان سے تقاضا نہ کیا ہو گا ، کیا خود کھانے پینے کی لذّت نے زندگی کی رغبت نہ پیدا کی ہوگی اور ان کو یہ نہ سمجھایا ہو گا کہ اب وہ حضورؐ کے پاس جانے کا ارادہ فسخ کر دیں مگر وُہ اللہ کی بندی پکّی رہی اور کچھ عرصہ کے بعد بچّہ کو لے کر آئی اور عرض کیا کہ حضورؐ ! میں اس سے فارغ ہو گئی ، اب میری طہارت میں کیوں دیر ہو ؟ فرمایا ، نہیں نہیں ، ابھی اس کو دُودھ پلاؤ ۔ جب دُودھ چھُوٹے تب آنا ۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کو دو برس تو ضرور لگے ہوں گے ، یہ دو برس کیسی آزمائش کے تھے ، نہ پولیس تھی نہ نگرانی ، نہ مچلکہ نہ ضمانت ، کتنے خیال اس کو آئے ہوں گے ۔ بچّہ کی معصوم صُورت اس کو جینے کی دعوت دیتی ہو گی ، اس کی مسکراہٹ زندگی کی خواہش پیدا کرتی ہو گی ، اور بچّہ اپنی زبان بے زبانی سے کہتا ہو گا کہ امّاں ! میں تو تیری ہی گود میں پلوں گا اور تیری انگلی پکڑ کر چلوں گا ۔ مگر اس کا ضمیر کہتا تھا : نہیں ، تیری ماں ناپاک ہے ، اس کو سب سے پہلے پاک ہونا ہے ، دل کا یقین کہتا تھا کہ احکم الحاکمین کے یہاں جانا ہے ، وہاں کی سزا سخت ہے ، وُہ پھر حاضر ہوئی ۔ روٹی کا ٹکڑا بچّے کے منہ میں ہے اور کہتی ہے : یا رسول اللہؐ ! دیکھیے اس بچّہ کا دودھ بھی چھُوٹ گیا اور وہ روٹی کھانے کے قابل ہو گیا ہے ۔ اب میری پاکی میں کیا دیر ہے ؟ آخر

خدا کی اس سچی اور پکی بندی کو سزا دی جاتی ہے اور حضورؐ خوشنودی کا پروانہ عطا کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اس نے ایسی سچی توبہ کی ہے کہ اس اکیلی توبہ کی اگر سارے مدینہ پر تقسیم کر دی جائے تو سب کے لیے کافی ہو۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہا و ارضاہا۔

میں پوچھتا ہوں کہ وہ کیا چیز تھی جو بغیر ہتکڑی بیڑی کے، بغیر مچلکہ و ضمانت کے، بغیر پولیس کے اس کو کھینچ کر لاتی ہے اور سزا کے لیے اصرار کرواتی ہے؟ آج ہزارہا پڑھے لکھے، قابل، فاضل مرد اور عورتیں ہیں جن کا علم اور نقصانات کا یقین ان کو غلط کام سے باز نہیں رکھ سکتا اور اچھے کام پر آمادہ نہیں کر سکتا۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو یہی تینوں انمول موتی عطا کیے۔ علمِ صحیح، یقینِ کامل اور نیکی کا تقاضائے قلبی، دنیا کو نہ اس سے زیادہ قیمتی سرمایہ ملا، نہ کسی نے اس پر آپ سے بڑھ کر احسان کیا۔

دنیا کے ہر انسان کو فخر کرنا چاہیے کہ ہماری نوعِ انسانی میں ایک ایسا انسان پیدا ہوا جس سے انسانیت کا سر اونچا اور نام روشن ہوا، اگر آپ نہ آتے تو دنیا کا نقشہ کیا ہوتا اور ہم انسانیت کی شرافت و عظمت کے لیے کس کو پیش کرتے؟ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہر انسان کے ہیں۔ محمد رسول اللہ سے اس دنیا کی رونق اور نوعِ انسانی کی عظمت ہے، وہ کسی قوم کی ملک نہیں، ان پر کسی ملک کا اجارہ نہیں، وہ پوری انسانیت کا سرمایۂ فخر ہیں، کیوں آج کسی ملک کا انسان فخر و مسرت کے ساتھ یہ نہیں کہتا کہ میرا اس نوع سے تعلق ہے جس میں محمد رسولؐ جیسا انسان کامل پیدا ہوا؟

آج انسانوں کا کون سا طبقہ ہے جس پر آپ کا براہِ راست یا بالواسطہ احسان نہیں، کیا مردوں پر آپ کا احسان نہیں کہ آپ نے ان کو مردانگی اور آدمیت کی تعلیم دی؟ کیا عورتوں پر آپ کا احسان نہیں کہ آپ نے ان کے حقوق بتلائے اور ان کے لیے ہدایتیں اور وصیتیں فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کہ: "جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے"؟ کیا کمزوروں پر آپ کا احسان نہیں کہ آپ نے ان کی حمایت کی اور فرمایا کہ "مظلوم کی بددعا سے ڈرو کہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں۔ خدا کہتا ہے کہ میں شکستہ دلوں کے پاس ہوں"؟ کیا طاقتوروں اور حکمرانوں پر آپ کا احسان نہیں کہ آپ نے ان کے حقوق و فرائض بھی بتلائے اور حدود بھی بتلائے اور انصاف کرنے والوں اور خدا سے ڈرنے والوں کو بشارت سنا دی کہ بادشاہ منصف رحمت کے سایہ میں ہوگا، کیا تاجروں پر آپ کا احسان نہیں کہ آپ نے تجارت کی فضیلت اور اس پیشے کی شرافت بتلائی اور خود تجارت کر کے اس گروہ کی عزت بڑھائی۔ کیا آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں اور راست گفتار اور دیانتدار تاجر جنت میں قریب ہوں گے، کیا آپ کا مزدوروں پر احسان نہیں کہ آپ نے تاکید فرمائی کہ مزدور کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے دے دو۔ کیا جانوروں تک پر آپ کا احسان نہیں کہ آپ نے فرمایا کہ ہر وہ مخلوق جو جگر رکھتی ہے اور جس میں احساس و زندگی ہے اس کو آرام پہونچانا اور کھلانا پلانا بھی صدقہ ہے" فی کل ذات کبد حری صدقۃ"۔ کیا ساری انسانی برادری پر آپ کا احسان نہیں کہ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر آپ شہادت دیتے تھے کہ خدایا! تیرے سب بندے بھائی بھائی ہیں" انا شھید ان العباد کلھم اخوۃ"۔ کیا ساری دنیا پر آپ کا احسان نہیں کہ سب سے پہلے

دنیا نے آپ ہی کی زبان سے سُنا کہ خدا کسی قوم، نسل و برادری کا نہیں سارے جہانوں اور دنیا کے سب انسانوں کا ہے جس دُنیا میں آریوں کا خدا، یہودیوں کا خدا، مصریوں کا خدا، ایرانیوں کا خدا کہا جاتا تھا وہاں " الحمد للہ رب العالمین" کی حقیقت کا اعلان ہُوا اور اس کو نماز کا جزُ بنا دیا گیا۔

ہماری آپ کی دنیا میں حکماً و فلاسفہ بھی آئے، ادبا و شعراً بھی، فاتح و کشور کشا بھی، سیاسی قائد اور قومی رہنما بھی، موجدین و مکتشفین (سائنٹسٹ) بھی، مگر کس کے آنے سے دنیا میں وہ بہار آئی جو پیغمبروں کے آنے سے؟ پھر سب سے آخر سب سے بڑے پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے سے آئی، کون اپنے ساتھ وہ شادابی، وہ برکتیں، وہ رحمتیں نوعِ انسانی کے لیے وہ دولتیں اور انسانیت کے لیے وہ نعمتیں لے کر آیا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے؟ تیرہ سو برس کی انسانی تاریخ پُورے وثوق کے ساتھ آپ کو خطاب کر کے کہتی ہے: ؎

سرسبز سبزہ ہو جو ترا پائمال ہو
ٹھہرے تو جس شجر کے تلے وہ نہال ہو

نبیؐ اپنے گھر میں

امین احسن اصلاحی

ایک شخص کے گھر کی زندگی اس کے سیرت وکردار کا حقیقی آئینہ ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی باہر کی زندگی میں ظاہر داری کی چادر اوڑھ کر نکلتا ہو اور جو کچھ وہ ہے اس سے بالکل مختلف شکل وصورت میں اپنے آپ کو پیش کرتا ہو، لیکن گھر کی زندگی میں وہ اپنے اوپر اس قسم کا پردہ ڈالے رکھنے میں زیادہ دنوں تک کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اوّل تو کوئی شخص اس قسم کی کوشش کرتا ہی نہیں اور اگر وہ کرے تو اس میں کامیاب نہیں بھی ہو سکتا۔ اس وجہ سے کسی شخص کو جانچنے کے لیے بہترین کسوٹی اس کے گھر کی زندگی ہے۔ وہاں اس کو دیکھنا چاہیے کہ اس کی سیرت کیا ہے؟ جس خدا ترسی اور تقویٰ کا درس وہ باہر دے رہا ہے، اس پر وہ اپنے گھر کے اندر کتنا عامل ہے؟ جس اتباعِ کتاب وسنّت کا وعظ وہ دوسروں کو سنا رہا ہے، اس پر وہ خود کس قدر عمل کرتا ہے؟ اور اپنے بیوی بچّوں سے کس قدر ان پر عمل کراتا ہے؟ جس دین کی اقامت کے لیے وہ خدائی فوجدار بنا ہوا سارے جہان سے لڑ رہا ہے، اس دین کو وہ اپنے گھر کے اندر کس حد تک قائم کرنے میں کامیاب ہو سکا ہے؟ جس سادگی، جس ایثار، جس قناعت، جس صبر اور اخلاص ودیانت کا وہ دوسروں سے مطالبہ کر رہا ہے، اس کا جمال خود اس کی گھریلو زندگی میں کتنا جھلک رہا ہے؟ اگر فی الواقع کوئی شخص اس کسوٹی پر پورا اترتا ہے، تو بلا شبہ یہ ایک ایسی کسوٹی ہے، جس پر پُورے اُترنے والے کی اخلاقی عظمت کا اور اس کی سچائی کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک ایسے شخص کے اصولوں اور نظریات سے تو آپ اختلاف کر سکتے ہیں، لیکن آپ اس کو محض ایک مصنوعی یا ایک بے کردار آدمی قرار نہیں دے سکتے۔

آئیے اس کسوٹی پر ہم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو جانچیں اور یہ دیکھیں کہ آپؐ کی باہر کی دعوت اور گھر کی زندگی میں کس حد تک مطابقت ہے۔ خوش قسمتی سے صرف آپؐ ہی کی زندگی ایک ایسی زندگی ہے جس کا ہر حصّہ دنیا کے سامنے ہے۔ ہم نہایت مستند معلومات کی بنا پر جس طرح یہ جانتے ہیں کہ آپؐ مسجد نبوی کے اندر صحابہؓ کی موجودگی میں کیا کچھ فرماتے تھے اور کیا کچھ کرتے تھے، اسی طرح ہم نہایت مستند معلومات کی روشنی میں یہ بھی جانتے ہیں کہ آپؐ بیوی بچّوں کے اندر کس طرح رہتے سہتے تھے۔

آپؐ نے اپنی زندگی پرائیویٹ اور پبلک کے دو حصّوں میں تقسیم نہیں کی تھی بلکہ آپؐ کی زندگی کا ہر حصّہ پبلک کے لیے کھلا ہوا تھا کہ لوگ اس کو دیکھیں اور اس سے رہنمائی حاصل کریں۔ آپؐ نے لوگوں سے یہ مطالبہ کبھی نہیں کیا کہ لوگ صرف آپؐ کی پبلک زندگی ہی کو دیکھیں، آپؐ کی نجی زندگی کا تجسس نہ کریں بلکہ آپؐ نے اپنی پبلک اور اپنی نجی زندگیاں ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح نہ صرف اپنے دوستوں کے سامنے بلکہ اپنے دشمنوں کے سامنے بھی رکھ دیں کہ لوگ چاہیں تو ان کو اسوۂ حسنہ

بنائیں اور چاہیں تو بے خوف وخطر ان پر حرف گیری کریں، اگر حرف گیری کی گنجایش پائیں۔

دُنیا میں دُوسروں کی بیویاں ان کی گھریلو زندگی کے رازوں کی امین ہوتی ہیں، لیکن صرف حضورؐ کی ازواجِ مطہرات کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ پبلک کے نمایندہ کی حیثیت سے آپؐ کی گھریلو زندگی کی ایک ایک ادا کو محفوظ رکھتی تھیں اور پُوری دیانت و امانت کے ساتھ اس کو پبلک تک پہنچاتی تھیں۔ ایک ایسی زندگی جس کی جلوت وخلوت سب کچھ ہمارے سامنے ہے، بہترین چیز اس مقصد کے لیے ہوسکتی ہے کہ ہم اس میں یہ دیکھ سکیں کہ اس کے دونوں پہلوؤں میں کس حد تک مطابقت پائی جاتی ہے۔

اس مقصد کو سامنے رکھ کر میں یہ سطریں لکھ رہا ہُوں اور میری کوشش یہ ہوگی کہ میں جس پہلو کو بھی نمایاں کروں، اس کے لیے موادِ استدلال اصلاً قرآن مجید سے اخذ کروں تاکہ آپؐ کی سیرت طیّبہ کا مستند ترین حصہ جو قرآن میں بیان ہوا ہے، اس کا ایک پہلو آپ کے سامنے آئے اور اگر کہیں مزید وضاحت کی ضرورت محسوس ہوئی تو حدیث اور سیرت کے بیان کردہ واقعات سے بھی مدد لوں گا۔

اہلِ بیت کا مشغلہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کا جو پہلو سب سے زیادہ نمایاں ہوکر ہمارے سامنے آتا ہے، وہ یہ ہے کہ آپؐ کے اہلِ بیت کا رات دن کا مشغلہ بھی وہی تھا، جو خود حضورؐ کا رات دن کا مشغلہ تھا۔ یہ صورت نہیں تھی کہ آپؐ خود تو لوگوں کو بندگیِ رب اور اطاعتِ الٰہی کا وعظ سناتے رہیں اور آپؐ کے اہلِ بیت دنیا کی دلچسپیوں اور مادی زندگی کی لذتوں میں منہمک ہوں یا آپؐ باہر تو لوگوں کو زُہد وقناعت کی تعلیم دیں اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے جہاد کی تلقین فرماتے ہوں اور گھر میں آکر اس تلقین کو بھول کر گھر کی دلچسپیوں اور راحتوں میں کھو جاتے ہوں۔ بلکہ آپؐ کا جو مشن باہر ہوتا تھا، آپؐ اسی مشن کو لے کر گھر میں داخل ہوتے تھے اور جس مبارک شغل میں خود اپنا وقت صَرف فرماتے تھے، اسی مبارک شغل میں آپؐ کے گھر والے بھی اپنا وقت بسر کرتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک مشن سورۂ جمعہ میں یہ بیان ہوا ہے:

ھو الذی بعث فی الامیین رسولاً منھم یتلوا علیھم اٰیاتہٖ و یزکیھم و یعلمھم الکتاب والحکمۃ۔ (آیت ۲)	وہی ہے جس نے بھیجا اُمیوں میں سے ایک رسول انہی میں سے جو ان کو سناتا ہے اللہ کی آیتیں اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو سکھاتا ہے کتاب اور حکمت۔

بعینہٖ اس مشن کی یاددہانی اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں کو اس وقت فرمائی ہے جب کہ منافقین اور منافقات اس غرض کے لیے دن رات ایک کیے ہوئے تھے کہ کسی طرح آپؐ کی ازواجِ مطہرات کو اس اعلیٰ نصب العین سے ہٹا کر دُنیوی اور مادی زندگی کی لذتوں کی طرف مائل کریں۔ چنانچہ منافقوں کی بیویوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے کانوں میں یہ پھونکنا شروع کیا کہ آپ معزز اور امیر گھرانوں کی بیٹیاں ہیں۔ آپ لوگوں کی پرورش سردار گھرانوں میں عیش و

آرام کے گہوارے میں ہوئی تھی۔ لیکن اس شخص نے آپ کو غربت اور فلاکت کی زندگی میں لا کر ڈال دیا ہے۔ اگر آپ ان کی قید سے آزاد ہوتیں تو بڑے بڑے سردارانِ قبائل آپ کو نکاح کے پیغام دیتے اور آپ کی زندگیاں بڑے عیش و آرام سے گزرتیں۔ اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات اس سے بالاتر تھیں کہ اس قسم کے شیطانی پروپیگنڈے سے متاثر ہوں، تاہم طبائع انسانی کی عام کمزوری کو سامنے رکھ کر اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے ان کو یاد دلایا کہ وہ خدا کی طرف سے ایک عظیم منصب پر سرفراز ہیں۔ اسی منصب کی ذمہ داریوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو چنا ہے اور اس دنیا کی کوئی عزت و شوکت بھی اس منصب کی عزت و شوکت کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ چنانچہ فرمایا:

<table>
<tr>
<td>یٰنسآء النبی لستن کاحدٍ من النسآء ان اتقیتن فلا تخضعن بالقول فیطمع الذی فی قلبہ مرض وقلن قولاً معروفاً وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاھلیۃ الاولیٰ واقمن الصلوٰۃ واٰتین الزکوٰۃ واطعن اللہ ورسولہٗ انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا۔ واذکرن ما یتلیٰ فی بیوتکن من اٰیٰت اللہ والحکمۃ ان اللہ کان لطیفاً خبیراً۔

(احزاب ۳۲-۳۴)</td>
<td>اے نبی کی بیویو! اگر تم تقویٰ کی روش اختیار کرو تو تم عام عورتوں کی مانند نہیں ہو۔ پس تم اپنے لہجہ میں ایسی نرمی نہ اختیار کرو کہ جس کے دل میں روگ ہے وہ کسی طمع خام میں مبتلا ہو جائے اور دستور کے مطابق بات کیا کرو اور اپنے گھروں میں ٹک کر رہو اور گزرے ہوئے زمانہ جاہلیت کی سی نمائش نہ کرو اور نماز قایم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتی رہو۔ اللہ تو بس یہی چاہتا ہے کہ تم سے دنیا کی آلائشیں دُور رکھے۔ اے نبی کے گھروالو! اور تم کو اچھی طرح پاک کرے اور تمھارے گھروں میں جو اللہ کی آیتیں اور حکمت کی باتیں سنائی جاتی ہیں، ان کا چرچا کرو۔ اللہ تعالےٰ لطیف وخبیر ہے۔</td>
</tr>
</table>

ان آیات سے صاف واضح ہے کہ جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کو سنوارنے اور سدھارنے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دینے کے لیے بھیجا تھا اُسی طرح آپؐ کے گھر والوں کو بھی اسی لیے چنا تھا کہ وہ اس مشن کی تکمیل میں آپؐ کا ہاتھ بٹائیں جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ سب سے اونچا بنایا تاکہ سب لوگ ہادی و مرشد اور پیغمبر و امام کی حیثیت سے آپؐ کی پیروی کریں، اسی طرح آپؐ کی ازواج کا درجہ بھی تمام اُمت کے مردوں اور عورتوں کے لیے امہات کا رکھا تاکہ سب لوگ ان کو اپنے لیے نمونہ مان کر ان سے زندگی کے وُہ طریقے سیکھیں جو ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم ہوئے ہیں۔

جس طرح ان تعلیمات پر سب سے زیادہ اہتمام سے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم عمل فرماتے تھے، جو آپ دُوسروں کو دیتے تھے،

اسی طرح ازواجِ مطہرات اور اہلِ بیتِ نبوت پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی تھی کہ وہ اپنے گھر سے پھیلنے والے چشمۂ نور سے خود پہلے اچھی طرح منوّر ہوں۔ پھر اس روشنی سے دوسروں کو منور کریں، جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کے لیے یہ پسند نہیں فرمایا کہ دنیا کے زخارف ان کو اپنی طرف متوجہ کریں، اسی طرح آپؐ کے اہلِ بیت کے لیے بھی یہ بات پسند نہیں کی گئی کہ آلایشِ دنیا کی چھینٹوں سے ان کے دامن آلودہ ہوں۔ اندر اور باہر دونوں جگہ کامل یکسانی اور کامل مشابہت تھی۔ جس اعلیٰ مقصد کے لیے حضورؐ نے اپنے دن رات ایک کر رکھے تھے اس اعلیٰ مقصد میں آپؐ کی ازواج بھی دل و جان سے منہمک تھیں۔

شریر اور دنیا پرست لوگ جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یکسوئی کو درہم برہم کرنے کے لیے طرح طرح کے فتنے اٹھاتے رہتے تھے، لیکن اللہ کی تائید اور رہنمائی سے آپؐ ہمیشہ ان فتنوں سے محفوظ رہ کر اپنے کام میں لگے رہے۔ اسی طرح منافقین اور منافقات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کی یکسوئی میں بھی خلل انداز ہونے کے لیے طرح طرح کی تدبیریں کرتے رہتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو ہر فتنہ سے محفوظ رکھا اور دنیا کی دلفریبیاں ان کو صراطِ مستقیم سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

آزادانہ انتخاب

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات نے دنیا طلبی کی تمام رغبتوں اور سرگرمیوں سے الگ تھلگ رہ کر محض اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت، اللہ کے دین کی تبلیغ و اشاعت اور کتاب و سنّت کی تعلیم و دعوت کے لیے اپنے آپ کو جو وقف کر دیا تھا، تو یہ کوئی مجبوری کا سودا نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان کے مقدس شوہر چونکہ ایک خاص طرح کی زندگی اور ایک خاص قسم کے مشن پر مامور کر دیے گئے تھے، اس وجہ سے ان کے لیے اب اس کے سوا کوئی راہ باقی ہی نہیں رہ گئی تھی کہ وہ چار و ناچار اسی کام میں اپنے آپ کو بھی لگائیں اور طوعاً و کرہاً دنیا کی لذتوں اور راحتوں کے ارمانوں سے اپنے دل خالی کریں، بلکہ یہ پاکیزہ زندگی اُنھوں نے آزادانہ انتخاب سے اختیار کی تھی۔ ان کے سامنے دُنیا پیش کی گئی، لیکن انھوں نے اس کو ٹھکرا دیا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اُنھیں پوری آزادی دی کہ وہ اپنے لیے جو زندگی پسند کریں، اس کا انتخاب کرلیں۔ اُنھوں نے ہر قیمت پر آپؐ کی رفاقت کو منتخب کیا۔

شریروں اور منافقوں نے ان کو طرح طرح سے غیر مطمئن کرنے کی کوشش کی، لیکن ان کے اس اطمینان اور اس سکونِ خاطر میں، جو نبی کی محبت میں حاصل تھا کوئی فرق نہ آیا۔ جس زمانہ میں منافقین کی ریشہ دوانیاں ازواجِ مطہرات کو غیر مطمئن کرنے کے لیے غیر معمولی طور پر بڑھ گئیں۔ آپ نے حجت تمام کرنے کے لیے اپنی ازواج کو اس بات کا پورا پورا اختیار دے دیا کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ اور زخارفِ دنیا میں سے کسی ایک چیز کا پوری یکسوئی اور دلجمعی سے انتخاب کرلیں۔ اگر انھیں دنیا اور دنیا کی راحتوں اور لذتوں کی خواہش ہے تو اللہ کا رسولؐ اس بات کے لیے تیار ہے کہ بڑی خوب صورتی کے ساتھ ان کو ان کے حقوق دے دلا کر رخصت کر دے اور اگر وہ دنیا پہ لات مار کر رسولؐ کی محبت و معیت اور اقامتِ دین کے اس جہاد کے لیے اپنے آپ کو وقف کرتی ہیں، تو پھر اس زہد و قناعت کی زندگی پر

ان کو قانع ہونا پڑے گا، جو وہ گزار رہی ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَ اُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا وَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا۔ (۳۳ : ۲۸)

اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینتوں کی طالب ہو تو آؤ میں تمھارے حقوق دے دلاؤں اور خوبصورتی کے ساتھ تم کو رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور آخرت کی طالب ہو تو اطمینان رکھو کہ اللہ نے تم میں سے خوبی طلب کرنے والیوں کے لیے بہت بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو یہ اختیار دے کر ایک طرف تو ان کے لیے اس بات کا موقع بہم پہنچایا کہ وہ اگر اقامتِ دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کے اس جہاد اور زہد و نفس کشی کی اس ریاضت میں آپؐ کی شریکِ سفر رہنا چاہتی ہیں تو اپنے آپ آزادانہ انتخاب و اختیار سے رہیں تاکہ اس جہاد و ریاضت کا جو اجر و ثواب اللہ تعالیٰ کے ہاں ملنے والا ہے اس میں پوری پوری حصہ دار بن سکیں۔

دوسری طرف آپ نے ان منافقین کے لیے بھی ان کی کوششوں کا نتیجہ دیکھ لینے کا ایک موقعہ بہم پہنچایا، جو ایک عرصہ سے اس مہم میں لگے ہوئے تھے کہ آپؐ کی گھریلو زندگی میں کوئی بے اطمینانی اور انتشار پیدا کر کے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کریں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اعلان کے بعد قدرتی طور پر ان کو دلی خوشی ہوئی ہو گی کہ ایک لمبے عرصے تک فساد کی جو فصل بوتے اور سینچتے رہے ہیں اب اس کے بار آور ہونے کا وقت آیا ہے۔ وہ متوقع ہوئے ہوں گے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیت کو اُکسانے اور ان کی موجودہ زندگی سے ان کو بیزار کرنے کی جو جدّوجہد کرتے رہے ہیں اب اس کے نتائج کچھ نہ کچھ ضرور نکلیں گے۔ آپؐ کی ازواج میں سے سب نہیں تو بعض تو ضرور ہی اس اختیار کے بعد آپؐ کی رفاقت سے انکار کر دیں گی اور اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے اور آپؐ کو ایذا پہنچانے کا نیا مواد ان کو ہاتھ آئے گا۔ لیکن ان کے چھکّے چھوٹ گئے ہوں گے جب اُنھوں نے دیکھا ہو گا کہ اس اختیار کے پانے کے بعد آپؐ کی ازواج کا جذبۂ اطاعت اور جوشِ محبت و وفاداری اور بڑھ گیا اور ان میں سے ایک ایک نے صاف صاف الفاظ میں اس امر کا اظہار کیا کہ:

"آپؐ کی غلامی کے آگے تمام دنیا کی سلطنت اور سارے کون و مکان کی سروری و سرداری بھی ہیچ ہے۔"

اس طرح یہ حقیقت مخالفین اور موافقین دونوں پر واضح ہو گئی کہ حضورؐ کی ازواج کی زندگیاں اس مقدس مشن کے ساتھ صرف اس لیے نہیں بندھی تھیں کہ وہ حضورؐ کے رشتۂ ازدواج میں منسلک تھیں، بلکہ ان میں سے خود ہر ایک کا مطلوبِ حقیقی بھی یہی مشن بن گیا تھا۔

بخاری میں ابوسلمہ بن عبدالرحمان سے روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کو بتایا کہ جب مذکورہ آیت تخییر اُتری تو حضورؐ نے اپنی ازواج میں سے ایک ایک کے سامنے اس مسئلہ کو رکھا اور اس کا آغاز مجھ سے کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں تم سے ایک بات کہہ رہا ہوں لیکن یہ ضروری نہیں کہ تم اس کے جواب کے لیے جلدی کرو، اس کا جواب تم اپنے والدین سے مشورہ کے بعد مجھے دو۔ اس کے بعد آپؐ نے مذکورہ بالا آیت تلاوت فرمائی۔ میں نے عرض کیا کہ اس میں ایسی کیا بات ہے جس کے بارے میں مجھے اپنے والدین سے مشورہ کی ضرورت ہو، میں دُنیا اور اس کی زینتوں کے مقابل میں اللہ اور اس کے رسولؐ اور آخرت کی زندگی کو اختیار کرتی ہوں:؂

بولائے تو کہ اگر بندہ خویشم خوانی
از سرِ خواجگی کون و مکاں برخیـــزم

پھر یہی سوال حضورؐ نے یکے بعد دیگرے اپنی تمام ازواج کے سامنے رکھا اور سب کا جواب وہی تھا جو حضرت عائشہ صدیقہ کا تھا اور اس کے سوا جواب اور ہو بھی کیا سکتا تھا! سن و سال کے لحاظ سے اگر دنیا کی زندگی اور اس کی زینتوں کا ارمان ہو سکتا تھا تو حضرت عائشہؓ کے دل میں ہو سکتا تھا، لیکن جب عشقِ حق نے ان کو اس قدر دنیا سے بے نیاز اور آخرت کا طالب بنا دیا تھا کہ اللہ کی محبت اور رسول کی اطاعت پر سب کچھ قربان کر دینے میں زندگی کی حقیقی لذت محسوس کر رہی تھیں تو دوسروں کا جواب ان کے جواب سے کس طرح مختلف ہو سکتا تھا۔

بعض مستشرقین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیت پر "حرم" کی پھبتی چست کرتے ہیں۔ بعض آپؐ کی ازواجِ مطہرات کو قیدیوں سے تشبیہ دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ "گرفتارانِ بلا" تھیں، جو صرف اس لیے آپؐ کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں کہ ان کے لیے کوئی راہِ فرار باقی نہیں رہی تھی۔ لیکن کیا پوری تاریخِ انسانی میں ایک مثال بھی اس امر کی پیش کی جا سکتی ہے کہ کسی نے اپنے قیدیوں کے سامنے آزادی کا اختیار نامہ رکھا ہو، جو حضورؐ نے رکھا، لیکن قیدیوں نے اس آزادی پر اس کی غلامی ہی کو ترجیح دی ہو؟

محبّت، اعتماد اور خودداری کی فضا

لیکن کسی کو یہ گمان نہ ہو کہ اگر حضورؐ اور حضورؐ کے اہلِ بیت نے دُنیا کی جگہ آخرت، ثروت و امارت کی جگہ فقر اور خدمتِ نفس کی جگہ خدمتِ انسانیت کے اس نصب العین کو اپنے لیے پسند فرمایا تھا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کی گھریلو زندگی میں سوئی لذت و کیفیت، کوئی چہل پہل، سرگرمی اور اتار چڑھاؤ کی کوئی نرمی و گرمی سرے سے باقی ہی نہیں رہ گئی تھی۔ ایک ہموار زندگی تھی، ہر قسم کے نشیب و فراز سے خالی ایک پرسکون ماحول تھا۔ ہر قسم کے جذبات کی مداخلت سے پاک اور محفوظ، ایک بہتا ہوا دریا تھا، ہر قسم کے تلاطم اور تموّج سے یکسر ناآشنا، حضورؐ کی گھریلو زندگی کے متعلق جن لوگوں کا تصوّر یہ ہے، ان کا تصور نہایت غلط ہے۔ آپؐ کی باہر کی زندگی کی طرح آپؐ کی گھر کی زندگی بھی ان تمام کیفیات سے معمور اور پُر رونق تھی، جس سے

انسانی زندگی کو معمور اور پُر رونق ہونا چاہیے۔ البتہ ان میں افراط و تفریط کی بے اعتدالیاں یا عیش دنیا کی خود فراموشیاں نہیں تھیں۔ آپؐ سوتے بھی تھے، جاگتے بھی تھے۔ آپؐ کھاتے بھی تھے اور بھوکے بھی رہتے تھے۔ آپؐ خوش بھی رہتے تھے اور ناخوش بھی ہوتے تھے۔ آپؐ پیار بھی کرتے تھے اور سرزنش بھی فرماتے تھے۔ غرض زندگی کے جتنے پہلو ہو سکتے ہیں، آپؐ کی گھریلو زندگی میں بھی وہ سارے پہلو پائے جاتے تھے۔ بس دُوسروں کی زندگی سے اگر کوئی فرق تھا، تو جیسا کہ عرض کیا گیا یہ فرق تھا کہ زندگی ایک مثالی زندگی تھی۔ اس وجہ سے اس میں کوئی شے نہ اپنے فطری حدود سے آگے بڑھی ہوئی تھی اور نہ اس سے پیچھے ہٹی ہوئی تھی۔ اگر کوئی چیز ذرا بھی آگے پیچھے ہٹتی تو ہمیشہ عالم الغیب کی طرف سے اس کی اصلاح کر دی جاتی۔

آپؐ اپنی ازواج پر حد درجہ شفقت فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات آپؐ ان کی دلداری کے خیال سے کوئی ایسی چیز کھانی چھوڑ دیتے جو خود آپؐ کو مرغوب ہوتی۔ لیکن آپؐ کی ازواج میں سے کسی کے مذاق کے خلاف ہوتی۔ آپؐ کی یہ شفقت و دلداری اللہ تعالیٰ نے پسند فرمائی۔ لیکن ساتھ ہی اس امر سے آگاہ فرمایا کہ یہ چیز اس حد تک نہیں بڑھنی چاہیے کہ اس کے سبب سے کوئی جائز چیز ناجائز بن جائے۔ آپؐ اپنی ازواجِ مطہرات پر حد درجہ اعتماد فرماتے تھے۔ ان کو اپنے رازوں میں شریک کرتے تھے۔ اس لیے کہ اگر بیوی محرم راز نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن اگر بیویوں کی طرف سے ان رازوں کی حفاظت میں کوئی کوتاہی ہوتی، تو اس پر آپؐ ان کو سرزنش بھی فرماتے۔ کیونکہ جس طرح شوہر کے لیے یہ بات پسندیدہ ہے کہ وہ اپنی بیوی پر اعتماد کرے، اسی طرح بیوی کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے شوہر کے رازوں کی امین بنے اور اس میں کوئی خیانت نہ کرے۔

آپؐ اپنے بیوی بچوں کو سرزنش بھی فرماتے تھے لیکن سرزنش کرنے کے معاملہ میں بھی حضورؐ کا ایک خاص انداز تھا۔ آپؐ اگر کسی بات پر سرزنش فرماتے تو اس طرح نہیں کہ جس کو سرزنش کی، اس کے لتے لے ڈالے، بلکہ اس طرح کہ مخاطب بات سمجھ بھی جائے اور اس پر کچھ زیادہ گراں بھی نہ گزرے۔ آپؐ کی ازواج کے باہمی تعلقات (معمولی فطری نسوانی جذبات کے وقتی اظہار کے سوا) نہایت خوشگوار تھے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے راز کی باتیں بھی ایک دوسرے پر ظاہر کر دیا کرتی تھیں۔ اس چیز پر بھی حضورؐ نگاہ رکھتے تھے کہ نہ تو غیر معمولی اعتماد کسی بے راہ روی میں مبتلا کرے اور نہ بلا وجہ سے بے اعتمادی کسی خرابی کا باعث بنے۔ حضورؐ کی ازواج کبھی کبھی خود حضورؐ کے مقابل میں بھی اپنی خودداری کا اظہار کرتی تھیں اور حضورؐ اس کو بھی پسند فرماتے تھے، بشرطیکہ یہ اپنی جائز حدود سے آگے نہ بڑھے۔

زندگی کے یہ سارے نشیب و فراز، جو حضورؐ کی گھریلو زندگی میں موجود تھے، ایک ایسی زندگی کا نقشہ پیش کرتے ہیں، جس کو انسانی زندگی کا بہترین مظہر کہا جا سکتا ہے۔ ہم یہاں قرآن مجید کی وہ آیتیں نقل کرتے ہیں، جن میں آپؐ کی گھریلو زندگی کے بعض مخفی گوشوں کی طرف اشارات کیے گئے ہیں۔ اگر آپ ان کی تہ میں اُتر کر غور کریں گے، تو وہ ساری جھلکیاں آپ خود دیکھ لیں گے، جو اُوپر کی سطروں میں نمایاں ہوئی ہیں:

یٰاَیھا النبی لم تحرم ما احل اللہ لك	اے نبی! جو چیز اللہ نے تمہارے لیے جائز
تبتغی مرضات ازواجك واللہ غفور	ٹھہرائی ہے، اس کو اپنی بیویوں کی دلداری کے

رحیم ۔ قد فرض اللہ لکم تحلۃ ایمانکم واللہ مولیکم وھو العلیم الحکیم و اذ اسرّ النّبی الیٰ بعض ازواجہ حدیثاً فلمّا نبّات بہٖ واظھرہُ اللہ علیہ عرف بعضہٗ و اعرض عن بعضٍ فلما نبّاھا بہٖ قالت من انباك ھٰذا قال نبانی العلیم الخبیر ۔ ان تتوبا الی اللہ فقد صغت قلوبکما و ان تظاھرا علیہ فان اللہ ھو مولٰہ وجبریل وصالح المؤمنین والملٰئکۃ بعد ذٰلك ظھیرٌ۔

(تحریم ۱۔۴)

خیال سے اپنے لیے حرام کیوں ٹھہراتے ہو؟ اللہ مغفرت کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے ۔ اللہ نے تمھارے لیے تمھاری خلاف شرع قسموں کا توڑنا فرض ٹھہرایا ہے اور اللہ ہی تمھارا آقا و مولا ہے اور وہ علم و حکمت والا ہے اور جبکہ پیغمبر نے اپنی کسی بیوی سے کوئی راز کی بات کہی تو جب اس بیوی نے وہ بات دوسری بیوی کو بتا دی اور اللہ نے اس امر سے آپ کو آگاہ کر دیا ، تو کچھ حصّہ کا آپ نے ذکر کیا اور کچھ حصہ کو حذف کر دیا تو جب آپ نے ان بیویوں پر ظاہر کیا تو وہ بولیں کہ آپ کو اس چیز سے کس نے آگاہ کیا ؟ آپ نے کہا کہ مجھے خدائے علیم و بصیر نے آگاہ کیا ۔ اگر تم دونوں بیویاں اللہ کی طرف رجوع کرو ، تو یہی تمھارے شایانِ شان ہے کیونکہ تمھارے دل پہلے ہی سے اللہ کی طرف مائل ہیں ۔ اگر تم پیغمبر کے خلاف ایکا کرو گی تو اللہ اس کا مالک ہے اور جبریل اور تمام مسلمان اور ملائکہ اس کے ساتھی ہیں ۔

ان آیات میں جس چیز کی تحریم کا ذکر کیا ہے یا جس راز کی طرف اشارہ ہے ان کے درپے ہونے کی ضرورت نہیں ہے ۔ جو باتیں اللہ تعالیٰ نے راز رکھیں ان کی کھوج کرید کوئی اچھی بات نہیں ہے ۔ بالخصوص نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی ازواج کے درمیان کے کسی راز کو معلوم کرنے کی کوشش کرنا تو ہمارے لیے کسی طرح بھی جائز نہیں ہے ۔ لیکن ان آیات سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کے جو پہلو بالکل نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آرہے ہیں ، انھیں ہمیں ضرور سمجھنا چاہیے ۔ ان سے اس بات کا ثبوت فراہم ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کوئی بے رنگ ، سپاٹ اور بے نشیب و فراز زندگی نہیں تھی بلکہ انسانی فطرت جن پاکیزہ تقاضوں اور جن خوب صورت داعیات سے مرکب ہے ان کی دھوپ چھاؤں یہاں بھی موجود ہے ۔ مثلاً ان آیات کے عمق میں اتر کر غور کیجئے تو مندرجہ ذیل باتیں نہایت واضح طور پر آپ کے سامنے آئیں گی :

ایک یہ کہ نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم جائز حدود کے اندر اپنی ازواج کی دلداری فرماتے تھے ۔ ان کے مذاق کا لحاظ رکھتے تھے اور ان کے جو شوق بے ضرر ہوتے تھے حتی الامکان وہ پورے کر دیتے ۔

دوسری یہ کہ آپؐ کی بیویاں آپؐ کی شریکِ رنج و راحت تھیں۔ آپؐ ان سے ہر طرح کی باتیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آپؐ ان کو اپنے رازوں کا امین بھی بناتے تھے۔

تیسری یہ کہ آپؐ کی بیویوں کے آپس کے تعلقات نہایت محبّت اور اخلاص کے تھے۔ اگرچہ کبھی کبھی بتقاضائے فطرتِ انسانی ان میں سوکنوں کے سے جذبات بھی ابھر آتے تھے، لیکن یہ عام حالت نہیں تھی۔ عام حالت اس قدر اعتماد و محبت کی تھی کہ ایک دوسرے کو شوہر کے راز سے بھی آگاہ کر دیتی تھیں، حالانکہ سوکنوں میں یہ اخلاق بہت کم پایا جاتا ہے۔

چوتھی یہ کہ آپؐ کی ازواج کو اپنے گھروں میں جائز حد تک اپنی خودداری کے اظہار کا پورا پورا موقع حاصل تھا، یہاں تک کہ کبھی کبھی وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایکا بھی کر لیتی تھیں، چونکہ یہ چیز محض بر بنائے محبّت و اعتماد ہوتی تھی، اس وجہ سے اس کو ہمیشہ حضورؐ نے گوارا فرمایا۔ صرف اس وقت اس سے اللہ تعالیٰ نے ان کو روکا جب یہ اپنی فطری حدود سے بڑھتی نظر آئیں۔

حضورؐ کی گھریلو زندگی کی یہ جھلکیاں ہمیں قرآن مجید میں نظر آتی ہیں۔ اگر اس کو ہم سیرت کی کتابوں میں دیکھیں تو وہاں ہر پہلو سے متعلق ہمیں پوری تفصیلات ملتی ہیں۔ لیکن ان تفصیلات کے لیے اس مضمون میں گنجائش نہیں ہے۔ اس وجہ سے ہم زاد المعاد کی مندرجہ ذیل سطروں پر قناعت کرتے ہیں۔ علامہ ابنِ قیمؒ لکھتے ہیں:

> "نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواجِ مطہرات کے ساتھ نہایت محبت اور حُسنِ سلوک کا معاملہ کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کے پاس انصار کی لڑکیاں جمع ہو جاتیں اور آپؐ ان کو ان کے ساتھ کھیلنے کے لیے چھوڑ دیتے۔ اگر وہ کسی ایسی بات کی خواہش کرتیں جس میں کوئی شرعی قباحت نہ ہوتی تو آپؐ انؓ کی خواہش پوری کر دیتے۔ وہؓ جس برتن سے پانی پیتیں آپؐ بھی اس برتن سے اُن کے منہ لگانے کی جگہ منہ لگا کر پانی پی لیتے۔ جس ہڈی کو وہ چوستیں اُس ہڈی کو آپؐ بھی لے کر چُوستے۔ ایک مرتبہ اہلِ حبشہ مسجدِ نبویؐ میں اپنے کرتب دکھا رہے تھے آپؐ نے حضرت عائشہؓ کے لیے اس کا موقع پیدا فرمایا کہ وہ آپؐ کے کندھے کی اوٹ سے ان کے کرتب دیکھ لیں۔ دو مرتبہ آپؐ سفر کے موقع پر ان کے ساتھ دوڑے بھی۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ تم میں سب سے اچھا وُہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ سب سے اچھا ہو، اور میں اپنے گھر والوں کے ساتھ سب سے اچھا سلوک کرنے والا ہوں۔ نمازِ عصر پڑھ کر آپؐ کا معمول یہ تھا کہ آپؐ تمام ازواج کے ہاں تشریف لے جاتے اور انُ کی خیر خیریت دریافت فرماتے۔ پھر شب میں جس کی باری ہوتی ان کے یہاں قیام فرماتے۔"
>
> (زاد المعاد، ج ۱، ص ۳۸)

محاسبہ

لیکن اس تمام اعتماد و محبّت کے باوجود حضورؐ اپنے اہلِ بیت کے محاسبہ سے کبھی غافل نہیں ہوتے تھے۔ ایک طرف

شفقت و مہربانی کا یہ عالم تھا کہ آپؐ کے خادمِ خاص حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دس سال مسلسل خدمت کی ۔ دُوسری روایت میں نو سال کے الفاظ ہیں ۔ لیکن حضورؐ نے میری کسی بات پر اُف تک نہیں کیا ۔ لیکن دوسری طرف محاسبہ کا یہ اہتمام تھا کہ دینی معاملات میں اگر ادنیٰ کوتاہی بھی کسی سے صادر ہوتی ، تو ناممکن تھا کہ وہ آپؐ کی گرفت سے بچ سکے ۔ اُمہات المومنینؓ کی یہ شہادت ہے کہ حضورؐ اپنے ذاتی معاملات میں کسی سے باز پرس نہیں فرماتے تھے ۔ لیکن خدا اور دین کے معاملہ میں ہر کوتاہی پر ضرور باز پرس فرماتے اور اس احتساب سے کوئی محبوب سے محبوب شخصیت بھی نہیں بچ سکتی تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے زیادہ آپؐ کو اور کون محبوب ہو سکتا تھا ؟ ایک مرتبہ ان کی زبان سے حضرت صفیہؓ کے بارے میں یہ الفاظ نکل گئے کہ :

حسبك من صفیه كذا كذا -

(صفیہؓ میں یہ عیب کیا کم ہے کہ ان کا قد چھوٹا ہے)

یہ بات ان کی زبان سے نکلنی تھی کہ آپؐ نے فوراً ان کو تنبیہ فرمائی ، اور جن الفاظ میں فرمائی ذرا ان کے تیور ملاحظہ ہوں :

" عائشہ ! تم نے ایسی بات زبان سے نکال دی ہے کہ اگر وہ سمندر میں بھی ملا دی جائے تو اس کی کڑواہٹ اس کو بھی تلخ کر کے رکھ دے ۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ محاسبہ بھی درحقیقت آپؐ کی محبت ہی کا ایک پہلو تھا ۔ جو لوگ اپنے گھر والوں سے محض مادی قسم کی محبت رکھتے ہیں ، وہ اپنے ذاتی عیش و آرام سے تعلق رکھنے والی باتوں پر تو بڑے سخت گیر اور تنک مزاج ہوتے ہیں ۔ ممکن نہیں ہے کہ کوئی ادنیٰ کوتاہی بھی کسی سے سرزد ہو جائے اور وہ اس کو نظر انداز کر جائیں ۔ لیکن خدا اور شریعت کے معاملات میں وُہ بڑے روادار اور فیاض ہوتے ہیں ۔ بیوی بچوں میں سے جس کا جی چاہے ، اپنی آخرت کی بربادی کے لیے جو چاہے کر گزرے ، انھیں کبھی ان کو ٹوکنے کی توفیق نہیں ہوگی ۔ حالانکہ حقیقی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ان کوتاہیوں کو تو نظر انداز کریں جو ان کی اپنی ذات کے معاملہ میں ہوں اور ان باتوں پر گرفت کریں ، جن کا تعلق خود ان کی اپنی آخرت سے ہو ۔ حضورؐ کا طریقہ یہی تھا ۔ آپؐ اپنے ذاتی آرام سے زیادہ اس بات کے لیے فکر مند رہتے کہ گھر والے اپنی آخرت کی ذمہ داریوں کی طرف سے غافل نہ ہونے پائیں ۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کا مرتبہ اللہ تعالیٰ نے جتنا اونچا بنایا تھا اُسی اعتبار سے ان کی ذمہ داریاں بھی بھاری تھیں ۔ دوسروں کے مقابل میں ان کا اجر بھی دُگنا تھا اور اگر ان سے کوئی جُرم سرزد ہو تو اس کی سزا بھی دُگنی تھی ۔

يٰنسآء النبي من يأت منكن بفاحشة	اے پیغمبر کی بیویو ! جو تم میں سے کسی کھلی ہوئی
مبينة يضاعف لها العذاب ضعفين	برائی کی مرتکب ہوگی ، تو اس کو دوہری سزا
وكان ذالك على الله يسيرا - ومن	سنادی جائے گی اور یہ اللہ کے لیے سہل بات ہے
يقنت منكن لله ورسوله وتعمل صالحاً	اور جو تم میں سے اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری
نؤتها اجرها مرتين واعتدنا لها	کرتی رہیں گی اور بھلے کام کرتی رہیں گی ، ہم ان کو

رزقاً کریما۔ (احزاب ۳۰-۳۱) ان کا اجر بھی دوہرا دیں گے اور ان کے لیے ہم نے رزق کریم تیار کر رکھا ہے۔

حضورؐ اپنے اہل بیت کی ان ذمہ داریوں کے احساس سے ہمیشہ گرانبار رہتے تھے اور ہر وقت ان کو دنیا کے بجائے آخرت کی کامیابیوں کے لیے اُبھارتے رہتے۔ آپؐ جب شب کی نمازوں کے لیے اُٹھتے تو آپؐ کی یہ خواہش ہوتی کہ آپؐ کی بیویاں بھی اس سعادت میں حصہ لیں ——— اور بتاتے کہ اپنی آخرت کے لیے جو کچھ کر سکتی ہو، کر لو۔ میں وہاں تمھارے کچھ کام نہ آ سکوں گا۔

نبی اکرمؐ بحیثیت داعی الی الحق

پروفیسر خورشید احمد

انسان بنیادی طور پر دو ایسی ضروریات کا محتاج ہے، جن سے وُہ ایک لمحہ کے لیے بھی صَرفِ نظر نہیں کر سکتا۔ ایک طرف اسے ان اشیاء و وسائل کی ضرورت درپیش ہے، جو اس کی مادی احتیاجات کو پُورا کریں، جن کے ذریعے وُہ اپنے جسم اور رُوح کے رشتے کو قایم و استوار کرے اور بقائے حیات کے مادی تقاضوں کو پُورا کرے۔ دُوسری طرف وہ اس ہدایت اور رہنمائی کا محتاج ہے، جس کی روشنی میں وہ اپنی اخلاقی، اجتماعی اور تمدنی زندگی کی تشکیل صحت مند بنیادوں پر کر سکے اور اس طرح انسانیت کے حقیقی مقاصد کی بوجہ احسن تکمیل کر سکے۔

اللہ تعالیٰ کی ربوبیت عامہ کا تقاضا ہے کہ وُہ انسان کی ان دونوں ضرورتوں کو پُورا کرے۔ پہلی ضرورت کو پُورا کرنے کے لیے اس نے زمین و آسمان میں وسائلِ معیشت کا ایک نہ ختم ہونے والا خزانہ ودیعت کر دیا ہے اور انسان ان کے وسائل کے ذریعے اپنی مادی ضرورتوں کو پُورا کر سکتا ہے، پوری کائنات انسان کے لیے اپنا دامن پھیلائے ہُوئے ہے اور اپنے سینے سے وہ وسائل اگل رہی ہے جو انسانیت کی بے شمار اور ہر آن بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو بحسن وخوبی پُورا کر رہے ہیں: ؎

دما دم رواں ہے یم زندگی
ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی

انسان کی دُوسری بنیادی ضرورت کو پُورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت اور اپنے نبی مبعوث فرمائے تاکہ وہ انسان کو زندگی کی حقیقت سے روشناس کرائیں۔ انھیں زندگی کے معنی اور اس کے مقاصد سے آشنا کریں۔ انھیں جینے کے طریقے سکھائیں اور ان اصول تمدن کی تعلیم دیں، جو زندگی کو اس کے اصل مقاصد سے ہمکنار کر دیں اور خدا کی زمین پر ایک صحت مند نظام قایم کریں، جس میں زمین اپنی نعمتیں اگل دے اور آسمان اپنی برکتیں نازل کرنے لگے۔

انبیاءؑ کی بعثت کا اصل مقصد یہ ہے کہ وُہ خدا اور بندے کے تعلق کو توحید، رسالت اور آخرت کے عقاید کی بنیادوں پر استوار کرائیں اور دعوتِ دین اور اجتماعی جدوجہد کے ذریعے تاریخ کی رَو کو موڑ دیں اور الہامی ہدایت کی روشنی میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تعمیر کریں۔ سورہ الحدید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لقد ارسلنا رسلنا بالبیّنات و انزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط۔ (حدید۔ ۲۵)	ہم نے رسول واضح نشانیاں دے کر بھیجے اور ان کے ساتھ قرآن (یعنی قانونِ حیات) اور میزانِ عدل اتاری تاکہ انسانوں پر انصاف قایم کریں۔

سورہ الصف میں رب السمٰوات والارض کا ارشاد ہے:

هو الذی ارسل رسوله بالهدٰی و دین الحق لیظهره علی الدین کلّه۔ (صف - ۹)

وہی ہے (ذات باری تعالیٰ) جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو تمام نظامہائے زندگی پر غالب کر دے۔

یہ ہے انبیاء کا مشن اور یہی وجہ ہے کہ نبی کی جو حیثیت اس کی تمام حیثیتوں سے نمایاں و ممتاز ہے، وہ داعی الی الحق کی حیثیت ہے۔ اسلام کا اصل مقصد انسانی زندگی کو ایک خاص نہج پر چلانا ہے۔ اسلام کوئی پوجا پاٹ کا جامد نظام نہیں بلکہ ایک زندہ اور متحرک تحریکِ فکر و عمل ہے۔ جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو ہدایت الٰہی کا پابند بناتی ہے۔ اسلام ایک دعوت ہے، جو انسانوں کو خدا کے دین کی طرف بلاتی اور ان کی زندگیوں کو نورِ الٰہی سے منور کرتی ہے۔ اسلام ایک مکمل دین، ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، جو زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے اور اس کی تمام وسعتوں پر حاکمیتِ الٰہی قایم کرنے کا دعویدار ہے۔ انبیاء وہ برگزیدہ ہستیاں ہیں، جو اس دعوت کے داعی اور اس تحریک کے قائدین ہیں اور جن کی رہنمائی میں یہ اصلاحی جد و جہد برپا ہوئی۔ اور جس سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔

قرآن پاک آپؐ کی بعثت کا مقصد اس چیز کو قرار دیتا ہے:

هو الذی بعث فی الاُمّیّٖن رسولاً منهم یتلوا علیهم اٰیاته و یزکیهم و یعلمهم الکتاب و الحکمة و ان کانوا من قبل لفی ضلٰلٍ مُّبِیْنٍ۔ (جمعہ - ۲)

وہی تو ہے جس نے ان پڑھوں میں انھی میں سے (یعنی حضرت محمدؐ کو) پیغمبر بنا کر بھیجا، جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتے، ان کا تزکیہ کرتے اور خدا کی کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں اور اس سے پہلے تو یہ صریح گمراہی میں تھے۔

یٰاَیها الرسول بلّغ ما اُنزل الیك من ربك۔ (مائدہ - ۶۷)

اے رسولؐ! جو جو کچھ تم پر تمھارے رب کی جانب سے اتارا گیا ہے، اس کی تبلیغ کرو۔

فلذلك فادعُ و استقم کما اُمرت۔ (شوریٰ - ۱۴)

پس اسی راہ کی دعوت دو اور اس پر استقامت کے ساتھ جمے رہو جس طرح کہ تمھیں حکم دیا گیا ہے۔

ان آیات ربانی سے معلوم ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بنیادی حیثیت داعی کی حیثیت ہے۔ آپؐ کا اصل مشن یہ تھا کہ خدا کی ہدایت لوگوں تک پہنچا دیں، انھیں خدا کی کتاب اور حکمت و دانش کی تعلیم دیں اور انھیں دعوت دیں کہ وہ دین کو اپنی پوری زندگی پر غالب کر دیں۔ پھر جو لوگ اس دعوت پر لبیک کہیں، انھیں ایک تحریک اور ایک اُمت میں منظم کریں، ان کے اخلاق کا تزکیہ کریں، ان میں کردار کے جوہر پیدا کریں اور اجتماعی جد و جہد کے ذریعے اپنی قیادت و رہنمائی میں وہ تہذیب و تمدن قایم کریں، جو اسلام قایم کرنا چاہتا ہے۔

اسلام فکر و نظر اور علم و عمل میں ایک ہمہ گیر انقلاب کا داعی ہے۔ وہ انسان کو غیر اللہ کی ہر غلامی سے نجات دلا کر اس کی زندگی کو خدا کے لیے خاص کرنا چاہتا ہے۔ اس کا پیغام یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ پر، خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، سماجی ہو یا سیاسی، معاشی ہو یا معاشرتی، قومی ہو یا بین الاقوامی، خدا کی حاکمیت قایم کرو۔ ہر اطاعت پر خدا کی اطاعت اور ہر قانون پر خدا کا قانون مقدم ہے: ؎

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت حاکمیتِ الٰہی کی دعوت تھی اور آپؐ کی سیرتِ پاک کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ آپؐ نے دعوتِ اسلامی کے کام کو باقی تمام کاموں پر مقدم رکھا اور ہر دور اور ہر حالت میں اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ہمہ تن مصروف رہے۔ آپؐ اوّل بھی داعی تھے اور آخر بھی داعی اور صرف داعی الی اللہ۔

آیئے آپؐ کی دعوتی زندگی کے چند اہم پہلوؤں کا مطالعہ کریں تاکہ ہم اپنی ذمہ داریوں کو آپؐ کے اُسوۂ حسنہ کی روشنی میں ادا کرنے کی کوشش کر سکیں۔ اس لیے کہ داعی الی الحق کی جو ذمہ داری آپؐ کے مبارک شانوں پر تھی، اب وہ پوری اُمتِ مسلمہ کے کندھوں پر ہے:

لیکون الرسول شهیدًا علیکم و تکونوا شهداء علی الناس۔ (الحج - ۷۸)	تاکہ پیغمبر تمھارے بارے میں شاہد ہوں اور تم لوگوں کے مقابلہ میں گواہ ہو۔

یعنی جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حق کی شہادت اور گواہی دی، اب اسی طرح پوری اُمت کو تمام انسانیت کے سامنے اس حق کی شہادت دینا ہے:

۱۔ آپؐ کی دعوتی زندگی کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ جو تعلیم آپؐ نے دنیا کو دی، اس پر سب سے پہلے ایمان لانے والے آپ خود تھے۔

اٰمن الرسول بما اُنزل الیه من ربه والمؤمنون۔ (بقرہ - ۲۸۵)	رسول اس پر ایمان لائے، جو رب کی طرف سے ان پر نازل کیا گیا اور تمام مومن بھی۔

آپؐ اس ہدایت پر سب سے پہلے ایمان لانے والے اور اپنی زندگی کو سب سے پہلے اس کے تابع کرنے والے تھے۔

انا اوّل المؤمنین، میں سب سے پہلا ایمان لانے والا ہوں۔ انا اوّل المسلمین، میں سب سے پہلا مسلمان ہوں۔

جو دعوت آپؐ نے دی، آپ کی پوری زندگی اس کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ بقول حضرت عائشہ صدیقہ آپؐ کی زندگی سراپا قرآن تھی۔ دنیا میں بے شمار مُصلح اور فلسفی آئے، جو گفتار کے غازی تو ضرور تھے مگر کردار کے غازی نہ تھے۔ جو تعلیم انھوں نے دی، وہ خود اس پر عامل نہ تھے مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے کہ آپؐ نے اپنی دعوت کے ہر پہلو پر خود عمل کر کے دکھا دیا اور انسانیت کے لیے بہترین نمونہ پیش فرمایا تاکہ لوگ صرف آپ کے ارشادات ہی سے ہدایت حاصل نہ کریں بلکہ آپؐ کے افعال و اعمال کی بھی پیروی

کریں اور زندگی کا کوئی گوشہ اور قلب و دماغ کا کوئی ریشہ ایسا باقی نہ رہے، جس پر آپؐ کے سیرت و کردار کی گہری چھاپ موجود نہ ہو۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔ (احزاب - ۲۱)

۲۔ دوسری بنیادی چیز یہ ہے کہ آپؐ نے جزوی اصلاح کے مقابلے میں کلی انقلاب کی جدوجہد کی۔ آپ کا مقصد چند جزئیات میں تبدیلی پیدا نہ کرنا تھا بلکہ پوری زندگی کو ہدایتِ الٰہی کے مطابق استوار کرنا تھا۔ آپ نے لوگوں کے خیالات اور نظریات کی اصلاح کی اور انھیں ایک ایمان اور جوشِ زندگی بخشا۔ آپؐ نے ان کے اخلاق و کردار کو سنوارا اور ایک نیا انسان پیدا کیا۔ آپؐ نے تمدن و معاشرت کی اصلاح فرمائی اور ایک نئی سوسائٹی کی تعمیر کی۔ آپؐ نے طاغوت کو زندگی کے ہر میدان میں شکستِ فاش دی اور پھر وہاں حاکمیتِ الٰہی کے تخت بچھائے۔ یہ ایک ہمہ گیر انقلاب تھا اور انسانی تاریخ کا وہ واحد انقلاب ہے جس نے انسانیت کی پوری زندگی کی اصلاح و تعمیر کی۔

پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ حضور سرورِ کائناتؐ کو دین کی فتح و کامرانی اور اس کی سربلندی پر ہمیشہ گہرا اور غیر متزلزل یقین رہا۔ عین اُن پُرآشوب حالات میں جب مسلمانوں کی کشتی مخالفتوں کے طوفان میں گھری ہوئی تھی اور دور دور ساحل کا کہیں نام و نشان نہ ملتا تھا اور روشنی کی کوئی رمق موجود نہ تھی، اس وقت بھی قطعاً مایوس نہ ہُوئے۔

مکی زندگی کا مشہور واقعہ ہے کہ مسلمان قریش کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہُوئے تھے، ہر مسلمان کی جان خطرہ میں تھی۔ صبح ہوتی تھی، شام کا بھروسا نہ تھا اور شام ہوتی تھی تو صبح کا یقین نہ تھا۔ بظاہر اسلام کا کوئی مستقبل نظر نہ آرہا تھا اور جو دن گزرتا تھا، غنیمت معلوم ہوتا تھا۔ ایسی حالت میں ایک مظلوم مسلمان حضرت خبابؓ آپؐ کے پاس آئے۔ آپؐ بیت اللہ کے سامنے بیٹھے تھے۔ حضرت خبابؓ نے کہا، یا رسول اللہؐ! اب تو پانی سر سے گزرا جا رہا ہے، آپ ہمارے لیے دعا کیجیے۔

آنحضرتؐ کا چہرہ سُرخ ہوگیا، آپؐ نے فرمایا: بس خبابؓ! گھبرا گئے۔ پہلی اُمتوں میں تو یہ ہُوا کہ مومن کو گڑھا کھود کر گاڑ دیا گیا اور سر پر آرہ چلایا گیا، یہاں تک کہ اس کے بدن کے دو ٹکڑے ہوکر گر گئے اور لوہے کی کنگھیوں سے ان کا گوشت ہڈیوں سے جُدا کیا گیا مگر اس کے پائے استقلال میں کوئی لغزش نہ آئی۔ خدا کی قسم، اللہ اپنے دین کو مکمل کرے گا۔ یہاں تک کہ (اس دین کی عمومیت اور غلبہ) کا یہ حال ہوگا کہ سوار صنعا سے حضرموت تک سیکڑوں میل کی مسافت طے کرتا چلا جائے گا اور اس کو اللہ کے سوا کسی کا کھٹکا نہ ہوگا، سوائے اس کے کہ اس کو بھیڑیے سے خطرہ ہو کہ وہ اس کی بکریوں پر حملہ کرے۔ لیکن تم جلدی بہت کرتے ہو۔

یہ واقعہ کئی حیثیت سے بڑا اہم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ داعی کو اپنی دعوت پر کتنا اعتماد ہے کہ بڑی سے بڑی مشکل اور آزمایش کو بھی وہ خاطر میں نہیں لاتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کی عمومیت اور غلبہ کا مطلب اپنے تمام تضمنات کے ساتھ اس کے سامنے اس وقت بھی تھا، جب غلبہ و حکمرانی بظاہر ناممکن نظر آتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ داعی استقامت کے اس مقام پر ہوتا ہے، جہاں سے کوئی چیز اس کے ارادہ کو متزلزل نہیں کرسکتی۔

۳۔ تیسری چیز ہمیں یہ نظر آتی ہے کہ آپ نے بعثت سے لے کر اپنے آخری سانس تک دین کی دعوت کو پھیلانے کی کوشش اس انہماک اور تندہی سے کی کہ اس کی نظیر تاریخ انسانی پیش کرنے سے قاصر ہے۔ آپؐ کا ہر لمحہ اسی فکر میں بسر ہوتا تھا کہ کسی طرح خدا کا یہ پیغام خدا کے بندوں تک پہنچائیں اور ان کو جہنم کی آگ اور دنیا کے خسران سے بچائیں۔ یہ فکر آپ کو اس درجہ دامنگیر رہتی تھی کہ ایک مرتبہ آپؐ

دن بھر کی تبلیغی جدوجہد اور دشمنوں کی اذیت رسانی سے چُور ہو کر رات کو تھکے ہارے گھر واپس آئے۔ بدن بخار سے تپ رہا تھا اور آپؐ چند منٹ کے لیے لیٹ گئے۔ اتنے میں اطلاع ملی کہ مکّہ سے چند میل ایک پہاڑی کے نیچے ایک قافلہ آ کر رُکا ہے۔ یہ سنتے ہی آپ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے تاکہ ان تک خدا کا پیغام پہنچائیں۔ لوگوں نے عرض کیا: "یا رسول اللہؐ! آپ بہت تھکے ہوئے ہیں، قافلہ والوں سے کل صبح مل لیں۔" آپؐ نے فرمایا: "کیا معلوم صبح تک مجھے موت آ جائے یا وہ قافلہ راتوں رات کہیں اور چلا جائے اور اس صورت میں میرا فرض نامکمل رہ جائے۔" دیکھیے دعوتِ اسلامی کے کام کو حضورؐ کتنی اہمیت دیتے ہیں اور فرض کی بجا آوری کو کیا مقام آپ نے دیا۔ فرض شناسی کی یہ مثال ہمارے لیے روشنی کا مینار ہے۔

۴۔ پھر آپؐ کی دعوتی زندگی کا یہ بھی ایک نمایاں پہلو ہے کہ آپ نے ہر مرحلے اور ہر دور کے حالات کے مطابق دعوتِ دین کی راہیں نکالیں اور ہر زمانہ میں نہایت حکمت و دانشمندی کے ساتھ کلمۂ حق کا اظہار کیا اور بالآخر دینِ حق کو قایم کیا۔ بعثت کے فوراً بعد خاموشی کے ساتھ آپ نے اپنی دعوت کا آغاز کر دیا اور قریبی حلقوں میں دین کا پیغام پہنچانا شروع کیا۔ بعثت کے تیسرے سال جب دعوت کی عام اجازت ملی، تو آپ نے تمام قریش کو فاران پر جمع کیا اور اسلام کی دعوت ان تک پہنچائی۔ پھر معززینِ قبیلہ کو خصوصی دعوت دی اور کھانے پر بلا کر ان کو خدا کے کلام سے آگاہ کیا۔ آپؐ ایک ایک قبیلہ، ایک ایک خاندان، ایک ایک گروہ اور ایک ایک فرد تک پہنچے اور ان کو اسلام سے روشناس کرایا۔ نجی گفتگوئیں، مکالمات و مذاکرات، تقریر و وعظ الغرض ہر ممکن طریق سے اسلامی تعلیمات ان کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی اور جب تک دعوت کی راہیں کھلی رہیں، آپؐ برابر حق کی طرف برملا بلاتے رہے اور جب کھُلے بندوں تبلیغ کا امکان نہ رہا تو خاموشی سے نجی ملاقاتوں کے ذریعے اپنے مشن کی تبلیغ کرتے رہے۔

جب آپؐ کو شعب ابی طالب میں محصور کر دیا گیا، تو آپؐ خاموشی کے ساتھ جن جن مقامات پر جا سکتے تھے، اس زمانہ میں بھی ان مقامات پر دعوت پہنچانے سے آپؐ نہ رُکے۔ پھر جب مکّہ میں دعوت کے مزید پھیلانے کا امکان نہ رہا، تو آپ نے مکّہ سے باہر جا کر دعوت و تبلیغ کا کام انجام دیا۔ میلوں اور جلسوں کے موقعوں پر باہر کے قبائل سے ملے۔ طائف کا سفر کیا اور دُوسرے بیرونی قبائل کو اپنی دعوت کی طرف بلایا، حتیٰ کہ بیرونی قبائل میں اس کوشش ہی کے نتیجہ میں اسلامی دعوت کا نیا مرکز مل گیا اور اہلِ مکّہ کی سختی اور ان کا تشدد ذریعہ بنے دینِ حق کے نئے مرکز — مدینۃ الرسول — کے قیام اور اس کے ذریعے بالآخر دعوتِ اسلامی کے غلبہ کا!

پھر مدینہ میں جب قوت و اقتدار اسلام کو حاصل ہو گیا، تو آپ نے ریاست کی تمام طاقتیں دعوتِ اسلامی کے فروغ کے لیے وقف کر دیں۔ ایک طرف مدینہ میں اسلامی ریاست قایم کی اور دُوسری طرف اس ریاست کے ذریعے تمام عرب اور بالآخر پُوری دنیا کو اسلام کی دعوت دی۔

۵۔ پھر آپؐ کی زندگی سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوتِ اسلامی کا لازمی تقاضا ہے کہ ہر کونے اور ہر جہت سے اس کی مخالفت کی جائے اور مخالفت کی نت نئی صورتیں نکالی جائیں۔ آپ کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی گئیں۔ آپؐ کے راستہ میں کانٹے بچھائے گئے۔ آپؐ کو سبّ و شتم کا نشانہ بنایا گیا۔ آپؐ کے متعلق افواہیں پھیلائی گئیں، آپؐ پر پتھر پھینکے گئے۔ آپؐ کو زدوکوب کیا گیا۔ آپؐ کے گلے میں پھندا ڈال کر کھینچا گیا۔ عین عالمِ سجدہ میں آپؐ کی پیٹھ پر اونٹ کی اوجھڑی تک رکھ دی گئی۔ آپؐ کے ساتھیوں کو آگ پر لٹایا گیا، تپتی ریت

پر گھسیٹا گیا، پتھر کی سلوں کے نیچے دبایا گیا اور اتنا مارا گیا کہ وُہ شہید ہو گئے۔ لیکن ہر حال میں آپ ثابت قدم رہے۔ آپ نے دعوتِ اسلامی کا کام جاری رکھا اور راہ کی کوئی مشکل اور مصیبتوں کا کوئی طوفان آپ کی پیش قدمی کو نہ روک سکا۔ اسی طرح کوئی لالچ اور کوئی ترغیب، خواہ وُہ دولت کی ہو یا سرداری کی یا بادشاہت کی، آپ کو اپنے مشن سے ہٹا نہ سکی اور ہر حالت میں آپ نے کہا، تو یہی کہا:

"خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ میں سُورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی رکھ کر کہیں کہ مہر و ماہ کے عوض میں تبلیغِ دین کا کام ترک کر دوں، تو مجھے منظور نہیں۔ اگر اس راہ میں مجھے ہلاکت نظر آئے تب بھی میں پیچھے نہ ہٹوں گا۔ حتیٰ کہ یہ مشن کامیاب ہو یا میں اس میں کام آ جاؤں۔"

یہ تھا داعی کا عزم! اور سچ ہے کہ داعی اگر اپنے مشن میں سچا اور اپنی دُھن کا پکا ہو، تو انھیں مشکلات سے کامیابی کی راہیں پھُوٹیں گی اور دینِ حق فاتح و کامران ہوگا۔ جس طرح کلی کی موت کے بعد ہی پھول خندہ زن ہو سکتا ہے اور جس طرح آگ کے جلے بغیر روشنی اور حرارت ممکن نہیں، اسی طرح آزمائش اور ابتلا کے بغیر دعوتِ حق کی کامیابی کا امکان نہیں۔ فتحِ مکہ کی منزل، شعب ابی طالب کی گرفتاری، طائف کی ہزیمت اور بدر و اُحد کی خوں پاشی کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے اور یہی فطرت کا قانون ہے، و لن تجد لسنت اللہ تبدیلاً اور تم خدا کے طریقے میں تبدیلی نہ پاؤ گے۔

عطیاتِ محمدیؐ

سید ہاشمی فرید آبادی

تاریخِ مذہب کا مطالعہ کرنے والے یہ مشاہدہ کیے بغیر نہ رہ سکیں گے کہ پیغمبر اسلام (علیہ التحیاۃ والسلام) نے تمام انبیائے سلف کی تصدیق و تعظیم کو شرطِ ایمان قرار دیا۔ خاص طور پر حضرت مسیحؑ اور ان کی والدہ ماجدہ کی بڑی ستائش فرمائی۔ قرآن مجید میں حضرت ممدوح کی خرقِ عادت، ولادت، پیدا ہوتے ہی کلام کرنا، پھر مُردوں کو جِلا دینے تک کے متعدد معجزات بہ تکرار گنائے گئے (آل عمران، ع ۵۔ سورۂ مریم، ع ۲) اور قیامت کے ایک منظر میں بھی ان کا عقیدۂ تثلیث سے تبرّی کرنا، رحمتِ الٰہی سے اپنی امت کو بخشوانے کی التجا نہایت پُر اثر الفاظ میں بیان کی (المائدہ، ع ۱۲) حضرت مریمؑ کو نہ صرف ہر قسم کی تہمت سے پاک ثابت کیا، بلکہ تمام دُنیا کی عورتوں (نساء العالمین) میں برگزیدہ ٹھہرایا (آل عمران، ع ۵)۔ اس درجہ واضح اور موثر حمایت کے باوجود عیسائی دنیا ہی پیغمبر اسلام (علیہ التحیاۃ والسلام) سے نہ صرف ناراض بلکہ سخت عداوت میں سرگرم پائی جاتی ہے اور آج تک گھرے تعصب و عناد کا اظہار کر رہی ہے۔ زیادہ حیرت انگیز اور اب ان کے جانشین، ولایت ہائے متحدہ امریکہ والوں پر ہوتی ہے جن کو مسلمانوں سے کوئی آزار یا قومی نقصان کبھی نہیں پہنچا، مگر پھر بھی وہ دوسری عیسائی قوموں سے کچھ زیادہ ہی اسلام دشمنی کے مرض میں مبتلا نظر آتے ہیں۔

ان تعصبات کے بعض تاریخی اور نفسی اسباب سے اہلِ علم آگہی رکھتے ہیں۔ اس لیے یہاں ان کی تصریح کا موقع نہیں۔ البتہ یہ اور جتا دینا مناسب ہوگا کہ گزشتہ دو صدیوں میں بہت سے الزام جو پادریوں نے اسلام پر لگائے اور عیسائی یورپ میں پھیلائے تھے، سراسر جھوٹے ثابت ہو چکے ہیں۔ اسلام کی آسمانی کتاب قرآن مجید اب قطعی صحت کے ساتھ دنیا کے سامنے کھلی ہوئی موجود ہے۔ اکثر زبانوں میں اس کے ترجمے اور خود مغربی مستشرقین میں اس کے عربی متن کی نسبت کسی شک و شبہ کی گنجایش نہیں رہی۔

یہ اس عجیب دعویٰ انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون کی روشن تصدیق ہے، جو ساڑھے تیرہ سو برس پہلے ایسے ملک اور زمانے میں کیا گیا تھا، جہاں لکھنے کا سامان میسر نہ تھا اور لکھنے والے بھی معدودے چند ہی تھے۔ پھر یہ واقعہ کہ ہر دور میں ایسی قوموں کے ہزاروں افراد عربی جیسی سخت نحوی زبان سے مطلق ناواقف ایک غیر منظوم، خاصی بڑی کتاب کو زیر زبر میں کامل صحت کے ساتھ حفظ کرتے رہے۔ قرآن کا محض معجزہ ہی نہیں بلکہ صریحی دلیل بھی ہے کہ یہ اسی مصنف کا کلام ہو سکتا ہے، جس نے انسان کے حافظہ اور نطق کو اس کلام کے مناسب و مطابق تخلیق کیا۔

کہتے ہیں کہ صرف محمد مارماڈیوک پکتھال مرحوم کا انگریزی ترجمہ قرآن لاکھوں کی تعداد میں مسیحی دنیا میں نشر ہو رہا ہے۔ غرض یہ کہ عقاید، عبادات، اخلاق وغیرہ کی اصل قرآنی تعلیم آج اس طرح محفوظ و مبرہن ہمارے سامنے ہے کہ اور کسی بڑے مذہب کی اصل

تعلیم اس طرح صحیح سلامت نہیں رہی۔ یہی دعویٰ بانیٔ مذہب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرتِ شریف کی صادق اور " اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ " کی بدیہی تفسیر ہے۔ البتہ اس کتاب و سنت کے معارف و معانی جاننے کے لیے ہمیں عربی زبان کے اساتذہ اور مستند علمائے دین کی طرف ہی رجوع کرنا ہوگا۔

قرآن کا سب سے نمایاں اور تاکیدی پیام توحیدِ الٰہی ہے۔ اس کی قطعیت اور تواتر کی خصوصیت کا غیر مسلم بھی اعتراف کرتے ہیں یہ تعلیم سب وسائل و وسائط کو چھوڑ کر براہِ راست انسان کو خدائے کائنات سے تعلق پیدا کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ قرآن کی یہ پُرہیبت و جلالت آواز اس وقت بلند ہوئی، جب کہ دنیائے معلوم عموماً تثلیث، ثنویت، شرک و بت پرستی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ یہی اہل عرب کا مذہب تھا۔ وہ خالقِ کل کے وجود سے انکار نہیں کرتے تھے، مگر بہت سی غیبی طاقتوں کو بھی انسانی یا دنیاوی معاملات میں کارساز حقیقی مانتے تھے۔ ایک حیّ و قیّوم، حاضر و ناظر، خالق و پروردگار کا تصور جس قوت اور وضاحت سے اسلام نے دنیا کو دیا، کسی انسانی یا الہامی کتاب میں اس کی مثال نہ پہلے تھی، نہ آج تک دیکھی جا سکتی ہے۔

ب۔ محمدیؐ تعلیم کی دوسری خصوصیت مساواتِ انسانی کا وہ عجیب عقیدہ ہے، جس نے ملک و وطن، رنگ و نسب، نسل و قوم، دولت و افلاس کی ساری تفریقوں کو یک قلم کالعدم کر دیا۔ تمام نوع بشر کو ایک باپ کی اولاد اور ایک ہی کنبے کے افراد قرار دیا، صرف اصولی اور اعتقادی طور پر نہیں، بلکہ فی الواقع عملاً حبشی غلاموں کو اشرافِ قریش پر فضیلت کا حقدار بنا دیا۔ (زیدؓ، بلالؓ، طیب المطیب، عمارؓ وغیرہم کی طرف دیکھیے) فلپ حتی اپنی تاریخ عرب (ص ۱۹۲) میں لکھتا ہے کہ بازنطی والیٔ مصر (کاٹرس یعربی مقوقس) یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ شرائطِ صلح کے لیے مسلمانوں کا جو وفد آیا، اس کا رئیس ایک حبشی تھا۔ مملوک اور غلاموں کی بادشاہیاں اسلامی تاریخ کے مشہور ابواب ہیں، جس کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں۔

ج۔ غالباً اس قرآنی حکم کو، کہ یتامیٰ کی املاک کی حفاظت کا بندوبست قوم کا ذمہ ہے (النساء، ع ۱- بنی اسرائیل، ع ۴) ہم اسے انسانی برادری کے تصور پر مبنی کر سکتے ہیں۔ کسی دوسری قوم یا معاشرہ میں ایسا قانون ضروری نہیں سمجھا گیا۔ لاوارث یا مجہول النسب بچوں کی پرورش گاہیں، جو عالمی جنگوں کے بعد یورپ میں بنیں، دوسری نوعیت رکھتی ہیں اور عام شہریوں کے یتیم بچوں کے لیے نہیں ہیں۔

انسانی برادری کا بھی بنیادی تصور اسلامی شریعت میں سود (ربا) کی قطعی حرمت کا باعث ہوا اور اس کے لیے ایسے تہدیدی الفاظ میں ممانعت کی گئی کہ پڑھ کر دل کانپنے لگتا ہے۔ بایں ہمہ مغربی استیلا (اور بظاہر یہودی ساہوکاروں کے اثر) سے مسلمان بھی اس کی زد سے نہ بچ سکے اور معتنم مستثنیات کو چھوڑ کر، ہم میں سے اکثر دانستہ یا نادانستہ اس کے چکر میں گھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسلامی حکومتیں بھی اس کی زد سے باہر نہیں۔ مسلمان تاجر، کارخانہ دار اور اہلِ ثروت (الا ماشاء اللہ) سب ہی سودی کاروبار میں کسی نہ کسی عنوان سہیم و شریک ہیں اور یہ دیکھ کر تو بہت ہی افسوس ہوتا ہے کہ وہ صاحبانِ شریعت، جو پہلے اس کے سخت مخالف تھے، سرمایہ دار بننے کے بعد اس کے موید ہو گئے ہیں اور "تجارتی منافع" اور "فے" وغیرہ کے شرعی حیلوں سے جواز پیدا کر رہے ہیں۔

سرمایہ اندوزی کی جڑ سود ہے۔ میرے علم کے مطابق اشتراکی نظام میں سودی سرمایہ کاری کی اس جڑ پر بھی ضرب لگائی گئی ہے

کوئی تعجب نہیں کہ لادین اشتراکیت میں حرمتِ ربا کے قرآنی اصول پر عمل کیا جا رہا ہو۔ ہر قسم کے سُودی کاروبار میں، بینک کے سُود میت، قباحت ہی قباحت ہے اور اس کے اقتصادی نقصانات کو تو اب بعض مغربی ماہرینِ مالیات بھی تسلیم کر رہے ہیں مگر ساتھ ہی یہ اعتراف بھی کرتے ہیں کہ تہذیب حاضر کے تار و پود میں یہ چیز اس قدر سرایت کر چکی ہے کہ بغیر کسی عظیم مالی انقلاب کے نوعِ انسانی کو اس تسمہ پا سے نجات نہیں مل سکتی۔

د۔ اسلام کے دو اور قانون قمار و مسکرات کی ممانعت ہیں، جن کے نقصانات علم اور تجربے سے برابر آشکارا ہو رہے ہیں۔ لیکن نفس پروری کے دور میں انسانی معاشرہ ان کے سدباب پر تیار نہیں ہوتا۔ ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہ اخلاقی مرض اندر ہی اندر اور بتدریج افراد یا اقوام کی تباہی کا باعث ہوتا ہے۔

مغربی اہلِ قلم کو محمدیؐ تعلیمات میں دو باتیں بہت قابلِ اعتراض معلوم ہوتی رہیں۔ یعنی مذہبی جہاد اور دوسری تعدادِ ازدواج۔ مگر یورپ کی دیوانہ وار گھارین جو محاربات صلیبی کہلاتی ہیں، ان کی گونج گلیڈاسٹن اور رالیس کوتھ کی تقریروں تک میں سُنی گئی۔ ادھر عمرانیات کے بعض مشہور اساتذہ نے جنگ کو "صالح" زندگی کا لازمہ ثابت کیا۔ گزشتہ خوفناک خونریزی اور نسل کشی کی شیطانی تدابیر نے بالواسطہ دکھا دیا کہ وُہ جہاد، جو فی الواقع خدا پرستی اور انسانی حقوق کی حفاظت کے لیے کیا جائے۔ سیلیؔ استاد کی طرح انسان کے حق میں رحمت اور انتہائی قربانی کی تعلیم ہے۔

تعدادِ ازدواج کی طبعی اور طبی ضرورت سے اب کوئی سائنسدان بھی انکار نہیں کر سکتا۔ دینِ فطرت نے اسے جائز قرار دیا اور انیسویں صدی کے یورپ کے جاہل نقالوں کے سوا آج کوئی بھی اس فطری قانون کی تکذیب نہیں کرتا۔ لیکن سب سے عجیب تاریخی حقیقت یہ ہے کہ اسلام دنیا کا پہلا مذہب تھا جس نے عورت کو انسانیت کے حقوق دیے۔ بے شبہ وہ اس کی "نسائیت" کو حجاب و عفت کے ذریعے محفوظ رکھنے میں متشدد ہے اور بقول اقبالؔ زن کو "نازن" بنانے کا روادار نہیں۔ لیکن دو سو برس پہلے تک، دنیا کا کونسا مذہب، فلسفہ یا قانون ہے جس نے عورتوں کو وراثت اور حصولِ علم و دولت کے وہ باقاعدہ شہری حقوق عطا کیے ہوں، جن کی قرآن مجید میں بہ تاکید صراحت فرمائی گئی ہے۔

سرورِ کونینؐ اور سماجی انصاف

کیپٹن محمد جمعہ ماڑگانی

ترجمہ: وحید عثمانی

اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے بنی نوع انسان سمیت ارض وسما میں شامل تمام چیزیں پیدا کیں اور اپنی تمام مخلوقات میں انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیا اور اسے روحانی بصیرت عطا فرمائی تاکہ قدرت اور فطرت کے مظاہر کو سمجھ سکے اور ان کا ادراک حاصل کر سکے۔ اس سلسلہ میں انسان کے سمجھنے کی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خداوند نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم النبیین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم سمیت لاتعداد پیغمبر بھیجے جو آتے اور جاتے رہے ان پیغمبروں کے یکے بعد دیگرے بھیجنے میں خداوند تعالیٰ کا ایک مقصد مسلسل کارفرما رہا اور وہ مقصد یہ تھا کہ بعد میں آنے والا ہر پیغمبر اس کام کو جاری رکھے جو اس کے پیشرو پیغمبر کو خدا کی طرف سے سونپا گیا تھا۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد سرورِ کونین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا گیا اور اگرچہ تمام انسانوں نے اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے تمام پیغمبروں کو قبول نہیں کیا مگر اس کے باوجود مبعوث ہونے والے ہر پیغمبر نے خدا کا پیغام انسانوں تک پہنچانے کا کام برابر جاری رکھا اور جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سارے زمانوں کے لیے آخری نبی بنا کر بھیجا گیا۔ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد یہی کام خلفائے راشدین نے جاری رکھا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم یتیم اور مفلس پیدا ہوئے تھے اور امی تھے مگر آپ کو سارے زمانوں کے سارے انسانوں کے لئے نبی مبعوث کیا گیا آپ نہ تو خدا کا بیٹا تھے اور نہ فرشتے بلکہ ہماری طرح بشری روپ میں تھے۔ آپ انتہائی دیانتدار اور امین تھے۔ آپ ہر قسم کے دنیوی لالچ اور حرص سے بے نیاز تھے۔

آپ کو نہ دولت کی خواہش تھی نہ اقتدار کی ہوس۔ آپ کو اللہ نے اپنے لوگوں کا ہادی اور رہنما بنا کر بھیجا تھا۔ آپ کے دادا عبدالمطلب نے اپنے پوتے کا نام محمدؐ رکھتے ہوئے اپنے مہمانوں سے کہا تھا "میں نے اس بچے کا نام محمدؐ اس لیے رکھا کہ مجھے توقع ہے کہ ایک دن یہ بہت بڑا ثابت ہوگا۔" اپنے اس پوتے کی پیدائش کے وقت عبدالمطلب کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ ان کے دوستوں نے انھیں اس سے زیادہ خوش پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ عبدالمطلب کے دوستوں نے ان سے پوچھا کہ اس بچے کا نام محمد ہی کیوں رکھا گیا اس کا نام عبدالمطلب کے گھرانے کے دوسرے ناموں کی طرح پر کیوں نہیں رکھا گیا۔ اس پر عبدالمطلب نے کہا کہ "یہ نام میں نے نہیں رکھا۔ یہ نام خدا نے رکھا ہے اور وہی اس نام کا دنیا میں بول بولا کرے گا کہ خدا ہی سب کچھ جاننے والا ہے اور وہی بہتر جانتا ہے۔"

پھر ماہ و سال گزرتے گئے۔ آپؐ اب مائی حلیمہ سعدیہؓ کی نگرانی اور رضاعت میں تھے مگر آپ رضاعت کے لئے مائی حلیمہؓ کے پاس آنے والے دوسرے تمام بچوں سے بہت مختلف تھے۔ پھر یہ بچہ کلی کی طرح بڑھ کر پھول بنا۔ بچپن لڑکپن میں ڈھلنے لگا۔ دادا عبدالمطلب بوڑھے ہوتے گئے اور آخرکار اپنی عمر کے ۸۲ ویں سال انتقال کر گئے دادا کے انتقال کے بعد چچا ابوطالب یتیم بھتیجے کے سرپرست ہوئے اب آپ کا عنفوانِ

شباب تھا آپ نے ہوش کی آنکھیں کھولیں تو اپنے ماحول کو لڑائی جھگڑے اور فتنہ و فساد سے معمور پایا۔ یہ جھگڑے قبائل کے اندرونی تنازعات اور قبائلی عصبیتیں تھیں اور وہ ملک جس سے آپؐ کو پیار تھا جہالت اور توہمات کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا اور آپ کے ہم وطن عرب جن میں اگرچہ شجاعت اور بہادری اور جنگجوئی کی خوبیاں تھیں قانون شکن ظالم اور بے رحم تھے اس طرح حضرت محمدؐ کو نبوت سے پہلے زندگی کا جو ماحول ملا وہ سماجی اعتبار سے زمانہ ماقبل تہذیب جیسا تھا بلکہ اکثر صورتوں میں اس سے بھی بدتر۔ ان حالات میں رہتے ہوئے اکثر آپ کو یہ خیال گزرتا تھا کہ میں اس دنیا میں کوئی نئی چیز نہیں لے کر آیا۔ میں اگر کچھ کر سکتا ہوں تو صرف یہی کہ اپنے معاشرے اور ماحول میں پھیلے ہوئے انتشار کو کم کردوں اور پچھلے گزرے ہوئے پیغمبروں کے چھوڑے ہوئے ادھورے کاموں کو پورا کردوں اور نبوت سے پہلے اس کا ثبوت کہ آپؐ ہی پیغمبر اسلام ہوں گے اور سماجی انصاف قائم کریں گے اس واقعہ سے ملتا ہے جب خانہ کعبہ کو منہدم کرکے اس کی دوبارہ تعمیر کا مرحلہ پیش آیا سنگ اسود کو جو اکھاڑا جا چکا تھا خانہ کعبہ کی دیوار میں اپنی اصل جگہ رکھنے کے سوال پر مکہ کے عرب قبائل میں جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوا۔ آخر کار فیصلہ اس پر ہوا کہ جو شخص سب سے پہلے خانہ کعبہ جو اس وقت بہت بڑا بُت کدہ تھا، میں داخل ہوگا وہی اس تنازعہ کو حل کرے گا اور پھر یوں ہوا کہ خانۂ کعبہ میں سب سے پہلے داخل ہونے والے حضرت محمدؐ تھے۔ چنانچہ آپ ہی کو ثالث بننا پڑا۔ آپ نے فیصلہ کیا کہ اس مقدس پتھر کو ایک دری یا بڑی چادر پر رکھا جائے اور ہر قبیلے کا ایک ایک شخص دری یا چادر کے کنارے کو تھام کر اسے اوپر لے جائے۔ اس طرح سنگ اسود دیوار کعبہ میں اس کے اصلی مقام پر نصب کر دیا گیا اور تمام قبائل کے نمائندے آپ کے فیصلے اور حسن تدبر پر مطمئن ہوگئے یہ واقعہ بعثت سے پہلے کا ہے۔

مکہ والوں کا ظالمانہ رویّہ

بعثت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی ہمارے سامنے ہے اس دور کے پندرہ برسوں کے دوران آپ نے ہمیشہ توحید خداوندی کی اشاعت کی اور پورے اعتماد کے ساتھ اپنا سارا وقت توصیف خداوندی کرتے ہوئے گزارا حالانکہ آپ اسلام اور خود اپنی ذات کے خلاف قریش کی سازشوں سے پوری طرح باخبر تھے اور یہ جانتے تھے کہ اہلِ قریش آپ کو قتل کرنے کے منصوبے باندھ رہے ہیں اس دور میں آپ کی تعلیمات پر کان دھرنے والے صرف یثرب کے وہ لوگ تھے جو خانہ کعبہ کی زیارت کے لیے مکہ آئے تھے۔

ہجرت نبوی

اس زمانے کا ذکر ہے۔ یہ ماہ جولائی کی ایک گرم رات تھی اور مکہ کے ایک مقام (دارالندوہ) میں اہلِ قریش کے نمائندوں کے ایک بڑے اجتماع میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کرنے کی سازش طے پائی۔ مگر اللہ تعالےٰ نے وحی کے ذریعے آپؐ کو دشمنوں کی اس سازش سے باخبر کر دیا اور آپؐ کو مکہ سے نکل جانے کی تاکید کی گئی اس رات آپؐ کا جس مکان میں قیام تھا اسے ابوجہل کے آدمی اپنے گھیرے میں لے چکے تھے مگر آپ دشمنوں کے ہاتھ نہ آئے جس پر انھیں سخت غصہ آیا۔ آپ مکہ سے ہجرت فرما چکے اور قبا میں تشریف لا چکے تھے اور دشمنوں کے ہاتھوں ستائے جانے کا دور گزر چکا تھا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ سے نکل جانے کی خبر سارے صحرائے عرب میں پھیل چکی تھی۔ یثرب جس کو ہجرت کے بعد شہر نبیؐ ہونے کا اعزاز ملا۔

مدینے میں ورود مسعود

حبیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری مدینے میں داخل ہوئی تو گلی کوچوں، سڑکوں بازاروں اور محلوں میں عید کا سماں تھا۔ مدینہ کا ہر شخص معزز مہمان کے استقبال کے لئے باہر نکل آیا تھا۔ ہر شخص کی خواہش تھی کہ اسے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرنے کی توفیق ملے اور یہ سب کچھ جس محبوب شخصیت کے لیے ہو رہا تھا اس کے ذہن میں صرف ایک ہی دھن تھی اور یہ دھن اسلام کی اشاعت کی تھی۔

آپ کی مدنی زندگی کا اصل اور منتہائے مقصود صرف اسلام کی سربلندی اور کامرانی تھی۔ اس پورے عرصے میں آپ تن من دھن سے بکھرے ہوئے لوگوں کو اتحاد کی لڑی میں پرونے، پرانی رقابتوں اور عصبیتوں کو مٹانے سب لوگوں میں سگے بھائیوں جیسی اخوت پیدا کرنے والوں کی نفرتیں اور کدورتیں دور کر کے انسان کے ساتھ پیار کے جذبے کو بیدار کرنے اور جہالت کے زمانے کی تمام سماجی برائیوں کو ختم کرنے اور بت پرستی کے ہر نقش باطل کو حرف غلط کی طرح مٹا دینے کی کوششوں میں لگ گئے۔ آپ کی ساری مدنی زندگی اسی مقصدِ عظیم کے حصول میں گزری۔ یہ وہ وقت تھا جب آپ کو اس کے اختیار اور ذرائع اور وسائل مل چکے تھے کہ آپ اپنی سوچوں، خیالوں، جذبوں اور خواہشوں کو عملی اور قانونی صورت دے سکیں اور اسلام کے نظری اصولوں کو روزمرہ زندگی کے معمولات کا حصہ بنا دیں اس غرض کے لیے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بیرونی ملکوں میں اسلام کا پیغام پہنچانے کے لئے سفیر اور ایلچی بھیجے اور غیر ملکوں کے نامور بادشاہوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت تحریری صورت میں دی۔

ان میں سے کچھ بادشاہوں نے مکتوباتِ رسالت ؐ کے جوابات بھی دیئے جبکہ کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے رسید تک نہ دی پھر آپ نے ان لوگوں کے خلاف عملی مزاحمت بھی کی جنھوں نے اسلام کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ مخالفین اسلام کے خلاف رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر فوجی مہم کامیاب اور اسلامی فوج ہر ایسے معرکہ میں فاتح رہی۔

اور آخر میں وہ مسعود و مبارک گھڑی آئی جب دس ہزار مسلمانوں کا لشکر پیغمبرِ اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں کسی مزاحمت کے بغیر مکہ میں داخل ہوا اور ہمارے پیارے نبی ؐ نے عفو و درگزر کی منفرد اور عملی شان قائم کرتے ہوئے مکہ کے ہر شخص کو معاف کر دیا خواہ اس کی خطائیں کیسی ہی سنگین کیوں نہ تھیں۔ معافی پانے والوں میں وہ بھی تھے جو ساری زندگی آپ کے خون کے پیاسے رہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے رسولِ خداؐ سے پوچھا تھی کہ مکہ والوں سے اس قدر فراخ دلانہ سلوک کیوں؟ اس کے جواب میں رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ان میں سے کسی کے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں ہوتا"

اس حسن سلوک کا نتیجہ ملاحظہ ہو۔ اسلام کے کٹر دشمنوں کی آل اولاد میں سے کوئی فرد و بشر ایسا نہیں رہا جو حلقہ بگوش اسلام ہونے پر فخر نہ کرتا ہو۔

یہ ہے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا عملی نمونہ۔ اور اس سے برملا اس کا ثبوت ملتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سماجی انصاف صرف اپنے ہم وطن عربوں تک ہی محدود نہ تھا بلکہ یہ ساری دنیا کے لئے تھا، ہے اور رہے گا۔

اسوۂ رسول ؐ پر عمل کی اہمیت

آپ کے اوصافِ حسنہ میں سب سے نمایاں خوبی یہ تھی کہ آپ اپنا ہر کام خود اپنے ہاتھوں سے

کرتے۔ آپؐ نے مسجد تعمیر کی تو خود اپنے ہاتھوں سے اس کے لئے پتھر، مٹی اور گارا ڈھویا۔ جبکہ آپؐ کے شرف یہ تھے کہ دنیا کے سب سے بڑے مقنن اور قانون ساز آپؐ تھے۔ سب سے بڑے منتظم اور انتہائی زیرک سیاست دان، مدبّر آپؐ تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپؐ ایک ہنرمند کاریگر اور صناع بھی تھے۔ آپؐ نے ساری زندگی لوگوں کو نیکی کرنے، خیرات دینے دوسروں کے ساتھ حسنِ سلوک اختیار کرنے اور بیاب اور اچھے کام کرنے کی تعلیم دی اور یہی اعمالِ حسنہ آپؐ کی تعلیمات کی اصل رُوح ہیں۔

چنانچہ آج ہماری موجودہ صورتِ حال کا تقاضا یہ ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری تعلیمات پر عمل کریں مثلاً آپؐ کے بتائے ہوئے جنگوں کے اصولوں اور اسلحہ کے استعمال کے طریقوں پر عمل کریں اور یہ دیکھیں کہ آپؐ نے حالت جنگ میں آزادیٔ قوت کا صحیح استعمال کرنے اور ضروری سامان رسد کی فراہمی جاری رکھنے کے لئے خود کیا کیا اقدامات کئے تھے۔ پھر یہ دیکھیں کہ اپنی حکومت کے قانون بناتے ہوئے آپؐ نے کیا اصول اپنے سامنے رکھے تھے اور بنی نوع انسان کی بھلائی اور فلاح کے لئے کیسی اصلاحات نافذ کیں تھیں اور ایسا کرتے ہوئے وقت کے تقاضوں کو مدِنظر رکھنے کو کتنی زیادہ اہمیت دی تھی اور آپؐ کے نزدیک انسانی توانائی اور اس کی حرکت اور عمل کی صلاحیتوں کو کتنی اہمیت حاصل تھی۔

نبی کریمؐ اور اصلاح معاشرہ

محمد حسام الدین شریفی

آج سے چودہ سو سینتیس برس پہلے ۹ ربیع الاوّل کو اس ذات قدسی صفات نے اس دنیا میں ظہور کیا جسے کائنات کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا تھا اور جس نے اپنی اسی رحمت سے کام لیتے ہوئے کائنات کی ساری تاریکیوں اور ظلمتوں کو روشنی سے بدل دیا اور انسانی معاشرے کی تمام خرابیوں کو دُور کر دیا۔

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے ظہور سے پہلے کی دنیا کا مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ کوئی خرابی ایسی نہ تھی جو دنیا میں نہ پائی جاتی ہو اور کوئی بُرائی ایسی نہ تھی جس میں اہلِ عرب مبتلا نہ ہوں بغرض سارا معاشرہ بگڑ چکا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آئی اور اس نے معاشرہ کی اصلاح و تطہیر کے لیے اپنے آخری پیغمبر جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا، جنھوں نے بہت قلیل عرصے میں دنیا بھر میں سب سے زیادہ بگڑے ہوئے معاشرے کی اصلاح نہایت عمدہ اور احسن طریقے سے فرمائی۔

رسولِ معظم نبی آخر علیہ السلام نے زندگی کے ہر شعبے کی اصلاح فرمائی اور معاشرے کا کوئی پہلو ایسا نہ رہا، جس تک آپ کی نگاہ نہ پہنچی ہو۔ اگرچہ معاشرے کی اصلاح کی خاطر نبی اکرم کو ہر طرح کی تکالیف برداشت کرنا پڑیں۔ لیکن تمام مصیبتیں سہنے کے باوجود بھی آپ نے معاشرے کی اصلاح و تطہیر کا کام جاری رکھا اور عمر مبارک کے کسی لمحے میں بھی یہ مقصد آپ کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو سکا اور آپ کی جدوجہد مسلسل اور سعی پیہم کے نتیجے میں تئیس سال کی مختصر سی مدت میں وہ مثالی معاشرہ وجود میں آگیا، جس کی نظیر دنیا آج تک پیش نہ کر سکی۔

کسی شخص کی عدم موجودگی میں اس کی برائی بیان کرنے کو لوگ کتنا حقیر کیوں نہ سمجھتے ہوں، لیکن بظاہر اس معمولی سی چیز سے معاشرے میں جو بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور گھر کے گھر جس طرح تباہ و برباد ہو جاتے ہیں، اس سے ہر شخص واقف ہے۔ اس لیے ایک دُوسرے کے دلوں میں کدورت، نفرت اور دشمنی پیدا ہو جاتی ہے اور پھر یہی چیز معاشرے میں بگاڑ کا باعث بنتی ہے، اسی وجہ سے اس کو روکا گیا اور ارشاد فرمایا:

"تم میں سے کوئی شخص کسی کی غیبت نہ کرے"۔ (القرآن)

اور غیبت کیا ہے؟

ذکر اخاك بما یکرہ قیل: افرأیت	اپنے مسلمان بھائی کا ذکر ان الفاظ میں کرنا کہ اگر وُہ
ان کان فی اخی ما اقول؟ قال	ان الفاظ کو سن لے، تو ناپسند کرے۔ پُوچھا گیا:
ان کان فیہ ما تقول فقد	اگر وُہ برائی جو بیان کی جا رہی ہے، اس میں موجود ہو،

اغتبتہ و ان لم یکن فیہ ما تقول نقد بھتہ۔	تب بھی؟ فرمایا: اگر وُہ عیب جو تم نے بیان کیا ہے، اس شخص میں موجود ہے تو غیبت ہے اور اگر تمہارا
(مسلم عن ابی ہریرہ)	بیان کردہ عیب اس میں نہیں پایا جاتا، تو یہ بہتان ہے (جو غیبت سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہے)

رشوت معاشرے کا ایک رستا ہوا ناسُور ہے اور ہر دور اور ہر زمانے میں اس کی مذمت کی جاتی رہی ہے۔ حضورؐ نے اس کی مذمت ان الفاظ میں فرمائی:

الراشی و المرتشی فی النار۔	رشوت لینے والے اور رشوت دینے والے کا ٹھکانا جہنم
(الحدیث)	ہے۔

بلکہ اس کی جڑ بھی اکھاڑ کے رکھ دی:

عن ابی عمر نھینا من التکلف۔ (بخاری)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نقل فرماتے ہیں کہ ہمیں تکلف سے روکا گیا اور یہ تکلف اور نمود و نمایش ہی رشوت لینے کا سبب بنتے ہیں اور جب کوئی معاشرہ تکلف کی بیماری میں مبتلا ہو جائے تو اور لوگ جس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، اس کے بجائے طبقہ اعلیٰ میں شامل ہونے کی خواہش ان میں پیدا ہو جائے، تو پھر ان تکلفات میں ان کی آمدنی ان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیتی ہے اور لامحالہ انھیں "دستِ غیب" کی ضرورت پڑتی ہے اس بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے رشوت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے اپنی امت کو تکلفات میں پڑنے سے روک دیا۔

سُود کے ذریعہ جس طرح غریبوں کی دولت کو ان سے چھینا جاتا ہے اور بعض حالتوں میں انھیں نانِ شبینہ تک سے محروم کر دیا جاتا ہے، اسے کسی طرح بھی درست قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پھر اس سے وُہ لوگ جن کے پاس کچھ رقم ہوتی ہے، ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور بغیر محنت و کوشش کے اپنے سرمائے میں اضافہ پر اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں، جس سے وُہ لوگ کاہل اور معاشرہ کے لیے ناکارہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔

یہ لوگ صرف اپنا بھلا چاہتے ہیں، دوسروں کی بھلائی اور نفع سے انھیں کوئی غرض نہیں ہوتی۔ ایسے لوگوں سے معاشرے کی کسی قسم کی بھلائی کی توقع نہیں رکھی جا سکتی اور اسی وجہ سے اسلامی معاشرے میں سُود کے لیے کوئی گنجایش نہیں۔

جناب عبداللہ بن مسعودؓ نقل فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سُودی کاروبار کرنے والے (سُود لینے اور سُود ادا کرنے والے)، سودی کاروبار کے متعلق گواہی دینے والے اور سودی کاروبار کی خط و کتابت کرنے پر لعنت فرمائی ہے۔

(ریاض الصالحین ص ۶۱۶)

جب کسی قوم اور کسی ملک کے لوگوں میں امارت کی حرص پیدا ہو جاتی ہے اور ہر آدمی امیر قوم، امیر صوبہ اور ہر راہ نما امیر ملک بننے کا خواہاں ہو اور اس مقصد کے لیے وہ ہر جائز و ناجائز ہتھکنڈے اختیار کرنا شروع کر دے، تو سمجھنا چاہیے کہ اس معاشرے میں

بگاڑ کی ابتداء ہوچکی ہے۔ کیونکہ ایسے موقع پر ہر شخص اپنے مقابل کی پگڑی اُچھالنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کی معمولی سے معمولی غلطی اور بُرائی کو بڑھا چڑھا کر دُوسروں کے سامنے پیش کرنے میں نظر آتا ہے:

وعین السخط تبدی المساویا

اسی لیے جناب نبی کریم علیہ الصلٰوۃ والتسلیم ارشاد فرماتے ہیں:

"تم لوگ امارت کے خواہشمند ہو گے، حالانکہ یہی چیز قیامت کے دن تمہارے لیے ندامت کا باعث ہو گی۔"
(بخاری عن ابی ہریرہؓ)

اور اُمت کی رہنمائی کرتے ہُوئے اس سلسلے میں بہ وضاحت بھی فرما دی کہ تمہیں اپنے لیے امیر منتخب کرتے وقت کن امور کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے اور کس قسم کے لوگوں کو اپنا حاکم بنانا چاہیے:

"تمہارے بہترین حاکم اور امراء وُہ ہیں، جن سے تم محبت رکھتے ہو، اور وہ تم سے محبت رکھتے ہیں۔ تم اُن کے لیے دعائیں مانگتے ہو اور وہ تمہارے لیے دعائیں کرتے ہیں۔ اور تمہارے بدترین حاکم وُہ ہیں جن سے تم نفرت کرتے ہو اور وُہ تم سے عداوت رکھتے ہیں اور تم اُن پر لعنت بھیجتے ہو اور وہ تم پر لعنت بھیجتے ہیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! کیا ایسے حاکموں کی اطاعت کرنے سے ہم اپنے آپ کو آزاد نہ کر لیں؟ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: نہیں، جب تک وہ تم میں نماز قایم رکھتے ہیں۔" (مسلم عن عوف بن مالک)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں بہترین حاکم وہ لوگ کہلانے کے مستحق ہیں، جو عوام سے قریب ہوں۔ ان سے اپنا رابطہ قایم رکھتے ہوں اور ہمہ وقت ان کی بھلائی میں مصروف رہتے ہوں۔ عوام ان کی حکومت کی سلامتی اور ان کی درازیٔ عمر کے لیے دعا گو ہوں، اور جن لوگوں نے عوام سے دُوری کو اپنا شیوہ قرار دے رکھا ہو اور ان کی بھلائی سے انھیں کوئی غرض نہ ہو بلکہ ان کے لیے مزید مشکلات پیدا کرتے رہنا ان کا پسندیدہ مشغلہ ہو۔ ان کی زبان پر، ان کے قلم پر اور ان کی آواز پہ پابندی لگا دینے کو اپنی کامیابی سمجھ رکھا ہو، ان کا شمار ناپسندیدہ حاکموں میں ہوتا ہے۔

دُوسری روایت میں اطاعتِ امیر کے متعلق مزید وضاحت فرمائی کہ ان کی اطاعت اسی وقت کے لیے ہے، جب تک ان کے احکام اور اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے مابین ٹکراؤ پیدا نہ ہو اور اگر اس کے برعکس صورت پیدا ہو جائے تو پھر ایک مسلمان کی شان یہ ہے کہ وُہ ان کی بات بھی سُننا گوارا نہ کرے۔

"اگر اس کی جانب سے اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی نافرمانی کا حکم دیا جائے، تو ایسی صورت میں اس کی بات بھی سننا گوارا نہ کرو اور نہ اس کی اطاعت کرو۔" (بخاری و مسلم عن ابن عمرؓ)

معاشی اور دوسری مختلف پریشانیوں کی بناء پر جب معاشرے سے ذہنی سکون و اطمینان رخصت ہو جائے اور ہر طرف بے اطمینانی کا دور دورہ ہو جائے، تو اس معاشرہ میں معمولی معمولی باتوں پر دُوسروں کو قتل کرنے اور اپنے آپ کو ختم کرنے کی وارداتیں عام ہونے لگتی ہیں۔ ضبطِ تولید کا پرچار کیا جانے لگتا ہے۔ مثبت اقدام اختیار کرنے کے بجائے منفی قدم اٹھائے جانے لگتے ہیں، مگر

اسلامی معاشرے میں ان میں سے کسی بھی چیز کو درست نہیں سمجھا گیا۔

اسلام اور پیغمبرِ اسلام نے ضبطِ تولید کو کسی طور پر مستحسن قرار نہیں دیا، کہ اس کے ذریعے عصمت و عفت کے ختم ہو جانے کا امکان ہی نہیں بلکہ یقین ہے اور یہ چیز زنا کے پھیلنے میں ممد ثابت ہوتی ہے اور حالات و واقعات اس پر شاہد ہیں۔ تو کیا محض ایک موہوم امید کے سہارے اتنے عظیم نقصان کو برداشت کرنا عقلمندی اور دانائی کہلا سکتا ہے؟

معاشرے سے اس برائی کو ختم کرنے کے لیے خود اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا:

ولا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق۔ اور بھوک سے ڈر کر اپنی اولاد کو ختم نہ کرو۔

(القرآن)

اور جناب نبی کریمؐ نے معاشرے کی اس گندگی کو دُور کرتے ہوئے فرمایا:

"کیا تم میں سے خدا کے ساتھ شریک ٹھیرانا ہے اور والدین کی نافرمانی کرنا اور قتل نفس اور جھوٹی قسم کھانا یہ تمام افعال کبائر میں سے ہیں" (بخاری عن عبداللہ بن عمرو بن العاص)

رسول معظمؐ نے ان چار باتوں کی نشان دہی کرکے ان سے بچنے کا حکم دیا اور ایک دُوسری حدیث میں تنگیِ رزق کا سبب بتلا دیا کہ جب کسی قوم میں زنا کی کثرت ہو جاتی ہے اور وُہ لوگ ناپ تول میں کمی کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں، تو پھر اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کے رزق میں کمی کر دی جاتی ہے اور غلّہ کم پیدا ہونے لگتا ہے اور پھر وُہ لوگ یہ رونا روتے ہیں کہ غلّہ کم اور کھانے والے زیادہ ہیں۔ لیکن اس کے علاج کی طرف توجہ نہیں کرتے کہ اپنے معاشرے سے زنا کو ختم کر دیں اور ناپ تول میں کمی کرنے والوں کو سختی سے اس حرکت سے منع کریں اور اس طریقے سے معاشرے کو فساد سے بچایا جا سکتا ہے۔

معاشرے میں فتنہ و فساد اور خرابی پیدا کرنے میں مرد و زن کا آزادانہ اختلاط بھی نمایاں کردار ادا کرتا ہے اس سلسلے میں مغربی ممالک کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ وہاں مرد و زن کے آزادانہ اختلاط سے معاشرہ جس تیزی سے تباہی و بربادی کے گڑھے کی طرف جا رہا ہے، اہلِ مغرب خود اس سے نالاں ہیں اور ہمارے ہاں کے اہلِ عقل و دانش ان حالات سے بخوبی آگاہ ہیں۔

اسلامی معاشرے میں اس اختلاط کو روکنے کے لیے پردے کو لازمی قرار دیا گیا ہے اور اپنے خاص رشتہ داروں کے علاوہ کسی بھی مرد کے سامنے آنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ حد یہ ہے کہ امہات المومنین رضوان اللہ علیہن اجمعین کو سب سے پہلے پردے کا پابند کیا گیا اور اپنے رشتہ داروں کے سوا سارے مسلمانوں سے پردہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس معاملے میں ان کے ساتھ بھی کوئی رعایت نہیں برتی گئی؛

وقرن فی بیوتکن۔ (القرآن) وہ سب اپنے گھروں میں ٹھہری رہیں۔

"ام المومنین حضرت سلمہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ (پردے کا حکم نازل ہو جانے کے بعد ایک مرتبہ) میں اور میمونہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے کہ عبداللہ ابن ام مکتومؓ آ گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم دونوں کو پردہ کر لینے کا حکم دیا کہ تم دونوں پردے میں چلی جاؤ۔ ہم نے کہا: یا رسول اللہؐ! کیا یہ نابینا نہیں ہیں؛

نہ یہ ہم کو دیکھتے ہیں اور نہ یہ ہمیں پہچانتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کیا تم دونوں اندھی ہو؟ تمہیں دکھائی نہیں دیتا؟ یعنی وہ تو دیکھنے سے معذور ہیں، لیکن تم جوان کو دیکھ رہی ہو اور پردہ دونوں ہی طرف سے ہے۔"

مرد و عورت کے دائرہ کار بالکل الگ الگ ہیں اور اسلامی معاشرے کی جانب سے ان دونوں کی حدود متعین ہیں۔ گھریلو ذمہ داریاں عورت کو سونپی گئی ہیں اور بیرونی معاملات مرد کے سپرد کیے گئے ہیں۔ ان دونوں میں سے جو فریق بھی اپنے حدود سے تجاوز کر کے دوسرے کے معاملات میں دخل دینے کی کوشش کرتا ہے، معاشرے میں فتنہ و فساد اور بگاڑ کی ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی ہے۔

معاشرے کے بگاڑ میں ان لوگوں کا بھی حصہ ہے اور اس کی سب سے زیادہ ذمہ داری انہی لوگوں پر ہے، جو ذہنی غلامی میں مبتلا اور احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں اور جو صرف دوسروں کی نقالی کرنا جانتے ہیں، خواہ یہ نقالی زبان کی حد تک ہو یا لباس، رہن سہن اور کھانے پینے کے طریقوں تک پھیل چکی ہو اور مرد زنانہ قسم کے لباس پہننا اور بال بنانا پسند کرتے ہوں یا عورتیں بالوں میں اور لباس میں مردوں کی نقالی شروع کر دیں۔ یہ تمام باتیں کسی طرح بھی مستحسن قرار نہیں دی جا سکتیں اور اسلام نے اپنے ماننے والوں کو ان تمام قسموں کی نقالی سے روکا ہے۔

"آدمی کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے، جن سے اسے محبت اور تعلق ہو (اور جن کے راستے پر چلنا اسے پسند ہو)۔

جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی اور اُن مردوں پر، جو عورتوں کے ساتھ مشابہت پیدا کرتے ہیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے سر کے بال منڈانے سے روکا ہے۔"

اور حلق راس میں وہ تمام صورتیں آجاتی ہیں، جن کا آجکل عام طور پر رواج ہے کہ چٹیا کٹا کر مردوں کی طرح بال بنا لیے جاتے ہیں۔

پھر یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے جس بگڑے ہوئے معاشرے کی مکمل اصلاح و تطہیر فرمائی، اس کی بنیاد خوفِ خدا پر رکھی۔ جس معاشرے کی بنیاد خوفِ خدا کے علاوہ کسی اور چیز پر ہوگی، وہ معاشرہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا اور اس معاشرے کا درست ہونا اور اس کی اصلاح ہونا قطعی ناممکن ہے۔ اسی بنا پر اسلام نے خوفِ خدا کو اپنے معاشرے کی اصلاح کے لیے بنیادی ستون قرار دیا ہے۔

حضورؐ نے معاشرے کے جن جن پہلوؤں کی اصلاح فرمائی، ان میں سے چند پہلو آپ کی خدمت میں پیش کیے گئے ہیں۔

آج معاشرے میں جو خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں، وُہ اسی طرح دور ہو سکتی ہیں کہ ان معاملات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو اپنے لیے لازمی قرار دے لیا جائے اور ان ہدایات سے سرِمُو انحراف نہ کیا جائے۔ بصورتِ دیگر معاشرے کے بگاڑ میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جائے گا اور آخر ایک دن وُہ آئے گا، جب اس کی اصلاح ناممکن ہو کر رہ جائے گی۔ اس دن کے آنے سے پہلے پہلے ہمیں معاشرے کی اصلاح کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔

حضورِ اکرمؐ اور تبلیغ

محمد جعفر شاہ پھلواروی

تبلیغ، ابلاغ اور بلاغ سب کے معنی ایک ہیں، یعنی پہنچانا۔ پہنچانے کا مفہوم خود لفظ "رسول" کے اندر بھی موجود ہے۔ رسول کے معنی ہیں بھیجا ہوا اور پیغام لے جانے والا۔ کوئی پیغام دے کر کسی کو بھیجا جائے، تو اس کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ اسے پہنچا دے۔ ان تمام باتوں کو قرآن کی ایک آیت ہی بڑی عمدگی سے واضح کرتی ہے۔ ارشاد ہے کہ:

یا یہا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک و ان لم تفعل فما بلغت رسالتہ۔ — اے پیغمبر! تمہارے رب کی طرف سے تم پر جو کچھ نازل ہوا ہے، اسے پہنچاؤ۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے پیغامبری کا حق ہی ادا نہ کیا۔

اس آیت سے یہ بات واضح ہوگئی کہ رسالت کے معنی ہی پیغام کے ہیں اور رسول وہی ہوتا ہے جو پیغام لائے اور اس کا اصلی فریضہ یہ ہے کہ وہ اس پیغام کو پہنچا دے، اسی پہنچا دینے کا نام ہے تبلیغ یا ابلاغ۔ رسول تو پیغام لانے والا ہے اور وہ پیغام قرآن مجید ہے جسے ھذا بلاغ للناس کہا گیا ہے۔ یعنی یہی کتاب پیغام خداوندی ہے اور اس کو پہنچانے والا رسول ہے۔ قرآن کریم نے رسول کے فریضہ تبلیغ کے متعلق واضح لفظوں میں یہ بھی فرما دیا کہ:

وما علی الرسول الا البلاغ المبین۔ — رسول کی ذمہ داری صرف اس قدر ہے کہ وضاحت کے ساتھ پہنچا دے۔

اس آیت سے یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ رسول کی حیثیت صرف اتنی ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کا پیغام سنا دے اور اس کے بعد آرام سے گھر پر آکر سو رہے۔ گویا نعوذ باللہ وہ صرف ایک چٹھی رساں کی طرح آکر خط دے جاتا ہے۔ اس کے بعد اسے نہ خط بھیجنے والے سے کوئی مطلب ہوتا ہے، نہ خط وصول کرنے والے سے کوئی غرض۔ لیکن یہ خوب یاد رکھنا چاہیے کہ رسول کے ذمے جو تبلیغ کی گئی تھی وہ محض لغوی حیثیت کا پہنچانا نہیں بلکہ وہ ایک قرآنی اصطلاح ہے، جو اپنے بیسیوں لوازم کے ساتھ وابستہ ہے۔ وہ ایک ایسا فریضہ ہے، جس میں سر دھڑ کی بازی لگانی پڑتی ہے۔ پوری کائنات خم ٹھونک کر مقابلے پر آجاتی ہے۔ دن کا چین اور رات کی نیند حرام ہوجاتی ہے، قدم قدم پر شدید مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور زندگی کی آخری سانس تک ایک ایک لمحے کو اسی مقصد کے لیے وقف کر دینا پڑتا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمے دو قسم کی تبلیغیں تھیں: ایک اہل کفر کو اسلام کی تبلیغ اور دوسرے اسلام لانے والوں کو سنبھالے رہنے کے لیے ہر ممکن تبلیغ۔ ان دونوں قسموں کی تبلیغ کا مطالعہ کرنے کے بعد اس حقیقت کے اعتراف میں کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ حضورؐ کی پوری زندگی ہی تبلیغ تھی اور زندگی کا ایک ایک لمحہ اور اس کی ایک ایک ادا ہمہ تن تبلیغ تھی۔ ان دونوں قسموں کی مثالیں

سننے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ تبلیغ کے ضروری لوازم کیا ہیں ۔ جو فریضۂ تبلیغ کو جان جوکھوں کا کام بنا دیتے ہیں ۔

تبلیغی کامیابی کے لیے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ مبلّغ کو اپنے مشن سے ایسی لگن اور ایسا عشق ہو کہ وُہ اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھے اور اس کے لیے ہر متاعِ عزیز کی قربانی کو اپنی سب سے بڑی سعادت سمجھے ۔ یہ دُھن ، یہ ایمان اور یہ اذعان و ایقان نہ ہو، تو مبلّغ کے لیے تبلیغی کامیابی تو الگ رہی ، وہ اس راہ میں قدم بھی نہ رکھے گا ۔

دُوسری ہے استقامت ۔ یعنی ارادہ و عزم میں کسی وقت بھی تزلزل نہ آئے ۔ اگر اندر سے یقین کی گرفت ذرا ڈھیلی ہو تو وُہ دُھن اور وہ لگن ہی کمزور ہو جاتی ہے ، جو تبلیغی سرگرمی کی جان ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم " فاستقم کما امرت" کا حکم دیتا ہے' یعنی اے رسول احکم الٰہی کے مطابق جمے رہو ۔

تیسری شرط ہے بے غرضی و بے لوثی ۔ اس کے بغیر بھی کوئی تبلیغ کامیاب نہیں ہو سکتی ۔ خود غرض انسان کے پیچھے کوئی نہیں چلتا ۔ یہی وجہ ہے کہ ہر پیغمبر نے اس کی وضاحت کر دی کہ :

لا اسئلکم علیہ اجرا ان اجری الّا علی اللّٰہ ۔
میں تم سے اپنی تبلیغ کے عوض کسی قسم کا کوئی اجر نہیں چاہتا میرا معاوضہ تو بس اللہ کے ذمّے ہے ۔

چوتھی شرط ہے حُسنِ افہام یعنی اپنا پیغام اتنی صفائی ، خوبصورتی اور وضاحت سے پیش کرے کہ سُننے والا متاثر ہوئے بغیر نہ رہے ۔ گفتگو اتنی مختصر نہ ہو کہ مضمون تشنہ رہ جائے اور اتنی طویل بھی نہ ہو کہ سامع اکتا جائے ۔ انداز مناسب اور موثر ہو، دلائل ناقابلِ تردید ہوں ۔ مخاطب کی ذہنی سطح کے عین مطابق ہوں وغیرہ وغیرہ ۔ اسی کو قرآن کہتا ہے کہ :

وقل لھم فی انفسھم قولا بلیغا ۔
ایسی بات کہو، جو ان کے دل میں اُتر جائے ۔

پانچویں شرط ہے انسانی خیر خواہی ۔ اگر زندگی کے ہر ہر مرحلے پر مبلّغ عملاً یہ ثابت نہیں کرتا کہ وہ بنی نوع انسان کا بھی خواہ اور خیر طلب ہے ، تو اس کے متعلق کسے یقین آئے گا کہ یہ بھی ہمارے ہی دینی و دنیوی فائدے کے لیے ہے ؟ خیر خواہی تبلیغ کے لیے ایسی ضروری شرط ہے کہ پیغمبروں نے تبلیغ کے ساتھ اس کا بھی ذکر کیا ہے ۔ مثلاً حضرت ہودؑ فرماتے ہیں کہ :

ابلغکم رسلٰت ربی و انا لکم ناصح امین ۔
میں نے تم تک اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا اور میں تم سب کا امانت دار خیر خواہ ہوں ۔

یہی مضمون حضرت نوحؑ ، صالحؑ اور شعیبؑ کی زبان سے بھی قرآن میں ادا ہوا ہے ۔

چھٹی شرط ہے خود مبلّغ کا سراپا نمونۂ عمل بننا ۔ یہ ایسی ضروری شرط ہے کہ اس کے بغیر کسی کامیاب تبلیغ کا تصوّر بھی مشکل ہے ۔ کون ایسے شخص کی بات مان سکتا ہے ، جس کا عمل اس کے قول کے مطابق نہ ہو ؟ مبلّغ کے لیے صرف اسی قدر کافی نہیں کہ اس کی زندگی اس کے پیغام کے مطابق ہو بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ وُہ جتنا بھی دُوسروں سے چاہتا ہے ، اس سے بے شمار گنا زیادہ خود کر کے دکھائے ۔ اگر وُہ دوسروں سے مال کا چالیسواں حصہ طلب کرتا ہو ، تو خود اپنی ساری پُونجی پیش کر دے ۔ اگر دُوسروں کے ترکے کو قانونِ وراثت سے رفتہ رفتہ ختم کرنا چاہے ، تو اپنے ترکے میں ایک درہم بھی نہ چھوڑے بلکہ اس کے پاس جو کچھ ہو ، وہ سب کا سب

قوم کی ملکیت ہو، غرض اس کی زندگی ایک اعلیٰ نمونۂ عمل ہو۔ جیسے قرآن کہتا ہے:

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔ تمھارے لیے رسول اللہ کی زندگی میں بہترین نمونہ موجود ہے۔

ایک ساتویں ضروری شرط جسے ان تمام شرائط کا مجموعہ کہنا چاہیے، یہ ہے کہ مبلّغ کا اخلاقی کردار اتنا بلند ہو کہ بڑے سے بڑے مخالف اور دشمن کو کسی جہت سے بھی اس پر نکتہ چینی کا موقع نہ مل سکے۔ قرآن کریم اسی حقیقت کو یوں بیان فرماتا ہے کہ:

انک لعلیٰ خلق عظیم۔ آپ بہت اعلیٰ کردار پر قایم ہیں۔

یہ ہیں وُہ چند شرائط جو ایک مبلّغ کے لیے ضروری ہیں، اور جن کے بغیر بلند سے بلند افکار کی تبلیغ بھی کامیابی سے ہم آغوش نہیں ہوتی، پھر اگر پیغام ایسا انوکھا ہو، جو سننے والی قوم کے افکار، عادات اور روایات سب کے خلاف ہو اور ہر متاعِ عزیز کی قربانی چاہتا ہو، تو کون ایسے مبلّغ کی بات قبول کرنے پر آمادہ ہو سکتا ہے، جب تک اس میں یہ تمام شرائطِ تبلیغ بہ تمام و کمال نہ پائی جائیں؟

اب اس مبلّغِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا تبلیغی کارنامہ ملاحظہ فرمائیے۔ سب سے پہلے کون ایمان لایا؟ وہ جن کے لیے بظاہر سب سے آخر میں بھی ایمان لانا دشوار تھا، یہ ایمان لانے والے حضورؐ کی رفیقۂ زندگی حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ ہیں۔ کسی انسان کی سیرت و کردار کی واقفیت بیوی سے زیادہ کسی کو نہیں ہوتی۔ انسان کی اصلیت گھر کی دن رات کی خلوتی زندگی میں بے نقاب ہو جاتی ہے جلوت کی زندگی میں تقدس قایم کر لینا دشوار نہیں۔ حقیقتِ حال کا پتا تو گھریلو زندگی سے چلتا ہے۔ ایک بیوی شوہر کی زندگی کے متعلق سب کچھ جانتی ہے اور اس پر کسی شوہر کا جھوٹا جادو نہیں چل سکتا۔ ذرا سوچیے، حضورؐ کا کردار کتنا بلند ہوگا کہ ان کا پیغام سنتے ہی سب سے پہلے ان کی رازدار، واقفِ حال، تجربہ کار اور ہوشمند بیوی ہی ایمان لاتی ہیں اور یہ سمجھ کر ایمان لاتی ہیں کہ اب آخر دم تک ہر سرد و گرم کو جھیلنا پڑے گا۔ کیا ایک مبلّغ کا اس سے بڑا بھی کوئی کارنامہ ہو سکتا ہے؟

اس کے بعد کون اس پیغام کو قبول کرتا ہے؟ ایک رفیق جو بچپنے سے ساتھ کھیلا ہُوا ہے، اور اس سے مبلّغِ اعظم کا کوئی راز پوشیدہ نہیں، اگر مبلّغ کی سیرت و کردار پر اس کی امانت و صداقت پر سو فیصد اعتماد نہ ہو، تو کون ہم عصر دوست ہے، جو ایک خشک و بے مزہ پیغام کو قبول کر کے زمین و آسمان کو دشمن بن جانے کی دعوت دے؟ یہ تھے حضرت ابوبکر صدیقؓ جن کی زیرکی و فراست اور ایثار و صداقت پر کوئی دشمن بھی حرف نہ لا سکا۔ کیا ایک مبلّغ کا اس سے بھی کوئی بڑا کارنامہ تصوّر میں آ سکتا ہے؟

پھر کون ایمان لایا؟ ایک منہ بولا فرزند زید بن حارثہؓ، جو دن رات اس مبلّغ کے ساتھ رہتا ہے، گھر کے اندر بے تکلّف آتا جاتا ہے۔ ہر آن اس مبلغ کی صداقت و کردار کا بچشمِ خود مطالعہ کرتا رہتا ہے۔ کمال اعتماد و اعتقاد نہ ہو تو کون ایسے خطرناک پیغام پر لبیک کہنے کی جرأت کرے؟ کیا تبلیغ کی یہ کامیابی بجائے خود ایک عظیم الشان کارنامہ نہیں۔

یہ تو ذرا عمر رسیدہ لوگ تھے۔ جناب خدیجۃ الکبریٰؓ کے بعد ایک نوخیز ۱۰ سالہ صاحبزادے کا ایمان لانا بھی کچھ معمولی کارنامہ نہیں۔ یہ ہیں حضرت علی مرتضیٰؓ، جو ابھی جوان بھی نہیں ہُوئے ہیں مگر اپنی عقل و فرزانگی میں ہزاروں بڑوں سے آگے ہیں۔ رسولؐ کی گود میں پرورش پائی ہے اور ان کی زندگی سے بخوبی واقف ہیں۔ کمال عزم و استقامت کے ساتھ یہ بھی ایمان لے آتے ہیں۔ یہ

تمام لوگ ایک ہی دن آگے پیچھے ایمان لاتے اور آخری دم تک ہر ایثار و قربانی کو برداشت کرتے رہے۔

یہ وُہ تبلیغ تھی جس سے متاثر ہونے والے لوگ پہلے ہی سے حضورؐ کے کردار سے متاثر تھے اور اس تبلیغ کے قبول کرنے والوں میں کوئی ایسا نہ تھا، جس پر حضورؐ کی دشمنی کا کوئی دور گزرا ہو۔ لیکن آگے چل کر کمال درجے کا تبلیغی کارنامہ وُہ ہے، جب کہ پیغامِ اسلام سُن کر لوگ خون کے پیاسے اور جان کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ چند مثالیں اس کی بھی سُن لیجئے ؛

سیدنا عمرؓ اس مبلغِ اعظمؐ کا سر قلم کرنے کے ارادہ سے شمشیر برہنہ لے کر گھر سے نکلتے ہیں۔ اپنی بہن اور بہنوئی کو اسلام قبول کرنے کے جرم میں خوب مارتے ہیں۔ اس کے بعد ہی حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام اور مسلمانوں کی سب سے بڑی قوت بن جاتے ہیں۔ ضمادِ ازدی حضورؐ کو دیوانہ سمجھ کر جھاڑ پھونک کرنے آتے ہیں اور خود اسلام کے دیوانے بن جاتے ہیں۔ طفیل دوسی اپنے کانوں میں رُوئی ٹھونس کر آتے ہیں کہ محمدؐ کی کوئی آواز ان کے کانوں میں نہ پڑے۔ مگر پھر ہمیشہ کے لیے اپنی غفلت کی ڈاٹ نکال دیتے ہیں۔ بریدہ اسلمی ستّر آدمیوں کے ساتھ حضورؐ کو گرفتار کرنے کے لیے مدینہ کی طرف روانہ ہوتے ہیں اور راستے میں حضورؐ سے مل کر سب کے سب گرفتارانِ اسلام ہو جاتے ہیں۔ ابوسفیان حضورؐ کے خلاف ہر تحریک کے پیرو بن جاتے ہیں لیکن آخر فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کر لیتے ہیں۔ عمیر بن وہب زہر میں خنجر بجھا کر حضورؐ کو قتل کرنے کے ارادے سے مدینے پہنچتے ہیں اور خود قتیلِ خنجرِ ایمان ہو جاتے ہیں۔ ثمامہ بن اثال جیسے پیشہ ور ڈاکو گرفتار ہو کر آتے ہیں اور بغیر کسی تعزیر کے رہا کر دیے جاتے ہیں، پھر کشاں کشاں خود آکر اپنے اسلام کا اعلان کرتے ہیں۔ مثالیں بے شمار ہیں۔ سارا عرب و عجم ہی دشمن تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ بے شمار انسان اپنے کفر سے تائب ہو کر حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ تبلیغ کا یہ عظیم الشان کارنامہ اور کس مبلغ کے ہاتھوں ظہور میں آیا ہے ؛

پھر اس کے بعد ایک تیسرا دورِ تبلیغ آتا ہے جو ۶ھ ہجری میں شروع ہوتا ہے۔ یہ وُہ دور ہے جب سلاطین کو تبلیغ نامے بھیجے گئے۔ نجاشی حبشہ اصحمہ بن ابجر کو، شاہِ بحرین منذر بن ساوہ کو، شام کے گورنر فروہ بن عمرو خزاعی کو، دُومۃ الجندل کے حکمران اکیدر کو، اضلاعِ یمن وطائف کے حکمران ذوالکلاع حمیری کو، شاہِ عمان جیفر کو اسلام کے پیغام بھیجے اور یہ سب کے سب حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔

جو فرمانروا ایمان نہ لائے، ان میں ہوزہ بن علی حاکمِ یمامہ، جریج بن متی شاہِ مصر ملقب بہ مقوقس، خسرو پرویز شاہِ ایران اور نیز شاہِ قسطنطنیہ ہرقل وغیرہ تھے۔ یہ سب کے سب تھوڑے ہی عرصہ میں تباہ و برباد ہو گئے۔

حضورؐ کی تبلیغی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ پُوری زندگی خصوصاً مکّی زندگی میں حضورؐ کو اور حضورؐ کے تمام ساتھیوں کو ہر ممکن ایذا پہنچائی گئی، راستے میں کانٹے بچھائے گئے، گلا گھونٹا گیا، بائیکاٹ کیا گیا، گالیوں اور تالیوں سے استقبال کیا گیا، قتل کی سازشیں کی گئیں، جنگ پر مجبور کیا گیا، وطن سے نکالا گیا۔ کیا کچھ نہ کیا گیا؛ لیکن استقامت، خیر خواہی، بے لوثی، ایثار اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کی محافظت وغیرہ میں کبھی فرق نہ آیا۔ یہی وُہ تبلیغی کردار کے اعلیٰ نمونے تھے، جنھوں نے حضورؐ کو دنیا کا سب سے زیادہ کامیاب مبلغ بنا دیا۔

رسولُ اللہ اور طرزِ معاشرت

سید رشید احمد ارشد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ تمام عالم کے لئے قابلِ تقلید ہے آپ کی حیاتِ مبارکہ از ابتدا تا انتہا ایک کھلی ہوئی کتاب ہے۔ جس کا ہر کوئی مطالعہ کر سکتا ہے اور رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔ آپ کی زندگی کے کسی دور کا حال پوشیدہ نہیں ہے۔ بلکہ آپ کی سیرت مبارکہ کا معمولی سے معمولی واقعہ بھی مستند ذرائع اور عینی شاہدوں کے ذریعے تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے۔ یہ واقعات ہر طبقے کے انسان کے لئے اس کی زندگی کے ہر شعبے میں مشعلِ ہدایت کا کام دے سکتے ہیں۔

آپ کی سیرت مبارکہ کی یہ خصوصیت بھی قابلِ غور ہے کہ آپ نے اپنی تعلیمات پیش کرنے سے پہلے خود اُن پر عمل کیا چنانچہ آپ کی تعلیمات کے ساتھ ساتھ آپ کی عملی زندگی کا ہر گوشہ نمایاں ہے۔ بلکہ آپ کی تعلیمات کی تکمیل اسی وقت ہوتی ہے۔ کہ جب آپ کی عملی زندگی سے اس کا ثبوت ملتا ہے، جسے شرعی اصطلاح میں سنتِ نبوی کہا جاتا ہے اور چونکہ شریعت میں سنتِ نبوی کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے آپ کے ہر عمل اور ہر فعل کو مکمل تحقیق کے بعد کتب احادیث میں محفوظ کر دیا گیا ہے تاکہ اہلِ اسلام بالخصوص اور اہلِ عالم بالعموم آپ کی عملی زندگی کو سرچشمۂ ہدایت بنا سکیں۔

کتبِ احادیث، سیرت اور تاریخ کی کتابوں کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی زندہ جاوید کتاب قرآن کریم سے بھی آپ کے اخلاق و عادات واضح ہیں۔ جیسا کہ آپ کی زوجہ محترمہ اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا ہے:۔

"آپ کے اخلاق (کا حال معلوم کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ) قرآنِ کریم ہے۔"

سیرتِ نبوی کی اہمیت

سیرتِ نبوی کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ عموماً ایک عظیم شخصیت بیرونی دنیا کو باعظمت نظر آتی ہے۔ مگر اس کے گھر والے، جو اس کی اندرونی کمزوریوں سے واقف ہوتے ہیں۔ اس کی عظمت کے قائل نہیں ہوتے ہیں بلکہ اکثر یہ دیکھا گیا ہے، کہ جس قدر کوئی شخص مشہور تر اور عظیم تر ہوگا۔ اسی قدر اس کے اندرونی حالات ناخوشگوار ہوتے ہیں۔ مگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمتِ کردار کے دوست دشمن سبھی مداح رہے ہیں۔ اسی طرح آپ کے گھر والے عزیز اور رشتے دار آپ کی مدح و ثنا میں رطبُ اللسان ہیں۔ کیونکہ آپ کی خانگی اور نجی زندگی بھی اسی طرح بے داغ و پاک و صاف ہے۔ جس طرح بیرونی دنیا کے سامنے آپ کا کردار عظیم اور پاکیزہ نظر آتا ہے۔

ہمارے دعوے کا کھلا ثبوت یہ ہے کہ جب آپؐ کو نبوت عطا ہوئی، تو آپ پر سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں آپ کی زوجہ محترمہ ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ، آپ کے پروردہ چچازاد بھائی حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، آپ کے متبنیٰ غلام حضرت زید بن حارثہ اور آپ کے مخلص ترین اور قریبی دوست ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔

اس واقعہ سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ کی سیرت مبارکہ اس قدر اعلیٰ و ارفع تھی کہ جو شخص جس قدر آپ کے قریب ہوتا تھا۔ اسی قدر وہ آپؐ کی عظیم ترین شخصیت سے زیادہ واقف ہو کر آپ پر جلد ایمان لاتا تھا کیونکہ وہ آپ کی پاکیزہ شخصیت سے بیحد متاثر ہوتا تھا۔

بیوی سے بڑھ کر کوئی فرد اپنے شوہر کی اندرونی کمزوریوں سے واقف نہیں ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر آپ کے کردار میں ذرا بھی کوئی بات ہوتی تو آپ کی ازواجِ مطہرات میں سے کوئی اس کا تذکرہ کرتیں۔ اس کے علاوہ قبیلہ قریش اور کفارِ مکہ آپ کے جانی دشمن تھے اور ساری عمر وہ آپؐ سے برسرپیکار رہے۔ وہ بھی آپ کی اخلاقی کمزوری کا کھوج لگاتے اور دنیا کے سامنے اپنی دشمنی کا انتقام لینے کے لئے نمایاں کرتے۔ مگر کسی تاریخی روایت سے ایسا کوئی واقعہ مذکور نہیں ہے۔ اس کے برعکس ازواجِ مطہرات نے آپ کے گھریلو واقعات بیان کئے ہیں ان سے آپؐ کی عظمتِ کردار اور زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ نیز آپ کے دشمن ابوسفیان نے ہرقل کے سامنے آپؐ کے بارے میں جو گفتگو کی تھی اس سے بھی آپ کے اعلیٰ کردار کا ثبوت ملتا ہے۔

کامل شخصیّت

عالمِ انسانیت کے لئے سیرت نبویؐ کا مطالعہ اس لئے اہم ہے کہ آپ کی عظیم ترین شخصیت جامع الکمالات تھی۔ آپ کی حیاتِ مبارکہ کا ہر دور، ہر عمر اور ہر طبقے کے لئے مشعلِ ہدایت ہے۔ بچے جوان بوڑھے مرد و زن سبھی اس سے رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ مثلاً آپ کے بچپن کا ابتدائی دور ہمارے بچے اور نوعمروں کے لئے سبق آموز ہے۔ آپ کے ابتدائی دور سے یہ رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں کہ ناسازگار ماحول کے باوجود ایک صداقت شعار بچہ اپنے عزم و استقلال کی بدولت اپنے اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ اصول کو برقرار رکھ سکتا ہے اور ہر حالت میں وہ دیانتداری، حق و صداقت اور شرافت کے اصول کے مطابق اپنی زندگی گزار سکتا ہے، یہاں تک کہ اس کے دشمن اور مخالف افراد بھی اسے صادق اور امین کا لقب دے کر اسے خراجِ تحسین پیش کر سکتے ہیں۔

آگے چل کر بعثت سے پہلے آپ نے حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے تجارتی مال کی فروخت میں محنت اور دیانتداری سے کام لیا۔ آپ کی اس محنت اور دیانتداری کی بدولت آپ کو اس تجارتی کاروبار میں بہت نفع حاصل ہوا۔ آپؐ کا یہ طرزِ عمل ہمارے ان تاجروں کے لئے سبق آموز ہے۔ جو محنت کے بغیر بددیانتی کے ذریعے جلد مالدار بننا چاہتے ہیں اور جنہوں نے گراں فروشی اور نفع خوری کو کامیابی کا واحد ذریعہ سمجھ رکھا ہے۔

عزم و استقلال

جب آپؐ کو نبوت عطا ہوئی تو آپؐ نے بت پرستوں کے مخالفانہ ماحول میں نہایت جرأت اور دلیری کے ساتھ توحید و رسالت کی تعلیمات کو پیش کیا اور کفارِ مکہ کی انتہائی مخالفتوں اور آزار رسانیوں کے باوجود حق و صداقت سے ذرا برابر بھی پیچھے نہیں رہے۔ بلکہ نیک مقصد کی خاطر آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے ہر قسم کی قربانی پیش کی۔ یہ واقعات ایسے ہیں جو ہمارے مبلغین معلمینِ اخلاق اور سماجی کارکنوں کے لئے قابلِ عمل نمونہ بن سکتے ہیں۔

نظام حکمرانی مدنی زندگی میں آپ نے اسلامی حکومت کی بنیاد قائم کی اور اسلامی نظم و نسق کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔ اس دور میں آپ نے مدینے کے یہودیوں کے ساتھ بین الاقوامی اصولوں کے مطابق صلح و امن کے ساتھ باہمی زندگی گزارنے کا ایک معاہدہ کیا۔ اس کے بعد جب یہودی اپنے معاہدے پر قائم نہیں رہے اور وہ آپ کے دشمنوں سے مل گئے۔ تو آپ نے صلح و جنگ کے اعلیٰ اصول قائم کیئے اور اس کے مطابق عمل کیا۔ یہ تعلیمات اور اصول ایسے ہیں جو آج بھی موجودہ قوموں کی مشکلات کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔ بلکہ آپ جس سیاست اور حکمت عملی پر کاربند رہے۔ اس کے بنیادی اصول آج بھی اسی طرح قابل عمل ہیں جس طرح وہ دور نبوی اور مسلمانوں کے ابتدائی دور میں عملی طور پر کامیاب ثابت ہوئے تھے۔

اس مختصر مقالے میں سیرت نبوی کے ہر گوشے کا احاطہ کرنا بہت مشکل ہے۔ آپ کی سیرت کے ہر گوشے کو بیان کرنے کیلئے ایک دفتر درکار ہوگا۔ اسی لیے ہم موجودہ حالات میں آپ کے نظام حکمرانی کے چند واقعات اور چند اصولوں کو تحریر کرتے ہیں۔

حکّام کا تقرر جب اسلامی حکومت مدینہ منورہ اور اس کے آس پاس کے علاقے تک محدود تھی اور اسوقت تمام انتظامی امور کے نگران آپ تھے۔ فتح مکّہ کے بعد تمام اہل عرب مسلمان ہو گئے تھے۔ اس وقت ان کی ضروریات کی وجہ سے آپ نے حکام کا تقرر کیا۔ اور دور دراز کے علاقوں کو مختلف حصّوں میں تقسیم کر کے ان کے لئے الگ الگ حاکم مقرر کیئے چنانچہ اسلامی تاریخوں میں مکہ معظمہ، عمان، بحرین، تیما اور یمن کے مختلف حصوں کے لئے جداگانہ حکام کے نام مذکور ہیں۔

اس زمانے میں یمن جزیرۂ عرب میں سب سے زیادہ آباد اور وسیع علاقہ تھا۔ اس کا قدیم تہذیب و تمدن مشہور تھا۔ تجارتی شاہراہ پر واقع ہونے کی وجہ سے اس کا تجارتی کاروبار ترقی پذیر تھا۔ زراعت اور صنعت و حرفت کے لحاظ سے بھی اس کی اہمیت تھی۔ لہٰذا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کے علاقے کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا اور ہر ایک حصہ کے لئے جداگانہ امیر (حاکم) مقرر کیا۔

تقرر کا معیار حکام کے تقرر کے سلسلے میں آپ اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ وہ یا تو اس علاقے کا سابق حاکم ہو۔ یا وہاں کا باشندہ ہو، وہ اسلامی اصولوں کے مطابق مکمل دیانت دار ہو اور خوش اخلاق بھی ہو۔ مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ وہ انتظامی امور کی صلاحیت رکھتا ہو۔

آپؐ حکام کے تقرر کے لئے مذکورہ بالا صلاحیتوں کو پیش نظر رکھتے تھے۔ حاکم کا خالص عربی النسل کا ہونا آپ کے نزدیک ضروری نہیں تھا اور اس سلسلے میں آپ عرب یا عجم کا امتیاز روا نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ آپ نے شاہان عجم میں سے بہرام گور کے خاندان کے ایک شخص باذان بن ساسان کو مسلمان ہونے کے بعد یمن جیسے اہم علاقے کا گورنر مقرر کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ پہلے یمن کے حکمران رہ چکے تھے۔ اس لئے انھیں وہاں کے انتظامی امور کا تجربہ حاصل تھا۔ اسی انتظامی صلاحیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے باذان کی وفات کے بعد آپ نے ان کے فرزند شہر بن باذان کو یمن کے علاقے صفار کا حاکم مقرر کیا۔

حکام کے فرائض آپ کا ایک خاص اصول یہ بھی تھا کہ آپ جب کسی مہاجر مسلمان کو کسی علاقے کا حاکم مقرر کرتے تھے تو اس کے ساتھ ساتھ ایک انصاری کا تقرر بھی فرماتے تھے۔ یہ مسلم حکام ملک کا انتظام کرتے کے ساتھ ساتھ لوگوں کے مقدمات کا فیصلہ بھی کرتے تھے اور خراج بھی وصول کرتے تھے۔ علاوہ ازیں ان حکام کا سب سے مقدم فریضہ

اسلام کی اشاعت و تبلیغ اور اسلامی احکام کی تعلیم و تدریس بھی تھا۔ چنانچہ جب آپ نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن کے ایک حصے کا قاضی بنا کر بھیجا تو جس طرح آپ نے ملکی مصالح کے بارے میں ان کو بیش قیمت ہدایات دیں، اسی طرح انھیں یہ حکم بھی دیا کہ وہ قرآن کریم اور اسلامی قوانین کی تعلیم دیں۔

ان کے ذمے یہ فرض بھی عاید تھا کہ وہ یمن میں صدقات کے محصلین سے صدقات وصول کریں اور انھیں جمع کر کے مرکز کو روانہ کریں۔

آپ نے حضرت معاذ بن جبل کو یہ ہدایات بھی ارشاد فرمائیں!

"تم انھیں سمجھاؤ کہ خدا نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے۔ جو ان کے امراء سے وصول کر کے ان کے غرباء پر تقسیم کیا جائے گا۔ اگر وہ اس کو تسلیم کر لیں تو (اس صدقے کے مال کو وصول کرنے میں) ان کا بہترین مال حاصل کرنے سے پرہیز کرو۔ (اس معاملے میں) مظلوم کی بد دعا سے بچتے رہو، کیونکہ اس کی (بد دعا) اور خدا کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہے۔"

چونکہ حضرت معاذ بن جبل کو ایک مہذب و متمدن علاقے میں قاضی بنا کر بھیجا گیا تھا، اس لئے وہاں کی مقامی ضروریات اور بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر آپ نے انھیں اجتہاد کرنے کے اختیارات بھی دیئے تھے۔ چنانچہ سنن ترمذی میں یہ حدیث مذکور ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب (حضرت) معاذ بن جبل کو یمن کی طرف بھیجا تو آپ نے فرمایا:

"تم کس (بنیاد) پر (مقدمات) کا فیصلہ کرو گے؟"

"انہوں نے کہا" کتاب اللہ (قرآن مجید) سے۔"

آپ نے فرمایا" اگر تم کو وہ فیصلہ اس میں نہ ملے؟"

انہوں نے کہا" سنت رسول سے!"

آپ نے فرمایا" اگر (سنت رسول اور احادیث سے) یہ ہدایت نہ ملے؟"

اس پر انہوں نے کہا" اس وقت میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔"

اس پر آپ نے فرمایا خدا کا شکر ہے کہ اس نے اپنے رسول کے قاصد کو وہ توفیق دی ہے۔ جسے اس کا رسول پسند کرتا ہے۔

خوش اخلاقی کی ہدایت

آپ اپنے حکام کو خوش اخلاقی اور نرمی کی ہدایت فرماتے تھے اور انھیں رعایا پر تشدد اور ظلم کرنے سے روکتے تھے۔ چنانچہ جب آپ نے ایک صحابی کے ساتھ حضرت معاذ بن جبل کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تو سب سے پہلے ان دونوں کو یہ نصیحت فرمائی:۔

"تم دونوں (لوگوں کے لئے) سہولت فراہم کرو۔ اور مشکلات نہ پیدا کرو۔ (لوگوں کو اچھے کاموں کی) بشارت دو۔ (ان کو) وحشت زدہ نہ کرو۔ اتفاق باہمی سے رہو۔ اختلافات پیدا نہ کرو۔" (صحیح مسلم ج ۲ ص ۶۳ کتاب الایمان)

اس کے بعد جب حضرت معاذ بن جبل رکاب میں پاؤں ڈال چکے اور گھوڑے پر سوار ہو گئے تو چلتے وقت آپ نے انھیں یہ ہدایت فرمائی :-

"لوگوں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آئیے۔"

تشدّد کی ممانعت

آپ اپنے حکام اور عام مسلمانوں کو یہ نصیحت فرمایا کرتے تھے۔ کہ وہ اپنے ماتحت ملازموں اور رعایا پر سختی نہ کیا کریں۔ بلکہ حکومت کے ٹیکس اور واجبات کو بھی تشدّد کے ذریعے وصول نہ کریں۔ اور جیسا کہ مذکورہ بالا احادیث سے ثابت ہے، آپ انھیں ہر حالت میں نرمی، خوش اخلاقی اور سہولت کا رویہ اختیار کرنے کی تاکید فرماتے تھے۔ تشدد اور مظالم سے روکتے تھے۔

آپ کا یہ قطعی حکم تھا کہ غیر مسلم رعایا سے بھی جزیہ وصول کرنے میں تشدد نہ کیا جائے۔ بلکہ انھیں بھی جزیہ کی رقم اور دیگر واجبات کے ادا کرنے میں ہر ممکن سہولت بہم پہنچائی جائے۔ اس سلسلے میں صحیح مسلم میں ہشام بن حکیم حزام کی ایک روایت مذکور ہے۔ جس میں فرماتے ہیں :-

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے :-

"اللہ ان لوگوں کو عذاب دے گا۔ جو دنیا میں (لوگوں) کو عذاب دیتے ہیں۔

محصّلین اور عمال

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نظام حکومت زیادہ وسیع نہیں تھا۔ کیونکہ اسلامی مملکت کی حدود صرف آپ کے آخری زمانے میں کسی قدر وسیع ہوئی تھیں۔ دیگر ممالک کی فتوحات آپ کے بعد ہوئیں۔ تاہم آخر زمانے میں آپ نے مسلم اور غیر مسلم رعایا کی سہولت کے لئے جو عمدہ انتظامات کئے تھے وہ بعد کے مسلم خلفاء کے لئے مشعل ہدایت بنے۔

دیگر انتظامات کے ساتھ ساتھ آپؐ نے یکم محرم سنہ ۹ھ سے صدقہ، زکوٰۃ، جزیہ اور خراج وصول کرنے کے لئے ہر قبیلے کے الگ الگ محصلین مقرر فرمائے، جو مختلف قبائل میں گشت کر کے صدقات و خراج جمع کرتے تھے۔ وصول کرنے کے بعد وہ تمام رقم آپ کی خدمت میں بھیجی جاتی تھی، بالعموم قبیلوں کے سردار اپنے قبیلوں کے محصّل ہوتے تھے اور ان کا تقرر عارضی طور پر ہوتا تھا۔

محصّلین کو ہدایت

زکوٰۃ اور خراج وصول کرنے کے سلسلے میں محصّلین آپ کی ہدایات کے مطابق وہ رقوم وصول کرتے تھے۔ آپؐ نے پہلے ہی سے زکوٰۃ وغیرہ کی مقدار اور ان کے شرائط کا باضابطہ تعین کر رکھا تھا۔ اس لئے وہ ان احکام و قوانین پر عمل کرتے تھے۔

آپ نے مویشی پر بھی زکوٰۃ مقرر کی تھی اور محصلین لوگوں کے گھروں پر جا کر مویشیوں کی زکوٰۃ مویشی کی جنس میں لیتے تھے اس لئے انھیں آپ نے یہ ہدایت فرمائی تھی کہ وہ مویشیوں یا دوسری اجناس میں سے سرکاری زکوٰۃ چھانٹ کر وصول نہ کریں۔ اور ایسا عمدہ مال لینے کی کوشش نہ کریں۔ جس سے عوام کو نقصان یا تکلیف پہنچے۔ بلکہ اوسط درجے کا مال وصول کریں۔

ان محصلین کے لئے یہ قطعی ممانعت تھی کہ وہ رعایا سے اپنے سرکاری فرائض انجام دینے کے زمانے میں کسی شکل میں لوگوں سے تحفہ یا نذرانہ وصول کریں۔ اس معاملے میں سختی کے ساتھ ان سے باز پرس ہوتی تھی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ان سے محاسبہ فرماتے تھے۔

نذرانے کی ممانعت

ایک بار آپ نے ابن اللتبیہ نامی ایک شخص کو صدقہ وصول کرنے کے لئے روانہ کیا جب وہ واپس آئے۔ اور آپ نے ان سے محاسبہ کیا تو انہوں نے کہا۔

"یہ آپ کا مال ہے اور یہ مجھے تحفے میں ملا ہے"۔

یہ سن کر آپ نے فرمایا "اگر یہ بات ہے تو تم کو گھر بیٹھے یہ تحفہ کیوں نہیں ملا"۔

آپ کا اس ارشاد سے یہ منشا تھا کہ جس کسی عامل کو سرکاری حیثیت سے کوئی ہدیہ یا نذرانہ دیا جائے۔ تو وہ بھی ایک قسم کی رشوت ہے۔ اس لئے سرکاری عہدے پر رہتے ہوئے اس قسم کا تحفہ یا ہدیہ قبول نہیں کرنا چاہیے۔

یہ معاملہ آپ کے نزدیک اس قدر اہم تھا کہ آپ نے فوراً مسلمانوں کا ایک جلسہ طلب کیا اور لوگوں کو اس قسم کا رویہ اختیار کرنے سے منع کیا۔

خویش پروری کا خاتمہ

آپ نے اقربا پروری کا خاتمہ کرنے کے لئے اپنے خاندان اور خاندان بنو ہاشم پر صدقہ لینا حرام کر دیا تھا۔ وہ نہ صرف صدقے کی کوئی چیز نہیں کھا سکتے تھے۔ بلکہ آپ انھیں صدقہ اور خیرات کے عامل اور محصل کی حیثیت سے بھی مقرر نہیں فرماتے تھے۔ کیونکہ صدقے کی تنخواہ اسی مد سے ادا ہوتی تھی۔ اس لئے ان کا تقرر ممکن نہیں تھا۔

آپ نے یہ اصول اس لئے مقرر فرمایا تھا کہ آپ نہیں چاہتے تھے کہ خاندان نبوت کے افراد اپنے اس تعلق سے ناجائز فائدہ اٹھائیں اور ان میں مذہبی تقدس قائم کر کے مفت خوری کی عادت نہ پیدا ہو۔ اس طرح دیگر مسلم حکام اور خلفا کو بھی یہ نصیحت حاصل ہو کہ وہ بھی اپنے رشتہ داروں کو ناجائز فائدہ حاصل کرنے کی اجازت نہ دیں۔

درخواست کی ممانعت

حکام کے تقرر اور انتخاب میں آپ کا یہ اصول بھی مقرر تھا کہ جو لوگ سرکاری خدمت کے لئے خود درخواست پیش کرتے تھے۔ انھیں حکومت کے کسی عہدے پر آپ مقرر نہ فرماتے تھے۔

اس قسم کا ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابو موسیٰ اشعری کے ساتھ دو شخص آپ کے پاس آئے۔ انہوں نے عامل بننے کی خواہش کا اظہار کیا۔ آپ نے ان دونوں کی درخواست نامنظور کر دی اور فرمایا۔

"جو لوگ خود (کسی سرکاری عہدہ کی) خواہش کرتے ہیں ہم ان کو عامل مقرر نہیں کرتے ہیں"۔

اس وقت حضرت ابو موسیٰ اشعری نے اس قسم کی کوئی درخواست نہیں کی تھی۔ اس لئے آپ نے انھیں بلا درخواست یمن کا حاکم مقرر کر کے وہاں روانہ کیا۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۰۹)

سرکاری ملازموں کو بقدر ضرورت معاوضہ ملتا تھا۔ آپ نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ جو شخص مقررہ تنخواہ سے زیادہ رقم لے گا۔ وہ مالی خیانت کا مجرم ہوگا۔ (سنن ابی داؤد ج ۲ باب ارزاق العمال)

مزدوروں سے حسنِ سلوک ہم ابھی بیان کر چکے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلم حکام کو یہ ہدایت دے رکھی تھی کہ وہ اپنے ماتحتوں اور غریب رعایا کے ساتھ نرمی اور خوش اخلاقی کا سلوک کریں۔ اس سلسلے میں آپ نے مزدوروں اور محنت کشوں کے بارے میں خاص ہدایات دی تھیں۔ جن کا ذکر کتبِ احادیث میں مذکور ہے! ان میں سے آپ کے چند ارشادات کا خلاصہ یہ ہے :-

۱۔ تم مزدور کی اجرت اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرو۔

۲۔ اس شخص پر خدا کی لعنت ہو جو مزدور کا حق غصب کرے۔

۳۔ کسی شخص کو ایسا سخت کام کرنے کا حکم نہ دو۔ جسے تم خود نہ کر سکو اگر کوئی ایسا کام ہو۔ تو اس کام میں اس کا ہاتھ بٹاؤ۔ اور اس سے نرمی کا سلوک کرو۔

۴۔ تم مزدور کو اپنے جیسا انسان سمجھو، اس پر اس کی طاقت سے زیادہ کام کا بوجھ نہ ڈالو۔ اس کی عزت اور عافیت کا خیال رکھو۔

۵۔ غریبوں کے حق کو پہچانو، کیونکہ یہ تمہارا ہی کام کرتے ہیں۔ خدا اس بندے کو ہرگز نہیں بخشے گا۔ جس نے کسی مزدور کا حق مار لیا ہو۔

محنت کی فضیلت ۱۔ مومن کی نشانی یہ ہے کہ مرتے وقت بھی اس کی پیشانی محنت کے پسینے سے تر ہو۔

۲۔ اس بندے پر خدا کی رحمت ہو۔ جو اپنی محنت سے اپنی روزی کماتا ہے

جس طرح آپ نے مزدوروں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔ اسی طرح مزدوروں کو ان کے فرائض بھی یاد دلائے ہیں کہ وہ فرض شناسی، دیانتداری اور محنت سے کام کریں۔

خطاب و کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا زیادہ وقت خاموش رہ کر گزارتے تھے۔ آپ اسی وقت گفتگو فرماتے تھے جب بولنے کی ضرورت ہوتی تھی، آپ کی آواز بلند تھی اور اچھی طرح سنی جا سکتی تھی۔ آپ کی گفتگو شیریں اور دلکش ہوتی تھی، آپ گفتگو اس طرح ٹھہر ٹھہر کر فرماتے تھے کہ ہر جملہ دوسرے جملہ سے علیحدہ ہوتا تھا تاکہ سننے والے اسے سمجھ سکیں اور آسانی کے ساتھ یاد رکھ سکیں۔ آپ جس بات پر زور دینا چاہتے تھے اسے دہراتے تھے۔ نہ تو آپ ضرورت سے زیادہ طویل گفتگو فرماتے تھے اور نہ اتنی مختصر کہ پوری طرح سمجھ میں نہ آسکے۔ آپ کی گفتگو بالکل جچی تلی اور متوازن ہوتی تھی۔ آپ کسی کی بات بیچ میں سے نہ کاٹتے تھے۔ اگر کسی کی کوئی بات دین کے خلاف ہوتی تو آپ اسے یا تو روک دیتے یا پھر وہاں سے اٹھ جاتے۔ آپ کی زبان سے کوئی بے معنی اور غیر متعلق بات نہ نکلتی تھی۔ اگر خطبہ دیتے وقت سامعین کی کثرت ہوتی تو آپ کسی ایک سمت یا ایک آدمی

کی طرف مخاطب نہ ہوتے تھے بلکہ آپ باری باری سے ہر طرف رخِ مبارک کو گھماتے تھے۔ آپ کو چلّانے اور شور کرنے کی عادت نہ تھی۔ آپ کی گفتگو ہمیشہ افادیت سے بھرپور ہوتی تھی۔

راست گفتاری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر راست گفتار تھے کہ مزاح کے وقت بھی آپؐ کے الفاظ سچے ہوتے تھے، اور آپ کی زبانِ مبارک سے کوئی غلط بات نہ نکلتی تھی۔ آپ کے دشمنوں اور مخالفوں نے آپ کو "شاعر" "دیوانہ" اور "سحر زدہ" تک کہا مگر ان میں سے کسی کو آپ پر جھوٹ کی تہمت لگانے کی جرأت نہیں ہوئی، ابوجہل آپ کا بہت بڑا دشمن تھا۔ وہ کہا کرتا تھا:

"محمدؐ! میں تم کو جھوٹا نہیں کہتا۔ ہاں! تم جو باتیں بیان کرتے ہو ان کو ٹھیک نہیں سمجھتا۔"

ایک موقع پر بہت سے لوگوں نے متفقہ طور پر اعتراف کیا:

"اے محمدؐ! آپ جو کچھ بھی کہیں گے۔ ہم اس پر یقین لے آئیں گے، اس لئے کہ ہم نے آپ کی زبان سے کبھی کوئی جھوٹی بات نہیں سنی۔"

غیرت وحیا آپ کنواری لڑکیوں سے زیادہ شرمیلے تھے۔ جب آپؐ بازاروں سے گزرتے تھے تو خاموشی اور وقار کے ساتھ گزرتے تھے۔ آپ کے لبوں پر اکثر تبسم رہتا تھا۔ مگر آپؐ نے کبھی زور سے قہقہہ نہیں لگایا۔

صفائی اور پاکیزگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صفائی، ستھرائی اور پاکیزگی کا انتہائی خیال رکھتے تھے۔ ایک شخص میلے کپڑے پہن کر آپ کے پاس آیا تو آپ نے فرمایا:

"کیا یہ آدمی اپنے کپڑے دھونے کی تکلیف بھی برداشت نہیں کر سکتا؟"

ایک خوش حال شخص آپ کی خدمت میں گھٹیا درجہ کے کپڑے پہن کر حاضر ہوا۔ آپ نے اس پر ارشاد فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے تم کو مال و دولت دی ہے۔ اس کا اظہار تمہاری ظاہری حالت سے بھی ہونا چاہیے۔"

اگر آپ مسجد کی دیواروں پر تھوک وغیرہ کا نشان دیکھتے تو اسے خود چھڑی سے کھرچ دیتے۔ کبھی کبھی آپ صحابہ کرام کو نصیحت کرتے کہ خوشبو کے لئے لوبان اور کافور سلگایا کرو۔ اکثر موقعوں پر آپ خود بھی مشک لگایا کرتے تھے۔ آپ لوگوں کو محض کاہلی کی وجہ سے برتن میں پیشاب کرنے سے منع فرماتے تھے۔

سادگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی سادہ زندگی گزارتے تھے اور اپنے گھر والوں کے لئے بھی سادہ زندگی پسند فرماتے تھے۔ آپؐ فطرتاً تواضع سے سادہ کپڑے پہنتے تھے۔ آپ موٹا جھوٹا لباس زیبِ تن فرماتے تھے۔ آپ نے جب وصال فرمایا ہے تو آپ کے بدن پر بھیڑ کے بالوں کا بنا ہوا لباس تھا۔ اس وقت جب کہ یمن سے لے کر شام تک اسلام کی سیادت کا پرچم لہرا رہا تھا۔ پیغمبرِ اسلام کے گھر میں صرف ایک معمولی سا پلنگ اور چمڑے کی ایک چھاگل تھی، آپ کی وفات کے وقت آپ کے گھر میں تھوڑے سے جَو کے علاوہ کھانے پینے کی کوئی اور چیز نہ تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر کا زیادہ تر کاروبار خود اپنے ہاتھ سے کر لیا کرتے تھے۔ اپنی بکریوں کو آپ خود دوہتے تھے،

کبھی کبھی اپنے کپڑے بھی دھو لیتے تھے، آپ گھر کے کام کاج میں ازواجِ مطہرات کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ اپنے ٹوٹے ہوئے جوتے اپنے ہاتھ سے گانٹھتے، اونٹ خود ہی باندھتے اور اپنے ہاتھ سے اس کے آگے چارہ ڈالتے۔

جود و عطا سخاوت اور داد و دہش آپ کا پیدائشی وصف تھا، آپؐ نے اپنی پوری زندگی میں کسی حاجت مند کے مانگنے پر "نہیں" کہا ہی نہیں۔ آپ کے پاس جو چیز بھی ہوتی سائل کو دے دیتے یا نرمی کے ساتھ غمخواری کے لہجہ میں اس کی تسلی کر دیتے۔ یا پھر اس سے وعدہ فرما دیتے کہ آئندہ کسی موقع پر آنا۔ آپ تنہا خوری کے عادی نہ تھے۔ جب کوئی چیز کھاتے پیتے تھے تو دوسروں کو بھی اس میں شریک فرما لیتے۔ ایک مرتبہ آپؐ نے فرمایا کہ اگر کوہِ اُحد میری خاطر سونے کا ہو جاتے تو بھی میں یہ پسند نہ کروں گا کہ تین رات گزر نے تک میرے پاس ایک دینار بھی بچ رہے۔ جب تک گھر میں رکھی ہوئی رقم پوری کی پوری خیرات نہ فرما دیتے۔ آپ کو چین نہ آتا تھا۔

خدمتِ خلق حضرت خباب رضی اللہ عنہ ایک جنگی مہم پر گئے ہوئے تھے۔ ان کے گھر میں کوئی مرد نہ تھا اور عورتیں دودھ دینے والے جانوروں کو دوہنا نہیں جانتی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روزانہ خبابؓ کے گھر جا کر جانوروں کو دوہتے تھے۔ آپ بیواؤں اور اپاہجوں کی مدد کرنے میں نہ تو عار محسوس فرماتے تھے اور نہ اس کو زحمت سمجھتے تھے۔ ایک بار ایک پاگل لڑکی آپ کے پاس آگئی اور حضور کا ہاتھ تھام لیا۔ آپ نے اس سے فرمایا:۔

"بی بی! تم مدینہ کی جس گلی میں چاہو جا کر بیٹھ جاؤ۔ میں تمہارا کام ضرور کر دوں گا۔"

چنانچہ آپؐ نے اس کے بتائے ہوئے کام کو پورا کر دیا۔ ایک دن آپ نماز پڑھ رہے تھے۔ اسی حالت میں ایک بدوی نے آ کر آپ کے دامن کو تھام لیا اور کہنے لگا:۔

"میرا تھوڑا سا کام رہ گیا ہے، پہلے تم اُسے پورا کر دو اس لئے کہ کہیں تم بھول نہ جاؤ۔" آپ بدوی کے ساتھ مسجد نبوی سے باہر نکلے اور اس کا کام کرنے کے بعد نماز کو پورا کیا۔

سرورِ کائنات ﷺ کے حقوق اُمّت پر

مولانا اشرف علی تھانوی

جاننا چاہیئے کہ کسی سے محبت ہونا اور اس محبت کا متقاضئ متابعت ہونا تین سبب سے ہے۔
ایک محبوب کا کمال جیسے عالم سے محبت ہوتی ہے، شجاع سے محبت ہوتی ہے،
دوسرا جمال، جیسے کسی حسین سے محبت ہوتی ہے،
تیسرا نوال، یعنی عطا و احسان، جیسے اپنے مربی اور منعم سے محبت ہوتی ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مقدسہ میں تینوں وصف علی سبیل الکمال مجتمع ہیں، جب تینوں وصف، جو علتِ محبت ہیں، آپ میں جمع ہیں، تو خود اس کا طبعی مقتضا ہے کہ آپ ﷺ کے ساتھ امت کو اعلیٰ درجہ کی محبت ہونی چاہیئے۔ اگر نصِ شرعی[1] بھی نہ ہوتی اور جب کہ نصوص شرعیہ بھی اس کے ایجاب میں موجود ہیں، تو داعی عقل و طبع کے ساتھ داعی شرع بھی مل کر آپ کے وجوب محبت کو موکد کرتا ہے اور درحقیقت اعظم غایت اس مضمون کی اس امر کی طرف اہل ایمان کو متوجہ کرنا ہے۔ یہ یقینی امر ہے کہ ان اسباب و دواعی کے ہوتے ہوئے محبت[2] سے اتباع کا انفکاک عادتاً محال ہے جس درجہ کی محبت ہوگی اسی درجے کا اتباع ہوگا اور ظاہر ہے کہ محبت علی سبیل الکمال واجب ہے۔ پس متابعت بھی علی سبیل الکمال واجب ہوگی، اور اس میں گو کسی کو بھی کلام نہیں ہو سکتا، تاہم محض تجدید استحضار کے لیے مختصر طور پر تنبیہہ کر دی گئی اور اسی کی تقویت کے لیے چند روایات بھی ذکر کی جاتی ہیں۔

پہلی روایت

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کہ تم میں کوئی شخص مومن نہ ہوگا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے والد اور اولاد اور تمام آدمیوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں (روایت کیا اس کو بخاری و مسلم نے کذا فی المشکوٰۃ۔)

ف: یعنی اگر میری مرضیات[3] اور دوسروں کی مرضیات میں تزاحم ہو، تو جس کو ترجیح دی جائے اسی کی محبوب تر

---

[1] یعنی اگر حضور ﷺ سے محبت کرنے کی کوئی شرعی دلیل نہ بھی ہوتی، تو تب بھی آپ کے اندر محبت کے وہ تمام اسباب موجود ہیں، جنکی وجہ سے کسی سے محبت کی جاتی ہے اور اب جب کہ شرعی دلائل بھی موجود ہیں تو عقلی دلائل کے ساتھ شرعی دلائل مل کر آپ سے محبت کرنے کو اور بھی زیادہ ضروری بنا دیتے ہیں۔

[2] محبت سے حضور کی پیروی کو جدا کرنا ناممکن ہے۔

[3] میری پسندیدہ اور دوسروں کی پسندیدہ باتوں میں ٹکراؤ اور مقابلہ ہو جائے۔

ہونے کی یہ علامت ہو گی۔

دوسری روایت امام بخاری نے ایمان و نذور کے باب میں حضرت عبداللہ بن ہشام سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ میرے نزدیک ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں، سوائے میرے نفس کے جو میرے پہلو میں ہے (یعنی وہ تو مجھے بہت ہی محبوب ہے) جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں کوئی مومن نہیں ہو سکتا، جب تک عود اس کے نفس سے بھی زیادہ میں اس کو محبوب نہ ہو جاؤں حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ پر کتاب نازل فرمائی کہ آپ میرے نزدیک اس نفس سے بھی زیادہ محبوب ہیں جو میرے پہلو میں ہے اس پر جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بس اب بات ٹھیک ہوئی۔

(کذا فی المواہب)

ف:۔ حضرت عمرؓ نے اول محبت بلا اسباب کو محبت بالاسباب سے اقوی سمجھ کر نفس کو مستثنےٰ کیا۔ پھر آپؐ کے اس ارشاد سے کہ اپنے نفس سے بھی زیادہ محبوب رکھنا ضروری ہے، یہ سمجھ گئے کہ اقوی ہونے کا مدار کوئی ایسا امر ہے کہ اس کے اعتبار سے کوئی چیز نفس سے بھی زیادہ محبوب ہو سکتی ہے۔ مثلاً یہ کہ آپؐ کی خوشی کو نفس کی خوشی پر طبعاً مقدم اور راجح پایا۔ سو اس حقیقت کے انکشاف کے بعد آپ کی احبیت من النفس (نفس سے بھی زیادہ محبوب ہونے کا) مشاہدہ کیا اور خبر دی مواہب کے مقصد سابع میں دوسرے صحابہؓ کی محبت کی عجیب و غریب حکایتیں ذکر کی ہیں۔

تیسری روایت حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت جنت میں داخل ہو گی مگر جس نے میرا کہنا قبول نہ کیا، عرض کیا گیا کہ حضورؐ قبول کس نے نہیں کیا؟

فرمایا کہ جس نے میری اطاعت کی، وہ جنت میں داخل ہو گا اور جس نے میری نافرمانی کی، اس نے قبول نہیں کیا۔

(روایت کیا اس کو بخاری نے کذا فی المشکوٰۃ)

ف:۔ صحابہؓ کے اس سوال سے معلوم ہوا کہ اباۓ[1] مخصوص بہ کفر نہیں ہیں، ورنہ اس میں کونسا خفا تھا پس آپ کے اتباع نہ کرنے کو اباء سے تعبیر فرمایا گیا۔ اس سے متابعت کا وجوب ثابت ہوا۔

چوتھی روایت حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے میری سنت سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی۔ وہ میرے ساتھ جنت میں ہو گا۔ (روایت کیا اس کو ترمذی نے کذا فی المشکوٰۃ)

ف:۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آپ کی محبت کی علامت آپؐ کی سنت سے محبت کرنا ہے اور آپ کی محبت کی فضیلت بھی ثابت ہوئی۔ کہ مفتاح[2] جنت ہے اور علاوہ جنت کے حضورؐ کی معیت کا بھی موجب ہے۔

---

[1] قبول کرنا۔
[2] جنت کی کنجی ۱۲

پانچویں روایت حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب پینے کے جرم میں سزا دی۔ پھر دوبارہ وہ اس جرم میں حاضر کیا گیا۔ آپؐ نے پھر سزا کا حکم دیا۔ ایک شخص نے مجمع میں سے کہا کہ اے اللہ! اس پر لعنت کر کس قدر کثرت سے اس کو (مقدمہ میں) لایا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس پر لعنت نہ کرو واللہ میرے علم میں یہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہے۔ (اس کو بخاری نے روایت کیا ہے)

ف: اس حدیث سے چند امور ثابت ہوئے۔ ایک بشارت زبانی کر کے ان سے اللہ اور رسولؐ کی محبت کی نفی نہیں کی گئی، دوسری ذہنیں کو تنبیہ کہ خالی اور صرف محبت سزا سے بچنے میں کام نہ آئی تو کوئی شخص اس ناز میں نہ رہے کہ خالی محبت ہی بغیر اطاعت و اعمال خیر کے سزائے جہنم سے بچالے گی۔ البتہ بعد بعید من الرحمت (خدا کی رحمت سے بہت دور ہو جائے) سے بچا سکتی ہے۔ جیسا کہ نہی عن اللعنت (لعنت کرنے سے منع فرمانے) سے معلوم ہوا۔ پس جو سزا آخرت اس ملعونیت پر مرتب ہے یعنی ہمیشہ جہنم میں رہنا اس سے یہ محبت قلبی بچالے گی اور سزا بھگتنے کے بعد مغفرت ہو جائے گی تیسری بات محبت کی فضیلت معلوم ہوئی، جیسا کہ ظاہر ہے، چوتھی بات محبت کے مراتب کا فرق ظاہر ہوا کہ باوجود ایک گناہ کے اثبات محبت کا حکم فرمایا۔ اس سے ثابت ہوا کہ متابعت کامل نہ ہونے سے گو کمال محبت کا حکم نہ ہوگا، مگر نفس متابعت سے جس کا ادنیٰ درجہ قبول اسلام ہے، کوئی نہ کوئی درجہ محبت ثابت کیا جائے گا۔ پانچویں بات یہ معلوم ہوئی کہ مومن خواہ کتنا ہی گناہ گار ہو، مگر اس پر لعنت نہ کرنی چاہیے۔ اس سے اللہ و رسولؐ کی محبت کی عظمت معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ وہ محبت ایک شمہ برابر ہو اور وہ بھی گناہوں میں ملوث ہو، لیکن ایسی محبت بھی لعنت کرنے سے مانع ہے، تو سوچیے کہ محبت کا کامل اور خالص درجہ کتنا کچھ مفید اور موثر ہے۔

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند
صاف گر باشد ندانم چوں کند

حضور محترم جناب رسول اکرمؐ کی توقیر احترام اور ادب کا واجب ہونا یہ مضمون بھی مضمون بالا کے ساتھ ملحق ہے، کیونکہ یہ بھی منجملہ آپؐ کے حقوق عظمت کے ہے۔ اس مضمون کے متعلق چند آیات اور روایات کا نقل کرنا کافی ہے۔

آیتہ اول:

ما کان لاھل المدینۃ ومن حولھم من الاعراب ان یتخلفوا عن رسول اللہ ولا یرغبوا بانفسھم عن نفسہ (نور)

آیتہ دوم:

انما المومنون الذین آمنوا باللہ ورسولہ واذا کانوا معہ علیٰ امر جامع لم یذھبوا حتی یستأذنوہ

ان الذین یستاذنونک اولئک الذین یومنون باللہ ورسولہٖ فاذا استاذنوک لبعض شانھم فاذن لمن شئت منھم واستغفر لھم اللہ ان اللہ غفور رحیم ہ لاتجعلوا دعاء الرسول بینکم کدعاء بعضکم بعضاً ط (نور)

آیت سوم :-

وما کان لکم ان تؤذوا رسول اللہ ولا ان تنکحوا ازواجہ من بعدہٖ ابداً ان ذالکم کان عند اللہ عظیماً الی قولہ ان الذین یؤذون اللہ ورسولہ لعنھم اللہ فی الدنیا والاخرۃ واعدّ لھم عذاباً مھیناً (احزاب)

آیت چہارم :-

انا ارسلناک شاھداً ومبشراً ونذیراً لتؤمنوا باللہ وتعزروہ وتوقروہ وتسبحوہ بکرۃ واصیلاً (فتح)

آیت پنجم :-

یاایھا الذین امنوا لاتقدموا بین یدی اللہ ورسولہٖ واتقوا اللہ ان اللہ سمیع علیم ط الی قولہ ولو انھم صبروا حتی تخرج الیھم لکان خیراً لھم ط واللہ غفور رحیم ہ

حاصل ان آیات کا یہ ہے :

۱۔ مدینہ کے رہنے والوں کو اور جو دیہاتی ان کے گرد و پیش میں رہتے ہیں ، یہ زیبا نہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ نہ دیں ۔ اور نہ یہ زیبا تھا کہ اپنی جان کو ان کی جان سے زیادہ عزیز سمجھیں ۔

۲۔ پس مسلمان تو وہی ہیں ، جو اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں اور صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کسی ایسے کام کے لیے ہوتے ہیں جس کے لیے جمع کیا گیا ہے اور اتفاقاً وہاں سے جانے کی ضرورت پڑتی ہے ، تو جب تک آپ سے اجازت نہ لیں اور آپ اس کی اجازت دیں مجلس سے اٹھ کر نہیں جاتے ۔ اے پیغمبر ! جو لوگ آپ سے ایسے مواقع پر اجازت لیتے ہیں بس وہی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں ۔ تو جب یہ اہل ایمان لوگ ایسے مواقع پر اپنے کسی ضروری کام کے لیے آپ سے اپنے جانے کی اجازت طلب کریں ، تو ان میں سے آپ جس کے لیے چاہیں مناسب سمجھ کر اجازت دینا چاہیں ، اجازت دے دیا کریں اور اجازت دے کر بھی آپ ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کیا کیجیے ۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے ۔

تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بلانے کو جب وہ کسی ضرورت اسلامیہ کے لیے تم کو جمع کریں ، ایسا معمولی بلانا مت سمجھو جیسا کہ تم میں ایک دوسرے کو بلا لیتا ہے کہ چاہے آیا نہ آیا ۔ پھر آکر بھی جب تک چاہا بیٹھا اور جب چاہا اٹھ کر بے اجازت لیے چل دیا ۔

۳۔ اور (حرمتِ ایذاءِ نبوی صرف قبول جمع کر بیٹھ جانے ہی کی صورت میں نہیں بلکہ علی الاطلاق حکم ہے کہ تم کو کسی امر میں) جائز نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کلفت پہنچاؤ ۔ اور نہ یہ جائز ہے کہ تم آپ کے بعد آپ کی بیویوں سے کبھی بھی نکاح کرو ۔ یہ خدا کے نزدیک بڑی بھاری معصیت کی بات ہے ۔ اور جس طرح یہ نکاح کرنا ناجائز ہے ، ایسے ہی اس

کا) زبان سے ذکر کرنا یا دل میں ارادہ کرنا یہ سب گناہ ہے۔ سو گر تم اس کے متعلق کسی چیز کو زبان سے ظاہر کرو گے یا اس کے ارادہ کو دل میں پوشیدہ رکھو گے، تو اللہ تعالیٰ (کو دونوں کی خبر ہوگی کیونکہ وہ) ہر ایک چیز کو خوب جانتے ہیں (پس تم کو اس پر سزا دیں گے اور ہم نے جو اوپر حجاب کا حکم دیا ہے، اس سے بعض مستثنےٰ بھی ہیں، جس کا بیان یہ ہے کہ) پیغمبرؐ کی بیویوں پر اپنے باپوں کے سامنے آنے میں کوئی گناہ نہیں، اور نہ اپنے بیٹوں کے، یعنی جس کے بیٹا ہو اور نہ اپنے بھائیوں کے اور نہ اپنے بھتیجوں کے اور نہ بھانجوں کے اور اپنی شریکِ دین عورتوں کے اور نہ اپنی لونڈیوں کے (یعنی ان کے سامنے آنا جائز ہے) اور اے پیغمبرؐ کی بیبیو! (ان احکام مذکورہ کے امتثال میں) خدا سے ڈرتی رہو۔ (کسی حکم کے خلاف نہ ہونے پائے) بے شک اللہ اور اس کے فرشتے رحمت بھیجتے ہیں۔ ان پیغمبرؐ پر۔ اے ایمان والو! تم بھی ان پر رحمت بھیجا کرو اور خوب سلام بھیجا کرو (تاکہ آپ کا حق عظمت جو تمہارے ذمہ ہے ادا ہو) بے شک جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو قصداً ایذا دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کرتا ہے اور ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

۴۔ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تم کو امت پر گواہی دینے والا قیامت کے عموماً اور دنیا میں خصوصاً مسلمانوں کے لیے بشارت دینے والا اور کافروں کے لیے ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور اے مسلمانو! ہم نے ان کو رسولؐ بنا کر اس لیے بھیجا ہے تاکہ تم لوگ اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کے دین کی مدد کرو۔ اور اس کی تعظیم کرو (عقیدتاً بھی کہ اللہ تعالیٰ کو موصوف بالکمالات[1] اور منزہ عن النقائص سمجھو اور عملاً کہ اطاعت کرو) اور صبح و شام اس کی تسبیح و تقدیس میں لگے رہو۔

۵۔ اے ایمان والو! اللہ اور رسولؐ کی اجازت سے پہلے تم کسی قول یا فعل میں سبقت نہ کیا کرو۔ (یعنی جب تک قرائن قویہ[2] یا تصریح سے گفتگو کی اجازت نہ ہو، گفتگو نہ کرو) اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ تعالیٰ (تمہارے سب اقوال کو سننے والا تمہارے سب افعال کو) جاننے والا ہے اور اے ایمان والو! تم اپنی آوازیں پیغمبرؐ کی آواز سے بلند مت کیا کرو اور نہ ان سے ایسے کھل کر بولا کرو، جیسے کہ آپس میں ایک دوسرے سے کھل کر بولا کرتے ہو۔ (یعنی آپ کے سامنے اگرچہ آپس میں گفتگو کرو، لیکن بلند آواز سے نہ بولو اور جب خود حضورؐ سے بات کرو، تو برابر کی آواز سے بھی نہ بولو کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رفع صوت[3] کو صورتاً بے باکی ہے اور جہر کجہر ما بینکم[4] طبعاً گستاخی ہے ناگوار اور موجب تاذی[5] ہوسکتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاذی موجب حبطِ (بربادی) اعمال ہے، گو اور دوسرے معاصی موجبِ حبط

---

[1] تمام تر کمالات سے موصوف اور تمام تر عیوب سے پاک۔

[2] جب تک ایسے قوی قرینے نہ ہوں جن سے گفتگو کا یقین ہو یا صاف طور پر بات کی اجازت مل جائے۔

[3] آواز بلند کرنا ظاہری طور پر گستاخی ہے،

[4] آپس میں بلند آواز سے بولنے کی طرح حضورؐ کے دربار میں بولنا۔

[5] ایذا پہنچانا،

نہیں ہوتے لیکن یہ اس عام میں مخصوص ہے۔ البتہ بعض اوقات جب کہ طبیعت زیادہ منبسط[1] ہو، یہ امور ناگوار نہیں ہوتے اس وقت ایذا دہی ثابت نہ ہونے کی وجہ سے رفع صوت موجب[2] حبط نہیں ہوتا۔ مگر چونکہ بعض اوقات متکلم کو سامع کی اذیت کا احساس نہیں ہوتا، اس لیے ممکن ہے کہ تاذی ہو جائے اور اس سے حبط ہو جائے اور متکلم اس گمان میں رہے کہ تاذی نہیں ہوئی، پس حبط کی بھی خبر نہ ہو۔ لاتشعرون کے یہی معنی ہیں اور اسی وجہ سے مطلق رفع صوت اور جہر بالقول کو منہی[3] عنہ ٹھہرایا کہ گو اس کے بعض افراد موجب تاذی نہ ہوں گے، لیکن اس کی تعیین کیسے ہوگی؟ لہٰذا مطلقاً تمام اجزا و افراد کو ترک کر دینا چاہیے۔ یہ تو رفع صوت پر ترہیب[4] تھی۔ آگے خفض[5] صوت پر ترغیب ہے کہ بے شک جو لوگ اپنی آوازوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پست رکھتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کے قلوب کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے لیے خالص کر دیا ہے (یعنی ان کے قلوب میں غیر تقویٰ نہیں ہے) مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس باب خاص میں، وہ کمال تقویٰ کے ساتھ متصف ہیں کیونکہ کمال تقویٰ یہ ہے جسب حدیث مرفوع ترمذی: لایبلغ العبد ان یکون من المتقین حتی یدع مالا باس به حذرا لما به باس[6] اور رفع صوت کا ایک فرد فی نفسہٖ غیر ذی باس ہے (یعنی اس میں بالذات کوئی نقصان نہیں) جس میں تاذی نہ ہو اور فرد ذی باس ہے (نقصان دہ) جس میں تاذی ہو۔ جب انہوں نے مطلقاً رفع صوت کو ترک کر دیا۔ پس کمال تقویٰ متحقق ہو گیا اور فی نفسہٖ کی قید اس لیے لگائی کہ ممانعت کے بعد تو دونوں ہی فرد ذی باس ہو گئیں آگے ان پر عمل کرنے کا اخروی ثمرہ مذکور ہے کہ ان لوگوں کے لیے مغفرت اور اجر عظیم ہے اور جو لوگ حجروں کے باہر سے آپؐ کو پکارتے ہیں، ان میں سے اکثروں کو عقل نہیں ہے، ورنہ آپؐ کا ادب کرتے اور ایسی جرأت نہ کرتے اور اگر یہ لوگ ذرا صبر و انتظار کرتے، یہاں تک کہ آپؐ خود باہر ان کے پاس آجاتے تو یہ ان کے لیے بہتر ہوتا (کیونکہ یہ ادب کی بات تھی) اور (اگر یہ لوگ اب بھی توبہ کر لیں تو معاف ہو جائے کیونکہ) اللہ غفور رحیم ہے۔

حضور پاکؐ کی عظمت اور احترام کے متعلق چند روایات درج ذیل ہیں۔

پہلی روایت

سنن ابو داؤد کتاب الحدود میں ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک نابینا کی ام ولد تھی، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بیہودہ اور گستاخانہ باتیں کیا کرتی تھی۔ وہ نابینا منع کیا کرتے، وہ باز نہ آتی۔ وہ اس کو ڈانٹتے، مگر وہ نہ مانتی۔ ایک شب اسی طرح اس نے کچھ بکواس شروع کی۔ نابینا نے چھرا لے کر اس کے پیٹ پر رکھ کر بوجھ دے دیا اور ام ولد کو ہلاک کر ڈالا۔ صبح کو اس کی تحقیقات ہوئی۔ نابینا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے فعل کا اقرار کیا اور پورا واقعہ بیان کر دیا۔ حضورؐ نے فرمایا، سب گواہ رہو کہ ام ولد کا خون رائیگاں ہے یعنی قصاص وغیرہ نہیں لیا جائے گا۔

---

[1] خوش [2] اعمال ضائع ہونے کا سبب نہیں ہوتے [3] ممنوع و ناجائز، [4] ڈرانا [5] آواز پست کرنا۔
[6] اس وقت تک متقی نہیں بنتا، جب تک ناجائز کے خوف سے جائز کو بھی نہ چھوڑ دے۔

ف :۔ اس واقعہ سے اس نابینا صحابیؓ کا حضورؐ کے ساتھ کس قدر جوشِ محبت اور پاسِ ادب ثابت ہوتا ہے، یہ قتل سیاستاً اور زجراً ہے کہ علانیہ ایسے کلمات کا کہنا کہ اس کا فر کے مذہب میں بھی داخل نہیں، پھر بار بار جو دلیل ہے ۔ تمرد اور اسلام کے استخفاف کی بلاشبہ موجب زجر بالقتل ہے ۔

دوسری روایت امام بخاری نے کتاب الشروط میں قصہ حدیبیہ کی ایک طویل حدیث نقل کی ہے ۔ اس میں یہ بھی ہے کہ عمرو بن مسعود رئیس مکہ نے آپ کی مجلس شریف سے مکہ واپس جاکر لوگوں سے بیان کیا کہ اے میری قوم! واللہ میں بادشاہوں اور قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے درباروں میں گیا ہوں ۔ واللہ میں نے کسی بادشاہ کو نہیں دیکھا کہ اس کے مصاحب اس کی اس قدر تعظیم کرتے ہوں جس قدر صحابہؓ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعظیم کرتے ہیں واللہ وہ جب کھنکار پھینکتے ہیں، تو وہ کسی نہ کسی کے ہاتھ میں پہنچتی ہے اور وہ اس کو اپنے چہرہ و بدن پر مل لیتا ہے اور جب آپ ان کو کوئی حکم دیتے ہیں، تو وہ تعمیل حکم کے لیے دوڑتے ہیں ۔ اور جب آپؐ وضو کرتے ہیں، تو ان لوگوں کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ وضو کا گرتا ہوا پانی لینے کے لیے گویا اب لڑ پڑیں گے اور جب آپ کلام فرماتے ہیں، تو وہ لوگ اپنی آوازوں کو آپ کے سامنے پست کر لیتے ہیں اور وہ لوگ آپ کی طرف تیز نگاہ سے دیکھتے تک نہیں ۔ (الحدیث)

ف :۔ اس سے صحابہؓ کے جو کچھ آداب ثابت ہوتے ہیں، ظاہر ہے ۔

تیسری روایت مشکوٰۃ میں بروایت امام احمد براء ابن عازب سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک انصاری کے جنازہ میں گئے اور قبر تک پہنچے ۔ ابھی میت کو لحد میں نہیں رکھا تھا (کچھ دیر ہو گئی) آپؐ بیٹھ گئے اور ہم آپ کے گرد اگرد اس طرح بیٹھ گئے کہ گویا ہمارے سروں پر پرندے تھے یعنی نہایت سکون اور سکوت کے ساتھ)

ف :۔ صحابہؓ کا حضور کی خدمت میں اس طرح بیٹھنے کا معمول تھا ۔ اس سے غایت ادب ثابت ہوتا ہے اور اس قسم کی بے شمار روایات وارد ہیں ۔ علماء نے تصریح فرمائی ہے کہ یہ آداب بعد وفات بھی باقی ہیں چنانچہ مواہب میں ہے کہ جب آپؐ کی صوت[1] پر صوت بلند کرنا اعمال کے حبط ہونے کا موجب ہے، تو اپنی آراء اور ہواء کو آپؐ کی سنت اور حکم پر بڑھانے کی نسبت کیا گمان رکھتے ہو، اور جب آپ کی مجلس سے بغیر اجازت جانا جائز نہیں تو آپؐ کی تفاصیل[2] دین سے دوسری طرف جانا کیسے جائز ہو گا اور دوسرے علماء نے لکھا ہے کہ جس طرح حضورؐ کے سامنے رفع صوت جائز نہیں تھا، اس طرح آپ کے ارشادات کے درس اور احکام کی نقل کے وقت بھی رفع صوت حاضرین و سامعین کے لیے خلاف ادب ہے اور اسی طرح محل جسد شریف کے قریب بھی رفع صوت ناجائز ہے ۔ مواہب میں ایک حکایت نقل کی ہے کہ خلیفہ منصور ابو جعفر نے امام مالک سے کسی مسئلے میں مسجد نبویؐ میں بیٹھ کر گفتگو کی، تو

---

[1] آواز [2] خواہشات

امام مالکؒ نے فرمایا کہ امیر المومنین تم کو کیا ہوا؟ اس مسجد میں آواز بلند کرو۔ کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا احترام وفات کے بعد وہی ہے جو حالت حیات میں تھا۔ سو ابوجعفر دب گیا۔ اس کی تائید حضرت عمرؓ کے ارشاد سے ہوتی ہے جو آپ نے اہل طائف کے دو شخصوں سے فرمایا تھا کہ کیا تم مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنی آواز کو بلند کرتے ہو؟ (روایت کیا اس کو بخاری نے وکذا فی المشکوٰۃ باب المساجد)

پس آپؐ کے نام کی، قرب مقام کی، کلام کی اور احکام کی، سب کی تعظیم واجب ہے اور منجملہ اسی تعظیم احکام کے یہ ہے کہ تعظیم ظاہری میں حدود شرعیہ سے تجاوز نہ ہو یعنی مثلاً کسی اور نبی کی یا حضرت تعالیٰ جل مجدہٗ کی بے ادبی نہ ہونے لگے چنانچہ چوتھی اور پانچویں درج ذیل روایات سے ظاہر ہے۔

چوتھی روایت حضرت ابوہریرہؓ سے ایک مسلمان اور یہودی کے جھگڑے کے قصے میں روایت ہے کہ مسلمان نے اپنی قسم میں کہا کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام عالم پر برگزیدہ بنایا۔ یہودی نے کہا کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے موسیٰ علیہ السلام کو تمام عالم پر برگزیدہ بنایا۔ مسلمان نے اس وقت ایک طمانچہ یہودی کے منہ پر مارا۔ یہودی نے جاکر حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا۔ آپؐ نے مسلمان سے تحقیق فرمائی۔ اس نے پورا قصہ عرض کر دیا۔ آپؐ نے فرمایا، تم مجھ کو موسیٰ علیہ السلام پر (ایسی) فضیلت مت دو (جس میں) ان کی بے ادبی کا شائبہ بھی ہو۔ جیسا کہ تفاضل میں لڑائی جھگڑے تک نوبت پہنچ جانے سے اس کا شبہ واقع ہو سکتا ہے۔ (روایت کیا اس کو بخاری و مسلم نے کذا فی المشکوٰۃ)

پانچویں روایت حضرت جبیر بن مطعمؓ سے روایت ہے کہ ایک اعرابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا، جانیں مصیبت میں آگئیں اور بال بچے بھوکے مرنے لگے اور اموال تباہ ہونے لگے (یعنی قحط کے سبب) سو آپ اللہ تعالیٰ سے ہمارے لیے بارش کی دعا کیجیے۔ سو ہم آپ کو خدا کے نزدیک شفیع لاتے ہیں اور خدا تعالیٰ کو آپؐ کے نزدیک شفیع لاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (اس کلمے سے نہایت مضطرب ہوئے اور) سبحان اللہ سبحان اللہ فرمانے لگے اور اس قدر مکرر سہ کرر تسبیح فرمائی کہ اس کا اثر صحابہؓ کے چہروں میں دیکھا گیا۔ پھر فرمایا، کم بختی مارے خدا تعالیٰ کو کسی کے نزدیک شفیع نہیں لایا جا سکتا۔ خدا تعالیٰ کی شان اس سے بہت زیادہ عظیم ہے (الحدیث) (روایت کیا اس کو ابوداؤد نے کذا فی المشکوٰۃ)

ف :۔ گو شفیع کا بے عظیم بھی ہوتا ہے، جیسا کہ حضرت ابوہریرہؓ سے آپنے دوبارہ مغیث فرمایا کہ میں حکم نہیں کرتا، شفاعت کرتا ہوں لیکن لوازم شفاعت سے یہ ہے کہ شفیع اس حاجت کو پورا کرنے سے خود عاجز اور جس سے شفاعت کرتا ہے، اس کا محتاج ہوتا ہے اور عجز و احتیاج کا تو احتمال بھی خدا تعالیٰ کی ذات میں محال ہے پس چونکہ اس عنوان میں اگرچہ اعلیٰ درجہ کی تعظیم نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے، مگر حق جل شانہٗ میں سوء ادب ہونے کی وجہ سے آپؐ پر کس قدر گراں گزرا اور آپ نے کس اہتمام سے اس سے رد کیا۔

حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی امتیازی خصوصیات

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

۱۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات کو قرآن پاک میں اجمالاً اس طرح بیان فرمایا گیا ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی المؤمنینَ اِذْ بعث فیھم رسولاً من انفسھم یتلوا علیھم اٰیٰتہٖ ویُزَکِّیھِمْ
و یُعَلِّمُھُمُ الکتٰبَ والحکمۃ وان کانوا من قبلُ لفی ضلٰل مبین ۝
(آل عمران ۱۶۴۔ دیکھیں البقرہ ۱۵۱۔ الجمعۃ ۲)

یعنی اللہ پاک کی آیات کی تلاوت، لوگوں کا تزکیۂ نفس، قرآن پاک کا علم اور حکمت، یہ چار خصوصیات ایسی ہیں جو حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا خلاصہ ہیں۔

۲۔ خود حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پانچ خصوصیات بیان فرمائی ہیں۔ صحیحین میں جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

أُعْطِیْتُ خَمْسًا لَمْ یُعْطَھُنَّ اَحَدٌ قَبْلِیْ نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِیْرَۃَ شَھْرٍ وَجُعِلَتْ لِیَ الْاَرْضُ مَسْجِداً وَطَھُوْراً فَاَیُّمَا رَجُلٍ مِنْ اُمَّتِیْ اَدْرَکَتْہُ الصلوٰۃُ فَلْیُصَلِّ وَاُحِلَّتْ لِیَ الْمَغَانِمُ ولا تُحِلُّ لِاَحَدٍ من قبلی وَاُعْطِیْتُ الشفاعۃُ وکانَ النبیُّ یُبْعَثُ اِلٰی قَوْمِہٖ خَاصَّۃً وَبُعِثْتُ اِلَی النَّاسِ عَامَّۃً

مجھے پانچ ایسی چیزیں دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں ملیں:
۱۔ ابھی ایک ماہ کی مسافت ہو کہ دشمن پر میرا رُعب طاری ہو جاتا ہے
۲۔ ساری زمین میرے لیے مسجد اور پاکیزہ بنا دی گئی ہے جو جہاں چاہے نماز پڑھ سکتا ہے۔ ۳۔ غنیمت کا مال میرے لئے حلال کر دیا گیا ہے جو پہلے کسی پر حلال نہیں تھا ۴۔ مجھے شفاعت کا حق دیا گیا ہے۔
۵۔ پہلے کے نبی اپنی قوم کے لیے خاص ہوا کرتے تھے مگر میں ساری دنیا کے لیے نبی ہو کر آیا ہوں۔

۳۔ قرآن پاک میں آتا ہے:۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رحمۃً للعالمین (الانبیاء ۱۰۷)=
اور آپ کو جو ہم نے بھیجا تو سارے جہانوں کے واسطے رحمت بنا کر۔
رب العٰلمین نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمۃ للعالمین بنایا —

۴۔ قرآن میں ہے کہ:۔ وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَافَّۃً لِلنَّاسِ بشیراً ونذیراً (سبا ۲۸)=
اور آپ کو جو ہم نے بھیجا، تو سارے لوگوں کے واسطے خوشی اور ڈر سنانے کو

۵۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں۔ مَا کانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ من رجالکم ولٰکن رسول اللّٰہ و

خاتم النبیّین ط وکان اللّٰہُ بکلِ شیءٍ علیماً ہ (الاحزاب۔۴۰)

= محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مَردوں میں سے کسی کے باپ نہیں لیکن اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں پر مُہر ہیں اور اللہ پاک سب چیزوں کو جانتا ہے۔

مَردوں میں سے کسی کے باپ نہیں۔اسی لیے اُن کے صاجزادے مَرد ہونے سے پہلے فوت ہو گئے۔وہ رسول ہیں اور نبیوں پہ مہر ہیں یعنی نبیوں کے سلسلے پر مہر ثبت کرنے والے ہیں اور جب وہ رسول ہی ہیں (وما محمّد الّا رسول) تو پھر اُن کی جائداد میں اولاد صلبی کا حق نہیں تھا۔

۶۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم ہی کے ہاتھوں دین کو مکمل کیا گیا۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ہ (المائدہ۔۳)

= آج میں پورا دے چکا تم کو دین تمہارا اور پورا کیا تم پر میں نے احسان اپنا اور پسند کیا میں نے تمہارے واسطے دین اسلام۔

۷۔ صرف حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے قرآن کو بے مثل بنایا۔ وَاِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَۃٍ مِّنْ مِّثْلِہٖ وَادْعُوْا شُھَدَآءَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ہ (البقرہ۔۲۳)

= اور اگر تم ہو شک میں اس کلام سے جو اُتارا ہم نے اپنے بندے پر تو لے آؤ ایک سورت اس قسم کی اور بلاؤ جن کو حاضر کرتے ہو اللہ کے سوا، اگر تم سچے ہو۔

۸۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے قرآن کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر۔۹)

= ہم نے آپ اُتاری ہے یہ نصیحت (قرآن) اور ہم اس کے نگہبان ہیں۔

دنیا جانتی ہے کہ تریب چودہ سو سال ہو چکے ہیں کہ قرآن قطعاً محفوظ ہے اور ہر سال تراویح میں حُفّاظ کا امتحان بھی لیا جاتا ہے تاکہ کسی طرح کی کوئی تحریف کا شائبہ بھی باقی نہ رہے۔

۹۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے قرآن کو مُطہّر لوگ ہی (دل سے) چھو سکتے ہیں — لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ ہ (الواقعہ۔۷۹)

= اس کو وہی چھوتے ہیں جو پاک بنے ہیں۔

مُطَھَّر، اسم مفعول ہے جس کا فاعل اللہ پاک ہے۔ چنانچہ اس لفظ کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ جن لوگوں کو صحیح عقیدہ بخشا گیا ہے وہی اس قرآن کو دل سے چھو سکتے ہیں۔یعنی بدعقیدہ لوگ اس کے حافظ نہیں ہو سکتے —

۱۰۔ صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو خصوصی معراج[1] پر بلایا گیا ۔ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ
(بنی اسرائیل۔۱)

= پاک ذات ہے جو لے گیا اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصا تک جس میں ہم نے خوبیاں رکھی ہیں کہ دکھائیں اس کو کچھ اپنی قدرت کے نمونے ۔ وہی ہے سنتا دیکھتا ۔

پھر سورۃ النجم کی ابتدائی اٹھارہ آیتوں میں اس معراج کی تفصیل ہے ۔ کچھ آیتیں یہ ہیں :۔

فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی = پھر رہ گیا فرق دو کمانوں کا بلکہ اس سے بھی نزدیک ۔

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی = بہکی نہیں نگاہ اور حد سے نہیں بڑھی ۔ حالانکہ موسیٰ علیہ السلام نے ایک تجلی دیکھی تھی تو پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا اور وہ بیہوش ہو گئے تھے (الاعراف ۱۴۳)

۱۱۔ صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کو وحی فرمایا گیا ہے ۔ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی ٭ اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ٭ (النجم ۳۔۴)

= اور نہیں بولتا اپنی چاؤ سے ۔ یہ تو وحی ہے جو پہنچی ہے ۔

" تجلی ربانی کا یہ استیلا سے تام ہوا کہ جو کچھ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں وہ وحی الٰہی ہوتی ہے " (روح البیان)

۱۲۔ صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو خصوصی کوثر دیا گیا ۔ اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ (الکوثر۔۱)

= بے شک ہم نے آپ کو کوثر عطا فرمایا ۔

یعنی آخرت میں جس کو چاہیں گے کہ حوض کوثر سے پلائیں گے ۔ کوثر کے معنی بے شمار خوبیاں بھی ہیں ۔ بہر حال کوثر عطا کیا گیا ہے اور عطا کی ہوئی چیز واپس نہیں لی جاتی ۔

بخاری اور مسلم میں بھی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بخشی ہوئی چیز کو واپس لینے سے منع فرمایا ہے ۔
(منقول از ریاض الصالحین نووی مترجم صفحہ ۳۲۴)

۱۳۔ صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کو اللہ پاک نے سب سے زیادہ بلند کیا ۔ وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ (الانشراح۔۴)

---

[1] اس خصوصی معراج میں آٹھ انبیاء علیہم السلام سے بھی ملاقات ہوئی ۔ پہلے آسمان پر حضرت آدم سے ۔ دوسرے آسمان پر یحییٰ اور عیسیٰ سے ۔ تیسرے آسمان پر یوسف سے ۔ چوتھے آسمان پر ادریس سے ۔ پانچویں پر ہارون سے ۔ چھٹے پر موسیٰ سے اور ساتویں پر ابراہیم (علیہم الصلوٰۃ والسلام) سے ۔

= اور ہم نے تمہارے لیے تمہارا ذکر بلند کر دیا۔

حدیث میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل علیہ السلام سے اس آیت کو دریافت فرمایا تو انہوں نے کہا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آپ کے ذکر کی بلندی یہ ہے کہ جب میرا ذکر کیا جائے تو میرے ساتھ آپ کا بھی ذکر کیا جائے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ" اذان میں، تکبیر میں، تشہد میں، منبروں پر، خطبوں میں"۔ پس اسی طرح درود و سلام میں، نیز بے شمار درس و تدریس اور گفتگو کے مواقع میں اللہ پاک کے بعد سب سے زیادہ ذکر آپ ہی کا آتا ہے۔

۱۴۔ صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتیوں کے دل میں آپ کے لئے جو محبت پیدا کی گئی ہے وہ کسی دوسرے نبی کے لیے اُن کے اُمتیوں میں نہیں پائی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ آج چودہ سو سال گزر چکنے کے باوجود ایک بے عمل اور گناہ گار اُمتی بھی آپ کے نام پر مرمٹنے کو تیار ہے اور آپ کی شان میں ذراسی گستاخی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ ایک حدیث ہے کہ:

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ○

تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میری محبت اُس کو اُس کے والدین اور اس کی اولاد اور تمام انسانوں سے زیادہ نہ ہو۔

آج کا بے عمل مسلمان بھی ایسی محبت کا احساس اپنے دل میں رکھتا ہے۔ الحمد للہ علیٰ احسانہٖ

۱۵۔ جتنی بُرائی ہو اُتنی ہی سزا دی جائے تو یہ عدل ہے اور اگر ایک نیکی کا دس نیکیوں کے برابر اجر دیا جائے تو یہ رحمت ہے اور یہ خصوصیت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کو حاصل ہے۔ سورۃ الانعام (۱۶۱) میں ہے: مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّیِّئَةِ فَلَا یُجْزٰۤی اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ○ = جو کوئی لایا نیکی اُس کو ہے اُس کے دس برابر اور جو لایا بُرائی تو سزا پائے گا اُتنی ہی اور اُن پر ظلم نہ ہوگا۔

۱۶۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بھی خصوصیت حاصل ہے کہ اُن کے بیس اُمتی، دو سو پر غالب ہوئے اور اُن کے سو اُمتی، ایک ہزار پر غالب ہوئے۔ سورۃ الانفال (۶۵) میں ہے:

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَى الْقِتَالِ ؕ اِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ ۚ وَاِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ یَّغْلِبُوْۤا اَلْفًا مِّنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ ○

اے غیب کی خبریں بتانے والے مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دو۔ اگر تم میں سے بیس صبر والے ہوں گے دو سو پر غالب ہوں گے اور اگر تم میں سے سو ہوں گے تو کافروں کے ہزار پر غالب آئیں گے، اس لیے کہ وہ سمجھ نہیں رکھتے

اس کے بعد کی آیت میں مسلمانوں کی کمزوری کے باوجود اُن کو اپنے سے دوگنے پر غالب ہونے کی بہر حال بشارت دی گئی ہے۔

۱۷۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہی ہر مسلمان کو محبوبیت کے درجے تک پہنچا دیتی ہے۔ سورۃ آل عمران (۳۱) میں ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ

آپ فرما دیں کہ اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ کی تو میری پیروی

يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ط وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ہ — کرو کہ اللہ تم سے محبت کرے اور بخشے گناہ تمہارے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے ۔

۱۸۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کامل و مکمل ہے اور ایسی بے داغ ہے کہ کسی موقع پر اور کسی زمانے میں اُسے بلا تکلف پیش کیا جا سکتا ہے۔ فرمایا ہے کہ "جو مجھے خلوت میں کرتے دیکھو اُس کو جلوت میں برملا بیان کرو، جو حجرہ میں کہتے سنو اُس کو چھتوں پر چڑھ کر پکار دو ——— اَلا فلیبلّغ الشاھد الغائب۔

اسی لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ کو اللہ پاک نے دنیا کے سامنے بطورِ چیلنج کے پیش کر دیا ہے کہ:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ہ (الاحزاب - ۲۱) — بے شک تمہیں رسول اللہ کی پیروی بہتر ہے، اُس کے لیے کہ جو اللہ اور پچھلے دن کی امید رکھتا ہو اور اللہ کو بہت یاد کرے ۔

یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی، ایمان والے کے لیے ہر طرح بہتر ہے اور اُن کی حیاتِ طیبہ ایسی مثالی ہے کہ اسی کی پیروی سے ہر خیر و فلاح کے دروازے کھل سکتے ہیں ؛

۱۹۔ توبہ کرنے والے کے لئے بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت ہی قابلِ قبول ہے بغیر اس شفاعت کے محض توبہ کافی نہیں۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ہ (النسآء - ۶۴) — اور جب وہ اپنی جانوں پر ظلم کریں (نافرمانی کریں) تو اے محبوب وہ تمہارے حضور حاضر ہوں اور پھر اللہ سے معافی چاہیں اور رسول اُن کی شفاعت فرمائے تو ضرور وہ اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان پائیں ـــ

اس آیتِ کریمہ سے ظاہر ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت اُن کے اُمتیوں کے لیے ضرور کارگر ہوگی ۔

۲۰۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہی قیامت میں ہر اُمت کے گواہ اور نگہبان بنائے جائیں گے ۔ سورۃ النسآء (۴۱) میں ہے :۔

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ ۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰي هٰٓؤُلَاۗءِ شَهِيْدًا ہ — تو کیسا ہوگا جب ہم ہر اُمت سے ایک گواہ لائیں (جو اُمت کے تمام افعال پر گواہ ہوگا) اور اے میرے محبوب، تمہیں ان سب پر گواہ اور نگہبان بنا کر لائیں گے ۔

اسی طرح سورۃ النحل (۸۹) میں بھی ہے اور سورۃ البقرہ (۱۴۳) میں بھی ہے :۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَي النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ہ — اور بات یوں ہی ہے کہ ہم نے تمہیں کیا سب اُمتوں میں افضل کہ تم، لوگوں پر گواہ ہو اور یہ رسول تمہارے نگہبان اور گواہ ہیں ۔

اس دوسری آیت کے سلسلے میں بخاری (کتاب التفسیر، جلد دوم ص۶۴۱) میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ پاک نوح علیہ السلام کو بُلائے گا۔ وہ آئیں گے اورعرض کریں گے کہ اے رب میں حاضر ہوں اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تم نے ہمارے احکامات کو لوگوں تک پہنچا دیا تھا؟ وہ کہیں گے کہ جی ہاں، اس کے بعد اُن کی اُمت سے دریافت کیا جائے گا کہ تمھارے پاس خدا کے احکامات لے کر کوئی رسول آیا تھا یا نہیں؟ وہ اُمت کہے گی کہ نہیں آیا...... اُس وقت میری (حضورؐ کی) اُمت گواہی دے گی کہ بے شک نوح علیہ السلام نے احکامِ الٰہی کی تبلیغ کی تھی اور میں کہوں گا کہ یہ لوگ سچ کہہ رہے ہیں"۔

عَسٰى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا　　آپ کا رب آپ کو مقامِ محمود پر ضرور کھڑا کرے گا۔

(بنی اسرائیل ۷۹)

مُقامِ محمود، ہی مقامِ شفاعت ہے کہ جب حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم وہاں کھڑے ہوں گے تو جملہ اولین و آخرین حضور کی حمد کریں گے (تفسیر خازن)۔
اس آیت کی تفسیر میں صحیحین میں وہ حدیث موجود ہے جو انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی سب کی شفاعت فرمائیں گے۔

(۲۱) حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت نمایاں خصوصیت تکمیلِ مکارمِ اخلاق ہے:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم-۴)　　اور بے شک آپ کو خلقِ عظیم پر پیدا کیا ہے۔

حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی فرمایا ہے کہ :-

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ وَ مَحَاسِنَ الْاَعْمَالِ　　میں بزرگ ترین اخلاق اور نیکو ترین اعمال کی تکمیل کے لیے نبی بنایا گیا ہوں ——

(۲۲) اللہ پاک نے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرمایا ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝ (الاحزاب ۴۶)

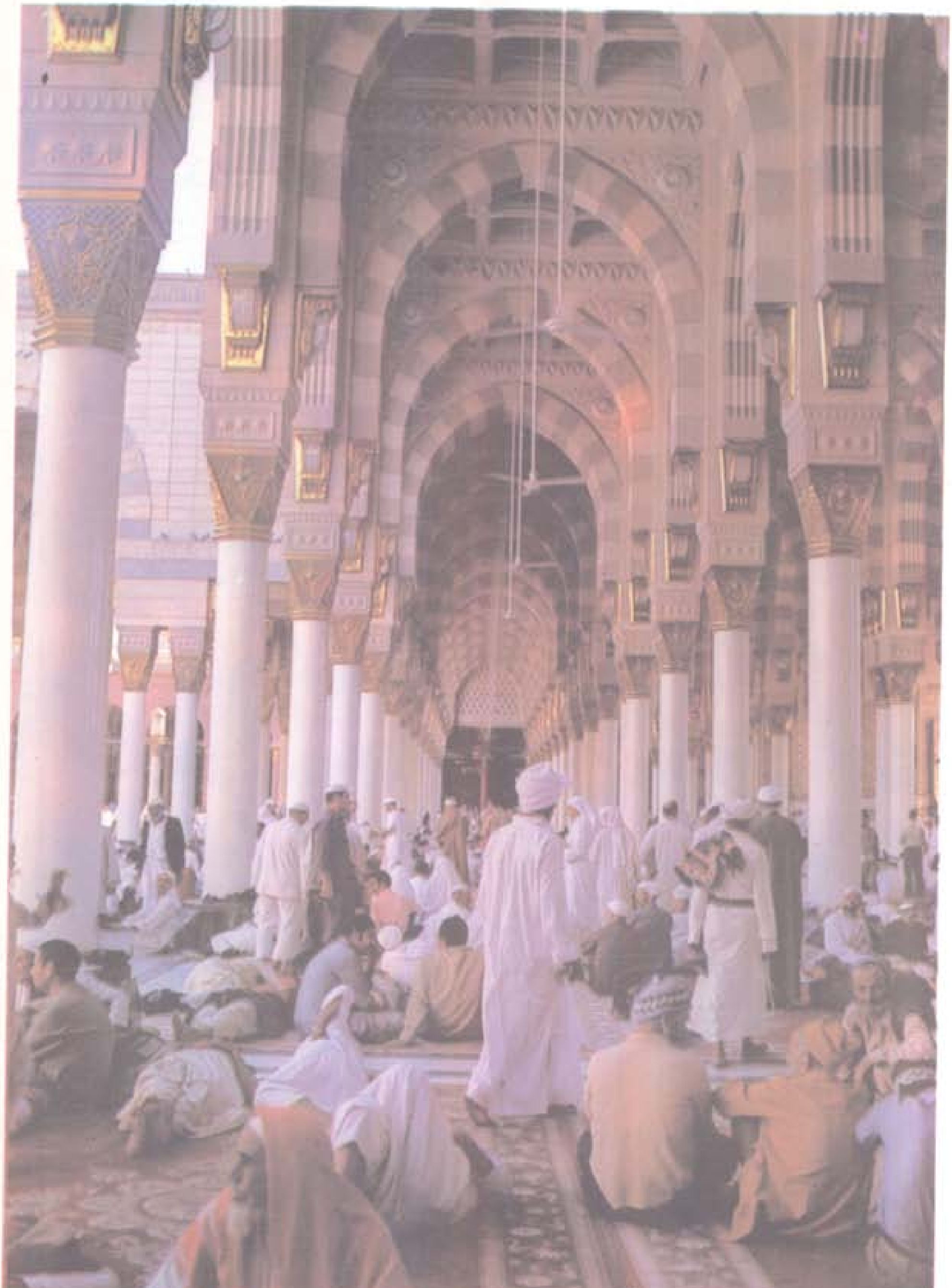
اس آیت میں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کو شاہد، مُبشر، نذیر، اللہ کی طرف اُس کے اذن سے داعی اور سراج منیر کہا ہے محققین کا خیال ہے کہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی کو سراج منیر نہیں کہا گیا۔

(۲۳) حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم "سراج منیر" ہیں تو اُن کے صحابہ نجوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ارشاد فرمایا ہے کہ:-

اَصْحَابِىْ كَالنُّجُوْمِ بِاَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ　　میرے صحابہ مانند نجوم کے ہیں، ان میں سے تم جس کی بھی پیروی کرو گے ہدایت پا جاؤ گے۔

کہا جاتا ہے کہ ۲۳ سال کی نبوی زندگی میں قریب ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ مستفیض ہوئے اور حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں وہ کامل ہدایت کے اہل قرار دیے گئے۔ پوری کائنات میں کبھی ایسی جماعت تیار نہیں ہو سکی —— یہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت نمایاں خصوصیت ہے۔

(۲۴) حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم ہی باعثِ تخلیقِ کائنات ہیں۔ وہ نہ ہوتے تو کائنات پیدا نہ کی جاتی۔ لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ، اِن الفاظ میں تمام و کمال حقیقت کی قوت پوشیدہ ہے۔



مسجد نبوی کا اندرونی منظر

(۲۵) صرف حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ پاک نے ہمیشہ پیار کے ناموں سے یاد کیا ہے ۔ دوسرے انبیاء علیہم السلام کو یا آدم یا نوح یا ابراہیم ۔ یا موسیٰ ۔ یا عیسیٰ کہہ کر خطاب کیا ہے لیکن حضورؐ کو کبھی یا محمد کہہ کر خطاب نہیں کیا ۔ بلکہ یا مُزّمل (اے کملی والے) یا مُدّثر (اے لحاف والے) ۔ یٰسٓ (اے سید) جیسے القاب سے یاد کیا ہے اور خود اپنے توصیفی ناموں میں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کو شریک کیا ہے ۔ مثلاً اللہ پاک رؤف بھی ہے رحیم بھی ہے اور حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی رؤف اور رحیم کہا ہے :

بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (توبہ - ۱۲۸) وہ مومنوں سے بہت پیار کرنے والے اور اُن پر ہمیشہ رحم کرنے والے ہیں ۔

ان کے علاوہ نور ۔ متین ۔ عزیز ۔ بَرّ ۔ رشید بھی اللہ پاک کے اور حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی توصیفی نام ہیں ۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ چند امتیازی خصوصیات ہیں ورنہ آپ کی حیاتِ طیبہ کا ہر واقعہ ایک امتیازی شان رکھتا ہے اور جامی نے ہرگز مبالغہ نہیں کیا جبکہ انہوں نے یہ کہا کہ :۔ ؏

ہمہ قرآں در شانِ محمدؐ

رحمت و رافت کی رُوحِ رواں

عبد الرحمٰن عزام بک

تاریخ عرب بلکہ تاریخ عالم میں بہت سی اولوالعزم ہستیاں پائی جاتی ہیں، جن کے کارنامے اور تذکرے ہمیشہ انسانوں کے کانوں میں گونجتے رہیں گے۔ ان کے اندر ایسی صفات تھیں، جن کے ذریعہ فلاح و کامیابی نے ان کے قدم چومے، یہی لوگ بہادر کہلاتے ہیں۔

ہم نے اسلام کے بطل اعظم کے بعض کارناموں اور صفات کو بیان کیا ہے جن میں ہم نے ظاہر کر دیا، کہ کس طرح آپ ان تمام صفات کے حامل تھے، اب ہم آپ کی اس رحمت و رافت کو قلم بند کرتے ہیں، جس کے ادنیٰ درجہ کو بھی کوئی شخص نہ پا سکا۔ آپ تنگ دستی و فراخ دستی، قوت و ضعف، فقر و غنا غرض کہ ہر حال میں رحمت و رافت کا مجسمہ اور شفقت و محبت کی جیتی جاگتی تصویر تھے، احسان اور بھلائی ہمیشہ آپ کی کنیز تھی اور رحمت آپ کے سامنے دست بستہ ہر وقت کھڑی رہتی تھی، آپ فرماتے ہیں: "احسان اور بھلائی جنت کی طرف رہنمائی کرتی ہے، تم زمین والوں پر رحم کرو، خدا تم پر رحم فرمائے گا۔ جو شخص لوگوں پر مہربان نہیں، خدا بھی اپنی رحمت سے اس کو نہیں نوازتا، رحم کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ رحم فرماتا ہے، بدکار کے دل سے رحمت و شفقت چھین لی جاتی ہے" قرآن مجید میں آپ کی صفت اس طرح بیان کی گئی ہے۔

لقد جآءکم رسولٌ من انفسکم	تمہیں میں سے تمہارے پاس ایک رسول آیا ہے، جس پر
عزیزٌ علیہ ما عنتم حریصٌ علیکم وبالمؤمنین	تمہاری تکلیف بہت شاق ہے، وہ تمہارا دلدادہ ہے
رؤفٌ رحیمٌ۔	اور مومنوں پر مہربان اور شفیق ہے۔

آپ کی رحمت پوری دنیا کے لیے عام تھی، آپ مسلمانوں اور مشرکوں پر احسان اور بھلائی کیا کرتے تھے۔ فقیروں، مسکینوں اور کمزوروں کے ساتھ آپ کو بے حد محبت تھی، فقراء کے ساتھ تو آپ کی محبت کا یہ عالم تھا کہ آپ نے خدا سے دعا مانگی تھی، کہ زندگی اور موت کے بعد انہیں میں آپ کو باقی رکھے، حضرت عائشہ رضؓ سے مروی ہے کہ آنحضرتؐ فرماتے تھے، "اے اللہ مجھے مسکینی کی حالت میں زندہ رکھ اور مسکینی کی حالت میں موت دے اور قیامت کے دن مسکینوں کی جماعت کے ساتھ اٹھا، حضرت عائشہ رضؓ نے دریافت کیا۔ ایسا کس لیے ہے، یا رسول اللہؐ؟ آپ نے فرمایا کیونکہ یہ لوگ مال داروں سے چالیس سال پہلے جنت میں داخل ہو جائیں گے، اے عائشہ رضؓ مسکین کو خالی ہاتھ مت لوٹانا، کھجور کا ایک ٹکڑا ہی سہی انہیں دے دینا، اے عائشہ رضؓ مسکینوں سے محبت رکھ، اور ان کی قربت میں رہ، خدائے تعالیٰ بھی قیامت کے دن تجھے اپنے قریب کرے گا۔"

الحاصل آپ کی زندگی فقیروں کے ساتھ بسر ہوتی تھی، جو کچھ آپ کے گھر میں موجود ہوتا آپ انہیں خیرات کر دیتے تھے آپ اُن پر اس قدر مہربان تھے کہ ایک آدمی آپ کے سامنے سے گزرا، آپ نے اپنے پاس کے ایک شخص سے دریافت فرمایا، اس کے بارے میں تیری کیا رائے ہے؟ اس نے جواب دیا۔ یہ شریف آدمیوں میں سے ہے، یہ اس قابل ہے کہ اگر کسی سے منگنی کرے، تو بیاہ دیا جائے اور اگر کسی کی سفارش

کرے، تو اس کی سفارش قبول کرلی جائے، پھر دوسرا شخص گزرا۔ آپ نے فرمایا اس کے متعلق تم کیا کہتے ہو؟ اس نے کہا کہ یہ فقیر آدمی ہے۔ یہ اس لائق ہے کہ اگر وہ منگنی کرنا چاہے، تو رد کر دیا جائے۔ اگر سفارش کرے تو نامنظور کر دی جائے، اور اگر کوئی بات کہے تو اس کو نہ سنا جائے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: "یہ شخص روئے زمین کے تمام آدمیوں میں بہتر ہے۔"

الغرض آنحضور اکرمؐ اپنی رحمت و شفقت اور تائید ایزدی کے ذریعہ، جو آپ کی فطرت میں ودیعت کی گئی تھی، فقراء و مساکین کی شان و عظمت اور ان کی توقیر و منزلت کو دوبالا کیا کرتے تھے۔ کمزوروں کی دست گیری اور یتیموں اور بیواؤں کی غم گساری اور ہمدردی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے، نیز آپ نے ان تمام کمزور طبقات پر وہ احسان کیا کہ تھوڑی مدت میں سوسائٹی کے نظام میں حیرت انگیز انقلاب برپا کر دیا، انہی بے چارے فقیروں اور مسکینوں میں وہ روح پھونکی کہ آخر کار انہوں نے مشرق و مغرب کو اپنا تابع فرمان بنا لیا۔ آنحضرتؐ فرمایا کرتے تھے: "تم اپنے مسکین اور کمزور آدمیوں کو میرے روبرو پیش کرو، کیونکہ انہی لوگوں سے تم فتح و غلبہ حاصل کرو گے۔" آپ ان کی جماعت میں بیٹھنے کو بہت مرغوب سمجھتے تھے، ایک مرتبہ آپ اپنی قوم کے بعض مالدار اشخاص سے گفتگو میں ایسے محو ہو گئے کہ ایک اندھے شخص کی طرف توجہ نہ فرما سکے اس وقت بطور عتاب و تنبیہ کے آپ پر وحی نازل ہوتی ہے۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰی اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی وَمَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّهٗ یَزَّكّٰی اَوْ یَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰی اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی۔	یہ پیغمبر چین بجبین ہو گئے اور متوجہ نہ ہوئے۔ اس بات سے کہ ان کے پاس اندھا آیا اور آپ کو کیا خبر شاید وہ سنور جاتا، یا نصیحت قبول کرتا۔ پس اس کو نصیحت کرنا فائدہ پہنچاتا، تو جو شخص بے پروائی کرتا ہے، آپ اس کی تو فکر میں پڑے رہتے ہیں۔

قریش یہ دیکھ کر، کہ آپ مسکینوں کی صحبت میں رہتے اور ان کے ساتھ کعبۃ اللہ جاتے ہیں، آپ کا مذاق اڑاتے اور کہتے:

اھؤلاء منّ اللہ علیھم من بیننا۔ "کیا یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے ہمارے درمیان احسان کیا ہے۔"

مگر آنحضرتؐ مساکین کے ساتھ بہت ہی مہربان اور شفیق تھے۔

عبداللہ بن عمرو بن عاص کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے اور فقراء کے ساتھ بیٹھے اور ان کو جنت کی خوشخبری سنائی، تو ان کے چہروں پر مسرت اور خوشخبری کے آثار نمایاں ہونے لگے، میں چونکہ ان کے گروہ سے نہیں تھا، اس لیے غم زدہ سا ہو گیا۔"

آپ نے سعد بن ابی وقاص کو مسکینوں پر اپنی بزرگی اور بڑائی جتاتے ہوئے دیکھا، تو فرمایا: "اس کو جو کچھ بھی بھلائی اور فتح و نصرت نصیب ہوگی، وہ انہی مسکینوں اور فقیروں کی صحبت کا فیض ہوگا۔" چنانچہ آپ کی یہ پیش گوئی اس وقت پوری ہوئی۔ جب کہ حضرت سعدؓ نے جنگ قادسیہ کے موقعہ پر مسکینوں کی قیادت فرمائی اور رستم کو شکست فاش دے کر کسریٰ کی سلطنت کو پامال کر دیا۔

مسکینوں کی وفات کے بعد بھی آپ کی رحمت اور آپ کا احسان ان پر برابر جاری رہتا۔ صحیح بخاری میں وارد ہے کہ آنحضرتؐ نے ایک دن ایک حبشی کو یاد فرمایا اور پوچھا کہ وہ کہاں ہے، لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! وہ تو فوت ہو چکا۔ آپ نے فرمایا تم نے کیوں

نہیں اس سے پہلے اس کی اطلاع دی، لوگوں نے کہا وہ ایسا ایسا تھا، گویا انہوں نے اس کی تحقیر و مذمت کی، آپ نے فرمایا اس کی قبر کہاں ہے، مجھے نشان دہی کرو، چنانچہ آپ اس کی قبر پر تشریف لائے اور نماز پڑھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غلاموں کی آزادی اور ان کی شان و منزلت کو بلند کرنے میں بہت ہی جد و جہد فرماتے تھے۔ ان کی راہ میں مال، دولت، حشمت غرض کہ ساری چیزیں قربان کر دیتے تھے، آپ ان پر بہت مہربان اور شفیق تھے۔ سب سے مشہور قصہ آپ کے غلام زید بن حارثہ کا ہے، آپ نے ان کو اپنے مالک (خود آنحضورؐ) اور ان کے والد کے درمیان اختیار دے دیا کہ جس کو چاہیں پسند کر لیں، لیکن انہوں نے آپ کو ایسے زمانے میں اپنے والد پر ترجیح دی، جب کہ آپ کے پاس نہ دولت و قوت تھی اور نہ مدافعت کا سامان، اس وقت آپ قریش کی مصیبتوں اور اذیتوں کا شکار بنے ہوئے تھے، ایک وہ دور بھی آیا جس میں آنحضرتؐ نے زید بن حارثہ کو غزوۂ روم کو لشکر روانہ کرتے وقت مہاجرین اور انصار کا قائد اعظم بنایا، جب موتہ کی لڑائی میں یہ شہید ہو جاتے ہیں، اس وقت آپ کی عمر صرف بیس سال کی تھی، تو قریش کے بڑے بڑے لوگ، صحابہؓ اور آنحضرتؐ آپ کے جنازے کے ساتھ تھے۔

اُوپر کے واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ غلاموں کی شان و عظمت کو دوبالا کرنے کے لیے اُن کے ساتھ کس قسم کا حسن سلوک کرتے تھے، آپ فرمایا کرتے تھے "غلاموں کے ساتھ بدسلوکی کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ یہ بھی آپ کا ارشاد ہے: اچھی لونڈی باعث یمن و برکت اور بُری لونڈی موجب شر ہے:"

خدمت گزاروں اور مزدوروں کے ساتھ آپ نہایت اچھا برتاؤ کرتے تھے، ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا "جب کوئی تمہارا خادم کھانا لائے، اگر وہ تمہارے ساتھ نہ بیٹھ سکے، تو اس کو ایک دو لقمے دے دو" معاویہ بن سوید کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہمارے پاس صرف ایک خادم تھا، ہم میں سے کسی نے اس کے ایک طمانچہ لگایا، آنحضرت کو جب اس کی خبر پہنچی، تو آپ نے فرمایا: اس کو آزاد کر دو۔ آپ سے کہا گیا کہ ان کے پاس سوائے اس کے کوئی اور خادم نہیں ہے، تو آپ نے فرمایا، اس سے خدمت لیتے رہو، جب کوئی دوسرا مہیا ہو جائے، تو اس کو آزاد کر دو" ابو مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے اپنے ایک غلام کو کوڑے سے مارا، میں نے اپنے پیچھے آواز سُنی مڑ کر دیکھا تو آنحضرتؐ یہ فرما رہے تھے: "اے ابو مسعود! تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ خدائے تعالیٰ اس غلام سے زیادہ تجھ پر قدرت رکھتا ہے۔"

آپ کی رحمت و شفقت کا یہ عالم تھا، کہ آپ کسی سے یہ سُننا بھی گوارا نہ فرماتے تھے کہ وہ اپنے غلام کو "اے میرے غلام یا میری لونڈی" کہہ کر پکارے، آپ مسلمانوں کو اس قسم کے القاب سے پکارنے کو باز رکھتے تھے۔ آپ کی یہ تعلیم و تربیت، غلاموں کو آزاد کرنے، ان کے اور آقا کے درمیان مساوات قائم کرنے، نخوت و غرور اور عصبیت جاہلیت کے فاسد و ردی تخیلات کو دُور کر کے ان کے اندر اخوت کی روح پھونکنے کے لیے بے حد مفید اور کارآمد ثابت ہوئی۔

معرور بن سویدؓ کہتے ہیں کہ میں نے ابو ذر کے جسم پر ایک چادر دیکھی۔ اسی قسم کی چادر ان کے غلام کے جسم پر بھی تھی، میں نے اس کا سبب دریافت کیا، تو انہوں نے کہا کہ آنحضرتؐ کو میں نے یہ کہتے ہوئے سُنا ہے کہ یہ تمہارے بھائی ہیں، خدا نے ان کو تمہارے حوالے کر دیا ہے۔ جس کسی کے ماتحت اس کا بھائی ہو تو اس کو چاہیے کہ یہ جو کچھ کھائے اور اوڑھے اس کو بھی وہی کھلائے اور پہنائے، تم

ان کی طاقت اور برداشت سے زیادہ کوئی تکلیف نہ دو، اگر کوئی مشکل کام ان کے سپرد کرو، تو تم بھی اس میں ان کی اعانت کرو اور ان کا ہاتھ بٹاؤ۔"

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دس سال خدمت کی، آپ نے مجھے کبھی اُف تک نہیں کہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسکینوں، خدمت گزاروں اور غلاموں سے میل جول رکھتے تھے، ان سے خندہ پیشانی سے گفتگو فرماتے، ان کی دعوت قبول کرتے، اُن کے بیماروں کی عیادت پرسی کے لیے تشریف لے جاتے، اُن کے جنازوں میں شریک ہوتے اور ان کے موتی پر نماز پڑھتے تھے۔

شریعت محمدیہ نے بیت المال میں سے غلاموں کی آزادی کا بھی حصہ مقرر فرمایا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غلام کو آزاد کرنے کے بعد اس کو کچھ دے دیا کرتے تھے، تاکہ وہ کوئی معاملہ کرے یا کسب معاش کا ذریعہ ڈھونڈے۔

آپ کی رحمت و شفقت اور احسان اور بھلائی نہ صرف انسانوں تک ہی محدود تھی، بلکہ آپ جانوروں پر بھی نرمی اور رحم فرماتے تھے۔ عربوں میں جانوروں اور انسانوں سے متعلق بے شمار ذلیل عادات اور انسانیت سوز حرکات پائی جاتی تھیں، آپ نے ان تمام کا سدباب کیا اور نفرت و بے رحمی کے جذبات کو ان سے دُور کر دیا، وہ لوگ زندہ حیوانات کے بدن سے گوشت کے ٹکڑے کاٹ کر بھون لیا کرتے اور ان کو کھاتے تھے، چنانچہ آپ نے اس بے رحمانہ فعل کو حرام قرار دیا۔ آجکل بھی صحرائے کبریٰ میں ایسے گروہ پائے جاتے ہیں جن میں اس دردانگیز فعل کی خو بو پائی جاتی ہے، جب وہ کسی جنگ کے لیے نکلتے ہیں اور ان کو دُور دراز مُلک کا سفر کرنا پڑتا ہے، تو اُونٹ کے پچھنے لگا کر اس کا خون چُوستے پھر اس کا گوشت پکا کر کھاتے ہیں، یا اس کی کوہان چیر کر اس کی چربی نکال کر کھا لیتے ہیں اور کوہان کو سی دیتے ہیں، چنانچہ آپ نے اس ایذا رساں فعل سے منع فرمایا، عرب اپنے جانوروں پر تیر آزمائی کرتے اور گھوڑوں کی دُمیں کاٹ دیتے تھے۔ آپ نے ان تمام حرکات سے روکا، ایک مرتبہ آپ نے ایک اُونٹنی کو بھوکی پیاسی بندھی ہوئی پایا، تو آپ نے اس کی رسی کھول دی اور اس کو چھوڑ دیا اور لوگوں کو نصیحت کی کہ جانوروں کے معاملہ میں خدا سے ڈرتے رہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ میں بے شمار مثالیں بیان فرمائی ہیں، آپ نے فرمایا کہ ایک آدمی سفر کر رہا تھا کہ اثنائے راہ میں اس کو سخت پیاس محسوس ہوئی، اس نے ایک کنواں دیکھا، اس میں اُتر کر پانی پیا، باہر نکلنے کے بعد اس نے دیکھا کہ ایک کتا پیاس کی شدت سے بہت بیتاب ہے، زبان باہر نکالے ہوئے مٹی چاٹ رہا ہے۔ اس شخص نے اپنے دل میں کہا کہ مجھے جیسی پیاس لگی تھی، ویسی ہی اس کتے کو بھی لگی ہے وہ کنوئیں میں اترا اور موزہ میں پانی بھر کر کتے کے مُنہ میں ڈالا، کتا سیراب ہو گیا۔ اس شخص نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کے گناہ معاف ہو گئے۔

لوگوں نے سوال کیا یا رسول اللہ! کیا جانوروں کے ساتھ حسن سلوک کرنے میں بھی ہمیں ثواب ملے گا، آپ نے فرمایا: ہر زندہ شئی میں ثواب ہے۔ آپ نے فرمایا ایک عورت بلی باندھے رکھنے کی وجہ سے دوزخ میں داخل ہو گئی۔ نہ اس نے اس کو کچھ کھلایا اور نہ ہی اسے کھلا چھوڑا تاکہ وہ زمین کے کیڑے کوڑے کھا کر اپنی بھوک رفع کرتی۔

یہ تمام تمثیلات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کے روبرو پیش کیں جن کو گمان تھا کہ حیوانوں کے ساتھ سلوک کرنے میں ثواب نہیں ملتا۔ مسلمانوں کے نفوس میں ان صفات کی وجہ سے نرمی اور رحم دلی کے جذبات پیدا ہو گئے، اور مشرق و مغرب میں، جو لوگ ان کے اثرات

تعلیمات سے فیض یاب ہوئے، ان میں ایک نمایاں اثر اور حیرت انگیز تبدیلی پیدا ہو گئی۔ جاہلیت میں یہ بھی طریقہ رائج تھا کہ اپنے جانوروں کی پیٹھ کو منبر بنا لیا کرتے تھے۔ آپ نے ان کو ایسا کرنے سے منع کیا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے جانور اس لیے مسخر کیے ہیں کہ تم ایک شہر سے دوسرے شہر کو پہنچ سکو، اس نے تمہاری حاجتوں کو بر لانے کے لیے زمین بنائی ہے، تم اس میں اپنی ضرورتوں کی تکمیل کرو۔

آپ کی رحمت و شفقت کی وسعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آپ چھوٹے پرندوں تک کو کوئی گزند پہنچانا گوارہ نہ فرماتے تھے عبدالرحمٰن بن عبداللہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے، ہم نے ایک سرخ پرندہ کو دیکھا، جس کے ساتھ اس کے دو چھوٹے بچے بھی تھے، ہم نے ان کو پکڑ لیا۔ ان کی ماں پھڑپھڑاتے ہوئے آئی۔ آنحضرتؐ جب تشریف لائے تو آپ نے فرمایا کس نے ان کی ماں کو صدمہ پہنچایا ہے؟ اس کے بچے اس کو واپس کر دو۔

آنحضرتؐ نے حضرت عائشہ رضؓ کو دیکھا کہ آپ اونٹ پر بیٹھی ہوئی اس پر سختی کا برتاؤ کر رہی تھیں آپ نے فرمایا، جو نرمی نہیں کرے گا وہ اپنے اوپر اپنی بھلائی حرام کرے گا۔

انسانوں اور جانوروں کے ساتھ آپ کی رحمت و اُنس کا یہ تقاضا تھا کہ جب آپ کسی بچے کو دیکھتے یا اس سے ملتے تو محبت اور خوشی کے آثار آپ کے چہرے سے نمایاں ہونے لگتے تھے۔ کبھی کبھی آپ اپنے صحابہؓ کے بچوں کو اُٹھا کر کھلایا کرتے تھے۔ جب لڑکوں پر سے گزرتے تو ان پر سلام کرتے تھے۔ جابر بن سمرہ حدیث بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرمؐ نے لڑکوں کو بھاگتے ہوئے دیکھا، تو آپ بھی ان کے ساتھ دوڑنے لگے۔ جب کبھی کوئی لڑکا آپ کو راستہ میں مل جاتا، تو آپ اس کو خوش کرنے کے لیے اپنی اونٹنی پر بٹھا لیتے تھے، بچے والدین سے بڑھ کر آپ سے پیار کرتے تھے۔

حضرت انس رضؓ کہتے ہیں کہ یہ نہیں پتہ چل سکا کہ آنحضرتؐ سے بڑھ کر اپنے اہل و عیال کو چاہنے والا کوئی ہوا ہو۔ اسامہ بن زید کہتے ہیں کہ جب میں بچہ تھا، تو رسول اللہؐ مجھے اٹھا لیتے اور اپنے ایک زانوئے مبارک پر بٹھاتے اور حسن رضؓ کو اپنے دوسرے زانو پر پھر ہم دونوں کو بھینچ کر فرماتے "اے اللہ ان دونوں پر رحم فرما کیوں کہ میں ان پر رحم کھاتا ہوں اور اُن سے پیار کرتا ہوں" بیان کیا جاتا ہے کہ بعض اعراب نے آنحضرتؐ کو خود اپنے اور اپنے صحابہ رضؓ کے بچوں کو محبت اور پیار کرتے ہوئے دیکھا، تو بہت تعجب کیا۔ ایک مرتبہ اقرع بن حابس نے آپ کو دیکھا، کہ آپ حسین رضؓ کو بوسہ دے رہے ہیں، تو کہا یا رسول اللہؐ! میرے دس بچے ہیں۔ آج تک میں نے کسی کو پیار نہیں کیا اس قسم کے سوالات بعض لوگ آپ کی غیر معمولی شفقت و محبت پر کرتے رہتے تھے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کو بے رحمی، سنگ دلی اور قساوت قلب سے منع فرماتے تھے، حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہؐ کے پاس ایک اعرابی آیا اور کہنے لگا کیا آپ لوگ بچوں کو پیار کرتے ہیں۔ مگر ہم تو اُن سے کبھی پیار نہیں کرتے۔ آپ نے فرمایا "جب خدا نے تیرے دل سے شفقت و رحمت چھین لی ہے، تو میں مقدور بھی اس کا ذمہ دار ہو سکتا ہوں۔"

آپ کے جذبہ رحمت کا یہ اثر تھا کہ آپ پر جس طرح مُسرت و خوشی کے آثار و جذبات ظاہر ہوتے، اس طرح آپ کا دل حزن و ملال کی کیفیات و تاثرات میں ڈوب جاتا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ سنگ دل و ستمگار لوگ آپ کی رقت قلب اور فراوانی شفقت پر تعجب کرنے لگتے۔ آپ ان کو ظاہر کرتے کہ یہ بھی رحمت کی ایک قسم ہے، جس میں کوئی عیب و نقص نہیں۔

آپ کی ایک صاحبزادی کی وفات ہوگئی، تو آپ کا دل پگھل رہا تھا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو رہے تھے۔ سعد بن عبادہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: "یہ رحمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دل میں پیدا کی ہے، خدا اپنے رحم دل اور شفیق بندوں پر رحم کرتا ہے۔"

سعد رضؓ جب بیمار پڑ گئے، تو آنحضرتؐ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے، دیکھا کہ یہ اپنی بیوی کی آغوش میں پڑے ہوئے ہیں، آپ نے فرمایا کیا وفات پا گیا؟ لوگوں نے کہا نہیں یا رسول اللہ! آپ رو دئیے اور فرمایا سنو! اللہ تعالیٰ آنکھوں سے آنسو جاری ہونے اور دل فگار غمزدہ ہونے کی وجہ سے عذاب نہیں دیتا، بلکہ۔ اپنی زبان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ اس کی وجہ سے عذاب دیتا ہے۔"

یہ رحمت نہ صرف چھوٹوں بڑوں اور مومنوں کے ساتھ مختص تھی، بلکہ دیگر ادیان و ملل کے دشمنوں، مشرکوں اور مخالفوں پر بھی شامل تھی کسی جنگ میں ایک بچہ قتل کر دیا گیا، آپ کو سن کر بہت ہی صدمہ ہوا، بعضوں نے آپؐ سے کہا یا رسولؐ اللہ! آپ کیوں اس قدر غم زدہ ہیں، وہ تو مشرکین کا بچہ تھا، آپ برا فروختہ ہو گئے اور فرمایا تم کیا کہتے ہو، کیا تم ان سے بہتر ہو گئے۔ وہ تو اپنی فطرت پر ہیں، تم بچوں کو قتل کرنے سے پرہیز کرو، تمہیں بچوں کو قتل نہ کرنا چاہیے۔"

امام بخاریؒ نے جابر بن عبداللہ سے روایت کی ہے کہ ہمارے سامنے ایک جنازہ گزرا، آنحضرتؐ اٹھ کھڑے ہوئے، آپ کے ساتھ ہم بھی اٹھ گئے۔ ہم نے کہا یا رسولؐ اللہ! وہ تو یہودی کا جنازہ ہے، آپ نے فرمایا کیا وہ انسان نہ تھا؟ جب کوئی جنازہ تمہارے روبرو سے گزرے، تو تم اس کے لیے اٹھ جاؤ، جب نجاشی نے وفات پائی، تو آپ نے اپنے اصحاب کو اس کی خبر مرگ سنائی، پھر آگے بڑھے، لوگوں نے آپ کے پیچھے صف باندھی، آپ نے نجاشی کی نماز جنازہ غائبانہ ادا کی۔"

آپ کی یہ وہ رحمت شاملہ ہے، جو کسی وطن، یا دین، یا ملت، و گروہ کے ساتھ مخصوص نہ تھی، آپ کی نظر میں انسان و حیوان کے ساتھ سلوک اور حسن معاملہ کرنے میں کوئی فرق نہیں تھا۔

بعض لوگوں نے آپ سے کہا کہ اپنے دشمنوں پر ملامت اور لعنت بھیجیں، آپؐ نے فرمایا، میں لعنت بھیجنے کے لیے نہیں آیا، بلکہ سراپا رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں، جب عبداللہ بن ابی بن سلول کی وفات ہوئی جو مدینہ میں منافقوں کا سردار تھا، جس نے جنگ احد میں اپنے ساتھیوں کو واپس لوٹا لیا اور آنحضرتؐ کو ایذائیں پہنچانے اور آپؐ کو رسوا کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی، تو اس کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے نے آنحضرتؐ سے آپ کی قمیص اس کی تجہیز و تکفین کے لیے طلب کی، آپؐ نے منافقین کے سرغنہ کیلئے اپنی قمیص مبارک اتار کر دے دی کیا اس قسم کا سلوک و احسان آج تک کسی نے اپنے دشمن جانی کے لیے کیا ہے؟ یہی نہیں بلکہ آنحضرتؐ اس کی قبر پر نماز پڑھنے کے لیے تشریف لے گئے، عمر بن خطاب یکایک آپؐ کے روبرو آئے اور کہا کیا آپ ابن اُبی پر نماز پڑھنا چاہتے ہیں، حالانکہ اس نے ایک دن آپ کی شان میں ایسا اور ایسا کہا تھا، یہ الفاظ حضرت عمر رضؓ بار بار دہرا رہے تھے، آنحضرتؐ نے مسکراتے ہوئے فرمایا اے عمر رضؓ خاموش رہ! حضرت عمر رضؓ فرماتے ہیں کہ جب میں نے اپنے جملہ کو آپ کے روبرو بار بار لوٹانا شروع کیا، تو آپ نے فرمایا مجھے اس امر میں اختیار دیا گیا ہے، لہٰذا میں نے اس کو اختیار کیا، اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ ستر مرتبہ سے زیادہ اس کی مغفرت کی دعا کروں، تو اس سے بھی زیادہ مغفرت کی دعا کرتا، پھر آپ وہاں سے لوٹ گئے۔

استغفار اور عدم استغفار کے بارے میں منافقین کی شان میں یہ آیت نازل ہوتی ہے۔

استغفر لھم اَولا تستغفر لھم،	خواہ تو اُن کی مغفرت طلب کرے یا نہ طلب کرے، اگر
ان تستغفر لھم سبعین مرۃً فلن	ستر بار بھی اُن کے لیے مغفرت چاہے تب بھی ہرگز اللہ تعا
یغفر اللہ لھم۔	ان کو نہیں بخشے گا۔

جب آپ کو اس معاملہ میں اختیار دیا گیا، تو آپ کی رحم پرور طبیعت میں اپنے دشمنوں کے استغفار کے لیے ایک ولولہ سا پیدا ہوا۔ یہاں تک آپ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ "اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ ان کی مغفرت کے لیے ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کروں، تب بھی اس سے زیادہ کے لیے میں تیار ہو جاتا۔"

یہ وہ رحم دلی اور شفقت کا جذبہ ہے، جو اپنے دشمنوں، دوستوں اور تمام لوگوں کے لیے وسیع و عام تھا۔

آپ نے ایک مرتبہ ایک اعرابی کو، جو آپ کے پیچھے نماز پڑھ رہا تھا۔ یہ کہتے ہوئے سنا کہ "اے اللہ مجھ پر اور محمدؐ پر رحم فرما اور ہمارے سوا کسی پر رحم نہ کر" جب آپ سلام پھیر کر فارغ ہوئے، تو فرمایا: "تو نے رحمت کے وسیع دائرہ کو تنگ کر دیا۔"

یہ اور اسی قسم کی مذکورۂ بالا مثالوں سے، جن کو آنحضرتؐ کی رحمت و شفقت کے بارے میں ہم نے پیش کیا ہے، واضح ہوتا ہے کہ آپ کی رحمت و شفقت، رقت و رافت نہ صرف اپنے گھر اور خاندان والوں کے ساتھ مخصوص تھی، بلکہ تمام دنیا کو گھیرے ہوئے تھی، یہی وہ وسیع و غیر محدود رحمت ہے، جس کی وجہ سے آپ اپنے دشمنوں کے حق میں بھی دعائے خیر کرتے ہیں، حالانکہ جنگِ اُحد میں آپ سخت زخمی کیے گئے تھے صحابہؓ نے آپ کو اپنے دشمنوں پر بددعا کرنے کے لیے زور دیا تھا، یہ وہ عالم تھا، کہ آپ کے چچا حمزہؓ کے ساتھ انسانیت سوز حرکات روا رکھی گئی تھیں، ان کے ہاتھ پیر اور کان کاٹ دیے گئے تھے، آپ کے انصار میں سے بعض مقتول اور بعض زخمی ہو گئے تھے۔ یہی وہ رحمتِ کاملہ ہے، جس نے ثقیف والوں کے لیے طائف میں دعا کرنے پر آمادہ کیا۔ حالانکہ انہوں نے آپ کی حمایت سے انکار کر دیا تھا، اور آپ کو سخت ایذائیں پہنچائی تھیں، اسی شفقت و محبت کا تقاضا تھا کہ جس نے قریش کی تجارت اور آمد و رفت کے لیے یمامہ و شام کے راستے بے خوف و خطر کھول دیے تھے، جب کہ انھوں نے آپ سے صلہ رحمی کی بھیک مانگی اور اپنے اہل و عیال کے فقر و فاقہ کی بے تابیوں کی شکایت کی تھی، اور یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے آپ کو اپنے گھر سے نکال دیا تھا اور مدینہ میں آپ کا محاصرہ کر لیا تھا۔

آنحضرتؐ کی رحمت و شفقت اور آپ کے احسان و کرم سے دوست و دشمن، قوی و کمزور، آزاد و غلام اور جانور تک فیض یاب ہوئے، آپ کا دل اسی رحمت کے جذبہ سے معمور تھا۔ اس کے نتیجہ میں آپ کے چہرہ پر مسرت کی لہریں دوڑنے لگتی تھیں۔ آپ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بھی جاری ہو جاتی تھیں، آپ کے ہاتھوں میں جود و کرم کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا تھا۔ یہی وسیع ترین رحمت آنحضرتؐ کے ظاہر و روشن صفات میں سے ہے، جو اپنی جانب تمام مشاہیر اور بہادروں کو کھینچتی رہے گی، اور یہ بہادر جذبۂ رحمت میں آپ سے سبقت لے جانا چاہیں گے لیکن ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکیں گے، اور آنحضرتؐ اِس صفت میں تنہا تمام کے پیشوا اور قائدِ اعظم تسلیم کیے جائیں گے۔

حضورؐ نے انسانی معاشرت کو کیا دیا

ڈاکٹر فواد فخرالدین (انڈونیشیا)　　ترجمہ: خلیل حامدی

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جس روز دینِ حق کا پیغام لے کر دنیا میں تشریف لائے ہیں، وہ روز دنیا کے اندر نئی روشنی کے ظہور کا روز تھا۔ اسی نئی روشنی کی برکت تھی کہ اس نے انسان کو وہ عقیدہ اور تصور دیا، جو سراسر مکارمِ اخلاق اور فضائل و محاسن کا مجموعہ تھا اور تسامح، رواداری اور رذائل سے اجتناب کی دعوت تھی۔ اس عطیہ نے انسانیت کے وجود کو افراط و تفریط کے گرداب سے نکال کر اعتدال پر فائز کیا۔ عورت کو، جو انسانی معاشرہ میں انتہائی پستی کے مقام پر گر چکی تھی، عزت و تکریم کے اعلیٰ مراتب سے ہمکنار کیا۔ جمہوریت کو رواج دے کر حقوقِ انسانی کی حد بندی کر دی۔ جو اس سنہری اصول پر قایم تھی کہ کسی عربی کو عجمی پر اور کسی سفید فام کو سیاہ فام پر کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ اولادِ آدم باہم دندانہ ہائے شانہ کی طرح ہیں۔

اسلام کے ظہور نے دنیا کے تختہ پر ایک نئے تمدن اور ایک نئی تہذیب کو جنم دیا۔ دنیا کا فرسودہ نظام بدل کر رکھ دیا۔ دنیا کے اندر بہ اندازِ نو نظم و نسق قایم کیا، دستورِ زندگی کی طرح ڈالی۔ انسانوں کے اندر ایک ایسی رُوح پھونک دی جس نے فرد اور جماعت کے درمیان الفت و محبت، اخوت و تعاون کے جذبِ مقناطیسی کو نشو و نما بخشی۔ شوریٰ فی الامر پر مملکت کی بنیادیں استوار کیں اور دین میں اکراہ و اجبار کی کوئی گنجایش نہ رکھی۔ "تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین" کہہ کر گویا اس بات کا اعلان کر دیا کہ اسلام کی اطاعت کا قلادہ گلے میں ڈالنے کے لیے ہر انسان کو اختیار اور آزادی حاصل ہے، کسی شخص کو اس لیے نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھا کہ وہ کافر ہے، بلکہ اہلِ کتاب کے ساتھ ازدواجی تعلقات استوار کرنے کی بھی اجازت دے دی۔ الغرض اس طرح کے دوسرے اصول اس امر کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں کہ اسلام روادارانہ نظریات کا حامل ہے اور ایک ایسے جہانِ نو کی ایجاد اس کے پیشِ نظر ہے، جو بغض و عداوت کی آلودگیوں سے مُبرّا اور تعصب و تنگ نظری کے جذبات سے پاک ہو اور نوعِ انسان کے لیے امن و سلامتی کا گہوارہ ثابت ہو سکے۔

اس مبارک گھڑی میں جس چیز کا بار بار جائزہ لینے کی ضرورت ہے، وہ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ اور آپؐ کے محامد و فضائل ہیں۔ یہ معلوم کیا جائے کہ دعوتِ دین کو پھیلانے میں آپؐ نے کس طرح انتھک کوششیں کیں۔ گھر بار کو خیرباد کہہ کر کس طرح سفر و غربت کی صعوبتوں سے دوچار رہے۔ دشمن جنگ و جدال پر اتر آئے، تو ان کے سامنے سینہ سپر ہو گئے اور بہت سے معرکے سر کیے، قوم کی طرف سے ایذائیں دی گئیں، تو صبر و شکیب کے ساتھ انہیں سہا۔ یہ تمام واقعات آپؐ کے فضائلِ حسنہ اور اعلیٰ کردار کی شہادت دیتے ہیں۔ خود ذاتِ خداوندی نے آپؐ کی تعریف میں فرمایا ہے:

فبما رحمة من الله لنت لهم و لو كنت فظاً غليظ القلب لا	اے پیغمبر! یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم لوگوں کے لیے بڑے نرم مزاج واقع ہوئے۔ ورنہ اگر

انفضوا من حولك۔ (آل عمران ـ ۱۵۹)	کہیں تم تندخو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب تمہارے گرد وپیش سے چھٹ جاتے۔
انك لعلٰی خلق عظیم۔ (القلم ـ ۴)	بیشک آپ انسانی اخلاق کے بلند مدارج پر فائز ہیں۔

اسلام دنیا کے سامنے بے شمار مفید اور گرانقدر اصول لے کر آیا ہے۔ اس نے انسانوں کا ایک گروہ تیار کر دیا، جس کی اساس اعلیٰ انسانی اخلاقیات پر قایم تھی اور اس عقیدے پر قایم تھی، جو کائنات کے فرمانروا نے اپنی بشری مخلوق کے لیے انفرادی و اجتماعی زندگی کا نظام بنا کر بھیجا ہے اور اس میں ہر اس چیز کی وضاحت کر دی، جس کی انسانوں کو اس جہانِ بے ثبات میں ضرورت لاحق ہو سکتی ہے اور ان تمام اعمال کا نقشہ پیش کر دیا ہے، جو آخرت کی زندگی میں سلامتی و نجات کے ضامن ہو سکتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس یادگارِ دوام آثار میں ہمارے لیے جو منفعت بخش پہلو ہیں، وہ آپؐ کا عمل اور آپؐ کا اُسوہ ہیں، جو آپ کی ذاتی زندگی سے لے کر خاندانی اور قومی زندگی تک پھیلا ہُوا ہے۔ آپؐ کا یہی اُسوہ ہماری عزت و سُرخروئی کے لیے دنیا میں ہماری قوت کی بقا کے لیے بہت بڑا بیش قیمت اور نایاب سرمایۂ وراثت ہے۔ آپؐ کے اُسوہ حسنہ اور آپؐ کی تعلیم کا خلاصہ چند نکات میں عرض کرنے کی کوشش کرتا ہُوں:

۱۔ دعوتِ حق کو خلقِ خدا تک پہنچانے میں آپ نے کوشش کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ نہایت صبر اور بردباری کے ساتھ اس پیغام کو پہنچایا۔ یہ جدوجہد کسی دُنیوی غرض اور ذاتی مفاد کی خاطر نہ تھی بلکہ خالص خدا کے لیے تھی۔ اسی بات کی تشریح کرتے ہُوئے آپؐ نے فرمایا تھا:

واللہ لو وضعوا الشمس فی یمینی والقمر فی یساری علٰی ان اترك ھذا امرما ترکته حتی یظھرہ اللہ او اھلك دونه۔	بخدا اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ پر سورج لا رکھیں اور بائیں ہاتھ پر چاند کہ میں اس کام سے باز آجاؤں، تو میں کبھی نہیں باز آؤں گا۔ یہاں تک کہ اللہ اس دین کو غالب کر دے یا میری جان جاتی رہے۔

دنیوی مال و متاع سے ہمیشہ آپ نے بے اعتنائی اختیار فرمائی۔ جب آپؐ کے سامنے سونے کے پہاڑ بھی پیش کیے گئے، تو آپ نے لینے سے انکار کر دیا اور شرف و کرامت کی زندگی بسر کرنے کے لیے معمولی کفاف پر اکتفا کی۔

۲۔ تواضع اور رواداری آپؐ کی پُوری زندگی میں ہمیں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا، جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ آپ نے کبھی اپنے آپ کو دُوسروں سے برتر رکھنے کی کوشش کی ہو بلکہ آپؐ کی مجلس غربا و مساکین اور معمولی حیثیت کے لوگوں کے ساتھ رہتی تھی اور جس طرح رؤسا اور سرداروں کے ساتھ آپؐ کا سلوک تھا، اسی طرح نچلے درجہ کے لوگوں کے ساتھ آپ کا مساویانہ طرزِ عمل تھا۔ آپؐ کی روادارانہ تعلیم کی اس سے بڑھ کر کیا مثال ہو سکتی ہے کہ وہ قریش جو ہمیشہ آپ کے جانی دشمن رہے، آپؐ کو ایذائیں دیتے رہے، آپؐ کے رفقا اور ساتھیوں کو آپؐ سے توڑنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہے۔

یہاں تک کہ ترکِ وطن پر انہوں نے آپؐ کو مجبور کر دیا۔ ان تمام سختیوں اور ایذارسانیوں کے باوجود وہی قریش فتح مکّہ کے دن جب گرفتار ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں آتے ہیں، تو آپؐ کی زبان مبارک سے ان کے حق میں یہ کلمات جاری ہوتے ہیں:

اذھبوا فانتم الطلقاء لا تثریب علیکم الیوم یغفر اللہ لکم وھو ارحم الراحمین۔	جاؤ تم آزاد ہو۔ آج تم پر کوئی گرفت نہیں اللہ تمہیں معاف کرے گا۔ اور وُہ سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔

۳۔ عام مساوات آپؐ نے جس باہمی مساوات اور طبقاتی کشمکش کے استیصال کا درس دیا، اس کی عملداری اس قدر ہمہ گیر تھی کہ آپؐ کا گھر اور اپنا خاندان بھی اس میں شامل تھا۔ آپؐ کے قبیلہ کے کسی فرد کو دوسروں پر کسی درجہ کوئی فضیلت و برتری حاصل نہ تھی۔ اس سلسلہ میں آپؐ کا وہ ارشاد مبارک بہت مشہور ہے، جو آپؐ نے اپنی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو خطاب کرتے ہُوئے فرمایا تھا:

یا فاطمہ بنت محمد، اعملی فانی لا اغنی عنك من اللہ شیئًا۔	اے محمدؐ کی بیٹی فاطمہ! اپنے لیے نیک عمل کر لو۔ میں اللہ کی گرفت سے تمہیں ذرّہ بھر نہیں بچا سکتا۔

اسی طرح دوسرے افرادِ خاندان کو مخاطب ہو کر آپؐ نے فرمایا تھا:

یا آل محمد لا یاتینی الناس باعمالھم وتاتون بانسابکم اعملوا فانی لا اغنی عنکم من اللہ شیئًا۔	اے محمدؐ کی آل! ایسا نہ ہو کہ لوگ میرے پاس نیک اعمال لے کر آئیں اور تم حسب و نسب لے کر۔ عمل کرو میں اللہ کی گرفت سے تمہیں بالکل نہیں بچا سکتا۔

عام انسانی مساوات کی تشریح کرتے ہُوئے فرمایا:

اجعلوا الناس فی الحق سواءً قریبھم کبعیدھم و بعیدھم کقریبھم۔	حقوق میں تمام انسانوں کو برابر رکھو۔ اس طرح کہ اپنے بیگانوں کی طرح اور بیگانے اپنوں کی طرح ہوں۔

۴۔ اسلامی اور انسانی اخوّت یہ وہ تعلیم تھی جس نے قوم کی منتشر صفوں میں اتحاد و الفت کے رُوح پرور گلشن کھلا دیے اور مدّت سے بچھڑے ہوُوں کو گلے ملا دیا۔ اخوت اسلامی کی بنیاد اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر ہے:

انما المومنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم واتقوا اللہ لعلکم ترحمون۔	تمام مومن بھائی بھائی، پس تم اپنے بھائیوں کے درمیان صلح رکھو اور اللہ سے ڈرو تاکہ وہ تم پر رحم کرے۔

اسی نعمت کا ذکر کرتے ہُوئے فرمایا:

واذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ کنتم اعداءً	اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو، جو اس نے تم پر کیا ہے

فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمته اخوانا۔

تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اس نے تمہارے دل جوڑ دیے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔

اسی نازک آبگینہ کی حفاظت کے اصول و قواعد بیان کرتے ہوئے آنحضرتؐ نے فرمایا:

ا۔ ولا تحاسدوا و لا تناجشوا و لا تباغضوا و لا تدابروا و لا یبیع بعضکم علی بعض و کونوا عباد اللہ اخوانا۔

آپس میں ایک دوسرے پر حسد نہ کرو اور نہ آپس میں کسی کو دوسرے کے خلاف بھڑکاؤ اور نہ آپس میں بغض رکھو اور نہ آپس میں کسی کی پیٹھ پیچھے برائی کرو اور نہ تم میں سے کوئی کسی کی بیع پر بیع کرے اور تم اللہ کے بندو بھائی بھائی بن جاؤ۔

ب۔ المسلم اخو المسلم لا یظلمه و لا یخذله و لا یکذبه و لا یحقره التقوٰی ھٰھنا و یشیر الی صدره ثلاث مرّاتٍ بحسب امرئٍ من الشر ان یحقر اخاه المسلم۔

مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے اور نہ اس سے جھوٹ بولتا ہے اور نہ اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ (آپ اپنے سینہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تین بار فرماتے ہیں)، تقوٰی یہاں ہے۔ انسان کو شر سے یہ بات کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر جانے۔

ج۔ کل المسلم علی المسلم حرامٌ دمه و ماله و عرضه۔

"ہر مسلمان کا دوسرے مسلمان پر خون، مال، آبرو حرام ہے۔"

عالمگیر انسانی برادری کے قیام کی دعوت دیتے ہوئے قرآن نے بیان کیا ہے:

یٰٓایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدةٍ و خلق منھا زوجھا وبث منھما رجالاً کثیرًا و نسآء و اتقوا اللہ الذی تسآءلون به و الارحام۔

لوگو! اپنے رب سے ڈرو، جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیے، اس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو اور رشتہ و قرابت کے تعلقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو۔

۵۔ اعتماد علی النفس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت کا ایک اہم پہلو یہ بھی تھا کہ آپؐ قوم کے اندر اعتماد علی النفس اور خودداری کی اعلیٰ صفات کو اجاگر کرنا چاہتے تھے تاکہ ایک طرف ہر ہر فرد بذاتِ خود قوت کی چٹان بن جائے اور دُوسری طرف پُوری اُمت قوت و طاقت کا ایک ایسا ہمالہ بن جائے، جو حوادث کے ہجوم اور جنگجوؤں کی شعلہ باری کے موقع پر دوسروں کے سامنے تعاون اور امداد کی جھولی پھیلانے کے بجائے اپنی ذات پر اعتماد کرنے والی اور اپنی مدد آپ کرنے والی ہو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے،

و اعدوا لهم ما استطعتم من قوة و من رباط الخيل ترهبون به عدو الله و عدوكم۔	جہاں تک تمہارا بس چلے زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے اُن کے (دشمن کے) مقابلے کے لیے مہیا رکھو، تاکہ اس کے ذریعہ سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو خوفزدہ کرو۔

یہ ہے مختصر اور سرسری خلاصہ، جو پیغمبرؐ انسانیت کی تعلیم میں ہمیں ملتا ہے اور پیغمبرؐ انسانیت کے یومِ ولادت پر اس کے اعادہ و تکرار کی ہمیں ضرورت ہے۔ یہ وہ انمٹ آثار ہیں جو اُمتوں اور قوموں کو زندگی کے میدانِ عمل میں فلاح و بہبودی سے متمتع کرتے ہیں۔ اسلام نے اس ربانی تعلیم اور صحیح فکر کی طرف تمام دنیا کو دعوت دی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انسانیت کی بہتری اور سلامتی بھی اسی میں ہے کہ زمامِ حیات اسی صالح قائد کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ جس قوم نے اپنی زندگی کی گاڑی اس فکر و عقیدے کے خطوط پر چلائی ہے اور اسلام کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیا ہے، وہ عزت و شوکت اور تہذیب و تمدن کے بالاترین مدارج پر جاگزین ہُوئی ہے۔

ان تمام گزارشات کے بعد ہم ملّتِ اسلامیہ کو خواہ وہ مسلمان ممالک کی ہو یا غیر مسلم ممالک کی، دعوت دیتے ہیں کہ تعلیمِ نبوی ؐ کی روشنی میں وہ اپنے موجودہ نظامِ حیات اور طرزِ عمل پر غور و فکر کرے کیونکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ امت اپنے اعمال میں اور زندگی کے معاملات میں عملی ربط و اتصال سے دامن کش ہے اور ایمان کی دولت سے بہرہ ور ابھی تک گوشہ ہائے خلوت کی زینت ہے اور مضبوط محاذ بنانے کے لیے اور مسلم قوم کے اندر عملی تعاون (CO-OPERATION) کی روح پھونکنے کے لیے ان میں کوئی حرکت نہیں ہوتی۔ حالانکہ مسلم معاشرہ گروہ بندی اور جماعت پرستی کا شکار ہو چکا ہے اور ہر گروہ کا عقیدہ مختلف اور مسلک جداگانہ ہے۔ نہ افکار و نظریات میں اتحاد پایا جاتا ہے اور نہ اصول و مبادی میں ہم آہنگی نظر آتی ہے اور سب سے افسوسناک بات یہ ہے کہ اپنی اس زبوں حالی کے باوجود مسلمان بڑے تساہل پسند ہو چکے ہیں۔ مستقبل بینی اور دُور اندیشی ان کے پاس نہیں پھٹکتی اور اپنی مدد آپ کرنے کا اصول ان کے نزدیک مضحکہ خیز بات ہے۔ عمل و کردار کے لحاظ سے اس قدر کھوکھلے ہیں کہ موجودہ خطرناک حالات (جن میں سب مسلمان ممالک گھرے ہُوئے ہیں) کی ایک ٹھوکر کی تاب نہیں رکھتے۔

آخر میں ہم یہ گزارش کریں گے کہ موجودہ حالات میں مسلمانوں پر، مشرق کے رہنے والے ہوں یا مغرب کے، یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور کام کا ایسا پروگرام بنائیں، جو ملّت کے لیے مفید اور نتیجہ بخش ہو، اور اس سکیم کو بروئے کار

لانے کے لیے اجتماعی عمل کے لیے فضا ہموار کریں ۔ اجتماعی تعاون پیدا کرنے کی یہ صورت نہیں ہے کہ چند دھواں دھار کانفرنسیں منعقد کر دی جائیں اور ان میں فصیح و بلیغ لیکچر دیے جائیں اور گھڑی دو گھڑی باغوں کی سیر کرا دی جائے ۔ بلکہ اس ورطۂ مذلت سے نکلنے کے لیے ٹھوس طریقے عمل میں لائے جائیں ۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے جس امر کی ضرورت ہے ، وہ یہ ہے کہ ایک ایسا فنڈ جاری کیا جائے جس کے ذریعہ اسلامی علاقوں میں ، جہاں دینی تحریکیں ہیں ، ان کی عام اشاعت و پبلسٹی کی جائے ۔

نبی کریمؐ کے بنیادی عناصر

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی امتیازی خصوصیت اس کی وسعت اور ہمہ گیری ہے۔ بعثت محمدیؐ سے قبل لاتعداد انبیاء، مصلحین و حکماء گزر چکے تھے۔ اسلام نے مسلمانوں کو یہ تعلیم دی کہ ان سب کی صداقت کا اقرار جزوِ ایمان ہے۔ لیکن مرورِ ایام سے ہر جگہ حق و باطل کی آمیزش ہوگئی ہے اور ہر جگہ ادیان میں غلو پیدا ہو گیا ہے۔ اب اس کی ضرورت ہے کہ وضاحت کے ساتھ حق کو حق اور باطل کو باطل ثابت کیا جائے۔ اور اس کے علاوہ ان تمام اساسی حقایق کو ایک تنظیم میں یکجا کیا جائے، جو مختلف زمانوں اور مختلف ملتوں میں منتشر ہیں۔ تعلیم محمدیؐ کی اساس توحید ہے۔ اگر خدا کی ذات اور اس کے صفات کے متعلق انسان کا عقیدہ منزّہ اور خالص ہو جائے تو باقی تمام صداقتیں لازمی نتائج کے طور پر حاصل ہو جاتی ہیں۔ گویا توحید ایک لبریز حیات تخم ہے اور اگر قلبِ انسانی اس کی آبیاری کرے، تو حیات و کائنات کے تمام حقایق شاخ و شگوفہ و برگ و ثمر کی طرح اس کے اندر سے پھوٹنے لگیں گے اور زندگی پھلنے پھولنے اور پھیلنے لگے گی۔ توحید ہی کے صحیح تصور سے یہ کائنات بھی قابل فہم ہو جاتی ہے اور زندگی کا مقصود بھی متعین ہو جاتا ہے۔ حکمت یا سائنس کا کام کائنات کی کثرت اور گوناگونی میں وحدتوں کی تلاش ہے۔ جسے حکمت کی زبان میں قوانینِ فطرت کہتے ہیں۔ بتدریج ان وحدتوں یا قوانین کو انجام کار ایک بنیادی وحدت میں منسلک کرنا حکمت کا نصب العین ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ نصب العین خدا ہے۔ والی ربك المنتھٰی۔ یہ منتہا مبدا بھی ہے۔ جس طرح کہ ایک ثمر کا بیج درخت کی ابتدا ہے اور انجام ارتقا میں ثمر کی صورت میں اس کی انتہا بھی۔ توحید کے تصورات اسلام سے قبل انبیاء نے بھی پیش کیے اور حکماء نے بھی۔ لیکن انسانوں کی پستی فکر نے ہمیشہ ان میں شرک کی آمیزش کر دی یا بعض حکماء کی طرح ان میں اس قدر منطقی تنزیہہ پیدا کی کہ خدا بے صفات ہو کر ایک مجرد تصور رہ گیا جس سے نہ عقل بہرہ اندوز ہو سکے اور نہ وہ عملی زندگی میں کام آ سکے۔ قرآنی اسلام کا سب سے بڑا کارنامہ اس تصور کو خالص کرنا تھا۔ آئیں اس پر ایک سرسری نظر ڈالیں کہ ادیانِ عالیہ اور فلسفوں میں خدا کا تصور کس کس طرح مسخ ہو چکا تھا ہندوؤں کے بلند مذہبی فلسفوں میں خدا کی ذات واجب الوجود کائنات سے اس قدر ماورٰی ہو گئی تھی کہ شنکر اچاریہ کی ویدانت میں خدا نرگن یعنی صفات سے معرّا ہو گیا تھا۔ وہ کائنات کا خالق نہ تھا کیونکہ ذات مطلق حقیقی تھی اور کائنات وہمی مایا یا فریبِ ادراک۔ انسانوں کا جسم و نفس بھی کائنات کے ساتھ بے حقیقت ہو گیا تھا۔ خیر و شر کی پیکار بھی وہمی تھی۔ اعمال اور ان کے نتائج بھی غیر حقیقی مظاہر کا تار و پود تھے۔ مہاتما بدھ نے برہمنیت میں بہت کچھ اصلاح کی کوشش کی۔ لیکن وہاں بھی نہ خدا نظر آتا ہے اور نہ نفس انسانی کوئی حقیقی جوہر رہتا ہے سب اعراض ہی اعراض ہیں، جن کی تہ میں کوئی جوہر نہیں اور زندگی کا مقصود ان تمام دھوکوں سے نجات پانا ہے اور یہ نجات تب تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ تمام آرزوئیں، یہاں تک کہ تمنائے حیات کو بھی بیخ و بُن سے نہ اکھاڑ دیا جائے۔ برہمنیت اور بدھ مت نے زندگی سے گریز کی تعلیم دی تاکہ انسان اعمال اور ان کے تکراری چکر میں سے نکل جائے۔ ان مذاہب میں یہ تعلیم بھی ملتی ہے کہ خدا کبھی کبھی انسان کی

صورت میں بغرضِ اصلاح دنیا میں اُتر آتا ہے بھگوت گیتا میں اس عقیدے کی نسبت ایک اشلوک ہے جس کا فیضی نے یہ ترجمہ کیا ہے :-

چوں بنیادِ دیں سُست گردد بسے
بر آریم خود را بشکل کسے

عیسائیت میں بھی یہی اوتار کا تصور تمام دین کا محور بن گیا اور مسیح علیہ السلام کو عیسائیوں نے عین خدا بنا دیا۔ جو دنیا میں انسان کی صورت میں اس لیے آیا کہ انسانوں کے ناقابلِ معافی گناہوں کا، جو اسے ہبوطِ آدم سے ورثے میں ملے ہیں، کفارہ بن جائے۔ جن فلسفوں میں خدا کا تصور ملتا ہے، وہاں بھی اس سے نہ کائنات و حیات کی توجیہہ ہو سکتی ہے اور نہ وہ انسانی زندگی میں کسی کام آ سکتا ہے۔ افلاطون کے ہاں خدا ناظم و صناع ہے لیکن اس صفت کا خام مواد اس کا پیدا کردہ نہیں ہے۔ اصل حقیقت اعیانِ ثابتہ کی ہے۔ خدا ان کے مقابلے میں ایک ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ ارسطو کے ہاں خدا عقلِ خالص یا فکرِ محض ہے۔ اس فکرِ ازلی کا موضوع و معروض وہ خود ہی ہے۔ موجودات سے اس کو کوئی واسطہ نہیں۔ وہ کلیات کا ایک منطقی نظام ہے جو زندگی کے جزئیات سے بے تعلق ہے۔ وہ نہ کائنات کا خالق ہے اور نہ اس کا رب اور ناظم۔ انسان کا انفرادی نفس ایک حادث مظہر ہے، جو خدا کے ساتھ دعا یا عبادت کا کوئی رابطہ پیدا نہیں کر سکتا۔ اس نفس کو بقا بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ یونانی فلسفے کی آخری صورت فلاطینوس اسکندری کا فلسفیانہ تصوف ہے جس کے نمایاں نقوش عیسوی اور اسلامی متصوفانہ افکار میں ملتے ہیں۔ اس جدید افلاطونیت میں بھی خدا نہ خالق ہے اور نہ رب۔ وہ ذی ارادہ اور صاحبِ اختیار ہستی بھی نہیں۔ موجودات اس سے اس طرح سرزد ہوتے ہیں، جس طرح سورج سے شعاعیں نکلتی ہے۔ وہ اپنی ذاتِ بحت میں تمام صفات سے معرّا یعنی ویدانت کے عقیدے کے مطابق نرگن ہے۔ اس اشعاعِ نور میں جو ہستیاں اس سے جتنی قریب ہیں، اتنی ہی منور ہیں۔ دوری کے ساتھ نور میں کمی اور ظلمت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ جسے ہم مادی کائنات کہتے ہیں۔ وہ ظلمت کدہ ہے۔ انسان کا جسم بھی اس ظلمت کا ایک پیوند ہے۔ ذاتِ مطلق احدیتِ مطلقہ ہے جس میں نہ ارادہ ہے نہ شعور۔ سب کچھ اسی سے بہ تنزل سرزد ہوتا ہے۔ وہ خود نہ سمیع ہے، نہ علیم نہ بصیر۔

اب اس مختصر تمہید کے بعد ذرا اس کا جائزہ لیجیے کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بذریعہ وحی قرآن اور بوسیلۂ بصیرت ایمانی انسانوں کے سامنے خدا کا کیا تصور پیش کیا۔ اسلام کا خدا ایک ذی شعور اور ذی ارادہ خالق ہے۔ اس نے کائنات کو مقصد اور ارادے سے پیدا کیا۔ وہ خلاق ہے۔ اس کی صفت خلاقی ازلی و ابدی ہے۔ وہ جو کچھ چاہتا ہے خلقت میں اضافہ کرتا رہتا ہے اس کے ہاں حیات و وجود کے خزانے لامحدود ہیں۔ لیکن وہ ہر چیز کو ایک اندازے سے پیدا کرتا ہے۔ وہ خالق ہونے کے علاوہ ناظم بھی ہے۔ اس کے ارادوں میں تلون نہیں ہوتا۔ اس کی خلاقی اس کی حکمت سے بھی ہم آغوش ہے اور اس کی رحمتِ عامہ سے بھی ہم کنار ہے۔ اس کی رحمت ہر چیز پر محیط ہے۔ وہ کائنات اور موجودات سے ماوریٰ بھی ہے اور اپنی قدرت مشیت اور حکمت سے ذرّے ذرّے میں جاری و ساری بھی ہے۔ اس کی سنّت یا عادت فطرت کے اندر آئین آفریں ہے :

لن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا۔ اس کے آئین تبدیل و تحویل سے بری ہیں۔

فطرتِ انسانی کو اس نے اپنی فطرت کے مطابق وضع کیا ہے۔ اس لیے انسانی زندگی کے بنیادی حقایق بھی حقایق الٰہیہ ہیں۔

انہی حقائق کا ادراک اور ان کے مطابق زندگی کو ڈھالنا دین کہلاتا ہے:

فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا۔ — اللہ کی اس فطرت پر غور کرو جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا۔

ذٰلک الدین القیم۔ — یہی دین قیم ہے۔

لا تبدیل لخلق اللہ۔ — اللہ کے قانون خلق میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

اس کائنات میں انسان خدا کا شاہکار ہے۔ قرآن کا آدم مسجودِ ملائک اور مسخر کائنات ہے۔ اس سے کوئی ایک فرد مراد نہیں بلکہ یہ انسانیت کا نصب العین ہے۔ خدا کا عابد اور ساجد ہونے سے وُہ فطرت کی تمام قوتوں کا مسجود ہو جاتا ہے۔ خدا کا محکوم ہو کر وہ کائنات پر حکمران بن جاتا ہے۔ اخلاقِ الٰہیہ کے تخلق سے وہ خلافت کرنے کا مستحق ہو جاتا ہے۔ انسان کے ممکنات کی کوئی انتہا نہیں کیونکہ زندگی کا ارتقا کہیں ختم نہیں ہوتا۔ اسلام نے خدا کے تصور کے ساتھ ساتھ کائنات اور انسانیت کے تصور کو بھی درست کر دیا۔ اس نے کہا کہ خدا خلاقِ حقیقت ہے، وہ باطل آفرینی نہیں کر سکتا۔ حیات و کائنات محض کھیل تماشہ نہیں مقاصدِ وجود نہایت سنجیدہ و پائیدار ہیں:

ربنا ما خلقت ھٰذا باطلا۔ — اے ہمارے رب! تُو نے اسے بے حقیقت نہیں پیدا کیا ہے۔

اسلام حریت و اخوت و مساوات کی تعلیم ہے۔ حریت یعنی آزادی آدمیت کے جوہر میں فطری طور پر موجود ہے۔ آدم نے حکمِ الٰہی کی خلاف ورزی کر کے آزادی کا ثبوت دیا۔ آزادی کے معنی میں یہ داخل ہے کہ اس کا غلط استعمال بھی ہو سکتا ہے اور صحیح بھی۔ لیکن خلاف ورزی کے احساس کے بعد تائب ہونا بھی انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ آدم کے قصّے کو بیان کر کے قرآن نے گناہ کا تصوّر بھی بدل دیا۔ عیسائیت نے آدم کی لغزش کو ناقابلِ معافی قرار دیا اور اس کے گناہ کو آیندہ آنے والی لاتتناہی نسلوں کے لیے متوارث بنا دیا۔ نبی کریمؐ کے ذریعہ سے انسانوں کو اس غیر منصفانہ تصوّر سے نجات ملی۔ قرآن نے کہا کہ ایک فرد کا گناہ اس کی انفرادی لغزش ہے اور تائب ہونے سے انسان اس کے خراب نتائج سے چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے۔ نیکیاں بدیوں کو ملیا میٹ کر دیتی ہیں:

ان الحسنات یذھبن السیئات۔ — نیکیاں برائیوں کو دُور کر دیتی ہیں۔

ہر فرد اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔ رُوحانی حیثیت میں کسی انسان کا بوجھ دُوسرے انسان پر نہیں ڈالا جاتا:

لا تزر وازرۃ وزر اُخریٰ۔ — کوئی شخص دُوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

چونکہ خدا انسان کو اپنی فطرت پر ڈھالنا چاہتا ہے، اس لیے وُہ اس کے اختیار کو سلب نہیں کرتا، وہ ہدایت اور گمراہی کی راہوں کو واضح کر دیتا ہے۔ جس کا جی چاہے یہ راستہ اختیار کرے یا وُہ۔ جو راستہ بھی اختیار کرے گا، اس کے نتائج سے وُہ گریز نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ اگر ہم چاہتے تو تمام انسانوں کو بالجبر مومن بنا دیتے۔ لیکن ہم نے ایسا کرنا نہیں چاہا۔ اس لیے کہ جبر اور ایمان باہم منافی چیزیں ہیں۔ مجبور کے لیے نہ نیکی نیکی ہے نہ بدی بدی۔ اور جبر کے بعد ثواب و عذاب کے بھی کچھ معنی نہیں رہتے۔ اسی لیے قرآن کریم نے علی الاعلان کہہ دیا کہ دین کے معاملے میں جبر ناروا ہے:

لا اکراہ فی الدین ۔ دین میں کوئی جبر نہیں۔

جب خدا، جو قادرِ مطلق ہے، انسان پر جبر روا نہیں رکھتا، تو کسی انسان کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ کسی دُوسرے انسان کو مجبورِ محض یا غلام بنالے۔ اگر مسلمان قرآن کریم کی اس حکیمانہ تعلیم کے نتائج اخذ کر کے ان کا اطلاق پوری طرح معاشرت پر کرتے، تو بیک قلم دنیا سے غلامی کا صفایا ہو سکتا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اس معاملے میں ڈھیل برتی۔ غلاموں کے ساتھ سلوک دیگر اقوام کے مقابلے میں تو بہتر ہو گیا لیکن یہ انسانیت کُش رسم باقی رہی۔ دین کے معاملے میں رواداری کی تلقین اسلامی تعلیم کا سب سے زیادہ قابلِ فخر پہلو تھا لیکن رُوحِ اسلام سے بیگانہ مدعیانِ دین نے غیر اسلامی تنگ نظری اور تعصب سے کام لے کر خود مسلمانوں کے اندر جبر و تعدی اور تکفیر کا بازار گرم کر دیا۔

قرآن نے نجات کو کسی ملّت کا اجارہ قرار نہیں دیا اور جو لوگ شریعتِ محمدیؐ کے دائرے میں داخل نہ ہو سکے، ان کے ساتھ بھی کمال درجے کی رواداری برتی۔ جس وقت یہود و نصاریٰ مسلمانوں سے برسرِ پیکار تھے اس وقت بھی انصاف سے کام لے کر یہ کہا کہ دیکھو سب کے سب ایک جیسے نہیں ہوتے اور اہلِ کتاب میں بھی بڑے بڑے خدا ترس اور خدا پرست موجود ہیں اور بعض دوسری ملّتوں کا نام لے لے کر وضاحت سے کہا کہ ان میں کا جو فرد بھی خدا پرست، آخرت کا قائل اور انسانوں کا محسن ہے، وہ نجات یافتہ ہے۔ ایسے لوگ اگر دُوسری ملّتوں میں بھی ہوں تو وہ اولیاء اللہ اور خوف و حزن سے بالاتر ہیں:

لا خوف علیھم و لا ھم یحزنون ۔ نہ ان کے لیے خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

محض اتفاق سے مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہونے والے مردم شماری کے مسلمان اسلام یا نجات کے ٹھیکیدار نہیں اسلام کی تعلیم کا جتنا حصہ جو فرد یا ملّت اپناتی ہے، اتنی وہ اسلام سے بہرہ اندوز اور صلاح و فلاح کے قریب ہے۔ نبی کریمؐ نے اعلان کیا کہ اسلام نے بادشاہی اور شہنشاہی کو منسوخ کر دیا ہے:

لا قیصر و لا کسریٰ۔

لیکن مسلمانوں میں یہ ملعون چیز جلد واپس آگئی اور رُوحِ اسلام سے بیگانہ شعراء و شیوخ نے ان مصادرِ ضلالت کو ظلّ اللہ قرار دے کر مسلمانوں کی اجتماعی و انفرادی حریّت کو مسخ کر دیا۔ اسلام نے زر و زمین کی سرمایہ اندوزی کے راستے بند کیے تھے مگر تھوڑے ہی عرصے میں یہ مخرّبِ انسانیت راہیں پھر کشادہ ہو گئیں اور ہمارے علمائے سُو ان کے جواز میں قرآن و حدیث کی تاویلیں کرنے لگے۔ اسلامی حریت کا ایک لازمی تقاضا یہ ہونا چاہیے تھا کہ مسلمان زندگی کے حقائق پر آزادی سے غور و خوض کریں اور تغیرِ احوال کے ساتھ ساتھ اسلام کے ازلی اصول سے ہنگامی طور پر فروع کو اخذ کریں۔ اسی کا نام اجتہاد ہے۔ لیکن مسلمانوں کی زندگی کے جامد ہونے کے بعد یہ عقیدہ استوار ہو گیا کہ فقہ میں اجتہاد کا دروازہ چوتھی صدی ہجری کے بعد قیامت تک کے لیے بند ہو گیا ہے۔ اب مسلمانوں کے لیے فقط لکیر کا فقیر ہونا اور روایت پرستی باقی رہ گئی ہے۔ اس کا نتیجہ وہی ہُوا، جو لازمی ہونا چاہیے تھا۔ بقول اقبالؒ یہ اُمت روایات میں کھو گئی اور زندگی کی تخلیقی قوتیں جنھیں اقبالؒ عشق کہتا ہے، ٹھٹھر کر رہ گئیں: ؎

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

قافلے دیکھ اور ان کی برق رفتاری بھی دیکھ
رہروِ درماندہ کی منزل سے بیزاری بھی دیکھ

لیکن مسلمان کے پاس خدا کی کتاب محفوظ ہے اور رسول ؐ کے اُسوۂ حسنہ پر نظر رکھنے والا اب بھی تمام برکات سے فیضیاب ہوسکتا ہے۔ مسلمانوں کو زندگی کے بنیادی حقایق اور اصول عمل دوسروں سے اخذ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر خدا ہے تو اس کا تصور اسلام سے خالص تر کہیں نہیں مل سکتا۔ سچی آزادی اور عدل و رحم کی تعلیم حقیقی اسلام سے بڑھ کر کہیں نہ ملے گی۔ حصولِ علم کی ترغیب قرآن سے زیادہ کسی مذہبی صحیفے میں نہ پاؤ گے۔ اسلام کا مقصود یہ ہے کہ اسی زندگی میں جمال و کمال پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ جو یہاں کور باطن ہے، وہ آخرت میں بھی اندھا ہی ہوگا۔ زندگی کی کسی جائز لذت کو اسلام نے حرام نہیں کیا۔ قرآن پوچھتا ہے کہ بتاؤ کون ہے جس نے اللہ کی زینتوں کو حرام کیا ہے۔ رہبانیت کو اسلام نے ممنوع قرار دیا تاکہ زندگی کی پیکار سے فرار ناممکن ہو جائے۔ حدود اللہ کو مدّ نظر رکھ کر زندگی بسر کرنے سے انسان پر عرصۂ حیات تنگ نہیں ہوجاتا بلکہ خدائے لامحدود سے رابطہ پیدا کرکے زندگی لامحدود بن سکتی ہے۔

رسول کریم ؐ کی ہمہ گیر اور محیط کل حیاتِ طیبہ سے بہتر نمونہ تاریخ انسانی میں مفقود ہے۔ افلاس میں زندگی کس طرح بسر کی جاتے۔ مال کے حصول کے بعد زندگی کا کیا ڈھب ہو، ایمان داری سے تجارت کس طرح کی جائے۔ زراعت میں نفع اندوزی سے کس طرح پرہیز کیا جاتے۔ ضرورت سے زیادہ مال کا کیا مصرف ہے۔ عورتوں اور مردوں کے حقوق و فرائض میں کس قدر مساوات ہے۔ صلح و جنگ کے آئین کیا ہیں۔ مسلمانوں کو آپس میں کیا برتاؤ کرنا چاہیے۔ غیر مسلموں کے ساتھ عدل و رواداری کا سلوک۔ جمہوری نظام مملکت، جس کا نظم و نسق اہل الرائے کے مشورے سے قایم کیا جائے۔ اقتصادی نظام جس میں دولت چند ہاتھوں میں متمرکز نہ ہو جائے بلکہ خون کی طرح تمام جسمِ ملت میں رواں دواں ہو اور چند معین حدود کے علاوہ زندگی کے تمام متغیر شعبوں میں مسلسل اجتہاد۔ یہ تھا اصل اسلام جس پر عمل کرکے رسول کریم ؐ اور صحابہ کرام نے دنیا کے سامنے عملاً ایک نصب العین پیش کیا۔ مسلمان اگر خودداری کے ساتھ مہذب اور ترقی پذیر زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو قرآن اور اُسوۂ رسول ؐ کی طرف عود کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ اگر دیگر اقوام نے اسلام کے بعض اہم پہلوؤں کو اپنا کر اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں صلاح و فلاح پیدا کی ہے، تو مسلمانوں کے لیے باعثِ شرم ہے کہ وہ دوسروں سے پیچھے رہ کر ان کی تقلید پر مجبور ہو جائیں۔ اصلِ اسلام اور اُسوۂ رسول ؐ کی طرف عود کرکے ملتِ اسلامیہ دوسروں سے بہتر نمونے پیش کرسکتی ہے۔ اس کا رسول ؐ کوئی ماضی کی شخصیت نہیں۔ وہ انسانیت کے حال اور مستقبل میں ہر قدم پر رہنمائی کرسکتا ہے۔ بشرطیکہ جامد مسلمان رسول ؐ کی رسالت کو بھی جامد نہ بنا دیں۔ ختمِ نبوت کے یہی معنی ہیں کہ یہ نبوت اب ہمیشہ تک اقوام کی رہنمائی کرسکتی ہے۔

پیغمبرِ اسلامؐ کا پیغامِ امن و سلام

زین العابدین سجاد میرٹھی

فتنہ و فساد کی ان اندھیری گھٹاؤں میں، جب کہ افق پر کوئی ستارۂ امید نظر نہیں آتا، ظلم و طغیان کی ان ہولناک موجوں میں جب کہ کشتیِ مراد پاش پاش ہو کر آخری جھکولے کھا رہی ہے، نومیدی و یاس کے ان جھکڑوں میں جب کہ گلشنِ آرزو کی آخری کلیاں بھی بکھر گئی ہیں آپ کو زمانۂ جاہلیت کا صحیح تصوّر کرنے میں زیادہ مشکل پیش نہ آئے گی۔ آیئے "تاریخ کی سُوئی کو چودہ سو سال پیچھے گھما دیں۔

دنیائے جاہلیت

یہ ایران ہے۔ یہاں فحاشی و زناکاری جزوِ دین بنا دی گئی ہے۔ "دینِ مزدکی" نے عصمت و عفت کی چادر انسانیت کے چہرہ سے اتار پھینکی ہے۔ عوام کی بہو بیٹیوں کی عزت امراء کی شہوت پرستی کے ہاتھوں کا کھلونا بن رہی ہے۔

یہ یونان ہے۔ یہاں غلاموں کو انسانیت کے ابتدائی "حقِ زندگی" سے بھی محروم کر دیا گیا ہے۔ آقاؤں کی پیشانی پہ ہر شکن ان کے لیے زنجیرِ پا بن سکتی ہے۔ ذرا ذرا سے قصوروں پر بھپرے ہوئے شیروں کے سامنے ڈال دینا اور غلاموں کی ہڈیوں کے گوشت سے جدا ہونے کا منظر دیکھنا ارکانِ حکومت کا ایک دلچسپ تماشا ہے، کمزور بچوں کو بھی یہاں زندہ رہنے کا حق نہیں ہے۔ پہاڑ کی چوٹی سے غار کی گہرائی تک ان کی منزلِ زندگی کو مختصر کر دیا گیا ہے۔

یہ ہندوستان ہے۔ یہاں انسان کو چار ذاتوں میں تقسیم کر کے حقوقِ انسانیت کو صرف تین ذاتوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ بیچارہ اچھوت مذہبی کتابوں کو ہاتھ نہیں لگا سکتا اور عبادت گاہوں میں قدم بھی نہیں رکھ سکتا۔

یہ ارضِ فلسطین ہے۔ یہاں یہودیوں نے نحن ابناء اللہ و احباءہٗ کا نعرہ لگایا ہے۔ بنی اسرائیل ہی ان کے زعم میں خدا کے لاڈلے بیٹے ہیں اور کسی کو اس کے فضل و کرم کے سفرۂ عام سے ایک ریزہ اٹھانے کی بھی اجازت نہیں۔

پھر اصولِ انسانیت کی اس تحقیر اور اخلاق و مدنیت کی اس تذلیل ہی پر بس نہیں بلکہ فیصلہ کر لیا گیا ہے کہ انسانیت کے وجود ہی کو ختم کر دیا جائے۔

ارضِ فلسطین یہودیوں اور عیسائیوں کے خون سے لالہ زار ہو رہی ہے۔ نصرانی حکومت یہودیوں کے ساتھ غلاموں کا سا برتاؤ کرتی ہے۔ یہودیوں کا ملی وجود تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ ان کو یہ اجازت نہیں کہ اپنے شعائرِ مذہبی کو آزادانہ انجام دے سکیں۔ یہودیوں نے شہر "صور" کا محاصرہ کر کے ہزاروں عیسائیوں کو تہ تیغ کر دیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ "جنگِ روم و ایران" میں ایرانیوں کے ہاتھوں قید ہونے والے اسّی ہزار عیسائی قیدیوں کو خرید کر ان کے خون سے اپنی آتشِ انتقام کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو سرد کر دیا ہے (محمد المثل الکامل جاد مولیٰ بك المصری)

مدائن سے قسطنطنیہ تک کی سرزمین وقت کی دو سب سے بڑی شہنشاہیتوں کی جوع الارض کا لقمہ بنی ہوئی ہے۔ تہذیب پامال

ہورہی ہے ۔ شرافت سر پیٹ رہی ہے ۔ انسانیت خون کے آنسو رو رہی ہے مگر شہنشاہیت کا سر غرور سے اونچا ہو رہا ہے ، اور وہ ان بربادیوں کو دیکھ کر مسکرا رہی ہے ۔ آبادیاں اُجڑ رہی ہیں ۔ گھر لُٹ رہے ہیں ۔ کھیتیاں پامال ہو رہی ہیں مگر انسانوں کی کھوپڑیوں پر قصرِ قیصری و ایوانِ کسروی کی شاندار بنیادیں اٹھائی جا رہی ہیں ۔

"عرب" سرزمینِ حرم کا حال نہ صرف یہ کہ بہتر نہیں بلکہ سب سے بدتر ہے ۔ ایام العرب کا ایک سلسلہ ہے ، جو خون کی موجوں کی طرح سارے جزیرہ میں پھیلا ہوا ہے ۔ جنگ وجدال ، قتل وخون ، سلب ونہب مائی فخر و ناز ہے ۔ امن واطمینان ، آرام وسکون باعث شرم وعار ۔ قماربازی فخر کی بات ہے ۔ شراب نوشی عزتِ نفس کی دلیل ہے ۔ زناکاری قابلِ تحسین کارنامہ ہے ۔ معصوم بچیوں کو زندہ درگور کر دینا عظمت وشرافت کا ثبوت ہے ۔

ادب جاہلی کی شہادت اگر یہ صحیح ہے کہ ہر زمانہ کا لٹریچر ، اس زمانہ کی تہذیب واخلاق کا آئینہ ہوتا ہے ، تو سُنیئے ابنِ قیس بن ثعلبہ کا ایک شاعر کہتا ہے : ؎

انا محیوك یا سلمٰی فحیینا

وان سقیت کرام الناس فاسقینا

(اے سلمیٰ (معشوقہ شاعر) ہم تجھے سلام کرتے ہیں ، تو بھی ہمیں سلام کر اور اگر تو سردارانِ قوم کی تواضع شراب سے کرتی ہے ، تو ہمیں بھی شراب پلا)

ایک دوسرا شاعر جھوم کر کہتا ہے : ؎

الا ھبی بصحنك فاصبحینا

ولا تبقی خمور الاندرینا

(ہاں اپنا شراب کا پیالہ لے کر اُٹھ اے محبوبہ اور ہمیں صبوحی پلا اور دیکھ اندرین کی شرابوں میں سے کوئی باقی نہ رکھ)

ایک اور شاعر ابوکبیر ہذلی فخریہ بیان کرتا ہے :

ممن حملن بہ وھن غواقد

حبك النطاق فشب غیر مھبل

(میں ان جوانوں میں سے ہوں ، جن کی ماؤں سے زبردستی ہم بستری کی گئی ۔ لہٰذا وہ جوان چھوٹے ۔ اس حال میں کہ چھریرے بدن کے ہیں)

اور رئیس الشعراء امراء القیس نے تو کمال ہی کر دیا ہے ۔ فرماتے ہیں :

و مثلك حبلٰی قد طرقت ومرضع

فالھیتھا عن ذی تمائم محول

(اور تجھ جیسی بہت سی حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتیں ہیں ، جن کے پاس میں رات کے آخری حصے میں پہنچا اور

انھیں اپنے شیر خوار بچوں سے غافل کر دیا)

وداک بنی یشل مازنی اپنی ہوسِ جنگ کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے: ؎

اذا استنجدوا لم یسالوا من دعاھم

لایۃ حرب ام بای مکان

(میں ان بہادروں میں سے ہوں، جب کوئی ان سے مدد مانگتا ہے، تو وُہ یہ نہیں پُوچھتے کہ کس جنگ کے لیے اور کہاں)

حصین بن ہمام مری کہتا ہے: ؎

نفلق ھاما من رجال اعزۃ

علینا وان کانوا اعق و اظلما

(ہم ذی عزت لوگوں کے سروں کو پارہ پارہ کر دیتے ہیں۔ اگرچہ وہ بڑے ظالم و جابر ہوں)

بنی عقیل کا ایک شاعر اپنے عزیزوں کو خطاب کر کے کہتا ہے: ؎

و نبکی حین نقتلکم علیکم

و نقتلکم کانا لا نبالی

(ہم تمھیں قتل کر دینے کے بعد تم پر روتے ہیں مگر جب قتل کرتے ہیں، تو کوئی پروا نہیں کرتے)

سوار بنی مضرب سعدی کہتا ہے:

وانی لا ازال اخا حرب

اذا لم اجن کنت مجن جان

(میں ہمیشہ لڑائیوں میں گھرا رہتا ہُوں۔ اگر خود ظلم نہیں کرتا، تو ظالموں کی سپر بن جاتا ہوں)

ندائے صفا ظلم و ستم، جور و جفا، قتل و غارت، سلب و نہب، عیاشی و فحاشی، عشرت پسندی و شہوت پرستی کی اس دنیا میں یکایک ایک صدائے حق بلند ہوتی ہے۔ خداوند قدوس کا ایک مقدس بندہ "حرا" کی خلوت راز سے باہر آتا ہے اور صفا کی چوٹیوں پر کھڑے ہو کر اعلان کرتا ہے:

یاایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منھا زوجھا و بث منھما رجالاً کثیراً و نساء۔

اے افرادِ نسلِ انسانی، تم (اخوت و محبت کے رشتہ کو توڑتے ہو) اپنے اس پروردگار سے ڈرو جس نے تم سب کو ایک اصل سے پیدا کیا اور اسی سے اس کے جوڑے کو پیدا کیا۔ پھر ان دونوں کی نسل سے گروہ در گروہ مرد اور عورتیں پیدا کیں (جو سطح ارضی کے مختلف حصوں میں پھیل گئی۔

جب تمھارا پیدا کرنے والا ایک ہے، تمھاری اصل و نسل ایک ہے، تمھاری حقیقت و ماہیت ایک ہے، تو پھر ملک و وطن کی حد بندی سے، رنگ و روپ کے فرق سے، غربت و امارت کے امتیاز سے یہ تزاحم و تصادم کیوں ؟

اس آیت کے ذیل میں صاحب رُوح البیان لکھتے ہیں :

تقوٰی کے حکم کو جو اس واقعہ پر مرتب کیا گیا، تو اس واسطے کہ یہاں انسانوں کو اپنے اہل خاندان اور اپنے ابنا جنس کے حقوق کی حفاظت کے بارہ میں خداوند جل وعلیٰ سے ڈرنے کا حکم دینا تھا اور اس واقعہ کو اس کی تمہید بنانا تھا۔ گویا کہ یہ فرمایا گیا :

"اے انسانو ! جس پروردگار نے تم سب کو ایک سلسلہ میں جکڑ دیا ہے اور ایک جڑ کی مختلف شاخیں بنا دیا ہے، اس پروردگار سے تعلقات باہمی کے حقوق کی ذمہ داری کے بارہ میں ڈرو۔ ان حقوق کا پُورا پورا خیال رکھو اور ان سے غافل نہ ہو۔" (رُوح البیان دوم ص ۱۵۹)

پھر چونکہ خطاب تمام کائنات انسانیت سے کرنا تھا اور سب کو ایک اخوت انسانیہ کے رشتہ میں جکڑنا تھا۔ لہٰذا قرآن کریم نے "نفس واحدۃ" فرمایا، آدم نہیں فرمایا۔ اس لیے کہ مختلف اقوام و ملل کے درمیان انسانی گھرانے کے جدِّ اعلیٰ کے متعلق اختلاف رائے ہے۔ یہود اور جمہور اہل اسلام نسل انسانی کی ابتداء آدم (علیہ السلام) سے مانتے ہیں۔ بعض دُوسری قومیں دوسری شخصیتوں کا نام لیتی ہیں۔ مثلاً اہلِ ہند برہما کو زنجیرِ انسانیت کی پہلی کڑی بتاتے ہیں۔ حکماء مغرب چند اصولوں کو خاندانِ انسانیت کا مبداء قرار دیتے ہیں۔ (تفسیر المنار سورۃ النساء)

بہرحال اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ "حقیقت انسانیت" تمام انسانوں کے درمیان مشترک ہے۔ لہٰذا قرآن کریم اس وحدت حقیقت ہی کی طرف متوجہ کرکے ان سے باہمی الفت و محبت کا مطالبہ کرتا ہے اور کسی شخصیت کی تعیین کرکے دعوت اخوۃ کو محدود نہیں کرنا چاہتا۔

پھر اس نے بتایا کہ تم معرفت و شناخت کی آسانی کے لیے خاندانوں اور کنبوں کی حد بندیاں قایم رکھ سکتے ہو، مگر انھیں کسی طرح عزت و ذلت، برتری و کمتری کا معیار نہیں بنا سکتے۔ عزت و ذلت اور برتری و کمتری کا معیار تو صرف ایک ہے اور وہ ہے تقوٰی و پرہیزگاری کی زندگی اور بس !

وجعلناکم شعوبًا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم۔	تم کو خاندانوں اور قبیلوں میں اس لیے تقسیم کر دیا ہے کہ ایک دوسرے کو پہچان سکو ورنہ خدا کے نزدیک سب سے زیادہ معزز وُہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

اس نے اعلان کر دیا کہ اگر حقیقی بلندی و برتری کی تمنا ہے، تو اس کا طریقہ صرف ایک ہے اپنے معبودِ حقیقی کے سامنے نیازمندانہ جھک جاؤ۔ اس راہ میں جو مشکلات پیش آئیں، انھیں خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرو۔ اس کے کمزور اور ستم رسیدہ بندوں کی مدد کرو اور برائی کو بھلائی کے ساتھ دفع کرو۔

والذین صبروا ابتغاء وجه ربهم و اقاموا الصلوٰة و انفقوا مما رزقنٰهم سرًّا و علانیة وّ یدرؤن بالحسنة السیّئة اولٰئك لهم عقبی الدار۔

اور جن لوگوں نے راہِ خدا میں ہر تکلیف پر صبر کیا، نمازوں کو ان کے آداب کے ساتھ ادا کرتے رہے اور جو کچھ ہم نے انھیں رزق دیا اس میں سے کچھ پوشیدہ و علانیہ ہماری راہ میں خرچ کرتے رہے اور برائی کا بدلہ بھلائی سے دیتے رہے تو یاد رکھو یہی لوگ ہیں جن کے لیے آخرت کا بہتر ٹھکانہ ہے۔

اس نے دشمنوں کے ساتھ بھی محبت کا سلوک کرنے کا حکم دیا اور بتایا کہ اگر کوئی ایسا کر سکے تو یہ نیکی و سعادت مندی کا اونچا مقام ہے:

ولا تستوی الحسنة و لا السیئة ادفع بالّتی هی احسن فاذا الّذی بینك و بینه عداوة کانّه ولیّ حمیم و ما یلقّٰها الّا الّذین صبروا و ما یلقّٰها الّا ذو حظٍّ عظیم۔

نیکی اور بدی کا درجہ برابر نہیں ہو سکتا۔ برائی کا جواب اچھائی کے ساتھ دو۔ اگر تم نے یہ طرزِ عمل اختیار کیا تو تم دیکھو گے کہ اچانک تمھارا دشمن تمہارا دلی دوست بن گیا ہے۔ البتہ انسانیت کے اس بلند مقام پر وہی پہنچ سکتا ہے جو اپنے نفس پر قابو رکھے اور جس کی قسمت میں نیکی و سعادت کا حظِ عظیم ہو۔

اس نبی رحمت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ظلم و شقاوت کی دنیا کو امن و سعادت کا گہوارہ بنانے کے لیے دنیا میں بدامنی و خونریزی کے جو اسباب ہو سکتے ہیں، ایک ایک کر کے ان کو ختم کیا۔

شہنشاہیت دنیا میں فتنہ و فساد کا بڑا سرچشمہ "شہنشاہیت" رہا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ قصرِ شاہی کی آبادی و رونق کے لیے رعیت کی جھونپڑیاں ہمیشہ اجڑتی رہی ہیں۔ خدا کی زمین اس کے بندوں کے خون سے اس لیے سیراب ہوتی رہی ہے تاکہ پادشاہوں کا نخلِ آرزو برگ و بار لائے۔ پیغمبرِ اسلام علیہ التحیۃ والسلام نے سب سے پہلے فتنہ کی اس جڑ کو صاف کیا۔

ولا یتخذ بعضنا بعضاً اربابًا من دون اللّٰه۔

اور خدا کو چھوڑ کر، ایک انسان دوسرے انسان کو اپنا پروردگار قرار نہ دے۔ دنیا خدا کا ملک ہے اور حکم بھی یہاں خدا ہی کا جاری ہوگا۔

لم یکن له شریك فی الملك ان الحکم الّا للّٰه۔

اس کی سلطنت میں کوئی شریک نہیں۔ حکم صرف خدا ہی کا چل سکتا ہے۔

یہاں تک کہ جب وفد بنی عامر نے آپ سے کہا انت سیّدنا، آپ ہمارے سردار ہیں۔ تو آپ نے جواب دیا: السیّد

اللہ تبارک و تعالیٰ سردار تو اللہ تبارک و تعالیٰ ہے۔
اس پر ان لوگوں نے عرض کیا: بہر حال شرف و عزت میں تو آپ ہم سے بلند و برتر ہیں ہی، تو آپ نے جواب دیا: ہاں یہ تم کہہ سکتے ہو۔

اسی لیے اس وقت کی شہنشاہیت کے مظہر اتم اور آمرانیت کے مجسمہ کامل "کسریٰ" کے متعلق ارشاد فرمایا ہے:

اذا مات کسریٰ لا کسریٰ بعدہ۔ — اس خاندان کسروی کے بعد اب اور کسریٰ نہ ہوگا

سرمایہ داری سرمایہ داری بھی امن عالم کے لیے بڑا فتنہ رہی ہے۔ ساہوکاروں کی مجلس نشاط کا ساغر احمری ہمیشہ غریبوں اور مزدوروں کے خون سے تیار ہوتا رہا ہے۔ پیغمبر اسلام علیہ التحیۃ والسلام نے زبان وحی ترجمان سے انسانی سوسائٹی کا ایسا نقشہ کھینچا جس میں ہر انسان کو خدا کے پیدا کیے ہوئے وسائل معیشت سے استفادہ کا موقع دیا گیا اور جدوجہد کے بعد جو کچھ حاصل ہوا، اس میں اس کا حق ملکیت و انفاق بھی تسلیم کیا گیا مگر طرق و اکتساب و انفاق پر ایسی پابندیاں عائد کر دیں جس سے دولت چند افراد کا سرمایہ بن کر نہ رہ جائے:

کی لا یکون دولۃً بین الاغنیاء منکم۔ — یہ اس لیے کیا گیا تاکہ دولت تمہارے سرمایہ داروں میں ہی گردش کرتی نہ رہ جائے۔

جو لوگ اسلام کے اس عادلانہ نظام معیشت سے بغاوت کریں، اس کے ممنوعہ طریقوں سے دولت جمع کریں، ذاتی تعیش و تنعم پر اسے خرچ کریں اور سوسائٹی کے محتاج و ضرورت مند طبقہ کو اس سے محروم رکھیں، ان کو شیطان کا بھائی قرار دیا گیا اور ان کو عذاب الیم کی بشارت دی گئی:

والذین یکنزون الذھب و الفضۃ و لا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم۔	جو لوگ چاندی سونے کے ذخیرے جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو انہیں عذاب الیم کی بشارت دے دیجیے۔
ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین۔	بے محل دولت کا استعمال کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔

سرمایہ داری کے دو بڑے مظاہر ساہوکاری اور جاگیرداری ہیں۔ اسلام نے احتکار اکتناز اور اس کے وسائل سود، قمار وغیرہ کو ممنوع قرار دے کر اور وراثت، زکوٰۃ، عشر وغیرہ تقسیم دولت کی صورتوں کو لازمی قرار دے کر ان دونوں کے پنپنے کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑی۔

وطنیت وطنیت بھی ہمیشہ سے ایک ایسا بت رہی ہے جس پر ہزارہا انسانوں کے سروں کے چڑھاوے چڑھتے رہے ہیں۔ "جرمنی" جرمنوں کے لیے ہے، انگلستان انگریزوں کے لیے ہے، ہندوستان ہندوستانیوں کے لیے ہے۔ یہ ایسے نعرے ہیں کہ آج بھی جن سے دنیا کی فضا گونج رہی ہے۔ اگر ان نعروں کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی طاقتور قوموں کو یہ

حق نہیں کہ وہ کمزور قوموں کے اسبابِ حصول دولت پر اپنی طاقت کے بل بوتے پر قابض ہو جائیں تو یہ نعرے درست ہیں۔ لیکن اگر ان کا مقصد یہ ہے کہ ملک اور وطن کے نام پر خدا کی مخلوق میں منافرت پیدا کی جائے اور خدا کے بندوں کو اس کی پیدا کی ہوئی زمین کے کسی حصّے سے جائز طریقوں سے فائدہ اٹھانے سے روکا جائے، تو اس سلسلہ میں پیغمبرِ اسلام کا اعلان یہ ہے:

لا فضل لعربی علی عجمی ولا لاحمر علی اسود کلکم من آدم و آدم من تراب۔	عربی النسل کو عجمی النسل پر اور سرخ رنگ والے کو کالے رنگ والے پر کوئی برتری حاصل نہیں۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدمؑ کا مایہ خمیر مٹی ہے۔
لیدعن رجال فخرهم باقوام انما هم فحم من فحم جهنم۔	لوگ اپنی قوموں پر فخر کرنا چھوڑ دیں۔ ایسا کرنے والے جہنم کا کوئلہ بنیں گے۔
لیس منا من دعا الی عصبیۃ	وہ ہم میں سے نہیں، جس نے عصبیت کا نعرہ لگایا۔
ان الارض للہ۔	زمین اللہ ہی کی ہے۔
وجعلنا لکم فیها معایش۔	ہم نے تم سب کے لیے زمین میں سامانِ معیشت پیدا کر دیئے ہیں۔

مذہبی منافرت مذہب کے نام پر بھی، جو دنیا میں امن و صلح کا پیغام ہونا چاہیے، جنگ و جدل کے نعرے بلند ہوتے رہتے ہیں بعثت محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے وقت بھی فضا ان نعروں سے گونج رہی تھی۔ بقول علامہ سید سلیمان ندوی:

"ہندوستان کے رشیوں اور منیوں نے آریہ ورت سے باہر خدا کی آواز کے لیے کوئی جگہ نہیں رکھی تھی۔ ان کے نزدیک پرمیشر صرف پاک آریہ ورت کے باشندوں کی بھلائی چاہتا تھا۔ خدا کی رہنمائی کا عطیہ صرف اسی ملک اور یہیں کے بعض خاندانوں کے لیے محفوظ تھا۔ زردشت خاک ایران کی پاک نژاد کے سوا اور کہیں خدا کی آواز نہیں سنتا تھا۔ بنی اسرائیل اپنے خاندانوں سے باہر کسی رسول اور نبی کی بعثت اور ظہور کا حق نہیں سمجھتے تھے۔ یہ پیغام محمدیؐ ہی ہے، جس نے پورب، پچھم، اتر، دکھن ہر طرف خدا کی آواز سُنی اور بتایا کہ خدا کی رہنمائی کے لیے ملک، قوم اور زبان کی تخصیص نہیں۔ اس کی نگاہ میں فلسطین، ایران، ہندوستان اور عرب سب برابر ہے۔ ہر جگہ اس کے پیغام کی بانسری اور ہر طرف اس کی رہنمائی کا نور چمکا۔"

قرآن کریم نے اس زمانہ کے اربابِ مذہب کے لیس وغرب کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا:

وقالت الیهود لیست النصٰری علی شئ وقالت النصٰری لیست الیهود علی شئ و هم یتلون الکتٰب کذالك قال الذین لا یعلمون مثل قولهم۔	یہودی کہتے ہیں کہ عیسائیوں کا دین بے بنیاد ہے اور عیسائی کہتے ہیں کہ یہودیوں کا دین بے اصل ہے حالانکہ دونوں کے پاس اللہ کی کتاب ہے اور وہ اسے پڑھتے ہیں۔ ایسی ہی بات ان نے بھی کہی جو مقدس

کتابوں کا علم نہیں رکھتے۔

پھر ان مذہبی گروہوں کے ان غلط خیالات کی تردید اس طرح فرمائی:

وان من اُمۃ الاّ خلا فیھا نذیر ٥ ولقد بعثنا فی کلّ امۃ رسولاً ان اعبدوا اللّٰہ واجتنبوا الطاغوت۔

کوئی قوم ایسی نہیں جس میں کوئی خدا کے عذاب سے ڈرانے والا نہ آیا ہو اور بلاشبہ ہم نے دنیا کی ہر قوم میں ایک پیغمبر مبعوث کیا جس کا پیغام یہ تھا کہ ایک اللہ کی عبادت کرتے رہو اور شیطان سے بچتے رہو۔

پھر حکم دیا گیا کہ پیغامِ محمدیؐ کے قبول کرنے والے کے لیے تمام پچھلے پیغمبروں اور ان کے صحیفوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اس اقرار کے بغیر کوئی شخص مسلم نہیں تسلیم کیا جا سکتا:

الذین یؤمنون بما انزل الیك وما انزل من قبلك۔

پرہیز گار وہ ہیں جو قرآن کریم پر ایمان رکھتے ہیں اور ان تمام کتابوں پر، جو اس سے پہلے اُتریں۔

پھر خدا کے ان مقدس بندوں میں نبی ہونے کے لحاظ سے، کسی قسم کا فرق کرنے کی بھی اجازت نہیں دی گئی:

کلّ اٰمن باللّٰہ وملٰئکتہٖ وکتبہٖ ورُسلہٖ لا نفرق بین احد من رسلہٖ۔

(محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان پر ایمان لانے والے) سب ایمان لائے اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور اقرار کیا کہ ہم اس کے رسولوں میں کوئی فرق نہیں کرتے۔

قرآن کریم نے اعلان کر دیا کہ شمعِ نبوت کی یہ روشنی، جو آج عرب کے ذرّوں کو جگمگا رہی ہے، کوئی نئی روشنی نہیں بلکہ مختلف عہدوں میں یہی روشنی زیتون کے مرغزاروں کو اور ہمالیہ کے کہساروں کو بھی روشن کر چکی ہے اور اب "پیغامِ محمدیؐ" کے نظر افروز فانوس میں ساری دنیا کو دعوتِ تماشا دے رہی ہے اور جمالِ حقیقت اور چشمِ شوق کے درمیان کوئی پردہ باقی نہیں چھوڑ رہی۔ بے شک آفتابِ نبوت اپنی عالم افروز اور جہاں تاب کرنوں کو دنیا کے چپّہ چپّہ میں بکھیرتا ہوا طلوع ہو چکا ہے۔ اس لیے ڈوبے ہوئے چاند اور تاروں سے رہنمائی کی جستجو بیکار ہے:

ان الدین عند اللّٰہ الاسلام۔

درحقیقت دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔

> آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
> آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

تاہم آفتاب کا کام یہ ہے کہ وہ اندھیرے کو دُور کر دے اور دنیا کو روشنی سے معمور کر دے۔ لیکن اگر کوئی چادر میں منہ

چھپا کر بیٹھ جائے اور روشنی سے فائدہ اٹھانا پسند نہ کرے، تو اس کی چادر کو کھینچ کر اتار پھینکنا آفتاب کا کام نہیں۔
نور اسلام نے اپنی ظلمت پاش شعاعوں سے حق و باطل، معروف و منکر، طاقت و معصیت، عدل و ظلم میں امتیاز پیدا کر دیا۔ ہر شخص کے لیے، جس کو دیدۂ بصیرت حاصل ہے اب یہ ممکن ہے کہ وہ صراطِ مستقیم کی شاہراہ پر چل کر منزلِ حقیقت کا سراغ پالے۔ لیکن اگر کوئی عقل کا اندھا کفر و طغیان کی گھاٹیوں میں ہی ٹاک ٹوئیاں مارنا پسند کرے، تو اس پر کوئی جبر نہیں:

لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی۔	دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں۔ کیونکہ حق اور باطل میں کھلا امتیاز قایم ہو چکا ہے۔
انا انزلنا علیک الکتاب للناس بالحق فمن اھتدٰی فلنفسہٖ و من ضل فانما یضل علیھا و ما انت علیھم بوکیل۔	ہم نے یہ کتاب لوگوں کی ہدایت کے لیے آپ پر سچائی کے ساتھ اتاری ہے۔ سو جس کسی نے راہِ ہدایت قبول کی، تو اپنے فائدے کے لیے اور جس کسی نے گمراہی اختیار کی، تو اپنے نقصان کے لیے اور اے پیغمبر! آپ ان کے ذمہ دار نہیں۔

ایک اور جگہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جوشِ دعوت کی مزاحمت کی جاتی ہے:

ولو شآء ربك لاٰمن من فی الارض کلھم جمیعا ط افانت تکرہ الناس حتّٰی یکونوا مؤمنین۔	اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو زمین پر سب بسنے والے ایمان لے آتے (لیکن اس کی حکمت کا یہ تقاضا نہیں) تو پھر کیا تم لوگوں کو مجبور کرو گے کہ وہ مسلمان ہو جائیں۔

ہاں البتہ اگر کوئی فرد یا گروہ صداقت کی اس روشنی ہی کو گل کر دینا چاہے، یا دوسروں کو اس سے جبراً استفادہ نہ کرنے دے، تو بے شک اس کی مزاحمت کی جائے گی۔ ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنی آنکھیں بند کر لے اور ٹھوکر کھا کر گر پڑے مگر دوسروں کی آنکھوں پر پٹی باندھنے کا حق کسی کو نہیں۔

یُریدون لیطفئوا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہٖ ولو کرہ الکٰفرون۔	کافر چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو منہ سے پھونکیں مار مار کر بجھا دیں مگر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ وہ اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا خواہ کافر اسے پسند نہ کریں۔

انتقام در انتقام

انتقام در انتقام کا چکر بھی ہمیشہ دنیا میں خون کے طوفان برپا کرتا رہا ہے۔ خود جزیرۃ العرب بعثت محمدی سے پہلے اس طوفان کی موجوں میں گھرا ہوا تھا۔ چراگاہوں میں، میلوں میں یا شاعروں کی مجلس میں کسی بات پر جھڑپ ہو جاتی تھی تو سیکڑوں تلواریں نیام سے تڑپ کر نکل آتی تھیں اور پھر برسوں اور قرنوں تک ان کی برق افشانی جاری رہتی تھی۔ انتقام کے اس مجنونانہ جذبے میں مجرم و غیر مجرم اور حق و ناحق کا کوئی فرق باقی نہ رہتا تھا۔ اسلام نے سب سے پہلے اس حقیقت کا اعلان کر دیا کہ خدا کی مخلوق کے درمیان پیدا ہونیوالے جھگڑوں کا فیصلہ خدا ہی کے مقرر کردہ قانون کے مطابق اس حکومت کے

ذریعہ ہونا چاہیے ، جو اس قانون کے نفاذ کے لیے قایم ہوئی ہو :

ان الحکم الا للّٰہ ۔ حکومت اور فیصلہ کا حق صرف خدا ہی کو حاصل ہے ۔

ایسی حکومت کے ارباب بست و کشاد کے یہ اوصاف بیان فرمائے گئے :

الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلٰوۃ و اٰتوا الزکٰوۃ و امروا بالمعروف و نھوا عن المنکر ۔ (۲۲ : ۴۱) یہ وُہ جماعت ہے کہ اگر ہم انھیں زمین پر صاحبِ اقتدار بنا دیں تو ان کا کام یہ ہوگا کہ نماز اور زکوٰۃ کا نظام قایم کریں ۔ بھلائی کا حکم دیں اور بُرائی سے روکیں ۔

قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لینے کا کسی بڑے سے بڑے آدمی کو بھی حق نہیں دیا گیا ۔ چنانچہ جب اسلام کے نامور خلیفہ حضرت عمر فاروق ؓ کو ابولؤلؤ نامی ایک غلام نے جفینہ نصرانی اور ہرمزان پارسی کی سازش سے شہید کر دیا اور جوشِ غضب میں وارفتہ ہو کر عبید اللہ بن عمر نے اپنے باپ کے انتقام میں ہرمزان کو تہ تیغ کر دیا ، تو قایم مقام خلیفہ حضرت صہیب کے حکم سے انھیں فوراً گرفتار کر لیا گیا اور جب تک ان کی طرف سے دیت ادا نہ کر دی گئی ، رہائی نہ ہو سکی ۔

پھر ایک عام حکم دیا گیا کہ دشمن ہوں یا دوست ، اپنے ہوں یا غیر ، مسلمانوں کو چاہیے کہ کسی سے بھی برتاؤ کرتے وقت عدل و انصاف کا سررشتہ ہاتھ سے نہ دیں :

و لا یجرمنکم شناٰن قوم علیٰ ان لا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوٰی ۔ کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس سے بے انصافی پر آمادہ نہ کر دے ۔ عدل کو ہاتھ سے نہ دو کہ وُہ پرہیزگاری سے زیادہ قریب ہے ۔

اس میں شبہ نہیں کہ ہر شخص قانون کے دائرہ میں رہ کر قانون کے ذریعہ جو زیادتی اس پر کی گئی ہے ، اس کا بدلہ لے سکتا ہے :

فمن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدیٰ علیکم ۔ جو تم پر زیادتی کرے ، تم بھی اس پر اتنی ہی زیادتی کر سکتے ہو جتنی اس نے تم پر کی ہے ۔

پھر بھی عفو و درگزر اور مرحمت و مغفرت کا درجہ بلند ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا بڑا اجر ہے :

و لمن صبر و غفر ان ذٰلک لمن عزم الامور ۔ اور درحقیقت جس نے صبر کیا اور بخش دیا تو بے شبہ یہ بڑی ہمت کا کام ہے ۔

فمن عفا و اصلح فاجرہ علی اللّٰہ ۔ (۴۲ : ۴۰) اور جس نے معاف کیا اور صلح کی راہ اختیار کی تو اس کا ثواب اللہ کے ذمّہ ہے ۔

خود جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اس آیت مبارکہ کی عملی تفسیر ہے ۔ دشمنوں نے آپ کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائیں ، آپ کو گالیاں دیں ، آپ کو دیوانہ و مجنوں کہا ، آپ کا مذاق اڑایا ، آپ کے راستہ میں کانٹے بچھائے ،

آپ کے جسم اطہر پر نجاست پھینکی، آپ کی پیشانی انور کو زخمی کیا، آپ کے قتل کی سازش کی اور آخر کار محض اس جرم میں کہ آپ خدا کے گھر میں خدا کا نام کیوں لیتے ہیں، آپ کو راتوں رات مکہ سے نکل کر مدینہ جانے پر مجبور کر دیا اور پھر وہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ بار بار قتل کی سازشیں کی گئیں، عہد نامے توڑے گئے، بدر، اُحد اور خندق کے معرکے برپا کیے گئے لیکن جب قدرت کے امتحان کی مدت ختم ہوئی اور رب العزت کے دستِ انتقام کو جنبش ہوئی، یہی مجبور و مقہور، ستم دیدہ وجفا کشیدہ "مہاجر" اسی کعبہ میں جہاں سے انھیں رب کعبہ کا نام لینے اور اس کی بارگاہِ نیاز میں سر جھکانے کی بھی اجازت نہ تھی، اس شان سے مجلس آرا ہُوا کہ ہزار ہا گردنیں اس کے سامنے عاجزانہ جھکی ہُوئی تھیں، ہزار ہا زبانیں اس کی عظمت و سطوت کا اعتراف کر رہی تھیں اور ہزار ہا کان اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے لیے اس کی جنبش لب پر لگے ہُوئے تھے، تو تمھیں معلوم ہے اس نے اپنے جان و مال، عزّت و آبرو، دین و ایمان کے دشمنوں کے متعلق کس فیصلہ کا اعلان کیا؟ اس نے اعلان کیا:

لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقاء۔ — آج تم پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ جاؤ تم سب آزاد ہو، جو چاہو، کرو۔

استیلاء کامل کے بعد یہ پہلا پیغام امن و سلام تھا۔ پھر حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں جو اُمت کے نام آپؐ کا آخری پیغام تھا، آپ نے جنگ کے دیوتا اور انتقام کے بھوت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پا بہ زنجیر کر دیا۔ آپ نے فرمایا:

الا ان کل شیٔ من امر الجاھلیۃ تحت قدمی موضوع و دماء الجاھلیۃ موضوعۃ و اول دم اضعہ من دماء فدم ابن ربیعہ۔ — سُنو، میں جاہلیت کی تمام رسمیں اپنے پاؤں تلے کچل دیتا ہُوں اور انتقام خون کی رسم بھی اپنے پاؤں تلے کچلتا ہوں اور سب سے پہلے اپنے بھائی ربیعہ ہی کے خون کے مطالبہ کو ختم کرتا ہوں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خلق عظیم اور ذکر جمیل آج تیرہ سو سال گزرنے کے بعد بھی دنیا کی امن پسند اور صلح جُو قوموں کے لیے ایک منارۂ روشنی ہے۔ ہر قوم و ملت کا چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا آدمی اس روشنی میں اخلاق و انسانیت اور صلح و امن کی گم شدہ منزل کا سراغ پا سکتا ہے۔ چنانچہ اگر ہر امن پسند اور صلح جُو کے لیے فمن عفی واصلح فاجرہ علی اللہ۔ (جس کسی نے عفو و صلح کی راہ اختیار کی، تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے) کی بشارت سنائی گئی تو آپ کو وان لك لاجرا غیر ممنون وانك لعلیٰ خلق عظیم (آپ کے لیے ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ منقطع ہونے والا نہیں، کیونکہ آپ کا اخلاق نہایت بلند ہے) کی کرامت عطا فرمائی گئی۔ اس لیے کہ:

من سن سنۃ حسنۃ فلہ اجر من عمل بہا۔ — جس کسی نے کوئی اچھا طریقہ جاری کیا، اسے ان سب لوگوں کے برابر ثواب ملے گا جو اس طریقہ کو اختیار کریں گے۔

فصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ بخلقہ محمّد و بارك وسلّم۔

آزادی کا علمبردار نبی صلی اللہ علیہ وسلم

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

اسلام کا ایک بنیادی نظریہ یہ ہے کہ خدا نے انسان کو آزاد پیدا کیا، لیکن اس نے یا خود ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہن لیں یا ظالمانہ روایات اور جابر انسانوں نے اپنے ہم جنسوں کو پابہ زنجیر کر دیا۔ کسی انقلاب کو حقیقی مصلحانہ انقلاب نہیں کہہ سکتے، جب تک اس انقلاب سے انسان کا قدم غلامی سے آزادی کی طرف نہ بڑھے۔ مولانا روم نے بھی نبوت کی یہی حقیقت اس مصرع میں بیان کی ہے کہ: ؏

خلق را از انبیاء آزادی است

اور اسی خیال کو علامہ اقبال نے اس شعر میں ادا کیا ہے: ؎

جس کے ڈر سے وہم کا قصرِ کہن آئین گرا
گردنِ انساں سے طوقِ راہبِ خود بیں گرا

جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے، اس وقت تمام دنیا کے انسان گوناگوں غلامیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ ظالم حکمرانوں نے رعایا کو غلام بنا رکھا تھا۔ بعض انسانوں نے بعض انسانوں کو حیوان یا مالِ تجارت قرار دے کر ان سے نفع اندوزی کا طریقہ رائج کر رکھا تھا۔ مذہبی پیشواؤں احبار و رہبان نے لوگوں کے دل و دماغ کو توہمات کی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا اور فطرت کے گلے میں بھاری طوق ڈال رکھے تھے۔ مردوں نے عورتوں کو بے طرح محکوم کر رکھا تھا اور ربے ور و سرمایہ داروں نے معاشی استبداد روا رکھا تھا۔ مصلحین عالم میں فقط ایک مصلح ایسا نظر آتا ہے، جس کی اصلاح میں ہمہ گیری ہے۔ استبداد کا کوئی ظاہری یا خفیہ پہلو اس کی نظر سے اوجھل نہیں۔ وہ ایک ایک کر کے ہر زنجیر اور ہر زنجیر کی ہر کڑی کو توڑتا ہے اور انسان کو آزاد کر کے خدائے مطلق کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے تاکہ وہ آزادانہ طور پر اپنی مرضی کو خدا کی مرضی کے ساتھ ایک کرے۔ انسان خدا تو نہیں بن سکتا، لیکن خدا کا ہم آہنگ ہو سکتا ہے اور خدا کے ساتھ ہم آہنگی ہی اصلی آزادی ہے۔

آئیے ہم طلوعِ اسلام کی معاصرانہ زندگی پر ایک نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ انسان جس کو اشرف المخلوقات اور خلیفۃ اللہ علی الارض بنانے کے لیے پیدا کیا گیا تھا، وہ کس قدر ذلیل و خوار ہو چکا تھا۔ مسجودِ ساکنانِ فلک سنگ و حجر اور اپنے وہم سے تراشیدہ معبودوں کا ساجد بن چکا تھا۔ وہی انسان جس میں مسخرِ کائنات بننے کی صلاحیت ودیعت کی گئی تھی، وہ خود خارج کی ہر قوت سے مسخر ہو چکا تھا۔ یونانی حکیم اپیکیورس جو لذتیت کے فلسفے کا امام شمار ہوتا ہے، اس کی تعلیم کا ایک جزوِ اعظم یہ تھا کہ انسانوں کے دلوں میں دیوتاؤں کا خوف جب تک زائل نہ ہو جائے، تب تک وہ حقیقی معنوں میں آزاد نہیں ہو سکتے اور جب تک بے بنیاد خوفوں سے چھٹکارا حاصل نہ ہو، تب تک مسرت و سعادت اور سکونِ قلب حاصل نہیں ہو سکتے۔

اپیکیورس دیوتاؤں کے وجود کا منکر نہ تھا، لیکن فقط یہ یقین دلانا چاہتا تھا کہ دیوتا انسانوں کے معاملات میں دخل نہیں دیتے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم توحید حقیقی کے علم بردار تھے۔ آپؐ نے فرمایا کہ ان دیوتاؤں کا کوئی وجود نہیں ہے اور یہ معبود انسان کی اپنی ادنیٰ خواہشوں کے مجسمے ہیں۔ ایک صوفی شاعر کا کیا عمدہ شعر ہے۔ ایک معبودِ بت زبانِ حال سے پجاری کو مخاطب کرکے کہہ رہا ہے: سہ

مرا بر صورتِ خویش آفریدی
بروں از خویشتن آخر نہ دیدی

(تم نے مجھے اپنی ہی صورت پر بنایا ہے، میں تمھاری ہی خواہشات کا آئینہ ہوں، میرے اندر تم اپنے آپ کو ہی دیکھ رہے ہو، اس کے سوا مجھ میں کیا رکھا ہے)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ اصل دین توحید ہے۔ جس قدر یہ عقیدہ کسی میں راسخ ہوتا جائے گا، اسی قدر وہ شخص آزاد ہوتا جائے گا، جو موحد ہے وہ فطرتِ خارجہ کی قوتوں سے ڈرے گا اور بے جا خوف ہر قسم کی پست ہمتی اور پست اخلاقی کی جڑ ہے۔ اسی لیے قرآن کریم جب نجات یافتہ انسان کا ذکر کرتا تو کہتا ہے:

فلا خوفٌ علیھم ولا ھم یحزنون۔

انسان کا کمال یہی ہے کہ وہ ہر قسم کے وہمی اور غیر اصلی خوف سے آزاد ہو جائے۔ اس پر کوئی شخص معترض ہو سکتا ہے کہ خدا کا ڈر تو باقی رہتا ہے۔ لیکن خدا کا ڈر تمام قسم کے خوفوں سے الگ نوعیت کا خوف ہے۔ یہ اپنی فطرت کے قانون کی خلاف ورزی کا ڈر ہے یہ ڈر اسی قسم کا ہے جس طرح صاف آدمی گندگی سے ڈرتا ہے، نیک سیرت آدمی بداخلاقی سے ڈرتا ہے اور محبت کرنے والے انسان ایک دوسرے کی ناراضگی سے ڈرتے ہیں۔ خدا کے ڈر کے معنی یہ ہیں کہ انسان اس سے ڈرے کہ وہ انسانیت کے مرتبے سے نہ گر جائے۔

توحید میں کائنات کے اندر صرف ایک ہی حقیقی عامل و مؤثر قوت باقی رہ جاتی ہے۔ لاحول ولا قوۃ الّا باللہ لا غالب الّا اللہ لا موثر فی الوجود الّا اللہ۔ جس شخص نے اپنی مرضی کو اس مشیّت ظلی کے ساتھ وابستہ کر دیا، اس کو کسی کا ڈر باقی نہ رہا اور وہ خلافتِ الٰہی کا حقدار ہو گیا۔ تمام قسم کے صحیح نظریاتِ حیات فقط عقیدہ توحید ہی سے سرزد ہو سکتے ہیں۔

توحیدِ کائنات جس پر تمام سائنس کی بنیاد ہے، وہ بھی اسی توحیدِ الٰہی کا ایک پہلو ہے۔ توحیدِ حیات اور توحیدِ انسانیت بھی اسی نخل توحید کی شاخیں ہیں۔ حضورؐ چونکہ یہ چاہتے تھے کہ تمام انسان حقیقتاً آزاد ہو جائیں، اسی نے سب سے زیادہ توحید کی حقیقت کو واضح کیا۔ اور کہا کہ سب سے بڑا گناہ شرک ہے، جو کسی طرح معاف نہیں ہو سکتا۔

مذہب نے تمام دنیا میں یہ صورت اختیار کر رکھی تھی کہ ہر مذہبی گروہ نجات کا اجارہ دار بن گیا تھا، اور قوموں کے اندر مذہبی پیشواؤں کے طبقے تفوق حاصل کرکے انسانوں اور خیالی معبدوں کے درمیان دلّال بن گئے تھے۔ اسلام نے انسانوں کو اس مذہبی استبداد اور اجارہ داری سے نجات دلائی اور یہ تعلیم دی کہ ہر انسان کا تعلق براہِ راست خدا سے ہونا چاہیے۔ درمیان میں کسی کمیشن ایجنٹ کی ضرورت نہیں۔ اس طبقے کی نسبت قرآن کریم میں ہے کہ یہ دھوکہ دے کر لوگوں کا مال کھاتے ہیں اور لوگوں کو خدا تک پہنچنے سے روکتے ہیں۔ اسلام کے انحطاط کے زمانے میں کچھ افراد اسی قسم کے اجارہ دار بن بیٹھے لیکن یہ طبقہ کبھی ملّتِ اسلامیہ پر منظم ڈاکہ نہ ڈال سکا۔

انسان نے انسانوں کو جو براہِ راست غلام بنا رکھا تھا، اس کا انسداد بھی اُسوۂ نبیؐ کی تعلیم میں اس انداز کا ملتا ہے، جس کی مثال قدیم دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ تمام تہذیبوں میں یہ خیال چلا آتا تھا کہ غلامی ایک فطری چیز ہے۔ ارسطو جیسا حکیم بھی کہتا تھا کہ غلامی ایک فطری چیز ہے اور بعض لوگ غلام ہی بننے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ قدیم تہذیبوں کے بڑے بڑے کارنامے غلاموں ہی کے رہینِ منت ہیں۔ اسلام نے دیکھا کہ دنیا کا تمام معاشی نظام اس لعنت کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ وہ ایسا ہمہ گیر تھا کہ بیک قلم اس کا منسوخ کرنا محال تھا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم اور اپنے عمل سے اس کی تنسیخ کا ایسا پروگرام بنایا کہ اگر مسلمان نیک نیتی سے اس پر چلتے، تو غلامی چند سال کے اندر داستانِ پارینہ بن کر رہ جاتی۔

غلاموں کو آزاد کرنا ایک بڑے ثواب کا کام قرار دیا۔ اس کو خیرات کا بہترین مصرف بنا دیا۔ یہ قانون بنا دیا کہ غلام کو کوئی شخص بالجبر غلام نہیں بنا سکتا۔ مالک کی شدید بدسلوکی کی وجہ سے غلام کو عدالت آزاد کر سکتی ہے۔ یہ بھی شرط لگا دی کہ غلام اس شرط پر رکھ سکتے ہو کہ جو تم کھاؤ، وہ اس کو کھلاؤ اور جو پہنو، اس کو پہناؤ۔ مقصد یہی تھا کہ اس شرط پر بھلا کون کسی کو نوکر رکھنا چاہے گا۔ مسلمان غلامی کو صفحۂ ہستی سے تو نہ مٹا سکے لیکن اسلام کی تعلیم کا یہ نتیجہ ضرور ہُوا کہ غلامی کی وُہ بھیانک صورت نہ رہی، جو دیگر اقوام میں پائی جاتی تھی۔ غلام رُکنِ خاندان بن گئے، مذہبی پیشوا اور عالمِ دین بن گئے، امیر و وزیر بن گئے، فوجوں کے سپہ سالار اور بادشاہوں کے محبوب بن گئے۔ رسولِ خدا کے بعد حضرت عمرؓ نے غلامی کو منسوخ کرنے کے لیے ایک بڑا قدم اٹھایا کہ کوئی عرب غلام نہیں بنایا جا سکتا۔ اس کے بعد کے فرمانروا اگر اس راستے پر دو چار قدم اور چلتے تو اسلامی ممالک میں غلامی کا قلع قمع ہو جاتا۔

اسلام نے غلاموں کو آزاد کرنا بہت سے گناہوں کا کفّارہ قرار دیا۔ اسلام سے پہلے اور اس کی معاصر دنیا میں غلامی کے بارے میں اس کے مماثل کوئی تعلیم نہیں ملتی۔ یونان کی جمہوری شہری مملکتوں میں ایک آزاد شہری کے مقابلے میں تین غلام ہوتے تھے اور یونان و روما کے قوانین میں ان کے حقوق نہ تھے۔ ان کا جو مالک تھا، وہ کلیۃً ان کے جان و مال اور آبرو کا مالک تھا۔

بعض مذاہب کی کتابوں میں ہے: غلامی کی ایک اور قسم یہ تھی کہ مردوں نے عورتوں کو غلام بنا رکھا تھا کہ عورت ماتحت رہنے کے لیے پیدا ہُوئی ہے، وُہ اپنی جائیداد نہیں رکھ سکتی۔ باپ کے گھر میں وُہ باپ کی محکوم ہے، شادی کے بعد شوہر کی محکوم اور بیوہ ہو جانے کی صورت میں اپنی اولادِ نرینہ کی محکوم۔

سب سے پہلے انسانوں کے آزاد کرنے والے نبیؐ نے عورتوں کو ایک مستقل حیثیت عطا کی اور کہا کہ جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں، اسی طرح عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں۔ نکاح کو ایک آزادانہ معاہدہ قرار دیا، جو ہر قسم کی جائز شرائط پر مشتمل ہو سکتا ہے۔ خاص نامساعد حالات پیدا ہو جانے سے مرد اور عورت دونوں ایک دُوسرے سے علیحدگی کا حق رکھتے ہیں۔ عورت خود اپنے سرمایہ اور جائیداد کی بے شرکتِ شوہر مالک ہو سکتی ہے۔ خود مسلمانوں نے انحطاط کے دور میں ان کے بہت سے حقوق سلب کر لیے، لیکن اصل اسلام میں ان کے حقوق کی مساوات موجود ہے۔ مغرب میں عورتیں اپنے قانونی حقوق کے لیے کم و بیش ایک سو سال سے جدوجہد کر رہی ہیں۔ اس پر بھی انھیں کچھ حاصل ہُوا اور کچھ نہیں۔ جو کچھ وہ جائز طور پر طلب کرتی ہیں، وہ اسلام کی تعلیم میں پہلے سے موجود ہے۔

آج عورتیں نکاح و طلاق، وراثت و ملکیت کے وہی حقوق طلب کرتی ہیں، جو اسلام میں مسلمان عورتوں کو حاصل ہیں۔ لیکن

اعلیٰ تہذیب کی مدعی قومیں ابھی تک ان کی مزاحم ہیں۔

غلامی کی دو اور بڑی قسمیں ہیں؛ ایک سیاسی غلامی، دُوسری معاشی غلامی۔ سیاسی غلامی کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں، ایک یہ ہے کہ کوئی حکمران فرد یا حکمران طبقہ تمام رعایا کی جان و مال کا مالک بن جائے۔ ایک ملوکیت ہے اور دُوسری آمریت شاہی کا خاتمہ کرنا اسلام کا ایک اساسی اصول تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جس قسم کا اقتدار حاصل ہُوا، اس قسم کے صاحبِ اقتدار قدیم دنیا میں بادشاہ بن جاتے تھے۔ نہ رسول کریمؐ سے پہلے کی تاریخ میں اور نہ آپؐ کے بعد کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال موجود ہے کہ کسی شخص نے اس قسم کے اقتدار کو بادشاہت میں تبدیل نہ کر دیا ہو۔ اس قسم کے لوگ پہلے بادشاہ بن جاتے تھے۔ اب اصطلاح بدل گئی ہے اور وُہ ڈکٹیٹر کہلاتے ہیں۔ ہے وہی دیو استبداد جس کا نام دُوسرا رکھ دیا جاتا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عین عروج کے زمانے میں ایک اعرابی نے کہا: "اَنْتَ مَلِکُنَا" (تُو ہمارا بادشاہ ہے)۔ رسول کریمؐ نے فرمایا: نہیں، میں بادشاہ نہیں، خدا بادشاہ ہے۔ سوا سادہ سے سادہ غذا اور لباس کے اپنے لیے کچھ روا نہ رکھا۔ یہی حال خلفاے راشدین کا تھا، جو خالص اسلامی طرزِ حکومت کے حکمران تھے۔ اس کے ساتھ ہی اسلام نے یہ تعلیم دی کہ کوئی قوم یا قبیلہ یا طبقہ حکمران نہ بن بیٹھے۔ قبائل کی باہمی فضیلت و تفوق کو منسوخ کر دیا، اور جب عربوں کو پورا غلبہ حاصل ہوگیا، تو یہ اعلان کیا کہ عرب کو عجم پر کوئی فوقیت نہیں ہے۔ سب فوقیت انفرادی ہے، جس کا مدار سیرت و تقویٰ پر ہے۔ قانونِ وراثت کو جاری کر کے جاگیرداری کی جڑ کاٹ دی۔ اس لیے اب جاگیرداروں کا بھی حکمران طبقہ بن نہ سکتا تھا جو کاشتکاروں کو موروثی غلام سمجھتے تھے۔

زکوٰۃ کو لازمی اور سُود کو حرام قرار دیا کہ سرمایہ داروں کا طبقہ رفتہ رفتہ غریبوں اور ناداروں کو غلام بنا لیتا ہے۔ نہ صرف قدیم زمانے ہی میں بلکہ زمانۂ حال تک یہ دیکھا جاتا تھا کہ سود خوار کے مقروض تب تک سُود خوار کی غلامی قبول کر لیتے تھے، جب تک کہ اصل مع سُود ادا نہ ہو جائے۔ لیکن سُود در سُود کی اتنی رقم جمع ہو جاتی تھی کہ مقروض کبھی اس دلدل میں سے نکل نہ سکتا تھا۔ جاگیرداری اور سرمایہ داری سے جتنی غلامی پیدا ہوتی ہے، انسانوں کے آزاد کرانے والے نے ان لعنتوں سے بھی ان کی گردنوں کو چھڑانے کی ایک بلیغ کوشش کی۔

غلامی اور آزادی کے مسئلے میں ایک اور طرف بھی نظر دوڑانے کی ضرورت ہے۔ اسلام سے قبل نہ صرف انسانوں کے اعمال پر بیجا پابندیاں تھیں بلکہ خود علم بھی آزاد نہ تھا۔ ہر جگہ علم مذہبی طبقے میں محدود تھا اور علم کی بھی اجارہ داری قایم تھی۔

قرآن کریم نے علم و حکمت کو خدا کی نعمتِ عظیم قرار دیا اور اس کو انسانیت کا جوہر ٹھہرایا۔ اس کی بدولت آدم مسجودِ ملائک ہُوا۔ علم کا حصول ہر مرد و عورت کے لیے فریضہ قرار دیا اور قوانینِ فطرت پر غور و خوض کو ایمان کا سرچشمہ ٹھہرایا۔ مورخوں کو حیرت ہوتی ہے کہ صحرا سے نکلنے والے دین نے اس قوم کو جو شروع میں اُمّی تھی اور جس کا نبیؐ بھی اُمّی تھا، کس طرح چند سال میں دنیا کے علوم و فنون کا مالک اور اقوام کا علمی رہبر بنا دیا؛ اس تاریخی اعجاز کو سمجھنے کے لیے یہ جان لینا کافی ہے کہ علم پہلے آزاد نہ تھا۔ اسلام نے اس کو ہمیشہ کے لیے آزاد کر دیا۔ جس قوم میں علم آزاد ہو اور اس کا حاصل کرنا ایک مذہبی فرض ہو، اس کی لامحدود ترقی کے راستے میں کوئی چیز حائل نہیں ہوسکتی۔

آخر میں مَیں اس غلامی کا ذکر کرتا ہوں، جو شدید ترین ہے۔ وُہ خواہشاتِ نفس کی غلامی ہے۔ اسلام کی اخلاقی تعلیم نے یہ بتایا کہ تمھارے اندر جو جبلّتیں ہیں، وہ فطری اغراض کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ ایمان اور عمل صالح سے ان سے بہت اچھے کام لیے جا سکتے ہیں۔ یہی جبلّتیں اگر بے عنان ہو جائیں، تو انسان اپنے باطنی شیاطین کا غلام بن جاتا ہے، جو اس کی گردن میں رسّی ڈالے ہُوئے، جدھر چاہیں، اس کو گھسیٹ لے جاتے ہیں۔ نفسِ انسانی کو ان پر حکمران ہونا چاہیے، ان کا محکوم نہیں بننا چاہیے۔ خواہشات کا غلام بدترین غلام ہے، خواہ وُہ بظاہر بادشاہ و امیر ہی نظر آئے۔

اگر ہر انقلابی تحریک کسی نہ کسی لحاظ سے کسی استبداد کے خلاف جہاد ہی کا نام ہے تو دنیا کی تاریخ میں سب سے بڑا مصلح، مجاہد اور انقلابی رہنما محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود ہے جس نے ہر استبداد کے خلاف جہاد کیا، خواہ معاشی اور خواہ دینی ہو، خواہ علمی۔

حقیقت میں آزادی کی علمبردار وہی اُمت ہو سکتی ہے جو اس قسم کا ہمہ گیر جہاد کرے جس کا اسوہ حسنہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے۔

اسلامی معاشرہ اور نابینا افراد

محمد اسمٰعیل آزاد

انقلابِ فرانس جس نے موجودہ جمہوریت کو جنم دیا، اس کے بعض کارکنوں نے انسانی مساوات اور حریت کے سلسلے میں نابینا افراد کو معاشرے کے لیے مفید بنانے کا کام شروع کیا۔ اور اس وقت کے گرجوں میں رکھے جانے والے نابینا افراد کو مخیر لوگوں کی خیرات پر گزارہ کرنے کے بجائے پڑھنا لکھنا اور مفید دستکاریاں سکھانے کا بطور تجربہ آغاز کیا۔ یہ طریقہ کار بتدریج یورپ اور یورپین قوموں کے سیاسی اقتدار کے ساتھ ساتھ دنیا بھر میں پھیلا۔

فرنگی اقتدار کے بل بوتے پر عیسائی مبلغین جس طرح عیسائیت کو فروغ دیتے رہے، یہ ایک تلخ کہانی ہے۔ اس کہانی کا ایک پہلو اندھے اور اپاہج لوگوں کی فلاح و بہبود کا کام تھا، جو عیسائی مشنریوں نے مختلف ملکوں میں شروع کیا۔

پہلی جنگِ عظیم میں ہزارہا افراد جنگ کے نتیجہ میں بینائی سے محروم ہوئے، اس لیے حکومتوں نے ان نابینا فوجی افراد کی پیشہ ورانہ تربیت اور آبادکاری کے لیے کثیر رقمیں خرچ کیں اور یہ کام ایک باقاعدہ فن بن گیا۔

دوسری جنگ عالمگیر کے موقع پر مزدوروں کی کمی کے وقت ایسے نابینا افراد کو کارخانوں میں بعض کاموں پہ لگایا گیا' اور یوں یورپ اور امریکہ کو ان کی ضرورت نے اس سلسلہ میں فلاح نابینا کا کام ایجاد کروایا۔ چنانچہ اب ہر ملک اس تجربہ سے فائدہ اٹھا رہا ہے اور دنیا بھر میں ہزاروں نابینا افراد کو تربیت اور تعلیم دی جا رہی ہے اور اس خاص سلسلے کا لٹریچر مختلف اداروں کی طرف سے پھیلتا جا رہا ہے۔

نابینا افراد کی تعلیم و تربیت کے عملی پہلو سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو، لیکن اس کے علمی پہلو میں ایک بہت بڑی خامی یہ نظر آتی ہے کہ اس سلسلے کا لٹریچر فلاح نابینا کے سلسلے میں ابتدا اور کامیابی کا سہرا صرف عیسائیت کے سر رکھتا ہے۔

(دیکھو - THE BLIND IN ASIA)

دوسرے اس قسم کے مصنفین کو جاپان کے قدیم زمانے کے بدھ مذہب کے نابینا علما تو نظر آتے ہیں، لیکن ممالک مشرقِ وسطیٰ میں اسلام کے دورِ اوّل سے لے کر آج تک جتنے نابینا علماء، ادباء، شعراء ہو گزرے ہیں اور جن کی تعلیم و تربیت دوسرے آنکھ والے افراد کے ساتھ ساتھ ہوتی رہی ہے۔ یا تو ان مصنفین کو ان کا علم نہیں ہے، یا وہ جان بوجھ کر چھپاتے ہیں اور اس طرح ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ جسے علومِ دین سے واجبی سی واقفیت ہوتی ہے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ معذور افراد کی فلاح و بہبود کا کام صرف مغربی تہذیب کی ایجاد بندہ ہے۔

ظاہر ہے اس غلط فہمی کو جس قدر جلد ہو سکے، دور کیا جانا چاہیے۔ اس سلسلے میں مصر کے ایک عالم صلاح الدین الصفدی

نے کتاب نکت الہمیان لکھ کر اس میں تاریخ اسلام کے تقریباً تین سو ایسے نابینا افراد کا تذکرہ لکھا جو علم و ادب، شاعری، علمِ دین وغیرہ میں اپنے دَور کے مسلّم علما تھے اور جن کی تعلیم و تربیت آنکھ والے افراد کے ساتھ ساتھ ہوئی تھی۔ غالباً کسی اسلامی ملک کی طرف سے یہ پہلی کتاب تھی۔

غیر منقسم ہند میں مولانا اسلم جے راجپوری نے "نوادرات" کی بنیاد غالباً اسی کتاب نکت الہمیان پر رکھی اور بہرحال اردو زبان میں پہلی مرتبہ نابینا علماءٔ و شعرا کا تذکرہ لکھا۔

ان تذکروں میں چونکہ نہایت اختصار سے کام لیا گیا ہے، دوسرے نابینا افراد کی تعلیم و تربیت اور آبادکاری کے موجودہ نکتۂ نگاہ سے ان میں کام نہیں لیا گیا، اس لیے راقم الحروف کو خیال ہوا کہ جدید نکتہ نگاہ سے اسلام میں نابینا افراد کے حقوق و فرائض اور دورِ رسالت میں نابینا افراد کی تعلیم و تربیت اور آبادکاری کے اصول اجاگر کیے جائیں۔

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ دورِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلّم کا مکمل ریکارڈ جس طرح ہمارے فنِ حدیث اور رجال میں موجود ہے، ایسا کسی مذہب کے دورِ اوّل کا مکمل ریکارڈ اس وقت دنیا کے پاس نہیں ہے اس لحاظ سے دورِ رسالت کے نابینا افراد، ان کی تعلیم و تربیت اور آبادکاری بہرحال مستند ریکارڈ کا درجہ رکھتی ہیں، جبکہ بعض مذاہب عالم میں نابینا افراد کے تذکرے افسانوی حیثیت سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اور یہ اسلام کا طرۂ امتیاز ہے کہ تاریخِ انسانیت میں اس نے پہلی مرتبہ نابینا افراد کو معاشرے میں دوسرے صحیح سالم افراد کے مساوی حقوق عطا فرمائے اور اس طرح انھیں معاشرے میں دوسرے طور پر جذب کر لیا جو آج بھی ترقی یافتہ ممالک کے لیے صرف ایک نصب العین ہے، جسے وہ باوجود اتنی ترقیوں کے حاصل نہ کر سکے۔

اخیر میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ اسلام کی امتیازیت کو نابینا افراد کو معاشرے میں جذب کرنے کے بارے میں ثابت کر دینا ہی سب کچھ نہیں بلکہ عملاً اس کو کر دکھانا اسلامی معاشرے کے ہر فرد پر واجب ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آیندہ سطور میں جو کچھ دورِ رسالت کے طریقہ کار کے بارے میں مستند کتابوں کے حوالے سے لکھا گیا ہے، نابینا افراد ان کی فلاح و بہبود کا کام کرنے والے افراد اور ادارے ملک کے تعلیم یافتہ افراد، سماجی کارکن، حکومت کے کارندے اور اسلام پسند حضرات اسے پڑھ کر رسالت کے طریقہ کار کو نابینا افراد کی فلاح و بہبود کے سلسلے میں اپنائیں گے۔

نابینا افراد کے مسائل قرآن و سنّت کی روشنی میں

قرآن کریم میں لفظ اعمٰی یعنی نابینا اپنے لغوی معنی میں بھی استعمال ہوا ہے اور اصطلاحی معنی میں بھی۔ عَبَسَ وَتَوَلّٰی اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی "تیوری چڑھائی اور منہ موڑ لیا، اس لیے کہ اس کے پاس ایک نابینا آیا"۔ یہاں یہ لفظ اپنے لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

هَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرُ اَمْ هَلْ تَسْتَوِی الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ۔

(کیا نابینا اور بینا برابر ہو سکتے ہیں اور کیا اندھیرا اور اجالا برابر ہو سکتے ہیں)

یہاں یہ لفظ اپنے وسیع اصطلاحی معنی میں استعمال ہوا ہے اور مقصود نابینا کی ذلت نہیں ہے بلکہ اسلام اور کفر کے فرق کو ہدایت اور گمراہی، نور و ظلمت، بینا اور نابینا کے ظاہری فرق سے مثال دے کر سمجھایا گیا ہے اور ایک جگہ ارشاد فرمایا:

فانها لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور۔ (۲۲: ۴۶)

(اسلام کے مخالفین بظاہر آنکھوں سے نابینا نہیں ہیں، لیکن ان کے قلوب کی آنکھیں اندھی ہیں، وہ بصیرت سے محروم ہیں)

ومن کان فی هٰذہٖ اعمٰی فهو فی الاٰخرة اعمٰی واضل سبیلا۔

(یہاں کا اندھا جو دنیا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لایا وہ آخرت میں بھی محروم رہے گا)

اس آیت میں لفظ اعمٰی اصطلاحی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

الغرض قرآن کریم نے ان لوگوں کو نابینا کہا ہے، جو آنکھ رکھتے ہوئے بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت سے محروم رہے۔ چنانچہ امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

"بلکہ نظرِ باطن کا نقصان بہ نسبت آنکھ کے نقصان کے زیادہ اور بڑا ہے، اس لیے کہ نفس مثل سوار کے ہے اور بدن مثل گھوڑے کے۔ اور ظاہر ہے کہ سوار کا اندھا ہونا بہ نسبت گھوڑے کے اندھے ہونے کے زیادہ مضر ہے اور باطن کی بصیرت کو ظاہری بصارت سے مشابہت کے لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

ما کذب الفؤاد ما رأی۔

جھوٹ نہ دیکھا دل نے جو دیکھا۔

اور فرمایا:

وکذٰلك نری ابراهیم ملکوت السمٰوٰت والارض۔

اور اسی طرح ہم دکھلانے لگے ابراہیمؑ کو سلطنتِ آسمان اور زمین۔

اور اس کی ضد کو نابینائی فرمایا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

فانها لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور۔

سو کچھ آنکھیں اندھی نہیں ہوئیں پر اندھے ہوتے ہیں دل، جو سینوں میں ہیں۔"

(مذاق العارفین ترجمہ احیاء العلوم جلد اول باب علم فصل ہفتم)

اسی طرح سورہ فاطر میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وما یستوی الاعمٰی والبصیر ولا الظلمٰت ولا النور ولا الظل ولا الحرور وما یستوی الاحیاء ولا الاموات۔

نابینا اور آنکھ والے، اندھیرا اور اجالا، سایہ اور دھوپ، زندہ اور مردہ برابر نہیں ہو سکتے۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ نابینا افراد کو آنکھ والے افراد کے مقابلے میں نعوذ باللہ حقیر سمجھا جا رہا ہے۔ چنانچہ امام رازیؒ نے ان آیات پر تفصیلی بحث کے بعد ثابت کیا ہے کہ اس آیت میں افراد کے بجائے اوصاف کا مقابلہ کیا گیا ہے پھر کفار کے طریقہ ضلالت و گمراہی کو نابینا اور دین اسلام کے ماننے والے کو بینا سے تشبیہ دی ہے۔ پس مومن بصیر (دیکھنے والا) ہے اور کافر اعمٰی (نابینا)۔ (خلاصہ از تفسیر کبیر امام رازیؒ ج ۲۶ سورۂ فاطر)

الغرض اس آیت میں لفظ اعمٰی اصطلاحی معنیٰ میں استعمال ہوا ہے اور اس طرح اسلام سے انکار کرنے والے کو نابینا، اندھیرا اور مُردہ فرمایا ہے۔

دُوسری طرف جیسا کہ آگے مناسب موقع پر آئے گا، قرآن کریم نے بصیرت قلبی رکھنے والے نابینا افراد کو آنکھ والے بے بصیرت پر ترجیح دی ہے اور یہ واقعہ انسانی تاریخ کے محفوظ ترین ریکارڈ قرآن کریم میں محفوظ ہے اور افضل ترین انسان حضور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق سے یہ واقعہ مذکور ہوا ہے۔

نابینائی اور مذاہب عالم

خدائے بزرگ و برتر نے محض اپنے فضل و کرم سے انسان کو زندگی جیسی نعمت بے بہا بخشی اور پھر اس سے محفوظ ہونے کے لیے انسان کو حواسِ خمسہ عنایت فرمائے اور عقل جیسی دولت عنایت فرمائی، جس کے ذریعہ انسان زندگی کے راستے میں حوادث روزگار کی پیدا کردہ مشکلات اور رکاوٹوں پر عبور حاصل کرتا ہے۔

زوالِ بصارت بھی زندگی کی راہ میں اگرچہ بڑی رکاوٹ ہے لیکن ناقابلِ عبور نہیں۔ زندگی اپنی ہر کمی کو خود ہی پُورا کر لیتی ہے اور اس طرح خود کو حالات سے ہم آہنگ بنا لیتی ہے۔ مثلاً کسی چوپائے کی ایک ٹانگ ضائع ہونے سے اس کی زندگی ختم نہیں ہو جاتی بلکہ تھوڑے ہی عرصہ میں وہ چوپایہ اپنی باقی ماندہ تین ٹانگوں سے پھر چلنے پھرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اس طرح کسی خارجی مدد کے بغیر خود کو نئے حالات سے ہم آہنگ کر لیتا ہے۔ زندہ رہنے کی یہ امنگ ہی زندگی کا اصلی جوہر ہے۔

زوالِ بصارت بھی اسی طرح کا جسمانی نقص ہے۔ جب دُوسرے جسمانی نقائص گونگا پن، بہرہ پن، لنگڑا پن، لولا پن وغیرہ زندگی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتے اور جب زبان کے قائم مقام گونگے کے لیے اشارے بن جاتے ہیں، جس کی مدد سے اس کی روزمرہ کی گزر بآسانی ہو جاتی ہے، تو گویا گونگے بہرے فرد کے لیے بینائی زبان اور آواز کی قایم مقام بن جاتی ہے۔ اسی طرح نابینا فرد کے لیے اس کی قوتِ سامعہ اور لامسہ بینائی کا قایم مقام بن جاتی ہیں۔ بہرحال اس جسمانی نقص سے ایسے فرد کی انسانیت میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔

تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف قوموں نے اس سانحہ کی اپنے اپنے عقائد کے مطابق توجیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ عقیدۂ تناسخ رکھنے والی قوموں کے نزدیک یہ سانحہ بھی دوسرے سانحوں کی طرح گزشتہ زندگی کے کسی جرم کی سزا کے طور پر واقع ہوتا ہے۔ یہ تسلیم کرنے کے بعد نابینا فرد سے ہمدردی کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ ایسا کرنا قانونِ آسمانی کی خلاف ورزی ہو سکتی ہے۔ نتیجے میں ایسے معاشرہ میں نابینا افراد دُوسروں کی خیرات ہی کے لیے پیدا کیے گئے ہیں تاکہ اس طرح مخیّر

لوگ نروانت (نجات) حاصل کریں۔

یہ جبری عقیدہ خود نابینا افراد میں اپنی اس رکاوٹ پر قابو پانے کے سلسلے میں کوئی حوصلہ پیدا نہیں کرتا بلکہ حوصلہ شکنی کرتا ہے۔

بعض معجزہ پرست اقوام میں ان کے بانی مذہب کے ایسے معجزے گنائے جاتے ہیں، جن کی وجہ سے ہزارہا نابینا افراد کو بینائی نصیب ہوئی تھی۔ لیکن اس بانیِ مذہب کے بعد نابینا افراد کو پھر ایسی معجزہ نما شخصیت کی تلاش میں سرگرداں رہنا ہی پڑتا ہے، جس کا معجزہ انھیں بینائی کی دولت سے مالا مال کر دے حالانکہ ان اقوام کے عقاید کی رُو سے اب ایسی شخصیت کا ملنا محال ہے۔ نتیجہ پھر وہی نکلتا ہے کہ نابینا افراد رضا بہ قضا خود کو مخیر حضرات کے رحم و کرم کے حوالے کر دیں۔ قرونِ وسطیٰ میں عیسائی گرجوں اور خانقاہوں میں معذور افراد کا پناہ گزیں ہونا اسی کیفیت کی غمازی کرتا ہے۔ بہرحال اس عقیدے سے بھی نابینا افراد کو اپنی اس رکاوٹ پر عبور حاصل کرنے کے سلسلے میں کوئی حوصلہ افزائی نہیں ملتی۔

دین اسلام انسانیت کی دنیوی و اُخروی فلاح و بہبود کا ضامن ہے۔ اس دین کا طرۂ امتیاز انسانی مساوات کا قیام ہے۔ یہ اسلامی مساوات رنگ و نسل، قوم و زبان بلکہ صحیح سالم افراد اور جسمانی نقص رکھنے والے افراد کے درمیان کسی فرق کو گوارا نہیں کرتی۔ ایک فردِ انسانی کے سارے اعضاء و حواس صحیح سالم ہیں۔ دوسرے کے کسی عضو میں کوئی نقص نہیں ہے، لیکن جسمانی نقص کی وجہ سے وہ کسی کمتر سلوک کا مستحق نہیں، بلکہ اسلام ایسے افراد کو بھی صحیح سالم افراد کی طرح فرائض کی ادائیگی کے نتیجے میں وہی حقوق عطا فرماتا ہے، اسلام نے ایسے افراد میں زندہ رہنے کی امنگ پیدا کی اور انھیں اپنے ماحول میں دل چسپی لینا اور خود کے لیے اور معاشرہ کے لیے مفید بننا سکھایا اور اس سلسلے میں انسانیت کی رہنمائی کی۔

نابینائی دربارِ رسالتؐ میں ایک دن حرمِ کعبہ میں سردارانِ قریش جمع تھے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلّم ان کو اسلام کے بارے میں سمجھا رہے تھے کہ عبداللہ ابن ام مکتوم نابینا ایک قائد (آنکھ والا رہبر) کے ساتھ اِدھر آنکلے اور درمیان گفتگو میں پوچھا کہ جو کچھ آپ کو خدا نے سکھایا ہے، مجھے بھی سکھائیے۔ آپ نے اشارے سے قائد کو سمجھایا۔ قائد کی بات ابن ام مکتوم نے نہ مانی اور گفتگو میں پھر دخل انداز ہوئے۔ حضورؐ نے منہ پھیر لیا اور دوسرے لوگوں کی طرف توجہ فرمائی۔ یہ واقعہ سورہ عبس کا شانِ نزول بنا اور وحی نازل ہوئی:

عَبَسَ وَتَوَلّٰىٓ ۙ اَنْ جَاۗءَهُ الْاَعْمٰى ۭ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰىٓ ۙ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۭ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۙ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ۭ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ۭ وَاَمَّا مَنْ جَاۗءَكَ يَسْعٰى ۙ وَهُوَ يَخْشٰى ۙ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۚ

تیوری چڑھائی اور منہ موڑا اس سے کہ آیا اس کے پاس اندھا اور کس چیز نے معلوم کروایا تجھ کو، شاید کہ وہ پاک ہوجاتا یا نصیحت سنتا۔ پس فائدہ دیتی اس کو نصیحت پر جو شخص کہ بے پروائی کرتا ہے پس تو واسطے اس کے تقید کرتا ہے اور کیا ملامت ہے اوپر تیرے یہ کہ ناپاک ہووے وہ۔ اور جو کوئی آیا تیرے پاس

دوڑتا ہوا اور وہ ڈرتا ہے پس تو اس سے تغافل کرتا ہے۔

مذکورہ بالا آیات اور ان کی شانِ نزول سے مندرجہ ذیل باتیں ظاہر ہوتی ہیں:

۱۔ عبداللہ ابن اُمِ مکتوم مسلمان تھے اور جو مسائل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کفارِ مکہ کو تبلیغ فرما رہے تھے، یہ انھیں مکرر پوچھ کر سمجھنا چاہتے تھے۔

۲۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش تھی کہ یہ دخل اندازی نہ کریں، تاکہ آپ ان سردارانِ قریش کو اسلام سمجھا سکیں۔

۳۔ آپ کا خیال تھا کہ شاید ان میں سے کوئی مسلمان ہو جائے اور اس ابتدائی دور میں کسی سردارِ قبیلہ کا مسلمان ہو جانا اسلام کی تقویت کا باعث ہوتا جب کہ ابن ام مکتوم مسلمان تھے اور یہی مسائل انھیں کسی دوسرے وقت سمجھائے جا سکتے تھے اس لیے ان کی دخل اندازی آپ کو ناگوارِ خاطر ہوئی۔

۴۔ نابینا سائل کو آپ نے نہ تو جھڑکا اور نہ بالراست خاموش ہونے کو فرمایا بلکہ اس کے ساتھی کو اشارہ فرمایا تاکہ نابینا کی دل شکنی نہ ہو کیونکہ اس کا ارادہ نہایت پاک تھا اور آپ دوسرے آدمیوں سے مصروفِ گفتگو ہو گئے۔

۵۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارے پر ان کے قائد نے انھیں ٹوکا تو انھوں نے نہ مانا کیونکہ وہ اسے فائدہ کی بات سمجھے۔

۶۔ نابینا ہونے کی وجہ سے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادے کو بھانپ نہ سکے۔

۷۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرح دوسری طرف مصروفِ گفتگو ہونے پر ابن ام مکتوم اگرچہ خاموش رہے، لیکن ان کے دل پر یہ بات شاق گذری اور جیسا کہ ایسے موقع پر نابینا افراد محسوس کرتے ہیں، انھیں یہ خیال ہوا ہو گا کہ نابینا ہونے کی وجہ سے انھیں نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ یہی احساس پستی نابینا کو خود سے اور معاشرے سے متنفر کر دیتا ہے۔ بہر حال ان کی اس ذہنی خلش کی اطلاع خدائے بزرگ و برتر نے اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی دی۔

۸۔ چونکہ اسلام سے قبل اہلِ عرب نابینا افراد کو معاشرہ کا ناکارہ فرد سمجھتے اور ان کے ساتھ مل کر کھانے پینے کو باعثِ ننگ سمجھتے تھے، اس لیے اس کا امکان تھا کہ وہ یہ نتیجہ اخذ کر لیتے کہ خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی نابینا افراد کے بارے میں انھیں کے ہم خیال ہیں۔ نعوذ باللہ منہا

۹۔ نابینا انسان جو راہِ راست پر ہو وہ آنکھ والے بے راہ انسانوں سے زیادہ توجہ کا مستحق ہے اور اس کی نابینائی سے اس کی انسانیت میں کمی واقع نہیں ہوتی اور وہ صحیح سالم افراد کی طرح زندگی میں اپنا کردار ادا کر سکتا ہے۔

۱۰۔ یہ واقعہ قرآن کریم کو خدا کا کلام ثابت کرنے میں زبردست دلیل ہے جس میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک طرزِ عمل پر نکتہ چینی فرمائی گئی ہے اور دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہ رسول امین ہیں جو خود کے بارے میں ایسی وحی کو پوری امانت کے ساتھ قوم کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ صلی اللہ علیہ وسلم

عہدِ رسالت میں نابینا افراد کی تعلیم و تربیت

ابن اُمِّ مکتوم ام المومنین خدیجہؓ کے ماموں زاد بھائی تھے۔ اس لحاظ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قریبی رشتہ داری تھی۔ قدیم الاسلام تھے اور ان سابقون الاوّلون میں سے تھے جنھیں ابتدائی مکّی دور میں حضورؐ کی مصاحبت اور آپؐ سے دین سیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی، پیدائشی نابینا تھے۔ بقول زرقانی:

"وزعم بعضهم انه ولد اعمٰى فكنت امه به لاكتتام نور بصره"

یہ نابینا پیدا ہوئے اس لیے ان کی والدہ محترمہ نے ان کی کنیت ابن ام مکتوم مقرر کی۔ لیکن دوسری روایت حسب ذیل ہے:

وقد روى ابن سعد والبيهقى من انس ان جبرئيل اتى النبى صلى الله عليه وسلم وعنده ابن ام مكتوم فقال متى ذهب بصرك قال ولها غلام ولفظ البيهقى وانا صغير۔

ابن سعدؒ اور بیہقیؒ نے انسؓ سے روایت کی ہے کہ جبرئیلؑ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے اور ان کے پاس ابن ام مکتوم تھے۔ انھوں نے پوچھا: تمھاری بصارت کب گئی؟ کہا: جب میں ابھی بچّہ تھا۔ بیہقی کے الفاظ میں چھوٹا تھا۔ (زرقانی ج ۳ ص ۲۷۰)

تجسس علم حاصل کرنے کے لیے بڑا ضروری عنصر ہے۔ آنکھ والے افراد اپنے گرد و پیش کو بیک نظر دیکھ کر سمجھ جاتے ہیں نابینا افراد ایسا نہیں کرسکتے، اس لیے اپنے گرد و پیش سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے یا تو لمس یا آوازوں کو سُن کر ہی معلوم کرسکتے ہیں۔ بصورتِ دیگر انھیں پوچھنا پڑتا ہے۔ ابن ام مکتومؓ میں تجسّس کا کتنا مادہ تھا، یہ تو اس واقعہ ہی سے معلوم ہوگیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو کی آواز سنتے ہی آپ کی خدمت میں دوڑے ہوئے آئے۔

واما من جاءك يسعىٰ۔

اور جو تمھارے پاس دوڑتا ہوا آتے۔

یہ تجسّس تحصیلِ علم کے شوق میں تبدیل ہوگیا۔ زرقانی کی مذکورہ بالا روایت سے یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ اکثر و بیشتر حضورؐ کی خدمت میں حاضر رہتے اور اپنی علمی پیاس بجھاتے۔

نزولِ سورۂ عبس کے بعد تو جب بھی یہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے، تو آپؐ فرماتے:

مرحبا بمن عاتبنى فيه ربى وليبسط رداءه۔

اس کو خوش آمدید جس کے معاملے میں میرے رب نے مجھ پر عتاب فرمایا اور آپ ان کے لیے اپنی چادر بچھا دیتے۔

اور ابن جریر نے روایت کی ہے کہ آپ اس کے ساتھ ہی ان کی ضروریات بھی پوچھ لیتے۔

دورِ رسالت میں عملی طور پر تعلیم و تربیت ہوتی تھی۔ نازل شدہ وحی کو حفظ کروانا، اس کے معانی و مطالب، روزمرہ پیش آنے والے مسائل اور ان کا حل، ارکانِ اسلام کی عملی تعلیم وغیرہ۔ اس تعلیم میں ابن ام مکتومؓ دوسرے آنکھ والے صحابہ کرامؓ کے دوش بدوش شریک رہے۔ آنکھ والے افراد سے الگ رہ کر نابینا فرد خود میں کمی محسوس کرتا ہے، اس لیے وہ خود کو زندگی کی دوڑ میں آنکھ والوں کے برابر کبھی بھی نہیں سمجھ سکتا۔ طریقۂ رسالت صلعم میں اس کی گنجائش نہیں، بلکہ آپ کے طرزِ عمل سے آپ نے مساواتِ انسانی کا وہ سبق دیا جس سے واضح ہوگیا کہ جسمانی نقص رکھنے والے افراد خود کو صحیح سالم افراد سے کمتر نہ سمجھیں۔ اس کے نتیجے میں ابن ام مکتومؓ میں خود اعتمادی پیدا ہوئی جو نابینا فرد کی تعلیم و تربیت کا پہلا قدم ہے۔

اس خود اعتمادی کی وجہ سے ابن ام مکتومؓ نابینائی کی وجہ سے پیدا ہونے والے احساسِ پستی کا شکار نہ ہو سکے اور دوسرے صحیح سالم افراد کی طرح زندگی اور اپنے ماحول میں دلچسپی لینے لگے۔

چنانچہ جب آیت لا یستوی القاعدون من المؤمنین و المجاھدین ۔۔۔ الخ نازل ہوئی، جس میں ارشادِ خداوندی تھا کہ جہاد فی سبیل اللہ میں حصہ لینے والے مومن اس میں شرکت نہ کرنے والے مومنوں سے زیادہ مراتب پائیں گے۔ علم دین کے شائق ابن ام مکتومؓ اپنے عذر نابینائی کے تعلق سے اس ارشادِ خداوندی کو سمجھنا چاہتے تھے۔ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا عذر پیش کیا۔ اس پر آیت غیر اولی الضرر نازل ہوئی یعنی معذور افراد اس سے مستثنیٰ ہیں۔ (دیکھو صحیح مسلم باب سقوط فرض الجہاد عن المعذورین)

اگر ان میں خود اعتمادی حضورؐ کے فیضِ صحبت سے نہ پیدا ہو جاتی تو اس آیت کے نتیجے میں بہر حال احساسِ کمتری کا شکار رہتے۔ لیکن آگے بڑھ کر پوچھ لینے سے استثنا کی اجازت مل گئی اور اس طرح دوسرے سب معذور افراد کی نمایندگی بھی ہوگئی، کیونکہ:

لا یکلف اللہ نفسًا الا وسعھا۔

خدا کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

اس طرح نماز باجماعت کی تاکید کے موقع پر ابن ام مکتومؓ نے یہ عذر پیش کیا کہ کیونکہ وہ مسجد نبویؐ سے کافی فاصلے پر رہتے ہیں، راستے میں جھاڑیاں وغیرہ ہیں اور ہر وقت کسی قائد کا ملنا بھی مشکل ہے، اس لیے نماز باجماعت سے انھیں مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ کیا تمھارے گھر تک اذان کی آواز سنائی دیتی ہے؟ کہا: ہاں۔ فرمایا: تم پر نماز باجماعت ضروری ہے۔ (المستدرک للحاکم، کتاب معرفۃ الصحابہ، تذکرہ ابن ام مکتومؓ)

مذکورہ بالا روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ نابینا فرد کے ساتھ حد سے زیادہ رعایت نہ برتی جاتی تھی۔ ورنہ ایسا کہنے سے نابینا فرد سستی اور کاہلی کا شکار ہو جاتا۔ اپنی جائے رہائش اور اس کے اطراف و اکناف میں اس کا چل پھر لینا خود اس کے اندر زندگی کی امنگ کو باقی رکھ سکتا ہے۔ اس لیے حضورؐ نے ابن ام مکتوم کو نماز باجماعت سے مستثنیٰ نہیں فرمایا اور یہ ثابت فرمادیا کہ جو حرکت اور کام نابینا افراد خود کر سکیں اس کے لیے ان کی مدد نہ کرنی چاہیے، تاکہ ان میں خود اعتمادی

پیدا ہو۔ چنانچہ اس سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل مدینہ ہجرت کرنے والوں میں ابو احمد بن جحش کا نام لیا جاسکتا ہے جو نابینا تھے اور مکّہ میں نشیبی اور بالائی علاقوں میں بغیر قائد کے پھرتے تھے (تاریخ الطبری ج ۲ ص ۹۷)

بہرحال اسلام کے دورِ اوّل میں نابینا افراد کو محض ناکارہ نہ سمجھا جاتا تھا اور وہ دوسرے افراد کی طرح روزمرہ کی زندگی میں اپنا کردار ادا کرتے تھے اور قومی و مذہبی اجتماعی کاموں میں حصہ لیتے تھے۔ اسی سلسلے میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

عن ابی هریرة قال طاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی حجتہ علیٰ ناقتہ الجدعاء وعبداللہ ابن ام مکتوم اخذ بخطامها یرتجز۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے حج کے موقع پر اپنی اونٹنی جدعا پر سوار ہو کر طواف فرمایا اور ابن ام مکتوم اس کی نکیل تھامے رجز پڑھتے جاتے تھے۔ (المستدرک للحاکم کتاب معرفۃ الصحابہ۔ تذکرہ ابن ام مکتومؓ)

نابینا افراد کی تربیت فرد واحد کا کام نہیں ہے بلکہ سارے معاشرے کا رویّہ نابینا افراد کے بارے میں ایسا ہو کہ وہ خود کو تنہا محسوس نہ کریں۔ انھیں یہ محسوس ہو کہ معاشرہ ان میں دل چسپی رکھتا ہے۔ نتیجے میں وہ خود بھی اپنے معاشرے میں دلچسپی لیتے ہیں۔ اسی سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مندرجہ ذیل عملی نمونہ قایم فرمایا ہے:

عن جابر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انطلقوا بنا الی البصیر الذی فی بنی واقف نعوده وکان رجل اعمٰی۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہمارے ساتھ چلو، بنی واقف کے ایک بصیر کی عیادت کریں اور وہ نابینا شخص تھا۔ (السنن للبیہقی ج ۱۰ ص ۲۰۰)

دوسری روایت میں ہے:

عن محمد بن جبیر بن مطعم بن ابیہ قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول لاصحابہ اذهبوا بنا الی بنی واقف نزور البصیر قال سفیان وهم حی من الانصار وکان محجوب البصر۔

محمد بن جبیر بن مطعمؓ نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں سے فرماتے تھے ہمارے ساتھ بنی واقف کی طرف چلو، ہم ایک بصیر سے ملاقات کریں گے۔ سفیان نے کہا بنی واقف انصار کا ایک قبیلہ ہے اور وہ شخص نابینا تھا۔ (السنن للبیہقی ج ۱۰ ص ۲۰۰)

پہلی روایت میں نابینا مریض کی عیادت کے لیے اور دوسری روایت میں ملاقات کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جانا اور اس پر اپنے ساتھیوں کو شوق دلانا ثابت ہے۔ اس کے نتیجے میں نابینا فرد خود کو تنہا نہیں پاتا اور محسوس کرلیتا ہے کہ اس کی زندگی سے معاشرہ کو دل چسپی ہے اور زندگی کی مشکلات پر قابو پانے کے سلسلے میں معاشرہ کی تمام ترہمدردیاں اس کے ساتھ ہیں۔ دوسری بات جو ہر دو روایت میں مذکور ہے، وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نابینا فرد کے بارے میں بصیر (دیکھنے والا

یا بصیرت رکھنے والا) فرمایا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ نابینائی ایک جسمانی نقص ہے، عیب نہیں، اور عام طور پر ایسے افراد کے سامنے یہ لفظ بطور عیب کے کہا جاتا ہے، جس سے ان کا ذہن فوراً اس کمی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، جس کا پورا ہونا بعض صورتوں میں ناممکن ہے اور وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ جب تک بینائی نہ ہو معاشرہ کے دوسرے افراد انھیں کمتر سمجھتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نمونہ عمل سے نابینا فرد کا ذہن اس طرف متوجہ نہیں ہوتا بلکہ وہ بینائی نہ رکھتے ہوئے بھی دوسرے صحیح سالم افراد کی طرح اپنے ساتھ برتاؤ ہوتا محسوس کر کے عزت نفسی جیسی کیفیت اس میں پیدا ہوتی ہے۔

نابینا افراد کی ذہنی تربیت کے سلسلے میں معاشرہ کا ان کے ساتھ برتاؤ ایک ضروری عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بات ابن ام مکتومؓ کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رویے سے ظاہر ہوتی ہے۔ حدیث میں آیا ہے:

عن ام سلمة انها كانت هي وميمونه عند النبي صلى الله عليه وسلم فدخل ابن ام مكتوم فقال النبي صلى الله عليه وسلم احتجبا منه فقالتا انه اعمى لا يبصرنا قال النبي صلى الله عليه وسلم افعميا وان انتما فليس تبصرانه۔

ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ وہ اور میمونہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھی تھیں کہ اتنے میں ابن ام مکتوم داخل ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ پردہ کر لو۔ دونوں نے کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ تو نابینا ہیں، ہمیں دیکھ نہیں سکتے۔ آپؐ نے فرمایا: کیا تم دونوں بھی نابینا ہو اور انھیں نہیں دیکھ سکتی ہو؟

اس حدیث اور دوسری روایات سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں: ایک تو یہ کہ ابن ام مکتومؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتے رہتے تھے اور دین کا علم حاصل کرتے رہتے تھے۔ دوسرے یہ کہ نابینا فرد سے پردہ اسی طرح آپؐ نے کروایا جیسا کہ آنکھ والے افراد سے کیونکہ اسلام میں غض بصر کا حکم مومن عورتوں اور مردوں دونوں کے لیے یکساں ہے اور نابینا فرد سے پردہ کر کے اسے دوسرے مردوں کی طرح سمجھا جا رہا ہے اور اس سے کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جا رہا ہے اور نابینا افراد سے معاشرہ کا امتیازی سلوک ہی نابینا افراد کی تربیت اور آباد کاری میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

دورِ رسالت میں نابینا افراد کی کارگزاریاں

سورۂ عبس میں مذکور واقعے کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی میں ابن ام مکتومؓ کا تذکرہ نہیں ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دور میں ان کی تعلیم و تربیت ہوتی رہی ہے۔ آخری مکی دور میں بیعت عقبہ اولیٰ کے موقع پر انصارِ مدینہ کی خواہش پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن ام مکتومؓ اور مصعب بن عمیرؓ کو مدینے میں اسلام کی تبلیغ کے لیے روانہ فرمایا۔ ابنِ قیم فرماتے ہیں:

وبعث معهم رسول الله صلى الله عليه وسلم عمرو ابن ام مكتوم ومصعب بن عمير يعلمان من اسلم منهم القرآن ويدعوان الى الله عزوجل فنزل على ابى امامه اسعد بن

زرارۃ وکان مصعب ابن عمیر یومھم لما بلغوا اربعین فاسلم علیٰ ایدیھما بشر کثیر منھم اسید بن الحضیر وسعد ابن معاذ واسلم باسلامھا یومئذ جمیع بنی عبد الاشھل الرجال والنساء۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار مدینہ کے ساتھ ابن ام مکتوم اور مصعب بن عمیر کو روانہ فرمایا۔ یہ حضرات نومسلموں کو قرآن کی تعلیم دیتے تھے اور غیر مسلموں کو اللہ کی طرف بلاتے تھے۔ یہ دونوں ابوامامہ اسعد بن زرارہ کے پاس اُترے۔ مسلمانوں کی امامت مصعب بن عمیر کرتے تھے اور جب چالیس افراد موجود ہوتے، تو جمعہ پڑھاتے تھے۔ ان دونوں حضرات کے ہاتھ پر کثیر تعداد میں لوگ ایمان لائے جن میں اسید بن الحضیر اور سعد بن معاذ بھی شامل ہیں اور ان دونوں کے اسلام لانے سے قبیلہ بنو عبدالاشہل کے سارے مرد اور عورتیں اسلام لے آئے۔" (زاد المعاد - ج ۲ - ص ۷۱)

ابن ام مکتومؓ کے بحیثیت مبلّغ مدینہ میں مصعب بن عمیر کے ساتھ بھیجے جانے کا ذکر علّامہ ابن حزم نے اپنی کتاب "جوامع السیرۃ" ص ۷۲ اور ابن خلدون نے جلد دوم ص ۱۸۳ میں، اور سیرۃ حلبی کے مصنف علامہ علی بن برہان الدین الحلبی الشافعی نے سیرۃ حلبی ص ۲۰۵ میں کیا ہے۔ اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔

اب ظاہر ہے کہ مکّہ کے باہر علی الاعلان تبلیغ کا یہ پہلا موقع تھا اور اس موقع کے لیے آزمودہ کار مبلّغین ہی کی ضرورت تھی۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہِ انتخاب ان دونوں حضرات پر پڑی اور یہ دونوں اس امتحان میں پُورے کامیاب ثابت ہوئے۔ ان کی یہ کامیابی خود مکّہ معظمہ میں ان کی تبلیغی کوششوں کو ظاہر کرتی ہے، جن کوششوں نے انھیں تجربہ کار مبلّغ بنایا اور انھیں کارگزاریوں کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں یہ اس کام کے لیے موزوں معلوم ہُوئے۔ پھر تبلیغ کے دونوں پہلوؤں پر کاربند رہے یعنی کفار کو اسلام سمجھانا اور مسلمانوں کو قرآن اور شریعت کی تعلیم دینا۔ اس سے ابن ام مکتومؓ کی اسلام کے بارے میں کماحقہٗ واقفیت و مہارت ثابت ہوتی ہے۔ بہرحال ابن ام مکتوم ہجرت سے پہلے مدینہ میں اسلام پھیلا کر ہجرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے فضا سازگار بنانے کا شرف حاصل کرنے والے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دو تربیت یافتہ صحابہؓ میں سے ایک ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلّم مدینہ تشریف لائے۔ مدینہ میں اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آیا۔ فرائض و احکام نازل ہوتے رہے اور اسلام کا قانون مکمل ہوگیا۔ اس دَور میں قرآن کریم و حدیث میں ابن ام مکتومؓ کے تذکرے ملتے ہیں، جس سے ان کی کارگزاریوں پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے:

عن ابن عمر قال کان لرسول اللہ موذنان بلال وابن ام مکتوم الاعمٰی۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو موذن تھے، بلالؓ اور ابن ام مکتومؓ نابینا۔

اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے:

كان ابن ام مكتوم يوذنون لرسول الله صلى الله عليه وسلم وهو اعمى۔

ابن ام مکتوم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اذان کہتے تھے اور وہ نابینا تھے۔ (صحیح مسلم باب استحباب اتخاذ المؤذنین للمسجد الواحد)

رمضان کے زمانے میں ابن ام مکتومؓ کی اذان سحر کے وقت کے ختم ہونے کا اعلان تھی۔ حدیث میں آتا ہے:

عن ابن عمر قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول ان بلالاً يوذن بليل فكلوا واشربوا حتى سمعوا اذان ابن ام مكتوم۔

ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سُنا کہ بلالؓ کچھ رات رہے اذان دیتے ہیں اس لیے تم کھاؤ اور پیو، یہاں تک کہ ابن ام مکتومؓ کی اذان سُن لو۔

(صحیح مسلم باب ان الدخول فی الصوم یحصل بطلوع الفجر)

امام نووی اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ:

"بلالؓ اپنے وقت اذان کہہ کر اپنے اوراد و اذکار میں مصروف ہو جاتے تھے۔ طلوعِ صبح صادق پر لوگ ابنِ اُمِ مکتومؓ کو کہتے اور وہ اذان دیتے۔ یہی اذان سحر کے وقت کے ختم ہونے کا اعلان تھی۔"

بہرحال مدنی زندگی میں ابن ام مکتوم کی کارگزاریوں کا آغاز اسی دینی خدمت سے ہوتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی آپ کی مصروف ترین زندگی ہے، تربیت صحابہ، تعلیم دین، معاملات کے فیصلے، نفاذ احکام اسلامی اور تنظیم مسلمین مقابلہ کفار وغیرہ۔ ایسے کئی مواقع آئے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ سے باہر تشریف لے جانا پڑا اور مدینہ میں کسی کو اپنا نائب مقرر فرمانا پڑا۔ ابنِ حجر عسقلانی کہتے ہیں کہ:

"ابن عبد اللہ نے علماء نسب اور سیرت کی ایک جماعت کے حوالے سے کہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن ام مکتومؓ کو ۱۳ مرتبہ شرفِ نیابت بخشا، حجۃ الوداع اور بدر کے موقع پر بھی۔ بدر کے وقت ابو لبابہ بھی آپ کے ساتھ شریک تھے۔" (الاصابہ فی تمییز الصحابہ)

اسی طرح سیرتِ حلبی میں لکھا ہے:

قال شعبي غزا رسول الله صلى الله عليه وسلم ثلاث عشر غزوة ما من غزوة الا واستخلف ابن ام مكتوم على المدينة وكان يصلى بهم۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۳ غزوات کیے اور کوئی غزوہ ایسا نہیں ہے، جس میں آپ نے ابن ام مکتومؓ کو اپنا نائب بنا کر مدینہ میں نہ چھوڑا ہو۔ وہ لوگوں کو نماز باجماعت پڑھاتے تھے۔ (سیرت حلبی ص ۳۰۴)

حدیث میں آتا ہے:

عن انس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم استخلف ابن ام مکتوم یوم الناس وھو اعمٰی۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن ام مکتومؓ کو، جو نابینا تھے، مدینہ میں اپنا جانشین بنایا اور وہ لوگوں کی نماز میں امامت کرتے تھے۔ (ابو داؤد)

اسی طرح اور کتب الرجال میں بھی اسی قسم کی روایات موجود ہیں۔ ان روایات سے ظاہر ہے کہ غزوات اور حج کے زمانے میں مدینے کے مسلمانوں کی بھاری اکثریت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتی تھی۔ جہاد چونکہ فریضہ تھا، اس لیے فوجی خدمات کے قابل افراد آپ کے ساتھ ہوتے۔ اب مدینہ میں ایسے لوگ باقی رہ جاتے، جو کسی نہ کسی عذر کی بنا پر شریکِ جہاد نہ ہو سکتے تھے۔ ان لوگوں کے لیے ضرورت تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کوئی نہ کوئی نائب موجود ہوتا۔ چنانچہ آپ نے اس طرح کے موقعوں پر ابولبابہ، ابوذر غفاری وغیرہ دوسرے اصحاب کو بھی مقرر فرمایا۔ لیکن سیرت حلبی کی روایت صاف بتاتی ہے کہ ہر موقع پر فریضۂ امامت ابن ام مکتومؓ ہی ادا کرتے رہے۔

نماز جمعہ کی امامت اور خطابت کے سلسلے میں روایت ہے:

حدثنی عبید اللہ بن نوح عن محمد بن سھیل بن ابی حثمہ قال استخلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابن ام مکتوم علی المدینۃ فکان یجمع بھم و یخطب الی جنب المنبر یجعله علی یسارہ۔

واقدی نے روایت کی ہے کہ ان سے عبید اللہ بن نوح اور ان سے محمد بن سہیل بن ابی حثمہ نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن ام مکتوم کو مدینہ پر اپنا نائب بنایا۔ وہ جمعہ پڑھاتے اور منبر کے بازو کھڑے ہو کر خطبہ پڑھتے تھے، اس طرح کہ منبر ان کی بائیں جانب ہوتا۔ (سیر اعلام النبلاء للذہبی ج ۷ ص ۲۶۰)

الغرض روایات سے ظاہر ہے کہ حضورؐ کی غیر موجودگی میں مدینہ میں بحیثیت نائب رسول آپ پوری ذمہ داریاں ادا کرتے تھے۔ حضورؐ کی غیر موجودگی میں دشمنوں سے مسلمانوں کے گھروں اور اہل و عیال کی حفاظت اور خبر گیری، معاملات کے تصفیہ وغیرہ بھی غالباً اسی ذمہ داری میں شامل تھے، اور ابن ام مکتوم نابینا ہونے کے باوجود تنظیمی صلاحیتوں کے مالک تھے، جس کی کسی عہدہ دار کے لیے سخت ضرورت ہے۔ یہ نتیجہ تھا آں حضرت صلی اللہ علیہ السلام کے فیض صحبت کا۔

ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ معذور افراد کس طرح ابن ام مکتوم کے سوال پر فرضیت جہاد سے مستثنیٰ کیے گئے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں ابن قتیبہ فرماتے ہیں:

وفیه وجه آخر وھو ان القرآن کان ینزل شیئاً بعد شیءٍ و آیۃ حتی لربما نزل الحرفان او الثلاثه قال زید بن ثابت کنت اکتب لرسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم۔ لا یستوی القاعدون من المؤمنین والمجاھدین فی سبیل اللہ فجاء ابن ام مکتوم فقال یا رسول اللہ

انی احب الجہاد فی سبیل اللہ و اکن بی عن الضرر ما تری قال زید فثقلت فخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی فخذی حتی خشیت ان ترضھا ثم قال اکتب لا یستوی القاعدون من المومنین غیر اولی الضرر والمجاھدین فی سبیل اللہ۔

اس کی ایک دوسری وجہ بھی ہے اور وُہ یہ کہ قرآن کریم تھوڑا تھوڑا ایک آیت کے بعد دوسری آیت، یہاں تک کہ دو یا تین حروف، بھی نازل ہوتا تھا۔ چنانچہ زید بن ثابتؓ نے کہا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے لکھ رہا تھا لا یستوی القاعدون کہ جہاد میں شریک نہ ہونے والے، اپنی جان و مال سے جہاد کرنے والوں کے برابر نہیں ہو سکتے اتنے میں ابن ام مکتومؓ آئے اور کہا: یارسول اللہؐ! میں جہاد سے محبت کرتا ہوں، لیکن آپ جانتے ہیں کہ میں نابینا ہوں۔ زید نے کہا کہ اتنے میں حضورؐ کا پاؤں جو میرے پاؤں پر تھا، ناقابلِ برداشت حد تک بوجھل ہوگیا (نزولِ وحی کی کیفیت تھی۔ جب وحی نازل ہوگئی تو) حضورؐ نے مجھ سے فرمایا: لکھو لا یستوی القاعدون من المؤمنین غیر اولی الضرر والمجاھدین فی سبیل اللہ جہاد میں شریک نہ ہونے والے سوائے اس کے کہ معذور ہوں، مجاہدین کے برابر نہیں ہو سکتے۔ (تاویل مشکل القرآن ابن قتیبہ ص ۱۸۴)

بہرحال غیر اولی الضرر میں نابینا، لنگڑے اور مریض افراد شامل ہیں (دیکھو ترمذی) حدیث میں آیا ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عند دخولہ المدینۃ بعد غزوۃ تبوک ان فی المدینۃ لاقواماً ما سرتم من مسیر ولا قطعتم من وادٍ الا کانوا معکم فیہ۔ قالوا یا رسول اللہ وھم بالمدینۃ۔ قال نعم بالمدینۃ حبسھم العذر۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک سے واپسی پر مدینے میں داخل ہوتے وقت فرمایا: مدینہ میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ نہ تم پھرے اور نہ تم نے کسی وادی کو قطع کیا مگر وہ تمھارے ساتھ ہیں۔ صحابہؓ نے پُوچھا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اور وہ مدینہ میں ہیں؟ فرمایا: ہاں، وہ مدینہ میں ہیں، ان کو ان کے عذر نے روکا ہے۔ (التفسیر الواضح ص ۴۸)

معذور افراد جذبۂ جہاد رکھتے ہُوئے بھی اپنے عذر کی بنا پر شریک نہ ہو سکے۔ لیکن ان کے خلوصِ نیت کی بنا پر انھیں مجاہدین کے برابر اجر ہے۔ لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس مرحلے پر ابن ام مکتومؓ مطمئن نہیں ہوئے۔ کیونکہ وُہ رخصت اور عزیمت کے فرق کو جانتے تھے۔ بہرحال شوقِ جہاد ان میں بڑھتا گیا اور بالآخر وہ شریکِ جہاد بھی ہوئے۔ چنانچہ روایت ہے:

ثابت البنانی عن ابی لیلی ان ابن اُم مکتوم قال ای رب انزل عذری فانزلت غیر اولی الضرر فکان بعد یغزو و یقول ادفعوا الی اللواء فانی اعمٰی لا استطیع ان افر و اقیمونی بین الصفین۔

ثابت البنانی نے ابولیلیٰ سے روایت کی ہے کہ ابن ام مکتوم نے آیت لایستوی القاعدون کے نزول پر کہا: اے میرے رب! میرے عذر نابینائی کے بارے میں بھی نازل فرما۔ پس آیت غیر اولی الضرر نازل ہوئی۔ اس کے بعد وہ بھی شریکِ جہاد ہوتے اور کہتے کہ مجھے جھنڈا دے کر دونوں صفوں کے درمیان کھڑا کر دو، میں نابینا ہوں، بھاگ نہیں سکتا۔ (سیر اعلام النبلاء ج ۱، ص ۲۶)

کتنا لطیف طنز ہے کہ آنکھ والا اپنے لشکر کو پسپا ہوتا دیکھ کر بھاگ سکتا ہے۔ لیکن نابینا چونکہ دیکھتا نہیں، اس لیے میدان میں جما رہتا ہے اور اپنے عَلم کو سرنگوں نہیں ہونے دیتا۔

الغرض اسی جذبۂ جہاد نے انھیں جنگِ قادسیہ میں اسلامی لشکر کے عَلم بردار کی حیثیت سے شریک کیا۔ چنانچہ ابن جریر طبری نے انس بن مالک سے روایت کی ہے کہ انھوں نے جنگِ قادسیہ میں ابن ام مکتوم کو دیکھا کہ جسم پر زرہ ہے اور ہاتھوں میں عَلم تھامے ہوئے ہیں اور اسی میں یہ شہید ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

دورِ رسالت میں نابینا افراد کے ساتھ ان کے اہلِ خاندان کا رویّہ

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے اسلام نابینا افراد کو ما بقی انسانیت سے الگ کوئی گروہ نہیں سمجھتا اور دُوسرے آنکھ والے افراد کے ساتھ ساتھ ان کی تعلیم و تربیت کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ نابینا افراد جس گھر اور خاندان کے اراکین ہیں، انھیں اسی ماحول میں جذب کرنا اسلامی نکتۂ نگاہ سے ضروری ہے، بصورتِ دیگر نابینا فرد کو گھریلو ماحول سے نکال کر دوسرے کسی ماحول میں تعلیمی مقاصد کے لیے جذب کیا جائے تو نتیجے میں اس کا اپنا گھریلو ماحول اس کے لیے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ اسی لیے صلہ رحمی جو اسلام میں ایک خوبی ہے، اس کا تقاضا ہے کہ نابینا افراد کے قریبی رشتہ دار ایسے افراد کی زندگی کو کامیاب بنانے میں ان کا ہاتھ بٹائیں اور یہ معاشرہ کی ابتدائی اکائی یعنی خاندان مل کر ایک فرد کی حالت کو سنواریں۔ اس طرح ایک نابینا فرد کی آبادکاری ایک خاندان کا اپنا مسئلہ بن جاتا ہے۔

قرآن کریم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

> لیس علی الاعمیٰ حرج ولا علی الاعرج حرج ولا علی المریض حرج ولا علی انفسکم ان تاکلوا من بیوتکم او بیوت اٰبآئکم او بیوت امھٰتکم او بیوت اخوانکم او بیوت اخواتکم او بیوت اعمامکم او بیوت عمٰتکم او بیوت اخوالکم او بیوت خٰلٰتکم او ماملکتم مفاتحہٗ او صدیقکم۔ (۲۴ : ۶۱)

نابینا پر اور لنگڑے پر اور مریض پر اور خود تم پر کوئی تنگی نہیں کہ تم کھاؤ اپنے گھروں سے یا اپنے والد کے یا ماؤں، بھائیوں، بہنوں، چچاؤں، پھوپھیوں، ماموؤں، خالاؤں یا جن کی کنجیوں کے تم مالک ہو یا اپنے دوستوں کے گھروں سے۔

اس آیت پاک کی تفسیر اور شانِ نزول میں مختلف روایات بیان کی جاتی ہیں۔ عطا خراسانی اور عبدالرحمٰن نے یہ معنی لیے ہیں کہ نابینا، لنگڑے اور مریض کے لیے جہاد کو چھوڑنے میں کوئی گناہ نہیں۔ ان کی ناتوانی اور عذر کے سبب سے آیت کا منطوق یہاں جہاد ہے ہی نہیں۔ دوسرے معذور افراد کو شرکت جہاد سے دُوسری آیت لایستوی القاعدون...... الخ میں مستثنیٰ کیا جا چکا ہے۔

سعید بن جبیرؓ اور مقسم نے کہا ہے کہ لوگ نابینا، لنگڑے اور مریض افراد کے ساتھ مل کر کھانے کو بُرا سمجھتے تھے، کیونکہ نابینا کھانے کو دیکھ نہیں سکتا اور ہوسکتا ہے کہ وُہ عمدہ کھانا' جو اس کی دسترس میں ہو، کھا جائے، جب کہ دستر خوان پر دوسروں کا لحاظ بھی ضروری ہے۔ لنگڑا صحیح طور پر بیٹھ نہیں سکتا۔ اس لیے دوسرے آدمی کو سبقت کرنی پڑتی ہے اور بیمار آدمی تندرست کی طرح کھا نہیں سکتا۔ بہرحال یہ آیت اس لیے نازل ہوئی کہ نابینا، لنگڑے اور مریض افراد کے ساتھ مل کر کھانے میں کوئی حرج نہیں حالانکہ آیت کے اسلوبِ بیان میں صحیح سالم افراد کے بجائے معذور افراد کو بتایا جا رہا ہے کہ انھیں اپنے رشتہ داروں کے گھروں میں کھانے میں کوئی حرج نہیں۔

اس آیت کے شانِ نزول میں ملّا جیون فرماتے ہیں:

واحسن من کل ذٰلک فی المدارک حیث قال۔ قال سعید بن المسیّب کان المسلمون اذا خرجوا الی الغزو مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم وضعوا مفاتیح بیوتھم عند الاعمٰی والمریض والاعرج وعند اقاربھم ویاذنوا بھم ان یاکلوا من بیوتھم وکانوا یتحرجون من ذٰلک ویقولون نخشیٰ ان لا تکون انفسھم بذٰلک طیبۃ فنزلت الایۃ رخصۃ لھم۔

اور ان سب سے بہتر مدارک التنزیل میں ہے، جیسا کہا سعید بن المسیّب نے کہ مسلمان جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد کے لیے نکلتے تو اپنے مکانوں کی کنجیاں نابینا، لنگڑے، مریض اور رشتہ داروں کو دیتے اور انھیں اپنے ان گھروں میں سے کھانے کی اجازت دیتے، لیکن یہ معذور افراد اور رشتہ دار اس میں حرج سمجھتے تھے اور ڈرتے تھے کہ شاید ان کے لیے یہ کھانا پاکیزہ نہ ہو۔ اس لیے انھیں رخصت کے طور پر یہ آیت نازل ہُوئی۔ (التفسیر الاحمدیہ ملا احمد جیون ص ۳۰۷ و نیز مدارک التنزیل سورہ نور)

معذور افراد اور مجاہدین کے رشتہ دار ان مجاہدین کے مکانات کی حفاظت کرتے ہوئے بھی وہاں سے کھانے کو اس لیے بُرا جانتے تھے کہ فرمانِ خدا تھا:

یٰاَیّھا الذین اٰمنوا لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل۔

اور ان کا خیال تھا کہ جہاد پر جانے والوں کے گھروں کی حفاظت کرتے ہوئے وہاں سے کھانا اس آیت کے مطابق اکل بالباطل ہوگا، اس لیے احتراز کرتے تھے۔ اس لیے رخصت کے طور پر یہ آیت لیس علی الاعمٰی حرج نازل ہُوئی۔

اس میں شک نہیں کہ معذور افراد جہاد سے مستثنیٰ کیے گئے تھے اور دوسرے مسلمان، جو فوجی خدمات کے لیے جاتے تھے ان کے گھروں کی دیکھ بھال بھی ضروری تھی۔ پس معذور افراد سے اس سلسلے میں کام لیا گیا اور یہ کام کرتے ہوئے ان لوگوں نے ان مکانوں میں سے کھانا اپنے تقویٰ کے خلاف جانا۔ اس طرح ان کے لیے رخصت ایک ہنگامی صورتِ حال کو ظاہر کرتی ہے لیکن قرآن پاک کا اسلوبِ بیان صاف بتا رہا ہے کہ یہ رخصت اتفاقی یا ہنگامی نہیں بلکہ عام حالات میں بھی اگر معذور افراد کو ان کے وہ رشتہ دار اور احباب، جن کا ذکر اس آیت میں ہے، سہارا دینا چاہیں، تو معذور افراد کو اس میں کوئی حرج نہیں سمجھنا چاہیے۔

پھر آیت کا شانِ نزول صاف بتا رہا ہے کہ مجاہدین ان معذور افراد کو بخوشی اپنے گھروں میں سے کھانے کی اجازت دیتے تھے۔ ان کے احتراز پر خدائے پاک نے خصوصی صورتِ حال کے ساتھ ساتھ عمومی طور پر گیارہ رشتوں کا تذکرہ فرما دیا کہ معذور افراد ان کی طرف سے دستِ تعاون کو حرج نہ سمجھیں۔

اگر رخصت کی جگہ ان رشتہ داروں کو معذور افراد کی امداد کا حکم دیا جاتا تو یہ بات خود معذور افراد کو کاہل بنا سکتی تھی۔ قرآن پاک میں رخصت کے طور پر جو بات ارشاد فرمائی گئی اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام کے دورِ اول میں معذور افراد بھی غایت درجہ کی خودداری اور عزتِ نفس کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اور یہ بات ان کی جبلیات کے جذبہ کے مطابق بھی ہے، پس اپنی جد و جہد کے ساتھ ساتھ اگر اہلِ خاندان کا تعاون حاصل ہو تو اس کی اجازت بھی ہے اور یہ معذور افراد کی اپنے گھریلو ماحول میں آباد کاری کی ایک بیّن دلیل بھی ہے۔ اس سے نابینا اور معذور افراد کسی نئے ماحول میں جا کر نئی ذہنی کش مکش میں مبتلا ہوئے بغیر اپنی زندگی کو اپنے گھریلو ماحول میں رہ کر کامیاب بنا سکتے ہیں۔

الغرض اس آیت پاک کا اطلاق خاندانی ماحول پر کرتے ہوئے اہلِ خاندان اپنے کسی نابینا فرد کو یا کسی اور معذور فرد کو مناسب کام پر لگا کر اس طرح ایک فردِ خاندان کی حالت کو سنوار سکتے ہیں اور یہی اس آیت کا مقصود بھی ہے اور شانِ نزول کی روایت جو سعید بن المسیب سے ہے، قدرت تائید کر رہی ہے۔

دورِ رسالت میں نابینا افراد اور ان کی ازدواجی زندگی

جنسی میلان ایک فطری داعیہ ہے۔ اس کی تکمیل کے بغیر جیسے آنکھ والے افراد میں بے راہ روی پیدا ہو جاتی ہے، اسی طرح نابینا افراد بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ اسلام میں اس داعیہ کی تکمیل کے لیے نکاح کا قانون موجود ہے۔ اور جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں اسلام میں اس معاملے میں بھی نابینا اور آنکھ والے افراد کے لیے یکساں ہدایت کی ہے اور جنسی داعیہ کی جائز تکمیل میں نابینا افراد بھی آنکھ والے افراد کی طرح کامیاب ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں۔ چنانچہ مندرجہ ذیل واقعات سے دورِ رسالت میں نابینا افراد کی متاہلانہ زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔

اوس بن الصامت (نابینا) نے کسی معاملے میں غضب ناک ہو کر اپنی بیوی خولہ بنت ثعلبہ کو کہہ دیا کہ:

انت علی کظھر امی وکان ذٰلک فی زمن الجاھلیۃ طلاقا۔

تو میرے لیے میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے۔ یعنی حرام ہے۔ اور یہ زمانہ جاہلیت میں طلاق کا طریقہ تھا۔
اس کے بعد انھوں نے مراجعت چاہی تو خولہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا کہ وہ پُوچھے مراجعت جائز ہے یا نہیں ؛ چونکہ اس وقت تک ظہار کے بارے میں کوئی حکم نازل نہیں ہُوا تھا اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"خدا نے اس معاملہ میں کوئی حکم نازل نہیں فرمایا اور میری رائے میں تُو اس کے لیے حرام ہے۔"

خولہ نے کہا: "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! جس خدا نے آپ پر کتاب نازل فرمائی اس نے طلاق کا ذکر نہیں کیا؛ اور وہ (اوس بن الصامت) میرے بچوں کا باپ ہے، یعنی میرا شوہر ہے، میں اسے چاہتی ہوں۔" حضورؐ نے فرمایا: "میری رائے میں طلاق ہوگئی ہے مراجعت ناممکن ہے۔" خولہ نے کہا "میں خدا سے فریاد کرتی ہوں اپنی بیکسی اور تنہائی کی اور اپنے بچوں کی، طلاق کی صورت میں اگر میں ان بچوں کو اپنے شوہر کے حوالے کر دیتی ہوں تو وہ تباہ ہو جائیں گے (اس لیے کہ شفقتِ مادری اور ماں کی تعلیم و تربیت سے محروم ہو جائیں گے یا یہ کہ شوہر نابینا ہونے کی وجہ سے بچوں کی دیکھ بھال شاید نہ کر سکے گا) اور خود اپنے ساتھ رکھتی ہوں تو بھوکوں مریں گے۔" یہ کہتے ہوئے وہ آسمان کی طرف منہ اٹھاتی رہی۔ حضرت عائشہؓ جو اس وقت موجود تھیں، فرماتی ہیں کہ وہ روتی رہی اور اس وقت جو لوگ موجود تھے وہ بھی اس سے متاثر ہو کر روتے رہے۔ اس کے بعد ہی وحی نازل ہوئی۔

(خلاصہ از شذرات الذہب ابن العماد، ج ۱، ص ۱۷، ۱۸، ۱۹)

قد سمع اللہ قول التی تجادلک فی زوجھا وتشتکی الی اللہ۔ واللہ یسمع تحاورکما۔ ان اللہ سمیعٌ بصیر ۝ والذین یظھرون منکم من نساء ھم ما ھن امھٰتھم ط ان امھٰتھم الا الّٰئی ولدنھم ط وانھم لیقولون منکراً من القول وزورا ط وان اللہ لعفو غفور ۝ ...

.... عذاب الیم ۝

واقعی اللہ نے اس عورت کی بات سُن لی، جو اپنے شوہر کے بارے میں جھگڑتی تھی اور اللہ کی طرف شکایت کرتی تھی اور اللہ تمھارے سوال وجواب سُنتا تھا۔ واقعی اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔ جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں، وہ ان کی مائیں نہیں ہو جاتیں۔ ان کی مائیں وُہ ہیں جنھوں نے انھیں جنا ہے اور یقیناً وہ بُری بات کرتے ہیں۔ جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کریں اور پھر اس سے لوٹ جانا چاہتے ہیں پس وُہ ایک غلام آزاد کریں، قبل اس سے کہ وہ ایک دوسرے کو چھُوئیں۔ تمھیں اس کی نصیحت کی جاتی ہے اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے۔ اور جو کوئی غلام آزاد نہ کر سکے وہ دو ماہ کے پے بہ پے روزے رکھے قبل اس سے کہ ایک دُوسرے کو چھوئیں اور جو یہ بھی نہ کر سکے وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ یہ اس لیے ہے کہ تم ایمان لاؤ خدا اور اس کے رسول پر، اور یہ اللہ کے حدود ہیں، اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ (خلاصہ از شذرات الذہب، ابن العماد

ج ۱ - ص ۱۷، ۱۸، ۱۹)

اسلام میں طلاق جاہلیت کو منسوخ کرنے والی اس آیت کا سببِ نزول ایک نابینا اوس بن الصامت کا اپنی بیوی کو ظہار کرنا یعنی طریق جاہلیت سے طلاق دینا ہے۔ طلاق کے بعد جدائی اور بچوں کا مستقبل دونوں کے سامنے آیا تو مراجعت چاہی۔ پھر خولہ نے خدا کے رسولؐ سے بحث وجدل کر کے خدا سے شکایت کی اور نتیجے میں کفارہ ادا کرنے کا حکم اور مراجعت کی اجازت ملی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اوس بن الصامت نابینا کی وفادار بیوی صحیح معنی میں ان کی رفیقہ حیات تھیں اور اپنے نابینا شوہر کے ساتھ کامیاب زندگی گزار رہی تھیں۔

یہ وہی خولہ ہیں جو حضرت عمرؓ کو ان کی خلافت کے زمانے میں راہ میں ملیں اور حضرت عمرؓ ان سے بڑی دیر تک دھوپ میں کھڑے ہوئے باتیں کرتے رہے۔ ان کے چلے جانے کے بعد اپنے ساتھی کے سوال پر آپ نے فرمایا: یہ وہ عورت ہے جس کی باتیں خدا نے سُنیں۔ (الدر المنثور تفسیر سورہ المجادلہ)

ابو احمد بن جحش رضی کے بارے میں پچھلے صفحات میں ذکر ہو چکا ہے کہ نابینا ہونے کے باوجود مکّے کے نشیبی اور بالائی علاقوں میں بغیر کسی قائد کے پھرتے تھے، یہ بھی ازدواجی زندگی میں منسلک تھے، اولاد کوئی نہ تھی۔

دورِ رسالت میں نابینا افراد برسرِ روزگار

کاروبار تمدنی ضروریات کی فراہمی کے لیے ضروری ہے۔ عرب کے سادہ تمدن کی وجہ سے ظاہر ہے کہ کاروبار کے ذرائع کم ہی ہوں گے تاہم زراعت، نجاری، لوہاری، اُونی کپڑا بننا، ہتھیار بنانا، بیوپار وغیرہ ایسے پیشے ہیں، جن کا تذکرہ احادیث و سیَر کی کتب میں ملتا ہے اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ان ذرائع روزگار کی مدد سے کسبِ حلال کے پابند تھے۔

اسلام نے چونکہ نابینا افراد کو از کار رفتہ تسلیم نہیں کیا تھا بلکہ باعزت روزی کمانے میں ان کی حوصلہ افزائی فرمائی تھی اس لیے نابینا افراد بھی دوسرے صحابہ کی طرح باعزت روزی کماتے تھے۔ تفصیلات حسب ذیل ہیں:

حضرت ابن ام مکتومؓ کے بارے میں ہم لکھ آئے ہیں کہ قرآن کی تعلیم دینا، اذان کہنا، بوقتِ ضرورت نماز باجماعت پڑھانا' اس طرح یہ دینی خدمت سے وابستہ ہو گئے تھے تعلیم دین کے سلسلے میں یاد رہے کہ مسجد نبویؐ کے ایک چبوترے پر کم از کم چالیس ایسے مجرد افراد رہتے تھے جن کا کام صرف وحیِ الٰہی کو حفظ کرنا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دین کی تعلیم حاصل کرنا ہوتا تھا، انھیں اصحابِ صُفّہ کہا جاتا تھا۔ حضرت ابوہریرہؓ، حضرت بلالؓ اور حضرت ابن ام مکتومؓ، صہیبؓ، سلمانؓ انھیں اصحابِ صُفّہ میں شامل تھے۔ آگے چل کر ان میں سے اکثر نے شادی کر کے الگ اقامت اختیار کر لی تھی۔

یہ حضرات دین کی تعلیم حاصل کرنے اور پھر اسے دُوسروں تک پہنچانے کے لیے وقف تھے، لیکن ان کے اس طرح وقف ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہ تھا کہ وہ دوسروں پر بارِ دوش بنتے۔ چنانچہ یہ حضرات تعلیم و درس سے فارغ ہوتے ہی

ان میں سے بعض جہاد میں شریک ہو گئے، بعض نے زراعت اختیار کی، بعض نے تعلیمی لائن اختیار کی، بعض نے قرأت' اور بعض نے عبادتِ الٰہی کے لیے زندگی وقف کر دی۔ (التربیت الاداریہ ج ۱ ص ۴۷۷)

اور یہ جو حدیث میں آیا ہے کہ "حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ سے فرماتے اور صحابہؓ اصحابِ صفہ میں سے ایک ایک یا چند افراد کو اپنے ساتھ کھانا کھلانے گھر لے جاتے"۔ تو صاف ظاہر ہے کہ یہ ایسی صورتِ حال ہے، جب اصحابِ صفہ میں سے کسی فرد کو کچھ روزگار نہ مل سکا ہو اور اپنی محنت سے کما کر اپنی ضروریات پوری کر لینا، یہی وہ جذبہ تھا جو نابینا افراد کو مجاہدین کے گھروں کی حفاظت کرتے ہوئے بھی وہاں سے کھا لینا حرج معلوم ہوتا تھا جس کو وحیِ الٰہی نے رفع کر دیا۔ یہ خودداری نابینا افراد میں اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ باعزت ذریعۂ روزگار کے پابند ہوں۔

غزوۂ اُحد کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے روانہ ہوئے، تو اپنی روانگی کو مخفی رکھنے کی غرض سے آپ نے عام راستہ سے ہٹ کر راستہ اختیار فرمایا اور بنی حارثہ کے محلہ میں سے ہو کر گزرے اور المرجح بن قیظی کی زمین میں سے گزرے۔ یہ شخص نابینا تھا اور منافقین میں شامل تھا۔ اس نے آواز سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان لیا اور احاطہ میں سے آپ کے گزرنے پر آپ سے نعوذ باللہ گستاخانہ گفتگو کی۔ صحابہؓ نے اسے سزا دینی چاہی لیکن آپ نے انھیں روک دیا اور فرمایا:

هذا اعمى البصر اعمى القلب -

یہ آنکھ اور دل دونوں کا اندھا ہے۔ (تاریخ طبری ج ۲ ص ۱۹۳)

یہ نابینا منافق اپنے مال کی خود ہی نگہداشت کرتا تھا اور اسی حالت میں اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جانتے ہوئے پہچان لیا تھا۔ اس طرح یہ نابینا فرد گلہ بانی کو ذریعۂ روزگار بنائے ہوئے تھا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ نابینا افراد اپنے جس گرد و پیش سے واقف تھے اور جہاں وہ بآسانی چل پھر لیتے تھے، وہیں کچھ ذرائع روزگار اختیار کر لیتے تھے اور معاشرہ ان سے تعاون کرتا تھا۔ اور یہی سب سے مناسب طریقہ نابینا افراد کی آبادکاری کا آج بھی ہے۔ نابینا افراد کے لیے تجارت ایک بہترین ذریعہ معاش ہے۔ اس سلسلے میں فقہائے اسلام نے واضح طور پر نابینا کی بیع و شرای خرید و فروخت کو جائز قرار دیا ہے۔ خیار رویت کی شرط کو نابینا افراد میں ٹھوس چیزوں میں بذریعہ لمس، بو والی چیزوں میں سونگھنے کے ذریعہ اور ذائقہ دار چیزوں میں چکھنے کے ذریعہ آنکھ والے افراد کے برابر تسلیم کیا ہے۔

(فتاویٰ عالمگیری۔ ج ۳۔ کتاب البیوع ثالث)

اور فقہائے اسلام کے فتاویٰ کی بنیاد در اصل قرآن پاک اور سنتِ نبویؐ ہے۔

امامت ایک دینی خدمت ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نابینا افراد اسے انجام دیتے رہے ہیں، جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں۔ اس سلسلہ میں فقہائے جو نابینا کی امامت کو مکروہ قرار دیا ہے اس کی وجہ ملاحظہ ہو:

نابینا نجاست سے بچ نہیں سکتا۔ دوسرے ہو سکتا ہے کہ وہ مقتدیوں میں سب سے افضل نہ ہو۔ اگر افضل ہو تو بہتر ہے۔ ابن ام مکتومؓ کی امامتِ نماز کو اسی پر قیاس کیا گیا ہے کہ اس وقت مدینہ میں ان سے افضل لوگ نہیں رہ گئے تھے۔ عتبان بن

مالک (آخیر عمر میں نابینا ہوئے)، اپنی قوم میں افضل تھے۔ (بحر الرائق شرح کنز الدقائق ج ۱ ص ۳۴۱)

اس سلسلے میں اتنا ہی عرض کر دینا کافی ہے کہ تربیت یافتہ اور تعلیم یافتہ نابینا افراد نجاست سے ایسے ہی بچ سکتا ہے جیسے آنکھ والا فرد۔ علمِ دین اور دوسری شرائط میں بھی نابینا دوسرے مقتدیوں سے افضل ہو سکتا ہے۔ اس لیے فتویٰ محدثین ہے کہ نابینا کی امامت بلا کراہت جائز ہے۔ رہ گیا عوام کی رغبت کا سوال، تو اصل کام نابینا فرد کے بارے میں عوام ہی کے رویّے کو تبدیل کرنا ہے، جس کی تفصیلی بحث گزر چکی ہے۔ اس طرح "موذن" ہونا نابینا فرد کے لیے ایک اچھا ذریعۂ معاش ہے اس سلسلے میں فقہا کا قول ہے کہ "اوقاتِ نماز کی حفاظت کرنے والا اگر دوسرا آنکھ والا فرد نابینا کے ساتھ ہو تو نابینا اور آنکھ والا اذان کہنے میں برابر ہیں"۔ (بحر الرائق ج ۱ ص ۲۶۵)

ظاہر ہے کہ اب جب نابینا فرد ابھرے ہوئے ڈائل والی گھڑی کی مدد سے وقت معلوم کر سکتے ہیں، یا دوسری صورت میں کسی آنکھ والے فرد سے وقت معلوم کر سکتے ہیں۔ اس طرح یہ خدمت نابینا فرد کے لیے مناسب ذریعہ معاش ہے۔ چنانچہ دورِ رسالت میں ابن ام مکتومؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد کے ایک موذن تھے۔ اور صبح کی اذان کا وقت لوگ انھیں بتا دیا کرتے تھے۔

اسی طرح عمیر بن عدی الخطمی نابینا تھے۔ بنوخطمہ میں یہ سب سے پہلے ایمان لائے۔ ان کے قبیلے کے ایک شخص یزید الخطمی انصاری کی بیوی عصما حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں شعر کہا کرتی تھی۔ اس سے اہلِ ایمان کو تکلیف ہوتی تھی بالآخر عمیر نے ایک دن موقع پا کر اس شاعرہ کو قتل کر دیا اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر من وعن سب بیان کر دیا۔

عمیر بن عدی الخطمی اپنی قوم کے امام اور قاری تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم انھیں بصیر فرمایا کرتے تھے۔ غالباً اسی بصیر سے ملاقات کرنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہ نفسِ نفیس تشریف لے جایا کرتے تھے۔ واللہ اعلم (وفاء الوفا باخبار دار المصطفیٰ ج ۱ ص ۱۹۷)

الغرض اسلام نے دینی خدمت جیسے مقدس ذریعہ روزگار پر نابینا تربیت یافتہ افراد کے تقرر سے ثابت کر دیا کہ یہ مقدس ترین خدمت کا شرف نابینا افراد کو بھی نصیب ہوا ہے۔ مذاہبِ عالم میں اس کی مثال اس طرح کے تاریخی مستند حوالوں سے ملنی ناممکن ہے۔

اسلام میں نابینا افراد کے حقوق

اسلام میں نابینائی کو ناقابلِ عبور رکاوٹ تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اس لیے نابینا افراد کو زندہ رہنے اور دوسروں کے لیے مفید ثابت ہونے کے سلسلے میں خاص حقوق عطا فرمائے گئے ہیں:

۱۔ نابینائی نکاح میں عیب نہیں ہے۔ جانبین میں کسی میں اس کا پایا جانا عیب نہیں۔ اس طرح نابینا کو ازدواجی

زندگی حاصل کرنے کا حق ہے۔

۲۔ نابینا کی خرید و فروخت جائز ہے۔ اس طرح اسے کاروبار کرنے کا حق تسلیم کیا گیا ہے۔

۳۔ تعلیم و تربیت سے مزین ہونے کے بعد معلم اور امام کی حیثیت سے روزگار حاصل کرنے کا اسے حق ہے۔

۴۔ شہادت جس طرح ایک معزز شہری کا حق ہے، اسی طرح نابینا افراد کی شہادت جائز ہے۔

(دیکھو المحلّٰی لابن حزم ج ۹ ص ۴۳۲)

۵۔ اپنی تمام تر کوششوں کے بعد بھی اگر ضروریاتِ زندگی کی فراہمی سے محروم رہے یا پیرانہ سالی کی وجہ سے محروم المعیشت ہو، تو اسلامی حکومت پر اس کا یہ حق واجب ہے کہ وہ اس کو زکوٰۃ و صدقات کی مد سے وظیفہ دے۔

۶۔ اپنے آباؤ اجداد اور دوسرے ذی محرم سے ورثہ پانے کا حق ہے۔ محض نابینائی کی وجہ سے ورثہ یا نفقہ سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ (فتاویٰ عالمگیری ج ۲ ص ۲۱۹)

۷۔ جن کاموں کے لیے نظر ضروری ہے، ایسے دینی فرائض مثلاً جہاد فی سبیل اللہ سے نابینا افراد کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ اور اس استثنأ سے ان کی اہانت مقصود نہیں ہے۔

۸۔ اسلامی معاشرہ میں نابینا فرد بالکل صحیح سالم افراد کی طرح پورے شہری حقوق سے متمتع ہو سکتا ہے، اور باعزت زندگی گزار سکتا ہے۔

خلاصہ: دورِ رسالت میں نابینا افراد کی تعلیم و تربیت اور آبادکاری کے اصولوں کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

۱۔ معاشرہ کا نابینا افراد کے ساتھ مساویانہ بیناؤں پر برتاؤ تاکہ ان میں احساس کمتری نہ پیدا ہو۔

۲۔ نابینا افراد کو الگ گروہ میں رکھ کر تعلیم دینے کے بجائے دوسرے صحیح سالم افراد کے ساتھ ان کی تعلیم و تربیت۔ اس طرح اپنے ماحول سے ان کی یگانگت باقی رہتی ہے۔

۳۔ نابینا فرد کو ناکارہ سمجھ کر کونے میں بٹھائے رکھنے کے بجائے اسے ضروری اور مناسب کاموں میں مشغول رکھا جائے اور اسے ذمہ داریاں سونپی جائیں۔ بیکاری جس طرح صحیح سالم افراد کے دل و دماغ ماؤف اور قوائے عمل کو مفلوج کر دیتی ہے اسی طرح نابینا افراد بھی اس سے ایسے ہی متاثر ہوتے ہیں۔

۴۔ اہلِ خاندان اپنے خاندان کے نابینا فرد کی آبادکاری میں تعاون کریں۔

۵۔ یہ تعاون کوئی احسان نہیں ہے بلکہ اس طرح معاشرہ خود اپنے آپ کی مدد کرتا ہے۔

۶۔ ذی حیثیت افراد نابینا فرد سے ملتے جلتے رہیں، اس سے اس میں احساسِ تنہائی باقی نہ رہے گا۔ دوسری طرف معاشرہ کو ایسے افراد اور ان کی ضروریات کے متعلق معلومات فراہم ہوں گی جنھیں آباد کیا جانا ہے اور آبادکاری کے بعد کی ملاقاتیں آبادکاری کی رفتار اور نتائج سے آگاہ کرتی رہیں گی۔

۷۔ بغیر کسی کے سہارے چلنے پھرنے سے نابینا فرد کی جسمانی نشو و نما ٹھیک طور پر ہو سکے گی جو ذہنی نشو و نما

کے لیے ضروری ہے۔

۸۔ ذی استطاعت افراد نابینا افراد سے مل کر ان کی ضروریاتِ زندگی معلوم کرنے اور فراہم کرنے میں پہل کریں۔ اس طرح نابینا افراد گداگری کی ذلت کو مجبوری کی حالت میں بھی قبول نہیں کریں گے۔

۹۔ تعلیم و تربیت کے بعد نظم و نسق کی ذمہ داریاں بھی نابینا افراد کو سونپی جا سکتی ہیں اور اس طرح نابینا افراد معاشرہ کے تعاون سے اپنے لیے اور معاشرے کے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

۱۰۔ جو کام نابینا فرد کسی قدر کوشش سے کر سکتا ہو، اس میں اسے رعایت یا سہارے کی ضرورت نہیں ہے تاکہ وہ آرام طلب نہ ہو جائے اور اس کی خود اعتمادی زائل نہ ہو۔

اسلام اور جنسی مساوات

محمد مظہر الدین صدیقی

مساوات ایک ایسی اصطلاح ہے جس کی صحیح طور پر تعریف کرنا بہت دشوار ہے۔ ایک معنی کر کے تمام انسان ایک دوسرے کے مساوی ہیں۔ لیکن جب ہم عملی زندگی کے واقعات کا مشاہدہ کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ کوئی دو آدمی بھی ایسے نہیں، جو ہر اعتبار سے باہم مساوی ہوں۔ ہر انسان کا اپنا ایک خاص مذاق ہوتا ہے۔ وہ ایک جداگانہ طبیعت لے کر عالم وجود میں آتا ہے۔ اس کے قوائے جسمانی اور دماغی اور اس کی ذہنی اور روحانی صلاحیتیں دوسروں سے بالکل الگ ہوتی ہیں۔ پھر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اختلافات بالکلیہ ماحول اور تربیت کے پیدا کردہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ انسانی حقوق اور ذمہ داریوں اور معاشرہ میں انسان کا انفرادی رتبہ متعین کرنے میں پیدائشی اختلافات کو بڑا دخل ہے۔ انسان کی بنیادی وحدت و مساوات کو اصولی حیثیت سے تسلیم کرنے کے باوجود یہ امر عملاً ناممکن ہے کہ افراد کے باہمی فروق و اختلافات کو بالکل مٹا دیا جائے۔ اور ان فروق و اختلافات سے جو عدم مساوات پیدا ہوتی ہے اسے یکسر محو کر دیا جائے۔ عدم مساوات کی وجہ سے جو مظالم اور ناانصافیاں پیدا ہوتی ہیں۔ وُہ اسی وقت وجود میں آتی ہیں جب انسانوں کی فطری اور پیدائشی عدم مساوات میں معاشرہ اپنی طرف سے مصنوعی عدم مساوات کا اضافہ کر دیتا ہے۔ یہ مصنوعی عدم مساوات جو بالآخر ظلم اور اتلاف حقوق کی جانب لے جاتی ہے۔ غیر فطری رسم و رواج اور پارینہ روایات کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔ جب یہ غیر فطری بندشیں اور مصنوعی پابندیاں کسی معاشرہ میں جڑ پکڑ لیتی ہیں، تو اس کے تمام افراد خواہ مرد ہوں یا عورتیں، اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کو نشو و نما دینے میں رکاوٹیں محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ان کا ذہنی اور روحانی ارتقا مسدود ہو جاتا ہے۔ ان کے بلند تر عزائم اور اعلیٰ حوصلے ٹھٹھر کر رہ جاتے ہیں۔ یہ کام مذہب، حکومت اور قانون کا ہے کہ وہ انفرادی نشو و نما کی راہ سے ایسی تمام رکاوٹوں کو دُور کریں اور ایک ایسا ماحول پیدا کریں جس میں صرف انسان کی پیدائشی صلاحیتوں کا فرق و اختلاف معاشرہ میں ان کا رتبہ متعین کر لے۔

جنسی مساوات کے مسئلہ پر بھی اسی نقطہ نظر سے غور کرنا چاہیے۔ اگر جنسی مساوات سے مراد یہ ہے کہ ہماری سوسائٹی کی دقیانوسی روایات مصنوعی رسوم اور ایسے تمام قوانین جن کی اسلام میں کوئی حقیقی سند موجود نہیں اور جو غیر مسلموں کے میل جول یا مخصوص قومی اور ملکی حالات کی پیداوار ہیں، ہمارے معاشرہ سے خارج کر دیے جائیں تاکہ مردوں کی طرح عورتوں کو بھی یہ موقع حاصل ہو کہ وہ اپنی ذہنی، روحانی اور جسمانی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکیں اور مسلمان سوسائٹی کی ترقی میں اپنا جائز حصّہ لے سکیں۔ تو بجز چند قدامت پرستوں کے اور کسی سمجھدار شخص کو اس قسم کی مساوات سے انکار نہیں ہو سکتا۔

لیکن اگر جنسی مساوات کے معنے بدلے جائیں کہ صنف نازک کے جسمانی خصوصیات، نفسیاتی میلانات اور ذہنی صلاحیتیں بعینہٖ اور ہوبہو مردوں کی مانند ہیں یا مرد اور عورت ایک دوسری کی تکمیل نہیں کرتے بلکہ ایک مشترک میدانِ عمل میں باہم حریفانہ حیثیت رکھتے ہیں اور ہر وہ کام جو مردوں کے کرنے کا ہے، عورتیں بھی اسی حسن و خوبی سے انجام دے سکتی ہیں، یا مرد بھی عورتوں کے وظائف انجام دے سکتے ہیں، تو اس قسم کی جنسی مساوات بالکل غیر حقیقی اور ناقابلِ عمل ہے۔

جہاں تک مرد و عورت کی بنیادی مساوات کا تعلق ہے، قرآن حکیم نے ایک جامع آیت میں اس کا اثبات کر دیا ہے:

یٰایھا النّاس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منھا زوجھا و بث منھما رجالا کثیرا و نساء۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو ایک نفسِ واحد سے پیدا کیا۔ پھر اسی نفس واحد سے انسان کا جوڑا پیدا کیا یعنی صنفِ نازک کی تخلیق بھی اسی نفس واحد سے عمل میں آئی جس سے مرد کو پیدا کیا گیا۔ یہاں نہ صرف مردوں اور عورتوں کی اصولی مساوات کا اعلان کیا گیا ہے بلکہ سارے انسانوں کو بلا امتیازِ نسل وخون اور قومیت مساوی قرار دیا گیا۔ کیونکہ سب کے سب بالآخر اسی نفس واحد کی پیداوار ہیں۔ اس جامع قرآنی آیت کے بعد جس میں مردوں اور عورتوں کی مساوات کا صاف لفظوں میں اثبات کیا گیا ہے۔ اگر کوئی حدیث یا روایت ہمیں ایسی ملتی ہے جس سے قرآن کے اس اعلان کی براہِ راست یا بالواسطہ تکذیب ہوتی ہے، تو ایسی حدیث یا روایت لائقِ استناد نہیں۔ مثلاً ایک حدیث میں آیا ہے کہ اگر خدا کے سوا کسی کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔ اسی طرح ایک حدیث میں کہا گیا ہے کہ اگر کسی چیز میں منحوسیت ہو سکتی ہے تو گھوڑے، عورت اور مکان ہیں۔ یہ دونوں حدیثیں قرآن کے اعلان مساوات کی صریحاً تکذیب کرتی ہیں اور اس لیے انھیں حضور رسالتمآبؐ کی جانب منسوب کرنا منصبِ نبوت کی تذلیل و اہانت ہے۔

عربوں کی تاریخ کے جس عہد میں اسلام منظر وجود پر نمودار ہوا، اس میں عورتوں کی حیثیت بہت پست اور حقیر تھی انھیں نہ صرف مردوں سے کم مرتبہ قرار دیا گیا تھا بلکہ ان کے ساتھ غلاموں کا سا سلوک کیا جاتا تھا۔ جب کسی مرد کا انتقال ہو جاتا، تو اس کی بیویاں اس کی اولاد میں وراثتاً منتقل ہوتی تھیں۔ گویا کہ وہ بھی کوئی جائداد منقولہ ہیں۔ لڑکیوں کا پیدا ہونا اہل خاندان کے لیے باعثِ ننگ سمجھا جاتا تھا اور بہت سے لوگ اس ذلت کی شرمندگی کو چھپانے کے لیے اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی تعلیمات نے اس غلط تصور کو مٹا دیا کہ لڑکیاں لڑکوں سے کم حیثیت اور کم رتبہ ہیں یا لڑکے سلوک اور برتاؤ میں کسی ترجیح کے مستحق ہیں۔ چنانچہ قرآن حکیم نے عورتوں اور مردوں کے رتبہ کو مساوی قرار دیتے ہوئے کہا:

احل لکم لیلۃ الصیام الرفث الی نساءکم	رمضان کی شب میں تمہارے لیے بیویوں سے
ھن لباس لکم وانتم لباس لھن۔	ہمبستری حلال ہے، کیونکہ وہ تمہارے لیے
(سورۂ بقر)	بمنزلہ لباس کے ہیں اور تم ان کے لیے۔

چونکہ لباس سے انسان کے بعض عیوب پوشیدہ ہو جاتے ہیں اور لباس سردی اور گرمی میں انسان کو بیرونی فضا کے

اثرات سے محفوظ رکھتا ہے ، اس لیے یہاں عورتوں کو مردوں کا لباس قرار دینے سے مراد یہ ہے کہ جس طرح مرد عورتوں کو برائیوں سے محفوظ رکھتے ہیں اور ان صفات کی تکمیل کرتے ہیں جو عورتوں میں نہیں پائی جاتیں ، اسی طرح عورتیں بھی مردوں کو فواحش سے روکنے کی موجب ہیں اور مردوں میں جن صفات کی کمی ہے ، انھیں پورا کرتی ہیں - یا اگر لباس سے آرائش و زینت مراد لی جائے ، تو اس آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ جس طرح مرد کا وجود عورتوں کو زیب و زینت بخشتا ہے اسی طرح عورتیں مردوں کے لیے باعثِ زینت ہیں - بہرحال دونوں صورتوں میں یہ آیت ثابت کرتی ہے کہ اللہ کی نظر میں مرد اور عورت بلحاظ مرتبہ مساوی ہیں - عربوں کی جیسی سوسائٹی میں ، جہاں عورت کو اتنا ذلیل سمجھا جاتا ہے ، قرآن کا یہ اعلان انتہائی انقلاب انگیز تھا اور نہ صرف عربوں میں بلکہ یورپ کے ممالک میں ابھی سو دو سو سال ہوئے ، عورتوں کو جو حیثیت دی گئی تھی اس کے لحاظ سے قرآن کا اعلانِ مساوات مہذب دنیا کے معیارات سے بہت اونچا تھا - اسی طرح عربوں میں لڑکیوں کو جس ذلت اور حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا ، قرآن اس کی صاف الفاظ میں مذمت کرتے ہوئے ان لوگوں کو نہایت کمینہ اور دنی الطبع قرار دیتا ہے ، جو لڑکی کی پیدائش پر ناک بھوں چڑھایا کرتے تھے اور اس کے وجود کو اپنے خاندان کے لیے ایک بارِ گراں سمجھتے تھے :

و اذا بشر احدھم بالانثیٰ ظل وجھہ مسودا وھو کظیم - یتواریٰ من القوم من سوٓء مابشر بہ - ایمسکہ علیٰ ھون ام یدسہ فی التراب - الا سآء ما یحکمون -
(سورہ نحل ۵۹)

اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خبر دی جاتی ہے تو اس کا منہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ غصہ سے بھرا ہوا ہوتا ہے - وہ اس خبر کی برائی کی وجہ سے جو اسے دی جاتی ہے ، لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کیا اسے ذلت کے لیے رہنے دے یا اسے مٹی میں گاڑ دے - سنو بہت بُرا ہے وہ فیصلہ جو وہ کرتے ہیں -

اسی طرح اس خیال کی بھی قرآن ہی نے تردید کی کہ عورتوں کو مردوں کے مقابلہ میں کوئی قانونی حق حاصل نہیں ہے ، بلکہ مرد آزاد ہے کہ ان کے ساتھ جو سلوک چاہے کرے - چنانچہ قرآن فرماتا ہے :

ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف -
(سورہ بقر)

اور عورتوں کے لیے بھی پسندیدہ طور پر ویسے ہی حقوق ہیں -

اسی اصول مساوات کی تعلیم دینے کے لیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو بار بار تاکید کی کہ لڑکیوں کے ساتھ انھیں بالکل وہی برتاؤ کرنا چاہیے جو لڑکوں کے ساتھ کیا جاتا ہے - اسلام سے قبل لڑکیوں کو ایک بار سمجھا جاتا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ خاندان میں اولاد ذکور کی جو عزت تھی ، لڑکیاں اس سے بالکل محروم تھیں بلکہ آج تک مسلمانوں میں اس عدمِ مساوات کے پیچھے کچھ اثرات پائے جاتے ہیں اور بہت سے لوگ لڑکوں کو اس لیے عزت و احترام اور شفقت و محبت کا مستحق سمجھتے ہیں کہ آگے چل کر ان سے خاندان کی معاشی سود و بہبود میں اضافہ ہوگا - چنانچہ لڑکیوں کی تعلیم و تربیت پر

له ستراً من النار۔ (مسلم کتاب البر والصلۃ)

میں ڈالا جائے، وہ ان میں پورا اترے اور اچھی طرح ان کی تربیت کرے، میں آتش جہنم سے اس کی آڑ بن جاؤں گا۔

مساوات جنسی کے قیام کے لیے اسلام نے بار بار اس پر زور دیا کہ اولاد کے لیے ماں اور باپ دونوں کا مرتبہ برابر ہے۔ اگر عورت اور مرد کو خدا نے مساوی رتبہ نہ دیا ہوتا، تو ان کے ساتھ یکساں سلوک کرنے کا مطالبہ اس زور و شدت سے نہ کیا جاتا بلکہ قرآن حکیم اور احادیث میں ماں کی عزت اور افضلیت پر بطور خاص توجہ دلائی گئی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

ووصّینا الانسان بوالدیه احسانا حملته امه کرها ووضعته کرها۔

ہم نے انسان کو تعلیم دی کہ اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اس کی والدہ نے حمل کے زمانے میں بھی اس کو تکلیف سے اٹھایا اور اس کو پیدا کرنے میں بھی تکلیف اٹھائی۔

یہاں اگرچہ ماں اور باپ دونوں کے ساتھ نیکی اور حسنِ سلوک کی تاکید کی گئی ہے۔ لیکن ماں کی قربانیوں کا بطور خاص تذکرہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح حضرت انسؓ بن مالک کی روایت ہے:

عن انس قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم الجنة تحت اقدام الامهات۔

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔

اسی طرح حضرت فاطمہؓ سے مروی ہے:

عن فاطمة قالت قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم الزم رجلها فان الجنة تحت اقدامها۔

حضرت فاطمہؓ کا بیان ہے کہ حضور صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ماں کے قدموں سے چمٹ جاؤ کیونکہ جنت اس کے قدموں کے نیچے ہے۔

اسی طرح اسلام نے عورتوں کو عزت و مساوات کا وہ مقام عطا کیا، جہاں اس سے پہلے وہ کبھی نہیں پہنچی تھی۔ اسلام کو عورتوں کے حقوق اور ان کے مساوی رتبہ کا کتنا خیال تھا۔ اس کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ اس نے نہ صرف آزاد عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید کی بلکہ باندیوں اور لونڈیوں کو بھی شرف و عزت کا مقام عطا کیا۔ چنانچہ بخاری (کتاب النکاح) کی روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جس شخص کے قبضہ میں کوئی لونڈی یا باندی ہو اور وہ اس کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کرے نیز اسے تہذیب و شائستگی اور فنون و آداب سے آراستہ کرے تو اس کو دوہرا اجر ملے گا۔

جہاں تک مردوں اور عورتوں کے روحانی ارتقا اور اخلاقی نشوونما کا تعلق ہے، قرآن نے واضح الفاظ میں یہ بتادیا ہے کہ اس میدان میں عورتوں اور مردوں کے درمیان کامل مساوات ہے اور مردوں کی طرح عورتیں بھی اپنی جدوجہد، کوشش

اور اطاعت گزاری سے روحانی ترقی کے اعلیٰ ترین مدارج تک پہنچ سکتی ہیں۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے :

للرجال نصیب مما اکتسبوا و للنسآء نصیب مما اکتسبن۔	مرد جو کچھ (اپنی جدوجہد سے) حاصل کریں گے اس سے بہرہ ور ہوں گے اور عورتیں جو کچھ (اپنی کوشش سے) حاصل کریں گی، اس سے مستفید ہوں گی۔

یہ آیت معاشی اور روحانی زندگی دونوں پر یکساں حاوی ہے۔ یعنی خواہ مال و دولت اور رزق کے حصول میں ہو یا روحانی اور اخلاقی ترقی کی دوڑ میں، ہر صنف کے لیے یکساں اور مساوی راہیں کھلی ہیں۔ مرد کی طرح عورت بھی معاشی زندگی کی جدوجہد میں حصہ لے کر مال و دولت کما سکتی ہے یا اخلاقی جدوجہد کے ذریعہ روحانی بلندیاں حاصل کر سکتی ہے۔ یہی بات ایک اور جگہ اس طرح بیان کی گئی ہے :

ومن یعمل من الصّٰلحٰت من ذکر او انثیٰ وھو مومن فاولئك یدخلون الجنة ولا یظلمون نقیراً۔	جو نیک کام کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو، تو بھی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرہ بھر بھی ظلم نہ کیا جائے گا۔

مذہبی فرائض اور اخلاقی حدود کے دائرہ میں قرآن نے مردوں اور عورتوں کے درمیان کوئی فرق و امتیاز نہیں کیا۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد میں دونوں یکساں اور مساوی طور سے شریک ہیں۔ اس لیے خدا کی نگاہ میں ان کا مرتبہ اور مقام بالکل مساوی ہے۔ چنانچہ قرآن فرماتا ہے :

والمؤمنون والمؤمنات بعضھم اولیآء بعض یامرون بالمعروف وینھون عن المنکر ویقیمون الصلٰوة ویؤتون الزکٰوة ویطیعون اللہ ورسوله اولئك سیرحمھم اللہ ان اللہ عزیز حکیم وعد اللہ المؤمنین والمؤمنات جنت تجری من تحتھا الانھار خالدین فیھا ومسٰکن طیبة فی جنّٰت عدن ورضوان من اللہ اکبر ذالك ھو الفوز العظیم۔	اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ وہ اچھے کام کرنے کا حکم دیتے ہیں اور بُرے کاموں سے روکتے ہیں، نمازیں قایم کرتے ہیں، زکٰوۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ ان پر اللہ رحم کرے گا، بے شک اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔ اللہ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے باغوں کا وعدہ کیا ہے، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، انہی میں رہیں گے اور مکان ستھرے رہنے کے باغوں میں اور رضامندی اللہ کی سب سے بڑی یہی ہے بڑی مراد ملنی۔

اب یہ ظاہر ہے کہ اگر قرآن کے ارشاد کی رُو سے مردوں اور عورتوں پر نماز اور زکٰوۃ کی ادائیگی، حق و صداقت کی

تبلیغ اور باطل کی روک تھام یکساں طور سے فرض کی گئی ہے ، تو انھیں تعلیم کے دائرہ میں بھی یکساں حقوق اور مساوی مواقع حاصل ہونے چاہئیں کیونکہ سچائی کی تبلیغ اور برائیوں سے روکنے کا کام صرف گھریلو زندگی کی چہار دیواری سے متعلق نہیں۔ قرآن نے ایسی کوئی تحدید نہیں کی جس سے یہ ثابت ہو کہ معاشی امور، سیاسی معاملات اور تعلیمی مسائل میں عورتوں کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ حکومت یا معاشرہ کی صحیح رہنمائی کریں اور اسے غلط تدابیر اختیار کرنے سے روکیں۔ پھر اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سیاسی زندگی، معاشی امور اور تعلیمی مسائل پر بھی حاوی ہے، تو وہ عورتیں جنھیں تعلیم و تربیت کے مواقع سے محروم کر کے ملکی سیاسیات، تمدنی مسائل، تعلیمی مشاغل یا صنعتی اور معاشی امور سے بالکل الگ کر دیا گیا ہو معاشرہ اور حکومت کو بُری راہوں پر چلنے سے کیسے روک سکتی ہیں۔ جو عورتیں سیاسی فہم سے عاری ہوں، جنھیں یہ خبر نہ ہو کہ ان کا معاشی نظام کن بنیادوں پر قایم ہے، جنھیں تعلیمی مسائل کی نوعیت اور پیچیدگیوں کا کوئی اندازہ نہ ہو، وہ ان امور میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکتی ہیں۔ اس لیے قرآن کی مندرجہ بالا آیات سے لازمی طور پر یہ نتیجہ مستنبط ہوتا ہے کہ عورتیں اور مرد نہ صرف خانگی زندگی میں یکساں اور مساوی حقوق رکھتے ہیں، بلکہ سیاسیات، معاشیات اور تعلیم کے دائرہ میں بھی انھیں مساوی درجہ حاصل ہے اور اگر عورتیں اپنے ان خصوصی فرائض اور ذمہ داریوں سے پہلوتہی نہ کریں، جو خاندانی زندگی کے دائرے میں ان کے تفویض ہیں، تو ان کے لیے عام ملکی اور سیاسی زندگی میں حصہ لینا نہ صرف جائز بلکہ ضروری قرار دیا ہے۔

رسول اللہ اور طبقہ نسواں

بیگم خدیجۃ النساء ایم سراج۔ سنگاپور

کسی قوم کی تہذیب و تمدن اور ترقی کا حال معلوم کرنا ہو تو یہ دیکھو کہ اس کے معاشرے میں عورت کا درجہ کیا ہے۔ بہترین معیار یہی ہے، جس زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خداوند تعالیٰ کا پیغام پہنچانے کے لیے مبعوث ہوئے۔ عورت ساری دنیا میں محکوم تھی اور کمتر سمجھی جاتی تھی، وہ بہت سے قانونی حقوق سے محروم تھی۔ بہت وثوق کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اُس وقت جن مذاہب و قوانین کا دور دورہ تھا اُن کی رُو سے عورت مردوں کی اس قدر محکوم تھی کہ مذہبی امور تک میں حصّہ لینا اس کے لیے ممنوع تھا۔ عورت ان کے نزدیک سرچشمۂ گناہ تھی۔ عرب کی عورتوں کا حال بھی دوسرے ملکوں کی عورتوں سے کچھ بہتر نہ تھا بلکہ مقابلۃً بدتر ہی تھا۔ اُس کی حیثیت اس سے زیادہ اور کچھ نہ تھی کہ وہ مردوں کی تسکین ہوس کا ایک ذریعہ تھی، اس کا کام صرف یہ تھا کہ قبیلے کی عزت کو محفوظ رکھنے کے لیے جفاکش سپاہی پیدا کرتی رہے۔ لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینے کا رواج بھی مفاخرت کے اسی جھوٹے تصور کا پیدا کردہ تھا۔ زناکاری پر بے حیائی کے ساتھ عمل تھا۔ ان گنت بیویاں رکھنا بھی عام تھا۔ اور اس پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہ تھی۔ عورت کو حقوق مطلقاً حاصل نہ تھے۔ وہ کسی جائیداد کی وارث تک نہ ہو سکتی تھی، بلکہ وُہ خود بھی جائداد کا ایک حصّہ تھی کہ جب اُس کا شوہر مر جاتا تو وہ شوہر کے بیٹے اور جانشین کے حصّہ میں جائداد کی طرح منتقل ہو جاتی، اور وُہ اُس کی مرضی کے خلاف اپنی بیوی بنا لینے کا حقدار سمجھا جاتا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیمات کے ذریعہ جو خداوند تعالیٰ کی جانب سے آپؐ نے انسانیت کو پہنچائیں۔ ان تمام باتوں کا یکسر خاتمہ کر دیا اور اس طرح سے بدقماشی اور ناپاکی کا خاتمہ ہوا۔ قرآن حکیم نے واضح طور سے اعلان کیا ہے کہ عورت اور مرد دونوں "نفس واحدہ" سے پیدا کیے گئے ہیں۔

> اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا اور اس جاندار سے اس کا جوڑ پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں اور تم خدا تعالیٰ سے ڈرو جس کے نام سے ایک دوسرے سے مطالبہ کرتے ہو اور قرابت سے بھی ڈرو بالیقین اللہ تعالیٰ تم سب کی اطلاع رکھتے ہیں۔ (آل عمران ۴)

> اور اللہ تعالیٰ نے تم ہی میں سے تمہارے لیے بیویاں بنائیں اور پھر ان بیویوں سے تمہارے لیے بیٹے اور پوتے پیدا کیے اور تم کو اچھی اچھی چیزیں کھانے (پینے) کو دیں، کیا پھر بھی بے بنیاد چیز پر ایمان رکھو گے اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری کرتے رہو گے۔ (النحل ۷۲)

خداوند تعالیٰ کی نظر میں عورت اور مرد قطعی مساوی سطح پر ہیں، نیکوکاری کے معاملے میں بھی اور اس کی جزا اور انعام کے معاملہ میں بھی قرآن حکیم میں اس پر بار بار زور دیا گیا ہے۔

جو شخص کوئی نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ صاحبِ ایمان ہو ہم اس شخص کو (دنیا میں) ان کے اچھے کاموں کے عوض میں ان کا اجر دیں گے۔ (النحل ۹۷)

(جہاں جزا کا یہ قانون ہے) کہ جو شخص گناہ کرتا ہے اس کو تو برابر سرا ہی ملتا ہے اور جو نیک کام کرتا ہے خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ مومن ہو ایسے لوگ جنت میں جائیں گے (اور) وہاں بے حساب ان کو لطف ملے گا۔ (المومن ۴۰)

اور جو شخص کوئی نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ مومن ہو، سو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا۔ (النساء ۱۲۴)

بیشک اسلام کے کام کرنے والے مرد اور اسلام کے کام کرنے والی عورتیں اور ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں اور فرمانبرداری کرنے والے مرد اور فرمانبرداری کرنے والی عورتیں اور راست باز مرد اور راست باز عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور خشوع کرنے والے مرد اور خشوع کرنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور بکثرت خدا کو یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں ان سب کے لیے اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔ (احزاب ۳۵)

سو منظور کر لیا ان کی درخواست کو اُن کے رب نے اس وجہ سے کہ میں کسی شخص کے کام کو جو کہ تم میں سے کرنے والا ہو اکارت نہیں کرتا خواہ وہ مرد ہو یا عورت، تم آپس میں ایک دُوسرے کے جزو ہو۔ سو جن لوگوں نے ترک وطن کیا اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور تکلیفیں دی گئیں میری راہ میں جہاد کیا اور شہید ہو گئے میں ضرور ان لوگوں کی تمام خطائیں معاف کر دوں گا۔ اور ضرور ان کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ یہ عوض ملے گا اللہ کے پاس سے اور اللہ ہی کے پاس اچھا عوض ہے۔ (آل عمران ۱۹۵)

اسلام کے مذہبی فرائض عورتوں اور مردوں دونوں پر یکساں عائد ہیں بلکہ بعض پہلوؤں سے تو احکام میں عورتوں کو رعایت بھی دی ہے اور بعض ایسے فرائض سے ان کو مستثنیٰ کیا گیا ہے جن کی بجا آوری مردوں پر لازمی ہے۔ مسلمان عورت "ایام" کے زمانے میں نماز اور روزے سے مستثنیٰ ہے۔ عیدگاہ جانا یا جمعہ کی نماز کے لیے مسجدوں میں پہنچنا بھی اس کے لیے ضروری نہیں ہے۔ اور اگر جانا چاہے تو ممانعت بھی نہیں۔

ہمیں قرآن حکیم نے یہ تعلیم دی ہے کہ جنت سے ہبوطِ آدم کی ذمہ دار تنہا حوا نہیں تھیں بلکہ آدم اور حوا دونوں شیطان کے فریب میں یکساں آگئے تھے اس لیے موردِ الزام بھی دونوں یکساں ٹھہرے۔

> اور ہم نے حکم دیا کہ اے آدم! رہا کرو تم اور تمہاری بیوی بہشت میں، پھر کھاؤ دونوں اس میں سے بافراغت جس جگہ سے چاہو اور نزدیک نہ جاؤ اس درخت کے ورنہ تم بھی انھیں میں شمار ہو جاؤ گے جو اپنا نقصان کر بیٹھتے ہیں۔ پھر لغزش دے دی آدم اور حوا کو شیطان نے اس درخت کی وجہ سے سو برطرف کر کے رہا ان کو اس عیش سے جس میں وہ تھے اور ہم نے کہا کہ نیچے اُترو تم میں سے بعضے بعضوں کے دشمن رہیں گے اور تم کو زمین پر چندے ٹھہرنا ہے اور کام چلانا ایک میعادِ معیّن تک۔ (البقرہ ۳۶)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم دی کہ عورت شیطان کا آلۂ کار نہیں برعکس شیطان (کی یورش) کے خلاف وہ ایک مضبوط قلعہ ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما کر تو عورت کو انتہائی اعزاز کا مرتبہ عطا کیا کہ "جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔"

روایت ہے کہ جب ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ سب سے زیادہ واجب الاحترام اور حقدار کون ہے جس کی خدمت نیکی اور حصولِ ثواب کی نیت سے کی جائے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تمہاری ماں۔" صحابی نے پوچھا: "ماں کے بعد؟" رسول اللہ ؐ نے پھر یہی فرمایا کہ "تمہاری ماں" حتیٰ کہ تیسری مرتبہ کے بعد چوتھی بار جب صحابی نے یہی سوال کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تمہارا باپ۔" اس روایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ماں کی حیثیت بیٹوں اور بیٹیوں کی نظر میں باپ سے تین گنی زیادہ ہونی چاہیے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کا معیار بھی بلند کر دیا اور اپنے پیروؤں کو اس کی تاکید کی، فرمایا کہ "نکاح میری سنت ہے۔ جو شخص میری سنت سے منحرف ہو وہ مجھ سے نہیں ہے (یعنی میرا پیرو نہیں ہے)" اور پھر یہ بھی فرمایا کہ "جس نے نکاح کر لیا اس نے نصف مذہب کی تکمیل کر لی۔"

نکاح کی مثالی غایت کو اور بیوی کے مرتبے کو رفعت بخشی گئی۔ قرآن حکیم فرماتا ہے،

> "اور اسی کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اُس نے تمہارے واسطے تمہاری جنس کی بیویاں بنائیں تاکہ تم کو ان کے پاس آرام ملے اور تم میاں بیوی میں محبت اور ہمدردی پیدا کی۔ اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو فکر سے کام لیتے ہیں۔" (الروم ۲۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیویوں کی محبت اور احترام کی بار بار تاکید کی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ :

"تم میں سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو اپنی بیویوں سے بہتر سلوک کرتے ہیں۔"

اور فرمایا :

"ایک مسلمان اپنی بیوی کے حق میں جتنا رحم دل اور مہذب ہوگا اتنا ہی وہ اپنے ایمان میں کامل ہوگا۔"

پھر یہ بھی فرمایا کہ :

"کسی مسلمان کو اپنی بیوی سے نفرت ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔"

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے یادگار خطبۂ حجۃ الوداع میں بڑی تفصیل سے عورتوں کا تذکرہ فرمایا ہے اور خاص طور پر یہ کہا کہ :

"اپنی بیویوں سے شفقت اور محبت کا سلوک کرو۔ تم نے اللہ کی ضمانت پر ان کو اپنے لیے حلال کیا ہے، ان کے معاملے میں اللہ سے ڈرو اور ان سے بہتر سلوک کرو۔"

لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینے کا وہ رواج جو اسلام سے پہلے تھا اس کی سخت مذمت کی گئی اور مسلمانوں کو حکم ہوا کہ وہ اپنی لڑکیوں کو لڑکوں سے زیادہ چاہیں۔ قرآن حکیم میں ہے کہ :

"قیامت کے دن وہ لڑکیاں جن کو زندہ دفن کیا گیا تھا اپنے قاتلوں کے خلاف گواہی دیں گی۔ جب ان سے پوچھا جائے گا کہ یہ کس جرم میں قتل کی گئی تھیں۔" (التکویر ۸، ۹)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

اور اپنی اولاد کو ناداری کے اندیشے سے قتل مت کرو۔ کیونکہ ہم ان کو بھی رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی، بیشک ان کا قتل کرنا بھاری گناہ ہے۔ (بنی اسرائیل ۳۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹیوں سے ترجیحی سلوک کی ہدایت فرمائی اور کہا کہ :

"جب تم اپنے بچوں میں تقسیم کرنے کے لیے کچھ لاؤ تو بیٹیوں سے شروع کرو کیونکہ بیٹوں کے مقابلہ میں بیٹیاں اپنے والدین سے زیادہ محبت کرتی ہیں۔"

یہ روایت بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ :

"جس کے کوئی لڑکی ہے اور اس نے زندہ دفن اس کو نہیں کیا، نہ غیر منصفانہ سلوک اس کے ساتھ کیا، نہ لڑکوں کو اس پر ترجیح دی، تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کرے گا۔"

ظہور اسلام سے پہلے قانون نے مرد سے علٰحدہ عورت کو آزاد حیثیت کوئی نہ دی تھی مگر اسلام نے اس کو مردوں کی طرح قانون اور معاملات میں مساوی حقوق عطا کیے۔ قرآن حکیم میں ہے :

اور طلاق دی ہوئی عورتیں اپنے آپ کو (نکاح سے) روکے رکھیں تین حیض تک، اور ان عورتوں کو یہ بات

حلال نہیں کہ خدا تعالیٰ نے جو کچھ ان کے رحم میں پیدا کیا ہو (حمل یا حیض) اس کو پوشیدہ کریں۔ اگر وہ عورتیں اللہ تعالیٰ پر اور یوم قیامت پر یقین رکھتی ہیں اور ان عورتوں کے شوہران کے (بلا تجدید نکاح) پھر لوٹا لینے کا حق رکھتے ہیں۔ اس عدت کے اندر بشرطیکہ اصلاح کا قصد رکھتے ہوں اور عورتوں کے لیے بھی حقوق ہیں جو کہ مثل ان ہی حقوق کے جو عورتوں پر ہیں قاعدہ (شرعی) کے موافق اور مردوں کا ان کے مقابلہ میں کچھ درجہ بڑھا ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ زبردست (حاکم) ہیں اور حکیم ہیں۔ (البقرہ ۲۲۸)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید کی کہ:

"طلبِ علم ہر مسلمان مرد اور مسلمان عورت پر فرض ہے۔"

مغربی قوانین نے شادی شدہ عورت کو ذاتی املاک خریدنے اور بیچنے کا حق جواب دیا ہے، اسلام نے یہ آزاد حیثیت بہت پہلے عطا کی ہے۔ قرآن میں ہے کہ:

اور تم کسی ایسے امر کی تمنا مت کیا کرو جس میں اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعضوں پر فوقیت بخشی ہے۔ مردوں کے لیے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے اور عورتوں کے لیے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کی درخواست کیا کرو بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں۔ (النساء ۳۲)

"پیرے کرا بائٹس" نے جو مصر کی مخلوط ٹریبونل کا سابق امریکی جج تھا اپنے ایک مقالہ میں جس کا عنوان ہے "محمدؐ نے عورت کے لیے کیا کیا" یہ اعتراف کیا ہے کہ حقوقِ نسواں کے سلسلہ میں محمدؐ کا شاندار کارنامہ وہ حق ملکیت ہے جو انھوں نے اپنی امت کی بیویوں کو عطا کیا۔ قانونی درجہ عورت کا بالکل وہی ہے جو اس کے شوہر کا ہے۔ جہاں تک ایک مسلمان بیوی کے حقِ ملکیت کا تعلق ہے، اس کو وہی آزادی حاصل ہے جو کسی پرندے کو پرواز کی حاصل ہے۔ قانون اس کی اجازت دیتا ہے کہ عورت اپنے شوہر کی رائے لیے بغیر اپنے مال و متاع کو جس طرح چاہے صرف کرے یا ٹھکانے لگا دے۔

قرآن حکیم کی بعض آیات اور احادیثِ نبویؐ کی تعبیر بعض اوقات اس طرح بھی کی گئی ہے جس سے مساوات کا انکار ہوتا ہے اور مردوں کا امتیاز ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن گہرا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوگا کہ بظاہر کتنی ہی غیر مساوی صورت نظر آئے۔ درحقیقت اسلام نے عورت کے مکمل حقوق کی ضمانت دی ہے۔ قرآن حکیم میں ہے کہ:

..... اور عورتوں کے لیے بھی حقوق ہیں جو کہ مثل ان ہی حقوق کے ہیں جو عورتوں پر ہیں قاعدہ (شرعی) کے موافق اور مردوں کے مقابلہ میں کچھ درجہ بڑھا ہوا ہے۔ (البقرہ ۲۲۸)

یہ فرق جو دونوں صنفوں میں ہے، وہ ان کے حقوق کے بنیادی اختلافات کا نتیجہ نہیں، بلکہ یہ تو اس فرق کی وجہ سے پیدا ہوا ہے جو معاشی مرتبے میں ان کے درمیان تھا۔ عملی طور پر عورت کو وہ سماجی مواقع حاصل نہیں جو مردوں کو تجربات، اختراعات اور معلومات عامہ کے سلسلے میں حاصل ہیں۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ معاشی طور پر عورتوں کا انحصار مردوں پر ہے اور یہی وہ پہلو ہے جو مردوں کو ایک طرح کی برتری اور ذمہ داری عطا کرتا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے کہ:

مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعضوں پر فضیلت دی ہے اور اس سبب سے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کیے ہیں، سو جو عورتیں نیک ہیں اطاعت کرتی ہیں۔ مردوں کی عدم موجودگی میں بحفاظت اپنی نگہداشت کرتی ہیں، اور جو عورتیں ایسی ہوں کہ تم کو ان کی بد دماغی کا احتمال ہو تو ان کو زبانی نصیحت کرو اور ان کو لیٹنے کی جگہ میں تنہا چھوڑ دو، اور ان کو مارو۔ پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کرنا شروع کر دیں تو ان پر بہانہ مت ڈھونڈو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے رفعت اور عظمت والے ہیں۔
(النساء ۳۴)

اس آیت میں جو لفظ "قوّامون" ہے۔ اس سے مراد سرپرستی، نگہداشت اور اعانت و کفالت کا فریضہ ہے۔ یہ آیت اس شخص کا تذکرہ کر رہی ہے جو کسی دوسرے مشغلے میں پوری طرح لگا ہوا ہو، اپنے مفادات کا تحفّظ کر رہا ہو، اور اپنے معاملات کی دیکھ بھال میں مصروف ہو، یہی لفظ دوسری جگہ قرآن حکیم میں یوں استعمال ہوا ہے کہ:

اے ایمان والو! انصاف پر خوب قایم رہنے والے، اللہ کے لیے گواہی دینے والے رہو اگرچہ اپنی ہی ذات پر ہو یا کہ والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے مقابلہ میں ہو۔ وہ شخص اگر امیر ہے تو، اور غریب ہے تو، دونوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو زیادہ تعلق ہے، سو تم خواہشِ نفس کا اتباع مت کرو، کبھی تم حق سے ہٹ جاؤ۔ اور اگر تم کج بیانی کرو گے یا پہلو تہی کرو گے تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں۔ (النساء ۱۳۵)

چنانچہ قرآن حکیم کی ان آیتوں میں مردوں کو عورتوں کے حقوق پامال کرنے کے بجائے ایک ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ ایک فریضہ عائد کیا گیا ہے کہ وہ عورتوں کے حقوق کے محافظ رہیں، حتیٰ کہ مردوں کے مفادات کے خلاف بھی، تاکہ عورتوں کے لیے مراعات اور انصاف کی ضمانت ہو۔ یہ ہے قوّامون کا مفہوم۔

وراثت کے سلسلہ میں اسلامی شریعت کا یہ قانون ہے کہ عورتوں کا حصہ مردوں کے مقابلہ میں نصف ہے۔ مثلاً قرآن حکیم کی یہ آیت دیکھیے:

اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے تمہاری اولاد کے باب میں لڑکے کا حصّہ دو لڑکیوں کے حصّے کے برابر، اور اگر صرف لڑکیاں ہی ہوں گو دو سے زیادہ ہوں تو ان لڑکیوں کو دو تہائی ملے گا اس مال کا جو مورث چھوڑ مرا ہے۔ اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اس کو نصف ملے گا۔ اور ماں باپ کے لیے یعنی دونوں میں سے ہر ایک کے لیے میت کے ترکے میں سے چھٹا چھٹا حصّہ ہے اگر میت کے کچھ اولاد ہو، اور اگر اس میّت کے کچھ اولاد نہ ہو تو اس کے ماں باپ ہی اس کے وارث ہوں تو اس کی ماں کا ایک تہائی ہے۔ اور اگر میت کے ایک سے زیادہ بھائی بہن ہوں تو اس کی ماں کو چھٹا حصّہ ملے گا (اور باقی باپ کو ملے گا) وصیت نکال لینے کے بعد کہ میت اس کی وصیت کر جاوے یا دَین کے بعد تمہارے اصول و فروع جو ہیں

تم پورے طور پر یہ نہیں جان سکتے کہ ان میں سے کون سا شخص تم کو نفع پہنچانے میں نزدیک تر ہے۔ یہ حکم منجانب اللہ مقرر کر دیا گیا۔ بالیقین اللہ تعالیٰ بڑے علم اور حکمت والے ہیں۔ (النساء ۱۱)

عورتوں کی اس قانونی حصہ داری میں بظاہر جو عدمِ مساوات سی نظر آتی ہے اس کی تشریح علامہ ڈاکٹر محمد اقبال نے یوں کی ہے:

> لڑکی کا یہ حصہ اس کی کسی فطری کمتری کی بنا پر نہیں بلکہ اس کے معاشی مواقع کے پیش نظر ہے۔ اور اس مقام کی وجہ سے ہے جو اپنے معاشرے کے نظام میں اس کو حاصل ہے "محمڈن لا" کے مطابق لڑکی اس جائداد کی پوری طرح مالک تصور کی گئی ہے جو اس کو شادی کے وقت باپ کی طرف سے بھی ملتی ہے اور شوہر کی طرف سے بھی، مزید برآں مہر بھی کلیتہً اسی کی ملکیت ہوتا ہے جو خود اس کی مرضی کے مطابق معجّل ہو یا موجّل، اتنا ہی نہیں بلکہ مہر کی ادائیگی تک وہ اپنے شوہر کی ساری جائداد اپنے قبضے میں رکھ سکتی ہے ساری عمر کی کفالت کی ذمہ داری بھی (شادی سے پہلے باپ پر اور شادی کے بعد) شوہر پر ہے۔ اگر آپ اس زاویۂ نظر سے قانونِ وراثت کے عمل کو دیکھیں تو آپ کو بیٹے اور بیٹیوں کے معاشی مرتبے میں کوئی مادی تفاوت نظر نہیں آئے گا بلکہ حق تو یہ ہے کہ وراثت کی حصہ داری میں بظاہر غیر مساوی نظر آنے والی یہ صورت ہی اصل میں قانونی مساوات مہیا کرتی ہے۔ (اسلام کی مذہبی فکر کی تشکیل جدید ص ۱۹۲، ۱۹۱)

اسلام نے مرنے والے مسلمان کی جائداد میں اس کی بیوی اور بیٹیوں کا متعین حصہ رکھا ہے اور یہ انتظام کیا ہے کہ اگر جائداد میں کسی قسم کا تصرف بھی ہو تو یہ اپنے قانونی حصوں سے محروم نہ ہونے پائیں۔ قرآن حکیم میں خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

> مردوں کے لیے بھی حصہ ہے اس چیز میں سے جس کو ماں باپ اور بہت نزدیک کے قرابت دار چھوڑ جاویں اور عورتوں کے لیے بھی حصہ ہے اس چیز میں سے جس کو ماں باپ اور بہت نزدیک کے قرابت دار چھوڑ جاویں خواہ وہ چیز قلیل ہو یا کثیر ہو، حصہ قطعی (النساء ۷)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق نکاح دراصل ویسا ہی "معاہدہ" ہے جیسے دوسرے معاہدات دو افراد میں ہوتے ہیں۔ جہاں تک معاہدہ کی شرائط کا تعلق ہے عورت مرد دونوں شرکاً ایک ہی سطح پر ہوتے ہیں اور ہر شریک کے فرائض ہیں اور حقوق بھی۔ اسلام ہر معاہدے میں عدل و انصاف کی تاکید کرتا ہے۔ معاہدۂ نکاح میں بھی عدل و انصاف پیشِ نظر ہونا ضروری ہے۔

امام بخاری کے نزدیک ایک باپ کو یہ اختیار نہیں ہے کہ اپنی لڑکی کو اس کی مرضی کے بغیر کسی کے حبالۂ عقد میں دے دے خواہ وہ دوشیزہ ہو یا ثیبہ۔ ایک روایت کے بموجب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے کہ:

> "کسی ثیبہ کو خود اس کے حکم کے بغیر کسی کے حبالۂ عقد میں نہیں دیا جا سکتا اور کسی دوشیزہ کو بھی اس وقت تک

کسی کے حبالۂ عقد میں نہیں دیا جا سکتا جب تک پہلے اس کی مرضی نہ معلوم کر لی جائے۔"

یہ روایت بھی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک لڑکی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور عرض گزار ہوئی کہ "میرے باپ نے مجھے ایک ایسے شخص کے نکاح میں دے دیا ہے جو مجھے پسند نہیں ہے۔" اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ اس کی پسند پر چھوڑ دیا۔

طلاق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ابغض المباحات ہے (جس کی اجازت بحالت مجبوری دی گئی ہے) چونکہ شوہر ہی کفالت کا ذمہ دار اور گھر کا نگران ہوتا ہے اس لیے اس کو یہ حق دیا گیا ہے کہ مجبوری یا ضرورت ہو تو معاہدۂ نکاح کو فسخ کر سکتا ہے، لیکن اس کی اجازت بھی اسی وقت ہے جب وُہ بیوی اور بچوں کا انتظام کر دے۔ مہر اور اخراجات کی ادائیگی سے سبکدوش ہو جائے۔ اس کو اپنا یہ حقِ طلاق استعمال کر کے بیوی کو جراحت یا نقصان نہیں پہنچانا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "اس سلسلہ میں نہ تو کوئی نقصان پہنچایا جائے نہ باہم نقصان پہنچانے کی کوئی نیت ہو۔"

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ طلاق صرف بوقتِ ضرورت دی جاتی ہے۔ بیوی کو بھی طلاق حاصل کرنے کا حق حاصل ہے وہ خلع حاصل کر سکتی ہے۔

قرآن حکیم میں ہے کہ:

وہ طلاق دو مرتبہ کی ہے پھر خواہ رکھ لینا قاعدے کے موافق خواہ چھوڑ دینا خوش عنوانی کے ساتھ اور تمہارے لیے یہ بات حلال نہیں کہ (چھوڑنے کے وقت) کچھ بھی لو (گو) اس میں سے (ہی) جو تم نے ان کو مہر میں دیا تھا۔ مگر یہ کہ میاں بیوی دونوں کو احتمال ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ضابطوں کو قایم نہ رکھ سکیں گے۔ سو اگر تم لوگوں کو یہ احتمال ہو کہ وہ دونوں ضوابط خداوندی کو قایم نہ رکھ سکیں گے تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ اس (مال کے لینے دینے) میں جس کو دے کر عورت اپنی جان چھڑا لے۔ یہ خدائی ضابطے ہیں سو تم ان سے باہر مت نکلنا اور جو شخص خدائی ضابطوں سے بالکل باہر نکل جائے سو ایسے لوگ اپنا نقصان کرنے والے ہیں۔ (البقرہ ۲۲۹)

حدیث میں بھی حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جمیلہ بنت عبد اللہ جو ثابت بن قیس کی بیوی تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور کہا: یا رسول اللہؐ! جہاں تک ثابت بن قیس کا تعلق ہے میں ان کے کردار اور تقویٰ پر کوئی الزام نہیں دھر سکتی لیکن میں اسلام میں احسان فراموشی کو پسند نہیں کرتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پُوچھا کہ کیا تم وہ باغ واپس کرنے پر آمادہ ہو جو ثابت نے تمھیں دیا ہے؟ جمیلہ نے کہا: جی ہاں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت بن قیس سے فرمایا کہ باغ لے لو اور ان کو ایک طلاق دے دو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعدّدِ ازواج کو نہ تو نافذ کیا نہ اس عمل کی تاکید کی۔ تعدّدِ ازواج قبل اسلام سے رائج تھا اور اس کی کوئی حد بھی مقرر نہ تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحدید نافذ کی اور کئی بیویوں کی اجازت اس وجہ سے دی کہ ان عورتوں کی کفالت ہو سکے جن کے باپ یا شوہر جنگوں میں کام آ گئے ہوں۔ قرآن حکیم نے بیویوں کی تعداد کو چار تک محدود کر دیا ہے اور تاکید کی ہے کہ سب کے ساتھ مساوی

اور عادلانہ سلوک کیا جائے۔ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے :

اور اگر تم کو اس بات کا احتمال ہو کہ تم یتیم لڑکیوں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو اور عورتوں سے جو تم کو پسند ہوں نکاح کر لو دو دو عورتوں سے اور تین تین عورتوں اور چار چار عورتوں سے۔ پس اگر تم کو احتمال اس کا ہو کہ عدل نہ رکھو گے تو پھر ایک ہی بی بی پر بس کرو یا جو تمہاری ملک میں ہو وہی سہی اس امر مذکور میں زیادتی نہ ہونے کی توقع قریب تر ہے۔ (النساء ۳)

معاہدۂ نکاح کے شرائط، شرکاء معاہدہ کے طے کرنے کے ہیں اسلامی تعلیمات کے مطابق۔ اگر شوہروں کو اجازت ہے کہ مجبوری کے وقت وہ اپنا حقِ طلاق استعمال کریں تو بیویاں بھی حقدار ہیں کہ اپنے مہر اور نفقے کا اپنی پسند کے مطابق تعین کریں، نیز اپنے شوہروں سے علیحدہ ہو جانے کا اختیار طلب کریں کہ جب ضرورت پڑے تو اس اختیار کو استعمال کر سکیں۔ اگر شادی کے وقت تمام امور کا پوری طرح لحاظ کر کے معاہدہ عمل میں آئے اور جانبین عملی طور پر ایک ہی سطح پر ہوں تو عورت کے لیے نقصان اٹھانے کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں فرماتا ہے کہ :

اور (اسی طرح) مسلمان عورتوں سے (بھی) کہہ دیجئے کہ (وہ بھی) اپنی نگاہیں نیچی کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت (کے مواقع) کو ظاہر نہ کریں۔ مگر جو اس (موقع زینت) میں سے (غالباً) کھلا رہتا ہے، جس کے ہر وقت چھپانے میں ہرج ہے) اور اپنے دوپٹے اپنے سینوں پر ڈالے رہا کریں اور اپنی زینت (کے مواقع مذکورہ) کو (کسی پر) ظاہر نہ ہونے دیں مگر اپنے شوہروں پر یا اپنے (محارم پر یعنی) باپ پر یا اپنے شوہر کے باپ پر یا اپنے بیٹوں پر یا اپنے شوہروں کے بیٹوں پر یا اپنے (حقیقی، علاتی یا اخیافی) بھائیوں پر یا اپنے بھائیوں کے بیٹوں پر یا اپنی (حقیقی، علاتی اور اخیافی) بہنوں کے بیٹوں پر یا اپنی عورتوں پر یا اپنی لونڈیوں پر یا ان مردوں پر جو طفیلی (طور پر رہتے) ہوں اور ان کو ذرا توجہ نہ ہو، یا ایسے لڑکوں پر جو عورتوں کے پردوں کی باتوں سے ابھی ناواقف ہیں (مراد غیر مراہق ہیں) اور اپنے پاؤں زور سے نہ رکھیں کہ ان کی مخفی زینت ظاہر ہو جائے۔ اور مسلمانو! تم سب اللہ کے سامنے توبہ کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ (النور ۳۱)

اگر اس آیت سے عورت کا اپنے گھر کی چار دیواری کے اندر عزلت گزیں رہنا درست کہا جائے کہ وہ اپنے جائز امور کو سرانجام دینے کے لیے بھی گھر سے باہر قدم نہ رکھنے پائے تو پھر یہی پابندی مردوں پر بھی عائد ہوگی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ :

آپ مسلمان مردوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ ان کے لیے زیادہ صفائی کی بات ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے جو کچھ لوگ کیا کرتے ہیں۔ (النور ۳۰)

پھر دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ :

اے پیغمبر! اپنی بیویوں سے اور اپنی صاحبزادیوں سے اور دوسرے مسلمانوں کی بیویوں سے بھی کہہ دیجئے

کہ (سر سے) نیچے کر لیا کریں اپنی ٹھوڑی سے اپنی چادریں، اس سے جلدی پہچان ہو جایا کرے گی تو آزار نہ دی جایا کرے گی اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ (احزاب ۵۹)

اس حکم کا مقصد عورت کی آزادی پر پابندی عائد کرنا نہیں تھا بلکہ اُس وقت مدینہ میں جو حالات تھے ان کے پیشِ نظر عورتوں کو چھیڑ چھاڑ اور دوسرے نقصانات سے بچانا مقصود تھا۔ زمانہ قدیم میں ایک خاص قسم کا لباس تھا جو عورت اور مرد دونوں کے لیے نشانِ عزت و امتیاز سمجھا جاتا تھا۔ مثلاً "آشورین" کے قدیم قانون نے شادی شدہ عورت کے لیے نقاب ضروری قرار دیا تھا اور لونڈیوں کو یا بدنام عورتوں کو نقاب کی ممانعت تھی۔

ہم حدیث میں پڑھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ مطہرہ سودہؓ بنت زمعہ باہر گئیں تو حضرت عمرؓ نے ان کو دیکھا اور پہچان لیا اور کہا کہ خدا کی قسم، سودہؓ! تم ہم سے چھپ نہیں سکتیں۔ لہٰذا وہ واپس چلی آئیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ واقعہ بیان کیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگوں کو اجازت ہے کہ اپنی ضرورتوں کے لیے باہر جاؤ۔ اگر یہ سچ ہے کہ عہدِ رسالت کے سماجی حالات کے مطابق عموماً عورتیں زیادہ تر گھریلو معاملات میں اپنے شوہروں اور بچّوں کی نگہداشت میں غرق رہتی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کی یہ مصروفیات ملی سرگرمیوں میں حصّہ لینے میں کبھی مانع نہ تھیں۔ گھر کے کام کاج نے ان کو نہ تو مسجد جانے سے روکا، نہ عید کی نمازوں سے روکا، نہ میدانِ جنگ میں جانے اور شریکِ جہاد ہونے سے روکا اور نہ دوسرے بے شمار فرائض کی ادائیگی سے روکا۔ مثلاً وہ رسد کی فراہمی کا انتظام کرتیں، بیماروں اور زخمیوں کی دیکھ بھال کرتیں، میدانِ جنگ سے زخمیوں اور شہیدوں کو اٹھاتیں حتّٰی کہ ضرورت آ پڑتی تو باقاعدہ لڑائی میں بھی حصّہ لیتیں۔ رسول اللہ صلعم کی ایک زوجۂ مطہرہ زینبؓ چمڑا تیار کرتی تھیں۔ یہ ان کا کاروبار تھا اور اس کاروبار کی آمدنی رفاہ عامہ پر صَرف کرتیں۔ عورتیں کھیتی کے کاموں میں اپنے شوہروں کا ہاتھ بٹاتیں، دعوتوں کے موقعوں پر مہمانوں (مردوں) کی تواضع کرتیں۔ اس کے علاوہ تجارت بھی کرتیں، وہ مردوں سے چیزیں خریدتیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کا مرتبہ بہت بلند کر دیا ہے اور قانونی طور پر عورت کو مردوں کے برابر حقوق عطا کیے ہیں۔ عدل کی تاکید کی ہے۔ خصوصی مراعات کی ہدایت کی ہے اور ان کی حفاظت اور کفالت کی ذمہ داری مرد کے سر عائد کی ہے۔ مگر آج یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا نہ صرف غلط استعمال ہوتا رہا بلکہ بعض اوقات تو سرے سے ان کو نظر انداز کیا گیا۔ مرد عورتوں کے محافظ بنائے گئے تھے مگر اس کے عوض وہی ان کے حق میں ظالم و جابر ہو گئے۔ آج بھی بہت سے ممالک میں "مسلم لا" پر عمل درآمد اس انداز سے ہو رہا ہے کہ حقوقِ نسواں کے معاملے میں مخالفانہ امتیاز نمایاں ہے۔ لیکن ان تمام باتوں پر موردِ الزام مسلمان ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اور دین و شریعت اس سے بری ہیں۔ شیخ محمد عبدہٗ نے لکھا ہے کہ جو شخص اس سے واقف ہے کہ اسلام سے پہلے کی تمام قوموں نے کس طرح مردوں کو ترجیح دی اور عورتوں کو جانور بنائے رکھا، اور وہ مردوں کا محض کھلونا سمجھی گئیں۔ اور کس طرح بعض مذاہب نے بھی مرد کو محض مرد ہونے کی وجہ سے فوقیت دی اور عورت کو عورت ہونے کی وجہ سے کمتر سمجھا اور کہیں بعض قوموں نے عورت کو مذہبی فرائض تک انجام دینے کے قابل نہ سمجھا، حتّٰی کہ یہ

تصوّر کیا کہ وہ روح کی بھی حامل نہیں ہے۔ ان تمام باتوں سے آگاہ ہونے کے بعد ہی وہ ان اصلاحات کی حقیقی قدر و منزلت کا اندازہ کر سکتا ہے جو عورتوں کے معاملے میں اسلام نے کی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی عیاں ہو جائے گی کہ اہلِ یورپ کا یہ دعویٰ کتنا بڑا فریب ہے کہ عورتوں کو اعزاز و اکرام اور مساوات سب سے پہلے انھوں نے عطا کیا۔ یہ اوّلیت تو اسلام کو حاصل ہے، اسی نے عورتوں کو اعزاز و اکرام اور مساوات سے نوازا۔ اور اہلِ یورپ کے قوانین اور احکام مذہبی میں تو آج تک مرد کی برتری بدستور قایم ہے۔

یقین کیجئے عورتوں کی تعلیم و تربیت اور ان کے حقوق سے آشنا کرنے میں ساری کوتاہی مسلمانوں کی ہے اسلام کی نہیں، اور ہم تو یہاں تک تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمان اپنے مذہب کی ہدایات کو پُورا کرنے سے اس قدر قاصر رہے ہیں کہ اب وہی اس کے خلاف ایک ثبوت بن کر رہ گئے ہیں۔

وقت آگیا ہے کہ مسلمان اسے محسوس کریں کہ اسلامی معاشرہ اس وقت تک سرسبز نہیں ہو سکتا جب تک عورت کو محکومی سے نجات نہیں ملتی اور وہ امتیاز ختم نہیں ہوتا جو بیچ میں حائل ہے اور معاشرے میں اسے پُوری طرح احکام قرآنی کے مطابق حصّہ لینے کی اجازت نہیں دی جاتی۔

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

"عورتیں ریاست کا ستون ہیں، اگر وہ اچھی ہیں تو ریاست بھی اچھی ہے۔ اگر وہ خراب ہیں تو ریاست بھی خراب ہوگی۔"

سرورِ کائنات ﷺ کا رویّہ منافقوں سے

رئیس احمد جعفری

کھلے ہُوئے دوست اور رکھلے ہوئے دشمن کے ساتھ طرزِ عمل متعین کرنے میں کوئی دشواری نہیں پیش آتی۔ یہ دوست ہے وہ دشمن ہے۔ دوست اس لیے ہے کہ موردِ لطف وکرم بنے اور دشمن اس لیے ہے کہ ترکی بہ ترکی جواب دیا جاتے۔ لیکن دشمن کی ایک قسم اور ہوتی ہے ؛ یہ قسم ہے منافقوں کی۔ یہ اپنے تئیں دوست ظاہر کرتے ہیں، دوستی کا عوامی دعوٰی کرتے ہیں۔ پیمانِ رفاقت بڑے زور شور سے استوار کرتے ہیں، لیکن درپردہ دشمن ہوتے ہیں، دشمنوں سے ساز باز رکھتے ہیں، ہر وقت تخریب کے درپے رہتے ہیں، سازش کرتے ہیں نقصان پہنچاتے ہیں، تباہ وبرباد کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے۔ یہ دشمن کی سب سے بدترین خطرناک اور ناقابلِ برداشت قسم ہے۔ ایسے لوگ جب براگندہ نقاب ہوجائیں، تو انھیں معاف نہیں کیا جاسکتا، ان پر لطف وکرم کی بارش نہیں کی جاسکتی۔ انھیں موردِ مہر وکرم نہیں بنایا جاسکتا۔ یہ صرف اس قابل ہوتے ہیں کہ جہاں ملیں کچل دیے جائیں۔ جہاں ان کا سراغ لگے، پامال کر دیئے جائیں۔ جب یہ ہاتھ آئیں، ان کے جسم وجان کا رشتہ بے تامل منقطع کر دیا جائے۔ زمانہ قبل از تاریخ میں بھی یہی ہوتا تھا، دورِ تاریخ کے آغاز میں بھی ایسا ہی ہُوا اور اب کہ دُنیا عمرانیت اور حضارت کے اوجِ کمال پر ہے، یہی اصول کارفرما ہے، سچ تو یہ ہے کہ بغیر اس تطہیر کے کام بھی نہیں چل سکتا، نہ نظم قایم ہوسکتا ہے، نہ امن بحال ہوسکتا ہے، نہ دوستوں کی شناخت ہوسکتی ہے، نہ دشمنوں سے نجات مل سکتی ہے۔ اب ہمیں دیکھنا ہے کہ آقائے دوجہاںؐ نے منافقوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا؟ ان کا کس طرح قلع قمع کیا؟ ان سے کیونکر نجات حاصل کی؟ انھیں

کیسی عبرت انگیز اور لرزہ خیز سزائیں دیں؟

اس سلسلہ میں چند واقعات خاص طور پر اس قابل ہیں کہ پیشِ نظر رہیں تاکہ عہدِ رسالت کی صحیح تصویر آپ کے سامنے آجائے اور رسالتمآبؐ کے کردار واخلاق اور صفات وسیرت کا واضح خاکہ متعین ہوجائے۔

منافق کا وار

غزوہ اُحد تاریخِ اسلام میں اپنے نتائج کے اعتبار سے بڑی فیصلہ کن جنگ ہے۔ کفارِ قریش نے اس لڑائی کا بڑی تیاریوں کے ساتھ انتظام کیا۔ بدر میں انھیں جو شکست فاش ہُوئی تھی، اس کا بدلہ لینے کے لیے وُہ بے چین تھے۔ سردارانِ قریش، جو اس جنگ میں ہلاک ہُوئے تھے، ان کے متعلقین ایک خوفناک جنگ کے لیے سربکف ہوچکے تھے۔ قریش کے کاروانِ تجارت کا جو نفع جمع ہو رہا تھا طے ہُوا کہ اسے جنگی تیاریوں پر صرف کر دیا جائے اور یہ تجویز بڑی گرم جوشی اور مسرت کے ساتھ منظور کرلی گئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی طرف سے جنگ کی ابتداء نہیں فرماتے تھے۔ لیکن اگر جنگ مسلّط کر دی جائے، تو پھر میدانِ جنگ آپ کا مرغوب ترین مقام بن جاتا تھا۔ جب آپ کو قریش کی تیاریوں کا علم ہُوا، تو آپ نے بھی جتنی اور جیسی کچھ تیاریاں ممکن تھیں، شروع

کردیں۔ لیکن یہ تیاریاں ابھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچی تھیں، کہ یک بیک قریش کا لشکر نمودار ہوگیا۔ مدینہ کے قریب پہنچ کر اُس نے اُحد پر پڑاؤ ڈال دیا تھا۔ تعداد لشکر کے بارے میں آپؐ نے تحقیق کی، تو معلوم ہوا بہت زیادہ ہے۔ یہ اندیشہ تھا کہیں قریش کا لشکر بڑھ کر مدینہ پر حملہ آور نہ ہوجائے۔ چنانچہ ہر طرف چوکی پہرے کا انتظام کیا۔ مسجد نبویؐ کے دروازے پر دو صحابی رات بھر مسلح کھڑے پہرہ دیتے رہے۔ دُوسرے دن صبح مشورہ ہُوا۔ کچھ لوگوں نے یہ رائے دی کہ شہر میں قلعہ بند ہوکر لڑا جائے۔ بعض کی رائے یہ تھی کہ شہر سے باہر نکل کر مقابلہ کیا جائے۔ پہلی رائے دینے والوں میں عبداللہ بن اُبی بھی تھا۔ یہ بہت بڑا منافق تھا اور منافقوں کا سردار بھی۔ بحث و مباحثہ کے بعد آنحضرتؐ نے دوسری رائے قبول فرمائی اور بعد نماز جمعہ ایک ہزار سرفروشوں کے ساتھ بارادہ جنگ شہر سے باہر نکلے۔ ان ایک ہزار لوگوں میں تین سو عبداللہ کے آدمی تھے۔ وُہ تھوڑی دُور ساتھ چلنے کے بعد اپنے تین سو آدمیوں کو لے کر الگ ہوگیا۔ اس نے کہا:

حب محمدؐ نے میری رائے نہ مانی، تو میں ان کا ساتھ کیوں دُوں۔

غور کیجئے یہ کتنا بروقت نفسیاتی وار تھا، جو اس منافق نے لشکرِ اسلام پر کیا تھا۔ مسلمان ایک ہزار سے سات سو رہ گئے۔ ان باقی ماندہ سات سو نفوس پر تین سو کے یک بیک الگ ہوجانے کا کیا اثر پڑنا چاہیے تھا۔ لیکن آپ کو خدا پر بھروسہ تھا۔ آپ نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔ یہی سات سو جاں نثار لے کر ایک بڑے لشکر کے مقابلہ کو نکلے اور بالآخر خدا نے فتح عطا فرمائی۔ عبداللہ کو اس حرکت کی سزا یہ سات سو آدمی وہیں "قضیہ زمین برسرِ زمین" کے مطابق دے سکتے تھے اور جنگِ اُحد کے خاتمہ کے بعد تو بڑی آسانی سے ایک نازک وقت میں دھوکہ دے کر الگ ہوجانے والے تین سو آدمیوں کو نہیں، تو اُن کے سردار کو ضرور موت کے گھاٹ اتارا جاسکتا تھا۔ لیکن تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ یہ کچھ نہ ہُوا۔ نہ منافقین کو کوئی سزا دی گئی، نہ ان کے سردار عبداللہ کے ساتھ کسی طرح کا منتقمانہ رویہ اختیار کیا گیا۔

منافق کی سازش

یہودیوں کا اسلام اور داعی اسلام کے ساتھ جو مفسدانہ، باغیانہ اور سرکشانہ رویہ تھا، اسے تاریخ کا ایک معمولی طالب علم بھی جانتا ہے۔ وُہ صلح و اسلام کے ہر عہد نامے کو ردّی کاغذ کے ایک ٹکڑے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ وہ لڑنے مرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ وہ کسی موقع پر لچک اور نرمی کا برتاؤ کرنا جانتے ہی نہیں تھے۔ یہودیوں کے ایک قبیلہ بنونضیر کی سرکشی حد سے تجاوز کرچکی تھی۔ اس کی جہاں ایک وجہ یہ تھی کہ وہ بڑے بڑے مضبوط اور مستحکم قلعوں میں پناہ گزیں تھے، وہاں ایک دُوسری وجہ یہ بھی تھی کہ مدینہ کے منافق ان کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے جب ان سے معاہدہ صلح کرلینے کی خواہش فرمائی تو وُہ لڑنے کے لیے تیار ہوگئے۔ اس موقعہ پر بھی عبداللہ بن ابی نے حسبِ معمول انھیں شہ دی اور اطمینان دلایا کہ جب تم لڑنے نکلو گے تو دو ہزار آدمیوں کے ساتھ میں بھی تمہاری مدد کو آؤں گا (ابو داؤد)۔ عبداللہ کی اس حرکت کی اطلاع وحیِ الٰہی نے آپؐ کو دے دی کہ یہ منافقین کا فروں (یہودیوں) سے کہہ رہے ہیں:

وان قوتلتم لننصرنکم۔ — اگر تم مقاتلہ کے لیے نکلے، تو ہم تمہاری مدد کریں گے۔

کیا اس سے بڑا جُرم بھی کوئی ہوسکتا ہے، جس کا ان منافقوں نے ارتکاب کیا تھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کسی طرح کی کوئی بازپرس نہ فرمائی، اپنی تیاریوں میں لگے رہے۔ نہ منافقین کی پروا کی، نہ یہودیوں کی طاقت سے مرعوب ہُوئے۔

منافق ساتھی

انصار اور مہاجرین میں رسول اللہؐ نے وُہ اخوت پیدا کردی تھی کہ اس بھائی چارہ کے آگے صلب اور رحم کے

رشتے ہیچ تھے۔ کوئی انصاری اگر مرتا تھا تو مہاجر بھائی اس کی وراثت میں حصہ پاتا تھا۔ ایسی مواخات دنیا میں پہلی بار قایم ہوئی تھی و پھر اس کے بعد دنیا یہ دل آویز منظر نہ دیکھ سکی۔

منافقین اس کوشش میں رہتے تھے کہ مہاجرین اور انصار میں غلط فہمی پیدا کرکے جنگ و پیکار کرا دیں تاکہ یہ عجیب و غریب بھائی چارہ بھی ختم ہو، اور ان دونوں کے اتحاد نے کفار و مشرکین کے لیے جو ایک خطرہ پیدا کر دیا ہے، وُہ بھی دُور ہو جائے مگر ان کی کوششیں کبھی بارآور نہیں ہُوئیں بلکہ ایک مرتبہ قریب تھا کہ یہ کوشش کامیاب ہو جائے۔ ایک مہاجر اور ایک انصاری کے ذاتی جھگڑے کو عبداللہ نے قومی اور طبقاتی جھگڑا بنا دینے میں کامیابی حاصل کر لی۔ دونوں نے اپنے اپنے طبقہ (مہاجرین اور انصار) کو مدد کے لیے پکارا۔ تلواریں کھنچ گئیں اور لڑائی کا میدان تیار ہوگیا۔ لیکن چند معاملہ فہم لوگوں نے مداخلت کی۔ بات بڑھنے نہ پائی۔ بغیر کسی خونریزی کے وہیں کی وہیں ختم ہوگئی۔

ایسا زریں موقعہ جب ہاتھ سے نکلتا دیکھا، تو عبداللہ تلملا اُٹھا۔ اس نے انصار سے مخاطب ہو کر کہا :

تم نے خود ہی یہ مصیبت مول لی ہے۔ مہاجرین کو تم نے اتنا بڑھایا کہ اب وُہ برابری کا دعویٰ کر کے تمہارے منہ آنے لگے ہیں۔ اب بھی موقع ہے، اپنا دستِ اعانت کھینچ لو، تو یہ (مہاجرین) فوراً (بے یارو مددگار ہونے کے باعث) بھاگ کھڑے ہوں گے۔

عبداللہ کی یہ باتیں ایسی نہ تھیں، جو نظر انداز کر دی جاتیں۔ معاملہ دربارِ رسالت میں پہنچا، حضرت عمرؓ بھی موجود تھے انہوں نے سرورِ کائناتؐ سے عرض کیا :

"کسی کو حکم دیجئے وہ اس منافق کی گردن اُڑا دے!"

اور کون کہہ سکتا ہے، حضرت عمرؓ کی یہ رائے قرینِ صواب نہ تھی، لیکن کیا رسول اللہؐ نے حضرت عمرؓ کے اس مشورہ کو قبول کر لیا؟ آپ نے ارشاد فرمایا :

"کیا تم اسے پسند کرو گے کہ لوگ کہیں محمدؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کر دیتے ہیں؟"

حضرت عمرؓ کچھ جواب نہ دے سکے اور رحمتِ عالمؐ کے عفوِ تام نے ایک بہت بڑے منافق کی جان بچا لی۔

یہی نہیں، اس رئیس المنافقین کے ساتھ ایک اس سے بھی بڑا اور حیرت انگیز واقعہ پیش آتا ہے۔

منافق باپ کا مومن بیٹا جب عبداللہ بن ابی کی منافقانہ سرگرمیاں حد سے بڑھ گئیں، ان میں کسی طرح کی کمی واقع نہ ہُوئی، بلکہ اضافہ ہی ہوتے لگا، تو مسلمانوں میں اس کے قتل کا چرچا ہونے لگا۔ یہ افواہ پھیلنے لگی اب وُہ بچ نہیں سکتا۔ ضرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے قتل کا حکم امروز فردا میں صادر فرما دیں گے۔

بات قرین قیاس تھی۔ شدہ شدہ عبداللہ بن اُبی منافق اعظم کے بیٹے عبداللہ کو یہ خبر پہنچی — یہ عبداللہ بڑے پکے اور سچے مسلمان تھے۔ اسلام کے شیفتہ، رسولؐ کے جاں نثار اور باپ کے خدمت گزار، یہ خبر سُن کر سیدھے دربارِ رسالتؐ میں حاضر ہُوئے اور عرض کیا :

"جو کچھ میں نے سُنا ہے (عبداللہ بن اُبی کے حکمِ قتل کے متعلق) اگر وُہ صحیح ہے، تو صرف اتنی استدعا کرتا

چاہتا ہوں، مجھے حکم دیا جائے، میں اپنے باپ کا سر ابھی کاٹ کر قدموں پر لا کر پھینک دوں گا۔"
آپ نے یہ سنا اور جاننے ہوگیا جواب دیا:
"نہیں! ہم اس کے قتل کا حکم نہیں دیں گے، اس سے لطف و کرم کا برتاؤ کریں گے۔"
عبداللہ باپ کی جاں بخشی کی نوید سن کر چلے گئے۔ باپ بھی اپنی جان کے بچ جانے پر خوش ہُوا لیکن اُس کی منافقانہ سرشت جُوں کی توں قایم رہی، اس میں کوئی فرق نہ آیا۔

منافقوں کا عذر لنگ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ لڑائی پر صلح کو ترجیح دیتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے یہودیوں اور مشرکوں سے معاہدے کیے اور ان پر سختی سے عمل کیا۔ لیکن مشرکین اور یہود کے معاہدے صرف اس لیے تھے کہ جب مناسب سمجھیں، انھیں چاک کر دیں۔ جنگ خندق (۵ھ) انہی عہد شکن یہودیوں اور قریش نے بغیر کسی وجہ کے برپا کی تھی۔ بنو نضیر تو خیر عہد شکنی میں ممتاز تھے ہی، بنو قریظہ بھی، جو ابھی تک پاسِ عہد کرتے چلے آرہے تھے، بنو نضیر کے بہکاوے میں آگئے اور معاہدے کو پس پشت ڈال کر ان کے ساتھی بن گئے۔ آپ نے معاہدے کی یاد دہانی اور اتمام حجت کے لیے دو صحابیوں کو ان کے پاس بھیجا۔ انہوں نے جو جواب دیا، وہ یہ تھا:
"نہ ہم یہ جانتے ہیں کہ محمدؐ کون ہے؛ نہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ معاہدہ کیا ہوتا ہے؛"
یُوں بھی کفار و مشرکین کا لشکر بہت بڑا تھا۔ اب بنو قریظہ نے اس کی تعداد دس ہزار تک پہنچا دی[1] اور اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کے پاس توکل اور نصرت الٰہی پر بھروسہ کے سوا کیا تھا۔ کفار و مشرکین کی اس متحدہ یلغار کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی قوت پارہ پارہ کر دی جاتے۔ تا کہ پھر کبھی وہ سر نہ اٹھا سکیں۔

ایک یہودی سردار حی بن اخطب نے اپنے خیال میں سچ ہی کہا تھا: "اب اسلام کا خاتمہ ہے"۔
اس دس ہزار کے لشکر جرار کے مقابلہ میں مسلمانوں کی تعداد صرف تین ہزار تھی، پھر بے مائیگی مستزاد۔ حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورہ سے یہ طے ہوا کہ خندق کھود کر جنگ لڑی جائے۔ خندق کھودنے میں آپ نے برابر کا حصہ لیا۔ کفار و مشرکین نے تین طرف سے محاصرہ کر لیا تھا، حالات سخت نازک تھے، مسلمانوں کی تعداد بھی کم تھی، وسائل بھی ناپید تھے، روپیہ اور اناج بھی نہیں تھا۔ لیکن کفر و شرک کی یورش سے گھبرانا اور پیٹھ پھیرنا مسلمان کا شعار نہیں۔ حالات خواہ کتنے ہی نامساعد اور نازک ہوں، مسلمان کلمۂ الٰہی کی سربلندی کے لیے جان کا قربان کر دینا ایک کھیل سمجھتا ہے۔ ہاں تو تاریخ کا یہ عجیب و غریب کھیل جاری تھا۔ ایسا کھیل جس کی نظیر چشم فلک نے کبھی نہ دیکھی تھی۔

ایک مہینا تک یہ محاصرہ قایم رہا۔ اس محاصرہ نے مسلمانوں کی حالت اور زیادہ زار و زبوں کر دی۔ بار بار فاقے کرنا پڑے ایک مرتبہ صحابہ پر مسلسل تین فاقے گزر گئے۔ انھوں نے آنحضرتؐ کے سامنے پیٹ پر پتھر باندھے ہُوئے دکھائے (عربوں کا

---

[1] فتح الباری

معمول تھا کہ شدتِ گرسنگی کے عالم میں پیٹ پر پتھر باندھ لیتے تھے تاکہ کمر سیدھی رہے) یہ منظر دیکھ کر آپؐ نے بھی اخفاءِ حال مناسب نہ سمجھا، شکم مبارک کھولا، تو دو پتھر بندھے ہُوئے تھے۔

مسلمانوں کے اس چھوٹے سے لشکر میں منافقین کی خاصی تعداد تھی۔ شروع شروع میں تو اپنے نفاق کو چھپاتے رہے۔ لیکن جب شدائد کا دور سخت ہُوا تو نفاق چھپاتے نہ چھپ سکا۔ عذر ہاتے لنگ پیش کر کر کے واپس جانے کی اجازت طلب کرنے لگے۔ قرآن مجید میں جنگِ خندق (جسے جنگِ احزاب بھی کہتے ہیں، کیونکہ بہت سی جماعتوں نے متحدہ یلغار کی تھی) کے متعلق جو سورہ (احزاب) ہے، اس میں ان کی اس کیفیت کو بیان کرتے ہُوئے ارشاد فرمایا ہے کہ ان کے عذرات کا مقصد راہِ فرار تلاش کرنا ہے:

ان یریدون الاّ فراراً۔ ان لوگوں (منافقوں) کا ارادہ صرف یہ ہے کہ بھاگ کھڑے ہوں۔

لیکن راہِ فرار تلاش کرنے والے ان منافقوں کے ساتھ نہ صرف وہ رویّہ اختیار نہیں کیا گیا، جو میدانِ جنگ سے بھاگنے والے سپاہی کے ساتھ ہوتا ہے بلکہ انھیں کسی طرح کی سزا نہیں دی۔ ایک طرف ان کا یہ حال تھا، دوسری طرف کھرے اور سچے مسلمان تھے، جو اس جنگ کی ہر حالت میں ہر سختی اور ہر مصیبت کے موقع پر جان ہتھیلی پر لیے قربان ہونے کو تیار رہتے تھے۔ وہ جانتے تھے، جان خدا کی دی ہُوئی ہے۔ اس سے بڑھ کر اس کا مصرف اور کیا ہو سکتا ہے کہ خدا کی راہ میں کام آجائے: ؎

جان دی ، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہُوا

منافق کوشیہ کا فائدہ مدینہ سے یہودیوں کی جلا وطنی کے بعد خیبر ان کا مستحکم ترین اور ناقابلِ تسخیر قلعہ بن گیا تھا۔ یہاں اطمینان سے بیٹھ کر وہ اسلام اور داعی اسلام اور مسلمانوں کے تخریب کی تدبیریں سوچا کرتے۔ سازشیں کیا کرتے اور جنگی منصوبے بنایا کرتے تھے۔ چنانچہ جنگِ خیبر سے کچھ قبل یہودیوں نے بنو غطفان کو اپنے ساتھ ملا کر جنگ کی طرح ڈالنا چاہی۔ مدینہ کے منافقین برابر یہودیوں کو خبریں پہنچا رہے تھے اور شہ دے رہے تھے۔ آنحضرتؐ نے کوشش کی کہ جنگ نہ ہو بلکہ معاہدۂ صلح ہو جائے۔ اس مقصد کے لیے آپ نے ایک صحابی کو بھی بھیجا، لیکن وُہ جنگ فتح کر لینے کے نشہ میں تھے، صلح کی باتیں کیا سُنتے؛ پھر جب کہ منافقین کے سردار عبد اللہ بن ابی نے انھیں یقین دلا رکھا تھا۔

محمدؐ کچھ نہیں کر سکتے، مٹھی بھر آدمیوں کے سوا ان کے پاس ہتھیار تک نہیں، وُہ کیا لڑیں گے؟ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ غطفان، جو اب تک شرکت یہود کے بارے میں تذبذب میں تھے، ان کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے۔

منافقین کی یہ درازیاں اس لیے تھیں کہ وُہ جانتے تھے، انھیں کوئی سزا نہیں ملے گی۔ انھیں جماعت سے خارج نہیں کیا جائے گا۔ ان پر کفر کا فتویٰ نہیں لگے گا، ان کا اسلام زیرِ بحث نہیں لایا جائے گا، اس لیے اسلام کا یہ اصول ہے کہ کسی ایسے شخص کی جان نہیں لیتا، جو اسلام کا مدعی ہو۔ اگرچہ وُہ جھوٹ ہی کیوں نہ بول رہا ہو۔

مسجدِ ضرار اس سے قبل ہم بتا چکے ہیں کہ منافقین کی سب سے بڑی اور دیرینہ تمنا یہ تھی کہ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا ہو۔ وُہ ایکدوسر سے اُلجھ پڑیں، ان میں جو اخوت، محبّت، ہمدردی اور ملاطفت کا جذبہ پیدا ہو چکا ہے، وُہ سرد پڑ جائے تاکہ اسلام پنپ نہ سکے اور یہ ملّت خود آپس کے نزاع میں مبتلا ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔

چنانچہ مسجد قبا کے توڑ پر انہوں نے ایک جداگانہ مسجد بنائی تاکہ مسلمانوں میں آسانی سے تفرقہ پیدا کیا جا سکے۔ وجہ یہ بتائی کہ معذور اور اپاہج لوگ، جو مسجد قبا میں نہیں جا سکتے، وُہ یہاں آکر نماز پڑھ لیا کریں۔

آنحضرتؐ کو وحیِ الٰہی نے بتا دیا کہ دراصل مقصد کیا ہے۔ چنانچہ سورہ توبہ میں ارشاد ہوتا ہے:

والذین اتخذوا مسجداً ضراراً — اور ان لوگوں نے مسجدِ ضرار کفر کے لیے اور

وکفراً وتفریقا بین المومنین۔ — مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے بنائی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسجد میں آگ لگوا دی اور اسے مسجد کے طور پر نہیں استعمال ہونے دیا۔ لیکن منافقوں کو ہر سزا سے محفوظ رکھا۔

منافقوں کی فتنہ انگیزی فتح مکہ سے ایک سال قبل کا واقعہ ہے کہ آنحضرتؐ کو اطلاع ملی۔ رومیوں کا ایک لشکرِ گراں مسلمانوں سے برسرِ پیکار ہونے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ یہ سُن کر آپ نے بھی جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ اگرچہ موسم نہایت گرم تھا (گرمی اور وُہ بھی عرب کی) اور قحط کی شدّت نے حالات کو حد درجہ نامساعد بنا دیا تھا۔ لیکن آپ کی تیاریاں جاری تھیں اور جو مخلص مسلمان تھے، وہ ان شدائد کے باوجود راہِ خدا میں اپنی جان قربان کر دینے کو تیار اور آمادہ تھے۔ لیکن منافقین، نہ صرف یہ کہ بہانہ بازی اور عذر تراشی کر کے وہ ان کی سرگرمیوں سے الگ رہے، بلکہ انہوں نے مسلمانوں کو بھی بھڑکانا شروع کیا کہ اُس قحط اور اس گرمی میں وُہ کیوں گھر کی عافیت چھوڑ کر جنگ کی صعوبتیں برداشت کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں:

لا تنفروا فی الحر۔ — اس گرم موسم میں باہر نہ نکلو۔

یہ تھا دعوتِ رسالت کے جواب میں ان کا وُہ خفیہ پیغام، جو مسلمانوں کے کانوں تک صرف اس لیے پہنچایا جا رہا تھا کہ وہ ایک بڑی سعادت سے محروم رہ جائیں۔

ان فتنہ طرازیوں کے باوجود ان کی جان کو کوئی گزند پہنچا، نہ مال کو۔

منافق کی سپر ایک بدری صحابی نے ایک مرتبہ آنحضرتؐ کو اپنے گھر بلایا، وہاں تشریف لے گئے، تو کھانے کے لیے اصرار ہوا، آپؐ راضی ہو گئے۔ محلہ کے تمام لوگ اس موقع پر موجود تھے۔ کسی نے کہا:

"آج مالک بن دخیشن نظر نہیں آتے۔"

ایک شخص نے یہ سن کر کہا: "وہ منافق ہے۔"

یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہ نہ کہو، وہ لا الٰہ الا اللہ کہتے ہیں۔"

سب خاموش ہوگئے۔ اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ زبان سے لَآ اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ کہہ دینا ایک منافق کے لیے بھی سپر بن جاتا ہے۔

منافق کا اقرار سے انکار

واقعہ افک یعنی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر جو تہمت لگائی گئی تھی، وہ ہر مسلمان کو معلوم ہے۔ حضرت عائشہؓ کی طہارت و تقدیس کی خود قرآن مجید نے توثیق فرمائی۔ لیکن یہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ اُم المومنینؓ کی ذات گرامی پر ایسا رکیک اتہام۔ قدرتاً اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف ہوئی۔ حضرت ابوبکرؓ کو بھی حد درجہ صدمہ ہوا اور خود حضرت عائشہؓ کے قلب و دماغ پر جو کچھ گزری، اس کا اندازہ ہر حساس شخص بآسانی کر سکتا ہے لیکن اتنے بڑے واقعہ کے سلسلے میں ہوا کیا؟ اس سلسلہ میں تین خاص اہم شخصیتوں کا ذکر لازمی ہے۔ تہمت لگانے والوں کو شرعی سزا دی گئی یعنی دِرّے لگائے گئے۔ ان سزا یافتگان میں حضرت حسان بن ثابتؓ بھی تھے، جو صحابیِ رسولؐ اور شاعرِ رسولؐ تھے۔ لیکن منافقین کے بہکاوے میں آگئے اور تہمت لگانے والوں میں شریک ہوگئے۔

ایک دُوسرے صاحب مسطح بن اثاثہ تھے۔ یہ بھی تہمت لگانے والوں میں (منافقین کے بہکاوے میں آکر) شریک تھے۔ انھیں بھی شرعی سزا ملی لیکن مزید سزا یہ ملی کہ حضرت ابوبکرؓ نے، جو ان کے کفیل معاش تھے، اپنی مالی امداد بند کر دی اور قسم کھالی کہ ایسے شخص کی مدد اب کبھی نہیں کریں گے۔ یہ بات خدا کو بُری لگی اور آنحضرتؐ پر یہ آیت نازل ہوئی:

و لیعفوا و لیصفحوا الا تحبون ان یغفر اللہ لکم و اللہ غفور رحیم۔ (سورہ نور۔ ۲۲)

تمہیں عفو و درگزر سے کام لینا چاہیے۔ کیا تم اسے پسند نہیں کرتے کہ خدا تمہاری مغفرت فرمائے اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔

لیکن اس واقعہ کا اصل ہیرو منافقوں کا سردار عبداللہ بن ابی تھا اور آپ اس حقیقت سے خوب واقف تھے کہ یہ سب کچھ اسی کا کیا ہوا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں، راسخ العقیدہ اور صالح مسلمانوں کو حدِ شرعی برداشت کرنا پڑی۔ اس لیے کہ اُن پر جرم ثابت تھا اور عبداللہ بن اُبی صاف بچ گیا۔ اس لیے کہ اسے خود اقرار نہیں تھا کہ اس نے تہمت لگائی اور شواہد و قرائن خواہ کتنے ہی قوی موجود ہوں لیکن کوئی ایسی شرعی شہادت موجود نہیں تھی جس کی بنا پر اسے سزا دی جا سکتی۔ کیا یہ معمولی واقعہ ہے؟ کیا اس عفو و درگزر اور لطف و مرحمت اور احسان و نعمت کی کوئی حد مقرر کی جا سکتی ہے؟

أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ

اللہ کی اطاعت کرو، رسول کی اطاعت کرو، اور جو تم میں سے حاکم ہو، اُس کی اطاعت کرو

(النساء: ۵۹)



سیاسی نظام پر اثرات

رسول اللہ کی بین الاقوامیت

اقبال احمد نوری

یوں تو ہر نبی اور رسول کے وجود کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر تاریکی کو چھانٹ کر نور میں تبدیل کر دے، ہر شرک و بدعت کی جڑ کاٹ کر توحید و سنت کی تخم ریزی فرمائے، باطل کے ہر اضطراری پہلو کو حق کے دائمی دامن میں سمیٹ لے۔ لیکن اسی کے ساتھ ایسا بھی ہوا کہ نبی یا رسول کسی خصوصی خطۂ ارض، کسی خصوصی طبقہ اور کسی خصوصی قوم کی طرف مبعوث فرمائے گئے اور یوں بھی ہوا ہے کہ یہ حضرات کبھی کبھی کئی کئی کی تعداد میں بیک وقت روئے زمین پر رونما ہوئے۔ اگر کسی نے خطۂ مصر میں اشاعتِ توحید کی تو کوئی فلسطین میں حق و صداقت کا درس دیتا رہا۔ غرض زمین کی پھیلی ہوئی کشادہ چادر کے طول و عرض میں ہر طرف انبیاء و رسل بھی جلوہ افروز رہے، لیکن ابھی تک ایسے پیغمبر آخر کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی، جس کی تجلیات سے بین الاقوامی تاریکی پاش پاش ہو جائے اور تمام دنیا کے حق کوش و حق بیں ایک ہی مرکز پر سمٹ کر آ جائیں۔ مذہبی اعتبار سے، ذہنی اعتبار سے، وضع قطع و لباس کے اعتبار سے غرضیکہ ہر اعتبار سے۔ اس سلسلے میں یہ بھی واضح رہے کہ یہ کام جب ہی ممکن ہو سکتا تھا، جب کہ ایسے جلیل القدر نبی کی پیدائش مرکزی حیثیت رکھتی ہو۔ چنانچہ سرزمین عرب کو بلاشبہ دائرۃ العرض میں مرکزی حیثیت حاصل تھی اور ہے۔ اور وہیں پر اس نبی آخر نے قدم رنجہ فرمایا جس کی طرف زمانے بھر کے صلحاء و علماء کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں اور اسی کے ساتھ یہ کمال بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک حیات ظاہری ہی میں عرب اور خصوصیت سے حجاز کو وہ مرکزی حیثیت حاصل ہوئی کہ اگر حبش سے بلالؓ یہاں آنے کو بے چین ہیں، تو فارس سے حضرت سلمان اگر ایک طرف ہرقل کے پاس اسلام کی دعوت بھیجی جا رہی ہے، تو دوسری سمت والیِ ایران کے پاس غرضکہ حضور رسالت مآب کی بعثت کا منشا ہی بین الاقوامی لادینی و الحاد کو نیست و نابود کرنا اور بین الاقوامی مذہب کی اشاعت و تبلیغ فرمانا تھا۔

عرب تین برِ اعظم، یورپ، ایشیا، افریقہ کے درمیان واقع ہے۔ ملک عرب کو جزیرہ عرب بھی کہتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب میں بحر احمر یعنی بحیرۂ قلزم، جنوب میں بحر ہند، مشرق میں خلیج عمان اور خلیج فارس ہیں شمال میں دریائے فرات جس نے عرب کو ایک جزیرہ کی شکل میں تبدیل کر دیا۔

عرب کی وجہ تسمیہ اہلِ لغت عرب کو بمعنی فصاحت و بلاغت اور اہلِ زبان ہونے کو اعراب کہتے ہیں اور عرب کے بالمقابل دنیا کے دوسرے ملکوں کو عجم یعنی گونگے کہا جاتا ہے۔

مختلف تفصیلات ملک عرب کا طول تقریباً پندرہ سو اور عرض چھ سو میل اور مجموعی رقبہ بارہ لاکھ مربع میل ہے ملک کا بڑا حصہ ریگستان ہے بقیہ زمین میں پہاڑوں کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے سب سے بڑا

پہاڑی سلسلہ جبل السراۃ کے نام سے مشہور ہے، جو جنوب میں یمن سے شروع ہو کر شمال میں ملک شام تک چلا گیا ہے اس کی سب سے بلند چوٹی آٹھ ہزار فٹ ہے۔ بعض حصّے زرخیز اور شاداب بھی ہیں۔ چاندی اور سونے کی کانیں بکثرت ہیں۔ دنیا میں سب سے پہلے اہلِ عرب ہی نے تمدن کی طرف قدم بڑھایا۔ گلہ بانی اور تجارت کے ذریعہ ادنیٰ حالت سے رفتہ رفتہ ترقی کرنے لگے۔ بھیڑوں کی اون سے موٹا ٹاٹ بنایا اور خیموں کی طرح نصب کر کے اس میں رہنے لگے۔ ان کا لباس صرف ایک لمبی بغیر سلی چادر، جس کو بطور تہبند کے اپنی کمر سے باندھتے، یا بطور احرام کے اپنی کمر سے لپیٹ لیتے تھے۔ ان کی خوراک ادھ پکا گوشت، اونٹ کا دودھ اور کھجوریں تھیں۔ ان کی تمام ملکیت اور جائیداد میں صرف مویشی اور گھوڑے، اونٹ، لونڈی اور غلام ہوتے تھے۔ یہی ان کا بیش قیمت سرمایہ تھا۔

عرب کا تہذیب و اخلاق اور معاشرتی حالت

ننگے ہو کر ناچنا، عورتوں کو برہنہ نچانا، شراب خود بنانا اور پینا، جوئے میں عورتوں کو ہار جانا، لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینا، لاتعداد بیویاں رکھنا اور باپ کے مرنے کے بعد دیگر مال کے ساتھ ماؤں کو آپس میں بانٹ لینا اور بیوی بنا کر رکھنا یا فروخت کر دینا، چوری لوٹ مار، قتل و غارت گری بعض قبیلوں کا پیشہ تھا۔ ذرا ذرا سی بات سے اچھے یا بد شگون لیا کرتے تھے۔ اگر پرند بائیں طرف سے دائیں طرف راستہ کاٹ گیا، تو نیک شگون لیتے تھے، اور اس کو سانح کہتے تھے۔ لیکن اس کے برعکس اگر کوئی پرند دائیں سے بائیں طرف راستہ کاٹ گیا تو بدشگون لیتے اور اس کو طیرہ کہتے تھے۔ پھر اس کام کو نہ کرتے اور لوٹ آتے اگر کوئی مر جاتا، تو اس کا اونٹ اس کی قبر پہ باندھ دیتے، یہاں تک کہ وہ بھوک اور پیاس سے مر جاتا اور اس مرنے والے کا سوگ ایک سال تک منایا جاتا۔ جو عورت بیوہ ہو جاتی اسے ایک سال کی عدت گزارنا ہوتی اور اسے نہایت منحوس سمجھا جاتا۔ ایک سال تک غسل اور منہ ہاتھ دھونے کو اسے پانی نہ دیا جاتا نہ کپڑے دیئے جاتے۔ یہاں تک کہ اس کے جسم میں سمیت پیدا ہو جاتی۔ جب عدت پوری ہو جاتی۔ اس کی جھولی میں اونٹ کی مینگنیاں بھر کر شہر میں گشت کرایا جاتا اور جہاں کچھ مرد عورتیں نظر آتیں، یہ عورت ان پہ مینگنیاں مٹھی بھر بھر کر مارتی تاکہ لوگ جان لیں کہ آج اس کی عدت پوری ہوئی ہے۔ جہاں اہلِ عرب میں عدت کا اتنا سخت اور ظالمانہ رواج تھا، وہاں یہ بھی تھا کہ حسین عورتوں کو اس کی حاجت ہی نہ پڑتی۔ مرنے والے کا ترکہ بانٹنے والے اس کو بھی مال متروکہ سمجھ کر حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ بسا اوقات اس کے حصول کی خاطر تلواریں چلا کرتیں اور خاندان کے خاندان تباہ ہو جاتے۔ جب بارش نہ ہوتی اور اس کی سخت ضرورت ہوتی تو یہ ظالم ایک گائے کی دم میں سوکھی گھاس کا گٹھا باندھ کر آگ لگا کر جنگل میں چھوڑ دیتے۔ وہ بیچاری آگ سے بچنے کے لیے جتنا بھاگتی، ہوا سے آگ اور بھڑکتی، تو وہ ربِ کریم اپنی رحمت کی بارش سے اس کی آگ بجھا دیتا۔

حشرات الارض، یعنی سانپ، بچھو، چھچھوندر، چوہے، چھپکلی اور کھنکھجورا وغیرہ تک کھا جاتے۔ یتیموں کا مال کھانا غریبوں اور کمزوروں کو ستانا وغیرہ وغیرہ۔ جہاں اہلِ عرب میں یہ خامیاں تھیں، وہاں بعض خوبیوں کے بھی مالک تھے یعنی وعدہ کے پکے اور عہد پہ اٹل، مر جاتے مگر بات میں فرق نہ آنے دیتے۔ اہلِ عرب کی سی مہمان نوازی اگرچہ دشمن ہی

کیوں نہ ہو، تاریخ دنیا میں نہیں ملتی، اہلِ عرب کسی بنا پر گاہک کو قرض دینے سے انکار کر دیتے۔ مگر جب یہ معلوم ہو جاتا کہ اس کے یہاں کوئی مہمان آیا ہے، تو فوراً دے دیتے۔ چاہے اس قرض کے ملنے کی امید ہو یا نہ ہو۔

اہلِ عرب کی خوبیوں اور اچھائیوں کو ان کی بدکرداری، غلو و عیاشی نے اپنے دامن میں چھپا لیا تھا۔ بے شمار برائیوں میں یہ چند خوبیاں کچھ اس طرح روپوش ہو گئی تھیں، کہ کوئی ان خوبیوں کو خوبیاں نہیں کہہ سکتا تھا۔ نہ صرف یہ کہ دوسرے ان خوبیوں کو تسلیم کرتے، بلکہ اہلِ عرب بھی ان خوبیوں کو نیکی اور اچھا کام سمجھ کر نہیں کرتے تھے۔ ان کے نزدیک اچھائی اور برائی میں فرق نہ تھا۔ وہ ہر فعل عادتاً کرتے تھے یہی حال دنیا کے ہر حصے اور ہر قوم و ملت کا تھا۔ عیسائی حضرت عیسٰی علیہ السلام کی تعلیم کو فراموش کر چکے تھے اور بجائے نبی و رسول ماننے کے عیسٰی علیہ السلام کو خدا کا بیٹا ماننے لگے تھے، جب ان کے مذہب کا یہ حال تھا تو ان کی تہذیب اور ان کے معاشرے میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کی تعلیم کا کون سا جزو باقی رہ گیا تھا۔

ایسی حالت میں جب کہ دنیا گناہوں کی تاریکی میں روپوش ہو چکی تھی، وہ قومیں جو اپنے آپ کو ایک روشنی کا منارہ تصور کرتیں اور ہدایت کی شمعیں روشن کرنے کی مدعی تھیں، وہ سب کفر و شرک و گناہ کی تاریکیوں کا ایک جزو بن رہ گئی تھیں ضروری تھا کہ دنیا کی اصلاح کرنے کے لیے کوئی معلم، کوئی بین الاقوامی ریفارمر پیدا ہو۔ اس لیے خالقِ کائنات نے ایک ایسا عظیم مصلح جو کائنات عالم کو ایک ہی وقت میں ہدایت کر سکے، دنیا کے مرکزی مقام عرب میں پیدا فرمایا اس آفتابِ ہدایت کا اسم مبارک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ وہ آفتابِ ہدایت فاران کی چوٹیوں سے چمکا اور دنیا کے ہر حصہ کو اپنی نورانی شعاعوں سے منور کرنے لگا۔

بین الاقوامی رسول جب کسی کو بین الاقوامی ریفارمر یا رسول یا مصلح کہا جائے گا، تو یہ بھی دیکھنا ضروری ہوگا کہ اس ذات میں وہ تمام صفات، جو ایک مصلح کے لیے ضروری ہیں، موجود ہیں یا نہیں اس کے اخلاق بین الاقوامی ہیں یا نہیں۔ اس کی معاشرت ہمہ گیر ہے یا نہیں۔ اس کی خاندانی شرافت اس کی زندگی اس کا عمل، اس کا ہر قول و فعل، اس کی ہر خو و خصلت، اس کا کردار، اس کا کیرکٹر بین الاقوامی تسخیر و کشش رکھتا ہے یا نہیں۔

سوانح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

سلسلہ نسب بین الاقوامی شخصیت خصوصاً جو رہبر عالم ہونے کا مدعی ہو، اس کے لیے ضروری ہے۔ کہ وہ عالی خاندان ہو، شرافتِ نسبی اس کے خون میں شامل ہو۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب نامہ یہ ہے

محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرۃ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔

یہ سلسلہ عدنان کی ۴۰ پشتوں کے بعد حضرت اسمٰعیل ؑ بن حضرت ابراہیم ؑ سے جا کر ملتا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام

کی شرافت نسبی تمام اقوام و مذاہب میں مسلم ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد در اولاد، جن کا سلسلہ حضور سے آکر ملتا ہے، سب خدا پرست گزرے۔ رسول عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام آباؤ اجداد میں سے کسی کا دامن شرک سے ملوث نہ ہوا اور تمام اقوام میں ممتاز رہے رسول عالم صلی اللہ علیہ وسلم خود ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیل کی اولاد میں سے کنانہ کو برگزیدہ فرمایا۔ اور کنانہ میں سے قریش کو اور قریش میں سے بنی ہاشم کو اور بنی ہاشم سے مجھ کو برگزیدہ بنایا۔ اسی طرح ترمذی شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خلقت کو پیدا کیا، تو مجھ کو ان کے سب سے اچھے گروہ میں بنایا۔ پھر قبیلوں کو چنا، تو مجھ کو سب سے اچھے قبیلے میں بنایا۔ پھر گھروں کو چنا تو مجھ کو ان کے سب سے اچھے گھر میں بنایا۔ پس میں روح و ذات و اصل کے لحاظ سے ان سب سے اچھا ہوں۔ قصیٰ کے چار لڑکے تھے، عبدالدار، عبد مناف، عبد بن قصی، عبدالعزیٰ۔ قصی نے مرتے وقت حرم محترم اور اس کا انتظام عبدالدار کے سپرد کیا۔

حضرت ہاشم کی تولیت کعبہ

لیکن ہاشم نے جب یہ دیکھا کہ خاندان عبدالدار کعبہ کا احترام و انتظام صحیح نہیں کرتے تو ان سے کعبہ کی تولیت چھوڑ دینے کا مطالبہ کیا اور خود اس منصب پر فائض ہوئے کعبہ معظمہ کی زیارت کے لیے اس وقت بھی بڑی دور دور سے لوگ آتے تھے۔ اگرچہ کعبہ شریف میں بھی کچھ عرصہ سے بت پرستی شروع ہو گئی تھی اور اس کا بانی بنی خزاعۃ کا ایک فرد ربیعہ بن حارث تھا۔ یہ ملک شام گیا اور وہاں لوگوں کو بت کی پرستش کرتے دیکھا تو یہ بھی چند بت خرید لایا اور کعبہ شریف کے آس پاس نصب کر دیئے۔ جو لوگ کعبہ کے عقیدت مند تھے انہوں نے بتوں کی بھی پرستش شروع کر دی۔ ورنہ اس سے پہلے عرب بھر میں بت پرستی کا رواج نہ تھا ——— صرف حضرت ہاشم نے کبھی بتوں کی طرف توجہ نہ کی مگر کعبہ اور اس کے زائرین کی آپ کے دل میں عقیدت تھی۔ لہٰذا ذی الحجہ کی پہلی تاریخ کی صبح کو ہاشم نے کعبہ سے پشت لگا کر قریش سے یوں خطاب کیا۔

> "اے قریش کے گروہ! تم خدا کے گھر کے پڑوسی ہو۔ خدا نے بنی اسمٰعیل میں سے تم کو اس کی تولیت کا شرف بخشا ہے اور تم کو اس کے پڑوس کے لیے خاص کیا ہے خدا کے زائرین تمہارے پاس آرہے ہیں، جو اس کے گھر کی تعظیم کرتے ہیں۔ پس وہ خدا کے مہمان ہیں اور خدا کے مہمانوں کی میزبانی کا حق سب سے زیادہ تم پر ہے۔ اس لیے تم خدا کے مہمانوں اور اس کے گھر کے زائرین کا اکرام کرو۔"

غرض ہاشم نے اپنے فرائض کو نہایت خوبی سے انجام دیا۔ زائرین کعبہ کو نہایت فراخ دلی سے کھلاتے تھے پانی کی قلت تھی، زمزم شریف کو بھی بنی جرہم نے بند کر دیا تھا۔ اس کا اب کچھ نشان بھی باقی نہ رہا تھا (جس کا ذکر آئے گا) ہاشم

نے چمڑے کے حوض بنا کر ان میں پانی بھر کر منیٰ اور زمزم شریف کے قریب پانی کی سبیلیں لگوا دیں۔ عرب کے راستے بڑے مخدوش تھے، دن میں قافلے لوٹ لیے جاتے تھے۔ ہاشم نے قریش کی تجارت کو فروغ دینے کے لیے قیصر روم اور شاہ حبش سے خط و کتابت کر کے فرمان حاصل کیے اور مال تجارت کا ٹیکس معاف کرایا اور راستہ کے قبائل میں دورہ کر کے ان سے معاہدہ کیا۔ اب ان کا قافلہ تجارت بلاخوف و خطر جاڑوں میں یمن اور گرمیوں میں شام اور ایشیائے کوچک تک جاتا اور بڑا فائدہ حاصل کرتا۔

عبدالمطلب حضرت ہاشم ایک بار تجارت کی غرض سے ملک شام گئے۔ راستہ میں مدینہ میں قیام کیا وہاں خاندان بنی نجار کی ایک شریف النسب لڑکی سلمیٰ سے نکاح کیا اور کچھ روز کے بعد شام کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں علیل ہو گئے اور غزہ کے قریب انتقال ہو گیا۔ سلمیٰ حاملہ تھیں، ان سے ایک لڑکا پیدا ہوا، ان کا نام سلمیٰ نے شیبہ رکھا۔ شیبہ نے آٹھ سال تک مدینہ میں پرورش پائی۔ جب ہاشم کے بھائی مطلب کو معلوم ہوا، تو مدینہ گئے۔ بھاوج اور بھتیجہ کو مکہ چلنے کے لیے کہا۔ سلمیٰ تیار نہ ہوئیں۔ مگر بھتیجہ کو ساتھ کر دیا۔ مکہ والے حضرت شیبہ کو عبدالمطلب کہنے لگے اور آپ اسی نام سے مشہور ہو گئے۔

چاہ زمزم کی دوبارہ کھدائی ہاشم کے انتقال کے بعد باتفاق رائے مکہ کی سرداری اور کعبہ کی تولیت عبدالمطلب کو ملی۔ آپ نے خواب میں زمزم شریف کا صحیح مقام دیکھا اور اپنے بیٹے حارث کو لے کر کھودنا شروع کر دیا۔ اس وقت آپ کو معاونین کی قلت کا بہت احساس ہوا۔ آپ نے اپنی اولاد میں برکت کی دعا کی اور عہد کیا کہ اگر میرے سب بیٹے میرے سامنے جوان ہو گئے، تو ان میں سے ایک کو خدا کی راہ میں قربان کر دوں گا۔

ذبیح اللہ حضرت عبداللہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کی۔ ادھر تو زمزم شریف کی کھدائی مکمل ہو گئی اور اللہ تعالیٰ نے دس بیٹے عطا فرمائے اور سب کے سب آپ کے سامنے جوان ہو گئے۔ تو آپ سب کو لے کر کعبہ میں حاضر ہوئے اور سب کے نام پر قرعہ ڈالا۔ خدا کی قدرت کہ قرعہ حضرت عبداللہ کے نام کا نکلا۔ عبدالمطلب حضرت عبداللہ کو لے کر قربان گاہ کی طرف چلے۔ حضرت عبداللہ کی بہنیں جو ساتھ تھیں۔ رونے لگیں اور حضرت عبداللہ کو چھوڑ دینے کی التجا کرنے لگیں۔ عبدالمطلب نے مجبور ہو کر یہ کیا کہ دس اونٹوں پر حضرت عبداللہ کے نام کا قرعہ ڈالا۔ اس میں بھی حضرت عبداللہ کا نام نکلا۔ پھر دس اونٹوں کا اور اضافہ کیا۔ اس بار بھی حضرت عبداللہ کا نام نکلا۔ اس طرح سو اونٹ ہو گئے۔ تب اونٹوں پر قرعہ نکلا۔ عبدالمطلب نے سو اونٹ قربان کیے۔ اس لیے رسول عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمایا کرتے انا ابن الذبیحین (میں دو ذبیحوں کا بیٹا ہوں) یعنی حضرت اسمٰعیل اور حضرت عبداللہ۔

حضرت عبداللہ کی شادی جب عبدالمطلب اس قربانی سے فارغ ہوئے، تو حضرت عبداللہ کے نکاح کی فکر ہوئی حضرت عبداللہ کے حسن و جمال کا شہرہ عرب میں پہلے ہی سے تھا۔ اس واقعہ نے آپ کو اور بھی مشہور کر دیا۔ عرب کی عورتیں اور مرد آپ کے حسن و جمال کے دیدار سے اپنے چشم و دل کو مسرور اور غم کو دور کرتے بہت سی عورتیں آپ سے عقد کی خواہش مند تھیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے حضرت عبداللہ کو پردہ عفت و عصمت میں محفوظ رکھا۔ قبیلہ زہرہ میں وہب بن عبد مناف کی لخت جگر حضرت آمنہ خاتون سے آپ کا عقد ہوا۔ عرب کے دستور کے

مطابق حضرت عبداللہ تین دن اپنے سسرال میں رہے۔ اس کے بعد اپنے گھر چلے آئے۔

حضرت عبداللہ کا انتقال کچھ عرصے کے بعد حضرت عبداللہ ملک شام کی طرف تجارت کے لیے گئے۔ واپسی میں مدینہ منورہ میں اپنی ننھیال میں قیام فرمایا، وہیں بیمار ہو گئے۔ عبدالمطلب نے علالت کی خبر سن کر حارث کو بھیجا کہ عبداللہ کو لے آئیں۔ حارث کو وہاں پہنچ کر انتقال کی خبر ملی۔ واپس آئے۔ یہ خبر وحشت اثر سب کو سنائی۔ تمام اہلِ مکہ کو اس خبر سے رنج و ملال ہوا۔ حضرت آمنہؓ اس وقت حاملہ تھیں۔ حضرت عبداللہ نے ترکہ میں صرف پانچ اونٹ، چند بکریاں اور ایک کنیز ام ایمن کو چھوڑا۔

ولادت رسولِ عالمؐ چرخِ کہن نے چمنستانِ عالم میں ہزاروں پھول کھلتے دیکھے، ہزاروں کلیوں کو مسکراتے دیکھا۔ کبھی خزاں کے تند و تیز جھونکوں سے تر و تازہ اشجار کو جڑ سے اکھڑتے دیکھا۔ کبھی موسم بہار کی آمد آمد کے ڈنکے بجتے سُنے۔ کبھی بادِ صرصر کی صدائیں گونجیں، تو کبھی بادِ نسیم کی سحر کاریاں دیکھیں۔ جب کبھی تاریکی نے آنکھیں دکھائیں، ایک نور چمکا اور ان تاریکیوں کو روپوش ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ جب کفر و شرک کی گھنگھور گھٹائیں فضائے عالم پر مسلط ہوئیں، کوئی رسول نورِ ہدایت کا منارا بن کر آیا۔ حسبِ ضرورت قوم و ملت کوئی صاحب خلق اور معلم اخلاق بن کر آیا۔ تو کوئی رعب و ہیبتِ حق سے متصف ہو کر جلوہ افروز ہوا۔ کوئی میدانِ شجاعت میں سربلند، تو کوئی صبر و توکل کا درس دینے والا، کوئی تختِ شاہی پر تاج و دستار سجائے نظر آیا تو کوئی زہد و قناعت کے فرش پر جلوہ گر دیکھا گیا۔ کسی کے حسن و جمال کا شہرہ ہوا تو کسی کی خوش کلامی اور فصاحت و بلاغت کے خطبے پڑھے گئے۔ مگر چرخِ کہن کی آنکھیں مضطرب، شمس و قمر، رات دن گردش میں مصروف کسی اور ہی نبیٔ باکمال کی منتظر تھیں۔ جس میں یہ تمام خصوصیات بدرجہ اتم و اکمل و اعلیٰ موجود ہوں اور کوئی ایسی صفت باقی نہ رہ جائے جو انبیاء و مرسلین میں اس سے پیشتر پائی گئی ہو۔ جب یہ گردش کرتے کرتے تھکنے ہی والے تھے، کہ ان کی مراد بر آنے کا وقت آ گیا

ازل کے روز جس کی دھوم تھی، وہ آج کی شب تھی
جو قسمت کے لیے مقسوم تھی، وہ آج کی شب تھی

ادھر سطح فلک پر نیلگوں چادر جس میں ہزاروں روشن ستارے ٹانکے گئے ہیں، ان آبدار موتیوں کی جھالر شامیانۂ آسمان میں بڑی دلکش معلوم ہو رہی ہے۔ ادھر فرش زمین جس پر چاند کی چاندنی بڑی صفائی سے بچھائی گئی ہے۔ دریاؤں کی روانی، نسیم صبح مست و سہانی کچھ عجیب سماں پیدا کر رہی ہے۔

نہا کے نہروں نے وہ چمکتا لباس آبِ رواں کا پہنا
کہ موجیں چھڑیاں تھیں دھار لچکا حبابِ تاباں کے تھل ٹکے تھے
پہاڑیوں کا وہ حسن تزئین، وہ اونچی چوٹی وہ ناز و تمکین
صبا سے سبزے میں لہریں آتیں دوپٹے دھانی چنے ہوئے تھے

غرض آسمان و زمین کو دلکش آرائشوں سے سجایا گیا ہے۔ یا بالفاظِ دیگر کائنات کو دلہن بنایا گیا ہے۔

ادھر سطح فلک پر چاند تارے رقص کرتے تھے
ادھر روئے زمین پر نقش بنتے تھے سنورتے تھے
سمندر موتیوں کو دامنوں میں بھر کے بیٹھے تھے
جبل لعل و جواہر کو مہیا کر کے بیٹھے تھے
زمرد وادیوں میں سبزہ بن کر ہر طرف بکھرا
ہوئی بارانِ رحمت ہر شجر کا رنگِ رُخ نکھرا
ہوائیں پے بہ پے اک سرمدی پیغام لاتی تھیں
کوئی مژدہ تھا جو ہر گوشِ گل میں کہہ سناتی تھیں

نسیم بہار چلی، شاخ شاخ سے گلے ملی۔ گل فرطِ مسرت سے پھولے نہ سمائے۔ کلیوں کی چٹک سے صلوٰۃ اللہ وسلام علیک کی آواز آئی۔ فاختہ صدائے کو کو چھوڑ کر منتظر تھا۔ بلبل ناشاد کے دن پھرے جب آسمان اور اس کے بسنے والے زمین اور اس میں رہنے والے، آسمان کے چاند ستارے چمنستان ارض کے سب نظارے رسول عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے استقبالی پروگرام کے تحت بن سنور گئے، تو:

بجائی بڑھ کے اسرافیل نے پر کیف شہنائی
ہوئی فوجِ ملائک جمع زیرِ چرخِ مینائی
ندا آئی دریچے کھول دو ایوانِ قدرت کے
نظارے خود کرے گی آج قدرت شانِ قدرت کے

سردار ملائک سدرہ سے چلے، ابلیس لعین کے فتنے ٹلے۔ قدوسیوں نے مبارک باد دی، ابلیسوں نے فریاد و بکا کی۔ روح الامین نے بامِ کعبہ پر ایک علم سبز نصب کیا۔ حورانِ بہشت نے حضرت آمنہؓ کو اپنی آغوش میں لیا۔ اور ایک جامِ سرد و شیریں پینے کو دیا اور بصد ادب یوں عرض کیا۔

اظہر یا سید المرسلین	اے انبیاء کے سردار تشریف لائیے
اظہر یا رحمۃ للعٰلمین	اے عالمین کے لیے رحمت جلوہ فرمایئے
اظہر یا خاتم النبیین	اے انبیاء کے ختم فرمانے والے بے نقاب ہو جایئے۔
اظہر یا رسول رب العٰلمین	اے رسول رب العٰلمین تشریف لایئے۔

فظہر محمد رسول اللہ کالبدر المنیر

پس بصد ہزار عز و شان ۱۲ ربیع الاول مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء کو احمد مجتبےٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم رونق افروز ہوئے۔ جبل و اشجار نے کھڑے ہو کر تعظیم دی۔ محراب کعبہ نے سر جھکا کر تسلیم کی۔ حطیم نے

بڑھ کر اپنی آغوش میں لیا۔ ابر رحمت نے سایہ کیا۔ بوندیاں شوق دیدار میں درود پڑھتی اتریں۔ بجلیوں نے سورہ نور وردِ زبان کی۔ وحوش و طیور نے ایک دوسرے کو بشارت دی۔ ملائکہ نے اہل زمین کو مبارک دی پیش کی۔ گھر گھر شادی کی رسوم ہر طرف مبارکباد کی دھوم، در و دیوار سے صلاۃ و سلام کی صدائیں بلند ہوئیں۔

اے مدینے کے تاجدار سلام — اے غریبوں کے غمگسار سلام
تیری اک اک ادا پہ اے پیارے — سو درودیں فدا ہزار سلام
رب سلم کے کہنے والے پہ — جان کے ساتھ ہوں نثار سلام
میری بگڑی بنانے والے پر — بھیج اے میرے کردگار سلام
اس جواب سلام کے صدقے — تا قیامت ہوں بیشمار سلام

عرض کرتا ہے یہ حسن تیرا
تجھ پہ اے خلد کی بہار سلام

ولادت اور چند خصوصیات

وقت ولادت حضرت آمنہؓ اپنے شوہر مرحوم حضرت عبداللہ کے مکان پر رونق افروز تھیں۔

۱۔ حمل کا اظہار کسی پر نہ ہوا۔ غیر تو غیر خود حضرت آمنہ خاتونؓ کو بھی محسوس نہ ہوا۔ آپ نے بشارت جلیلہ سے جانا کہ میں حاملہ ہوں (سیرت جلیلہ) اس طرح ان کے رب نے حیا والے رسولؐ کی والدہ ماجدہ کی پردۂ رحمت سے پردہ پوشی فرمائی۔

۲۔ آپ وقت ولادت بالکل تنہا تھیں۔ گھر میں کوئی نہ تھا۔ آپ کی خواہش تھی کہ اس وقت عبد مناف کی بیٹیاں ہوتیں تو اچھا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی مدد کے لیے اہل جنت اور حوران بہشت کو بھیجا (جلال الدین جوزی بیان میلاد نبوی) اس رب کریم نے اپنے محبوب کی والدہ ماجدہ کو کسی عورت کے سامنے بھی بے ستر نہ ہونے دیا۔

۳۔ حضورؐ ناف بریدہ اور ختنہ شدہ اور معطر و مطہر پیدا ہوئے۔ (سیرت جلیلہ) یہ اس لیے کہ حیا والے رسولؐ کو کوئی بے ستر نہ دیکھے۔

۴۔ بعد ولادت ایک فرشتہ آیا اور آب رحمت ساتھ لایا پھر تین بار غسل دیا اور پارہ حریر سے ایک مہر کہ شکل میں مثل بیضہ کے چمک میں مانند زہرہ کے تھی، نکال کر دونوں شانوں کے درمیان ثبت کی (دلائل النبوۃ ابونعیم) اگر دایہ غسل دیتیں، تو حضور کا بے ستر ہونا یقینی تھا۔ اس لیے فرشتے نے غسل کرایا۔

۵۔ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں جب حضور پیدا ہوئے میں نے دیکھا حضورؐ سجدے میں ہیں۔ پھر ایک سفید ابر نے آکر حضورؐ کو ڈھانپ لیا۔ جب پردہ ہٹا تو میں نے دیکھا کہ حضور ایک سفید اونی کپڑے میں لپیٹے ہوئے ہیں اور سبز ریشمین بچھونا بچھا ہے اور گوہر شاداب کی تین کنجیاں حضورؐ کی مٹھی میں ہیں اور ایک کہنے والا کہہ رہا ہے کہ نصرت کی کنجیاں، نبوت کی کنجیاں فتح کی کنجیاں سب پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے قبضہ فرمالیا۔

حضورؐ کے اسماءِ مبارک حضرت آمنہؓ نے فرشتوں سے سُن کر حضورؐ کا اسمِ مُبارک احمد رکھا اور کتب سالبقہ میں بھی احمد ہی لکھا ہے ۔ مگر حضرت عبدالمطلب نے حضورؐ کی ولادت کے تیسرے دن خوشی میں قریش کی دعوت کی اور سب کو حضورؐ کا دیدار کرایا ۔ بعدۂ عرب کی رسم کے مطابق اسی مجلس میں حضور کا نام مُحمّد صلی اللہ علیہ وسلم رکھا قرآن مجید میں بھی حضورؐ کا ذاتی اسم گرامی مُحمّد ہے صلی اللہ علیہ وسلم ۔ علاوہ ان ذاتی اسماء کے صفاتی نام بکثرت ہیں ۔ امام اہلِ سُنت اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ علامہ احمد خطیب قسطلانی ؒ نے پانچسو نام جمع فرمائے ۔ سیرت شامی میں تین سو اور اضافہ کیے اور ہیں (اعلیٰ حضرت) نے چھ سو اور ملائے ۔ کل چودہ سو ہوئے (الملفوظ اول)

کثرتِ اسماء کا سبب یہ ہے کہ حضور کے اسمائے گرامی ہر طبقہ میں مختلف ہیں اور ہر جنس میں جداگانہ ہیں ۔ آسمانوں میں اور نام ہیں اور زمین میں اور نام ۔ ملائکہ میں اور ہیں ، جنات میں اور ، بہشتیوں میں اور نام ہیں ، انسانوں میں اور ، دریاؤں میں اور نام ہیں ، پہاڑوں میں اور ۔

ایامِ رضاعت حضرت آمنہؓ نے دو یا تین دن اپنا دودھ پلایا ۔ اس کے بعد ثویبہ ، جو ابولہب کی کنیز تھیں ، اس دولت سے مشرف ہوئیں ۔ ابولہب حضورؐ کا سوتیلا چچا تھا ۔ ثویبہ نے جاکر ابولہب سے کہا کہ تجھے مبارک ہو کہ تیرے بھتیجے محمدؐ پیدا ہوئے (صلی اللہ علیہ وسلم) ابولہب خوش ہوا اور انگلی سے اشارہ کر کے کہا : اے لونڈی ! میں تجھے اس خوشی میں آزاد کرتا ہوں ۔ جا تو اس مولود کو دودھ پلا ۔ ثویبہ حضرت آمنہؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرتی ہے مبارک ہو سیدہ زہرہؓ کہ محمدؐ کے قدم بابرکت ہیں ۔ ان کے دنیا میں آتے ہی غلام اور کنیزیں آزاد ہونے لگیں ۔

میلاد کی خوشی منانے والا ابولہب جب حضور نے اعلانِ نبوت فرمایا اور دنیا کو بھلائی کی طرف بلایا ، تو ابولہب حضورؐ کا جانی دشمن بن گیا ۔ یہ اور اس کی بیوی نے حضورؐ کو بہت دکھ پہنچائے ۔ اس کی مذمت میں قرآن مجید کی ایک سورۃ نازل ہوئی ۔ (سورۃ لہب پ ۳۰) ابولہب کی موت کے ایک سال بعد حضرت عباس نے اس کو خواب میں دیکھا ، تو پوچھا : اے دشمنِ رسول ! تیرا کیا حال ہے اس نے جواب دیا لم الق بعدکم غیر انی سقیت فی ھٰذہٖ بعتاقتی ثویبۃ ۔ تمہارے بعد مجھے کچھ بھی آرام نہ ملا ، سوائے اس کے کہ ثویبہ کو آزاد کرنے کے سبب سے بمقدار اس کے دو بیچ کی انگلی اور کلمہ کی انگلی کے درمیان گھائی ہے سے پانی مل جاتا ہے ، جسے میں پی لیتا ہوں اور سکون پاتا ہوں ۔

یہ حدیث عروہ بن زبیر سے مرقوم ہے ۔ مقامِ غیرت ہے کہ ایک کافر اکفر ، منکر توحید و رسالت حبیب پیدائش محبوب کی خوشی میں جس انگشت سے اشارہ کر کے ایک لونڈی کو آزاد کر دے ، تو ہر روز دو شنبہ کو اسی انگشت سے پانی جاری ہو ۔ جس کو پی کر ابولہب اس دن آرام و سکون سے رہے اور عذاب قبر سے محفوظ رہے ، تو جو صاحب ایمان والیقان اس رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے میلاد مبارک کی خوشی ہر سال منائے ، تو کیا اس پر سے عذاب حشر و قبر نہ اٹھ جائے گا اور جو اس خوشی کو مناتا ہوا دنیا سے جائے گا تو اس کے رونگٹے رونگٹے سے رحمت کے فوارے نہ پھوٹ نکلیں گے ۔

وباللہ التوفیق وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

حضورؐ کی ولادت کا ماہ مبارک ربیع الاول تھا، خدا کی قدرت کہ یہ موسم بھی ربیع (یعنی بہار) کا تھا۔ قریش کا دستور تھا کہ وہ اپنے بچے کسی بدوی خاندان میں ایام رضاعت گزارنے بھیج دیا کرتے تھے۔ ان کے خیال میں جو بچے اس طرح پرورش پاتے تھے، تو وہ جوان ہو کر شجاعت و بہادری میں یکتا ہوتے۔ اور عربی زبان، عربی لہجہ اور فصاحت و بلاغت میں بھی ماہر ہوتے تھے۔ یہ رسم قریش میں ایسی رائج ہوئی کہ اب ہر سال موسم ربیع میں طائف کی دایہ عورتیں خود آتیں اور شیر خوار بچوں کو اپنے ساتھ لے جا کر پرورش کرتیں، چنانچہ اس سال بھی قبیلہ بنی سعد سے دس عورتوں پر مشتمل ایک قافلہ طائف سے چلا۔ **حلیمہ سعدیہؓ** بھی اپنی لاغر اونٹنی پر خالق کائنات کے سہارے قافلے کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئیں۔ باد خزاں کے تیز جھونکے درختوں کی پتی پتی کو مرجھا کر گرا سکتے تھے۔ مگر حلیمہ کی خوش آئند زندگی اور رشاندار مستقبل پر اثر انداز ہونا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ مایوس و بیمار حلیمہ چلی جا رہی تھیں مگر قسمت نازاں تھی کہ حلیمہ اس گوہر بیش بہا کو حاصل کرنے جا رہی ہے، جو آگے جانے والوں کو نہیں مل سکتا۔ وادی مکہ میں قافلہ اترا دایہ عورتیں اپنے نونہالوں کو شوہروں کی آغوش میں دے کر زردار دوں کی تجوریوں کی طرف لپکیں اور امیروں کے بچوں کو حاصل کر لیا۔ مگر حلیمہ شہنشاہ حقیقی کے دربار میں حاضر ہوئی اور سنگ اسود کو بوسہ دے کر عرض کی۔ اے خالق و مالک! سب اپنی آرزوئیں کے کر امیروں دولت مندوں کے دربار میں گئیں اور اپنی آرزوؤں کے پھل حاصل کر لائیں اور میں تیرے حضور حاضر ہوئی ہوں، بلکہ اپنی خواہش کو تیرے حضور لائی ہوں تو دانائے غیوب ہے رحیم و کریم ہے تو اپنی رحمت سے میرے دامن مراد کو بھر دے۔

ادھر عرض کی ادھر قبول ہوئی۔ حضرت عبدالمطلب آتے ہیں اور حلیمہ سے فرماتے ہیں۔ اے حلیمہ! تیرا گوہر مراد میرے پاس ہے۔ حلیمہ خوشی سے جامہ میں پھولی نہیں سمائی۔ جب دولت کدہ آمنہؓ پر پہنچی، تو حضرت آمنہؓ نے اس در یتیم کو جس کے حضور قبولیت خود مرادیں مانگنے آئے، حلیمہ کی آغوش میں دے دیا۔ حلیمہ نے رخ انور سے چلمن ہٹائی، سرکار نے مسکرا کر چشم حق بین کھولیں۔ ایک نور آسمان کی جانب بلند ہوتا نظر آیا، حلیمہ کی نظر جب اس منبع نور پر پڑتی ہے، ساری کلفتیں راحت سے بدل جاتی ہیں۔

> جس کے جلوے سے مرجھائی کلیاں کھلیں
> اس کف پا کی حرمت پہ لاکھوں سلام

حلیمہ اپنی متاع جاں نچھاور کرنے کو تیار ہو جاتی ہیں۔ نصیبہ جاگ اٹھتا ہے۔ قسمت رقص کرتی ہے۔ خشک چھاتیاں دودھ کی نہریں بن کر بہہ نکلتی ہیں۔ آپ پہلے سیدھی چھاتی سے دودھ پلاتی ہیں سرکار شرف قبولیت سے نوازتے ہیں جب بائیں چھاتی منہ میں دیتی ہیں، سرکار بنظر انصاف منہ پھیر لیتے ہیں۔ جب کئی بار ایسا ہوا تو حلیمہ حیران و پریشان ہوئیں کہ سب بچے دونوں چھاتیوں سے دودھ پیتے ہیں۔ یہ دوسری کو منہ کیوں نہیں لگاتے۔ غیب سے ندا آتی ہے کہ اے حلیمہ! پریشان نہ ہو۔ ہمارے محبوب منصف مزاج ہیں۔ داہنا اپنے لیے پسند فرمایا اور بایاں تمہارے لڑکے کے لیے چھوڑ دیا ہے یہ بشارت سن کر حلیمہ بڑی مسرور و شاداں ہوئیں۔

بھائیوں کے لیے ترک پستان کریں

دودھ پیتوں کی نصفت پہ لاکھوں سلام

پھر باجازت اس سرمایۂ خیر و برکت کو لے کر قافلہ کی طرف چلیں۔ اس وقت حلیمہ کی قسمت حالت وجد میں اس طرح پکار اٹھتی ہے

رہے محروم اس دولت سے دولت ڈھونڈنے والے

سبھی کچھ پا گئے دامانِ رحمت ڈھونڈنے والے!!

حلیمہ کے شوہر کبھی یاس بھری نظریں آسمان کی طرف اٹھاتے تھے۔ اور کبھی مایوس نگاہوں سے راہ مکہ کو تکتے تھے کہ حلیمہ رحمتِ عالم کو آغوش میں لیے جا پہنچیں اور کتاب نور کی زیارت کرائی۔ دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے۔ گویا چشم تمنا گویا تھی کہ

اتنی مدت تک ہو دید مصحف عارض نصیب

حفظ کر لوں ناظرہ پڑھ پڑھ کے قرآن جمال

واپسی کے روز ہدیہ تشکر پیش کرنے درگاہ ایزدی میں حاضر ہو کر طواف کعبہ کر کے قافلہ کے ساتھ چل دیتی ہیں۔ حلیمہ کی وہ کمزور و لاغر اونٹنی ہے جس سے کل شام تک قدم اٹھانا دشوار تھا۔ آج وہ کچھ ایسی سبک رفتار ہو گئی ہے کہ خود حلیمہ حیران ہے حلیمہ کے شوہر جو اونٹنی کے لاغری کے خیال سے پاپیادہ چل رہے تھے، اسے تازہ دم اور تندرست و توانا دیکھ کر خود بھی اس پر سوار ہو گئے۔ ایک سراپا معجزہ ذات شریف کی سواری میں آنے کے بعد یہ اونٹنی سراپا کرامت بن گئی تھی جس مقام پر اس کا قدم پڑتا، اس جگہ ہری ہری گھاس اگ آتی۔ کچھ ہی دیر میں سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری سارے قافلے کے آگے نظر آنے لگی، جس کے برابر سے گزرتی۔ قافلہ والے حیرت سے حلیمہ کو مخاطب کرتے کہ اے حلیمہ! ذرا لگام تھام۔ یہ صبا رفتار اونٹنی تجھے کہاں سے ہاتھ لگی؟ کل تک تو تجھے رستہ چلنا دشوار تھا، آج یہ کیا ماجرا ہے۔ حلیمہ بھلا کیا جواب دیتیں۔ انہیں کیا خبر کہ آج کون ذات شریف ان کی آغوش میں ہیں۔ اس اونٹنی نے بزبان فصیح کہا۔ اے بنی سعد کی عورتو! تمہیں خبر نہیں کہ آج مجھ پہ وہ شخص سوار ہے، جو خدا کا پیارا اور پیغمبروں کا سردار ہے صلی اللہ علیہ وسلم۔ راہ میں بکریاں چرتی تھیں۔ بولیں اے حلیمہ! تو اس کو جانتی ہے، یہ مالک زمین و آسمان کا پیغمبر اور اولادِ آدم کا سردار اور سب جن وانس سے بہتر ہے صلی اللہ علیہ وسلم (سرور القلوب)

ابھی قافلہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ شوق زیارت میں سورج نکل آیا۔ جیسے ہی سورج کی کرنیں اس قافلہ کی طرف متوجہ ہوئیں، ایک ابر کا ٹکڑا دوڑ کر آیا اور سرکارؐ کے ساتھ حضرت حلیمہ اور ان کے شوہر کو بھی اپنے سائے میں لے کر ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

جب سورج نصف النہار پر آیا، ایک پڑاؤ پہ قافلہ ٹھہر گیا۔ حلیمہ نے کچھ ستو اور کچھ کھجوریں نکالیں اس کے بعد اونٹنی کا دودھ دوہنے بیٹھیں، تو حیران رہ گئیں اور شوہر کو مخاطب کر کے بولیں آج سے پہلے کبھی اس اونٹنی نے نصف برتن سے زیادہ دودھ نہ دیا تھا آج پورا برتن بھر گیا۔ لانا دوسرا برتن تو دینا۔ قدرت خدا کہ دوسرا برتن

بھی بھر گیا، مگر اونٹنی کے تھن اسی طرح بھرے ہوئے نظر آرہے تھے، تو سخی حلیمہ نے قافلہ میں گشت کیا اور جسے حاجت مند دیکھا، اس کا برتن لے آتیں۔ دودھ بھر کر دے آتیں۔ قافلہ کے بیشتر افراد کا صرف حلیمہ کی اونٹنی کے دودھ پر وقت گزرنے لگا۔

مکہ کا چاند اور حلیمہ کا گھر یہ مبارک قافلہ پڑاؤ سے چلا۔ راہ میں طرح طرح کے عجائبات و غرائبات ظاہر ہوتے جدھر سے گزر ہوتا سنگ و شجر سلام علیک کرتے۔ جو بکریوں کا گلہ ادھر سے گزرتا، حضورؐ کو سجدہ کرتا اور سلام علیک کرتا۔ یہاں تک کہ یہ قافلہ اپنی منزلِ مقصود پر پہنچا۔ شب کا وقت تھا۔ حلیمہ نے چاہا کہ چراغ روشن کریں مگر گھر میں اس وقت تیل نہ نکلا۔ غریب حلیمہ خود تو اندھیرے کی عادی تھیں مگر فکر تو حضورؐ کی تھی خیال گزرا کہ کہیں تاریکی سے ڈر نہ جائیں۔ حلیمہ نے بستر کیا اور حضورؐ کو لے کر لیٹ گئیں، جیسے ہی چہرہ مبارک سے کپڑا ہٹا، سارا گھر نور سے معمور ہو گیا۔ پھر تو حلیمہ کو اپنے گھر چراغ روشن کرنے کی ضرورت نہ پیش آئی۔ جب آفتاب آسمانی اپنا منہ چھپاتا، ماہ مدینہ اپنے نور سے سارے گھر کو منور کر دیتا۔ ایک ہمسایہ نے دریافت کیا۔ اے حلیمہ! کیا تیرے گھر رات بھر آگ جلتی ہے یا چراغ۔ جب میری آنکھ کھلتی ہے تیرے گھر کو روشن پاتی ہوں۔ آپ نے جواب دیا کہ تو نے آگ اور چراغ میں ایسی روشنی دیکھی ہے جیسی میرے گھر میں ہوتی ہے۔ خدا کی قسم یہ پیاری روشنی آمنہ کے لال کے چاند سے چہرے کی ہے جس سے میرا گھر بقعہ نور بنا رہتا ہے۔ جب صبح ہوتی حلیمہ اور ان کے بچے حضورؐ کے جاگنے کے منتظر رہتے حضورؐ کبھی نہ سوتے، صرف آنکھ سوتی تھی۔ واللہ اگر حضورؐ سو جاتے، تو کائناتِ عالم سو جاتی پھر کبھی اس کی صبح نہ ہوتی۔ حلیمہ کی عادت تھی کہ جب تک حضورؐ جاگ نہ جاتے اور اپنی مسکراہٹ سے اجازت نہ دیتے وہ کسی کام کو ہاتھ نہ لگاتیں۔ کبھی دیر تک حضورؐ آرام فرماتے، تو حلیمہ جگانے کی کوشش نہ کرتیں۔ خود جاگ جانے کی منتظر رہتیں اور جب ان چشمانِ حق بین کی کیفیات اور دلنواز مسکراہٹوں سے محظوظ ہونا چاہتیں، تو اس طرح گنگنایا کرتیں۔

مرے لاڈلے دلربا جاگو جاگو — محمدؐ رسولِ خدا جاگو جاگو
ذرا آنکھ کھولو تو لے لوں بلائیں — کروں جان تم پر فدا جاگو جاگو
سُنا میں نے مرغِ سحر کی اذاں سے — نکلتا ہے صلِ علیٰ جاگو جاگو
بکھیرے ہیں سبزے نے شبنم کے موتی — ہے اٹکھیلیوں پر صبا جاگو جاگو
کیا کرتے ہو خواب میں کس سے باتیں — مخاطب ہے کیا کبریا جاگو جاگو
نکل آیا شوقِ زیارت میں سورج — ہوئی صبح اے مصطفیٰ جاگو جاگو
پیو دودھ دایہ کی گودی میں بیٹھو — اٹھو میرے مشکل کشا جاگو جاگو
ہٹا ہے جو یہ روئے روشن سے پردہ — چمکتا ہے نورِ خدا جاگو جاگو

حلیمہ کے گھر خیر و برکت کی بارش حضورؐ چشمانِ حق بین کھول دیتے ہیں اور دلنواز مسکراہٹ سے حلیمہ کا دل موہ

لیتے ہیں حلیمہ کی بیٹیاں، انیسہ، حذیفہ، شیما، جو حضورؐ کے جاگنے کی منتظر تھیں، بلائیں لینے لگتی ہیں۔

جس طرف اٹھ گئی دم میں دم آ گیا
اس نگاہِ عنایت پہ لاکھوں سلام

حلیمہ نے حضور کا چہرہ انور اور دست و پا دھوئے۔ مگر پانی کو زمین پر نہیں گرنے دیا بلکہ وہ پانی ایک برتن میں محفوظ کر کے اپنی بکریوں کو پلا دیا۔ حلیمہ کی بکریاں قحط سالی کی وجہ سے نہایت لاغر و کمزور تھیں، مگر وہ پانی پی کر تندرست ہو گئیں اب تو ان کا یہ حال ہوا کہ جہاں قدم رکھتیں، ہری ہری گھاس اگ آتی۔ اسے کھا کر اپنا پیٹ بھر لیتیں۔ جن سے بیٹھ کر اٹھا نہیں جاتا تھا، جن کے تھن سوکھے پڑے تھے، ان کے دودھ میں وہ برکت ہوئی، کہ ایک دن کا دودھ سات دن کفایت کرتا یا تو حلیمہ فاقہ کرتی تھیں یا رحمت عالم کے قدوم مبارک کی برکت کہ اب ان کے دروازے پر اکثر فقیر پڑے رہتے اور ان کی بکریوں کے دودھ سے سیراب ہوتے۔ مواہب لدنیہ اور سیرت ابن ہشام میں ہے کہ قبیلہ کی عورتیں اپنے مردوں سے کہتیں کہ تم اپنی بکریاں اسی جنگل میں کیوں نہیں چراتے، جہاں حلیمہ کی بکریاں چرتی ہیں۔ دیکھو تو اس کی بکریاں کیسی شیر دار اور طاقت ور ہو رہی ہیں اور ہماری بکریاں سوکھتی چلی جا رہی ہیں۔ وہ جواب دیتے کہ حلیمہ پر اس دُرِ یتیم کے قدوم کی برکت ہے، اس کی بکریاں بھی اسی جگہ چرتی ہیں، جہاں ہماری۔ سارے جنگل خشک سالی کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں مگر اس کی بکریاں جہاں قدم رکھتی ہیں، گھاس اگ آتی ہے (سرور العباد)

ایک دن تمام قبیلہ کی عورتیں جمع ہو کر حاضر ہوئیں۔ حضورؐ کی پیشانی اور قدوم مبارک کو بوسہ دے کر بولیں۔ اے حلیمہ! ہم بدقسمت تھے، جو تجھ سے پہلے مکہ پہنچے اور اس دولت عظیمہ سے محروم رہے۔ خدا نے اس بابرکت ذات شریف کی خدمت تیرے ذمہ رکھی تھی۔ اے حلیمہ! اگرچہ یہ ہماری آغوش میں نہیں مگر ہمارے قبیلہ میں تو ہیں۔ ان کی رحمت سے یہ تو بعید ہے کہ ایک گھر کو مستفیض فرمائیں، باقی محروم رہیں۔ اے حلیمہ! ان گھنگھریالے گیسوؤں کا صدقہ ہمیں بھی عطا ہو۔ ان نیم وا چشم رحمت کی بھیک ہم بھی چاہتے ہیں۔ ان کے دست و پا کا غسالہ ہمیں بھی مل جائے۔ حلیمہ نے اجازت طلب نظروں سے حضورؐ کے رُخ انور کی طرف دیکھا۔ حضورؐ مسکرا دیئے۔ یہ گویا اجازت تھی۔ فوراً دست و پا دھو کر تھوڑا تھوڑا پانی بطور تبرک سب کو دے دیا۔ وہ پانی جو بیمار پیتا شفا پاتا، اور جو جانور پیتے تندرست اور شیر دار ہو جاتے، حلیمہ کی بکریاں کچھ عرصہ میں سات سے سات سو ہو گئیں اور ایک دن کا دودھ ۴۰ دن تک کفایت کرتا۔

(سرور القلوب)

مُفت کا دار الشفا حلیمہ کا گھر شفا خانہ بنا ہوا تھا۔ بستی اور قبیلہ میں جو بیمار ہوتا، حضورؐ کے قدموں پر ڈالتے ہی شفایاب ہوتا۔ جو جوان اور بوڑھے بیمار پڑتے، حلیمہ کی منت و سماجت کرتے۔ حضرت حلیمہ حضورؐ کا دستِ شفا ان کے سر پر رکھ دیتیں، فوراً اچھے ہو جاتے۔ جس کی وجہ سے دور دور تک شہرت ہو گئی کہ حلیمہ کے

یہاں قریش کا ایک ایسا بچہ آیا ہے، جو بچپن ہی میں منصف مزاج ہے جس نے اپنے رضاعی بھائی عبداللہ کی حق تلفی نہیں کی بلکہ داہنی چھاتی اپنے لیے اور بائیں برادرِ رضاعی کے لیے چھوڑ دی جس کے دست و پا کا غسالہ شفا بخش اور باعث خیر و برکت ہے وہ جس پہ دستِ کرم رکھ دیتا ہے، وہ مہلک امراض سے شفا پاتا ہے۔

دُرِ یتیم گہوارے میں جھولا، پالنا، ہنڈولا، جسے عربی میں مہد اور فارسی میں گہوارہ کہتے ہیں، رحمت عالم کے لیے بھی حلیمہ نے پالنا بنایا جس میں حضورؐ آرام فرماتے۔ حلیمہ فرماتی ہیں کہ میں جب حضورؐ کو گہوارے میں لٹا دیتی، تو مجھے ہلانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ وہ کسی کے ہلانے کا محتاج نہ تھا۔ تاریخ الخمیس میں ہے کہ فرشتے حضورؐ کا جھولا ہلاتے رہتے تھے۔

نورِ خدا کا نوری کھلونا فطرتاً بچوں کو کھلونوں سے لگاؤ ہوتا ہے شفقتِ مادری، پدری بہتر سے بہتر کھلونے لانے پہ مجبور کر دیتی ہے۔ مگر رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ماجد ولادت سے پہلے اس دارِ فانی سے رخصت ہو چکے تھے۔ دادا جان کی محبت اور والدہ ماجدہ کی قربت سے دور کاشانۂ حلیمہ میں رونق افروز ہیں غریب حلیمہ کسی لائق نہیں، جو شایانِ شان کھلونے حاصل کر سکیں۔ ان کا طالب، ان کا محب، ان کے خالق و مالک نے ہی خود اپنے محبوب و مطلوب کے لیے ان کی شایانِ شان کھلونا مہیا فرما دیا۔ جس کو عربی میں قمر اور فارسی میں ماہ، اردو میں چاند، ہندی میں چندرماں کہتے ہیں۔ اس نورِ لم یزل کے نورانی کھلونے تو دیکھیے۔ آپؐ مہد میں آرام فرما ہیں۔ قمر آسمانی دنیا پر جلوہ افگن ہے۔ آپؐ جدھر انگشتِ مبارک سے اشارہ فرماتے ہیں، اسی طرف جھک جاتا ہے۔ آپؐ اس سے باتیں کرتے ہیں، وہ آپؐ سے باتیں کرتا ہے۔

عبداللہ ابن عباسؓ ایک دن خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے۔ حضورؐ اعلانِ نبوت فرما چکے تھے۔ آپ نے فرمایا۔ اے میرے چچا کے بیٹے، مسلمان ہو جاؤ۔ عرض کی لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ اے سرکار، یہ خیال نہ فرمائیں کہ میں آج مسلمان ہوا ہوں، بلکہ میں نے اسی وقت آپؐ کو نبی تسلیم کر لیا تھا، جب آپ مہد میں جھولا کرتے اور چاند سے باتیں کیا کرتے تھے اور وہ آپؐ کے اشارے پہ چلا کرتا تھا۔

قوتِ گویائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے گہوارے میں اپنی امی جان کی طہارت و پاکی پہ گواہی دی۔ حضورؐ نے پیدا ہوتے ہی اپنے رب کو سجدہ کیا۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اول کلمہ جو زبانِ مبارک سے نکلا، یہ تھا۔ اللہ اکبر کبیرًا والحمدللہ کثیرًا۔ فسبحان اللہ بکرۃ واصیلاً۔ قسطلانی اور ابونعیم روایت کرتے ہیں کہ بعد ولادت آپ نے خدا کو سجدہ کیا اور انگشتِ مبارک آسمان کی طرف اٹھا کر فرمایا۔ لاالٰہ الا اللہ انی رسول اللہ بعض روایات میں ہے کہ اس کے بعد فرمایا۔ ربّ ھب لی امتی (خدایا میری امت مجھے بخش دے) (سرور القلوب)

پہلے سجدے پہ روزِ ازل سے درود
یادگاریٔ اُمّت پہ لاکھوں سلام

اب رسول اکرم سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ پوچھنا کہ آپؐ کس عمر میں گفتگو فرمانے لگے تھے، درست نہیں۔ جب سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اسی دن یا چند روز بعد کلام فرما سکتے ہیں، تو حضورؐ تو سرور انبیاء ہیں ان کی فصاحت و بلاغت ان کی قوت گویائی کا کیا پوچھنا۔ پیدا ہوتے ہی اپنے رب کی وحدانیت اور اپنی رسالت کی گواہی دی۔ پھر اس کے بعد کسی سے کلام فرمانے کے متعلق تحقیق نہیں۔ اگر حضور چاہتے تو پیدا ہوتے ہی ہر ایک سے گفتگو فرماتے مگر یہ شاید اس لیے نہیں ہوا کہ اس وقت لوگ بت پرستی کا شکار تھے۔ حضورؐ پر کسی دیوی یا دیوتا کا اثر سمجھنے لگتے۔ پھر بھی آپؐ چھ مہینے کی عمر میں بڑی فصاحت و بلاغت سے کلام فرمانے لگے تھے۔ ایک دن حضرت حلیمہ نے حضورؐ کا ہاتھ منہ دھلا کر سرمہ لگایا اور بڑے پیار سے اس چاند سی صورت کو دیکھا، ناگاہ خیال ہوا کہ کہیں میرے لال کو نظر نہ ہو جائے۔

اللہ اللہ وہ بچپنے کی پھبن

اس خدا بھاتی صورت پہ لاکھوں سلام

فوراً بکس میں سے ایک ہار مہر یمانی کا نکال کر لائیں اور حضورؐ کو پہنا دیا۔ آپؐ نے پوچھا امی جان یہ کیا ہے۔ فرمایا یہ ہار نظر بد سے محفوظ رکھتا ہے۔ آپؐ مسکرائے اور فرمایا۔ امی جان میرا محافظ و نگہبان میرے ساتھ ہے، اسے بکس میں رکھ دیجئے۔

سات ماہ کی عمر میں چلنا

دو ماہ کی عمر میں بلا تکلف بغیر سہارے بیٹھنے اور سات ماہ کی عمر شریف میں خوب دوڑ کر چلنے لگے تھے۔ سات ماہ میں دوڑ کر چلنا خصوصیات نبوت سے نہیں ایک صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ مرغی کا بچہ تو پہلے ہی دن کھڑا ہو جاتا ہے اور چلنے لگتا ہے۔ پھر سات ماہ میں حضورؐ کا چلنا کیا تعجب کی بات ہے۔

بالفرض یہ خصوصیت نبوی سے نہ بھی سہی مگر یہ ماننا پڑے گا کہ جس طرح اور بچے کھڑے ہوتے اور گر پڑتے ہیں، ایک بار نہیں صدہا بار گرتے ہیں، تب کہیں چلنا سیکھتے ہیں۔ مگر یہ آپؐ کی خصوصیت تھی کہ کبھی آپ گرے نہیں۔ اور بھلا حضورؐ کیا گرتے، جو گرتوں کو اٹھانے کے لیے آئے تھے۔ ایک سوال اب یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنی کم عمری میں چلنے کی کوشش کرنا کیوں تھا۔ اس کے متعلق مولانا ضیاء المصطفیٰ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ یہ اس لیے کہ وقت کم اور کام بہت۔ ساری شریعتوں کا منسوخ کرنا اور اگلی شریعت کی مشکلوں کو کھولنا کروڑہا گناہگاروں کو بخشوانا، سارے جہان میں اسلام پہنچانا۔ تھوڑے وقت میں کام بہت کرنا۔ چونکہ حضرت دور سے آئے تھے، اس لیے دیر میں آئے۔ ساتویں مہینے بہت دوڑ کر چلنا اس لیے تھا کہ دوزخ کے ساتوں دروازے (اپنی امت پر) بند کرنے تھے۔ (محفل میلاد صفحہ ۵۲)

بچپن کے کھیل

بچے فطرتاً کھیل کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ چاند جو ایک نورانی کھلونا قدرت نے مہیا فرما دیا تھا (مگر وہ تو بچپن کا کھلونا تھا) اس کھیلنے کا وقت گزر چکا تھا، جیسے جیسے عمر و عقل میں پختگی آتی جاتی ہے، کھیلوں کا معیار بھی بڑھتا جاتا ہے۔ اب آپؐ گھر کے باہر آنے جانے لگے تھے۔ اپنے ہم عمر بچوں کو کھیلتا دیکھتے، مگر ان کے کھیل

میں شریک نہ ہوتے، کیونکہ وہ آپ کے معیار کے لائق نہ ہوتے۔ ابتدا میں آپ کے رضاعی بھائی عبداللہ بن حارث حسب عادت حضورؐ کو بھی کھیل میں شرکت کی دعوت دیتے۔ آپؐ ان کے ساتھ کھیل میں شریک نہ ہوتے بلکہ انہیں بھی نامناسب کھیل کھیلنے سے روکتے۔ البتہ ایک کھیل، جو بچپن ہی سے مرغوب تھا اور آخر عمر تک کبھی اس کھیل سے غافل نہ رہے، وہ تھا بتوں کو توڑنا جیسا کہ حضرت مولانا بیدلؒ فرماتے ہیں۔

نہ لڑکوں میں خیر الوریٰ کھیلتے تھے
وہ کچھ کھیل اپنا جدا کھیلتے تھے

نہ رکھتے تھے کچھ پاس دیتے تھا سب ——— یہ بازی وہ راہ خدا کھیلتے تھے
بتوں کے کیے ٹکڑے بتخانے توڑے ——— یہ کھیل اشرف الانبیاء کھیلتے تھے
روایت ہے چاند آپؐ سے کرتا باتیں ——— ہنڈولے میں جب مہ لقا کھیلتے تھے

تھے قدرت کے کھیل ان کے سب کھیل بیدلؔ
وہ کھیل ایسے معجز نما کھیلتے تھے

جب حضورؐ دو برس کے ہوئے تو آپ کا دودھ چھڑا دیا گیا اور حلیمہؓ حضورؐ کو لے کر حضرت آمنہ خاتونؓ کی خدمت میں مکہ حاضر ہوئیں۔ عرض کی آپ کی امانت حاضر ہے، مگر میری خواہش ہے کہ ابھی میں ان کی قربت و خدمت سے اور شرفیاب ہوں۔ ان دنوں مکے کی ہوا کافی گرم تھی۔ اس لیے حضرت عبدالمطلب اور حضرت آمنہؓ دونوں نے اجازت دے دی اور حضرت حلیمہؓ گوہر مراد کو اپنے ہمراہ پھر لے آئیں۔

بکریاں چرانا حضورؐ اکثر اپنے رضاعی بھائی کے ساتھ بکریاں چرانے کے لیے جانے کا ارادہ فرماتے مگر حلیمہ شفقت سے منع فرما دیتیں۔ ایک دن آپؐ چھپ کر شیما کے ساتھ جنگل چلے گئے۔ حلیمہ کو جب وہ چاند سا چہرہ کچھ دیر نظر نہ آیا، تو جانِ بہار کی مسکراہٹ سے قلب کو مطمئن کرنے کے لیے بے چین ہو کر دروازہ پر آئیں۔ آپ کو جب باہر نہ پایا، تو بچوں سے دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ حضورؐ جنگل کی طرف تشریف لے گئے ہیں۔ آپ تڑپ اٹھیں۔ اپنے شوہر حارث کو آواز دی اور جنگل کی طرف دوڑیں۔ دیکھا کہ آپؐ شیما کے ساتھ ہیں۔ حلیمہ شیما پر ناراض ہوئیں کہ اس تیز دھوپ میں میرے جگر پارے کو کہاں لے آئی۔ تو شیما نے کہا اماں جان بھائی پر اس تیز دھوپ کی تپش کا کچھ اثر نہ ہوا کیونکہ ایک بادل کا ٹکڑا آپ کے سر پر سایہ کئے ہوئے تھا۔ جب آپؐ چلتے وہ بھی چلتا۔ جب ٹھہر جاتے وہ بھی ٹھہر جاتا۔ یہی حال راستے بھر رہا۔ یہاں تک کہ ہم یہاں آپہنچے (سیرت رسول عربیؐ)

اس واقعہ سے حلیمہ کچھ مطمئن ہو گئی تھیں۔ ادھر حضور کو بکریاں چرانے کی رغبت، جس نے حلیمہ کو مجبور کر دیا اور حضورؐ کو عبداللہ کے ساتھ بھیج دیا۔ واپس آ کر عبداللہ نے بیان کیا۔ اے ماں! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان عجیب۔ جس جنگل میں جاتے ہیں، ہرا ہو جاتا ہے اور دھوپ میں ابر سایہ کرتا ہے۔ جنگل کے جانور آپ کے قدم چومتے ہیں۔ حلیمہ نے کہا اے فرزند! اپنے بھائی کا یہ حال کسی سے نہ کہنا۔ (سرور القلوب)

اب حضور روزانہ بکریاں چرانے عبداللہ کے ساتھ جنگل جانے لگے۔

نکتہ پروردگار عالم نے بکریاں چرانے کی رغبت بچپن سے اس رحمت عالم کے دل میں پیدا فرمائی کہ یہ کام سیاست و شفقت بر ضعفائے امت اور صبر بر مصیبت وغیر ہا امور سے کہ لوازم نبوت سے ہیں، نہایت مناسبت رکھتا اور تواضع و فروتنی سکھاتا ہے۔ علاوہ بریں جب مرد احسان شناس ایسے حقیر کام سے کسی منصب عمدہ اور عہدۂ جلیلہ پر سرفراز ہوتا ہے تو اس نعمت غیر مترقبہ کو محض فضل اپنے مولا کا سمجھتا ہے اور اس کا شکر بجا لاتا ہے۔ (سرور القلوب)

بے مثل بشر کا شق صدر چار سال کی عمر شریف تھی حسب دستور ایک دن سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم جنگل میں بکریاں چرانے میں مشغول تھے کہ دو فرشتے سفید پوش آئے اور حضور کو ایک صاف ستھری جگہ پر لٹایا اور سینہ اقدس چاک کیا پھر قلب منور کا آپریشن کر کے ایک سیاہ نقطہ خون آلود نکال کر پھینک دیا اور کہا ھٰذا حظ الشیطٰن منك یا حبیب اللہ (اے پیارے! یہ جو پھینکا گیا ہے، شیطان کا حصہ تھا۔ اب وہ آپ کی طرف کبھی دست درازی نہ کر سکے گا۔)

اور ایک نعمت، جو ازل سے حضورؐ کے لیے خاص تھی، رکھ کر سی دیا۔ یہ ہے بے مثل بشر کی بے مثلی کہ دنیا میں کوئی بھی ایسی مثال ملنا محال ہے کہ کسی کے قلب کا آپریشن ہو اور وہ زندہ رہ سکے۔ ادھر حلیمہ کے بیٹے نے جونہی حضورؐ کو لٹاتے اور سینہ چاک کرتے ہوئے دیکھا، روتا پیٹتا گھر آیا اور ماں کو خبر دی۔ پھر تو حلیمہ پر جو گزری، کس کی زبان میں طاقت کہ بیان کر سکے۔ نہ سر کے دوپٹے کا ہوش، نہ پاؤں کے جوتے کا خیال۔ وارفتگی کے عالم میں روتی جاتیں اور کہتی جاتیں ہائے محمدؐ کے خدا! اے کعبہ کے مالک! میں نے یہ کیا وحشت انگیز خبر سنی اے خدا اگر انہیں کچھ ہو گیا تو میں کیا منہ لے کر مکہ جاؤں گی اور کس منہ سے یہ خبر سناؤں گی۔ اے خدا تیرے محبوب کی آئی مجھے آئے میرے بچوں کو آئے مگر حضرت عبدالمطلب کی امانت بخیر و عافیت مل جائے۔ یہ فریاد و بکا کرتی جنگل کی طرف دوڑیں قبیلے والوں میں جو بھی سنتا، وہ بھی دوڑتا چلا آتا۔ کچھ دور چلی تھیں کہ حضور کو مسکراتے ہوئے آتے دیکھا۔ دوڑ کر حلیمہ نے سینے سے چمٹا لیا۔ حضورؐ نے فرمایا: اماں! میں تو اچھا ہوں، آپ پریشان کیوں ہیں۔ وہ تو اللہ کے فرشتے تھے جنہوں نے میرا سینہ چاک کیا تھا۔

مکہ میں واپسی حارث نے کہا: اے حلیمہ! بہتر یہ ہے، اسے مکہ میں چھوڑ آؤ۔ نہ معلوم یہ کیا اسرار ہیں۔ حلیمہ کس دل سے حضورؐ کی جدائی گوارا کرتیں۔

آرزو یہ تھی کہ نکلے دم تمہارے سامنے
ہم تمہارے سامنے ہوں، تم ہمارے سامنے

مگر مرضیٔ خدا کہ

طائف سے چلے نگارِ کعبہ
کعبہ میں رہے بہارِ کعبہ

مجبور و لاچار حلیمہ، اپنے پیارے رضیع ہم گنہگاروں کے شفیع کو با دل بریاں و دیدۂ گریاں لے کر چلیں، عبد اللہ اپنے بھائی رضاعی کو گلے لگا کر رخصت کر رہے ہیں شیما پچھاڑیں کھا رہی ہے۔ کبھی گود میں لے کر پیار کرتی اور اس طرح کہتی اے بھائی ابتا ؤ تو اب اس گھر میں مجھے سکون کس طرح آئے گا، تم اس گھر کو اندھیرا کر چلے۔ یہ تمہاری لونڈی شیما کس کو لوریاں دے کر سلائے گی اور کس کے جاگنے کے انتظار میں صبح تک تارے گنے گی۔ اب نسیمِ سحر کس کی مسکراہٹوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے طائف کے چکر لگائے گی۔ اب طائف کے پیر و جوان کس کے دستِ شفاء کی طلب میں بیمار رہنے کی التجائیں کریں گے۔ بنی سعد کے بیمار بچے کس کے قدم پر لوٹیں گے۔ اب طائف کے یتیموں پر دستِ شفقت کون رکھے گا۔ اے ماں سے زیادہ شفیق اور باپ سے بڑھ کر مہربان بتائیے تو ہمیں کس کے سہارے چھوڑے جا رہے ہیں۔ نہ صرف قبیلہ بنی سعد کے بچے بوڑھے مرد و عورتیں تحفے اشک رواں کی صورت میں پیش کر رہے ہیں، بلکہ بنی ہوازن کے جانور بھی قدوم مبارک پر سر رکھ کر جانِ بہار کو رخصتی سلام کر رہے ہیں۔ ہاں حلیمہ کا قلب کچھ مطمئن ہے کہ مجھے ابھی چند دن خدمت و قرب کا موقع حاصل ہے۔ اس امانت عبد المطلب کو لے کر مکہ کی طرف چلیں ہر مقام پر قیام، ہر منزل پر مقام کرتی وادیٔ بطحا تک آئیں۔ یہاں غیب سے ایک آواز سنی۔ کوئی کہنے والا کہتا ہے۔ اب خیر و برکت بنی سعد سے جاتی ہے اور اے وادیِ بطحا مبارک ہو کہ تجھ میں خوشی و زینت دوبارہ آتی ہے۔ اے حطیم مبارک ہو کہ آج آفتاب جود و سخا تجھ میں تشریف لاتا ہے۔ حلیمہ حضورؐ کو حطیم میں بٹھا کر گویندہ کی تلاش میں نکلیں مگر کہنے والے کا دور تک پتا نہ چلا۔ واپس آئیں تو حضورؐ حطیم میں نہ پایا۔ اس وقت حلیمہ کی جو حالت ہوئی، کس کی زبان میں یارا، جو اس کا عشر عشیر بھی بیان کر سکے رنگ زرد، لب پر آہِ سرد، دل سے وفورِ بے تابی پیدا، چہرے سے پریشانی ہویدا، افتاں و خیزاں ہر طرف جاتیں اور کہیں اس یوسفِ مصرِ نبوت کا پتہ نہ پاتی تھیں۔ اسی اثنا میں ایک بوڑھا ملا۔ اس نے حلیمہ کا حال پُر ملال سنا، تو کہا اس کی کچھ نشانیاں بتاؤ۔ تو تلاش کیا جائے۔ آپ نے بتایا اے بزرگ صورت میں اس کی کیا نشانی بتاؤں میں نے اس کی سی آنکھ کسی کی نہ دیکھی، میں نے اس کی سی بینی (ناک) کسی کی نہ پائی، اس کا سا چہرہ آج تک دیکھا نہ سنا۔ بس اتنا جانتی ہوں کہ سورج اس کے جمال کو کبھی نہ دیکھ سکا۔ جب سورج نکلا ابر نے اس پر سایہ کر لیا۔ چاند اس کے تلووں کے مقابل شرما جاتا۔ اس بوڑھے نے کہا۔ اے حلیمہ چل، میں تجھے ہبل کے پاس لے چلتا ہوں۔ وہ بت غیب کی خبریں دیتا ہے حلیمہ اس کے ساتھ ہو لیں۔ انہیں کیا خبر کہ جس صاحبِ دولت کا پتہ لگانے ہبل کے پاس جا رہی ہوں، وہ بت شکنی کے لیے رونق افروز ہوئے ہیں۔ اس پیر مرد نے بت کو سجدہ کیا اور کہا۔ اے خداوند عرب! یہ حلیمہ مسافرہ تیری پناہ میں آئی ہے۔ اس کا بیٹا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تیرے ملک میں گم ہو گیا۔ یہ سن کر ہبل اور تمام بت سرنگوں گر پڑے اور ان سے آواز آئی کہ اے شخص کس کا نام لیتا ہے۔ کیوں ہمارے زخموں پر نمک چھڑکتا ہے جس کا نام سنتے ہی ہمارے چیلے اور فتنے خاک میں مل گئے پیر مرد نے یہ واقعہ عجیب و غریب دیکھ کر کہا۔ مبارک ہو وہ لڑکا ہرگز ہرگز گم نہ ہوگا۔ بلکہ گمراہوں کو راہ دکھائے گا۔

جب وہاں بھی دُرِ مقصود کا پتہ نہ چلا تو ناچار عبد المطلب کی خدمت میں پہنچیں، عبد المطلب کی نظر جیسے ہی حلیمہ پر پڑی اور اس کی گود گلِ مراد سے خالی دیکھی، بے چین ہو گئے۔ حال دریافت کیا، حلیمہ نے کلیجہ تھام کر حال پُر ملال سنایا

کہ اے سردار میں تمہارے فرزندِ ارجمند کو وادی بطحا تک بخیر و سلامت لائی۔ یہاں اس نامراد کے ہاتھ سے وہ دامنِ دولت چھوٹ گیا۔ حلیمہ ناشاد کا خرمنِ صبر و قرار لٹ گیا۔ عبد المطلب نے قریش کو حضورؐ کی تلاش میں روانہ کیا اور خود جانب حرم چلے اور اس کی بارگاہ بیکس پناہ میں رو رو کر عرض کرتے لگے۔ الٰہا بادشاہا! اگرچہ میں اس قابل نہیں کہ میری بات تیرے آستانے پر سنی جائے، مگر اس طفلِ ذی شان میں تیری رحمت کے آثار پاتا ہوں اس لیے اسی کو تیری جناب میں شفیع لاتا ہوں کہ اس جان جہاں آرام جاں کو مجھ سے ملا دے۔ عبد المطلب گریہ و زاری کر رہے تھے کہ ناگاہ ملہمِ غیب نے ندا دی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایک خدا ہے جو انہیں ضائع نہ چھوڑے گا۔ عبد المطلب نے عرض کی۔ اے ندا کرنے والے، یہ بتا کہ وہ ہیں کہاں؟ ندا آئی وہ سر وادی تہامہ میں ایک درخت کے نیچے جلوہ فرما ہیں۔ یہ نوید جانفزا سن کر مجمع قریش جانب تہامہ روانہ ہوا۔ تلاش کیا تو دیکھا کہ ایک ماہ رخسار جن کے چہرے سے جمال ہاشمی کے انوار نمودار ہیں اور سرِ نیاز جھکائے مراقبہ میں جلوہ آرا ہیں۔ عبد المطلب نے قریب آکر فرطِ ادب سے نام نامی پوچھا۔ ارشاد ہوا۔ محمدؐ ابن عبد اللہ ابن عبد المطلب۔ حضرت عبد المطلب نے عرض کی میری جان تیرے قربان، میں ہوں تیرا دادا عبد المطلب۔ پھر اس درِ مقصود کو صدفِ آغوش میں لے کر جانب آمنہؓ چلے اور اس مایۂ قرار کے دیدار سے مادرِ غمگین کے دل کو تسکین دی۔

کنول پھولے دلوں کے کھل گئے اُمید کے غنچے
تیرا آنا بہارِ جاں فزا ہے باغِ عالم کو

پھر عبد المطلب نے حلیمہ کو باخلعت و لباس کچھ زر و مال دے کر رخصت کیا۔

والدہ ماجدہ کی آغوشِ شفقت سے جدائی

دنوں کو گزرتے دیر نہیں لگتی حلیمہ کے یہاں سے آئے دو برس ہو چکے ہیں۔ حضورؐ چھوٹے بچوں اور ہم عمر لڑکوں کو درس راست گوئی، دیانت داری، خوش خلقی دیتے اور بری عادتوں اور بری باتوں سے روکتے۔ نہ صرف بچے بلکہ آپ کی پر لطف اور نیک باتوں سے بڑے بھی اثر لیتے۔ مکہ میں مشہور ہو گیا کہ عبد اللہ کا یتیم فرزند بغیر کسی تعلیم و تربیت کے کتنا اچھے اٹھان اٹھ رہا ہے۔ آپ جب اپنے والد بزرگوار کا نام سنتے، آنکھیں نم ہو جاتیں۔ ایک دن امی جان کے گلے میں باہیں ڈال کر فرمایا۔ امی ہم نے سنا ہے، ہمارے والد مدینہ گئے، تو واپس نہیں آئے، چلیئے ہم آپ ہی چل کر مل آئیں۔ یہ سن کر حضرت آمنہؓ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے، مگر ننھے دل کا خیال فرما کر پونچھ ڈالے اور فرمایا، بیٹا اپنے دادا سے اجازت لے لو۔ حضورؐ نے عبد المطلب سے اجازت لے لی۔ حضرت آمنہؓ، ام ایمن حضورؐ کو لے کر مدینہ کی طرف روانہ ہوئیں۔ حضرت خوشی سے جامے میں پھولے نہیں سماتے بڑی دلکش اداؤں کے ساتھ مدینہ کا سفر طے فرما رہے ہیں مگر ضمیر پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ آج جس باپ کی زیارت کی خاطر اپنی مادرِ مشفقہ کے ساتھ مکہ سے مدینہ کا سفر فرما رہے ہیں، واپسی میں یہ آغوشِ مادر بھی ساتھ نہ ہو گی۔ آج تو والد ماجد کی سرپرستی سے محروم ہیں، کل ماں کی آغوش بھی جدا ہو جائے گی۔ مکہ میں سب ان کو عبد اللہ کا یتیم فرزند کہتے ہیں اور مدینہ والے دُرِّ یتیم کہا کریں گے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ حضورؐ مستقبل کے ان مراحل سے ناواقف تھے، ہاں دنیا تو یہی کہے گی۔

مرغِ عقل تو عمر کے تقاضے اور صغر سنی کے لحاظ سے اپنی پرواز کو موقوف کر دے گا کہ چھ برس کی عمر میں مستقبل کی فکر کیسے ہوتی ہے چہ جائیکہ مستقبل کے مراحل سے باخبر ہونا۔ مگر ایمان و ایقان و عقیدت کی پرواز عقل و دانش ہی کے بل پہ نہیں بلکہ خالقِ کائنات کی قدرت و طاقت کے بھروسہ پر ہے اس لیے ہم یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ حضورؐ کو مستقبل کے تمام مراحل کی خبر تھی۔ آپؐ خدا کے عطا کردہ علم سے سب کچھ جانتے تھے کہ ایک دن وہ آنے والا ہے کہ مکہ چھوڑ کر مدینہ بسانا ہے۔ یثرب کو مدینہ اور وہاں کی بادِ سموم کو بادِ بہار اور وادیٔ یثرب کو گلشنِ طیبہ بنانا ہے۔ والد ماجد تو اسی سرزمین کو ہمیشہ کا مسکن بنا چکے، امی جان بھی اس خطہ میں بس جائیں گی، جو ہمارا دائمی ابدی وطن بننے والا ہے اور خالق کی مرضی بھی ہے۔ اسی لیے باصرار مادرِ مشفقہ کو جانب مدینہ لے چلے۔ غرض مدینہ پہنچ کر اپنی ننھیال میں قیام کیا اور والد ماجد کی قبر پر والدہ کے ہمراہ گئے۔ بڑی دیر تک خمیدہ سر چشم بند استادہ رہے۔ ایک دن حضورؐ کچھ بچوں کے ہمراہ قریب کے تالاب جس کو چاہ بنی عدی کہتے ہیں تشریف لے گئے اور اس میں غسل فرمایا اور تیرنے کی مشق فرمانے لگے۔ کہ کچھ یہودی اس طرف سے گزرے۔ اس وقت دونوں شانوں کے درمیان مہرِ نبوت مثلِ آفتاب روشن تھی۔ ایک نے اپنے ہمراہیوں سے کہا، یہ نبی آخر الزماں ہونے کی نشانی ہے (معارج و مدارج)۔ ام ایمن ساتھ تھیں۔ انہوں نے یہ واقعہ حضورؐ کی والدہ کو سنایا۔ تقریباً ایک ماہ کے بعد یہ تین نفوس پر مشتمل مبارک قافلہ مدینے سے مکہ معظمہ کی طرف چلا۔ واپسی میں جب مقام ابوا میں قیام فرمایا، تو جو مرضیٔ رب تھی، پوری ہوئی اور خوش خصلت حضرت آمنہؓ نے اپنے جگر پارے کو امِ ایمن کے سپرد کر کے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور یتیمانِ امت کی ڈھارس بندھانے کے لیے اپنے فرزند ارجمند کو دُرِ یتیم کا خطاب دے کر ہمیشہ کے لیے دنیا سے رخصت ہوئیں۔ کوئی اس وقت حضور کے دل سے پوچھے کہ والد کی قبر شریف کی زیارت کو تشریف لائے تھے اور اب والدہ ماجدہ کو دفن فرما کر لوٹ رہے ہیں چھ سال کی عمر ہے۔ یہ جانتے ہیں کہ دنیا کی ہر شے حاصل کی جا سکتی ہے، مگر آغوشِ مادر اور شفقتِ پدری اٹھ جانے کے بعد کسی قیمت پر واپس نہیں مل سکتی۔ جو ذات دوسرے کی تکلیف نہ دیکھ سکے، اگر کسی کے کانٹا چبھے، تو وہ بے چین ہو جائے اگر کسی کا سر دکھے، تو ان کا دل دکھ جائے، کسی کو اذیت پہنچے تو یہ تڑپ اٹھیں، مگر آج اس غریب الوطنی کے عالم میں کوئی ڈھارس بندھانے والا نہیں۔ نہ عبد المطلب ہیں، جو سر پہ ہاتھ رکھ سکیں۔ نہ رضاعی باپ حارث ہیں، جو تسکین قلب فرما سکیں۔ نہ حلیمہ موجود ہیں کہ کلیجہ سے چمٹا کر تسلی دیں۔ نہ شیما سے قربت ہے، جو اپنے آنچل سے آپ کے آنسو خشک کر سکے۔ صرف ام ایمن والدین کی کنیز تجہیز و تکفین میں مشغول ہے اور کبھی حسرت بھری نظروں سے اس معصوم کو دیکھتی اور آنسو بہاتی ہے شاید کوتاہ بین ان حادثات کو قدرت کی ستم ظریفی پر محمول کریں، مگر حقیقت میں یہاں معاملہ ہی برعکس ہے۔ یہ رحمت عالم ہیں، رحمت کا یہی تقاضا تھا جو ہو رہا تھا۔ شاید روزِ ازل ہی سے محب و محبوب، طالب و مطلوب میں عہد و پیمان ہو چکا تھا کہ اے محبوب ہم تمہیں یتیم ہی نہیں بلکہ دُرِ یتیم بنا کر مبعوث فرمائیں گے۔ تاکہ تمہاری ذات یتیموں کے لیے باعث تسکین اور مصیبت زدوں کی تشفی کا موجب ہو اور اے محبوب ہم تمہیں بین الاقوامی حیثیت سے سرفراز فرمائیں گے۔ جس کے لیے ضروری ہے کہ دنیا میں آپؐ کو تعلیم و تربیت دینے والا کوئی نہ ہو اور ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ تم ہمارے سوا کسی اور کی تعظیم کرو۔ بس دنیا

تمہاری تعظیم کرے اور تم کسی کے آگے زانوے ادب تہہ نہ کرو۔

عبدالمطلب کی کفالت

زندگی تکلیف و راحت میں یا عیش و آرام میں ہر طرح بسر ہو ہی جاتی ہے مگر اس عمر میں والدین کی مفارقت بڑی تکلیف دہ ہوتی ہے، ہر ہر قدم پر یہ احساس قلب کو مجروح کرتا رہتا ہے کہ اس قدر والد حیات ہوتے تو یہ دشواریاں آسانی سے بدل جاتیں۔ اگر والدہ حیات ہوتیں تو میلے کپڑے دھو کر یا پھٹے کو سی کر پہنا دیتیں اگر ماں ہوتیں تو اپنے امکان بھر بھوکا نہ سونے دیتیں مجبوری تسلی و تشفی دے کر ممتا کی آغوش میں سکون سے سلا دیتیں۔ دنیا جس طرح یتیموں کو حقیر نظر سے دیکھتی ہے اور عرب کی تہذیب، جس میں دوسروں کی تحقیر و تذلیل تفریح میں داخل تھی۔ بھلا حضور کے قلب پر کیا گزرتی ہوگی۔ مگر رحمت عالم ہو کر آنے والی ذات کے لیے ضروری تھا کہ یہ سب تکلیفیں اٹھائے اور ہنسی خوشی برداشت کرے تاکہ جب کوئی بشر ان مراحل سے دو چار ہو، تو اس کے لیے ان کے حالاتِ زندگی باعثِ تسکین ہوں۔ کہ مدنی تاجدار، سرکار ابد قرار رحمت للعلمینؐ نے بھی یہ مصیبتیں برداشت کی ہیں۔ اور تکلیفات اٹھائی ہیں۔ قاعدے کی بات ہے کہ جب کسی پر کوئی مصیبت آتی ہے، تو دوسرے کی تکلیف و مصیبت اس کے لیے سکون قلب کا سبب بن جاتی ہے کہ فلاں پر بھی ایسا وقت گزر چکا ہے اور اس نے ہنسی خوشی وہ وقت گزار دیا تھا۔ اللہ اکبر! حضور کے والد ماجد ولادت سے پہلے ہی رخصت ہو جاتے ہیں۔ ولادت کے چند روز بعد ہی والدہ کی آغوش سے دور غریب الوطنی کی حالت میں حلیمہ کے ہاں چار سال گزارتے ہیں۔ اگر اس دوران والدہ مشفقہ دنیا سے رخصت ہو جاتیں تو اتنا تکلیف دہ نہ ہوتا۔ مگر قدرت چار سال کی عمر میں ماں کی آغوش پھر عطا فرماتی ہے۔ جب آپؐ رضاعی ماں کی آغوش سے مادرِ حقیقی کی آغوش کا لطف پا کر رضاعت و حقیقت کے فرق سے روشناس ہو جاتے اور مانوس ہو جاتے ہیں تو دو سال بعد اسے بھی چھین لیا جاتا ہے، وہ بھی غریب الوطنی کی حالت میں۔ ہم جب ان مراحل پر نظر ڈالتے ہیں، دل ابل آتا ہے، چشم پُرنم ہو جاتی ہے، جگر پارہ پارہ ہو جاتا ہے مگر قدرت مسکراتی ہے اور غیب سے ندا آتی ہے۔ وَلَلْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی اے محبوبؐ! تم کیوں رنجیدہ ہوتے ہو، نہ تمہارے چاہنے والے دل ملول ہوں۔ کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ اس میں کیا راز ہے۔ ہم بتاتے ہیں کہ تمہاری ہر آنے والی ساعت پچھلی ساعت سے بہتر و افضل و اعلیٰ ہے اس کا اظہار عبدالمطلب کی محبت و شفقت سے ہوا۔ ام ایمن کو تاکید شدید تھی کہ میرے دریتیم کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے تمہاری شفقت ماں کی آغوش کو بھلا دے۔ اگرچہ عبدالمطلب خود بھی حضورؐ کی دلجوئی اور دلنوازی کا خیال رکھتے۔ اکثر خواہشات مرغوبات کے متعلق دریافت فرماتے رہتے۔ پھر بھی مکہ کی سرداری جس کی وجہ سے ساری قوم کی ذمہ داریاں آپ ہی کے سر تھیں، ہمہ وقت حضور کی پرورش پر صرف نہ کر سکتے تھے۔ تاہم حضورؐ کو سکون حاصل تھا۔ کوئی حضور کی طرف غلط نظر سے نہ دیکھ سکتا تھا نہ زبانِ طعن دراز کر سکتا تھا۔

عبدالمطلب بھی رخصت ہوتے ہیں

ابھی دو ہی سال گزرے تھے، ابھی والدہ ماجدہ کی جدائی کا غم نہ بھولا تھا کہ عبدالمطلب کی سرپرستی سے بھی جدائی کا سامان مہیا ہو گیا۔ عبدالمطلب مرض الموت میں بستر علالت

پرورانڈ ہیں۔جب زندگی سے مایوس ہوگئے تو ایک دن اپنے تمام بیٹوں کو بلا کر فرمایا۔ میں اپنی زندگی کے دن پورے کر چکا۔ حضورؐ کے سرِ اقدس پر اپنا دستِ شفقت رکھ کر کہا۔ مجھے ان آخری لمحات میں ان کے سوا کسی کی نہ فکر ہے نہ غم۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے بعد اس بے مادر وپدر بچہ کی گذرے نہ اس کا کوئی محافظ و نگہبان ہے، نہ مربی وکفیل۔ میں اس درِ یتیم کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ امکان بھر آرام دیتا، دلجوئی کرتا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے سامنے کوئی اس درِ یتیم کی پرورش کا عہد کرے اور اس کی کفالت اپنے ذمہ لے تاکہ میں باطمینان تمام دنیا سے رخصت ہوں۔ یہ سن کر ابولہب کھڑا ہوا اور کہا کہ اے رئیس عرب! آپ اس کی فکر نہ کریں۔ ہم سب ان کی خدمت کے واسطے موجود ہیں اور اگر آپ چاہیں تو مجھے دے دیں۔ میں ان کی پرورش دل وجان سے کروں گا۔

عبدالمطلب نے فرمایا اگرچہ تو مالدار ہے، تو پرورش کر سکتا ہے مگر تو بہت سفاک و بے رحم ہے یتیم خستہ دل ہوتے ہیں۔ ان کے قلب ادنیٰ دل آزاری کی بھی طاقت نہیں رکھتے۔

یہ سن کر امیر حمزہؓ اٹھے اور حضور کو اپنی کفالت میں لینے کی درخواست کی۔

عبدالمطلب نے جواب دیا، تم بے اولاد ہو اور بے اولاد دوسرے کی اولاد کی تربیت کی قابلیت نہیں رکھتا دوسرے تم شکار کے عادی اور سپاہیانہ زندگی بسر کرتے ہو۔ اس لیے تمہاری غفلت قابلِ گرفت نہ ہوگی مگر میرے جگر پارے کو تمہاری غفلت سے جو تکلیف ہوگی، وہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔

اب حضرت عباسؓ نے گذارش کی کہ میں آپ کے منظورِ نظر کو سر آنکھوں پر رکھوں گا اور کبھی غفلت نہ برتوں گا۔

عبدالمطلب نے کہا اے عباسؓ! میں جانتا ہوں کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو، وہ پورا کرو گے۔ مگر تم کثیر العیال ہو اور غریب ہو۔ کس طرح ان کی خواہشات کا احترام کر سکو گے۔

اب ابوطالب کھڑے ہوئے اور عرض کی میں ان کی خدمت سے شرفیاب ہونے کی آرزو لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ مگر بہ سبب ادب پہلے عرض نہ کر سکا۔ اگرچہ میں مالدار تو نہیں مگر یہ وعدہ کرتا ہوں کہ ان کی دلجوئی و دل نوازی میں کسر نہ اٹھا رکھوں گا۔ پہلے انہیں کھلاؤں گا، پہلے انہیں پہناؤں گا، پھر اپنے بچوں کو۔ ہر وقت ساتھ رکھوں گا۔ ان کی خدمت سے کبھی غافل نہیں ہوں گا۔

عبدالمطلب کچھ دیر خاموش رہے اور فرمایا تمہاری ہر ہر بات سے صداقت ٹپک رہی ہے اور میں نے تمہاری آنکھوں میں اپنے جگر پارے کی طرف سے محبت کے چشمے چھلکتے دیکھے ہیں مجھے یقین ہے کہ تم اپنا عہد پورا کرو گے مگر میں اس کا فیصلہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کے سپرد کرتا ہوں۔ اے بیٹا! میں چاہتا ہوں، یہ تمہارے چاروں چچا اس وقت موجود ہیں تم جس کو پسند کرتے ہو، اس سے آگاہ کر دو۔ تمہاری مرضی پر میرا فیصلہ ہوگا۔ حضورؐ اٹھے اور ابوطالب کی گود میں جا بیٹھے۔ عبدالمطلب نے کہا، جسے میں چاہتا تھا، تم نے بھی اسی کو پسند کیا۔ اب میں سکون سے مر سکوں گا۔

ابوطالب کی سرپرستی

آٹھ سال کی عمر شریف میں غموں کا انبوہ اور دوسری میت کی تجہیز و تکفین۔ جنازے کے ہمراہ جاتے ہیں اور فرط محبت سے اشک بہاتے ہیں۔ دیکھنے والوں کے دل رو رہے ہیں۔ ہر زبان پر عبداللہ کے یتیم فرزند کا چرچا ہے۔ مگر قدرت مسکرا کر وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ کا پرکیف نغمہ سناتی ہے اور مستقبل کی ہر آن، اس وجد آفرین ترانہ کو سن کر جھوم جاتی ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ ابوطالب نے جو عہد کیا تھا، بحسن و خوبی انجام دیا اور زندگی بھر اپنے اہل و عیال اور جان و مال سے زیادہ عزیز رکھا۔ قدرت کو جو منظور ہوتا ہے، وہی ہو کر رہتا ہے۔ عبدالمطلب کے انتقال کے بعد مکے کی سرداری پھر بنو امیہ کے خاندان کی طرف منتقل ہو گئی اور دنیوی اقتدار خاندان بنو ہاشم سے چھن گیا۔ صرف منصب سقایہ یعنی حجاج کو پانی پلانا حضرت عباسؓ کے ہاتھ رہا۔ خاندان بنی ہاشم سے دنیاوی اقتدار چھن جانے سے ان کی معاشی حالت پر بھی کافی اثر پڑا۔ ابوطالب بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکے۔ اب صرف تجارت ہی ذریعہ معاش تھا۔ ابوطالب نے تجارت کی طرف توجہ دی مگر حسب وعدہ حضور کی طرف سے غافل نہ ہوئے۔ جہاں جاتے ساتھ لے جاتے، ساتھ کھلاتے، پاس سلاتے۔ یہاں تک کہ حضورؐ کے مقابل اپنے بچوں تک کی پروا نہیں کرتے۔ حضورؐ بھی کافی مانوس ہو گئے مگر کمال استغنیٰ کہ کبھی بچپنا نہ ضدیں اور فرمائشیں نہ کیں۔ معمولی کپڑے کو بھی اس طرح خوشی خوشی قبول فرماتے، جیسے دلی تمنا پوری ہو گئی ہو۔ غیر مرغوب غذا ایسے تناول فرماتے، گویا سب سے زیادہ یہی مرغوب ہے۔ ابوطالب کے قلب میں حضورؐ کی ان اداؤں نے عشق پیدا کر دیا تھا۔ حضورؐ نے محسوس فرمایا کہ ہمارے چچا معاشی مشکلات سے دوچار ہیں تو آپ نے بغیر کسی کے کہے بکریاں چرانے کا کام اپنے ذمہ لیا۔ ابوطالب نے ہر چند منع کیا مگر آپ نے فرمایا بکریاں چرانے سے میرے ذوق کو تسکین ہوتی ہے اور پھر بکریاں بھی اپنی ہی ہیں۔ اس لیے شرم و عار کا کوئی سوال نہیں۔ غالباً اس وقت دس سال کی عمر شریف ہو گی۔ یہی وہ وقت ہے، جب دوبارہ شق صدر ہوا۔

حضورؐ کے اشارے پر پانی برسنا

ابن عساکر جہلمہ بن عرفطہ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ اہل مکہ سخت قحط میں مبتلا تھے میں وہاں موجود تھا۔ لوگوں کو فکر و تشویش ہوئی۔ ایک نے مشورہ دیا کہ لات و عزیٰ کے پاس چلو۔ دوسرا بولا منات کے پاس چلو۔ غرض سب کے سب اس کام کے لیے تین سو ساٹھ خداؤں میں ایک کا انتخاب کرنے لگے اور ہر شخص اپنے قبیلہ کے خدا کا نام لیتا۔ مگر ایک خوبرو صائب الرائے بوڑھے نے کہا کہاں الٹے جا رہے ہو، جب کہ ہم میں اولاد ابراہیمؑ و اسماعیلؑ موجود ہے۔ غرض سب لوگ ابوطالب کے پاس آئے اور پانی برسانے کے لیے دعا کے طالب ہوئے۔ ابوطالب کے ساتھ حضور بھی تھے۔ کعبہ میں پہنچ کر حضورؐ کو گود میں لیا، کعبہ سے پشت لگائی اور حضورؐ کے چاند سے رخساروں کے وسیلے سے دعا کی۔ حضور نے ابوطالب کو دیکھا۔ پھر اپنی انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ اس وقت آسمان پہ بادل کا کوئی ٹکڑا نہ تھا مگر اشارہ کرنا تھا کہ چاروں طرف سے بادل آنے لگے۔ پانی برسا اور خوب برسا۔

بعثت کے بعد جب کفار نے حضور کو ایذائیں دینا شروع کیں، تب ابوطالب نے ایک قصیدہ لکھا، جو سیرت ابن ہشام میں نقل ہے۔ اس میں ایک شعر یہ بھی ہے۔

وابیض یستسقی الغمام بوجھہ
ثمال الیتامی عصمۃ للارامل

(۱ ور گورے رنگ والے جن کے وسیلے سے نزولِ باراں طلب کیا جاتا ہے، یتیموں کے ملجا، بیواؤں اور درویشوں کے نگہبان۔)

ملک شام کا سفر ۱۲ سال کی عمر میں حضور نے ابوطالب کے ساتھ ملک شام کا سفر کیا۔ بضرورت شدید ابوطالب نے تجارت کے قافلہ کے ساتھ جانے کا ارادہ کیا۔ تکلیفاتِ سفر کی وجہ سے حضورؐ کو ساتھ لے جانا مناسب نہ جانا مگر آپ نے اصرار کیا اور ابوطالب نے دل شکنی گوارا نہ کی، ساتھ لے لیا۔ حضورؐ جس کام سے دنیا میں تشریف لائے تھے، وہ بین الاقوامی تھا، اس لیے دور دراز ممالک کا سفر اور وہاں کی معاشرتی، اخلاقی، مذہبی حالات کا خود جائزہ لینا بھی ضروری تھا۔ اس کے لیے تجارت ہی بہتر اور آسان ذریعہ ہو سکتا تھا۔ جب یہ قافلہ بصریٰ میں پہنچا، تو ایک عیسائی راہب بحیرا نامی نے حضورؐ کو پہچان لیا اور قوم کو بتایا کہ اس قافلہ میں نبی آخر الزماں بھی ہیں۔ یہ خبر قریش تک پہنچی۔ وہ بحیرا کے پاس گئے اور نشانیاں دریافت کیں۔ اس نے کہا کیا تم میں محمدؐ نامی کوئی بچہ تو نہیں۔ انہوں نے کہا، ہے اس نے کہا، کیا ان کے دونوں شانوں کے درمیان سیب کے مانند ابھرا ہوا گوشت نہیں، جو مثل چاند کے چمکتا ہے انہوں نے کہا، ہے۔ اس نے کہا کہ یہی نشانی ہے میں نے تم لوگوں کو گھاٹی سے اترتے دیکھا۔ تو تمام درخت سجدہ کر رہے تھے۔ درخت سوائے نبی کے کسی اور کو سجدہ نہیں کرتے (ترمذی) اس روایت میں اختلاف ہے بعض کے نزدیک شام کے دوسرے سفر میں یہ واقعہ پیش آیا۔

حرب فجار میں شرکت ایام جہالت کی جنگ خاندان کو تباہ کر دیتی تھی اور سات سات پشت تک چلا کرتی تھی۔ حرب فجار ایامِ جہالت کی آخری جنگ تھی۔ یہ لڑائی خاندان قریش اور قبیلہ قیس میں ہوئی تھی، جس میں قریش کے سب خاندان شریک تھے۔ خاندان بنی ہاشم کا عَلَم زبیر بن عبدالمطلب کے ہاتھ میں تھا اور قریش حق پر تھے۔ اس لیے حضور کو شریک ہونا پڑا۔ اس وقت حضورؐ کی عمر شریف ۱۴ سال کی تھی سخت خونریزی کے بعد قریش غالب آئے۔ بالآخر حضورؐ کے طفیل صلح پر خاتمہ ہوا۔ مگر حضور نے تلوار ہاتھ میں لینے سے یہ کہہ کر انکار فرما دیا تھا کہ یہ ماہِ حرام ہے۔ اس ماہ قتل و خونریزی منع ہے اور اس چیز نے اہل مکہ کو صلح پر آمادہ کیا۔ کیونکہ ایام جہالت میں اہل عرب ماہ حرام میں جنگ کرنا جائز سمجھتے تھے۔

مبارک عہد اس جنگ نے بعض طبیعتوں کو اصلاح کی طرف راغب کر دیا تھا۔ چنانچہ جنگ فجار کے فوراً بعد زبیر بن عبدالمطلب نے یہ تجویز پیش کی کہ مکہ کے تمام باشندے ایک معاہدہ کریں کہ ہم میں کا ہر شخص مظلوم کی حمایت

کرے گا اور کوئی ظالم مکہ میں نہ رہنے پائے گا۔ اگرچہ اس قسم کا معاہدہ حضورؐ کی ولادت سے قبل بھی مکہ میں ہوا تھا جس کو حلف الفضول کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اب یہ معاہدہ رحمۃ للعالمینؐ کے زیر سایہ ہوا تھا، اس لیے کامیاب ہوا۔ حضور عہد نبوت میں فرمایا کرتے تھے کہ اس معاہدے میں میں شریک تھا کہ جس کی شرکت سے روکنے کے لیے سرخ اونٹ بھی دیئے جاتے تو قبول نہ کرتا اور آج بھی کوئی مظلوم اس قسم کے عہد کے لیے پکارے، تو میں حاضر ہوں۔

شادی کے سلسلہ میں عرب دو راستوں پر گامزن تھا۔ اولاً تو یہ کہ شادی کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ اکثر باپ کے ترکہ میں مال و دولت بیویاں بھی مل جاتیں اور ماؤں کو بیوی بنا لیتے یا جب کسی ایسے شخص کا انتقال ہوتا جس کا کوئی لڑکا نہ ہوتا، تو قریبی رشتہ داروں میں سے جو بھی جس عورت پر پہلے قبضہ جما لیتا، وہ اس کی ہو جاتی۔ لڑکیاں تو پیدا ہوتے ہی دفن کر دی جاتیں، مگر جو کسی وجہ سے بچ جاتیں اور جوان ہو جاتیں، تو ان کا بھی باپ کے مرتے بعد یہی حال ہوتا۔ دوسری صورت میں اگر شادی کرنا پڑتی تو اتنی رقم خرچ ہوتی کہ بڑے بڑے مالدار بھی برداشت نہ کر پاتے تھے۔

قافلہ تجارت کے ساتھ ملک شام کا دوسرا سفر جب حضورؐ کی عمر شریف تقریباً ۲۴ سال کی ہوگی کہ ایک دن آپؐ کے چچا نے حضورؐ کے سر مبارک پر دست شفقت رکھ کر فرمایا۔ بیٹا! میں سمجھتا ہوں کہ تم برابر میرا ہر کام میں ہاتھ بٹا رہے ہو۔ جب کوئی کام نہیں ہوتا ہے، تو بکریاں چراتے ہو اور خالی نہیں بیٹھتے۔ پھر بھی آج یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اب بحمد اللہ تم جوان ہو۔ گو عرب میں شادیاں بہت عمر میں ہوتی ہیں، مگر میں چاہتا ہوں کہ تمہاری شادی جلد کر دوں۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ شادی میں کتنی رقم کی ضرورت ہوگی اور میں بالکل مفلس ہوں بلکہ کافی قرض دار ہوں۔ قحط کی تیز دھوپ نے امیدوں کے درختوں کو جلا دیا ہے۔ حضور نے ارشاد فرمایا۔ اے چچا جان! آپ ہراساں نہ ہوں۔ میرے لیے جو حکم ہو، میں اس کے لیے تیار ہوں۔ ابو طالب نے کہا۔ آج کل خدیجہ کا کاروبار عروج پر ہے اور اس وقت اسے ایک دیانتدار اجیر کی ضرورت ہے۔ اگر تم چلے جاؤ تو دوسروں کے مقابل وہ تمہیں ترجیح دے گی۔ حضورؐ نے فرمایا اے چچا جان! مجھے اس کام میں کوئی عذر نہیں۔ مگر میں خود جا کر خدیجہ سے درخواست کروں، یہ میری خاندانی وجاہت کے خلاف ہے۔ بات معقول تھی ابو طالب خاموش ہو گئے، قدرت کا منشا ہی کچھ اور تھا۔ اس گفتگو کو کچھ زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ حضورؐ کی پھوپھی زاد بہن حضرت عاتکہ تشریف لائیں اور ابو طالب سے فرمایا کہ ہمارے بھائی محمد صلی اللہ علیہ وسلم فضل خدا سے اب جوان ہیں۔ کہیں شادی کی فکر کیوں نہیں کرتے۔ ابو طالب نے کہا مجھے بھی فکر ہے مگر قحط کی تیز دھوپ نے امیدوں کے درختوں کو جلا دیا ہے اور اس وقت میں کافی مقروض بھی ہوں۔ حضرت عاتکہ نے فرمایا اس وقت بی بی خدیجہ کا کاروبار بڑے زوروں پر ہے اور اسے ایک شخص کی ضرورت بھی ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس سے کہوں۔ ابو طالب نے کہا میں خود یہی چاہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں بھیج دیا۔ حضرت عاتکہ فوراً بی بی خدیجہ کے دولت کدہ کی طرف چل دیتی ہیں۔

حضرت بی بی خدیجہؓ کے مختصر حالات زندگی خویلد عرب بھر میں بڑے مالدار ملک التجار تھے۔ حضرت خدیجہؓ

ان کی اکلوتی بیٹی تھیں، آپ کا سلسلہ نسب پانچویں پشت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے ملتا ہے آپ کی ماں کا نام فاطمہ بن زائدہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے عرب بھر کا حسن حضرت خدیجہؓ کی ایک ذات میں جمع فرما دیا تھا، علم و ہنر نے ان کے حسن میں چار چاند لگا دیے تھے۔ ایسی پاک طینت اور پاکدامنہ تھیں کہ لوگ ایامِ جہالت میں بھی آپ کو سیدہ طاہرہ کے خطاب سے پکارتے تھے۔ اور آپ کی پاکدامنی اور حیا کی مثال پیش کرتے تھے، آپ کی پہلی شادی بناش ابن زرارہ تمیمی کے ساتھ ہوئی اور اس سے آپ کے دو لڑکے پیدا ہوئے ایک کا نام ہند اور دوسرے کا ہالہ تھا۔ اس لیے بناش کا خطاب ابو ہالہ ہو گیا۔ ہالہ کا انتقال ایامِ جہالت میں ہو گیا۔ اور ہند احضورؐ پر ایمان لائے اور صحابہ میں داخل ہوئے، حضورؐ کا حلیہ مبارک انہیں سے منقول ہے۔ نہایت فصیح و بلیغ تھے، حضرت علیؓ کے ساتھ جنگ جمل میں شریک تھے اور اسی جنگ میں شہید ہوئے۔

ابو ہالہ بناش کے انتقال کے بعد آپ کا دوسرا نکاح عتیق ابن عابد مخزومی کے ساتھ ہوا اس سے ایک لڑکی پیدا ہوئی، جس کا نام ہند تھا۔ یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں۔ مگر ان سے کوئی حدیث مروی نہیں ہے۔ کچھ دنوں بعد عتیق کا بھی انتقال ہوا۔ دوسرے شوہر سے حضرت خدیجہؓ کو بہت محبت تھی اس کے انتقال پر حضرت خدیجہؓ کو عظیم صدمہ پہنچا۔ آپ کے لیے اب دنیا میں کوئی کشش باقی نہ تھی۔ لہٰذا آپ دنیا سے بیزار ہو کر خانہ کعبہ میں اپنی زندگی گزارنے لگیں، وہ عرب جہاں بیوگی موت سے بدتر ثابت ہوئی ہے، یا تو وہ بیوہ مال غنیمت کی طرح دوسرے کی ملکیت میں چلی جائے اور زر خرید کنیزوں سے بھی زیادہ حقیر رہ کر زندگی گزارتی یا پورے ایک سال کی عدت اس طرح پوری کرتی کہ پیاس بھر سے زائد پانی نہ ملتا، غسل تو غسل ہاتھ منہ دھونے اور استنجا پاک کرنے تک کو پانی نہ دیا جاتا، جو کپڑے جسم پر ہوتے، ان کے علاوہ دوسرا کپڑا نہ دیا جاتا، غرض وہ جب عدت کی موت سے بچ جاتی، تو کہیں دوسرے سے شادی کرنے کے لائق ہوتی، مگر اب دوسری شادی ہونا اس سے زیادہ اہم کام ہوگا، بخلاف اس کے حضرت خدیجہ اپنی عدت کے دن کعبہ معظمہ کے طواف اور عبادت خدا میں گزارتیں، آپ کو دوسری شادی کرنے کا خیال نہیں تھا۔ اس لیے کسی قانون کی پابندی ضروری نہ سمجھی، عدت کے دن گزر رہتے اور بڑے بڑے مالدار نوجوانوں کے پیغامات آنا شروع ہو جاتے۔ یہی دوسرے شوہر کے انتقال پر بھی ہوا، مگر اب آپ نے صاف صاف انکار کر دیا اور باقی زندگی کاہنہ اور عبادت گزار عورتوں کی صحبت میں گزار دینے کا عزم صمیم کر لیا، اکثر ان کاہنہ عورتوں سے آنے والے حالات پر گفتگو کرتی رہتیں جس سے آپ کو یہ تو معلوم ہو ہی چکا تھا کہ عرب میں ایک ذات ایسی بھی ہوگی، جو نبوت کا اعلان کرے گی اور ان کا دین تمام ادیان سابقہ پر غالب آئے گا۔

ایک دن خویلد نے حضرت خدیجہ کو بلا کر کہا۔ اے بیٹی! اب میں بوڑھا ہو چکا، تجارت کا بار اب مجھ سے نہیں اٹھتا کوئی بیٹا نہیں جس کے سپرد یہ کام کیا جائے۔ لے دے کر صرف تم ہو۔ تو تم نے بھی دنیا سے بیزاری کا اظہار کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے، بتاؤ میں کیا کروں؟

بی بی خدیجہؓ نے جواب دیا۔ اے والد بزرگوار آپ پریشان نہ ہوں۔ اس کام کو میں اپنے ذمہ لیتی ہوں۔ آپ نے اپنے حسن انتظام سے تجارتی مرکز کو اپنے قبضہ میں لیا اور چند ہی روز میں کئی گنا ترقی پر پہنچا دیا۔ آپ کا قافلہ تجارت مصر، عراق، شام تک جاتا جس کا سردار آپ کا غلام میسرہ ہوا کرتا تھا۔ وہ ایک ہوشیار تاجر تھا مگر بی بی خدیجہؓ کو یہ فکر تھی کہ میسرہ ایک غلام ہے۔ قافلہ کے لوگ اس کی سرداری مجبوراً تسلیم کرتے ہیں۔ اگر کوئی شریف النسب، دیانتدار ہوشیار آدمی مل جائے تو کام اور بڑھ سکتا ہے۔ اس ضرورت کا اعلان کر دیا گیا۔

ایک حسین خواب

جس دن حضرت عاتکہ بی بی خدیجہ کے یہاں پہنچیں، اسی رات بی بی خدیجہ نے ایک حسین خواب دیکھا کہ چاند میری گود میں اتر آیا ہے اور میں نے اسے اپنے دامن میں چھپا لیا ہے۔ صبح کو یہ خواب لکھ کر ایک راہب کے پاس بھیجا۔ اس نے تعبیر میں کہلا بھیجا کہ نبی آخر الزماں جو کہ پیدا ہو چکے ہیں وہ تمہیں اپنے نکاح میں لائیں گے۔ اس دن خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی اور یہ خیال کر رہی تھیں کہ نہ معلوم وہ ذات گرامی کون ہے کہ حضرت عاتکہ پہنچیں۔ بی بی خدیجہ اور تمام خدمت گار تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے۔ نہایت ادب سے مسند پر بٹھایا اور دریافت کیا کہ اے سیدہ عرب! آج یہاں آنے کی تکلیف کیونکر گوارا فرمائی۔ حضرت عاتکہ نے فرمایا۔ اے ملکہ عرب! میں اس لیے آئی ہوں کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کو ایک آدمی کی ضرورت ہے اور جن خصوصیات کا حامل انسان آپ کو درکار ہے، وہ سب فضائل ایک ذات میں ملنا دشوار ہیں۔ مگر آپ چاہیں تو میں ایک ایسا آدمی آپ کو بتا سکتی ہوں جو آپ کے قافلہ کے ساتھ جانے کو بھی تیار ہے۔

بی بی خدیجہؓ نے بے چینی سے دریافت کیا، وہ کون ہے؟

حضورؐ کی بی بی خدیجہؓ کے قافلے میں شمولیت

آپ نے فرمایا، میرے بھتیجے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ سنتے ہی بی بی خدیجہؓ کی رگوں میں خون جوش مارنے لگا اور آپ کو اپنے خواب کی صداقت کا گمان یقین میں تبدیل ہو گیا اور فرمایا مجھے منظور ہے جو معاوضہ دوسرے کو دیتی ہوں، اس سے دوگنا دوں گی۔ کیا آپ انہیں یہاں بلا سکتی ہیں، امور تجارت کے متعلق کچھ گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔ حضرت عاتکہ نے فرمایا، میں ابھی انہیں اپنے ہمراہ لے کر آتی ہوں۔ یہ کہہ کر آپ چلی آئیں۔

حضرت بی بی خدیجہؓ نے اپنے خدمت گاروں کو بلا کر اپنی نشست گاہ کی صفائی اور سجاوٹ کا حکم دیا۔ اپنی نشست پر ایک باریک پردہ ڈالا اور ادب سے بیٹھ کر حضورؐ کی تشریف آوری کا انتظار کرنے لگیں۔ ادھر حضرت عاتکہ نے ابوطالب کو خوشخبری سنائی اور حضورؐ کو لے کر دولت کدۂ بی بی خدیجہ پر پہنچیں۔ بی بی خدیجہ نے پس پردہ کھڑے ہو کر استقبال کیا مگر حضورؐ کا رعب حسن ان پر ایسا غالب ہوا کہ ایک نظر بھی نہ دیکھ سکیں، گفتگو کرنا تو بڑی بات تھی۔ کچھ دیر بعد حضرت عاتکہ سے فرمایا، میں جو کچھ سمجھانا اور بتانا چاہتی تھی، آپؐ اس سے کہیں زیادہ جانتے ہیں۔ بہتر ہے کہ آپ کو لباس سفر پہنا کر جلد بھیج دیجیے۔ میرا قافلہ تیار ہے۔ ادھر بی بی خدیجہ نے اپنے غلام میسرہ کو بلا کر فرمایا۔ اے میسرہ دیکھو! اس سفر میں میرا قافلہ بن کر محمد صلی اللہ

علیہ وسلم) جا رہے ہیں، تو ان کی اطاعت و فرماں برداری اس طرح کرنا جس طرح میری کرتا ہے۔ اور ایک قصبی خلعت دے کر فرمایا، دیکھ جب یہاں سے قافلہ چلے تو سب سے اگلے سجے ہوئے اونٹ کی مہار ان کے دست مبارک میں دے دینا۔ شہر کے آخری پڑاؤ تک وہ اسی طرح جائیں گے۔ اور جب اس پڑاؤ سے قافلہ آگے بڑھے تو یہ خلعت انہیں پہنا کر اسی اونٹ پر بٹھا دینا اور اس کی مہار ساربانوں کی طرح تو خود پکڑ کر ساتھ ساتھ چلنا۔

مکہ سے روانگی میسرہ نے وعدہ کیا اور چلا گیا۔ حضور بھی قافلہ میں پہنچ چکے تھے۔ میسرہ نے سب سے آگے والے اونٹ کی مہار حضور کے دست مبارک میں دے کر آگے بڑھنے کے لیے کہا۔

شہر کے بہت لوگ اپنے عزیزوں، رشتہ داروں کو رخصت کرنے پڑاؤ پر آئے ہوئے تھے۔ انہیں میں حضرت عاتکہ اور ابو طالب بھی تھے۔ ابو طالب نے حضور کو اونٹ کی مہار پکڑے پیادہ پا دیکھا تو کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ آنکھوں سے اشکوں کا مینہ برسنے لگا۔ اور حضور کو اس مقام پر پہنچانے کا مجرم اپنے آپ کو سمجھنے لگے۔ حضرت عاتکہ سے برداشت نہ ہو سکا اور اس طرح پکار اٹھیں، اے عبد المطلب ذرا خاک لحد سے سر نکالو اور دیکھو کہ جسے آپ نے بڑے ناز و نعم سے پالا تھا، زمانہ اس کے ساتھ کیا سلوک کر رہا ہے اے آمنہ رض لحد سے باہر آؤ اور دیکھو تمہارا لاڈلا آج کس حال میں ہے۔ وہ جو حلیمہ کی بکریاں لے کر جنگل کو جائے تو فرشتے آکر جنگل کو صاف کریں، ابر جس کے سر پر سایہ کرے، وہ جسے چرند پرند سجدے کریں۔ مگر آج وہ پیادہ پا، بطور اجیر ملک شام کا طویل و کٹھن سفر کرنے جا رہا ہے۔

وہ اونٹوں کو مکہ سے لے جانے والا   پیادہ در شہر تک جانے والا
خدیجہ کو جلووں سے تڑپانے والا   وہ بے باپ، بے ماں گزر کرنیوالا

امیں اور امانات عرشی کا حامل
متیں اور حفظ شرافت میں کامل

مہار اونٹ کی ہاتھ میں اپنے لے کر   چلا جانب شام محبوب داور
فرشتوں نے کی عرض اے رب اکبر   یہ کس حال میں ہیں جناب پیغمبر

ہوا حکم یہ گر ہے پیغمبری کا
یہ آغاز ہے شیوۂ رہبری کا

محمد ہے انسان و حیواں کا رہبر   محمد ہے ہر قوم عریاں کا رہبر
محمد ہے گرد بیاباں کا رہبر   زمانے کا ہادی ہے دوراں کا رہبر

نبوت جلو میں کھڑی کہہ رہی ہے
مہار اس کے ہاتھوں میں کونین کی ہے

دوست دشمن غرض یہ قافلہ شہر سے باہر ایک پڑاؤ پر مقیم ہوا۔ اس قافلہ میں ازلی دوست دشمن سب ہی تھے۔ ننہ دوستوں

کو یہ خبر تھی کہ کل اس بارگاہِ بیکس پناہ سے کیا اعزاز انہیں ملنے والا ہے، نہ دشمنوں کو اس کا علم تھا ہمیں ان کی بارگاہ سے کیا ذلت و خواری نصیب ہو گی۔ مگر ازلی عداوت اور ازلی محبت دونوں کارفرما تھیں۔ جب اس پڑاؤ سے قافلہ روانہ ہوا تو میسرہ نے حضرت خدیجہؓ کے حکم کے مطابق وہ قیمتی خلعت حضورؐ کو پہنایا اور اس زر و جواہرات سے سجا ہوا امیرِ قافلہ اونٹ پر بٹھا دیا گیا۔ اور اس اونٹ کی مہار سار بانوں کی طرح اپنے کاندھے پر ڈال لی۔ ابوجہل بھی اسی قافلہ میں تھا۔ یہ منظر دیکھ کر جل گیا دوڑا ہوا آیا اور میسرہ سے کہا۔ اے میسرہ یہ تو نے کیا کیا۔ یہ ابھی کم عمر ہیں۔ شاید عمر کا دوسرا سفر ہے انہیں تو موٹے کپڑے پہننے کو دے اور محنت و مشقت سے کام لے، تاکہ تکالیف سفر کا تجربہ ہو۔ میسرہ نے کہا، میں تیرا غلام نہیں، جو تیرے حکم پر عمل کروں مجھے جو میری ملکہ کا حکم ملا ہے، اس کے موافق کر رہا ہوں۔ یہ سن کر وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

دو تھکے اونٹوں کا دستِ شفا سے کھڑا ہو جانا قافلہ کو ٹھہرے کافی دیر ہو چکی تھی کہ حضورؐ نے میسرہ سے دریافت کیا۔ اے میسرہ! یہ قافلہ کیوں رکا ہوا ہے۔ میسرہ نے جواب دیا کہ درمیان کے دو اونٹ نہ معلوم بیمار ہیں یا تھکے ہوئے ہیں کہ اٹھتے ہی نہیں۔

حضورؐ یہ سن کر اپنے اونٹ سے نیچے تشریف لائے اور ان تھکے ہوئے اونٹوں کے پاس تشریف لے گئے۔ یکے بعد دیگرے دونوں کی پشت پر اپنا دست مبارک پھیر دیا۔ وہ دونوں فوراً کھڑے ہو گئے اور چلنے لگے۔ اب تک میسرہ بی بی خدیجہ کے حکم سے حضورؐ کی خدمت کر رہا تھا، مگر یہ کرشمہ دیکھ کر اس کے قلب میں حضورؐ کی سچی محبت و عظمت پیدا ہو گئی اور اب اس نے دل سے حضورؐ کی خدمت کرنا شروع کر دی۔

نسطورا راہب غرض یہ قافلہ منزل در منزل قیام کرتا بُصریٰ کے پڑاؤ پر اترا۔ بُصریٰ چونکہ پہلا تجارتی مرکز تھا۔ یہاں زیادہ دنوں قیام کرنا تھا۔ اس لیے قافلہ والوں نے اپنے اونٹوں سے کود کود کر جلدی جلدی درختوں کے سایہ کو گھیرنا شروع کر دیا اور اپنے اپنے بستر لگا کر سامان اتارنے کی فکر میں لگ گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بڑے اطمینان سے نیچے تشریف لائے اور دیکھا کہ تمام درختوں کے سائے گھر چکے ہیں۔ صرف ایک طرف ایک خشک درخت کھڑا ہے جس میں ایک پتہ بھی نہیں۔ آپ بلا تکلف اسی طرف چلے اور اس درخت کے نیچے چادر مبارک بچھا کر بیٹھ گئے۔ آپ کا بیٹھنا تھا کہ وہ درخت سرسبز و شاداب ہو کر سایہ کر لیتا ہے۔ اس منظر کو نسطورا راہب جس کی خانقاہ قریب ہی تھی۔ بالاخانے پر سے دیکھ رہا تھا۔ وہ گھر میں گیا اور ایک کتاب لے کر دوڑا ہوا حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سامنے کھڑا ہو گیا کبھی اپنی کتاب کی ورق گردانی کرتا اور کبھی کتاب نور پر نظر ڈالتا۔ آخر کار بلند آواز سے پکار اٹھا۔ اے قافلے والو! آنکھوں کے اندھو! تمہیں خبر ہے کہ یہ ذات شریف کون ہیں۔ خدا کی قسم میری کتاب میں صاف لکھا ہے کہ اس درخت کے نیچے کوئی نہیں بیٹھ سکتا۔ مگر نبی۔ میری کتاب میں جو نشانیاں اس نبی کی لکھی ہیں، وہ سب ان میں موجود ہیں میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ وہ نبی آخر الزماں ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم) جن کی بشارت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی۔ میں انہیں کے شوقِ زیارت میں ایک مدت سے ٹھہرا ہوا ہوں۔ الحمد للہ

کہ آج کامیاب ہوا۔ کاش میری عمر عہد نبوت تک وفا کرتی کہ میں بھی آپ کا دین متین اختیار کرتا۔

میسرہ نے شور سن کر نظر اٹھائی تو حضورؐ کے قریب نسطورا راہب کو کھڑا دیکھا۔ گمان ہوا کہ یہ حضور پر کچھ ناراض ہو رہا ہے۔ میسرہ نے تلوار کھینچی اور خزیمہ کو، جو بی بی خدیجہؓ کے بھانجے تھے، انہیں پیچھے آنے کا اشارہ کر کے آگے بڑھ گیا۔ خزیمہ کو بھی یہی گمان ہوا، جو میسرہ کو ہوا تھا۔ انہوں نے بھی تلوار ہاتھ میں لے لی۔ حضورؐ نے جب ان دونوں کو غصہ میں آتے دیکھا تو اشارے سے ضبط کی تلقین فرمائی۔ ان دونوں نے تلواریں نیام میں ڈال لیں اور کان اس کی گفتگو پر لگائے۔ جب بات سمجھ میں آئی کہ یہ تو حضور کی تعریف کر رہا ہے، تو ادب سے دست بستہ ہو کر سننے لگے اس طرف نسطورا کی پشت تھی۔ جب اس نے اپنا کلام ختم کیا، تو ان کی طرف دیکھ کر پوچھا کہ تم دونوں کا ان ذات شریف سے کیا تعلق ہے۔ ان دونوں نے بیک زبان کہا، ہم دونوں حضورؐ کے غلام ہیں۔ نسطورا نے کہا تمہارا قافلہ ملک شام جا رہا ہے۔ وہاں یہودی زیادہ ہیں۔ ان کو بھی نبی آخر الزماں کی ولادت کی خبر مل چکی ہے۔ ان کی کتابوں میں ان کا حلیہ بھی لکھا ہوا ہے۔ جس طرح میں نے انہیں پہچان لیا، اسی طرح وہ بھی پہچان لیں گے۔ یہودیوں کو ان کے عالموں نے یہ بتا کر کہ یہ نبی ہیں، یہودیوں کو فنا کر دینے والے ہیں۔ ان کا جانی دشمن بنا دیا ہے۔ اگر تم میرا کہا مانو، تو ملک شام نہ جاؤ یا انہیں اپنے ہمراہ نہ لے جاؤ۔

بُصریٰ کا بازار

میسرہ نے خزیمہ کی طرف اور خزیمہ نے میسرہ کی طرف دیکھا۔ کیونکہ یہ مرحلہ ایسا نہیں تھا کہ آسانی سے طے ہو سکے۔ اصل مرکز تجارت شام ہی تھا، بغیر وہاں جائے کامیابی ناممکن تھی مگر خزیمہ نے کہا اے میسرہ! سوچتے ہو کیا ہو۔ بی بی خدیجہ راضی ہوں یا ناراض، تم آگے جانے کا ارادہ ہی ملتوی کر دو۔ میں دیکھ لوں گا۔ یہ سن کر میسرہ نے کہا، اے سردار! ایسا ہی ہو گا۔ کیونکہ اب میں حضور کو ساتھ لے کر نہ ملک شام جا سکتا ہوں، نہ تنہا چھوڑ سکتا ہوں، جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

قدوم مُبارک کی برکت

دوسرے دن بصرے کے بازار میں سارے قافلے نے اپنا مال لگایا۔ خدا کی قدرت اور حضور کے قدوم مبارک کی برکت کہ ہر ایک کا مال اسی بازار میں فروخت ہو گیا اور مال بھی زیادہ نفع سے فروخت ہوا۔ اور بی بی خدیجہؓ کے مال میں تو ہر سال گزشتہ سے دس گنا منافع ہوا۔ جب قافلہ کا کل مال فروخت ہو گیا، تو بُصریٰ کے بازار سے ان لوگوں نے اناج وغیرہ وہ چیزیں خریدیں، جو مکہ میں لا کر فروخت کی جائیں۔

عہد نبوی کی سیاست خارجہ کا شاہکار

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ تاریخ عالم میں ایک انقلابی نقطہ اور ایک عہد آفریں دور کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایران اور روم کی سلطنتیں دنیا پر چھا جانے کی کوشش میں باہم زندگی و موت کی آویزش میں مبتلا ہو گئیں تھیں۔ اگرچہ چین اور ہند میں بھی متمدن قومیں حکمران تھیں۔ لیکن بحر متوسط اس زمانے میں بھی نہ صرف جغرافیائی اعتبار سے بلکہ سیاسی و معاشی حیثیت سے "وسط الارض" (میدی ترانین) تھا۔ یونان اس سمندر پر آباد ہے، تو روم بھی، مصر و شام بھی اس کے ساحل پر ہیں، تو خود عرب کی شمالی سرحدیں اسی پر ختم ہوتی ہیں۔ ایران بھی اپنے حدود مملکت اس تک پہنچانے کی کوشش میں تھوڑی مدت کے لیے کئی بار کامیاب ہو چکا تھا۔ قدرت نے عرب کو ایشیا، یورپ اور افریقہ کے تینوں براعظموں کے بیچوں بیچ پیدا کیا ہے اور اس عرب میں بھی مکہ آباد ساحلی علاقے کے وسط میں واقع ہے اور یہ کوئی شاعری نہیں بلکہ ایک واقعہ ہے کہ مکہ معظمہ نافِ زمین پر آباد ہے اور پرانی دنیا کی کونی عالمگیر تحریک اس سے بہتر مرکز شکل سے پا سکتی ہے۔ یورپ کی سردیوں، افریقہ کی گرمیوں اور ایشیا کی سرسبزیوں میں سے ہر ایک کا کچھ نہ کچھ حصہ حجاز کو عطا ہوا ہے اور اس امر نے وہاں والوں کو تینوں براعظموں کی اخلاقی خوبیاں عطا کر دی تھیں۔ جنگی نقطہ نظر سے بھی اس سے محفوظ مقام کم مل سکتے ہیں۔ ۱۳ ق ھ ۶۰۹ء میں پیغمبر اسلامؐ نے اپنے آبائی شہر مکہ میں اصلاح دین کی کوشش شروع فرمائی، اور معدودے چند لوگوں کے ہم خیال ہونے کے ساتھ ساتھ عام اہلِ ملک کی دشمنی اور عملی مخالفت میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا۔ آخر تیرہ کٹھن سالوں کے اختتام پر ۱ھ ۶۲۲ء میں آپؐ کو وطن سے بے وطن ہو کر مدینہ منورہ جا رہنا پڑا۔ جیسا کہ معلوم ہے، نراج میں آپ نے ایک تنظیم پیدا کرنے اور ایک شہری مملکت کے قائم کرنے میں کامیابی حاصل فرمائی، جس کا تحریری دستور تاریخ نے آج تک (۵۲) دفعات کی ایک دستاویز کی صورت میں محفوظ رکھا ہے[1]۔ مدینہ آنے کے چند ہی مہینوں بعد آپ آس پاس کے قبائلی علاقوں کا دورہ فرمانے اور ان سے حلیفانہ تعلقات فرمانے لگے۔ چنانچہ مدینے سے ینبع تک جو علاقہ ہے، وہاں کے قبائل (بنی ضمرہ مُدلج وغیرہ) نے باوجود اسلام قبول نہ کرنے کے اس بات پر آمادگی ظاہر کی کہ اگر کوئی مدینہ پر حملہ آور ہو تو یہ مسلمانوں کو مدد دیں اور اگر ان کے علاقے پر کوئی چڑھائی کرے، تو مسلمان ان کو مدد دیں۔ البتہ جارحانہ پیش قدمی میں غیر جانبداری برتی جائے[2]۔ یہ وہی علاقہ ہے، جہاں سے کاروانی قافلے گزرا کرتے تھے۔ اور مکے والے اگر شام، مصر یا عراق جانا چاہتے تو اسی راستے سے گزرتے تھے۔ اس راستے کی بندش

---

[1] اس پر میرا مضمون "دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور"، مجلہ طیلسانین حیدر آباد دکن جولائی ۱۹۳۹ء ملاحظہ ہو۔

[2] ان کے متن کے لیے دیکھیے میری عربی تالیف الوثائق السیاسیہ (قاہرہ ۱۳۶۰ھ)

قریش پر معاشی دباؤ ڈالنے میں اتنی موثر ثابت ہوئی کہ بدر کی فاش شکست بھی انہیں اتنا بے بس نہ کر سکی۔ ۳ھ میں احد میں مسلمانوں کو صدمہ پہنچا، لیکن فوراً ہی انہوں نے اس کی تلافی یوں کی کہ نجد کے علاقے میں جو مدینے کے مشرق میں ہے، اپنے اثرات پھیلائیے اور مکے والوں کو عراق جانے کا جو متبادل کو کلیف وہ راستہ باقی رہ گیا تھا، وہ بھی بند ہو گیا۔ اسی اثنا میں بنی قینقاع اور بنی النضیر کے یہودی مضافات مدینہ سے جلاوطنی پر مجبور ہوئے، تو انہوں نے مدینہ کے شمال میں خیبر وغیرہ کی یہودی بستیوں میں جا کر بسنا اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنی شروع کیں اور قریش و غطفان وغیرہ قبائل کو ورغلانا آغاز کیا۔ عرب کے شمال میں دومۃ الجندل ایک بڑا اہم کاروانی جنکشن تھا۔ مدینہ آنے والے کاروانوں کو یہاں چھیڑا جانے لگا[1] جو کوئی تعجب نہیں کہ یہودی سرمایہ داروں کے اثرات ہی کے باعث ہو اور انہیں یہودیوں کی کوشش سے غطفان و فزارہ نے ایک طرف سے اور قریش اور ان کے حلیفوں نے دوسری طرف سے خندق کے معرکے میں مدینے کا محاصرہ کیا اور انتظام کر لیا گیا کہ عین نازک لمحے میں مدینے کے اندر کے باقی یہودی یعنی بنی قریظہ بھی غداری کریں جب کسی طرح یہ بلا ٹلی اور بنی قریظہ کو اپنے کیے کی سزا بھگتنی پڑی، تو خیبر و تیماء اور وادی القریٰ و مقنا وغیرہ کے یہودیوں نے مسلمانوں کے خلاف نئے سرے سے شدید جد و جہد کا آغاز کیا۔

یہ مسلمانوں کے لیے بڑا نازک زمانہ تھا۔ شمال میں خیبر وغیرہ یہودی قوت کے مرکز تھے۔ شمال مشرق میں فزارہ و غطفان کے قبائل خیبر والوں کے حلیف تھے اور ان کی مسلمانوں سے بنتی نہ تھی اور جب موقع ملتا، یہ مسلمانوں کی تاخت کے درپے رہتے تھے[2] جنوب میں مکہ تھا، جس کی قوت چاہے معاشی طور سے متاثر ہوئی ہو، جنگی حیثیت سے برقرار تھی اور یہ سب کے سب غم و غصہ سے بیقرار اور مسلمانوں کے خلاف خار کھائے بیٹھے تھے اور سابقہ ناکامیوں کی خلش الگ تھی۔ آثار یہ نظر آ رہے تھے کہ خیبر میں جا بسے ہوئے (جلاوطنان مدینہ یعنی) بنی النضیر کی کوششیں رنگ لائیں گی اور یہودی غطفان اور قریش سہ گانہ قوت مدینے پر ہلہ بول دے گی۔ جس کی مدافعت آسان نہ تھی۔ معرکہ خندق ہی دس ہزار کا لشکر مدینہ پر چڑھ آیا تھا جس میں یہود شریک نہ تھے۔ مجوزہ حملے میں کچھ نہیں تو تین چار ہزار مزید سپاہیوں کا اضافہ ہو جاتا۔ خندق میں جوان اور بچے ملا کر مسلمانوں کے پاس کوئی تین ہزار آدمی تھے۔ اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا۔

ضرورت تھی کہ خیبر اور مکہ دونوں کی قوت کا استیصال کیا جائے۔ مگر مسلمانوں کے پاس اتنی قوت نہ تھی کہ وقت واحد میں ان دونوں مرکزوں پر حملہ کر سکتے یا کم از کم مدینے کی مدافعت کے قابل محافظ دستہ چھوڑ کر کسی ایک مرکز کو تباہ کر سکنے والی فوج روانہ کر سکتے۔ ساتھ ہی اس کا بھی خوف لگا ہوا تھا (جیسا کہ شمس الائمہ سرخسی نے کتاب المبسوط[3] میں نہایت بالغ نظری اور تہ بینی سے واضح کیا ہے) کہ اگر مسلمان مکہ جاتے ہیں، تو خیبر و غطفان مدینے پر چڑھ نہ دوڑیں اور اگر مسلمان خیبر جائیں تو مکہ والے اپنے مواشی

---

۱ التنبیہ والاشراف للمسعودی ص ۲۴۸

۲ عُیَینہ بن حصن الفزاری کی تاخت مدینہ کی طرف اشارہ ہے۔

۳ جلد ۱۰ ص ۸۶۔

والوں کے ساتھ آکر مدینہ لوٹ نہ لیں۔ کیونکہ مدینہ بیچوں بیچ واقع ہے۔ خیبر اس کے شمال میں کوئی آٹھ منزل کی مسافت پر ہے تو مکہ اس کے جنوب میں بارہ منزل پہ ہے۔

ان حالات میں سیاست دانی کا اقتضاء یہی ہو سکتا ہے کہ دونوں میں سے کسی ایک دشمن سے صلح کر کے دوسرے کے مقابلے میں اس کو دوست ورنہ کم از کم ناطرفدار بنا دیا جائے اور جب ایک سے فراغت ہو جائے گی، تو دوسرا خود ہی ہتھیار ڈال دے گا اور اسے پھر سر زوری کی جرأت نہ ہوگی۔ سوال یہ تھا کہ صلح مکے والوں سے کی جائے یا خیبر والوں سے؟ خیبر کے حلیف و معاون یعنی فزارہ و غطفان محض لوٹ مار کے شایق اور بالکل بے اصول خانہ بدوش عرب تھے۔ خیبر میں یہودی تھے، جو تمدنی اور نسلی وجوہ سے عربوں سے الگ تھے۔ ان کو اپنی جلاوطنی اور جائیداد کے لٹنے کا داغ تھا۔ جو جائداد کی واپسی کے بغیر مٹ نہ سکتا تھا۔ سرمایہ داری کی وجہ سے کوئی معمولی "سرمایہ الاحتفاظ" ان کو مطمئن نہ کر سکتا تھا اور نہ ہی ان کی بات پر کوئی اعتماد کیا جا سکتا تھا شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ خیبر کا مالدار مرکز ایک نسبتاً غیر جنگ جو قوم کے قبضے میں ہونے سے آسان تر مالِ غنیمت بھی تھا۔

دوسری طرف مکہ مسلمانوں کے لیے بہت سی رعایتوں کا متقاضی تھا۔ مسلمان مہاجرین سب مکی ہی تھے اور اہلِ مکہ ان کے رشتہ دار، کعبہ مسلمانوں کی نماز کا قبلہ اور حج کی منزلِ مقصود تھا۔ اہلِ مکہ کی تباہی سے زیادہ ان کا اسلام زیادہ مفید ہو سکتا تھا۔ کیونکہ قریش کے معاشی اور تمدنی تعلقات تمام عرب سے تھے اور ان کی صلاحتیں تمام عرب میں سب سے زیادہ تھیں۔ کیونکہ ان میں بات کا پاس تھا، وہ دھن کے پکے تھے، قومی مفاد کے لیے تن من دھن سے لگ جاتے تھے۔ طبیعت مہمات پسند تھی، ادبی ذوق اور انتظام ملک کی قابلیت و ملکہ بھی عام بدویوں کے مقابلے میں ان میں کہیں بڑھا ہوا تھا اور شاید یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے معاشی دباؤ کے باعث اب وہ واقعی صلح پر آمادہ بھی ہو چکے تھے اور صرف لاج رکھنے کے لیے کسی اچھی شرط کے منتظر تھے۔ اتفاق سے اسی زمانے میں حجاز میں سخت قحط پڑا تھا۔ اور مکے والوں کی رسد کے مرکز یمامہ پر بھی مسلمانوں کا (ثمامہ بن اثال کے اسلام لانے کے باعث) قبضہ ہو کر درآمد بند ہو گئی تھی۔[1] رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بندش کا اثر محسوس کرا دینے کے بعد اپنی مرضی اور اختیار سے ممانعت اٹھا[2] کر نیز مکے والوں میں سے غربا و فقرا کی امداد کے لیے سرمایہ قحط میں اس زمانے میں پانچ سو اشرفیاں روانہ کر کے[3] وہاں کے عوام کے دل موہ لیے تھے اور مکے کے سب سے بڑے اور با اثر سردار ابو سفیان کی لڑکی بی بی ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے جو حبشہ گئی ہوئی تھیں، اس زمانے میں عقد غائبانہ کر لیا تھا۔ نیز مختلف سامانِ ضرورت (کھجور وغیرہ) ابو سفیان کو "ہدیہ" بھیج کر معاوضہ میں جانوروں کی کھالیں طلب کی تھیں۔[4] غرض باوجود حالتِ جنگ قائم رہنے کے یہ خاموش دلدہی کے کام جاری تھے۔ قریش کے حج کا زمانہ بھی آگیا تھا جس میں وہ مسلسل

۱؎ سیرۃ ابن ہشام ص ۹۹۷ تا ۹۹۸۔ استیعاب ابن عبدالبر، سوانح عمری ص ۲۷۰۔

۲؎ ایضاً۔

۳؎ مبسوط سرخسی جلد ۱۰ ص ۹۱ تا ۹۲۔ شرح السیر الکبیر سرخسی جلد ۱ ص ۶۹۔

۴؎ مبسوط سرخسی جلد ۱۰ ص ۹۲ شرح السیر الکبیر سرخسی جلد ۱ ص ۷۰۔

تین ماہ تک لڑائی بھڑائی حرام سمجھتے اور اس میں ان کا سخت ترین دشمن بلکہ قابل قصاص ملزم بھی ان کے شہر میں انہیں ملتا تو اس پر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔ مسلمانوں نے بھی قریش ہی کے کعبے کو اپنا قبلہ بنا لیا تھا اور حج کعبہ کو بھی اپنے دین کا جزء بنا لیا تھا جس کا نفسیاتی اثر قریش پر پڑے بغیر رہ نہ سکتا تھا۔

ان حالات میں معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سوچا کہ اگر حج کے مہینوں میں مکہ جائیں اور ارادہ طواف کعبہ اور قربانی وعمرہ کے لیے ہو اور قریش کو منہ مانگی شرطیں پیش کی جائیں، تو کوئی تعجب نہیں جو وہ صلح پر آمادہ ہو جائیں اور اتفاق سے اسی زمانے میں نینوا کے مقام پر ایران وروم کی صدیوں سے چلی آنے والی جنگ ایران کی مکمل اور قطعی شکست پر منتج ہوئی تھی اور کچھ اور نہیں تو عرب میں جو "لا وارث" ایرانی صوبے مثلاً یمن، بحرین اور عمان تھے، ان کے متعلق حسب دلخواہ کارروائی کرنے کا اس بین الاقوامی صورت حال کے باعث ایک خداداد اور نادر موقع بھی ہاتھ آ گیا تھا۔ یمامہ پر قبضہ کے باعث مسلمان پہلے ہی بحرین و عمان کے قریب پہنچ گئے تھے۔ قریش کا ہموار ہونا ان کا راستہ بھی کھول دیتا تھا اور رومیوں کی نینوا میں کامیابی ابھی فی الحال شمال میں کسی بڑی کارروائی میں مانع تھی۔

ہمیں معلوم ہے کہ مدینے میں قابل کار مسلمان مرد تقریباً تین ہزار تھے۔ اب ذی قعدہ کے مہینے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم چودہ سو آدمیوں کے ساتھ مدینے سے چلتے ہیں۔ حج کا احرام بندھا ہوا ہے اور ساتھ قربانی کے جانور ہیں اور ارادہ محض سالانہ ہے اس لیے ساتھ جنگی ہتھیار تک نہیں ہیں۔ (البتہ کچھ دور جانے کے بعد حضرت عمرؓ کے مشورے سے احتیاطاً مدینے سے فوجی مخزن منگا لیا جاتا ہے[2]۔ جو ساتھ تو رہتا ہے مگر بند حالت میں) مسلمان کافی فوج مدینے میں چھوڑ گئے تھے۔ اور خاموشی کے ساتھ حدیبیہ کے مقام پر پہنچ گئے تھے۔ جہاں سے حدودِ حرم شروع ہوتے ہیں۔ جہاں سے ساحلی میدان ختم ہو کر دشوار گزار وادیاں اور پہاڑی سلسلے شروع ہوتے ہیں مکے والوں کو اطلاع مل گئی تھی اور جنگی نقطہ نظر سے حدیبیہ کے درے کے دہانے پر حریف کو روکنے سے بہتر ان کے لیے کوئی اور مقام نہیں مل سکتا تھا۔ یہ جگہ مکہ سے صرف دس بارہ میل پر واقع ہے اور ایک طرح قریش اپنے گھر ہی میں رہ کر دور دراز سے آئی ہوئی اور ہر طرح کی رسد اور مدد سے منقطع اسلامی فوج سے لڑ سکتے تھے۔

حدیبیہ میں آتے ہی سفارتی سرگرمی شروع ہو گئی۔ قریش کے نمائندے اور کارندے آ آ کر مقصد معلوم کرنے لگے آخر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے داماد حضرت عثمانؓ کو مکہ بھیجا کہ مختار کل کی حیثیت سے گفت وشنید کر سکیں۔ عجیب بدنظمی تھی اور کوئی مرکزیت نہیں پائی جاتی تھی۔ ان کا سب سے بااثر سردار ابوسفیان بھی کسی نامعلوم راستے سے چھپ چھپا اور بچ بچا کر ان دنوں شام گیا ہوا تھا۔ اسی لیے حضرت عثمانؓ نظر بند ہو گئے اور ان کی واپسی میں دیر ہوئی تو مسلمانوں کو خوف ہوا کہ کہیں انہیں شہید نہ کر دیا گیا ہو۔ اب مسلمانوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور حدیبیہ میں انہوں نے مرتے مارنے کا اقرار

---

۱ دیکھیے گرلانڈ کی جرمن کتاب "قیصر ہرقل کی جنگی مہمیں"

۲ تاریخ طبری صہ ۱۵۳۱۔

کیا جس کا "اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ" کے الفاظ میں قرآن مجید میں بھی ذکر ہے۔ قریش کو خبر ملی تو وہ گھبرائے آخر صلاح کر کے انہوں نے سُہیل بن عمر کو مختار کل کر کے سفیر بنا کر حدیبیہ بھیجا اور تھوڑی سی رد و قدح کے بعد صلح نامہ طے ہو گیا قریش کو اطمینان ہو گیا کہ ان کا مطالبہ کہ:۔

۱۔ مسلمان اس سال مکہ آئے بغیر واپس ہو جائیں اور سال آئندہ عمرہ کرنے آئیں،

۲۔ کوئی مسلمان بھاگ کر مکہ آئے اور پناہ گزیں ہو، تو اس کی تحویل عمل میں نہ آئے لیکن کوئی مکی بھاگ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو مطالبے پر اس کی قریش کے ہاتھ تحویل عمل میں آجائے۔

۳۔ دس سال تک باہم صلح رہے۔ ایک دوسرے کی جنگوں میں غیر جانبدار رہیں اور تجارت وغیرہ مسالمانہ ضرورتوں سے ایک دوسرے کے علاقے سے گزرنے کی اجازت ہو۔

اسے جب مسلمانوں نے منظور کر لیا اور معاہدہ کے متن میں بجائے "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" کے خالص اسلامی فارمولے کے قریش فارمولا "باسمك اللّٰهم" لکھا جانا اور "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" کی جگہ "مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِاللّٰہِ" لکھا جانا طے ہوا تو گویا فتح قریش ہی کی ہوئی اور انہیں وہ بنا پڑا اور بظاہر یہ صحیح بھی تھا اور مسلمان سپاہیوں میں عام طور پر رنج کی لہر دوڑ گئی حتیٰ کہ حضرت عمرؓ جیسے دقیقہ رس مدبر بھی اپنی بے چینی کو چھپا نہ سکے لیکن مسلمانوں میں نظم و ضبط اتنا کچھ آچکا تھا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ طے ہو چکا ہے اور آپؐ اس کو پسند کرتے ہیں، تو پھر کسی کی مجال نہ تھی کہ سوائے خاموشی اور اطاعت شعاری کے کچھ اور کریں۔

حدیبیہ کی اس صلح (یا بقول قریش "شکست") کو قرآن مجید میں مسلمانوں کے لیے "فتح مبین" اور "نصر عزیز" کے ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ بادی النظر میں حیرت ہوتی ہے کہ یہ برعکس نہند نام زنگی کافور" کیوں؟ لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلامی حکومت تو قریش کی منہ مانگی شرطیں منظور کرنے کو تیار تھی۔ صرف خیبر میں جنگ سے ان کی غیر جانبداری مطلوب تھی۔ اسے قریش نے منظور کر لیا تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ رعایتیں منظور کر لی تھیں۔ "باسمك اللّٰهم" کے فارمولے میں کوئی شرک یا بت پرستی نہیں ہے اور اس کو نیز "محمد بن عبداللہ" کو منظور کرنے میں مسلمانوں کا کوئی نقصان نہ تھا۔ اسی طرح عمرے میں رکاوٹ معمولی امر ہے اور "من استطاع الیہ سبیلا" کے باعث اس وقت وہ مسلمانوں پر فرض ہی نہ تھا۔ یک طرف تحویل ملزمین کی توجیہہ خود جناب رسالت مآبؐ یہ فرمائی کہ ہمارے پاس سے بھاگ کر جانے والا کافر ہی ہوگا۔ ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ اور قریش کے پاس سے بھاگ کر آنے والا مسلمان ہی ہوگا اور اگر وہ اپنے ہم وطنوں کے مظالم پر صبر کرے گا تو خدا اسے اجر دے گا۔ یوں بھی چند ہی دنوں میں اسلامی عملداری کے باہر نو مسلموں نے قریشی کاروانوں کا کچھ وہ ناطقہ تنگ کر دیا کہ خود قریش نے جناب رسالت مآبؐ التجا کی کہ اس شرط کو منسوخ کر کے ان نو مسلموں کو مدینہ بلا لیں اور تیسری شرط تو مسلمان خود ہی چاہتے تھے کہ قریش مسلمانوں سے صلح کریں اور مسلمانوں کی جنگوں میں غیر جانبدار رہیں اور اس میں ذرا بھی شبہ نہیں رہتا کہ مسلمانوں کے لیے سخت ترین نازک زمانے میں حدیبیہ میں قریش کا اس صلح پر آمادہ ہو جانا اسلامی سیاستِ خارجہ کی ایک واقعی "فتح مبین" "نصر عزیز"

تھی، جس کے باعث ان کے ہاتھ کھل گئے اور فوری خطرات پر نجات ملنے پر انہوں نے آزادی کے ساتھ تین ہی سال میں پر امن ذرائع سے اپنی مملکت کو تقریباً دس گنا پھیلا کر پورے جزیرہ نمائے عرب کو اپنا مطیع بنا لیا اور وہاں سے رومی اور ایرانی اثرات بالکل خارج کر کے ایک ایسی مستحکم حکومت قائم کر دی، جو پندرہ ہی سال میں تین براعظموں پر پھیل گئی اور جو اس سے ٹکرایا، پاش پاش ہو کر رہ گیا اور جس نے سر تسلیم خم کر دیا، وہ اسلام کے رنگ و زبان سے بالاقومیت میں برابری کے حصے کے ساتھ شریک ہو گیا

یہی وہ صلح حدیبیہ ہے، جسے عہدِ نبویؐ کی سیاست خارجہ کا شہ کار کہنا چاہیئے! اس معاہدہ کا متن عربی ماخذوں میں کہیں تو پورا پورا، کہیں جستہ جستہ ملتا ہے، جس کی تفصیل میں نے الوثائق السیاسیہ (مطبوعہ مصر ۱۳۶۰ھ) میں دستاویز نمبر ۱۱ کے تحت دی ہے، یہاں اس کا ترجمہ کافی ہو گا۔

معاہدہ حدیبیہ

۱۔ تیرے نام سے اے اللہ!

۲۔ یہ وہ معاہدہ ہے، جو محمدؐ بن عبداللہ اور سُہیل بن عمرو میں طے ہوا،

۳۔ ان دونوں نے اس بات پر صلح کر لی ہے کہ دس سال تک جنگ روک دی جائے، جس دوران میں لوگ امن سے رہیں اور ایک دوسرے سے رُکے رہیں۔

۴۔ یہ کہ محمدؐ کے ساتھیوں میں سے جو حج یا عمرے یا تجارت کے لیے مکہ آئے، تو اس کی جان و مال کا امان ہو گا اور قریش کا جو شخص تجارت کے لیے مصر یا شام (بروایت ابو عبیدہ عراق یا شام) جاتے ہوئے مدینے سے گزرے، تو اسے جان و مال کا امان حاصل ہو گا[1]

۵۔ یہ کہ قریش کا جو شخص اپنے ولی (سرپرست) کی اجازت کے بغیر محمدؐ کے پاس آئے گا، تو آپؐ اسے ان کے سپرد کر دیں گے اور محمدؐ کے ساتھیوں میں جو شخص قریش کے پاس آ جائے گا، وہ اسے آپؐ کے سپرد نہیں کریں گے،

۶۔ یہ کہ ہم میں باہم سینے ہر طرح بند رہیں گے (جن میں باہر سے کوئی غداری داخل نہ ہو سکے گی) اور نہ تو خفیہ کسی دوسرے کو مدد دی جائے گی نہ علانیہ خود خلافِ عہد دغا کریں گے۔

۷۔ یہ کہ جو محمدؐ کے معاہدہ اور ذمہ داری میں داخل ہونا چاہتا ہے، وہ بھی ایسا کرے گا۔ (اس پر قبائل خزاعہ نے اُٹھ کر کہا کہ ہم محمدؐ کے معاہدہ اور ذمہ داری میں شریک ہوتے ہیں اور بنی بکر نے کہا کہ ہم قریش کے معاہدہ اور ذمہ داری میں شریک ہوتے ہیں۔)

۸۔ یہ کہ تو اس سال ہمارے پاس سے واپس چلا جائے گا اور ہمارے ہاں مکہ نہ آئے گا۔ البتہ سال آئندہ ہم باہر چلے جائیں گے اور تو اور تیرے ساتھی وہاں (مکے میں) داخل ہو کر تین راتیں ٹھہر سکیں گے تیرے ساتھ سوار کا

---

[1] یہ دفعہ ابن اسحٰق اور ابن ہشام میں نہیں ہے۔ نہ ہی تاریخ طبری میں ہے۔ لیکن تفسیر طبری، ابو عبید، کی کتاب الاموال، فتوح بلاذری اور بکری وغیرہ میں ہے۔

ہتھیار ہوگا یعنی تلوار میان میں پڑی ہوئی۔ اس کے سوا کوئی اور ہتھیار لے کر تو وہاں نہ آسکے گا۔

۹۔ یہ کہ یہ قربانی کے جانور وہیں رہیں گے، جہاں ہم نے ان کو پایا (یعنی حدیبیہ میں) اور ان کو حلال کر دیا جائے گا اور ان کو ہمارے پاس (مکہ قربانی کے لیے) نہیں لایا جائے گا۔ اور صراحت کہ ہمارے اور تمہارے حقوق اور واجبات برابر کے ہوں گے۔

(غالباً) مہر نبوی ﷺ

(غالباً) مہر سہیل بن عمرو

گواہانِ اسلام: ۔ ابوبکرؓ، عمرؓ، عبدالرحمٰن بن عوف، عبداللہ بن سہیل بن عمرو، سعد بن وقاص، محمود بن مسلمہ، ابو عبیدہ بن الجراح وغیرہ

گواہان قریش: ۔ مکرز بن حفص، وغیرہ۔

کاتب: ۔ علیؓ بن ابی طالب

ماخذ ہائے متن تفسیر طبری ص۲۶ ص۱۰۱۔ سیرۃ ابن ہشام ص۷۴۷ تا ۷۴۸، فارسی ترجمہ سیرۃ ابن اسحٰق ورق ۲۱۰/الف (مخطوطہ پارس) مغازی واقدی (مخطوطہ برٹش میوزیم) ورق ۱۴۰/الف۔ طبقات ابن سعد ج ۲ حصہ ۱ ص۷۱ نیز ج ۲ حصہ ۱ ص۷۰ تا ۷۱۔ تاریخ طبری ص۱۵۴۶ تا ۱۵۴۸، سیرۃ طبری بروایۃ الکبریٰ (مخطوطہ آیا صوفیا)۔ فصل حدیبیہ تاریخ ابن کثیر ج ۴ ص۱۶۸ تا ۱۶۹۔ تاریخ الخمیس للدیار بکری ج ۲ ص۲۳۔ تاریخ ابن الاثیر ج ۲ ص۱۵۶ سیرۃ حلبی ج ۳ ص۲۳۔

ماخذ ہائے اقتباس متن کتاب الاموال لابی عبید ص۱۴۴ تا ۴۴۴۔ صحیح البخاری ۶۴/۴۳، ۶۴/۳۵-۲۹، ۵۴/۲،۷، ۵۴/۱ وغیرہ۔ عن کتب سید المرسلین لابن طولون ۲۶۔ فتوح بلاذری ص۳۵۶۔ تاریخ الیعقوبی ج ۲ ص۵۵۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد۔

جدید بحث و ترجمہ کائتانی کی اطالوی تاریخ اسلام حالات ۶ھ ص۳۴۔ ہیفننگ کی جرمن کتاب اسلام کا قانون خارجہ، ضمیمہ دوم۔

اشپرنگر کی جرمن سوانح و تعلیمات محمدی ص۳ ص۲۴۶ جہاں تمیمی کے ایک اور متن کا ذکر ہے۔ نقل نہیں۔

مجید خدوری کی انگریزی کتاب "اسلام کا قانون جنگ و امن" ص۸۹۔

مزید حوالے فنسنک کی مفتاح کنوز السنہ میں تحت عنوان حدیبیہ ہیں۔

عالمِ عربی کی قیادت

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

عالمِ عربی کی اہمیت

دنیا کے سیاسی نقشہ میں عالمِ عربی بہت اہمیت رکھتا ہے، وہ ان قوموں کا گہوارہ ہے جنھوں نے انسانی تاریخ میں سب سے اہم پارٹ ادا کیا۔ اس کے سینہ میں دولت و طاقت کے عظیم الشان خزانے محفوظ ہیں۔ اس کے پاس پٹرول ہے جو آج جنگی اور صنعتی جسم کے لیے خون کا درجہ رکھتا ہے اور یورپ و امریکہ اور مشرق بعید کے درمیان رابطہ کا کام کرتا ہے۔

وہ عالمِ اسلامی کا دھڑکتا ہوا دل ہے جس کی طرف روحانی اور دینی طور پر پورے عالمِ اسلامی کا رُخ ہے جو ہر وقت اس کا دم بھرتا ہے اور اس کی محبت و وفاداری میں سرشار رہتا ہے۔

اس کی اہمیت اس لیے اور بڑھ جاتی ہے کہ اس کا امکان ہے کہ خدانخواستہ اس کو تیسری جنگ کا میدان بننا پڑے۔ وہاں طاقت ور بازو ہیں، سوچنے سمجھنے والی عقلیں ہیں اور جنگجو جسم ہیں، وہاں بڑی بڑی تجارتی منڈیاں ہیں اور قابلِ کاشت زمینیں ہیں۔

مصر وہیں واقع ہے جو اپنی پیداوار، آمدنی، زرخیزی و شادابی، دولت و ترقی، تہذیب و تمدن میں خاص درجہ رکھتا ہے۔ جس کی گود میں دریائے نیل رواں دواں ہے۔ یہاں فلسطین ہے اور اس کے ہمسایہ ممالک ہیں جو اپنی آب و ہوا کی لطافت و حسن و خوب صورتی اور فوجی اہمیت میں ممتاز ہیں۔

اس کے پاس عراق کا ملک ہے جو اپنی بہادری، سخت جانی، شجاعت، عزم اور پٹرول کے ذخیروں کی وجہ سے مشہور ہے۔

یہاں جزیرۂ عرب ہے جو اپنے روحانی مرکز، دینی اثر میں سب سے منفرد ہے جس کے حج کے سالانہ اجتماع کی نظیر دنیا میں نہیں، جہاں تیل کے چشمے سب سے زیادہ تیل پیدا کرتے ہیں۔

یہ سب چیزیں ہیں جنھوں نے عالمِ عربی کو اہلِ مغرب کی نظر کا مرکز، ان کی خواہشات کی آماجگاہ اور قیادت و لیڈر شپ کے لیے مقابلہ کا میدان بنا دیا اور جس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ ان ملکوں میں عربی قومیت اور وطن پرستی کا شدید احساس پیدا ہو گیا ہے۔

محمد رسول اللہ عالمِ عربی کی روح ہیں

ایک مسلمان، عالمِ عربی کو جس نظر سے دیکھتا ہے اس میں اور ایک یورپین کی نظر میں زمین آسمان کا فرق ہے، بلکہ

خود ایک وطن پرست عرب، عالم عربی کو جس نگاہ سے دیکھتا ہے وہ ایک مسلمان کی نگاہ سے بالکل مختلف ہے۔

مسلمان عالم عربی کو اس حیثیت سے دیکھتا ہے کہ وہ اسلام کا گہوارہ ہے، انسانیت کی پناہ گاہ ہے، عالمی قیادت کا مرکز ہے، روشنی کا مینار رہے، اس کا عقیدہ ہے کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم عالم عربی کی جان، اس کے عزت و افتخار کا عنوان اور اس کا سنگِ بنیاد ہیں۔ اگر اس سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جُدا کر دیا جائے تو اپنے تمام قوت کے ذخیروں اور دولت کے چشموں کے باوجود اس کی حیثیت ایک بے جان لاشہ اور ایک نقشِ بے رنگ سے زیادہ نہ ہو گی۔ محمد صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم ہی کی ذات ہے جن کی وجہ سے عالم عربی عالم وجود میں آیا۔ اس سے پہلے یہ دنیا منقسم اور منتشر اکائیوں، باہم دست وگریباں قبیلوں، غلام قوموں اور بے مصرف صلاحیتوں کا دوسرا نام تھی، اس پر جہل و گمراہی کے بادل چھائے ہوئے تھے، عرب رومی شہنشاہی سے جنگ مول لینے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس کا تصور کرنا بھی ان کے لیے مشکل تھا، شام جو بعد میں عالم عربی کا بہت اہم حصہ قرار پایا ایک رومی نو آبادی تھی جو مطلق العنان حکومت اور سخت ترین ڈکٹیٹر شپ کے رحم و کرم پر تھی، اس نے ابھی تک آزادی و انصاف کا مفہوم ہی نہیں سمجھا تھا۔

عراق کیانی حکومت کی اغراض و خواہشات کا شکار رہتا۔ نئے نئے محاصل اور بھاری ٹیکسوں کی وجہ سے اس کی کمر جھک گئی تھی، رومی مصر کے ساتھ ایک گائے کا سا برتاؤ کرتے تھے جس کو دوہنے اور فائدہ اٹھانے میں وہ کمی نہ کرتے۔ لیکن چارہ دیتے وقت حق تلفی اور بخل سے کام لیتے۔ پھر وہاں سیاسی استبداد کے ساتھ مذہبی استبداد کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ دفعتاً اس متفرق، منتشر، مظلوم دنیا پر اسلام کی بادِ بہاری کا ایک جھونکا چلا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ اس وقت یہ عربی دنیا ہلاکت کے قریب تک پہونچ گئی تھی، آپؐ نے اس کی دستگیری فرمائی، اس کی نبضیں ڈوب رہی تھیں آپ نے اس کو زندگی بخشی، نئی روشنی عطا کی، کتاب و حکمت کی تعلیم دی، تزکیہ کا سبق پڑھایا، آپ کی بعثت کے بعد اس دنیا کی نوعیت بدل گئی، اب وہ اسلام کی سفیر تھی، امن و سلامتی کی پیامبر تھی، تہذیب و تمدن کی علمبردار تھی، قوموں کے لیے رحمت کا پیغام تھی۔ اب ہم شام کا بھی نام لے سکتے ہیں، عراق کا بھی ذکر کر سکتے ہیں، ہم مصر پر بھی فخر کر سکتے ہیں۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوت نہ ہوتی تو آج نہ شام کا کہیں پتہ ہوتا نہ عراق کا کہیں ذکر ملتا نہ مصر کا وجود ہوتا اور عالم عربی' عالم عربی ہی نہ ہوتا، اور یہیں تک نہیں، دُنیا بھی تمدن و شائستگی، علم و فن، تہذیب و ترقی کی اس سطح پر نہ ہوتی۔ اب اگر عرب قوموں اور حکومتوں میں کوئی دینِ اسلام سے مستغنی ہونا چاہتا ہے اور اپنا رُخ مغرب کی طرف پھیرتا ہے یا عرب کے عہدِ قدیم کی طرف حریصانہ نظر ڈالتا ہے یا اپنے نظامِ زندگی اور سیاست و حکومت میں مغربی دستور اور مغربی قوانین کی پیروی کرتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کو اپنا قائد، امام، رہبر اور اُسوہ و معیار نہیں سمجھتا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عطا کی ہوئی نعمت کو فوراً واپس کر دے اور اپنے پہلے دورِ جاہلیت کی طرف واپس چلا جائے، جہاں رومیوں اور ایرانیوں کا سکہ چلتا تھا، جہاں ظلم و استبداد کا بازار گرم تھا، جہاں سامراج کی فرمانروائی تھی، جہاں جہل و گمراہی تھی، جہاں غفلت اور ریکاری تھی، جہاں دنیا سے الگ تھلگ گمنامی کے گوشہ میں ایک

مجموعی زندگی گزاری جارہی تھی، اس لیے کہ یہ شاندار اور روشن تاریخ، یہ تابناک تہذیب، یہ بازارِ ادب، یہ عرب سلطنتیں اور حکومتیں صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک بعثت کا فیض اور آپ کی آمد کا نتیجہ ہیں۔

ایمان، عالم عربی کی طاقت ہے

اسلام عالم عربی کی قومیت ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے امام اور قائد ہیں، ایمان اس کی قوت کا خزانہ ہے جس کے بھروسا پر اس نے دوسری قوموں کا مقابلہ کیا اور فتح یاب ہُوا، اس کی طاقت کا راز اور اس کا کارگر ہتھیار جو کل تھا وہی آج ہے جس کے ساتھ وہ دشمنوں سے جنگ کر سکتا ہے، اپنی ہستی کی حفاظت کر سکتا ہے اور دوسروں تک اپنا پیغام پہنچا سکتا ہے۔

عالم عربی کو اگر کمیونزم یا یہودیت سے جنگ کرنا ہے یا کسی دُوسرے دشمن کا مقابلہ کرنا ہے تو اس دولت کے بل بوتے پر جنگ نہیں کر سکتا جو برطانیہ اس کو عطا کرتا ہے یا امریکہ اس کو خیرات دیتا ہے، یا پٹرول کی قیمت کے طور پر اس کو حاصل ہوتی ہے، وُہ اپنے دشمن کا مقابلہ صرف اس ایمان، معنوی قوت، اس رُوح اور اسپرٹ کے ساتھ کر سکتا ہے جس اسپرٹ کے ساتھ کبھی اس نے بیک وقت رومی و ایرانی حکومتوں کو جنگ کی دعوت دی تھی اور فتح حاصل کی تھی، وہ اس دل کے ساتھ جنگ نہیں کر سکتا جس کو زندگی سے عشق اور موت سے نفرت ہو، اس جسم سے مقابلہ نہیں کر سکتا جو عیش و عشرت کا دلدادہ ہو اس عقل کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتا جس کو شک و شبہ کا گُھن لگ چکا ہو، اور افکار و خواہشات باہم دست و گریبان ہوں، اس کو یاد رکھنا چاہیے کہ ضعیف الایمان اور متشکک قلب اور میدان میں ساتھ چھوڑ دینے والی قوت کے ساتھ میدانِ جنگ کبھی نہیں جیتا جا سکتا، عرب کے قائدین اور عرب لیگ کے ذمہ داروں کے لیے سب سے اہم کام یہ ہے کہ وہ عربی فوج، کسانوں، تاجروں اور جمہور کے ہر طبقہ میں ایمان کی تخم ریزی کریں۔ ان میں جہاد کا جذبہ، جنت کا شوق اور ظاہری آرائشوں کی تحقیر و اہانت کا احساس پیدا کریں، ان کو خواہشاتِ نفس اور زندگی کی مرغوبات پر قابو حاصل کرنے، خدا کے راستہ میں مصائب اور تکلیفیں برداشت کرنے، مسکراتے چہروں کے ساتھ موت کے استقبال اور اس پر پروانوں کی طرح گرنے کا سبق دیں۔

شہسواری اور فوجی زندگی کی اہمیت

یہ ایک تکلیف دہ حقیقت ہے کہ عربی اقوام نے اپنی بہت سی فوجی خصوصیات کو ضائع کر دیا، خاص طور پر شہسواری ان کی زندگی سے بالکل خارج ہوگئی، جو ایک بہت بڑا نقصان اور میدانِ جنگ میں ہزیمت اور کمزوری کا بہت اہم سبب ہے، جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ان قوموں کی فوجی اسپرٹ جو ان کا طغرائے امتیاز تھی ختم ہوگئی، جسم کمزور ہو گئے، لوگ ناز و نعم میں زندگی گزارنے لگے، موٹروں نے گھوڑوں کی جگہ لے لی اور قریب ہے کہ عربی گھوڑے جن کی دُنیا میں دھوم ہے

جزیرہ عرب سے نیست و نابود ہو جائیں ، لوگوں نے کشتی، شہسواری، جنگی مشقوں اور دوسری جسمانی ورزشوں کو فراموش کر دیا اور ان کھیلوں کو اختیار کیا جن کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس لیے تعلیم و تربیت کے رہنماؤں کے لیے ضروری ہے کہ عرب نوجوانوں میں شہسواری، فوجی زندگی، سادگی، استقلال، عزیمت اور مصائب پر صبر و استقامت کی اہلیت پیدا کریں۔ امیرالمومنین عمرؓ بن الخطاب عجمی ممالک میں اپنے عرب عمّال کو لکھتے ہیں:

ایاکم والتنعم وزی العجم وعلیکم بالشمس فانها حمام العرب وتمعددوا واخشوشنوا واخلولقوا واعطوا الراکب استنها وانزوا نزواً وارموا الاغراض[1]

تن آسانی و راحت طلبی کی زندگی اور عجمی لباسوں سے ہمیشہ دُور دُور رہنا، دُھوپ میں بیٹھنے اور چلنے کی عادت برقرار رکھنا کہ وہ عربوں کا حمام ہے، جفاکشی، سادہ زندگی، صبر و تحمل، موٹے جھوٹے پہننے کے عادی رہو۔ گھوڑے پر جست لگا کر بے تکلف بیٹھنے کی مشق رہنی چاہیے، نشانے درست ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ارموا بنی اسماعیل فان اباکم کان رامیا[2]

اے اہلِ عرب! تیر اندازی کی مشق رکھو اس لیے کہ تمھارے جدِّ امجد (حضرت) اسماعیل (علیہ السلام) تیر انداز تھے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

الا انّ القوۃ الرمی، الا ان القوۃ الرمی[3]

یاد رکھو جس قوت کے تیار رکھنے کی قرآن مجید میں تاکید ہے وہ تیر اندازی ہے، وہ تیر اندازی ہے۔

تعلیم و تربیت کے ذمہ داروں کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ ہر ایسی چیز کا مقابلہ کریں جو مردانگی و شجاعت کی روح کو کمزور کر رہی ہو اور عجز و تخنث پیدا کرتی ہو، عریاں صحافت نگاری، فحش اور ملحد ادب کی روک تھام کریں، جو نوجوانوں میں نفاق، بے حیائی، فسق و فجور اور شہوت پرستی کی تبلیغ کر رہا ہو، ان پیشہ وروں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فوجی کیمپ میں نہ داخل ہونے دیں جو نسل اسلامی کے قلب و اخلاق میں فساد برپا کرنا چاہتے اور فسق و معصیت اور فحش پسندی کو چند حقیر پیسوں کے لیے خوب صورت اور مزین بنا کر پیش کرتے ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی کسی قوم میں مردانگی اور غیرت انسانی کو زوال ہوا۔ عورتوں نے اپنی نسائیت اور

[1] بغوی [2] بخاری [3] مسلم

فطرت مادری کے خلاف بغاوت کی اور آزادی و بے حجابی کی راہ اختیار کی۔ ہر چیز میں مردوں کی مسابقت کی کوشش کی۔ خانگی زندگی سے نفرت و غفلت بڑھی اور ضبطِ تولید کی رغبت پیدا ہوئی۔ اس کا ستارۂ اقبال غروب ہوا اور رفتہ رفتہ اس کے نشانات بھی مٹ گئے۔ یونانی، رومی اور ایرانی اقوام کا انجام بھی ہوا اور یورپ بھی آج اسی راہ پر گامزن ہے جو اس انجام تک لے جاتی ہے۔ عالم عربی کو ڈرنا چاہیے کہ کہیں اس کا انجام بھی ایسا نہ ہو۔

طبقاتی تفاوت اور اسراف کا مقابلہ

عربوں کو مغربی تہذیب کے اثر سے اور بہت سے دوسرے اسباب کی بنا پر عیش و عشرت، غیر ضروری لوازم زندگی کے شدید اہتمام، اسراف، لذت و خواہش اور فخر و آرائش کے لیے فضول خرچی کی عادت پڑ چکی ہے۔ اس عیش و تنعم اور بیدردی کے ساتھ خرچ کے پہلو بہ پہلو فقر و فاقہ اور عریانی بھی موجود ہے، جب ایک شخص بڑے بڑے عرب شہروں پر نظر ڈالتا ہے تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں اور سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ ایک طرف وہ آدمی ہے جس کو اپنی ضرورت سے زاید غذا، لباس کا مصرف نظر نہیں آتا، دوسری طرف اس کی نگاہ ایسے بدوی پر پڑتی ہے جس کو ایک روز کا کھانا اور ستر پوشی کے لیے کپڑا بھی نصیب نہیں۔ جب عرب کے امراد اصحابِ ثروت ہوا سے باتیں کرنے والی موٹروں پر سرگرم سفر ہوتے ہیں، اسی وقت چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے بچوں اور بچیوں کی ایک فوج سامنے آتی ہے جن کا لباس تار تار ہوتا ہے جو ایک پیسہ کے لیے ان کی موٹروں کے ساتھ دوڑنے لگتی ہے۔

جب تک عرب ملکوں میں فلک بوس محلوں، بہترین کاروں کے ساتھ ساتھ حقیر جھونپڑیاں اور تنگ و تاریک مکانات نظر آئیں گے، جب تک تخمہ و فاقہ ایک شہر میں شباب پر ہوگا اس وقت تک کمیونزم کے لیے دروازے کھلے ہوتے ہیں، ہنگامے، جھگڑے ہونا لازمی ہیں، کوئی پروپیگنڈا اور طاقت اس کو روک نہیں سکتی۔ وہاں اگر اسلامی نظام اپنے جمال و اعتدال کے ساتھ قائم نہیں ہوگا تو تعزیرِ خداوندی کے طور پر اور ردِ عمل کے طریقہ پر اس کی جگہ ایک ظالم و جابر نظام کا قائم ہونا ضروری ہے۔

تجارت اور مالی نظام میں خود مختاری

عالم اسلامی کی طرح عالم عربی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی تجارت، مالیات، صنعت و حرفت اور تعلیم میں پورے طور پر آزاد اور خود کفیل ہو، وہاں کے رہنے والے انھیں چیزوں کا استعمال کریں جو ان کی زمین کی پیداوار اور ان کی صنعت محنت کا نتیجہ ہوں، زندگی کے ہر شعبہ میں وہ مغرب سے مستغنی ہوں اپنی تمام ضروریات، مصنوعات، غذا، لباس، ہتھیار، مشینیں، آلاتِ حرب کسی چیز میں وہ غیر کے دستِ نگر اور مغرب کے پروردۂ رحمت اور نمک خوار نہ ہوں۔

اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ عالم عربی اگر بعض ناگزیر حالات کی بنا پر مغرب سے جنگ کرنا چاہے تو وہ اس لیے

جنگ نہیں کرسکتا کہ وہ اس کا مقروض اور اس کی امداد کا محتاج ہے۔ جس قلم سے وہ مغرب کے ساتھ معاہدہ پر دستخط کرتا ہے وہ قلم بھی مغرب ہی کا بنا ہوا ہے، اگر وہ مقابلہ کرتا ہے تو میدانِ جنگ میں اسی گولی کو استعمال کرتا ہے جو مغرب کے کارخانہ کی تیار شدہ ہے۔ عالم عربی کے لیے یہ ایک بڑی ٹریجیڈی ہے کہ وہ اپنے دولت کے ذخیروں اور قوت کے سرچشموں سے خود فائدہ نہ اٹھا سکے، زندگی کا خون اس کو فائدہ پہونچانے کے بجائے اسی کی رگوں سے دوسروں کے جسم میں پہونچتا ہو، اس کی فوجوں کی ٹریننگ مغرب کے ایجنٹوں اور فوجی افسران کے ہاتھ میں ہو اور حکومت کے دُوسرے شعبے بھی انھیں کے سپرد ہوں۔ عالمِ عربی کے لیے ضروری ہے کہ وُہ اپنی ضروریات کا خود کفیل ہو، تجارت و مالیات کی تنظیم، درآمد برآمد، قومی صنعت، فوج کی ٹریننگ اور مشینوں اور آلاتِ حرب کی تیاری پر اس کا مکمل قبضہ ہو، ایسے اشخاص کی تربیت کی جائے، جو حکومت کی ذمہ داریوں کو سنبھال سکیں اور سرکاری فرائض پوری واقفیت، فنی مہارت، دیانت اور خیر خواہی کے ساتھ انجام دیں۔

انسانیت کی سعادت کے لیے عربوں کی ذاتی قربانی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اس وقت ہُوئی جبکہ انسانیت کی شقاوت و بدبختی انتہائی حد کو پہونچ چکی تھی۔ اس وقت انسانیت کی اصلاح کا مسئلہ ان افراد کی دسترس سے باہر تھا جن کی زندگی ناز و نعمت میں بسر ہو رہی تھی اور جو محنت و مشقت کے برداشت کرنے اور مالی و جانی نقصانات کو جھیلنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے اور جن کے لیے ہمہ وقت عیش و نشاط کا سامان موجود تھا، اس وقت انسانیت کو ایسے افراد درکار تھے جو انسانیت کی خدمت میں اپنے مستقبل کو قربان کرسکتے تھے اور منافع سے دست بردار ہو کر اپنے جان و مال، عیش و آرام اور اپنے تمام دنیاوی مفاد کو خطرات و مشکلات کے مقابلہ میں پیش کرسکتے تھے، ان کو اپنے پیشہ و تجارت کی کساد بازاری اور کسی طرح کے مالی نقصان و خطرات کی پروا نہ تھی، جن کو اپنے آباؤ اجداد، اپنے دوستوں، اور قرابت مندوں کی قائم کی ہوئی اُمیدوں پر پانی پھیر دینے میں تامل نہ تھا۔ صالح علیہ السلام کی قوم نے جو کچھ ان سے کہا تھا وہی ان تعلق والوں کی زبان پر بھی جاری ہوجاتا:

قالوا یٰصٰلح قد کنت فینا مرجوًّا قبل هذا۔ — اے صالح! تم سے تو ہماری بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔

جب تک دُنیا میں ایسے مجاہد تیار نہ ہوں اس وقت تک انسانیت کا بقا، استحکام اور کسی اہم دعوت کا کامیاب ہونا ناممکن ہے۔ یہ کردار رکھنے والے گنتی کے چند افراد جو دنیا کی اصلاح میں محروم اور کوتاہ قسمت سمجھے جاتے ہیں انھیں کی بلند ہمتی اور جذبۂ قربانی پر انسانیت کی فلاح و کامرانی اور عیش و شادمانی کا دارومدار ہے، وُہ چند افراد جو اپنی جان کو مصائب میں ڈال کر ہزاروں بندگانِ خدا کے ابدی مصائب سے بچنے کا سبب بنتے ہیں اور دنیا کے ایک بڑے گروہ کو شر سے خیر کی طرف لاتے ہیں۔ اگر چند افراد کی محرومی و ہلاکت ایک پوری ملّت کے لیے خوشحالی اور سرفرازی کا باعث ہو اور اگر کچھ مال و زر اور تجارت و حرفت کے نقصان اور گھاٹے سے بے شمار اور لاتعداد انسانوں کے لیے دینی و

دُنیوی فلاح کا دروازہ کھلتا ہو تو یہ سودا ہر طرح سستا ہے۔

جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تو وہ جانتا تھا کہ روم و فارس اور دنیا کی متمدن قومیں جن کے ہاتھ میں اس وقت عالم کی باگ ڈور ہے ہرگز اپنے عیش و نشاط کو نہیں چھوڑ سکتیں، وہ اپنی ناز پروردہ زندگی کو خطرہ میں نہیں ڈال سکتیں، وہ بے یار و مددگار انسانیت کی خدمت، دعوت وجہاد کے لیے مصائب و آلام کے برداشت کرنے کی قوت نہیں رکھتیں۔ ان کے اندر اتنی استطاعت ہرگز نہیں کہ اپنی پُرتکلف زندگی اور زیب و زینت کا ایک معمولی سا جز بھی قربان کریں، ان میں ایسے لوگ بالکل مفقود تھے جو اپنی خواہشات پر قابو رکھتے ہوں، اپنی حرص وطمع کو روک سکیں، اور جو تمدن کے لوازم اور فیشن کی پابندی سے بے نیاز ہو کر واجبی گزران پر اکتفا کر سکیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسلام کے پیغام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے لیے ایسی قوم کا انتخاب فرمایا جو دعوت وجہاد کے بوجھ کو اٹھا سکتی تھی اور ایثار و قربانی کے جذبہ سے بھرپور تھی۔ یہ وہی عربی قوم تھی جو طاقت ور، سادہ منش اور جفاکش تھی، جس پر مصنوعی تمدن کا کوئی وار کارگر نہ ہوا اور دنیا کی رنگینیوں کا کوئی جادو نہ چل سکا۔ یہی لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں جو دل کے غنی، علم سے بھرپور اور تکلفات سے کوسوں دُور تھے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس عظیم الشان دعوت کو لے کر اُٹھے اور آپ نے جدوجہد وجانفشانی کا حق پُوری طرح ادا کر دیا، اس دعوت کو ہر اس چیز پر ترجیح دی جو آپ کے لیے رکاوٹ کا سبب بن سکتی تھی۔ آپ خواہشات سے بالکل کنارہ کش تھے۔ دُنیا کی دلفریبیوں کا آپ پر کوئی جادو نہ چل سکا۔ یہی وہ چیز تھی جو دنیا کے لیے اُسوۂ حسنہ اور رہنما بنی۔ جب قریش کے وفد نے آپ سے اس سلسلہ میں گفتگو کی اور آپ کے لیے وہ تمام چیزیں پیش کیں جو ایک نوجوان کے دل کو فریفتہ اور نفسیات رکھنے والے انسان کو خوش کر سکتی تھیں، مثلاً حکومت و ریاست، عیش وعشرت، دولت و ثروت، تو آپ نے ان تمام چیزوں کو بے تامل ٹھکرا دیا۔ اسی طرح جب آپ کے چچا نے گفتگو کی اور چاہا کہ آپ کو اس دعوت کے پھیلانے اور اس میں حصہ لینے سے روک دیں تو آپ نے صاف صاف فرما دیا کہ "اے چچا! خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور میرے بائیں ہاتھ میں چاند لا کر رکھ دیں جب بھی میں اس کام سے باز نہیں آ سکتا۔ اور اس وقت تک کوشش کرتا رہوں گا جب تک اللہ تعالیٰ اس دعوت کو غالب نہ کر دے یا میں خود اس سلسلہ میں کام نہ آجاؤں"۔ یہی جدوجہد اور قربانی، دنیا کی نفع اندوز ذہنیت سے بے تعلقی اور پُرمسرت زندگی کے مقابلہ میں تکلیف و مشقت کی زندگی کی ترجیح، اہلِ دعوت کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک نمونہ اور اُسوہ بن گیا۔ آپ نے اس سلسلہ میں اپنے اوپر تمام عیش و آرام اور راحت و آسائش کے دروازے بند کر لیے، خود اپنے ہی اوپر نہیں بلکہ اپنے پُورے خاندان، اہلبیت اور تمام عزیزوں کو بھی عیش وعشرت کے مواقع سے مستفید ہونے کا موقعہ نہیں دیا، وہی لوگ جو آپ سے زیادہ قریب وعزیز تھے زندگی کے عیش و راحت میں اُنھیں کا حصہ سب سے کم تھا اور جہاد و قربانی میں وہ سب سے آگے رکھے گئے تھے۔ جب آپ کسی چیز کی حرمت کا ارادہ کرتے تو اس کی ابتدا اپنے قبیلہ اور اپنے ہی لوگوں سے

کرتے اور جب کسی حق کی باری آتی یا کوئی نفع پہنچانا ہوتا تو دُور کے لوگوں سے شروع کرتے۔ اور بسا اوقات آپ کے قرابت دار اور قبیلہ والے اس سے محروم ہی رہ جاتے۔ آپ نے جب سُودی کاروبار ختم کرنے کا ارادہ فرمایا تو سب سے پہلے اپنے چچا عباس بن عبد المطلب کے کاروبار کو مٹایا اور ان کے تمام سُودی منافع کو ختم کر دیا۔ اسی طرح جاہلیت کے انتقامات و مطالبات کو باطل کرنے اُٹھے تو ربیعہ بن حارث ابن عبد المطلب کے خون کو پہلے باطل کیا، اور جب آپ نے زکوٰۃ کا قانون جاری فرمایا (جو درحقیقت ایک بہت بڑی مالی منفعت ہے اور تا قیامت باقی رہنے والی چیز ہے) تو آپ نے اپنے قبیلہ بنی ہاشم کے لیے اس کو قیامت تک کے لیے حرام کر دیا۔ فتح مکّہ کے دن جب علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے آپ سے بنی ہاشم کے لیے سقایت زمزم کے ساتھ ساتھ خانہ کعبہ کی کلید برداری کا مطالبہ کیا تو آپ نے شدّت سے انکار فرما دیا اور عثمان بن طلحہؓ کو بلا کر خانہ کعبہ کی کنجی ان کے سامنے رکھ دی اور کہا کہ اے عثمان! دیکھو یہ تمہاری کنجی ہے تم اس کو لے لو، آج احسان اور وفا کا دن ہے اور اب یہ تمہارے خاندان میں ہمیشہ رہے گی کوئی اس کو تم سے نہیں لے سکتا، الّا یہ کہ کوئی ظالم اس کی جرأت کرے۔ آپ نے ازواجِ مطہرات کو زُہد و قناعت اور رُوکھی پھیکی زندگی گزارنے کی ترغیب دی اور صاف صاف فرمایا کہ اگر تم فقر و فاقہ کی زندگی گزارنے کے لیے آمادہ ہو تو میری رفاقت اختیار کر سکتی ہو ورنہ ناز و نعمت و راحت کے ساتھ تم میرے ساتھ نہیں رہ سکتیں اور اس وقت آپ نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پڑھ کر سُنایا:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ إِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ط وَإِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللّٰهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنْكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا ٥ (احزاب - ۲۹)	اے نبی! آپ اپنی بیویوں سے فرما دیجیے کہ تم اگر دنیوی زندگی اور اس کی بہار چاہتی ہو تو آؤ میں تم کو کچھ متاع دے دوں اور تم کو خوبی کے ساتھ رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ کو چاہتی ہو اور اس کے رسول کو اور عالمِ آخرت کو، تو تم میں سے نیک کرداروں کے لیے اللہ تعالیٰ نے اجرِ عظیم مہیا کر رکھا ہے۔

لیکن اس انتخاب میں آپ کے گھر والوں نے اللہ اور رسول ہی کو اختیار کیا۔ اسی طرح حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جب سُنا کہ آپ کے پاس کچھ غلام و خادم آئے ہیں اور جبکہ ان کے ہاتھوں میں چکّی چلانے سے گٹّے پڑ گئے تھے۔ آپ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچیں کہ یا رسول اللہ! مجھے بھی ایک خادم عنایت فرما دیجیے تاکہ میں کچھ آرام حاصل کر سکوں تو آپ نے ان کو تسبیح و تحمید کی وصیت فرمائی اور کہا کہ تمہارے لیے یہ چیز خادم سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ یہی معاملہ آپ کا اپنے تمام قریبی رشتہ داروں اور عزیزوں کے ساتھ تھا اور جو جتنا ہی قریب ہوتا جاتا اسی قدر اس کی ذمہ داری بڑھتی جاتی۔

مکّہ کے لوگ جب ایمان لائے تو ان کی اقتصادی زندگی کا نظام درہم برہم ہو گیا، ان کی تجارت کساد بازاری کا

شکار ہوگئی اور بعض اپنے راس المال سے بھی محروم ہو گئے تھے جس کو انھوں نے اپنی زندگی میں جمع کیا تھا، ان میں ایسے بھی ایمان لانے والے تھے جو راحت و آرام کے سامان اور آرائش و زینت کے اسباب بھی ختم کر چکے تھے حالانکہ پہلے ان کی امتیازی شان یہی تھی کہ وہ زینت و آرائش کے دلدادہ تھے، اسی طرح اس دعوت کے پھیلانے اور اس راہ کی رکاوٹوں کو دُور کرنے کے سلسلہ میں بہتوں کی تجارت برباد ہوگئی اور کتنے اپنے آبائی دولت کے حصّوں سے محروم ہو گئے۔

اسی طرح جب آپ نے مدینہ ہجرت فرمائی اور انصار نے آپ کا ساتھ دیا تو اس کا اثر ان کے کھیتوں، ان کے باغات پر پڑا مگر بایں ہمہ جب انھوں نے اپنا کچھ تھوڑا سا وقت ان کی نگہداشت کے لیے چاہا تو ان کی اجازت نہیں ملی اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کو متنبہ کیا گیا، ارشاد ہوا:

وَ اَنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ لَا تُلۡقُوۡا بِاَیۡدِیۡکُمۡ اِلَی التَّہۡلُکَۃِ ۔

اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

یہی حال عرب اور ان تمام لوگوں کا ہُوا جو اس دعوت سے متاثر اور اس پر عمل پیرا ہوئے۔ چناں چہ جہاد کی مشقت اور جان و مال کے خسارہ میں ان کا اتنا بڑا حصہ تھا جو دنیا کی کسی قوم کے حصہ میں نہیں آیا۔ اللہ تعالیٰ ان سے مخاطب ہوکر فرماتا ہے:

قُلۡ اِنۡ کَانَ اٰبَآؤُکُمۡ وَ اَبۡنَآؤُکُمۡ وَ اِخۡوَانُکُمۡ وَ اَزۡوَاجُکُمۡ وَ عَشِیۡرَتُکُمۡ وَ اَمۡوَالُۨ اقۡتَرَفۡتُمُوۡہَا وَ تِجَارَۃٌ تَخۡشَوۡنَ کَسَادَہَا وَ مَسٰکِنُ تَرۡضَوۡنَہَاۤ اَحَبَّ اِلَیۡکُمۡ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ وَ جِہَادٍ فِیۡ سَبِیۡلِہٖ فَتَرَبَّصُوۡا حَتّٰی یَاۡتِیَ اللّٰہُ بِاَمۡرِہٖ ؕ وَ اللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِیۡنَ ۔ (التوبہ-۲۴)

آپ کہہ دیجیے کہ اگر تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے اور تمھارے بھائی اور تمھاری بیبیاں اور تمھارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں نکاسی نہ ہونے کا تم کو اندیشہ ہو اور وہ گھر جس کو تم پسند کرتے ہو، تم کو اللہ اور اس کے رسول سے، اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہوں تو تم منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیج دے اور اللہ تعالےٰ بے حکمی کرنے والوں کو ان کے مقصود تک نہیں پہونچاتا۔

دُوسری جگہ فرمایا:

مَا کَانَ لِاَہۡلِ الۡمَدِیۡنَۃِ وَ مَنۡ حَوۡلَہُمۡ مِّنَ الۡاَعۡرَابِ اَنۡ یَّتَخَلَّفُوۡا عَنۡ رَّسُوۡلِ اللّٰہِ وَ لَا یَرۡغَبُوۡا بِاَنۡفُسِہِمۡ عَنۡ نَّفۡسِہٖ ۔ (التوبہ-ع ۱۵)

مدینہ کے باشندوں کو اور ان اعرابیوں کو جو اس کے اطراف میں بستے ہیں لائق نہ تھا کہ اللہ کے رسول کا ساتھ نہ دیں اور پیچھے رہ جائیں اور نہ یہ بات لائق تھی کہ اس کی جان کی پروا نہ کر کے محض اپنی جانوں کی فکر میں پڑ جائیں۔

اس لیے کہ انسانی سعادت کی عمارت انہیں لوگوں کی قربانیوں کے ستونوں پر قائم ہونے والی تھی اور حالات کی تبدیلی میں صرف اسی بات کا انتظار تھا کہ یہ مہاجرین و انصار اپنے کو مٹا کر انسانیت کی سرسبزی اور قوموں کی ہدایت و فلاح کا فیصلہ حاصل کرلیں ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ۔ (البقرہ ۱۵۵)

ہم تمھیں ضرور آزمائیں گے کچھ نہ کچھ خوف، بھوک، مالوں، جانوں اور پھلوں کی کمی اور نقصان کے ساتھ۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہے :

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ٥

کیا لوگ اتنا کہہ کر چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کی آزمائش نہ کی جائے گی ۔

اگر عرب اس سرفرازی کو قبول کرنے سے ہچکچاتے اور انسانیت کی اس عظیم خدمت میں تردد سے کام لیتے تو بدبختی اور عالم کے فساد کی مدت اور بڑھ جاتی اور جاہلیت کی تاریکی بدستور دنیا پر چھائی رہتی ۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ ۔ (الانفال ۔ ع ۱۰)

اگر تم ایسا نہ کرو گے تو زمین میں بڑا فتنہ پیدا ہوگا اور بڑی ہی خرابی پھیلے گی ۔

چھٹی صدی عیسوی میں دنیا ایک دوراہے پر کھڑی تھی، اس وقت دو ہی راستے تھے، یا تو عرب کے لوگ اپنے جان و مال، آل اولاد اور تمام محبوب چیزوں کو خطرہ میں ڈال کر آگے بڑھ جاتے اور دنیا کی ترغیبات سے کنارہ کش ہو کر اجتماعی مصلحت کی راہ میں اپنا سارا سرمایہ قربان کر دیتے جب دنیا کو سعادت نصیب ہوتی اور انسانیت کی قسمت بدلتی، جنت کا شوق ابھرتا اور ایمان کی ہوائیں چلتیں ۔ یا پھر وہ اپنی خواہشات و مرغوبات اور اپنی انفرادی لذت و عیش کو انسانیت کی سعادت و فلاح پر ترجیح دیتے تو ایسی صورت میں دنیا گمراہی و بدبختی کے دلدل میں پھنسی رہ جاتی اور غفلت و مدہوشی کے عالم میں پڑی رہتی، لیکن اللہ تعالیٰ کو انسانیت کی بھلائی منظور تھی اس لیے عربوں میں اس نے ولولہ پیدا کیا، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اندر ایمان و ایثار کی روح پھونک دی اور ان کو آخرت اور اس کے بے پایاں ثواب کی ترغیب دی، تو انھوں نے اپنے آپ کو انسانیت پر قربان کرنے کے لیے پیش کر دیا اور اللہ کے ثواب اور نوعِ انسانی کی سعادت کی امید میں انھوں نے دنیا کے تمام عیش و آرام سے آنکھیں بند کر کے اپنے جان و مال کو اللہ کے راستے میں جھونک دیا اور ان تمام چیزوں کو تج دیا جن پر لوگ حریصانہ نظریں اٹھاتے ہیں، انھوں نے پورے خلوص اور صداقت کے ساتھ راہِ خدا میں جانیں دیں اور محنتیں کیں، تو اللہ نے ان کو دنیا اور آخرت کے بہتر اجر سے نوازا ۔ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (اور اللہ محسنین سے محبت رکھتا ہے)

آج دنیا ہٹ ہٹا کر پھر اسی نقطہ پر پہنچ گئی ہے جس پر وہ چھٹی صدی مسیحی میں تھی ۔ یہ عالم پھر اسی دوراہے پر نظر آرہا ہے جس دوراہے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت تھا، آج اس کی ضرورت ہے کہ عرب قوم (جس کو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق خاص ہے) میدان میں نکل آئے اور پھر دنیا کی قسمت بدلنے کے لیے جان کی بازی لگائے اور اپنی تمام آسائش و ثروت، دنیا کی نعمتوں، ترقی و خوشحالی کے امکانات اور اپنے سامانِ راحت کو خطرہ میں ڈال دے تاکہ دنیا اس مصیبت سے نجات پائے جس میں وہ مبتلا ہے اور زمین کا نقشہ بدل جاتے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ عرب بدستور اپنے حقیر اغراض اور ذاتی سربلندی و ترقی، عہدہ و منصب، تنخواہوں کی بیشی، آمدنی کے اضافہ اور کاروبار کی ترقی کی فکر میں رہیں اور سامانِ عیش اور اسبابِ راحت کی فراہمی میں مشغول رہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا اسی زہریلے "تالاب میں غوطہ زن رہے گی جس میں وہ صدیوں سے ہلاک ہو رہی ہے، اگر اچھے اچھے ذہین عرب نوجوان بڑے بڑے شہروں میں خواہشات کے غلام بن کر بیٹھے رہیں اور اگر ان کی زندگی کا محور صرف مادہ اور معدہ ہو اس کے علاوہ ان کی کوئی اور فکر نہ ہو اور ان کی تمام جدوجہد صرف اپنی ذاتی زندگی اور اپنی مرفّہ الحالی کے گرد چکر لگا رہی ہو، تو ایسی صورت حال میں انسانی سعادت کا تصور بھی مشکل ہے، بعض جاہلی قوموں کے نوجوان ان سے زیادہ حوصلہ مند تھے اور ان کا ذہن ان سے کہیں زیادہ بلند تھا جبکہ انھوں نے اپنے پسندیدہ مقاصد کی راہ میں اپنی تمام راحت و آرام اور اپنے مستقبل تک کو قربان کر دیا۔ جاہلی شاعر امراء القیس ان سے کہیں زیادہ باہمت تھا کہ کہتا ہے: ؎

ولو اننی اسعی لادنی معیشۃ　　　کفانی ولم اطلب قلیلاً من المال

ولکنما اسعی لمجد مؤثل　　　وقد یدرك المجد المؤثل امثالی

(اگر میں کسی ادنیٰ درجہ کی زندگی کے لیے کوشش کرتا ہوتا تو مجھے تھوڑا سا مال بھی کافی ہوتا اور اس کے لیے ایسی جدوجہد کی ضرورت نہ ہوتی۔ لیکن میں تو ایسی عظمت کا طالب ہوں جس کی جڑیں مضبوط ہوں اور مجھ جیسے آدمی ہی ایسی عظمت کو حاصل کر لیتے ہیں)

دنیا کی سعادت و کامرانی کی منزل تک پہونچنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان نوجوان اپنی قربانیوں سے ایک پل تعمیر کریں، اس پل پر سے گزر کر دنیا بہتر زندگی کی منزل تک پہونچ سکتی ہے۔ زمین کھاد کی محتاج ہوتی ہے، لیکن انسانیت کی زمین کی کھاد جس سے اسلام کی کھیتی برگ و بار لاتی ہے، وہ وہی انفرادی خواہش و ہوس ہے جس کو مسلم نوجوان اسلام کا بول بالا کرنے اور اللہ کی زمین میں امن و سلامتی پھیلانے کے لیے قربان کریں۔ آج انسانیت کی افتادہ زمین کھاد مانگتی ہے یہ کھاد راحت و آرام کے مواقع، انفرادی ترقی کے امکانات اور عیش کے اسباب ہیں جن کو مسلمان بالخصوص عرب اقوام قربان کر دینے کا ارادہ کر لیں۔ چند انسانی جانوں کی جدوجہد اور ان کی قربانیوں سے اگر انسانی گلہ آگ کی راہ سے نکل کر جنّت کی راہ پر لگ جاتا ہے تو یہ بڑا سستا سودا ہے، اس لیے کہ جو نعمت حاصل ہوگی وہ بہت ہی جنس گراں مایہ ہے اور اس کے لیے جو کچھ قربان کرنا پڑے وہ اس کے مقابلہ میں بہت ہی معمولی اور ارزاں ہے ؎

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں　　　اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

سیاستِ نبوی ؐ کا ایک اہم پہلو

خالد مسعود

رمضان ۹ھ کا واقعہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک سے واپس آ چکے تھے۔ تبوک کا غزوہ وہ تھا، جس میں مسلمان روم کے ساتھ جنگ کرنے کے ارادہ سے نکلے تھے اور یہ سفر اس زمانہ میں پیش آیا، جب گرمی زوروں پر تھی اور ملک میں فصل کا زمانہ ہونے کی وجہ سے پھل پک چکے تھے۔ یُوں تو حضور کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ دشمن کو زک پہنچانے اور لڑائی کی مہم کو کامیاب بنانے کے نقطۂ نظر سے اس کی سمت اور اس کے علاقہ کو مخفی رکھنے کے لیے آپؐ غزوات کے ارادہ کو راز میں رکھتے، لیکن اس غزوہ کے موقع پر آپ نے تبوک جانے کا اعلان فرما دیا۔ اس کے بارے میں ابن ہشام لکھتا ہے:

"سوائے غزوۂ تبوک کے کہ اس میں آپؐ نے طویل مسافت، موسم کی شدّت اور مقابل دشمن کی کثرت کا لحاظ رکھتے ہُوئے لوگوں میں اس کا عام اعلان فرما دیا" تاکہ لوگ اس کے لیے ضروری سامان ساتھ لے لیں۔ پھر آپؐ نے تیاری کا حکم دیا اور واضح طور پر بتا دیا کہ آپؐ روم کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم فاتح لشکر کے ساتھ واپس آئے، جسے اللہ تعالیٰ کی شدید آزمائش نے ہلا کر رکھ دیا تھا اور اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کے اندر کے منافقوں اور کمزور ایمان والوں کو چھانٹ دیا تھا۔ سورہ توبہ کی مندرجہ ذیل آیات ان لوگوں کے نفاق، تردّد اور کمزوری ایمان کا ایک ابدی نشان بن گئی ہیں:

لا یستاذنك الذین یؤمنون باللہ و الیوم الاٰخر ان یجاهدوا باموالهم و انفسهم و اللہ علیم بالمتقین انما یستاذنك الذین لا یؤمنون باللہ و الیوم الاٰخر و ارتابت قلوبهم فهم فی ریبهم یترددون و لو ارادوا الخروج لاعدوا لہٗ عُدّۃ و لٰکن کرہ اللہ انبعاثهم فثبطهم و قیل اقعدوا مع القاعدین لو خرجوا فیکم ما زادوکم الا خبالاً و لا اوضعوا خلالکم یبغونکم الفتنة و فیکم سمّٰعون لهم و اللہ

نہیں رخصت چاہتے تجھ سے وہ لوگ جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کرنے کی اور اللہ متقیوں کو خوب جانتا ہے تجھ سے رخصت تو وہی لوگ چاہتے ہیں، جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دلوں میں شک ہے اور وہ اپنے شک میں ڈھلمل یقین ہو رہے ہیں۔ اگر وہ واقعی نکلنا چاہتے تو اس کی تیاری کرتے۔ مگر خدا نے انھیں اٹھانا پسند نہیں کیا۔ پس اس نے انھیں روک دیا اور ان سے کہہ دیا گیا کہ بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو اور اگر وہ نکلتے تو تمہارے اندر فساد بڑھاتے اور تمہارے درمیان

علیمٌ بالظّٰلمین۔ (توبہ ۴۴-۴۷)	فتنہ پھیلانے کی کوشش کرتے اور تمہارے اندر ان کے جاسوس بھی ہیں اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

جب حضورؐ ذی اوان میں تھے، تو آپؐ کو خبر پہنچی کہ منافقین کے ایک گروہ نے مومنین کی جماعت میں تفریق ڈالنے کی غرض سے ایک مسجد تعمیر کی ہے۔ یہ وہ مسجد تھی، جس میں حضورؐ کی تبوک کو روانگی سے قبل منافقوں نے حضورؐ سے نماز ادا کرنے کی درخواست کی تھی اور تعمیر مسجد کا مقصد یہ بتایا تھا کہ "ہم نے اسے مریضوں، حاجت مندوں اور سردی کی بارانی راتوں کے نمازیوں کی خاطر تعمیر کیا ہے"۔ اس وقت حضورؐ نے اپنا جواب غزوۂ تبوک سے واپسی تک ملتوی فرما دیا تھا۔

جب آپؐ کو ذی اوان میں یہ خبر معلوم ہوئی، تو آپ نے مالک بن دخشم اور معن بن عدی کو بلا کر حکم دیا کہ ظالموں کی اس مسجد کو جا کر گرا دو اور اسے آگ لگا دو۔ وہ دونوں جلدی سے گئے اور مسجد کو گرا کر آگ لگا دی۔ اس مسجد اور اس کے تعمیر کنندوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نازل ہوا:

والذین اتخذوا مسجداً ضراراً وکفراً وتفریقاً بین المؤمنین و ارصاداً لمن حارب اللہ ورسولہ من قبل ولیحلفن ان اردنا الا الحسنٰی و اللہ یشھد انھم لکٰذبون۔ (توبہ ۔ ۱۰۷)	اور جنھوں نے مسجد بنائی ضرر پہنچانے کے لیے اور کفر کے لیے اور مومنین کے درمیان تفریق ڈالنے کے لیے اور اس شخص کو گھات مہیا کرنے کے لیے جو اللہ اور اس کے رسولؐ سے لڑا اور یہ قسمیں کھائیں گے کہ بجز بھلائی کے ہمارا کوئی ارادہ نہیں اور اللہ گواہ ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔

اس طریقے سے نبی قائد نے وحدت جماعت کے لیے خطرہ بنے ہوئے نفاق کی سرزنش کے لیے مضبوط قدم اٹھانے کا حکم دیا اور اسے مسلمانوں کے لیے عبرت کا نمونہ قرار دے کر یہ سبق دیا کہ مومنین کے دشمنوں کا مسجدیں بنانا اور مظاہر اسلام کو اختیار کرنا نبیؐ کی نظر میں کوئی وقعت نہیں پا سکا۔ بلکہ اس کا غضب ان کے مظاہر اسلام کے اختیار کرنے کی نسبت ہی سے زیادہ ہوا اور نبیؐ نے ان مظاہر کی بیخ کنی میں بھی پوری درشتی سے کام لیا۔ قرآن کریم نے بھی منافقین کی قسموں کو جھٹلا کر ان کی خباثت کو نمایاں کیا ہے۔ فرمایا:

ولیحلفن ان اردنا الا الحسنٰی و اللہ یشھد انھم لکٰذبون۔ (توبہ ۔ ۱۰۷)	اور وہ قسمیں کھائیں گے کہ بجز بھلائی کے ہمارا کوئی ارادہ نہیں اور اللہ گواہ ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔

اس واقعہ کے کچھ ہی عرصہ بعد قبائل طائف کا نمائندہ وفد ثقیف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیعت اور قبول اسلام کی غرض سے آیا۔ ان کی شرط یہ تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مطالبات منظور فرمائیں اور ان کی قوم، ان کے علاقوں اور اموال کے بارے میں انھیں خصوصی پروانہ لکھ کر دیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ملاقات کی اور ان کی شرائط سنیں۔ ان میں ایک شرط ابن ہشام کی روایت کے مطابق یہ تھی کہ "ان کے قبیلے کے بُت 'لات' کو ان کے لیے باقی رہنے دیا جائے اور تین سال کی مدت تک اسے نہ گرایا جائے"۔ وفد ثقیف کی دلیل یہ تھی کہ جب تک ان کی قوم اسلام نہیں لے آتی، وہ اس کے بُت کو توڑ کر اسے رنج میں مبتلا کرنا پسند نہیں کرتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شرط ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ چنانچہ وہ اس مدت کو سالوں سے گھٹاتے گھٹاتے ایک ماہ تک لے آئے۔

لیکن حضورؐ نے دو ٹوک فرما دیا کہ آپ ہدم لات کے لیے کوئی بھی مدت مقرر کرنے کو تیار نہیں خواہ یہ مدت ایک ہی دن کی کیوں نہ ہو۔

اس کے بعد وفدِ ثقیف نے درخواست کی کہ انھیں نماز معاف کر دی جائے اور ان پر یہ پابندی نہ لگائی جائے کہ وہ اپنے بتوں کو اپنے ہی ہاتھوں توڑیں۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا:

"جہاں تک اپنے ہاتھوں بت توڑنے کا تعلق ہے، ہم تمھیں اس کی معافی دیں گے لیکن جہاں تک نماز کی معافی کا تعلق ہے یاد رکھو کہ جس دین میں نماز نہیں، اس دین میں کوئی خیر نہیں۔"

پھر آپؐ نے حضرت ابوسفیانؓ بن حرب اور مغیرہ بن شعبہؓ کو طائف روانہ کیا۔ انھوں نے وہاں جا کر لات کو توڑا۔ پھر حضورؐ نے حضرت عثمانؓ بن ابوالعاص کو ان کی صغرسنی کے باوجود صرف اس لیے ثقیف کا امیر مقرر کر دیا کہ حضرت ابوبکرؓ نے ان کے متعلق یہ رائے دی تھی کہ "یا رسول اللہؐ! میں نے ان لوگوں میں سے اس لڑکے کو اسلام کے سمجھنے اور قرآن سیکھنے میں سب سے زیادہ حریص پایا ہے۔"

اس واقعہ میں ہم دوسری مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاست میں مضبوط فیصلہ کی کارفرمائی دیکھتے ہیں۔ ایک معبودِ من دون اللہ کی بیخ کنی میں تاخیر کی اجازت نہ دے کر، دوسرے فرض نماز کا حکم دینے میں۔ پھر عثمان بن ابوالعاصؓ کو ان کی صغرسنی کے باوجود محض ان کے تعلیم قرآن اور تفقہ فی الاسلام کے شوق کے پیشِ نظر ثقیف کا امیر مقرر کر دینے میں بھی ہمیں حضورؐ کا حتمی فیصلہ نظر آتا ہے، جو آپؐ نے ایک نبی کے مخصوص معیارِ انتخاب پر انھیں جانچ کر کیا۔

ہمارے اہلِ سیاست جب سیرت النبیؐ کے اس پہلو کا مطالعہ کرتے ہیں، تو انھیں خیال ہوتا ہے کہ ہدم لات میں ذرا سی تاخیر گوارا کر لینے میں آخر کیا حرج تھا۔ جب کہ ایک نہ ایک دن اسے منہدم ہونا ہی تھا؛ اگر یہ تاخیر گوارا کر لی جاتی تو اہلِ طائف کے جذبات اور زیادہ مسلمانوں کے ساتھ ہوتے۔ اسی طرح اگر کچھ عرصہ کے لیے نماز معاف کر دی جاتی، تو اس سے کیا نقصان ہوتا، جب کہ ان لوگوں میں اسلام ابھی نیا نیا داخل ہو رہا تھا؛ امیر کے تقرر میں بھی ہمارے ان اہلِ سیاست کو ایک چیلنج نظر آتا ہے، جو وفدِ ثقیف کے مسلّمہ معیارِ سیادت کو دیا گیا۔

لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ نبیؐ کی سیاست اس طرح کی حکمت عملیوں پر مبنی نہیں ہوتی۔ وہ ایک ایسے زندہ اور واضح عقیدے سے پھوٹتی ہے، جو حق کے معاملہ میں نمائشی رواداری سے کام نہیں لیتا۔ یہ اس واضح اور کامل پیغام پر مبنی ہوتی ہے، جس کے اٹھانے کے اہل صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جن کے دلوں میں اس کی جڑیں اچھی طرح راسخ ہو چکی ہوں اور وہ اس کے معاملہ میں کبھی متزلزل نہ ہوں۔ جب معاملہ عقیدۂ توحید کا ہوتا ہے اور یہ حقیقت پیشِ نظر ہوتی ہے کہ یہ عقیدہ خدا کے ساتھ کسی بت کی پرستش اور کسی طاغوت کے خوف سے کوئی جوڑ نہیں رکھتا، تو آپ کو نبیؐ کی سیاست میں بناوٹ اور رواداری کی تعبیروں کا سراغ نہیں ملے گا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ خدا کے داعی کسی نرمی یا رخصت پر کبھی آمادہ نہیں ہوتے۔ ہم نے اسی واقعہ میں دیکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وفدِ ثقیف کو اتنی رعایت دی کہ خود ان کے اپنے ہاتھوں بت کو نہیں تڑوایا۔ ان کو نرمی سے حقیقت سمجھائی حتیٰ کہ انھوں نے حضورؐ کی بات مان لی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی واضح رہے کہ اگرچہ حضورؐ نے ان کے ساتھ نرمی بھی کی اور انھیں رعایت بھی دی، لیکن جہاں تک بتوں کے توڑنے اور اس میں تاخیر نہ کرنے کا تعلق ہے، آپؐ اپنے عزم پر قائم رہے اور اس کو قربان نہیں ہونے دیا۔ (المسلمون) ٭

آنحضرتؐ کی پہلی سیاسی فتح (ہجرتِ حبشہ)

سید مرتضیٰ حسین فاضل

بسم اللہ ولہ الحمد وصلی اللہ علی رسولہ محمد وآلہ الامجاد۔

بصیرت نبوت کا اعجاز

ہادیِ دوعالم، رسولِ اعظم، نبی خاتم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات با برکات جس قدر متنوع فتوحات ومعجزات کی حامل ہے کہا جائے اس کی عظمت وافادیت کا ادراک دشوار ہے۔ ولادت باسعادت، ظہور قدسی سے بعثت اور اعلانِ رسالت سے ہجرت تک حضورؐ کی سیرت وکردار کے بے شمار پہلو سب کے سامنے آئے، دشمنوں نے انھیں دشمنی کی بنا پر چھپایا اور ان کا تذکرہ نہ کیا یا پھر ان کی ذہنی افتاد ان حقائق کو دریافت ہی نہ کر سکی جن سے راستے منور ہوتے، بہت سے چھوٹے بڑے مشاہدات دوستوں کے تھے مگر وہ لوگ "عیاں را چہ بیاں" سمجھ کر روایت نہ کر سکے۔ راویانِ اخبار، سیرت نگار حضرات اپنے اپنے رجحان کے مطابق بات کرتے اور واقعات لکھتے رہے، مگر جسے وہ ضروری سمجھے اس کا تذکرہ کیا، جسے بڑا واقعہ جانا اُس کا خلاصہ اور جس کی اہمیت نہ سمجھ سکے اس پر اشارہ ہی کافی جانا۔ اجمال وتفصیل کا یہ دفتر ہر دور میں نکتہ رس آدمی کے لیے فکر وتردد کا باعث رہا۔ وہ جس نکتے کو تلاش کرنا چاہتا ہے اس کی تفصیل نہیں ملتی۔ اس کے باوجود تاریخ وحدیث وتفسیر، جغرافیہ سیاست وثقافت کے وسیع مطالعے کے سہارے معاصر حالت وصورت کا ایک خاکہ ضرور مل سکتا ہے، بشرطیکہ واقعات وحقائق کی راہوں سے باحتیاط گذر کر منزل کی بڑی شاہراہ دریافت کر لے۔

اس وقت میرے سامنے "ہجرتِ حبشہ" کا مسئلہ ہے میں سوچتا ہوں کہ ہجرت اولیٰ کا پس منظر کیا تھا؟ یہ ہجرت حبشہ ہی میں کیوں ہوئی؟ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کیوں نہ فرمائی؟ ہجرت کی تیاری، سمندر اور ساحل کا سفر، راستے اور منزلیں، احوال وواقعات کے کلیات وجزئیات کیا تھے؟ ان نکات وسوالات پر مواد کی کمی جوابات کی مکمل تفصیل مہیا نہیں کرتی۔

چھٹی ساتویں صدی عیسوی کے حجاز اور اس علاقے کے کسی واقعے پر لکھتے پڑھتے وقت وہاں کی ثقافت وسیاست پر بہت سے محققین کی نظر ہے لیکن مذاہب وعقائد اور ان کے حلقوں کا پھیلاؤ، ان کی باہمی کشمکش پر کم، پھر ان باتوں کے سیاسی زاویے سے معاملات کی صورتِ حال پر بہت کم توجہ کی گئی ہے، تجارتی معاملات وجزئیات پر مترتب ہونے والے اثرات تو سب سے کم زیرِ بحث آئے۔ ہم جانتے ہیں کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمہ جہت حالات ومسائل سے فائدے اُٹھائے اور تبلیغِ دین کے لیے کوئی لمحہ ضائع نہیں ہونے دیا۔ دعوت وارشاد، تعلیم وپیام رسانی میں کوئی گوشہ خالی نہ چھوڑا۔ ہجرت حبشہ بھی انھیں میں سے ایک اہم ترین واقعہ ہے۔

بازنطینی و ایرانی حکومتوں کی باہمی طاقت آزمائی، یمن پر ایران و روم و حبش کی سعیِ حصولِ اقتدار کی جدوجہد، پھر عیسائی فرقوں کی باہمی چپقلش۔ حبشے کی جغرافیائی، سیاسی اور مذہبی حیثیت پر غور کیجئے تو ظہورِ اسلام سے لے کر ہجرتِ حبشہ تک ایک لکیر نظر آئے گی۔ یمن سے مکّہ، شام سے مکہ، سندھ و ہند سے مکہ — اور حبشہ سے مکّہ تک ایک ربط ملے گا۔

مکّہ حجاز و عرب کا مقدس شہر تھا۔ کعبے کی تولیت عرب زعامت کی اساس تھی بیہقی نے حضرت علی علیہ السلام سے روایت کی ہے — " کان ھذا الامر فی حمیر فنزعه الله منھم وجعله فی قریش "۔ عرب کی زعامت پہلے یمن کے حمیری خاندان میں تھی، اللہ نے یہ زعامت ان سے لے کر قریش کو عطا کر دی۔ قریش خانہ کعبہ کے متولی اور حجاج کی مہمانداری کے سربراہ بنے قصی نے اہلِ مکّہ کی اصلاح و تنظیم کا اہتمام کیا، تجارت کے منصوبے بنائے — قرآن مجید میں قریش کی تجارتی مہم میں ایک اصول کا تذکرہ ہے۔ یہ لوگ سردی میں اور گرمی میں الگ الگ سمتوں کا رُخ کرتے تھے۔ موسم کے مطابق سامان سفر اور مال تجارت لے کر آتے جاتے تھے، اس طرح انھیں قریب و بعید، آسان و دشوار راستوں، تجارتی منفعتوں کے علاوہ اقتصادی و سیاسی و ثقافتی تعلقات کے امکانات بھی معلوم ہو گئے تھے۔ اچھے تاجر ہمیشہ صلح کے پیامی اور امن کے قاصد ہوتے تھے، تمام تاجروں میں قریش کا اعزاز مسلّم تھا۔ یہ لوگ معاملات میں دوسرے قبائل سے ممتاز مانے گئے — قریش کے مراکز تجارت شام، عراق اور ایران، مصر اور حبشہ میں تھے۔

خانہ کعبہ میں پورے سال زائر آتے رہتے تھے، لیکن موسمی اجتماع میں خاص کر دُور دُور سے لوگ آتے تھے، منڈیاں لگتی تھیں، کاروباری قافلے میدانوں اور پہاڑوں پر ڈیرے لگاتے۔ معزز لوگ اپنے دوستوں کے گھروں میں قیام کرتے تھے۔ یمن، شام، حبشہ و مصر، عراق و ایران، سندھ و ہند کے نامور تاجر، امراء مکّہ کے خصوصی مہمان ہوتے تھے، ان میں خبروں کا تبادلہ ہوتا، ملک ملک کے احوال معلوم ہوتے، باہمی معاہدات کی بات چیت ہوتی تھی، یہ لوگ اپنے وطن جا کر مکّے والوں کے بارے میں اپنے ملک کے تاجروں اور رہنماؤں کو باخبر کرتے، سربرآوردہ اشخاص و افراد اور عوام کے کردار سے مطلع کرتے اور خاص خاص دوستوں کا تعارف کراتے تھے۔

اہلِ مکّہ بھی اپنے سفر میں سابقہ تعارف رکھنے والوں اور جہاں جاتے وہاں کے ہم آہنگ افراد سے ملتے اور اُن کی بستیوں میں اُترتے۔ اُن کی منڈیوں میں مال بیچتے اور پھر نئے دوست بناتے۔ ان سے میل جول بڑھا کر نئے روابط پھیلاتے رہتے تھے۔

حبشے کے ضمن میں کہا جاتا ہے کہ حضرت ہاشم ایک مرتبہ وہاں گئے تھے اور وہاں کے حاکم نجاشی سے ملے تھے۔ اس ملاقات میں اُنھوں نے قریش کو کچھ تجارتی مراعات بھی دلاتے تھے۔ ان کے تجارتی سامان پر ٹیکس بھی معاف کرایا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہاشم اور اُن کی اولاد کو سرکار و دربار تک رسائی حاصل تھی اور بازار کے بڑے بڑے بیوپاری اُنھیں عزّت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس کا ایک ثبوت حضرت ابوطالب کے وہ خط ہیں جو اُنھوں نے شاہ حبشہ کو لکھے تھے۔ حبشے والے عیسائی مذہب کے پرستار تھے۔

یمن میں حمیری خاندان یہودی و یہود نواز تھا رومیوں نے حبشہ کی مدد کر کے ایک مرتبہ یمن پر حملہ کروایا اور ۵۲۵ء کے لگ بھگ حبشے نے یمن پر قبضہ کر لیا تھا اور وہاں اُن کا آدمی حاکم ہو گیا تھا۔ ابرہہ نے یمن پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہی نصاریٰ یہودیوں کی اچھی طرح خبر لینے کے بعد عیسائی مذہب کو فروغ دینے کی طرف توجہ کی۔ یہ لوگ خانۂ کعبہ کی مرکزیت سے خائف تھے۔ اس سے ان کو معاشی، سیاسی اور مذہبی بالادستی حاصل ہونے کی اُمید نہ تھی۔ وہ سوچتے تھے کہ جب تک کعبہ موجود ہے مکّے پر ان کا قبضہ نہ ہو سکے گا اور اس مرکزی شہر تجارت میں ان کے مقاصد پورے نہ ہو سکیں گے۔ حبشہ و روم کے سربراہ بھی اپنے اپنے اقتدار کی فکر میں تھے۔ وہ یمن کی قربت سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ ان سب حقائق کے پس منظر میں عیسائیوں نے فیصلہ کیا اور صنعاء و نجران میں بڑے بڑے مرکزی گرجے بنانے پر متفق ہو گئے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح لوگ خانۂ کعبہ کے بجائے ان کے نو تعمیر عبادت خانوں میں آئیں گے۔ مگر یہ خواب تشنۂ تعبیر ہی رہا۔ کعبہ کی مرکزیت میں کوئی فرق نہ پڑا۔ آخر ابرہہ نے خانہ کعبہ کو مسمار کرنے کی ٹھانی۔

ابرہہ کا کعبہ پر حملہ سنہ پانچ سو ستر یا اکہتر عیسوی میں یمن کا حاکم ابرھہ ہاتھی کے ساتھ بھاری فوج لے کر مکہ مکرمہ کی طرف بڑھا، کم و بیش ساٹھ ہزار سپاہی اور قلعہ شکن ٹینک یعنی ہاتھی، خوفناک تیاری تھی، یمن سے طائف تک یہ خبر جنگل کی آگ بن کر پھیلی۔ عرب سردار قوم قبیلوں کو لے کر مقابلے کے لیے تیار ہوئے۔ اعزاز و آزادی کی خاطر جان کی بازی لگانے راستوں میں رکاوٹ بنے، پہلے ایک یمنی سردار ذونفر کی کمان میں عرب لشکر نے راہ روکی، پھر نفیل ابن حبیب کی قیادت میں قبیلۂ خثعم مقابلے میں آن ڈٹا، مگر ابرہہ شکست پر شکست دیتا، ہاتھی ریلتا، آبادیوں کو روندتا، قبیلوں کو کچلتا طائف کے قریب پہنچا تو بنی ثقیف نے صلاح مشورہ کر کے اپنا وفد ابرہہ کے پاس بھیجا اور عاجزی کا اظہار کر کے مکّے کی رہنمائی کی۔ ان راستہ بتانے والوں میں ایک شخص ابو رغال آگے آگے تھا۔ ابو رغال راستے ہی میں مر گیا۔ اس کی قبر راستے ہی میں بنی۔ عربوں کو اس سے اتنی نفرت تھی کہ جو ادھر سے گذرتا اس کی قبر پر سنگ باری کرتا۔ مدتوں یہ عمل جاری رہا اور عرب غیرت ابو رغال پر نفرین کرتی رہی۔ یہاں تک کہ قبر کا نشان مٹ گیا۔

ابرہہ کی فوج کشی سے سردار قریش جناب عبدالمطلب باخبر تھے۔ انھوں نے نہ تو ابرھہ سے مقابلہ کے لیے جنگی تیاری کی، نہ اس کے استقبال و امن طلبی کا منصوبہ بنایا۔ ان کے باپ دادا نے مکّہ مکرمہ کی زمین اور اس کے تقدس کی خاطر جنگ جوئی کو ہمیشہ ناپسند کیا۔ جنگ کے مقابلے میں صلح اور اختلاف میں معاہدۂ دوستی پر ان کا یقین تھا۔ ان کے طریق حکمرانی میں کسی پر حملہ کا شائبہ تک نہ تھا کسی حملہ آور کی خوشنودی و بالادستی تسلیم کرنے کا خیال۔ اُنھوں نے اپنی دوراندیشی و بصیرت سے خونخوار قبیلوں اور جنگجو پہلوانوں کو امن عامہ پر آمادہ کر رکھا تھا، تاجروں کی حفاظت اور قافلوں کے راستے لوٹ مار سے محفوظ رکھنے کے لیے دستور وضع کئے اور لوگوں سے حلف لیے۔ وہ خود تجارتی قافلے بھیج کر اور آنے والے قافلوں کی نگہداشت کر کے قرب و جوار اور دور دراز کے سوداگروں کو اطمینان دلاتے رہتے تھے۔ ابرہہ کو ہاشم اور عبدالمطلب کی نیک نامی اور صلح جوئی، بلند کرداری اور بلند نگاہی کی خبر تھی۔

ابرھہ طائف سے آگے بڑھا تو راستے میں کسی فوجی دستے کو نہ دیکھ کر حیران ہوا، وہ شہر کے قریب پہنچا تو مکے والوں کے اطمینان کا

مظاہرہ دیکھا کر سرداروں کے اُونٹ میدان میں چر رہے ہیں، کوئی سردار، کوئی وفد، کوئی دستہ نہ لڑنے کے لئے ملا نہ بات کرنے آیا۔ اس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اُونٹ پکڑ لیں، گلے قبضے میں کرنے کے بعد وہ شہر میں داخل ہوا تو شہر خاموش تھا، عبدالمطلب نے لوگوں سے کہہ رکھا تھا کہ ارد گرد کی پہاڑیوں پر چلے جائیں اور قدرت خدا دیکھیں۔ کچھ لوگ کعبۃ اللہ کے قریب حفاظت کی علامت کے طور پر متعین تھے اور بس۔

قریش کی خاموشی دیکھ کر ابرہہ نے اپنے ایلچی کے ہاتھ خود پیغام بھیجا کہ ہم لڑنے نہیں آئے ہیں۔ ہمارا مقصد اس گھر کو ڈھانا ہے ــــ ایلچی کو سمجھا دیا تھا کہ اگر لوگ تم سے بات چیت کرنا چاہیں تو اُن کے سردار کو میرے پاس احترام کے ساتھ لے آنا۔ ایلچی شہر میں داخل ہوا، اُسے عبدالمطلب کی شان اور متفق علیہ قیادت کی خبر ملی، وہ اُن سے ملا اور ابرھہ کے پاس چلنے کی درخواست کی، عبدالمطلب پورے وقار کے ساتھ ابرہہ سے ملے۔ ابرہہ ان کی صورت و شخصیت دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ مسند سے اُٹھا، استقبال کر کے مسند تک لایا، اُن کے پہلو میں بیٹھا اور ان کی خواہش دریافت کی۔ عبدالمطلب نے اپنے دو سو اونٹوں کی واپسی کا ذکر کیا۔ ابرہہ نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا ــ میں آپ کو دیکھ کر جس قدر متاثر ہوا تھا اُتنا ہی آپ کی بات سن کر حیران ہوں، آپ کو اپنے اونٹوں کی اتنی فکر ہے اور اس گھر کی شمہ بھر فکر نہیں جو آپ کے آباؤ اجداد اور دین و دیانت کا ملجا و ماویٰ، مرکز و اساس ہے ــــ عبدالمطلب نے انتہائی اعتماد کے ساتھ جواب دیا ــــ ابرھہ! میں تو صرف اپنے اُونٹوں کا مالک ہوں انھیں کے بارے میں بات کر سکتا ہوں، خانہ کعبہ کا مالک اللہ ہے وہ اپنے گھر کی حفاظت خود کرے گا، ابرھہ نے غیر متوقع جواب سنا وہ عبدالمطلب کی شخصیت، اُن کی عزیمت، ان کے اعتقاد سے مرعوب ہو چکا تھا، اس نے اُونٹ واپس کر دیئے اور عبدالمطلب وہاں سے اُٹھ کر خانۂ کعبہ کے پاس پہنچے اور دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھا کر مناجات شروع کی :۔

لاھُمَّ اِن العبد یَمْنَعُ رحلہ فامنع حلالک

یا اللہ، بندہ اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے تو اپنے گھر کی حفاظت فرما

لایَغْلِبَنَّ صَلِیْبُھُم ومحالھم عدواً محالک

کل ان کی صلیب اور ان کی تدبیریں تیری تدبیروں پر غالب نہ آئیں

ان کنت تارکھم وَ قِبْلَتُنَا فامر ما بدالک

اگر تو ان کو اور ہمارے قبلے (کعبے) کو چھوڑنا چاہتا ہے تو تیری جو مشیت ہو وہ کر (طبری، تاریخ)

یارب لا ارجولھم سواکا

یارب فامنع عنھم حماکا

انّ عدوّ البیت من عاداکا

اِمنعھم اَن یخربوا قراکا

پروردگار! میں ان دشمنوں کے مقابلے میں تیرے سوا کسی کا آسرا نہیں رکھتا، پروردگار! اپنے گھر کو ان کے حملے سے محفوظ رکھ۔ جو شخص تیرے گھر کا دشمن ہے وہ تیرا دشمن ہے۔ ان دشمنوں کو اپنے مہمان خانے کو تباہ کرنے سے باز رکھ۔ ابرھہ ابھی شہر سے دُور ہی تھا کہ

ابابیلوں نے حملہ کر دیا ننھی ننھی چونچوں سے مٹی مٹی کنکریاں برسانا شروع کر دیں۔ ابرھہ مع فوج اور فوج ہاتھیوں سمیت فنا کے گھاٹ اُتر گئی۔ حکومت حبشہ کو یقیناً اس واقعے کے تفاصیل معلوم ہوئے ہوں گے اور حضرت عبدالمطلب کے عقیدے سے، ان کی پالیسی اور اُن کی عظمت کی رپورٹ دی گئی ہوگی۔ تاریخ نے کروٹ لی:

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی سال دنیا میں تشریف لائے جس سال ابرھہ نے شکست پائی تھی، کچھ عرصے بعد وہ اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ تجارت کی غرض سے شام کے اُن علاقوں سے گزرے جہاں راہبوں کی کٹیاں اور پادریوں کے گرجے تھے، ان لوگوں نے قافلے میں نبوت کے چاند اور رسالت کے انوار کو دیکھ کر حضرت ابوطالب کو بتایا کہ آپ کے بھتیجے میں آنے والے رسولؐ کی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔ حضرت موسیٰؑ و عیسیٰؑ کے بتائے ہوئے صفات ان کے چہرے مُہرے سے عیاں ہیں، پیغمبروں کی سیرت اور انبیاء کی صورت کے جو تذکرے مقدس کتابوں میں درج ہیں، محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حُلیہ ان سب کا جامع ہے ——— یہ باتیں اگر ابوطالب سے ہوئیں تو خود چرچ کے ذمے داروں کو بھی تو اطلاع تھی۔

عیسائیت کے مبلغوں نے نئے پیغام کو سُنا اس کی تہہ کو پہنچے اور اس کی پیش رفت کے بارے میں مذہبی اور قومی سطح پر سوچا، وہ مطمئن تھے کہ قریش اور مکّے کے بڑے بڑے خاندان اسلام کے خلاف کمربستہ اور نبرد آزما ہیں۔ باہمی جنگ و جدال چھوڑ کر رسولِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل پر متحد و آمادہ ہیں، ان کی تبلیغ پر بند باندھ رکھے ہیں، لوگوں کو آپ کے پاس نہیں جانے دیتے، تقریر نہیں سُنتے، بات نہیں مانتے، عبادت سے روکتے ہیں۔ مسلمانوں کا معاشرتی، اخلاقی، ذہنی اور معاشی بائیکاٹ کر رکھا ہے، ان کو جسمانی و رُوحانی اذیتیں پہنچاتے اور خوش ہوتے ہیں۔ مارتے، جلاتے، پتھروں سے دباتے، دہکتی ریت پر لٹاتے، بال بچّوں کو سخت تکلیفیں پہنچاتے ہیں۔ بھرے شہر میں ایک دو رحمدل یہ عالم دیکھ کر مسکراتے جاتے ہیں۔ کوئی جماعت ان کی کمک کو نہیں بڑھتی۔ وہ خاموش تماشائی تھے۔

ادھر کارواں آگے بڑھتا رہا، جاں نثار مجاہد ثابت قدمی سے نورِ حق کی مشعل لیے راہوں میں چراغاں کرتے، خون کی سُرخی پھیلاتے جا رہے تھے اور ایک سے دوسرا چراغ روشن ہوتا اور دلوں کے ایاغ منور ہوتے جاتے تھے۔ پانچ سال کے اندر اندر مکّے میں براہِ راست اور بیرونِ مکّہ مسلمانوں کے ذریعے اسلام کا چرچا ہو چکا تھا مسلمانوں کی بڑھنے والی تعداد نے قریش کو قتلِ نبیؐ کے آخری منصوبے بنانے پر آمادہ کر دیا، مگر حضرت ابوطالب آڑے آگئے۔ اب وہ مکمل اقتصادی بائیکاٹ کرنے ہی والے تھے کہ اللہ کی تدبیر فتح کی نوید لے کر آئی۔

ہجرت، ایک نئی جنگ
ایک نئی سیاسی فتح
ایک نئے برِّاعظم میں داخلہ
ایک اہم انسان دوستی کا اعلان

نگاہ بصیرتِ نبوت، بالفاظ دیگر مشیّتِ پروردگارِ عالم نے اشارہ کیا۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حبشہ کی طرف

ہجرت کی اجازت دے کر مسلمانوں کو آگے بڑھایا۔

لوگ کہتے ہیں —— "قریش کے ظلم و تعدی کے بادل جب پیہم برس کر نہ کھلے تو رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جاں نثارانِ اسلام کو ہدایت کی کہ حبش کو ہجرت کر جائیں۔" میں سمجھتا ہوں کہ بارشِ ظلم و ستم اور نفرتِ کفر سے گھبرا کر آنحضرتؐ نے اپنے ساتھیوں کو میدان چھوڑنے کا حکم ہرگز نہیں دیا، مہاجرین کی فہرست بتاتی ہے کہ کمزور و لاوارث افراد یا غلام و بے کس لوگوں کو یہ حکم نہیں تھا بلکہ معززین خاندان اور بڑے بڑے گھرانوں کے افراد کو ترکِ وطن کا مشورہ دے کر آپ نے دو جنگی کارنامے انجام دیئے۔

مکے والے پہاڑی اور میدانی جنگ کے ماہر تھے وہ ایک ایک کو قتل کر سکتے تھے، تھوڑے سے افراد پر بڑی فوج سے حملہ کر کے سب کو تہ تیغ کر سکتے تھے، اب حضورؐ نے اُن کے سامنے نیا نقشہ پیش کیا۔ مکے کی بندرگاہ سے حبشہ کی طرف ساتھیوں کو بھیج کر دشمن کو للکارا کہ۔ لو اگر بہادر ہو تو سمندر میں بیڑا اُتار دو اور سمندر پار جا کر انھیں مار لو، یہ وہاں اکیلے اور نہتے ہیں تم اسلحہ لے جاؤ اور اُن کے سر اُتار لاؤ۔

اہلِ مکہ نے کلمہ گویوں کا جینا دوبھر کر رکھا تھا، لگاتار اذیت دے رہے تھے۔ حضرتؐ نے ان مجاہدوں کو وطن سے دور بھیج کر دشمنوں کی اذیت سے بچایا، انھیں آزادیٔ اظہارِ ایمان و اظہارِ عمل کا موقع دیا اور ان کے دشمن گھروں میں کرب و بے چینی کی فضا پیدا کر دی، خاندان خالی ہو گئے، گھروں کے چراغ دور چمک رہے تھے اور گھر تاریک تھے۔ جنگ میں دشمنوں کو گھریلو پریشانیوں اور ذہنی خلفشار سے دوچار کرنا اعلیٰ درجے کی تکنیک ہے۔ لوگ پیچ و تاب کھاتے رہیں اور حملہ آور سکون سے بیٹھا ان کی بے بسی پر خوش ہو، اور اپنا مشن پورا کرے۔

آنحضرتؐ نے رجب ۵ بعثت اپریل ۶۱۵ء پہلے تھوڑے سے آدمی بھیج کر نئے ملک کے طور طریقے اور وہاں کی حکومت و عوام کا مزاج سمجھایا، پھر مکمل دستہ بھیج کر ایک اور سیاسی برتری حاصل کی، دشمن یہ سمندر پار کر سکا، نہ حبشہ جا کر کوئی عیسائی منصوبہ پورا کرا سکا۔ ایک دو آدمی گئے بھی تو اپنا نقصان اور مسلمانوں کا فائدہ کر آئے۔

اللہ نے اسلام کو آفاقی مذہب بنایا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کالے اور گورے انسانوں کے لیے یکساں رحمت تھے۔ آپ پر فرض تھا کہ دنیا بھر میں اللہ کا پیغام پہنچائیں۔ اس وقت دنیا میں دو بڑی طاقتیں تھیں۔ روم اور ایران، دونوں باہم متصادم تھیں۔ شام و عراق، ترکی اور ایران میں جنگ ہو رہی تھی۔ آپ کا پیغام ایشیا کے قلب اور یورپ کی سرحد تک پہنچ چکا تھا۔ عیسائیوں، یہودیوں اور بت پرستوں کی وجہ سے ہند و سندھ، ایران و ترکستان، شام و قسطنطنیہ تک بات پہنچ چکی تھی۔ حضورؐ نے برِاعظم افریقہ پر نگاہِ انتخاب ڈالی اور اسلام عرب سے حبشہ میں پہنچا دیا۔ اسلام کا یہ نئے برِاعظم میں داخلہ تھا جہاں آدم و نوح، ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام میں سے کوئی نہیں گیا تھا، وہاں حضورؐ نے اپنے نامزد نمائندے کے ذریعے اسلام کو بھیجا۔ یہ تبلیغ کا عظیم ترین کارنامہ تھا۔

حبشہ، افریقہ، کالوں کی دنیا اس قوم سے خطاب جسے رنگ کی بنیاد پر غلام بنایا جاتا رہا، جسے بے وقعت

سمجھا گیا، جیسے دوست بنانے کے قابل اور برابر بٹھانے کے لائق نہیں سمجھا گیا۔ آنحضرتؐ نے ان سیاہ فاموں کو خطاب سے نوازا، نگاہِ کرم سے سرفراز کیا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دنیا میں پہلا اسلام لانے والا سربراہ مملکت ایک سیاہ فام بنا۔ اور اسلام کی سب سے اہم اور بنیادی عبادت کا نقیب ایک افریقی، حبشی سیاہ فام بلال رضؓ کو مقرر کرکے کالوں کو گوروں کی سرداری بخشی۔

ہجرتِ حبشہ، مشکلات سے فرار یا دشمنوں کے مقابلے سے تھک کر آخری راستہ نہیں تھی بلکہ یہ ہجرت انقلاب کی طرف کامیاب پیش قدمی اور سفر کی دوسری منزل تھی۔ مشرکین مکہ کو شکست اور مجاہدین اسلام کو فتح دینے، ایک حکومت کو کلمہ پڑھوانے اور اللہ کی تدبیر اور اپنی سیاست کا بلند ترین مظاہرہ کرنے کا ایک معجزہ تھی۔

حبشہ حجاز کے سمندر پار افریقہ کا بّراعظم ہے بحرِ احمر کی موجودہ بندرگاہ سے کچھ دُور جنوب میں شعَیبَہ نامی بندرگاہ اس دور میں قافلوں کے اترنے کا اڈہ تھی۔ اس سے قریب ترین ساحل حبشہ کا تھا۔ مملکت کا دارالخلافہ اکسوم نامی شہر بتایا گیا ہے۔ حبشہ کا حکمران نجاشی کہا جاتا تھا۔ اُن دنوں اَصحمہ نامی نجاشی فرماں روائی کر رہا تھا۔ اصحمہ سلیم الطبع منصف مزاج بادشاہ تھا۔ وہ نہ خود کسی پر ظلم کرتا، نہ کسی کے ظلم پر خاموش رہتا تھا، تاریخ کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حبشہ کی زمین پسند تھی اور اصحمہ پر اعتماد۔ آپ نے مسلمانوں سے فرمایا: "تفرقوا فی الارض" آپ لوگ زمین پر پھیل جائیں — لوگوں نے پوچھا: یا رسول اللہ! کہاں جانا چاہیئے تو آپ نے حبشہ (الٰی سینا) کا اشارہ فرمایا۔

پہلا مہاجر گروہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اشارہ ملتے ہی کم و بیش پندرہ آدمی سفر کو تیار ہوئے جن کی فہرست یہ ہے:-

(۱) عثمان بن مظعون (۲) عثمان بن عفّان (۳) اُن کی بیوی رقیّہ (۴) ابوحذیفہ بن عُتبہ بن ربیعہ (۵) اُن کی بیوی سہلہ بنت سہیل بن عمرو (۶) زبیر بن العوام (۷) مصعب بن عمیر (۸) عبدالرحمٰن بن عوف (۹) ابوسلمہ بن عبدالاسد (۱۰) اُن کی بیوی اُم سلمہ ابوجہل کی چچا زاد بہن (۱۱) عامر بن ربیعہ العنزی (۱۲) اُن کی بیوی لیلیٰ بنت ابی حثمہ (۱۳) ابوسبرہ بن ابی رُہم، سہیل بن بیضاء۔ حاطب بن عمرو بن عبدشمس۔ ابوسبرہ کی بیوی، اُم کلثوم۔ عبداللہ بن مسعود اور اُم ایمن کے نام بھی لیے جاتے ہیں۔

روانگی

یہ لوگ الگ الگ گروہوں میں شعیبہ پہنچے تو کشتیاں لنگر اُٹھانے کو تھیں۔ نصف دینار فی کس کرایہ دیا، کشتی میں بیٹھے اور بادبان کھلے سفر شروع ہوگیا۔ دشمنوں کو جو خبر ملی تو دوڑے، بندرگاہ پہنچے تو قافلے جا چکے تھے، پیچ و تاب کھاتے ہوئے پلٹے۔ یا تو یہ سوچ رہے تھے کہ اُنھیں مکے کی پتھریلی زمین اور ارد گرد کی پہاڑیوں میں ختم کر دیں گے، آگے بڑھے تو دہکتی ریت میں بھون ڈالیں گے، حضور نبی اعظمؐ کی نئی تدبیر نے اُن کے کیے دھرے پر پانی پھیر دیا۔ وہ خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے۔

مہاجرین کا قافلہ راستے میں کن حالات سے دوچار ہُوا؟ کتنے دن میں سفر تمام ہوا؟ جیسے سوالات ذہن میں اُبھرتے ہیں،

لیکن تاریخ نگار محمد بن سعد واقدی، طبقات میں صرف یہ بتاتا ہے کہ مہاجرین نے کہا:

" قدمنا ارض الحبشۃ فجاورنا بھا خیر جار، امنا علی دیننا وعبدنا اللہ، لانوذی ولا نسمع شیئا نکرھہ "

"ہم حبشہ میں اُترے تو اچھے پڑوسیوں کا ساتھ رہا، ہم اپنے دین کے پابند تھے، اللہ کی عبادت کرتے تھے، نہ کوئی تکلیف پہنچی نہ کوئی بُری بات سُننے میں آئی"

ادھر مکے میں مشرکین نے صورتِ حال کا جائزہ لیا اور اکسوم میں وفد بھیجنے کا فیصلہ کیا، طے ہوا کہ اصحمہ نجاشی سے نمائندے ملاقات کرکے تارکین وطن کی واپسی اور اُن کو قریش کے حوالے کرنے پر بات کریں چنانچہ عمرو عاص ربیعہ کے بیٹے کو ساتھ لے کر حبشہ پہنچے، دونوں نے اپنی سی کوشش کی مگر حکومت نے توجہ نہ کی اور دونوں سیاسی نمائندے ناکام لوٹے۔

قریش نے دوسرا سیاسی ہتھکنڈا استعمال کیا اور حبشہ میں یہ افواہ اُڑادی کہ قریش مسلمان ہوگئے۔ اس خبر کے اثر سے کم و بیش سب مہاجر مکے واپس آگئے اور تین مہینے (رجب ۵ بعثت سے شعبان ۵ بعثت تک) وطن سے دُور رہنے کے بعد جو گھروں میں آئے تو قریش کے تیور بدلے دیکھے اس لیے آنے والوں نے اپنے اپنے طاقتور دوستوں کے یہاں پناہ لی:

• عثمان بن عفّان نے ابواُحیحہ سعید بن العاص سے پناہ لی • ابوحذیفہ بن عتبہ نے اُمیّہ بن خلف سے • زبیر بن العوّام نے زَمعہ بن الاسود سے • مصعب بن عمیر نے نضر بن الحارث بن کلدہ یا ابوعزیز بن عمیر سے • عبدالرحمٰن بن عوف نے اسود بن عبد یغوث سے • عامر بن ربیعہ نے عاص بن وائل سہمی سے • ابوسبرہ بن ابی رہم نے اخنس بن شریق سے حاطب بن عمرو نے حویطب بن عبدالعزّیٰ سے اور سہیل بن بیضاء نے یا تو کسی عزیز سے پناہ لی یا روپوش رہے اور موقع پاکر حبشہ چلے گئے • عثمان بن مظعون کو ولید بن مغیرہ نے پناہ دی تھی، مگر انھوں نے اعلان کرکے پناہ سے علیحدگی اختیار کرلی۔

۶۱۵ء کے آغاز اور ۶ بعثت میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک باقاعدہ قافلہ سالار معین کرکے مہاجرین کو حکم سفر دیا۔ کفّار نے رُکاوٹیں ڈالیں مگر قافلہ نہ رُکا اور قریش منہ دیکھتے رہ گئے۔ اس مرتبہ جانے والوں کی جو فہرست مرتب کی گئی ہے وہ یہ ہے:-

بنی ہاشم ۱۔ جعفر بن ابی طالب
۲۔ اُن کی زوجہ اسماء بنت عمیس خثعمیّہ

بنی اُمیّہ میں ۳۔ عمرو بن سعید بن العاص
۴۔ ان کی بیوی فاطمہ بنت صفوان (بنی کنانہ)
۵۔ خالد بن سعید بن العاص
۶۔ ان کی اہلیہ اُمَیْنَہ بنت خلف (بنو خزاعہ)

بنی اُمیہ کے حلیف ۷۔ عبداللہ بن جحش (بنی غنم بن دودان)

۸ - عبیداللہ بن جحش (یہ شخص عیسائی ہو کر مرا)

۹ - اس کی بیوی اُمِ حبیبہ بنت ابوسفیان - آنحضرتؐ نے نجاشی سے کہہ کر انھیں اپنی زوجیت میں لے لیا، اس طرح ابوسفیان جیسے دشمن پر دوہری ضرب لگی۔

۱۰ - قیس بن عبداللہ (بنی اسد بن خزیمہ)

۱۱ - ان کی بیوی برکہ بنت یسار (ابوسفیان کی آزاد کردہ کنیز)

۱۲ - مُعَیقیب بن ابی فاطمہ (دوسی)

بنی عبدشمس بن عبدمناف میں سے — ۱۳ - ابو حذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ۔

خلفاء بنی نوفل بن عبدمناف میں سے — ۱۴ - عتبہ بن غزوان (بنی قیس بن عیلان میں)

بنی اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی میں سے — ۱۵ - زبیر بن العوام بن خویلد } حضرت اُمّ المومنین خدیجہ کے

۱۶ - اسود بن نوفل بن خویلد } بھتیجے۔

۱۷ - یزید بن زمعہ بن اسود بن مطلب

۱۸ - عمرو بن اُمیّہ بن حارث بن اسد

بنی عبد بن قصی میں سے — ۱۹ - طلیب بن عمیر بن وہب (حضورؐ کے پھوپھی زاد بھائی اروی بنت عبدالمطلب کے بیٹے۔

عبدالدار بن قصی میں سے — ۲۰ - مصعب بن عمیر بن ہاشم

۲۱ - ان کے بھائی ابوالروم بن عمیر

۲۲ - سُوَیبط بن سعد

۲۳ - جہم بن قیس

۲۴ - ان کی زوجہ اُمّ حرملہ بنت عبد الاسود (از بنی خزاعہ)

۲۵ - عمرو بن جہم

۲۶ - خزیمہ بن جہم (گویا جہم کا گھر)

۲۷ - فراس بن نضر بن حارث بن کلدہ

۲۸ - عبدالرحمن بن عوف

۲۹ - عامر بن ابی وقاص

۳۰ - مطلب بن ازہر

۳۱ - ان کی اہلیہ رملہ بنت ابی عوف (از بنی سہم)

بنی زہرہ کے حلیف — ۳۲ - عبداللہ بن مسعود (از ھذیل)

۳۳ ۔ عُتبہ بن مسعود (بھائی)

۳۴ ۔ مقداد بن اسود (اسود بن عبدیغوث کے متبنّٰی، ان کے اصل والد کا نام عمرو تھا)

۳۵ ۔ خالد بن حارث

۳۶ ۔ ان کی زوجہ رَیْطَہ بنت الحَارث بن جبلہ/جُبَیْلَہ (از بنی تمیم)

۳۷ ۔ عمرو بن عثمان، (طلحہ کے چچا)

بنی مخزوم کے افراد

۳۸ ۔ ابو سلمہ بن عبد الاسد (آنحضرتؐ کے پھوپھی زاد اور دودھ شریک بھائی)

۳۹ ۔ ان کی اہلیہ امّ سَلَمہ بنتِ ابو اُمیہ (جو بعد میں اُمّ المومنین ہوئیں)

۴۰ ۔ شماس بن عثمان (عتبہ بن ربیعہ کے بھانجے)

۴۱ ۔ ہبّار بن سفیان

۴۲ ۔ عبداللہ/عبیداللہ بن سفیان

۴۳ ۔ ہشام/ہاشم بن ابی حذیفہ بن مغیرہ

۴۴ ۔ سلمہ بن ہشام بن مغیرہ (ابوجہل کے بھائی)

۴۵ ۔ عیّاش بن ابی ربیعہ (ابوجہل کے بھائی)

بنی مخزوم کے حلیف

۴۶ ۔ مُعَتِّب بن عوف (از بنی خزاعہ)

بنی جمح کے افراد

۴۷ ۔ عثمان بن مظعون

۴۸ ۔ ان کے فرزند، سائب بن عثمان

۴۹ ۔ قُدَامہ بن مظعون (عثمان بن مظعون کے بھائی)

۵۰ ۔ عبداللہ بن مظعون 〃 〃 〃 〃 〃 〃

۵۱ ۔ حاطب بن حارث

۵۲ ۔ ان کی بیوی فاطمہ بنت مجلّل عامریہ

۵۳ ۔ ان کے فرزند محمد بن حاطب

۵۴ ۔ دوسرے بیٹے حارث بن حاطب

۵۵ ۔ ان کے بیٹے حطّاب بن حارث

۵۶ ۔ ان کی اہلیہ فُکَیْہَہ بنت یسار

۵۷ ۔ سفیان بن مَعْمَر

۵۸ ۔ ان کے فرزند جابر بن سفیان

۵۹ ۔ دوسرے فرزند جنادہ بن سفیان
۶۰ ۔ دونوں کی والدہ اور سفیان کی بیوی حسنہ
۶۱ ۔ حسنہ کے دوسرے شوہر سے فرزند شرحبیل بن حسنہ (از بنی یغوث بن مر)
۶۲ ۔ عثمان بن ربیعہ بن اُھبان
۶۳ ۔ خُنیس بن حُذافہ (حضرت حفصہ کے پہلے شوہر)
۶۴ ۔ قیس بن حُذافہ
۶۵ ۔ عبداللہ بن حارث
۶۶ ۔ ہشام بن عاص بن وائل (عمرو عاص کے بھائی)
۶۷ ۔ ابوقیس بن حارث
۶۸ ۔ عبداللہ بن حذافہ
۶۹ ۔ حارث بن حارث بن قیس
۷۰ ۔ معمر بن حارث بن قیس
۷۱ ۔ بشر بن حارث بن قیس
۷۲ ۔ ان کے مادری بھائی سعید بن عمرو (از بنی تمیم)
۷۳ ۔ سعید بن حارث بن قیس
۷۴ ۔ سائب بن حارث بن قیس
۷۵ ۔ عُمیر بن رِئاب

بنی سہم کے حلیف

۷۶ ۔ مُحمیّہ بن الجزء (از بنی زبید)

بنی عدی کے افراد

۷۷ ۔ مَعمر بن عبد اللہ بن نَضْلَہ
۷۸ ۔ عروہ بن عبد العزّی یا عروہ بن ابی اثاثہ بن عبد العزّی
۷۹ ۔ عدی بن نضلہ
۸۰ ۔ ان کے فرزند نعمان

بنی عدی کے حلیف

۸۱ ۔ عامر بن ربیعہ العنْزی (خطاب کے متبنّٰی)
۸۲ ۔ ان کی بیوی لیلےٰ بنت ابی حثمہ (از بنی عدی)

بنی عامر بن لوی کے افراد

۸۳ ۔ آنحضرتؐ کے پھوپھی زاد بھائی ابوسبرہ بن ابی رُھم (برّہ بنت عبدالمطلب کے بیٹے)

۸۴ - ان کی اہلیہ، ام کلثوم بنت سہیل بن عمرو

۸۵ - عبداللہ بن مخرمہ

۸۶ - عبداللہ بن سہیل بن عمرو

۸۷ - سلیط بن عمرو

۸۸ - سکران بن عمرو

۸۹ - ان کی بیوی سودہ بنت زمعہ (جو بعد میں اُمّ المومنین ہوئیں)

۹۰ - مالک بن زمعہ (سودہ کے بھائی)

۹۱ - عمرہ یا عمیرہ بنت السّعدی

۹۲ - حاطب یا ابوحاطب بن عمرو

بنی عامر کے حلیف — ۹۳ - سعد بن خولہ (یمنی)

بنی الحارث بن فہر سے — ۹۴ - ابوعبیدہ بن الجرّاح

۹۵ - سہیل بن بیضاء

۹۶ - عمرو بن ابی سرح

۹۷ - عیاض بن زہیر یا ربیعہ بن ہلال

۹۸ - عمرو بن الحارث بن زہیر

۹۹ - عثمان بن عبدغنم بن زہیر

۱۰۰ - سعد یا سعید بن عبدقیس

۱۰۱ - حارث بن عبدقیس

بعض روایات کے مطابق عثمان بن عفّان اور اُن کی اہلیہ رقیّہ ملالی جائیں تو ایک سوتین افراد ہوتے ہیں۔ ان میں اکثریت بڑے بڑے قبائل اور ابوجہل، ابوسفیان، عتبہ بن ربیعہ، ہندہ، جگر خوار اور نضر بن حارث جیسے سرداروں کے بھائی، بیٹے بیٹیاں ہوتیں، اور دلوں کے چین تھے۔ عمرو بن عاص کے بھائی کی ہجرت بھی ایک سانحہ تھی۔

جعفر بن ابی طالب کی سربراہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی صورت سے مشابہ صورت رکھنے والے بھائی اور تربیت یافتہ شاگرد، سردارِ عرب جناب ابوطالب کے فرزند حضرت جعفر رضوان اللہ علیہ کو اس قافلے کا سربراہ اور اپنا خصوصی نمائندہ بنا کر ساتھ کیا تھا۔ یہ لوگ حبشہ پہنچ کر منزل گزیں ہوئے۔ تاریخوں نے کوئی ایسی بات نہیں لکھی جس سے یہ معلوم ہو کہ آنحضرتؐ نے انھیں تحفے اور ہدیے دیئے ہوں، بادشاہ اور اُمراء سے ملنے کا حکم دیا ہو، جائز ناجائز روابط کی اجازت دی ہو، سردار اور ساتھی عام حالت میں گئے اور عام حالت میں وہاں رہنے لگے۔

قریش کا وفد

کچھ دن بعد قریش نے ابوجہل کے مادری بھائی عبداللہ بن ربیعہ اور عمرو بن عاص کو نجاشی کے پاس بھیجا۔ یہ لوگ پادریوں، امیروں اور خود بادشاہ کے لیے قیمتی تحفے اور سوغاتیں لے کر حبشہ کی طرف روانہ ہوئے۔ دشمنی میں پختہ عیاری و چرب زبانی میں ماہر، جوڑ توڑ کے استاد، سمندر سے ساحل پہنچے، کچھ دم لے کر مذہبی و سیاسی رہنماؤں سے ملنے نکلے۔ ارکان سلطنت اور زمام برآوردہ لوگوں کو تحفے دیتے اور ہموار کرتے پھرے، جب راہ ہموار کر لی تو بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، پہلے عرب سرداروں کے تحفے نذر کیے، پھر کہنے لگے:

"ایھا الملک! انہ قد ضوی الی بلدک منا غلمان سفھاء فارقوا دین قومھم ولم یدخلوا فی دینک وجاءوا بدین ابتدعوہ لا نعرفہ نحن ولا انت۔ وقد بعثنا الیک فیھم اشراف قومھم من آبائھم واعمامھم وعشائرھم لتردھم الیھم فھم اعلی بھم عینا واعلم بما عابوا علیھم وعاتبوھم فیہ۔"

"بادشاہ سلامت! آپ کے ملک میں ہمارے یہاں کے چند بے وقوف لڑکے چلے آئے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنی قوم کا دین چھوڑ دیا ہے، پھر آپ کے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے۔ ان لوگوں نے ایک نیا دین ایجاد کیا ہے، جسے نہ ہم جانتے ہیں نہ آپ۔ ان کی قوم قبیلے کے معززین نے ہمیں آپ کے حضور میں بھیجا ہے، سرکار ان لوگوں کو ان کے حوالے کر دیں، کیونکہ وہی حضرات ان کے نگران ہیں۔ وہی حضرات ان پر عائد شدہ الزامات سے باخبر اور ان پر ناراضگی کے وجوہ سے مطلع ہیں۔"

ان کی تقریر ختم ہوتے ہی ان کی سنگت رکھنے والے سردار و امرا بول اٹھے:

سرکار! یہ دونوں سردار سچ کہہ رہے ہیں، جب ان کی قوم کے سردار ان کے عزیز و اقارب ان سے مطمئن نہیں، ان کے خاندان والے انھیں اچھی طرح جانتے ہیں تو انھیں عمرو بن عاص و ابن ربیعہ کے حوالے کر دیا جائے وہ انھیں پکڑ کر واپس لے جائیں۔

نجاشی نے شاہانہ تحمل و شان سے اُن کی عرض داشت سنی اور جواب میں کہا:

لاھا اللہ، اذاً لا اسلمھم الیھما ولا یکاد قوم جاوروني ونزلوا بلادي واختاروني علی من سوای حتی ادعوھم فاسئلھم عما یقول ھذان فی امرھم۔ فان کانوا کما یقولان اسلمتھم الیھما ورددتھم الی قومھم وان کانوا علی غیر ذلک منعتھم

نہیں، خدا کی قسم! ایں تو ان لوگوں کو تمہارے حوالے نہیں کروں گا۔ جو لوگ میری پناہ میں آئیں، دوسروں کے مقابلے میں مجھے ترجیح دیں، اُن لوگوں کے لیے تو یہ نہیں ہوگا ——— میں انھیں بلاؤں گا۔ جو کچھ ان دونوں نے کہا ہے، اس کے بارے میں اُن سے پوچھوں گا۔ اگر بات وہی ہے جو یہ دونوں کہتے ہیں تو ان لوگوں کو ان

منهما واحسنت جوارهم ما جاوروني۔ کے حوالے کر دوں گا، انھیں ان کی قوم قبیلے کے پاس بھیج دوں گا اور اگر ان کے کہنے کے برخلاف بات نکلی تو ان دونوں کے مقابلے میں ان کی حفاظت کروں گا۔ اور وہ لوگ جب تک میرے پاس یہاں رہیں گے میں اچھی طرح امن و پناہ میں رکھوں گا۔"

حبشہ کے بادشاہ نے مختصر لفظوں میں جو کچھ کہا اُسے سیاست و آداب حکومت کے جاننے والے سمجھ سکتے ہیں عمرو عاص اور ابن ربیعہ نے باپ دادا اور قوم قبیلے کی بات ہی نہیں کی تھی اس نے مذہب کے نام پر اشتعال انگیزی کی تھی۔ وہ ان لوگوں کے خلاف مذہبی رہنماؤں کی وساطت سے بادشاہ کو مسلمانوں کے خلاف سخت اقدام پر اُبھارنا چاہتا تھا، لیکن دانشمند حکمران نے منطقی جواب دے کر انصاف کی راہ نکالی۔

جعفر اور اُن کے ساتھی، آنحضرتؐ کی طرف سے نہ تحفے لائے تھے نہ کوئی خط اور درخواست، قریش کے وفد سے بھی نہیں ملے رحضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی وفد یا خط بھیج کر کوئی منبادل قدم نہیں اُٹھایا، گویا حضورؐ کو مہاجرین کے قائد پر بھروسا تھا اور حضرت جعفر کو اللہ پر یقین و توکل۔ انھیں قرآن مجید کی تعلیم یاد تھی:

وَلَا تُجَادِلُوْا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْا اٰمَنَّا بِالَّذِىْ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ

(۴۶ - العنکبوت)

اور اہل کتاب سے بحث و مناظرہ کرو مگر شائستہ وعمدہ انداز سے۔ ان لوگوں کے سوا جنھوں نے ظلم کیا ہو اور اُن سے کہو ہم اس کتاب پر بھی ایمان لائے جو ہم پر نازل ہوئی اور اس پر بھی جو تم پر نازل ہوئی اور ہمارا تمہارا اللہ ایک ہے ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔

حضور شاہ میں اہل سخن کی آزمائش

مسلمان اطمینان سے بیٹھے تھے کہ دربار سے طلب آئی، وفد کے قائد حضرت جعفر ایک دو افراد کو لے کر دربار میں پہنچے تو عیسائی علما، اپنی کتابوں کے ساتھ، قریش کے دونوں نمائندے، شاہی فوج کے افسر، ارکان سلطنت اور بادشاہ اپنی اپنی مسندوں پر بیٹھے تھے، بادشاہ نے جعفر کی طرف روئے سخن کیا:

——— یہ کیا سننے میں آیا؟ کیا واقعی تم نے اپنے باپ دادا کا دین بھی چھوڑا اور ہمارے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے؟ کیا وہ نیا دین ہمارے مذہب جیسا ہے نہ دوسرے مذاہب کی طرح!

جعفر ابن ابی طالب:

جناب! ہماری قوم جاہلیت میں مبتلا تھی، بتوں کو پوجتی، مُردار کھاتی، بیہودگیوں کا ارتکاب کرتی، پڑوسیوں کا حق چھینتی تھی، طاقت وروں نے کمزوروں کو دبا رکھا تھا ——— ان حالات میں ——— اللہ نے ہماری قوم میں ایک نبیؐ مبعوث فرمایا، اس کے نسب، اس کے کردار، اس کی امانت و صداقت اور پاک دامنی میں کسی کو کبھی کوئی شک نہیں ہوا۔

اسلام کا تعارف

اس رسولؐ نے توحید کی تعلیم دی، پتھروں کی پوجا اور باپ دادا کا طریقہ چھوڑنے کو کہا:
(۲) ہمیں سچ بولنے، امانت داری، صلۂ رحم، ہمسایوں سے حُسنِ سلوک، خواتین کی حفاظت اور اپنی ذات کے تحفظ کا حکم دیا۔
(۳) فحش باتوں، جھوٹ، مالِ یتیم کھانے، عورتوں پر اتہام لگانے سے روکا۔
(۴) وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ اللہ کو ماننے اور اس کی اطاعت کا پابند کیا،
(۵) نماز، زکوٰۃ جیسی عبادتیں بجالانے کو کہا۔

ہم نے ان باتوں کو مانا، ایمان لائے، جو حکم اللہ کی طرف سے آتے ہیں ہم اُن کی پیروی کرتے ہیں، اور وحدہ لاشریک اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ اللہ کا کسی کو شریک نہیں مانتے، جو باتیں محمدؐ نے حرام فرمائی ہیں اُنھیں حرام، جو حلال بتائی ہیں اُنھیں حلال جانتے ہیں۔

یہ باتیں ہماری قوم کو گوارا نہیں، وہ ہم پر ستم کرنے لگے، ہمیں تکلیفیں دیں، دین سے برگشتہ کرنا چاہا، اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت چھڑوا کر بتوں کی پوجا کروانا چاہی، بیہودہ باتوں کو حلال منوانے کی کوشش کی۔

"جب انھوں نے ہمارا گھیراؤ کر لیا، ہمیں حد سے زیادہ ظلم و ستم کا نشانہ بنایا، ہمارے دین میں رُکاوٹ ڈالی تو ہم آپ کے ملک میں آگئے، ہم نے آپ کی حکومت کو دوسری حکومتوں پر ترجیح دی، ہم اُمید کرتے ہیں یہاں کوئی زبردستی نہ ہو سکے گی۔"

جعفرؓ کی شخصیت، تقریر کا زور، حقائق کا بیان سُن کر نجاشی اور اہلِ دربار بہت متاثر ہوئے۔ بادشاہ نے ایک اور سوال کیا:

اچھا، خدا کا کوئی پیام یاد ہے؟

جی ہاں!

سناؤ!

جناب جعفرؓ نے سورہ مریم کی تلاوت شروع کی:

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ کٓھٰیٰعٓصٓ ۝ ذکر رحمۃ ربک عبدہ زکریا.......

........قرآن کی فصاحت و بلاغت، قاری کی رُوحانیت، لہجہ کی تاثیر، انبیاؑ کا تذکرہ، حضرت زکریا، یحییٰ، ابراہیمؑ عیسیٰ اور مریم علیہم السّلام کا حال سُنتے سنتے محویت، جذب اور کیف کا سماں بندھ گیا، اسقفوں کا رنگ بدلا، اور آنکھ کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی، پادریوں کی کھلی کتابوں پر موتی برسے۔ نجاشی نے کہا:

"کتاب عیسیٰؑ کی قسم! یہ کلام بھی اسی مرکز کا نور ہے جہاں سے رُوح اللہ کتاب لائے تھے ـــــ جاؤ ـــــ اب تم سے نہ کوئی باز پُرس ہوگی نہ کسی کے سپرد کئے جاؤ گے۔"

سفرائے قریش کو حکم دیا، آپ تشریف لے جائیں۔
ابن ابی ربیعہ اور ابن عاص منہ لٹکائے، پسینے میں نہائے، غصے میں بل کھاتے نکلے اور منزل پہنچے حضرت ام سلمہؓ کی روایت ہے:

قال عمرو بن العاص:	عمرو عاص بولا:
واللّٰہ لاتینّہ غدا عنھم بما یستاصل بہ خضراءھم۔	خدا کی قسم، کل میں اُن کے خلاف وہ بات کروں گا کہ ان لوگوں کا سبز باغ جڑ سے اکھڑ جائے گا۔
عبداللہ بن ابی ربیعہ نے کہا:	(ذرا صاحب دل تھا)
لاتفعل فانّ لھم ارحاما وان کانوا خالفونا۔	ہم سے تو یہ نہ ہوگا، آخر ہم ان کے رشتے دار ہیں اگرچہ انھوں نے ہماری مخالفت کی ہے مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ انھیں ذلیل یا قتل کروا دیں۔

عمرو عاص: قسم ہے، میں تو ضرور کہوں گا کہ یہ لوگ عیسیٰؑ بن مریمؑ کو بندہ کہتے ہیں۔
دوسرے دن دونوں نمائندے پھر دربار پہنچے، ادھر اُدھر کی باتیں کر کے بادشاہ سے کہا:
عالی جاہ! یہ لوگ حضرت عیسیٰؑ و مریمؑ کے بارے میں بڑی سخت بات کہتے ہیں، کسی کو بھیج کر دریافت کیا جائے کہ آخر اس سلسلے میں ان کا عقیدہ کیا ہے؟

شاہی ہرکارہ بھیجا گیا، جعفر حاضر ہوئے۔ نجاشی نے پوچھا:
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تم لوگوں کا کیا عقیدہ ہے؟
جناب جعفر: ہمارے نبیؐ نے وحی کے ذریعے ہمیں جو کچھ بتایا وہی ہمارا عقیدہ ہے۔ ہمارے نبیؐ نے فرمایا:
"وہ اللہ کے بندے، اس کے رسول، روح الٰہی اور کلمۃ اللہ ہیں جو اللہ نے مریم بتول کو مرحمت کیا۔"
نجاشی نے جھک کر ایک عصا اُٹھا کر کہا:
تمھارے اور ہمارے عقیدے میں اتنا بھی تو فرق نہیں ہے۔
فوجی سرداروں کے بگڑتے تیور دیکھ اصحمہ نے کہا:
مجھے تمھارے تیوروں کی پروا نہیں۔
پھر مسلمانوں کی طرف رُخ کیا:
"آپ لوگ میرے ملک میں اطمینان سے رہ سکتے ہیں جو آپ کو بُرا کہے گا سزا پائے گا، جو بھی ناسزا کہے گا اُسے جرمانہ ہوگا، جو بگاڑ کرے گا مزا بھگتے گا، آپ میں سے کسی آدمی کو دُکھ دینے کے عوض اگر سونے کا پہاڑ بھی ملے تو میں قبول نہ کروں گا۔"

——— ملازمین بارگاہ سے متوجہ ہو کر :
ان کے ہدیے واپس کر دو، ہیں رشوت لینے کو تیار نہیں۔
——— دوسرا بیان :
حضرت اُم المومنین اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ، ابن مسعود نے بھی دربارِ نجاشی کا واقعہ بیان کیا ہے۔ وُہ موقع کے گواہ تھے اس لیے اُن کی روایت سے کچھ باتیں اور معلوم ہوتی ہیں :
قریش کے دونوں سفیروں نے دربار میں نجاشی کو سجدہ کیا۔ اس کے بعد دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ معروضات پیش کرتے ہوئے کہنے لگے۔ ہمارے بنی عم میں سے کچھ لوگ آپ کے ہاں آئے ہیں۔ یہ لوگ ہم سے اور ہمارے دین سے الگ ہو چکے ہیں ——— نجاشی نے شکایت سُننے کے بعد مہاجرین کو بُلایا۔ حضرت جعفر نے ترجمانی کی ذمے داری لی، یہ لوگ حضورِ شاہ میں پہنچے، حضرت جعفر نے فقط سلام کیا، درباریوں نے ٹوکا ——— سجدہ کیوں نہیں کرتے ؟ حضرت جعفر نے کہا۔ ہم خدا کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کیا کرتے۔ اس کے بعد بادشاہ کے سوالوں کے جواب دیئے، آنحضرت کے بارے میں اپنا عقیدہ بتایا، احکام اسلام کا تعارف کرایا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مسلمانوں کے اعتقاد کا تذکرہ کیا ——— نجاشی نے کہا :

> "خدا کی قسم! حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جو کچھ ہم کہتے ہیں تم لوگ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہتے۔ تم پر اور اُس شخص پر مرحبا جس کے پاس سے تم یہاں آئے ہو ——— میں ان کے رسول اللہ ہونے کی گواہی دیتا ہوں۔ وہی ہیں جن کا تذکرہ انجیل میں موجود ہے جس کی بشارت حضرت عیسیٰؑ نے دی تھی۔"

خدا کی قسم! اگر میں بادشاہی کی ذمہ داریوں میں نہ گھرا ہوتا تو اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا، اُن کی جوتیاں اُٹھاتا، اُن کو وضو کراتا۔

خود حضرت جعفر نے اپنے فرزند عبداللہ سے کہا :۔
قریش کے وفد نے جب ہمارے خلاف بیان ختم کیا اور ہم جواب اور اپنے عقائد کی تفصیل ختم کر چکے تو نجاشی نے اُن سے پوچھا :
کیا یہ لوگ تمھارے غلام ہیں ؟
نہیں !
کیا یہ قرض دار ہیں ؟
نہیں !
تو پھر تم لوگ اُن کا تعاقب چھوڑ دو۔

حضرت جعفر کا بیان ہے کہ عمرو ابن العاص کی گفتگو اور ہماری تقریر کے بعد اصحمہ نے پوچھا:

یہاں کوئی تکلیف تو نہیں دیتا؟

ہم نے کہا ——— ہاں ——— بادشاہ نے حکم دیا کہ منادی کر دی جائے کہ جو کوئی ان لوگوں کو ستائے گا اُسے چار درہم جرمانہ کیا جائے گا ——— پھر ہم سے پوچھا ——— کافی ہے؟ ——— ہم نے کہا نہیں، بادشاہ نے کہا۔ اچھا اس سے دگنا جرمانہ ہوگا ——— (ابن ہشام و مجلسی و مودودی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح پائی، شرک باطل ہوا، توحید کا بول بالا ہوا، قرآن کا کلمہ پڑھا گیا، حضرت عیسیٰؑ پر بہتان ختم ہوا۔ دین کے عقائد و اعمال کی تبلیغ ہوئی چھوٹے چھوٹے سرداروں کے عوض اللہ نے ایک باقاعدہ حکومت کو حامی بنا دیا۔ عمرو عاص و ابن ابی ربیعہ ناکام لوٹے۔

یہ سب ام سلمہؓ کا بیان اور ابن ہشام اور ابن کثیر کی نقل ہے۔ (السیرۃ ۱/۳۳۶، ابن کثیر، التاریخ ۳/۷۴)

ابن ہشام ہی نے حضرت ابوطالب کا ایک منظوم خط بھی نقل کیا ہے جسے پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوطالب نے نجاشی کو نجی طور پر اپنے روابط اور جناب جعفر کو وہاں پہنچنے پر توجہ دلائی تھی اور ان کے دشمنوں کے اقدامات و نتائج کے بارے میں خود بادشاہ سے جواب طلب کیا تھا۔

خط کے بے ترتیب پانچ شعر یہ ہیں:-

الا لیت شعری کیف فی النأی جعفرٌ ——— وعمرو واعداء العدو الاقارب

وھل نالت افعال النجاشی جعفرًا ——— واصحابه او عاق ذلك شاغب

تعلّم، ابیت اللعن، انك ماجد ——— كريم فلا يشقى لديك المجانب

تعلّم، بانّ الله زادك بسطةً ——— واسباب خير كلها بك لازب

وانّك فيض ذو سجالٍ غزيرة

ينال الاعادى نفعها والاقارب

کاش مجھے معلوم ہو سکتا کہ اس طولانی سفر و عالم غربت میں جعفر اور سخت ترین دشمنِ ہم وطن میں کیا کیا مقابلے ہوئے؟

آیا نجاشی کے کردار و اخلاق سے جعفر اور اُن کے ساتھیوں کو فیض پہنچا یا رکاوٹوں نے اس فیض کو روک دیا۔

جناب والا، لعنت آپ سے دُور، آپ معزز و مکرم ہیں، آپ کی بارگاہ میں آنے والے محروم نہیں رہا کرتے ———

آپ کو خدا نے قوت و قدرت عطا کی ہے۔ آپ کے پاس ہر اچھائی کے وسائل موجود ہیں۔

آپ سخاوت کا گہرا اور طوفانی سمندر ہیں جس سے دوست اور دشمن سب فائدہ اُٹھاتے رہتے ہیں (ابن ہشام ۱/۳۵۶)

ابوطالب و امدادِ اسلام

ہجرت حبشہ اور شعب ابوطالب کے واقعے سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ حضرت ابوطالب کی بصیرت و کمک نے بھی حدِ کمال ختم کر دی۔ آپ نے اپنے جوان بیٹے کو حبشہ بھیج کر مہاجرین

کا پلہ بھاری کیا۔ خود مکہ میں رہ کر مخالفین کو مرعوب رکھا، نجاشی کو خط لکھے، جس میں ایک خط کے چند اشعار لکھے گئے۔ دوسرا خط تھا ــــ شاید باعتبار تاریخ یہ پہلا مکتوب ہو۔

تعلّم ــ ملیک الحبش ان محمّدًا ۔۔۔ نبیّ کموسیٰ ، والمسیح ابن مریم
اتی بالھدیٰ ، مثل الّذی اتیا بہ ۔۔۔ فکل بامر اللّٰہ یھدی ویعصم
وانّکم تتلونہ فی کتابکم ۔۔۔ بصدق حدیث لا حدیث المرجّم
فلا تجعلوا اللّٰہ نداء، واسلموا ۔۔۔ فان طریق الحق لیس بمظلم
وانّکم ما ناتیک منّا عصابۃ ۔۔۔ لقصدک الا ارجعوا بالتکرّم

سلطان حبشہ کو معلوم ہوا محمدؐ ویسے ہی نبی ہیں جیسے موسیٰؑ اور مسیحؑ ابن مریم وہ اسی طرح کی ہدایت لے کر آئے جیسے وہ دونوں لائے تھے، ہر نبی اللہ کی طرف سے ہدایت حاصل کرتا اور حفاظت میں رکھا جاتا ہے۔ آپ لوگوں نے ان کا حال اپنی کتاب میں پڑھا ہے سچی بات ہے، اٹکل کی رائے نہیں ــــ اللہ کا کسی کو حریف نہ بناؤ، اسلام قبول کرو، حق کا راستہ تاریک نہیں ہوتا۔ یہ گروہ جو ہمارے یہاں سے آپ کے پاس آیا ہے وہ اس لیے آیا ہے کہ آپ انھیں عزت و احترام سے واپس کریں۔ (ابوطالب مؤمن قریش: عبداللہ خنیزی ص ۱۸۲)

حبشہ کے عیسائیوں کے وفد کی روانگی

رسول اللہ کی تعلیمات و صفات، اسلام کے حقائق و تفاصیل سن کر عیسائی حلقوں میں چرچے ہونے لگے۔ پادریوں نے تحقیق احوال کے لیے ایک وفد تیار کیا اور بیس تیس علماء و زعماء مکے روانہ ہوئے۔ مکے پہنچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نشست و برخاست، آپ کے عادات و اطوار کا جائزہ لیا، پھر حاضر خدمت ہوئے، سوال و جواب کے بعد آنحضرتؐ نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں ان میں ایک آیت تھی:۔

واذ قال اللّٰہ یٰعیسی بن مریم اذکر نعمتی علیک وعلی والدتک اذ ایدتک بروح القدس تکلم الناس فی المھد وکھلا واذ علمتک الکتب والحکمۃ والتوراۃ والانجیل واذ تخلق من الطین کھیئۃ الطیر باذنی فتنفخ فیھا فتکون طیرا باذنی ...... (المائدۃ آیت ۱۱۰)

(جس دن اللہ رسولوں کو جمع کر کے اُن سے فرمائے گا............) اور عیسیٰؑ ابن مریم سے خطاب ہوگا۔ تم اس نعمت کو یاد کرو، جو میں نے تمھیں اور تمھاری والدہ کو دی، ہم نے روح القدس سے تمھاری تائید کی، تم جھولے سے۔ لے کر بڑھاپے تک لوگوں سے باتیں کرتے رہے۔

اور جب ہم نے تمھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دی اور توراۃ و انجیل، اور جب تم نے میرے حکم سے مٹی سے چڑیا بنائی اور میرے حکم سے اس پر دم کیا وہ میرے حکم سے طائر بنی اور تم میرے حکم سے مادر زاد اندھے کوڑھی کو شفا دیتے تھے اور جب تم میرے حکم سے

مردوں کو زندہ کرکے قبروں سے نکال لیتے تھے اور جب تم بنی اسرائیل کے پاس معجزے لے کر آئے اور اس وقت میں نے ان کو تم پر دست درازی کرنے سے روکا تو ان میں سے بعض کفار بولے یہ تو کھلم کھلا جادو ہے۔

وفد کے ممبر آیتیں سُن کر شدت اثر سے رونے لگے۔ انھوں نے قرآن کی تصدیق کی اور رسُول کو سچا ماننے کا اعلان کیا، یہ لوگ خانہ کعبہ کے پاس سے اُٹھ کر آگے بڑھے تو ابوجہل کی پارٹی نے انھیں روک کر بہت بُرا بھلا کہا، مگر انھوں نے پروا نہ کی، یہ لوگ وطن واپس آگئے تو اور بھی اچھے اثر مرتب ہوئے۔

ایک عجیب واقعہ مہاجرین کے وفد میں عبیداللہ بن جحش نہ معلوم کیونکر داخل ہو گیا۔ اپنے بھائی کی محبت میں یا اُم حبیبہ اپنی اہلیہ کے زور دینے سے، چونکہ وہ مخلص نہ تھا اس لیے حبشہ میں عیسائی ہو گیا اس واقعے سے مہاجرین کو سیاسی اور نفسیاتی دھچکا لگنے والا تھا کہ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دستگیری فرمائی اور نجاشی کو خط لکھ کر اُم حبیبہ رضی اللہ عنہا سے عقد کا پیغام بھیج کر مسلمانوں کی عموماً اور حضرت اُم حبیبہ کی عزت کو برقرار ہی نہیں رکھا بلکہ کئی گنا بڑھا دیا، ابوسفیان سے یہ رشتہ مزید سیاسی و معاشرتی فوائد کا سبب ہوا۔

خلاصہ و نتیجہ حبشہ کی سیاسی و سماجی تاریخ موجود نہ ہونے کی وجہ سے تفاصیل تو نہیں ملتے مگر نجاشی اصحمہ کے بارے میں جو کچھ معلوم ہو سکا، اس کی روشنی میں وہ ۵ سنہ بعثت سے ۸ سنہ ہجری یعنی مکتوب نبوی پہنچنے تک اسلام کا حامی رہا۔ اس نے اپنے بیٹے کا نام محمدؐ رکھا (حیوٰۃ القلوب) اس نے ہدایا بھیجے۔ اس کا فرستادہ شہزادہ بانیبز رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں رہا، پھر حضرت علی کی زمین اور ینبع کے چشموں کی نگرانی کرتا رہا۔

(المبرد الکامل ۔ ۳ / ۲۳۸)

ہجرت حبشہ، قریش کے منصوبوں کے لیے ناکامی کا سبب ہوئی، مسلمانوں کو ایک سیاسی طاقت سے یہ کمک ملی کہ یمن کے عیسائی ان کی مخالفت میں وہ نہ کر سکے جو ان سے متوقع تھا مسلمان دشمنوں کی اذیت رسانی سے بچے، دوسرے برِاعظم میں اسلام کی تبلیغ شروع ہوئی۔ عرب و عجم، سیاہ و سفید کا فرق مٹا اور عوام پر یہ ثابت ہو گیا کہ اسلام تمام انسانوں کی مساوات و آزادی کا حامی ہے۔

آپؐ نے مصائب سے گھبرا کر لوگوں کو ترکِ وطن کا حکم نہیں دیا بلکہ مصائب سے مقابلہ کرنے کے واسطے، ترکِ وطن کی مشقت پر آمادہ کیا تاکہ اسلام کا بول بالا ہو۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ خود بنفسِ نفیس اس میدان میں کھڑے رہے اور مقابلہ کے سخت ترین امتحانوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے رہے۔

آپؐ کی زندگی تضاد کے سائے سے دُور تھی، آپؐ خود پریشانیاں برداشت کرتے رہے مگر دوسروں کو آرام پہنچانے کی سعی میں کمی نہ کی، اگر حضورؐ خود حبشہ تشریف لے جاتے تو یقیناً زیادہ عظمت و راحت حاصل کرتے مگر یہ بات حضورؐ کی فطرت بلند کے خلاف تھی۔

ہجرت حبشہ نے نگاہ نبوت کی بلندی، مستقبل پر نظر رکھنے والی بصیرت اور حال سے نپٹنے کی قوت، دشمن کو شکست

دینے کی طاقت، سرِ جنگ فتح کرنے کی صلاحیت کا جو ثبوت مہیا فرمایا ہے اس پر مؤرخ و مفکر حیران اور آپؐ کو نبی آخر الزمان ماننے والے شاد مان ہیں۔

مصادر و مراجع

الطبقات الکبریٰ ج ۱	محمد بن سعد الکاتب	بیروت ، لبنان
تاریخ الامم والملوک	محمد بن جریر الطبری	مصر
السیرۃ النبویہ	ابن ہشام	مصر
سیرۃ النبیؐ	شبلی نعمانی	اعظم گڑھ
رسولِ رحمت	غلام رسول مہر و آزاد	لاہور
سیرت سرورِ دو عالم ج ۲	ابوالاعلیٰ مودودی	ادارہ ترجمان القرآن ، لاہور
خطیب قرآن	مرتضیٰ حسین	غلام علی اینڈ سنز، لاہور
حیات القلوب ج ۲	محمد باقر مجلسی	نول کشور پریس ، لکھنو ۱۹۱۶ء
منتہی الآمال	شیخ عباس قمی	طہران
حیاۃ محمدؐ	محمد حسین ہیکل ترجمہ امام خان نوشہروی	ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۵۵ء
اسوۃ الرسولؐ ج ۲	اولاد حیدر فوق بلگرامی	کراچی ۱۹۷۷ء

اسلام کا سیاسی و معاشی تصوّر

ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم

یہ بات بخوبی معلوم و مشہور ہے کہ اسلام محض کوئی مابعد الطبیعی عقیدہ نہیں ہے بلکہ وُہ زندگی کا ایسا مکمل نظام اور جامع تصوّر ہے، جو ایک منطقی ربط کا حامل ہے۔ ہم اس کے نظریات کا ایک مختصر خاکہ پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہم دیکھیں گے کہ وُہ ہر بڑے منصوبہ کے بعض اجزا سے اتفاق کرتا ہے اور بعض دیگر حصّوں کو رَدّ کر دیتا ہے۔ ہر منصوبہ کا اس طرح مختصر بیان بہ ظاہر کر دے گا کہ کوئی ایسی اہم خرابی یا تو اس کی بنیاد ہی میں موجود ہے یا وہ عواقب جو ناگزیر طور پر اس سے رونما ہوتے ہیں، اسے فاسد کر رہے ہیں۔

اصول عدم مداخلت پر مبنی سرمایہ داروں نے مجرد حریت اور مساوات کی تبلیغ کی۔ مگر مملکت تنازع للبقاء میں غیر جانبدار رہ کر اس کا تدارک نہ کر سکی کہ ظالمانہ عدم مساوات سر نہ اٹھانے پائے۔ معاشرہ کو جاگیری اور شخصی حکومتوں کی ظلم و زیادتی سے آزادی دلا کر اس نے ایک قسم کی زرخرید غلامی کی ترویج کی۔ آزادانہ معاہدہ اور آزاد رائے کا حق بے سُود ثابت ہوا۔ سیاسی عمومیت معاشی غلامی کے ساتھ متحد ہو گئی۔ انگلستان اور امریکہ جیسے ممالک میں سرمایہ دارانہ جماعت نے ان خرابیوں کو رفتہ رفتہ دور کرنے کی ایسی کوششیں کیں، جو بے قید سرمایہ داری سے صورت پذیر ہوتی ہیں۔ لیکن جو مشکلات اور دشواریاں اس نظام کے مزاج سے رُونما ہوتی ہیں، وُہ معاشرتی انتشار و تشتت پیدا کرتی ہیں۔

اسلام حریت، اخوت اور مساوات پر مبنی ہے اور اس کا فلسفیانہ نقطۂ نگاہ خدا پرستانہ ہے زندگی کے تمام فلسفے اور وجود سے متعلق اساسی اندازے زبردست عملی نتائج رکھتے ہیں۔ راسخ الاعتقاد اشتمالیت کا فلسفہ مادہ پرستانہ اور ملحدانہ ہے۔ اس کے برعکس اسلام یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ زندگی ایک روحانی ماخذ، ایک روحانی پس منظر، ایک روحانی سطحِ نظر اور مقصد رکھتی ہے۔ کائنات پر بے بصر میکانکی قوتوں کی کارفرمائی نہیں ہے اور نہ وہ محض مادہ پرستانہ جدلیات کی تابع ہے۔ زندگی ایک مادی اساس بھی رکھتی ہے اور اس کی اس حیثیت کو اسلام نظر انداز نہیں کرتا۔ یہ اس حقیقت سے باخبر ہے کہ انسان کو روحانی طور پر آزاد رکھنے کی خاطر اسے مادی خوشحالی کا یقین دلایا جائے۔

ایک مہربان، ہمہ داں اور ہمہ تواں ہستی کی تخلیق کردہ کائنات اخلاق سے بے تعلق نہیں ہے بلکہ وہ قطعاً خیر و خوبی ہے، جس کے طریقہ ہائے عمل چند دائمی اقدار کو وجود بخشتے ہیں۔

روح اور جسم کے درمیان یا دُنیا اور آخرت میں کوئی تناقض نہیں۔ چونکہ خدا ایک ہے اس لیے جملہ موجودات باہم مربوط ہیں۔ مسلمانوں کو دوسری دنیا کی خوشحالی سے قبل اس دنیا کی خوشحالی کے لیے دُعا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اخلاقی علت و معلول یہاں اس دنیا میں جس طرح اپنے اثرات مترتب کرتے ہیں، ایسے ہی وُہ اپنے اس عمل کو آخرت میں جاری رکھیں گے۔ اشتمالیت تخلیق کے منجانب اللہ ہونے کی تردید کرتی ہے

اور اس کی تمام تاریخ انسانیت کی تشریح، تمام مادی مظاہر کی طرح سراسر مادہ پرستی پر مبنی ہے۔ صرف پیدائش دولت کے طریقے اخلاقی، مذہبی اور تہذیبی اقدار پیدا کرتے ہیں۔ تاریخ کی قرآنی تشریح بالکل اس کے برعکس ہے۔ وہ دعویٰ کے ساتھ کہتا ہے کہ قوموں کا عروج و زوال قوم کے اعتقادات اور سیرتوں میں تبدیلیوں کے سبب ہوتا ہے اور اسلام یہ یقین رکھتا ہے کہ بصیرت سے محرومی کے باعث قومیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ قرآن کی رو سے حقیقی انقلاب کسی قوم کی زندگی میں واقع نہیں ہوتا جب تک کہ اس کے اخلاقی اور ذہنی نقطۂ نگاہ میں تبدیلی نہیں ہوتی:

ان اللّٰہ لا یغیّر ما بقوم حتّٰی یغیّروا ما بانفسھم۔ (انفال - ۵۳)

خدا کسی قوم کی زندگی میں اس وقت تک تبدیلی پیدا نہیں کرتا جب تک کہ ان کے نفوس کے انداز بدل نہیں جاتے۔

قرآن مادی طور پر خوشحال قوموں کی مثالیں پیش کرتا ہے، جو مادہ پرستانہ تنگ نظری کے سبب تباہ ہو گئیں۔ قانون اخلاق کے ابدی حقایق پر ایمان نہ لانے سے وہ خود غرض اور ظالم بن گئیں۔ انھیں اصلاح کے لیے بڑی بڑی مہلتیں دی گئیں۔ لیکن جب انہوں نے خدا کی نشانیوں کی پروا نہ کی، تو سزا کا دن ان پر آن پہنچا اور وہ تباہ ہو گئیں۔ "خدا نے خیر و شر کی میزان قایم کی ہے۔ یہ میزان ایسی حساس ہے کہ ہر ذرہ اس میں وزن کیا جاتا ہے اور جس کا نتیجہ اپنے وقت پر ظاہر ہوتا ہے۔" تاریخ کا اسلامی نظریہ اس کے خدا پرستانہ نقطۂ نگاہ سے پیدا ہوتا ہے اور تاریخ کا اشتمالی نظریہ اس کی مادیت سے رونما ہوتا ہے۔ یہ دو نظریات کلی طور پر باہم ایسے متخالف ہیں کہ ایک خدا پرست مسلمان کے لیے مارکسی، اشتمالی بننا ناممکن ہے۔

فاشستوں نے محض پیدائش دولت اور مساویانہ تقسیم کی پرستش کو مملکت کی پرستش سے مبدل کر دیا۔ مملکت کی پرستش بجز بڑے پیمانہ پر قبائلیت کے، جو دورِ وحشت کی تہذیب کی یادگار ہے اور کچھ نہیں۔ "غلط یا صحیح جو کچھ بھی ہو میرا وطن ہے"۔ فاشیت ایک طاقتور مملکت کی تعمیر چاہتی ہے اور بطور فوق الفردہستی کے مملکت کی پرستش کی تلقین کرتی ہے۔ اسلام بھی ایک طاقت ور مملکت کی تعمیر کی ضرورت محسوس کرتا ہے، جو قوم کے اساسی حقوق کا تحفظ کرے۔ باہر کے حملہ آوروں سے اپنا بچاؤ کرے اور طاقت ور کی ظلم و زیادتی سے کمزور کی حفاظت کرے۔ اسلام ایک اجتماعی اور سیاسی مذہب ہے اور اس کے تمام آئین و دستور کا تعلق معاشری عدل اور معاشری اتحاد سے ہے تاہم مملکت یا اس کے قائدین اور حکمرانوں کی غیر مشروط اطاعت واجب نہیں ہے۔ قانون اور نظم و ضبط کی خاطر بالادستوں کی اطاعت کی تعلیم دی گئی ہے۔ لیکن یہ اطاعت ہمیشہ احکام کے اخلاقی ہونے پر مشروط ہے:

لا طاعۃ للمخلوق فی معصیۃ الخالق۔

خالق کی نافرمانی کر کے مخلوق کی اطاعت نہ کی جائے۔

اسلام کا اساسی اصول ہے۔ صدر حکومت تک کے اعمال و احکام پر ایک ادنیٰ ترین باشندہ ملک برسرِ عام نکتہ چینی کر سکتا ہے۔ اسلام کے نزدیک قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔ خود آنحضرتؐ نے لوگوں سے ارشاد فرمایا کہ اگر آپ نے نادانستہ کسی کو نقصان پہنچایا ہے، تو وہ اپنے انتقام کا حق خود آپ کے خلاف استعمال کر سکتا ہے۔ فاروق اعظمؓ اور حضرت علیؓ بار ہا بلا رعایت داد خواہی کے لیے عدالت میں بحیثیت مدعی اور مدعا علیہ کے حاضر ہو چکے ہیں۔

اسلام شوریٰ کے ذریعہ حکومت کی تعلیم دیتا ہے۔ آنحضرتؐ تقریباً ہر روز معاملاتِ حکومت میں اپنے اصحاب سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ قرآن مسلمانوں کے اوصافِ حسنہ ہی سے بطور خوبی کے اس وصف کا اظہار کرتا ہے اور وہ مستبد اور آمر نہیں ہوتے، بلکہ اجتماعی ہیئت کے تمام معاملات باہمی شورہ سے طے کرتے ہیں۔

قرآن میں مسلمانوں کو اُمتِ وسطیٰ کا خطاب دیا گیا ہے، جو انتہاؤں میں ہمیشہ خیرالامور اوسطہا پر عمل کرتے ہیں۔ یہ یونانیوں کے نظریہ حیات کے مشابہ ہے۔ جن کا قول تھا کہ زیادتی میں کچھ بھی نہیں۔ خیرالامور اوسطہا کا اصول ارسطاطالیسی اخلاقیات میں محوری نقطہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام کی یہ خصوصیت اس کی تمام تعلیمات اور عمل میں جاری ہے۔ اسلام کی جملہ اخلاقیات عملی اخلاقیات ہے جس نے رینان کو یہ کہنے پر مجبور کیا کہ اسلام بنی نوع انسان کا مذہب ہے۔ یہ فرشتوں کے لیے نہیں ہے۔ ہر حکم میں انسان کی اصل فطرت کو مع اس کی تمام جبلتوں اور خواہشات کے ملحوظ رکھا گیا ہے۔ وجدانات اور جذبات زندگی کے لیے بطور آلات کے ہیں۔ یہ نظم وضبط میں لانے کے لیے ہیں، فنا کرنے کے لیے نہیں۔ آنحضرتؐ کے ایک صحابی نے اپنے رنج وافسوس کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا:

"جب میں آپ کی صحبت میں رہتا ہوں تو میرا اخلاقی رنگ نہایت بلند و برتر رہتا ہے۔ بلند خیالات اور معیارات میری شعوریت میں جاری وساری رہتے ہیں۔ لیکن جب میں آپ سے دُور رہتا ہوں، تو میری اخلاقی سطح یکایک پست ہو جاتی ہے۔ میں اپنی حالت پر کس قدر افسوس کرتا ہوں۔"

اس کو سن کر آنحضرتؐ نے فرمایا:

"تم کو مایوس اور پست ہمت نہ ہونا چاہیے۔ تم انسان ہو، فرشتہ نہیں ہو۔ اگر خدا یہ چاہتا کہ دنیا کو ایسی ہستیوں سے آباد کرے، جو اخلاقی کشمکش سے آزاد ہوں، تو وہ ملائکہ کو یہاں بساتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں چاہا، تمہاری اخلاقی پشیمانی اور یہ بلندی اور پستی کا احساس ایمان کی علامت ہے۔" یہ سن کر آپ کے صحابی کو اطمینان حاصل ہوا۔

انسانی اصلاح وترقی کے بعض عظیم پروگراموں کا خاکہ مختلف اقوام کے حالیہ مفکرین، قائدین اور مصلحین نے کھینچا ہے۔ ان اصلاحی تجاویز میں سے ہر ایک میں چند ایسے اصول ہیں، جو اسلامی غیبیات کے اجزاء ہیں۔ لیکن ان سب میں جزوی صداقتوں پر دروغ بیانی کی حد تک مبالغہ آمیزی کی گئی ہے۔ دیگر اجزاء کے اخفاء کے ساتھ چند اجزا پر تشددانہ تاکید نے انھیں بحیثیت مجموعی زندگی کے ساتھ سلوک میں ناکام وخاسر رکھا ہے۔ حریت پسند عمومیت میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں، جو اسلام کی جزو لاینفک ہیں۔ ہر ایک کو مساوی مواقع ملنے اور قانون کی نظر میں سب کے برابر ہونے کی تعلیم اسلام نے دی ہے، لیکن نسلی اور قومی تعصبات حریت پسند عمومیت کے عقاید و اعمال کو اب تک فاسد کر رہے ہیں۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے یہ کافی حریت پسندانہ نہیں ہے، نہ اسلام اس کے سرمایہ دارانہ نظام کی تائید کر سکتا ہے جس میں سُود کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ دنیا کے حاشیۂ خیال میں آنے سے قبل اسلام نے تمام علوم کی آزادی کے ساتھ آزادیِ تقریر اور آزادیِ ضمیر کی تعلیم دی تھی۔ دین میں کوئی جبر و اکراہ نہیں ہے۔ یہ قرآن کے اساسی اصولوں میں سے ایک ہے۔ مغربی عمومیت شہری حقوق میں باشندوں کی مساوات کے اسلامی حکم کو تسلیم کرتی ہے۔ لیکن وہ باشندوں کی اکثریتوں اور اقلیتوں میں تقسیم کو ضروری اور مخالف جماعتوں کے وجود کو لازمی سمجھتی ہے، جن کا خاص مقصد حکومت کے معاملات میں تقریباً ہر چیز کی

مخالفت کرنا ہوتا ہے۔ یہ مخالفت صرف مخالفت کی خاطر کی جاتی ہے۔ جس کا معین مقصد بے اعتبار کرنا اور برسرِ اقتدار جماعت کو بالآخر بے دخل کرنا ہے۔ اشتمالیوں اور فاشستوں دونوں نے انتخابی جماعتوں کی سرپھٹول کو ترک کر دیا اور صرف ایک کارفرما جماعت قائم کی، جو افراد یا جماعتوں کی طرف سے کسی قسم کی مخالفت برداشت نہ کیا کرے۔ اسلام کا سارا رجحان ان دونوں متبادل صورتوں کے خلاف ہے۔ ایک جماعت کی حکومت باشندوں کے آزادانہ احساسات کے اظہار کو سلب کر لیتی ہے۔ ایسی یک جماعتی حکومتوں میں فرد کے لیے کوئی آزادی باقی نہیں رہ سکتی۔ اس کو یا تو جماعت کے احکام کی موافقت کرنی پڑتی ہے یا اپنے ضروری حقوق سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔ اسی طرح حریت پسند عمومیتوں کی جماعتی سیاسیات کے اقتدار کی جدوجہد میں صداقت اور عام خوش حالی برطرف ہو جاتی یا نہایت ثانوی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ ہر پارلیمان میں قوم کے نمایندوں کی گروہ بندی ہوتی ہے۔ ایک آزاد انسان پابند بن جاتا ہے۔ اس طریقہ میں ایک آزاد خیال انسان اگر کبھی وہ منتخب بھی ہو جائے، تو نکما سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ کوئی جماعت اس پر اعتماد نہیں کر سکتی۔ سچی اسلامی مجلس شوریٰ میں جیسا کہ حضرت عمرؓ اکثر طلب فرمایا کرتے تھے۔ اصحاب فہم و کردار بغیر کسی آمرانہ جماعت کو ترتیب دیے یا اکثریت اور اقلیت میں منقسم ہوئے، باہم مجتمع ہوا کرتے تھے۔ اگر کوئی اسلامی مملکت، مجالس یا مشاورتی جماعتوں کو مخصوص یا عام مسائل کے حل کرنے کے لیے طلب کرے تو ہر رکن ایک آزاد رکن ہونا چاہیے، جو خاص علاقوں یا خاص مفادات کی نمائندگی کرے، جو کسی پارٹی کے طریقہ پر منتخب نہ ہوا ہو۔ اس کا انتخاب صرف اس کے علم اور قابلیت کی بناء پر ہوا ہو۔

اسلامی مملکت، فاشستی مملکت کے پیش نامہ کے بعض اجزاء کی، اس کے جملہ تصورات کی تائید کیے بغیر توثیق کرتی ہے۔ فاشسیت قوم کو ایک عضوی کل میں ڈھالنا چاہتی ہے، جس میں مفاد کی خاطر لڑائیوں کو اتنا کھل کھیلنے کا موقع نہ دیا جائے، جس سے قومی یگانگت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ اس میں ذاتی ملکیت کے حق کو اسلام کی طرح تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن آجر و اجیر کے تمام حقوق ملکیت کی پوری نگرانی اور اختیار میں ہوتے ہیں۔ فاشستی پیش نامہ میں بہت کچھ ایسی چیزیں ہیں، جو قابلِ تعریف ہیں، لیکن فاشستی مملکت کا اصلی محرک فاسد ہے اس مملکت کا قیام نسلی یا قومی اساس پر ہوا ہے۔ مملکت ایک موضوع پرستش بن گئی ہے، جو خود اپنی ایک زندگی افراد کی زندگیوں کے علاوہ رکھتی ہے۔ یہ مابعد الطبیعی اور افسانوی وجود کسی قسم کے اخلاقی مقاصد نہیں رکھتا۔ فرد کی اخلاقیت کا اس پر انطباق نہیں ہوتا۔ مملکت کا مقصد طاقت اور عظمت کو برقرار رکھنا اور باشندوں کو بے چون و چرا اور پُراسرار اطاعت کی تعلیم دینا ہوتا ہے۔ بین الاقوامیت سے احتراز کیا جاتا ہے۔ عالم انسانیت ایک بے حقیقت چیز سمجھی جاتی ہے اور اس کے لیے کوششیں منافقت سے موسوم کی جاتی ہیں، فاشسیت کی رُو سے قومی جماعتوں میں حیاتی تنازع للبقاء ہوتی ہے، جو برتر قوت کے ذریعہ بقاء کے سوا اور کوئی قانون تسلیم نہیں کرتی۔ اس کے لیے جنگ کے لیے تیار رہنا ہر مملکت کا اولین فرض ہے اور امن پسندی ذلیل و خوار لوگوں کا مذہب و ایمان ہے۔ جبری ہم آہنگی کے طریقوں کو جاری کر کے قوم کے اندرونی تصادمات کو رفع کرنے کے بعد یہ مختلف مملکتوں کے درمیان آویزشوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ جیسے یک جماعتی آمریت کی بناء قوت ہے ایسے ہی فاشستی مملکت کا اساسی تصور تصادم ہے۔ اسلام نسلی یا قومی حد بندیوں کو اہم اور قطعی تسلیم نہیں کرتا اور جملہ بین الاقوامی مساعی امن کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ ان تمام مبادیات و اصول کی اساس پر جو مختلف مذاہب یا قومی جماعتوں میں باہم مشترک ہیں، اُن کے ذریعہ پُرامن تعاون عمل پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ قرآن میں یہودیوں اور عیسائیوں کو ان چیزوں

کی طرف، جو ان میں باہم مشترک ہیں، مسلمانوں کے ساتھ تعاون عمل کی دعوت دی گئی ہے۔ فاشسیت نے مجلس اقوام کی اساس کا مضحکہ اڑایا۔ مجلس اقوام اور اس کی جانشین اقوام متحدہ نے نہایت اعلیٰ نصب العین کا اعلان کیا لیکن ان کو روبہ عمل لانے میں بُری طرح ناکام رہیں۔ بجائے امن کے قوت ان کے قلوب پر حکمران تھی اور اس ذہنی ساخت کے ساتھ بین الاقوامی انصاف کے دائرہ میں کوئی حقیقی کامیابی حاصل کرنے کی بہت کم اُمید ہو سکتی تھی۔ اوّلاً یہ کہ ان کے لیے انصاف کے ایک کھلے طریقے پر متفق ہونا ہی دُشوار تھا۔ پھر اگر اتفاق سے وہ راضی بھی ہو جائیں اور انھیں کوئی ایثار و قربانی کرنی پڑے، تو نہ وہ اس کا عزم رکھتی ہیں اور نہ ان کے پاس اپنے فیصلہ کو روبہ عمل لانے کی کوئی قوت ہے۔ مجلس اقوام پر فاشسٹی تصور یہ ہے کہ طاقتور کا یہ حق ہے کہ قبضہ کرے اور تصرف میں رکھے، جہاں تک کہ ممکن ہو سکے اور یہ کمزور کی قسمت ہے کہ وہ مغلوب، محکوم اور مطیع بنا رہے۔ اگرچہ اندرونِ مملکت آویزشوں کو ختم کر دینے اور قومی یگانگت کو حاصل کرنے کے نازیستی طریقوں کی ستائش کی جا سکتی ہے لیکن ایک حقیقی اسلامی مملکت کے لیے اس کا اتباع ایک زبردست اخلاقی زیاں ہے، جس کا مقصد تمام نسلی اور قومی حد بندیوں سے ماوراء ہو کر عالمگیر امن و امان کا قیام ہے۔

قرآن نے اپنی اس تعلیم سے ایک حقیقی اور موثر انجمن اقوام کی اساس کا اعلان کیا ہے کہ اگر دو جماعتیں اپنے کسی اہم حق کے لیے آپس میں لڑ پڑیں تو غیر جانب دار جماعتوں کی طرف سے منصفانہ طریقہ پر اس قضیہ کے تصفیہ کی کوشش کی جانی چاہیے۔ فیصلہ صادر ہونے پر تمام متخاصم جماعتوں پر اس کی پابندی لازمی ہوگی۔ اگر کوئی جماعت سرتابی کرے اور فیصلہ کے مطابق عمل کرنے سے انکار کرے، تو تمام جماعتوں کو باہم مل کر قوت کے ذریعہ اس کو منوانا چاہیے۔ یہ ظاہر ہے کہ کوئی مجلس اقوام کبھی بااثر نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ اس قرآنی حکم پر عمل پیرا نہ ہو۔

مملکتِ فلاح و خیر جدید مملکتوں نے تدریجاً ایک مملکت فلاح و خیر کا تصور پیدا کیا ہے مگر ایک تاریخ دان کے لیے اس حقیقت سے انکار دشوار ہوگا کہ مملکت فلاح و خیر کو تشکیل دینے والے اور اسکو روبہ عمل لانے والے پہلے مدبر آنحضرتؐ تھے۔ اس وقت بھی جب کہ انگلستان نے اپنے سیاسی اداروں کو ترقی دی تھی اور پارلیمانی حکومت ایک قابلِ عمل اساس پر استوار کی تھی، تو اس کا زبردست فلسفی ہربرٹ اسپنسر اصول عدم مداخلت کی حامی مملکت کے تصور کی تائید کر رہا تھا، جو محض ایک پولیس مین کی طرح کارگزار ہو۔ ایسی انتظامی مملکت اپنے باشندوں سے محصول جمع کرتی ہے تاکہ محصول ادا کنندوں کی طرف سے فوج اور پولیس کو رکھے اور حملہ آوروں اور قانون شکنوں کے خلاف باشندوں کی محافظت کرے۔ مملکت کو باشندوں کے قتل، ذاتی نقصان اور چوری و فریب دہی کا بھی انسداد کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ مملکت زیادہ سے زیادہ تعلیم اور صحت عامہ پر خرچ کر سکتی ہے قوم کی معاشی زندگی میں اسپنسر مملکت کی مداخلت کا خواہاں نہ تھا، جو صرف آزادانہ معاہدہ پر مبنی ہونی چاہیے۔ قانون طلب و رسد بطور خود توازن پیدا کرے گا۔ آدم اسمتھ نے جو معاشیات میں اصول عدم مداخلت کا باوا آدم ہے، حکومت کے اعمال کو صرف تین چیزوں پر محدود کیا ہے۔ اس کا قول ہے:

"فطری آزادی کے اصول کے بموجب بادشاہ کو صرف تین فرائض انجام دینے پڑتے ہیں اور یہ ہیں حقیقی اہمیت رکھنے والے تین فرائض جو فہم عامہ کے لیے سادہ اور آسان ہیں:

اوّلاً : معاشرہ کو دیگر آزاد معاشروں کے تشدد اور حملہ سے محفوظ رکھنا ،

ثانیاً : سوسائٹی کے ہر رکن کی اس کے دیگر ارکان کے ظلم و زیادتی سے تاحدِ امکان حفاظت کرنا یعنی صحیح عدل و انصاف قایم کرنا ،

ثالثاً : چند تعمیرات اور چند ادارہ جات قایم کرنا ، جن کا قیام و برقراری کسی فرد یا افراد کی قلیل تعداد کے مفاد کے لیے نہ ہو۔

مملکت کے یہ محدود فرائض آجروں اور سرمایہ داروں کو نفع اٹھانے کی بے روک آزادی عطا کرتے ہیں اور دولت کی غلط تقسیم معاشرہ کو دو متحارب گروہوں میں بانٹ دیتی ہے۔ مملکت کی طرف سے کوئی علاج تجویز ہونے سے قبل مالداروں اور ناداروں کے درمیان خلیج وسیع ہوجاتی ہے۔ مزدوروں کی ہڑتال سے خلاف حکومت پولیس کے فرائض انجام دیتی ہے۔ رفتہ رفتہ سیاست دان اور انسانیت دوست مفکرین مملکت کے فرائض میں وسعت دینے کی تحریک شروع کرتے ہیں۔ پہلا علاج معاشری عدم مساوات کو جزوی طور پر ہموار کرنے کے لیے محصول کا ایک اصلاح شدہ نظام تھا۔ سرمایہ دار مملکتوں نے اپنے دائرہ عمل کو وسیع کرنا شروع کیا۔ رہایش، بیروزگاری کا بیمہ، تندرستی کا بیمہ، وظیفہ پیرانہ سالی اور دیگر متعدد ہمدردانہ تدابیر رفتہ رفتہ تجویز کی گئیں اور بعض ممالک نے انھیں ایک حد تک اختیار بھی کیا، یہاں تک کہ ہم بیورج کے منصوبہ (BEVERIDGE SCHEME) پر پہنچتے ہیں، جس نے ایک مکمل لائحہ عمل ایک مملکت خیر کے لیے ترتیب دیا ہے۔ یہ رجحانات اس امر کا واضح ثبوت ہیں کہ دنیا کس طرح آزمایش و فروگذاشت کے طولانی عمل سے گزر کر درجہ بدرجہ آنحضرتؐ کے تصورِ مملکت کی معقولیت اور صداقت کو دیکھنے کے لیے قریب آرہی ہے۔

سُود کی بابت اسلام کا نقطۂ نگاہ بہت واضح ہے۔ آنحضرتؐ اس پر مُصر تھے کہ تمام معاشی معاملات میں سُود کا خاتمہ ہوجانا چاہیے۔ اس وقت مغرب کے تمام بڑے معاشیین کسی قدر جھکتے ہُوئے اسی نظریہ کے قریب آرہے ہیں کہ بنک کاری کو قومی بنایا جائے اور سُود پر قابو حاصل کیا جائے۔ کینس نے مملکتوں کو یہ نصیحت کی ہے کہ وہ اس خصوص میں اخلاقی اور مذہبی تحدیدات عاید کریں۔ لیکن اب بھی معاشیین یہ خیال کرتے ہیں کہ سُود کو مطلقاً موقوف کر دینا کوئی قابلِ عمل تجویز نہیں ہے۔ اس پر صرف قابو پانا اور پیدایش دولت کے لیے اس کو انتہائی ادنیٰ سطح پر لے آنا چاہیے۔ اسلام سرمایہ کے مالک کو پیداآور مزدور کے ساتھ حصّہ دار بننے کی اجازت دیتا ہے تاکہ سرمایہ پیدایش دولت کے ساتھ ناقابلِ شکست طور پر مربوط رہے اور تجارت کے نشیب و فراز میں دونوں شریک رہیں۔ جب سُود پیداآوری سے محروم ہوجاتا ہے تو مدیون عام خطرات برداشت کرتا ہے درآنحالیکہ دائن کو حکومت کی طرف سے یہ اطمینان دلایا جاتا ہے کہ وہ قانوناً اپنی سُودی رقم کا مطالبہ کرسکتا ہے۔ اسلامی نظام میں اس سرمایہ پر جو بیکار پڑا ہو زکوٰۃ عاید کی گئی ہے اسلام پیدایش دولت اور تجارت کو فروغ دینے کا خواہاں ہے اور یہ چیز اکتناز کے خلاف اس کے تمام سخت احکام کی تشریح کرتی ہے۔ اندوختہ دولت کا ایک حصّہ حکومت لے لیتی ہے اور اسے اجتماعی فلاح و بہبود خاص کر غریب طبقوں کو مدد دینے میں خرچ کرتی ہے۔ مملکت خیر و فلاح کو انسانی محنت اور قدرتی ذرائع سے نفع اٹھا کر پیدایش دولت کی ہمت افزائی کرنی پڑتی ہے۔ لیکن اس کو اس سے بھی باخبر رہنا پڑتا ہے کہ دولت ساری ہیئت اجتماعیہ میں سرایت کیے ہُوئے ہے اور کسی حصّہ میں بیجا فراوانی اور دُوسرے

حصہ میں بے انتہا کمی کا باعث نہیں بن رہی ہے۔ قرآن آگاہ کرتا ہے:

کی لا یکون دولۃ بین الاغنیاء۔ (حشر۔ ۷) خبردار! دولت صرف مالداروں میں گردش نہ کرتی رہے۔

بے محنت کے کمائی ہوئی دولت زیادہ تر سُود اور فاضلات کے اکتناز سے جمع ہوتی رہتی ہے۔ یہ وراثت کے غیر منصفانہ قوانین یا کسی ایک کو تمام جائداد کی وصیت سے بھی جمع ہوتی ہے۔ حقِ ملکیت اور ذاتی جائداد کے اصول کو عطا کر کے اسلام نے ایک طرف ناواجبی دولت کے اکتناز اور دُوسری طرف افلاس کے خلاف ضروری تحفظات کر دیے ہیں۔ تمام بڑے مذاہب نے ہمیشہ خیرات پر بہت زور دیا ہے اور بخیل و بے حس مالداروں کو مطعون کیا ہے۔ لیکن یہ اسلام ہی تھا، جس نے منصفانہ تقسیم دولت کے مسئلہ کو کامیابی کے ساتھ عملی طریقہ پر حل کرنے کی کوشش کی۔ انسانی فطرت کا اندازہ کر کے اس نے یہ دریافت کر لیا کہ محض اخلاقی پند و موعظت سُودمند نہ ہوگی، جب تک کہ قوم کا معاشی نظام ضروری قوانین کے ذریعہ از سرِ نو ترتیب نہ دیا جائے۔ مذہبی عقیدہ اور اس کا زبانی اقرار ناکافی ہے۔ قرآن میں نیک لوگوں کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ یہ وُہ لوگ ہیں جو ایمان لاتے اور اچھے کام کرتے ہیں اور نیک کاموں میں خیرات پر بحیثیت اصل نیکی کے زور دیا گیا ہے۔ پھر خیرات کی ارادی اور جبری خیرات میں تقسیم کی گئی ہے۔ اپنی خوشی سے خیرات کرنے کی بابت یہ کہا گیا ہے کہ نیکوکار اپنی ضرورت سے زاید کوئی چیز نہیں رکھتے، وہ اندوختہ نہیں کرتے بلکہ اپنی زاید دولت کو خرچ کرتے ہیں۔ زکوٰۃ جس کی وصولی کا انتظام حکومت کی طرف سے ہوتا ہے۔ ہر قسم کی مصیبتوں میں امداد کے لیے ہے۔ اسلام کے اہم ارکان میں سے یہ ایک ہے جس کا بیان قرآن میں اکثر نماز کے ساتھ اس تنبیہہ سے کیا جاتا ہے کہ ان لوگوں کی عبادتیں جو زکوٰۃ یا خیرات نہیں دیتے، خدا کے پاس بے اثر اور ناقابل قبول ہیں۔ اپنے گرد و پیش کی معاشی زندگی پر نظر فرما کر آنحضرتؐ نے متعدد موقعوں پر اس امر کی صراحت فرمائی کہ کس مقدار سے اوپر فاضل دولت شمار کی جائے اور کس حد تک اس پر محصول عاید کیا جائے۔ اگر معاشرہ کے معاشی نظام میں بنیادی تبدیلیاں واقع ہوں تو ہمیشہ منصوبہ کے اقتضاء اور مقصد کو پیش نظر رکھ کر اس کی جزئیات میں حالات کی مناسبت سے مطابقت دی جا سکتی ہے۔ اسلام کی رُو سے جمع شدہ فاضل دولت اخلاقی اور معاشی مضرت کا موجب ہوتی ہے اور غریب، مفلوک الحال، بےبس لوگوں کے اخلاق بگاڑ دیتی ہے جس سے پورا معاشری نظام فاسد ہو جاتا ہے۔ زکوٰۃ کے معنی پاکی اور نیز افزونی اور بخشش و رحمت کے ہیں۔ جو جماعت اس کی پابندی کرتی ہے، وہ پاک ہوتی اور پھلتی پھولتی ہے۔ کیونکہ اصلی خوشحالی بجز اجتماعی صحت مندی کے اور کچھ نہیں۔ معاشی زندگی کی کارکردگی اور ترقی کا دارو مدار اسی پر ہے۔ یہ مسلمانوں کے بیت المال کا محور ہے۔ آنحضرتؐ کو تمول اور افلاس دونوں سے اندیشہ تھا، آپؐ نے غربت و افلاس کے انسداد کو اسلام کے اہم مقاصد میں سے بیان فرمایا ہے۔ متعدد دیگر مذاہب نے افلاس کی مدح سرائی کو روحانیت کی حد تک پہنچا دیا ہے۔ یہ اندازِ فکر افلاس اور سادہ زندگی میں خلط مبحث کا نتیجہ ہے۔ سادہ زندگی کی آنحضرتؐ نے توصیف فرمائی اور اس پر عمل کر کے دکھلا دیا۔ لیکن افلاس کے متعلق آپؐ نے خدا سے دعا فرمائی کہ اسے انسانوں سے دُور رکھے، جیسا کہ آپؐ کا ارشاد ہے:

الفقر سواد الوجه فی الدارین۔ افلاس دونوں جہانوں میں موجبِ رُوسیاہی ہے۔

جس کے سبب بعض دفعہ ایمان سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ اسی طرح بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ آپ دولت کی افزونی سے ہراساں تھے۔ یہ روایت کی گئی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا:

"مسلمانو! مجھے تمہارے افلاس سے زیادہ تمہارے تمول سے اندیشہ ہے"

آپ کے بعد جب ایران فتح ہوا اور بیش قیمت مالِ غنیمت کے انبار حضرت عمرؓ کے سامنے لگائے گئے، تو آپؓ کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔ کسی نے دریافت کیا، اے امیرالمومنین! یہ محل شادمانی اور مسرت کا ہے نہ کہ غم و اندوہ کا۔ اس پر خلیفہ نے ارشاد فرمایا: "مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں یہ اسلام کے لیے خطرہ نہ ثابت ہو" یہ اظہارِ خیال اسلام کے ان مخالف اور جاہل نکتہ چینوں کی آنکھیں کھول دے گا، جو یہ کہتے ہوئے نہیں شرماتے کہ مالِ غنیمت کی محبت سابقین اسلام کی جنگ آزمائیوں کا بھی اصل محرک بنی ہوئی تھی۔

زکوٰۃ کا آئین، جو اسلامی مملکت خیر کا ایک محوری نقطہ ہے۔ اس امر کا متقاضی ہے کہ ہم اس کی مزید وضاحت کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"صرف زکوٰۃ کی ادائی ہی میں تمہارے اسلام کو بناہ مل سکتی ہے۔ اپنے مال و دولت میں سے زکوٰۃ ادا کرو۔ یہ تمہیں پاک و صاف بنائے گی اور تمہیں ان کا حق ادا کرنے کے قابل بنائے گی، جو تمہارے رشتہ دار ہیں۔ سائل، ہمسایہ اور مسکین کے حقوق سے باخبر رہو اور فضول خرچی میں مبتلا نہ ہو۔ جو قوم زکوٰۃ کو موقوف کر دیتی ہے، وہ قحط و فلاکت سے ہم آغوش ہوتی ہے۔ بغیر زکوٰۃ کے اللہ کے نزدیک نہ ایمان قبول ہے نہ عبادت"

کوئی مملکت اسلامی مملکت کہلانے کی مستحق نہیں۔ اگر وہ زکوٰۃ کے احکام سے بے اعتنائی برتتی ہے کیونکہ اسلام کی رو سے مملکت کا مقصد بجز اجتماعی فلاح و بہبود کے اور کچھ نہیں اور اجتماعی فلاح بغیر زکوٰۃ کے ناممکن ہے۔ اگر انفرادی حق قانون سازی اور ذاتی ملکیت کو انفرادی آزادی میں بطور ایک ضروری عنصر کے شامل کیا جائے۔ لیکن یہ نظام بلا اصلاحی محاصل کے اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو بعض لوگ یقیناً اپنی حاجت سے زیادہ اس کو حاصل اور جمع کرلیں گے اور دوسرے بے نوائی اور افلاس میں چھوڑ دیے جائیں گے۔ اس لیے طریقہ تحصیل اور تقسیم دولت پر حکومت کا اختیار اور قابو ہونا چاہیے۔ اسلام کی سیاسی کامیابی کے بعد بعض عرب قبائل اسلامی مملکت کے حلقہ اثر میں بلا اسلام کی روح کو بخوبی سمجھے اور اخذ کیے بسرعت داخل ہونا شروع ہوئے۔ قرآن میں ایسے لوگوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ جب وہ اقرار کرتے ہیں کہ وہ ایمان لے آئے ہیں، تو ان سے کہا جائے کہ انھوں نے صرف اسلام کی قوت کے آگے اپنا سر اطاعت جھکا دیا ہے اور ایمان ایک قلبی اثر پذیری کا معاملہ ہے۔ آنحضرتؐ کے وصال کے بعد ایسے متعدد قبائل نے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کر دیا اور عدم ادائیگی محصول کی مہم شروع کر دی۔ آنحضرتؐ کے جانشین متحیر تھے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ کیا کیا جائے، جو خود کو مسلمان کہتے ہوں، خدا کی وحدانیت پر ایمان لاتے ہوں اور نماز ادا کرتے ہوں اور خلیفہ کس طرح اہلِ ایمان کے خلاف برسرِ جنگ ہو سکتا ہے۔ ابتداءً یہ خیال حضرت عمرؓ جیسے مضبوط ارادہ رکھنے والے لوگوں کا بھی تھا۔ لیکن اس خصوص میں آنحضرتؐ کے خلیفہ اول حضرت ابوبکرؓ اسلام پر ایک صاف اور واضح مدبرانہ نظر رکھتے تھے۔ آپ کا خیال تھا کہ بغیر زکوٰۃ کے ایمان نامکمل رہتا ہے۔ نمازیں ادا کرنا لیکن بہبودِ عامہ میں حصہ نہ لینا اور اس کے لیے ایثار و قربانی نہ کرنا فی الواقع ایمان کی نفی و انکار ہے۔ آپ نے فرمایا: میں ان سے لڑوں گا، جنھوں نے اس محصول کی ادائیگی سے انکار کیا ہے۔

حضرت عمرؓ نے بھی آپ کی اعلیٰ بصیرت اور اٹل فیصلہ کی داد دی اور واقعتہً ایک خونریز جنگ اس مقصد کے تحت لڑی گئی۔ مقام افسوس ہے کہ مابعد زمانوں میں یہ لازمی محصول، جو فلاحی مملکت کا سرمایۂ قوت تھا اور جس کی تحصیل و تقسیم مملکت کے ذریعہ ہونی چاہیے تھی، اختیاری بن کر رہ گیا اور اس کو ادا کرنے والے کے ضمیر و ایمان پر چھوڑ دیا گیا۔ مغرب کی معاشیات عدم مداخلت نے معاشی توازن پیدا کرنے کے لیے افراد کی روشن خیال خود مطلبی پر اعتماد کیا تھا اور اب اس چیز کو دہرایا جاتا ہے کہ ان وجدانات کے غلط مطالعہ نے کیا افراتفری برپا کر رکھی ہے۔ خود مطلبی ایسی روشن خیال ثابت نہیں ہو سکتی کہ انفرادی اور اجتماعی مفادات کسی من جانب اللہ انتظام سے ایک دوسرے کے موافق ہو جائیں۔ مسلمان مملکتوں نے جو زکوٰۃ کے معاملہ میں مسلمانوں کے ایمان پر اعتماد کیا تو وہ غلطی کی مرتکب ہو جائیں حکومت کے اختیار و قابو سے نکل کر زاید سرمایہ بیت المال میں جمع نہ ہو سکا اور بہت سے فلاح و بہبود کے منصوبے بھی انفرادی ضمیر و ایمان پر چھوڑ دیے گئے۔ اسلام نے پیدائش و تقسیم دولت کے انتظام کی ذمہ داری حکومت پر عاید کی تھی۔ اسلامی حکومت کو ہمہ گیری عفریت بنے بغیر اس کام کے کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ قانون سازی کا اہم مسئلہ حکومت کی مداخلت اور فرد کی آزادی دونوں کے حدود کے تعین کے لیے ہے۔ اسلام نے اس مسئلہ کو ایک دلپذیر اور سہل العمل طریقہ پر حل کیا ہے۔ لیکن مسلمان مملکتوں نے خود اس تجویز کو غارت کر دیا۔ زکوٰۃ ایک محصول ہے، جو سرمایہ پر عاید کیا جاتا ہے۔ یہ دولت کو ان حصوں میں گردش کراتا ہے، جو اس کے زیادہ حاجت مند ہوتے ہیں۔ زکوٰۃ دولت کی ربط رہی اجتماعی فلاح و بہبود کے ساتھ کرتی ہے اور یہ اصول عدم مداخلت کی نقیض ہے۔ مسلمان مفکرین اور مشہور عالمان دین اخلاقی پاکیزگی اور عام خوشحالی کے لیے زکوٰۃ کی اہمیت کو تسلیم کر چکے ہیں یہاں حضرت شاہ ولی اللہ کی ایک عبارت پیش کی جاتی ہے، جو اسلام کے ایک دلی صفت مفکر تھے۔ فرماتے ہیں: "اس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی سوء فہم نہ ہونا چاہیے کہ زکوٰۃ کا حکم دو مقصدوں کی تکمیل کے لیے دیا گیا ہے۔ ایک تادیب نفس اور دوسرے بے نوائی کے خلاف فراہمی اسباب۔ مال و دولت، بخل، خود غرضی، باہمی عناد، نفرت اور اخلاقی تنزل پیدا کرتی ہے۔ ان خرابیوں کا بہترین علاج مال و زر کی فیاضانہ بخشش و عطا ہے۔ اس سے بخل کا استیصال اور خود غرضی کا علاج ہوتا ہے۔ یہ معاشی رخنوں کو پُر کرتی اور اس کی جگہ جذبۂ رفاقت پیدا کرتی ہے۔ یہ رفاقت اعلیٰ اخلاقی کردار کا سنگِ بنیاد بن جاتی ہے۔ جب یہ نشوونما پاتی ہے، تو ایماندارانہ سلوک کے عادات کی پرورش کرتی ہے۔ رفتہ رفتہ لیکن یقین کے ساتھ یہ شریفانہ اوصاف انسان کو اخلاقی برتری کا نمونہ اخلاق بنا دیتے ہیں۔ اسی کے معنی تادیب نفس کے ذریعہ اصلاح ذات کے ہیں۔"

زکوٰۃ قومی اور معاشری افلاس کے خلاف ایک نہایت موثر تدبیر ہے، کیونکہ ایک شہری بنا اس وقت تک محکم نہیں ہو سکتی، جب تک کہ وہ کسی درست معاشی اساس پر استوار نہ ہو۔ ایک سوسائٹی اپنے معاشی نظام ہی کے ذریعہ اپنے محتاج اراکین کی ضرورتوں اور حاجتوں کا ان کی حیثیت کے مطابق انتظام کر سکتی ہے۔ وہ گداگروں کو پھیلنے سے روکتی ہے۔ کیونکہ نادار، معذور، اپاہج، یتیموں اور ایسے ہی محتاجوں کے دیگر تمام قبیل کی مناسب طریقہ پر نگہداشت کی جاتی ہے اور انھیں بھیک مانگنے کی ذلت اور بے عزتی سے بچایا جاتا ہے یہ مملکت ہی کا کام ہے اور اس کو ان لوگوں کی پرورش و پرداخت کا کفیل ہونا چاہیے۔ مگر یہ بوجھل ذمہ داری اسی وقت قابلِ اطمینان طریقہ پر انجام دی جا سکتی ہے جب کہ حکومت کے معمولی ذرائع آمدنی کے ساتھ زکوٰۃ کی صورت میں ایک معتدبہ رقم دولت مندوں سے حاصل ہوتی رہے۔

قرآن نے چند ایسے طبقوں کے نام گنائے ہیں، جو زکوٰۃ کی رقم سے امداد و اعانت کے مستحق ہیں:

انما الصدقات للفقرآء و المساکین والعاملین علیھا و المؤلفة قلوبھم و فی الرقاب والغارمین وفی سبیل اللہ و ابن السبیل ط فریضة من اللہ ط و اللہ علیم حکیم ہ (التوبہ - ۶۰)

خیرات غربا، ومساکین کے لیے ہے اور ان کے لیے جو اس کام پر مامور ہوں اور ان کے لیے، جو جدید الایمان ہیں اور ان کے لیے، جو غلامی اور قرض میں ہیں اور یہ راہِ حق میں خرچ کرنے اور مسافروں کے لیے ہے۔ یہ خدا کا حکم ہے اور خدا جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

غریب اور محتاج کے دو لفظ اس قدر جامع ہیں کہ ان تمام حالتوں کی ایک فہرست بنانا ناممکن ہو جائے گا، جن میں انسان ضروریاتِ زندگی کے لیے اعانت کا خواستگار ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے محتاجوں کی قبیل میں نہ صرف ملازمت کے نا اہل لوگوں کو بلکہ بے روزگاروں کو بھی ان میں شامل فرمایا ہے۔ یعنی ایسے لوگ جو کام کر سکتے ہیں لیکن جنھیں کام نہیں ملتا۔ ان میں سے ایک قسم خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے۔ آنحضرتؐ انسانیت کو زبردست آزادی دلانے والے اور اس کے سخت آرزومند تھے کہ غلامی کے رواج کو برخاست کر دیا جائے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ کسی غلام کو آزاد کرنا انتہا درجہ قابلِ قدر عمل ہے۔ چونکہ قدیم تہذیبوں کا جملہ معاشی نظام غلامی کے رواج پر قایم تھا۔ اس لیے بیک جنبشِ قلم اس کو ختم کرنا ناممکن تھا۔ چند اعمال کے ارتکاب اور ترکِ فعل کے کفارہ میں بطور تدبیر کے غلاموں کو آزاد کرنے کا حکم دیا گیا۔ غلاموں کے ساتھ رفق و ملاطفت کا سلوک کرنے کے لیے آقاؤں سے پُرجوش اپیلیں کی گئیں لیکن اس اصول کی رُو سے کہ حکومت تمام اہم معاملات افراد کو آزادانہ حقِ قانون سازی کے ساتھ اپنے ہاتھ میں لے لے، مملکت پر یہ چیز بھی لازم کر دی ہے کہ وہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ غلاموں کی آزادی پر صرف کرے حکومت کو اس شخص کی بھی اعانت کرنی چاہیے، جو قرض میں گھرا ہوا ہو اور بدقسمتی سے اس حالِ زار میں مبتلا ہو گیا ہو غیر مستحق قرضداری سے رہائی بخشنا بھی حکومت کا ایک فرض ہے۔ فی سبیل اللہ کی اصطلاح رفاہِ عامہ کے تمام اعمال پر حاوی ہے۔

سرورِ کائناتؐ کی حکومت

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

مندرجہ عنوانِ بحث پر روشنی ڈالنے سے پہلے چند امور صاف کرنے ضروری ہیں :

کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حکومت قایم کرنی چاہتے تھے یا اس سے بھی کسی بڑے مطمحِ نظر کے حصول کے لیے حکومت کا قیام ایک ناگزیر چیز تھا؛ عام طور پر حکومت کے قیام کے ذرائع کیا سمجھے جاتے ہیں ؛ آنحضرت صلعم کا ماحول، جس میں حکومت قایم کی گئی، کیا تھا؛

آنحضرتؐ کا ماحول چودہ سو برس پہلے عرب کی سیاسی حالت کا عام نقشہ یہ تھا کہ گو عرب طبعًا ایک ہی ملک تھا، جغرافیائی، لسانی، نسلی یک جہتی موجود تھی۔ رسم و رواج یکساں تھے مگر کوئی متحد کرنے والی مرکزی قوت موجود نہ تھی۔ ڈاکہ، لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا، جُوا، زنا، شراب نوشی ہر قسم کی برائیاں پھیلی ہوئی تھیں (تفصیل صبح الاعشیٰ از قلقشندی وغیرہ میں دیکھیے) خانہ جنگیاں عام تھیں، جن کے باعث ساحلی و سرحدی مقامات پر طاقتور ہمسایہ حکومتوں کی حمائتیں (PROTECTORATES) قایم ہو گئی تھیں[1]۔ ایک حصّہ پر رومن اثر تھا، تو دوسری طرف ایرانی گرفت بھی تھی[2] اور یہ اجنبی تسلّط و نفوذ ہر قسم کے اثرات ڈال رہا تھا۔ چنانچہ ملک میں عیسائی مذہب کی تبلیغ ہو رہی تھی۔ عربی زیرِ حمایت حکومتوں میں شاہانہ طمطراق اور کرّ و فر پیدا ہو گئے تھے مگر گورنرِ یمن ابرہہ حبشی کی تباہی کے بعد (جو عربوں کی روایات اور قومی معبد کو تباہ کرنے آیا تھا)[3] "یوم ذی قار" میں اجنبی استعمار کو ایک زبردست دھکا لگا تھا۔ جس سے عربوں کے ولولوں میں ایک خاموش محرک پیدا ہو گیا تھا اور وُہ اپنی برتر قابلیتوں کو محسوس کرنا شروع کر چکے تھے۔ قسمت سے ان استعماری قوتوں (روم و ایران) میں مسلسل جنگیں ہوتی رہیں جس سے دونوں کمزور ہو گئے۔ قبیلہ واری حکومت تھی لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیمات کے اثر سے ملک میں ایک طرح کی مرکزیت بھی تھی۔ چنانچہ سب عرب حج کو مکہ معظمہ آتے تھے، جہاں قریش اور قریش بھی عبد مناف کا خاندان سب سے با اقتدار تھا۔ حج اور دیگر میلے وحدتِ لسانی و خیالی میں بہت مددگار رہتے۔ ان میں ایک طرح کی جمہوریت موجود تھی۔ دار الندوہ میں وقتِ ضرورت ان کی "پارلیمان" کا اجلاس ہوتا تھا[4]۔ ان کے خطیب، سفیر، حکم یا ثالث خزانہ دار وغیرہ بھی منتخب ہوتے تھے[5]۔ ملک میں چپکے ہی چپکے ذہنیت ترقی کر رہی تھی اور بیرونی ممالک کے سفر وغیرہ سے ان کے چند اعلیٰ تر دماغوں میں تلاشِ حق پیدا ہو گئی تھی۔ بعض لوگ شراب چھوڑ چکے تھے۔ متعدد لوگ بت پرستی سے خود بخود نفور ہو گئے تھے۔ موحدین بھی غیر موجود نہ تھے۔ انسانی قربانی بند ہو چکی تھی اور

---

(۱) جملہ حوالے نمبروں کی ترتیب سے مضمون کے آخر میں دیے گئے ہیں۔ (م۔ ح۔ ا)

ایسی منت کا معاوضہ سوا اونٹ مقرر ہو چکے تھے[۵] انسانیت پروری کا خیال پھیلنے لگا تھا اور متعدد قبائل نے معاہدہ "حلف الفضول" کے ذریعے ایک انجمن مظلوموں کی مدد کے لیے قایم کی تھی۔ غرض اس قسم کی قابلیت ملک میں پیدا ہو چکی تھی کہ انھیں ایک متمدن اور منضبط قوم بنا کر ان کی عملی قوتوں سے کام لیا جائے اور ساتھ ہی ہمسایہ اجنبی حکومتیں اوجِ کمال کو پہنچنے کے بعد تیزی سے رو بہ انحطاط تھیں۔

ظہورِ قدسی

ان حالات میں ۹ ربیع الاوّل ۵۳ قبل ہجرت (۲۰-اپریل ۵۷۱ء) کو مولانا شبلی کے الفاظ میں "شاہِ حرم، حکمران عرب، فرمانروائے عالم، شہنشاہِ کونین، عالمِ قدس سے عالمِ امکان میں تشریف فرمائے عزت و اجلال ہوا۔ اللھم صل علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم"[۶]

سرورِ کائنات کا مقصدِ رسالت

عام طور سے تسلیم کیا جاتا ہے اور اس کو باور نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری کوشش اور جد و جہد کا منشا فقط یہ تھا کہ "خدائے واحد ہی کا بول بالا ہو"[۷] اور ایک ایسی حکومت کا قیام عمل میں آئے جس میں ظلم معدوم ہو۔ ہر شخص اعتقاد کی کامل آزادی سے بہرہ ور ہو، دنیا سے بدامنی و فساد دور ہو تاکہ ہر شخص کو اپنی قابلیت کے مطابق خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں سے زیادہ سے زیادہ استفادے کا موقع ملے اور نیز محتاجوں کو ممکنہ حد تک حکومت کی جانب سے امداد دی جائے۔ پس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن اسی طرح پورا ہو سکتا تھا کہ تمام انسان ایک مذہبی و سیاسی معاشرے یعنی حکومت کے تحت لائے جائیں، جس کے بغیر امن، انتظام اور خودداری ممکن نہیں۔ آپ کے مشن کے خالص مذہبی اغراض سے یہاں ہمیں بحث نہیں ہے۔

یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ ابتدائی دورِ رسالت میں اہلِ مکہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مال و دولت کی، حسین عورتوں کے ساتھ عقد کی اور امارت و حکومت کی چاٹ دی تاکہ آپ نبوت کے دعویٰ سے باز آ جائیں مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ٹھکرا دیا اور کہا کہ اگر چاند سورج بھی مجھے توڑ کر لا دیے جائیں، تو میں تبلیغ حق سے باز نہیں آ سکتا۔[۸] اس واقعہ سے کم از کم اتنا ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ چالیس پچاس برس کی عمر تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کی کوئی خواہش نہ تھی، اس کے بعد بھی آپ میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی اور بقیہ چند سالہ زندگی گو سیاسی واقعات سے پُر ہے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آخر تک یہی فرماتے رہے کہ "میں مکارم اخلاق کے اتمام کے لیے بھیجا گیا ہوں اور بس"۔

حکمرانی کی تربیت

پیدایش سے چند ماہ قبل باپ کا سایہ سر سے اُٹھ جانا، بچپن قبیلہ بنی سعد کے پہاڑوں میں گزارنا، چند ہی سال کے اندر ماں اور دادا کا بھی دنیا سے کوچ کر جانا، ایک جنگ (حربِ فجار) میں بعض بزرگ رشتہ داروں کے تیر بردار کی حیثیت سے شامل ہونا، دو ایک تجارتی سفرِ شام کے اختیار کرنا، ایک معمر بیوہ سے شادی کرنے کے بعد غریب پروری اور نیکوکاری کرتے کرتے بلند تر جذبات کے اثر سے خلوت گزینی پر مائل رہنا ——— یہی وہ چند باتیں ہیں، جو اس دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ البتہ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ آپ کے دادا قبیلہ قریش کے سردار تھے۔ یہ قبیلہ مکہ معظمہ میں آباد تھا، جو قدیم سے ملک عرب کا مرکز تھا۔ آپ کے دادا کے انتقال پر سرداری دوسرے خاندان میں چلی گئی۔ آپ کے متعدد چچا بھی زندہ تھے، اس لیے آپ کو سرداری حاصل کرنے کا خیال نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی وجہ سے بظاہر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ سلطنت کے قیام کی تحریک اس زمانے میں دل میں پیدا ہو گئی تھی۔

حکومتیں کس طرح قایم ہوتی ہیں؟ قیام حکومت کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خاندانوں سے قبائل اور قبائل سے شاہی پھر شہنشاہی بنتی ہے۔ قبائلی دور تک ارتقاء طبعی ہوتی ہے اور بلا مخالفت،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت لیکن قبائل کے شیوخ کو کسی مرکز (بادشاہ) کی اطاعت پر جمع کر لینا آسان نہیں۔ شاہی سے شہنشاہی مملکت مختلف طور سے بن سکتی ہے اور جدید اضافۂ ملک یا تو ایسے ممالک کا ہوتا ہے، جس میں کوئی حکومت اور انتظام پہلے سے موجود ہوتے ہیں، یا محض خودسر قبائل کے مقبوضات ہوتے ہیں۔

خودسر قبائل کے ملک کا الحاق دو طور سے ہو سکتا ہے: یا تو بزور شمشیر یا بذریعہ تدبیر۔ یہ تو ظاہر ہے کہ موروثی طور سے کسی کو تاج شہر یاری حاصل ہو جائے تو اس کو محفوظ رکھنا اتنا مشکل نہیں، جتنا بزور بازو کوئی مملکت قایم کرنا۔ مملکت قایم کر کے اسے مستحکم اور پائیدار کرنا، حکومت عدل و انصاف سے کرنا اور نیک نام چھوڑ جانا۔ بہرحال ان کے برعکس امور سے بہتر ہیں اور مشکل تر بھی۔

محض حسن ظن سے نہیں بلکہ استقرا، و تفحص کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عرب میں کسی مملکت کا قیام ایک واقعی مشکل کام تھا۔ ملک میں کوئی حکومت نہ تھی۔ بے شبہ بعض خطوں پر چھوٹی چھوٹی شاہی حکومتیں حکمران تھیں اور وہ بھی اجنبی استعماریت کا شکار۔ (ان کو اپنے ماتحت بنانا، ان کی حامی و محافظ قوی استعماری شہنشاہیتوں سے مقابلے کرنے کے بغیر ناممکن تھا) ان حیرہ وغیرہ کی حکومتوں کے قطع نظر عرب میں عام طور سے صرف قبائلی حکومت تھی۔ جن میں آپس میں سخت رقابتیں اور موروثی جھگڑے صدیوں سے بیش از بیش ہی ہوتے چلے آرہے تھے۔ غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قبائل کی ان مرکز گریز قوتوں کو یکجا کرنا، ان میں معاشرتی اور اخلاقی کایا پلٹنے والی اصلاحات کو رائج کرنا، عرب کو غیر ملکی حمایتوں سے آزاد کرا کے ان کا الحاق کرنا، ایک حکومت کی جملہ ضروریات قانونی و انتظامی کو بالکل نئے سرے سے مہیا کرنا اور اندرون ملک کی یہودی اور نصرانی مخالفتوں سے دوچار ہونا تھا (یہودی مخالفتیں، مذہبی، معاشی، سیاسی ہر قسم کی رہیں اور بہت سخت جیسا کہ آیندہ بھی اشارۃً ذکر ہو گا) اس مہم کو سر کرنے اور مملکت عرب کو قایم کرنے کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو مضبوط اور گہری بنیاد پر مستحکم حالت میں چھوڑ جاتے ہیں۔ رہا آپ کا نیک نامی سے مملکت کو قایم کرنا اور نیک نامی سے حکومت کرنا اور اپنے بعد بھی نیک نام چھوڑ جانا، اس سلسلہ میں کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔

ان سب کے علاوہ قیام کے دو بڑے ذریعے یعنی زر اور زور (فوج) میں سے ایک بھی آپ کے پاس نہ تھا اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ حکومت کا قیام حکومت کرنے کی غرض سے نہیں چاہتے تھے۔ آپ کا پہلا اور آخری مقصد بُرے رسم و رواج کو مٹانا اور مذہب اسلام کی تبلیغ کرنا۔ غرض مقصد وحید اصلاح قوم تھا۔ اسی وجہ سے لوٹ مار، ظلم، طمع، لالچ، مکر و فریب، دغا وغیرہ (جن سے اپنے گرد جتھے جمع کیے جا سکتے ہیں اور دولت جمع کی جا سکتی ہے) آپ کے طریق عمل سے خارج تھے۔ آپ کو تبلیغ دین کر کے متبعین فراہم کرنے تھے اور اصولاً اور حسب معمول یہ متبع ابتداءً عموماً مفلسوں، غریبوں، مسکینوں وغیرہ ہی پر مشتمل تھے، جن سے معمولی امداد تو کجا، خود ان کی جانی و مالی حفاظت مشکل تھی۔ ان سب امور کے باعث قیام حکومت میں آپ کے لیے بے اندازہ اور بلا انتہا مشکلیں پیش آتی تھیں اور آئیں بھی۔ اس پر آپ کس طرح غالب آئے، آیندہ مذکور ہو گا۔

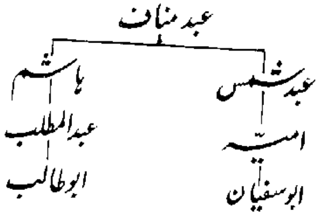
ابتدائے کار

چالیس سال کی پختہ عمر میں عرفان سے مالا مال ہو کر اور ربانی ہدایت کے ماتحت (ہونے کا دعویٰ فرماتے ہوئے آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اس سے سخت تر کام نہ کبھی ہوا اور نہ ہوگا۔ عربوں کی سی اجڈ اور پُر نفاق قوم کو خدائے واحد کی پرستش پر یکجا کرنا، مکارم اخلاق سکھانا اور تمام ساتھ دینے والے متبعین کو بھائی بھائی بنا دینا، یہ آپؐ کا مشن تھا۔ متلاشیان حق دوڑ پڑے کہ چشمۂ حیات کا پتا لگ گیا۔ غرض چند سال کی خفیہ اور پھر علانیہ کوشش اور تبلیغ سے دنیا کے چند اعلیٰ ترین دماغ مل گئے، جو آپؐ کی تعلیم کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ تن من دھن سے اس کی توسیع پر آمادہ ہو گئے۔ زبردست ہم خیالوں کا پیدا کرنا آئندہ ہونے والے کام کی مضبوط بنیاد تھی۔

جب اس کا چرچا پھیلا اور کچھ اہلِ مدینہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے تو آنحضرتؐ نے ان سے عہد لیا کہ "اگر آپؐ کو مدینہ آنا پڑے، تو یہ لوگ پوری امداد دیں گے اور حفاظت کریں گے"[10]

حریتِ خیال اور آزادی تبلیغ میں جب مزاحمت ہوئی، تو اس کی شدت کے باعث آنحضرتؐ ترکِ وطن پر مجبور ہوئے اور بظاہر یہ واقعہ حکومت کے قیام کی تحریک کا پہلا باعث ہوگا، یعنی دشمنوں کو شکست دے کر فاتحانہ وطن کو لوٹنا، ہر ایسے جبری تارکِ وطن کی فطری خواہش ہوتی ہے۔ بغرض جو بھی ہو، مکہ معظمہ چھوڑ کر مدینہ منورہ میں قیام اختیار کیا گیا، جہاں سیکڑوں ہی متبعین موجود تھے اور جن سے مدد کا معاہدہ پہلے ہی ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کو وطن چھوڑنے پر مجبور کرنا قریش کی جانب سے عملاً ایک اعلانِ جنگ تھا۔ اس پر مستزاد انھوں نے اسلام کو تباہ کرنا اپنا قومی مقصد بنا لیا، جیسا کہ بعد کے حالات سے ثابت ہوتا ہے۔

آپؐ کی مخالفت جو اہلِ مکہ کر رہے تھے، اس میں بنو امیہ کا خاندان پیش پیش تھا۔ اور یہ مخالفت پشتینی تھی، کیونکہ عبد مناف کی زندگی میں ان کے فرزند اکبر عبد شمس کا انتقال ہو گیا تھا، اس لیے فرزند اصغر اور ان کے بعد ان کی اولاد نے سرداری حاصل کی، لیکن عبد شمس کی اولاد کا دعویٰ باقی رہا اور ہاشم سے ان کا جھگڑا عبد مناف کی زندگی ہی میں شروع ہو گیا۔ آخر عبد المطلب اور ابو طالب کی وفات پر بنو امیہ نے مکمل اقتدار حاصل کر لیا۔ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت گویا دوبارہ بنو امیہ کے لیے بنو ہاشم کی اطاعت پر مجبور رہنا تھا۔ چونکہ بنو امیہ اب قریش کے سردار تھے، اس لیے ان کا مخالفت پر تُلنا گویا پورے اہلِ مکہ کا تُلنا تھا۔



آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ آتے ہی اس بات کی کوشش کی کہ اپنے تمام ساتھیوں میں اتحاد و اتفاق کی روح کو ترقی دیں۔ اس سے پہلے عربی قبائل میں باہم چشمک رہا کرتی تھی، خصوصاً اہلِ مکہ تو سب کو حقیر سمجھتے تھے، لیکن آنحضرتؐ نے یہ انتظام[11] فرمایا کہ تمام اہلِ مکہ کا، جو مدینہ منورہ ترکِ وطن کر کے آئے ہوئے تھے، مسلمانانِ مدینہ کے ساتھ بھائی چارہ (عقدِ مواخات) کرا دیا۔ یہ فقط برائے نام نہ تھا۔ یہ کارروائی اس جوش و خروش سے قبول کی گئی کہ اہلِ مدینہ نے اہلِ مکہ کو ہر چیز میں اپنا شریک بنا لیا۔ اپنی دولت کا آدھا حصہ انھیں دے دیا۔ ان میں سے کوئی مرتا تو اس کا ساتھی وارث بھی ٹھہرتا۔[12]

اس سے متعدد فائدے ہوئے۔ بے گھر و بے بس اہلِ مکہ چین سے بس گئے۔ قبائلی تعصب اور علیحدگیوں کا یک قلم

خاتمہ ہوگیا اور تمام مسلمانوں میں بلا امتیاز رنگ و زبان اخوت اور امداد باہمی کی حقیقی رُوح کام کرنے لگی

لیکن پھر بھی جو بے اطمینانی اور خوف و دہشت پھیلی ہوئی تھی، اس کا کسی قدر اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مسلمان مسلح سر بکف ہوتے تھے۔

غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تمام موجودہ قوتوں کو نہ صرف ایک مرکز کے تحت قایم کر لیا بلکہ ان میں اعلیٰ درجے کا ضبط (ڈسپلن) اور مل کر کام کرنے اور اُبھرنے کا غیر مختتم جوش بھی پیدا کر دیا۔ عرب یُوں بھی ایک جنگجو قوم تھی، اب ان کی قابلیتوں کو ابھار کر ان سے بہتر فائدہ اٹھایا جانے لگا۔

اس کے ساتھ ہی آس پاس کی اجنبی قوتوں سے (یہودی و دیگر عرب قبائل سے) معاہدے کرنے شروع کر دیے[۱۱]۔ ان معاہدوں کا مقصد یہ تھا کہ قریش کے منصوبوں کے خلاف حلیف پیدا کر کے قومی حفاظت کا مقصد حاصل کیا جائے۔ چنانچہ یہودیوں کے معاہدے کا متن یہ تھا:

"۱۔ خون بہا اور فدیہ کا جو طریقہ پہلے سے قایم چلا آتا ہے، اب بھی قایم رہے گا۔

۲۔ یہود کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی اور ان کے مذہبی امور سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔

۳۔ یہود اور مسلمان باہم دوستانہ برتاؤ رکھیں گے۔

۴۔ یہود یا مسلمان کو کسی سے لڑائی پیش آئے گی تو ایک فریق دوسرے کی مدد کرے گا۔

۵۔ کوئی فریق قریش کو امداد نہ دے گا۔ (شبلی نے امداد کی جگہ امان لکھا ہے۔)

۶۔ مدینہ پر کوئی حملہ ہوگا، تو دونوں فریق شریک یکدگر ہوں گے۔

۷۔ کسی دشمن سے اگر ایک فریق صُلح کرے گا، تو دُوسرا بھی شریکِ صلح ہوگا، لیکن مذہبی لڑائی اس سے مستثنیٰ ہوگی۔"

بنی ضمرہ کے معاہدے کے یہ الفاظ تھے،

"یہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تحریر ہے بنو ضمرہ کے لیے۔ ان لوگوں کا جان اور مال محفوظ رہے گا اور جو شخص ان پر حملہ کرے گا، اس کے مقابلے میں ان کی مدد کی جائے گی بجز اس صورت کے کہ یہ لوگ مذہب کے مقابلے میں لڑیں اور پیغمبر خداؐ ان کو مدد کے لیے بلائیں گے، تو یہ مدد کو آئیں گے۔"

اسی زمانے میں عید رمضان کے دن فطرہ یعنی غلہ خیرات کرنے کا حکم ہُوا جس پر آیندہ بحث ہوگی۔

ان انتظامات کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل مقصد و فرض یعنی تبلیغ اسلام کا کام بھی برابر جاری رہا اور روز بروز حلقہ بگوشوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ اہلِ مکہ کو کچھ تو اس بات کی جلن تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ہاتھ سے صحیح سلامت نکل گئے تھے اور اس سے زیادہ یہ خوف تھا کہ آپ کی روز افزوں طاقت کسی نہ کسی دن مکہ معظمہ پر حملے کا باعث ہوگی۔ اس لیے سردارانِ قریش مخالفت کا سامان کرنے لگے۔ ادھر سے بھی کوئی غفلت نہیں برتی گئی۔ تجسس اور خبر رسانی کا کافی انتظام کیا گیا۔ پتا چلا کہ مکہ والوں کا ایک تجارتی قافلہ شام جا رہا ہے، جس کے سردار طے کر چکے تھے کہ جملہ منافع "خلاف

مسلمانانِ مہم" کی سربراہی کے لیے مخصوص کر دیا جائے گا۔ وجہ کافی تھی۔ اس کو روکنے کی کوشش کی گئی مگر اسلامی دستہ دیر سے پہنچا۔ اس سے مکہ اور مدینہ کے سیاسی تعلقات کی فضا اور بھی مکدر ہو گئی۔ دو ایک چھوٹی مقامی جھڑپیں رہیں مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنگ کو برابر ٹالتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک موقع پر جب مسلمانوں کے ایک خبر رساں دستے نے لوٹ مار کی اور دو ایک آدمیوں کو مار ڈالا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہوئے[۱۱]

آخر جب شام سے قریش کا مذکورہ بالا تجارتی قافلہ واپس ہونے لگا (جس کا نفع مسلمانوں کے خلاف مہم کی تیاریوں میں صرف کیا جانے والا تھا) تو خطرے کے احساس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ سے چل پڑے اور چاہا کہ اسے روک لیں۔ قافلے کی مدد کو مکے سے کمک پہنچ گئی۔ قافلہ راستہ کترا کر نکل گیا، لیکن اس کی مدد کے لیے جو فوج آئی تھی، اس کی آنحضرتؐ کے ساتھیوں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ باوجود ایک اور تین کے تناسب کے اعلیٰ تر حربی انتظام اور فوجی ضبط کے باعث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شاندار فتح ہوئی[۱۲]۔ اہلِ مکہ شکست کا بدلہ لینے کے لیے بے چین ہو گئے۔ جلدی ہی وہ مدینہ منورہ چڑھ دوڑے۔ وہاں بھی خبر لگ گئی تھی اور گو اس مقابلے میں مسلمانوں کو شکست ہوئی[۱۳]، لیکن مکہ والے اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے اور ان کے لیے فتح و شکست برابر رہی۔

اس عرصے میں حلیف یہودیوں کی بدعہدی ناقابلِ برداشت ہو گئی اور ان کی اچھی طرح سرکوبی کی گئی[۱۴]، مگر اس کے بعد ایک خطرناک ترین دَور شروع ہوا۔ شکست خوردہ یہودیوں نے قریش کے ساتھ اتحاد کر لیا اور ایک انتہائی آخری کوشش مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لیے شروع ہوئی۔ اس واقعہ کو جنگِ احزاب یا جنگِ خندق کہتے ہیں۔ اس کی شدت کا خود قرآن شاہد ہے[۱۵]۔ مگر اب کی بھی برتر فوجی قوت اور سیاست دانی سے حریفوں کو محاصرہ اٹھا کر واپسی پر مجبور کر دیا گیا[۱۶] اور مدینہ منورہ سے غدار یہودی عنصر کو بھی اس کے بعد ہی خارج کر دیا گیا[۱۷]۔

مگر یہودیوں کا غرور اور ان کی قوت پوری طرح نہ ٹوٹی تھی اور وہ خیبر کی نوآبادی میں آمادۂ جنگ ہو رہے تھے۔ اس لیے ایک طرف تو ان کی قوت کا قطعی طور پر استیصال کر دیا گیا[۱۸] اور دوسری طرف صلح حدیبیہ میں قریش سے ایک معاہدۂ امن ہو گیا[۱۹]۔ لیکن چند روز میں اُدھر سے بدعہدی ہوئی تو ادھر سے ایک لشکرِ جرار نے جا کر مکہ معظمہ پر قبضہ کر لیا۔ ظالم مگر بے بس حریفوں کو عام معافی دے دی گئی اور یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا اثر تھا کہ فاتح لشکر نے (جسے کبھی دیس سے نکلنا اور انتہائی تکالیف و آلام برداشت کرنا پڑا تھا) اپنے سابقہ دشمنوں کے قصوروں کو یک لخت نسیاً منسیاً کر دیا[۲۰]۔ اس کی نظیر سے ہمارے علم میں تاریخ عالم تہی مایہ ہے۔[۲۱]

مکہ معظمہ کی فتح حکومت عرب کے بنیادی استحکام کا آخری مرحلہ تھا۔ اس کے بعد تھوڑے ہی عرصے میں طوعاً و کرہاً عربوں کی مرکزی حکومت کا فرمانبردار بننا پڑا۔ ہر طرف سے اطاعت کے وفود آنے لگے اور مرکزی حکومت کی جانب سے ہر جگہ ٹیکس یا مالگزاری (زکوٰۃ) وصول کرنے والے اور مذہبی و سیاسی فرائض انجام دینے والے افسر مقرر کیے جانے لگے[۲۲] اور آپؐ کے تدبّر و انتظام کا نتیجہ تھا کہ عرب جیسے ملک میں ہر طرف امن و امان کا دور دورہ ہو گیا۔

فتح مکہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اقتدار جزیرۂ عرب پر پوری طرح قایم ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے صلح حدیبیہ سے دوران میں اپنی عالمگیر تعلیم سے دنیا کو مستفید کرنے کے لیے آپ نے سفارتیں روانہ فرمائیں[۱۲]۔ اور بین الاقوامی (باصحیح تر اصطلاح بین الممالک) تعلقات کی بنا پڑی۔

اجنبی استعمار پر حملہ عربی سلطنت پر اب اجنبی استعمار کی نظریں پڑنے لگیں۔ یہ تصادم ناگزیر تھا۔ اس کی نمایاں صورت جنگِ تبوک و موتہ میں ظاہر ہوتی ہے، جس کے ذریعے عرب کی آیندہ سیاست معین ہو گئی اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے چند ہی دنوں بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت اور ایک زبردست مہم کشورکشائی کے لیے فلسطین روانہ ہونے ہی کو تھی[۱۳]۔

حقوق شہریت کا منشور اعظم حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطبے دیے، وہ تاریخ تمدن میں نہایت اہم درجہ رکھتے ہیں۔ ان میں تفصیل سے رعایا کے حقوق و فرائض کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ تفصیل سیرت شبلی، تاریخ ذہبی، ابن ہشام وغیرہ میں ملے گی۔ مختصراً تمام جاہلیت کے دستور پامال ہیں۔ سب انسان برابر ہیں، عرب کو عجم پر، عجم کو عرب پر کوئی فوقیت نہیں۔ فقط پرہیزگاری وجہ کرامت ہے۔ سب مسلمان بھائی بھائی ہو، غلاموں کو وہی کھلاؤ، جو خود کھاؤ، وہی پہناؤ جو خود پہنو۔ موروثی جاہلانہ انتقام باطل ہیں۔ جاہلیت کے سود لغو ہیں۔ عورتوں سے برتاؤ میں خدا سے ڈرو۔ تمہارا ان (عورتوں) پر اور ان کا تم پر حق ہے۔ ہر شخص کا جان و مال و آبرو محفوظ ہے۔ ضابطۂ قرآنی کو ملحوظ رکھ کر گمراہ نہ ہو گے۔ حقوق ترکہ و میراث متعین ہو گئے۔ وارث کے لیے (مزید) وصیت نہیں۔ بچہ بستر والے کا ہے، زانی کے لیے پتھر ہیں، جو بچہ اپنے ماں باپ کے سوا غیر اور جو غلام اپنے مالک کے سوا دوسرے کا ہونے کا دعویٰ کرے، اس پر خدا کی لعنت ہے۔ عورت اپنے "شوہر کے مال" سے اس کی اجازت کے بغیر کسی کو کچھ نہ دے۔ قرض ادا کیا جائے۔ عاریت واپس کی جائے۔ عطیے کا بدلہ دیا جائے۔ ضامن تاوان کا ذمہ دار ہے۔ باہم خونریزی نہ کرو۔ ہر شخص اپنے فعل کا ذمہ دار ہے۔ بیٹا باپ کا، باپ بیٹے کا جوابدہ نہیں، اپنے امیر کی اطاعت کرو، چاہے وہ نکٹا حبشی ہی کیوں نہ ہو۔ خدا کی عبادت کرو، پانچ وقت نماز پڑھو، مہینا بھر کے روزے رکھو، میرے احکام کی اطاعت کرو۔ جنت میں جاؤ گے۔

اسی زمانے میں قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی: "آج تمہارا دین مکمل ہو گیا"۔

حکومت کے ارادے حکومت اگر باقی نہ رہ سکے، تو اس کے حصول سے کیا فائدہ۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت کس طرح اوامر الٰہیہ کے تحت عدالت و صداقت کے ذریعے قایم فرمائی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حکومت کی استواری و پائیداری کے متعلق کیا ارادے قایم کیے گئے۔ اس بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم پر ایک نظر ڈالنی چاہیے۔

استقرار سے پتا چلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم "دنیا و آخرت" دونوں کی بھلائی پر مشتمل ہے اور اس کے ذرائع (۱) علم (۲) جسم (۳) اخلاق قرار دیے گئے ہیں۔ علم سے مراد اپنے حقوق و فرائض کا علم ہے، یعنی ہر چیز تو (فقط میری نہیں) ہماری ہے لیکن ہم (اور ہیں بھی) خدا کے۔

چنانچہ اسلام کے ارکان (ایمان کے بعد) پانچ ہیں: نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، جہاد۔ ان میں آخر الذکر فرض کفایہ ہے

یعنی اگر کافی تعداد اس میں حصہ لے، تو باقی سے ساقط ہو جاتا ہے۔ باقی چار فرض عین ہیں۔ ان پر غور کرنے سے اس دعوے کی تصدیق ہو سکتی ہے کہ دین و دنیا کی بھلائی ان سے حاصل ہو سکتی ہے۔ واضح رہے کہ یہ عمومی فرائض ہر مسلمان پر واجب ہیں۔ ان کے علاوہ جو خصوصی فرائض حاکم وقت کے ہیں، وُہ علیحدہ بیان ہوں گے۔

چونکہ ایک حکومت کے لیے افراد رعایا کے غالب حصے کا متحد ہونا ضروری ہے، اس لیے اس اتحاد کی رُوح کو ابھارنے کا لحاظ ہر حکم میں شامل رہا اور مذہبی احکام میں بھی اسی چیز کی آبیاری کی گئی۔ چنانچہ عمومی فرائض سے (سوائے بچوں اور دیوانوں کے جو مرفوع القلم طبقہ ہے) کوئی مستثنیٰ نہیں۔ راعی، بادشاہ اور ادنیٰ مزدور سب کو ایک ہی قسم کے فرض کی ادائیگی کا حکم دیا گیا۔ ہر روز پانچ مرتبہ محلے والوں کو، ہر ہفتے شہر والوں کو اور ہر سال دُو مرتبہ شہر و مضافات کے باشندوں کو جمع ہونے کا حکم دیا گیا۔ ایک حربیاتی نے غالباً صحیح لکھا ہے کہ اسلامی نماز ایک طرح کی فوجی پریڈ اور عسکری تربیت ہے۔ صف بندی قائد (امام) کے احکام پر متفقہ حرکت' وقت کی پابندی، صفائی و طہارت، صبح تڑکے اُٹھنے کی عادت یہ سب نماز کے جز ہیں۔ ایک حدیث میں (غالباً ابوداؤد میں) ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جہاد کو نکلتے تو بلندی پر چڑھتے وقت اللہ اکبر کہتے، نشیب آتا تو سبحان اللہ فرماتے۔ اسی پر نماز کے قیام وقعود اور رکوع و سجود کے اوراد مقرر کیے گئے۔" نماز ایک ورزش اور کسرت بھی ہے، کیوں نہ ہو عماد الدین یعنی دین کا ستون ہے۔

جنگی ضروریات میں سفر کی عادت بہت ضروری ہے۔ حج اسی کا موقع بہم پہنچاتا ہے اس میں ہر سال مکہ معظّمہ میں تمام دنیا کے مسلمان جمع ہوتے ہیں۔ یہ عالمگیر اخوت اور انسانی برادری (یا دُوسرے الفاظ میں تمام رعایا کی یگانگی) کی یاد تازہ کرنے کا بھی بہترین وسیلہ ہے۔ جملہ صوبہ جاتِ مملکت اور اقطاعِ عالم کے مسلمانوں کی ایک سالانہ موتمر بھی ہے۔ خلیفۂ اسلام کا ایک دربار عام بھی ہے' جس میں ہر حصّے کی بہترین نمایندگی کی گئی ہے۔ زکوٰۃ کو لیجیے۔ حکومت بغیر مالیے کے عضو معطل ہے۔ زکوٰۃ اور عُشر زراعت حکومتِ اسلامیہ ہی نہیں' ہر حکومت کے لیے لابدی اور ضروری ہیں۔ مگر تاریخ میں پہلی مرتبہ حکومت کی آمدنی کو بادشاہ کے صرف خاص کی جگہ ملکیت عامہ (Public Property) قرار دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کا مصرف یوں معین کیا گیا کہ صدقات (یعنی زکوٰۃ، عشر، خمس، غنیمت وغیرہ) فقراء و مساکین کی امداد، عہدہ دارانِ متعلقہ کی تنخواہ، غلاموں کو آزاد کرانے، قرضداروں کو قرض سے نجات دلانے اور فی سبیل اللہ یعنی فوجی تیاری، رفاہِ عام، سڑکوں، پلوں کی تعمیر وغیرہ میں اور راہگزاروں کی امداد میں صرف ہوں[۱]۔ انفرادیت واجتماعیت کا بین بین محنت اور سرمائے اور زمین کی اصلاح، سرمایہ داروں اور مزدوروں کے حقوق کا بہترین محافظ، ملک سے افلاس کو دُور کرنے اور معاشی حالت کو سدھارنے کا علاج اگر کوئی اسلامی ادارہ کرتا ہے، تو یہی ادارۂ زکوٰۃ و صدقات ہے۔ اور برنارڈ شا کے الفاظ میں اس سے بہتر کوئی امر ممکن نہیں[۲]۔

جہاں دنیاوی کاروبار کی تکمیل کے بہت سے ادارے قایم کیے گئے اور رہبانیت کو مردود ٹھہرایا گیا، وہیں متعدد احادیث و آیات کے ذریعہ خیرات کی انتہائی تاکید کر کے روحانی و مادی جذبات میں توازن قایم کیا گیا اور "فی الدنیا حسنۃ و فی الاٰخرۃ حسنۃ" "دین و دنیا کی بھلائی" عام طور پر ہر فرد کا مطمح نظر قرار دیا گیا اور اسی سلسلے میں ہر سال مہینا بھر روزے رکھنے کا حکم دیا گیا، جس میں خود ضبطی، ایثار، امیروں اور مفلسوں میں یکسانیت غرض بہت سے مصالح پوشیدہ ہیں اور یہ سب امورِ شہریت کی تربیت کے لیے واجب قرار دیے گئے۔

فرائض و مقاصد حکومت کی انجام دہی

جدید اصول قانون میں حکومت کے اعلیٰ ترین فرائض صرف دو قرار دیے ہیں: جنگ اور عدل گستری۔ یہ دونوں دراصل حفاظتِ حقوق ہی کے دو ذریعے ہیں۔ جنگ غیر عدالتی ذریعہ ہے اور عدل گستری عدالتی۔ جنگ کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوجی خدمات ہر مسلمان پر اسی طرح لازم کر دیے جس طرح اب بھی CONSCRIPTION کے نام سے اکثر یورپی ممالک میں ہے جسے معمول طبیعت میں راسخ کر دینے کے لیے اسے بھی مذہبی رنگ دے دیا گیا، ورنہ جنگی تیاریوں کے لیے قوم کو عام رغبت دلانا کوئی آزاد و مختار قوم بے جا نہیں ٹھہرا سکتی۔ الفاروق میں شبلی صاحب لکھتے ہیں کہ اسلام سے قبل عام جبری فوجی خدمت کا طریقہ نہ تھا۔ اس کی ابتداء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہوئی۔ اس کا مزید تذکرہ آگے آتے گا۔ یہ یاد رہے کہ تبدیل مذہب کے لیے جنگ یا جبر کرنا اسلام میں جائز نہیں، لیکن حکومت الٰہیہ (سلطنت اسلامیہ) کے قیام کو مذہب سے (اس کے محدود معنوں میں) کوئی تعلق نہیں۔

حکومت کا دُوسرا بڑا فریضہ عدل گستری ہے تاکہ "امن" انتظام اور تمدن کا دَور دورہ ہو اور خوشحالی اور زرفہ کا زمانہ آئے۔ عدل گستری کے معنی یہ ہیں کہ "جماعت، قوم اور اس کے افراد کے صحیح حقوق کی نگہداشت"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عدالت کا جو مستحکم اور ترقی یافتہ ادارہ قایم کیا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ امیر و غریب سب کا قانون ایک رکھا گیا، جس کے اصول غیر متبدل تھے۔ قاضیِ وقت کے روبرو خود بادشاہِ اسلام پر مقدمہ دائر ہو سکتا تھا۔ تاریخ یہ واقعہ محفوظ رکھتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آخری عمر میں مجمع عام میں اعلان فرمایا کہ جس کسی کا آپؐ پر حق ہو، وُہ طلب کرے اور جس کسی کو آپؐ سے تکلیف پہنچی ہو، وُہ انتقام لے۔ صرف ایک شخص نے چند درہم کا مطالبہ کیا جس کی آپؐ نے فوری ادائی فرمائی۔ شاید حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کا اپنے دورِ خلافت میں قاضی کی عدالت میں حاضر ہو کر جواب دہی کرنا، یہاں ایک تذکرہ بے محل ہو گا، یہاں صرف اسلامی عدلیہ کے خدوخال بیان کرنے ہیں کہ وہ عاملہ یا تنفیذیت سے مکمل اور قطعاً آزاد تھا۔ یہاں تک کہ قاضی کا فیصلہ نافذ ہونے سے بادشاہِ اسلام بھی نہیں روک سکتا تاوقتیکہ قاضی کا فیصلہ شرع و قانون کے صریح خلاف نہ ہو۔ قرآن مجید میں ہے کہ:

"خدا تم کو عدل کرنے کا حکم دیتا ہے"

نیز "اور جب تم لوگوں میں فصل مقدمات کرو، تو عدل سے فیصلہ کرو"

ایسی احادیث بے شمار ہیں، جن میں عدل و انصاف کی تاکید اور ظلم و ستم پر دھمکی وارد ہے۔ غرض اسلام میں امیر و غریب، آقا و غلام، مسلم و غیر مسلم سب عدالتی نقطۂ نظر سے برابر کے حقوق اور وجوہات رکھتے ہیں۔

جس حکومت میں حقوق کی حفاظت اور انصاف ہو اور وہاں کی رعایا کے کلیات خمسہ[۲۲] (یعنی دین، عقل، نفس، نسب، مال) کی آزادانہ اور مکمل نگہداشت ہو، تو ان کی وفاداری اور امداد میں کیا شبہ رہتا ہے؛ عدلیہ کے لازمی جز دو "شرع اور تشریع" (قانون و قانون سازی) ہیں۔ اسلامی قانون "شخصی قانون" ہے، یعنی مسلمان جہاں بھی ہو اسی کا پابند ہے۔ سامنڈ "اصول قانون" میں لکھتا ہے کہ:

"مقامی قانون روز بروز بے وقعت بنتا اور کم ہوتا جا رہا ہے اور شخصی قانون بڑھتا جاتا ہے"

قانون کے استحکام اور تبدل پذیری کے متعلق ابھی تک بڑی بحث ہے۔ سائمنڈ کی رائے یہ ہے کہ قانون کا کچھ اصولی حصہ غیر تبدل پذیر ہونا چاہیے جس سے ذیلی قواعد حسب ضرورت بنائے اور بدلے جا سکیں تاکہ قانون ضروریات زمانہ کا ساتھ دے کر تمدن کی ترقی میں معاون ہو نہ کہ خارج۔ اسلامی قانون آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی قسم کا قانون مقرر فرمایا۔ قرآن مجید میں غیر تبدل اصولی احکام ہیں احادیث میں قطعی اور متواتر بہت ہی کم ہیں۔ اس لیے کتاب و سنت سے مسائل قیاس و اجتہاد کی پوری اجازت دی گئی۔ مگر واضح رہے کہ متعدد قوانین و ضوابط کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانے میں تدوین ہو چکی تھی، چنانچہ تعزیرات، ٹارٹ (سرجے اور دیتیں) تحریری صورت پا چکی تھیں[۱]۔ انھیں چیزوں کو بعد میں ترقی دی گئی اور اس میں استنباطی ترقی کی پوری اجازت دی گئی۔ اسلامی ضابطۂ قانون و تشریع کی ابتداء اُس مشہور حدیث سے ہوتی ہے، جس میں معاذ ابن جبلؓ کو یمن کا عامل (گورنر) بنا کر بھیجتے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ وُہ بطور قاضی کس طرح فیصلے صادر کریں گے، تو انہوں نے کہا کہ قرآن کے مطابق اور اگر اس میں نہ ہو، تو سنتِ نبویؐ کے موافق اور اس میں بھی پتا نہ چلے تو "اجتہد برائی" یعنی میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو صحیح قرار دیا اور ان کی تعریف کی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ آپؐ کی اُمت میں ایسے صائب دماغ پیدا ہوتے ہیں (ترمذی)۔ ظاہر ہے کہ مختلف حکام عدالت کا اجتہاد مختلف ہوگا اور ایک مسئلے سے متعلق متضاد احکام بھی ہو سکیں گے اور غالباً اسی وجہ سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

اختلافُ اُمتی رحمۃٌ (یعنی) میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔

اور الدین یسرٌ۔ دین آسان چیز ہے۔ غرض یہ کہ اسلامی قانون میں ہر ملک اور ہر زمانے میں کار آمد ہونے کی صلاحیت ہے اور مسلمانوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شریعت کے ہر زمانے کا ساتھ دے سکنے کے متعلق یہ صریح خوشخبری بھی دی ہے کہ ہر سو برس کے بعد ایک مجدد پیدا ہوگا، جو اس امت کے دین کی تجدید کرے گا[۲] اور واقعۃً ایسا ہوتا رہا ہے۔

مزید برآں قانون کا تبدل پذیر ہونا گو نظریے کی حد تک اچھا ہو، لیکن یہ ایک عجیب حقیقت ہے کہ عملاً قانون اسلامی کے اصول میں کسی ترمیم یا اصلاح کی ضرورت ہی اب تک نہیں پائی گئی بلکہ دنیا اسی کی طرف کھنچی چلی آ رہی ہے[۳]، اور مسئلہ توریث، ازدواج و طلاق اور ترک مسکرات میں خاص کر یورپ و امریکہ کا میلان طبع قابل ذکر ہے۔

قانون اور انصاف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بڑی ترقی دی تھی اور یہ امر کہ جواب دہ صرف خاطی اور مجرم ہی ہو، سب سے پہلے توریت میں اس کا حکم ہوا[۴]۔ قدیم زمانے میں ملزم کے اہل خاندان بلکہ اہل قوم بھی جواب دہ ہوتے تھے۔ اسلام نے ایک اور زبردست نظریۂ قانون میں پیدا کر کے کروڑوں بے گناہوں کو محفوظ کر دیا اور وُہ نیت کا مسئلہ تھا۔ حدیث کی کتابوں میں سب سے مشہور حدیث یہی مروی ہوتی ہے کہ:

"اِنّما الاعمال بالنیات" - یعنی کام نیت کے مطابق ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وقف، توریث، طلاق وغیرہ متعدد ئی چیزوں کو قانونی حیثیت عطا فرمائی اور "جائداد" یا "دولت" کے متعلق ایسا انتظام فرمایا کہ دولت کی تقسیم میں توازن ہو۔ کے لا یکون دولۃً بین الاغنیاء منکم (تاکہ مالداروں



غارِ حرا، جہاں پہلی وحی نازل ہوئی

ہی میں نہ بھیر نا رہے) زکوٰۃ، مالگذاری، توریث، تحدید وصیت اس کے خاص اجزا ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فصل مقدمات کا نہ صرف مستقل اور باقاعدہ انتظام فرمایا تھا اور نہ صرف قاضیوں کے تقرر اور ان کے لیے شہادت و قضا کے دستور العمل مرتب کیے گئے تھے، بلکہ ساتھ ہی افتاء (یعنی پبلک کو قانونی احکام دریافت کرنے پر مستند معلومات بہم پہنچانا) اور اصلاح بین الناس (یعنی بیرونِ عدالت جھگڑے رفع کرنے) کے انتظامات شروع فرمائے تھے۔ (سیرۃ النبی۔ شبلی)

عدالتوں کے ساتھ سزا دہندہ عملہ (جلّاد وغیرہ) اور پولیس اور احتساب یعنی تجارتی وغیر تجارتی ہر قسم کے کاروبار کی نگرانی اور انسپکشن کی طرح بھی پڑ چکی تھی۔ (ایضاً) اسی سلسلے میں قانون شہریت اور رعایا کے باہمی برتاؤ پر روشنی ڈالنی چاہیے، جو حکومت کے استحکام میں بہت اہم حصہ رکھتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رعایا میں مسلمان اور ذمی (امان دادہ غیر مسلم) دو حصے قرار دیے۔ حفاظت حقوق کی حد تک سب برابر تھے۔ البتہ مسلمانوں پر جنگی خدمات فرض تھیں اور ذمیوں کو اس سے نیز دیگر بہت سے مسائل سے مستثنیٰ کیا گیا۔ صرف ان سے ایک حفاظتی ٹیکس لیا جاتا تھا، اسے جزیہ کہتے تھے۔ مسلمان رعایا کو اپنی قومیت کی فلاح وبقا کے لیے یہ تعلیم دی گئی کہ "غیروں پر سخت اور باہم رفیق القلب" نیز "مومنوں پر نرم اور غیروں پر سخت"۔ سیاسیات کے اس عام اصول پر مزید بحث ضروری ہے۔ اسلام چونکہ محض خدا کا بول بالا کرنے کے لیے آیا تھا، اس لیے اکثر فقہاء کا یہ خیال ہے کہ صرف خدا کے قائل یعنی اہلِ کتاب کو اسلامی عملداری میں جزیہ دے کر رہنے کی اجازت ہے (مثلاً یہود، نصاریٰ، مجوس) بت پرستوں کو اجازت سکونت نہیں۔ مگر اس پر عملدرآمد عرب کے باہر کبھی نہیں رہا۔ یہاں تک کہ ہندوؤں تک کو مشابہ اہلِ کتاب قرار دے لیا گیا۔

رعایا کے فرائض "امداد، وفاداری و اطاعت حکومت ہیں" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت احتیاط سے نہ صرف اس کے احکام اور ترغیبات دیے بلکہ مسلمانوں کا ماحول ہی ایسا پیدا کر دیا کہ جس میں خود بخود ان فرائض کی تعمیل پر ابھارنے والے جذبات کی آبیاری ہوتی ہے[۱] مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ، جو ارکانِ مذہب ہیں۔ اس سے عملاً خود بخود امداد، وفاداری اور اطاعت کی تربیت ہوتی ہے۔ نیز ایک جگہ قرآن میں ہے: "اور نزاع نہ کرو ورنہ فشل پیدا ہو جائے گا اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی"[۲] اس کی فوجی اور ملکی یعنی سول، ضبط یا "ڈسپلن" میں جیسی اہمیت ہے ظاہر ہے، ان کے علاوہ تمدنی فرائض بھی ہیں مثلاً حلال و حرام غذائیں، درست وغلط معاملات وغیرہ۔ ان کی تفصیل یہاں بے محل ہے، صرف اتنا تذکرہ کیا جاتا ہے کہ ان کی سائنٹیفک تقسیم کی گئی ہے یعنی حلال وحرام، مکروہ و مستحب اور مباح اور یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ انسان ملکی قانون سے زیادہ مذہبی اور ضمیری قانون کی تعمیل کرتا ہے۔ اس لیے فرائض شہریت کو مذہبی رنگ دے کر ذہنیت میں رچا دیا گیا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اس کی تعمیل حسبِ دلخواہ ہوئی؛ ورنہ امریکہ کا صرف "قانوناً" شراب حرام کر دینا عملاً بے اثر ثابت ہوا ہے۔ اسلام میں جس طرح شراب بند کی گئی، اس نظریے سے امریکہ اور دنیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہی حال ہر قسم کی اصلاحات کا ہے، جس میں تدریج اور ذہنی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔

حکومت کے لیے دستور لازمی چیز ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک "منتخبہ ذمہ دار ملوکیت" "ELECTED

ہے کیونکہ موروثی کی جگہ منتخب ہونے سے بہترین نظریہ ہے۔ جو ایک بالکل نیا لیکن مسلّمہ طور سے بہترین نظریہ ہے کیونکہ موروثی کی جگہ منتخب ہونے سے
"RESPONSIBLE MONORCHY" قایم فرمائی، جو ایک بالکل نیا لیکن مسلّمہ طور سے بہترین نظریہ ہے
بہترین صلاحیت و قابلیت کا فرد حاکمِ اعلیٰ بنے گا۔ اسی طرح ہر فرد رعایا کے روبرو بالراست ہو یا بالواسطہ جوابدہ ہونے کے فوائد ظاہر ہیں۔
ملوکیت بالاتفاق اس طرزِ حکومت پر بہ لحاظ افادہ مرجح ہے جو ایک جماعت پر مشتمل ہو، مگر شرط یہ ہے کہ فردِ مستبد بھی خواہ و بے غرض ہو۔
ذمہ دار شاہی جو مشورہ لینے کی پابند ہو، وُہ پروفیسر لاسکی کے الفاظ میں اس مقصد کو بہترین طور سے پورا کرتی ہے[۱۲] آنحضرت صلی اللہ علیہ
وسلم چونکہ عالمگیر حکومت قایم کرنی چاہتے تھے، اس لیے ایک زبان بولنے یا ایک ملک میں رہنے یا ایک قوم سے ہونے کو عنتبی حصے میں
ڈال دیا اور ہر رنگ اور ہر ملک کے مسلمانوں میں ایک ایسا رشتہ قایم کیا، جو خاندانی یا نسلی یا لسانی یا ملکی رشتوں سے کہیں مستحکم اور دیرپا تھا
اور بتایا گیا کہ یہی حبل اللہ ہے، اسی کو تھامے رہنے میں مسلمانوں کی فلاح و بقا ہے۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سوائے "شرعی" قانون اور خارجہ سیاست کے، جو مرکزی حکومت سے متعلق تھے اور امور میں
بڑی حد تک صوبہ داری خودمختاری رکھی اور عامل یعنی گورنر کی ذات (جو بعد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں فرائض کی
کثرت کے باعث عامل، قاضی، تحصیلدار مال تین افراد میں منقسم ہو گئی) صوبے میں بالکل خودمختار تھی۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نیابت اور منصری کا طریقہ بھی ڈال دیا تھا۔ جب کبھی آپؐ مستقر سے باہر جاتے، کسی کو
اپنا نائب بنا کر چھوڑ جاتے[۱۴] تاکہ کاروبار عادی میں ابتری نہ پیدا ہو۔ مختلف انتظامی ادارے مثلاً خفیہ پولیس کا انتظام بھی قایم
ہو گیا تھا۔ چنانچہ فتح مکہ سے قبل حضرت عباسؓ مکہ معظمہ میں خفیہ پرچہ نویس مقرر تھے[۱۵] دیگر اداروں کی بھی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ چنانچہ اسی
سلسلے میں اوپر متعدد صیغوں کا تذکرہ ہو چکا ہے، جن میں سے عدالت، احتساب، پولیس، افتاء وغیرہ پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ ان کے
سوا تبلیغ، تعلیم، سول و ملٹری سروس اور قوانین منضبط متعلقہ معاملات وغیرہ، فوج، صیغہ خارجہ (دارالانشاء وغیرہ) اور صیغہ داخلہ
(مہمانداری، عدالت، احتساب وغیرہ) اور صیغہ مالیہ کا مختصر تذکرہ کیا جائے گا۔

تبلیغ و تعلیم اسلام کے سب سے مقدم ادارے رہے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی مذہبی اور عام تعلیم کے لیے خاص
ذرائع اختیار فرمائے۔ چنانچہ علاوہ ترغیب و تشویق کے خود معلم جا بجا بھجوائے۔ تعلیم یافتہ جنگی قیدیوں کا فدیہ یہ مقرر کیا
کہ مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں۔ (تشویق کے سلسلے میں اطلبوا العلم ولوکان بالصین، طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم
ومسلمۃ، والذین اوتوا العلم درجات، فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین وغیرہ قابلِ ذکر ہیں)
غیر مسلموں میں تبلیغ کے وسیع انتظامات مستقل طور سے قایم فرمائے۔ چنانچہ سرکاری آمدنی کی ایک اہم مد اسی کے لیے
مختص تھی۔ وقت بے وقت جو غیر معمولی آمدنی ہوتی تھی، اس سے بھی تالیفِ قلبی کی جاتی تھی۔ بے شبہ جبری اسلام پر
کبھی کسی کو مجبور نہیں کیا گیا اور نہ قرآن اس کی اجازت دیتا ہے۔ البتہ مسلمانوں کا فریضہ قرار دیا گیا کہ ہر شخص تبلیغِ دین کرے اور
اعلائے کلمۃ اللہ میں حصہ لینے کی سعادت حاصل کرے۔ اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف عرب کے مختلف حصوں
اور مصر و شام وغیرہ بلکہ کہتے ہیں کہ دُور دراز ممالک مثلاً چین وغیرہ تک بھی تبلیغ کے لیے خاص خاص صحابہ کو روانہ فرمایا۔
مساجد مسلمانوں کی بزم گاہیں ہیں اور ان کی ہر قسم کی دینی و دنیوی سرگرمیوں کا مرکز اور حجز وغیر منفک۔ ان کی تعمیر و ترمیم،

ائمہ و مؤذنین کے تقرر وغیرہ کی طرف بھی خاص توجہ فرمائی اور خاص احکام دیے۔

سول سروس ان سب کے ساتھ سول سروس کا ادارہ بھی قایم ہوگیا۔ جہاں گورنروں، قاضیوں، اماموں، مبلغوں، معلموں وغیرہ کی تعلیم و تربیت ہوتی تھی اور ان کا امتحان لیا جاتا تھا۔ جن لوگوں کا کسی عہدے پر تقرر ہوتا تھا، انھیں زبانی اور تحریری دستور العمل اور ہدایات دیے جاتے تھے۔ عہدیداران مال کو ہر قسم کے مداخل (زکوٰۃ، عشر، خراج، جزیہ وغیرہ) کی شرحیں تحریری طور پر لکھ کر دی جاتی تھیں۔ مخارج کا بھی ایک باقاعدہ دفتر تھا۔ چنانچہ ایک رجسٹر میں سرکاری وظیفہ یا تنخواہ پانے والوں کے نام تحریر تھے۔ مجرد و متاہل کی شرح میں ایک و دو کا تناسب تھا۔ بندوبست و مالگزاری کی طرح پڑ چکی تھی اور جاگیرات نوآبادی بسانے کے لیے ملنے لگے تھے۔ اس میں اصول یہ تھا کہ چشمے وغیرہ مفاد عامہ کی چیزیں شخصی ملک نہ ہو جائیں (شبلی صفحہ ۲)۔ قاضیوں کو خاص کر فوجداری (تعزیری)، اور دیوانی ضابطے مہیا کیے جاتے تھے اور ٹارٹ (ہرجے اور دیت) کے متعلق معلومات بہم پہنچائے جاتے تھے۔ جن امور میں متضرر قصاص معاف کر دے، وہاں متضرر کو کیا معاوضہ دلایا جائے، معاملات و معاہدات (خرید و فروخت، سود وغیرہ) اور سماجی تعلقات (مثلاً نکاح، طلاق وغیرہ) کے متعلق بھی آپ نے اصولی طور سے قوانین (قواعد مرتب فرما دیے تھے جن کی ضروری تفصیل و تشریح (ترمیم بھی وقت بوقت ہوتی گئی۔ ان تمام کی تدوین مسلمانوں نے بعد میں مکمل کی۔

فوج حکومت کی بقا اور ترقی کے لیے فوج ناگزیر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عام فوجی تعلیم اور مستعدی اور تیاری باشی کے زبردست احکام دیے۔ وقت بوقت تیراندازی، گھوڑ دوڑ، نیزہ بازی وغیرہ میں حصہ لے کر شوق بڑھایا۔

سپہ سالاروں کو بھی آگاہ کیا جاتا تھا کہ غیر جانب داری، جنگ اور اس سے پہلے اور اس کے بعد کیا امور ملحوظ رہیں مثلاً آداب سفر و قیام، مختلف طبقوں کی مختلف پلٹنیں، صف آرائی، دشمن کو پہلے اطاعت کی دعوت دینا، غیر جنگی عنصر کو قتل نہ کرنا، نہ زراعت و عمارات وغیرہ کو تباہ کرنا، تقسیم غنائم، تبادلۂ قیدیاں، قیدیوں سے سلوک، زخمیوں کے لیے دواخانے اور مقتولین سے برتاؤ وغیرہ وغیرہ۔

دار الانشا میں فرامین و توقیعات، معاہدے، مراسلتیں، احکام وغیرہ لکھائے جاتے تھے اور قرآن مجید مدوّن کرایا جاتا تھا (قرآن موجودہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پوری طرح مدوّن ہو چکا تھا۔ تاریخ القرآن۔ پروفیسر مفتی عبد اللطیف جامعہ عثمانیہ)

صیغہ داخلہ مہمانداری، مریضوں کی عیادت پر توجہ کی جاتی تھی۔ عدالت و قانون و خفیہ پولیس کا اوپر تذکرہ آ چکا ہے۔
یہ ہے حکومت اسلامیہ کے قیام اور اس کی تنظیم و تشکیل کا خلاصہ۔

حوالے

له شبلی۔ سیرۃ النبیؐ جلد اوّل   MUHAMMAD   NOLDKE DAS LEBAN   سدیو کی
دفریج تاریخ عرب باب ۸۔

۲ له ابن ہشام، صبح الاعشیٰ قلقشندی

۳ له عرب اور ایران کی مشہور جنگ، جو عین زمانہ ولادت نبوی میں "ذی قار" نامی چشمے کے کنارے ہوئی اور جس میں عرب کامیاب رہے۔ دیکھئے سدیو SEDILLOT کی کتاب YLISTORIC GENERALE DES ARABES, LEW EMPIRE, LEW CIVILISATION اور ایام عرب مولفہ شرر وغیرہ

۴ له شبلی وغیرہ

۵ له عرب قبل اسلام، شام، ہند، چین وغیرہ سے تجارت کرتے تھے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھئے تمدن عرب مترجمہ سید علی بلگرامی اور مضمون حکیم شمس اللہ قادری "تجارت العرب قبل الاسلام"، رسالہ دبدبۂ آصفی بابت رجب و شعبان ۱۳۲۳ھ

۶ له قرآن مجید: لتكون كلمة الله هي العليا

۷ له ابن ہشام

۸ له حدیث: بعثت لاتمم مكارم الاخلاق

۹ له قرآن مجید: اذ كنتم اعداء فالف بين قلوبكم فاصبحتم بنعمته اخوانا۔

۱۰ له ابن ہشام

۱۱ له تفسیر بیان القرآن از محمد علی آیت: والوا الارحام بعضهم اولى ببعض۔

۱۲ له شبلی صفحہ ا ۱ھ میں یہودیوں اور ۲ھ میں بنی ضمرہ و بنی مدلج وغیرہ سے معاہدے ہوئے۔

۱۳ له ابن ہشام

۱۴ له قرآن مجید: اذ جاؤكم من فوقكم ومن اسفل منكم واذ زاغت الابصار وبلغت الحناجر وتظنون بالله الظنونا هنالك ابتلى المومنون وزلزلوا زلزالا شديدا۔

۱۵ له اشارہ ہے بت شکنی کی مہموں اور جنگ حنین وغیرہ کی طرف۔ تفصیل ہر سیرت کی کتاب میں ملے گی۔

۱۶ له فوائد مدبریہ از "قاضی الملک بدرالدولہ" شبلی وغیرہ

۱۷ له قرآن مجید: انما الصدقات للفقراء والمساكين والعاملين عليها والمؤلفة قلوبهم وفي الرقاب والغارمين وفي سبيل الله وابن السبيل۔

۱۸ له مضمون انگلستان کا مذہب آیندہ صدی میں حسب بیان برنارڈ شا بحوالہ رسالہ اشاعت الاسلام۔ لاہور

۱۹ له سامنڈ کی کتاب " JURISPRUNDENCE " حصہ اول

۲۰ له قرآن مجید: (ا) ان الله اشترى من المؤمنين انفسهم واموالهم

(ب) واعدوا لهم ما استطعتم من قوة

(ج) لا تحسبن الذين قتلوا في سبيل الله امواتا وغیرہ وغیرہ

حدیث کی کتابوں میں اَن گنت تشویقیں، ثواب، احکام وغیرہ ملتے ہیں ۔صحاح ستہ وغیرہ کا کتاب الجہاد ملاحظہ ہو۔مثال کے طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر ممکن ہوتا تو آپؐ اس بات کو پسند کرتے کہ بار بار راہِ خدا میں شہید ہوں ۔ آپ نے فرمایا، موت پر ہر شخص کا عمل ختم ہو جاتا ہے ۔لیکن شہید کا عمل قیامت تک جاری سمجھا جاتا ہے ۔

۲۱؎ قرآن مجید میں: (الف) ان اللہ یامر بالعدل الآیہ

(ب) واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل الآیہ

۲۲؎ مسلم الثبوت (اصول فقہ) از محب اللہ بہاری مسئلہ تقریر (سنت نبویؐ)

۲۳؎ بدایۃ المجتہد از ابن رشد صفحہ ۲ کتاب الدیات

۲۴؎ ان اللہ عزوجل یبعث لھٰذہ الامۃ علی راس کل مأتہ سنۃٍ من یجدد لھما دینھا (حدیث) (ک۔وق کتب حدیث)

۲۵؎ امریکہ میں ممانعت شریف برنارڈ کی تصنیف انگلستان کا مذہب آیندہ صدی میں رجحانات سیاسی میں مجلس اقوام کے ذریعے اتحاد د تعاون عالم اور نیز اشتراکیت ۔حج و زکوٰۃ اور اخوت اسلامی کی جانب مائل ہیں ۔روحانیات سے روز افزوں دلچسپی ، مغرب کی عیسائیت سے بیزاری دنیا میں بت پرستی اور شرک سے عام نفرت ، ہندی ذات پات اور چھوت چھات سے کراہت ، ملوکیت کی جگہ ذمہ دار جمہوریت اور پارلیمانی مشاورت وغیرہ وغیرہ ۔

۲۶؎ باب ہاوز کی کتاب مارٹس اِن ایوالیوشن باب قانون اور انصاف ۔

۲۷؎ قرآن مجید: (ا) ھو الذی ارسل رسولہٗ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہٗ علی الدین کلّہ وکفیٰ باللہ شھیدا محمد رسول اللہ والذین معہٗ اشدآءُ علی الکفار رحماء بینھم تراھم رکعا سجّداً یبتغون فضلاً من اللہ ورضوانا سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود ذٰلک مثلھم فی التوراۃ و مثلھم فی الانجیل کزرعٍ اخرج شطأہٗ فاٰزرہٗ فاستغلظ فاستوٰی علیٰ سُوقہٖ یعجب الزراع لیغیظ بھم الکفار وعد اللہ الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات منھم مغفرۃ واجراً عظیما۔

(ترجمہ) خدا نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا تاکہ اسے تمام دینوں پر غالب کرے ۔خدا کی گواہی کافی ہے محمد رسول اللہ اور آپ کے ساتھی کفار پر سخت اور باہم نرم ، راکع وساجد خدا کے فضل اور رضا مندی کے طلبگار رہیں ۔ ان کی پیشانیوں پر سجدے کے نشان ہیں ۔توریت وانجیل میں ان کی مثال یوں دی گئی ہے کہ ایک پودا ہے جس کی شاخ نکلتی ہے جو رفتہ رفتہ مضبوط اور سخت بن کر اپنی ساق پر استوار قایم ہو جاتی ہے اور بونے والے کو باغ باغ کر دیتی ہے ، تاکہ کفار کو ان سے جلائے خدا نے ان میں سے مومنوں اور نکوکاروں سے مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ کیا ہے ۔

(ب) اذلۃ علی المومنین اعزۃ علی الکافرین الآیہ

یعنی مومنوں پر نرم اور کافروں پر سخت ۔

۲۸ے قرآن مجید: واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیئ فردوہ الی اللہ والرسول۔ الآیہ
۲۹ے قرآن مجید: ولا تنازعوا فتفشلوا وتذهب ریحکم۔ الآیہ
۳۰ے حدیث: کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ۔
۳۱ے

"THE NATION OF LEAVING THE GOVERNMENT OF THE STATE TO DECIDE AND COMPELLING IT ONLY TO CONSULT, SEEMS PREFERABLE....."

GRAMMER OF POLITICS BY H. LASKI P.82 CH. SOVEREIGNTY.

ایچ لاسکی کی کتاب گرامر آف پالیٹکس باب ساورینٹی یعنی اقتدار اعلیٰ:

"یہ خیال بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ملک کی حکومت کو فیصلے کا اختیار دے دیں اور اسے صرف مشورے لینے پر مجبور کیا جائے...."

نبیؐ بحیثیت ایک مدبّر اور ماہرِ سیاست

امین احسن اصلاحی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے دُنیا کے لیے جو دین بھیجا، وُہ جس طرح ہماری انفرادی زندگی کا دین ہے، اسی طرح ہماری اجتماعی زندگی کا بھی دین ہے۔ جس طرح وُہ عبادت کے ذریعے بتاتا ہے، اسی طرح وہ سیاست کے آئین بھی سکھاتا ہے، اور جتنا تعلق اس کا مسجد سے ہے، اتنا ہی اس کا تعلق حکومت سے بھی ہے۔ اس دین کو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو بتایا اور سکھایا بھی، اور ایک وسیع ملک کے اندر اس کو جاری و نافذ بھی کر دیا۔ اس وجہ سے حضورؐ کی زندگی جس طرح بحیثیت ایک مزکّیِ نفوس اور ایک معلّمِ اخلاق کے ہمارے لیے اُسوہ اور نمونہ ہے، اسی طرح بحیثیت ایک ماہرِ سیاست اور ایک مدبّر کامل کے بھی اسوہ اور مثال ہے۔ میں آج کی صحبت میں حضورؐ کی زندگی کے اس پہلو سے متعلق چند باتیں عرض کرنی چاہتا ہوں۔

اس امر واقعی سے آپ میں سے ہر شخص واقف ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب قوم سیاسی اعتبار سے نہایت پست حال قوم تھی۔ مشہور مورّخ علامہ ابن خلدون نے ان کو ان کے مزاج کے اعتبار سے بھی ایک بالکل غیر سیاسی قوم قرار دیا ہے۔ ممکن ہے ہم میں سے بعض لوگوں کو اس رائے سے پورا پورا اتفاق نہ ہو، تاہم اس حقیقت سے تو انکار نہیں کر سکتے کہ اہلِ عرب اسلام سے پہلے اپنی پوری تاریخ میں کبھی وحدت اور مرکزیت سے آشنا نہیں ہُوئے بلکہ ہمیشہ ان پر مزاج اور انارکی کا تسلط رہا۔ پُوری قوم جنگجو اور باہم نبرد آزما قبائل کا ایک مجموعہ تھی۔ جس کی ساری قوت وصلاحیت خانہ جنگیوں اور آپس کی لُوٹ مار میں برباد ہو رہی تھی۔ اتحاد، تنظیم، شعورِ قومیت اور حکم و اطاعت وغیرہ جیسی چیزیں، جن پر اجتماعی اور سیاسی زندگی کی بنیادیں قائم ہوتی ہیں، ان کے اندر یکسر مفقود تھیں۔ ایک خاص بدویانہ حالت پر صدیوں تک زندگی گزارتے گزارتے ان کا مزاج، مزاج پسندی کے لیے اتنا پختہ ہو چکا تھا کہ ان کے اندر وحدت و مرکزیت پیدا کرنا ایک امرِ محال بن چکا تھا۔ خود قرآن نے ان کو قَوْمًا لُّدًّا کے لفظ سے تعبیر فرمایا جس کے معنی جھگڑالو قوم کے ہیں اور ان کی وحدت و تنظیم کے بارے میں فرمایا ہے:

لو انفقت ما فی الارض جمیعا ما الفت بین قلوبھم۔ (انفال ۶۳) اور تم زمین کے سارے خزانے بھی خرچ کر لیتے، جب بھی ان کے دلوں کو آپس میں جوڑ نہیں سکتے تھے۔

لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ سال کی قلیل مدت میں اپنی تعلیم و تبلیغ سے اس قوم کے مختلف عناصر کو اس طرح جوڑ دیا کہ یہ پُوری قوم ایک بنیان مرصوص بن گئی۔

یہ صرف متحد اور منظم ہی نہیں ہو گئی بلکہ اس کے اندر سے صدیوں کے پرورش پائے ہوئے اسباب نزاع و اختلاف بھی ایک ایک کر کے دُور ہو گئے۔ یہ صرف اپنے ظاہر ہی میں متحد و مربوط نہیں ہو گئی تھی بلکہ اپنے باطنی عقاید و نظریات میں بھی بالکل ہم آہنگ،

ہوگئی۔ یہ صرف خود ہی منظم نہیں ہوگئی بلکہ اس نے پوری انسانیت کو بھی اتحاد و تنظیم کا پیغام دیا اور اس کے اندر حکم اور اطاعت دونوں چیزوں کی ایسی اعلیٰ صلاحیتیں اُبھر آئیں کہ صرف استعارے کی زبان میں نہیں بلکہ واقعات کی زبان میں یہ قوم شتر بانی کے مقام سے جہاں بانی کے مقام پر پہنچ گئی اور اس نے بلا استثنا دنیا کی ساری ہی قوموں کو سیاست و جہانبانی کا درس دیا۔

اس تنظیم و تالیف کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک بالکل اصولی اور انسانی تنظیم تھی اس کے پیدا کرنے میں حضورؐ نے نہ تو قومی، نسلی، لسانی اور جغرافیائی تعصبات سے کوئی فائدہ اٹھایا۔ نہ قومی حوصلوں کی انگیخت سے کوئی کام کیا، نہ دنیوی مفادات کا کوئی لالچ دیا، نہ کسی دشمن کے ہوّے سے لوگوں کو ڈرایا۔ دُنیا میں جتنے بھی چھوٹے یا بڑے مدبّر اور سیاست دان گزرے ہیں، انھوں نے ہمیشہ اپنے سیاسی منصوبوں کی تکمیل میں انہی محرکات سے کام لیا ہے۔ اگر حضورؐ بھی ان چیزوں سے فائدہ اُٹھاتے، تو یہ بات آپ کی قوم کے مزاج کے بالکل مطابق ہوتی۔ لیکن آپ نے صرف یہ کہ ان چیزوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ ان میں سے ہر چیز کو ایک فتنہ قرار دیا اور ہر فتنہ کی خود اپنے ہاتھوں سے بیخ کنی فرمائی۔ آپؐ نے اپنی قوم کو صرف خدا کی بندگی اور اطاعت، عالمگیر انسانی اخوت، ہمہ گیر عدل و انصاف، اعلائے کلمۃ اللہ اور خوفِ آخرت کے محرکات سے جگایا۔ یہ سارے محرکات نہایت اعلیٰ اور پاکیزہ تھے اس وجہ سے آپ کی مساعی سے دنیا کی قوموں میں صرف ایک قوم کا اضافہ نہیں ہوا بلکہ آپؐ کی کوشش سے ایک بہترین اُمت ظہور میں آئی، جس کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے:

کنتم خیر امت اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر۔ (تم دنیا کی بہترین اُمت ہو، جو لوگوں کو نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کے لیے اٹھائے گئے ہو)

حضورؐ کی سیاست اور حضورؐ کے تدبّر کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ آپؐ جن اصولوں کے داعی بن کر اُٹھے، اگرچہ وہ، جیسا کہ میں نے عرض کیا، فرد، معاشرہ اور قوم کی ساری زندگی پر حاوی تھے، اور انفرادی و اجتماعی زندگی کا ہر گوشہ ان کے احاطہ میں آتا تھا، لیکن آپ نے اپنے کسی اصول کے معاملہ میں کبھی کوئی لچک قبول نہیں فرمائی۔ نہ دشمن کے مقابل میں، نہ دوست کے مقابل میں۔ آپ کو سخت سے سخت حالات سے کہ لوہا بھی ہوتا تو آپؐ کے مقابل میں موم پڑ جاتا، لیکن آپؐ کی پوری زندگی گواہ ہے کہ آپؐ نے کسی سختی سے دب کر کسی اصول کے معاملہ میں کبھی کوئی سمجھوتہ کرنا گوارا نہیں کیا۔ اسی طرح آپؐ کے سامنے پیشکشیں بھی کی گئیں اور آپؐ کو مختلف قسم کی دینی اور دنیوی مصلحتیں بھی سوجھانے کی کوشش کی گئی اور آپؐ کو مختلف قسم کی تدبیریں بھی آپؐ کے کسی موقف سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہوسکیں۔ آپؐ جب دنیا سے تشریف لے گئے، تو اس حال میں تشریف لے گئے کہ آپؐ کی زبان مبارک سے نکلی ہوئی ہر بات اپنی اپنی جگہ پر پتھر کی لکیر کی طرح ثابت و قایم تھی۔ دنیا کے مدبروں اور سیاستدانوں میں سے کسی ایسے مدبر اور سیاستدان کا نشان آپ نہیں دے سکتے، جو اپنے دو چار اصولوں کو بھی دنیا میں برپا کرنے میں اتنا مضبوط ثابت ہوسکا ہو کہ اس کی نسبت یہ دعویٰ کیا جاسکے کہ اس نے اپنے کسی اصول کے معاملے میں کمزوری نہیں دکھائی یا کوئی ٹھوکر نہیں کھائی لیکن حضورؐ نے ایک پُورا نظامِ زندگی کھڑا کر دیا، جو اپنی خصوصیات کے لحاظ سے زمانہ کے مذاق اور رجحان سے اتنا بے جوڑ تھا کہ وقت کے مدبرین اور ماہرین سیاست اس انوکھے نظام کے پیش کرنے کے سبب سے حضورؐ کو دیوانہ کہتے تھے لیکن حضورؐ نے اس نظامِ زندگی کو عملاً دنیا میں برپا کر کے ثابت کر دیا کہ جو

لوگ حضورؐ کو دیوانہ سمجھتے تھے، وہ خود دیوانے تھے۔

صرف یہی نہیں کہ حضورؐ نے کسی ذاتی مفاد یا مصلحت کی خاطر اپنے کسی اصول میں کوئی ترمیم نہیں فرمائی بلکہ اپنے پیش کردہ اصولوں کے لیے بھی اپنے اصولوں کی قربانی کبھی نہیں دی۔ اصولوں کے لیے جان اور مال اور دوسری تمام محبوبات کی قربانی دی گئی۔ ہر طرح کے خطرات برداشت کیے گئے اور ہر طرح کے نقصانات گوارا کیے گئے، لیکن اصولوں کی ہر حال میں حفاظت کی گئی۔ اگر کوئی بات صرف کسی خاص مدت تک ہی کے لیے تھی، تو اس کا معاملہ اور تھا، وُہ اپنی مدت پُوری کر چکنے کے بعد ختم ہو گئی یا اس کی جگہ اس سے بہتر کسی دوسری چیز نے لے لی لیکن باقی رہنے والی چیزیں ہر حال میں اور ہر قیمت پر باقی رکھی گئیں۔ آپؐ کو اپنی پوری زندگی میں یہ کہنے کی نوبت بھی نہیں آئی کہ میں نے دعوت تو دی تھی فلاں اصول کی لیکن اب حکمت عملی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو چھوڑ کر اس کی جگہ فلاں بات بالکل اس کے خلاف اختیار کی جائے۔

حضورؐ کی سیاست اس اعتبار سے بھی دنیا کے لیے ایک نمونہ اور مثال ہے کہ آپؐ نے سیاست کو عبادت کی طرح ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک رکھا۔ آپ جانتے ہیں کہ سیاست میں وہ بہت سی چیزیں مباح بلکہ بعض صورتوں میں مستحسن سمجھی جاتی ہیں، شخصی زندگی کے کردار میں مکروہ اور حرام قرار دے دی جاتی ہیں اگر کوئی شخص اپنی کسی ذاتی غرض کے لیے جھوٹ بولے، چالبازیاں کرے، عہد شکنیاں کرے، لوگوں کو فریب دے یا ان کے حقوق غصب کرے، تو اگرچہ اس زمانہ میں اقدار اور پیمانے بہت کچھ بدل چکے ہیں اور اخلاق بھی ان چیزوں کو معیوب ٹھہراتا ہے اور قانون بھی ان باتوں کو حرام قرار دیتا ہے لیکن کیا ایک سیاستدان اور ایک مدبر یہی سارے کام اپنی سیاسی زندگی میں اپنی قوم یا اپنے ملک کے لیے کرے تو یہ سارے کام اس کے فضائل اور کمالات میں شمار ہوتے ہیں۔ اس کی زندگی میں بھی اس کے اس طرح کے کارناموں پر اس کی تذلیل نہیں ہوتی اور مرنے کے بعد بھی وُہ اپنی قوم کا ہیرو سمجھا جاتا ہے۔ سیاست کے لیے یہی صفات اور کمالات عرب جاہلیت میں بھی ضروری سمجھے جاتے تھے مگر اس کا نتیجہ یہ تھا جو لوگ ان باتوں میں ماہر ہوتے تھے وہی لوگ اُبھر کر قیادت کے مقام پر آتے تھے۔

لیکن حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سیاسی زندگی سے دنیا کو یہ درس دیا کہ ایمان داری اور سچائی جس طرح انفرادی زندگی کی بنیادی اخلاقیات میں سے ہے، اسی طرح اجتماعی اور سیاسی زندگی کے لوازم میں سے بھی ہے، بلکہ آپ نے ایک عام شخص کے جھوٹ کے مقابلہ میں ایک صاحب اقتدار اور ایک بادشاہ کے جھُوٹ کو، جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے، کہیں زیادہ سنگین قرار دیا۔ آپؐ کی پُوری سیاسی زندگی ہمارے سامنے ہے۔ اس سیاسی زندگی میں وہ تمام مراحل آپ کو پیش آئے، جن کے پیش آنے کی ایک سیاسی زندگی میں توقع کی جا سکتی ہے۔ آپؐ نے ایک طویل عرصہ نہایت مظلومیت کی حالت میں گزارا اور کم و بیش اتنا ہی عرصہ آپؐ نے اقتدار اور سلطنت کا گزارا۔ اس دوران میں آپؐ کو حلیفوں اور حریفوں دونوں سے مختلف قسم کے سیاسی اور تجارتی معاہدے کرنے پڑے۔ دشمن سے متعدد جنگیں لڑنی پڑیں، عہد شکنی کرنے والوں کے خلاف جوابی اقدامات کرنے پڑے، قبائل کے وفود سے معاملے کرنے پڑے، آس پاس کی حکومتوں کے وفود سے سیاسی گفت گوئیں کرنی پڑیں اور سیاسی گفتگوؤں کے لیے اپنے وفود ان کے پاس بھیجنے پڑے۔ بعض بیرونی طاقتوں کے خلاف فوجی اقدامات کرنے پڑے۔ یہ سارے کام آپؐ نے انجام دیے لیکن دوست اور دشمن ہر شخص کو اس بات کا اعتراف ہے کہ آپؐ نے کبھی کوئی جھوٹا وعدہ نہیں کیا۔ اپنی کسی بات کی غلط تاویل کرنے کی کوشش نہیں فرمائی۔ کوئی بات کہہ چکنے کے بعد اس سے انکار نہیں کیا۔ کسی معاہدہ کی کبھی خلاف ورزی

نہیں کی۔ حلیفوں کا نازک سے نازک حالات میں بھی ساتھ دیا اور دشمنوں کے ساتھ بدتر سے بدتر حالات میں بھی انصاف کیا۔ اگر آپ دنیا کے مدبرین اور اہلِ سیاست کو اس کسوٹی پر جانچیں، تو میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کو بھی آپ اس کسوٹی پر کھرا نہ پائیں گے۔ پھر یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ سیاست میں عبادت کی اس دیانت اور سچائی قائم رکھنے کے باوجود حضورؐ کو اپنی سیاست میں کبھی کسی ناکامی کا تجربہ نہیں کرنا پڑا۔ اب آپ اس چیز کو چاہے تدبر سے تعبیر کیجئے یا حکمتِ نبوت سے۔

حضورؐ کی سیاست اور حضورؐ کے تدبر کا یہ بھی ایک اعجاز ہے کہ آپؐ نے عرب ایسے ملک کے ایک ایک گوشے میں امن و عدل کی حکومت قائم کی۔ کفار و مشرکین کا زور آپؐ نے اس طرح توڑ دیا کہ فتح مکہ کے موقع پر فی الواقع انہوں نے گھٹنے ٹیک دیے۔ یہود کی سیاسی سازشوں کا بھی آپؐ نے خاتمہ کر دیا۔ رومیوں کی سرکوبی کے لیے بھی آپؐ نے انتظامات فرمائے۔ یہ سارے کام آپ نے کر ڈالے لیکن پھر بھی انسانی خون بہت کم بہا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کی تاریخ شہادت دیتی ہے اور آج کے واقعات بھی یہ شہادت دے رہے ہیں کہ دنیا کے چھوٹے چھوٹے انقلابات میں بھی ہزاروں لاکھوں جانیں ختم ہو جاتی ہیں اور مال و اسباب کی بربادی کا کوئی اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھوں سے جو انقلاب برپا ہوا، اس کی عظمت اور وسعت کے باوجود شاید ان نفوس کی تعداد چند سو سے زیادہ[1] نہیں ہوگی، جو اس ساری جدوجہد کے دوران میں حضورؐ کے ساتھیوں میں سے شہید ہوئے یا مخالف گروہ کے آدمیوں میں سے مارے گئے۔

پھر یہ بات بھی غایت درجہ اہمیت رکھتی ہے کہ دنیا کے معمولی معمولی انقلابات میں بھی ہزاروں لاکھوں آبروئیں فاتح فوجوں کی ہوس کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اس تہذیب و تمدن کے زمانہ میں بھی ہم نے دیکھا ہے کہ فاتح ملک کی فوجوں نے مفتوح ملک کی سڑکیں اور گلیاں حرام نسل سے بھر دی ہیں اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ اربابِ سیاست اس صورتِ حالات پر شرمندگی اور ندامت کا اظہار کرنے کی بجائے اس کو انقلاب کا ایک ناگزیر نتیجہ قرار دیتے ہیں لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں دنیا میں جو انقلاب رونما ہوا، اس کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی۔ کوئی ایک واقعہ بھی ہم کو ایسا نہیں ملتا کہ کسی نے کسی کے ناموس پر دست درازی کی ہو۔

اہلِ سیاست کے لیے طمطراق بھی سیاست کے لوازم میں سے سمجھا جاتا ہے۔ جو لوگ عوام کو ایک نظام میں پرونے اور نظم قاہر کے تحت منظم کرنے کے لیے اٹھتے ہیں، وہ بہت سی باتیں اپنوں اور بیگانوں پر اپنی سطوت جمانے اور اپنی اہمیت قائم کرنے کے لیے اختیار کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ساری باتیں ان کی سیاسی زندگی کے لازمی تقاضوں کا نتیجہ ہیں۔ اگر وہ یہ باتیں نہ اختیار کریں گے، تو سیاست کے جو تقاضے ہیں، وہ ان کے پورے کرنے سے قاصر رہ جائیں گے۔ اس طرح کے مقاصد کے پیشِ نظر جب وہ نکلتے ہیں، تو بہت سے لوگ ان کے جلو میں چلتے ہیں۔ جہاں وہ ظاہر ہوتے ہیں ان کے نعرے بلند کرائے جاتے ہیں۔ جہاں وہ اترتے ہیں، ان کے جلوس نکالے جاتے ہیں۔ جلسوں میں ان کے حضور میں ایڈریس پیش کیے جاتے ہیں اور ان کی شان میں قصیدے پڑھے جاتے ہیں۔ جب وہ مزید ترقی کر جاتے ہیں تو ان کے لیے قصر اور دیوان خانے آراستہ کیے جاتے ہیں۔ ان کو سلامیاں دی جاتی ہیں۔ ان کے لیے بری، بحری اور ہوائی خاص سواریوں کے انتظامات کیے جاتے ہیں۔ جب وہ کسی خاص سڑک پر نکلنے والے ہوتے ہیں تو وہ سڑک دوسروں کے لیے بند کر دی جاتی ہے۔

اس زمانہ میں ان چیزوں کے بغیر کسی صاحبِ سیاست کا تصور بھی نہ دوسرے لوگ کرتے ہیں اور نہ کوئی صاحبِ سیاست ان لوازم سے الگ خود اپنا کوئی وجود تصور کرتا ہے، لیکن ہمارے نبی کریمؐ اس اعتبار سے بھی دنیا کے تمام اہلِ سیاست سے الگ رہے۔ جب

---

[1] قاضی سلیمان منصور پوری کی تحقیق کے مطابق عہدِ نبوی کے جمیع شہدا کی تعداد ۲۵۹ اور کفار مقتولین کی تعداد ۷۵۹ بنتی ہے جبکہ دوسری جنگِ عظیم کے مقتولین کی تعداد مولانا غلام رسول مہر کی تحقیق کے مطابق ۲ کروڑ سے بھی متجاوز ہو جاتی ہے۔ (محمد عالم مختار حق)

آپ اپنے صحابہ میں چلتے، تو کوشش فرماتے کہ سب کے پیچھے چلیں۔ مجلس میں تشریف رکھتے تو اس طرح گھل مل کر بیٹھتے کہ یہ امتیاز کرنا مشکل ہوتا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں۔ کھانا کھانے کے لیے بیٹھتے تو دو زانو ہو کر بیٹھتے اور فرماتے کہ میں اپنے رب کا غلام ہوں اور جس طرح ایک غلام کھانا کھاتا ہے، اسی طرح میں بھی کھانا کھاتا ہوں۔ ایک مرتبہ ایک بدو اپنے اس تصور کی بنا پر، جو حضورؐ کے بارے میں اس کے ذہن میں رہا ہو گا، سامنے آیا تو حضورؐ کو دیکھ کر کانپ گیا۔ آپؐ نے اسے تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ ڈرو نہیں۔ میری ماں بھی سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی یعنی جس طرح تم نے اپنی ماں کو بدویانہ زندگی میں سوکھا گوشت کھاتے دیکھا ہو گا، اسی طرح کا سوکھا گوشت کھانے والی ایک ماں کا بیٹا میں بھی ہوں۔ نہ آپؐ کے کوئی خاص سواری تھی، نہ کوئی خاص قصر دیوان تھا، نہ کوئی خاص باڈی گارڈ تھا۔ آپؐ جو لباس دن میں پہنتے ، اسی میں شب میں استراحت فرماتے اور صبح کو وہی لباس پہنے ہوئے ملکی وفود اور سفراء سے مسجد نبویؐ کے فرش پر ملاقاتیں فرماتے اور تمام اہم سیاسی امور کے فیصلے فرماتے۔

یہ خیال نہ فرمایئے کہ اس زمانہ کی بدویانہ زندگی میں سیاست اس طمطراق اور اس ٹھاٹھ باٹھ سے آشنا نہیں ہوئی تھی، جس طمطراق اور ٹھاٹھ باٹھ کی اب وہ عادی ہو گئی ہے۔ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں، ان کا خیال بالکل غلط ہے۔ سیاست اور اہلِ سیاست کی ناناشاہی ہمیشہ سے یہی رہی۔ فرق اگر ہے، تو محض ظاہری باتوں میں ہوا ہے۔ البتہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نئے طرز کی سیاسی زندگی کا نمونہ دنیا کے سامنے رکھا جس میں دنیوی کر و فر کے بجائے خلافتِ الٰہی کا جلال اور ظاہری ٹھاٹھ باٹھ کی جگہ خدمت اور محبت کا جلال تھا۔ لیکن اس سادگی اور فقر و درویشی کے باوجود اس کے دبدبے اور اس کے شکوہ کا یہ عالم تھا کہ روم وشام کے بادشاہوں پر اس کے تصور سے لرزہ طاری ہوتا تھا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاست اور آپؐ کے تدبر کا ایک اور پہلو بھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ آپ نے اپنی حیات مبارک ہی میں ایسے لوگوں کی ایک بہت بڑی جماعت بھی تربیت کر کے تیار کر دی جو آپؐ کے پیدا کردہ انقلاب کو اس کے اصلی مزاج کے مطابق آگے بڑھانے، اس کو مستحکم کرنے اور اجتماعی و سیاسی زندگی میں اس کے تمام مقتضیات کو بروئے کار لانے کے لیے پوری طرح اہل تھے۔ چنانچہ اس تاریخی حیثیت سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا کہ حضورؐ کی وفات کے بعد اس انقلاب نے عرب سے نکل کر آس پاس کے دوسرے ممالک میں قدم رکھا اور دیکھتے دیکھتے اس کرۂ ارضی کے تین بر اعظموں میں اس نے اپنی جڑیں جما لیں۔ لیکن اس کی اس وسعت کے باوجود اس کی قیادت کے لیے موزوں اشخاص کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ میں نے جن تین بر اعظموں کی طرف اشارہ کیا ہے ان کے متعلق یہ حقیقت بھی ہر شخص جانتا ہے کہ ان کے اندر وحشی قبائل نہیں تھے بلکہ وقت کی نہایت ترقی یافتہ، جبّار و قہار حکومتیں تھیں لیکن اسلامی انقلاب کی موجوں نے جزیرۂ عرب سے اٹھ کر ان کو ان کی جڑوں سے اس طرح اکھاڑ پھینکا، گویا زمین میں ان کی کوئی بنیاد ہی نہیں تھی اور ان کے ظلم و جور کی جگہ ہر گوشے میں اسلامی تہذیب و تمدن کی برکتیں پھیلا دیں، جن سے دنیا صدیوں تک متمتع ہوتی رہی۔

دنیا کے تمام مدبرین اور اہلِ سیاست کی پوری فہرست پر نگاہ ڈال کر غور کیجئے کہ ان میں کوئی ایک شخص بھی نظر نہیں آتا جس نے اپنے دو چار ساتھی بھی ایسے بنانے میں کامیابی حاصل کی ہو اس کے فکر و فلسفہ اور اس کی سیاست کے ان معنوں میں عالم اور عامل رہے ہوں، جن معنوں میں رسول اللہؐ کے بنائے ہوئے طریقہ کے عالم و عامل ہزاروں صحابہ تھے۔

آخر میں ایک بات بطور تنبیہہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی مرتبہ اور مقام یہ ہے کہ آپؐ نبی خاتم اور پیغمبر عالم ہیں۔ سیاست اور تدبر اس مرتبہ بلند کا ایک ادنیٰ شعبہ ہے، جس طرح ایک حکمران کی زندگی پر ایک تحصیلدار کی زندگی کے زاویہ سے غور کرنا ایک بالکل ناموزوں بات ہے اس سے زیادہ ناموزوں بات شاید یہ ہے کہ ہم سیّدِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر ایک ماہر سیاست یا ایک مدبر کی زندگی کی حیثیت سے غور کریں۔ نبوت اور رسالت ایک عظیم عطیہ الٰہی ہے، جب یہ عطیہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندہ کو بخشتا ہے، تو وہ سب کچھ اس کو بخش دیتا ہے، جو اس دنیا میں بخشا جا سکتا ہے۔ پھر حضورؐ تو صرف نبیؐ ہی نہیں تھے بلکہ خاتم الانبیاءؑ تھے، صرف رسول ہی نہیں تھے بلکہ سیّد المرسل تھے۔ صرف اہلِ عرب ہی کے لیے نہیں تھے بلکہ تمام عالم کے لیے مبعوث ہوئے تھے اور آپؐ کی تعلیم و ہدایت صرف کسی خاص مدت تک ہی کے لیے نہیں تھی بلکہ ہمیشہ باقی رہنے والی تھی اور یہ بھی ہر شخص جانتا ہے کہ حضورؐ کسی دینِ رہبانیت کے داعی بن کر نہیں آئے تھے بلکہ ایک ایسے دین کے مدعی تھے، جو رُوح اور جسم دونوں پر حاوی اور دنیا و آخرت دونوں کی حسنات کا ضامن تھا۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

سرورِ کائنات ﷺ کا دربار

مُلّا واحدی

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا لمحہ لمحہ لوگوں کو فیض پہنچانے کے واسطے وقف تھا۔ لیکن تمام لوگ ہمہ وقت حاضرِ خدمت نہیں رہ سکتے تھے۔ کبھی ایک جماعت مستفیض ہوتی تھی، کبھی دوسری۔ اس لئے حضورؐ نے مستقل اجلاس کا بھی اعلان کر رکھا تھا کہ جو آنا چاہیں۔ اس وقت آ جائیں۔

یہ اجلاس بیشتر مسجد نبوی میں منعقد کئے جاتے تھے، اور ان کا وقت عموماً پنج وقتہ نمازوں کے بعد تھا۔ خصوصاً صبح کی نماز کے بعد۔

مٹی کی چھوٹی سی چبوتری[1] تھی جس پر حضورؐ نشست فرماتے تھے اور چبوتری کے سامنے اور دونوں جانب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بیٹھتے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دربار بیحد سادہ تھا حاضرین میں اگرچہ ایسے باادب حضرات ہوتے تھے کہ بغیر اجازت زبان نہیں کھولتے تھے اور مطلق جنبش نہیں کرتے تھے۔ ان کی بابت راویوں کے الفاظ یہ ہیں کہ ـــ سروں پر گویا چڑیاں بیٹھ جاتی تھیں کہ جنبش کی اور وہ اُڑیں ـــ کان الطیر فوق رؤسہم مگر گنواروں (بدّوؤں) کی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ آتے ہی پوچھتے "محمدؐ کون ہیں"۔ اور جب انہیں بتایا جاتا کہ "وہ گورے رنگ والے جو ٹیک لگائے بیٹھے ہیں"۔ تو کہتے "اے ابن عبدالمطلب اخفامت ہونا۔ میں سختی سے سوال کروں گا"۔ اور عجیب عجیب سوال کرتے۔ مثلاً "بتایئے میرے باپ کا نام کیا ہے"۔ یا "میرا اونٹ کھو گیا ہے، بتایئے کہاں ہے؟"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ سوالات صرف تزکیۂ نفس کے متعلق کئے جائیں لغو و فضول سوالات کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ مگر لغو و فضول سوالات کو برداشت ضرور کر لیتے تھے۔ ایک دفعہ حضورؐ نے بگڑ کر اتنا کہا تھا "پوچھے جاؤ جو پوچھنا ہو، میں سب کا جواب دوں گا"۔ اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے محسوس کیا تھا کہ حضورؐ برہم ہیں۔

کوئی آدابِ مجلس سے ناواقف دورانِ تقریر میں یا دوسرے کا جواب دینے میں سوال کرتا تھا تو حضورؐ تقریر جاری رکھتے تھے۔ حضورؐ سے ایک وقت میں ایک ہی شخص گفتگو کر سکتا تھا۔

ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم تقریر کر رہے تھے کہ ایک گنوار (بدو) آیا اور آتے ہی بولا۔

"قیامت کب آئے گی"

---

[1] چبوتری اس غرض سے بنادی گئی تھی کہ اجنبی آنے والوں کو حضورؐ کی شناخت میں دشواری پیش نہ آئے ورنہ عموماً حضورؐ سب کے ساتھ مِلے جُلے بیٹھتے تھے حضورؐ نے اپنی کوئی اور ممتاز جگہ مقرر نہیں فرمائی تھی۔

حضورؐ تقریر کرتے رہے۔ تقریر سے فارغ ہو کر دریافت فرمایا:

"قیامت کی بابت کس نے سوال کیا تھا"

بدّو نے کہا۔

"مَیں نے"

حضورؐ نے جواب دیا۔

"قیامت جب آئے گی جب لوگ امانت ضائع کرنے لگیں گے"

بدّو نے پوچھا:

"امانت کیوں کر ضائع ہوگی؟"

فرمایا:

"جب کام نااہلوں کے ہاتھ میں پہنچ جائے گا"

یہی بدّو حضورؐ کے پاس بیٹھتے بیٹھتے تمیز سیکھ جاتے تھے۔

حضورؐ کے دربار میں نام و نسب یا دولت و ثروت کی وجہ سے کسی کو امتیاز نہیں دیا جاتا تھا۔ کچھ ایسا برتاؤ ہوتا تھا کہ ایک شخص بھی یہ محسوس نہیں کرتا تھا کہ مجھے دوسروں کی نسبت کم عزّت دی گئی ہے۔

اوّل، حضورؐ اہلِ حاجت کو اپنی حاجتیں پیش کرنے کا موقع بخشتے تھے۔ جب تک بولنے والا چُپ نہ ہو جاتا تھا تو حضورؐ اس کی بات سُنتے رہتے تھے بعض اوقات بولنے والا بولے جاتا تو اُسے انگیز کر لیتے تھے ——

قبیلوں کے سردار آجاتے تو حضورؐ ان کی تعظیم و تکریم فرماتے تھے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے۔ اکرموا کریم کل قوم ہر قوم کے معززین کی عزت کرو۔ ویسے ازراہ شفقت بیٹی (حضرت فاطمہ زہراؓ) کے لیے بھی کبھی کبھی کھڑے ہو جاتے تھے۔ اپنی اَنّا (بی بی حلیمہ) کے لیے بھی اُٹھ کر چادر بچھادی تھی اور حضرت حلیمہ کے فرزند تشریف لائے تو اُن کے لیے بھی کھڑے ہو گئے تھے۔ مگر اُس قسم کی تعظیم و تکریم جو بادشاہوں اُمرا و رؤسا کے ہاں رائج تھی (اور آج تک رائج ہے) اِس کی حضورؐ نے شدومد سے مذمت فرمائی ہے۔ مثلاً ایک شخص کے آنے پر تمام حاضرین کا کھڑا ہو جانا یا ایک شخص بیٹھا ہو اور حاضرین اس کے سامنے دست بستہ کھڑے رہیں گویا اللہ تعالیٰ کے سامنے قیام کر رہے ہیں۔ حضورؐ نے اس قسم کی تعظیم و تکریم کو منع فرمایا ہے حضورؐ کا ارشاد ہے "جسے یہ پسند ہو کہ لوگ اُس کے سامنے تعظیماً کھڑے رہیں اُسے اپنی جگہ جہنم میں تلاش کرنی چاہیے"۔ باتیں پوچھنے والے کو حکم تھا کہ بیٹھ کر پوچھو۔ کھڑے ہو کر مت پوچھو۔

حضورؐ حاضرین کے ساتھ بے تکلف اور شگفتہ رہ کر بیٹھتے تھے۔ ہنسی اور ظرافت کی بات اگر ادب و آداب کے خلاف نہ ہوتی تو اُسے بھی جائز رکھتے تھے اور ہنسی و ظرافت میں حصّے لیتے تھے۔

ایک دفعہ حضورؐ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ سے کسی شخص نے خواہش کی کہ مَیں جنت میں کھیتی کروں گا لیکن میں چاہتا ہوں کہ اِدھر بوؤں اُدھر کاٹ لوں۔ چنانچہ دانہ ڈالتے ہی فصل تیار ہو گئی، کوئی بدّو صاحب بھی حاضرِ دربار تھے۔ وہ بولے، یہ نعمت فقط مکہ مدینہ والوں کے حصّے میں

ہم تو زراعت نہیں جانتے۔ حضورؐ ہنسنے لگے۔
آئے گی۔ کیونکہ مکہ اور مدینے والے ہی اہلِ زراعت ہیں۔
ایک دفعہ ایک صحابی آئے اور بولے "میں تباہ ہو گیا"۔ حضورؐ نے پوچھا کیوں اور کیسے؟ صحابی نے عرض کیا، میں نے رمضان میں بحالت صوم بیوی سے ہمبستری کرلی۔ حضورؐ نے فرمایا
ایک غلام آزاد کر دو۔ کفارہ ہو جائے گا۔ صحابی نے کہا میں غریب ہوں۔ غلام کہاں سے لاؤں۔ حضورؐ نے فرمایا اچھا۔ دو مہینے کے روزے
رکھ لو۔ صحابی نے کہا یہ بھی ممکن نہیں۔ حضورؐ فرمایا، اچھا ۶۰ مسکینوں کو کھانا کھلا دو۔ صحابی نے کہا۔ اس کا بھی مقدور نہیں۔ اتفاق سے اسی
وقت کھجوروں کا ڈھیر حضورؐ کی خدمت میں کہیں سے پہنچا۔ حضورؐ نے فرمایا لو یہ ڈھیر مسکینوں میں بانٹ دو۔ صحابی نے کہا، اُس اللہ کی قسم جس نے
آپ کو رسول بنایا ہے۔ سارے مدینے میں مجھ سے بڑھ کر مسکین دوسرا نہیں ہے — حضورؐ ہنس پڑے اور فرمایا اچھا تم اپنے ہی لیے لے جاؤ۔
ایک مرتبہ دو شخص حاضر ہوئے ایک کو چھینک آئی، اُس نے الحمد للہ نہیں کہا۔ حضورؐ نے بھی یرحمک اللہ نہیں فرمایا۔ دوسرے کو چھینک آئی
تو اُس نے الحمد للہ کہا اور حضورؐ نے یرحمک اللہ فرمایا۔ الحمد للہ نہ کہنے والا الحمد للہ کہنے والے کی نسبت ذی حیثیت تھا اُسے اپنے لیے یرحمک اللہ نہ
فرمانا اور دوسرے کے لیے یرحمک اللہ فرمانا کھٹکا۔ اُس نے حضورؐ سے شکایت کی۔ حضورؐ نے فرمایا۔ اس نے اللہ کو یاد رکھا، لہٰذا میں نے
اُسے دُعا دی۔ تم اللہ کو بھول گئے میں نے تمھیں بھلا دیا۔
ایک دفعہ حضورؐ مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے۔ مجمع زیادہ تھا۔ تین شخص آئے۔ ایک کو درمیان میں ذرا سی جگہ مل گئی، وہ وہاں
گھس بیٹھا، دوسرے نے کنارے پر بیٹھ جانا غنیمت سمجھا، وہ کنارے پر بیٹھ گیا۔ تیسرا واپس چل دیا۔ حضورؐ نے فرمایا۔ ایک نے اللہ کی پناہ لی۔
دوسرے نے اللہ سے حیا کی۔ اللہ بھی اُس سے شرمایا۔ تیسرے نے اللہ سے منہ پھیر لیا۔ اللہ نے بھی اُس سے منہ پھیر لیا۔
ان جامع میں چونکہ خواتین شریک نہیں ہو سکتی تھیں، خواتین نے درخواست کی کہ ہمارے واسطے الگ دن مقرر کر دیجئے۔ چنانچہ الگ دن
مقرر کر دیا گیا۔ خواتین کی مجلس میں عام مسائل شرعیہ پوچھنے کی اجازت تھی۔ لیکن عورتوں کے مخصوص مسائل پوچھنے
کی اجازت نہیں تھی۔ وہ مسائل ازواج مطہرات انھیں بتاتی رہتی تھیں۔ مخصوص مسائل خواہ عورتوں کے متعلق ہوتے
خواہ مردوں کے متعلق کوئی سب کے سامنے، برملا دریافت کرنے لگتا تھا تو حضورؐ مکدر ہو جاتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عاصم انصاری رضی اللہ
عنہ نے مجمع عام میں سوال کیا کہ اگر انسان اپنی بیوی کو غیر مرد کے ساتھ دیکھ لے۔ تو کیا کرے۔ حضورؐ نے انھیں جھڑک دیا۔
عام سوالات لوگ بے دھڑک کرتے تھے اور جواب باصواب پاتے تھے۔
ایک طریقہ تعلیم کا یہ بھی تھا کہ حضورؐ بطورِ امتحان خود سوال کرتے تھے اور لوگوں سے فرماتے تھے کہ جواب دو۔ اس
سے لوگوں کے دماغ پر زور ڈالنے کی عادت پڑتی تھی۔ مثلاً ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے سوال کیا۔ اچھا بتاؤ وہ
درخت کون سا ہے۔ جس کے پتے جھڑتے نہیں اور جو مسلمانوں سے مشابہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں۔ میرا ذہن
کھجور کے درخت کی طرف گیا۔ لیکن میں کم سن تھا۔ اظہار کی جرأت نہیں ہوئی۔ دوسرے حضرات اور درختوں کے نام لیتے رہے۔ آخر حضورؐ نے فرمایا
کہ وہ کھجور کا درخت ہے، میں ہمیشہ افسوس کیا کرتا ہوں کہ میں نے اُس وقت کھجور کیوں نہ کہہ دیا۔
ایک دفعہ حضورؐ نے پوچھا۔ تم لوگ جانتے ہو، مفلس کون ہے؟ صحابہ نے عرض کیا، بے زر کو مفلس کہتے ہیں۔ میری اُمت میں مفلس وہ
ہے جو قیامت کے دن نماز، روزہ اور زکوٰۃ وغیرہ جملہ قسم کی نیکیاں لے کر تو آئے گا۔ لیکن اُس نے کسی کو گالی بھی دی ہوگی کسی پر تہمت
بھی لگائی ہوگی۔ کسی کا مال بھی کھایا ہوگا، کسی کا خون بھی بہایا ہوگا کسی کو مارا بھی ہوگا۔ لہٰذا اس کی نیکیوں میں سے تھوڑا تھوڑا ان کو دے دیا۔

جائے گا، جس کے ساتھ اُس نے زیادتی کی ہو گی اور پھر اُس کے پاس کوئی نیکی نہیں بچے گی۔ بلکہ اوروں کا کچھ اس کے ذمے رہ جائے گا۔ سو اوروں کی بدیاں اُس کے نام لکھ دی جائیں گی اور وہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

ایک دفعہ فرمایا کیا میں تمہیں بتاؤں کہ تم میں اچھا کون ہے اور بُرا کون۔ فرمایا اچھا وہ ہے جس سے لوگ اچھائی کی امید رکھیں بُرائی سے لوگ امن میں ہوں اور بُرا وہ ہے، جس سے اچھائی کی توقع نہ کی جائے اور جس کی برائی سے کوئی مامون نہ ہو۔

دقیق مباحث جو عامۃ الناس کی سمجھ میں نہیں آتے۔ اُن کو حضورؐ نہیں چھڑنے دیتے تھے ایک دفعہ صحابہ تقدیر پر بحث کر رہے تھے کہ تقدیر کیا شے ہے۔ حضورؐ کے کانوں میں آواز پہنچی تو حضورؐ حجرے سے باہر نکل آئے اور بڑے غصے سے بولے "تمھیں اللہ نے اس لیے پیدا کیا ہے کہ آپس میں قرآن کو ٹکراؤ، پچھلی اُمتیں ایسی ہی باتوں سے برباد ہوتی رہتی تھیں۔"

ایک دوسرے موقع پر حضورؐ نے تقدیر کی گرہ باتوں باتوں میں کھول دی۔

کسی میت کے ساتھ حضورؐ قبرستان تشریف لے گئے تھے۔ وہاں حضورؐ نے فرمایا: "کوئی شخص ایسا نہیں ہے، جس کا جنتی یا دوزخی ہونا لکھا نہ جا چکا ہو۔" ایک صاحب نے کہا: "تو پھر عمل کس توقع پر کیا جائے؟ ہم تقدیر پر توکل کر کے عمل کیوں نہ چھوڑ دیں؟"

حضورؐ نے فرمایا: "توکل قوت عمل کو معطل کر دینے کا نام نہیں ہے۔ اعمال ہی تقدیر ہیں۔ اللہ جسے اعمال کی توفیق بخشتا ہے، وہی اس کا نوشتۂ تقدیر ہے۔ جو جنتی ہو گا۔ وہ جنتیوں کے عمل ضرور کرے گا اور جس کی تقدیر میں دوزخ لکھی ہے، وہ دوزخیوں کے عمل کرے گا۔"

دقیق مباحث کے علاوہ عام بحثیں حضورؐ صحابہ کو کرنے دیتے تھے۔ مثلاً ایک دفعہ اس مضمون پر بحث ہو رہی تھی کہ شہرت طلبی اور تفاخر خلوص عمل کے منافی ہیں یا نہیں۔ ایک صحابی نے کہا اگر اس نوع کے فقرے جہاد میں کہے جائیں کہ "میں فلاں ہوں اور فلاں قبیلے سے ہوں، ذرا میرا وار روکو تو سہی"۔ تو ثواب نہیں ملے گا۔ دوسرے صحابی نے کہا "میرے نزدیک تو اتنا کہہ دینا جائز ہے"۔ حضورؐ نے سنا تو فرمایا شہرت اور ثواب میں بیر نہیں ہے۔"

ایک دفعہ حضورؐ مسجد میں تشریف لائے تو دیکھا کہ بعض صحابی قرآن خوانی اور ذکر و شغل میں مشغول ہیں اور بعض علمی باتیں کر رہے ہیں، حضورؐ نے فرمایا، دونوں جماعتوں کا عمل ٹھیک ہے لیکن مجھے اللہ نے مُعلّم بنا کر بھیجا ہے، انما بُعِثتُ مُعلّماً اور حضورؐ علمی باتیں کرنے والی جماعت میں بیٹھ گئے۔

حضورؐ کی مجالس کتنی باثر ہوتی تھیں، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل دو روایتوں سے کیجیے:۔

ایک دفعہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! جب تک ہم حضورؐ کی خدمت میں رہتے ہیں۔ دنیا ہماری نظر میں ہیچ ہو جاتی ہے لیکن بال بچوں میں جا کر حالت پھر بدل جاتی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: "ایک سا حال رہتا تو فرشتے تمہاری زیارت کو آتے۔"

ایک دفعہ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے۔ یا رسول اللہ! میں منافق تو نہیں ہو گیا۔ میں خدمت اقدس میں حاضر ہوتا ہوں تو جنت اور دوزخ دکھائی دینے لگتی ہے۔ مگر گھر پہنچ کر جنت اور دوزخ کو بھول جاتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا: "اگر ہر وقت وہی حالت رہتی تو فرشتے تم سے مصافحہ کرتے۔"

ایک دفعہ ایک امیر خاتون چوری کے جرم میں پکڑی ہوئی آئیں، بعض صحابہؓ نے ان کی سفارش کی، حضورؐ نے فرمایا: "تم سے پہلے کی قومیں

اسی لیے تباہ ہو جایا کرتی تھیں کہ معمولی لوگ قصور کرتے تھے تو انھیں سزا ملتی تھی اور بڑے لوگ قصور کرتے تھے تو ٹال دیتے تھے۔"

ایک دفعہ ایک بدّو آیا۔ اتفاق سے اُسے استنجے کی حاجت ہوئی، وُہ مسجد کے صحن میں بیٹھ کر رفع حاجت کرنے لگا۔ صحابہ مارنے دوڑے، حضورؐ نے فرمایا " تم سختی کے لیے نہیں پیدا کئے گئے۔ تمہارا کام نرمی ہے۔ اس کے بعد حضورؐ نے بدّو کو بلا کر سمجھا دیا اور صحابہ کو حکم دیا کہ غلاظت پانی سے بہا دو۔

ایک دفعہ کسی صحابی نے پوچھا، یا رسول اللہ! کوئی اگر یہ کوشش کرے کہ اُس کے کپڑے اچھے اور سلیقے کے ہوں، اس کا جوتا اچھا ہو تو کیا یہ بھی غرور ہے۔ فرمایا نہیں۔ اِنّ اللہ جمیل ویحب الجمال اللہ صاحب جمال ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے بندوں کو چاہیے کہ اپنے طور و طریق اور لباس میں سلیقے اور جمال کا لحاظ رکھیں۔

کبھی کبھی حضورؐ بات کو اہمیت دینے کے لئے اُسے کئی بار دوہراتے تھے۔ مثلاً ایک دفعہ فرمایا: " واللہ وہ صاحب ایمان نہیں، واللہ وہ صاحب ایمان نہیں۔ واللہ وہ صاحب ایمان نہیں۔"

حاضرین نے پوچھا " کون یا رسول اللہ!؟"

فرمایا " جس کے پڑوسی کو اُس کی برائیوں سے امن نہ ملا۔"

ایک دفعہ فرمایا " دینداری اخلاص کا نام ہے، دینداری اخلاص کا نام ہے، دین داری اخلاص کا نام ہے۔"

صحابہ نے عرض کیا " یا رسول اللہ! کس کے ساتھ؟"

فرمایا " اللہ تعالیٰ کے ساتھ، اُس کی کتاب کے ساتھ اُس کے رسولؐ کے ساتھ، مسلمان سربراہوں کے ساتھ اور عام مسلمانوں کے ساتھ۔"

عہدِ نبویؐ کے عربی ایرانی تعلقات

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

قبل اسلام جزیرہ نمائے عرب زیادہ تر صحرا ہے۔ اس لیے وہاں کی آبادی اپنی غذا تک کے لیے قدیم سے بیرونی درآمد کی محتاج رہی ہے تعدادِ ازدواج سے آبادی میں تیز اضافہ اور ذرائع معیشت میں خانہ جنگیوں وغیرہ کے باعث روزافزوں انحطاط عربوں کو اکثر ترکِ وطن پر قدیم سے مجبور کرتا رہا ہے۔ ایک طرف وہ خطرناک بحری راستہ سے مشرقی افریقہ جاتے رہے، تو دوسری طرف شمال مشرق میں عراق کی طرف اور شمال مغرب میں فلسطین کی طرف بھی خشکی کے راستے سے ہمیشہ ان کا رخ رہا۔ بعد میں ملاحی مہارت بڑھنے پر وہ ہند اور چین تک تجارت کے لیے آنے جانے لگے۔

جہاں تک ایران کا تعلق ہے، اس کو سب سے پہلے معلوم ہوتا ہے کہ قبیلہ طے ہی سے سابقہ پڑا۔ چنانچہ اب یہ مسلمات سے سمجھا جاتا ہے کہ فارسی لفظ "تازی" اور اسی کا بگڑا ہوا چینی لفظ "تاشی"[1] (جس سے عرب مراد لیتے ہیں) اسی لفظ "طی" کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔

ان تارکانِ وطن کی تعداد ایرانی صوبۂ عراق میں اتنی زیادہ ہوگئی تھی کہ انھوں نے عہد نبویؐ سے صدیوں قبل حیرہ (کوفہ) میں ایک طاقتور سلطنت قایم کر لی تھی اور لخمی قبیلہ کے ان عرب حکمرانوں پر ماحول کا کچھ اتنا اثر پڑا کہ شام کی طرف جانے والے غسانیوں کے برخلاف انھوں نے خانہ بدوشی تک ترک کردی اور بستیوں میں بس کر عربی تہذیب کی عظیم الشان خدمت انجام دینے لگے۔

ایرانی شہنشاہوں نے مختلف مصلحتوں سے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ چنانچہ ایک طرف تو یہ عرب اور ایران (عراق) کے مابین حدِ فاصل اور حاجز مملکت (BUFFER - STATE) بنے اور خانہ بدوش بدویوں کی عراق میں لوٹ مار کی مہمیں خود یہ لوگ جھیلنے لگے[2] اور ایرانی امن میں ہوگئے، تو دوسری طرف ایرانی جو روزافزوں آرام طلب ہوتے جا رہے تھے، مفت کے عرب رضاکاروں سے اپنی فوج میں کثیر تعداد میں کام لینے لگے۔ اس سے عربوں میں جنگجوئی اور فوج آرائی کی روح نہ صرف تازہ رہی بلکہ صیقل پاتی اور فطرت میں رچتی گئی، تو ساتھ ہی ایرانی روز بروز جنگ سے ڈرنے لگے اور بزدل ہوتے گئے۔ ایرانی بیزنطینی جنگوں میں ایک سے زیادہ مرتبہ ان عربی فوجوں نے جو فیصلہ کن اور عظیم الشان حصہ لیا اور ایرانی حکومت کے لیے صرف اپنے بل بوتے پر جو وسیع فتوحات حاصل کیں، ان سے ہر کوئی واقف ہے، ان کے دُہرانے کی ضرورت

---

[1] اس کی قدامت اور وسعت کے لیے دیکھیے میرا مقالہ "عربوں کے تعلقات بیزنطینیوں سے"، مجلہ تحقیقات علمیہ جامعہ عثمانیہ سالنامہ سوم۔ مختصر یہ کہ سینٹ پاول کے زمانہ میں دمشق میں ایک عرب بادشاہ حارث حکمران تھا، تو حلب جیسے شمالی علاقوں تک میں عرب کی راجدھانیاں قایم ہو چکی تھیں۔

[2] بریٹ شنائڈر کا انگریزی رسالہ "عربوں کے متعلق چینیوں کی معلومات" (ص۵)

[3] تنبیہ مسعودی ص ۱۸۶

نہیں۔ یہ امر البتہ نمایاں کیے جانے کے قابل ہے کہ بیزنطینی قیصروں نے ضجعمیوں اور پھر غسانیوں سے جنگی معاہدہ کرلیا اور ایرانی کسراؤں کے لیے بھی ناگزیر تھا کہ اسی کے مماثل طاقتور عربوں کو اپنا حلیف بنائے رکھیں۔

عرب کے جانوروں تک کی وفاداری ضرب المثل ہے۔ پھر حیرہ کے حکمرانوں پر کسرایانِ ایران کا اعتماد کیوں نہ بے پایاں ہوتا۔ کسی اور ملک میں یہ نظیر نہ ملے گی، جیسی یہاں ملتی ہے کہ کسرائے ایران اپنے ولی عہد کو اپنے جونیئر حلیف بلکہ ماتحت حکمران حیرہ کے ہاں بھیج دے، تاکہ وہیں اس کی تعلیم و تربیت ہو۔ بعد میں بدوی روایات کے حامل اس شہزادے نے حکمران بن کر دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ حیرہ کا عربی ماحول مدائن کے ایرانی ماحول سے کہیں زیادہ مفید و کردار ساز تھا۔

حیرہ والوں کی خدمات خود عرب کے لیے کچھ کم اہم نہ تھیں۔ عربی شعراء اور تاجر ہمیشہ ان کے دربار میں بھرے رہتے تھے اور غیر محسوس طور سے تاثر و تاثیر کرتے چلے جاتے تھے اور غالباً صحرا نشینوں سے اس مسلسل تعلق ہی نے باوجود عیش و ترفہ کے لخمی حکمرانوں میں بہت سی اچھی بدوی صفتیں مثلاً بات کا پاس اور آن کے لیے جان تک کی پروا نہ کرنا، بہت کچھ برقرار رکھیں۔

عربی رضاکاروں کی وفاداری اور اطاعت شعاری نے رفتہ رفتہ دربار مدائن کو یہ بھلا دیا کہ حیرہ کمزور اور جونیئر حلیف سہی لیکن ماتحت اور غلام نہ تھا۔ مجوسی و مزدکی روایات نے عصمت و ناموس کا تصور ہی ایرانی دربار سے مٹا دیا تھا[1]۔ اسی لیے انھوں نے اس میں کوئی برائی ہی نہیں سمجھی، کہ انہی اصول کا اطلاق عرب حکمران کی بہو بیٹیاں پر کیا جائے۔ اس کے نتیجے سے سب واقف ہیں کہ حکمرانِ حیرہ کو مدائن طلب کیا گیا اور اس وفاشعار نے جانتے بوجھتے اس کی تعمیل کی، تو تحفظ عصمت کے جرم میں اس کا سر قلم کیا گیا اور نشۂ غرور میں چور شہنشاہ نے حاجز مملکت کو بھی فنا کر دینے کا حکم دیا۔ چنانچہ حیرہ میں ایرانی افسر آ دھمکے اور گو برائے نام ایاس بن قبیصہ نامی ایک عرب کو بھی وہاں کے عربوں کا سردار بنایا گیا، لیکن سلطنت حیرہ کا ایران سے الحاق کر کے ایک معمولی صوبہ بنا دیا گیا۔ یہ قصہ یہیں ختم نہ ہوا، بلکہ حکمرانِ حیرہ نے اپنے پاس کا بعض امانتی مال اصل مالکوں کو پہنچانے کے لیے بعض بدوی قبائل کے سرداروں کے سپرد کیا، تو شہنشاہی احکام اس کی فوری حوالگی کے لیے پہنچے اور انکار پر سزا دہی اور عربوں کی بالکلیہ تباہی کے لیے ایک عظیم الشان ایرانی لشکر روانہ کیا گیا مگر اب کی دفعہ قدرت نے ایران کو ایک تنبیہ کرنی چاہی اور ذی قار کی جھیل پر ان کی فوج کو جان پر کھیلے ہوئے بدوؤں نے کاٹ کر رکھ دیا مگر دربار ایران نے بجائے سبق لینے اور اپنی اصلاح کرنے کے عربوں پر مزید ستم آرائی شروع کر دی اور انھیں روز افزوں اپنا دشمن بنانا شروع کیا (اب جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا مدنی دورِ زندگی شروع ہو چکا تھا) اور خلافتِ صدیقی کے آغاز پر اسی ایرانی سرحد کے ستم رسیدہ مثنّیٰ شیبانی کا ایران پر حملے کے لیے اپنی رضاکارانہ خدمات کا پیش کرنا زیادہ تر ایران کی اسی عرب کش سیاست کا ردِّ عمل تھا۔ اس واقعہ سے چند ہی سال قبل یمنیوں کی دعوت اور تعاون سے ایرانیوں نے حبشیوں کو نکال کر یمن پر قبضہ کر لیا تھا اور وہرز کی فوجی گورنری کے بعد لایق باذان وہاں گورنر بنا۔ لیکن پایۂ تخت ایران میں کچھ ایسی تیزی سے شاہ گردی ہو رہی تھی کہ مٹھی بھر ایرانی فوج کے لیے کسی مزید کمک کی غیر موجودگی میں یمن پر قبضہ رکھنا بڑا دشوار ہو گیا تھا۔

---

[1] مزدک نے ملکۂ ایران کے متعلق بھرے دربار میں شہنشاہ سے جس بے باکانہ بے حمیتی کا اظہار کیا تھا، اس سے عربی خوان بے خبر نہ تھے۔

حیرہ اور یمن کے علاوہ مشرقی اور جنوب مشرقی عرب کے ساحلی علاقوں یعنی عمان اور الحسا میں بھی (جسے اس زمانہ میں بحرین کہا جاتا تھا) ایرانی اثرات مستحکم ہو گئے تھے۔ عمان میں جلندی بن المستکبر کا خاندان کسرٰی ایران کی طرف سے حکمران نامزد ہوا تھا، جس کے کچھ حالات محمد بن حبیب (المتوفی ۲۴۵ھ) نے اپنی مشہور کتاب المحبر (مخطوطہ دائرۃ المعارف حیدر آباد میں لکھے ہیں) اور بعد میں اسی جلندی کے بیٹوں جیفر اور عبد سے جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے تخاطب فرمایا تھا۔ عمان وسیع ملک ہے۔ وہاں کے ایک اور عرب سردار ہوذہ بن علی کو کسرٰی نے ایک جواہر نگار ٹوپی عطا کی تھی، اس لیے اس کا لقب ذوالتاج یا صاحب التاج مشہور ہو گیا تھا (دیکھیے اشتقاق ابن درید ص ۲۰۹، عقد الفرید ابن عبد ربہ جلد ۲ ص ۹۷) الحسا میں کسی عرب ریاست کا بظاہر پتا نہیں چلتا اور وہاں کے صدر مقام ہجر میں ایرانی فوجی گورنر (مرزبان) رہا کرتا تھا۔ بعض غیر موروثی عرب افسر بھی تھے۔

عرب مولفوں کے ہاں اس قسم کے تذکرے کثرت سے ملتے ہیں، فلاں عربی شیخ نے فلاں بادشاہ (کسرٰی، قیصر، نجاشی وغیرہ) کے ہاں باریابی حاصل کی۔ ابن عبد ربہ نے اس کا ایک مستقل باب (الوفادات) ہی قایم کیا ہے۔ ایسے ہی ایک شخص سے خوشنودی کے سلسلہ میں کہتے ہیں کہ شیخ کی خواہش پر کسرٰی نے ایک مہندس (انجینئر) بھیجا جس نے وادی وج میں ایک فصیل دار قلعہ تعمیر کیا، جسے طائف کہنے لگے (کتاب الاغانی جلد ۱۲ ص ۴۸-۴۹) اس کے استحکام کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ فتح مکہ و حنین کے بعد طائف کو اسلامی فوجوں نے آ گھیرا تھا اور باوجود منجنیق اور دبابوں کے استعمال کے محاصرہ ختم ہوتا نظر نہ آیا اور جناب رسالتمآب صلعم نے مزید جانی نقصان نامناسب سمجھ کر محاصرہ اٹھا لیا تھا۔

ابتدائے اسلام

ایران آتش پرست تھا۔ انتہائی جنسی اباحیت رکی بھی تو حقیقی بہنوں اور صلبی بیٹیوں تک کو وہاں ازدواجی اغراض کے لیے محرمات میں نہیں شامل کیا جاتا تھا۔ غالباً اسی قسم کے معاملات ہوں گے، جس نے مشرک عیسائیوں کو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں مجوسیوں پر قابل ترجیح بنا دیا تھا۔ قرآن مجید کی سورہ روم بھی انھی جذبات کی ترجمان ہے۔

ابن ہشام (ص ۲۸۰) وغیرہ نے روایت کی ہے کہ ابتدائے اسلام میں جب آنحضرت صلعم مختلف قبائل کو اسلام کی دعوت اور اسلام کی ملکی ترغیب دیتے تو علاوہ اخروی روحانی ثواب کے وعدے کے یہ پیش گوئی بھی فرماتے کہ کسرٰی و قیصر کی دولت تمہارے قدموں پر نچھاور ہو گی۔ جنگ خندق میں سنگ مرمر کی چٹانوں کو توڑتے وقت چنگاریاں اڑنے پر اسی پیش گوئی کا اعادہ فرمایا گیا تھا۔ (دیکھو طبری وغیرہ)

میں نے ایک مستقل مضمون میں اس پر تفصیل سے بحث کی ہے[1] کہ ۶ھ کی صلح حدیبیہ کو قرآن مجید نے "فتح مبین" اور "نصر عزیز" کیوں کہا ہے اور کس لیے اسے اسلام اور مسلمانوں کی سیاسی کامیابیوں کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے (مشہور عام خیال تبلیغ کی سہولت کچھ دل کو نہیں لگتا)، یہاں اس کا دہرانا غیر ضروری ہے۔ بہرحال اس صلح سے جہاں مسلمانوں کے ہاتھ کھل گئے اور وہ خیبر کے نمو پذیر خطرے کا دو ہی تین ماہ میں استیصال کرنے کے قابل ہو گئے، وہیں انھیں نینوا میں ایرانیوں کی بیزنطینیوں (رومیوں) کے ہاتھوں عہد آفرین شکست کے سلسلہ میں بین الممالک صورت حال سے فائدہ اٹھانے کا موقع مل گیا۔ (نینوا کی لڑائی شعبان ۶ھ میں ہوئی، اس کے بعد ہی

---

[1] دیکھیے رسالہ سیاحت حیدر آباد دکن اپریل ۱۹۴۲ء

صلح حدیبیہ ہوئی)

بلاذری (فتوح ص ۹۰) اور ابن الاثیر (کامل ۲/۱۲۵) نے بیان کیا ہے کہ ایرانی مقبوضہ بحرین کے ایک عربی النسل افسر منذر بن ساوی کو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلا خط ۶ھ ہی میں روانہ کیا تھا۔ غالباً کسرائے ایران کا خط بھی اسی نامہ بر کے ذریعہ سے بھیجا گیا ہوگا، جس نے بحرین کے حاکم سے خواہش کی کہ اسے کسریٰ کے پاس مدائن بھیج دے۔

یہاں اس کی غالباً ضرورت نہیں کہ سماوہ، بحرین، عمان، یمن وغیرہ عرب کے جملہ ایرانی مقبوضات سے عہد نبوی میں جو اسلامی تعلقات رہے، ان کی پوری تفصیل اور ان کا ارتقاء بتایا جائے، ورنہ ان علاقوں کے ایرانی افسروں یا عرب شیوخ کے نام لکھے ہوئے کئی درجن نامہ ہائے نبویؐ تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں۔ ایک منذرؓ ہی کے نام کے نو خط ملتے ہیں، جن میں بحرین کی سیاسیات کی پوری تاریخ محفوظ ہے۔ ان کے متن کے لیے میری حقیر تالیف "الوثائق السیاسیة" دیکھی جاسکتی ہے (جس کی طباعت کے بعد اوائل ۱۳۶۱ھ میں کتب خانہ خدا بخش مرحوم پٹنہ میں قبیلۂ عبد القیس سے کیا ہوا اور ایک اور معاہدہ کتاب وسیلة المتعبدین میں دستیاب ہوا ہے) یہاں صرف شہنشاہ ایران سے خط و کتابت پر کچھ بحث کی جائے گی۔ جس میں متعدد گتھیاں سلجھانی ہیں۔

تمام اسلامی مورخوں، محدثوں اور دیگر مولفوں نے متفقہ طور سے بیان کیا ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد ہی جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ہمسایہ ممالک کے حکمرانوں کے نام اسلام کے تبلیغی خطوط بھیجے تو ان میں سے ایک کسرائے ایران کے نام بھی تھا، اس کا متن جس میں کچھ لفظی اختلافات پائے جاتے ہیں، یہ ہے:

۱۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔	۱۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔
۲۔ من محمد رسول اللہ الی کسری عظیم فارس۔	۲۔ محمد رسول اللہ کی طرف سے سردار ایران کسریٰ کے نام۔
۳۔ سلامٌ علی من اتبع الھدیٰ و اٰمن باللہ ورسولہ۔	۳۔ ہدایت پر چلنے اور خدا و رسول پر ایمان لانے والے کے لیے سلامتی ہو۔
۴۔ وادعوك بدعاية اللہ فانی انا رسول اللہ الی الناس کافة۔	۴۔ میں تجھے خدا کا بلاوا دیتا ہوں کیونکہ مجھے خدا نے تمام انسانوں کی طرف بھیجا ہے۔
۵۔ لانذر من کان حیًّا و یحق القول علی الکافرین۔	۵۔ تاکہ میں ہر زندہ شخص کو ڈراؤں، کافروں کے متعلق خدا کی بات پوری ہو کر رہے گی۔
۶۔ فاسلم تسلم۔	۶۔ اسلام لا سلامت رہے گا۔
۷۔ فان ابیت فان اثم المجوس علیك۔	۷۔ اگر تو انکار کرے تو تمام مجوسیوں کا وبال تجھی پر پڑے گا۔

یہ متن تاریخ طبری ص ۱۵۷۱ و ص ۱۵۷۲ (دو روایتیں)، صبح الاعشیٰ قلقشندی جلد ۶ ص ۲۹۶، کتاب الصناعتین لابی

ہلال العسکری، نیز جلد ۶ ص ۸، ۳۰، اعلام السائلین عن کتب سید المرسلین لابن طولون مکتوب ۳، المواہب اللدنیہ للقسطلانی جلد نمبر ۱ ص ۲۹۱، تاریخ الیعقوبی جلد ۲ ص ۳۰، نصب الرایۃ الاحادیث الہدایۃ للزیلعی مکتوب نمبر ۹، مفید العلوم و مبید الہموم، للقزوینی مکتوب نمبر ۲، دلائل النبوۃ لابی نعیم جلد ۲ ص ۱۲۲، المنتقی لابی نعیم ورق ۳۵/ب (مخطوطہ حیدر آباد دکن) لفریدون بک جلد ۱ ص ۳۱، وسیلۃ المتعبدین لعمر الموصلی جلد ۸ ورق ۲۱/ب (مخطوطہ بانکی پور) میں مکمل ملتا ہے اور طبقات ابن سعد، اموال ابی عبید، صحیح البخاری، صحیح مسلم، مسند ابن حنبل وغیرہ میں جستہ جستہ ملتا ہے۔ اس پر کاتانی نے اپنی اطالوی تاریخ اسلام میں اور اسپرنگر نے اپنی جرمن کتاب سوانح و تعلیمات محمدی میں بحث کی ہے۔ ادارہ معارف اسلامیہ لاہور کے اجلاس دوم کی روداد میں میرا بھی ایک انگریزی مضمون اس خط کے متعلق ملیگا۔

جیسا کہ ابھی بیان ہوا، یہ متن مختلف تاریخوں نے لفظی اختلاف کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اہم تریہ ہے: بعض روایتوں میں "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" حذف ہوگیا ہے، اس کی کوئی اہمیت نہیں، کیونکہ حذف عبارت کا عام رواج رہا ہے۔

قلقشندی نے ابو ہلال عسکری سے جو متن نقل کیا ہے، صرف اسی ایک روایت میں "کسریٰ ابرویز عظیم فارس" کے الفاظ ہیں اور باقی کسی نے بھی پرویز کا نام نہیں لیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پرویز کا نام لبعد کا قیاسی اضافہ ہے، واللہ اعلم۔

ف ۳ میں طبری کی ایک روایت میں واشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لاشریك له وان محمدا عبدہٗ ورسولہٗ کے الفاظ زاید ہیں، جو اصل فقرے کی صرف شرح معلوم ہوتی ہے۔

ف ۴ میں دعاء اللہ اور دعایۃ اللہ کی روایتیں عام ہیں۔ رسالات نبویہ مولفہ عبدالمنعم خاں ٹونکی نے دعاء الاسلام کہیں سے نقل کیا ہے۔ مطلب سب کا ایک ہی ہے۔

ف ۵ میں قرآنی آیت کے لحاظ سے بعض روایتوں میں "لینذر" بھی مروی ہے، جو عربی کے لحاظ سے ذرا تکلف سے ٹھیک ہوگا۔

ف ۶ میں "فان" کی جگہ "وان" اور اسی طرح "ابیت" کی جگہ "تولیت" نیز "اثم المجوس علیك" کی جگہ "علیك اثم المجوس" وغیرہ فرق بھی ملتے ہیں، جو روایت بالمعنیٰ کا نتیجہ ہیں۔ ان سے مطلب پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

غرض یہ خط عبداللہ بن حذافہ السہمی بحرین کے حاکم کے پاس لے گئے تھے، یہ ٹھیک طور سے نہیں معلوم ہوتا کہ آیا عبداللہ بن حذافہ ہی مدائن گئے تھے یا حاکم بحرین نے اپنے کسی آدمی کے ہاتھ اسے پایۂ تخت روانہ کیا تھا۔ بہرحال تمام اسلامی مولف بیان کرتے ہیں کہ کسریٰ (خسرو پرویز) نے طرز تخاطب دیکھتے ہی پورا خط پڑھے بغیر چاک کر دیا اور نامہ بر کو سامنے سے نکلوا دیا۔ اس کے علاوہ یہ قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ کسریٰ نے یمن کے گورنر باذان کو حکم بھیجا کہ دو آدمی مدینہ روانہ کرے اور نبی عربی کو برضامندی ورنہ گرفتار کرکے مدائن روانہ کرے۔ جب یہ لوگ مدینہ آئے تو جناب رسالت مآب صلعم نے ان سے کہا کہ آج رات میرے رب نے تمہارے رب کو قتل کر دیا۔ اس پر وہ یمن چلے آئے اور جلدی ہی مدائن سے کسریٰ شیرویہ نے سرکاری اطلاع بھیجی کہ اس نے مصلحت عامہ کے تحت اپنے باپ کو قتل کر دیا اور خود تخت نشین ہوگیا ہے اور کہتے ہیں کہ شیرویہ کی پدرکشی کی تاریخ وہی تھی، جو حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی اور اس معجزہ کو دیکھ کر باذان اور بہت سے یمنی مسلمان ہو گئے۔

یہ واقعہ سیرت ابن ہشام (ص ۹۴۶) پر مذکور ہے جو بظاہر ابن اسحاق کا بیان نہیں ہے بلکہ ابن ہشام نے زہری کی

روایت خود اضافہ کی ہے۔ سیرۃ ابن ہشام ص ۹۷۱ میں جہاں بادشاہوں کے نام خطوط کا ذکر ہے وہاں کسریٰ کے سلسلہ میں یہ قصہ بیان نہیں ہوا ہے۔ تاریخ طبری (ص ۲، ۱۵۷۱ تا ۱۵۷۴) میں جہاں اس سفارت کا ذکر ابن اسحاق کے حوالہ سے نقل ہوا ہے، وہیں زہری کی روایت صرف اتنی بیان ہوئی ہے کہ کسریٰ کے نامہ مبارک کو پارہ پارہ کر ڈالنے کی اطلاع ملی تو آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ خدا اس کے ملک کو بھی پارہ پارہ کر دے۔ اور طبری نے شیرویہ کی پدرکُشی کا قصہ زہری کے اس قطع کلام کے بعد یزید بن حبیب کی روایت کی بناء پر نقل کیا ہے اور وہاں زہری کا اس سے تعلق نہیں ہے۔

اس اختلاف کو ہم کوئی خاص اہمیت عام حالتوں میں نہیں دیتے لیکن طبری نے جہاں یہ قصہ ۶ھ کے حالات میں حدیبیہ کے بعد بیان کیا ہے، وہیں ایران قدیم کے حالات میں (ص ۱۰۰۹ پر) یہ جملہ بھی عکرمہ کے حوالہ سے ایک غیر مربوط قصہ کے آخر میں لکھا ہے:

فاهلك الله كسرىٰ وجاء الخبر الى	چنانچہ خدا نے کسریٰ کو ہلاک کر دیا اور اس کی اطلاع
رسول الله (صلى الله عليه وسلم) يوم	جناب رسالت مآبؐ کو حدیبیہ کے دن پہنچی جس سے
الحديبية ففرح و من معه -	آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو خوشی ہوئی۔

جب خسرو پرویز کے مرنے کی اطلاع حدیبیہ کے دن آچکی تھی، تو پھر بعد میں پرویز کے نام خط لکھنا، اور پدرکُشی کی اطلاع بطور معجزہ وغیرہ سب بے بنیاد قصے بن جاتے ہیں۔ کثیر نویسی کی وجہ سے طبری کے ہاں بلا تنقید متضاد روایات کا آجانا اور روایات میں بھی بے احتیاطی سے قطع و برید ہو جانا ایک معروف واقعہ ہے جس سے ہر وہ شخص واقف ہے، جس نے طبری کا غور سے مطالعہ کیا ہے۔

اسی بنا پر ابونعیم کی دلائل النبوۃ (جلد ۲ ص ۱۲۴) کی یہ روایت خاص توجہ کی مستحق ہے کہ:

"رومیوں کے ہاتھوں ایرانیوں کو اسی دن شکست ہوئی تھی، جس دن حدیبیہ کی صلح ہوئی اور جب اس کی اطلاع پہنچی تو جناب رسالتمآب صلعم کو بڑی خوشی ہوئی (کہ قرآن مجید کے سورۂ روم کی کئی سال قبل کی پیشگوئی پوری ہوگئی)۔"

نینوہ کی لڑائی شعبان ۶ھ (دسمبر ۶۲۷ء) میں ہوئی تھی، جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا۔ عام طور سے اسلامی مورخ یہ بیان کرتے ہیں کہ مہم حدیبیہ کے لیے مسلمان مدینہ سے ذی قعدہ ۶ھ میں نکلے لیکن امام ابویوسف نے کتاب الخراج (ص ۱۲۸) میں روایت بیان کی ہے کہ جناب رسالت مآب صلعم حدیبیہ کے لیے رمضان میں نکلے۔ تاریخ ابن کثیر (البدایہ والنہایہ جلد ۴ ص ۱۶۴) میں حدیبیہ کے ذی قعدہ میں پیش آنے کا ذکر کر کے اس بات پر تعجب ظاہر کیا گیا ہے کہ عروہ کے بیان کے مطابق صلح حدیبیہ ماہِ شوال میں منعقد ہوئی۔

آنحضرت صلعم کے ہمعصر زمانہ کی تاریخیں نہ تو بیزنطینیوں کے ہاں محفوظ رہیں، نہ ایرانیوں کے ہاں اور نہ حبشیوں کے ہاں۔ ان حالات میں ایک واحد استثناء خاص توجہ کا محتاج ہے، وہ یہ کہ قیصر ہرقل اور کسریٰ پرویز میں جب آخری فیصلہ کن لڑائی ہوئی، تو قیصر میدان جنگ سے وقتاً فوقتاً اپنے بیٹے کو خط روانہ کرتا رہا۔ اتفاق سے یہ اب تک محفوظ ہیں اور انہی میں سے ایک میں قیصر نے اپنے بیٹے کو لکھا ہے کہ "خبر آئی ہے کہ خسرو پرویز کو اس کے بیٹے شیرویہ نے ۲۷ فروری ۶۲۸ء کو قتل کر ڈالا ہے"[1] (جو وسط رمضان ۶ھ کے

---

[1] قیصر ہرقل کی جنگوں کے متعلق بھی بڑی پیچیدگیاں ہیں۔ اس موضوع پر سب سے مستند کتاب جرمن زبان میں (باقی بر صفحہ آئندہ)

مطابق ہے) قرآنی شہادت قیصر کے اس خط کی صحت کی تائید کرتی ہے۔ شعبان میں نینوہ میں فیصلہ کن شکست کھانے کے بعد وسط رمضان میں اس کا مارا جانا کوئی تعجب کا حامل نہیں اور بظاہر قیصر کو اس واقعہ کے بیان کرنے میں عمداً جھوٹ پر آمادہ کرنے کی بھی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ اسی وجہ سے واقدی کا یہ بیان کرنا کہ:

"شیرویہ نے اپنے باپ کسریٰ کو منگل کی رات ۱۰ جمادی الاولیٰ ۷ھ کو قتل کیا جب کہ چھ گھڑی رات گزر چکی تھی" (تاریخ طبری ص ۴، ۱۵)

اپنے اندر مقابلتاً کم کشش رکھتا ہے۔

غرض اس وقت جو گتھیاں نظر آتی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:

واقعہ	طبری فی روایہ	ابو نعیم	ابو یوسف	واقدی	ابن کثیر فی روایہ	ہرقل کا خط یونانی تاریخ میں	عام مورخین
نینوا میں ایرانی شکست	.	.	.	.	یوم الحدیبیہ	.	شعبان ۶ھ
کسریٰ پرویز کا قتل بیٹے کے ہاتھ	یوم الحدیبیہ	.	.	۱۰ جمادی الاولیٰ ۷ھ	.	وسط رمضان ۶ھ	
اس قتل کی اطلاع جناب رسالتمآبؐ کو پہنچنا	.	یوم الحدیبیہ	.	.	.	.	حدیبیہ کے کئی ماہ بعد تقریباً ربیع الثانی یا جمادی الاولیٰ میں
حدیبیہ کے لیے روانگی	.	.	رمضان ۶ھ	.	.	.	ذی قعدہ ۶ھ
صلح حدیبیہ	.	.	.	.	شوال ۶ھ	.	تقریباً اواخر ذی قعدہ یا اوائل ذی حجہ ۶ھ

ان میں ممکن ہو تو باہم تطابق دینے ورنہ کسی ایک کے بیان کو ترجیح دینے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس طرف توجہ کرنے سے قبل دو اہم امور بطور تمہید ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے:

۱۔ واقدی اور ان کے شاگرد ابن سعد نے سیرۃ نبویہ کے واقعات کو کبھی تو ہجری سنہ سے بیان کیا ہے اور کبھی ہجرت کے وقت سے اور سب جانتے ہیں کہ ہجرت ۱۲ ربیع الاوّل کو ہوئی اور سنہ ہجری اس سے کوئی دو ماہ اٹھارہ دن قبل یکم محرم سے شمار کیا جاتا ہے۔ اسی لیے مثلاً جنگ بدر کا ذکر کرنا ہو تو ماہ نہم (رمضان) ۲ھ یا ہجرت سے ایک سال چھ ماہ بعد کہنا پڑے گا۔ واقدی نے کسی ایک طریقہ شمار کا چونکہ شروع سے آخر تک لزوم نہیں رکھا ہے، اسی لیے من الہجرۃ (ہجرت کے وقت سے) اور للہجرۃ (ہجری سنہ سے) کہنے سے بآسانی خلط ملط ہو سکتا ہے۔ مزید برآں اگر راوی کی صرف روایت پہنچی ہو اور اس سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) گیرلانڈ (GERLAND) کی ہے جس کا نام "قیصر ہرقل کی ایرانی مہمیں" (DIE-PERSISCKE FELDZUGE DES KAISERS HERAKLIUS) ہے۔ یہ واقعہ اس کتاب میں یونانی مورخ تیوفان کے حوالے سے نقل ہوا ہے۔

بالمشافہ جرح اور تعین کا موقع نہ ہو اور راوی نے ہجری سنہ مراد لیا ہو اور واقدی نے وقت ہجرت سے مدت مراد ہونی سمجھی ہو، تو نادانستہ تین ماہ کا بڑی آسانی سے فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ خاص کر اس لیے کہ واقدی نے مہینے کا نام لینے کے لیے اکثر مہینوں کی گنتی دی ہے کہ ہجرت کے اٹھارہ یا بیس مہینوں بعد، وغیرہ۔

۲۔ جناب رسالت مآب صلعم نے ذی حجہ ۱۰ھ میں سال کبیسہ کو عربی مہینوں کے لیے ہمیشہ کے واسطے منسوخ فرما دیا اور خطبہ حجۃ الوداع میں اس کی قرآنی ممانعت (انما النسئ زیادۃ فی الکفر الآیۃ) کو دہرانے کے بعد ارشاد فرمایا تھا:

وان الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق اللہ السمٰوٰت والارض۔ — زمانہ چکر کھا کر پھر وہی شکل اختیار کر چکا ہے، جیسا خلقتِ آسمان و زمین کے وقت تھا۔

(سیرت ابن ہشام ص ۹۶۸، تاریخ طبری ص ۱۷۵۴، وغیرہ)

اور متفقہ طور سے اس کی تشریح یہ کی جاتی ہے کہ اس وقت سنہ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقع پر قمری اور کبیسہ دونوں لحاظ سے ذی حجہ باہم جمع ہو گئے تھے۔ قمری اور کبیسہ مہینوں کے متعلق عربی مورخوں نے جو بیانات چھوڑے ہیں، ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر تیسرے سال قبیلہ بنی فقیم کا سردار (جس کا لقب قلمس ہوا کرتا تھا) حج کے موقع پر منیٰ میں ایک خاص رسم کی انجام دہی کے ذریعہ سے اعلان کرتا تھا کہ اب جو ذی حجہ چل رہا ہے، اس کے بعد نیا چاند نظر آئے، تو وہ محرم الحرام کا نہ ہوگا (بلکہ ایک گمنام اور محترم مہینا ہوگا) اور اس کے بعد کا نیا چاند محرم الحرام کا ہوگا۔ (جدید علم ہیئت بھی یہی کہتا ہے کہ قمری سال میں شمسی سال سے دس دن کم ہوتے ہیں اور ہر تیسرے سال ایک مہینا کا فرق پڑ جاتا ہے) اس بیان کے بموجب اگر سنہ ۱۰ھ میں دونوں قسم کے مہینے یکجا ہو گئے تھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ:

سنہ ۶		سنہ ۷		سنہ ۸		سنہ ۹		سنہ ۱۰	
ہجری مدنی	مکی کبیسہ	ہجری مدنی	کبیسہ مکی	ہجری مدنی	کبیسہ مکی	ہجری مدنی	کبیسہ مکی	ہجری مدنی	کبیسہ مکی
محرم	ربیع ۱	محرم	صفر	محرم	صفر	محرم	صفر	محرم	محرم
صفر	ربیع ۲	صفر	ربیع ۱	صفر	ربیع ۱	صفر	ربیع ۱	صفر	صفر
ربیع ۱	جمادی ۱	ربیع ۱	ربیع ۲	ربیع ۱	ربیع ۲	ربیع ۱	ربیع ۲	ربیع ۱	ربیع ۱
ربیع ۲	جمادی ۲	ربیع ۲	جمادی ۱	ربیع ۲	جمادی ۱	ربیع ۲	جمادی ۱	ربیع ۲	ربیع ۲
جمادی ۱	رجب	جمادی ۱	جمادی ۲	جمادی ۱	جمادی ۲	جمادی ۱	جمادی ۲	جمادی ۱	جمادی ۱
جمادی ۲	شعبان	جمادی ۲	رجب	جمادی ۲	رجب	جمادی ۲	رجب	جمادی ۲	جمادی ۲
رجب	رمضان	رجب	شعبان	رجب	شعبان	رجب	شعبان	رجب	رجب
شعبان	شوال	شعبان	رمضان	شعبان	رمضان	شعبان	رمضان	شعبان	شعبان

رمضان	ذی قعدہ	رمضان	شوال	رمضان	شوال	رمضان	شوال	رمضان	رمضان
شوال	ذی حجہ	شوال	ذی قعدہ	شوال	ذی قعدہ	شوال	ذی قعدہ	شوال	شوال
ذی قعدہ		ذی قعدہ	ذی حجہ	ذی قعدہ	ذی حجہ	ذی قعدہ	ذی حجہ	ذی قعدہ	ذی قعدہ
ذی حجہ	محرم	ذی حجہ	محرم	ذی حجہ	محرم	ذی حجہ		ذی حجہ	ذی حجہ

اس طرح ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ذی قعدہ سنہ ٦ مکی میں جب صلح حدیبیہ ہُوئی، تو رمضان سنہ ٦ ہجری چل رہا تھا اور اس طرح عروہ کا یہ کہنا کہ مہم حدیبیہ شوال میں ختم ہوئی یا امام ابو یوسف کا کہنا کہ حدیبیہ کے لیے مسلمان رمضان میں نکلے تھے اور عام مورخین کا اس واقعہ کو ذی قعدہ میں قرار دینا، ان میں باہم کوئی تضاد نہیں۔ چونکہ اُس وقت تک سال کبیسہ منسوخ نہیں ہُوا تھا اور مکہ پر قریش ہی قابض تھے، اس لیے ان کے حج کا موسم ان کے ذی قعدہ سے شروع ہوا تھا۔ حالانکہ خالص قمری حساب سے ابھی رمضان ہی کا مہینہ چل رہا تھا۔

سنہ ہجری اور وقت ہجرت کے فرق کے تین مہینے اور قمری اور کبیسہ سالوں کے سنہ ٦ھ میں فرق کے تین مہینے جملہ چھ مہینوں کا فرق، یہ بڑی آسانی سے واقدی کی اس روایت کی توجیہہ کر دیتا ہے کہ پرویز کا قتل ذی قعدہ (مکی) کی جگہ جمادی الاولیٰ میں کیوں بیان کیا گیا۔ دوسرے الفاظ میں راوی نے کہا ہوگا کہ سنہ ہجرت اکہتر دیں مہینے میں اور واقدی نے وقت ہجرت (ربیع الاول) سے حساب کیا، اور نہ تو دو کبیسہ سالوں کا خیال رکھا اور نہ ہجرت اور سنہ ہجری کے فرق کا لحاظ کیا اور سنہ ہجرت کے اکہترویں مہینا یعنی ذی قعدہ سنہ ٦ مکی کی جگہ جمادی الاولیٰ سنہ ٦ھ بیان کر دیا۔

واقدی نے یہ نہیں بیان کیا ہے کہ خسرو پرویز کے اپنے بیٹے کے ہاتھوں مارے جانے کی تاریخ انھیں کس ماخذ سے معلوم ہُوئی۔ اگر اس تاریخ کے متعلق یونانی مورخ کا بیان (خود قیصر ہرقل کے خط کی بنا پر) صحیح مانا جائے تو یہ واقعہ ۲۷ فروری ۶۲۸ء (مطابق وسط رمضان سنہ ٦ھ م وسط ذی قعدہ سنہ ٦ھ مکی) کو ہوا ہوگا اور یہ روایت قطعاً رد کر دینی پڑے گی کہ کسریٰ کے حکم سے جب یمن سے دو ایرانی افسر مدینہ آئے تو جناب رسالت مآب صلعم نے ان سے فرمایا کہ "آج رات میرے رب نے تمہارے رب کو قتل کر دیا" اور یہ کہ اس پیش گوئی یا غیب گوئی کے صحیح ثابت ہونے پر گورنر یمن مع حوالی موالی مسلمان ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اپنی عظمت کی برقراری کے لیے ایسے کسی معجزہ کی محتاج نہیں، خاص کر جب کہ اس معجزہ کا حال کچھ بہت زیادہ مستند ذرائع سے بھی معلوم نہیں ہوتا ہے اور اس کے متعلق خود عرب مولف متضاد باتیں بیان کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر واقدی کی روایت کہ یہ قتل ۱۰ جمادی الاولیٰ کو ہوا، صحیح بھی مانی جائے تو متعدد علمی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور پرویز کے قتل کی جو تاریخ ایرانی اور رومی ذرائع سے متعین ہے، اسے نظر انداز کرنا آسان نہیں ہے۔

اسی لیے طبری کی روایت کہ کسریٰ کے قتل کی اطلاع حدیبیہ کے دن آئی، اصل میں اس روایت کی بگڑی ہُوئی شکل ہے، جو ابو نعیم نے بیان کی ہے کہ نینوا کی شکست کی خبر[1] حدیبیہ کے دن آئی اور اس میں کوئی امر مانع نہیں معلوم ہوتا کیونکہ یہ حدیبیہ سے مہینا بھر پہلے کا واقعہ تھا

[1] گو ابو نعیم کے ظاہری الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نینوا کی شکست ہی حدیبیہ کے دن ہُوئی۔

اور اس عرصہ میں ایران کی خبر اس زمانہ میں مکہ تک آسکتی تھی۔

مجھے اپنے ان اخذ کردہ نتائج پر اصرار نہیں ہے اور اگر کوئی اہل علم ان کی اصلاح کر سکیں اور گتھیوں کو سلجھا سکیں تو سیرۃ نبویہ کی ایک الجھن رفع ہو سکے گی واللہ الھادی الی الصواب وھو الموفق والیہ المآب۔

تتمہ جیسا کہ عرض کیا گیا جناب رسالت مآب صلعم نے "کسریٰ عظیم الفرس" کے نام خط روانہ فرمایا تھا، ابو ہلال عسکری کی روایت کہ خط میں "کسریٰ ابرویز" لکھا ہوا تھا، ممکن ہے کہ صحیح ہو اور باوجود پرویز کے قتل ہو چکنے کے اس کی اطلاع اس وقت تک مدینہ منورہ نہ آئی ہو لیکن پرویز کے قتل کے بعد مداین میں جو شاہ گردی شروع ہوئی، اس کے باعث یہ معلوم نہیں کہ وہ نامۂ مبارک در اصل کس نے وصول کیا بہرحال ایران کی پریشان صورت حال کے باعث جناب رسالت مآب صلعم نے براہِ راست ایرانی مقبوضات عرب کے افسروں سے مخاطبت شروع فرمائی۔ چونکہ ان مٹھی بھر ایرانیوں کو اب مداین سے کسی کمک اور مدد کی توقع نہ رہی تھی، جیسا کہ طبری نے (تاریخ ص ۱۹۹۰ میں) بیان کیا ہے کہ کم از کم یمن میں ایک وطنیت پسند تحریک زور و شور سے اٹھ چکی تھی کہ مداخلت کنندہ ایرانی غیر ملکیوں کو نکال باہر کیا جائے، اس لیے علاوہ اور اسباب کے کوئی تعجب نہیں کہ اپنی جان و مال کے اس خطرہ کو دیکھ کر ان ایرانیوں نے اسلام قبول کرنے اور حکمران عرب صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت حاصل کرنے کی جانب ترغیب پائی ہو اور ہم دیکھتے ہیں کہ یمن، عمان، بحرین وغیرہ کے ایرانی مقبوضات دیکھتے کے دیکھتے مداین سے ٹوٹ کر مدینہ سے جڑ گئے تھے اور آنحضرت صلعم کی سیاستِ خارجہ کچھ اتنی کامیاب ہو رہی تھی کہ مابقی علاقوں کے لیے مداین کو فکر ہونے لگی۔ چنانچہ چند ہی دنوں بعد جب قسمت نے بوران دخت کو تخت کیانی پر پہنچایا، تو اس نے جناب رسالتمآبؐ کے پاس تحفے تحائف بھیج کر دوستی کی طرح ڈالنی چاہی (جیسا کہ تاریخ طبری ص ۱۶۲۳ میں صراحت سے اور ترمذی شریف جلد ۲ ص ۲۹۶ باب قبول الھدایا میں بلا صراحتِ نام اس کا ذکر ملتا ہے)

ضمیمہ نسی کے متعلق عرب مولفوں میں سے البیرونی وغیرہ یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ سال قمری کو سال کبیسہ بنانے کا نام ہے تو بعض مولف یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ اشہر حرم کی طوالت سے گھبرا کر غیر حرام مہینا بیچ میں شامل کیا جانے کا نام تھا تاکہ اس زمانہ میں لوٹ مار کی جا سکے۔ غور کرنے پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ "نسی" کی حرمت کے کئی سو سال بعد جب خالص قمری سنہ میں پلے ہوئے بعض عرب مولف اس کو سمجھ نہ سکے اور جس طرح قمری و شمسی سال میں سالانہ دس دن کا فرق قدیم زمانہ میں عام بدویوں کی سمجھ میں نہ آتا تھا اور وہ قلمس کی کبیسہ گری کو محض یہ سمجھتے تھے کہ مسلسل تین حرام مہینوں کی دل برداشتہ کرنے والی طوالت کو توڑنے کے لیے ایک غیر حرام مہینا لایا گیا ہے، بالکل اسی طرح ان بدویوں کی اولاد اور ان کی کہاوتوں اور روایتوں کے حامل مسلمان علماء بعد کو زیادہ غور کیے بغیر بدویوں کی روایتوں کو اسلامی ادبیات میں شامل کرنے لگے۔ نسی کے متعلق سویڈن کے پروفیسر موبرگ (MOBERG) نے جرمن زبان میں ۱۹۳۱ء میں جو مقالہ لکھا ہے، وہ چاہے نتائج کے لحاظ سے غیر تشفی بخش ہو لیکن مواد اور حوالوں کے اعتبار سے بہت مفید ہے۔ اسی کا خلاصہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں بھی دیا گیا ہے۔

عہدِ نبوی کے اصولِ سیاسیات

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

ایک شخص جس کو وطن میں جان کے لالے پڑے ہوں۔ صرف ایک رفیق کے ساتھ غاروں میں چھپتا۔ نامانوس اور دشوار گذار راستوں پہ چلتا سینکڑوں میل دور جا پناہ گزیں ہوا ہو۔ وہ دس ہی سال بعد جب انتقال کرتا ہے تو دس لاکھ مربع میل کے علاقے پر حکمراں ہو چکا تھا۔

پھر اس علاقے میں جہاں اس سے پہلے کبھی سیاسی مرکزیت آئی ہی نہ ہو اور ملک قبائلی سطح تمدن سے بلند نہ ہو سکا ہو اس مزاج میں ایک راج قائم کرے اور بغیر نمونے کے ایک باقاعدہ مملکت کی ضرورت کی ہر چیز رائج کرے اور ایک ایسی حکومت قائم کرے جس کا آغاز ایک شہر کے چند محلوں سے ہوا اور جو ۲۷ ہی سال میں دنیا کی دو عظیم ترین شہنشاہیتوں سے وقت واحد میں لڑ کر اور بیسیوں دیگر سلطنتوں کو شکست دے کر ایشیا، افریقہ اور یورپ کے تین براعظموں پہ پھیل جائے۔

اس سیاست کا مطالعہ صرف ایک عظمت ماضیہ کا مطالعہ ہی نہیں ہے۔ بلکہ ایک ایسی شخصیت کے کارناموں کا مطالعہ ہے جس کے ہر قول و فعل کو اب بھی دنیا کی چوتھائی آبادی اپنا قانون اور اپنا اسوۂ حسنہ سمجھتی ہے۔ اگرچہ انسانوں کا یہ گروہ دنیا کی چوتھائی آبادی ہی پہ مشتمل ہے۔ لیکن ایک تو یہ "مشارق الارض" سے "مغارب الارض" تک پھیلا ہوا ہے۔ دوسرے پرانی دنیا کی اکثر اہم شاہراہوں پہ سیاستاً نہیں تو سکونتہً قابض ہے۔ تیسرے زیادہ تر جنگی نسلوں پہ مشتمل ہے۔ چوتھے عظیم الشان اور قابلِ رشک تاریخ رکھتا ہے۔ جس کے پچھلے کارہائے نمایاں ہمیشہ امکانات کے خوش آئند ارادے اور ولولے پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ پانچویں یک نسلی نہ رکھنے کی وجہ سے ہمیشہ اس کا کوئی نہ کوئی جز" میثاقی انحطاط" کو ختم کر کے نئی زندگی کا ثبوت دیتا رہتا ہے چھٹے ابھی تک اس کا پھیلاؤ رکا نہیں اور انتہائی ناساز گار مقاموں میں زبردست ترین اور منظم حریفوں کو شکست دے رہا ہے۔ اور ساتویں اس کے پرانے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کے قاعدے متمدن ممالک میں بھی ضروریات حاضرہ کے مطابق خیال کئے جاتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

سیاست کاری

عہدِ نبوی کی سیاست خارجہ کے اصول دو حصّوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں بعض ایسے تھے جو عام اور ہمہ گیر تھے اور ہر حال میں اور ہر کسی کے ساتھ ملحوظ رہتے تھے اور بعض ہر انفرادی وحدت کے ساتھ بدلے ہوئے تھے اور یہ ناگزیر بھی تھا کہ :

۱۔ اپنے ظالم وطن مکّہ۔

۲۔ عرب کے غیر عربی عناصر خاص کر یہودی قبائل۔

۳۔ خانہ بدوش عرب قبائل۔
۴۔ عرب کے حضری زندگی رکھنے والے شہریا شہری مملکتیں (CITY - STATES) مثلاً طائف۔
۵۔ عرب میں بیرونی دخل اندازیعنی ایرانی اور رومی صوبے۔ محفوظات۔ نوآبادیاں وغیرہ۔
۶۔ عرب کے ہمسایہ ممالک وغیرہ میں سے ہر ایک کے ساتھ آنحضرتؐ کی "سیاست کاری" خصوصی مسائل سے دوچار ہوا اور ان کو حل کرنے کے لئے وہ ہر جگہ الگ اور بدلی ہوئی رہے۔ بسطور ذیل میں آنحضرتؐ کی صرف ملکی سیاست سے بحث کی جائے گی۔

مکّہ کی اہمیت

شہر مکہ قدیم جغرافیہ نگاروں کے الفاظ میں "ناف ارض" پر پڑا چاہیے اسلام کی عالمگیر توسیع میں کتنا ہی ممدو معاون رہا ہو لیکن یہاں زمانہ ہائے مابعد سے ہمیں کوئی بحث نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ عہدِ نبویؐ میں اس کو کیا اہمیت حاصل تھی۔ ہمیں ان مشنری پادریوں کا لحاظ کرنے کی ضرورت نہیں جو مصلحتہً مکّہ اور مکّہ والوں کو کوئی اہمیت دینا نہیں چاہتے اسی طرح ان روحانی عظمتوں یا دیگر لا حاصل قصوں سے بھی یہاں سروکار نہیں جو کرۂ ارض کے بننے میں مکہ کے حصے وغیرہ سے متعلق ہیں۔

شہر مکہ میں جو عرب بستے تھے وہ قریش کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ ان کے تجارتی تعلقات کی اہمیت کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ چونکہ اس زمانے میں جزیرہ نمائے عرب میں کوئی مرکزی حکومت نہ تھی اور ہر قبیلہ اور اس کے علاقے سے گزرنے کے لئے زمانہ حال کے پاسپورٹوں سے بھی زیادہ دشواریاں تھیں اس لئے کاروانوں کے سفر کرنے اور بین الممالک تجارت کے عرب سے گزرنے کے لئے خفاروں اور بدرقوں کا ایک وسیع اور ترقی یافتہ نظام وجود میں آ گیا تھا۔ اس نظام نے عرب میں سیاسی تو نہیں ایک معاشی وفاق ضرور قائم کر دیا تھا۔ اس وفاق میں قریش کے موقف کا اندازہ مشہور مؤرخ محمد بن حبیب (فوت ۲۴۵ھ) کے اس بیان سے ہو سکتا ہے :۔

> "ہر تاجر جو یمن یا حجاز سے وہاں (دومۃ الجندل جو عرب کے شمال میں ہے) جایا جاتا تو جب تک قبائل مُضر کے علاقہ سے گزرتا ہو قریشی خفارے کے خدمات حاصل کرتا کیونکہ نہ کوئی مضری اور نہ مضریوں کا کوئی حلیف قریشی خفارے کو تکلیف دیتا چنانچہ قبائل کلب (بنی الجشم سے حلیفی کے باعث) اور قبائل طے (بنی اسد سے حلیفی کے باعث) قریشیوں کو نہیں چھیڑتے تھے۔ قبائل ربیعہ کے پورے علاقہ میں تاجر اپنے لئے بنی عمرو بن مرشد کا خفارہ حاصل کرتے تھے ...... بحرین کے صدر مقام المشقّر کو جانے کے لیے بھی قریشی خفارہ حاصل کیا جاتا تھا.... جنوبی عرب میں مہرہ جانے کے لئے بنی محارب کا خفارہ لیا جاتا تھا..... حضرموت کے سوق رابیہ جانے کے قریشی کاروان بنی آکل المرار کے خدمات حاصل کرتے تھے..... جس کے باعث آکل المرار جلد اپنے حریفوں پر غالب ہو گیا..... عکاظ عرب کا سب سے بڑا سالانہ میلہ تھا جس میں تمام عرب کے قبائل سامان لاتے تھے۔ مثلاً قریش۔ ہوازن۔ غطفان۔ عضل۔ ولیش۔ جبار۔ مصطلق۔ احابیش وغیرہ۔"

اس کے سوا زمانۂ جاہلیت میں قریش اپنے حج کے سلسلے میں مکّے کے مضافات میں منا میں جمع ہوتے تھے۔ ۳ھ میں بیعت عقبہ کے سلسلے میں مؤرخین نے ذکر کیا ہے کہ اہل مدینہ سے ملنے سے پہلے آں حضرتؐ پندرہ قبائل کے پڑاؤوں میں تبلیغ کے لئے گئے تھے۔

ان میں سے کندہ عرب کے انتہائی جنوب میں رہتے تھے۔ کلب انتہائی شمال میں دومۃ الجندل میں بستے تھے۔ بنی حنیفہ بحرین کے پاس انتہائی مشرق میں آباد تھے۔ ان کے علاوہ وہاں یمن کے۔ مدینے کے غرض عرب کے ہر حصے کے لوگ آتے تھے اور یہ ہر سال ہوتا تھا۔

غالباً یہی وجہ تھی کہ ۸ھ میں مکہ فتح ہوا تو ۹ھ تاریخ اسلام میں "عام الوفود" (سفارتوں کا سال) کے نام سے مشہور ہوا کیونکہ عرب کے ہر حصے سے مدینے میں سفارتیں ٹوٹ پڑیں اور فاتح مکہ کے مذہب اور فاتح مکہ کی حکومت کو ماننے کا اعلان کرتی گئیں اور یہ سفارتیں بھی عرب کے ہر حصے سے آئی تھیں۔

جیسا کہ اوپر عرض ہوا۔ سیاست نبویؐ کے چند اصول عام اور ہمہ گیر تھے پہلے ان ہی کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے یہ مکے سے مقابلہ کرنے میں بھی اتنے ہی ملحوظ رہے جتنے دیگر سیاسی وحدتوں کے سلسلے میں۔

تبلیغ رسالت سب سے پہلا اصول جو ہر حالت میں پیشِ نظر رہا وہ یہ تھا کہ جس مشن اور مقصد کو لے کر آپؐ اٹھے تھے اس کی اشاعت ہو اس غرض کے لئے مالی منفعت اور خواہش انتقام کو نظر انداز کرنا بھی گوارا کیا جاتا تھا۔ چنانچہ جب آنحضرتؐ نے شہر مکہ کو بلا شرط اور بزور فتح کر لیا تو یہ بہت آسان تھا کہ اس مالدار شہر کو آپ لوٹ لیتے اور مہاجرینؓ کی مغصوبہ جائیدادوں اور دیگر کثیر جسمانی اور مالی نقصانوں کا بدلہ لیتے۔ ابوسفیان گرفتار ہو کر ہاتھ آئے تو کچھ نہیں تو ان سے چند ہزار کا فدیہ ہی طلب کرتے اس کی مزید مثالیں جمع کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

اندرونی استحکام کوئی بڑی سے بڑی سلطنت بھی جو سخت اندرونی خلفشار میں مبتلا ہو اکثر حقیر اور کمزور دشمنوں تک کا مقابلہ نہیں کر سکتی تاریخ عالم اس کی مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں اس اصولِ مسلّمہ کا بیان مقصود نہیں ہے۔ بلکہ یہ دکھانا ہے کہ ناگزیر باہمی اختلافات کو کس طرح رد کیا یا دور کیا جاتا تھا اور کس طرح اختلافات کو مٹانے سے اپنی قوت میں اضافہ ہوتا تھا۔

جس وقت آنحضرتؐ ہجرت کر کے مدینے آئے ہیں تو مسلمانان مدینہ اوس اور خزرج کے دو رقیب اور خون کے پیاسے گروہوں میں بٹے ہوئے تھے اور ابھی بعاث کی معرکہ آرائی کا خون بھی خشک نہیں ہوا تھا۔ ان دونوں متصادم قوموں کی سرداری کوئی قابلِ رشک حالت نہیں کہی جا سکتی جس طرح آج اسلامی مبلغین کو ممالک متحدہ امریکہ میں ایک حل نہ ہونے والی گتھی سے سابقہ ہے کہ وہاں حبشیوں میں تبلیغ کریں تو وہ کہتے ہیں۔ آمنّا لیکن آپ گوروں کی لنچنگ پر اتر آنے والی ننگِ انسانیت قوم کو اسلام کے برکات سے ہرگز متمتع نہ ہونے دیجئے اور گورے نومسلم نہیں چاہتے کہ حبشی بھی مسلمان ہو کر ان سے سماجی مساوات حاصل کر لیں۔

عرب کے خانہ بدوش بدو آج بھی اپنے حضری اور بستیوں میں رہنے والے بھائیوں کو سخت حقارت سے دیکھتے ہیں عہد نبویؐ میں نو حضری آبادی آج سے بھی فوجی مہموں میں بدوی رضاکاروں کا ضبط جیسی صبر آزما چیز ہوگی محتاج بیان نہیں۔

سب سے مقدم یہ کہ ہجرت کر کے مدینہ آئے تو وہاں ایک مزاج تھا ایک شہری مملکت تک نہیں پائی جاتی تھی۔ چند مدنی عرب قبائل مسلمان ہو گئے تھے اور چند میں ابھی تک اسلام پوری طرح نہیں پھیلا تھا۔ ان کے ساتھ ہمسائے میں ہزاروں کی تعداد میں

یہودی رہتے تھے جو زراعت تجارت صنعت غرض جملہ معاشی زندگی پر حاوی تھے ان میں بھی آپس میں خون ریزا اور راہمٹ رقابتیں تھیں اور ان کا اپنا ایک مذہب اور تمدن تھا اور ان کے اسلام قبول کرنے کی اتنی بھی توقع نہ تھی جتنی لامذہب بدؤں کی، ان سب کے ساتھ سینکڑوں مہاجرین تھے جو کے بیسیوں قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان تمام عناصر میں ایک وفاقی وحدت پیدا کرنا اور مدینے میں ایک شہری مملکت قائم کر کے اس کا ایک دستور مرتب کرنا اور اس کے ذریعے راعی و رعایا کے حقوق و فرائض کا تعین کرنا اور پھر ان تمام متصادم اور ضائع ہونے والی توانائیوں کو ایک مرکز پر لاکر ان سے مفید کام لینا۔ ابتداءً سیاست خارجہ ہی کے مسائل تھے اور طے ہو چکنے کے بعد اندرونی مسائل بن گئے۔

مدینے کی حفاظت کے لئے علاوہ اس اندرونی استحکام کے اس کی ضرورت تھی کہ آس پاس کے قبائل سے دوستی کی جائے چنانچہ ہجرت کے چند مہینے بعد ہی آنحضرتؐ مدینے کے جنوب مغربی اور ساحل سے متصل علاقے کا بار بار دورہ شروع کرتے ہیں۔ اور ینبوع وغیرہ میں رہنے والے قبائل سے حلیفی کرتے ہیں کہ ان پر کوئی حملہ کرے تو مسلمان انکو مدد دیں گے اور مسلمانوں پر کوئی حملہ کرے تو یہ مدد کو آئیں گے۔ بعض معاہدات میں آنحضرتؐ کے دشمنوں سے دوستی نہ رکھنے کی شرط منظور کی گئی تھی بعض میں اتنی پابندی بھی نہ تھی اور قبیلہ غیر جانبدار رہنے پر آمادہ ہوا تھا بعض میں مسلمانوں کی دینی لڑائیوں میں ان قبائل کو مدد دینے کی پابندی سے مستثنیٰ کیا گیا تھا۔ بہرحال مدینے کے چاروں طرف دوستوں میں اضافہ اور مخالفوں میں کمی کی مسلسل کوشش کی جا رہی تھی۔

ایک اور اصول یہ قرار دیا گیا تھا کہ عرب میں جو شخص یا خاندان یا قبیلہ مسلمان ہو وہ ہجرت کر کے مدینہ یا مضافات میں آبسے۔ یہ سیاست فتح مکہ تک باقی رہی (لا ھجرۃ بعد الفتح مشہور حدیث اسی سیاست کے اختتام کا اعلان تھی) اور بہت کم اس سے استثنا منظور کیا جاتا تھا۔ اس سیاست کا نتیجہ دوگونہ تھا مسلمان فوج کے لئے محفوظ رضاکاروں میں روز افزوں اضافہ اور ان نومسلموں میں اسلام کی گہرائی۔

انسانی خون کی عزت

عہد نبوی میں دس سال میں دس لاکھ مربع میل کا علاقہ فتح ہوا جس میں یقیناً کئی ملین آبادی تھی۔ اس طرح روزانہ تقریباً ۲۷۴ مربع میل کے اوسط سے دس سال تک فتوحات کا سلسلہ ہجرت سے وفات تک جاری رہا۔ ان فتوحات میں دشمن کا ماہانہ ایک آدمی قتل ہوا۔ اسلامی فوج کا نقصان اس سے بھی کم ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد نبویؐ ہے۔ انا نبی الرحمہ انا نبی الملحمہ (میں رحمت کا پیغمبر ہوں میں جنگ کا پیغمبر ہوں) اس کا اس سے بہتر ثبوت کیا ہو سکتا ہے دشمن کے ۷۰ آدمیوں کا مارا جانا (جنگ بدر میں) سب سے بڑی تعداد ہے۔ یاد رہے کہ یہ عہد نبوی کی سب سے پہلی جنگ تھی۔

فنون حرب کی ترقی و استفادہ

دشمن کو بے بس کر دینے اور ساتھ ہی خونریزی کو کم ترین حد تک گھٹا دینے کے لئے ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے کہ فنون حرب میں اتنا کمال حاصل کیا جائے کہ حریف مقابلہ ہی نہ کر سکے۔ اس غرض کے لئے ہر اچھی چیز چاہے کسی ملک کی ہو اختیار کی گئی۔

عربوں میں صف بندی کا رواج نہ تھا۔ جوش کا بے وقت اور بے محل استعمال اور اسلحہ کا بیکار خرچ بھی عام چیز تھی جنگ بدر ہی سے آنحضرتؐ نے اپنے سپاہیوں میں صف بندی شروع کر دی تھی اور معائنہ میں جو آگے پیچھے نظر آتا تھا۔ اسے درست کیا جاتا

تھا۔ فتح مکہ کے وقت توصف آرائی ایک مخصوص افسر کے سپرد ہوگئی تھی۔ جو وازع کہلاتا تھا۔ ہر فوج کا مہم پر روانگی سے پہلے شہر کے باہر معائنہ ہوتا تھا۔ اور کم عمر رضاکار یا سواری یا اسلحہ نہ رکھنے والے یا اور طور پر نامناسب افراد (مثلاً مشرکین یہودی وغیرہ) واپس کر دیئے جاتے تھے۔ جنگ بدر میں صف آرائی کے بعد جو جامع ہدایات دی گئی تھیں وہ یہ تھیں کہ "جب تک میں حکم نہ دوں کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے دشمن دور ہو تو تیر چلا کر بیکار ضائع نہ کرے۔ بلکہ اوپر آئے تو مارے اس سے قریب آئے تو پتھر پھینک کر مارے اس سے بھی قریب آئے تو نیزہ اور پھر تلوار چلائے۔" وردی کی غیر موجودگی میں اور شبخون کی ضرورتوں کے لئے اسلامی سپاہیوں کے لئے شعار (واچ ورڈ) مقرر کئے گئے تھے اور ہر دو بدو کے مقابلہ کے وقت سپاہی اسے دہراتا اور حریف وہ لفظ نہ دہراتا تو اطمینان ہو جاتا کہ وہ رفیق نہیں ہے بلکہ دشمن۔

خندق کے ذریعے محصور شہر کی مدافعت اسی اصول کی ایک دوسری مثال ہے چنانچہ جنگِ خندق میں شہر مدینہ پر دشمن کو حملہ آور ہونے سے اسی کے ذریعہ سے روک کر ناکام واپس کیا گیا۔

خیبر کی لڑائی میں منجنیق سے دشمن کے محصور قلعہ میں پتھر برسائے گئے تھے۔ طائف کے محاصرہ میں مزید برآں دبابے بھی استعمال کئے گئے تھے۔ جو ترقی پاکر زمانہ حال میں خود بخود حرکت کرنے والی ٹینک کی صورت میں نظر آتے ہیں۔

دبابہ ایک پہیئے والی گاڑی ہوتی ہے جس کے اوپر بیل کا یا کوئی اور موٹا چمڑہ منڈھ دیا جاتا تھا کہ تیروں سے اندر رہنے والے آدمیوں کو صدمہ نہ پہنچایا جا سکے۔ فصیلوں کو کھودنے اور مماثل کام کرنے کے لئے اسے کام میں لایا جاتا تھا۔ طائف میں منجنیق کے علاوہ عرادہ بھی برتا گیا تھا۔ جو منجنیق ہی کی طرح پتھر وغیرہ دور پھینکتا تھا۔

فوجوں کی مشقیں۔ گھوڑوں۔ اونٹوں۔ گدھوں وغیرہ کی دوڑ۔ تیر اندازی کے مقابلے اور فوجی اسپورٹ وغیرہ ایک مستقل مضمون کے محتاج ہیں۔ نمازوں کے ذریعے صف بندی روزے کے ذریعے ہر موسم میں سپاہیوں کو بھوک پیاس کی مشق حج کے ذریعے عرفات وغیرہ کے بے آب وگیاہ علاقوں میں کوچ اور قیام کی عادت وغیرہ ان کے علاوہ ہیں۔ سرکاری اصطبلوں، محفوظ چراگاہوں اور اسلحہ خانوں کا قیام بھی اسی سلسلے میں قابل ذکر ہے۔

خبر رسانی اور ناکہ بندی

ایک اور چیز جو عام تو تھی لیکن جس کا قریش کے سلسلے میں بہت مکمل مظاہرہ ہوا وہ یہ ہے کہ دشمن کی ہر نقل وحرکت سے پوری طرح باخبر رہیں اور اپنی نقل وحرکت سے اسے آخر وقت تک بے خبر رکھیں۔

اس غرض کے لئے مکہ میں بھی آپ کے نامہ نگار متعین تھے۔ خندق کے معرکے میں قریش نے مدینہ کے شمال کے قبائل غطفان وغیرہ کے دس ہزار کے جم غفیر کے ساتھ حملہ کیا تھا۔ اتنا بڑا لشکر عرب میں غیر معمولی بات تھی۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں آنحضرتؐ عرب کے شمال میں دومۃ الجندل کی طرف گئے ہوئے تھے۔ آپ کا آدھے راستے سے واپس آجانا اور محاصرہ کنندوں کے پہنچنے سے پہلے دو ہفتہ کی مہلت پاکر خندق کی کھدائی کو مکمل کرنا۔ خبر رسانی کے عمدہ انتظام پر دلالت کرتا ہے۔ اسی طرح فتح مکہ کی تیاری ایک شخص نے مدینہ سے قریش کو لکھ کر بھیجی تو پیام رساں راستے میں پکڑا گیا۔ اپنی خبروں کو پھیلنے سے روکنے کے لئے ناکوں کی بندش (جس

طرق) جتنی مکمل ہو چکی تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ دس ہزار کا لشکر مدینہ سے مکہ کی طرف چلتا ہے اور مضافات مکہ میں پڑاؤ ڈالنے سے پہلے دشمن کو خبر نہیں ہوتی۔ اس کا ایک اور طریقہ غلط سمت میں جانے کی خبر مشہور کرنا تھا کہ دشمن مغالطہ میں مبتلا ہو اور غلط سمت میں سفر کرکے چکر کھاکر منزلِ مقصود پر پہنچنا بھی ہر وقت زیر عمل تھا اور مورخین نے صراحت سے لکھا ہے کہ " صرف تبوک" کی مہم میں سفر کی درازی اور موسم کی خرابی کے باعث سپاہیوں سے پہلے ہی کہہ دیا گیا تھا کہ کہاں جانا ہے ورنہ ہمیشہ توریہ (دکھاوا) کیا جاتا تھا۔"

معاشی دباؤ

یہ سب جانتے ہیں کہ قریش نے آنحضرتؐ اور آپ کے متبعین کو کس طرح تکلیفیں دے کر ترک وطن پر مجبور کیا تھا اور کس طرح ان مہاجرین کی جائیداد منقولہ وغیر منقولہ پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا اسی طرح سب لوگ اس سے بھی واقف ہیں کہ قریش کا روزگار زیادہ تر تجارت سے حاصل ہوتا تھا اور تبادلہ اشیاء کے ذریعے وہ نفع کمایا کرتے تھے اور اس غرض کے لئے سردیوں میں جنوب یعنی یمن وغیرہ کو کاروان لے جاتے تھے اور گرمیوں میں شمال یعنی شام فلسطین۔ مصر، عراق وغیرہ جایا کرتے تھے۔

شمالی راستہ اس علاقے سے گزرتا تھا جو مدینہ اور ینبوع کے مابین ہے۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ ہجرت کے چند مہینے بعد ہی اس علاقے کے باشندوں سے آنحضرتؐ نے معاہدے پیدا کرنے شروع کر دیئے تھے اور جب اس کی ایک حد تک تکمیل ہو گئی تو قریشی کاروانوں کو حق غنیم کے تحت لوٹ لیا جانے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش نے ساحلی راستہ مجبوراً ترک کر دیا اور صحرا میں سے ہو کر عراق جانے لگے، لیکن جلد ہی آنحضرتؐ کا اثر نجد تک پھیل گیا تو وہ راستہ بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ قریش کو بحرین اور یمامہ سے بھی غلہ ملتا تھا۔ ان علاقوں پر اسلامی اثر کے پھیلنے خاص کر ثمامہ بن اثال کے مسلمان ہونے پر غلہ کی برآمد مکہ کو روک دی گئی تھی۔

متعدد قیمتی کاروانوں کے لٹنے کے علاوہ ذرائع معیشت کا بند ہو جانا قریش کو مطیع کرنے کا سب سے مقدم اور سب سے مؤثر ہتھیار ثابت ہوا۔

غنیم کے دوستوں کو توڑ لینا

دوسری اہم تدبیر یہ اختیار کی گئی تھی کہ مختلف وسائل سے قریش کے دوستوں کو اس دوستی کے توڑنے اور مسلمانوں سے جوڑنے پر آمادہ کیا جائے۔ یہ طریقہ بہت آہستہ چلا مگر بالآخر بہت کارگر ثابت ہوا۔

بیعت عقبہ میں جو مدینے والے مسلمان ہوئے تھے۔ وہ اصل میں قریش سے حلیفی کرنے آئے تھے۔ دستور مملکت میں مدینے کے یہودیوں کو اسی شرط پر کسی حملہ آور کے خلاف مدد دینا منظور کیا گیا تھا کہ وہ قریش کو کبھی مدد نہ دیں۔ نہ ان کے جان و مال کو کوئی پناہ دیں۔ اس دستور میں مدینے کے غیر مسلم عربوں کی حفاظت اس شرط سے منظور کی گئی تھی کہ وہ قریش کو نہ تو خود کوئی مدد دیں اور ان کی جان و مال پر مسلمان حملہ کریں تو آڑے آئیں اطراف مدینہ کے قبائل سے بھی معاہدات میں اسے ملحوظ رکھا گیا۔

کاروانی اسٹیشنوں پر جو لوگ رہتے ہیں۔ انھیں کاروانوں کے ٹھہرنے کے زمانے میں کھانے پینے کی چیزیں پانی اور دیگر ضروریات کے فروخت سے روزگار نکلتا ہے، آج کل بھی حجاج کا قافلہ اونٹوں پر جائے تو کئی کئی دن پہلے سے منزلوں پر تیاریاں ہونے لگتی ہیں اور دور دور سے بدوی تربوز۔ گھی۔ بھیڑ۔ بکری وغیرہ وہاں لے جاتے ہیں۔ قریشی کاروانوں کے رک جانے سے متعدد قبائل نے روزگار کے لئے آنحضرتؐ سے مدد طلب کی تھی اور اشجع وغیرہ اسی طرح حلیف بنے تھے۔ (حوالہ ابن سعد)

اس سلسلے میں سب سے اہم کارنامہ صلح حدیبیہ ہے۔ ۶ھ میں مدینہ میں مسلمانوں کو دو خطرے تھے۔ شمال میں خیبر اور جنوب میں مکہ دونوں سے ایک ہی وقت میں مقابلہ ممکن نہ تھا۔ دونوں کی بڑھنے والی دوستی کو روکنا اور ہم خیالی کو ہم عملی کی صورت اختیار نہ کرنے دینا بھی ضروری تھا۔ یہ بھی خوف تھا کہ اگر مسلمان خیبر پر حملہ کرنے جائیں تو مدینہ کو فوج سے خالی پا کر مکہ والے آکر نہ لوٹ لیں اور مکہ پر حملہ کریں تو یہی خدشہ خیبر سے تھا۔ صلح حدیبیہ میں قریش کو اس بات پر آمادہ کر دینا کہ وہ مسلمانوں کی جنگوں میں غیر جانبدار رہیں گے (اور اس کے معاوضہ میں مسلمان قریش کا تجارتی راستہ کھول دیں گے اور دس سال تک باہم صلح رہے گی) ایک زبردست سیاسی فتح تھی جو مسلمانوں نے حاصل کی کیونکہ قریش کو اس وقت مؤثر مدد دے سکنے والے صرف خیبری ہی رہ گئے تھے۔ ان کو پچھاڑ دینے اور پھر تباہ کر دینے سے قریش کا آئندہ کوئی مددگار نہ رہا۔

دشمنوں سے گھیرنا مذکورہ بالا اصول کا ناگزیر نتیجہ یہ تھا کہ رفتہ رفتہ قریش کے اطراف چاروں طرف مسلمان یا مسلمانوں کے حلیف ممالک اور قبائل جمع ہو جائیں۔ قبائل اسلم و خزاعہ اس کی بہت نمایاں مثال ہیں جو مکہ کے اطراف رہتے تھے۔

آنحضرتؐ کا ابتدا سے یہ اصول تھا کہ بات کا پاس رہے اور حلیفوں کی مدد سے کبھی غفلت نہ کی جائے۔ اس کے ساتھ اسلامی فوجوں کی جنگی برتری فتوحات کی دھاک معاشی وسائل پر زبردست اقتدار ان تمام امور نے چو طرف کے چھوٹے چھوٹے قبائل کو آنحضرتؐ کا مطیع کر دیا تھا۔

دِعایہ کاری دشمنوں میں پھوٹ ڈالنا بھی ایک مفید اصول کے طور پر اکثر عہد نبوی میں برتا گیا تھا جنگ خندق اس سلسلے میں کئی نظیریں پیش کرتی ہے۔ محاصرہ کرنے والے متحدین میں سے قبیلہ غطفان کو اس پر آمادہ کر دیا گیا تھا۔ کہ وہ بعض شرائط پر محاصرہ اٹھا کر اور قریش کا ساتھ چھوڑ کر چلے جائیں مگر ان شرائط پر خود مسلمان افسر آمادہ نہ ہوئے گو آنحضرتؐ ان پر راضی تھے۔

دوسری نظیر اسی جنگِ خندق میں قریش اور مدینے کے یہودیوں میں پھوٹ ڈالنا تھا۔ اس میں جتنی زبردست کامیابی ہوئی اس سے سب واقف ہیں کہ قریش نے بیزار ہو کر محاصرہ اٹھا دیا اور بے نیل مرام واپس چلے گئے۔

دشمن کے ایک طبقے کو موہ لینا یہ اصول بھی بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ اوپر بیان ہوا کہ قریش کے غلہ کی منڈی جو یمامہ میں تھی بند کرا دی گئی تھی۔ مورخ بیان کرتے ہیں کہ اس سے مکہ میں قحط نمودار ہو گیا۔ اس سال عرب میں بارش نہ ہونے سے عام کال بھی تھا۔ اس دباؤ کی قوت کا جب قریش کو اندازہ ہو گیا تو پھر یہ بندش اٹھالی گئی اور وہ بہت ممنون ہوئے۔ یہی نہیں بلکہ اسی زمانے میں پانچ سو اشرفی کی خطیر رقم مکہ کے سردار ابوسفیان کو بھیجی گئی کہ مکہ کے فقرا میں تقسیم کر دے۔

ان کارروائیوں سے مکہ میں بیسیوں بہی خواہ پیدا ہو گئے اور اس طرح کی سیاست سے مختلف مواقع پر اور مختلف ممالک میں مسلمانوں نے فائدہ اٹھایا۔

معزز دشمنوں کا اسلام میں بھی اعزاز

اس مختصر تبصرہ کے آخر میں اس اصول کا ذکر کیا جا سکتا ہے جو حدیث میں ہے کہ خیارکم فی الجاھلیۃ خیارکم فی الاسلام اذا فقھوا (غیر مسلم معزز اسلام لانے پر بھی معزز رہیں گے - اگر وہ اسلامی قوانین سے بھی واقف ہو جائیں) یہی وجہ تھی کہ عمرو بن العاصؓ کے اسلام لانے پر انہیں سابقین اولین کا سردار بنا کر فوجی مہموں میں بھیجا گیا - ابوسفیان نے اسلام قبول کیا تو نہ صرف انھیں انعام واکرام دیا گیا بلکہ ان کا گھر امن گاہ قرار دیا گیا - انھیں لشکروں کی سرداری اور صوبوں کی گورنری بھی فوراً دی جانے لگی - خالد ابن الولید کو (باوجود احد میں مسلمانوں کی شکست کا واحد سبب ہونے کے) اسلام لاتے ہی سیف اللہ کے قابل رشک خطاب سے سرفراز کیا گیا

اگر سیرت النبی کا ان امور کی تلاش کے لئے مطالعہ کیا جائے تو نہ صرف مذکورہ بالا اصولوں کی مزید نظیریں ملیں گی - بلکہ اور نئے سیاست کاری کے اصول بھی نظر آ سکتے ہیں - یقین ہے کہ اہل علم ان سے مستفید ہو کر اوروں کو محروم نہیں رکھیں گے

رسول اللہؐ کے عہد میں نظامِ عدل

جسٹس ایس اے رحمٰن

قانون کے معنی

قانون کا لفظ لغوی اعتبار سے یونانی لفظ "کانون" سے ماخوذ ہے جو سریانی کی وساطت سے عربی زبان میں داخل ہوا۔ اس میں اس کے معنی "سیدھی سلاخ" یا مسطر کے تھے، پھر اس کا اطلاق "قاعدہ" پر ہونے لگا۔ آج کل یہ لفظ یورپی زبانوں میں بمعنی قانون کلیسا مستعمل ہے۔ فقہ اسلامی میں "قانون" کے بجائے "شرع"، "شریعت" یا "حکم شرعی" کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ سلطنتِ عثمانیہ میں لفظ "قانون" کا اطلاق اکثر ان سرکاری احکام پر ہوتا تھا جنھیں حکومت جاری کرتی تھی تاکہ احکام شرع سے ان کی تمیز ہو سکے۔ اسلامی تصورِ حیات کے مطابق "شارعِ حقیقی" صرف ذاتِ باری تعالےٰ ہے جس نے وحی کے ذریعے، دین و دنیا دونوں پر حاوی ہدایت، رسولِ اکرمؐ کی زبانِ حق ترجمان پر نازل کی۔ لہٰذا فقہِ اسلامی میں عبادات، معاملات اور عقوبات سب کو علوم دینیہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس مختصر مقالہ میں ہم "قانون" سے امورِ مدنیت سے متعلق وہ جامع اور ضروری قواعد مراد لیں گے جن کی پابندی ایک متمدن معاشرہ میں لابدی ہوتی ہے۔ اور جن کا نفاذ بصورتِ مخاصمہ اولی الامر کی معرفت کرایا جا سکے۔ اس تعریف کی رُو سے وہ دینی یا اخلاقی ضوابط و قواعد، جن کی خلاف ورزی ریاستی سطح پر قابلِ مواخذہ نہیں، ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔

قرآنی قانون کی خصوصیت

اسلامی قانون سازی کا پہلا دور رسول اکرمؐ کی نبوّت یعنی ۶۱۰ء سے لیکر آنحضرتؐ کی وفات یعنی ۶۳۲ء تک پھیلا ہوا ہے۔ جیسا کہ ہم نے ابھی ابھی اشارہ کیا ہے اسلامی قانون کا اصلی اور بنیادی سرچشمہ قرآنِ حکیم ہے۔ جس کی آیات بائیس سال سے کچھ زیادہ عرصے میں وقتاً فوقتاً بذریعہ وحی قلب و زبانِ رسولِ مقبولؐ پر اتاری گئیں۔ اسلام کے سیاسی ثم معاشرتی نظام میں قرآنِ حکیم بمنزلہ دستورِ اساسی کے ہے۔ کوئی اقدام خواہ قانونی ہو یا کسی اور نوعیت کا، قرآنی احکام یا اصولوں کے خلاف نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی ایسا قانون بنایا جائے جو قرآنی نص کا نقیض ہو تو اسلامی ریاست کے نزدیک وہ کالعدم ہو گا۔ عام دساتیرِ اساسی سے قرآنی دستور اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس کے متن میں کوئی انسانی ادارہ یا فرد ترمیم و تبدل کا مجاز نہیں۔

اس ابدی اساس کے ہوتے ہوئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی نظام میں قانون سازی کی کہاں تک گنجائش ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ماسوائے چند ایک مخصوص موضوعات کے جن کے متعلق احکامِ قانونی قرآن مجید میں بالتصریح موجود ہیں، دیگر امور میں اصولی رہنمائی پر اکتفا کیا گیا ہے اور ان امور میں ذیلی یا جزئیاتی قواعد کا تعین حکمتِ شارع نے مکان و زمان کے امکانی تغیرات کے پیش نظر، امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے تاکہ دین میں تنگی کے بجائے آسانی ہو۔ شرط یہ ہے کہ یہ ذیلی یا جزئیاتی قواعد قرآنِ حکیم کے غیر متبدل اساسی اصولوں یا روحِ دین کے منافی نہ ہوں۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حضورِ رسالت مآبؐ نے ارشادِ خداوندی :

"یاَیُّھا الذین اٰمنوا لا تسئلوا عن اشیاء ان تُبد لکم تسؤکم۔"
کو مدِنظر رکھتے ہوئے معاملات یا عبادات کے متعلق زیادہ کریدیا سوالات کرنے سے منع فرمایا تاکہ دین متحجر ہو کر نہ رہ جائے۔ حضورؐ کا فرمان ہے کہ اپنے اوپر سخت گیری نہ کرو مبادا اللہ تعالیٰ بھی تمہارے ساتھ سختی سے پیش آئے۔ پھر یہ بات بھی سزاوارِ اعتنا ہے کہ قرآن مجید کے بعض مسائل کے تصفیہ کو "عرف" یعنی رسوم و عادات کے مروجہ پیمانوں پہ مبنی رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے رسم و رواج اختلاف زمان و مکان کے باعث تغیر پذیر ہو سکتے ہیں۔ البتہ یہ رواجی قاعدے بھی نص یا اصول قرآنی سے متعارض نہ ہونے چاہئیں۔ نصوص یا بنیادی اصولوں کا خاص واقعات پہ اطلاق بھی تعبیر و تفسیر کا تقاضا کرتا ہے۔ قرآنی احکام کی تعبیر و تفسیر کے لئے سنتِ رسولؐ سے بہتر رہنمائی ممکن نہیں۔ ایک بظاہر عام قرآنی حکم کی تخصیص یا ایک بظاہر خاص حکم تعمیم یا ذیلی جزئیات کی تصریح کی متعدد مثالیں ہمیں احادیث میں ملتی ہیں۔ البتہ جیسا کہ علامہ اقبال نے اپنے ایک لیکچر میں اشارہ کیا ہے۔ بعض "قانونی نوعیت کی احادیث کے متعلق یہ سوال بھی اٹھ سکتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر منحصر ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اکرمؐ نے علیٰ حالہٖ قائم رکھا اور بعض میں ترمیم فرما دی۔ کیا ان رسوم و رواج کو جن سے تعرض نہ کیا گیا۔ ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا؟ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ انبیا علیہم السلام کی بعثت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جس قوم کی ہدایت کے لئے وہ مامور ہوئے ہیں۔ ان میں اتفاقات کی مروجہ صورتوں کی اصلاح کریں۔ ان کی مالوفات کو یکسر ان سے چھڑا دینے کا ان کو حکم نہیں دیا جاتا اِلّا یہ کہ بعض خاص صورتوں میں بہ تقاضائے مصلحت ایسا کرنا پڑے۔ تاہم تشریح میں ان علوم و عادات کو ترجیح دی جاتی ہے جو کسی ایک قوم سے مخصوص نہیں۔ جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں۔ ان رسم و رواج کے سانچے ابدی نہیں ہوتے۔

نظریۂ اجتہاد ان گزارشات سے روشن ہوگا یہ مفروضہ کہ قرآنی نظامِ قانون ایک جامد ضابطہ یا بند محیط ہے۔ جس میں اتنی لچک نہیں کہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات و مقتضیات کا ساتھ دے سکے، صحیح نہ ہوگا۔ اجتہاد کا اصول اس نظام کو ایک حرکی اور ترقی پذیر ضابطۂ حیات کی صورت دیتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ شارع حقیقی کی حکمت بالغہ نے دین کامل میں مخصوص حدود کے اندر مستقبل کی ضرورتوں سے ہم آہنگی کی گنجائش رکھی ہے اور غالباً یہ وہی منطقۂ فکر و عمل ہے جو فقہی اصطلاح میں مباح کے زیرِ نگیں ہے۔ ابن قیمؒ، اعلام الموقعین میں لکھتے ہیں کہ احکام کی تبدیلی اور اختلاف زمان، مکان احوال، نیت اور عادات انسانی کے اختلاف کے ساتھ وابستہ ہے۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ معاشرہ انسانی اور قانون کا باہمی رشتہ نہ جاننے کے باعث لوگوں میں ایک غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے۔ جس نے شریعتِ اسلامی کا دائرہ بالکل محدود کر دیا ہے۔ حالانکہ وہ نہیں سمجھتے کہ جس شریعت اسلامی میں مصالح انسانی کا سب سے زیادہ لحاظ رکھا گیا، اس میں ایسے "تنگ نظریوں کی گنجائش نہیں ہے۔

اجتہادی نظریہ کی تصدیق معاذ بن جبل والی حدیث سے ہوتی ہے۔ جسے ترمذی اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب آنحضرت نے ان کو یمن روانہ کیا تو دریافت فرمایا کہ "جب کوئی معاملہ تیرے سامنے آئے گا تو تُو کس طرح اس میں فیصلہ کرے گا؟ عرض کیا۔ "کتاب اللہ کے موافق فیصلہ کروں گا۔" فرمایا۔ "اگر کتاب اللہ میں اس بات کو نہ پائے؟" عرض کیا۔ "رسول اللہؐ

کی سنت کے موافق فیصلہ کروں گا۔" فرمایا" اگر سنتِ رسول اللہؐ میں بھی وہ بات نہ ملے؟" عرض کیا" اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا"۔ یہ سُن کر رسول اللہؐ نے ان کے سینہ پر ہاتھ مارا اور فرمایا" تمام تعریفیں اس خدا کے لئے ہیں جس نے اللہ کے رسول کو اس امر کی توفیق دی کہ راضی ہو اس سے اللہ کا رسولؐ"۔ یہ حدیث گویا اجتہاد کا منشور ہے اور ہمارے لئے ہدایت کا ابدی سرچشمہ۔

قانونی نوعیت کی احادیث

اب ہم ان قانونی نوعیت کی احادیث کا ایک سرسری جائزہ لیتے ہیں جن سے کسی اصول یا قاعدے پر روشنی پڑتی ہو۔ اس مختصر صحبت میں ساری متعلقہ احادیث کا احاطہ کرنا یا تمام مسائل کو لپیٹ لینا ممکن نہیں۔ اس لئے ہمیں رسالت کے سراج منیر کی چند کرنوں پر ہی اکتفا کرنا ہوگا۔

رسول کریمؐ کی قانونی تصریحات کے پس منظر کے طور پر ایام جاہلیت میں عرب کی حالت کا مختصر ذکر بے جا نہ ہوگا۔ ڈاکٹر صبحی محمصانی اپنی کتاب فلسفہ التشریع فی الاسلام میں لکھتے ہیں کہ اسلام سے قبل عرب معاشرہ متفرق قبائل کے مجموعہ سے عبارت تھا۔ جس میں کسی مرکزی حکومت کی شیرازہ بندی نہ تھی۔ ہر ایک فرد اپنے قبیلہ سے وابستہ تھا خواہ قرابت داری کے ذریعہ سے ہو یا باہمی عہد و پیمان کے واسطے سے۔ چنانچہ وہ اپنے قبیلہ کی جنبہ داری کرتا تھا اور بیرونی دشمن کے مقابلہ میں قبیلہ کی حمایت میں سینہ سپر رہتا تھا۔ قبائل کے درمیان جنگ و جدل عام تھا اور اس کے ساتھ لوٹ مار، مردوں اور عورتوں کو قید کرنے اور لونڈی غلام بنانے کا عام رواج تھا۔ ان کا اقتصادی نظام سادہ تھا۔ کام کرنے کو ذلیل سمجھا جاتا تھا۔ ان کے معاملات کی حیثیت عرفی تھی یعنی قدیم رسوم و عادات پر مبنی تھی۔ عورت کا معاشرہ میں درجہ نہایت پست تھا۔ عار یا فقر و فاقہ کے خوف سے لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ کثرتِ ازدواج کے باعث بیویوں کی کوئی تعداد مقرر نہ تھی۔ متعہ یا نکاحِ موقت کا بھی عام رواج تھا۔ شوہر بلا کسی پابندی یا شرط کے طلاق دینے کا مجاز تھا۔ اور عورتیں اور بچے حق وراثت سے محروم تھے۔

رسول کریمؐ کی ذات بابرکت کے باعث حکومتی سطح پر شوریٰ کا نفاذ ہوا اور حاکم کے لیے نصوص مقدسہ کی پابندی اور مصلحت عامہ کی رعایت ضروری ٹھہری۔ عدل و احسان، مساوات اور اخوت انسانی کے اصول نافذ ہوئے۔ قبیلہ کی عصبیتیں یا جارحانہ لڑائی ممنوع اور دفاعی جنگ مباح قرار پائی۔ امن و امان کی تاکید ہوئی۔ عورت اور معذور لوگوں کی حالت بہتر ہوگئی۔ انفرادی ملکیت کی حرمت قائم ہوئی۔ عہد و پیمان کی پابندی واجب ٹھہری اور دھوکہ بازی یا حیلہ پردازی کی مختلف صورتیں زیر امتناع آئیں۔

معاہدوں کی پابندی

قانون کا ایک حصہ بین قومی معاہدوں سے تعلق رکھتا ہے۔ عہد نبوی کے سیاسی آثار میں سے ایک نمایاں واقعہ یہ ہے کہ ہجرت کے بعد رسول اکرمؐ نے مدینہ میں ایک وفاقی حکومت کی بنیاد رکھی جس کے صدر اعلیٰ خود حضورؐ تھے۔ اس تحریری معاہدے کا متن جو اس موقع پر تیار ہوا۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اپنی کتاب" الوثائق السیاسیہ" میں درج کیا ہے۔ فریق معاہدہ ایک طرف رسول اکرمؐ اور مہاجرین و انصار تھے اور دوسری طرف مدینہ کے تمام یہود و نصاریٰ اور دیگر غیر مسلم باشندے۔ تمام فریقوں کو سیاسی طور پر ایک جماعت کی حیثیت دی گئی۔ مدینہ پر حملہ کی صورت میں شرکائے معاہدہ میں سے ہر فرد اور جماعت حملہ آور کی مداخلت کے خلاف دوسرے فریقوں کی حمایت کی پابند تھی۔ اور دشمن سے صلح کی صورت میں ہر فریق

کی منفعت میں مسلمانوں کی مانند دوسرے شرکاء بھی متمتع ہونے کا حق رکھتے تھے۔ ہر فرد کا فرض تھا۔ کہ اپنے ہمسائے کی طرف داری اپنے نفس کی مانند کرے انصاف رسانی پوری جماعت کا فریضہ قرار پائی۔ اس بارے میں کسی رشتہ داری یا قرابت کا پاس ولحاظ ممنوع ہوا۔ ایک شق معاہدہ کی یہ بھی تھی کہ کسی قاتل یا مجرم کو کوئی شخص پناہ نہ دے سکے گا۔ فدیہ اور دیت وغیرہ کے اصول حسب سابق رہے۔ انفرادی انتقام جوئی کی جگہ مرکزی عدل گستری کا نظام قائم ہوا۔ باہمی اختلاف یا تنازعہ کا مقدمہ خود رسول اکرمؐ کے فیصلے پر موقوف تھا۔ آنحضرت غیر مسلموں کے مقدمات میں ان کے اپنے شخصی قانون کے مطابق فیصلے فرماتے تھے۔ یہ فقید المثال معاہدہ بعد میں قبائل یہود کی مسلمانوں کے خلاف سازشوں اور ان کی فتنہ پردازیوں کی نذر ہو گیا۔ ہمارے ہاں اقلیتوں کے مسائل کا حل شاید اس تاریخی معاہدہ کی روشنی میں دریافت ہو سکے۔

بین قومی معاہدوں کا جو حشر مہذب متمدن مغربی اقوام کے ہاتھوں ہوتا آیا ہے کسی تاریخ کے طالب علم سے مخفی نہیں۔ رسول اکرمؐ نے جس جماعت یا فرد کے ساتھ کوئی معاہدہ کیا۔ خود اس کی پابندی کی اور اپنے پیروؤں سے پوری دیانتداری کے ساتھ اس پر عمل کروایا۔ صلح حدیبیہ اس ضمن میں فقید المثال ہے۔ یہ معاہدہ کفار قریش اور آنحضرت کے درمیان حدیبیہ کے مقام پر ہوا اور اس کے کاتب حضرت علیؓ تھے۔ اس معاہدہ کی رو سے فریقین میں دس سال کے لئے جنگ ممنوع قرار پائی۔ ایک شرط معاہدہ کی یہ تھی کہ اس عرصہ میں اگر مسلمان مکہ میں حج عمرہ یا تجارت کے لئے وارد ہوں تو اہل مکہ پر ان کی جان و مال کی ذمہ داری ہوگی اور اگر قریش تجارت کے لئے مدینہ کی راہ سے مصر یا شام کی طرف عازم ہوں تو مسلمان ان کی جان و مال کی حفاظت کے ذمہ دار ہوں گے۔ ایک اور شق کے مطابق اگر اہل مکہ میں سے کوئی شخص اپنے خاندانی سربراہ کی اجازت کے بغیر مسلمان ہو کر مدینہ چلا آئے تو اس کا مکہ لوٹا دینا رسول اکرم پر واجب تھا۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص مدینہ میں سے اسلام ترک کر کے مکہ میں پناہ گزیں ہو تو قریش اس کی واپسی پر مکلف نہ ہوں گے۔ بظاہر اس شق کے تحت فریقین کے حقوق مساوی نہ تھے۔ لیکن جب ابو بصیر، جنھیں صاحب عیص بھی کہا جاتا ہے، مکہ سے فرار ہو کر مدینہ پہنچے تو آنحضرت نے اہل مکہ کے دو ایلچیوں کے ہمراہ انھیں واپس جانے کا حکم دیا۔ ابو بصیر نے تعمیل ارشاد کی۔ جب تینوں ذوالحلیفہ کے مقام پر پہنچے تو ابو بصیر نے حیلہ سے اپنے ایک محافظ کی تلوار پر قبضہ کر کے اسے ختم کر دیا اور پھر بھاگ کر رسول کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضورؐ نے فرمایا "تم بڑے لڑاکے ہو۔ اگر دوسروں کے ہمراہ بھی تھوڑے آدمی ہوتے تو فریقین میں جنگ چھڑ جانا مشکل نہ تھا" قریش کا دوسرا آدمی بھی بدحواسی کے عالم میں رسول اکرمؐ کے پاس شکایت کے لئے پہنچا۔ یہ رنگ دیکھ کر ابو بصیر چپکے سے نکل گئے اور عیص کے مقام پر جا کر مقیم ہو گئے۔ یہ واقعہ ملک میں مشہور ہو گیا تو اہل مکہ میں سے اس زمرہ کے اور لوگوں نے بھی عیص کا رخ کیا اور اس طرح وہاں گویا مجاہدین کی ایک نوآبادی بن گئی۔ جو قریش کے قافلوں کے لئے خطرہ بن گئی چنانچہ قریش نے خود معاہدہ کی اس شق سے دست برداری دے دی اور عیص والے مدینہ آ گئے۔ ابو بصیر اس اثنا میں وفات پا چکے تھے۔

روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضورؐ نے جاسوسوں کے قتل کی اجازت دی۔ یہ بات زمانِ حاضر میں بھی سیاست ملکی اور جماعتی سلامتی کے موافق سمجھی جاتی ہے۔ خصوصاً جنگ کے ایام میں قاصدوں کے بارے میں حضورؐ کا فرمان تھا کہ ان کا قتل ممنوع ہے۔ ان کے ارشاد کے مطابق قاصد کا روک لینا اور اس سے کسی قسم کا تعرض بھی روا نہیں رکھا جا سکتا۔ مفتوح جماعتوں یا قوموں پر

مقرر ہوتا ہے، عاید کیا جاتا تھا اور ان کے مال و جان کی حفاظت کی ذمہ داری اسلامی ریاست پہ قائم ہوجاتی تھی۔ اس قسم کے ذمیوں کو فوجی خدمت سے معاف رکھا جاتا تھا اور کسی قسم کا دیگر بار ان پہ نہ ڈالا جاتا تھا۔ پھر ان کے معذور یا نادار لوگوں سے جزیہ بھی وصول کیا جاتا تھا۔ اس کی ایک مثال وہ وثیقہ امان ہے، جو حضورؐ نے تیما کے یہود بنی عادی کے لئے لکھوا دیا تھا۔

ریاست کے معاملات

اب معاملات ریاست پر ایک نظر ڈالئے آیہ شریفہ "ان اللہ یامر بالعدل والاحسان" ہمیشہ حضورؐ کے پیش نظر رہتی تھی۔ چنانچہ جب حضورؐ نے حضرت معاذؓ کو یمن روانہ فرمایا تو انھیں خاص طور پہ ہدایت فرمائی کہ جب زکوٰۃ وصول کرو تو لوگوں کے نفیس اور منتخب مال کو زکوٰۃ میں لینے کی کوشش نہ کرنا اور مظلوموں کی بددعا سے بچنا اسلئے کہ بددعائیں مستجاب ہوتی ہیں۔ یہ روایت صحیحین میں ہے۔ زکوٰۃ ہی کے سلسلے میں حضورؐ نے قبیلہ ازد کے ایک شخص ابن لتبیہ کو زکوٰۃ کی وصولی پہ مامور فرمایا اور بعد میں جب معلوم ہوا کہ اس نے زکوٰۃ کے علاوہ تحفہ کے طور پر کچھ چیزیں زکوٰۃ دینے والوں سے لی ہیں تو سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا اور اس کے فعل کو زکوٰۃ کے مال میں خیانت سے تعبیر فرمایا۔ گویا حضورؐ نے صراحت فرما دی کہ حرام وسائل بھی حرام میں شمار ہوتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے رشوت لینے والے اور دینے والے دونوں پہ لعنت فرمائی اور بعض روایتوں میں یہ الفاظ بھی شامل ہیں کہ رائش یعنی اس شخص پہ بھی لعنت فرمائی جو راشی اور مرتشی کے درمیان واسطہ بنے۔

اجتہاد کی اہمیت

عدلت گستری سے متعلق ہمیں احادیث سے رہنمائی ملتی ہے۔ جب اسلامی عملداری کا کام مدینہ کی حدود سے بڑھ گیا تو حضورؐ نے چند مفتی یعنی قاضی مدینے میں مقرر فرمائے۔ جن کے فیصلوں کے خلاف آنحضرتؐ کے پاس مرافعہ بھی ہوتا تھا۔ کتانی نے اپنی کتاب التراتیب الاداریہ میں بحوالہ ابن الجوزی و مؤطا اس تنظیم کا ذکر کیا ہے۔ بعض مقدمات کے لئے حضور نے موقتی قاضی بھی تعین فرمائے۔ سرخسی نے مبسوط میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت نے حضرت عمروؓ بن العاص سے فرمایا کہ ان دو آدمیوں کا قضیہ چکاؤ۔ کہا "کیا آپ کی موجودگی میں فیصلہ کروں؟" فرمایا "ہاں!" کہا "کس صورت میں؟" فرمایا "اس طور پہ کہ اگر اجتہاد کرو اور صحیح چیز پہ پہنچو تو دس نیکیوں کا ثواب ہوگا اور اگر خطا کر جاؤ تو ایک نیکی شمار ہوگی۔" حضرت ابوبکرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ جب حاکم غیظ و غضب میں ہو تو دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ نہ کرے۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں وہ ٹھنڈے دل سے معاملہ کے حسن و قبح پہ غور نہ کر سکے گا۔ ایک اور حدیث میں اجتہاد کی اہمیت پہ ان الفاظ میں روشنی ڈالی گئی ہے "جب حاکم حکم لگانے پر آمادہ ہو تو اجتہاد کرے (یعنی معاملہ پر خوب غور و خوض کرے) اگر اس کا فیصلہ حق بجانب ہوگا تو اسے دو اجر ملیں گے اور اگر فیصلہ میں باوجود پوری کوشش کے غلطی رہ جائے تو اُسے ایک اجر ملے گا۔" یہ حدیث صحیحین میں ہے۔ ساتھ ہی حضورؐ نے قضا کی ذمہ داریوں کا احساس ان معنی خیز الفاظ میں دلایا "جس شخص کو لوگوں کا قاضی بنایا گیا اسے گویا بغیر چھری کے ذبح کیا گیا۔" انصاف رسانی کے سلسلے میں حضورؐ کا فرمان ہے "قاضی کو چاہیئے کہ صرف روداد پہ فیصلہ کرے اور اپنی ذاتی معلومات کو اس میں دخل نہ دے۔"

حاکم کی صفات

آنحضرت طالب عہدہ لوگوں کو کبھی قاضی یا گورنر نہ بناتے تھے۔ لیکن جسے عہدہ کے لئے موزوں خیال فرماتے تھے اس کی جرأت افزائی فرماتے تھے۔ حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ حضور نے مجھ کو عامل بنا کر یمن بھیجا۔ میں

نے عرض کیا " یا رسول اللہ آپ مجھ کو حاکم بنا کر بھیج رہے ہیں۔ میں جوان ہوں اور حکومت کرنے کا طریقہ بھی مجھے معلوم نہیں " آپ نے فرمایا " خداوند تعالیٰ تیرے دل کی رہنمائی کرے گا اور تیری زبان کو ثابت رکھے گا " پھر ارشاد ہوا " جب دو شخص کوئی معاملہ لے کر تیرے پاس آئیں تو پہلے شخص یعنی مدعی کے حق میں اس وقت تک فیصلہ نہ کر، جب تک کہ دوسرے کے بیان کو نہ سن لے اس لئے کہ مدعا علیہ کا بیان تجھے حکم دینے میں مدد دے گا " ایک اور حدیث کے مطابق حضورؐ نے فرمایا کہ دونوں فریق یعنی مدعا علیہ اور مدعی حاکم کے سامنے بیٹھیں (یعنی ان سے برابری کا سلوک ہو) حضورؐ کا قول ہے کہ اگر محض لوگوں کے دعوے پر ہی ان کا مطالبہ تسلیم کر لیا جائے تو بہت سے لوگ اپنے آدمیوں کے خون اور مال کا دعویٰ (بغیر مستحکم بنیاد کے) کرنے لگیں گے۔ لہٰذا مدعا علیہ پر قسم بھی ہے۔ یعنی صرف مدعی کا بیان کافی نہیں بلکہ مدعی سے قسم لینا بھی ضروری ہے۔ ایک اور حدیث کے الفاظ ہیں کہ " ثبوت مدعی کے ذمہ ہے اور قسم مدعا علیہ پر "

حضرت ام سلمیٰؓ کہتی ہیں کہ حضور نے فرمایا " میں ایک انسان ہوں اور تم اپنے جھگڑے لے کر میرے پاس آتے ہو۔ ممکن ہے تم میں سے کوئی شخص ایسا ہو جو اپنی دلیل کے ساتھ خوب تقریر کر سکے۔ پھر میں اس کے بیان کے مطابق اس کے حق میں فیصلہ کر دوں تو حقیقت میں اگر اس کا حق نہیں تو وہ اسے نہ لے۔ ایسی صورت میں گویا اس کے لئے دوزخ کی آگ کے ایک ٹکڑے کا فیصلہ کرتا ہوں " یہ محض قانونیت پر انحصار کے خلاف تنبیہ ہے۔ جب حق مدعی کے ساتھ نہ ہو۔ اس بارے میں خود فرد کے ضمیر کو قاضی بنایا گیا ہے اور یہ امر اس پر دال ہے کہ اسلامی نظامِ قانون لادینی نظاموں کے برعکس، محض قانونی موشگافیوں کی بنا پر یا قانونی حیلوں کے ذریعے کسی کو اپنی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں کرتا۔ ہر فرد کو روحِ اسلامی کو بھی مدِ نظر رکھنا ہوگا۔

مرافعہ کے علاوہ " استصواب " اور " تصحیح " کی مثالیں بھی عہدِ نبوی کی تاریخ میں ملتی ہیں جب کبھی حضور کو کسی افسر کے غلط فیصلے یا طرزِ عمل کی خبر ملتی تو آپ بصیغۂ تصحیح دخل دہی فرما کر تلافی اور تدارک فرماتے۔ مسندِ احمد بن حنبل میں بھی آنحضرتؐ کے پاس مرافعوں کی نظیریں درج ہیں۔ نیز اس وثیقہ سے جو حضورؐ نے قبیلہ بنو عبدالقیس کو تحریر کرا دیا، ظاہر ہوتا ہے کہ فیصلوں پر نظرِ ثانی کا امکان بھی تھا۔ اس میں یہ ہدایت بھی درج تھی کہ مفصل مقدمات میں ایسا عدل کریں کہ فریقینِ مقدمہ کو نظرِ ثانی کی ضرورت نہ رہے۔

کتمانِ شہادت

کتمانِ شہادت اور جھوٹی گواہی کے خلاف کئی ایک حدیثوں میں شدید تنبیہ وارد ہے۔ حریم بن فاتک کہتے ہیں کہ آنحضرت نے ایک روز صبح کی نماز کے بعد کھڑے ہو کر تین مرتبہ فرمایا کہ جھوٹی گواہی شرک باللہ کے برابر کی گئی ہے۔ ایک حدیث میں ہے " قل الحق ولو علیٰ نفسک " (سچ بولو خواہ تمہارے اپنے خلاف ہو) عدلِ رسالت مآب کی اس سلسلے میں ایک مشہور روایت ہے۔ ابولمعہ نے جو انصار میں سے تھا۔ ایک زرہ چرائی اور اسے آٹے کی بوری میں رکھ لیا۔ بوری پھٹی ہوئی تھی اور اس لئے آٹا راستے میں اس کے گھر تک گرتا چلا گیا۔ قرائن سے معلوم ہوا تھا کہ وہی چور ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ زرہ اس نے ایک یہودی کے پاس امانت رکھ دی تھی اور پھر اپنی برادری میں آ کر مشہور کر دیا کہ زرہ یہودی نے چرائی ہے۔ اس انصاری کے برادری کے لوگ حضورؐ سے خواہاں ہوئے کہ آپ انصاری کی عذر خواہی کریں۔ حضورؐ کو اشارۂ غیبی سے حقیقت کا پتہ چل گیا اور آپؐ نے فیصلہ یہودی کے حق میں فرمایا۔ ابولمعہ اس کے بعد مکہ کی طرف بھاگ کر چلا گیا اور مرتد ہو گیا۔

قاضیوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھا دی جاتی تھی کہ دی ہوئی ہدایتوں کے خلاف وہ جو کام کریں گے کالعدم تصور ہوگا۔ جب عمرو بن حزم یمن کے گورنر بنا کر بھیجے گئے تو ان کو آنحضرتؐ نے ایک تحریری ہدایت نامہ عنایت فرمایا تھا۔ اس دستاویز میں منجملہ دیگر ہدایات کے، انھیں ہر معاملہ میں اللہ کے امر کے مطابق صداقت کو مدِنظر رکھنے کا حکم دیا گیا تھا اور ظلم و ستم سے باز رہنے کی تاکید کی گئی تھی۔ یہ تفصیل بھی اس میں درج تھی کہ جسمانی ضرر رسانی کی کس کس صورت میں متضرر کو کیا ہرجانہ دلایا جائے گا۔ نیز مختلف اجناس کے لئے بلحاظِ وسائلِ آبپاشی اور پالتو حیوانات پر زکوٰۃ کے پیمانوں کی صراحت کی گئی تھی۔

سود کی ممانعت

سود کا دستور سرمایہ داری نظام کی اساس ہے۔ سود کی ممانعت قرآن مجید میں آئی ہے۔ اس ممانعت کے تحت حضورؐ نے ایک ہی جنس کی کم و بیش مقدار کا تبادلہ ممنوع قرار دیا تاکہ دھوکے، غلطی یا ربا کا امکان نہ رہے۔ صرف دست بدستی برابر برابر مقدار کے جنسی سودے کو جواز بخشا گیا۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت بلالؓ عمدہ قسم کی کھجور حضورؐ کی خدمت میں پیش کرنے کی غرض سے لائے۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ دو صاع ناقص کھجوریں دے کر ایک صاع عمدہ کھجوریں خریدی گئی ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا۔ "ایسا نہ کرو۔ اگر ضرورت ہو تو پہلے اپنی کھجوریں بیچ ڈال اور ان کی قیمت سے دوسری کھجوریں خرید لے"۔ صحیح مسلم میں ہے کہ حضورؐ نے بغیر تلی یا غیر معین کھجوروں کے عوض فروخت سے منع فرمایا۔ اس اصول کے پیش نظر ایک سونے کے ہار کے متعلق ارشاد ہوا کہ اسے فروخت نہ کیا جائے، جب تک سونا اور نگینے علیحدہ علیحدہ نہ کر لئے جائیں۔

ابن ماجہ اور بیہقی کی روایت کے مطابق آنحضرتؐ نے فرمایا کہ تم میں سے جو شخص کسی کو قرض دے اور پھر قرض لینے والا اس کے پاس کوئی ہدیہ یا تحفہ بھیجے یا سواری کے لئے جانور دے تو وہ نہ تو سواری استعمال کرے اور نہ ہدیہ اور تحفہ قبول کرے مگر اس صورت میں جبکہ قرض دینے سے پہلے بھی اس قسم کا معاملہ جاری ہو۔ صحیحین کی روایت ہے کہ اسی احتیاطی اصول کے پیشِ نظر حضورؐ نے مزابنہ سے منع فرمایا۔ مزابنہ سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے باغ کے تازہ پھلوں کو خشک پھلوں کے بدلے اس طرح فروخت کرے کہ خشک پھل کے پیمانے معین کرے اور تازہ پھلوں کا اندازہ کرے۔ اسی طرح محاقلہ یعنی کھڑی کھیتی کے بدلے معین مقدار غلہ کی فروخت کی ممانعت فرمائی۔ اس ضمن میں درختوں پر لگے پھلوں کو اس وقت تک بیچنے سے منع فرمایا ہے جب تک ان میں پختگی کے آثار نمایاں نہ ہو جائیں۔ حضورؐ نے ایک موقع پر فرمایا کہ جب تک قبضہ میں نہ لے کر، ناپ نہ لیا جائے، اسے فروخت نہ کیا کرو۔ عمومی طور پر حضورؐ نے غیر مقبوضہ اشیاء کی فروخت کے خلاف تنبیہہ فرمائی۔ مگر بیع سلف کی ان شرائط پر اجازت دی کہ ناپ، وزن اور معیار متعین ہوں۔ ملامست اور منابذت کی شکل میں بیع کی حرمت بھی اسی مصلحت کے تحت تھی کیونکہ ان دونوں میں فروخت شدہ کپڑے کو کھول کر نہیں دیکھا جاتا بلکہ پہلی صورت میں بیع محض کپڑے کو چھو لینے سے اور دوسری صورت کپڑے کو ایک دوسرے کی طرف پھینک دینے سے مکمل ہو جاتی ہے۔ پوشیدہ عیب والی شے کی بیع کرنے والے کو حضورؐ نے غضبِ الٰہی کا مورد قرار دیا۔ صحیح مسلم میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: "مسلمان کے لئے دھوکہ دینا جائز نہیں"۔

بیوع کے بارے میں حضورؐ کا ارشاد ہے کہ اگر بائع اور مشتری میں اختلاف واقع ہو اور فروخت شدہ چیز بجنسہٖ موجود ہو اور فریقین اگر گواہ نہ رکھتے ہوں، تو بائع کا قول معتبر ہوگا، اور فریقین کو بیع فسخ کرنے کا اختیار ہوگا۔ رفع تنازعہ کی خاطر حضورؐ نے یہ

صراحت فرمائی کہ بیع فسخ کرنے کا اختیار تا اختتامِ مجلس رہتا ہے اور بیچنے والے کو مجلس ختم کرنے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ ہاں اگر معاہدۂ بیع کی شرط ہو کہ اختیار بعد میں بھی ہوگا تو اور بات ہے۔

احتکار یعنی گرانی کے خیال سے غلہ روک رکھنے والے کو حضورؐ نے ملعون فرمایا۔ یہاں تک تنبیہ کی گئی کہ اگر کسی نے چالیس دن غلہ کو بند رکھنے کے بعد اسے خیرات بھی کر دیا تو اسے ثواب نہ ہوگا۔

قرض کا لین دین

آنحضرتؐ نے قرضہ کی بوجہ احسن ادائیگی کی بارہا تاکید فرمائی۔ روایت ہے کہ ایک شخص اپنے اثاثہ سے زائد قرضے چھوڑ مرا تو حضورؐ نے اس کا جنازہ پڑھنے سے پرہیز کیا۔ حضورؐ کا فرمان ہے کہ خدا سارے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے مگر قرض کی معافی نہیں ہوتی۔ اس لئے مفلس قرضدار کا قرضہ معاف کر دینے یا کم از کم اسے مہلت دینے کی ترغیب متعدد احادیث میں وارد ہے۔ ایک شخص کے قرضے اس کے اثاثہ سے متجاوز تھے، حضورؐ نے اثاثہ قرض خواہوں میں بحصہ رسدی تقسیم کر دینے کا حکم فرمایا۔ عصرِ جدید میں قانون دیوالیہ کے تحت بھی یہی طریق کار اختیار کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف قرض خواہوں کا تقاضا کرنے کا حق تسلیم کیا گیا ہے۔ بخاری اور مسلم میں روایت ہے کہ ایک شخص نے آنحضرتؐ سے سختی کے ساتھ قرض کا تقاضا کیا۔ صحابہؓ اس کو دھمکانے یا مارنے کے ارادے سے اُٹھے۔ حضورؐ نے فرمایا "اسے کچھ نہ کہو اس لئے کہ حق دار کو کہنے کا حق حاصل ہے۔" پھر فرمایا "اونٹ خرید کر اسے دے دو۔" صحابہؓ نے عرض کیا کہ اس کے اونٹ سے بہتر اور زیادہ عمر کا ملتا ہے۔ فرمایا۔ "وہی خرید کر دے دو۔ بہتر آدمی وہی ہے جو قرض کو خوبی کے ساتھ ادا کرے۔"

مدنیت کے اصولوں میں ایک اصول ہمیں احادیث میں ملتا ہے کہ جو شخص ایسی بنجر زمین کو کاشت کے قابل بنائے جو کسی کی ملکیت نہ ہو وہ اسی کی ہے۔ ساتھ ہی کسی کی زمین پر ناحق قبضہ کرنے کے خلاف زبردست تہدید ملتی ہے۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ اگر ایک شخص کسی قوم کی زمین بلا اجازت کاشت کرے تو اس کھیتی کی پیداوار کا وہ حقدار نہیں ہے لیکن جو خرچ اس نے کاشت پر کیا ہو۔ اس کے لینے کا مستحق ہے۔

ابوداؤد اور ابنِ ماجہ کی روایت ہے کہ آنحضرت نے فرمایا کہ تین چیزوں میں سارے مسلمان شریک ہیں۔ پانی، گھاس اور آگ۔ شفع کا حق ہمسایہ اور شریکِ ملکیت کے لئے احادیث میں تسلیم کیا گیا ہے۔ اس میں حکمت یہی ہے کہ قریب کے رہنے والوں میں مغایرت یا منافرت پیدا نہ ہو۔ یہ بھی صراحت ملتی ہے کہ مشترک ملکیت کی تقسیم کے بعد شریک کا حق قائم نہیں رہتا۔ رفاہِ عام کے لئے وقف کے احکام بھی ہمیں احادیث میں ملتے ہیں۔ روایت ہے کہ رسول اکرمؐ نے کچھ زمین جس کا نام ثمغ تھا۔ حضرت عمرؓ کو عنایت فرما دی تھی۔ حضرت عمرؓ نے کچھ اور اراضی یہود سے خرید کر اس کے ساتھ شامل کر لی۔ ایک روز حضرت عمرؓ نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا "میری جائیداد خوب ہے اور مجھے بہت پسند ہے۔" حضورؐ نے فرمایا "اسے وقف کر دو اور اس طرح کہ اس کا اصل قائم رہے اور اس کی آمدنی خرچ کی جا سکے۔" حضرت عمرؓ نے اسی پر عمل کیا۔

قرآنی اجمال کی رسالتی سطح پر تفصیل کی مثالیں ہمیں قانونِ میراث میں ملتی ہے۔ آیۂ میراث کا حکم عام ہے حضورؐ کے ارشادات سے والدین اور اولاد کے مفہوم کی تخصیص ہوئی۔

حضورؐ نے یہ بھی فرمایا کہ ایک دوسرے سے میراث پانے والے ایک ہی دین پر ہونے چاہئیں۔ آپ ہی کا یہ ارشاد بھی ہے
کہ قاتل مقتول کے مال کا وارث نہیں ہوتا۔ اسی طرح قرآن مجید میں بظاہر وصیت کے متعلق عام حکم ہے۔ حضورؐ نے آیۂ میراث کے
پیش نظر صراحت فرمائی ہے کہ وارث کے لئے وصیت نہیں ہے۔ اِلّا یہ کہ تمام ورثاء رضامند ہوں۔ لا وصیۃ للوارث۔ پھر آپ
نے وصیت کی تحدید ایک تہائی جائیداد تک فرمائی۔ حضرت سعد بن وقاص فتح مکہ کے سال میں بیمار ہوئے اور انہوں نے آنحضرت
سے استفسار کیا کہ کتنے مال کی وصیت کر دیں۔ حضورؐ نے ایک تہائی کی وصیت کی اجازت دی اور فرمایا کہ ایک تہائی بھی بہت ہے
ارشاد ہوا کہ اگر تو اپنے وارثوں کو مالدار اور خوشحال چھوڑے گا۔ تو یہ اس سے بہتر ہے کہ تو ان کو مفلس چھوڑے اور وہ لوگوں کے
آگے ہاتھ پھیلائیں۔ اس روایت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وصیت کے احکام کی صورت آیۂ میراث کے نزول کے بعد بدل گئی۔
نیز حضورؐ نے توضیح فرمائی کہ وصیت اور تقسیم میراث پر قرض کی ادائیگی مقدم ہے۔ حالانکہ آیۂ قرآنی کے الفاظ ہیں "مِنْ بَعْدِ
وصیۃٍ توصون بھا او دَین" بظاہر ان الفاظ سے قیاس ہو سکتا تھا کہ وصیت کا ذکر چونکہ پہلے آیا ہے۔ اس لئے اسے دَین
یعنی قرضہ پر بھی فوقیت ہوگی۔

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں کچھ رشتے حرام فرمائے ہیں۔ مثلاً ماں، بیٹی، بہن یا دو بہنوں کا ایک عقد میں جمع کرنا وغیرہ۔
ان کے علاوہ باقی رشتوں کو آیۂ قرآنی میں حلال بیان کیا گیا ہے۔ حضورؐ کا فیصلہ تھا کہ بیک وقت پھوپھی اور بھتیجی یا خالہ اور بھانجی سے
بھی نکاح نہ کیا جائے کہ اس طرح خطرہ ہے کہ ان کے درمیان صلہ رحمی اور محبت قائم نہ رہ سکے۔

عورتوں کے حقوق کے بارے میں متعدد احادیث میں تذکرہ ملتا ہے۔ صحیحین میں ہے کہ آنحضرت نے فرمایا "بیوہ عورت کا
نکاح نہ کیا جائے جب تک اس سے اجازت حاصل نہ کرلی جائے اور کنواری عورت کا نکاح نہ کیا جائے جب تک اس سے دریافت نہ کر لیا جائے"
حضورؐ نے فرمایا کنواری کی خاموشی ہی رضامندی کے مترادف سمجھی جائے۔ گویا قرآن کی شہادت کا جواز اس حکم سے پیدا
ہوتا ہے۔ ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور دارمی نے ابوموسیٰ سے روایت ہے کہ اگر کنواری انکار کرے تو اس پر جبر جائز نہیں۔
چنانچہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ایک کنواری لڑکی نے بارگاہِ نبوت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرے باپ نے میری رضامندی
کے بغیر میرا نکاح کر دیا ہے۔ آپ نے اس کو چھوڑ دینے کا اختیار دیا۔ حضورؐ نے خلع کا حق ثابت بن قیس کی بیوی کو دلوایا اور
فیصلہ محض اس کی ذاتی نفرت کی بنا پر دیا۔ شرط یہ رکھی گئی کہ مہر میں جو باغ اسے شوہر نے دیا تھا۔ وہ شوہر کو واپس کر دے۔ ان مثالوں
سے ظاہر ہے کہ حضورؐ نے عورت کو معاشرہ میں اس کا جائز مقام دلوایا۔ اسی ضمن میں غالباً شعار کی ممانعت بھی آتی ہے۔ شعار یہ ہے کہ
کوئی شخص اپنی بیٹی کا نکاح اس شرط پر کرے کہ وہ اپنی بیٹی کا نکاح اس کے ساتھ بدلے کے طور پر کر دے گا۔ اور دونوں نکاحوں میں
مہر کچھ نہ ہوگا۔ اس میں قباحت یہی ہے کہ لڑکیوں کی رضامندی کا حق بالائے طاق رہ جائے گا۔

طلاق کی صورت میں حضانت کا حق حضورؐ نے صغر سن بچوں کی ماں کو دلوایا۔ حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت نے ایک لڑکے
کو اس امر کا اختیار دیا کہ وہ ماں کے پاس رہے یا باپ کے پاس۔ ان فیصلوں میں بچوں کی صحیح تربیت اور مناسب نشوونما کا نکتہ پوشیدہ ہے۔
عہدِ عتیق میں قانونِ حمورابی کے مطابق کسی کی بیٹی یا بیٹے کے قتل پر قاتل کی بیٹی یا بیٹے کو قتل کیا جاتا تھا اور اصلی قاتل محفوظ رہتا

تھا۔ قانون حمورابی کے بعد اس کے قانون قصاص کا ذکر ہے۔ آنحضرت کے عہد معدلت گستری میں قتلِ عمد، شبہ عمد اور قتلِ خطاء میں فرق کیا جانے لگا۔ اس تفریق کا ذکر حضورؐ کے خطبۂ حجۃ الوداع میں بھی ملتا ہے۔ قتلِ عمدؔ کے لئے قصاص کا حکم ہوا۔ یعنی کہ وارث خون بہا پر راضی ہو جائیں یا معاف کر دیں۔ شبہ عمد کی صورت میں حضورؐ نے دیت مقرر فرمائی۔ ایک روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ قاتل کے ہاتھ نے عمداً فعل کیا ہے اور اس کے دل نے خطاء۔ یہ بھی ارشاد ہوا کہ اگر قاتل کے ہاتھوں بلا ارادہ یا نیت کے قتل ہو جائے تو پھر مارنے والے کا قاتل دوزخ کا مستحق ہو گا۔" آیت ربانی لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی کے موافق شخصی ذمہ داری کا اصول آنحضرت کے زمانے میں قائم ہوا۔ زمانۂ جاہلیت میں نظیریں ملتی ہیں کہ کسی طاقتور قبیلے کے فرد کا خون بہا معمولی قبیلے کے فرد سے دگنا ہوتا۔ ابن ہشام نے اپنی سیرت میں اس بات کا ذکر کیا ہے۔ آزاد فرد کا قاتل غلام ہوتا تو غلام سے قصاص لینا ناکافی سمجھا جاتا اور غلام کے مالک یا کسی اور آزاد و رشتہ دار کا سر مانگا جاتا۔ کوئی آزاد کسی غلام کو قتل کرتا تو قاتل کا قصاص گوارا نہ کیا جاتا بلکہ کوئی کم تر معاوضہ دیا جاتا۔ یہی حال عورت کا تھا۔ آنحضرت کے حکم سے ایک آزاد آدمی بھی ایک غلام کے قتل کے لئے واجب القتل ٹھہرا حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت نے فرمایا" سب مسلمان قصاص اور دیت میں برابر ہیں۔" کل مومنٌ اِخوۃٌ کی یہ عملی تشکیل تھی۔ حضورؐ نے فعل کی نوعیت کے لحاظ سے سزا میں بھی تفریق کی ایک شخص کو جس نے مقتول کو پکڑ رکھا تا آنکہ قاتل نے اسے مار ڈالا۔ حضورؐ نے اسے تا عمر قید کی سزا دی اور قاتل کو قتل کرا دیا گیا۔

حضورؐ نے بہت سی صورتوں میں ضمان یعنی TORT کا اصول قائم فرمایا اور ہرجے کا معاوضہ بجائے مساوی انتقام کے رقمی یا مادی صورت میں دیا جانے لگا۔ غیر جانبدارانہ قانونی انصاف کے ساتھ رحم کے تقاضے بھی نظر انداز نہ ہوئے۔ حضورؐ نے ضرب یا جراحت کی دیت کے پیمانے مقرر فرمائے۔ لیکن رحمت للعالمینؐ کی شان یہ تھی کہ کمزوروں اور ناداروں سے مروت اور فیاضی کا سلوک ہوتا تھا۔ ابن حصین روایت کرتے ہیں کہ ایک نادار و مفلس طبقہ کے لڑکے نے ایک دولت مند خاندان کے لڑکے کا کان کاٹ ڈالا۔ مفلس طبقہ کی جماعت حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا" ہم تو فقیر لوگ ہیں۔ دیت کی استطاعت نہیں رکھتے۔" حضورؐ نے ان کو معاف فرما دیا۔

حالات و واقعات کے لحاظ سے مناسب رعایت روا رکھی جاتی تھی۔ ایک اپاہج اور بیمار شخص جس نے قبیلہ کی ایک لونڈی سے زنا کیا تھا حضورؐ کی خدمت میں لایا گیا۔ حضورؐ کے حکم سے اسے کھجور کی ایک ٹہنی سے جس میں چھوٹی چھوٹی سو شاخیں تھیں، ایک ہی ضرب لگائی گئی اور یوں" مأۃ جلدۃ" کا لفظی تقاضا پورا کیا گیا۔ کیونکہ احتمال تھا کہ وہ کوڑوں کی سزا سے مر جائے گا۔ سفر یا جنگ کے حالات میں چوری کے لئے ہاتھ کاٹنے کی سزا سے احتراز کیا گیا۔ حضورؐ کا فرمان ہے" لا تقطع الایدی فی السفر" اور ایک روایت میں" سفر" کی بجائے غزورہ کا لفظ ہے ایک شخص کے غلام نے اس کی بیوی کا آئینہ چرا لیا۔ غلام کو حضورؐ نے سزا دی۔ عباد بن شرحبیل کے سرقے کا واقعہ بھی حدیث میں مذکور ہے۔ انہوں نے کسی کے کھیت میں گھس کر وہاں سے کچھ غلہ توڑ کر کھا لیا اور کچھ اپنے کپڑے میں باندھ لیا۔ اتنے میں مالک آن پہنچا۔ اس نے انہیں مارا اور کپڑا بھی چھین لیا اور حضورؐ کے پاس ان کو لے گیا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ یہ نادان تھا تو تم نے اسے سمجھایا نہیں اور بھوکا تھا تو کھلایا نہیں۔ یہ سن کر مالک نے

اسے کپڑا بھی واپس کر دیا اور ایک نصف وسق غلہ بھی دے دیا۔

امتحانی آزادی

میری ناچیز رائے میں اس روایت سے پہلے جرم پر محض فہمائش یا امتحانی آزادی PROBATION کے جواز کا قیاس ہو سکتا ہے۔ ایک شخص کو جس نے کھانے کی چیز کی چوری کی تھی۔ حضورؐ نے سزا نہیں دلوائی۔ درختوں پر لگے ہوئے پھلوں اور سفید کھجوروں کے سرقہ پر بھی حضورؐ نے قطع ید سے منع فرمایا۔ ایک غلام کو جو عادی چور تھا حضورؐ نے چار مرتبہ معاف فرما دیا۔ اور بعد کے جرائم پر سزا دلوائی۔

آنحضرتؐ کی حدیث ہے "لاضرر و لاضرار" یعنی شریعت کا مطمح نظر کسی فریق مقدمہ کو نقصان پہنچانا نہیں ہے۔ اسلامی فقہ میں استحسان مصالح مرسلہ کی قسم کے اصولوں کی بنیاد اس قولِ نبوی سے مناسبت رکھتی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ کسی کو "تنبیہ" یا تعزیر کے طور پر مارنا ہو تو خطاکار کے منہ پر نہیں مارنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ ایسا فعل شرفِ انسانی کے خلاف ہے۔ شرابی کو بعض روایات کے مطابق حضورؐ نے معمولی مارپیٹ کی سزا دی اور بعض حالتوں میں کوڑے بھی لگوائے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ ہر نشہ آور چیز خمر ہے اور خمر حرام ہے۔

اسلام سے پہلے عرب میں کوئی گڑھا یا کوئی جانور اگر کسی آدمی کی مضرت یا ہلاکت کا باعث ہوتا تو سزا وار عقوبت قرار دیا جاتا۔ انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک انگلستان میں بھی کسی گاڑی درخت یا دیگر کسی جاندار قاتل کو قانوناً سزائے قتل دی جاتی تھی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ بے زبان جانور، کان اور کنوئیں کی ضرر رسانی سے کوئی ذمہ داری پیدا نہیں ہوتی۔

جان و مال کی حفاظت کا حق متعدد احادیث سے ثابت ہے۔ حضرت یعلی بن امیہ سے روایت ہے کہ ان کا ایک نوکر ایک دوسرے آدمی سے لڑ پڑا۔ دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ کاٹ کھایا۔ ان میں سے ایک نے جب اپنا ہاتھ دوسرے کے منہ سے زور سے کھینچ کر نکالا تو اس کے دانت گر پڑے۔ اس نے حضورؐ سے استدعا کی کہ دانتوں کا معاوضہ دلوائیں۔ آپ نے فرمایا۔ کیا وہ اپنے ہاتھ کو تیرے منہ میں چھوڑ دیتا کہ تو اس کو اونٹ کی طرح چباتا رہتا؟" ایک اور حدیث میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے مال کی حفاظت میں لڑتا ہوا مارا جائے تو اسے شہید کا درجہ حاصل ہوگا۔ اور اگر وہ غاصب کو ایسی حفاظتی لڑائی میں مار ڈالے تو اس سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ اسی راوی نے آنحضرتؐ کا قول روایت کیا ہے کہ اگر کوئی شخص بلا اجازت تیرے گھر میں جھانکے اور تو اسے کنکری مارے جس سے اس کی آنکھ پھوٹ جائے تو تجھ پر کوئی گناہ نہیں۔" یوں ذاتی تخلیہ یا PRIVACY کا حق حضورؐ نے تسلیم فرمایا۔

کوئی امتیاز نہیں

حضورؐ نے واضح فرما دیا کہ حدود کے معاملے میں بڑے اور چھوٹے، امیر اور غریب میں امتیاز نہیں ہو سکتا۔ حضورؐ نے ایک مرتبہ خطبہ ارشاد فرمایا کہ تم سے پہلی امتیں اس لئے ہلاک ہوئیں کہ ان میں سے جب کوئی عزت والا چوری کرتا تھا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے اور کوئی کمزور آدمی چوری کرتا تھا۔ تو اسے سزا دیتے تھے۔ قسم ہے خدا کی اگر فاطمہؓ محمدؐ کی بیٹی بھی چوری کرے تو میں اس کا ہاتھ کاٹ ڈالوں۔ اس خطبہ کا ذکر بخاری اور مسلم دونوں نے کیا ہے۔

رسول مقبولؐ کے زیرِ ہدایت شک کا فائدہ ملزم کو دیا جانے لگا۔ آپؐ کا قول ہے "ادرؤ بالشبہات" یعنی شبہات کی موجودگی

ہیں سزاؤں سے درگزر کرو" اس قول کا حوالہ ابن رشد نے ہدایۃ المجتہد میں دیا ہے اور اس کی روایت ترمذی میں بھی موجود ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے حضورؐ کا فرمان مروی ہے کہ مسلمان سے جہاں تک ہو حدود کو دور کرو اور اگر ذرا سا موقع بچاؤ کا نکل آئے تو اس کو چھوڑ دو۔ ایک موقع پر حضورؐ نے فرمایا: " فان الامام ان یخطی فی العفو خیرٌ من ان یخطی فی العقوبۃ" یعنی معافی دینے میں خطا کرنا بہتر ہے بہ نسبت سزا دینے میں غلطی کرنے سے۔

حضرت اسامہ بن زید سے روایت ہے کہ قبیلہ جہینہ کے لوگوں کے مقابلے میں آنحضرتؐ نے ہم کو بھیجا۔ میں ایک شخص کے مقابلہ پر آیا اور اس پر نیزہ سے حملہ کرنا چاہتا تھا کہ اس نے لا الٰہ الا اللہ کہہ دیا۔ میں نے اس کو نیزے سے مار ڈالا اور بارگاہِ نبوتؐ میں حاضر ہو کر عرض کیا، آپؐ نے فرمایا جب اس نے لا الٰہ الا اللہ کہہ دیا تھا تو پھر تو نے اسے کیوں قتل کر دیا؟ میں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ اس نے تو اپنے آپ کو بچانے کے لئے کلمہ پڑھا تھا۔ آپؐ نے فرمایا، تو نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا؟ حضورؐ نے ایک اور مرتبہ فرمایا:۔

" نحن نحکم بالظاھر واللہ یتولی السرائر" یعنی ہم ظاہر پر فیصلہ کرتے ہیں (جہاں نیت نہ معلوم ہو سکے) اور نیتوں کا حال اللہ جانتا ہے۔ ظاہر واقعات اور قرائن پر انحصار کا اصول ایک در مخاصمہ سے روشن ہوتا ہے۔ جو حضورؐ نے فیصلہ فرمایا۔ ایک جانور کی ملکیت کے متضاد زبانی دعوؤں کی صورت میں حضورؐ نے فیصلہ اس شخص کے حق میں کیا۔ جس کے قبضہ میں وہ جانور تھا۔ جدید اصول قانون کا مقولہ بھی یہی ہے کہ قبضہ قانون کا ۹/۱۰ حصہ ہے۔

قتل کے مقدمہ میں عدم شہادت کی صورت میں حضورؐ نے قسامت یعنی جماعتی قسم کا قاعدہ استعمال فرمایا اور جہاں فریقین میں سے کوئی جماعت قسم کھانے کو تیار نہ ہوئی تو حضورؐ نے دیت بیت المال سے دلوا دی۔

بعض نظیروں سے مترشح ہے کہ حضورؐ نے فوجداری نوعیت کے مقدموں میں ملزم کو تحقیقات تک اور مدیون کو قرض کی ادائی کے لئے حوالات میں محبوس رکھا، اس قسم کی ایک روایت سنن ابو داؤد میں شامل ہے۔ صاحب مبسوط نے اس بات کا ذکر بھی کیا ہے کہ بعض اوقات عہد نبوی میں حاضری کا مچلکہ بھی لیا جاتا تھا۔

مغربی قانونی فلسفہ کا ایک اصول یہ ہے کہ صدر ریاست دیوانی عدالتوں میں جواب دہ نہیں ہو سکتا۔

اسلامی نظام میں کسی فرد کو خواہ وہ ریاست کا سربراہ ہی کیوں نہ ہو قانون سے بالاتر نہیں سمجھا جاتا۔ خود رسول اکرمؐ نے اپنی ذات کے خلاف ضمان یعنی ٹارٹ اور دیوانی، دونوں قسم کے دعوے سن کر مدعیوں کے حق میں فیصلے دیئے۔ اس قسم کے فیصلے قانون کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہیں۔ انہی نظیروں کی وجہ سے عہد خلافت راشدہ میں خلیفۂ وقت کو بھی قاضی ایک معمولی فریق مقدمہ کی حیثیت سے طلب کر لیتا تھا اور اسے حاضر ہو کر جواب دہی کرنی پڑتی تھی۔ قضا کی اہمیت حضورؐ کے ایک اور قول سے بھی واضح ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ دو فریقوں کے کسی جھگڑے کا عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا، صدقہ ہے۔

شہادت کی پرکھ کی نسبت حضورؐ کا ارشاد ہے کہ خائن مرد اور خائنہ عورت زانی مرد اور زانیہ عورت کی شہادت مقبول نہیں۔ جو شخص کسی کی نسبت دل میں کینہ رکھتا ہے۔ یا کھانے پینے میں کسی کا طفیلی ہے اس کی شہادت بھی اس کے حق میں جس کا وہ

طفیلی ہے۔ قابلِ پذیرائی نہیں۔ حضورؐ کی یہ بھی سنت ہے کہ جب شہادت کے متعلق کسی قسم کا شبہ ہو تو گواہوں کا تزکیہ کیا جائے۔

مقدمہ بازی کو حضورؐ نے عمومی طور پہ مذموم قرار دیا۔ آپ کا ارشاد ہے کہ "جھگڑالو اور مقدمہ باز شخص کو اللہ تعالیٰ سخت ناپسند کرتا ہے۔ وہ خدائے پاک کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض ہے۔" بعض مقدمات میں حضورؐ نے فقط ایک گواہ کی شہادت پر بھی فیصلہ فرمایا۔ بشرطیکہ حلف اس کے ساتھ ہی شامل ہو۔

نفع یا نقصان کے اثبات یا نفی کا پیمانہ حضورؐ کے فرمان کے مطابق عرفِ عام ہے۔ اس کی مثال براؓ بن عازب کا مقدمہ ہے۔ اس کی اونٹنی کسی کے باغ میں گھس گئی اور اس کو خراب کر ڈالا۔ باغ کا مالک اور صاحبِ شتر دونوں اپنے آپ کو معذور یا حق بجانب سمجھتے تھے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ دن کے وقت کھیت اور باغ کے مالکوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے ملک کی حفاظت کریں۔ مال مویشی کے مالکوں پر اس کی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی۔ برخلاف اس کے رات کے وقت مویشی کے مالکوں کا فرض ہے کہ ان کو سنبھالے رکھیں۔

ایک بنیادی جامع بلیغ اصول حضورؐ نے "الخراج بالضمان" کہہ کر قائم فرمایا یعنی کسی چیز کی حاصل یا پیداوار کا مستحق وہی شخص ہوتا ہے جو اس کے وجود اور بقا کا ذمہ دار ہے۔ دوسرے لفظوں میں جو شخص کسی چیز کا "تاوان" برداشت کرتا ہے اس کو اس سے فائدہ اٹھانے کا بھی حق ہے۔

معاہدات کے متعلق حضورؐ نے یہ کلیہ بیان فرمایا کہ مسلمانوں نے آپس میں جن شرطوں کا التزام کیا ہو۔ ان کی پابندی لازم ہے۔ الا یہ کہ انہوں نے کوئی شرط عائد کی ہو جس کی وجہ سے حرام حلال ہو جائے۔ یا حلال کو حرام سمجھنا پڑے۔

بعض خصومات میں تسویے کے لئے ماہرین کی امداد حاصل کرنے کی مثالیں بھی عہدِ نبویؐ سے ملتی ہیں۔ تعمیرات، غلے یا دیگر زرعی پیداوار کا اندازہ کرنے کے لئے آنحضرتؐ نے ماہر، برسرِ موقع تفتیش کے لئے، مامور فرمائے۔ قیافہ شناس کی بشارت بطورِ قرائن کے مقبول کئے جانے کی نظریں تاریخ عہدِ نبوی میں مذکور ہے۔

نبی اکرمؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر (۱۰ھ) جبل الرحمۃ کے مشہور خطبے میں جو تصریحات فرمائیں تاریخ میں منشورِ انسانیت کے مترادف ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر شخص کے بنیادی حقوق یعنی جان، مال آبرو محفوظ اور قابلِ احترام ہیں۔ امانت کی واپسی اور قرض کی ادائی فرائض میں شامل ہے۔ ربا لینے یا دینے کی قطعی ممانعت کی گئی اور ارشاد ہوا کہ قرض خواہ کو صرف اصل رقم واپس ہوگی۔ قتل عمد کے لئے قصاص اور شبہ عمد کے لئے دیت ہوگی۔ زوجین کے ایک دوسرے پر حقوق کی صراحت کی گئی۔ کسی کا مال غصب کرنے اور کسی مسلمان بھائی سے لڑائی کے خلاف سخت تہدید کی گئی۔ احترام فرد کا معیار، نسل و رنگ کی اضافی قدروں کی بجائے اتقا یعنی خوفِ خدا قرار دیا گیا، وراثت میں قرآنی حصص کی پابندی کی تاکید ہوئی اور وصیت کی تہائی مال تک تحدید کی گئی۔

ہم نے بحرِ سنتِ نبویؐ کی غواصی کر کے چند دُرِ آبدار آپ کی خدمت میں پیش کئے ہیں۔ حضورؐ کے قول، فعل اور تقریر میں کئی مسائل پر ہمیں رہنمائی مل سکتی ہے لیکن یہ مقالہ ان سب کا متحمل نہیں ہو سکتا ع

سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

بہرصورت جو نظریں میں نے عرض کی ہیں ان سے واضح ہو گیا ہو گا کہ اسلامی نظام جس کی داغ بیل حضورؐ رسالت مآب نے ڈالی تھی قانون کا احترام محض سماجی یا مالی مواخذہ کے خوف سے وابستہ نہیں کرتا بلکہ افراد اور جماعتوں کے اخلاقی شعور کو بیدار کرکے ایک ایسا نصب العین ان کے سامنے رکھتا ہے۔ جس کے زیر اثر قانون کے تقاضوں سے گریز یا فرار کی کم سے کم گنجائش رہے اور افراد اسلامی قانون کی بالادستی بہ طیب خاطر قبول کر لیں۔ یہ گویا ان کا دینی فریضہ ہے کہ قانون کے تقدس کو قائم رکھیں۔ اس طریق کار سے نظام ربوبیت انسانی معاشرہ میں تشکیل پا سکتا ہے تاکہ نیابت الٰہی کے تقاضے پورے ہوں۔ یہ حضورؐ ہی کا فیض ہے کہ ہمارے پاس ایک ایسا نظام شریعت موجود ہے۔ جس کی تحسین اعلام الموقعین میں ابن قیم نے ان الفاظ میں کی ہے

"شریعت کی اساس و بنیاد حکمت پر اور بندوں کے معاشی و معادی مفادات پر قائم ہے۔ شریعت کلیتہً عدل، ہمہ تن رحمت اور سراپا حکمت ہے۔ پس جو مسئلہ بھی عدل سے نکل کر ظلم کی طرف یا رحمت سے عدم رحمت کی طرف یا صلاح سے فساد کی طرف یا حکمت سے نامعقولیت کی طرف جا رہا ہو وہ شریعت ہی نہیں اگرچہ اسے بہ دلائل داخل شریعت کر دیا گیا ہو۔"

اسلام اور مذہبی رواداری

خلیفہ عبدالحکیم

اسلام نے دوسرے مذاہب وادیان کے ساتھ جو رویّہ اختیار کیا، اس کے متعلق قرآن میں واضح احکام موجود ہیں۔ جب قرآن نے کہا کہ لا اکراہ فی الدین (مذہب کے معاملے میں کوئی جبر نہیں)، تو گویا اس نے غیر مبہم الفاظ میں تمام دُوسرے ادیان کا پُوری آزادی کے ساتھ زندہ رہنے کا بنیادی حق تسلیم کر لیا۔ آیت "لا اکراہ فی الدین" میں لفظ دین اپنے مفہوم کے لحاظ سے مروجہ لفظ "مذہب" سے بہت وسیع معنویت کا حامل ہے۔ قرآن میں لفظ دین مختلف معنوں میں استعمال ہُوا ہے:

۱۔ کسی ملک یا ملّت کے قوانین،

۲۔ قانون کے مطابق سزا اور جزا،

۳۔ ایک قوت مطاع کی اطاعت،

۴۔ طریقۂ زندگی، جس میں عقاید اور اعمال شامل ہیں۔

ماکان لیاخذ اخاہ فی دین الملک۔ ملکی قانون کے مطابق وُہ اپنے بھائی کو گرفتار نہیں کر سکتا تھا۔

"دین الملک" میں دین کا لفظ دُوسرے معنوں میں استعمال ہُوا۔ لا اکراہ فی الدین میں دین کا لفظ اپنے وسیع ترین مفہوم میں استعمال ہُوا ہے، جس میں عقاید و اعمال سبھی داخل ہیں۔ ایک فرد یا قوم کا طریقۂ زندگی درحقیقت اس نظریۂ حیات کا عکس ہوتا ہے، جس کو وہ شعوری یا لاشعوری طور پر قبول کرتا ہے۔

دینی آزادی کا مفہوم جب مغرب میں انسانی زندگی کو دینیت اور لادینیت، روحانیت اور مادیت، مذہب اور ریاست کی مکمل اور مطلق ثنویت میں تقسیم کیا گیا، تو اس سے پہلے انسان کی تمام تر زندگی کی تشکیل خواہ وہ پرائیویٹ ہو یا معاشرتی سب مذہبی عقاید پر ہی ہوتی تھی۔ مذہبی اقدار و اصول زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہوتے تھے۔ عقاید، اخلاق، آداب و قوانین اور رسوم و رواج سب ایک ہی کل کے مربوط اجزا سمجھے جاتے تھے۔ اس لیے جب قرآن نے دین کے معاملے میں مکمل آزادی کا اعلان کیا، تو اس آزادی کا مفہوم مشہور صدر روزولٹ کی اعلان کردہ "چار آزادیوں" سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اگر کسی سلطنت میں کوئی قوم یا ملّت اپنے شخصی قانون کی پیروی پر مُصر ہو، تو اسے اس کی پُوری آزادی ہونی چاہیے اگرچہ دُوسرے حقوق کی طرح اس حق کا استعمال بھی چند حدود کے اندر محصور رہو گا۔ اگر یہ بنیادی اخلاقی اقدار کے خلاف ہو یا معاشرے کے امن اور ملک کے دفاع میں خلل انداز ہو، تو اس پر عمل کرنے کی کلی ممانعت ہوگی، خواہ وہ کسی ملّت یا قوم کے مذہب کا جزو ہی

کیوں نہ ہو، مثلاً ایک اسلامی مملکت میں کسی بیوہ کو اپنے خاوند کی چتا پر جلنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی، خواہ کسی ملت کے نزدیک یہ عمل کتنا ہی پسندیدہ کیوں نہ ہو۔ اسی طرح ہر حالت میں بلا تفریقِ مذہب و ملت ربا، جُوا اور زنا مکمل طور پر حرام ہوں گے۔ اس قسم کی حدود اور پابندیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مختلف ملتوں اور قوموں کو اپنے عقاید و اعمال کے مطابق زندگی بسر کرنے کی مکمل آزادی ہو گی اور اس بنیادی اصول کا جواز قرآن حکیم کی اسی آیت "لا اکراہ فی الدین" سے مستنبط ہے۔

صلح پسندی

آنحضرتؐ کی دفاعی جنگوں کے متعلق یہ غلط نقطۂ نگاہ پیش کیا جاتا ہے کہ آپ عرب کے بُت پرست قبائل کو تلوار کے زور سے اپنے دین میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ کافی مدت تک آنحضرتؐ نے کوشش کی کہ لوگ مسلمانوں کو اپنے عقاید اور نظریۂ حیات کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آزادی دیں تاکہ وہ اور مسلمان دونوں ایک پُرامن ماحول میں اپنے اپنے طریقوں پر عمل پیرا ہوتے رہیں، لیکن آپؐ کو اس مقصد میں کامیابی نہ ہو سکی۔ اس ناکامی کے بعد آنحضرت بقول کارلائل ایک انسان اور ایک عرب کی حیثیت سے مجبور ہو گئے کہ اپنے دین و عقیدے کی آزادی اور بقاء کے لیے قوت کا مقابلہ مناسب قوت سے کریں۔ وحشی اور ظالم قبیلوں کے ساتھ پُرامن ترغیب اور رواداری کا برتاؤ ناممکن تھا۔ اگر ان کے خلاف قوت کا استعمال نہ کیا جاتا، تو اسلام اسی وقت ختم ہو جاتا۔ ان کی ذہنیت کا اندازہ تو اس سے ہو سکتا ہے کہ آنحضرتؐ کی وفات کی خبر سُنتے ہی انھوں نے مسلمانوں کی نوخیز مملکت کے مرکز مدینہ پر حملہ کر دیا۔ اگرچہ انہوں نے بظاہر اسلام کی سیاسی طاقت کو تسلیم کر لیا تھا۔ یہ مسلمانوں کے بلند عزائم اور حوصلے کا نتیجہ تھا کہ وہ اس جوابی انقلاب کے ضرررساں نتائج سے محفوظ رہے اور یہ رجعت پسند تحریک ہمیشہ کے لیے ختم کر دی گئی۔ آنحضرتؐ کا رویّہ ان لوگوں اور قبیلوں کے متعلق نہایت صلح کن اور رواداری کا بہترین مظہر تھا، جنھوں نے مسلمانوں کے ساتھ غیر جارحانہ رویّہ اختیار کیے رکھا۔ جب وہ مکّہ واپس آئے، جہاں ان وحشی اور ظالم لوگوں نے مسلمانوں پر ہر قسم کے جور و ستم روا رکھے تھے، تو آنحضرتؐ نے ان تمام باتوں کو محض اس لیے فراموش کر کے انھیں معاف کر دیا کہ اب اسلام کو ان سے کسی قسم کا خطرہ نہ تھا۔

یہود و نصارٰی سے مراعات

جب آنحضرتؐ پہلی دفعہ مدینہ پہنچے، جہاں کے باشندوں کی اکثریت نے انھیں دعوت دی تھی اور ان کی حفاظت کا ذمّہ لیا تھا، تو وہاں یہودیوں کی ایک اقلیت بھی تھی، جو دولت اور زمین کی ملکیت کے لحاظ سے خاصی بااثر تھی۔ آنحضرتؐ نے ان کے ساتھ جس قسم کا معاہدہ کیا، اس سے اسلام کی رُوح کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ انھیں اپنے عقاید و اعمال کی پیروی کرنے اور اپنے طریقۂ زندگی کو آزادی سے ادا کرنے کا مکمل حق تسلیم کیا گیا۔ اس کے ساتھ انھیں یہ یقین بھی دلایا گیا کہ اگر ان کے مقدمات آپ کے سامنے بھی پیش ہُوئے، تو ان کا فیصلہ ان کی اپنی شریعت اور قانون کے مطابق کیا جائے گا۔ لیکن انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لیے کفارِ مکّہ سے خفیہ ساز باز شروع کر دی۔ انھوں نے پتھر کی ایک چٹان لڑھکا کر یا زہر دے کر آنحضرتؐ کو ختم کرنے کی بھی کوشش کی اور ایک یہودی عورت نے تو آپؐ کو زہر کھلا ہی دیا۔ لیکن خوش قسمتی سے اس کا اثر مہلک ثابت نہ ہو سکا۔ آپؐ نے یہود و نصارٰی کو یقین دلانے کی انتہائی کوشش کی کہ آپ کا مقصد محض ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کے لائے ہوئے ابدی پیغام کی تکمیل ہے۔ ان کی فراخدلی سے تعریف کی۔ ان کی کتابوں کو الہامی اور ان کی تعلیمات کو نورِ ہدایت اور حیات افزا قرار دیا اور خود ان کو خدائے واحد کے سچے پیغمبر تسلیم کیا۔ لیکن اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہُوا۔ یہودی ان سے یہ مطالبہ کرتے تھے کہ وہ پیچیدہ اسرائیلی قوانین کی مکمل پیروی کریں اور

عیسائی ان سے تثلیث، ازناری اور کفارے کے عقیدوں کو تسلیم کرنے کی توقع رکھتے تھے، لیکن ان باتوں کو تسلیم کرنا آنحضرتؐ کی بنیادی تعلیمات اور اسلام کی اصلاحی تحریک کی روح کے منافی تھا۔ اس کے باوجود ان کی خواہش تھی کہ یہ دو ملتیں جو توحیدی عقیدے کی حامل تھیں، مسلمانوں کے ساتھ صلح، امن اور آشتی سے رہ سکیں۔ کیونکہ ان تینوں میں کم از کم ایک چیز تو مشترک ہے یعنی عقیدۂ توحید۔

قل یاھل الکتاب تعالوا...... الخ (۳ : ۶۴)

یہ پیشکش اس وقت قابلِ توجہ نہ سمجھی گئی، لیکن اب چودہ صدی کے بعد کم از کم عیسائی دنیا کے بہترین افراد بظاہر اس کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نظر آتے ہیں۔ اس پیشکش میں صرف چند باتیں ہیں۔ ایک خدا پر ایمان، جو سب توحیدی مذاہب میں مشترک ہے اور خدا کے سامنے تمام انسانوں کی مساوات یعنی کوئی فرد یا جماعت کسی شخص یا اشخاص کو اپنا خداوند یا الٰہ نہ تسلیم کرے۔ اس وقت بھی جب یہ پیشکش قبول نہ کی گئی تھی مسلمانوں کو یہ ہدایت ملی تھی کہ وہ اہلِ کتاب سے ہر قسم کے بہترین روابط یا رشتہ مودت و الفت قایم کریں، جو مشرک اور کفار کے ساتھ ممکن نہ تھا، چنانچہ مسلمانوں کو اجازت تھی کہ وہ یہود و نصاریٰ کی عورتوں سے تبدیلیِ مذہب کا تقاضا کیے بغیر شادی کر سکتے ہیں اور ان کے اکل و شرب میں شامل ہو سکتے ہیں۔ قرآن میں نیک عیسائیوں کی خاص طور پر تعریف کی گئی ہے کہ وہ اپنے ایمان اور ہمدردیوں میں مسلمانوں سے نزدیک ترین ہیں اور خدا کی محبت میں سرشار اور عجز و انکسار کے پتلے ہیں۔

ایک دوسری جگہ قرآن میں مسلمانوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ ایک قوم کے تمام افراد یکساں نہیں اور اس لیے محض کسی ایسی قوم کا فرد ہونا، جس کو تم ناپسند کرتے ہو یا جو تمہاری دشمن ہے، اس کے خراب ہونے کی دلیل نہیں۔ افراد کی اچھائی یا برائی کا معیار بھی انفرادی ہونا چاہیے نہ کہ مجموعی۔

عبادت گاہوں کا احترام

انصاف کے معاملے میں دوست، دشمن، مسلم و غیر مسلم کی کوئی تمیز نہیں۔ اخلاقی یا قانونی حدود میں معیار ایک اور یکساں ہونا چاہیے اور اس میں کسی قسم کی دُوئی قابلِ برداشت نہیں سمجھی گئی۔ ہر قسم کا جارحانہ اقدام ممنوع قرار دیا گیا۔ قرآن میں بے شمار آیات ہیں، جن میں یہ چیز دہرائی گئی ہے کہ خدا حدود اللہ سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اسلام کا بنیادی نظریۂ حیات تمام دیگر ادیان کو صرف آزادی دینا ہی نہیں بلکہ سیاسی نظام اور معاشرتی ماحول میں ان کی مکمل حفاظت کا انتظام بھی ہے۔ مندرجہ ذیل آیت دیکھیے:

ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت...... (الحج - ۴۰)

یہ چیز قابلِ غور ہے کہ ایسی کتاب، جو اسلام کی داغ بیل رکھ رہی ہے، اس میں دوسرے ادیان کے معبدوں کی حفاظت کا ذکر مسجدوں کی حفاظت سے مقدم ہے۔ اپنے معبدوں کی حفاظت ایک فطری بات ہے اور یہ اجتماعی نفسیات کی ایک بنیادی حقیقت ہے لیکن ایسے حالات میں جب مسلمانوں سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ وہ دوسرے ادیان کے پیرؤوں کے معبدوں کی حفاظت کو اپنی مسجدوں سے بھی مقدم سمجھیں، تو انسانیت کی تاریخ میں گویا ایک عظیم الشان انقلاب کی داغ بیل ڈالنا ہے۔ دوسرے مذاہب اور ان کی آزادی کو برقرار رکھنے کا یہی شدید جذبہ تھا، جس کے باعث ابتدائی جنگوں میں مسلمانوں نے نہتے شہریوں، بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کی ہمیشہ حفاظت کی۔ کسی مذہب کے پجاریوں، پروہتوں اور راہبوں پر تلوار نہ اٹھائی اور نہ کسی عبادت گاہ کو مسمار ہونے دیا۔ ان جنگوں کا مقصد تمام انسانوں کی آزادی کو بحال کرانا تھا، نہ کہ کمزوروں اور مفتوحہ علاقوں کے باشندوں

کا استیصال فلسطین کی فتح کے بعد حضرت عمرؓ بذاتِ خود وہاں پہنچے، ان کے ساتھ کوئی حفاظتی فوجی دستہ نہ تھا۔ ایک ہی اُونٹ پر وُہ اور ان کا ملازم باری باری سفر کرتے رہے۔ حضرت عمرؓ عیسائی بشپ کے ساتھ محوِ گفتگو تھے کہ نماز کا وقت آگیا اور آپ نے بشپ سے باہر جا کر نماز پڑھنے کی اجازت چاہی لیکن بشپ نے گرجا ہی میں نماز پڑھنے کی پیش کش کی۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا: "ٹھیک ہے ہم خدا کی زمین پر ہر جگہ نماز ادا کر سکتے ہیں، لیکن مجھے ڈر ہے کہ میرے اس عمل سے آیندہ زمانے میں مسلمان اس گرجے کو مسجد میں تبدیل کرنے کا جواز نہ پیدا کر لیں۔"
اس سے اسلام کی صحیح ہیئت سامنے آجاتی ہے کہ اس کا مقصد تمام ادیان وعقاید کی آزادی کو بحال کرنا تھا نہ کہ دُوسروں کی آزادی پر ڈاکہ ڈالنا اور ان پر غاصبانہ حملہ اور قبضہ کرنا۔ آنحضرتؐ نے اپنی زندگی میں ایک عیسائی وفد کے اراکین کو اپنی مسجد میں عبادت کرنے کی اجازت دی۔ اس پر انھوں نے کہا کہ ہماری عبادت میں موسیقی وارغنون وغیرہ کا استعمال ہوتا ہے اور ممکن ہے کہ آپ کے خیال میں مسجد میں یہ چیز مناسب نہ ہو۔ لیکن اس کے باوجود آپ نے ان کو اپنے طور پر نماز ادا کرنے کی اجازت دی۔ کیا کوئی ایسا رواداراور فراخ دل پیغمبر دُوسرے مذاہب و عقاید کے خلاف کسی قسم کی سختی اور تنگ نظری روا رکھ سکتا تھا۔ قرآن کریم میں ایک جگہ آتا ہے کہ اس دنیا کے انسان کبھی ایک عقیدے اور ایک نظریے کے پیرو نہیں ہو سکتے اور اس لیے ان کے شرائع اور رسوم و رواج میں اختلافات یقیناً موجود رہیں گے لیکن ان کے اختلافات کے باوجود ہر ایک کی یہی کوشش ہونی چاہیے اور یہی اصل چیز ہے کہ خیر کے حصول کی انتہائی کوشش کی جائے اور اس میں ایک دُوسرے سے سبقت لے جانے کا عزم کیا جائے۔ لکل جعلنا منکم شرعة و منهاجا.... فاستبقوا الخیرات۔ (۵: ۴۸)

آزادی و رواداری

یہی وہ نظریہ تھا جس کے باعث مسلمان ملکوں میں اسلامی سیاسی استیلاء کے باوجود غیر مسلم ملتیں اپنی انفرادی زندگی اور تمدن وتہذیب کو برقرار رکھ سکیں۔ عیسائی کلیسا سے ناقوس کی آواز متصل مسجد کی اذان کے ساتھ بلند ہوتی تھی۔ ہسپانیہ میں تقریباً آٹھ صدی تک مسلمانوں کی حکومت رہی۔ لیکن انھوں نے کبھی دباؤ یا جبر سے غیر مسلموں کو مسلمان بنانے کی کوشش نہ کی۔ ان کی اس حکمت عملی ہی کا نتیجہ تھا کہ جب مسلمانوں کی فوجی طاقت کمزور ہُوئی، تو غیر مسلم اکثریت نے ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا اور ان کی عطا کردہ ثقافتی اور مذہبی آزادی کا بالکل پاس نہ کیا۔ وُہ تمدن وتہذیب، جو مسلمانوں نے وہاں پیدا کیا اور جس کی ضیا پاشیوں سے تمام یورپ بعد میں منور ہُوا، اس متعصبانہ لوٹ کھسوٹ اور قتل وغارت کے بعد ہمیشہ کے لیے فنا ہو گیا۔ ترکوں نے مشرقی یورپ پر چار صدی تک حکومت کی اور مختلف عیسائی فرقوں اور گروہوں کو مکمل مذہبی اور ثقافتی آزادی دیے رکھی۔ ایک عثمانی سلطان نے تمام غیر مسلم رعایا کو جبراً مسلمان کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لیکن علماء نے قرآنی اصولوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس کی شدید مخالفت کی۔ انھوں نے اصول کی خلاف ورزی کرنے کے بجائے اقلیت میں رہنے کو ترجیح دی۔ اگرچہ آخر کار اس کے سیاسی نتائج ان کے حق میں اچھے نہ ثابت ہوئے۔

برعظیم پاک و ہند میں یہی صورتِ حال تھی۔ کسی سیاسی یا تبلیغی کوشش کے بغیر ہندو عوام برہمنوں کی ذات پات کی تقسیم کے شدید عملی مضرات سے تنگ آکر مسلمان ہوتے رہے اور یہ عمل اس وقت بھی جاری رہا جب مسلمانوں کا سیاسی غلبہ ختم ہو گیا، حتیٰ کہ پنجاب میں سکھوں کے تاریک ترین دورِ حکومت میں بھی، جب شاہی مسجد رنجیت سنگھ کے اصطبل میں تبدیل کی جا چکی تھی، اسلام کی فتوحات بدستور جاری رہیں اسی طرح جس طرح آج افریقہ میں عیسائی مشنری تنظیم اور کثیر دولت کے علی الرغم مسلمانوں کی تعداد بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اس کا باعث صرف اسلام کی سادہ تعلیم، غیر عقلی عقاید کا فقدان اور انسانی مساوات کے تصورات ہیں۔ انڈونیشیا میں بھی اسلام اس وقت پھیلا۔

جب وہاں ہالینڈ کے عیسائی حکمران اپنے عقاید کی تبلیغ کے لیے سیاسی قوت اور سرمایہ صرف کرنے میں دریغ نہیں کر رہے تھے۔

یہودی جو قبل مسیح اور بعد میں خود عیسائی سلطنتوں اور علاقوں میں ہمیشہ ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنے رہے، ان کو اسلام کے بعد چین اور آرام کی زندگی میسر آسکی۔ کسی شہر میں یہودی باڑہ نہ تھا۔ مغربی عیسائی سلطنتیں ان پر ظلم کرتیں تو وہ پناہ لینے اسلامی ملکوں میں جا پہنچتے جہاں ان کے لیے دُوسرے باشندوں کی طرح ترقی کے تمام مواقع کھلے تھے۔ کسی اسلامی ملک میں یہودیوں کے خلاف نہ کبھی جذبۂ عناد پیدا ہوا اور نہ ان پر حملے ہُوئے۔ لیکن بدقسمتی سے جدید دور میں ان مراعات اور رواداری کے بدلے میں جو سلوک بین الاقوامی جارحانہ صیہونیت نے کیا ہے، وہ سب کے سامنے ہے۔

غیر مسلموں سے معاہدے عیسائیوں اور یہودیوں کے متعلق جو رویہ مسلمانوں کا رہا ہے، اس کے متعلق دو واقعات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ آنحضرتؐ نے مدینے کے یہود سے جو معاہدہ کیا، اس کے الفاظ درج ذیل ہیں:

ان یهود ۔۔۔۔ الخ

" بنی عوف کے یہود مسلمانوں کی طرح ایک ملّت شمار ہوں گے۔ ہر قسم کے حملے کے خلاف ان کا دفاع مسلمانوں کے ذمے ہوگا۔ ان دونوں کے تعلقات خوش سگالی اور باہمی مشترکہ مفاد پر مبنی ہوں گے۔ یہود کے حلیف مسلمانوں کے حلیف شمار ہوں گے اور ہر مظلوم کی حمایت کی جائے گی، خواہ وہ کسی گروہ سے ہو۔"

نجران کے عیسائیوں کو جو آزادی کا منشور دیا گیا، اس کے الفاظ یہ ہیں:

لنجران جوار ۔۔۔۔ الخ

" نجران کے عیسائی خدا اور اس کے رسول کی حفاظت میں ہوں گے۔ ان کی جان و مال، عقاید اور علاقوں کی حفاظت کی جائے گی اور یہ حفاظت کی ذمہ داری نہ صرف ان تک محدود ہوگی، جو اس وقت موجود ہیں بلکہ ان پر بھی عائد ہوگی، جو اس وقت موجود نہیں (یعنی آنے والی نسلیں) اور ان پر بھی جو اس قبیلے کی حفاظت میں ہیں (وہ اس قبیلے سے متعلق ہوں یا نہ ہوں)۔"

فلسطین پر قبضہ ہونے کے بعد حضرت عمرؓ نے جو آزادی کا منشور ایلیا کے باشندوں کو دیا، اس کے الفاظ درج ذیل ہیں:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔۔۔۔ الخ

" یہ امان کا وہ منشور ہے، جو خدا کے بندے عمر امیر المؤمنین نے ایلیا کے باشندوں کو دیا۔ ان کی جان و مال، گرجاؤں اور صلیبوں کی حفاظت کی جائے گی۔ ہر شہری خواہ وہ تندرست ہو یا بیمار، ہماری امان میں ہوگا۔ ان کے گرجا لوگوں کی رہایش گاہوں میں تبدیل نہ ہوں گے اور نہ ان کو گرایا جائے گا۔ ان کی جائدادوں اور صلیبوں کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے گا، نہ ان پر کسی قسم کا مذہبی دباؤ ڈالا جائے گا اور نہ کسی کو پریشان کیا جائے گا۔"

آذربائیجان، جرجان اور مدائن کے شہریوں کو جو امان نامے حضرت عمرؓ نے دیے ان کے الفاظ بھی تقریبًا ایسے ہی ہیں۔

صرف یہ اضافہ ہے کہ ان کے مذہبی قوانین کی حفاظت کی جائے گی اور ان کے مطابق زندگی بسر کرنے اور ان کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کی پوری آزادی ہوگی۔

تبلیغ کے طریقے قرآن کریم میں اسلام کی تبلیغ و توسیع کے لیے قوت یا دباؤ کا استعمال قطعاً ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وُہ اپنے عملی کردار سے دوسروں کو متاثر کریں اور ان کے سامنے ان ابدی حقایق کو پیش کریں، جن کی اسلام نے تصدیق کی ہے اور ان حقایق کو بھی، جو وسیع تر اور ارتقا پذیر انسانیت کے لیے ناگزیر ہیں۔ قرآن کریم نے اس کام کے لیے صرف تین طریقوں کی اجازت دی ہے اور آنحضرتؐ کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنی تمام کوششیں صرف ان ذرائع کے استعمال تک محدود رکھیں۔

اُدع الی سبیل ربّك ..... الخ (۱۶ : ۱۲۵)

"اے پیغمبر! لوگوں کو اپنے خدا کے راستے کی طرف حکمت، موعظت اور اچھے دلائل کے ساتھ دعوت دو"

مذہبی جھگڑوں میں عام طور پر لوگ مخالفین کے قابلِ حرمت اشخاص اور اشیا، کے متعلق ناواجب اور ناروا الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ قرآن نے اس قسم کے غیر مہذب حملوں سے منع کیا ہے۔ حتیٰ کہ مشرکین کے جھوٹے دیوتاؤں کے متعلق بھی بُرے الفاظ استعمال کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس طرح ان کی طرف سے خدائے واحد کے خلاف غلط باتیں منسوب کیے جانے کا خطرہ ہے۔

ولا تسبّوا الذین ..... الخ (۶ : ۱۰۸)

قل یا یھا الکٰفرون لا اعبد .... الخ (۱۰۹ : ۱-۲)

اس سورت میں آنحضرتؐ کو اعلان کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ معبود کے متعلق مخالفین میں کسی قسم کی مصالحت کی گنجائش نہیں۔ اس لیے مختلف عقاید کے پیرؤوں کا فرض ہے کہ وُہ ایک دُوسرے کو مکمل آزادی دیں۔ صداقت اور کذب واضح ہوچکے ہیں، اس لیے اب لوگوں کو سوچنے اور آزادی سے اپنا راستہ اختیار کرنے کا موقع دینا چاہیے۔

لا اکراہ فی الدین قد تبیّن الرشد من الغی (۲ : ۲۵۶)

فان اعرضوا فما ارسلنٰك علیھم .... الخ (۴۲ : ۴۸)

اے رسول! اگر وہ صداقت سے اعراض کریں، تو انھیں چھوڑ دو، جب تم نے پیغام پہنچا دیا، تو تم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اب ان کا معاملہ خدا کے سپرد کر دیا۔

لست علیھم بمصیطر (۸۸ : ۲۲)

قل لست علیکم بوکیل (۶ : ۶۶)

نحن اعلم بما یقولون وما انت علیھم بجبار (۵۰ : ۴۵)

اے رسول! ہم جانتے ہیں، جو یہ لوگ کہتے ہیں۔ تم انھیں ایمان لانے کے لیے مجبور کرنے پر مامور نہیں ہوئے ہو۔ کچھ یہودی مسلمان ہوچکے تھے، لیکن ان کے بیٹے ابھی اپنے قدیم دین پر تھے۔ ان کے والدین نے ان کو مجبور کرنا چاہا، تو

اس موقع پر یہ آیت اُتری کہ لا اکراہ فی الدین۔ ایک دُوسری جگہ یہی تنبیہہ دُہرائی گئی :

افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مؤمنین (۱۰ : ۹۹)

کیا تم لوگوں کو مجبور کرو گے حتیٰ کہ وہ مسلمان ہو جائیں ؟

بنیادی تصوّر اسلام نے جو رویّہ دُوسرے ادیان کے متعلق اختیار کیا ہے، اس کی بنیاد اس تعلیم پر ہے کہ صحیح دین ہمیشہ سے توحیدی رہا ہے اور ان تمام توحیدی ادیان کے ہاں بنیادی اخلاقی اقدار مشترک رہے ہیں۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں پیغمبر اور رسول مختلف قوموں کے پاس آتے رہے ہیں، جو انھیں صحیح تعلیم دیتے رہے۔ لیکن مرورِ زمانہ سے یہ تعلیم خراب ہوتی رہی۔ ایک مسلمان کو تمام مذاہب کی اصلی اور بنیادی سچائیوں پر ایمان لانے کا حکم ہے۔ غیر مسلموں نے عام طور پر آنحضرت پر حملہ کرنا ضروری سمجھا اور مغرب نے جو کتابیں اسلام پر لکھی ہیں، ان میں اس ترقی پذیر، لبرل دین کی غلط ترجمانی کے علاوہ آپ کی ذات کے خلاف زہریلے حملے کیے گئے ہیں۔ لیکن اپنے عقاید کی رُو سے مسلمان ان کا ترکی بہ ترکی جواب نہیں دے سکتے۔ اس لیے اسلامی کتب میں کسی دین کے رہنما کے متعلق ناروا حملے نہیں پائے جائیں گے۔ کوئی مسلمان ابراہیم و موسیٰ علیہما السلام یا دُوسرے نبیوں کے خلاف کیسے منہ کھول سکتا ہے؟ قرآن میں مذکور ہے کہ لاتعداد رسولوں میں سے صرف چند کا ذکر کیا گیا ہے، اس لیے غالب خیال یہ ہے کہ وہ نیک ہستیاں جن کو ہندو یا چینی عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، وہ بھی حق تعالیٰ کے پیغمبر ہوں گے۔ وہ قومیں جن کے پاس الہامی کتابیں ہیں، ان کو اہلِ کتاب کہا جاتا ہے۔ عرب میں صرف عیسائی اور یہودی ہی ایسی دو قومیں آباد تھیں۔ اس کے بعد کئی اور قوموں سے بھی نہیں ملنے کا اتفاق ہُوا، جن کے ہاں قدیم دینی روایات تھیں۔ اس لیے اہلِ کتاب کی اصطلاح ان سب پر حاوی ہے اور مسلمانوں کو حکم ہے کہ ان کے اور اپنے درمیان عقاید کے اشتراک اور اتفاق و ہم آہنگی کی نشان دہی کریں تاکہ باہم میل جول اور خیر سگالی کے تعلقات قایم کرنے میں آسانی ہو۔ قرآن نے توحیدی عقاید رکھنے والے گروہوں سے جو تعاون کی اپیل ہے، وہ تمام مہذب انسانیت سے تعاون کی اپیل ہے۔ لیکن اگر کوئی قوم چھوٹی یا بڑی الحادی مادیت کو مع اس کے تقاضوں کے بطور عقیدہ قبول کرتی ہے، تو اس سے البتہ کسی قسم کا تعاون کرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن پھر بھی قرآن کی دعوت یہی ہے کہ ہر اس شخص اور گروہ سے تعاون کیا جائے، جو نیکی اور بھلائی کی تعلیم دیتا اور ان پر عمل کرتا ہے۔ اگر لادین اشخاص بھی اخلاقی کوشش میں دیانت داری سے تعاون کرتے ہیں، تو اس حد تک ان سے تعاون کیا جا سکتا ہے :

تعاونوا علی البر ..... (۵ : ۲)

تمام توحیدی مذاہب میں نیکی اور تقوٰی کی تعریف تقریباً یکساں طور پر کی گئی ہے۔ اس لیے تعاون کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ لیکن جہاں اس کے متضاد نظریات کارفرما ہوں، وہاں تعاون کا حلقہ بہت محدود ہو جاتا ہے۔ دُوسرے توحیدی مذاہب کے پیروؤں کے ساتھ اسلام کا رویّہ محض سلبی اور انفعالی رواداری کا نہیں، بلکہ ایجابی افہام و تفہیم کا ہے۔ قرآن میں نجات یافتہ افراد کی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ رنج و خوف سے بالا ہیں۔ قرآن ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا، جو صداقت یا نجات کی اجارہ داری کا دعویٰ کرتے ہیں۔

قرآن کریم میں دو جگہ ذکر کیا گیا ہے کہ کائنات کی بنیادی صداقتیں یہ ہیں: خدائے واحد پر ایمان، موت کے بعد انسانی انا کا بقا اور ایک اخلاقی نظام کا وجود، جس کے باعث موت کے بعد انسانوں کو ان کے اعمال کے مطابق سزا اور جزا ملتی ہے۔ جو شخص بھی ان صداقتوں پر ایمان لائے اور نیک اعمال کرے، وُہ نجات یافتہ ہے اور اس نے اپنا فرض ادا کیا، خواہ وہ کسی گروہ سے تعلق رکھتا ہو۔

ان الذین اٰمنوا ... . (۲ : ۶۲)

لوگوں میں رسم و رواج اور شرائع کے لحاظ سے اختلاف ہوتا رہے گا اور ایک ہی منزل تک پہنچنے کے لیے مختلف راستے اختیار کیے جاتے رہیں گے۔ لیکن تمام وُہ لوگ، جو ایک روحانی زندگی پر ایمان رکھتے ہیں، سب نجات پائیں گے۔ بعض تنگ نظر مسلمان علما، نجات کے متعلق قرآن کے اس فراخ دلانہ رویّے کو پسند نہیں رکھتے اور اسے اپنی اجارہ داری کے خلاف سمجھتے ہیں۔ وہ اس کی تشریح اس کے واضح مفہوم کے بالکل برعکس کرتے ہیں۔ ان کی ذہنیت تقریباً وُہی ہے، جس کا تذکرہ قرآن نے متعصب اور تنگ نظر عیسائی اور یہودی علماء کے متعلق کیا ہے:

قالت الیھود لیست النّصارٰی علٰی .... الخ (۲ : ۱۱۳)

لارڈ ہیڈلے نے خود مجھ سے بیان کیا کہ جب انہوں نے مسلمان ہونے کا اعلان کیا، تو ان کا ایک عزیز ترین دوست ایک بشپ ان کے پاس آیا اور کہا: "مجھے افسوس اس بات کا ہے، کہ اس تبدیلیِ مذہب سے جہنّم واصل ہو جاؤ گے۔" ہیڈلے نے جواب دیا: "تمہارے مذہب کی یہی تنگ دلی اور تعصب ہے، جس نے مجھے اس کو چھوڑ کر ایک دوسرے زیادہ لبرل مذہب میں داخل ہونے پر مجبور کیا ہے۔ تم کہتے ہو کہ چونکہ میں نے چند اذعانات پر ایمان لانا ترک کر دیا ہے، اس لیے میں جہنم میں جاؤں گا لیکن اسلام، جس کو میں نے اختیار کیا ہے، اس کی تعلیم ہے کہ چونکہ تم خدا پر ایمان رکھتے ہو، اور بہت اچھے آدمی ہو، اس لیے تم جہنم میں نہیں جاؤ گے۔ اسلام کا خدا ان چھوٹے مسائل کے متعلق متعصب اور تنگ نظر نہیں۔"

عقلیت پسند، انسیت کے علمبردار اور تجربیت پر یقین رکھنے والے لوگوں کا کہنا ہے کہ مذہب انسانوں میں تفریق اور اختلاف پیدا کرتا ہے۔ لیکن قرآن کا خیال ہے کہ یہ خرابیاں مذہب کے باعث نہیں، بلکہ مذہب کے غلط استعمال سے پیدا ہوتی ہیں۔ اسلام انسانیت کی بنیادی وحدت کا قائل ہے، جو ابدی حقایق کے مشترکہ علقے میں ناگزیر اور شاید پسندیدہ کثرت کو تسلیم کیے بغیر ممکن الحصول نہیں۔ صحیح دین، آپ اسے اسلام کہہ لیجئے یا کوئی اور نام دے دیجیے، زندگی کے متعلق ایسا نظریہ ہے، جس سے غیر عقلی اختلافات کم ہوں اور خیر سگالی، محبت اور تعاون و تفہیم کا دائرہ وسیع ہو جائے۔

دعوتِ نبوی ؐ کے اصول و مقاصد

معین الدین احمد شاہ

علمائے حدیث اور سیرت نگار حضرات کی دماغی اور علمی کاوشیں ملتِ اسلامیہ بلکہ پوری انسانی دنیا کے لیے مایۂ صد افتخار ہیں کہ انھوں نے انتہائی سعی و محنت سے کائنات انسانی کے رہنمائے کامل صلی اللہ علیہ وسلم کے حالاتِ زندگی جامعیت اور استیعاب کے ساتھ فراہم کیے اور ترتیب دیے ہیں۔ یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے نکلی ہوئی کوئی بات، آپ کی کوئی جسمانی حرکت و سکون، فرحت و انبساط اور غم و غصہ کی کوئی ادا، بزم و رزم کی کوئی حرکت ایسی نہیں، جو ضبطِ تحریر میں نہ آچکی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ختمِ رسالت کی کوئی دلیل موجود نہ ہو، تو صرف یہی ایک دلیل کافی ہے کہ اگر آپ کے بعد کسی دوسرے نبی کی بعثت کی ضرورت باقی ہوتی تو پہلے انبیاء علیہم السلام کی طرح آپ کے حالاتِ زندگی بھی نسیًا منسیا ہو چکے ہوتے اور اس طرح آپ کی ہر ہر بات اور ہر ہر حرکت ضبطِ تحریر میں نہ آئی ہوتی۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ انبیائے سابقین میں سے کسی کے تفصیلی حالاتِ زندگی آج محفوظ شکل میں موجود نہیں، حالانکہ ان میں ایسے بھی ہیں، جن کے ماننے والے آج بھی کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ اس کے برعکس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالاتِ زندگی پر سیکڑوں مستند کتابیں ہر زبان میں موجود ہیں، تو اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ کی نبوت و پیشوائی تاقیامت جاری رہنے والی ہے۔ اسی لیے خود قدرت کی طرف سے آپ کے حالاتِ زندگی کی حفاظت کا اتنا اہتمام کیا گیا۔ ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں ابن حاتم الرازی کا یہ قول نقل کیا ہے:

لم یکن فی امة من الامم منذ خلق الله تعالیٰ آدم امة یحفظون آثار نبیهم غیر هذه الامة[1]	جب سے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا ہے امتِ مسلمہ کے سوا کوئی ایسی امت نہیں گزری جس نے اپنے نبی کے آثار کو محفوظ رکھا ہو۔

تاہم بعض دوسری حیثیتوں سے سیرت نگاری کے کام کو علمی حیثیت سے جاری رکھنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً احیاء و اقامتِ دین کی دعوت کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر زمانہ کے مخصوص مزاج کے لحاظ سے پیغمبرانہ اصولِ دعوت کی تفسیر کی جائے اور ماحول کی جدید تبدیلیوں پر اس کا انطباق کیا جائے اور جدید مملکتی مسائل کو زمانہ رسالت کی سیاست کاری اور معاشی خاکہ بندی کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں حل کیا جائے اور عہدِ رسالت کے اصولِ دعوت اور اصولِ عمران و تمدن کی ترتیب و تدوین موجودہ دور کے مخصوص اجتماعی مزاج کی رعایت کے ساتھ کی جائے اور اسلام کے عالمگیر اور ابدی اصول و تصورات کی تعبیر اس ڈھنگ کے ساتھ کی جائے، کہ اس زمانہ کا ذہن و دماغ اس کو آسانی سے قبول کر سکے۔

---

[1] موزج اللبیب للسیوطی، قلمی

دعوتِ نبویؐ کی اصل عظیم علم و عمل کی ہم آہنگی

پیغمبرانہ دعوت کا مزاج عام سیاسی، معاشی، اصلاحی اور تعلیمی تحریکات سے بالکل مختلف ہے۔ اسی قسم کی تمام تحریکیں محدود اور وقتی مقاصد کے لیے اٹھتی ہیں اور ان کے حصول کے بعد ان کا کام ختم ہو جاتا ہے۔

اس کے مقابلہ میں پیغمبرانہ دعوت مستقل اور ابدی مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے ہوتی ہے اور وقتی مسائل سے وہ صرف ناگزیر حد تک تعرض کرتی ہے اور زندگی کی عالی اور مقصود بالعرض قدروں کو محض وسیلہ و ذریعہ کی حد تک مستحق توجہ سمجھتی ہے اور اپنے عمل اور جد و جہد میں وہ زندگی کی حقیقی اور مقصود بالذات قدروں ہی کو سامنے رکھتی ہے۔ اسی لیے انبیاء و رسل سب سے پہلے لوگوں کو زندگی کے حقیقی مقصد سے روشناس کرتے ہیں اور پھر اسی کے مطابق سیرت سازی کا کام شروع کرتے ہیں اور ذہن و فکر کی تعمیر کا کام اس وقت تک مسلسل جاری رہتا ہے، جب تک کہ مقصدِ حیات کی عقیدت و محبت دلوں کی گہرائیوں میں نہ اتر جائے۔ اس طریقہ سے تربیت یافتہ اور پختہ کار انسانوں کا ایک گروہ تیار ہو جاتا ہے، جس کا عزم و یقین کفر و باطل کے آہنی قلعوں کو پاش پاش کر دیتا ہے اور جس کی نگاہ بڑے بڑے پُرغرور سروں کو اپنے آگے جھکا دیتی ہے اور جس کی صدائے عشق ملوک و سلاطین کے سر بفلک ایوانوں میں زلزلہ پیدا کر دیتی ہے۔ ؎

با سلاطین در فتد مردِ فقیر
از شکوہِ بوریا لرزد سریر
قلبِ او را قوت از جذب و سلوک
پیشِ سلطاں نعرۂ او لا ملوک

لیکن اس مقدس گروہ کی منزل مقصود روٹی کے چند ٹکڑے اور منصب و اقتدار کی مسند نہیں، بلکہ اس کی منزل ہر منزل سے آگے اور اس کا مقام ہر مقام سے اونچا ہے۔ اس لیے اس کی سعی و کوشش مسلسل اور غیر منقطع ہوتی ہے۔ اگرچہ جس منزل تک پہنچنے میں دوسرے لوگوں کو کئی کئی صدیاں لگ جاتی ہیں، ان کو اہلِ ایمان کا بے سر و سامان قافلہ چند دنوں میں پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ مگر اس کا جذبۂ عشق اس کو کسی منزل پر ٹھہرنے کی اجازت نہیں دیتا کہ: ؎

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

حاصل یہ کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی دعوت کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تبلیغ، درس و تعلیم اور تربیت تینوں کام ساتھ ساتھ تکمیل پاتے ہیں۔ محض تبلیغ اس مقصد کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ ایک مشفق اور جفاکش استاذ کی حیثیت سے درس و تعلیم اور تربیت بھی اس کے فرائض میں ہے، اس لیے پیغمبر کا وصف خاص یہ ہے کہ وہ ان سہ گانہ فرائض نبوت کو ایک ساتھ انجام دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم نے کارِ نبوت کے ان تینوں مراحل کو متعدد مقامات میں بیان کیا ہے۔ وعظ و تبلیغ کا تعلق بالعموم ان لوگوں سے ہے، جنھوں نے اب تک دعوت قبول نہ کی ہو اور تعلیم و تربیت ان لوگوں کے لیے ہے، جو اپنے سابقہ عقاید کو چھوڑ کر نبی کی جماعت میں شامل ہو گئے ہوں۔ وعظ و تبلیغ کی حسبِ ذیل آیات ہیں:

یاایها الرسول بلغ ما انزل الیك من ربك و ان لم تفعل فما بلغت رسالته و الله یعصمك من الناس۔ (مائدہ)

اے رسول! آپ ان اصول و احکام کی تبلیغ کریں جو آپ کے رب کی جانب سے آپ کی طرف اتارے گئے ہیں (اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو اس کا مطلب یہ ہے) کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام نہیں پہنچایا اور اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں کی (شرانگیزیوں) سے محفوظ رکھے گا۔

ادع الی سبیل ربك بالحکمة و الموعظة الحسنة و جادلهم بالتی هی احسن۔ (نحل)

آپ دعوت دیں اللہ کے دین کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ اور ان کے ساتھ بحث کریں، اس طریقہ سے جو بہت اچھا ہو۔

فاعرض عنهم وعظهم و قل لهم فی انفسهم قولا بلیغا۔ (النساء-۶۳)

پس اے نبی! آپ ان (کی شرانگیزیوں) سے اعراض کریں اور ان سے ایسی بات کہیں جو دلوں میں اتر جانے والی ہو۔

الذین یبلغون رسٰلٰت الله و یخشونه ولا یخشون احدا الا الله۔ (احزاب-۵)

وہ جو اللہ تعالیٰ کے پیغاموں کی تبلیغ کرتے ہیں۔ اللہ سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی دوسرے سے نہیں ڈرتے۔

تزکیۂ نفوس اور تعلیم و تربیت پیغمبرانہ دعوت کے اہم عناصر ہیں۔ اس لیے قرآن حکیم نے ان کا بار بار ذکر کیا ہے:

هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم یتلوا علیهم اٰیاته و یزکیهم ویعلمهم الکتاب و الحکمة۔ (الجمعہ)

وہ ذات جس نے عربوں کی اُمّی قوم میں رسول بھیجا، جو انہی میں سے ہے۔ وہ ان پر اللہ کی آیتیں پڑھتا ہے ان کے دلوں کو (عقاید شرک سے) پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

ان آیات میں تعلیم کتاب سے نظری تعلیم اور تعلیم حکمت سے عملی تعلیم و تربیت مراد ہے۔ "حکمت" کے معنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی یعنی سنت کے ہیں۔ چنانچہ امام شافعی نے کتاب الرسالۃ میں لکھا ہے:

سمعت من هو ارضی من اهل العلم بالقرآن الحکمة سنة رسول الله صلی الله علیه وسلم۔

میں نے اس شخص کو جو علوم قرآنی کے ماہرین میں سب سے زیادہ مقبول ہیں، یہ کہتے ہوئے سنا کہ حکمت سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔

اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ نوع انسانی کے لیے نظام تعلیم و تربیت کا ایک مکمل عملی نمونہ ہے:

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللہ و الیوم الآخر و ذکر اللہ کثیرا ۔ (الاحزاب)	بلاشبہ تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بہترین نمونۂ عمل ہے ۔ یہ اس کے لیے ہے جو اللہ اور یوم آخرت کی آرزو رکھتا ہو اور اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرتا ہو۔

دراصل درس گاہ نبوت ایک چلتی پھرتی اور متحرک درس گاہ ہے ۔ جس کا طرز تعلیم کلاسکی علوم کی طرح محض نظری استدلال پر مبنی نہیں ہے اور نہ مدرسہ و خانقاہ کی حدود کا پابند ہے بلکہ سفر و حضر، خلوت و جلوت، بزم و رزم اور زندگی کے ہر میدان اور ہر شعبہ میں اس کا کام برابر جاری رہتا ہے ۔ شہسواری کی تعلیم گھر کی چار دیواری یا صحن مسجد میں نہیں دی جاتی بلکہ گھوڑے کی پیٹھ پر اس فن کی مشق کرائی جاتی ہے ۔ پیراکی کے اصول خشکی میں نہیں بلکہ طوفانی لہروں کی کشاکش میں ڈال کر سکھائے جاتے ہیں ۔ کتاب کے جامد نقوش انسانی قلوب میں وہ ہنگامی رُوح کس طرح پیدا کر سکتے ہیں ، جو مردِ حق آگاہ کی نگاہ انقلاب انگیز سے پیدا ہوتی ہے : ؎

این کارِ حکیمے نیست داماں کلیمے گیر
صد بندۂ ساحل مست یک بندۂ دریا مست

اس لیے سرورِ دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا مطالعہ زندگی کے ہر شعبے میں کرنا چاہیے ۔ آپ جب گھر میں تشریف فرما ہوتے تو اطاعت و عبادت کے فضائل ، امورِ خانہ داری اور عام معاشرتی مسائل کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہتا ، جب مسجد میں تشریف لاتے ، تو مسلمانوں کے اجتماع میں طہارت و عبادت ، حلال و حرام ، حقوق و فرائض ، اخلاق و معاشرت اور سیاست و معیشت کے نکات و معارف بیان فرماتے اور جب مجاہدین کا لشکر جرار جہاد کے لیے کوچ کرتا تو اثنائے سفر اور عین میدانِ جنگ میں بھی خدا پرستی ، اخلاص مقصد، طہارت و پاکیزگی اور احترام آدمیت کا سبق دیتے ۔ غرض ہر لحظہ تعلیم و ارشاد کا سلسلہ جاری رہتا۔

غزوۂ احد میں چند لوگوں کی لغزش سے مسلمانوں کو بڑے مصائب کا سامنا کرنا پڑا ۔ کفار کی ناگہانی یلغار سے اسلامی جمعیت درہم برہم ہوگئی اور ستر مسلمان شہید ہو گئے ۔ یہ بڑا نازک اور پریشانی کا وقت تھا ۔ ہر طرف سے زخمیوں کی دردناک صدائیں کانوں میں پڑ رہی تھیں ، دشمنوں کا جذبۂ عداوت شہدا کی لاشوں تک سے انتقام لے رہا تھا ، مسلمانوں پر بدحواسی طاری تھی ۔ لیکن ایسے نازک وقت میں بھی خدا کے سچے پیغمبر کے ثبات و استقلال میں فرق نہ آیا اور آپ صرف خدا پرستی ، توحید اور غیرت دینی کا سبق دیتے رہے ۔ چنانچہ مخالف کیمپ سے جب ابو سفیان نے للکار کر کہا : کیا قوم میں محمدؐ موجود نہیں ؟ تو آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا : جواب نہ دو ۔ ابو سفیان نے دوبارہ آواز دی : کیا قوم میں ابن ابی قحافہ (ابو بکرؓ) ہیں ؟ آپؐ نے پھر فرمایا : "خاموش رہو"۔ تیسری مرتبہ ابو سفیان نے عمرؓ بن الخطاب کا نام لیا ۔ آپؐ نے اس دفعہ بھی فرمایا : "کوئی جواب نہ دو"۔ اس خاموشی پر ابو سفیان نے بلند آواز سے کہا "یہ لوگ مارے گئے اگر زندہ ہوتے تو ضرور جواب دیتے "۔ جب تک محض غیرتِ نفس کا سوال تھا ، اس وقت تک آپؐ نے جواب دینے سے منع فرمایا ۔ لیکن جب ابو سفیان نے "اعل ھبل" ہبل کی جے کا نعرہ بلند کیا تو آپؐ نے فرمایا : "تم بھی کہو اللہ اعلیٰ و اجل "۔ اللہ بلند اور برتر ہے اور جب ابو سفیان نے یہ مشرکانہ نعرہ لگایا " لنا العزّی ولا عزّی لکم " اور ہمارے لیے عزّی (بُت کا نام ، ہے اور

تمہارے لیے نہیں ہے۔ تو آپؐ نے پھر صحابہؓ سے فرمایا: تم جواب دو: "اللہ مولانا و لا مولا لکم" اللہ ہمارا مالک ہے اور تمہارا کوئی مالک نہیں ہے۔

اس واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو یہ تعلیم دی کہ ان کی جد و جہد انتقام ذاتی اور غیرتِ نفس کے جذبہ کی تسکین کے لیے نہیں بلکہ محض اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے ہے اور یہ بھی بتا دیا کہ اللہ کے دین کی عظمت شخصیتوں کی موت وحیات سے وابستہ نہیں ہے۔ خواہ ہم لوگ رہیں یا نہ رہیں، مسلمان کی خواہش یہ ہونی چاہیے کہ اللہ کا دین ہمیشہ غالب و سرفراز ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ سفرِ جہاد میں اگر مسلمانوں سے کوئی لغزش ہوتی تو آپ فوراً تنبیہ فرماتے۔ سفر خیبر میں جب اسلامی لشکر خیبر کے قریب پہنچا، تو کچھ لوگوں نے بلند آواز سے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ اس پر آپ نے سخت لہجہ میں فرمایا:

اربعوا علی انفسکم انکم لا تدعون اصم و لا غائباً انکم تدعون سمیعًا قریبًا و ھو معکم۔ (بخاری)	ضبطِ نفس سے کام لو۔ تم کسی بہرے اور غائب کو نہیں پکار رہے ہو، بلکہ تم سمیع وقریب کو پکار رہے ہو، جو ہر لمحہ تمہارے ساتھ ہے۔

اثنائے سفر میں بھی تزکیۂ قلوب کا کام برابر جاری رہتا تھا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ خیبر کی راہ میں مَیں کچھ زیرِ لب پڑھتا جا رہا تھا۔ آپ نے فرمایا: کیا پڑھ رہے ہو؟ میں نے عرض کی: "لا حول ولا قوۃ الا باللّٰہ"۔ فرمایا: کیا میں تم کو ایک ایسا کلمہ بتا دوں جو جنت کے خزانہ میں سے ایک خزانہ ہے؟ میں نے عرض کی: ہاں یا رسول اللہ[1]۔ فرمایا: "لا حول ولا قوۃ الا باللّٰہ"۔

غزوۂ بنی المصطلق (جو ابن اسحٰق، ابن جریر اور ابن ہشام کی روایت کے مطابق ۶ھ میں اور موسیٰ بن عقبہ اور حاکم کی روایت کے مطابق ۵ھ میں واقع ہوا) میں یہ افسوسناک واقعہ پیش آیا کہ ایک انصاری اور ایک مہاجر میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ مہاجر نے انصاری کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ اس پر انصاری نے یا للانصار (انصار کی دہائی) کا نعرہ لگایا۔ اس کے مقابلہ میں مہاجر نے یا للمہاجرین کا نعرہ بلند کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کانوں میں جب یہ نامانوس آواز پہنچی، تو آپؐ نے فرمایا:

"یہ جاہلیت کا نعرہ کیسا ہے۔ اس کو چھوڑ دو کہ یہ بہت ناپاک نعرہ ہے"۔

غرض حضر کی طرح سفر میں بھی جس قدر دینی، اجتماعی اور ملی مسائل پیش آتے، تو آپ نورِ نبوت سے ان کو حل فرماتے اور کسی حال میں بھی دعوت وارشاد کا سلسلہ بند نہ ہوتا بلکہ کتبِ احادیث و سیر سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے قرآنی احکام و فرائض اثنائے سفر ہی میں نازل ہوتے۔

شجاعت وتہور اور سخاوت و فیاضی عربوں کا مایۂ فخر تھی۔ لیکن وہ ان اوصاف کو بلند اخلاقی اصول و مقاصد اور انسانیت کی فلاح وسعادت کے لیے نہیں بلکہ قتل وغارت، انتقام، توہینِ آدمیت اور اس قسم کے دوسرے پست مقاصد کے لیے استعمال

---

[1] بخاری

کرتے تھے۔ یہاں تک کر قتل و سفا کی، لوٹ مار، انسانوں کو آگ میں جلانا، عورتوں کی بے آبروئی کرنا، بچّوں اور بڈھوں کو قتل کرنا اور اس قسم کے بہیمانہ افعال ان کے قومی کردار بن گئے تھے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیشتر غزوات میں اسلامی فوجوں کی خود قیادت فرماتے تھے۔ اس لیے قدم قدم پر اسلامی قوانین صلح و جنگ کی تعلیم دیتے جاتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ کسی غزوہ میں مسلمانوں کو بھوک نے تنگ کیا۔ وہ کہیں سے بکریاں لُوٹ لاتے اور ذبح کرکے ان کا گوشت پکانا شروع کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہُوا تو آپؐ نے دیگچیاں اُلٹوا دیں اور فرمایا:

ان النهبة ليست باحل من المیتة۔	لوٹ مار کا مال مردار سے زیادہ حلال نہیں ہے۔
(اخرجہ ابو داؤد)	

فتح مکہ کے موقعہ پر آپؐ نے فرمایا:

لا یجهزن علی جریح و لا یتبعن مدبر و لا یقتلن اسیر و من اغلق بابه فهو آمن۔ (فتوح البلدان)	زخمی پر حملہ نہ کیا جائے۔ بھاگنے والے کا پیچھا نہ کیا جائے، قیدی کو قتل نہ کیا جائے اور جو دروازہ بند کر دے، اس کو امن دیا جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی دستور تھا کہ جب آپ کسی جنگ کے لیے مدینہ سے لشکر روانہ کرتے تو رخصت کرتے وقت اہلِ لشکر کو یہ ہدایت فرماتے تھے:

اغزوا باسم الله فی سبیل الله تقاتلون من کفر بالله لا تغلوا و لا تغدروا و لا تمثلوا و لا تقتلوا ولیدًا و لا امرأة۔ (رواہ مالک)	تم اللہ کی راہ میں اللہ کے نام سے جہاد کرو۔ اللہ کا انکار کرنے والوں سے لڑو۔ مالِ غنیمت میں چوری نہ کرو۔ بدعہدی نہ کرو۔ مُثلہ نہ کرو اور بچّے اور عورت کو قتل نہ کرو۔

پیغمبرانہ دعوت میں تعلیم و تربیت اور علم و عمل کا اتحاد ایک ایسی حقیقت ہے، جس سے کسی واقف کار شخص کو (خواہ وہ مارکسزم پر ایمان رکھتا ہو، یا کسی دوسرے جدید نظریۂ زندگی کا علمبردار ہو) انکار نہیں ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں دورِ نبوت اور عہدِ خلافتِ راشدہ کی جنگی مہموں کا مطالعہ کرنے سے ظاہر ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح قدیم وحشیانہ جنگی طریقوں کی اصلاح کی اور جدید قانون صلح و جنگ کو کس طرح عملاً نافذ کیا اور صحابہ کے جوشِ عمل کا یہ حال تھا کہ ادھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے کوئی حکم جاری ہوتا اور ادھر اس پر عمل شروع ہو جاتا۔ اس کے مقابلہ میں اس زمانہ کی دُوسری اقوام کی حالت یہ تھی کہ ان کے یہاں کسی شائستہ جنگی قانون کا وجود ہی نہ تھا جس کی وُہ پابندی کرتے۔ اس لیے وُہ ہر قسم کی اخلاقی پابندیوں سے آزاد تھیں اور خواہشِ نفس اور لاقانونی ہی ان کا قانون تھا۔

یہ تو انسانوں کے دورِ جہالت کا حال تھا۔ دورِ حاضر کی مہذب اور شائستہ قوموں میں اگرچہ دو تین صدی سے قانون بین الممالک کی ترتیب کا کام ہو رہا ہے اور اس مقصد کے لیے بین الملکتی کانفرنسیں منعقد ہوتی رہی ہیں کہ جنگ کی ہلاکتوں کو ممکن حد تک کم

کیا جا سکے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سب سے پہلے جنگ سی سالہ کے اختتام پر ۱۶۴۸ء میں ہالینڈ کے مقنن گروٹیوس کی ان اصلاحی سفارشات کو قبول کیا گیا کہ جنگ میں بچوں، عورتوں، بوڑھوں، مذہبی رہنماؤں، کاشتکاروں، تاجروں اور اسیرانِ جنگ کو قتل نہ کیا جائے۔ اس کے بعد دولِ مغرب نے جنیوا کانفرنس، بروسلز کانفرنس، ہیگ کانفرنس اور واشنگٹن کانفرنس میں زہریلی گیسوں اور خود بخود پھٹنے والے زہریلے بموں کے استعمال کی ممانعت، تحدیدِ اسلحہ اور بعض دوسری تجویزیں منظور کی گئیں۔ لیکن ان کوششوں کے باوجود پہلی جنگ عظیم میں ایک کروڑ جانوں کا نقصان ہوا اور دوسری جنگ عظیم میں تین چار کروڑ انسان مارے گئے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ واضعین قانون کی یہ تمام کوششیں محض ریاکاری اور منافقت پر مبنی ہیں، ورنہ ان کے دلوں میں تحفظِ انسانیت کا جذبہ نہ پہلے تھا اور نہ اب ہے اور جب قیامِ امن اور تحفظ انسانیت کی کوشش کرنے والے خود ہی بہیمیت و درندگی کا مظاہرہ کرتے ہوں تو انسانیت کے مرض کا علاج کیسے ممکن ہے۔ ؎

در دستِ طبیب است علاج ہمہ دردے
دردے کہ طبیب دہد آں را چہ علاجے

ان افسوسناک ناکامیوں کو دیکھ کر بعض مغربی مفکرین اس درجہ مایوس ہو گئے ہیں کہ انھوں نے ان کوششوں کی افادیت ہی کا انکار کر دیا ہے۔ چنانچہ پروفیسر نیو لڈ نے صاف صاف کہہ دیا کہ قانون اور جنگ باہم نقیض ہیں اور میدانِ جنگ میں قانونی پابندیوں کی رعایت کسی صورت سے ممکن نہیں ہے۔

ان حقایق کے پیشِ نظر نسلِ انسانی کو رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عظیم الشان کارنامہ پر فخر کرنا چاہیے کہ آپ نے صرف آٹھ نو سال کی مدنی زندگی میں عربوں جیسی اجڈ اور وحشی قوم کے وحشیانہ جنگی طریقوں کی اصلاح کر کے ایک جدید بین المملکتی دستور اور احترامِ انسانیت پر مبنی قوانینِ جنگ کو عملاً نافذ کر دیا اور جو لوگ درندوں کی طرح ایک دوسرے کو پھاڑ کھاتے تھے، ان کے دلوں میں ہمہ گیر اخوتِ انسانی کا جذبہ پیدا کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ وہ عظیم الشان کارنامہ ہے، جس کا اعتراف دشمنوں کو بھی کرنا پڑا۔ پروفیسر ورکر لکھتے ہیں:

"یہ عجیب بات ہے کہ جرمنوں اور تاتاریوں ایسی وحشی اقوام کے برعکس، عرب کے بدو جب یک دفعت اپنے صحرائی برِ اعظم سے نکل کر دوسرے ممالک پر حملہ آور ہوئے، تو ان فتوحات کو عام تصور کی وحشیانہ فتوحات میں ہرگز شامل نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ ان لوگوں میں پہلے ہی دن سے ان کے مفتوحوں سے بڑھ کر تہذیب اور پاکیزہ اخلاق نظر آتے تھے۔" [1]

پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی کارنامہ

سطورِ بالا میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کو کم و بیش تاریخ اسلام کا ہر واقف کار جانتا ہے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی کارنامہ اس سے بہت

۱؎ دی ہسٹری آف دی لاز آف نیشنز

بلند ہے اور اس کو وہ مردِ مومن ہی سمجھ سکتا ہے، جو ذوقِ عشق و مستی سے آشنا ہو۔ وہ کارنامہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تزکیۂ نفوس اور تعلیم و تربیت نے عربوں کو وہ نگاہِ حق شناس اور دلِ خود آگاہ عطا کیا کہ کائناتِ ہستی کے نقش و نگار اور عالمِ رنگ و بُو کی گوناگوں بُوقلمونیوں میں ان کو جلوۂ حق کے سوا کوئی چیز نظر نہ آتی تھی اور ان کے ذوقِ یقین و ایمان کا یہ عالم تھا کہ ان کی نگاہ ماورائے محسوسات کو پیکرِ مشہود کی صورت میں دیکھتی تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرت حارثؓ سے دریافت کیا: حارثؓ! تمھارا کیا حال ہے؟

عرض کی: یا رسول اللہؐ! خدا پر صدقِ دل سے ایمان رکھتا ہوں۔

فرمایا: ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے، تمہارے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟

کہا: دنیا سے میرا دل اچاٹ ہوگیا ہے۔ رات کو جاگتا اور دن کو بھوکا رہتا ہوں۔ گویا عرشِ الٰہی مجھے سامنے نظر آرہا ہے۔ اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔

اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تم نے ایمان کی حقیقت کو پالیا، اب اس پر قایم رہو۔"[1]

حضرت حنظلہؓ فرماتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم جب ہم سے جنت و دوزخ کا ذکر فرماتے تو ہماری آنکھوں کے سامنے جنت و دوزخ کا سماں بندھ جاتا تھا۔[2]

نگاہِ نبوت نے ان کے دلوں میں عشق کا ایک ایسا ولولہ پیدا کر دیا تھا کہ وُہ ہر لمحہ ذکر و فکر میں مشغول رہتے اور ان کی راتیں یادِ الٰہی میں کٹتی تھیں۔ چنانچہ قرآن حکیم نے ان الفاظ میں ان کی تعریف کی ہے:

تتجافی جنوبھم عن المضاجع یدعون ربھم خوفاً وطمعاً و مما رزقنٰھم ینفقون۔ (السجدہ۔۱۶)	ان کے پہلو بسترِ استراحت سے الگ رہتے ہیں، وُہ خوف و رجاء سے خدا کو پکارتے ہیں اور ہماری دی ہُوئی چیزوں سے راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقۂ دعوت و تبلیغ یہ بھی تھا کہ آپ قرآنی آیات ایسے مؤثر لہجہ میں تلاوت فرماتے تھے کہ پتھر دل موم ہوجاتے تھے۔ بہت سے لوگوں کے دلوں میں آپ کی تلاوت کے اثر سے اسلام اُتر گیا۔ چنانچہ حضرت عثمان بن مظعون، حضرت ارقم بن ابی الارقم، حضرت جبیر بن مطعم، حضرت ابوعبیدہ بن الحارث اور کئی دوسرے صحابہ رضوان اللہ علیہم آپ کی زبانِ مبارک سے قرآن سُن کر مسلمان ہُوئے۔

تلاوتِ قرآن کے وقت حضراتِ صحابہ پر عجیب رقت کا عالم طاری ہوجاتا تھا۔ قرآن حکیم نے ان الفاظ میں اس کا نقشہ کھینچا ہے:

---

[1] اسد الغابہ تذکرۂ حارث بن مالک [2] سنن ترمذی

تقشعر منه جلود الذین یخشون ربھم ثم تلین جلودھم و قلوبھم الیٰ ذکر اللہ۔ (زمر۔ ۳)	اللہ کے کلام سے ان لوگوں کے جسم کانپ اٹھتے ہیں، جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔ پھر ان کے جسم اور دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف پھر جاتے ہیں۔

انسانی شرف و سعادت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ جہالت اور قلب و نظر کی تیرگی ہے جہالت کا پردہ اٹھ جانے کے بعد دوسرے تمام پردے آپ ہی سرکنے لگتے ہیں۔ اس لیے پیغمبرانہ دعوت سب سے پہلے قلب و نظر ہی سے تعرض کرتی ہے اور پیغمبرانہ تعلیم و ارشاد کے اثر سے جیسے ہی جہالت کی گرفت ڈھیلی ہوتی ہے، زندگی کی مستور حقیقتیں اجاگر ہو کر آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہو جاتی ہیں: ؎

واقف نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

اس لیے حضرات انبیاء علیہم السلام کی حیثیت محض مبلغ اور واعظ کی نہیں ہے بلکہ ان کو معلم اور مربی بنا کر بھیجا جاتا ہے اور وہ منصبِ رسالت پر فائز ہوتے ہی فکر و ذہن کی تطہیر اور پھر سیرت کی تعمیر کا کام شروع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات کی نسبت فرمایا کرتے تھے کہ:

"مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔"

ایک مرتبہ آپ مسجد میں تشریف لے گئے۔ اس وقت وہاں دو گروہ الگ الگ بیٹھے تھے۔ ایک گروہ ذکر و عبادت میں مشغول تھا اور دوسرا مذاولت میں مصروف۔ آپ نے فرمایا، اوّل الذکر گروہ بے شک نیک کام کر رہا ہے، ——— وہ خدا سے کچھ مانگ رہا ہے۔ خدا کی مرضی ہے کہ اس کی دعا کو شرف قبول بخشے یا مسترد کر دے لیکن دوسرا گروہ تعلیم و تعلم کا کام کر رہا ہے (جو آیندہ نسلوں تک اپنا اثر چھوڑنے والا ہے) مجھے بھی چونکہ معلم بنا کر بھیجا گیا ہے، اس لیے میں اسی گروہ میں بیٹھنا پسند کرتا ہوں۔

اسی بنا پر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے جہل و تشکک کی تاریکیوں میں گھری ہوئی نسل آدم کو یقین و ایمان کی ضیاباریوں سے منور کیا اور اس کو ضلالت و غوایت کی راہ سے ہٹا کر سعادت ابدی اور شرفِ انسانیت کی شاہراہ پر لگایا۔

دعوت نبوی کا اقتضائے طبعی مصالحت و امن پسندی

پیغمبر کی سیرت عفت و پارسائی، عفو و حلم، صبر و ضبط، مروت و احسان، محبت و ہمدردی اور دوسرے فضائل اخلاق کا ایسا پاکیزہ اور حسین مرقع ہوتی ہے کہ عام انسان تو کیا، بڑے بڑے اہل علم و تقویٰ اور پاکیزہ سیرت لوگ بھی اس کے حسن و زیبایش کی تاب نہیں لا سکتے اور عقل انسانی یہ دیکھ کر دنگ رہ جاتی ہے کہ ایک شخص انسان ہوتے ہوئے بھی اتنے صبر و تحمل، اتنے حوصلہ و ضبط اور اتنی فراخدلی و وسعت قلبی سے متصف ہو سکتا ہے کہ برائی کرنے والوں سے نیک سلوک کرے، راہ میں کانٹے بچھانے والوں کی عیادت کرے، پتھروں سے زخمی کرنے والوں کے حق میں دعا کرے اور شدید کینہ پرور اور انتقام کیش

دشمنوں پر قابو پانے کے بعد ان کو معاف کر دے۔ وُہ اتنا پاکباز اور عفت مآب ہو کہ اس کی کتابِ زندگی کا کوئی صفحہ خواہش نفس کے دھبوں سے داغدار نہ ہو۔ اس کی بے غرضی کا یہ حال ہو کہ سونے چاندی کے ڈھیر اس کے قدموں پر نثار کیے جا رہے ہوں اور وہ نگاہ غلط انداز سے بھی کبھی ان کی طرف نہ دیکھے۔ اس کو اپنے نصب العین سے اتنی محبت ہو کہ اپنی زندگی کا سارا عیش و آرام اس کے لیے قربان کر دے۔ اس کے دل میں انسانیت کا اتنا درد ہو کہ کسی پر ظلم کرتے ہُوئے دیکھ کر تڑپ اُٹھے اور اپنی ذات کے لیے ایک مرتبہ بھی کسی سے انتقام نہ لیا ہو؛ بلاشبہ عقل ایسے شخص کے متعلق یہی فیصلہ کرے گی کہ یہ شخص مقامِ انسانیت سے بہت بلند ہے۔ ورنہ یہ ممکن نہیں ہے کہ انسان میں خواہش انتقام، ہوائے نفس اور دُوسرے لوازمِ بشریت نہ ہوں۔

قرآن حکیم بار بار گزشتہ ایام و وقائع کا ذکر کرتا ہے اور اشرار و مفسدین کی معصیت کوشیوں اور شر انگیزیوں کے مقابلہ میں حضرات انبیاء علیہم السلام کی دعوتِ اصلاح و تعمیر کے حالات اور ان کی مقدس سیرتیں ایسے موثر انداز میں بیان کرتا ہے کہ ایک نیک سرشت انسان کے دل میں ان مقدس نفوس کے لیے عقیدت و محبت کے جذبات کا طوفان امڈ آتا ہے اور اس کی زبان بے ساختہ ان کی تعریف و توصیف میں زمزمہ سنج ہو جاتی ہے۔ اس موقع پر اس کی چند مثالیں کافی ہوں گی۔

جب انبیاء علیہم السلام دیکھتے ہیں کہ ان کی دعوت کی مخاطب قومیں کفر و معصیت پر مُصر ہیں اور بار بار سمجھانے کے باوجود ضلالت و گمراہی میں اور زیادہ سخت بلکہ انسانیت کے ان سچے خیر خواہوں کی ایذا رسانی اور قتل تک کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہیں، تو اس حالت میں بھی ان کے دل جذبۂ انتقام سے بالکل پاک اور قوم کی فلاح و سعادت کے لیے بے چین ہوتے ہیں اور ان کی صلاح و فلاح میں اپنے مساعی کی بے غرضی کا ان الفاظ میں اعلان کرتے ہیں:

لا اسئلکم علیه مالا ان اجری الا علی اللّٰه۔ (ہود۔ ۳)	میں دعوت و تبلیغ کے عوض تم سے مال و دولت نہیں مانگتا میرا اجر صرف اللہ کے ذمہ ہے۔
قل ما سألتکم من اجرٍ فهو لکم ان اجری الا علی اللّٰه۔ (سبا۔ ۶)	اے نبی! ان سے آپ کہہ دیں کہ میں نے اگر تم سے کوئی اجرت طلب کی ہے تو وہ تم اپنے پاس ہی رکھو۔ میرا اجر خدا کے ذمہ ہے۔

غور کیجئے کہ یہ الفاظ کتنے درد و خلوص میں ڈوبے ہُوئے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سعیِ تبلیغ کے سلسلہ میں قرآن میں جو آیات نازل ہُوئی ہیں، ان سے اس کام کے ساتھ آپ کے شدتِ تعلق اور آپ کے دل میں انسانی فلاح و سعادت کی تڑپ کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ارشاد ہے:

لعلک باخع نفسک الا یکونوا مومنین۔ (الشعراء۔ ۱)	شاید آپ اپنے نفس کو اس لیے ہلاک کر یں گے کہ وُہ لوگ ایمان نہیں لاتے؟

حضرات انبیاء علیہم السلام کی پاکیزگیِ سیرت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے جب حضرت موسیٰؑ کو ایک مدت کے لیے اجیر مقرر کیا، تو اس وقت انھوں نے جو الفاظ کہے، وُہ انسانیت کی حقیقی خیر خواہی کے

آئینہ دار ہیں؛

ما ارید ان اشق علیک ستجدنی ان شآء اللہ من الصالحین۔ (القصص)	میں یہ نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی سختی کروں۔ ان شاء اللہ تو مجھے صالحین میں سے پائے گا۔

ان حقایق سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی سیرت خلوص و دیانت اور انسانی محبت و ہمدردی سے معمور اور ایذا و قتل و سفاکی سے بالکل پاک ہوتی ہے۔ اس لیے پیغمبروں کی نسبت یہ خیال بالکل غلط ہے کہ ان کی دعوت قتل و سفاکی اور خون آشامی کو ضروری قرار دیتی ہے۔ بلکہ درحقیقت پیغمبرانہ دعوت کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ پُرامن طریقہ سے خدا کی زمین کو ظلم و معصیت سے پاک کیا جائے۔ لیکن جب شر پسند قوتیں مقابلہ پر اتر آتی ہیں، اس وقت قوت کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے، کیونکہ: ؎

کارِ حق گاہ بہ شمشیر و سناں نیز کنند

پیغمبرانہ دعوت کی ایک اصل یہ ہے کہ مصالحت کے تمام ضروری وسائل و ذرائع استعمال کرنے سے پہلے قوت و طاقت کا ہرگز استعمال نہ کیا جائے اور امکانی حد تک مخالفوں کو حسنِ سلوک اور مروّت و احسان کی قوت سے تسخیر کیا جائے۔ فریضۂ دعوت کی تکمیل میں جنگ ہرگز شامل نہیں ہے۔ اس کا حقیقی مقصد انسانیت کی فلاح و نجات ہے۔ لیکن اگر اس مقصد کی تکمیل میں شرارت پسند مزاحم ہوں اور وہ جنگ سے مجبور کریں، تو عقل و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی شر انگیزیوں کو قوت کے ذریعہ کچل دیا جائے۔ مگر اس کی اجازت بہت سے شرائط کے ساتھ ہے؛

اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا و ان اللہ علی نصرھم لقدیر۔ (الحج)	ان لوگوں کو جنگ کی اجازت دی گئی ہے، جن سے جنگ کی جاتی ہے یہ اجازت اس لیے کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے۔
قاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین۔ (البقرہ ۔ ۲۴)	تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور حد سے تجاوز نہ کرو۔ بے شک اللہ تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

لیکن یہی لوگ اگر جنگ سے دستبردار ہو کر صلح کی پیش کش کریں یا کم از کم ایسا رویہ اختیار کریں جس سے یہ یقین ہو جائے کہ وہ آئندہ جنگ کی خواہش نہیں رکھتے، تو اس حالت میں قرآن حکیم کا صریح حکم ہے کہ ان لوگوں کے خلاف ہرگز جنگ نہ کی جائے:

الذین یصلون الی قوم بینکم و بینھم میثاق او جآؤکم حصرت صدورھم ان یقاتلوکم او یقاتلوا قومھم۔ (نساء)	ان لوگوں سے نہ لڑیں، جو ایسی قوم سے جا ملیں، جس سے تمہارا معاہدہ ہے یا وہ اس حال میں تمہارے پاس آئیں کہ تمہارے ساتھ اور تمہاری قوم کے ساتھ جنگ کرنے سے دل برداشتہ ہوں۔
وان جنحوا للسلم فاجنح لھا۔ (الانفال)	اگر اہل کفر صلح کے لیے جھکیں، تو آپ ان سے صلح کر لیں۔

اس ضمن میں سیرت نبوی کے بہت سے واقعات شہادت میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ہجرت کے بعد جب مدینہ منورہ کو مستقر دین بنایا گیا تو یہاں کے یہود سے جو معاہدہ ہوا تھا، اس میں یہود کو شہری حقوق عطا کیے گئے تھے لیکن ۲ھ فتح بدر کے بعد یہودیوں نے جب محسوس کیا کہ اسلام ایک ناقابل شکست طاقت بنا جاتا ہے، تو ان کے سینوں میں حسد و عداوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ قبائل یہود میں بنی قینقاع سب سے زیادہ جنگجو اور دلیر تھے۔ اس لیے پہلے انھوں نے معاہدہ کو توڑا اور مسلمانوں کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ ابن سعد میں ہے:

فلما کانت وقعة بدر اظهروا البغی والحسد ونبذ والعهد۔

غزوۂ بدر کے وقت یہودیوں نے سرکشی و حسد کا اظہار کیا اور عہد کو توڑ ڈالا۔

اس موقع پر اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے، تو ان کا ایک فرد بھی زندہ نہ رہنے پاتا، مگر رحمۃ للعالمین نے عبداللہ بن ابی کی درخواست پر توریت کے حکم کے مطابق ان کو محض جلاوطنی کی سزا دی اور وہ اپنے مال و متاع کو لے کر اذرعات (شام) چلے گئے۔ اس کے بعد ۴ھ میں بنو نضیر نے نقض عہد کیا۔ انھوں نے کئی مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش اور قریش کے بھڑکانے سے معاہدہ کی خلاف ورزی کی۔ ایسے لوگوں کی سزا "بین المملکی" قانون کے مطابق قتل سے کم کسی صورت میں نہیں ہو سکتی تھی۔ مگر سرور دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی جان و مال سے کسی قسم کا تعرض نہ کیا اور فقط جلاوطنی کی سزا پر اکتفا کیا۔

عہد رسالت کے واقعات میں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں، جن میں غلبہ و اقتدار کے بعد غیر مسلم قبائل سے ان کی جان و مال کے تحفظ کا معاہدہ کیا گیا۔ چنانچہ تبوک کے سفر میں ایلہ، جربا اور اذرح کے قبائلی سرداروں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کیا۔ دومۃ الجندل کا اکیدر نامی سردار، جو اس سے پہلے قیصر کے زیر اثر تھا مدینہ میں آیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پروانۂ امن عطا کیا۔ ۹ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرب کے مختلف حصوں سے بہت سے وفود آئے۔ ان میں سے بہتوں نے اسلام قبول کر لیا۔ لیکن بعض ایسے بھی تھے، جنھوں نے کہا کہ ہم اسلام تو نہیں قبول کر سکتے، لیکن مسلمانوں کے خلاف کسی قسم کا اقدام بھی نہیں کریں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی شرط پر ان سے معاہدہ طے کیا۔

مندرجہ بالا واقعات سے اگر صرف نظر بھی کر لیا جائے، تو تنہا فتح مکہ کے موقع پر مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن (قریش) کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فراخدلانہ بلکہ ہمدردانہ سلوک اس حقیقت کبریٰ کی بین دلیل ہے کہ پیغمبرانہ دعوت احترام آدمیت اور ہمہ گیر اصول انسانیت پر مبنی ہے، جس میں انتقام اور جنگ و قتال کی خواہش کو قطعاً کوئی دخل نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں بعض ارشادات نبویؐ کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ غزوۂ خیبر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت علیؓ کو علم عطا کیا تو اس موقع پر حضرت علیؓ نے کہا: "میں ان لوگوں سے یہاں تک لڑوں گا کہ وہ ہماری طرح مسلمان ہو جائیں۔" اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"نہیں، تم نرمی سے ان کو اسلام کی دعوت دو اور ان کو ان امور سے آگاہ کرو، جو ان پر واجب ہیں۔ خدا کی قسم اگر ایک آدمی بھی تمھاری کوشش سے راہ راست پر آ جائے، تو یہ تمھارے لیے سرخ اونٹوں سے بہتر ہوگا۔"[1]

---

[1] بخاری

جب معرکۂ قتال گرم ہوتا ہے، اس وقت کسے اس کا خیال رہتا ہے کہ دشمن کے چہرہ پر اس لیے ضرب نہ لگائی جائے کہ وہ تمام اعضائے انسانی سے شریف تر عضو اور قدرت کی صنعت کا حسین تزین مظہر ہے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی ہدایت کی ہے:

اذا قاتل احدکم فلیجتنب الوجہ۔ (بخاری ص ۳۴۷)

جب تم سے کوئی دشمن سے لڑ رہا ہو، تو اس کے چہرہ پر وار کرنے سے اجتناب کرے۔

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ

اور ان کے اموال میں سائل اور محروم کا حق ہے

(الذّٰریٰت ۱۹)



فلاحی معاشرہ

اور

اقتصادی نظام

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیش کردہ نظامِ حیات

مولانا محمد ظفیر الدین

آج دنیا ایک ایسے نظامِ حیات کے لیے سرگرداں ہے، جو اسے تمام شعبہ جات زندگی میں طمانیت کی دولتِ وافر عطا کر دے اور جس نظامِ اجتماع و تمدن میں عدل و مساوات کی حکمرانی ہو جہاں افراط و تفریط کو چھوڑ کر اعتدال و توازن قایم ہو، انسانیت کا احترام و اکرام ہو، دھرم اور مذہب کے نام پر فتنہ و فساد کی گرم بازاری نہ ہو، نظامِ معیشت میں ہمواری ہو اور طبقاتِ انسانی میں کوئی طبقہ افلاس کے قدموں میں کچلتا ہوا نظر نہ آئے، معاشرتی زندگی پاکیزہ اور بدکرداریوں سے پاک ہو اور تمام انسانوں کی عفت و عصمت کا مکمل تحفظ ہو۔

بلاشبہ دنیا میں اس وقت تک ہزاروں مصلح اور پیغمبر تشریف لائے۔ اس میں بڑے بڑے انقلابیوں اور راہ نماؤں نے جنم لیا اور انسانیت کی فلاح و نجاح کے نام پر اصلاح کی سعی کی مگر اس عظیم الشان جماعت میں جو ہمہ گیر نظامِ حیات رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا وہ اور کہیں نظر نہیں آتا۔ ہم آپ کے سامنے آنحضرتؐ کی زندگی اور آپؐ کے پیغام کا خلاصہ سرسری طور پر پیش کرتے ہیں۔

چالیس سال اپنوں میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چالیس سال کی عمر اپنے آبائی ماحول میں گزاری، اس عرصہ میں آپ نے تجارت کی، ازدواجی زندگی گزاری، بڑوں اور چھوٹوں میں رہے اور عرب اور شہر مکہ کی ہی تہذیب و تمدن میں پرورش پاکر جوان ہوئے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ان کی اس چالیس سالہ زندگی پر کسی کو کوئی جائز اعتراض ہوا؟ کسی نے آپ کے اعمال و اخلاق کا کوئی گلہ اور شکوہ کیا؟ آپ کے رہن سہن اور اپنوں کے ساتھ احترام و اکرام اور محبت و شفقت پر کسی نے کوئی حرف گیری کی؟ انسانی لغزشوں اور کذب و افتراء کی کسی نے ایک مثال پیش کی؟ ظلم و ستم اور جور و تعدی پر کسی کو نالاں پایا؟ مختصر یہ ہے کہ آپ کی زندگی کے کسی شعبہ پر کسی ایک متنفس کو بھی (بشرطیکہ وہ قابلِ اعتماد اور منصف ہو) شکوہ سنج نہیں پائیں گے بلکہ اس کے برعکس نظر آئے گا تو یہ کہ پورے مکہ والوں کی زبان پر رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے امین اور صادق کے پاکیزہ لفظ کے علاوہ دوسرا کوئی لفظ نہیں ہے۔

زندگی کے تیئیس سال مکہ اور مدینہ میں اب چالیس سال بعد بایں ہمہ اعتماد و اعزاز جب توحید کا لفظ زبانِ وحی ترجمان پر آتا ہے تو مکہ والوں میں ایک عجیب شورش پیدا ہو جاتی ہے اور مکہ کی تیرہ سال کی زندگی کا نقشہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے غیر ہو گئے، مجلس احباب بزمِ اعدا میں تبدیل ہو گئی، چچا پیچھے پڑ گئے۔ اہلِ خاندان نے حمایت سے انکار کر دیا، سردارانِ قریش نے دباؤ ڈالنے کی سعی کی، قوم تند مزاجی اور درشت خوئی سے پیش آئی، قریش نے سخت و سست کہا۔ قتلِ نبی کی پے در پے جد و جہد کی گئی۔ صحابہ کرام پر مشقِ ستم جاری رہی، مسلمان خواتین کو زخم لگایا گیا۔ صاحبزادیؓ کو ہجرت حبشہ پر

مجبور رہنا پڑا۔ منافقوں نے مذاق اڑایا۔ شانہ مبارک پر غلاظت ڈالی گئی، گردن مبارک میں پھندا ڈالا گیا، محمدؐ کی جگہ مذمم سے خطاب کیا گیا، شعب ابی طالب میں قید کر کے ترکِ موالات کیا گیا، جسمِ اطہر لہولہان کیا گیا، معراج کی تکذیب کی گئی، فریب دینے کی کوشش کی گئی، بیہودہ مطالبات کیے گئے اور بالآخر ہجرت پر مجبور کیا گیا، ہجرت کر کے نکلے تو تعاقب کیا گیا، گرفتاری پر انعام و اکرام کا اعلان کیا گیا اور کاشانۂ نبوی پر پہرہ لگایا گیا جو چند گنے چنے مسلمان ہوئے تھے سب نے وطنِ عزیز کو سلام رخصت کیا اور مدینہ منورہ جا پہنچے۔

مدینہ منورہ پہنچے تو تعمیری کام کی طرف توجہ دی مگر مدینہ کی دس سال کی زندگی میں آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ یہود و منافقین اور کفارِ مکہ سے چھوٹی بڑی ۸۴ لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ عزیز چچا اور رفیقۂ حیات کی موت کا غم مکہ میں اٹھا چکے تھے۔ یہاں بھی کتنے عزیزوں کی موت کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ پھر صحابہ کرام کی اچانک شہادت کا رنج والم، حضرت حمزہ کی شہادت کا صدمۂ عظیم اور ان کی لاش کے ساتھ وحشیانہ سلوک کا درد۔ اور دوسری اذیتیں علاوہ ہیں۔

تعلیماتِ نبویؐ

۲۳ سال کی مختصر مدت اور مصائب اور دوسری مصروفیتوں کا یہ ہجوم مگر بتانا یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بایں ہمہ افکار و مصائب دنیا کو کیا تعلیمات دیں۔ ان کی کیسی اصلاح کی۔ ان کے انتشار و تشتت کو کیونکر دُور کر دیا۔ سالہا سال کی جنگ کو صلح اور آشتی سے کیسے بدلا اور کچلی ہوئی انسانیت کو بامِ رفعت تک کس طرح پہنچایا۔

انسانیت کا مقام

انسانیت دم توڑ چکی تھی اور آدمیت رسوا ہو رہی تھی۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پہلے شخص تھے جنہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے بعد انسانوں کو ہدایت کی مشعل دکھائی اور بتایا کہ ساری کائنات انسان کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ زمین و آسمان، چاند و سورج سب انسان کے اطاعت گزار ہیں۔ دنیا کی تمام چھوٹی بڑی چیزیں انسان کے فائدہ کے لیے ہیں۔ انسانیت کا مقام سب سے بلند اور عظیم الشان ہے۔ آپ نے اعلان کیا:

وسخر لکم الّیل والنهار والشمس والقمر والنجوم مسخرات بامره ان فی ذلك لاٰیٰت لقوم یعقلون ۔ (نحل ۲)	اور تمہارے کام میں اس نے رات دن، سورج اور چاند کو لگا دیا ہے اور ستارے اس کے حکم سے کام میں لگے ہیں۔ اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو سمجھ رکھتے ہیں۔

انسانوں کو توہم پرستی سے نکالا اور بتایا کہ انسان اپنی خلقت میں سب سے اشرف ہے۔ خوب صورتی اور وضع قطع میں دنیا کی کوئی چیز انسان کے مدِمقابل نہیں ہے۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کی طرف سے اعلان فرمایا:

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ (والتین)	بے شبہ ہم نے آدمی کو بہترین انداز سے پر بنایا۔

مرکزیت و اجتماعیت

انسان میں خود اعتمادی پیدا کی اور بتایا کہ تم سے اوپر کوئی ہے تو وہ صرف خدا کی ذات ہے اور تم اسی کی پرستش کے لیے پیدا کیے گئے ہو۔ وحی محمدیؐ نے اعلان کیا:

وماخلقت الجن والانس الا لیعبدون۔ (ذریٰت ۲)	اور میں نے آدمی اور جن جو پیدا کیا سو اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا۔

اور پھر انسان کا مرکزی نقطہ اسی ایک ذات کو قرار دیا، جس نے کائنات کو وجود بخشا اور اسی مرکز پر لا کر سب میں

یگانگت اور اتحاد پیدا کیا، انتشار و تشتت کو دُور کیا اور سب کے لیے لا الٰہ الا اللّٰہ مُحَمّد رسول اللّٰہ کی تصدیق و اقرار کو بنیاد قرار دیا، جس میں کسی کو شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

یٰاَھل الکتاب تعالوا الیٰ کلمۃ سواءٍ بیننا وبینکم الا نعبد الا اللّٰہ ولا نشرک بہٖ شیئًا و لا یتخذ بعضنا بعضًا اربابًا من دون اللّٰہ۔ (آل عمران ۷)

اے اہل کتاب آؤ ایک بات کی طرف جو ہم میں اور تم میں برابر ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اور اس کا کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور اللہ کے سوا کوئی کسی کو ہم میں رب نہ بنائے۔

کلمۂ توحید میں "محمد رسول اللہ" کا کلمہ شریک کیا گیا۔ مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں اپنی ب‍ے کسی کا بیسیوں جگہ اعلان کیا اور اپنی عبدیت کو کبھی بھی الوہیت کے درجہ میں لانے کی سعی نہیں فرمائی بلکہ بے شمار موقعوں پر تاکید فرمائی کہ میں اس کا محض ایک بندہ اور رسول ہوں، اس سے زیادہ میری کوئی حیثیت نہیں:

قل انما انا بشرٌ مثلکم یوحیٰ الیّ انما الٰھکم اللّٰہُ واحد۔ (کہف۔۱۲)

تو کہہ میں بھی تم جیسا ایک آدمی ہوں۔ میری طرف وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود ایک معبود ہے۔

یہ بھی پسند نہیں فرمایا کہ کوئی آپ کی تعظیم کے لیے کھڑا ہو۔ کسی نے غیب داں بتایا تو اسے روک دیا کہ اس طرح مت کہو۔ یہ کوئی مخفی بات نہیں ہے کہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسی زندگی گزاری۔ پتھر اٹھاتے، خندق کھودی، لکڑی توڑی، رات رات بھر اللہ تعالیٰ کی عبادت کی، دوسروں سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے خود ڈرتے رہے۔ الوہیت کا مسئلہ جب اجاگر ہوگیا تو نظام اجتماع کی بنیاد ڈالی اور اپنے ہر عمل سے توحید کا مظاہرہ کیا۔

نظام اجتماع

دن رات میں پانچ وقت کی نماز فرض ہوئی اور ہر بالغ مرد و عورت پر یہ فریضہ ضروری قرار دیا گیا۔ نماز کے اوقات متعین کیے اور سب کے لیے ایک ہی وقت مقرر کیا۔ فرض نماز کی ادائیگی کے لیے مسجد کے نام سے ایک خاص گھر بنوایا گیا۔ پھر جماعت کی نماز جس کو عذر شرعی نہ ہو اس پر ضروری قرار دی۔ اسی کے ساتھ اس میں ایک شخص کو امام اور بقیہ کو مقتدی قرار دیا اور اس طرح یہ نماز روزانہ اجتماعی زندگی کے لیے راہِ عمل قرار پائی۔ اس میں اخوت و مساوات کی پوری پوری رعایت ملحوظ رکھی گئی۔ ہر روز ہر محلہ اور گاؤں کی مسجد میں یہ اجتماع ہوتا ہے ہفتہ میں تمام محلوں کو ایک جامع مسجد میں جمع کر دیا۔ سال میں شہر اور دیہات کو عیدگاہ میں لاکر اکٹھا کر دیا اور سال کے اخیر مہینہ میں مسجد حرام کے ذریعہ سارے مسلمانوں کو یکجا کر دیا گیا۔ ان اجتماعوں میں سے کسی میں بھی امیر و غریب، شاہ و گدا اور شریف و وضیع کا امتیاز باقی نہیں رکھا گیا، بلکہ سب کو ایک صف میں، ایک گھر کے اندر، ایک امام کے پیچھے جمع کر دیا گیا۔ یہ عملی عبادت آج بھی کسی نہ کسی درجہ میں قائم ہے۔ اس لیے مزید توضیح اور دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔

دنیاوی زندگی میں ایک امیر کی امارت ضروری ٹھہرائی گئی۔ خلیفۃ المسلمین امام منتخب ہوا۔ اس کی اطاعت، اگر اکثریت نے اسے منتخب کر لیا ہے ضروری ہے۔ اس سے انحراف جرم اور معصیت ہے۔ خلیفہ خود بھی احکم الحاکمین کے حکم کا تابع ہوگا۔ اسے

کسی الٰہی قانون میں دم مارنے کی گنجایش نہیں۔ نماز کے متعلق ربّ العزّت کا ارشاد ہے:

واركعوا مع الراكعين - (بقرہ ۵) — اور نماز پڑھنے والوں کے ساتھ نماز پڑھو۔

مسجد میں ادا کرنے کے متعلق ارشاد فرمایا:

واقيموا وجوهكم عند كل مسجد وادعوه مخلصين له الدين۔ (اعراف ۳) — تم سب اپنا چہرہ ہر مسجد کے پاس سیدھا کرو اور اس کو خالص اسی کا فرمانبردار ہو کر پکارو۔

جامع مسجد کے نظام اور ہفتہ وار اجتماع کے باب میں قرآن نے پکارا:

يٰآيها الذين اٰمنوا اذا نودي للصلٰوة من يوم الجمعة فاسعوا الى ذكر الله وذرو البيع - (جمعہ - ۲) — اے ایمان والو! نماز جمعہ کی جب اذان پکاری جائے تو اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف دوڑ پڑو اور بیچنا چھوڑ دو۔

سالانہ اجتماع کے لیے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

واذن فى الناس بالحج يأتوك رجالاً وعلى كل ضامرٍ ياتين من كل فج عميق - (حج ۳) — اور حج کے واسطے لوگوں کو پکار دو کہ تیری طرف پیدل اور دبلے دبلے اونٹوں پر سوار ہو کر آئیں۔ تمام دور راہوں سے آئیں۔

امامت کے لیے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اذا كانوا ثلٰثة فليومهم احدهم و احقهم بالامامة اقرأهم۔ (مسلم باب احق بالامامۃ) — وہ جب تین شخص ہوں تو ان میں ایک کو ان کی امامت کرنی چاہیے اور ان میں مستحق امامت سب سے زیادہ پڑھا ہوا ہے۔

امام کی اقتدا اور پیروی کی تاکید فرمائی:

انما جعل الامام ليوتم به۔ (بخاری انما جعل الامام .... الخ) — امام تو بس اسی لیے بنایا گیا ہے کہ اس کی پیروی کی جائے۔

یہ چیزیں اس لیے پیش کی جا رہی ہیں کہ غور فرمائیے کہ ان میں کہیں بھی ایسا لب و لہجہ اختیار کیا گیا ہے جس سے نیچ اُونچ کی بُو آتی ہو، شریف اور کمینہ کی بات معلوم ہوتی ہو، شودر اور برہمن کی تفریق ہو اور پھر یہ بھی دیکھنے کی بات ہے کہ یہ نظام کیسا تدریجی اور کتنا مرتبط اور ٹھوس ہے۔

خلافت ارضی کے متعلق اعلان ہوا:

ولقد كتبنا فى الزبور من بعد الذكر ان الارض يرثها عبادى الصّالحون۔ (انبیاء) — اور ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھ دیا ہے کہ بالآخر زمین پر میرے نیک بندے مالک ہوں گے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا:

وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم و عملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض۔ (نور-۱۲)

اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا ہے جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کیے کہ البتہ ان کو زمین میں خلیفہ بنا دیں گے۔

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تشریح فرمائی:

اسمعوا و اطیعوا و ان ولی علیکم عبد حبشی ذو زبیبۃ۔

کہ سنو اور فرمانبرداری کرو، گو تم پر کسی حبشی بدصورت غلام کو والی بنا دیا جائے۔

طریق انتخاب کے متعلق ارشاد فرمایا گیا:

امرھم شوریٰ بینھم۔ (شوریٰ-۴)

وہ آپس کے مشورہ سے کام کرتے ہیں۔

یہاں بھی بار بار غور کیا جائے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافتِ ارضی کے متعلق جو طریقہ اختیار فرمایا اس میں کہیں ذات پات اور زور زبردستی کی گنجائش ہے؟ کہیں بھی مساوات کا دامن ہاتھ سے چھوڑا گیا ہے؟ صرف صلاحیت اور ایمان وجہ استحقاق ہے اور انتخاب کا معاملہ باہمی مشورہ پر ہے، جو منتخب ہو گیا، اس کی اطاعت سب پر ضروری قرار دی گئی۔

نظامِ مساوات

اسلام کا نظام اجتماع دیکھ چکے، اب دیکھیے آپ نے مساوات کا کیسا نظام قایم فرمایا۔ جو کچھ عرض کیا جا رہا ہے اسے گہری تنقیدی نگاہ سے ملاحظہ کیجیے۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا:

انما المومنون اخوۃ۔ (حجرات-۱)

سارے مسلمان تو بس بھائی بھائی ہیں۔

اس کی تشریح فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

لا فضل العربی علی عجمی ولا عجمی علی عربی و لا لابیض علیٰ اسود و لا لاسود علی ابیض الا بالتقویٰ، الناس من آدم و آدم من تراب۔ (زاد المعاد، ص ۲۲، ج ۴)

نہ کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت ہے اور نہ کسی عجمی کو عربی پر، نہ کسی گورے کو کالے پر فضیلت ہے اور نہ کسی کالے کو گورے پر۔ مگر اصل تقویٰ ہے۔ تمام لوگ آدم سے ہیں اور آدم مٹی سے ہیں۔

علاوہ ازیں خود قرآن پاک کے ذریعہ وضاحت فرمائی:

یاایھا الناس اتقو ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ و خلق منھا زوجھا وبث منھما رجالاً کثیراً و نساء۔ (النساء-۱)

اے لوگو! تم اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو پھیلایا۔

شعوب و قبائل کے متعلق جو مسئلہ پیش تھا اس کو بھی کھول کر بیان فرمایا اور بتایا کہ شرافت و رذالت خاندان اور قبیلہ میں نہیں ہے یہ اپنے کردار اور اعمال و اخلاق میں ہے اور عند اللہ شریف وُہ ہے جو خدا سے سب سے زیادہ ڈرتا ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے

اعلان کیا:

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَ جَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ (الحجرات ۔ ۲)	اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہاری ذاتوں اور قبیلوں کو رکھا تاکہ تمہارے آپس کی پہچان ہو اور اللہ کے نزدیک تم میں باعزت وہی ہے، جو بڑا متقی ہے۔

دین کے معاملہ میں نسب و نسل کے بت کو پاش پاش کر ڈالا اور شرافت اور بزرگی، اتقا اور خدا ترسی کو قرار دیا۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ حضرت زیدؓ کی شادی جو نسبًا غلام تھے حضرت زینب بنت جحشؓ سے کی اور اس کا تذکرہ قرآن پاک میں محفوظ کر دیا۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان اولیائی المتقون حیث کانوا واین کانوا۔ (زاد المعاد)	میرے ہم کنبہ وُہ ہیں جو خدا سے ڈرتے ہیں، وہ جہاں کہیں بھی ہو۔

اس نظامِ مساوات میں کہیں سے کوئی خامی نظر آتی ہے؟ ایک منصف مزاج کا جواب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ اسلام کا نظامِ مساوات کلّاً و جزءً بے داغ ہے۔

نظامِ عدل و انصاف

دنیا میں شور بپا ہے کہ عدل اور انصاف کی روشنی ہر جگہ بکھتی نظر آتی ہے۔ یورپ جو اس وقت دنیا میں سب سے بڑا متمدن خطہ ہے وہ ساری ترقی و تہذیب کے باوجود اب تک گورے اور کالے کی تفریق کرتا ہے اور قانون میں جو رعایت گورے کو اس نے دی ہے، کالے کو اس سے محروم رکھا ہے۔ اپنوں کے لیے جو لطف و کرم ہے، غیروں کے لیے نہیں۔ مگر رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا نظامِ عدل و انصاف ملاحظہ فرمائیے، کہیں اس میں رو رعایت نظر آتی ہے:

نظامِ مساوات کے ضمن میں آپ نے عدل کی جلوہ گری دیکھ لی۔ اب غور فرمائیے کہ اپنوں سے نہیں غیروں کے ساتھ عدل و انصاف کا کیا برتاؤ روا رکھا گیا ہے۔ بڑے بڑے عادل یہاں پہنچ کر جوشِ عصبیت میں مبہوت نظر آتے ہیں اور قوانین میں ہمواری باقی نہیں رکھتے مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی بھر اس میں افراط و تفریط نہیں کی اور دوست و دشمن دونوں کے ساتھ برابر کا سلوک کیا۔ عدل و انصاف کے قوانین کا اعلان فرمایا اور آج نہیں جب کہ اس کا عام شور بپا ہے بلکہ آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے جب کہ کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ نہیں آ سکتا تھا:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ۔ (المائدہ ۔ ۲)	اے ایمان والو! اللہ کے لیے پوری پابندی کرنے والے عدل کے ساتھ شہادت دینے والے رہو۔
لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی۔ (مائدہ ۔ ۲)	کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کا دامن ہرگز نہ چھوڑو۔ عدل کرو کہ پرہیزگاری کے زیادہ قریب یہی بات ہے۔

جور و تعدی پر جب حالات مجبور کر رہے ہوں، انسانی عقل و فہم عدل و انصاف کا ساتھ نہ دے رہی ہو، اس وقت بھی حکم ہے کہ انصاف کا رشتہ ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے کیونکہ اسلام کی محبت و عداوت دونوں جچی تلی ہوتی ہیں۔ کسی موقع پر بے قابو ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر کوئی بے قابو فرض کر لیجئے ہو جائے تو حکم یہ ہے کہ اس کی اس سلسلہ میں ہرگز امداد نہ کی جائے بلکہ اس کے لیے سب مل کر نیکی اور تقویٰ کا اس طرح اظہار کریں کہ بے جا غیظ و غضب پر شرمندہ ہو کر راہِ راست پر آ جائے:

لا یجرمنکم شنأن قوم ان صدوکم عن المسجد الحرام ان تعتدوا و تعاونوا علی البر والتقوٰی و لا تعاونوا علی الاثم والعدوان واتقوا اللہ ان اللہ شدید العقاب۔ (مائدہ-۱)	اس قوم کی دشمنی جو تم کو حرمت والی مسجد سے روکتی تھی اس کا باعث نہ ہو کہ زیادتی کرنے لگو۔ آپس میں نیک کام اور پرہیزگاری پر مدد کرو۔ گناہ اور ظلم پر مدد نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو بلاشبہ اللہ کا عذاب سخت ہے۔

انصاف کے تخت پر جلوہ افروز ہونے کے بعد کبھی معاملہ سنگین آ جاتا ہے۔ احترام و اکرام اور محبت و شفقت ارادوں میں جنبش پیدا کر دیتی ہے۔ اس وقت بھی اجازت نہیں ہے کہ عدل کا دامن تار تار کیا جائے۔ ارشادِ رب العزت ہے:

یاَیّھا الذین اٰمنوا کونوا قوّامین بالقسط شھدآء للہ و لو علٰی انفسکم او الوالدین والاقربین۔ (نساء-۲۰)	اے ایمان والو! انصاف پر قایم رہو۔ اللہ جیسی گواہی دو گو تمہارا یا تمہارے ماں باپ کا اور یا تمہارے قرابت والوں کا نقصان ہو۔

یہ اعلان ہی اعلان نہیں ہے، عہدِ نبویؐ اور خلافتِ راشدہ کے زمانہ کی تاریخ پڑھ جایئے، وہاں عمل ہی عمل ملیں گے۔ آپ پڑھیں گے کہ مسلمان اور یہودی کا مقدمہ پیش ہوا اور فیصلہ یہودی کے حق میں ہوا۔ تفصیل میں چونکہ جانا نہیں ہے، اس لیے واقعات کی تفصیل چھوڑتا ہوں۔

نظامِ جنگ اور انتقام جنگ اور انتقام کا نام ہی خوفناک ہے۔ یہاں اعتدال کا نام شاید کہیں نظر آ جاتے۔ اگر یقین کے ساتھ اعتدال دیکھنا ہو تو اسلام کی تاریخ پڑھیے کہ اسلام نے نظامِ جنگ کتنا پاکیزہ ترتیب دیا اور انتقام کے لیے کتنا جاذبِ نظر اور دلنشین اصول مرتب کیا ہے۔ جزا اور سزا کے متعلق رب العزت کا ارشاد ہے کہ درگزر سے کام لیا جائے اور اگر بدلہ ہی لینا ہو تو برابر اور ویسا ہی ہو:

جزاء سیئۃٍ سیئۃٌ مثلھا فمن عفا و اصلح فاجرہ علی اللہ انہ لا یحب الظالمین۔ (شوریٰ-۴)	برائی کا بدلہ برائی اسی کے برابر ہے۔ پھر جو معاف کرے اور صلح کرے تو اس کا اللہ کے پاس سے ثواب ہے۔ بے شک اس کو زیادتی کرنے والے پسند نہیں۔

دوسری جگہ فرمایا اور کیسے دلنشین انداز میں فرمایا کہ کوئی سخت بات کہے یا برا معاملہ کرے تو اس کے ساتھ رفق و ملاطفت سے

پیش آنا چاہیے:

لا تستوی الحسنۃ و لا السیئۃ ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینک و بینہ عداوۃ کانہٗ ولیٌّ حمیم و ما یلقّٰھا الّا الذین صبروا وما یلقّٰھا الّا ذُو حظٍّ عظیمٍ۔ (حٰم سجدہ۔ ۴)

نیکی اور بدی برابر نہیں۔ بدلہ میں ایسی بات کہو جو اس سے بہتر ہو۔ پھر ایسا ہو کہ تجھ میں اور جس میں دشمنی تھی گویا گہرا دوست قرابت والا ہے اور یہ بات انہی کو ملتی ہے جو تحمل رکھتے ہیں اور یہ بات اسی کو نصیب ہوتی ہے جس کی قسمت بڑی ہے۔

عفو اور درگزر کے متعلق ارشاد فرمایا گیا:

و ان تعفوا و تصفحوا و تغفروا۔ (تغابن ۲)

اگر تم معاف کر دو اور درگزر کرو اور بخش دو۔

فان ذٰلک من عزم الامور۔ (آل عمران ۔ ۱۹)

بے شک یہ عزیمت کی بات ہے۔

جنگ و قتل کے متعلق فرمایا کہ بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور جو خدا کی یاد میں گوشہ نشین ہوں، ان کو نہ چھیڑو:

و قاتلوا فی سبیل اللّٰہ الذین یقاتلونکم و لا تعتدوا ان اللّٰہ لا یحب المعتدین۔ (البقرہ۔ ۲۳)

اور اللہ کے راستہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور کسی پر زیادتی نہ کرو، اللہ تعالیٰ بے شک زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے۔

اسلام نے کہیں بھی زیادتی اور جور و ظلم کو پسند نہیں کیا۔ صلح و سلامتی اسلام کے قوام میں داخل ہے انتقام و مکافات کے سلسلہ میں اس نے بہادری اور احتیاط کی تعلیم دی۔ ارشاد ہوا کہ جو ہتھیار ڈال دیں اور صلح کے لیے آمادہ ہو جائیں، ان پر زیادتی نہ کرو:

فان اعتزلوکم فلم یقاتلوکم و القوا الیکم السلم فما جعل اللّٰہ لکم علیھم سبیلا۔ (النساء)

سو اگر وہ تم سے علیحدہ رہیں، پھر تم سے نہ لڑیں اور صلح پیش کریں، تو اللہ تعالیٰ نے تم کو ان پر راہ نہیں دی۔

جہاں جاؤ وہاں خوب غور و فکر کو کام میں لاؤ۔ بغیر سوچے سمجھے کوئی کام عجلت میں نہ کر ڈالو۔ قتل و خونریزی کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس لیے اسے خوب اچھی طرح تحقیق کر لو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

یٰایھا الذین اٰمنوا اذا ضربتم فی سبیل اللّٰہ فتبیّنوا۔ (النساء ۔ ۱۳)

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کی راہ میں جب سفر کرو تو تحقیق کر لیا کرو۔

پھر بے رحمی کو بھی راہ نہیں دی ہے۔ اگر کوئی زبان سے ایسا کلمہ کہے جو اس کے باایمان ہونے کو بتاتا ہو یا اطاعت کا اعتراف کرے تو اس کو معاف کر دیا جائے:

و لا تقولوا لمن القیٰ الیکم السلام لست مؤمنا۔ (النساء ۔ ۱۳)

اور جو شخص تم سے سلام علیک کرے، اس کو یہ نہ کہو کہ تو مسلمان نہیں۔

فیصلہ تو ظاہر عمل پر ہے باطن کی ذمہ داری حاکم کے ہاتھ میں نہیں ہے اسے اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور فیصلہ جو بھی ہو، انصاف کے ساتھ ہو۔ افراط و تفریط سے پاک اعتدال پر حکم ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

و اذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل۔ (النساء۔ ۸)

اور تم لوگوں میں جب فیصلہ کرو تو انصاف سے فیصلہ کرو۔

اس حکم سے سرِ مو تجاوز کی اجازت نہیں۔ تاریخ اسلام میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔ عورتوں پر ہاتھ اٹھانے کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت نہیں دی۔ غزوۂ اُحد میں جس خاتون (ہندہ) نے حضرت حمزہؓ کی کچی کلیجی نکال کر چبائی تھی، حضرت ابو دجانہؓ نے اس کے سر پر تلوار اس غزوہ میں رکھ کر اٹھائی تھی کہ آنحضرتؐ کی اجازت نہیں ہے کہ عورتوں پر تلوار چلائی جائے[1]

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے کچھ ہی پہلے ایک لشکر کی تیاری کا حکم دیا تھا جس کا سردار حضرت اسامہ بن زیدؓ کو مقرر فرمایا تھا۔ ابھی لشکر روانہ بھی نہیں ہوا تھا کہ آپ وفات فرما گئے۔ چونکہ صدیق اکبرؓ جب خلیفہ منتخب ہوتے تو اسے روانگی کا حکم فرمایا حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت اسامہؓ کو روانہ کرتے ہوئے یہ نصیحتیں فرمائیں:

"دیکھو خیانت نہ کرنا، دھوکا نہ دینا، مال نہ چھپانا، کسی کے اعضاء کو نہ کاٹنا، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو قتل نہ کرنا، کھجور کے درختوں کو نہ جلانا، پھل والے درختوں کو نہ کاٹنا اور کھانے کی ضرورت کے سوا کسی بکری، گائے یا اُونٹ کو نہ کاٹنا۔ تمہارا گزر ایک قوم پر ہوگا، جو دُنیا کو چھوڑ کر اپنی خانقاہوں میں بیٹھی ہوگی، تم اس سے تعرض نہ کرنا۔"[2]

پھر دنیا جانتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جنگ کے معاملہ میں یہ دستور تھا کہ پہلے مخالفین پر اسلام کی دعوت پیش فرماتے اگر اس پر راضی نہ ہوتے تو جزیہ کا مطالبہ ہوتا، جس کا ماحصل یہ تھا۔ اسلام کی حکومت تسلیم کرلی جائے اور اس کے بعد آخری درجہ میدان کارزار کا ہوتا۔ ذمیوں کی تاریخ پڑھی جائے کہ وہ اسلامی حکومت میں کتنے آرام و عافیت کی زندگی گزارتے تھے۔ ان کی عزت و آبرو کتنی محفوظ ہوتی تھی۔

یہ تھا رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا نظامِ جنگ اور اصولِ انتقام۔ آج تو بہت سے لوگ جب اسلام کی رحمتیں عام ہو چکی ہیں یہ کہتے نظر آئیں گے کہ جنگ میں وحشت و بربریت نہیں ہونی چاہیے۔ مگر اس وقت تو کسی کے وہم میں بھی ایسی بات نہیں تھی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ نظامِ جنگ مرتب فرما کر پیش کر رہے تھے۔

نظامِ معیشت

دنیا میں تہلکہ مچا ہوا ہے کہ انسانوں میں ایسا نظامِ عمل ہونا چاہیے کہ سارے انسان پیٹ بھر کر کھائیں، پہننے کے لیے ان کو کپڑا میسر ہو اور رہنے کے لیے گھر ہوں۔ پیٹ کے نام پر بے شمار تحریکیں اُٹھتی رہتی ہیں گو نتیجہ کے اعتبار سے کوئی بھی کامیاب نہیں ہوتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے جو نظامِ معیشت پیش فرمایا، اس میں کوئی

---

[1] سیرۃ النبیؐ جلد اوّل بیان غزوۂ اُحد

[2] تاریخ ملت ص ۵۰ ج ۲

بھی بُھوکا، ننگا اور بے گھر نہیں رہ سکتا۔ اس کی عملی مثال خلافتِ راشدہ کا دورِ خلافت موجود ہے۔

اسلام میں زکوٰۃ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور ارکانِ خمسہ میں ایک زکوٰۃ بھی ہے۔ خدا سے ڈرنے والوں کی صفتوں میں ایمان بالغیب کے ساتھ یہ بھی فرمایا گیا:

ومما رزقنٰھم ینفقون۔ (بقرہ ۔۱) — اور جو کچھ ہم نے انہیں روزی دیا، اس سے خرچ کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اقیموا الصلوٰۃ و اتوا الزکوٰۃ۔ (بقرہ ۔ ۳) — نماز قایم کرو اور زکوٰۃ دیا کرو۔

قرآن میں بیسیوں جگہ اس کی تکرار ہے اور یہی وہ زکوٰۃ ہے جس کے بند کر دینے پر صدیق اکبرؓ نے تلوار اٹھائی تھی منکرین زکوٰۃ سب کچھ ماننے اور کرنے کو آمادہ تھے مگر صرف یہ کہتے تھے کہ نبی کریمؐ کے بعد زکوٰۃ نہیں دیں گے۔ بہت سے صحابہ کرام اس موقع پر پس وپیش میں تھے کہ وُہ کلمۂ اسلام پڑھتے ہیں پھر صرف زکوٰۃ کے بند کر دینے پر ان کے خلاف تلوار کس طرح اٹھائیں گے مگر صدیق اکبرؓ کی عزیمت اور ان کے بیان سے سبھوں کا سینہ کھلا اور سب نے متفقہ طور پر طے کیا کہ جو زکوٰۃ بند کر دے اس سے لڑنا ضروری ہے اور لڑے۔ صدیق اکبرؓ کی اسی سوجھ پر امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں:

قام ابوبکر یوم الرد مقام الانبیاء (ارتداد کے زمانہ میں حضرت ابوبکرؓ نے نبیوں کا سا کام کیا)

بخاری اور مسلم دونوں نے حضرت صدیق اکبرؓ کا واقعہ بیان کیا ہے۔ اس میں مذکور ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ لا الٰہ الا اللہ جو کہتے ہیں، ان سے قتال کس طرح کیا جائے گا۔ اس موقع پر حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا:

واللہ لاقتلن من فرق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ فان الزکوٰۃ حق المال واللہ لو منعونی عقالا لقاتلتھم علی منعہ۔ (ریاض الصالحین ص ۵۰۸) — خدا کی قسم میں ان سے ضرور قتال کروں گا جو نماز و زکوٰۃ کی فرضیت میں تفریق کرے گا۔ کیونکہ زکوٰۃ مال کا حق ہے بخدا اگر کوئی مجھ کو زکوٰۃ کا ایک عقال (اونٹ باندھنے کی رسّی) بھی نہ دے گا، اس کے روکنے پر بھی ان سے لڑوں گا۔

اس واقعہ سے اہمیت کا اظہار ہے کہ عمل بھی اس پر کس قدر ضروری ہے ورنہ قرآن پاک میں جس قدر تاکید ہے وہی بہت کافی ہے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

خذ من اموالھم صدقۃ تطھرھم و تزکیھم بھا۔ (توبہ ۔۱۳) — ان کے مالوں سے زکوٰۃ لے کر تو ان کو پاک کرے اور اس کی وجہ سے ان کو بابرکت کرے۔

اور اس زکوٰۃ کا منشا یہ ہے کہ مالداروں سے لے کر حاجت مندوں پر خرچ کی جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان اللہ افترض علیھم صدقۃ توخذ من اغنیائھم وترد علیٰ فقرائھم متفق علیہ (ریاض الصالحین باب وجوب الزکوٰۃ)	بے شک اللہ تعالیٰ نے ان پر زکوٰۃ فرض کی ہے کہ ان کے مالداروں سے لی جائے اور انکے حاجتمندوں کو دی جائے۔

زکوٰۃ پر چالیس روپے میں ایک روپیہ، غلّہ میں اگر سینچائی نہیں لگی ہے تو دس من میں ایک من یعنی دسواں حصّہ جسے اصطلاح میں عُشر کہتے ہیں اور اگر سینچا پڑا ہے تو اس میں نصف عُشر ہے یعنی بیسواں حصّہ۔ اسی طرح ہر پائدار چیز میں زکوٰۃ ہے جس کی تصریح فقہاء نے بتائی ہے۔ تفصیل فقہ اور حدیث کی کتابوں میں دیکھی جائے۔

غور فرمایئے صرف زکوٰۃ اور عُشر کی رقم کتنی ہوگی۔ پورے ملک میں جتنا غلّہ پیدا ہوتا ہے اس کا دسواں اور بیسواں حصّہ غریبوں کے نام پر نکل جائے گا اور نقد رقم کا چالیسواں حصّہ محتاجوں کو مل جائے گا۔ علاوہ ازیں قرابت داروں کا حق ہے اور دُوسرے حقوق ہیں، جن کی تاکید حدیث کی کتابوں میں جگہ جگہ ہے۔

پھر سرمایہ داری کو ختم کرنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میراث کے خدائی قانون کا اعلان فرمایا۔ سُود کو حرام قرار دیا۔ فریب اور کذب کی کمائی سے منع فرمایا، رشوت کو ناجائز بتایا اور دُوسرے ناجائز شعبوں پر پہرہ بٹھا دیا۔

اسی کے ساتھ اسلام کا یہ قانون ہے کہ اگر تمام ضروری مدات کی وصولی اور تقسیم کے بعد بھی کچھ لوگ بھوک سے مر رہے ہوں اور کچھ لوگوں کے پاس ضرورت سے زیادہ غلّہ اور رقم ہو تو خلیفۂ وقت مالداروں سے فاضل چیز لے کر مفلسوں اور بھوک سے مرنے والوں پر خرچ کرے۔

اس سے بڑھ کر بہتر اور مکمل نظام اور کیا ہو سکتا ہے، کمیونزم میں بھی بالکلیہ مساوات نہیں ہے ورنہ کاشتکاری نہ ہو، کارخانے نہ چلیں، باربرداری کا کام انجام نہ پائے۔ ایک کاشتکاری کرنے والا صدر جمہوریہ جیسا آرام نہیں پا سکے گا اور اس جیسی عزت حاصل نہ کر سکے گا۔ پھر کمیونزم میں قوت کارکردگی مُردہ کر دی جاتی ہے۔ لوگوں میں کمانے اور محنت کا صحیح جذبہ باقی نہیں چھوڑا جاتا۔ اسلام کا نظام ان تمام خامیوں سے پاک ہے۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نظامِ معیشت پیش فرمایا ہے اس میں کوئی بُھوک سے نہیں مر سکتا۔

نظامِ عفت و عصمت

پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ دنیا نے عفت و عصمت کی مٹی پلید کر ڈالی تھی، عورتوں کی قدر و منزلت ذلت و حقارت میں تبدیل ہوگئی تھی۔ حسب و نسب کا معاملہ پیچیدہ ہوتا جا رہا تھا۔ عصمت فروشی عام تھی۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے اس کے خلاف آواز بلند کی۔ ان کی عفت و عصمت کو بیش قیمت قرار دیا۔ اس راستے سے جو فتنہ و فساد اٹھتے رہتے تھے ان کو بند کیا۔ نکاح کا ایک درست طریقہ پیش فرمایا اور اس پر عمل کی تاکید کی۔ زن و شو کے تعلقات کے لیے قوانین ترتیب دیئے۔ اعلان فرمایا:

وانکحوا الایامٰی منکم والصالحین من عبادکم وامائکم ان یکونوا فقراء	اپنے بے بیاہوں کا اور تمہارے غلام اور لونڈیوں میں جو لائق ہوں ان کا نکاح کر دو۔ اگر وہ مفلس

یغنیہم اللہ من فضلہ و اللہ واسع	ہوں گے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دیگا
علیم ۔ (نور ۔۴)	اور اللہ کشائش والا ہے ، سب کچھ جانتا ہے ۔

اس آیت کا لب ولہجہ بتاتا ہے کہ نکاح صلاحیت کے بعد ضرور کرنا چاہیے ۔ فقر و فاقہ کا خدشہ جو نفس پیدا کرتا رہتا ہے ' اس طرف سے بھی بڑی حد تک تسکین دلائی گئی ہے کہ اگر مشیت ہے تو رب العزت کوئی نہ کوئی جائز شکل پیدا کر دے گا ۔
جس میں نکاح کی صلاحیت ہی نہ ہو ، نہ بالفعل ہو اور نہ بالقوہ بلکہ وُہ ہر طرح مجبور ہو ، اس کو عفت کی زندگی گزارنے کی ہدایت کی گئی ہے اور اشارہ ہے کہ جہاں پھر صلاحیت ہو نکاح کر لے ؛

ولیستعفف الذین لا یجدون نکاحًا	ایسے لوگ جن کو نکاح کی استعداد نہیں ہے ، ضبط
حتّٰی یغنیہم اللہ من فضلہ ۔ (نور ۔۴)	کریں تا آنکہ اللہ ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے ۔

نکاح ایک بڑی نعمت ہے ۔ انسان اپنی زندگی میں ماں باپ کے بعد بیوی ہی سے آرام و عافیت اور سکون اور چین حاصل کرتا ہے اور اس کے ذریعہ اپنی عفت اور عورتوں کی عصمت کا پورے طور پر تحفظ کر سکتا ہے ۔ رب العالمین فرماتے ہیں ؛

ومن اٰیاتہ ان خلق لکم من انفسکم	اس کی نشانیوں میں سے یہ بات ہے کہ اس نے
ازواجًا لتسکنوا الیہا وجعل بینکم	تمہارے لیے تمہاری ہی قسم سے جوڑے بنا دیے
مودۃ و رحمۃ ۔ (روم ۔۳)	تاکہ تم ان کے پاس چین حاصل کرو اور اس نے
	تمہارے آپس میں پیار اور مہربانی رکھی ۔

شہوت کی جگہ کی حفاظت کا حکم فرمایا اور اس پر عمل کرنے والوں کو سراہا ۔ برائی سے روکا اور زیادتی کرنے والوں کی مذمت کی ۔ جہاں ایمان والوں کی فلاح کا تذکرہ ہے ، ان میں ان کو بھی شمار کیا گیا ہے ؛

والذین ھم لفروجھم حافظون الا علٰی	اور جو اپنی شہوت کی جگہ کی حفاظت کرتے ہیں مگر
ازواجھم او ما ملکت ایمانھم فانھم	اپنی بیویوں اور لونڈیوں سے لطف اندوز ہوتے
غیر ملومین ومن ابتغٰی وراء ذٰلک	ہیں ، ان پر کوئی الزام نہیں ہے اور جو کوئی اس کے
فاولٰئک ھم العادون ۔ (مومنون ۔۱)	سوا کی جستجو کرے وُہ حد سے بڑھنے والے ہیں ۔

عفت و عصمت پر غلط تہمت لگانے والوں کے لیے اسّی دُرّے سزا مقرر کی اور اس کی گواہی کو مردود قرار دیا ؛

والذین یرمون المحصنٰت ثم لم یأتوا	جو پاک دامن عورت کو تہمت لگائیں اور چار گواہ
باربعۃ شہداء فاجلدوھم ثمانین جلدۃ	نہ لائیں تو ان کو اسّی کوڑے مارو اور کبھی ان کی
ولا تقبلوا لھم شھادۃً ابدًا واولٰئک	گواہی قبول نہ کرو وہ فاسق لوگ ہیں ۔
ھم الفاسقون ۔ (نور ۔۱)	

زنا کار کی سخت سزا مقرر کی ۔ اگر غیر شادی شدہ ہے تو سَو دُرّے اور شادی شدہ ہے اور خلوت کر چکا ہے تو اس کے لیے

سنگسار کرنے کا حکم ہے۔ یعنی قوم کے روبرو اس کو پتھر مار کر ہلاک کر دیا جائے:

الزانیۃ والزانی فاجلدوا کل واحدٍ منھما مائۃ جلدۃٍ ولا تاخذکم بھما رافۃٌ فی دین اللہ ان کنتم تؤمنون باللہ والیوم الاخر ولیشھد عذابھما طائفۃ من المؤمنین۔ (نور - ۱)	زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مردان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر یقین رکھتے ہو تو تم کو ان دونوں پر اللہ کا حکم جاری کرنے میں ترس نہ آئے اور کچھ مسلمان ان کی سزا کو دیکھتے رہیں۔

سنگسار کرنے کے باب میں حدیث میں حضرت ماعزؓ کا واقعہ مذکور ہے اور بھی بہت ساری حدیثیں ہیں۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے کتنا عظیم الشان نظامِ عفت و عصمت پیش فرمایا۔ اگر اس کے تمام شعبہ جات پر عمل کیا جائے، تو ممکن نہیں، دنیا میں عفت و عصمت کا تحفظ کمزور رہے اور بہت ساری بداخلاقیاں مٹ مٹا نہ جائیں۔

نظامِ امن وامان امن وامان جو اب ایک جنسِ نایاب بنتی جارہی ہے اس کے متعلق بھی رحمتِ عالمؐ نے جو اصول و قوانین پیش فرمائے، وہ ہر طرح مکمل ہیں۔ ان میں کسی جگہ کوئی رخنہ نہیں ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ولا تقتلوا النفس التی حرم اللہ الا بالحق۔ (بنی اسرائیل ۴)	اس جان کو قتل نہ کرو، جس کو اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے لیے۔

قاتل کے لیے قصاص کا حکم نافذ فرمایا یعنی مقتول کے بدلہ میں قاتل بھی قتل کر دیا جائے:

یاایھا الذین امنوا کتب علیکم القصاص فی القتلی الحر بالحر والعبد بالعبد والانثی بالانثی۔ (البقرہ - ۲۲)	اے ایمان والو! مقتولوں میں تم پر قصاص (برابری کرنا) فرض ہے۔ آزاد کے بدلہ آزاد اور غلام کے بدلہ غلام اور عورت کے بدلہ عورت۔

اور اس کو عین زندگی بتایا کہ اس کی اہمیت اور فائدوں میں انسان غور و فکر سے کام لے:

ولکم فی القصاص حیوۃ یا اولی الالباب۔ (بقرہ - ۲۲)	اور اے عقل والو! قصاص میں بڑی زندگی ہے۔

فسادی اور ڈاکوؤں کے متعلق سخت سے سخت سزا تجویز کی تاکہ امن وامان میں کبھی خلل نہ ہونے پائے جس سے ملک کی ترقی رُک جاتی ہے، پبلک میں خوف و ہراس پھیل جاتا ہے، سفر اور کہیں آنا جانا دشوار ہو جاتا ہے اور بہت ساری مصیبتیں ٹوٹ پڑتی ہیں:

انما جزاء الذین یحاربون اللہ ورسولہ ویسعون فی الارض فسادا ان یقتلوا او یصلبوا او تقطع ایدیھم وارجلھم من خلاف او ینفوا من	ان کی سزا جو اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور ملک میں فساد مچاتے ہیں، یہ ہے کہ وہ قتل کیے جائیں، یا پھانسی دیے جائیں، یا ان کے ادھر کے ہاتھ اور ادھر کے پاؤں کاٹ ڈالے جائیں یا ملک سے

الارض۔ (المائدہ۔۵) الگ کر دیئے جائیں۔

چوری کی سزا کے متعلق رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو رات کا سکون حرام کر دیتا ہے اس کے ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں؛

السارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیھما جزآءً بما کسبا نکالاً من اللہ۔ (مائدہ۔۶)

یہ اور اس طرح کے بیسیوں حکم اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے جاری فرمائے، جن سے امن و امان کا کامل تحفظ ہو جاتا ہے۔ کسی کو گنجائش نہیں مل سکتی کہ وہ فتنہ برپا کرے۔

نظامِ تعلیم

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیمات میں جگہ جگہ علم و فضل کی ترغیب دی اور ارتقاء و عروج پر برانگیختہ کیا۔ دورِ اوّل میں مسلمانوں نے حکمت و تہذیب کے جو قابلِ تقلید نمونے پیش کیے، وہ سب رسول الثقلین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و ہدایات کا ادنیٰ پرتو تھا۔ ارشاد ہُوا:

هل يستوى الذين يعلمون و الذين لا يعلمون۔ (الزمر۔۱) کیا علم والے اور بے علم برابر ہوتے ہیں۔

کہیں ترغیب کا پہلو اختیار کیا اور فرمایا:

وما اُوتیتم من العلم الا قلیلا۔ تم کو علم نہیں دیا گیا مگر تھوڑا سا۔

دعا کے جملہ کے طور پر فرمایا گو خاص واقعہ ہی کے سلسلہ میں فرمایا:

قل رب زدنی علماً۔ (طٰہٰ۔۶) تو کہہ اے رب مجھ کو علم میں زیادہ کر۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے علوم و فنون کے تحصیل کی تاکید فرمائی۔ ارشاد فرمایا:

اطلبوا العلم ولو کان بالصین۔ علم حاصل کرو اگر اس کے لیے چین جانا پڑے۔

علم کی قدر افزائی فرمائی، عالموں کی قدر و منزلت بیان کی، علم کے فضائل پر بحث فرمائی اور مسلمانوں اور دوسرے انسانوں کے دل میں یہ حقیقت راسخ کی کہ علم دنیا کی بڑی نعمت اور بیش قیمت دولت ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

فقیہ واحد افضل عند اللہ من الف عابد۔ ایک فقیہہ اللہ کے نزدیک ہزار عبادت گزاروں سے افضل ہے۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ طالب علم کی روشنائی شہید کے خون سے زیادہ مقدس ہے۔ طلبہ کے لیے ساری چیزیں دُعا کرتی ہیں، حتیٰ کہ مچھلیاں سمندر کی تہہ میں ان کے لیے دعا گو ہیں۔ پھر اس کا جو نتیجہ ہُوا وہ تاریخ میں پڑھیے۔ علوم و فنون کا وہ کونسا میدان ہے، جہاں مسلمان نظر نہ آتے ہوں اور سائنس و فلسفہ کا کون سا شعبہ ہے، جو مسلمانوں کا رہینِ منت نہیں۔ پہلے پہل تحقیقات کی تشویق مسلمانوں نے پیدا کی اور کد و کاوش اور جد و جہد کا صور رحمتِ عالمؐ کا پھونکا ہوا ہے۔ حدیث کی کتابوں میں ایک مستقل باب "کتاب العلم" کے نام سے موجود ہے۔

عقل وفہم سے کام لینے کی ترغیب جتنی رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے شاید کسی نے دی ہو۔ قرآن میں ہر چند سطروں کے بعد افلا یعقلون ، افلا یتدبرون ، لا یشعرون ، لا یفقھون اور فھل من مدکر اور اس طرح کے بیسیوں الفاظ ہیں جو دماغ اور فکر و شعور سے کام لینے کی ترغیب دیتے نظر آتے ہیں۔ اس کا اعتراف غیروں نے بھی کیا ہے۔

نظام اخلاق واعمال رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اخلاق و اعمال کی جو بیش بہا تعلیم دی، وہ تو مخصوص آپ ہی کا حصہ ہے۔ فرمایا:

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔	میں تو اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ مکارم اخلاق کی تکمیل کروں۔

قرآن پاک نے اعلان کیا:

انك لعلیٰ خلق عظیم۔ (القلم۔۱)	اے محمدؐ! بے شک آپ اخلاق کے بڑے درجہ پر ہیں۔

دوسری جگہ کہا:

لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیزٌ علیہ ما عنتم حریصٌ علیکم بالمؤمنین رؤف رحیم۔ (توبہ۔۱۶)	تمہارے پاس تم ہی میں کا ایک رسول آیا ہے۔ تم کو جو تکلیف پہنچتی ہے، وہ اس پر شاق گزرتی ہے۔ تمہاری بھلائی پر حریص ہے۔ ایمان والوں پر نہایت شفیق اور مہربان ہے۔

اپنی امت کو مخاطب کرکے فرمایا:

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنھون عن المنکر۔ (آل عمران۔۱۲)	تم بہترین امت ہو، جن کو عالم میں بھیجا گیا اچھے کاموں کا حکم کرتے ہو اور بُرے کاموں سے روکتے ہو۔

ہلاک ہونے والی کے متعلق ارشاد فرمایا گیا:

کانوا لا یتناھون عن منکر فعلوہ لبئس ما کانوا یفعلون۔ (المائدہ۔۱۱)	وہ آپس میں بُرے کام سے نہیں روکتے تھے، جیسے وہ کر رہے تھے۔

پھر جزئی مسئلوں میں اخلاق برتنے کی تاکید فرمائی۔ ماں باپ کی تعظیم و تکریم کا حکم فرمایا۔ ان کے لیے دعائے خیر کرنے کی تاکید کی اور خلافِ ادب بات کہنے سے منع فرمایا۔ والدین کے متعلق ارشادِ ربانی ہے:

لا تقل لھما اُفٍّ ولا تنھرھما وقل لھما قولاً کریما۔ (بنی اسرائیل۔۳)	تو ان کو ہونہہ نہ کہہ اور نہ ان کو جھڑک اور ان سے باادب بات کہو۔

باہمی تعلقات کے متعلق رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لا تقاطعوا ولا تدابروا لا تباغضوا ولا تحاسدوا وكونوا عباد الله اخوانا ولا يحل للمسلم ان يهجر اخاه فوق ثلاث۔ (ترمذی ص ۱۲، ج ۲)

نہ قطع رحمی کرو، نہ ایک دوسرے کو پیٹھ پیچھے بُرا کہو، نہ بُغض رکھو اور نہ حسد رکھو۔ اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی ہو جاؤ، مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی کو چھوڑ دے۔

ضرر رسانی اور تکلیف دہی سے منع کیا اور مکر و فریب سے سختی کے ساتھ روکا۔ ایک دفعہ فرمایا:

ملعون من ضار مؤمنا او مكربه۔ (ترمذی ص ۱۶، ج ۲)

اس پر خدا کی لعنت ہے جو کسی مسلمان کو نقصان پہنچائے یا فریب دے۔

جھوٹ بولنے والوں کے لیے وعید شدید بیان فرمائی اور سچ بولنے والوں کو سراہا:

عليكم بالصدق فان الصدق يهدى الى البر والبر يهدى الى الجنة و اياكم و الكذب فان الكذب يهدى الى الفجور والفجور يهدى الى النار۔ (ترمذی ص ۱۹، ج ۲)

تم پر سچائی ضروری ہے کیونکہ سچ بولنا نیکوکاری کی راہ دکھاتی ہے اور نیکوکاری جنت کی اور جھوٹ بولنے سے قطعی پرہیز کرو۔ کیونکہ جھوٹ بدکاری کی طرف لے جاتا ہے اور بدکاری آگ کی طرف۔

حسن خلق کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

خیارکم احسنکم اخلاقاً۔ (ترمذی، ص ۱۹، ج ۲)

تم میں بہتر وہ ہے جو اخلاق میں سب سے اچھا ہے۔

جو کچھ عرض کیا گیا، وہ سمندر میں سے چند قطرے ہیں۔ پھر بھی گزارش ہے کہ ان مسئلوں کو گہری نظر سے مطالعہ کریں اور یہ چیز بھی غور کرنے کے لایق ہے کہ یہ تعلیمات آپ نے دنیا کے سامنے اس وقت پیش کیں، جب وہ فسق و معصیت، ظلم و جبر، عصبیت و جہالت اور شر و فتن میں پھنسی ہوئی تھی، ہدایت اور حقانیت کا چراغ گل ہو چکا تھا اور روئے زمین آبِ رحمت کے ایک ایک قطرے کو ترس رہی تھی۔

سطورِ بالا میں اسلام کے اجتماعی، معاشرتی، اقتصادی، عمرانی اور ملکی کارناموں کی طرف اجمالی اشارہ کیا گیا ہے۔ اس دور میں بھی اس تابناک روشنی اور عالمتاب آفتابِ ہدایت کی ضرورت آپڑی ہے۔ ان شاء اللہ قوم و ملک دونوں کی گتھی اس میں غور و فکر کرنے سے سلجھ سکتی ہے اور اس پر عمل کرنا حکومت و ملت کی ترقی و عروج کا ذریعہ ثابت ہوگا، وما ارسلناك الا رحمة للعلمين۔

صلى الله عليه وسلم

عہدِ جدید کے مسائل اور آنحضرتؐ کا پیغام

شرف الدین اصلاحی

اس میں شک نہیں کہ آج کی دُنیا مسائل کی دُنیا ہے، چھوٹے بڑے گوناگوں مسائل، اُلجھے ہوئے، پیچیدہ اور سنگین مسائل؛ سیاسی اور اخلاقی مسائل، معاشی اور معاشرتی مسائل۔ انفرادی اور اجتماعی مسائل، داخلی اور خارجی مسائل، قومی اور بین الاقوامی مسائل، الغرض مسائل ہی مسائل۔ یہ بھی درست ہے کہ پچھلے ادوار کے مقابلے میں اس دَور کے مسائل اور ہیں۔ قرونِ اولیٰ میں زندگی سادہ اور محدود تھی اس لیے مسائل بھی کم اور سیدھے سادے تھے۔ تہذیب و تمدّن کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ زندگی جوں جوں پیچیدہ ہوتی گئی مسائل بھی بڑھتے گئے اور ان کی ژولیدگی میں بھی اضافہ ہوتا گیا، لیکن فی نفسہٖ مسائل کا ہونا کوئی نئی بات نہیں، مسائل ہمیشہ سے ہیں۔ مسائل اس وقت بھی تھے کہ جب انسان نے تہذیب و تمدن کی بُنیاد رکھ کر اجتماعی زندگی کا آغاز کیا۔ مسائل کل بھی تھے، مسائل آج بھی ہیں، اور مسائل آئندہ بھی رہیں گے۔ مسائل زندگی کے ساتھ ہیں۔ انسان اور مسائل لازم و ملزوم ہیں۔ ان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

اس دَور کے مسائل کیا ہیں؟ اس کا جواب ہر وہ شخص بآسانی دے سکتا ہے جو آج کی دُنیا میں رہتا ہے اور حالاتِ حاضرہ کی تھوڑی بہت خبر رکھتا ہے۔ مسائل کا شمار ہمارا مقصود نہیں۔ اصل مسئلہ یہ نہیں کہ مسائل ہیں یا نہیں۔ یہ سوال بھی نہیں کہ مسائل کیا ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ان مسائل کا حل کیا ہے۔ حل ہے بھی یا نہیں۔ اگر حل ہے تو مسائل حل کیوں نہیں ہوتے۔ گتھیاں سلجھنے کی بجائے اور اُلجھتی کیوں جاتی ہیں۔ مسائل کی تعداد میں کمی کی بجائے روز بروز اضافہ کیوں ہوتا جاتا ہے۔ امن و سکون، سکھ اور شانتی اس جہانِ گذراں میں انسان کی تمام تر سعی و جستجو کا منتہائے مقصود ہے۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ سعی و تلاش کی راہ میں اُٹھنے والا ہر قدم اُسے منزل سے دُور لے جا رہا ہے۔

مسائل کی مثال اُن بیماریوں کی سی ہے جو انسانی جسم کو لاحق ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے بیماری کوئی آرزو کرنے کی چیز نہیں۔ بیماری چھوٹی ہو یا بڑی، بیمار امیر ہو یا غریب، بچّہ ہو یا بوڑھا، مرد ہو یا عورت، پہلی فرصت میں فکر یہی ہوتی ہے کہ بیماری کا ازالہ کیا جائے اور انسان اپنا سب کچھ قربان کر کے کھوئی ہوئی صحت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن تمام تر تگ و دو اور کوشش کے باوجود اگر مرض ٹھیک نہ ہو بلکہ اُلٹا بڑھتا جائے تو یہی نتیجہ اخذ کیا جائے گا کہ علاج صحیح نہیں ہو رہا۔ مختلف دوائیں اور مختلف معالجوں کو بدل بدل کر آزمانے اور تجربہ کرنے کے بعد بھی اگر مرض میں افاقہ کی بجائے اضافہ ہوتا جائے تو یہی نتیجہ اخذ کیا جائے گا کہ خود علاج میں کوئی خرابی ہے۔ بیماری کے علاج میں چند باتیں بُنیادی اہمیّت کی حامل ہوتی ہیں۔ ایسے طبیبِ حاذق کی طرف رجوع کیا جائے جو صحیح طریقِ علاج سے واقف ہو اور اپنے فن کا ماہر ہو۔ طبیب اس نکتے سے واقف ہو کہ مرض کا سبب معلوم

کیے بغیر کوئی علاج کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس کے مریض کے مزاج اور موسم کی کیفیت کا علم بھی ضروری ہوتا ہے۔ مرض کی صحیح تشخیص اور صحیح دوا کی تجویز پر ہی صحت کی بازیابی کا دارومدار ہے۔ وہ معالج جو اس فطری طریقے کو چھوڑ کر کوئی اور طریقہ اختیار کرے گا، وہ مرض کو اور اُلجھائے گا۔ اپنی بے تدبیروں سے معمولی سی شکایت کو پیچیدہ اور مزمن امراض میں تبدیل کر دے گا۔ اُلٹی سیدھی دوائیں دے کر نئی بیماریاں پیدا کر دے گا۔ ایسے طبیب کے ہاتھوں مریض کی جان خطرے میں پڑ جائے تو بھی جائے تعجب نہیں، اس کے برعکس اگر تشخیص و تجویز صحیح ہو تو خطرناک سے خطرناک بیماری بھی بسا اوقات معمولی دواؤں سے ٹھیک ہو جاتی ہے۔ اور دوا صحیح ہو تو اس کا اثر فوری ہوتا ہے اور صحت یابی کی رفتار غیر معمولی طور پر تیز ہوتی ہے۔ اس مثال کو سامنے رکھ کر عہدِ جدید کے مسائل اور ان کی تاریخ کا بے لاگ تجزیاتی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" کا مضمون ہے۔ یہ صورتِ حال اس امر کا بدیہی ثبوت ہے کہ مسائل کو حل کرنے کی جتنی بھی کوششیں اب تک کی گئی ہیں یا کی جا رہی ہیں ان میں ضرور کوئی بنیادی خرابی موجود ہے۔

مسائل کے حل میں ساری بات صحیح سمت میں قدم اُٹھانے کی ہے۔ مکّہ کا مسافر اگر ترکستان کی شاہراہ پر چل پڑے، تو منزل کی سچی لگن اور طلبِ صادق کے باوجود وہ ہر گام منزل سے دُور ہوتا جائے گا۔ منزل سے ہمکنار ہونا ایسے مسافر کا مقسوم نہیں ہوتا۔ منزل انھیں ملتی ہے جو ارادے کے بعد منزل کی سمت سفر بھی کرتے ہیں اور راہِ راست ان کے ہمرکاب ہوتی ہے عہدِ جدید کا انسان اپنے نت نئے مسائل کے حل کا دل سے خواہاں ہے، لیکن اس کے لیے وہ جو تدبیریں کرتا ہے وہ اس لیے اُلٹی ثابت ہوتی ہیں کہ منزل کے تعیّن کے باوجود وہ صحیح راستہ اختیار کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ مقصد کا اُسے شعور ہے، لیکن ذریعے کی تلاش میں وہ ٹھوکر کھاتا ہے۔ اس لیے اسے ناکامی و نامرادی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

فرض کیجیے ہمیں ریشمی دھاگے کا اُلجھا ہوا ایک لچھا سلجھانے کو دیا جائے۔ اگر ہم نے شروع ہی سے اس کا سرا پا لیا تو بڑی سے بڑی گتھی کے سلجھانے میں بھی چند لمحوں سے زیادہ صرف نہیں ہو گا۔ لیکن اس کے برعکس اگر ہم نے سرا ہاتھ میں لیے بغیر ہی اُسے سلجھانے کی کوشش کی تو اس کوشش کا انجام کیا ہو گا۔ یہ ہزار دقّت اگر ہم ایک گرہ کھولنے میں کامیاب ہوں گے تو اس میں سو گرہیں اور پڑ جائیں گی۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ تھوڑی دیر بعد اس میں گرہیں ہی گرہیں نظر آئیں گی۔ آج انسانیت کو درپیش مسائل اور اُن کے حل کی کوششوں کا یہی حال ہے۔ آج کے انسان کا حال ریشم کے اُس کیڑے کا سا ہے جو ریشم کے تار اپنے گرد لپیٹتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے تہ بہ تہ پھندے اس کا گلا گھونٹ دیتے ہیں اور یہ حالت اس وقت تک تبدیل نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ اس ضمن میں اپنی حکمتِ عملی تبدیل کر کے صحیح طرزِ عمل اختیار نہیں کرتا۔ اسے سب سے پہلے یہ دریافت کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ مسائل کیوں پیدا ہوئے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس دریافت میں وہ اپنی ناقص عقل اور خطا کار بصیرت پر اعتماد کرتا ہے اس لیے اصل اسباب کی دریافت سے قاصر رہتا ہے اور رشتہ کا سرا اس کے ہاتھ نہیں آتا۔

اس قسم کی صورتِ حال میں انسانیت کے گُم کردہ راہ قافلے کی رہنمائی کے لیے اس دنیا میں اگر امید کی کوئی کرن ہے تو وہ آنحضور صلعم کا پیغام ہے۔ آنحضرت صلعم کا پیغام نہ صرف یہ کہ مرض کے سبب کی نشان دہی کرتا ہے بلکہ علاج کے فطری طریقے بھی تجویز

کرتا ہے۔ ضرورت اس کے علم اور اس پر عمل کی ہے۔ آنحضرت صلعم نے بتایا کہ ساری خرابی کی جڑ پیغامِ حق سے انسان کی رُوگردانی ہے اور حق کا پیغام ہی دراصل آنحضرتؐ کا پیغام ہے۔ آپؐ نے اپنے پیغام میں سبب کی نشان دہی کے ساتھ فرداً فرداً مسائل کے حل بھی بتا دیئے ہیں۔

آنحضرت صلعم کا پیغام اللہ کا فرمان اور آپؐ کی سیرت عمل بالقرآن ہے۔ قرآن مجید اور آپؐ کی سیرت ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالےٰ نے ہدایت و رہنمائی کے لیے جو کچھ فرمایا ہے آنحضورؐ کی زندگی اس کا عملی نمونہ ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا سے جب آپؐ کی سیرت کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا وَكَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰن آپؐ کی سیرت قرآن ہے۔ قرآن ایک حرف کی کمی بیشی کے بغیر آج کے انسان کے پاس موجود ہے۔ آپؐ کی سیرت کو آپؐ کے پاک اصحاب نے جس اہتمام کے ساتھ جمع کر کے محفوظ کر دیا ہے وہ بھی تاریخِ انسانی کا ایک فقید المثال واقعہ ہے۔ یوں تو آپ کے پیغام کا ایک ایک لفظ اپنی افادیت کے لحاظ سے اہم اور قابلِ توجہ ہے لیکن اس میں تین باتیں خاص اور بنیادی ہیں۔ آج کا انسان اگر صحیح معنوں میں ان کو اپنا لے تو اس کے جملہ مسائل آپ سے آپ حل ہو جائیں گے :

۱۔ توحید۔ ۲۔ رسالت ۳۔ آخرت۔

یعنی معبودِ حقیقی اللہ تعالیٰ کو حاکم علی الاطلاق تسلیم کر کے اس کے حکم کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔ سلسلۂ نبوت کو حیاتِ دنیوی میں واحد ذریعۂ ہدایت مان کر زمامِ کار کلیتہً اس کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ روزِ جزا کی جوابدہی کا احساس اپنے دل میں ہر لحظہ تازہ رکھا جائے۔ انسانی زندگی سے ان باتوں کا اُٹھ جانا ہی عہدِ جدید کے مسائل کا باعث ہے اس لیے یہ مسائل اس وقت تک حل نہیں ہو سکتے جب تک کہ ان باتوں کو اُن کے جملہ تقاضوں سمیت اختیار نہیں کر لیا جاتا۔

آنحضرت صلعم کا پیغام اس حقیقت کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ کائنات کی ہر شے قانونِ فطرت یعنی حکمِ الٰہی کی پابند ہے، وَكُلٌّ لَّهٗ قَانِتُوْنَ ہر چیز اللہ کے حکم کے تابع ہے۔ یہ قرآن کا فرمان ہی نہیں ہے بلکہ ہمارا آپ کا مشاہدہ بھی یہی کہتا ہے۔ کوئی بڑے سے بڑا کافر، مشرک، ملحد، زندیق، دہریہ اور کمیونسٹ بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ یہ قدرت کا کارخانہ کچھ بندھے ٹکے اصُولوں کے مطابق چل رہا ہے اور اسی لیے اس میں کبھی خلل نہیں واقع ہوا۔ آفاق والنفس کی بے شمار کھلی ہوئی آیات اس کی روشن دلیلیں ہیں۔ انسان اس وسیع و عریض کائنات کا ایک ادنیٰ اور حقیر سا حصّہ ہے۔ کیا وجہ ہے کہ مسائل کا بکھیڑا صرف اسی کی جان کے ساتھ ہے۔ رخنے صرف اسی کی زندگی میں کیوں ہیں؟ وجہ یہ ہے کہ انسان اپنے لیے مسائل خود پیدا کرتا ہے۔ یہ اس کی اپنی کج اندیشیاں اور غلط کاریاں ہیں جو اس کے مسائل کی ذمہ دار ہیں۔ اس کائنات میں انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جو آزادی و خود مختاری کی نعمت سے بہرہ ور ہے اور یہ آزادی و خود مختاری ہی اس کی سب سے بڑی مصیبت ہے۔ کائنات کی کوئی شے قدرت کے ٹھہرائے ہوئے اصولوں سے سرِمُو انحراف نہیں کر سکتی۔ مگر انسان کو یہ حق و اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو ان اصولوں کی پابندی کرے اور چاہے تو خلاف ورزی کرے۔ جہاں تک وہ اسلوبِ فطرت کی پابندی کرتا ہے اس کی زندگی ہموار اور استوار رہتی ہے، جہاں وہ انحراف کرتا ہے اس کی زندگی کے نظام میں خلل پیدا ہوتا ہے اور اس خلل سے نِت نئے مسائل جنم لیتے ہیں۔ انسان کے لیے پسندیدہ راستہ یہی ہے کہ وہ دوسری مخلوقات کی طرح

اپنے فکر و عمل میں فطرت کے تقاضوں کا پابند رہے لیکن اس کی اُفتادِ طبع ہے دوسرے الفاظ میں بشری کمزوری کہنا چاہیئے اس کو فطرت کے قواعد کی خلاف ورزی کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور وہ ان حدود سے تجاوز کر جاتا ہے جن کی پابندی کئے بغیر وہ کائنات کے ساتھ ہم آہنگی پیدا نہیں کر سکتا اور نتیجۃً الجھنوں میں گرفتار ہوتا ہے اور طرح طرح کے مسائل سے دوچار ہوتا ہے، آنحضرت صلعم نے آکر انسان کو فطرت کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ اس کو بتایا کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ دُنیا میں امن و سلامتی کی زندگی بسر کرنے کے لیے اس کو کس طرح رہنا چاہیئے۔

اس ضمن میں ایک بُنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان ہدایتِ آسمانی سے بے نیاز ہو کر اپنے مسائل حل کر سکتا ہے؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ مسائل پیدا ہی آسمانی ہدایت سے بے نیازی کے سبب ہوتے ہیں تو آسمانی ہدایت کے بغیر ان کو حل کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ گویا کہ مسائل کا حل آسمانی ہدایت کی پیروی ہی میں مضمر ہے اور آسمانی ہدایت کا آخری صحیفہ آنحضرت صلعم کا پیغام قرآن ہے۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہیں ہو سکتا کہ عہدِ جدید کے مسائل صرف قرآن حل کر سکتا ہے۔ انسان کی علمی فتوحات اور عقلی ترقیات کے سامنے مہر و ماہ کی بلندیاں سرنگوں ہیں۔ پھر بھی زندگی کے بُنیادی مسائل کے حل کے لیے وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی ہدایتِ ربّانی کا محتاج ہے۔ آج کا انسان بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ دُنیا کا خالق وہ ہے۔ جب وہ دُنیا کا خالق نہیں تو اس کے نظام کو چلانے کے لیے قاعدے اور قانون بنانے کا وہ کس طرح اہل ہو سکتا ہے۔ دُنیا کا خالق اللہ تعالےٰ ہے اس لیے اس کی حکمرانی کا حق بھی اُسے پہنچتا ہے۔ لہ الخلق ولہ الامر تخلیق اسی کی ہے اس لیے حکم بھی اسی کا ہوگا۔ انسان خدا کا نائب ہے اور نائب ہی رہے گا۔ نائب کا کام صرف اتنا ہوتا ہے کہ اصل مالک کے حکم کو نافذ کرے نہ کہ اپنا حکم چلائے۔ انسان ہوا و ہوس کا بندہ ہے۔ اس سے یہ ہرگز توقع نہیں کی جا سکتی کہ منصبِ حکمرانی پر فائز ہو کر بے لاگ عدل و انصاف کے ساتھ دُنیا کا کاروبار چلائے گا۔ اسی لیے آنحضرت صلعم نے یہ پیغام دیا کہ تمام بنی نوعِ انسان اس بالاتر ہستی کے مطیع و فرمانبردار ہو جائیں جو ایک ہے، پاک ہے، بے نیاز ہے۔ خالق ہے، مالک ہے، علیم ہے، خبیر ہے، حکیم ہے عادل ہے۔ کہ اس کی اطاعت ہی میں ان کے مسائل کا حل ہے۔

آج کے انسان کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ وُہ ایک ایسے دَور میں رہتا ہے جو افکار کے تصادم نظریات کی جنگ کی وجہ سے ابتری اور پراگندگی کا شکار ہے۔ یہ ازم وہ ازم، باطل رنگ بدل بدل کر انسانی فکر و نظر پر یلغار کرتا ہے اور حق اپنے علمبرداروں کی بے حسی کا ماتم کرتا ہے۔ عام انسان ایک افراتفری کے عالم میں کبھی ادھر دیکھتا ہے کبھی اُدھر۔ وہ سرگشتہ و حیران ہے کہ کدھر جائے۔ کبھی اس کو آزماتا ہے کبھی اس کو۔ کبھی اس کو اپناتا ہے کبھی اس کو۔ ایک ازم کو آزماتا ہے اور جب دیکھتا ہے کہ اس سے مسائل حل نہیں ہوتے تو اس کو چھوڑ دیتا ہے اور دوسرے ازم کی طرف لپکتا ہے مگر وہاں بھی اس کو مایوسی اور ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑتا ہے۔ وہ تجربات کے اس چکر سے اُس وقت تک نہیں نکل سکتا جب تک کہ وہ ایسے "ازم" کو نہیں اپناتا جو اس کی فطرت کے مطابق ہے اور وہ ازم دینِ فطرت اسلام ہے جو نبی عربی محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہُوا۔

عہدِ جدید کے مسائل میں ایک بڑا مسئلہ...... بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ عہدِ جدید کے فتنوں میں سے ایک بڑا فتنہ خود یہ

سوال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام یعنی دین اسلام عہدِ جدید کے مسائل حل کر سکتا ہے یا نہیں۔ اغیار اور دشمنان اسلام کا ذکر چھوڑیئے خود ہم مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو یہ کہتا ہے کہ اسلام قصۂ پارینہ ہو چکا ہے۔ یہ چودہ سو سال پُرانا نظام بانظر یہ نئے دور کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا۔ اسلام اس دور کے لیے تھا جب انسانی تمدن ہنوز عہدِ طفولیت میں تھا۔ عہدِ حاضر کی پیچیدہ زندگی کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ نئے دور کے نئے مسائل کے لیے نئے نظام کی ضرورت ہے، اور یہ ضرورت وہ عصرِ حاضر کے نت نئے ازموں (ISMS) سے پوری کرنی چاہتے ہیں۔ یہ طبقہ ایسے افراد پر مشتمل ہے جو خدا کی ہستی پر یقین نہیں رکھتا نہ ہی رسالت کی حقیقت سے واقف ہے اور نہ ہی روزِ جزا کا قائل ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ ان بے دین دہریوں اور ملحدوں کا گروہ ہے جو سرے سے آسمانی ہدایت کی ضرورت ہی پر ایمان نہیں رکھتا۔ یہ لوگ آج کیا چودہ سو سال پہلے بھی اسلام کے اس حق کو تسلیم نہیں کرتے۔ انہی میں منافقوں کا وہ گروہ بھی شامل ہے جو اوّل الذکر کے سے ہی خیالات رکھتا ہے۔ لیکن معاشی اور معاشرتی مجبوریوں کی وجہ سے اسلام کا نام لینا بھی ضروری سمجھتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو دینِ اسلام کو عام مذاہب کی طرح ایک مذہب ہی سمجھتے ہیں۔ وہ دنیا اور دنیا کے امور و مسائل کو مذہب کے دائرے سے خارج تصور کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں مذہب چند رسمی عبادات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ یہ جاہلوں کا گروہ ہے جن کی دینی معلومات چند سنی سنائی باتوں تک محدود ہے۔ وہ اسلام کی تعلیمات سے بے خبر ہیں۔ انہیں آنحضرت صلعم کی بعثت کی غرض و غایت کی بھی خبر نہیں اس لیے گمراہ کُن خیالات سے متاثر ہو جاتے ہیں۔

ان سب کو ہمارا ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ کہ وہ تعصّب و تنگ نظری کو خیرباد کہیں، نیک نیتی کے ساتھ حق کی جستجو کریں اور چاہِ جہالت سے نکل کر علم کی دنیا میں قدم رکھیں۔ پھر دیکھیں کہ اسلام کس طرح آج کے مسائل حل کرتا ہے۔ اسلام کا مقابلہ دنیا کے کسی نظام یا ازم سے کرنا اسلام کی توہین ہے۔ مقابلے اور موازنے کے لیے جو شرائط ہیں وہ یہاں پوری طرح پائی ہی نہیں جاتیں۔ اسلام اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا نظامِ حیات ہے جب کہ دوسرے نظام ہائے زندگی انسانی ذہن کی پیداوار ہیں۔ انسانی ذہن جو ہمیشہ افراط و تفریط کا شکار رہتا ہے، خطا اور نسیان جس کی صفت، نقص اور کوتاہی جس کی خاصیت ہے اور ایمان کی بات یہ ہے کہ دوسرے نظام یا ازم جنہیں عہدِ جدید کے مسائل کے حل کا دعوےٰ ہے ناقص اور نامکمل ہیں۔ ان کا دائرۂ عمل زندگی کے کسی ایک شعبے یا چند شعبوں تک محدود ہے۔ اس کے برعکس اسلام مکمل نظامِ زندگی اور جامع دستورِ حیات ہے انسانی زندگی کا کوئی گوشہ اس کی گرفت سے باہر نہیں۔ وہ انسانی زندگی کو ایک اکائی سمجھتا ہے جب کہ دوسرے نظام افراط و تفریط میں مبتلا ہیں جب کہ اسلام ہر مسئلے میں اعتدال اور توازن کی راہ پسند کرتا ہے۔ خیر الامور اوسطہا اس کا اصل الاصول ہے۔ وہ اپنے اوامر و نواہی قواعد اور قوانین میں انسانی فطرت کو ملحوظ رکھتا ہے۔ فطرۃ اللہ التی فطر النّاس علیہا۔

رہے دوسرے آسمانی مذاہب سو ان کو مقابلہ پر لانے کا سوال اس لیے نہیں پیدا ہوتا کہ ان کی صحیح اور سچّی باتوں کو اسلام خود تسلیم کرتا ہے اور وہ سب کی سب اسلام میں زیادہ صحت و کمال کے ساتھ موجود ہیں۔ ان کی اصلی تعلیمات اور اسلام کی تعلیمات میں کوئی تضاد اور اختلاف نہیں۔ اسلام کوئی نیا دین ہونے کا مدعی نہیں وہ ان تمام مذاہب آسمانی کا جامع اور ناسخ ہے جن کا سلسلہ

پیغمبر اول حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوتا ہے۔ نبی آخر الزماں جو دین لے کر آئے وہ ہر لحاظ سے جامع اور مکمل تھا۔ اس لیے نہ اگلے مذاہب کو باقی رکھنے کی ضرورت رہی، نہ ہی یہ ضرورت رہی کہ آئندہ کوئی اور دین آئے۔ آنحضرت صلعم جو پیغام لائے اب وہ رہتی دنیا تک اہل دنیا کی ہدایت و رہنمائی کے لیے کافی ہے، زندگی کتنی ہی کروٹیں بدلے، زمانہ اپنے اوپر کتنے ہی رنگ چڑھائے، تہذیب و تمدن کا کارواں کتنی ہی منزلیں آگے بڑھ جائے۔ انسان علم و اکتشاف سائنس اور ٹیکنالوجی کے کتنے ہی معرکے سر کرلے اسلام کی قندیل رحمانی انسانیت کو اس کے سفر ارتقا میں راستہ دکھاتی رہے گی اور اس کی روشنی میں انسان اسی طرح اپنے مسائل حل کرتا رہے گا جس طرح کہ چودہ سو سال پہلے کیا تھا۔ اسلام کسی انسان کا ایجاد کیا ہوا فیشن تو نہیں جو کچھ دنوں بعد پرانا ہو کر بے کار ہو جاتا ہے' وہ ایک حکیم و خبیر خدائے لم یزل ولایزال کا مرتب کردہ آخری جامع اور مکمل دستورِ حیات ہے جس کا مقصد ہی بندوں کی ہدایت و رہنمائی ہے، اگر وہ انسانی مسائل حل نہیں کرے گا تو کیا عہدِ جدید کے وہ ازم حل کریں گے جو چند برخود غلط گم کردہ راہ انسانوں کی خود غرضانہ خواہشات یا ردّعمل کے منفی رجحانات کا نتیجہ ہیں۔

اب ہمیں مختصراً یہ دیکھنا ہے کہ عہدِ جدید کے وہ خاص خاص مسائل کیا ہیں جنھیں حل کرنا وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ اسلام ان مسائل کا کیا حل پیش کرتا ہے اور آج کے نام نہاد "ازم" ان کو کس طرح حل کرنا چاہتے ہیں۔ آج انسانیت کو جن سنگین مسائل کا سامنا ہے ان میں ایک بڑا مسئلہ خود اس کی بقا اور سلامتی کا ہے۔ اس وقت پوری انسانیت آتش فشاں کے دہانے پر کھڑی ہے۔ دنیا کا گوشہ گوشہ شر و فساد سے بھر چکا ہے۔ قریب ہے کہ انسان اپنی ہی جلائی ہوئی آگ میں جل کر بھسم ہو جائے۔ ہلاکت اور تباہی کے مہیب تاریک سائے ہر سو بڑھتے اور پھیلتے جا رہے ہیں۔ وسائلِ حیات کا بڑا حصہ جو انسان کے لیے بہتر زندگی کا سامان فراہم کرنے کی ضمانت ہوتا وہ آج دنیا کو جہنم میں تبدیل کرنے پر صرف ہو رہا ہے۔ بظاہر امن کی باتیں کرنے والے بباطن جنگ اور کشت و خون کے نقیب ہیں۔ انسان، انسان کا دشمن ہے۔ نفرت، حقارت، تعصب اور تنگ نظری نے انسانیت کی ردا کو تار تار کر دیا ہے۔ دنیا جسے اخوت، محبت اور بھائی چارے اور باہمی ہمدردی کا چمن زار ہونا چاہیئے تھا وہ آج بغض و عناد، ظلم و ناانصافی، بے رحمی اور برادر کشی کا گہوارہ بن چکی ہے۔ انسان جسے زندگی سے پیار ہونا چاہیئے تھا وہ زندگی سے بیزار خود زندگی کا گلا گھونٹنے کے درپے ہے۔ یہ صورتِ حال سب کے لیے پریشان کن ہے۔ افراد ہوں یا اقوام، چھوٹی ریاستیں ہوں یا بڑے ممالک، اس براعظم کے رہنے والے ہوں یا اُس براعظم کے۔ ان کا تعلق ایک بلاک سے ہو یا دوسرے بلاک سے، یہ ایک عالمی اور ہمہ گیر مسئلہ ہے۔ اس وقت پوری انسانیت معرضِ خطر میں ہے۔ انسان نے تہذیب و تمدن اور اسبابِ زیست کی ترقی کے ساتھ خوشگوار زندگی کے جو خواب دیکھے تھے وہ پورے نہیں ہوئے۔ اس کی کوشش کے جو ہولناک نتائج سامنے ہیں وہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ معلوم نہ تھا کہ اٹوپیا کی جستجو میں وہ جہنم کے دروازے پر پہنچ جائے گا۔ وہ ماحول کی پرہول تاریکی سے نکل کر روشنی کی طرف آنا چاہتا ہے مگر اس کی کوشش اس لیے کارگر نہیں ہوتی کہ رشتہ کار کا وہ سرا اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکا ہے جس کے بغیر تدبیر اُلٹے نتائج پیدا کرتی ہے۔ اس کی کوشش کی مثال دلدل میں پھنسے ہوئے اُس آدمی کی ہے جو محض اپنی طاقت کے بل پر باہر آنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے ایسے آدمی کا انجام ہلاکت ہے۔ اس حالت سے نکلنے کا

صرف ایک راستہ ہے اور وہ یہ کہ انسان اپنے ہی جیسے انسان کی غلامی ترک کر کے معبودِ حقیقی کی بندگی قبول کرلے کہ یہی سلامتی کا واحد راستہ ہے۔ باقی جتنے راستے ہیں ان میں ہلاکت ہے، خرابی ہے تباہی ہے، بربادی ہے۔ پکارنے والا آج بھی پکار رہا ہے یآ ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی۔ اسلام کا راستہ اطاعت اور اس کی منزل سلامتی ہے۔ عہدِ جدید کے اس بنیادی مسئلے کے حل کے لیے آنحضرت صلعم کا پیغام ہے ادخلوا فی السلم کآفۃ سب کے سب پوری طرح اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ اس آواز پر لبیک کہنے کی دیر ہے۔ یہی دنیا جو آج جہنم کا نمونہ بنتی جارہی ہے، جلد ہی رشکِ ارم بن جائے گی۔

عہدِ جدید کے فتنوں میں ایک بڑا فتنہ نسل، رنگ، زبان اور وطن کے امتیازات کا ہے جن کی بنیاد پر خلقِ خدا اقوام میں بٹ کر باہم برسرِ پیکار ہوتی ہے۔ اسلام ان امتیازات کو مٹاکر تمام بنی نوعِ انسان کو ایک وحدت کی لڑی میں پروتا ہے اور ان تمام دیواروں کو گرا دینا چاہتا ہے جو انسان اور انسان کے درمیان تفریق و تقسیم کی بنیاد پر کھڑی کی گئی ہیں۔ یہاں نہ عربی کو عجمی پر فضیلت ہے نہ گورے کو کالے پر۔ اس کے نزدیک معیارِ فضیلت اگر کوئی چیز ہے تو دین و تقویٰ شرافت اور اخلاق ہے۔ انا خلقنٰکم من ذکرٍ وانثیٰ وجعلنٰکم شعوبًا وقبآئل لتعارفوا انّ اکرمکم عند اللہ اتقاکم اسلام صلہ رحمی کی تعلیم دیتا ہے نہ کہ قطع تعلق کی۔ وہ کہتا ہے کہ انسان سب کے سب ایک خدا کی مخلوق اور ایک آدم و حوّا کی اولاد ہیں اس لیے بعض فطری امتیازات کی بنیاد پر تفریق و تقسیم کی مصنوعی حدبندیاں قائم کر کے اپنے گرد گروہی اور جماعتی مفاد پرستی کا حصار کھینچنا فساد فی الارض کے مترادف ہے اور اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ واللہ لایحب الفساد۔

موجودہ دور میں سیاسی کشمکش کی جتنی صورتیں پائی جاتی ہیں وہ سب کی سب دین سے دُوری کا نتیجہ ہیں۔ اس دور کی سیاسی کش مکش نے انسانی زندگی پر جو بُرے اثرات ڈالے ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں۔ آج ممالک اور اقوام ہی نہیں قبائل اور خاندانوں سے گذر کر گھر گھر اس کے تباہ کُن اثرات پھیل چکے ہیں اسلام میں سیاست کا مفہوم کچھ اور ہے اور عہدِ حاضر کے مادہ پرستانہ نظریات کے زیرِ اثر فروغ پانے والے تصوراتِ سیاست کچھ اور ہیں۔ اسلام میں سیاست کی بنیاد خدمتِ خلق، ایثار اور انسانیت کی بھلائی پر ہے جب کہ دوسرے نظام عیّاری، مکاری، خود غرضی، مفاد پرستی اور استحصال کو سیاست کا نام دیتے ہیں۔ دنیا میں جب تک اسلامی تصورِ سیاست کی کارفرمائی رہی، دنیا نے عفو و درگذر فلاح و بہبودِ عامہ کے وہ مناظر دیکھے کہ شاید و باید جب سے دنیا میں غیر اسلامی تصورِ سیاست کو فروغ ہوا ہے باہمی منافرت، جوشِ انتقام، لُوٹ کھسوٹ کا دور دورہ ہے۔ دین سے جُدا ہو کر سیاست نے چنگیزی کی صورت اختیار کر لی ہے جس کی تباہ کاریاں دیکھ کر دُنیا پناہ مانگتی ہے۔ آنحضور صلعم نے جو دستورِ حیات اور نظامِ زندگی ہمیں دیا ہے اس میں انسانی زندگی کا کوئی جُز اپنے کل سے الگ نہیں رہ سکتا اور اس نظام میں سیاست چونکہ دین کے تابع رہتی ہے اس لیے بے راہروی کا شکار نہیں ہونے پاتی۔ اسلام میں سیاست بھی اسی طرح اصلاح اور اشاعتِ خیر کا ذریعہ ہے جس طرح کہ عبادات و اخلاق۔ آنحضرت صلعم نے جس قسم کی سیاست کو رواج دیا اس کے زیرِ اثر قائم ہونے والی ریاست میں بلا امتیاز و تفریق مسلم اور غیر مسلم سب کے لیے امن اور سلامتی کی ضمانت ہے۔

کردار کی پستی اور اخلاقی گراوٹ بذاتِ خود عہدِ جدید کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے جو دوسرے معاشرتی معاشی اور سیاسی مسائل پیدا ہوتے ہیں اور ان مسائل نے زندگی میں جو الجھنیں پیدا کی ہیں، ان کا ذکر یہاں اس لیے غیر ضروری ہے کہ ان سے ہر کہہ و مہ واقف ہے۔ اخلاق انسانیت کا زیور اور سماج کی زینت ہی نہیں بلکہ اس کی حیثیت جسدِ زندگی میں قلب کی ہے جس کے لیے کہا جاتا ہے کہ اگر وہ بگڑ جائے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے اور اگر وہ ٹھیک رہے تو پورا جسم ٹھیک رہتا ہے۔ لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ دُنیا کے دساتیرِ حیات میں اخلاقی تعلیم و تربیت کا کوئی باب نہیں اور اگر اس نام کی کوئی چیز کہیں ہے تو اس کا مسمّیٰ کچھ اور ہے۔ ان کا اخلاق اغراض و مصالح کے تابع ہوتا ہے۔ مجرّد اخلاق کا ان کے ہاں کوئی تصوّر نہیں۔ اخلاق کو ایک مقصود بالذات کی حیثیت سے کسی دنیوی نظام نے اپنے اندر جگہ نہیں دی۔ یہ صرف آسمانی مذہب میں جس کی تکمیلی شکل آنحضرت صلعم کا پیغام دینِ اسلام ہے ایک مستقل حیثیت سے موجود ہے۔ قرآنِ مجید کا ایک حصہ اخلاقِ عالیہ کے ذکر و بیان پر مشتمل ہے۔ آنحضرت صلعم نے ایک حدیث میں اخلاقِ عالیہ کی تکمیل کو اپنی بعثت کا مقصد قرار دیا ہے۔ آپ نے فرمایا بعثت لا تمم مکارم الاخلاق میں اچھے اخلاق انسانی کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ اسلام حُسنِ اخلاق اور حُسنِ سیرت کو زندگی کی اساس قرار دیتا ہے۔ جس نظام کی بنیاد ہی اخلاقی قدروں پر ہو اس کے مطابق قائم ہونے والا معاشرہ بنی نوع انسان کے لیے رحمت ہی ثابت ہو سکتا ہے۔

دوسرے مسائل کی طرح اس دَور کے معاشی مسائل بھی بے خدا نظریۂ حیات، بے دین تصوّرِ سیاست اور مادہ پرستانہ نظامِ معیشت کے زادہ و پروردہ ہیں۔ اس وقت دو معاشی نظام ہیں جنھوں نے پوری دُنیا کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت کہنے کو یہ اس دور کے معاشی نظریئے ہیں لیکن حقیقت میں یہ معاشی چکّر ہیں جنھوں نے مِل کر خلقِ خدا کو مبتلائے رنج و محن کر رکھا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کو دعویٰ ہے کہ وہ انسان کے معاشی مسئلے کا حل ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ خود مسئلے ہیں، جن کو حل کرنے کی ضرورت ہے۔ انسان کے دوسرے مسائل کی طرح معاش کے مسئلے کا حل بھی اسلام ہی ہے۔ اسلام معاش و معاد کے امتزاج اور دین و دُنیا کی ترکیب سے ایک ایسا متوازن صالح اور پاکیزہ نظامِ معاشرت قائم کرتا ہے جس میں نہ سرمایہ داری فروغ پا سکتی ہے، نہ اشتراکیت پروان چڑھ سکتی ہے۔

اِسلام میں سرمایہ داری کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اسلام کے اقتصادی اصول سرمایہ داری کو پنپنے نہیں دیتے۔ اسلام سب سے پہلے تو دولت کمانے کے ذرائع پر پابندی عاید کرتا ہے۔ حرام و حلال اور جائز و ناجائز کی تمیز قائم کر کے آمدنی کے ان تمام طریقوں کو روک دیتا ہے جن کے ذریعے ایک آدمی بِلا محنت مشقت کیے بے حساب دولت کما سکتا ہے۔ سُودی کاروبار جو سرمایہ دارانہ نظام کی ریڑھ کی ہڈی ہے اپنی جملہ اقسام کے ساتھ اسلام میں حرام ہے، جوئے سٹّے کی ممانعت ہے، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، استحصال اور منافع خوری، ناپ تول میں کمی کرنا، یہ اور اس قسم کی وہ تمام باتیں اسلام میں ناجائز ہیں جن کے باعث عام لوگ معاشی تنگی میں مبتلا ہوں اور ایک مخصوص طبقہ اُن سے فائدہ اُٹھا کر اپنی دولت بڑھائے۔ اس کے بعد اسلام جائز اور حلال ذرائع سے کمائی ہوئی دولت کے ساتھ بھی ایسی بہت سی قیدیں لگا دیتا ہے کہ معاشی خوشحالی چند آدمیوں کا مقسوم نہ رہے، سوسائٹی کے دوسرے طبقات اور افراد کو بھی اس میں سے باقاعدہ حصّہ ملتا رہے۔ اسلام نے زکوٰۃ کا پورا نظام اسی مقصد کی تکمیل کے لیے

قائم کیا ہے ۔ جو اغنیا سے وصول کر کے غریبوں میں تقسیم کی جاتی ہے ۔ اس انتظام کے تحت اسلامی معاشرہ میں ہر شخص کو اس کی بنیادی ضروریات فراہم کی جاتی ہیں ۔ زکوٰۃ فرض ہے لیکن اس کے علاوہ بھی خیرات ، صدقات اور انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب دے کر اسلام اپنے متبعین کو رضاکارانہ خرچ کرنے اور اپنے بھائیوں کی مدد کرنے کی تلقین کرتا ہے ۔ ایک مسلمان کے مال و دولت میں سائل اور محروم کا حق رکھا گیا ہے ۔ وفی اموالھم حق للسائل والمحروم اسلام ارتکاز دولت کے خلاف ہے ۔ وہ اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتا کہ دولت چند ہاتھوں میں گردش کرتی رہے اور باقی لوگ اس کے فیض سے محروم رہیں کی لا یکون دولۃ بین الاغنیا (آیہ ۵۹:۷) اسلام میں تقسیم وراثت کے احکام بھی اسی مصلحت کے تابع ہیں ۔

اسلام جبر کا قائل نہیں انسان کو اللہ تعالیٰ نے مختار پیدا کیا ہے اور مختار ہی رہنے دینا چاہتا ہے اسلام جبر کر کے اس کا یہ حق سلب نہیں کرنا چاہتا ، مذہب تک کے معاملے میں وہ جبر کا روادار نہیں تو کسی کی جائز ذرائع سے کمائی ہوئی دولت کو وہ کس طرح جبراً چھین سکتا ہے ، لیکن زر اندوزی کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتا سونا چاندی جمع کرنے والوں کے لیے سخت وعید ہے ۔ الذین یکنزون الذھب والفضۃ فبشرھم بعذاب الیم ۔ وہ شخص مسلمان نہیں ہو سکتا جو پیٹ بھر کر کھاتے اور اس کا پڑوسی بھوکا سو رہے ۔ غلاموں کو اور دیگر متعلقین کو حسب مقدرت اچھا کھانا کپڑا مہیا کرنے کی ہدایت کرتا ہے ۔ حب مال اور بخل کی مذمت کرتا ہے ۔ اور ان تمام باتوں کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ معاشرہ میں انتہا درجہ کی معاشی ناہمواری راہ نہ پائے اور عام خوشحالی اور فارغ البالی کا دور دورہ ہو ۔ اسلام ان اقتصادی اصولوں کی بنیاد پر ایک مثالی معاشرہ قائم کرنے کا کامیاب تجربہ کر چکا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ آئندہ یہ تجربہ کامیاب نہ ہو ۔

اسلام کے اقتصادی نظام کے نفاذ کے بعد سرمایہ داری خود بخود ختم ہو جائے گی اور سرمایہ داری کا خاتمہ اشتراکیت کی طبعی موت ہوگی ۔ اشتراکیت سرمایہ داری کا ردِّ عمل ہے ۔ سرمایہ داری نہ ہوتی تو آج اشتراکیت کا وجود بھی نہ ہوتا ۔ انتہا کا ردِّ عمل ہمیشہ انتہا ہوتا ہے ایک انتہا سرمایہ داری ہے تو دوسری انتہا اشتراکیت ۔ اشتراکیت انسان کو روٹی کے چند ٹکڑے دے کر اس سے ہر وہ چیز چھین لیتی ہے جو بحیثیت انسان اس کا فطری حق اور ما بہ الامتیاز ہے اور سرمایہ داری اسے بے لگام چھوڑ دیتی ہے کہ وہ ابنائے جنس کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لے ۔ انسان کے معاشی مسئلے کا حل نہ تو سرمایہ داری کے پاس ہے نہ اشتراکیت کے پاس اشتراکیت کے پاس لے دے کر ایک نعرہ معاشی مساوات کا ہے ، لیکن معاشی مساوات کا وہ تصور جو اشتراکیت پیش کرتی ہے ناقابلِ عمل جبری اور غیر فطری ہے اس لیے معاشرت اور معیشت کے حق میں بحیثیتِ مجموعی اس کے نقصانات زیادہ اور فائدے کم ہیں ۔ اشتراکیت جس معاشی مساوات کی تبلیغ کرتی ہے وہ اس عالم کا عنقا ہے ۔ خود کمیونسٹ معاشرہ اس کے وجود سے خالی ہے ۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس زمانے میں معاشی مسائل کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی ہے یہ مسائل انتہا درجے کی معاشی ناہمواری نے پیدا کئے ہیں ۔ لیکن معاشی مسئلے کو آج کل جتنی اہمیت دی جا رہی ہے اسے دیکھ کر کبھی کبھی یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ انسان انسان نہیں کوئی معاشی حیوان ہے جس کا مقصدِ تخلیق شکم پری کے سوا کچھ نہیں بیشک پیٹ انسان کے ساتھ ہے مگر انسان پیٹ کا نام نہیں اسلام انسان کے معاشی مسئلے کو نظر انداز نہیں کرتا مگر اتنی اہمیت بھی نہیں دیتا کہ دوسرے مسائل جو زیادہ اہم ہیں نظروں سے اوجھل ہو جائیں ۔ آنحضرت صلعم کے پیغام کا ما بہ الامتیاز یہی ہے کہ آپ نے انسان کو اس کے مقام سے آگاہ کر کے اس کے مسائل کا حل تجویز کیا ہے ۔

اسلام کا بنیادی فلسفہ

شبیر احمد

اسلام کا بنیادی فلسفہ "کائناتی نصب العینیت" ہے۔

اسلام میکانکیت کا قائل نہیں، جس کی رُو سے تمام واقعات وحوادث بشمول انسانی افعال کے ایک لاانتہا ہی سلسلۂ علل ومعلومات کے ناقابلِ شکست جال میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس اسلام کائنات کو "نصب العینی" زاویہ نگاہ سے دیکھتا ہے جس کے مطابق دنیا کے تمام واقعات انسانی اعمال ہوں یا مظاہر کائنات، کسی نہ کسی مقصد کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اس اندازِ فکر کا اساسی تصور "ربوبیت" ہے، جس کا فیصلہ ہے کہ عالم ایک حکیم وعلیم، قادر وقدیر اور رحمٰن ورحیم ہستی کی صنعت گری ہے جس نے کائنات کو کسی بلند تر مقصد کے ساتھ خلق فرمایا ہے۔

قرآن کریم میں غلط نظریوں کی تردید چنانچہ قرآن کہتا ہے کہ اس کائنات کی تخلیق بربنائے باطل نہیں ہوئی:

وما خلقنا السماء والارض وما بينهما باطلا ذٰلك ظن الذين كفروا فويل للذين كفروا من النار۔ (ص - ۲۷)	اور ہم نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے بیکار نہیں بنائے، یہ کافروں کا گمان ہے، تو کافروں کی خرابی ہے آگ سے۔

کائنات کی تخلیق باطل کا ڈھکوسلا ان کجرو دماغوں کا تراشا ہوا ہے، جو اپنی عیش کوشی کے لیے آخرت کی جوابدہی سے اس جواب دہی سے ڈرانے والوں اور ان ڈرانے والوں کے بھیجنے والے کو جھٹلاتے ہیں۔ مگر یہ اتنی پائدار حقیقت ہے کہ اس کے جھٹلانے کی سزا جہنم ہے۔ کیونکہ اس ٹھوس اور سنگین حقیقت تک ملکوت ارض وسماوات میں سنجیدہ اور دیانت دارانہ تفکر کے بعد فکر صالح کو جلد یا بدیر پہنچنا ناگزیر ہے۔ قرآن کہتا ہے:

ان فی خلق السمٰوٰت والارض واختلاف الیل والنهار لاٰيات لاولی الالباب الذين يذكرون الله قياماً وقعوداً وعلىٰ جنوبهم ويتفكرون فی خلق السمٰوٰت والارض ربنا ما خلقت هٰذا باطلا سبحٰنك فقنا عذاب النار۔ (آل عمران ۱۹۰ - ۱۹۱)	بیشک آسمانوں اور زمین کی پیدائش رات اور دن کی باہم تبدیلیوں میں نشانیاں ہیں عقلمندوں کے لیے۔ جو اللہ کی یاد کرتے ہیں کھڑے اور بیٹھے اور کروٹ پر لیٹے، اور آسمانوں اور زمین میں غور کرتے ہیں اور (کہتے ہیں) اے رب ہمارے! تُو نے یہ بیکار نہیں بنایا (بلکہ اپنی معرفت کی دلیل بنایا ہے) پاکی ہے تجھے، پس تو ہمیں دوزخ سے بچا لے۔

اسی طرح قرآنی تعلیمات کے رُو سے تخلیقِ کائنات عبث و بیکار نہیں ہوئی۔ قرآن کہتا ہے:

افحسبتم انما خلقنٰکم عبثًا و انکم الینا لا ترجعون ۔ فتعالی اللہ الملک الحق ط لا الٰہ الّا ھو ربّ العرش الکریم۔ (مومنون ۱۱۵، ۱۱۶)	تو کیا یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تمھیں بیکار بنایا اور تمھیں ہماری طرف پھرنا نہیں، تو بہت بلندی والا ہے اللہ سچا، بادشاہ، کوئی معبود نہیں سوائے اس کے، عزّت والے عرش کا مالک ہے۔

اور نہ ہی تخلیقِ کائنات کے لہو و لعب کا نتیجہ ہے، جیسا کہ مشرک اقوام کا عقیدہ تھا۔ ان کے مذہبی پروہتوں نے حکمران طبقہ کی مطلق العنانی اور فحاشی و عیاشی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے یہ دیومالا گھڑی تھی کہ خدا نے اوّلین ایک دیوی کے ساتھ کھیل کھیلا، جس کے نتیجہ میں اولاد پیدا ہوئی، اور اس اولاد نے بھی، جنھیں یہ مذہبی پروہت اور قومی بھاٹ فوق الانسانی صفات سے متصف کرتے تھے، اسی طرح کے کھیل کھیلے۔ اس طرح دیوی دیوتاؤں کی ایک فوق الفطری دنیا (PANTHEON) آباد ہوگئی۔ انھیں دیوی دیوتاؤں کی اولاد ہونے کے دعویدار یہ جابرہ روزگار تھے، جو کہتے تھے کہ ان کے تجبر و عظمت کا راز اور ان کے حقِ خداداد سلطنت کی سند ان کے اندر سرولایت کا ظہور ہے اور چونکہ ان کے دیوی دیوتا آباؤ اجداد ہر قسم کی رنگ رلیاں منایا کرتے تھے، لہٰذا انھیں بھی اس عیش کوشی کا حق ہے۔ یونانیوں کی دیومالا اسی خرافات سے بھری ہوئی ہے اور ان کا اسطوری دیولوک اسی قسم کے دیوتاؤں سے آباد ہے، جو شرمناک جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ چنانچہ قدیم یونانی فلسفی زنوفینز ہومر (HOMER) اور دُوسرے شاعروں کی اس خرافات کو بے نقاب کرتے ہوئے کہتا ہے:

"لوگ ہومر اور ہزیوڈ کے سامنے سر جھکاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ خدا انھیں کی طرح پیدا ہوئے ہیں اور انھیں کی طرح حس، آواز اور جسم رکھتے ہیں اور خداؤں کو ایسی تمام صفات سے متصف کرتے ہیں، جو خود ان کے لیے باعثِ شرم و ذلت ہیں۔ مثلاً چوری، زنا، جھوٹ وغیرہ۔" (تاریخ فلسفہ۔ ویبر ص۱۵)

لیکن اسلام اس اسطوری نظریۂ کائنات پر جو تھیوکریسی، شہنشاہیت و ملوکیت اور جاگیردارانہ نظام کی اصل ہے، ضربِ کاری لگاتا ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

وما خلقنا السمآء و الارض وما بینھما لٰعبین، لو اردنا ان نتخذ لھوًا لّاتّخذنٰہ من لدنّا ان کنّا فٰعلین، بل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغہ فاذا ھو زاھق و لکم	اور ہم نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، کھیل کُود میں نہیں بنائے (بلکہ اس میں ہماری حکمتیں ہیں کہ بندوں کو ہماری معرفت ہو) اگر ہم کوئی بہلاوا ہی اختیار کرنا چاہتے (مثل زن و فرزند کے جیسا کہ مشرکین کہتے تھے)، تو اپنے پاس سے اختیار کرتے، اگر ہمیں کرنا ہوتا

الویل ممّا تصفون - (انبیا ۱۶-۱۸)

(کیونکہ زن و مرد والے انھیں اپنے پاس رکھتے ہیں، مگر ہم اس سے پاک ہیں۔ ہمارے لیے یہ ممکن ہی نہیں) بلکہ ہم حق کو باطل پر پھینک مارتے ہیں، تو وہ اس کا بھیجا نکال دیتا ہے تو جبھی وُہ مٹ کر رہ جاتا ہے اور تمہاری خرابی ہے (اے مشرکو) ان باتوں سے جو تم بناتے ہو اور ہیں رنگ رلیوں اور زن و مرد کے جھمیلے سے متصف کرتے ہو۔

اسلام کا اصولی نظریہ اس بے مقصدی تخلیق کائنات کے عقیدے کے برعکس اسلام کائناتی نصب العینیت کا علمبردار ہے۔ اس کی تعلیم کی رُو سے کائنات کی تخلیق حق حکمت کے ساتھ ہوئی ہے، قرآن کہتا ہے:

وماخلقنا السمٰوٰت والارض وما بینھما الّا بالحق وان الساعۃ اٰتیۃ۔ (حجر - ۸۵)

اور ہم نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے عبث نہ بنایا۔ اور بے شک قیامت آنے والی ہے۔

دوسری جگہ قرآن کہتا ہے کہ:

خلق اللہ السمٰوٰت والارض بالحق ان فی ذالک لاٰیۃ للمؤمنین۔ (عنکبوت ۴۴)

اللہ نے آسمان اور زمین حق بنائے۔ بیشک ان میں نشانی ہے (اس کی قدرت وحکمت اور اس کی توحید و یکتائی پر دلالت کرنے والی) اہل ایمان کے لیے۔

لہٰذا اسلامی تعلیم کی رُو سے انسان کوربصیرت مادے کا بے مقصدی مظہر نہیں ہے، بلکہ خلاقِ کائنات نے اُسے ایک بلند مقصد کے لیے پیدا کیا ہے، جس میں کامیابی و ناکامی کی جواب دہی کے لیے اسے اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

افحسبتم انما خلقناکم عبثاً و انکم الینا لا ترجعون۔

غرض اسلام کے نزدیک یہ کائنات اور انسان کی زندگی بخت و اتفاق (CHANCE) کا نتیجہ نہیں ہے، نہ مادے کے بے مقصدی (FORTUTIOUS) ارتقا کا عارضی مظہر (EPIPHENOMENON) ہیں، جو میکانکی قوتوں کے ایک بے مقصد عمل ویگر سے ختم ہو جائیں، بلکہ ان کی ایک بلندتر غرض وغایت اور ایک پاکیزہ تر نصب العین ہے، جس کے لیے خلاق کائنات نے انھیں پیدا کیا ہے۔ اس کی حکمتِ بالغہ نے کائنات کے مختلف حصص واجزا میں ایک فوق الفکری نظم و ارتباط ودیعت

فرمایا ہے۔ کائنات کے مختلف حصے ایک منظم و مربوط کل کے اجزا ہیں، جو کچھ ظہور میں آتا ہے، ایک مقصد کلی کے تحقق کا جز و ہوتا ہے۔ اسی اصول کے مطابق انسانی اعمال بھی سعیِ لاحاصل کا مصداق نہیں۔ انسان کی مساعی صرف اس چند روزہ دنیوی زندگی تک محدود نہیں، بلکہ اس کا منشائے تخلیق و وظیفۂ حیات ایک بلند تر مقصد کا حامل ہے، جو عبودیت و عرفانِ الٰہی کا مترادف ہے۔ قرآن کہتا ہے:

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون۔ (ذاریات ۵۶)

اس کے ساتھ اگر کائنات میں توافق و ہم آہنگی ہے۔ اگر ہر شے کے نمو اور فروغ کے لیے ایک سلسلہ انتظامات ہے۔ اگر آنکھ کی حفاظت کے لیے اس کی مخصوص ساخت، پپوٹے، پلک اور بھنویں بنائی گئی ہیں تاکہ آنکھ اپنے مخصوص وظیفہ کو باحسن وجوہ انجام دے سکے، تو یہ بھی ہونا یقیناً ضروری ہے کہ انسان جو صنع خداوندی کا شاہکار ہے اور جسے بلند تر وظیفہ ادا کرنا ہے، ایسا بلند تر فریضہ جو منشائے تخلیقِ کائنات ہے، تو اس کے لیے بھی اپنے فریضہ کی ادائیگی کے لیے کوئی مناسب انتظام درکار ہے۔ اس کی ہدایت کے واسطے بھی ایک ربانی ضابطۂ عمل کی ضرورت ہے اور اگر یہ صحیح ہے کہ کائنات کا کوئی جز محض "تجربہ وخطا" (TRIAL AND ERROR) کے اصول کا نتیجہ نہیں تو اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انسان کو عمل کی دنیا میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے لیے نہیں چھوڑ دیا گیا بلکہ اس کی ہدایت کے لیے بھی ایک ربانی ضابطۂ عمل اور اس کا فوق البشری ابلاغ ضروری ہے۔

پس "کائناتی نصب العینیت" اور عقیدۂ ربوبیت کا تقاضا ہے کہ پروردگارِ عالم نے انسانوں کی رہنمائی کے لیے ایک ضابطۂ الٰہی، ایک صراطِ مستقیم، ایک ہدایت نامۂ ربانی بھی نازل کیا ہو، تاکہ اس ضابطہ کے مطابق عمل کر کے اور اس شاہراہِ ہدایت پر چل کر انسان فلاحِ دارین حاصل کر سکے۔

یہ ہے کائناتی نصب العینیت کا ماحصل، جس کا اسلام سرگرم مبلغ ہے۔ بلکہ یہ کہنا حقیقت سے بعید نہ ہوگا کہ اسلام ہی دنیا میں کائناتی نصب العینیت کا واحد بلا شرکتِ غیرے علمبردار ہے۔ نام کے لیے تو بہت سے فکری نظام بالخصوص مذاہب و ادیان نصب العینیت کے مدعی رہے ہیں۔ مگر وہ اس کے مقتضیات کی کماحقہ مراعات نہیں کر سکے۔ اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

نصب العینی اندازِ فکر کے بنیادی اجزا

خالق کے افعال ہوں یا مخلوق کے اعمال، انفس و آفاق ہر جگہ نصب العینی اندازِ فکر میں تین اساسی تصورات مضمر رہتے ہیں:

۱۔ ایک فاعل مختار کا تصور، جس نے اس فعل کا ارادہ کیا ہو،

۲۔ اس مقصد و نصب العین کا تصور، جس کے لیے وہ ارادہ کیا گیا ہو۔

۳۔ اس طریقِ کار کا تصور، جس کے ذریعے وہ مقصد حاصل ہوتا ہے۔

اس لیے کائناتی نصب العینیت کے مقتضیات ثلثہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ خلاقِ کائنات کا تصوّر، جس نے کائنات کو بشمول اس کی جملہ تفصیلات کے خلق فرمایا۔
۲۔ اس مقصد کا تصوّر، جس کے لیے یہ کائنات اور اس کے شاہکار انسان کی تخلیق ظہور میں آئی ہے۔
۳۔ اس طریقِ کار او ر ضابطۂ عمل کا تصوّر، جس کے مطابق عمل کر کے انسان مقصدِ تخلیق کے تحقق میں فائز المرام ہو سکتا ہے۔

اسلام کی اصطلاح میں :

پہلا اصول " ایمان باللہ " کہلاتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے معبودِ برحق ہونے پر ایمان، اس کی وحدانیت پر ایمان اور اس بات پر ایمان کہ وہ تمام صفاتِ کمالیہ سے متصف اور تمام اقسامِ نقص سے پاک و منزہ ہے۔

دوسرا اصول " ایمان بالآخرۃ " کہلاتا ہے، یعنی اس بات پر کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو عموماً اور انسان کو خصوصاً عبث و باطل پیدا نہیں کیا، بلکہ ایک بلند تر مقصد کے تحقق کی خاطر پیدا کیا ہے اور اس بلند تر مقصدِ تخلیق کے حصول و تحقق میں کامیابی و ناکامی کی جواب دہی کے لیے انسان کو مرے پیچھے جی اُٹھنا اور اپنے رب کے سامنے اپنے اچھے بُرے اعمال کا جواب دینا ہے۔ اور

تیسرا اصول " ایمان بالرسالۃ " کہلاتا ہے، یعنی اس بات پر ایمان کہ اللہ رب العزّت نے محض اپنے لطف و کرم سے انسانوں کی ہدایت کے لیے اپنے برگزیدہ بندوں کے ذریعے (جنھیں اسلام کی اصطلاح میں رسول کہتے ہیں) صحیفۂ ہدایت اتارے، تاکہ وُہ اپنی حیاتِ دنیوی اور آنے والی زندگی کو کامیاب بنا سکیں اور یہ کہ ان رسولوں میں آخری رسول جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلّم ہیں۔

اسلام کے بنیادی عقائد

پہلا اصول کلمۂ توحید کا، جو اسلام کی بنیادی تعلیم ہے، نصف اول ہے۔ یعنی :

لا الٰہ الا اللہ ۔ اللہ ربّ العزّت کے سوا کوئی معبود نہیں، صرف وہی معبودِ برحق ہے۔

دوسرا اور تیسرا اصول (ایمان بالآخرۃ اور ایمان بالرسالۃ) اس (کلمۂ توحید) کا نصف آخر ہیں۔ یعنی :

محمد رسول اللہ ۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ لہٰذا انھوں نے جو کچھ (بالخصوص آخرت کے بارے میں) فرمایا حق ہے اور جو ہدایت فرمائی، واجب العمل ہے۔

اس طرح اسلام اور کائناتی نصب العینیت عین یک دیگر ہیں۔

نصب العینیت کی غیر اسلامی توجیہات پر ایک نظر

اوپر کہا گیا ہے کہ اسلام ہی دنیا میں کائناتی نصب العینیت کا واحد بلا شرکتِ غیرے علمبردار ہے (اگرچہ نام کے لیے بہت سے فکری نظام اس کے مدعی ہیں، اور کیوں نہ ہوں کہ یہ انسان کی فطرتِ سلیمہ کا مقتضا اور کائنات کی ناقابلِ انکار حقیقت ہے) مگر وہ اس کے مضمراتِ ثلثہ کے ساتھ خود کو راضی نہ کر سکے، بالخصوص اس کا تیسرا اصول (ایمان

بالآخرۃ) انھیں حریتِ فکر وعمل یا طبیعت کی مطلق العنانی میں سدِ راہ نظر آیا۔ اس لیے اُنھوں نے اس کا سرے سے ہی انکار کر دیا اور چونکہ فطرت کے یہ تین حقایق آپس میں اس طرح مربوط و منظوم ہیں کہ ایک کا انکار بقیہ دو کے انکار کے بغیر منطقی طور پر ناممکن ہے، اُدھر نفس نصب العینیت سے انکار کی عقلِ سلیم اجازت نہیں دے سکتی۔ اس لیے اس اقرار و انکار میں اُٹنے پونے کے سمجھوتے کے لیے مختلف ڈھکوسلے تراشے گئے۔ اس کی مزید تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

جہاں تک "ایمان بالغیب" اور محض اقرارِ عبودیت کا تعلق ہے، مسئلہ بالکل صاف ہے اور سوائے ڈھٹائی کے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انسان کی فطرت سلیمہ سے پوچھیے بلا تامل اللہ رب العزت کی معبودیت کا اقرار کرے گی۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

ولئن سالتھم من خلق السمٰوٰت والارض لیقولن خلقھن العزیز العلیم۔ (زخرف ۹)

اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان اور زمین کس نے بنائے، تو ضرور کہیں گے انھیں بنایا اس عزت والے علم والے نے۔

اسی طرح "ایمان بالرسالۃ" کا مسئلہ بھی پیچیدہ نہیں ہے۔ معاملہ صرف ایک دستورِ حیات کے نفاذ کا ہے، جو جلد یا بدیر طے ہو سکتا ہے۔ مگر اصل پیچیدگی اس وجہ سے پیدا ہوتی تھی کہ انبیائے کرام فرماتے تھے کہ بندوں کو مرے پیچھے دوبارہ زندہ ہو کر اُٹھنا اور اپنے اچھے بُرے کا بارگاہِ رب العزت میں جواب دینا ہے۔ اس "ایمان بالآخرت" کے عقیدے کے ساتھ دنیا پرست مترفین خود کو راضی نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ محاسبۂ آخرت کا عقیدہ عنان گسیختہ لذت کوشی کی راہ میں سب سے بڑا روڑا ہے۔ آدمی صرف اسی صورت میں دل کھول کر دادِ عیش دے سکتا ہے کہ اس کے دل میں حشر و نشر اور حساب آخرت کا دغدغہ نہ ہو۔ ع

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

اسی لیے عرب جاہلیت کی لذت پرستی نے بعث بعد الموت کے تصور کو عسیر الفہم بنا دیا تھا۔ ان کے ایک شاعر کا قول ہے: ؎

حیات ثم موت ثم نشر
حدیث خرافۃ یا ام عمرو

ساسانی عہد کے آخر میں "زروانیت" (دہریت) نے بھی انکار آخرت کے لیے "دہر" (یا زروان) کا ڈھکوسلا تراش لیا تھا۔ "اسکندر گمانیک وژار" میں ہے:

"جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ خدا نہیں ہے اور اپنے آپ کو دہری (زروانی) کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ دنیا اور وُہ تمام تغیرات جو اس میں رُونما ہوتے ہیں، سب زمانِ نامحدود کے ارتقا کے نتیجے ہیں۔ اُن کا یہ دعویٰ ہے کہ نہ اچھے اعمال کے لیے جزا ہے اور نہ بُرے اعمال کے لیے سزا۔ نہ بہشت ہے نہ دوزخ اور نہ کوئی ایسی چیز، جو انسان کو اچھے یا بُرے کاموں پر مجبور کر سکے۔"

عہدِ حاضر نے جو اس قسم کے تناقضات کی ضخیم سائنٹیفک اور فلسفیانہ اصطلاحوں میں پردہ پوشی کرنے میں کمال رکھتا ہے فطرت کی اس حقیقت ساذجہ (نصب العینیت اور اس کے مضمرات ثلٰثہ) پر "تشبیہیت" (ANTHROPOMORPHISM) کا الزام لگایا۔ چونکہ معقولیت پسندی "نصب العینیت" کا کھل کر انکار نہیں کر سکتی، اس لیے اس کا ایک نیا تخیل اختراع کیا جس کی رُو سے جرمن فلسفی ونڈل بینڈ (WINDEL BAND) کے الفاظ میں:

"عضوی کل میں اجزاء کی ہیئت کا تعین خود اپنے کل کے ذریعے ہوتا ہے اور کل کے اجزا ہونے کی حیثیت سے اُن کا وجود ممکن ہے۔ غایت جو آغاز سے پیدا ہوتی ہے، خود آغاز کا تعین کرتی ہے۔"[1]

لیکن کائنات کا یہ اعجوبۂ روزگار تصور معقولیت پسند اذہان کے لیے کہاں تک قابلِ فہم ہے، اس پر تبصرہ بھی وِنڈل بینڈ ہی کی زبان سے سُن لیجیے:

"یہ بات نہ صرف ناقابلِ فہم ہی معلوم ہوتی ہے بلکہ ناممکن بھی۔"[2]

قصہ مختصر یہ کہ:

ا۔ بخت و اتفاق (CHANCE) کے عقیدے سے انسانی ذہن اِبا کرتا ہے۔

ب۔ میکانکیت کا اصول اپنی گوناگوں اشکال میں ارتقائے کائنات کی توجیہہ سے قاصر ٹھہرا۔

ج۔ نصب العینیت کی نئی اعجوبۂ روزگار توجیہہ، کہ غایت اپنے آغازِ کار کی اور کل اپنے اجزاء کی ہیئت کا تعین کرتے ہیں، خود اپنے علمبردار ونڈل بینڈ کے خیال میں نہ صرف عسیر الفہم بلکہ ناممکن ہے۔

اس کے بعد سوائے منطقی "نصب العینیت" پر جس شکل میں وہ اُوپر اپنے مضمرات ثلٰثہ کے ساتھ بیان ہوئی، ایمان لانے کے سوا چارہ نہیں، اور یہی اسلام کا موقف ہے۔

اسلامی فکر کے بنیادی اجزاء

ا۔ اسلامی فکر کا نقطۂ آغاز "ایمان بالغیب" ہے۔ اس کی تمام مساعی علمیہ و عملیہ کی غایت اسی عقیدہ کی تحقیق و توضیح ہے۔ اسلام

---

[1] "IN THE ORGANIC WHOLE, ON THE OTHER HAND, THE PARTS THEMSELVES ARE CONDITIONED BY THE WHOLE AND ARE ONLY POSSIBLE IN IT THEREFORE, THE END, WHICH IS TO COME OUT OF IT, DETERMINES THE BEGINING."

(W. WINDLEBAND, INTRODUCTION TO PHILOSOPHY, P. 144)

[2] "IT SEEMS TO BE NOT MERELY INCOMPREHENSIBLE BUT IMPOSSIBLE."

(IBID., P. 145)

کی نگاہ میں "توجہ الی المعبود" جسے آپ چاہیں تو "جذبۂ مذہبیت" یا "حسِ مذہبی" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ فطرتِ انسانی کا جزو لاینفک ہے جس پر بسا اوقات خارجی حالات کے دباؤ، تعیش کی فراوانی، افلاس کی شدت، ہوا پرستی و نفسانیت اور اسی قسم کے دوسرے عوارض کی بنا پر زنگ لگ جاتا ہے۔ اس لیے دعوتِ اسلامی کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اس زنگ آلودہ جذبے کو نکھار دے یا جہاں یہ جذبہ بغیر زنگ آلودہ حالت میں ہو، اسے جِلا اور صیقل دے کر اس سونے کو کندن بنا دے۔

لہٰذا اسی مشن کے ساتھ انبیاء سابقین کی بعثت ظہور میں آئی۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

وما ارسلنا من قبلك من رسول الّا نوحی الیہ انہ لا الٰہ الّا انا فاعبدون۔ (انبیاء - ۲۵)	اور ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول نہ بھیجا مگر یہ کہ ہم اس کی طرف وحی فرماتے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، تو مجھی کو پُوجو۔

ب - اسلام کے نزدیک منشائے تخلیق و وظیفۂ حیات ایک بلند تر مقصد ہے، جو عبودیت و عرفانِ الٰہی کا مترادف ہے، قرآن کہتا ہے کہ کائنات و مافیہا کی تخلیق صرف انسان کے واسطے ہوئی ہے:

ھو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعًا۔	وہی (اللہ) ہے، جس نے تمھارے (دینی و دنیوی نفع کے لیے) بنایا، جو کچھ زمین میں ہے۔

اور انسان کی تخلیق عبودیت و عرفانِ الٰہی کے واسطے ظہور میں آئی ہے:

وماخلقت الجن والانس الّا لیعبدون۔ (ذاریات - ۵۶)	میں نے جن اور آدمی صرف اس لیے بنائے کہ میری بندگی کریں (اور میری معرفت ہو)

اس توحید عبودیت کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے انسانوں کو ایک الٰہی الاصل ضابطۂ ہدایت کی ضرورت ہے، جو انھیں انبیائے کرام کے ذریعے بھیجا گیا۔ اس ضابطۂ ہدایت پر عمل فرض ہے اور اس لیے انسانوں کو ایک دن اس فریضہ کی بجا آوری یا اس میں غفلت یا اس سے بغاوت کی جوابدہی کے لیے اللہ رب العزت کے حضور میں حاضر ہونا ہے۔

اسلامی آئیڈیالوجی میں اس آنے والی زندگی پہ ایمان و ایقان اور اچھے بُرے اعمال کی جزا و سزا کا عقیدہ ایمان بالآخرۃ کہلاتا ہے، جو اسلامی فکر کی جان ہے اور جس کے بغیر اسلام جسدِ بے روح ہے۔ قرآن زندگی کے ایسے تصور کو جو عقیدۂ آخرت سے معرا ہو، بشدت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے:

انّ الذین لا یرجون لقآءنا و رضوا بالحیٰوۃ الدنیا واطمأنوا بہا والّذین ھم عن اٰیٰتنا غافلون اولٰئك ماواھم النار بما کانوا یکسبون۔ (یونس ۷ - ۸)	بے شک وہ، جو ہمارے ملنے کی اُمید نہیں رکھتے (روزِ قیامت اور ثواب و عذاب کے قائل نہیں) اور اس پر مطمئن ہو گئے (اور اس فانی کو جاودانی پر ترجیح دی اور عمر اس کی طلب میں گزار دی) اور وہ جو ہماری آیتوں سے غفلت کرتے ہیں (ذاتِ

گرامی سرورِ کائنات اور قرآن کریم سے اعراض کرتے
ہیں) ان لوگوں کا ٹھکانا دوزخ ہے بدلہ ان کی کمائی کا۔

اسلام کے بنیادی فلسفہ یا اس کے ہمہ گیر نظامِ حیات کا مطالعہ، مطالعہ کہلانے کا مستحق ہی نہیں جب تک اسے بعث بعد الموت اور محاسبۂ آخرت کے عقیدے کی روشنی میں نہ لیا جائے۔

ج ۔اسلام کا تیسرا اصول یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے محض اپنے لطف و کرم سے بندوں کی صلاح و فلاح کے واسطے ضابطۂ عمل اپنے پیغمبروں کے ذریعے نازل فرمایا۔ اس الٰہی الاصل ضابطۂ ہدایت کا آخری نزول اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا، جس کا نام قرآن ہے۔

کہنے کو بہت سے مفکرین عرفانِ الٰہی اور تکمیلِ نفس کے مدعی ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ عقلائے دہر اور سنجیدہ مفکرین کی مساعی فکریہ نہ صرف عرفانِ خداوندی کے باب میں بلکہ نظامِ معاشرت کی تنظیم کے لیے ایک مفید اور دیرپا ضابطہ کی دریافت کے متعلق بھی اپنے عجز و ادراک کا بزبانِ حال اعتراف کر چکی ہیں، کیونکہ ان کا افقِ ذہنی اپنے گرد و پیش ہی تک محدود ہے۔ اپنے ماحول سے بلند ہو کر وہ کسی ایسے نظام کو نہیں سوچ سکتے، جو باوصف اختلافِ اقوام و اوطان اور باوجود تغیرِ ادوار و زمان ہر جگہ اور ہر زمانے میں نافذ ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو اور اس کے لیے وہ معذور بھی ہیں۔ ان کی حکیمانہ برتری اور فلسفیانہ عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی یہ کہنا پڑے گا کہ وہ آخر تو انسان ہی ہیں۔ ان کا علم کتنا ہی وسیع اور غور و فکر کتنا ہی عمیق کیوں نہ ہو، آخر تو انسان ہی ہیں جس کے ماخذ اور طریقِ حصول بھی انسانی ہی ہیں۔ لہٰذا وہ صرف وہی سوچ سکتے ہیں اور تجویز کر سکتے ہیں، جو انسانی بساط میں ممکن ہو سکتا ہے اور جس کے لیے ان کا محدود ماحول ان کی مساعدت کر سکتا ہے۔ اپنے ماحول سے بلند ہو کر سوچنا انسان کے لیے ناممکن ہے اور کسی ایسے معاشرے کا نظامِ حیات مرتّب کرنا، جو اس کے مخصوص گرد و پیش سے وسیع تر ہو اور زمان و مکان کی حدبندیوں سے آزاد ہو، انسانی عقل کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کے لیے ایک مافوق البشری طریق کے سوا چارہ نہیں، جسے اسلام کی اصطلاح میں "وحیِ الٰہی" کہتے ہیں۔

لہٰذا اسلام نے انسان کے منزلِ مقصود تک پہنچنے نیز حیاتِ دنیوی اور آنے والی زندگی کو ہم آہنگ اور متوافق بنانے اور ضمناً خالص انسانی دوستی اور منصفانہ و عادلانہ بنیادوں پر اجتماعی زندگی کی تنظیم استوار کرنے کے لیے انسان کی شاہراہِ عمل کا تعیّن ایک ایسے ہدایت نامہ کی بنا پر کیا، جو منجانب اللہ ہے اور جسے اس کی زبان میں نبوّت و رسالت کہتے ہیں۔ اللہ رب العزت نے محض اپنے لطف و کرم سے اپنے بندوں کی نزاعات کے فیصلے کے لیے ایک ضابطۂ حیات اپنے رسول پر نازل فرمایا اور انھیں اس کی بے لاگ مراعاۃ پر مامور کیا۔ قرآن کہتا ہے:

انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما ارٰىك الله و لا تکن للخائنین خصیماً۔ (نساء - ۵ - ۱۰)

اے رسول! بے شک ہم نے تمھاری طرف سچی کتاب اتاری تاکہ لوگوں میں فیصلہ کرو، جس طرح تمھیں اللہ دکھائے اور دغا والوں کی طرف سے نہ جھگڑو۔

اس کے ساتھ بندوں کو مامور فرمایا کہ جو کچھ یہ رسول فرمائیں اسے قبول کرو اور جس سے منع فرمائیں، اس سے باز رہو:

وما اٰتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا۔ (حشر) اور جو کچھ تمھیں رسول عطا فرمائیں، وہ لو اور جس سے منع فرمائیں، باز رہو۔

یہ ہے اسلام کا الٰہی الاصل ضابطۂ حیات جس کے ساتھ "کائناتی نصب العینیت" کے مقتضیات ثلٰثہ کی تکمیل ہو جاتی ہے اور اس کے بعد اسلام اور کائناتی نصب العینیت عین یکدیگر ہو جاتے ہیں۔ بہر حال اس الٰہی الاصل ہدایت نامہ (قرآن) کا تصور ہی اسلامی اور غیر اسلامی نظام ہائے حیات میں فارق ہے۔ اس پر عمل واجب ہے اور انسانیت کی بدنصیبی اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ اسے چھوڑ کر ہوا و ہوس کے خود ساختہ ڈھکوسلوں کی طرف نظر اُٹھاتے:

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید
مپندار سعدی کہ راہِ صفا تواں رفت جز بر پئے مصطفیؐ

رسولِ اکرمؐ کا معاشی نظام

ملک شیر محمّد خاں اعوان

جن لوگوں نے تاریخِ عالم کے انقلابات پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے ان کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اسلام تاریخ انسانی میں ایک عظیم الشان انقلاب تھا۔ انقلاب کا مفہوم یہی ہے کہ اس کے بعد کی زندگی اس سے پیشتر کی زندگی سے بنیادی طور پر مختلف ہو جائے اور یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اسلام نے اپنے سے قبل کی زندگی میں واضح تفاوت پیدا کر دیا ہے اسی لیے اہل عرب اسلام سے پیشتر کی زندگی کو زمانۂ جاہلیت سے تعبیر کرنے لگے اور پھر یہ انقلاب زندگی کے کسی ایک گوشہ میں نہیں آیا بلکہ اس کی ہمہ گیری نے زندگی کے تمام گوشوں کو بدل کر رکھ دیا۔ اس نے اخلاق و معاشرت، عبادات و معاملات، تہذیب و ثقافت، سیاست و عدالت اور معیشت و معاشرت کے تمام پہلو منقلب کر دیے۔ ان پہلوؤں پر تحقیقی نظر ڈالنے کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اسلام نے ہر شعبۂ زندگی میں عظیم ترین انقلاب برپا کیا لیکن آج کی دنیا میں معاشی اور اقتصادی مسائل زندگی کے تمام پہلوؤں پر غالب آ گئے ہیں اور مفکرین نے تمام نظامہائے افکار و اخلاق اور تمام مذاہب کو اسی کسوٹی پر پرکھنا شروع کر دیا ہے کہ علم المعیشت کے متعلق ان کے اصول و قوانین کیا ہیں۔ مغرب میں مذہب کے خلاف جو بغاوت ہوئی اس کا صرف یہی سبب نہ تھا کہ مسیحیت کے تصوراتِ الوہیت لوگوں کو بے بنیاد معلوم ہونے لگے تھے بلکہ ایک بہت بڑا سبب یہ تھا کہ اشتراکی مفکرین اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ عیسائیت کا کلیسائی نظام محتاج کو محتاج اور غنی کو غنی رکھنے کا معاون ہے اور وہ ناداروں کو فقط اس موہوم اطمینان کی افیون کھلاتا ہے کہ وہ اس دنیا میں روٹی کو ترستے رہیں تو کوئی بات نہیں اگلی دنیا کی بادشاہت ان کا مقدر ہے اور دولت مندوں کو جنت کی ہوا تک نہیں لگنے دی جائے گی اور امیروں کا جنت میں داخل ہونا اسی طرح ناممکن ہوگا جس طرح اونٹ کا سوئی کے ناکے سے گزرنا ناممکن ہے۔ اشتراکی مفکرین کے یہی دلائل مغرب کے دماغ میں ہلچل پیدا کرنے لگے اور انھوں نے اگر اشتراکیت قبول نہیں کی تو کم از کم مذہب بیزاری ان کا مستقل ذہنی روگ بن کر رہ گئی ہے۔

آج جبکہ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم اور محنت و سرمایہ کی آویزش نے دنیا کے اقتصادی نظام کو درہم برہم کر رکھا ہے اس وقت دنیا مختلف اور متضاد نظریات و تحریکات کے سیلاب میں بہی جا رہی ہے ہر تحریک اس امر کی مدعی ہے کہ موجودہ دور کی اجتماعی مشکلات کا حل اس کے دامن میں ہے لیکن اس کھلی حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ آج ان نظریات کی افراط میں دنیا امن و سکون سے جس قدر دُور جا پڑی ہے اور اس وقت اضطراب، بے چینی اور بدامنی کے جس قدر ہولناک طوفان اُٹھ رہے ہیں یہ سب دنیا کی تاریخ میں اس سے پیشتر کبھی نظر نہیں آئے۔ یہ سب کچھ کیوں ہے؛ جن لوگوں کی نگاہیں بین الاقوامی مسائل کا جائزہ لیتی رہتی ہیں وہ اس امر پر متفق ہیں کہ دنیا کا موجودہ ہیجان براہِ راست معاشی و اقتصادی عدم توازن کا نتیجہ ہے۔

جب کسی ملک کی یہ حالت ہو جائے کہ چند افراد ملک کی تمام دولت اور وسائل دولت پر قابض ہو کر عیش و مسرت کی زندگی گزار رہے ہوں اور کروڑوں لوگ افلاس و تنگدستی سے دم توڑ رہے ہوں تو عوام میں لازماً ہیجان و اضطراب پیدا ہو گا۔

دولت کی غیر منصفانہ تقسیم آج کے دور کا سلگتا ہوا موضوع ہے۔ مختلف معاشی نظریات کتابوں کی زینت بن رہے ہیں مگر عملاً ہر جگہ سرمایہ داری کا دور دورہ ہے کیونکہ جو نظریات پیش کیے جاتے ہیں وہ ناقابلِ عمل ہوتے ہیں۔ آئیے ہم ان لادین نظریات کے پیچھے دوڑنے کے بجائے قابلِ عمل اور تجربہ شدہ اسلامی نظام کو اپنا کر ایک مثالی قوم بن جائیں اور اندھیرے میں بھٹکنے والی انسانیت کے لیے مینارِ نور بن کر اسے صحیح معاشی نظام سے روشناس کرائیں۔ اسلام کے معاشی نظام کے اصول صرف کتابوں میں لکھے رہنے والے ناقابلِ عمل اصول نہیں بلکہ ریگزارِ عرب ان کی تجربہ گاہ رہی ہے اور تاریخ شہادت دے رہی ہے کہ جب یہ اصول برسرِ عمل تھے تو غربت و افلاس کا خاتمہ ہو گیا تھا لوگ زکوٰۃ اٹھائے پھرتے تھے مگر لینے والا نہیں ملتا تھا۔ دنیا کا کوئی بے رحم اور متعصب مؤرخ بھی اس حقیقت کا آج تک انکار نہیں کر سکا۔

آج بھی مظلوم انسانیت کو اگر پناہ ملے گی تو اسلام کے دامن میں۔ اگر سیماب وار بے قرار دنیا کو سکون و اطمینان نصیب ہو گا تو اسلام کی چھاؤں میں۔ اگر مجروح و مضطرب سوسائٹی کی مرہم پٹی اور تسکین و تسلی ہو گی تو سرورِ کائنات، فخرِ موجودات احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دارالشفاء میں کیونکہ نسخۂ شفاء ان ہی کے پاس ہے۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ (پارہ ۱۵ رکوع ۹)

"اور ہم قرآن میں اتارتے ہیں وہ چیز جو ایمان والوں کے لیے شفاء اور رحمت ہے۔"

(ترجمہ مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ)

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ ۙ

(پارہ ۱۱ رکوع ۱۱)

"اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آئی اور دلوں کی صحت۔"

(ترجمہ مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ)

یہی نسخۂ شفا دل و دماغ اور نفس و روح کی تمام بیماریوں کا مجرب نسخہ ہے اور یہی نسخۂ شفا کیمیا ہے۔ ؎

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا
مسِ خام کو جس نے کندن بنایا
کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا

حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا ارشادِ گرامی ہے:

ان اللہ یرفع بھذا الکتاب اقواماً ویضع بھا آخرین۔ (صحیح مسلم)

"اللہ تعالیٰ اسی قرآن کے ذریعے اقوام (عالم) کو بامِ عروج پر پہنچائے گا اور اسی قرآن پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے دوسرے لوگوں کو (قعرِ ذلّت میں) گرا دے گا"

انسانیت جب تک غیر مسلم ممالک کی راہ تکے گی ٹھوکریں کھاتی رہے گی اسے قرار وسکون نصیب ہوگا تو مکّہ اور مدینہ کی گلیوں میں ۔ اسے امن و امان ملے گا تو آقا مدنیؐ کے قدموں میں ۔ ؎

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جُرمِ خانۂ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں
(اقبالؒ)

سرورِ کائنات کے قدموں سے ہٹ کر کائنات کی حیات وثبات ایک موہوم سی بات ہے ترجمانِ حقیقت فرماتے ہیں : ؎

در جہاں وابستۂ دینش حیات
نیست ممکن جز بآئینش حیات

میں پُوچھتا ہوں آخر وقت کے کون سے مسائل ہیں جن کے بارے میں آج غیر مسلم ممالک کی طرف دیکھا جاتا ہے اور سوسائٹی کی راہ میں کون سی مشکلات ہیں جن کے حل کرنے کے لیے اسلام پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ پست کو بلند کرنے ، گرے پڑے کو اٹھانے ، مزدور کو روٹی دینے اور عوام کو خوشحال دیکھنے کا حسین تصور تو پہلی بار دنیا کے سامنے پیش ہی اسلام نے کیا ہے اسلام تو خود سب سے بڑا غریب نواز ہے اور سب سے پہلا مزدور پرور ہے۔ اگر مزدور کی حوصلہ افزائی ، بھوکے کی شکم پُری اور حاجت مند کی حاجت روائی کا نام کمیونزم ہے تو یہ کمیونزم اسلام کی نقالی ہے۔ اسلام نے یہی اور عین یہی تعلیم کارل مارکس اور انجلز سے سوا ہزار سال پیشتر نہ صرف پیش کی بلکہ اس پر عمل کر کے دکھا دیا۔ اگر تقسیم دولت اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کی حوصلہ شکنی کا نام کمیونزم ہے تو پھر ہمارے کمیونسٹ دوستوں کو ماسکو کی بجائے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فلسفہ پر اعتماد کرنا چاہیے جنھوں نے سب سے پہلے دنیا کو اس تعلیم سے روشناس فرمایا اور جن کا ایک ممتاز وصفی نام اجیر (مزدور) بھی ہے صلی اللہ علیہ وسلم ۔

حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک اقتصادی سوال ہے کہ کمیونزم اسلام کا حریف نہیں اس سلسلہ میں سوویٹ روس صحیح حریف ہے تو سرمایہ دار امریکہ اور امپیریلیسٹ برطانیہ کا۔ کمیونزم دراصل یورپ کے ظالمانہ جفاکارانہ اور امپیریلزم کے سرمایہ دارانہ ، خودغرضانہ ، تعیشانہ نظام کا جارحانہ ردّ عمل ہے۔ اس لیے ملوکیت اور سرمایہ داری کی مظلوم اور زخم خوردہ بھوکی پیاسی دنیا کمیونزم کے سراب کی طرف لپکے تو تعجب نہیں لیکن افسوس کا مقام ہے کہ مسلمان بھی اشتراکی نظام کی تعریف و تحسین میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے نظر آتے ہیں۔ یہ دراصل اسلام کی صحیح رُوح اور سچّی شکل وصورت سے ناآشنائی اور صحیح اسلامی نظام و معاشرہ سے عدمِ واقفیت کا افسوسناک نتیجہ ہے ورنہ سوسائٹی کے اونچ نیچ کو جس کامیابی سے اسلام نے ہموار کیا ۔ کمیونزم اس کے تصور سے بھی ناآشنا ہے ۔

اب میں اس طرف آتا ہوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاشی نظام کے اساسی عناصر کیا ہیں اور وُہ کیسا معاشی

نظام ہے جو ہمیشہ کے لیے معاشی عدل کے نصب العین کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ حصول معیشت اور اکتساب مال بجائے خود کوئی مقصد نہیں ہے بلکہ وہ ایک وسیلہ ہے اعلیٰ تر مقاصد کے حصول کا۔ اسلام نے چونکہ انسان کو زمین پر خدا کا خلیفہ اور اس کا نائب قرار دیا ہے اور اس حیثیت میں اس کو یہ منصب تفویض کیا ہے کہ وہ انفرادی طور پر خدا کی ذات و صفات سے قربت و مشابہت حاصل کرے اور اجتماعی حیثیت سے خدا کے قانون کو انسان کے خود ساختہ نظریات و قوانین پر بالاتر کرے اس لیے وہ معاشی اصلاح کو اس نصب العین کے حصول کا ایک ضروری وسیلہ قرار دیتا ہے اور انسان کے معاشی مسئلہ کو اسی حیثیت پر قائم رکھنا چاہتا ہے اس کو نہ کسی خاص طبقہ سے کوئی دشمنی ہے نہ وہ غریبوں کو دولت مند افراد سے رشک و حسد کرنا سکھاتا ہے اور نہ اسے بورژوا یا متوسط طبقہ سے نفرت ہے۔ وہ معاشی اصلاح کے ذریعے دولت کو محدود ہو جانے سے روکنا ضرور ہے لیکن اس کا مقصد انسان کے اخلاقی احساس کو اتنا بیدار اور قوی کر دیتا ہے کہ ہر فرد اخوت و ہمدردی کے جذبہ سے سرشار ہو جائے اور دوسروں کے مصائب و تکالیف میں ان کی مالی اعانت کرنا اپنا دینی فرض خیال کرے نہ وہ ایک ایسی سوسائٹی تعمیر کرنا چاہتا ہے جس میں دولت سمٹ سمٹا کر ایک محدود طبقہ کے ہاتھوں میں چلی جائے بلکہ وہ سوسائٹی کے زیادہ سے زیادہ افراد کے درمیان پھیلے اور گردش کرے اس کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد ہے:

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ وَ لِذِی الْقُرْبٰى وَ الْیَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِیْنِ وَ ابْنِ السَّبِیْلِ ۙ كَیْ لَا یَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْكُمْ ؕ (پارہ ۲۸ رکوع ۴)

"جو غنیمت دلائی اللہ نے اپنے رسول کو شہر والوں سے وہ اللہ اور رسول کی ہے اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے کہ تمہارے اغنیا کا مال نہ ہو جائے۔"

(ترجمہ مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ)

آیت کے آخری جزو میں اس نے صاف طور پر فرما دیا ہے کہ وہ اجتماعی دولت کو صرف دولت مندوں کا حق نہیں سمجھتا ہے بلکہ اس کی تقسیم میں ہر طبقہ کے افراد کو شریک کرنا چاہتا ہے۔ اسلام نے اس سرمایہ دارانہ ذہنیت کو مٹانے کی پوری کوشش کی ہے جو دولت کو حاصل کرنے میں بڑی حریص ہے لیکن اس کے صرف کرنے میں بے حد تنگ دل ہے وہ کہتا ہے کہ تم دولت کما سکتے ہو لیکن یہ حق نہیں رکھتے کہ اس کے انبار لگاتے رہو یا صرف اپنی راحت و آسائش پر اسے صرف کرتے رہو۔ نماز اور زکوٰۃ کے بعد کلام مجید میں شاید ہی کسی اور بات کو اتنی بار دُہرایا گیا ہو جتنا اس بات کو کہ دولت خدا کی راہ میں صرف کرتے رہنا چاہیے یہاں تک کہ ان لوگوں کو سختی سے متنبہ کیا گیا ہے جو دولت جمع کرتے ہیں لیکن خدا کی راہ میں صرف نہیں کرتے ارشاد ہوا ہے:

وَ الَّذِیْنَ یَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ۙ (پارہ ۱۰ رکوع ۱۱)

"اور وہ جو جوڑ کر رکھتے ہیں سونا اور چاندی اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انھیں خوشخبری سناؤ دردناک عذاب کی۔" (ترجمہ مولانا احمد رضا خان بریلوی)

ایک اور جگہ یہ بات بتائی گئی ہے کہ انسان نیکی حاصل نہیں کر سکتا ہے جب تک اپنی دولت کو راہِ خدا میں صرف نہ کرے:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ط (پارہ ۴ رکوع ۱)

"تم ہرگز بھلائی کو نہ پہنچو گے جب تک راہِ خدا میں اپنی پیاری چیز خرچ نہ کرو۔" (ترجمہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی)

دولت کو زیادہ سے زیادہ افراد میں تقسیم کرنے کی غرض سے اسلام نے خاندانی نظام کو باقی رکھنا ضروری سمجھا کیونکہ خاندان انسانی زندگی اور تمدن کی ایک قدرتی اکائی ہے اور دنیا کے تمام خارجی نظامات میں سب سے زیادہ محکم اور بھروسہ کے قابل ہے۔ حکومتیں بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔ سیاسی اور معاشی انقلابات کی آندھیاں آتی اور گزر جاتی ہیں۔ طبقاتی تقسیم بدلتی رہتی ہے لیکن خاندان اپنی جگہ مضبوطی سے قائم ہے اور قائم رہے گا۔ اشتراکی اور دُوسرے خیال پرستوں کے باوجود انسانی تمدن پر وہ دور کبھی نہیں آیا ہے اور نہ آسکتا ہے جب انسان خاندانی رشتوں اور بندھنوں سے اپنا پیچھا چھڑا سکے۔ جہاں بھی دس بیس آدمی بسیں گے شادی بیاہ ہوگا۔ شوہر بیوی، ماں باپ، بھائی بہن، داماد اور خسر کے رشتے ہوں گے اور انسان الفتوں اور قرابتوں کے ایک پھیلے ہُوئے سلسلہ میں منسلک رہے گا۔ انسانی زندگی کی اس فطری وحدت کو اسلام اپنے اخلاقی اور معاشی مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے اور اس باہمی امداد و معاونت کے جذبہ پر جو فطرتاً خاندان کے افراد میں ایک دوسرے کے لیے موجود ہوتا ہے مذہبی فرض و احساس کی مہر لگا دیتا ہے تاکہ انسان نفس پرستی اور خود غرضی کی کیسی ہی شدید حالت سے گزر رہا ہو کم از کم ایک محدود دائرہ میں وُہ دُوسروں کی امداد و پرورش کا ذریعہ بنا رہے۔ اسی غرض سے اسلام نے خاندان کی زندگی کو چھوٹے پیمانہ پر امداد باہمی کا ادارہ بنا دیا ہے اور اہلِ خاندان کے حقوق و فرائض پر مذہبی احکام کا وزن ڈال دیا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر ذوی القربیٰ کے حقوق کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور غیر مستطیع اقربا کی امداد کو انسان کی پہلی ذمہ داری قرار دیا گیا ہے۔ ایک جگہ نہایت بلیغ انداز میں یہ حکم سُنایا گیا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِى الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ (پارہ ۱۴ رکوع ۱۹)

"بیشک اللہ حکم فرماتا ہے انصاف اور نیکی اور رشتہ داروں کے دینے کا اور منع فرماتا ہے بے حیائی اور بری بات اور سرکشی سے۔" (ترجمہ مولانا احمد خان بریلوی)

اپنے قوانین وراثت میں بھی اسلام نے اس امر کو ملحوظ رکھا ہے کہ وراثت افراد خاندان کی زیادہ سے زیادہ تعداد پر تقسیم ہو اس بارے میں اگر اس کا مقابلہ مغربی ممالک کے مماثل قوانین سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں میں دولت اس طرح ایک جگہ جمع ہی نہیں ہو سکتی جیسے کہ مغرب میں وہ ایک خاص حلقہ میں منجمد رہتی ہے۔

اسلام کے معاشی نظام کا سنگِ بنیاد زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ وُہ رقم ہے جو صاحبِ استطاعت افراد سے لے کر غریبوں اور مستطیع افراد میں تقسیم کی جاتی ہے۔ یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ زکوٰۃ اس قسم کی کوئی رقم ہے جو آج کل حکومتیں اپنی رعایا سے وصول کرتی ہیں کیونکہ اس قسم کے جتنے ٹیکس عوام سے وصول کیے جاتے ہیں وہ ان منافع اور فوائد کے معاوضہ میں لیے جاتے ہیں جو

عوام کو حکومت کی سرپرستی سے حاصل ہوتے ہیں لیکن زکوٰۃ وہ ٹیکس ہے جو محض غیر مستطیع افراد کی مالی اعانت کے لیے وصول کیا جاتا ہے اور اس کے معاوضہ میں محصول دہندگان کو کوئی دُوسرا فائدہ کسی اور شکل میں نہیں ہوتا اسی لیے زکوٰۃ کے مصارف معین کر دیے گئے ہیں یعنی زکوٰۃ کی رقم صرف غریبوں کی مالی اعانت میں صرف کی جا سکتی ہے لیکن دوسرے مصرف میں نہیں لگائی جا سکتی ہے۔

اسلام کے معاشی نظام کے متعلق اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظام نہ تو خالص اشتراکی ہے اور نہ خالص سرمایہ داری بلکہ ان دُو انتہاؤں کے درمیان وہ ایک اعتدال پیدا کرتا ہے۔ وُہ ذاتی ملکیت کو باقی رکھنا ضروری خیال کرتا ہے لیکن اس پر ایسے قیود و شرائط عائد کرتا ہے کہ وہ معاشی استحصال کا ذریعہ نہ بننے پائے۔

صحیح اسلامی نظام کے اندر قوم کا کوئی فرد بھُوکا نہیں رہتا اور کمیونزم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خلافت راشدہ کے عہد میں حضرت عثمانؓ کی حکومت کا دور وہ زمانہ ہے جب عرب کی دولت افراط کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ حضرت ابو ذر غفاریؓ نے شام میں قرآن حکیم کی اس آیت کے مطابق:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (پارہ ۱۰ رکوع ۱۱)

"اور وہ کہ جوڑ کر رکھتے ہیں سونا اور چاندی اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انھیں خوشخبری سناؤ دردناک عذاب کی۔" (ترجمہ مولانا احمد رضا خان بریلوی)

یہ فتویٰ دیا کہ دولت جمع کرنا حرام ہے (مسند احمد بن حنبل جلد ۵) تو حضرت ابو ذرؓ کی یہ آواز عام پسند نہ ہو سکی اور نہ عوام میں کوئی فتنہ پیدا کر سکی کیونکہ زکوٰۃ کا قانون پورے نظام کے ساتھ جاری تھا (سیرت النبی جلد پنجم مولفہ علامہ سید سلیمان ندوی صفحہ ۲۶۱)

اس آواز کی ناکامی کی وجہ صرف یہ تھی کہ لوگ آسُودہ حال تھے اول تو کوئی بھُوکا پیاسا نہیں تھا اور جو تھے تو عہد عثمانی میں ان کا کھانا بیت المال سے مقرر تھا بلکہ عہد صدیقی میں اسی قسم کا انتظام شروع ہو گیا تھا (طبری صفحہ ۲۰۴۸ بحوالہ خلفائے راشدین مولفہ شاہ معین الدین احمد ندوی صفحہ ۲۴۴)

اہل حیرہ سے حضرت ابو بکرؓ کا جو معاہدہ ہُوا اس میں یہ شرط تھی کہ کوئی ذمی، بوڑھا (اپاہج) اور مفلس ہو جائے گا تو وہ جزیہ سے بری کر دیا جائے گا نیز بیت المال اس کا کفیل ہو گا۔ (کتاب الخراج صفحہ ۲۷ بحوالہ خلفائے راشدین صفحہ ۲۷)

حقیقت یہ ہے بھُوک کا علاج صرف اسلام کے پاس ہے۔ اسلام نے فقیر کو امیر، نادار کو مالدار بنا دیا اور بھُوکے ابو ہریرہؓ کو بحرین کا گورنر اور دس ہزار روپے نقد کا مالک بنا دیا۔ (اصابہ بحوالہ مہاجرین حصّہ دوم صفحہ ۵۰)

کتان کے رنگے ہُوئے کپڑے سے ناک صاف کر کے کہا واہ ابو ہریرہ آج تم کتان سے ناک صاف کرتے ہو حالانکہ کل منبر نبویؐ اور حضرت عائشہؓ کے درمیان غش کھا کر گرتے تھے اور گزرنے والے تمھاری گردن پر پیر رکھ کر کہتے تھے کہ ابو ہریرہ کو جنون ہو گیا ہے حالانکہ تمھاری یہ حالت صرف بھُوک کی وجہ سے ہوتی تھی۔ (بخاری بحوالہ مہاجرین صفحہ ۶۶)

اسی طرح حضرت علی مرتضیٰؓ نے فرمایا ایک زمانہ وُہ تھا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھُوک کی شدت سے پیٹ پر پتھر باندھتا تھا اور آج میرا یہ حال ہے کہ چالیس ہزار سالانہ میری زکوٰۃ کی رقم ہوتی ہے (مسند احمد بن حنبل جلد اول صفحہ ۱۵۹ بحوالہ خلفائے راشدین صفحہ ۲۳۶)

آج ہر طرف بھُوک ہی بھوک ہے۔ مشینی دور کی برکت سے دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کے باعث ایک جگہ زر و جواہر کے قارُونی انبار ہیں اور ایک جگہ نانِ جویں تک میسّر نہیں۔ سرمایہ کی اس غیر متوازن تقسیم نے مزدور کو سرمایہ دار کا جانی دشمن بنا دیا ہے۔ بھوکا مزدور بھُوکے بال بچوں کو اپنے سامنے دم توڑتا دیکھ کر کمیونزم کا نعرہ بلند کرتا ہے اور دُنیا تنکے کی طرح کمیونزم کے سیلاب میں بہی چلی جارہی ہے اے کاش کہ وُہ یہ دیکھتی کہ اس درد کی دوا تو اسلام کے پاس ہے۔ اسلام ہی بے ٹھکانوں کا ملجا و ماویٰ ہے۔ اسلام کے اقتصادی نظام کی برکت سے کوئی بھوکا رہتا ہے نہ کوئی ننگا۔ بیت المال سے سب کی کفالت ہوتی ہے۔ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کے عہد خلافت میں جتنے اپاہج تھے سب کے نام درج رجسٹر تھے ان سب کو وظیفہ ملتا تھا۔ (اصابہ جلد ۵ صفحہ ۸۰)

قرض داروں کے قرض کی ادائیگی کے لیے بھی ایک مد تھی۔ شیر خوار بچّوں کے وظائف مقرر تھے ایک عام لنگر خانہ تھا جس سے فقراء و مساکین کو کھانا ملتا تھا۔ (طبقات ابنِ سعد جلد ۵ صفحہ ۲۸۱ بحوالہ تابعین صفحہ ۲۳۸ و ۲۳۹)

اسی پر بس نہیں بلکہ اسلام نے کسی کو بھُوکا، ننگا اور محتاج و فقیر رہنے ہی نہیں دیا سب کو غنی اور مالدار بنا دیا۔ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کے وقت ملک کے طول و عرض میں افلاس کا نشان باقی نہ رہ گیا تھا۔ مہاجر بن زید کا بیان ہے کہ ہم لوگ صدقہ تقسیم کرنے تھے۔ ایک سال کے بعد دُوسرے سال وُہ لوگ جو پہلے صدقہ لیتے تھے خود دُوسروں کو صدقہ دینے لگے تھے۔ (طبقات ابنِ سعد جلد ۵ صفحہ ۲۵۶ بحوالہ تابعین صفحہ ۲۴۲)

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کی صرف اڑھائی سال کی حکومت کی مختصر مدت میں یہ حالت ہوگئی تھی کہ لوگ ان کے عمال کے پاس فقراء میں تقسیم کرنے کے لیے صدقہ کا مال لے کر آتے تھے لیکن کوئی صاحبِ حاجت نہ ملتا تھا اور وہ مال واپس لے جانا پڑتا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے سب کو اس قدر مالا مال کر دیا تھا کہ کوئی شخص حاجت مند باقی نہ رہ گیا تھا۔ (فتح الباری جلد ۶ ص ۱۵۴)

متذکرہ بالا تصریحات سے یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ اسلام کے معاشی نظام میں تمام افراد کو زندگی کی اساسی ضروریات مہیا کی جاتی ہیں اور کوئی فرد کسی کا محتاج نہیں رہتا۔ ؎

کس نہ گردد در جہاں محتاج کس
نکتۂ شرع مبیں این است و بس (اقبالؒ)

حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی لائی ہوئی روشن کتاب نے حیاتِ انسانی کے ہر تاریک گوشہ اور شعبہ کو منور فرمایا اور بنی نوعِ انسان کو ایسا جامع ضابطۂ حیات عطا فرمایا جو تا قیامِ قیامت لازوال رہے گا۔ ؎

مُصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام
(مولانا احمد رضا خان بریلویؒ)

نقشِ پیمبر — سماجی انصاف

ڈاکٹر محمد صغیر حسن معصومی

سماجی انصاف مسلم معاشرے کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ تاریخی واقعات اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ ہر زمانے میں اسلام کے فرزندوں نے سماجی انصاف کا بول بالا کیا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو سماجی انصاف اسلام کی بنیادی تعلیم ہے۔ اسلام کے معنی ہیں اللہ پروردگار کے آگے سر جھکا دینا، حق کے آگے چون وچرا نہ کرنا۔ مسلمان وُہ ہے جو اپنے حقوق کو دوسروں کے لیے قربان کر دے۔ جس کی زبان، ہاتھ یا دل سے کسی دُوسرے شخص کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ آج سے تقریبًا چودہ سو برس پیشتر پیغمبرِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی تبلیغ شروع کی تاکہ دنیا میں سماجی انصاف قایم ہو، کوئی شخص کسی شخص پر ظلم نہ ڈھائے، زور آور کمزور کو آنکھیں نہ دکھائے، مالدار مفلس کو ذلیل نہ سمجھے طاقت اور مال ودولت کی میزان پر انصاف کو تولا نہیں جاسکتا۔ آج کی طرح اُس دور کی دنیا میں بھی طاقت ودولت کی بنیاد پر طبقات قایم تھے۔ عرب میں علم وتہذیب نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ بدنظمی تھی۔ قبائلی جھگڑے آئے دن ہوتے رہتے تھے، لوگ طاقت کے مظاہرے سے باز نہ آتے تھے۔ بس چلتا تو اکے دُکے مسافروں کو پکڑ کر دُوسرے قبائل کے ہاتھوں بیچ دیتے تھے۔ لوٹ مار کا خطرہ برابر رہتا تھا۔ یہود ونصارٰی بھی سرزمین عرب میں بستے تھے۔ مگر علم وثقافت کے دعویدار ہونے کے باوجود سماجی خیرو بہبود کے قوانین کا پاس نہ رکھنے کی وجہ سے عربوں کے اخلاق وعادات پر اثرانداز نہ ہوسکے۔ تاریخی شہادتیں بتاتی ہیں کہ مدینہ منورہ، طائف، نجران اور خیبر وغیرہ میں بڑی تعداد میں یہود ونصارٰی بستے تھے، علم ودولت کے ذریعہ آس پاس کے عرب قبائل پر حاوی تھے۔ ان سے کام لیتے اور معاوضہ بہت کم دیتے یا بالکل نہ دیتے۔ عرب سرداروں میں بھی یہ بُرائیاں آگئی تھیں۔ سرزمین عرب سے باہر شام ومصر میں بازنطینی نصرانیوں کی حکومت تھی اور مشرق وشمال کی جانب ایرانیوں کی سلطنت تھی، جو آتش پرست تھے۔ عرب کے جنوب میں یمن اور حضرموت کے علاقوں پر اکثر ایرانیوں یا حبشہ کے عیسائی حکمرانوں کا قبضہ رہتا تھا۔ ان کے قلمرو علاقوں میں بھی امن وامان، آزادی وحریّت اور سماجی انصاف وعدل واجبی حد تک ہی نظر آتے تھے۔ ایسے پُرآشوب زمانے میں پیغمبرِ اسلامؐ رحمت بن کر مبعوث ہُوئے۔ سیکڑوں بتوں کی عبادت کی جگہ ایک اللہ ربّ العٰلمین کی عبادت کی تلقین کی۔ اللہ تعالیٰ کا کلام قرآن پاک پڑھ کر سُنایا اور اس کی تعلیمات پر عمل کرنے کے طریقے بتائے۔ قریش اور مکّہ کے لوگوں کو اپنی صداقت وامانت کا واسطہ دے کر اپنی رسالت کا یقین دلایا۔ وُہ لوگ جنہیں دولت وثروت اور طاقت کا نشہ تھا، آپؐ سے برگشتہ ہو گئے۔ غریب، مفلوک الحال، غلام اور کمزور آپ کے گرد جمع ہو گئے اور آپ کی تعلیم کے مطابق آپس میں مساوات، اخوت، اخلاص و محبّت، عدل وانصاف اور ایثار وقربانی کا عملی مظاہرہ کرنے لگے۔ کچھ مالدار شخصیتیں، جو ایمان کے نور سے چمکیں، انہوں نے بھاری قیمتیں ادا کر کے اپنے غلام مسلمان بھائیوں کو خرید کر آزاد کیا۔ حُسنِ سلوک، محبت وخلوص کا بدلہ اسلام کے فرزندوں کو دشمنی وعداوت سے ملا اور سختیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ قریشیوں نے توحید کے پروانوں کا جینا حرام کر دیا۔ خود پیغمبرِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کو طرح طرح سے

تکلیفیں پہنچا نے لگے۔ مجبوراً مسلمانوں کو مکّہ سے ہجرت کرنے کی اجازت دی گئی۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یثرب کی جانب ہجرت کرنی پڑی اور اس شہر کا نام آپؐ کی تشریف آوری کے بعد مدینۃ الرسول پڑگیا۔

مدینہ پہنچ کر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن حکیم کی تعلیمات پر عمل کرنے میں بڑی سہولت ہوگئی اور امن وامان کے ساتھ مدینہ منورہ کے مختلف قسم کے باشندوں کو جن میں یہود، نصارٰی اور اوس وخزرج کے وُہ سارے افراد بھی تھے، جو ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے، ان سب کو آپ نے ایک معاہدہ کے ذریعے متحد کر دیا اور یہ لوگ ایک عرصے تک اس معاہدے کی وجہ سے آپس میں ایک دُوسرے کے مدد ومعاون بنے رہے اور صلح وآشتی کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے۔ البتہ مسلمانوں کی بڑھتی ہُوئی طاقت اور ان کی خوشحالی کو یہود ونصارٰی نہ دیکھ سکے اور وقتاً فوقتاً فرزندانِ اسلام کے خلاف بدعہدی اور بغاوت کا مظاہرہ کرتے رہے اور آخر کار غدر و بے وفائی کے نتیجے میں مدینہ منورہ سے نکالے گئے۔

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد عرب قبائل کے اخلاق وعادات میں نمایاں فرق رونما ہُوا۔ وُہ لوٹ مار، قتل وغارت، فحاشی اور دُوسری برائیوں سے تائب ہوکر باہمی تعاون، حسن سلوک اور اخلاق فاضلہ کے خُوگر ہوگئے۔ امانت ودیانت، صلح وآشتی، مودت واخوت، عدل وانصاف جیسی صفات کے حامل بن گئے۔ مہاجرین وانصار ایک دُوسرے کے بھائی بن چکے تھے اور ایک دوسرے کے حقوق وعزت کے نگہبان سمجھے جانے تھے۔

اسلام نے اوّلین بار ایک ایسے معاشرے کو جنم دیا جو صراطِ مستقیم اور راہِ اعتدال پر گامزن رہا۔ اس معاشرے کا ہر فرد نیکی کا گرویدہ اور بدی سے دُور بھاگنے والا تھا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (یعنی نیک کام کا حکم دینا اور بُرے کاموں سے روکنا) کو اپنا فرض منصبی بنا کر اسلامی معاشرہ "امت وسط" کے لقب کا مستحق ہُوا۔ دنیا میں عدل اسی طرح قایم ہوسکتا ہے کہ بُرائی کو روک دیا جائے اور نیکی کو رائج کیا جائے۔ اسی طرح دنیا کے نظم میں اعتدال پیدا ہو سکتا ہے۔ عدل کے معنی ہیں افراط وتفریط سے بچنا یعنی کسی شے کا نہ زیادہ ہونا اور نہ کم ہونا۔ یہ درجہ مقام وسط اور درمیانی ہے۔ دُنیا میں جو بُرائیاں ہیں، غور کیجیے تو وہ افراط و تفریط کے سوا اور کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ اسی طرح کسی چیز کو ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا اور ہر شے کا اپنی حد سے تجاوز کرنا اسراف ہے اور اس سے بڑھ کر گناہ کی کیا تعریف ہوسکتی ہے کہ وُہ قوتوں اور خواہشوں کے خرچ میں اعتدال سے کام نہ لینے کا نام ہے۔ اسی طرح ایک دوسرا لفظ "تبذیر" ہے۔ یعنی کسی چیز کو اس کے مصرف کے علاوہ دُوسری جگہ خرچ کرنا۔ مثلاً دولت فرد کے ضروری آرام وآسایش، عزیز واقارب کی اعانت، اور اعمال حسنہ میں خرچ کرنے کے لیے ہے۔ اگر اسے محض نمود ونمایش، دنیوی عزت اور حکام کی نظروں میں رسوخ حاصل کرنے کے لیے لٹانا شروع کردیں، تو قرآن پاک اسے "تبذیر" سے تعبیر کرتا ہے اور چونکہ اس کا نقصان اسراف سے زیادہ ہے، اس لیے وعید بھی سخت وارد ہُوئی۔ مسرف کے لیے تو صرف "ان اللہ لایحب المسرفین" (خدا اسراف کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا) فرمایا اور تبذیر کے مرتکبین کو "کانوا اخوان الشیاطین" کہہ کر شیطان کے اخوان واقارب میں شمار کیا گیا۔

دونوں لفظوں کا فرق قرآن پاک کی آیتوں سے واضح ہوجاتا ہے یعنی "کلوا واشربوا ولا تسرفوا — ان اللہ لا یحب المسرفین" کھاؤ، پیو، لیکن اسراف نہ کرو — اللہ اسراف کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

بھوک اور پیاس میں غذا اور پانی کا صرف بالکل صحیح کام ہے اور اشیاء کا بے موقع خرچ کرنا نہیں ہے۔ غذا کھانے ہی کے لیے ہے اور پانی پینے ہی کے لیے ہے۔ لیکن اگر حد خواہش اور ضرورت سے زیادہ کھایا جائے، یا ان کی تیاری اور اکل و شرب پر بے جا روپیہ صرف کیا جاسئے تو یہ اسراف ہوگا اور اعتدال سے دُور۔ اسی لیے حکم ہُوا کہ اسراف مت کرو۔ ایک دُوسرے موقع پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"وآت ذاالقربیٰ حقہ والمسکین وابن السبیل و لا تبذر تبذیرا"

اور اقارب کا حق ان کو دو، نیز مسکین اور مسافر کے حقوق ادا کرو اور دولت کو ضائع مت کرو۔ یہاں مقصد یہ ہے کہ دولت کا صحیح مصرف ہے، اعزہ و اقارب کے حقوق ادا کرنا، حاجت مندوں اور مسافروں کی ضرورتوں کو پورا کرنا۔ پس دُوسرے کاموں میں بے موقع خرچ کرنا سماجی انصاف کے خلاف ہوگا اور فسق و فجور سمجھا جائے گا۔

ایک دفعہ پیغمبرِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اعرابی سے کچھ قرض لیا اور اس کو ایک معین وقت پر ادائیگی کے لیے بلایا۔ اتفاق یہ ہوا کہ میعاد پوری ہونے پر جب وہ اعرابی آپ کے پاس آیا اور اپنے قرض کی ادائیگی کا تقاضا کیا، تو آپ کے پاس کچھ نہ تھا۔ آپ نے مزید مہلت چاہی اور فرمایا کہ کچھ دنوں کے بعد آئے۔ اعرابی کو آپ پر طیش آگیا اور بے ادبی کی باتیں کرنے لگا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو پکڑ لیا اور چاہتے تھے کہ اس کو زیادتی کا مزہ چکھائیں، کہ خود پیغمبرِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بڑھ کر حضرت عمرؓ کو روکا اور کہا کہ میں مقروض ہوں اور اس کا حق مجھ پر ہے اس لیے صبر و تحمل کی ضرورت ہے۔ آخر آپ نے ایک دُوسرے صحابی سے لے کر قرض ادا کیا۔ اعرابی پر آپ کے انصاف اور صبر و تحمل کا بڑا اثر ہُوا اور وُہ ایمان لے آیا۔

غزوۂ خندق میں جب مدینہ کے ایک جانب کھائی کھودنے کا فیصلہ ہُوا تو صحابہ کرام کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی خندق کھودنے اور مٹی ہٹانے میں برابر کے شریک تھے۔ شب و روز سب کے ساتھ اس کام میں مصروف رہے۔ مدینے کے اردگرد قریش کے ناگہانی حملہ کے خوف سے باری باری پہرہ دینے کا کام آپ بھی انجام دیتے تھے۔ ایک شب کو جب کفار کے حملہ کی افواہ گرم ہُوئی تو آپ ایک گھوڑے پر سوار ہوکر دُور دُور تک دشمنوں کے کھوج میں نکل گئے۔ پھر واپس آکر سب کو تسلّی دی، اور اپنے اپنے گھروں میں آرام سے سونے کا حکم دیا۔

لگان و خراج کی رقمیں اور اشیاء لوگوں میں آپ سب سے پہلے تقسیم کر دیتے اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اپنے لیے کچھ نہ چھوڑتے چنانچہ اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ بسا اوقات تین تین روز تک گھر میں آگ نہ جلتی اور آلِ نبیؐ ایک یا نصف کھجور کھا کر روزہ افطار کر لیتے۔ غرض اپنے اہل و عیال سے زیادہ اپنی اُمت کی آسایش و سہولت کا آپ کو خیال رہتا تھا۔

فتح مکّہ کے دن قریش کے ظالم سردار آپ کے سامنے سرنگوں کھڑے تھے۔ آپ چاہتے، تو ان کے ظلم کا بدلہ لے سکتے تھے۔ مگر آپ تو سراپا رحمت اور عدل و انصاف تھے۔ آپ نے سب کو معاف کر دیا۔ آپ کے حسن سلوک سے سب مسلمان ہو گئے۔ مسلمانوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ سماجی انصاف اور عدل کا خیال مسلمانوں کو اتنا تھا کہ وُہ کبھی ظلم کا بدلہ بیجا طور پر نہ لیتے اور سزا دینے میں حدِ اعتدال سے آگے نہ بڑھتے۔

اسلام سارے عالم کے اربابِ دانش کو ببانگِ دہل دعوت دیتا ہے کہ آؤ سب مل کر اس ایک بات پر اتفاق کرلیں کہ اللہ کے

سوا کسی دوسرے کی پرستش نہ کریں۔ اس کا کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور نہ اپنے میں سے کسی کو کسی پر ماسوائے اللہ فوقیت دیں اور نہ اس کے سوا کسی کو آقا اور داتا سمجھیں۔ اگر یہ اہلِ کتاب (اربابِ دانش) اس بات کا عہد نہ کریں، تو کہہ دو کہ تم سب گواہ رہو۔ ہم خود کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں؛

قُل یآ اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سوآءٍ بیننا وبینکم الا نعبد الا اللہ و لا نشرك بہ شیئا و لا یتخذ بعضنا بعضًا اربابًا من دون اللہ فان تولوا فقولوا اشھدوا بانا مسلمون۔

(آل عمران: ۶۴)

اس آیت پاک کی واضح تعلیم ہے کہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے اور اس کے سارے بندے، جس ملک و ملت اور جس دین و عقیدے کے بھی ہوں، اس کے لیے برابر ہیں۔ کسی کو یہ حق نہیں کہ کسی پر اپنی فضیلت جتائے اور نہ کسی کے لیے جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو حاجت روا سمجھے۔ یہ بات شرک کے قریب ہے کہ کوئی یہ خیال کرے کہ فلاں بزرگ کی قبر پر حاضری دینے کی وجہ سے میری یہ حاجت یا آرزو پوری ہوئی، حاجت روا اور آرزو پوری کرنے والا اللہ اور صرف اللہ ہے۔ اپنی بداعمالیوں یا ناقص اعمال کی وجہ سے کسی کی دُعا قبول ہوتی دکھائی نہیں دیتی تو وُہ کسی بزرگ کی زیارت کے بعد ان کی سفارش کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے۔ اسلام نے بُرے اعمال سے بچے رہنے کی تعلیم اسی لیے دی ہے کہ اللہ کے بندے سب آپس میں برابر ہیں۔ کسی کو کسی پر فوقیت نہیں[1] اور نہ کسی کو اپنے سے نیچا سمجھنا چاہیے۔ پس سب کو برابر حقوق حاصل ہیں۔ البتہ ہر ہر فرد اپنے اپنے نیک اعمال کی وساطت سے مختلف مدارج و مراتب پر فائز ہوتا ہے۔ اس لیے اساسی اصول عدل و انصاف، حقوق و واجبات سارے انسانی افراد کے لیے برابر ہیں۔ ان میں اگر ذرہ برابر بھی کمی یا بیشی کی جائے گی، تو ظلم و عدوان ہوگا۔ رنگ، رُوپ، مذہب اور عقیدے کا فرق نہ کیا جائے گا۔ اسلامی سماج دنیا کی تاریخ میں اوّلین مثال ہے کہ مسلمانوں کی حکومت میں ہر کیش و ملت کے لوگ صلح و آشتی اور امن و امان کے ساتھ بستے تھے اور سب کو مساویانہ شہری حقوق حاصل تھے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہر فرد کے لیے آذوقہ[2] مقرر کیا، تو غیر مسلم فقیر و محتاج کو دستِ سوال بڑھانے کے لیے نہیں چھوڑا۔ ان کے لیے بھی روزینے مقرر کر دیے۔

معاملات اور تجارتی لین دین میں کمی بیشی کرنے سے اسلام نے سختی سے منع کر دیا۔ قیمتوں پر کنٹرول کرنے کے لیے اشیاء کو بازار سے ناپید کر دینا سخت گناہ قرار پایا۔ گرانی بڑھانے کے لیے چیزوں کو خریدنا فساد برپا کرنے کے مترادف بتایا گیا۔ چور بازاری، چوری چھپے اشیاء کی نقل و حرکت کو بھی فساد کہا گیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"قد جآءتکم بینۃ من ربکم، فاوفوا الکیل والمیزان و لا تبخسوا الناس اشیآءھم، و لا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا ذٰلکم خیر لکم ان کنتم مؤمنین" (الاعراف: ۸۵)

"تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانی آچکی ہے، تو تم ناپ اور تول پُوری کیا کرو، اور لوگوں کو

---

[1] مگر تقویٰ کی بنا پر (محبوب احمد)

[2] طعام۔ کھانا (محبوب احمد)

چیزیں کم نہ دیا کرو، اور زمین میں اصلاح کے بعد خرابی نہ پیدا کرو۔ اگر تم صاحب ایمان ہو، تو سمجھ لو کہ یہ بات تمہارے حق میں بہتر ہے۔

"یا قوم اوفوا المکیال والمیزان بالقسط ولا تبخسوا الناس اشیاءھم ولا تعثوا فی الارض مفسدین۔"

(ہود: ۸۵)

اے قوم! ناپ اور تول انصاف کے ساتھ پوری پوری کیا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ کیا کرو اور زمین میں خرابی نہ کرتے پھرو۔

زمین میں خرابی کرنا فساد برپا کرنا نہایت عام حکم ہے، اس کا مطلب صرف نقضِ امن نہیں۔ ملکی قوانین، دینی اور اخلاقی نیز معاشرتی اصولوں کی خلاف ورزی سے بھی فساد رُونما ہوتا ہے۔ دُوسروں کے حقوق غصب کرنا، کسی کے ساتھ زبردستی کرنا، کسی کو دھوکا دینا، دنیاوی کاروبار میں تعطل پیدا کرنا، اپنے ذاتی مفاد کے لیے دُوسروں کی سہولتوں کو برباد کرنا، بھلے کاموں میں تعاون نہ کرنا اور بُرے کاموں کے لیے ورغلانا سب خرابی و فساد کے نتائج ہیں۔

اسلام نے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیا ہے۔ وُہ اسی سماجی انصاف کے پیشِ نظر مشروع ہے۔ غیر اسلامی ثقافت کے غلبے کے باعث آج کے مہذب سماج میں البتہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی کوشش کرنے والوں سے کہا جاتا ہے: "دوسروں کے امور میں مداخلت نہ کرو اور اپنی راہ لو۔" آج سے سالہا سال پہلے کے لوگ جو اسلامی تعلیمات سے زیادہ لگاؤ رکھتے تھے، ایسا کہنے والوں کو بُرا سمجھتے تھے، کیونکہ ایسا کہنا اسلامی حکم کے خلاف ہے۔ دو جھگڑنے والے گروہوں میں صُلح کرانا مسلمانوں کی شان ہے اور قرآن کا فرمان۔

سماجی انصاف کے پیشِ نظر اسلام نے جہاد کا حکم دیا ہے اور پیہم کوشش کرنے کی تلقین کی ہے۔ قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کا فریضہ تھا کہ اپنے ملک، وطن اور ہم قوم کی فلاح و بہبود کے لیے کوشش میں لگے رہنا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ ایک طرف سترہ سالہ سپہ سالار محمد بن قاسم سندھ کو فتح کرتا ہے اور مسلمان قیدی عورتوں کو دُشمنوں کے چنگل سے چھڑاتا ہے۔ دُوسری جانب موسیٰ بن نصیر ستر سال کی عمر ہو جانے پر بھی بحر اطلانتک کے کنارے پانی میں گھوڑے ڈال دیتا ہے اور کہتا ہے: اے آسمان اور اے بحر بیکراں! اگر اس سے پرے بھی کوئی خطۂ زمین میرے علم میں ہوتا تو اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے وہاں بھی پہنچنے کی کوشش کرتا اور آگے بڑھنے سے باز نہ آتا۔

غرض اسلام کے نام لیوا اپنے آخری وقت تک کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ کبھی جدّوجہد اور عمل خیر سے دست بردار یا ریٹائرڈ نہیں ہوتے۔

عہدِ نبوت کے عمرانی اور تمدنی مسائل

حکیم حیدر زمان صدیقی

عقل و شعور اور دلِ دردمند رکھنے والے ہر انسان کی نگاہِ تجسس ایک ایسی نئی دنیا کی تعمیر کے لیے وقفِ انتظار ہے، جس کی ہر صبح مسرت بدوش اور حیات آفرین ہو اور ہر شام سکون بخش اور گہوارۂ راحت ہو۔ وہ کون ہوگا جو ایسی انسانی سوسائٹی کی ضرورت محسوس نہ کرتا ہوگا جس کا ہر فرد خداترس، خود آگاہ اور فرض شناس ہو جس کے حدود مملکت میں ہر انسان زندگی کی حقیقی لذتوں سے لطف اندوز ہو۔ جہاں ایک دل بھی بالادست انسانوں کی چیرہ دستیوں سے اندوہ گیں نہ ہو اور نہ کوئی آنکھ زندگی کی محبوب اور حسین تمناؤں کی پامالی سے نمناک ہو۔

بلاشبہ ایک سنجیدہ فکر اور بااحساس انسان کے لیے ازحد مشکل ہے کہ وہ محنت کش اور دکھیا انسانوں کی چیخ پکار، اخلاق و شرافت کی رسوائی، متاعِ انسانیت کی پامالی اور انسانی خون کی ارزانی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اس پرخون کے آنسو نہ بہائے۔ لیکن اس کا کیا علاج کیا جائے کہ اس بے نور اور بے ذوق دورِ انسانیت میں درندہ صفت جاہ پرستوں کی کوئی کمی نہیں مگر ایسے بالغ النظر لوگ بہت کیاب ہیں، جو زمانہ کی رفتارِ نبض کو پہچان کر بیمار دنیا کے لیے نسخۂ شفا مہیا کر سکیں۔ ورنہ مبداءِ فیض کے دارالشفاء میں ہر درد کا علاج موجود ہے اور سازِ فطرت میں نغمہ ہائے زندگی کی کوئی کمی نہیں: ؎

تو راہ شناس نہ واز مقام بے خبری
چہ نغمہ الیست کہ در بربط سلیمی نیست

دورِ حاضر کا انسانی دماغ جن عملی مسائل سے الجھا ہوا ہے، وہ ہمارے ہی زمانہ کی پیداوار نہیں ہیں بلکہ وہ ہمیشہ سے انسانی فکر و توجہ کا مرکز بنے رہے ہیں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ہر دوسرے دور میں پہلے دور کی نسبت سے ان مسائل کی سطحی نوعیت و وضعیت بدلتی رہی ہو بلکہ کہنا چاہیے کہ بدلتی رہی ہے۔ لیکن زندگی کے واقعی اور حقیقی مطالبات ہر زمانہ میں ایک جیسے رہے ہیں اور اس لیے زندگی سے تعلق رکھنے والے عملی مسائل بھی بنیادی طور پر یکساں ہی رہے ہیں۔ اس بناء پر عقل و بصیرت اور دیانت و انصاف کا اقتضاء یہ ہے کہ مسائلِ حاضرہ کے عملی حل کے لیے انسانی تاریخ کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ کیا ماضی کے کسی دور میں ان مسائل کا موثر عملی حل پیش کیا گیا ہے اور کیا کسی انقلابی تصورِ حیات کے ذریعہ ایسی پاکیزہ انسانی سوسائٹی کی تشکیل عمل میں آئی ہے، جس کا ذکر پچھلی سطور میں کیا گیا ہے؟ اگر کسی انسانی دور میں ایسا ہوا ہے تو ہماری انتہائی بدنصیبی ہوگی کہ ہم اس مقدس انقلاب کے بانی کی پاکیزہ زندگی کی رہنمائی قبول کرنے کے بجائے کسی ایسے شخص کی رہنمائی قبول کریں، جو راہ و رسمِ منزل سے ناآشنا ہے۔ یقیناً آج انسانی دنیا کی آفاق گیر تباہی و بدامنی اسی چیز کا نتیجہ ہے کہ آج انسانوں کی زمامِ کار ان ائمۂ ضلالت کے ہاتھ میں ہے، جو ان کو خدا اور اس کے پیغمبروں کی راہ سے

بھیر کر فساد و معصیت کی راہ پر چلا رہے ہیں: ؎

لا یفلح الناس فوضٰی لا سراۃ لھم
ولا سراۃ لمن جھالھم سادوا

یہ مقدس انقلاب جو چھٹی صدی میں ظہور پذیر ہُوا، پُوری انسانی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا انقلاب تھا، جس کی تہہ میں عالمگیر اور بین الانسانی تصورِ حیات کارفرما تھا اور جس نے انسانوں کا زاویۂ نگاہ، زندگی کا نقطۂ نظر اور فکر و نظر کی دنیا ہی بدل ڈالی تھی یہاں تک کہ کرۂ ارضی پر بسنے والا کوئی انسان ایسا نہ رہ گیا تھا جو اس حیرت انگیز انقلاب سے متاثر نہ ہوا ہو۔

زیرِ نظر مقالہ میں یہ دیکھنا ہے کہ دنیائے انسانیت کے امیرِ اعظم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کارِ نبوت کا آغاز کیا تھا، تو اس وقت آپ کو کن کن مسائل سے دوچار ہونا پڑا تھا اور آپ نے ان مسائل کو حل کرنے کے لیے کون سا طریق کار اختیار فرمایا تھا۔ نیز یہ کہ وہ مسائل اس زمانہ کے وقتی مسائل تھے یا ان میں اور زمانہ حال کے مسائل میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے، اگر دوسری صورت ہے یعنی عصرِ حاضر کے پیچیدہ مسائل جن کو اربابِ علم و دانش کی پیہم اور لگاتار کاوشیں آج تک حل کرنے سے قاصر رہی ہیں، بنیادی حیثیت سے متذکرہ بالا دورِ انقلاب کے انسانی مسائل سے مختلف نہیں ہیں، تو اس صورت میں آج بھی وہی ہمہ گیر تصورِ حیات اور اسی طرز کی عملی جد و جہد انسانی دنیا کو ایک نئے انقلاب سے روشناس کر سکتی ہے اور اس کے نتیجہ میں ایک مقدس اور پاکیزہ انسانی سوسائٹی معرضِ وجود میں آ سکتی ہے۔

زمانہ قبل نبوت کے اجتماعی مفاسد

جس انسانی دور میں رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کا آغاز کیا، اگر اس کا موازنہ موجودہ دور سے کیا جائے، تو ان میں اس لحاظ سے یقیناً اختلاف پایا جاتا ہے کہ موجودہ دور علم و تہذیب کے اعتبار سے بہت آگے جا چکا ہے اور انسانی تمدن کی ارتقائی حرکت اور علم سائنس کی حیرت انگیز وسعت و ترقی نے انسان کو زمین کی پستی سے اٹھا کر آسمان کی بلندی پر پہنچا دیا ہے اور جس تاریخی دور کا ہم ذکر کر رہے ہیں، وہ تاریک خیالی، وہم پرستی، جہالت اور علمی کم مائگی کا بدترین دور تسلیم کیا گیا ہے مگر مسائل زندگی کے الجھاؤ کے لحاظ سے ان دونوں میں کوئی واضح اور حقیقی فرق نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ وہاں علم و ہنر کا فقدان انسانیت کے لیے بلائے بے درماں تھا اور یہاں حکمت و دانش کا غلط استعمال اہلِ دنیا کے لیے وجہ ہلاکت بن گیا ہے: ؎

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں اُلجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

بہر حال سطور ذیل میں قبل از نبوت دور کے ان بنیادی مفاسد کا ذکر کیا جاتا ہے، جو اس وقت انسانی دنیا کو ہلاکت و بربادی کی طرف دھکیل رہے تھے اور بظاہر ان کی اصلاح کی کوئی امید نہ تھی۔

بے روح اور غلط کارانہ مذہب پرستی

مذہب انسانی اجتماعیت کا قدیم ترین اور موثر ترین عنصر ہے اور اگر وہ الہامی صداقتوں اور ہمہ گیر اصولِ انسانیت پر مبنی ہو تو اپنے ماننے والوں میں خدا ترسی، حق پرستی اور ذکر و فکر کی اعلیٰ صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے۔ نیز قدرِ حریت کی نگہداشت اور حقوق انسانی کے تحفظ کا ضامن ہے۔ ایک سچا مذہب

ایک لمحہ کے لیے بھی اس بات کو برداشت نہیں کرتا کہ اس کو ماننے والا خواہشاتِ نفس کی تکمیل کے لیے آبادیوں کو پامال کرے اور بے گناہ انسانوں کی لاشوں پر اپنا تختِ جبروت بچھائے۔ لیکن یہ حقیقت کس قدر رُوح فرسا اور اندوہناک ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں بہت کم ایسا ہوا ہے کہ اہلِ مذاہب نے مذہب کی حقیقی روح کو اپنے دل و دماغ میں جگہ دی ہو۔ ورنہ آج تک جو کچھ دیکھا اور سُنا گیا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہمیشہ مذہب کے نام سے دنیا کے سٹیج پر ہیبت ناک خونی ڈرامے کھیلے گئے اور مذہب کے پردے میں علمبردارانِ مذاہب جس مکروہ اور بھیانک کردار کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں، اس سے شیطان کی روح بھی لرز جاتی رہی ہوگی۔

یہ جو کچھ کہا گیا ہے، بالکل حقیقت پر مبنی ہے اور سوائے چند مستثنیات کے مذہب کی پوری تاریخ اس پر شاہد ہے لیکن جس انسانی دور میں دنیا کے آخری ہادیِ برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلانِ دعوت کیا، وہ اس حیثیت سے بدترین دورِ انسانیت تھا۔ یعنی اس دور میں مختلف مذاہب کو ماننے والے لوگ جس طرح مذہب کی توہین و تذلیل کر رہے تھے، اس کی مثال شاید انسانی تاریخ میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلانِ نبوت کے وقت دنیا میں یہودیت، مجوسیت، حنیفیت، ہندوازم، بدھ ازم وغیرہ مذاہب کو ماننے والے لوگ بکثرت موجود تھے، لیکن بے لوث خدا پرستی اور حقیقت شناسی کسی مذہب میں موجود نہ تھی۔ ہر مذہب چند رسوم وظواہر کا مجموعہ رہ گیا تھا جو مختلف گروہ بندیوں کے لیے محض لیبل کی حیثیت رکھتا تھا اور پھر صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ہر مذہبی گروہ اپنی غلط کارانہ روش کو عین صواب سمجھتا تھا اور دوسروں کی اچھی چیز بھی اس کی نگاہ میں بُری تھی۔ گویا اُن کے نزدیک حق و باطل کا معیار صرف یہ رہ گیا تھا کہ جو چیز ان کی طرف منسوب تھی، وہ حق، اور جو دوسروں میں پائی جاتی تھی، وہ باطل تھی۔ اس غلط بینی اور اعتقادی گمراہی کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ مختلف گروہ بندیوں میں کوئی اصولی، اعتقادی اور عملی چیز وجہِ اشتراک نہ رہی تھی بلکہ ہر گروہ دُوسرے گروہ سے بالکلیہ مغایرت رکھتا تھا اور اسی چیز نے ان گروہ بندیوں میں شدید نفرت اور عصبیت پیدا کر دی تھی۔

قالت الیھود لیست النصٰرٰی علیٰ شیئٍ وقالت النصٰرٰی لیست الیھود علیٰ شیئٍ وھم یتلون الکتٰب۔ (بقرہ)	یہود نے کہا نصرانی کسی مذہب حق پر نہیں ہیں اور نصرانیوں نے کہا یہود حق پر نہیں ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں گروہ اللہ کی کتاب پڑھتے ہیں۔

یہ نفرت و عصبیت اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ ایک گروہ کے لوگ دوسرے گروہ سے ناروا سلوک کرنے میں کوئی قباحت تصور نہیں کرتے تھے۔ دوسروں پر ظلم و تشدد کرتے، ان سے بددیانتی کرتے بلکہ ان کے مقابلہ میں ہر بد اخلاقی کو روا سمجھتے تھے۔ چنانچہ قرآن کریم نے یہود کے نقطۂ خیال کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

لیس علینا فی الامیّین سبیل۔ (الآیہ)	اُمیّین (غیر اہل کتاب) کے بارے میں ہم پر کوئی الزام نہیں ہے۔

اس زمانہ کے اخلاقی تسفل و انحطاط کا صحیح اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں، جو مذہب کی عالمگیر سچائیوں پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان رکھتے ہیں اور جن کی نگاہ حقیقت شناس نیکی کو ہر حال میں نیکی اور بُرائی کو ہر حال میں برائی تصور کرتی ہے خواہ نیکی اور برائی کا تعلق اپنوں سے ہو

یا بیگانوں سے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس زمانہ کے اہلِ مذاہب، مذہب کی اس سیدھی سادی حقیقت سے بھی آشنا نہ تھے۔

دین و مذہب کی حقیقت ہی یہ ہے کہ وُہ انسانی قلوب، نظر کو ذوقِ تجسس اور امتیازِ حق و باطل کی گہری بصیرت عطا کرتا ہے اور انسانی قوائے فکر و عمل کو معین حدود و اخلاق کے زیرِ اثر نشوونما دیتا ہے۔ اس لیے جو لوگ مذہب کی حقیقت سے آگاہ ہیں، ان کی دور رس نگاہ کفر و معصیت کے ہر چہار سُو چھائے ہُوئے دھندلکے میں بھی حق و صداقت کی متلاشی رہتی ہے اور زندگی کی تگ و دَو میں ایک لمحہ کے لیے بھی ان کی طلب و جستجو اور ذوقِ حق پرستی میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوتی بلکہ ان کا جذبۂ شوق بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ لیکن جس قوم میں خدا پرستی کی حقیقی رُوح فنا ہوجاتی ہے، اس کی آنکھوں سے ایمان و عمل کے حیات آفرین حقایق اوجھل ہوجاتے ہیں اور وُہ اپنے مذہب کی سطحی اور ثانوی درجوں کی باتوں پر ہی قناعت کرلیتی ہے یا دینِ آباء کے اوہامِ باطلہ کو حقیقت تصور کرلیتی ہے:

انھم اتخذوا الشیاطین اولیاء من دون	ان لوگوں نے اللہ کے مقابلہ میں شیطانوں کو اپنا
اللہ و یحسبون انھم مھتدون۔	دوست بنا رکھا ہے اور سمجھتے ہیں کہ وہ راہِ راست
(الاعراف - ۳)	پر چل رہے ہیں۔

یعنی چند بے ضرر مذہبی مراسم جن پر عمل کرنے سے کچھ دینا اور کھونا نہ پڑتا ہو، ان کی اہمیت کو ضرورت سے زیادہ بڑھا دیا جاتا ہے، لیکن وہ احکامِ دینی، جن میں قربانیِ جان و مال اور ترکِ عیش و نشاط کا مطالبہ ہو، ان کو اس طرح پسِ پشت ڈال دیا جاتا ہے، گویا اب ان احکام کی ضرورت ہی نہیں یا وہ بالکل منسوخ ہوچکے ہیں یا خدائی دین کے مقابلہ میں بالکل ایک نیا دین تراش لیا جاتا ہے اور پھر اسی کو خدائی دین کا نام دے دیا جاتا ہے۔ یہی وہ اعتقادی و عملی گمراہی ہے، جو ہر زمانہ میں قوموں کی ہلاکت و بربادی کا سبب بنتی رہی ہے:

مرشدِ رُومی حکیمِ پاک زاد   سرِ مرگِ اُمتاں بر ما کشاد

سرِ ہلاکِ اُمتِ پیشیں کہ بود   زانکہ بر جندل گماں بُردند عود

دَورِ نبوت کے یہود و نصاریٰ کی بالکل یہی حالت تھی کہ ان کو دین کی زندہ اور متحرک رُوح سے کوئی سروکار نہ تھا، بلکہ انھوں نے دین کو خواہشاتِ نفس کا تابع بنا رکھا تھا۔ جہاں مذہب کا فیصلہ ان کی خواہشات کے خلاف ہوتا، وہ کمال دیدہ دلیری سے احکامِ مذہب کی قطع و برید کرکے ان کو خواہشِ نفس کے سانچے میں ڈھال دیتے تھے۔ یحرّفون الکلم عن مواضعہٖ ونسوا حظّاً ممّا ذکروا بہٖ - (الآیہ)

ان میں نیک و بد اور صواب و ناصواب کی تمیز ہی باقی نہ رہی تھی۔ علماء و مشایخ ان کو جس راہ پر ڈال دیتے، وہ لوگ اُسی راہ پر چل پڑتے تھے۔

اتخذوا احبارھم و رُھبانھم ارباباً	ان لوگوں نے اپنے علماء اور مشایخ کو اللہ کے سوا
من دون اللہ - (الآیہ)	رب بنا رکھا ہے۔

یہود صرف اس بات کو اپنی نجات کا واحد ذریعہ سمجھتے تھے کہ وہ اسرائیلی یا یہودی النسل ہیں اور نصرانی اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ حضرت مسیحؑ کی الوہیت کو مان لینا ہی فلاح و نجات کے لیے کافی ہے، لیکن ان کی عملی زندگی کو دیکھ کر کسی کو یقین نہ آسکتا تھا کہ وُہ

فی الواقع کسی پیغمبر کی رہنمائی کو مانتے اور اللہ کی کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔ قرآن حکیم نے ان کی اس گمراہی کا بار بار ذکر کیا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ کچھ یہودیوں اور مسلمانوں میں بات چل نکلی۔ یہودیوں نے دعویٰ کیا کہ "ہمارا مذہب سچا ہے اور نجاتِ اخروی کا استحقاق بغیر ہمارے کسی کو نہیں ہے۔" ان کے مقابلہ میں مسلمانوں نے کہا: "ہمارے نبی سب سے آخری نبی ہیں اور ہمارا دین آخری اور مکمل دین ہے۔" لیکن ذیل کی قرآنی آیت میں ان لوگوں سے واشگاف الفاظ میں کہا گیا کہ محض دین و مذہب کی نمائش سے کچھ نہیں بنے گا۔ اصل چیز ایمان و عمل ہے۔ اگر یہ نہیں تو محض کسی مذہب کا کامل و برتر ہونا تمہارے کسی کام نہیں آ سکتا۔[1]

لیس بامانیکم و لا امانی اھل الکتاب من	نہ تمہاری آرزوئیں اور نہ اہلِ کتاب کی آرزوئیں کام آئینگی
یعمل سوءً ایجزبہ — — — — — —	(خدا کا عالمگیر قانون یہ ہے کہ) جو شخص برائی کریگا
— — — — — — — — — — —	اس کو اس کی سزا ملے گی اور نہیں پائے گا وہ اللہ کے
— — — — — — — — — — —	سوا کوئی دوست اور نہ مددگار۔ اور جو نیک کام کرے گا
— — — — — — — — — — —	خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مومن بھی ہو،
— — — — — — — — — — —	وہ جنت میں داخل ہوگا اور اس پر ذرہ برابر بھی ظلم
و لا یظلمون نقیرًا۔ (النساء)	نہ ہوگا۔

یہود کی عملی حالت کا نقشہ جو قرآن حکیم نے کھینچا ہے، اس سے ان کی اخلاقی پستی کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے:

و تری کثیراً منہم یسارعون فی الاثم	آپ ان میں سے بہتوں کو دیکھیں گے کہ گناہ و سرکشی
و العدوان — — — — — — —	اور حرام خوری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ بہت ہی
— — — — — — — — — — —	بُرے ہیں وُہ اعمال، جو وُہ کرتے ہیں۔ ان کے علما
— — — — — — — — — — —	و مشایخ ان کو گناہ و معصیت کی بات کہنے اور حرام
— — — — — — — — — — —	کھانے سے کیوں نہیں روکتے؟ بہت ہی بُرا ہے
لبئس ما کانوا یصنعون۔ (المائدہ)	وہ کام، جو وہ کرتے ہیں۔

اور عام اہلِ کتاب سے قرآن حکیم نے یوں خطاب کیا ہے:

قل یاھل الکتب لستم علی شیءٍ حتّٰی تقیموا	اے پیغمبر! آپ کہہ دیں اے علمبردارانِ کتاب، تم
التوراۃ و الانجیل و ما انزل الیکم من	کسی صداقت پر نہیں ہو جب تک کہ تم توراۃ و انجیل
ربکم۔	اور اُن احکام کو جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر
(مائدہ)	اتارے گئے ہیں، پوری طرح قایم نہ کرو۔

---

[1] ابن جریر

يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِىْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ۔ (النساء)

اے اہل کتاب! تم اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ کی ذات پر حق کے سوا کوئی بات نہ کہو۔

مدینہ منورہ اور اس کے ارد گرد یہود کثرت سے آباد تھے۔ یہ لوگ بخت نصر کے حملۂ بیت المقدس کے زمانہ میں مدینہ میں آ رہے تھے[1]۔ مدینہ منورہ کے علاوہ یہ لوگ خیبر، فدک، وادی القریٰ میں بھی آباد تھے نیز عرب سے باہر یورپ، افریقہ اور ایشیا کے مختلف ممالک میں بھی پائے جاتے تھے لیکن ان کی کوئی جداگانہ ریاست دنیا کے کسی حصہ میں موجود نہ تھی۔ عرب میں ان کا ذریعہ معاش تجارت، کھیتی باڑی اور سودی کاروبار تھا۔ یہ لوگ حد درجہ کے لالچی اور سنگدل تھے۔ بڑی بڑی شرحوں پر سُودی رقمیں دیتے تھے اور کفالت کے طور پر لوگوں کے بچے بلکہ مستورات تک اپنے پاس رہن رکھتے تھے۔ ان میں دولت کی کثرت تھی۔ اس وجہ سے ان میں زنا و فحاشی کی کوئی حد نہ تھی اور علماءِ یہود نے اپنے امراء کی دلجوئی کے لیے زنا کی سزا (جو تورات نے مقرر کی تھی) ہی بدل ڈالی تھی۔

مسیحی مذہب کے پیرو عرب میں بکثرت موجود تھے۔ ابن قتیبہ کا بیان ہے کہ قبائل ربیعہ و غسان عیسائی تھے۔ قضاعہ میں بھی عیسائیت کا اثر پایا جاتا تھا بلکہ مکہ معظمہ میں بھی کچھ پیروانِ مسیحیت پائے جاتے تھے۔ چنانچہ ورقہ بن نوفل جو ایک خداشناس عیسائی اور عبرانی زبان کے ماہر تھے، مکہ معظمہ کے رہنے والے تھے۔

عیسائیوں میں اگرچہ کچھ بچے کھچے ایسے لوگ بھی تھے جو دل میں اللہ کا خوف رکھتے تھے اور ٹھیک ٹھیک مسیحی مذہب پر عمل پیرا تھے۔ یہی وہ لوگ ہیں، جن کی قرآن حکیم نے بھی تعریف کی ہے اور ایک مستند حدیث میں "الا بقایا من اھل الکتاب" کے الفاظ سے ان کو اس وقت کی گمراہ قوموں سے الگ کیا گیا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ان کی عظیم اکثریت سخت گمراہی میں مبتلا تھی۔ چنانچہ ایک مسیحی مصنف ڈریپر لکھتا ہے:

"عیسائیوں کے عقائد میں قدیم یونانی اصنام پرستی کا عنصر شامل ہو گیا تھا۔ عقیدۂ تثلیث قدیم مصری روایات کے سانچے میں ڈھل گیا تھا۔"[2]

اس زمانہ میں ایک گروہ مریمی کے نام سے پیدا ہوا تھا، جو حضرت مریمؑ کو بھی شریکِ الوہیت تصور کرتا اور اقانیم اربعہ کا اعتقاد رکھتا تھا۔ نیز اس زمانہ میں مسیحی فرقوں کے دلچسپ مسائل، جن پر وہ پوری قوت صرف کر رہے تھے، یہ تھے کہ حضرت مسیحؑ میں صرف خدائی طبیعت پائی جاتی ہے یا خدائی اور انسانی دونوں طبیعتیں ان میں جمع ہیں؟ اگر دونوں ہیں تو ان کا منشا ایک ہے یا الگ الگ؟

نصرانیوں کی اخلاقی حالت یہود سے کچھ کم افسوسناک نہ تھی۔ زمانۂ نبوت سے پہلے یہ لوگ دنیا کے بہت بڑے حصہ پر حکمران تھے اور دولت و اقتدار نے ان میں خطرناک حد تک ذمائم اخلاق پیدا کر دیے تھے۔ زنا، مے نوشی، رشوت خوری اور دیگر اخلاقی بیماریاں ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گئی تھیں۔ حضرت اقبالؒ نے دورِ حاضر کے فرنگیوں کی زہر آلود معاشرت پر بڑی خوبی سے طنز کیا ہے:

فرنگیوں کو عطا خاکِ سوریا نے کیا ۔۔۔ نبیٔ عفت و غمخواری و کم آزاری

---

[1] طبری [2] معرکۂ مذہب و سائنس ص ۹۲

حلقۂ فرنگ سے آیا ہے سورۂ پا کے لیے مَے وقمار و ہجومِ زنانِ بازاری (ضربِ کلیم)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ عہدِ رسالت کے ابتدائی دَور میں عیسائیوں کی اخلاقی حالت کسی لحاظ سے انیسویں اور بیسویں صدی کی عیسائیت سے بہتر نہ تھی۔

مجوسیت کا سرچشمہ ایران کی سرزمین تھی، لیکن عرب میں بھی کہیں کہیں اس کے اثرات پائے جاتے تھے۔ چنانچہ مورخین نے لکھا ہے کہ عرب کا قبیلۂ تمیم مجوسی تھا اور اس دور کے مجوسیوں کی مذہبی اور اخلاقی حالت ہمعصر اقوام سے کہیں زیادہ دردناک تھی۔ زمانۂ بعثتِ نبویؐ سے بہت پہلے ایران کے مشہور رہنما مانی نے عیسائیت و مجوسیت کے اجزا سے عجیب و غریب ملغوبہ تیار کیا تھا۔ ایک طرف اس کی جدت نوازی کا یہ حال کہ بیٹی اور بہن کی حرمت اٹھادی تھی۔ چنانچہ ایران کے ایک حکمران یزدگرد ثانی نے جو اس شریعت کا پیرو تھا، اپنی بیٹی سے نکاح کیا اور کچھ مدت بعد اس کو قتل کر دیا۔[1]

اس کے بعد ایک اشتراکیت پسند مزدک نامی مصلح پیدا ہوا، جس نے یہ تعلیم دی کہ دولت اور عورت کسی کی ملکیت نہیں۔ اس دین کی اشاعت میں عیاش حکمران و امراء نے سرگرم حصہ لیا کیونکہ یہ نیا دین ان کی تعیش پسندانہ طبائع سے مناسبت رکھتا تھا۔

قریش کو اس بات پر ناز تھا کہ وہ کعبۃ اللہ کے نگہبان اور ملتِ ابراہیمی کے پیرو ہیں۔ لیکن یہ دعویٰ یہود و نصاریٰ کے دعوؤں سے زیادہ بے حقیقت اور بے مغز تھا۔ ملتِ ابراہیمی کا بنیادی عقیدہ توحید ہے لیکن ان لوگوں کی زندگی کے کسی ایک گوشہ میں بھی توحید کا شائبہ تک موجود نہ تھا بلکہ وُہ شدید درجہ کی توہم پرستی اور شرک و بدعت میں مبتلا تھے اور ان کے معبودانِ باطل کی کوئی انتہا نہ تھی۔ ہاں بہت قلیل تعداد میں کچھ ایسے اشخاص بھی ان میں موجود تھے، جن کے ضمیر بالکل مُردہ نہیں ہو چکے تھے اور وُہ اپنی خداداد بصیرت سے اس حقیقت کو جان گئے تھے کہ انسان کا مقام اس سے بہت بلند ہے کہ وُہ اپنے ہاتھ سے گھڑے ہُوئے معبودوں کے سامنے سرِ نیاز خم کرے۔ چنانچہ ابن اسحٰق نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ کسی بُت کے سالانہ میلے میں ورقہ بن نوفل، عبداللہ بن جحش، عثمان بن الحویرث اور زید بن عمرو بن نفیل شریک تھے۔ ان لوگوں نے یک لخت ہی محسوس کیا کہ یہ کیا حماقت ہے کہ ہم انسان ہو کر پتھروں کے سامنے جھکتے ہیں۔ یہ خیال آتے ہی ان لوگوں نے حق و صداقت کی جستجو شروع کر دی۔ ورقہ، عثمان اور عبداللہ نے مسیحی مذہب قبول کر لیا اور زیدؔ نے دینِ حنیفی کی تلاش میں شام کا سفر کیا، کئی پادریوں اور راہبوں سے ملے لیکن جس چیز کی ان کو تلاش تھی، اس کا سراغ نہ ملا اور بالآخر اس اجمالی ایمان کو کافی سمجھا کہ "میں ابراہیمؑ کا دین قبول کرتا ہُوں"۔ اسی طرح امیہ بن صلت، جو طائف کے رئیس اور مشہور شاعر تھے، نے بھی بُت پرستی کی مذمت کی تھی۔ غالباً یہ وہی اُمیّہ ہیں، جن کی نسبت ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: "اس کا دل مومن اور دماغ کافر تھا"

دورِ جاہلیت کے کچھ سنجیدہ فکر اور صحیح الخیال اہلِ سخن کا کلام عربی لٹریچر میں ملتا ہے۔ نابغہ اور زہیر ان میں خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ چنانچہ نابغہ کے اس شعر سے ان کی توحید پرستی کا اندازہ ہو سکتا ہے: ؎

---

[1] مورخوں کی تاریخ عالم ص ۸۴، بواسطہ سیرتِ نبویؐ جلد ۴

حَلَفْتُ فَلَمْ اَتْرُكْ لِنَفْسِكَ رِيْبَةً
وَلَيْسَ وَرَاءَ اللّٰهِ لِلْمَرْءِ مَذْهَبٌ[1]

اور زہیر کے اس شعر سے ان کی وسعتِ نظر اور دقیقہ سنجی کا پتا چلتا ہے: ؎

وَ اِنَّ الْحَقَّ مَقْطَعُهُ ثَلٰثٌ
يَمِيْنٌ اَوْ نِفَارٌ اَوْ جِلَاءٌ

ان کے علاوہ ایک جاہلی شاعر کا یہ مشہور شعر ہماری درسی کتابوں میں پایا جاتا ہے: ؎

اَرَبًّا وَاحِدًا اَمْ اَلْفَ رَبٍّ
اَدِيْنُ اِذَا تَقَسَّمَتِ الْاُمُوْرُ

غرض سخنِ عشق کی آواز جاہلیت کے بے نور اور گھناؤنے دور میں بھی کہیں کہیں اُٹھ رہی تھی مگر اس کی حیثیت ایسی ہی تھی جیسے موجودہ مادہ پرستانہ ماحول میں صدائے حق کی ہے اور عربوں کا عام مذاق ذوقِ حق پرستی سے قطعی نا آشنا تھا۔

مدینہ منورہ کے مشرک قبائل اوس و خزرج کی دینی حالت بھی یہی تھی۔ یہ لوگ صدیوں پہلے جنوبی عرب (یمن) سے یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔ ابن کثیر نے بیان کیا ہے کہ سیل العرم کے زمانہ میں جو لوگ اِدھر اُدھر پھیل گئے تھے، اوس و خزرج بھی انھیں میں سے تھے۔ انھوں نے مدینہ منورہ کو اپنا مستقر بنا لیا تھا اور یہود سے عہد و پیمان کر لیا تھا۔[2]

بعثتِ نبویؐ کے وقت ہندوستان کے ہندو اپنی تاریخ کے تاریک دور میں داخل ہو چکے تھے۔ اس دور کو اہلِ تاریخ نے "پُرانک دور" کا نام دیا ہے۔ جس میں ویدا ور گوتم بدھ کی تعلیم کے بجائے پُرانوں کی تعلیم پر عمل شروع ہو گیا تھا۔ یہ دور بدھ ازم کے دورِ تنزل سے مسلمانوں کے داخلۂ ہند تک جاری رہا۔ مؤرخین کا اتفاق ہے کہ یہ دور قدیم ہندوستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ تاریک دور تھا۔ اس عہد میں بُت پرستی اوجِ کمال کو پہنچ گئی۔ مندر اور عبادت گاہیں زنا و فحش کاری کے اڈے بن گئیں اور مندر کے پجاری ایسے اخلاق سوز اعمال کا ارتکاب کرنے لگے کہ ان کے تصور ہی سے انسانی رُوح کانپ اُٹھتی ہے۔ غرض ہندوستان میں ہندوؤں کی دینی اور اخلاقی حالت بھی اس انتہائی حالت کو پہنچ گئی تھی کہ اس کی صلاح کی کوئی توقع نہ رہی تھی۔

نظامِ تمدن کی ہیبت ناکیاں

انسانی تمدن و اجتماع اگر کسی پاکیزہ اور بلند اخلاقی تصور پر مبنی نہ ہو تو اس کا لازمی نتیجہ بہیمانہ طبقاتی نزاع، خودغرضانہ گروہ بندی، ملت کش مفاد پرستی، ظالمانہ سیاست اور معاشی نامساوات کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور اس بات کو کوئی مانے یا نہ مانے لیکن حقیقت یہی ہے کہ ایسا پاکیزہ نصب العین دینِ حق کے سوا کسی دُوسری جگہ سے دستیاب نہیں ہوتا اور جہاں دین کی رُوح کا فقدان ہو، وہاں یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ انسان اپنے مقصدِ وجود اور حقیقی نصب العین کو جان سکے۔ لیکن سطورِ بالا میں عرض کیا جا چکا ہے کہ سرورِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت

---

[1] اغانی تذکرہ نابغہ جلد ۹ [2] ابن کثیر ص ۲۲۴

دنیا کی تمام قومیں دین کی حقیقی رُوح سے محروم اور لذتِ حق پرستی سے نا آشنا تھیں اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کی سیاست و معیشت اور عمران و تمدن کا پُورا نظام انتشار و فساد کی نظر ہو گیا تھا۔ ظھر الفساد فی البرّ والبحر بما کسبت ایدی النّاس۔ (الآیہ)

انسانی تاریخ کا یہ دور غیرالٰہی حاکمیت کے جبر و استبداد، سرمایہ پرستانہ ذہنیت کی سفاکی، ظالمانہ اور فاسقانہ معاشرت اور ہمہ گیر فساد، انسانیت کا ایک ایسا ہیجانی دور تھا، جس کی مثال ماضی کی پوری تاریخ میں بہ مشکل ہی مل سکتی ہے۔ پادشاہوں کی قبا زریں فاقہ کش اور مفلوک الحال عوام کے خونِ ناحق سے رنگین تھی اور ان کے تختِ زرنگار ہزاروں انسانوں کی لاشوں پر بچھائے گئے تھے۔ امراء و حکام ملک کا خُون چُوس رہے تھے، چاروں طرف ظلم و معصیت کا طوفان بپا تھا، قلب و نظر کی صلاحیتیں مٹ گئی تھیں۔ نیکی کو بُرائی اور بُرائی کو نیکی تصور کیا جانے لگا تھا۔ انسانی طبائع شر و فساد سے مانوس ہو گئی تھیں اور اخلاق و شرافت کے لیے دنیا کے کسی گوشہ میں پناہ گاہ نہ رہی تھی اور حد یہ کہ چند گنے چُنے انسانوں کو چھوڑ کر کسی انسانی دل میں حق کی طلب و جستجو کی خواہش ہی باقی نہ رہی تھی، ؎

مشرق خراب مغرب ازاں بیشتر خراب
عالم تمام مردہ و بے ذوق جستجو

یہ حالات تھے جن میں خالقِ کائنات نے اپنے آخری نبی احمدِ مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور آپ کے ذریعہ اس ظلمت کدۂ عالم کو نورِ ہدایت سے روشن کیا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کی اقوام کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی مفاسد کا سرسری جائزہ لیا جائے تاکہ اس سے اندازہ ہو سکے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ بعثت میں اجتماعی اور تمدنی مسائل کی نوعیت کیا تھی اور آپ کو کن کن عملی مسائل سے سابقہ پڑا؛ اس کے بعد ہم کسی ایک نتیجہ پر پہنچ سکیں گے کہ عصرِ حاضر کے انسانی مسائل وہی ہیں، جو اس دور میں تھے یا ان سے متاثر ہیں؟

زہرناک قومی تعصب اور بے قید سیاست بعثت نبویؐ کے وقت دنیا کی تمام چھوٹی بڑی قوموں کا اجتماعی کردار پستی کی انتہائی حد کو پہنچ گیا تھا۔ ان کی سیاست بے اصولے پن، نسل کشی، قومی عصبیت، تخریب پسندی، سفاکانہ حملہ و ہجوم اور بے دردانہ قتل و غارت کے لیے وقف تھی اور ان کے معاشی منصوبوں کا انحصار آوارہ گردی، غارت گری اور لوٹ مار کی متنوع اسکیموں پر تھا اور ان کی معاشرت ظالمانہ اور انسانیت کُش قوانین پر مبنی تھی۔ چنانچہ اس دور کی متمدن قوموں، روم و ایران اور ہند و چین کے حالات کا اگر جائزہ لیا جائے تو حیرانی ہوتی ہے کہ اگر تہذیب و تمدن اسی کا نام ہے تو پھر وحشت و بہیمیت کے لیے کون سا نام تجویز کیا جائے؟

روما کی حکومت اس وقت دو بازوؤں میں تقسیم ہو چکی تھی، "مغربی بازو" اور "مشرقی بازو"۔ مغربی بازو اخلاقی طور پر تسفل و انحطاط کے انتہائی نقطہ پر پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ مشہور مسیحی مورخ گبن لکھتا ہے:

"اگر اس وقت روم کے تمام بیرونی وحشی مخالفین فنا بھی ہو جاتے تو ان کی تباہی سلطنت کے مغربی بازو کو زوال و تباہی سے نہیں بچا سکتی تھی"۔

نیز مورخ مذکور لکھتا ہے:

"رومن حکومت مخالفین کی نظر میں روز بروز زیادہ کمزور اور خود اپنی رعایا کی نظر میں زیادہ ظالم اور ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ کفایت شعاری جتنی ضروری ہوتی جا رہی تھی، اسی قدر اس کی جانب سے بے اعتنائی بڑھتی جاتی تھی اور جس نسبت سے رعایا کے مصائب روزافزوں تھے، اسی نسبت سے ٹیکسوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔"[1]

اس سیاسی بدنظمی اور اخلاقی پستی کا نتیجہ تھا کہ جرمنی کی وحشی اقوام نے مغربی بازو کو کچل کر رکھ دیا اور گو ان حملہ آور جرمنوں نے عیسائیت قبول کر لی مگر قبولِ مذہب ان کے سفاکانہ اور وحشیانہ مظالم میں کوئی کمی نہ کر سکا۔

سلطنت روما کے مشرقی بازو کی حالت بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھی۔ چونکہ اس کی سرحدیں مملکتِ ایران سے ملتی تھیں، اس لیے یہ ہمیشہ اہلِ ایران سے اُلجھا رہا اور پے بہ پے جنگوں نے اس کو بالکل نچوڑ دیا تھا۔ عہد نبویؐ کے آغاز میں ایرانیوں نے اہل روم کو عبرت ناک شکست دی تھی اور ان کے اہم صوبوں مصر و شام و فلسطین پر قبضہ کر لیا تھا اور ۶ھ یعنی صلح حدیبیہ کے زمانہ میں رومیوں نے اہلِ ایران کو ایسی شکست دی کہ وُہ پھر کبھی نہ سنبھل سکے لیکن بیزنطینیوں کے داخلی مفاسد نے ان کو اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ وُہ اس فتح عظیم سے فائدہ اٹھاتے۔

رومیوں اور ایرانیوں کی خونریز لڑائیوں میں جو چیز سب سے زیادہ افسوسناک تھی، وُہ یہ ہے کہ ان کی قومی عصبیت اور مذہبی جنون اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ انسانیت و شرافت کی کوئی قدر ان کی نظر میں مستحق احترام نہ رہی تھی اور مذہب و اخلاق کی پامالی کا خوفناک سے خوفناک منظر بھی ان کے دلوں کو پسیجنے کے لیے کافی نہ تھا۔ چنانچہ خسرو پرویز نے جب فلسطین پر حملہ کیا تو اس نے پہلا کام یہ کیا کہ عیسائیوں کی عبادت گاہوں کو نذرِ آتش کر دیا اور بے دردی سے ہزارہا عیسائیوں کو تہ تیغ کیا اور جو بچے کھچے تھے، ان کو گرفتار کر لیا۔ اسی طرح رومی سلطنت کے حکمران ہرقل نے جب شمال کی طرف سے ایران پر حملہ کیا تو اس نے بھی جوابی طور پر مجوسیوں کے آتشکدوں کو برباد کیا اور لاکھوں انسانوں کا خون بہایا۔

یہ کوئی اتفاقی واقعات نہ تھے بلکہ یہ وحشت و بہیمیت اس دور کی اقوام کے قومی کردار کا جزو لاینفک بن گئی تھی اور اس سے پہلے بھی بارہا اس قسم کے واقعات منظرِ عام پر آ چکے تھے۔ چنانچہ رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے ایک سو سال پہلے کا ایک واقعہ جس کو اسلامی مورخوں نے قلمبند کیا ہے، یہ ہے کہ یمن کے ذونواس نامی یہودی بادشاہ نے نجران کے عیسائیوں کو جبری حکم دیا تھا کہ وہ عیسائیت چھوڑ کر یہودی بن جائیں اور اہل نجران کے انکار پر اس نے نجرانی عیسائیوں کو دہکتے ہوئے شعلوں میں دھکیل دیا تھا۔[2] نجران کے کچھ لوگ جو اس آزمائش سے بچ نکلے تھے، حبشہ کے نجاشی کے پاس پہنچے اور داستانِ ظلم پوری کی پوری سنائی۔ نیز انجیل کے جلے ہوئے اوراق بھی دکھائے اور نجاشی سے انتقام کی درخواست کی۔ اس پر نجاشی نے قیصر سے مدد طلب کی اور بہت بھاری مسلح فوج لے کر یمن پر حملہ آور ہوا۔ ذونواس کو عبرتناک شکست ہوئی اور اب یمن پر باقاعدہ عیسائی حکومت قائم ہو گئی۔ لیکن ان عیسائی حکمرانوں میں سے ابرہہ نامی ایک حکمران نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے کچھ ہی دن پہلے کعبۃ اللہ کو منہدم کرنے کی غرض سے مکہ پر چڑھائی کی تھی جس کا اجمالی ذکر قرآن حکیم میں بھی موجود ہے۔

---

[1] تاریخ زوال وانحطاط روما جلد دوم

[2] طبری ص ۹۲۵

عیسائی حکومتوں میں یہودیوں پر جو مظالم ڈھائے جاتے تھے، ان کے تصور ہی سے رُوح کانپ اُٹھتی ہے۔ خود پیروان مسیح کئی فرقوں میں بٹے ہُوئے تھے اور ہر فرقہ اتنا متعصب اور تنگ نظر تھا کہ دُوسرے فرقوں کی جان اور مال اس کے دستِ تعدی سے محفوظ نہ رہے تھے یہاں تک کہ برسرِ اقتدار طبقہ نے دُوسرے فرقوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔ چنانچہ گبن لکھتا ہے، جب حکمران طبقہ سے مسلمانوں کی جنگ شروع ہُوئی، تو دُوسرے فرقے کے عیسائیوں نے باہر سے آنے والے اجنبی مسلمانوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور جی کھول کر اپنے ہم مذہبوں کے خلاف مسلمانوں کو مدد دی اور مسلمانوں کے ماتحت رہنا ان کو دُوسرے عیسائی فرقوں کے ماتحت رہنے سے اچھا معلوم ہوتا تھا۔[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت چین اور ہندوستان جو ایشیائی ممالک میں اپنی قدیم تہذیب اور تاریخی عظمت کے اعتبار سے ممتاز سمجھے جاتے تھے، ایک عبوری دَور سے گزر رہے تھے اور نہایت خطرناک قسم کی خانہ جنگیوں میں مبتلا تھے۔ ہند کے برہمنوں اور بدھ ازم کے علمبرداروں میں ایک مدت سے کش مکش چل رہی تھی اور بالآخر برہمنیت کے جبر و تشدد نے بدھ ازم کو ملک بدر کر دیا تھا اور آخرالذکر نے چین میں جا پناہ لی تھی۔ لیکن چین میں پہلے سے فتنوں کی بھرمار تھی اور بڑی مشکل سے اس کو وہاں قدم جمانے کی اجازت ملی۔

یہ تو دُوسری اقوام کے حالات تھے لیکن خود عرب قوم جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہُوئے، اجتماعی اور سیاسی اعتبار سے اس کی حالت بھی کچھ کم تشویشناک نہ تھی۔ یہ ایسی خودسر قوم تھی کہ اس میں قومی مرکزیت کا کبھی احساس ہی نہیں پیدا ہُوا تھا اور اس وجہ سے یہاں کوئی متحدہ عرب سٹیٹ قایم نہ ہو سکی تھی۔ اس ملک میں بیسیوں قبائل آباد تھے اور ہر قبیلہ آزاد و خود مختار تھا۔ بڑے بڑے شہروں میں اعیانیت کے طرز کی شہری مملکتیں قایم تھیں۔ پڑوس کے حکمرانوں کی للچائی ہُوئی نگاہیں گاہے گاہے اس آزاد خطۂ ارضی کی طرف اٹھتی رہیں اور شاہان روم و ایران کی طرف سے بارہا کوشش کی گئی کہ اس خودسر قوم کو ہتھیا یا جائے، لیکن وہ اس میں کبھی کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ چنانچہ عثمان بن الحویرث کو جب قیصر نے مکہ کی بادشاہت کی سند عطا کی اور اس نے واپس آ کر مکہ میں اعیانِ قریش کے اجتماع میں قیصر کا پیغام سُنایا تو اس بات کے باوجود کہ اہل مکہ کا معاشی مفاد اہل روم و شام سے وابستہ تھا، انھوں نے کھلے طور پر انکار کر دیا اور صاف کہہ دیا کہ اہل مکہ ہمیشہ سے آزاد و خود مختار رہے ہیں اور وُہ ہرگز کسی کی آمریت کو پسند نہیں کریں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ قیصر نے مکہ والوں کو شام کے تجارتی سفر سے روک دیا مگر یہ انتقامی اقدام بھی اہلِ مکہ کو بیرونی طاقت کی غلامی پر مجبور نہ کر سکا۔ غرض عربوں میں ایک طرف اگر یہ خُوبی تھی کہ وُہ حریت نواز اور جمہوریت پسند تھے، تو دوسری طرف مرکزیت کے فقدان نے ان میں انتہائی درجہ کی بہیمیت و خودسری اور قبائلی عصبیت پیدا کر دی تھی اور اس جاہلی عصبیت نے سرزمین عرب کو صدیوں تک قتل و غارت اور سفاکی و خون آشامی کی آماجگاہ بنائے رکھا۔ اس ملک میں انسانی جان کی قیمت مکھی اور مچھر کے برابر بھی نہ تھی۔

نیز آزادانہ بدوی زندگی نے عربوں میں کچھ اچھے جوہر بھی پیدا کر دیے تھے۔ مثلاً ہمت و پامردی، شجاعت و بسالت، عزتِ نفس، فیاضی کی قسم کی صفات ان کی فطرت ثانیہ بن گئے تھے۔ لیکن زندگی کا کوئی پاکیزہ تصور نہ ہونے کی وجہ سے ان کی یہ صفات اصلاح و تعمیر کی جگہ تخریبِ انسانیت کے لیے استعمال ہو رہی تھیں۔ ایک قبیلہ کے لوگ دُوسرے قبیلہ والوں سے نہایت حقیر اور معمولی بات پر اُلجھ جاتے اور دونوں کی طرف سے سینکڑوں انسانی لاشیں فرشِ خاک پر ڈھیر ہو جاتیں۔ چنانچہ بکر و تغلب کی مشہور لڑائی جو حرب بسوس کے

---

[1] تاریخ زوال و انحطاط روما

نام سے متعارف ہے، صرف اتنی سی بات پر چھڑ گئی تھی کہ بسوس نامی عورت کی اُونٹنی دُوسرے فریق کی چراگاہ میں داخل ہُوئی اور اس نے پناہ دیے ہُوئے پرندوں کے انڈے توڑ دیے۔ اس پر کلیب وائل نے اُونٹنی کو ہلاک کر دیا اور اس کے نتیجہ میں بکر اور تغلب کی جنگ چھڑ گئی، جو چالیس سال تک جاری رہی۔

قبیلوی عصبیت نے ان کو خیر و شر اور نیک و بد کے احساس و شعور سے بالکل بے نیاز کر دیا تھا۔ قتل و غارت گری، ظلم و معصیت اور دیگر جرائم ان کی نگاہ میں عیب نہ تھے بلکہ قابلِ فخر کارنامے تصوّر کیے جاتے تھے۔ چنانچہ ایک شاعر اپنی نسبت لکھتا ہے : ؎

و انّی لا انال اخا حروب

اذا لم احبن کنت محبن حبان

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایامِ جوانی میں قریش اور قبیلہ قیس کے درمیان بڑے عرصہ تک جنگ جاری رہی جو حرب فجار کے نام سے مشہور ہے۔ اس جنگ نے دونوں طرف سے کئی خاندان برباد کر دیے تھے۔ مدینہ کے قبائل اوس اور خزرج ہمیشہ باہم جنگ آزما رہتے تھے اور زمانۂ بعثت سے کچھ ہی عرصہ پہلے بعاث کی لڑائی سے فارغ ہُوئے تھے۔

غرض عرب کی داخلی سیاست کی اصلاح کا مسئلہ کوئی معمولی مسئلہ نہ تھا جو کسی سیاسی رہنما کی ذہنی اُپج سے حل ہو جاتا اور اس پر مستزاد یہ کہ عرب کا محلِ وقوع بھی ایسا تھا کہ وُہ ہر طرف سے اس وقت کی بڑی طاقتوں میں گھرا ہوا تھا اور ان متمدن طاقتوں کے سیاسی اور معاشی دباؤ سے عرب بڑی حد تک متاثر تھے۔ اس کی تفصیل کے لیے عرب کے تاریخی پس منظر کو سامنے لانا ضروری ہے۔ عرب کسی زمانہ میں ایشیا و یورپ کے ممالک کے لیے تجارتی گزرگاہ کی حیثیت رکھتا تھا اور خود عربوں کی زلیست کا ذریعہ بھی بیرونی تجارت ہی تھی۔ عرب ہمیشہ سے تجارت کی غرض سے بیرونی ممالک مصر و شام، مشرقی افریقہ، عراق و فلسطین اور ہند و چین کا سفر کرتے تھے، بلکہ عرب کی قدیم تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ یہ مردم خیز خطۂ ارضی اپنے باشندوں کو آب و دانہ کے لیے ہمیشہ باہر دھکیلتا رہا ہے اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ عرب کی سرزمین کا بڑا حصّہ پیداوار کی کمی کی وجہ سے خود مکتفی نہ تھا اور ان لوگوں کو طوعاً و کرہاً معاشی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے اپنی بے آب و گیاہ مرزبوم کو چھوڑ کر سرسبز و شاداب ممالک کا رُخ کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ عرب کی قدیم ترین تاریخ گواہ ہے کہ حضرت مسیحؑ سے دو تین ہزار سال قبل عرب کی کچھ قومیں صحرائے عرب سے نکل کھڑی ہُوئیں اور انسانی آبادیوں کو پامال کرتی ہوئی آندھی کی طرح آناً فاناً دنیا کے بہت بڑے حصّہ پر چھا گئیں۔ ان قوموں نے بیشتر ممالک مثلاً مصر و شام، مشرقی افریقہ، ایران و عراق، قرطاجنہ، کریٹ اور یونان کو زیرنگیں کیا اور بڑی بڑی مملکتیں قایم کیں۔ چنانچہ ابن خلدون نے لکھا ہے :

وکان لھذہ الامم ملوک و دول فی جزیرۃ العرب وامتد ملکھم فیھا الی شام و مصر فی شعوب منھم۔ (تاریخ ابن خلدون ج ۲)	ان اقوام میں کئی بادشاہ ہو گزرے ہیں۔ جزیرہ عرب میں ان کی بڑی بڑی سلطنتیں قایم تھیں اور ان کے کچھ قبائل کی وسعتِ مملکت مصر و شام تک پہنچ گئی تھی۔

یہ قومیں وہی ہیں، جن کو قرآن حکیم نے عاد اولیٰ کے نام سے موسوم کیا ہے اور قدیم عربی تاریخ میں عرب عاربہ (خالص عرب) اور عرب بائدہ (تباہ ہونے والے عرب) کے ناموں سے متعارف ہیں۔ اور امم سامیہ اُولیٰ میں سے جو لوگ عرب ہی میں رہ گئے تھے، انھوں

نے عرب کے شمال میں عظیم مملکت قایم تھی۔ قرآن حکیم نے ان کو "ثمود" کا نام دیا ہے۔
زمانہ کی نیرنگیوں نے قوموں کو ایک ہی حال میں کب رہنے دیا ہے ؛ شاید یہ بات منشاءِ خداوندی کے خلاف ہے کہ ایک ہی قوم ہمیشہ کے لیے انسانی دنیا پر مسلط رہے۔ اس لیے اس قوم کا اقتدار بھی آخر کچھ سامی النسل قوموں کے ہاتھوں ختم ہوا۔

یقال انہم انتقلوا الیٰ جزیرۃ العرب من بابل لما زاحمہم فیہا بنو حام۔ (کتاب العبر جلد ۱)

کہا جاتا ہے کہ وہ بابل سے جزیرۂ عرب کی طرف منتقل ہو گئے جبکہ حامی النسل لوگوں نے ان کو مار بھگایا۔

اسی طرح مصر میں قبطی اقوام نے نئی حکومت قایم کر لی اور دوسرے ممالک میں بھی ان کا شاہانہ اقتدار مٹ گیا۔ ان کے بعد عراق و یمن و شام میں مختلف قومیں برسرِ عروج رہیں۔ یہاں تک کہ روما کی عیسائی سلطنت نے مصر و شام اور فلسطین پر تسلط قایم کر لیا اور عراق و یمن اہلِ فارس کے زیرِ نگیں آ گئے۔ لیکن چونکہ ایران و روم میں مسلسل آویزش رہتی تھی اور اس کے علاوہ عرب کے خانہ بدوش بدوی قبائل عراق اور شام میں داخل ہو کر لوٹ مار کرتے تھے۔ اس لیے ایرانی حکومت نے مصلحت اندیشی کے طور پر عراق میں عرب اسٹیٹ قایم کر دی اور روما نے دمشق میں عربوں کی ایک ریاست قایم کر دی۔ یہ ریاستیں جن سیاسی اغراض کے لیے قایم ہوئی تھیں، ان کے لیے بہت کار آمد ثابت ہوئیں اور نہ صرف یہ کہ ان سرحدی ریاستوں نے حاجز مملکت (بفر اسٹیٹ) کا کام دیا اور ایرانی و بیزنطینی عرب بدوؤں کے غارت گرانہ حملوں سے محفوظ ہو گئے، بلکہ ایران و روم کی جنگوں میں ان ریاستوں کے لوگ اپنے اپنے اقتدارِ اعلیٰ کے ماتحت سر دھڑ کی بازی لگا دیتے اور میدانِ جنگ میں پیش پیش رہتے تھے۔ بالآخر بیزنطینیوں کا اثر و نفوذ یہاں تک بڑھا کہ شمالی عرب کے بہت سے قبائل مثلاً دومۃ الجندل، اذرح، جربا وغیرہ نے عیسائیت قبول کر لی اور بیزنطینی حکومت نے یہاں بھی کچھ عرب سرداروں کی ریاستیں قایم کر دیں اور اس طرح اس نے اپنے آپ کو محفوظ بنا لیا تھا۔ اسی طرح عراق اور یمن پر ایرانی تسلط بھی دعوتِ نبویؐ کے لیے مستقل خطرہ تھا۔

غرض عرب کی خارجہ سیاست کچھ اس قدر پیچیدہ تھی کہ محض سیاسی بصیرت اور عقل و تدبر سے اس کو حل نہ کیا جا سکتا تھا، بلکہ اس کے لیے پیغمبرانہ بصیرت اور الہامی طریق کار کی ضرورت تھی۔ مذکورہ مسائل کے علاوہ عرب اور بیرونِ عرب کا معاشی مسئلہ بھی کچھ کم اہمیت نہ رکھتا تھا اور یہ بات باد نیٰ تامل سمجھ میں آ سکتی ہے کہ جو ملک سیاسی لحاظ سے شدید انتشار و ابتری کا شکار ہو یا پے بہ پے جنگوں نے اس کے ملکی نظام کو درہم برہم کر دیا ہو، وہاں معاشی حالت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور پھر آمرانہ طرزِ حکومت میں دولت کی نامساویانہ تقسیم ایک ناگزیر اور طبعی چیز ہے اور ظاہر ہے کہ اس وقت تمام دنیا کی قومیں مطلق العنان حکمرانوں یا قبائلی سرداروں کے پنجۂ استبداد میں جکڑی ہوئی تھیں۔

یہ باتیں تو تمام ممالک میں مشترک تھیں لیکن عرب کا معاشی مسئلہ دوسرے ممالک کی نسبت سے بہت زیادہ الجھا ہوا تھا کیونکہ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے ملک کے پیداواری ذرائع کے فقدان نے عربوں کو ہمیشہ پریشان حال رکھا۔ اس ملک کی پیداوار کھجور تھی۔ بعض علاقوں میں غلہ کی کاشت ہوتی تھی لیکن وہ اتنی نہ تھی کہ دوسرے علاقوں کے لیے برآمد کی جا سکے۔ نیز بکریوں اور اونٹنیوں کا دودھ بھی صحرائی لوگوں کی غذا کے کام آتا تھا۔ زیادہ تر یہ لوگ لوٹ مار اور غارت گری کے ذریعہ تنورِ شکم کے لیے ایندھن مہیا کرتے تھے۔

ابن خلدون نے لکھا ہے کہ اگر ان کو چولہے کے لیے پتھر کی ضرورت ہوتی تو کسی مکان کی دیوار توڑ ڈالتے اور اگر لکڑی کی ضرورت پڑتی تو کسی مکان کی چھت اکھاڑ لیتے۔ لوٹ مار اور قتل و غارت گری اخلاقی نقطۂ نظر سے خواہ کتنی ہی معیوب کیوں نہ ہو لیکن ان کی نظر میں معیوب نہ تھی بلکہ ان کو اپنے اس ظالمانہ کردار پر ناز تھا اور اس کے علاوہ کچھ لوگوں کا ذریعہ معاش بیرونی ممالک کی تجارت تھی۔

نیز ملک کے طول و عرض میں یہودی سرمایہ دار پھیلے ہوئے تھے۔ تجارت کی اہم منڈیوں پر ان کا قبضہ تھا اور اس کے علاوہ یہ لوگ وسیع پیمانہ پر سودی کاروبار بھی کرتے تھے۔ عرب عوام ان کے قرضوں کے بوجھ سے دبے ہوئے تھے اور یہودی بنیے نہایت گراں شرح سود پر قرض دیتے تھے۔ ان درندہ صفت انسانوں کی سنگدلی کا یہ حال تھا کہ ضمانت کے طور پر لوگوں کے بچوں اور عورتوں کو گرد رکھتے تھے۔

اس اجمالی بیان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس ملک کے عوام کی معاشی زندگی حد درجہ پست تھی اور قوم کو اس خوفناک افلاک و فاقہ مستی سے نکالنا ملک کا اہم اجتماعی و ملّی سوال تھا۔

عربوں کے معاشرتی رسم و رواج اور اخلاقی و مجلسی مفاسد اس درجہ گہرے اور خطرناک تھے کہ عام حالات میں ان کی اصلاح کی کوئی توقع نہ ہو سکتی تھی۔ بلند و پست، اونچ نیچ اور شریف و وضیع کا امتیاز ان کی قومی روایات میں غیر معمولی اہمیت رکھتا تھا اور اخلاقی و مجلسی مفاسد کی تو کوئی حد ہی نہ تھی۔ یہ مسئلہ ایک مستقل موضوع بحث ہے اور اس کے تفصیلی گوشوں سے بحث کرنا اس موقع پر مشکل ہے۔ یہاں صرف ایک واقعہ کی طرف اشارہ کرنا کافی ہوگا۔

طائف کی سفارت نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر شرف باریابی حاصل کیا تو انھوں نے کہا ہم اس شرط پر اسلام قبول کرتے ہیں کہ ہمارے یہ مطالبات تسلیم کیے جائیں۔ پہلے یہ کہ زنا ہمارے لیے جائز رکھا جائے کیونکہ ہم میں اکثر لوگ مجرد زندگی بسر کرتے ہیں اور زنا کے بغیر ان کو چارہ نہیں۔ دوسرے شراب سے منع نہ کیا جائے کیونکہ یہ ہماری قومی تجارت ہے۔ تیسرے سودی کاروبار کی مخالفت سے ہمیں مستثنیٰ کیا جائے، کیونکہ یہ ہمارا ذریعۂ معاش ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تمام شرطیں نامنظور کیں۔ لیکن اس واقعہ سے اس بات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی مجلسی زندگی کس قدر بے لگام اور معصیت آلود تھی۔

عرب کے علاوہ دوسرے ممالک کا بھی یہی حال تھا۔ مثال کے طور پر ہندوستان ہی کو لیجیے۔ یہاں ذات پات کی تفریق اور نامنصفانہ مجلسی قوانین نے آبادی کو کئی طبقوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ کسی اونچی ذات کا مرد اگر کسی نیچی ذات کی عورت سے زنا کرتا تو اس کے لیے کوئی سزا نہ تھی۔ لیکن کسی اعلیٰ ذات کو اچھوت نسل کا آدمی چھو لیتا، تو اس کی سزا موت تھی۔ اس ملک کی اخلاقی پستی کا یہ عالم تھا کہ عورتیں جوئے میں ہاری جاتی تھیں۔ ایک عورت کے کئی کئی شوہر ہوتے تھے۔ قومی تہواروں میں شراب کے دور چلتے تھے اور نشہ کی حالت میں ماں، بہن اور بیٹی کی تمیز نہ رہتی تھی اور اس پر طرفہ یہ کہ اس کام کو نیکی کا کام تصور کیا جاتا تھا۔

یہود کے اخلاقی اور مجلسی مفاسد کو قرآن حکیم نے بالوضاحت بیان کیا ہے۔

نتائج بحث و فکر گزشتہ بحث سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت انسانی زندگی کے اجتماعی مفاسد کیا تھے؟ ان مفاسد پر دوبارہ سرسری نگاہ ڈال لیجیے تاکہ آپ کو ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو سکے کہ عصر حاضر کے

اجتماعی مفاسد کو اس دور کے مفاسد سے کیا نسبت ہے؛

۱ ——— بے مقصد اور بے روح مذہبیت: یعنی اس دور کی تمام قومیں اگرچہ کسی نہ کسی مذہب کی پیرو تھیں، لیکن اس کے باوجود ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی دین کی روح سے بالکل تہی مایہ تھی اور یہی وُہ بنیادی فساد تھا جس نے ان لوگوں کی نگاہ سے زندگی کا حقیقی تصور بالکل اوجھل کر دیا تھا اور اگر غور سے دیکھا جائے، تو دیگر تمام مفاسد کا سرچشمہ یہی ہے۔

۲ ——— شدید نسلی و قومی تعصب ۔ اس دور میں سطح ارضی پر سینکڑوں چھوٹی بڑی قومیں آباد تھیں اور ہر قوم اس زعم میں مبتلا تھی کہ عظمت و شرف اور فضیلت و منقبت کے تمام محاسن و کمالات صرف اسی کے لیے مخصوص ہیں اور دوسرے لوگ محض اس کی محکومی اور نازبرداری کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ یعنی ہر قوم یہ عقیدہ رکھتی تھی کہ مخلوقِ خدا پر خدائی کرنے کا حق اسی کو حاصل ہے اور دوسری قوموں کا بس یہی کام ہے کہ اس کی بندگی کریں۔

۳ ——— بے قید سیاست ۔ یعنی اس دور میں زندگی کا اجتماعی اور سیاسی نظام دین کی پابندی سے بالکل آزاد تھا اور اس ثنویت نے قوموں کی اجتماعی زندگی میں مہلک جراثیم پیدا کر دیے تھے۔

۴ ——— دولت کی نامنصفانہ تقسیم

۵ ——— ظالمانہ معاشرتی اور مجلسی رسم و رواج

اس تفصیل سے آپ خود ہی سمجھ سکتے ہیں کہ اس دور کے عملی مسائل کیا تھے اور اس بات کو سمجھنا بھی کچھ مشکل نہیں کہ دورِ حاضر کے عملی مسائل بنیادی حیثیت سے دورِ رسالت کے مسائل سے مختلف نہیں ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ چودہ سو سال پہلے کے انسانی دور اور موجودہ دور میں کچھ فرق نہیں ہے۔ یقیناً فرق ہے اور ہونا چاہیے۔ لیکن سطورِ بالا میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے، وہ صرف اتنا ہے کہ انسانیت کے حقیقی اور بنیادی مسائل میں چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔ یقیناً آج بھی پیروانِ مذاہب، مذہب کی حقیقی سپرٹ سے بالکل محروم ہیں اور ان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کو دیکھ کر کسی کو یقین نہیں آ سکتا کہ یہ کسی دین کے پیرو ہیں۔ اس طرح اقوامِ عالم کا نسلی اور قومی تعصب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ دین و سیاست کی جدائی ایک مستقل عقیدہ بن چکی ہے۔ معاشی نامساوات اور معاشرتی مفاسد بھی انسانی سوسائٹی میں گہرا اثر پیدا کر چکے ہیں۔ لہٰذا جب انسانیت کا مرض وہی ہے، جو چودہ سو سال پہلے تھا، تو علاج بھی وہی کیوں نہ ہو، جو پہلے ایک مرتبہ آزمایا جا چکا ہے۔ یعنی آج اگر ہم دیانت داری سے ان مسائل کو حل کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ایک تابناک مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔